خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۷۸ — ۸۰

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۲۳۴۲۴/۷۷

شمارہ: اٹھہتر تا اسّی

اس شمارہ کی قیمت: پچہتر روپے

سالانہ: ۳۰۰ روپے ہندمیں

۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپواکر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

جہانِ غالب

- 'زمانہ' کی غالبیات — دیا نرائن نگم کے 'زمانہ' (۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء) سے انتخاب — ۱

مخطوطات شناسی

- مثنوی حالنامہ: گوی و چوگان — ڈاکٹر متین احمد صبا — ۱۴۵
- دیوانِ میر سوز کا نسخۂ کراچی — جناب زاہد منیر عامر — ۱۸۵
- دیوانِ ہاشم — ڈاکٹر کلیم سہسرامی — ۱۹۷
- شیخ غلام محمد اول اور ان کا تاریخ نامہ — ڈاکٹر نورالسعید اختر — ۲۰۵
- دیوانِ مصحفی کا خدا بخش اڈیشن — پروفیسر مختارالدین احمد — ۲۲۰
- تصوف مخطوطات — جناب عارف نوشاہی — ۲۲۲

تاریخ ہند: عہدِ وسطیٰ

- شہنشاہ اکبر کا دارالترجمہ — ڈاکٹر اطہر عباس رضوی (آسٹریلیا)، ترجمہ: جناب سید حسن عباس (تہران) — ۲۲۷

جناح

- جناح صاحب — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۲۴۹

جہانِ سرسید

کچھ جان ڈیون پورٹ کے بارے میں (لندن سے سرسید کے دو خط محسن الملک کے نام)		۲۶۱
مؤید الاسلام	جان ڈیون پورٹ	۲۶۳

جہانِ ودود

یادداشت بسلسلۂ ودود	قاضی عبدالودود	۲۷۱

جہانِ آزاد

فتنۂ ارتداد اور مسلمان	مولانا ابوالکلام آزاد	۲۹۱

اشاریے

سہ ماہی فکر و نظر (علی گڑھ) کا اشاریہ	ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری	۲۹۷

مراسلات

جرنل ۶۹ - ۳۰ کے بارے میں	جناب عبدالرؤف خان	۳۳۵
جرنل ۶۳ - ۶۸ کے بارے میں	جناب مصطفیٰ خان شروانی	۳۴۷

انگریزی

اولڈ مسلم انسکرپشنز آف پٹنہ	سید محمد	۱

زمانہ کی

غالبیات

(دیا نرائن نگم کے)

'زمانہ' (۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء) سے ایک انتخاب

زمانہ (کانپور) بجا طور سے اردو کے بڑے رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیا نرائن نگم اعلیٰ درجہ کا ادبی علمی ذوق رکھتے تھے۔ نگم مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اچھے لکھنے والے تو تھے ہی بہت اچھے ایڈیٹر بھی تھے۔ زمانہ میں مختلف موضوعات پر اتنا اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ کم ہی کسی دوسرے رسالے میں ہوگا۔

مرزا غالب پر رسالہ زمانہ سے ایک انتخاب پیش خدمت ہے۔

—— طرب

مشتملات

تصویرِ غالب	پیشکش: دیا نرائن نگم	۲
غالبِ مغفور	ا۔ ز۔ لکھنوی	۵
مرزا غالب کی اردو و فارسی شاعری	ا۔ ز	۲۵
فلسفۂ غالب	مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی	۳۱
مرزا غالب اور دیگر شعرا	حاسد طالب کاشمیری	۴۸
براؤننگ اور غالب	سید مقبول حسن احمد پوری	۶۲
کلیم اور سلیم (دونوں ترک لکھنے میں ہیں) غالب کے ایک شعر کے متعلق	میر ولی اللہ	۶۶
مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ (ادیب)	مولانا ابو الکلام آزاد	۷۵
مرزا غالب مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ غزل (ادیب)	مولانا ابو الکلام آزاد	۸۵
غالب از ڈاکٹر سید عبد اللطیف	سید علی عباس حسینی	۸۶
غالب (ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی کتاب پر تبصرہ)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۹۴
رقعاتِ غالب میں کاٹ چھانٹ	پروفیسر مہیش پرشاد	۹۷
غالب کا مذہب	سید عاشق علی	۱۰۰
روحِ کلامِ غالب	مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی	۱۰۲
غالب مصنفہ غلام رسول مہر (پر تبصرہ)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۱۲
مرزا غالب کی بے لطف الیاں	مسٹر اقبال انصاری	۱۱۵
خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد پر تبصرہ)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۲۱
انتخابِ دیوانِ غالب	مسٹر سلیم جعفر	۱۲۲
دیوانِ غالب اردو کے قلمی نسخے	پروفیسر مہیش پرشاد	۱۲۶
دیوانِ غالب (مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۲۹
بیانِ غالب (مرتبہ آغا محمد باقر)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۲۹
روحِ غالب (مرتبہ محی الدین قادری زور)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۳۰
دیوانِ غالب اردو (مرتبہ نظامی بدایونی/ملک راس مسعود/سعید القادر) ناشر گلاب سنگھ	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۳۱
دیوانِ غالب (مرتبہ چشتی)	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۳۲
غالب پر اہم خبریں	دیا نرائن نگم/ادارہ	۱۳۳
قتیل اور غالب (مباحثہ)	حکیم ابو العلا ناطق	۱۳۴
غالب (نظم)	روش صدیقی	۱۴۳



شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم
(از زمانہ۔ جولائی ۱۹۰۹ء)

مطبوعہ زمانہ پریس کانپور

غالب مغفور

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلئے

غالب کو کیا دل و دماغ قدرت سے عطا ہوا ہے کہ سب شاعرون سے انکا فکر سحر طراز، تلاش معنی، ترکیب بندش، نشست، الفاظ جدا گانہ ہے انکی رنگین بیانی اور معجز نگاری کے ڈنکے بجے ہوئے ہین غالب دراصل فارسی گو شاعر ہین اور فارسی گو کیسے ترکی النسل اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب تو را بن فریدون تک پہونچتا ہے تو غالب کو شہزادہ کہنے مین کیا تامل ہے ایک تو شہزادہ اور دوسرے فرمانروائے ملک سخنوری نور علیٰ نور کی مثل صادق آگئی غالب نے ادعائے سخنوری فارسی مین کیا ہے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ سے آرزو کرتے ہین کہ شاہجہان کے عہد مین کلیم کو سیم و زر سے تولا گیا تھا مگر مین صرف یہ چاہتا ہون کہ اور کچھ نہین تو میرا کلام ہی ایک مرتبہ کلیم کے کلام کے ساتھ

تول دیا جاسے۔ غالب کا یہ ادعا نازیبا نہین ہے نہ اور غالب نے اپنی ایک مقطع مین خود کو حزین کے برابر کہا ہے۔ یعنی

تو بدین شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنی شیخ علی را مانی

جو انصاف پسند سخن فہمی کو صحیح مذاق رکھتے ہین وہ غالب کے خیال سے اختلاف نہ کرین گے۔ غالب کے اصناف سخن پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہی کہ ان کا درجہ سخنوری بہت ہی بلند اور رجادی ہی اور انکی قدر اُن اہل کمال نے کی ہے جو خود فن سخن مین کامل دستگاہ رکھنے والے تھے اور اب بھی غالب کے قدردان کثرت سے ہین اور یہ خیال ذہن نشین ہے کہ غالب نے جو جادۂ سخن وری اختیار کیا ہے وہ حد درجہ دشوار گزار ہے مگر غالب کی ہمہ گیر طبیعت نے جس رنگ مین قلم اُٹھایا اور جس خیال کی مصوری کی وہ تمام اہل نظر کے لیئے دلفریب ثابت ہوی غالب نے اپنی زندگی ہی مین معاصرین سے داد سخنوری حاصل کی حکیم مومن خان مومن اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے کمال سخنوری سے کون نہین واقف مگر یہ دونون بزرگوار غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہمپایہ سمجھتے تھے اور نواب ضیاء الدین خان مرحوم کا قول تھا کہ ہندوستان مین فارسی کی ابتدا ایک ترک چین (امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (غالب) پر اسکا خاتمہ ہوا اور غالب کی نسبت یہ رائے دی گئی ہو کہ اگر یہ عربی شعر کی طرف توجہ کرتے تو متنبی یا ابو تمام ہوتے اور اگر زبان انگریزی کے شاعر ہوتے تو انگلستان کے مشہور شاعرون کا مقابلہ کرتے۔ در اصل یہ بیانات مبالغہ آمیز نہین ہین۔ اس لیئے کہ اگر شاعر قدرتی طور پر لائق ہے تو وہ ہر زبان مین کمال دکھا سکتا ہے۔ اور صائب الرائے اشخاص اُسے کامل تسلیم کر سکتے ہین۔ میر کا کلیات۔ سعدی کی گلستان۔ عمر خیام کی رباعیان۔ دیوان حافظ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دُنیا کے علمی حلقو مین عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہین غالب کا مجموعہ کلام بھی اسی قابل ہو کہ اگر کوئی لائق شخص انکے چیدہ کلام کا ترجمہ انگریزی زبان مین کرے تو بہت رغبت سے انکا کلام دیکھا جائے۔ شاید یہ خیال مبالغہ آمیز نہین ہے کہ بمقابلہ دیگر اردو شعرا (باستثناے میر) کے غالب کا کلام جدید قابل تعلیم یافتہ اصحاب کے

نزدیک بھی زیادہ وقعت رکھتا ہو اور اسکی وجہ یہ ہو کہ غالب کی شاعری مین محض مبالغہ اور صرف رنگ آمیزی اور خیالات دور از قیاس کی ٹھونس ٹھانس نہین ہو۔ تغزل جسکی بنیاد زیادہ تر وصل اور ہجر اور باہمی رشک معشوق کی بیوفائی اور عاشق کی ایذا پسندی وغیرہ امور پر ہو یہی سلسلہ میر سے لیکر اسوقت تک برابر جاری ہو۔ جو شخص اُردو شاعری کے مختلف رنگون کو گہری نظر سے دیکھ چکا ہو وہ تو ضرور یہ کہیگا کہ زیادہ تر پُرانے ہی مضامین کو نیا لباس پہنایا جاتا ہو اور بہت کم ایسے مضامین نکلینگے جو جدید کہے جا سکین۔ قدیم شعرائے اُردو کے کلیون پر تعدد برآمد چلا آتا ہے مگر غالب نے اس حقیقت امر کو سمجھ لیا اور اسی وجہ سے اُنھون نے چمنستان شاعری مین ایک نئی کیاری لگائی اور جسطرح ایک ماہر فن باغبان نئے گُل بوٹے اور پودھون کی فکر مین رہتا ہے ایک درخت کی شاخ دوسرے مین لگاتا ہو یعنی آم (انبہ) سے قلمی بناتا ہے اسیطرح غالب نے ہندوستانی اُردو مین شیراز و اصفہان کی چاشنی دیدی اور وہ اُردو کے بعض قدیم کلیون سے ہٹے غالب نے برخلاف دیگر شعرا کے ہجر یار کو مکلف اور وصل کو راحت رسان نہین سمجھا یعنی وہ ہجر ہی مین لذائذ عشق کا احساس کرتے ہین اور درد محبت ہی کو دارو سمجھتے ہین۔ مین یہان غالب کو اور اساتذہ اردو سے بڑھاتا نہین چاہتا ہون بلکہ مین انکے خصوصیات طبعی کا ذکر کرتا ہون اُردو شاعری کے آخری دور مین حضرت امیر مینائی کا جو درجہ شاعری مین تھا وہ محتاج بیان نہین اور مشکل سے امید ہوسکتی ہے کہ اب پھر دوسرا امیر پیدا ہو اُنھون نے ایک شعر یار ہوتا اور نثار ہوتا مین کہا ہے اور خوب کہا ہے فرماتے ہین۔

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیون چرائی
وہی تیر کیون نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

اس شعر کے مفہوم سے یہ مترشح ہے کہ تیر کی خلش دردافزا ہے اور اسکو جگر کے پار ہونا چاہیئے تاکہ تکلیف سے نجات ملتی حد درجہ کا نازک اور عاشقانہ شعر ہے لیکن غالب نے اسی قافیہ کو کسطرح کہا ہے۔

ترے تیر نیمکش کو کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اس شعر مین غالب نے اس بات کو ثابت کیا ہی کہ تیر کا جگر مین چھیدا رہنا ہی باعث لذت ہی عاشقانہ درد پسندی کا مقتضا بھی یہی ہے۔

مضمون آفرینی مین گہرے جذبات عشق و محبت کا رنگ پیدا کرنا نہایت ہی اہم کام ہی اور مبالغہ مین واقعہ کی صداقت کا قائم رکھنا سحر ہے۔ مضمون کی تلاش اور اسپر صحیح قیاس قائم کرنا کہ یہ نیا ہی یا پامال آسان کام نہین ہی اور یہ کام کاملین فن کا ہی۔ عاشق کے دل عاشق کے گھر کی ویرانی کے اکثر مضامین ناظرین نے دیکھے سُنے ہون گے لیکن غالب نے ذیل کے اشعار مین کیا بات پیدا کی ہی اور ویرانی کی تصویرین کیسی دلکش اتاری ہین۔ سو بار پڑھیئے تو سو ہی بار دل متاثر ہو۔ فرماتے ہین۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر کی یاد آنا عجیب بات ہی لطف معنی سمجھنے والے اسکی داد دے سکتے ہین کتنا نیا تقابل ہی اور یہ شعر بھی بالکل نیا ہے۔

اُگ رہا ہی در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیابان مین ہین اور گھر مین بہار آئی ہی

گھر کی ویرانی سے بہار ثابت کرنا غالب کا کام ہی۔ ویران گھر مین در و دیوار سے سبزے کا اُگنا بدیہیات سے ہی۔ مگر ہائے ری ناکامی کہ ایسی بہار بھی جب آئی کہ یہ گھر چھوڑ کر بیابان مین آئے اور کس مایوسانہ طرز سے گھر کی یاد کی ہے۔ غالب کی خیال آفرینی ہر جگہ اک نیا مزہ دیجاتی ہے اور عاشقانہ مضمون مین بلاغت کی جھلک پیدا کر دینا تو کوئی بات ہی نہین مثلاً غالب کا یہ شعر ہی تو عاشقانہ رنگ مین لیکن اُنھون نے ہمین ایک سائنس دان کی حیثیت سے اظہار لیاقت کی ہے یعنی۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمین پانی کا ہوا ہو جانا

اور بندش تو دیکھیئے کتنی صاف دونون مصرعے سانچے مین ڈھلے ہوئے ہین۔ یہی وہ شاعری ہی جو کوشش سے بھی نہین آتی۔ طرز بیان کو سحر اور شعر کو حکمت اسی

بنیاد پر کہا گیا ہے۔

غالب کی مشکل پسندی کو ان کے معاصرین نے بھی تسلیم کیا ہو اور حتی کہ بعض قابل اشخاص کے نزدیک غالب کے بعض اشعار صرف شوکت لفظی ظاہر کرنے والے ہین۔ مگر نہین یہ خیال غلط ہو بات صرف اتنی ہو کہ غالب اُردو شاعری کے فرسودہ لباس کو اُتارنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین کے مشاعرو نمین جو غزلین پڑھتے تھے اسپر سرگوشیان ہوتی تھین اور یہ اس لیے کہ انکی سخن طرازی کا رنگ جُدا ہوتا تھا۔ اور لوگ میر و سودا وغیرہ کے رنگ کے عادی تھے۔ میرے خیال مین یہ خیال ابتک قائم ہو اَب بھی ایسے لوگ ملین گے جو غالب کے کلام کو عام فہم نہین کہتے مگر یہ اعتراض نہ کبھی درست تھا اور نہ اَب ہے اس لیئے کہ جدت پسند طبعیتین تو لکیر کی فقیر نہین رہ سکتین غالب نے اگر اُردو شاعری کے تراکیب اور خیالات مین کتر بیونت کی تو کوئی گناہ نہین کیا۔ اب سو برس کے بعد اگر کسی کا دماغ زبردست اور دل طاقتور ہو تو کوئی اور نئی بات پیدا کرے مگر ہم تو دیکھتے ہین کہ یہ غالب ہی تھے جنھون نے اپنی جدت پسندی مین کامیابی حاصل کی اور زمانے نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہان انکا طرز سخنوری الگ ہے۔ غالب نے اُردو کا بظاہر ایک مختصر سا دیوان لکھا ہے۔ لیکن وہ بڑے بڑے ضخیم اور حجیم دیوانون سے بھی بڑھا ہوا ہے کلام کا زیادہ ہونا اسکے اچھے ہونے کی دلیل نہین ہے بلکہ کلام کلام کی حیثیت سے ہونا چاہیئے چاہے وہ کم ہی کیون نہ ہو یہی خیال غالب کو مدنظر رہا ہے اُنھون نے اپنے کلام کی روح نکال لی ہو اور اسی کو اپنے نام سے چھپوایا اور یہ نہین کیا کہ غزل مین آم گھاس بھر دیا ہو پچاس پچاس شعر کی غزل کی جگہ چار چار پانچ پانچ کہین دس گیارہ پر اکتفا کی ہے اور کہین دو ایک ہی شعر لکھکر غزل تمام کر دی۔ اللہ اللہ کیا انتخابی لیاقت تھی غالب کا یہ انتخاب اوروں کے لیے ہدایت نامہ ہو۔ غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے اور گو وہ کسی کے شاگرد فن شعر مین نہین ہین لیکن وہ فارسی مین نظیری اور بیدل کے معتقد ہین اور وہی ترکیبین اور خیالات ان کے دل و دماغ مین بسے ہوئے ہین اُردو مین بھی وہی تراش خراش موجود ہے اور غالب یہ کہتا ہو کہ

رنگ بیدل مین ریختہ لکھنا۔ اسد اللہ خان قیامت ہے۔

بالکل سچ ہے عاشقانہ مذاق میں اُردو شعر کو مسنی خیز بنا دینا بڑے عالی دماغوں کا کام ہے غالب نے اپنے دیوان کا پہلا مطلع بطور حمد باری تعالیٰ لکھا ہی لیکن سرسری نظر سے دیکھنے والے کو امتیاز نہوگا۔ لیکن غور سے دیکھیئے تو عجیب رنگ مین حمد لکھی ہے اور کسی کے خیال کی تقلید نہین کی ہے۔

نقش فریادی ہی کسکی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مصرعۂ اولی مین نقش کی وسعت معنوی کو دیکھیئے تحریر کی شوخی سے فریاد کی آمادگی کتنی نئی بات ہی کس لفظ کا نقش ایسا ہی جو معنی سے خالی ہی (مہملات کا ذکر نہین) اور لفظ کا نقش کاغذ پر ہونا ظاہر اور کاغذ سے ہر لفظ پیرہن کاغذی پہنے ہوئے مصرعہ ثانی مین تلمیح ہی یعنی ایران مین قاعدہ تھا اور شاید اب بھی ہو کہ فریادی پیراہن کاغذی پہنکر حاکم کے سامنے جاتا تھا۔ یہ مطلع مجاز اور حقیقت دونون پہلو لیئے ہوئے ہے انسان کا کالبد خاکی کیا ہی کچھ بھی نہین یہ سارے کرشمے روح کے ہین یہ گویائی یہ تکلم عقل و ادراک کس کی بدولت ہی روح کی؟ روح کس لیئے پھونکی ہی خدا نے بس آپ سمجھ لیجیے کہ روح کیا ہی اور ساری چہل پہل شور و غل فریاد دم کے ساتھ ہی ورنہ خفتگان خاک جو بیروح ہین کیسے چُپ ہین۔ کاغذ پر اگر نقش نہو بقدر الفاظ کے معنی ہی تو بولتے ہین بولتے کیا فریاد کرتے ہین اور فریاد بھی کیسی کہ دوسرے سنکر دیکھکر سر دھنتے ہین۔ کیا بامزہ شعر دیکھ سنکر سخن فہم بےچین نہین ہوتے آہین نہین بھرتے اُف نہین کرتے۔ اُف کیسی کلیجہ تھام لیتے ہین۔ غالب کا مطلع اپنی شرح کے لیئے وسعت بیان اور میدان چاہتا ہے اور یہان طول مقصود نہین۔ سخن فہم ناظرین خود سمجھ سکتے ہین۔ یہان غالب کے دیوان کی شرح لکھنا نہین مقصود ہے صرف مرحوم کی شاعری مذاق سخن کو تازہ کرنا ہی اور یہ ظاہر کرنا کہ اردو شاعری کو کھیل نہ سمجھنا چاہیئے۔ چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہون۔

حضرات صوفیہ کا قول ہے کہ آتش عشق ماسوا اللہ کو پھونک دیتی اور وہ سوا خدا کے دُنیا مین کسی کو موجود نہین جانتے حتی کہ خود کو بھی بھول جاتے ہین اور ہجر و وصل کا امتیاز نہین رہتا۔ اسی خیال کو غالب نے نظم کیا ہے۔

دلمین ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہین
آگ اس گھر مین لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

غالب اور مسئلہ عشق حقیقت کو یون نظم کرے۔ لیکن دراصل غالب ترے سے آشام
ہی نہ تھے جیسا اُنھون نے خود کہا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

غالب میکش تھے مگر سکار میکش نہ تھے اُنکا مشرب صلح پسند تھا واقعی وہ اس
شغل سے سکر محوی اور سکر سہوی کی کیفیت حاصل کرتے تھے غالب اہل شریعت
کے نزدیک چاہے قابل معافی نہ ہون لیکن غالب کی راستبازی اور اُنکا
متصوفانہ مذاق قابل غور ہے وہ شرب مدام کو بُرا جانتے تھے لیکن تصوف اور توحید
کے مسائل کو جس خوبی سے اُنھون نے نظم کیا ہے اُس کو انصافاً دیکھنا چاہیئے۔
اُنھون نے دبی زبان سے ادعائے ولایت کیا ہے گو یہ ادعا شاعرانہ ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سابق نواب صاحب رامپور نے شعر سُن کر کہا کہ ہم تو جب بھی ولی نہ سمجھتے غالبؔ نے
ظریفانہ جواب دیا کہ حضور تو اب بھی سمجھتے ہین۔

عاشقانہ رنگ مین ذیل کے اشعار کی نازکخیالی کی داد کہان تک دیجائے
اس زمین مین کون سا اُستاد ہے جس نے فکر سے غزل نہین لکھی لیکن ان اشعار
کا اور ہی عالم ہے مطلع مین تصوف کا رنگ کس خوبی سے پیدا کیا ہے عشق
حقیقی کی بے خودی مین جان کو بھول جانا انتہائے محویت کو ثابت کر رہا ہے
اور زاہد کی ستائش گری صرف اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ اسکو معشوق
حقیقی کی یاد مین استغراقی حالت نہین ہے یعنی۔

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضوان کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودون کے طاق نسیان کا

(عاشقانہ)

ویرانی

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

توحید

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجکو ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

خدا کی ازلیت اور ابدیت کو کس طریقے سے ثابت کیا ہے۔ اپنی ہستی کے افسوس مین کس رمز کو ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساری دُنیا اسی ایک قدرت سے پیدا ہوئی اور یہ سب اجزا اسی کے قدرت کے ہین غالب کا خیال ہے اگر مین نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا مطلب ظاہر ہے قبل از ظہور عالم خدا ہی خدا تھا اور ایک دن وہی وہ رہ جائے گا عجب خیال ہے اور ضمناً غالب نے کیا لطف کیا ہے کہ مین کیا ہوتا۔ عدم کو وجود پر کیونکر ترجیح دی ہے۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھون مین ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اسمین آنسو کو گوہر پر ترجیح دی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک آنکھون مین رہتا ہے اور گوہر صدف مین بالکل نیا مضمون ہے

عاشقانہ بیدلی

عرض نیاز عشق کے قابل نہین رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہین رہا

صبر

رات دن گردش مین ہین سات آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائین کیا

توحید اور فنائیت

عشرتِ قطرہ ہے دریا مین فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تماشائے نیرنگ قدرت

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب چشم کو چاہیئے ہر رنگ مین وا ہو جانا

ذوق فنا اور تحمل دیدار

کیون جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھکر جلتا ہون اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

مصرعہ اولی مین رُخ یار کو دیکھکر فنا ہو جانے کی آرزو کی ہے۔ مصرعہ ثانی مین طاقت دیدار پر عتاب ہے کہ اس نے مجھے زندہ رکھا اور جلتا ہون کے ٹکڑے کو ملاحظہ کیجئے کیا بات رکھی ہے تاب رُخ سے نہ جلے تو اس طور پر جل رہے ہین۔ سوز و گداز عشق کو

غالب کا یہ شعر بھی ذرا پیچیدہ ہے مصرعہ اولیٰ صاف ہو یعنی دل ایسی شے مین شوق کو تنگی جا کا گلہ اس لئے کہ شوق کی کوئی حد نہین ہے اور دل ایک محدود جگہ کہی جاسکتی ہو اور کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہو کہ دل اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایسی شے ہو جسمین دونون جہان کے خیالات کی گنجائش ہے پس دل کی تنگی کو تسلیم نہین کیا جاسکتا اور اسوجہ سے یہ مصرعہ بھی کھٹک پیدا کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی مین اگر گہر سے مراد دل سے لین اور اضطراب دریا سے مراد شوق سے تو محو ہونا جو اضطراب دریا (شوق) سے منسوب ہے چسپان نہین ہوتا اس لیئے کہ محویت مین اضطراب نہین ہوتا۔ اس اختلاف خیال سے مفہوم شعر سامع کو تسکین نہین دیتا اور سیدھے سادے معنی یون کہہ سکتے ہین کہ شوق کو تنگی دل کا گلہ تو ہے لیکن وہ رہتا دل ہی مین ہے اور اسوجہ سے شوق جو دریا کا سا اضطراب رکھتا ہو۔ وہ دل پر محو ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ شعر بھی مثل دیگر اشعار غالب کے پیچیدہ ہو اور ایسے اشعار شعرائے فارسی کے یہان بھی ہین جنکے مختلف معنی بیان کیئے گئے ہین مگر غالب نے اُردو مین یہ بلاغت اور معنی آفرینی دکھاکر ثابت کیا کہ اردو بھی مضامین کے لیئے گنجائش رکھتی ہے۔ جناب حالی ایسے شخص نے خیالات عامہ کی تائید مین ذیل کے اشعار کو قریباً بے معنی کہدیا ہے۔

شمار سبحہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوئے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل — کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

ایضاً

لیگئے خاک مین ہم داغ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہونا
شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیط بادہ صورتخانہ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکان کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار پر بے معنی ہونے کا الزام لگانا میرے نزدیک تو انتہا کی بیدردی ہو جس جانسوز فکر سے یہ اشعار غالب نے موزون کیئے ہین ممکن ہو انسے پوری تسکین نہو لیکن غور کامل سے معانی کا پتہ چلتا ہو۔ مثلاً شمار سبحہ والا شعر ملاحظہ ہو غالب کہتے ہین کہ میرے بُت (معشوق) کو سبحہ صددانہ کا شمار پسند آیا ہو اور یہ اس لیئے کہ اُن

سوداؤن کو سودل (دل اور دانۂ تسبیح مین کچھ مشابہت ہی) سمجھتا ہے اسوجہ سے اسنے سبحہ کو ہاتھ مین لے لیا ایک معشوق دلستان کے لئے سودلون کا ایک بار رنجانا عجب بات ہی اور تسبیح کے داؤن کو زاہدون کا دل کیون نہ سمجھئے ورا س لحاظ سے اس شعر کی عمدگی اور بھی بڑھ گئی۔

ہوائے سیر گل الخ مین بالکل فارسی کی ترکیب ہے۔ اس شعر مین عاشقانہ مذاق دکھایا گیا ہے۔ دیوانگان عشق سیر گل سے بھی بیقرار ہوتے ہین اور اسی طرح بیمہری قاتل کا آئینہ دیکھکر طپان۔ مصرعۂ ثانی مین کہ کاف بیانیہ نہین ہے بلکہ اسکے معنی یا کے لئے جائین تو قافیا بیجا ہوگا اور اس لئے اس شعر کے یہ معنی کیے جائین تو قرین قیاس ہین۔

ہوائے سیر گل اور آئینۂ بیمہری قاتل یا انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا اور پسند کسکو آیا عاشق کو۔ عاشق کو مقدر مانئیے۔ مین نے جو خیال اس شعر کی نسبت ظاہر کیا ہو ممکن ہی کہ بعض اصحاب کو اس سے اتفاق نہو۔ یہ اختلاف اکثر فارسی اشعار مین شارحین نے کیا ہی غالب کا یہ شعر بھی فارسی ہی ہے۔

لے گئے خاک مین ہم الخ اس شعر کا مفہوم میرے خیال مین یہ ہے کہ ہم داغ تمنائے نشاط کو خاک مین لے گئے یعنی آرزو پوری نہوئی اور موت آگئی۔ اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ دوسرے مصرعہ مین معشوق کو مخاطب کرکے کہتے ہین کہ آپ تمکو اپنا گلستان صدرنگ مبارک ہو اسکی بہار دیکھو اور خوش ہو عجب عاشقانہ پیرایہ مین اظہار شکایت کیا ہے اور اس شعر کی ضمیر معشوق حقیقی کی طرف بھی راجع ہے اور گو اسمین مذہبی استخفاف کی بو آتی ہی۔ لیکن شاعرانہ تخیل کو کون روک سکتا ہی۔ غالب نے اس قسم کی شوخی ایک اور شعر مین بھی کی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

الغرض جو اشعار غالب باعتبار مفہوم گرے ہوئے معلوم ہوتے ہین انکو غالب کے رجحان طبیعت کے موافق دیکھنا چاہیئے غالب کے معاصر بھی اس دقت پسندی سے الجھتے تھے دلی زبان سے اور کبھی علانیہ اعتراض بھی کرتے تھے۔ غالب کے اس شعر پر انکے ایک ہمعصر نے اعتراض کیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اسپر اعتراض یہ ہی کہ مصرعہ ثانی مین اے کی جگہ جز ہو تو معنی صاف ہو جائین اور
دخل کو جناب حالی نے بھی جائز رکھا ہی لیکن میرے خیال یہ دخل دخل در معقول
سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ ناظرین اے اور جز کے فرق کو ملاحظہ فرمائین اگر جز
ہو جائے تو یہ مطلب ہی کہ سوا نالہ کے (جس سے مراد قمری و بلبل ہے) نشان جگر سوختہ
کیا ہے لیکن قابل غور یہ بات ہی کہ جگر مین نالہ نہین ہوتا نالہ کی جگہ دل ہے غالب
قمری اور بلبل کو جگر سوختہ کا نشان بتا رہے ہین اور اسلیے سے مراد اے نالہ دل ہی
یعنی اے نالہ دل جگر سوختہ کا نشان قمری اور بلبل ہی یہ تشبیہہ باعتبار رنگ کے ہے
قمری اور بلبل کا رنگ خاکی ہی۔ قمری اور جگر سوختہ کا رنگ بھی خاکی ہی تو اس
لحاظ سے میرے ذہن ناقص مین اے جز سے اچھا ہی اردو و فارسی مین نالہ کشی دل
سے منسوب ہی جگر سے درد و زخم تپش ناسور منسوب اور دل سے آہ و نالہ وغیرہ شعرا
فارسی نے قمری اور بلبل کو اپنا نالہ مجسم کہا ہی۔ ایک شاعر کا مصرعہ ہے۔

نالہاے دل بہم کردند و بلبل ساختند

غالب نے قمری و بلبل کو جگر سوختہ کا نشان کہا ہے۔ گو غالب ان اعتراضات
کو بے حقیقت جانتے تھے اور بعض اشعار مین دفع اعتراض بھی کیا ہی لیکن تاہم ابتدائی
غزلون کا سا رنگ انکی آخری غزلو مین نہین ہی مگر غالب نے صاف اور عاشقانہ
رنگ مین بھی جو اشعار موزون کیئے ہین وہ لاجواب ہین لیکن لطف معنی کی جھلک
انمین بھی موجود ہے ذیل کے شعر ملاحظہ ہون۔

مین اور بزم مے سے یون تشنہ کام آؤن — گر مین نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہی ایک تیر جس مین دونون چھدے پڑے ہین — وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اول شعر مین لطف بیان اور شوخی کی کچھ حد نہین ہی ساقی سے شکایت ہے کہ
اگر مین نے توبہ بھی کی تھی تو اسے زبردستی پلا دینا تھا دوسرے شعر مین مصرعہ ثانی
یعنی وہ دن گئے۔ الخ تیر عشق کی دستبردی کو ظاہر کر رہا ہے اور دل جگر کا ایک
ہی تیر مین چھد کر رہ جانا کس قیامت کی بے کسی ہے

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیری جلوے نے — کرے جو پرتو خورشید عالم شبنستان کا

نازکخیالی

مری تعمیر مین مضمر ہی اک صورت خرابی کی — ہیولی برق خرمن کا ہی خون گرم دہقان کا

خون گرم دہقان کو برق خرمن کا ہیولی قرار دیا اور اس سے تعمیر جیسا بی کی خرابی عجیب بات ہی اردو مین یہ مضمون آفرینی اور ایسی جدت پسندی غالب کا حصّہ ہے۔

معرفت

محرم نہین ہے توہی نواہائے راز کا — یان ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہی ساز کا

وفا کی مذمت

دہر مین نقش وفا وجہ تسلّی نہوا — ہے وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہوا

حُسن وعشق کا تعلق

مین نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹون — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

بدی اخلاق کی شکایت

بس کہ دشوار ہی ہر کام کا آسان ہونا — آدمی کو بھی میسر نہین انسان ہونا

کتنا سچا مضمون اور کیسا اچھوتا خیال ہی۔ ہر انسان انسان ہے لیکن اگر اسمین آدمیت نہو تو کچھ بھی نہین اس خیال کو دیگر شعرا نے بھی لیا ہے لیکن غالب کا یہ شعر لاجواب ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا — نہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غالب نے فطرتِ انسانی کی تصویر اپنے خیال کے موافق خوب کھینچی ہے کہ انسان آمادہ نشاط وسرور اس لیئے ہی کہ وہ جانتا ہی کہ ایکدن مرنا ہو لہٰذا جہان تک ہوسکے زندگی کے مزے حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر مرنے کا خوف نہوتا تو جینا بیمزہ ہوجاتا۔

شوخی بیان

جمع کرتے ہو کیون رقیبون کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

اعتراف عجز وقصور

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گلہ ہی شوق کو دلمین بھی تنگی جا کا — گہر مین محو ہوا اضطراب دریا کا

ر ثابت کیا ہے۔

عاشقانہ

ی آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ... جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھکر
نی تھی ہمپہ برق تجلی نہ طور پر ... دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر
ر پھوڑتا وہ غالب شوریدہ حال کا ... یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

ایضاً

ز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا ... قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیدان پر
ڑا نا صح سے غالب کیا ہوا گر اسنے شدت کی ... ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

شوخی

ے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ... متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہین قرض رہزن

اس شعر مین عجیب شوخی طبع دکھائی ہے فلک سے تقاضائے عیش رفتہ چور کو
رض دینا اور پھر مانگنا ہے سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔

اظہار ناکامی

ریف مطلب مشکل نہین فسون نیاز ... دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

کیا نازکخیالی اور کیا فکر ہے۔مصرعۂ اولی مین کہتے ہین کہ میرا افسون سازِ حریف
طالب مشکل ہو ہی نہین سکتا۔ دوسرے مصرع کی شوخی قیامت کی ہے خدا سے
التجا کرتے ہین کہ میری دعا قبول ہو کونسی دعا کہ حضرت خضر کی عمر دراز ہو خضر
ی درازی عمر ظاہر ہے اور اُسکے لئیے دعا تحصیل حاصل ہے۔

عاشقی اور صبر

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ... دل کا کیا رنگ کرون خون جگر ہونے تک

دُنیا کے مصائب

ام ہر موج مین ہے حلقۂ صد کام نہنگ ... دیکھین کیا گزرے ہے قطرہ پر گہر ہونے تک

محبت اور بے بسی

تجھنے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن ... خاک ہو جائین گے ہم تمکو خبر ہونے تک

حالت زندگی

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ مین جلتی ہو سحر ہونے تک

دیگر

مجکو دیار غیر مین مارا وطن سے دور — رکھ لی مری خدا نے مری بیکسی مین شرم

وہ حلقہائے زلف کمین مین ہین اےخدا — رکھ لیجیو میرے دعوی وارستگی کی شرم

درد پسندی

زخم سلوانے سے مجپر چارہ جوئی کا طعن ہے — غیر سمجھا ہو کہ لذت زخم سوزن مین نہین

غیر کی بدگمانی کو کس پہلو سے ثابت کیا ہو کہ دشمن یہ سمجھتا ہے کہ زخم مین ٹانکے اچھے ہونے کی غرض سے دلوائے ہین حالانکہ میری غرض یہ ہو کہ نوک سوزن سے جو تکلیف زخمون کو پہونچتی ہے وہ میرے لیے باعث لذت ہو۔

رندانہ شوخی

قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہان — رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

غالب کے اس شعر نے انتہا درجے کی شہرت حاصل کی ہے اور شعر بھی تو کیسا ہے۔

تسلیم و رضا

ملتی ہو خوے یار سے نار التہاب مین — کافر ہون گر نہ ملتی ہو راحت عذاب مین

اضطراب اور مزاج شناسی

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون — مین جانتا ہون جو وہ لکھینگے جواب مین

رندانہ

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہون روز ابر و شب ماہتاب مین

منصور پر طنز

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہو دریا لیکن — ہمکو منظور تنک ظرفی منصور نہین

ہجر اور بیبسی

یہ ہم جو ہجر مین دیوار و در کو دیکھتے ہین — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہین

عاشقانہ

وہ آئین گھر مین ہمارے خدا کی قدرت ہو — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہین

یہ لوگ کیون مرے زخم جگر کو دیکھتے ہین　　مین نظر نہ لگے انکے دست و بازو کو

یادِ رفتگان نیچرل رنگ مین

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہو گئین　　خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہان ہو گئین

اسی زمین مین غالب کا یہ عاشقانہ شعر کتنا خوب ہی

نیند اسکی ہی دماغ اسکا ہی راتین اس کی ہین　　تیری زلفین جسکے بازو پر پریشان ہو گئین

اسی زمین مین ایک شعر غالب نے عجیب مذاق کا نکالا ہی موحدانہ رنگ بھی مترشح ہی اور موجودہ زمانہ کے تعلیمیافتہ جو ہندوستان مین قومیت کے طالب ہین اور اسی قومیت کو باعث ترقی خیال کرتے ہین لیکن اختلاف مذاہب و رسوم سے یکرنگی نہین ہو سکتی اور یہی بڑا باعث اختلاف ہے اگر یہ ملتین قومون کا بکھیڑا نہ رہے اور ایک موحدان اختلافات سے ضرور الجھتا ہے۔ غالب کے یہ خیال کس لطف سے قلمبند کیا ہے۔

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہی ترک رسوم　　ملتین جب مٹ گئین اجزائے ایمان ہو گئین

صحرا اور عالم وحشت

خوریدگی کے ہاتھ سے سر ہو وبال دوش　　صحرا مین اے خدا کوئی دیوار بھی نہین

دیگر

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہین خلوت ہی کیون نہو

اس شعر مین جو متضاد حالت دکھائی ہو اسکی تصدیق ہر شخص کو ہو سکتی ہے آدمی کا بجائے خود محشر خیال ہونا بدیہی امر ہے اور خلوت مین بھی تو صدہا قسم کے خیال پیش نظر ہوتے ہین خلوت کو انجمن کس خوبی سے ثابت کیا ہے۔

جب میکدہ ہی چھٹ گیا پھر کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر مین میکدہ چھٹنے کا صرف افسوس ہی نہین کیا بلکہ زندگی ہی بیکار سی معلوم ہوتی ہو اور اب مسجد مدرسہ خانقاہ صرف پڑ رہنے کے لیے ہے لطف زندگی میکدہ ہی کے قیام تک تھا۔

ذیل کے اشعار مین غالب نے اس حالت کی تصویر اتاری ہی جسمین انسان

فرطِ غم و یاس سے ایسی تنہائی ڈھونڈھتا ہی جہان کوئی اُس تک پہونچ نہ سکے اور جب انسان مصائب سے تنگ اور اپنے اعزہ و احباب کی بیوفائی سے مایوس ہوجاتا ہے تو وہ سب سے قطع تعلق چاہتا ہے یہ بالکل نیچرل مضمون ہے مگر یہ حالت کبھی کبھی پیش آتی ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہان کوئی نہو — ہم سخن کوئی نہو اور ہمزبان کوئی نہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے — کوئی ہمسایہ نہو اور پاسبان کوئی نہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہو بیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خوان کوئی نہو

ذیل کے شعر مین کتنا گہرا رنگ تغزل ہے اس شعر کی ترکیب مین نظیری کے رنگ تغزل کی شان ہے۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیئے — یا پردۂ تبسم پنہان اُٹھائیے

اسیری اور ناامیدی

خزان کیا فصل گل کہتے ہین کسکو کوئی موسم ہو — وہی ہم ہین قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

متصوفانہ عشق

ڈھونڈھے ہے اک مُغنیِ آتش نفس کو جی — جسکی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

عاشقانہ

رگون مین دوڑتے پھرنے کے ہم نہین قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

لطفِ زبان

ہوا ہی شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر مین غالب کی آبرو کیا ہے

رندانہ شوخی

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

ذیل کے شعر مین محویتِ تصوریار کی حالت کس خوبی سے نظم کی ہے اور حصول وصال مین تعویق کی وجہ سے ناامیدی کے اثر سے کسطرح بچنا چاہا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

اور اس دوسرے شعر مین بھی تصوریار کی حالت خوب دکھائی ہے۔

دل ڈھونڈھتا ہی پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہین تصورِ جانان کیے ہوئے

غالب کے یہ دونون شعر اُولی کیا اس مشہور شعر سے لطف مین کم نہین ہین۔

در بزم وصال تو بہنگام تماشا — نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد

ذیل کا شعر ملاحظہ ہو اسکے رنگ تغزل کو دیکھیئے لطف زبان حسن بندش پر نظر کیجیئے
پھر مفہوم کے اعتبار سے نہ صرف عشق مجازی بلکہ عشق حقیقی کا رنگ بھی جھلک رہا
ہے اسی کا نام سحر طرازی ہے۔

ہے خونچکان کفن مین ہزارون بناؤ ہین — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدون پہ حور کی

اس زمین مین یہ شعر بھی لاجواب ہے کوہ طور کے واقعہ پر سب ہی شعرا نے طبع آزمائی
کی ہے لیکن غالب نے بالکل جداگانہ طریقے سے حسن طبیعت دکھایا ہے مصرعۂ اول کا
لطف بیان دیکھنا چاہیئے زبان کی خوبیان دیکھنے والے تو ہزارون بار پڑھ کر بھی تازہ
لطف حاصل کرتے ہین۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کرین کوہ طور کی

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہون

کرتا ہون جمع پھر جگر لخت لخت کو — مدت ہوئی ہے دعوت مژگان کیے ہوئے
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق — سامان صد ہزار نمکدان کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی ہوس — عرض متاع عقل و دل و جان کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشان کیے ہوئے
اک نوبہار تازہ کو مانگے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستان کیے ہوئے
غالب ہمین نہ چھیڑ کر طوفان رنگ سے — بیٹھے ہین ہم تہیہ طوفان کیے ہوئے

مرزا کی یہ غزل جواہرین تولنے کے قابل ہے۔ میرے خیال مین اگر نظیری بھی
غالب کے عہد مین ہوتے تو وہ انکے کلام کی داد معاصرانہ دیتے نظیری کی ادا بندی
اور لطف زبان پر سخن شناس لوٹ ہین انصافاً غالب کے ان اشعار کو دیکھو کہ
یہ کیا چیز ہین۔ یہ دردمندی اور یہ گہرا سوز و گداز تو اردو کیا فارسی مین بھی مشکل سے
ملے گا۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خون ہے — رکھون کچھ اپنی بھی مژگان خونفشان کیلئے

اس شعر کا مضمون شعر مندرجہ بالا کرتا ہون جمع الخ سے ملتا ہوا ہے ترکیب مین

پہ فرق ہو اسی زمین مین ایک اور شعر بھی خوب نکالا ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم مین نے پاسبان کے لیئے

عجیب مضمون ہو شوخی اور ظرافت کی کیا حد ہو جب تک پاسبان انکو گدا سمجھا سوقت تک چپ رہا مگر جب اُنھون نے اُٹھکر قدم لیئے تو وہ سمجھ گیا کہ یہ غالب ہین اور ان کی شامت آگئی ضمناً یہ بات ثابت ہوگئی کہ پاسبان کو سمجھا دیا گیا تھا کہ غالب حضور مین نہ آنے پائین۔

جب تک وہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھسے راہ سخن وا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہین کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

یہ دونون شعر بھی متصوفانہ ہین پہلے شعر مین ثابت کیا ہے کہ بغیر دہان زخم پیدا کیئے ہوئے تجھسے کوئی گفتگو نہین کرسکتا یعنی جب تک انسان عشق سے زخمی نہو معشوق سے مکالمت اور رسم و راہ محال ہے دوسرے شعر مین تماشائے حسن یار کو محال ثابت کیا ہے لیکن عاشقانہ رنگ ہاتھ سے نہین جانے پایا یعنی تجکو بغیر دیکھے ہی بصارت چلی جاتی ہے تو تجکو بے پردہ کون تماشا کرسکتا ہے۔

تادیبِ عشق

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

ذیل کے شعر مین میکشی کی حسرت اور نزع کی بے بسی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے اس سے زیادہ خوبی پیدا کرنا محال ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالب نے جس رنگ مین قلم اُٹھایا شان قادر الکلامی دکھادی اب اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہو وہ کون سخن دوست ہو جو غالب کی نیرنگیِ خیال کا شیدا نہین ان اشعار کے لکھنے سے غالب کی مدح سرائی مقصود نہین ہے اس لیئے کہ غالب مستغنی عن المدح ہین۔ آفتاب کو روشن کہنا تحصیل حاصل ہے۔ لیکن غالب کی سخن طرازی کی یاد دو فائدون سے خالی نہین نقادان سخن کا مذاق سخن فہمی تازہ ہوتا ہے اور جو لوگ فن شاعری کے دلدادہ ہین اُنکے لیئے غالب کی شاعری کارنامہ ہدایت ہے میرے خیال مین اب اُردو شاعری کا رنگ بالکل ہلکا اور بودا ہے۔ شعر مین

صرف پوست و استخوان نہین بلکہ مغز ہونا چاہیئے۔ غالب کے کلام مین جو جامعیت ہے وہ قابل غور اور لائق تقلید ہو۔ لیکن قدرت کی فیاضیون سے دور نہین کہ پھر کوئی غالب کا ثانی پیدا کرے مگر اب تک تو انتظار اور اُمید ہی ہے۔ شعرائے اُردو مین باعتبار مجموعی کمالات غالب ایک خاص امتیاز رکھتے ہین ہرچند غالب نے میر کی اُستادی کو تسلیم کیا ہے ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہو بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہین

لیکن مرزا کی طرز روش جُدا گانہ ہو اور انکی زبردست طبیعت مثل دیگر اساتذہ اُردو کے صرف غزلون اور مختصر مثنویات پر اکتفا نہین کی بلکہ اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ شعرائے اُردو مین غالب کی سی پُرزور نثر کس نے لکھی اور نثر مین نظم کے مزے کس نے بھرے پُرانے طریق کی نثر کو کسنے بدلا۔ مختصر نویسی کی ایجاد کس نے کی؟ یہ کام غالب ہی نے انجام دیا۔ اگر سچ پوچھیے تو مرزا نے عود ہندی۔ اور اُردوے معلی لکھکر لوگون کو اُردو نثر لکھنا سکھایا۔ زمانہ کا رنگ اور مذاق ہمیشہ بدلتا رہا ہے اس زمانے کی تعلیم یافتہ جس دلاویزی سے عود ہندی کو دیکھین گے کسی لمبے چوڑے القاب و آداب والی انشا کو نہ دیکھین گے۔ مرزا نے اپنے دوست و احباب کو جو رقعے لکھے ہین اسکے فقرے ریزہ ہاے جواہر ہین کیسے دلچسپ اور کتنے دلاویز جملے کہ طبیعت وجد مین آتی ہے۔ غالب کی نسبت جیسا ظاہر کیا گیا ہو کہ وہ کوئی فاضل اجل نہ تھے جھوٹ نہین لیکن وہ حد درجہ کے وسیع النظر تھے انکے رنگ کلام سے معلوم ہوتا ہو کہ اُنھون نے مطالعہ کتب مختلفہ خصوصاً دواوین فارسی کو بہت ہی غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے اور انکا حافظہ بہت قوی تھا انکو معمولی اور غیر معمولی مضامین مین امتیاز کا خاص ملکہ تھا دیکھیے کہ غالب کے دیوان مین پامال اور روندے ہوئے مضامین کا پتہ نہین چلتا اور بیجا مبالغہ بھی، انکے کلام مین شاید ہی کہین ہو۔ غالب دراصل اُردو غزل گوئی کو زیادہ وقیع نہ جانتے تھے لیکن وہ اپنے اُردو معاصرین اور نیز بادشاہ کی ملازمت اور فرمائش سے اُردو کہتے تھے غالب فارسی شاعری کے دلدادہ تھے اور انصاف بھی یہی ہو کہ فارسی شعرا جن سے جیسے لطیف مضامین ہین وہ اُردو مین نہین غالب نے اپنے ایک معاصر

(ذوق) کو یہ قطعہ لکھا تھا۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

اس سے یہ غرض نہین کہ غالب نے شعراے اردو کی ہجو کی ہے بلکہ ایک امر حق بیان کر دیا ہے ورنہ ذوق خود ایک زبردست شاعر تھے اور انکی تحصیل بھی معمولی نہ تھی اگر سچ پوچھیے تو ذوق نے بھی اردو مین جو کمالات خیال آفرینی دکھاے ہین وہ انھین کا حصہ ہین اور قصائد مین بھی وہ زور اور شان پیدا کی ہے جو مسلم ہے بہر حال غالب بڑے خوش نصیب تھے جنھون نے اپنی معاصرین کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ وہ ظہوری اور عرفی کا درجہ رکھتے ہین اور نظیری اور بیدل کے رنگ مین غزل لکھکر غالب ہی نے کچھ کامیابی حاصل کی نظیری وہ شخص ہے جسکی نسبت صائب نے کہا ہے۔

صائب چہ محال است شوی مثل نظیری — عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اسمین شک نہین کہ اگر غالب اکبر کے وقت مین ہوتے تو انکی قدر بھی فیضی سے کم نہوتی افسوس کہ اب دہلی لکھنؤ غالب ایسے اہل کمال سے خالی ہے۔

اثر لکھنوی

'زمانہ' جولائی ۱۹۰۹ء

مرزا غالب کی اردو فارسی شاعری

مرزا غالب نے اپنی شاعری میں جو محاسن پیدا کیے تھے وہ ان کی موت کے بعد اور زیادہ قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔ زندگی تو بعض لوگ ایسے تھے جو مرزا غالب سے معاصرانہ چشمک اس بات پر کرتے تھے کہ وہ اردو شاعری میں ایک شاہراہ جدید قائم کرتے ہیں۔ اردو میں فارسی کا پیوند لگا رہے ہیں۔ مرزا کے ہمعصر زیادہ تر عشق و عاشقی کے ترانے غزل کے پیرایہ میں بلند کیا کرتے ہے۔ لطف زبان اور محض سادگی پر لوگ لوٹ تھے۔ دراصل یہ خوبیاں بھی شاعری کی جان ہیں اور سادگی بیان پر قادر ہونا سہل نہیں ہے لیکن ایک ایسا شخص جو جدت آفرینی پر اپنے کو فنا کرنا چاہتا ہو وہ کب لکیر کا فقیر رہ سکتا ہے۔ غالب کی شاعری کو یم مذاق کے لوگوں کے سوا جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی حد سے زیادہ پسند کرتے جاتے ہیں اور یہ بات صرف مرزا ہی سے زیادہ مخصوص ہے۔ مرزا کے واقعات زندگی اور ان کے مذاق طبعی کی شہرت بھی حد کو پہونچی ہوئی ہے۔ غالب متصوفانہ مذاق کے ساتھ فلسفہ صوف کے بھی رمز شناس تھے۔ اس مختصر مضمون میں تصوف پر کوئی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بالاختصار یہ بیان کرنا ہے مرزا کی اردو اور فارسی شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ انھوں نے اردو میں جو مضامین لکھے ہیں، وہ معنی خیزی کے لحاظ سے شعرائے فارس کے پر مضمون اشعار سے کسی طور پر کم نہیں ہیں اور بعض حالتوں میں وہ فارسی سے بھی ممتاز ہیں۔ چند مختلف اردو فارسی کے اشعار تفنن طبع ناظرین کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے بس رقص شرر ہونے تک

اس شعر میں انھوں نے نہ صرف ہستی انسان بلکہ تمام موجودات عالم کی ہستی کی بے اعتباری اور بے ثباتی کو بیان کیا ہے مگر لطف بیان نے خدا جانے کیا مزہ اس شعر میں بھر دیا ہے۔ مطلب اس کا بہت صاف ہے، کہتے ہیں کہ ' اے غافل تیری ہستی ایک نظر (طرفۃ العین) "پلک مارنا" سے زیادہ نہیں ہے۔ اتنی دیر میں تیرے لیے فنا ممکن ہے کہ ادھر آنکھ جھپکی اور تیرا خاتمہ ہے۔ کیا واقعات اس بات کو نہیں ثابت کرتے کہ ایک دم میں انسان فنا ہو جاتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں مثال کتنی برجستہ ہے

ہیتے ہیں کہ تیری بزم ہستی کی گرمی، رقص شرر سے مشابہ ہے کہ وہ ادھر چمکا اور ادھر غائب ہوا۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس شعر میں عجیب تعلقات ظاہر کیے ہیں۔ توحید کے مضمون کو بالکل اچھوتے رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دریا کا ہر قطرہ ساز انا البحر بجا رہا ہے مگر قطرہ کی آواز غیر محسوس کو کون سُنے؟ یہ کام خاص موحدین کا ہے۔ مگر دراصل قطرہ ایک جزو بحر کا ہے اور اس لیے کہ وہ کل سے جدا نہیں اور اس پر قطرہ ناز کر سکتا ہے۔ مصرعِ ثانی میں صاف رنگ تغزل پیدا کر گئے ہیں اور ناز کر رہے ہیں کہ ہم اس کے (شاہدِ حقیقی کے) عاشق ہیں اس لیے ہماری شان اور رتبہ کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے اور ہم اس کو کیا بیان کر سکتے ہیں۔ توحید کے مضامین اور بھی غالب نے خوب خوب لکھے ہیں۔ یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

غالب نے اس شعر میں بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور منصور پر بڑی چوٹ کی ہے۔ مضامین تصوف کے سوا جس مضمون کو غالب نے لکھا ہے وہ دل پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ غالب نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اُردو میں ہر طرح کی فصاحت و بلاغت، فلسفہ، حکمت اور نیچرل جذبات کی گنجائش ہے۔ غالب نے شاعری کے اصلی مقصد کو خوب پہچانا ہے وہ صرف غزل سرائی سے اپنے محدود جذبات کو خوش کرنے والے نہ تھے غالب نے وہ روش اور وہ اسلوب بیان اختیار کیا جس کے باعث وہ شاعر اور حکیم دونوں کہے جا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے غالب کو بعض یورپین مصنفین سابق کا ہم پلہ کہا ہے۔ حکیمانہ خیال کے مصنف اپنے اشعار سے دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ یہی حال غالب کا ہے۔ گو بعض لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ غالب خود رند مشرب تھے وہ دوسروں کی کیا اصلاح کر سکتے ہیں۔ تسلیم کیا جاتا ہے کہ غالب ایک قابل ترک عادت میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن ان کی صداقت شعاری میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا وہ چھپ کر پینے والوں اور دھوکہ باز پرہیزگاروں سے بدرجہا اچھے تھے۔ وہ غیور اور بے باک تھے اور اپنے کو گنہگار بھی سمجھتے تھے اور اپنی عادت پر منفعل۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کے کلام میں تصوف، توحید، حکمت، فلسفہ کی کمی ہے ان کے طرزِ کلام سے ظاہر ہے کہ وہ حد کے متفکر اور راستباز تھے۔ وہ شاعری کے فرائض ادا کرنے میں کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم نہیں ہیں وہ فارسی اور اردو میں یکساں قلم اٹھاتے ہیں۔

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

فرماتے ہیں کہ رات کو شوقِ ساقی کا خمار قیامت کے انداز کا تھا اور میرا صورت خانۂ خمیازہ محیطِ بادہ تک پہنچا ہوا تھا۔ بالکل صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جس شب میں ساقی تک نہ پہنچ سکا تو میرا خمیازہ کا صورت خانہ (نقشہ سے مراد ہو سکتی ہے) محیطِ بادہ یا شراب خانہ تک مجسم ہو کر پہنچا۔ اس کی شرح کافی کی جائے تو وہ ایک صفحہ بھر سکتے ہیں لیکن نوعیت تخیل کے شناسا سمجھ سکتے ہیں کہ غالب نے اس شعر میں جن جذبات کی مصوری کی ہے وہ بالکل نئے ہیں اور ان کو اپنے تصورات ذہنی کے ظاہر کرنے میں جو جگر کاوی کرنا پڑی ہوگی اس کی تصدیق ہر نقادِ سخن کرے گا۔ میرے نزدیک غالب کے مذکورہ بالا شعر کا مفہوم گو بخوبی ذہن نشین اور تسکین

ہو مگر ایک عجیب و غریب معنی آفرینی ہے۔ رندانہ خمارو خمیانہ کی حالت کو اس نئے انداز سے لکھا ہے کہ دل اور خیال پر خاص
ہے۔

(خودداری اور موددبانہ استغنا)

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب اپنی خودداری کا اقرار کرتے ہیں لیکن درِ کعبہ کو بند دیکھ کر اس کے کھلوانے کی جرأت نہ کرنا بھی ادب شناسی میں
ہے اور اس لئے یہ ادعائے خودبینی بالکل نیا اور قدرِ حسنی ہے۔
غالب نے اپنے اُردو دیوان میں دقیق اشعار کے سوا جو صاف و سادہ شعر کہہ دیئے ہیں تو ان میں بھی بے حد مزہ بھر دیا ہے
ن کا بھی جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ غالب گویا نرے فارسی شاعر تھے ان کی اردو بھی فارسی ہے اور فارسی تو بالکل ٹکسالی
ہے اور ان کا یہ کہنا کہ:

بیا ورید گر اینجا بود زباں دانے — غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

گو ایک قسم کے انکسار کو ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل بہت بڑا دعویٰ کیا ہے وہ ایک ایسے زباں داں کی تلاش کرتے ہیں جو ان کے
سمجھا اور داد دے۔ غریبِ شہر اپنے کو اسی لئے کہتے ہیں کہ باوجود پارسی النسل ہونے کے ان کی تعلیم و تربیت ہندوستان میں ہوئی۔ غالب
ردو اشعار بہت کچھ مشہور ہیں۔ اسوقت ان کے بعض فارسی اشعار بھی ملاحظہ ناظرین کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔
ذیل کے شعر میں غالب کی شوخی ملاحظہ ہو:

غالب اگر خرقہ و مصحف بہم فروخت — پرسد چرا کہ نرخِ مے لعل فام چیست

اس شعر کے ایک معنی تو مذاق غالب کے موافق یہ ہوئے کہ ایک خرقہ و مصحف جائداد کے طور پر تھا اگر ان کو اس نے فروخت
بھی کیا تو شراب کا نرخ کیوں دریافت کیا۔ اس میں رندانہ شوخی استخفاف مذہب کی حد سے بھی گذر گئی ہے لیکن دوسرے معنی یہ بھی ہوئے
کہ جو لوگ خرقہ بیچ کر اور مصحف پر ایمان لا کر بھی شراب کی طرف مائل ہیں وہ کس واسطے مائل ہیں یعنی ان کا ایمان اور عقیدہ یکساں نہیں ہے
دوسرا اول میں استفہامی حالت ہے خرقہ و مصحف کے فروخت کرنے کا یقین نہیں ہے لیکن شراب کا نرخ دریافت کرنے سے شک ہوتا
ہے کہ شاید ایسا کیا گیا ہے۔ جو لوگ خرقہ و مصحف رکھ کر پابند شریعت نہیں ہیں وہ گویا اس شعر کے حسب حال ہیں۔

رضوان چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد — بیچارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

یہ شعر بھی رندانہ رنگ میں ہے مگر اصل حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ مے نوش کو شہد و شیر سے کیا تسکین ہو سکتی ہے اس لئے اس
نے اس کو واپس کر کے مے مشکبو کی خواہش کی اور پردہ رضوان پر عدم مزاج شناسی کا اعتراض کیا ہے۔ مصرعِ ثانی میں مئے مشکبو سے مراد دنیاوی شراب
ہو ہی نہیں سکتی مے مشکبو سے مراد شرابِ طہور لیجا سکتی ہے کہتے ہیں کہ جب میں مرکھپ کر ایسے مقام تک پہنچا ہوں تو مجھے شہد و شیر کے
بدلے مشکبو شراب ہی کیوں نہ دی جائے بیچارہ کا ٹکڑا ریزہ الماس سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور اس کے معنوں میں جو لطف ہے وہ لفظوں میں
نہیں ادا ہو سکتا عجب عاجزی اور بے کسی ٹپکتی ہے۔

(تصوف)

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند　　ہم خزاں ہم بہار در گذر است

کہتے ہیں کہ دنیا کی خزاں و بہار میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایک میں پتے گرتے ہیں دوسرے میں پھول اور مآل دونوں کا فنا ہے اسلیے نہ خزاں سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے نہ بہار سے بے حد خوش ہونے کی۔

نومیدی ما گردش ایام ندارد　　روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

کتنا صاف اور سچا شعر کہا ہے کہتے ہیں کہ ہماری نااُمیدی گردش ایام سے بری ہے اس لیے کہ ناامیدی میں خوشی اور غم دونوں یکساں ہو جاتے ہیں اور پھر گردش ایام کی شکایت ہی نہیں رہتی۔ دوسرے مصرعہ میں مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ جب گھنگھور گھٹا میں دن تاریک ہو جاتا ہے تو اُس کو سحر و شام یکساں ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں اپنی ناامیدی دکھائی ہے اور دوسرے میں ایک واقعہ کو موزوں کر دیا ہے۔

بوصل لطف باندازۂ تحمل کن　　کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

کیا مزہ کی بات پیدا کی ہے کہ وصل میں مجھپر اتنی ہی مہربانی اور لطف کرو جس کا میں متحمل ہو سکوں اور اگر میرے اندازہ تحمل سے زیادہ لطف ہوگا تو میں خوشی کے مارے جی نہ سکوں گا۔ شادی مرگ ہو جاؤں گا۔ مصرعہ ثانی میں مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ جب دریا میں پانی کسی کے سر سے گزر جاتا ہے تو موت پیاسی ہو جاتی ہے یعنی وہ ڈوب جاتا ہے کس قدر سچا مضمون ہے۔ معشوق سے کہتے ہیں کہ تو مجھپر وصل میں زیادہ لطف نہ کر۔ یہ فرمائش عام مذاق عشاق کے تو خلاف ہے لیکن دراصل غالب کا خیال بہت صحیح ہے۔

مشو بہ مرحمت چرخ غرہ ہاں ہشیار　　یوسف از چاہ برآرد کہ ببازار برد

اس شعر میں فلک کی دھوکہ بازیوں سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں اور مثال دیکر سمجھاتے ہیں کہ دیکھو کہ جب حضرت یوسف کنوئیں سے نکالے گئے تو بطور غلام بازار میں گئے اور یہ سب گردش فلکی کا اثر تھا۔

ذیل کے شعر میں فلک کی شکایت ظلم و عداوت دوسرے طریقہ سے کرتے ہیں۔

از رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد　　در خستگی نشاط مرا دید و خوار کرد

ہائے کیا پاکیزہ مضمون ہے اور کتنی پسندیدہ معنی آفرینی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلک نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ رشک اور عداوت سے۔ جب اس نے مجھے خستہ حالی میں بھی خوش دیکھا تو اس نے مجھکو خوار کرنے کی فکر کی۔ اس سے ضمناً یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ فلک نے اگر میری خستگی کو پسند کیا تھا تو پھر کیوں اسے مجھے ذلیل نہ کرنا تھا۔

بوسہ از لبانم دہ عمر خضر از من خواہ　　جام مے بہ پیشم نہ عشرت جم از من پرس

غالب کا یہ شعر بادی النظر میں رندانہ ہے لیکن دراصل اس میں متصوفانہ جھلک نظر آ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے اپنے لب جاں بخش کا بوسہ دے اور عمر خضر کی مجھ سے چاہ یعنی مجھکو بوسہ لب جاں بخش سے عمر خضر حاصل ہو جائے گی۔ مصرعہ ثانی میں

شق پیکر عشرت جم کی حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

خدارا وقت پرسش نیست گفتم بگذر از غالب   کہ ہم جان بر لب ہم داستانہا بر زبان دارم

غالب نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کیا ہے ایسے شعر تو بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ مصرعہ اولیٰ میں "خدارا وقت پرسش ت" کا جملہ ایسا وسیع المعنی ہے کہ کئی معنوں میں اسکی شرح کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنے معشوق حقیقی سے عالم نزع میں یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ وقت ش حال یا احوال کا نہیں ہے یعنی یہ وقت محض کوچ کا ہے۔ بگذر از غالب یعنی غالب کو معاف کر دے۔ دوسرے میں وجہ بیان تے ہیں کہ گو جان لب پر ہے لیکن تیری یاد اب تک زبان پر ہے پس ایسی حالت میں پرسش بیکار ہے اور ایک لطیف معنی یہ بھی نکلتے ہیں میں عالم نزع میں بھی تیری داستان بیان کرکے ذوق حاصل کر رہا ہوں اب مجھ سے کوئی دوسری بات نہ پوچھ تاکہ میں لطف داستان سے روم نہ رہوں کیا محویت اور کیا گہرا تعلق ہے اس شعر میں متصوفانہ مذاق بھی حد درجہ کا ہے۔

گر جلوہ رخ تو بہ ساغر ندیدہ ایم   چندیں بذوق بادہ دل از جا چہ میرود

غالب کی قادر الکلامی کی کیا حد ہے وہ ایک رندانہ مذاق کے شعر میں بھی تصوف و توحید کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے ساغر میں جلوہ رخ یار دیکھتا ہوں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا دل ذوق بادہ میں اسقدر از خود رفتہ نہ ہوتا گو اس شعر کا ضمون بہت بلند نہیں ہے لیکن حسن بیان نے اس میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے۔

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوے تو   ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

غالب نے اس شعر میں جو مزہ بھرا ہے وہ عرفی کے اس شعر سے باعتبار رنگ تغزل کسی طرح کم نہیں ہے:

از در دوست چہ گویم بچہ ساماں رفتم   ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

غالب معشوق کے فریب صلح پر ناز کرتے ہیں کہتے ہیں میں اسکی گلی سے ناکام تو گیا ہوں لیکن میرا دل امیدوار ہی رہا عجیب لیے شوق بیان کر گئے ہیں دراصل عاشق صادق کا یہی کام ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنے معشوق سے ناکام اور مایوس نہ ہو عرفی کہتے ہیں کہ میں کیا کہوں کہ در دوست سے کس طرح پھرا ہوں۔ میں ہمہ تن شوق بن کر گیا تھا لیکن معشوق کی بے مہری سے ہمہ تن حرماں ہو کر پھرا۔ غالب نے یاس سے کنارہ کیا ہے مگر عرفی نے اپنے دل میں حرماں کو جگہ دی اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ گویا اپنے معشوق سے ناامید ہو گئے ہیں۔ عرفی کا شعر اپنے رنگ میں بہت بلند اور بے نظیر ہے مگر غالب نے معاملت حسن و عشق کے غیر منقطع ہونے کو کس درد دریا نہ مندی سے بیان کیا ہے یہ شعر محض عاشقانہ نہیں ہے بلکہ انتہائی مذاق تصوف کو لیے ہوئے ہے غالب نے اپنی ہر غزل بلکہ شعر میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ ادبی لیاقت بہت خاص درجہ کی رکھتے ہیں۔ انشا پردازی اور بلیغ معنی آفرینی کی دھن میں ان کا دل و دماغ اعلیٰ ترین دستگاہ رکھتے ہیں مثلاً ذیل کے شعر میں بھی انھوں نے کیا لطف اور شوخی پیدا کی ہے۔

ذوقی است ہمدمی بفغاں مگزرم ز رشک   خارے بپای عزیزاں خلیدہ باد

کہتے ہیں کہ میرے پاؤں میں جو خار عشق چبھا ہے اور تنہا فغاں کر رہا ہوں یہ کچھ زیادہ لطف کی بات نہیں ہے بہتر ہو کہ میرے

ساتھ اور لوگ بھی فغاں کریں تاکہ فغاں کا لطف بڑھ جائے اِس لیے میں چاہتا بلکہ میری دعا ہے کہ تیری گلی کا خار عزیزوں کے بھی پاؤں میں چبھے تاکہ ہمدردی کے ساتھ فغاں کی جائے۔ اور ہنگامہ عشق میں گرمی پیدا ہو۔ دوسری بات یہ بھی نکلتی ہے کہ وہ عزیز جن کو میری فغاں سے ہمدردی نہیں ہے اور وہ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں پھر نہ سمجھیں گے۔ کیا خیال آفرینی اور کیا جدت ہے۔

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد　　محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

یہ شعر محض متصوفانہ نہیں ہے بلکہ اسمیں فلسفۂ حکمت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہتے ہیں کہ رمز شناسی کا ملکہ پیدا کرو ہر نقطہ (باریک بات یا ادنیٰ ادنیٰ شے میں) ایک ادا یا رمز مخفی ہے اگر تو نے اسکو نہ پہچانا تو کچھ کام نہ کیا اور تو عقل و فراست سے خالی ہے۔ محرم اور فریس وہ ہے کہ اشارہ پر کام کرے اور مصلحت وقت کو پہچانے زمانہ یا نیچر کی ہدایت کو خضر راہ بنائے۔

ذیل کا شعر نہیں زہر میں بجھایا ہوا نشتر ہے اس سے زیادہ بامزہ شعر کہنا مشکل ہے۔

زمن بجرم طپیدن کنارہ میکردی　　بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

کہتے ہیں کہ میرے تڑپنے کے جرم میں تو مجھ سے الگ رہتا تھا لیکن اب تڑپتے تڑپتے میرا دم نکل گیا اور مجھ کو خاک میں دفن کر دیا گیا اس لیے اب تو میری خاک (قبر) پر آ اور دیکھ کہ کس آرام سے سو رہا ہوں۔ ہائے کس دردناک طریقے سے معشوق کے آنے کی تمنا کی ہے۔ اور پھر رضا جوئی معشوق کے لیے طپش کا موقوف کر دینا کیا شان عاشقی ہے۔

—— ا ۔ ز

زمانہ مارچ ۱۹۱۵ء

فلسفۂ غالب

(از مسٹر جگدیش ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

شاعری روحانی غذا کا سامان مہیا کرتی ہے، شاعر کو فطرت کے ہر ذرّہ میں عرصۂ دو عالم کی وسعت
زمیں صدائے جاں نواز اور ہر قطرہ میں دریا نظر آتا ہے۔ ہر وہ شے جو بادی النظر میں تمام دلفریبیوں
کر چکی ہو، شاعر کے سازِ روح کو اپنی مضراب سے ایسے اچھوتے نغموں سے مالا مال کر دیتی ہے
ہ کان لطافت بجاتا ہے۔

شاعر کی دنیا وسیع و غیر محدود ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی طبع آزمائی کسی خاص مضمون یا
کی پابند نہیں۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی شاعری ان چند مضامین کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی

(۱) معرکۂ حسن و عشق (میر۔ سودا۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ مومن اور غالب)

(۲) رزم و بزم اور مرثیہ خوانی (انیس اور دبیر)

(۳) نعت و مذہب (خسرو وغیرہ)

(۴) مدح و ہجو (سودا وغیرہ)

(۵) مصوری فطرت (آزاد اور اُن کے مقلدین)

(۶) حب وطن و ملت پرستی (حالی اور اُن کے مقلدین)

(۷) فلسفہ و اخلاقیات (غالب وغیرہ)

اپنے ہمعصر شعراء کی طرح مرزا غالب نے بھی ریختہ گوئی کو چھوڑ کر قریب قریب ہر عنوان پر زور طبع دکھایا ہے۔ اگر اردو میں بیدل کا تتبع کرکے وہ میر، سودا، جرأت، انشاء اور ذوق سے بازی لے گئے تو فلسفی شعراء کی دنیا میں اُسے ہائن اور گوئٹے جیسے بلند پایہ سخن سنجوں کی ہمنوائی کا فخر حاصل ہے فارسی میں جو نسبت ظہوری اور نظیری کے کلام کو عرفی اور طالب کے کمال سے ہے بعینہٖ وہی علاقہ مرزا کی اُردو شاعری کا میر اور سودا سے ہے۔ غالب کا فارسی کلام سلیمان، ظہیر، انوری، خاقانی نظیری، عرفی، طالب اور عمر خیام کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ نثر میں بھی مرزا نے ابوالفضل اور ظہوری جیسے مسلم الثبوت ادیبوں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے

یہاں مرزا کے کلام پر بحیثیتِ مجموعی تبصرہ کرکے اُس کے محاسن کو نمایاں کرنا مقصود نہیں بلکہ اسکی تحقیقت مشاہدہ کو "دیدۂ عبرت نگاہ" کے روبرو عریاں کرنا اور اسکی فلاسفی کو "گوشِ نصیحت نیوش" تک پہنچانا ہے۔ فلسفۂ غالب سے لذت آشنا ہونے کے لئے یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس ماحول سے واقفیت حاصل کرلی جائے اس کے بغیر کسی شاعر کی عظمت کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے

یہ حقیقت ہے کہ مرزا نے فنِ شعر کی تحصیل فارسی شعراء سے کی اور اپنے کلام میں بھی ان کا تتبع کیا، اس لئے یہاں فارسی ادب کے اُس حصہ کا مختصر تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جو غالب کے عہد تک معرضِ ظہور میں آتا رہا۔

جہاں تک بہاریہ کلام کا تعلق ہے دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان فارسی کا مقابلہ کرسکے یہی وجہ ہے کہ فارسی شعراء نے غزلگوئی کو دیگر اصناف سخن پر ترجیح دی اور حُسن وعشق کی ہنگامہ خیزی ومعرکہ آرائی کے لئے اس سے بہتر صنف اور ہو بھی کیا سکتی تھی؟

غزل گو شعراء نے بالعموم پردۂ مجاز میں عشق حقیقی کا اظہار کیا ہے، اس قسم کے عشقیہ مضامین کا نادر نمونہ سعدی، حافظ اور خسرو کے یہاں بکثرت موجود ہے۔ جس پایہ کے رزمیہ مضامین فردوسی اور نظامی کی مشہور عالم مثنویاں (شاہنامہ اور سکندر نامہ) میں ملتے ہیں، دنیا کی بہت کم زبانوں میں ایسا بیش قیمت ذخیرہ نظر آئیگا۔ فلسفہ اور اخلاقیات کی تعلیم صوفی مشرب شعراء اور سعدی و خیام کے یہاں ملتی ہے۔ فطرت کے حسنِ بلیغ میں فارسی شعراء کے لئے کوئی کشش نہ تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں اس کے مصوروں اور ترجمانوں کی کمی ہے۔

تصوف اور غالب | مسلکِ صوفیاء کی بنیاد بھی مصوری کی طرح صنفِ نازک کی نگاہِ نازکی رہینِ منت ہے۔ سے اس رندانہ مشرب کی ابتداء ہوئی، اور عائشہ خاتون کی تبلیغی سرگرمیوں نے اس کی نشرواشاعت م

، قدر وست دی۔ صوفیوں نے بھی ویدانت کی تلقین (आत्मन विद्ध) کے مطابق اپنی
ت کو معلوم کرنے کو مقدم سمجھا اور ترک لذات کی عادت ڈالی۔ یونان سے یہی صدا آتی ہے :-
(... thy self) اور قرآن کا بھی ارشاد ہوتا ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

عائشہ کے معتقدین اس لئے صوفی (پشمینہ پوش) کہلائے کہ اُنھوں نے بیش بہا لباس جو دنیا داروں
بیش پسندوں کو مرغوب تھا یکلخت ترک کر کے سادگی اختیار کی اور صوف یا اُون کو زیب تن کیا۔
فیوں کا مذہب کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسلام ہی کا ایک جزو ہے

دنیا کے فلاسفروں نے صرف اِن دو طریقوں پر کاربند ہو کر عالمِ موجودات کی حقیقت، روح و مادہ اور خدا
ہستی وغیرہم اہم مسائل سے بحث کی ہے :-

(۱) تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ظاہر اشیاء کے وجود کے متعلق نتائج اخذ کرنا۔
(۲) تخیلات و تصورات کو دلائلِ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر انسانی وجود کی حقیقت و علت وغیرہ معلوم کرنا
ن میں سے دوسرا طریقہ زیادہ آسان و مفید مانا گیا ہے۔ صوفیوں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہو کر منزل
مقصود کی جستجو کی ہے۔ مسٹر براؤن کی رائے ہے کہ آریوں کی تعلیم و تلقین اور ناستکوں (منکروں) کے عقا
صوفی مذہب پر بہت کچھ اثر ہوا ہے۔ بعض صوفی شعراء کے یہاں (جن کا فارسی ادب تا ابد منت کش رہیگا)
س حقیقت کے ثبوت موجود ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے ارتباط باہمی سے ہی "صوفی ازم" کی جڑ مضبوط ہوئی
یہاں صرف یہی مثال کافی ہوگی کہ صوفیوں نے انتہائی خلوص و رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کی بت پرستی
کو کفر و لعنت کے بجائے اصلِ ایمان قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مسلماں گر بدانستی کہ بت چیست ۔۔۔ بدانستی کہ دیں در بت پرستی ست (گلشنِ راز)

مزید ثبوت کے لئے ایم۔ ضیاء الدین، وان کریمر (Von Kremer) اور ڈوزی (Dozy) وغیرہ اصحا
کی آراء بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر یہاں ایک ہی ثبوت کافی ہے۔

صوفیوں کے فلسفہ کی توجیہ و تشریح تو ایک مبسوط تبصرہ کی محتاج ہے، یہاں صرف اس حصہ کا بالاختصار
تذکرہ کیا جاتا ہے جس کا نفسِ مضمون سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے۔

جبر و اختیار دونوں عقیدوں پر ایمان رکھنے والے صوفی اس بارے میں بالکل متفق ہیں کہ خدا
کی ذات "وحدہٗ لاشریک" ہے اور اسی کے ایک اشارہ (کُن فیکون) پر ظاہری دنیا اور خالق کے وجود
کی مظاہر اشیاء عالم وجود میں آئیں۔ ان کے اعتقاد کے موافق دنیا کی ہر شے ایک بے حقیقت فریب و طلسم ہے
صرف خدا کی ذات قادر و قیوم ہے، دوسری ارواح اور مادی اشیاء اسی لافانی ذاتِ پاک کا جزو ہیں۔ آگے

بلکہ اس عقیدہ میں تراش و خراش ہوئی ہے، اور دنیا اور اُس کے لوازمات کو خالق کے صفات حمیدہ سے معرا جزو قرار دیا گیا ہے۔ منصور اس سے بھی آگے گیا اور "انا الحق" کا دعا کر کے سزاوار دار ہوا۔

منصور کا "نعرۂ انا الحق" ہندو فلسفہ سے بہت کچھ مشابہ ہے، حالانکہ تفصیلات کے لحاظ سے اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ہندو فلسفہ خالق دو عالم کے تین صفات (۱) ستیہ (۲) چت اور (۳) آنند بتاتا ہے، اور روح کو تیسری صفت کے علاوہ باقی دونوں پر قادر مانتا ہے، اور بعض ناقابل تردید دلائل کی بنا پر مدعی ہے کہ روح پیہم کشاکش اور مسلسل جدوجہد کے بعد اس تیسری صفت پر بھی قابو پا سکتی ہے، اسی لئے روح کا ازلی اور غیر فانی ہونا ضروری ہے۔ مشہور جرمن مصنف اور فلسفی کانٹ بھی روح کو لافانی ثابت کرنے کے لئے قریب قریب اسی طریقہ پر استدلال کرتا ہے اور روح کو بشر کا منتہائے نظر قرار دیکر منصور کی ہمنوائی کا دم بھرتا ہے۔[۲]

گو کانٹ اور منصور دونوں کے خیالات ہندو فلسفہ کی طرح جامع نہیں، پھر بھی حقیقت سے قریب ہیں۔ ہندو فلاسفی کے متذکرہ بالا نظریہ کے صحیح مفہوم کو شمس تبریزی نے خوب ادا کیا ہے۔

جنبش ہر ذرہ با اصل خود است　　ہر چہ بود میل کسے آں شود
جان و دل از جذبۂ میل و ہوش　　ہم صفت دلبر و جاناں شود

"ہمہ اوست" صوفیوں کا عام عقیدہ ہے، دنیا کی حقیقت اُنکی نظروں میں اس کے سوا کچھ نہیں۔

جہاں خود جملہ امر اعتباری ست　　بہ آں یک نقطہ کاندر دور ساری ست

روح اور خالق کے مابین جو رشتہ صوفیوں نے قائم کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:-

آناں کہ طلبگار خدائید خدائید　　حاجت بطلب نیست شمائید شمائید
چیزیکہ نگردید گم از بہر چہ جوئید　　کس غیر شما نیست کجائید کجائید
وجود اولیا او را چو عضو اند　　کہ او کلیست و ایشاں ہمچو جزو اند
جناب حضرت حق را دوئی نیست　　دراں حضرت من و ما و توئی نیست
من و ما و تو و او ہست یک چیز　　کہ در وحدت نباشد ہیچ تمیز

---

[۱] अहम ब्रह्म द्वितीय न अस्ति (अद्वैत वाद)

[۲] "Act as a member of the Kingdom of ends."
.... Society is the Kingdom of ends"
"سوسائٹی حیات بشری کے حقیقی مقاصد کا شیرازہ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی منظم شیرازہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے فرائض بشریت کی تکمیل کریں۔"

غالب کو نہاں خانۂ ازل سے شاعر کا دل اور فلسفی کا دماغ ودیعت ہوا تھا، اس کتابِ حقیقت و صوفیوں کے عقائد سے بہت کچھ استفادہ حاصل کیا، چنانچہ کلامِ غالب زبانِ حال سے اس امر کی شہادت ہے، کہیں عالمِ ملکوت میں وہ صوفیوں کا ہمزبان ہے ع

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

عالمِ جبروت میں ان کا ہمنوا ہے ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کہیں عالمِ لاہوت میں وحدت الوجود کا حامی اور مدعی ہے ؎-

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود　　ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

اولیاء کی طرح غالب بھی صرف خدا کی ہستی کو ازلی تسلیم کرتا ہے اور عالمِ موجودات کے ذرہ ذرہ کے عدم و وجود کو اسی ایک ذات سے وابستہ سمجھتا ہے۔ ملاحظہ ہو ع

نہ تھا جب کچھ خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

دنیا کی حقیقت بھی غالب کی نظروں میں بالکل وہی ہے جو صوفی شعراء کی نگاہ میں ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

منصور کی طرح غالب بھی روح و خالق کے رشتہ کی حقیقت سے آشنا ہے ؎۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں
نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　مٹایا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مرزا نے عام صوفیوں کی طرح خالق کو "کل" اور روح و مادہ کو "جزو" مانا ہے ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

عمر خیام اور غالب | متصوفین کے علاوہ ایک اور بھی بزرگ ہستی ہے جس کا فلسفۂ غالب پر بین اثر ہے اور یہ خراسان کا مشہور حکیم عمر خیام ہے (ہرچند خیام کا سنِ ولادت یقین کے ساتھ تعین نہیں کیا جا سکتا مگر عام طور پر اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۰۲۰-۱۰۱۵ء بیان کی جاتی ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی خیام اور ما قبل الاسلام بھی فانی انسان اور لافانی خدا کے باہمی رشتہ کی

و دیانت میں غلطاں و پیچاں تھے۔ چنانچہ زرتشت کے مذہب کے دوران فروغ میں بھی مانی و مزدک کی تحریکات کو قبولیت عامہ کا فخر حاصل تھا۔ ادھر بدھ اور ویدانت کے فلسفہ نے حدود خراسان میں اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ کچھ ایرانیوں کی ذہنیت بھی ایسی تھی کہ متصوفین کے معتقدات میں حزن و ملال، یاس و حسرت کے عناصر شامل ہو گئے۔ چنانچہ فارسی ادبیات میں خیام سے بہت پہلے ایک محزون و ملول شاعر گزرا ہے جس کا نام شہید بلخی تھا اور جو رودکی کا ہمعصر خیال کیا جاتا ہے، اس کے کلام سے حزن و یاس کے اشارات پائے جاتے ہیں، جو غالباً گوتم بدھ کی تلقین کا نتیجہ ہیں۔ گوتم کی نظروں میں کائنات کے تمام مناظر و مظاہر عارضی، ناکارہ اور ہیچ تھے۔ اور زندگی کا مقصود اعلیٰ ہوا و ہوس کو مٹا کر نروان حاصل کرنا تھا۔

اس کے علاوہ یونانی فلسفہ بھی یونان اور دیگر قطعاتِ مغرب سے ایرانی ذہنیت کو من حیث المجموع متاثر کرتا رہا۔ ٤٣٥-٣٥٦ق م میں سیرین کا مشہور فیلسوف ارسٹیپس (Aristippus) ایک نئے فلسفۂ حیات کی تبلیغ میں مصروف تھا اُس نے دنیا کی ناپائداری و بے ثباتی، مستقبل کی تاریکی اور انسانی عقل کی نارسائی و معذوری سے متاثر ہو کر طربیہ زندگی کو مقصودِ ہستی قرار دیا۔

ارسٹیپس کی وفات کے چند سال بعد (٣٤١-٢٧٠ ق م) اپیکیورس (Epicurus) نے بھی قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ اس کی تبلیغی سرگرمیوں کو از سرِ نو تازہ کرنے کی سعی کی۔ اور قریب قریب اسی نظریہ کی تائید کی جو اس کے پیشرو کا مقولہ تھا۔ ماد ھو آچاریہ "سرو درشن سنگرہ" کے باب اول میں رقمطراز ہیں کہ ہندِ قدیم میں چرواک منی نے بھی اپنے پیروؤں کو یہی تلقین کی تھی، ان کی تعلیم کا بنگال میں صدہا سال تک چرچا رہا۔ بہرحال یہ خیالات زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہندی اور یونانی تہذیب کی بجائے اتصال (ایران) تک بھی جا پہنچے، اور رنگین مزاج خیام۔ ہوریس (Horace) ہائین اور بائرن کی طرح موجِ حیات کی اس طغیانی میں بہہ گیا۔

دسویں صدی کے مشہور طبیب ابو جعفر نے پہلے پہل ایرانی ذہنیت کی جبلی افسردگی و انقباض کا ردِ عمل تلاش کیا اور غالب کی طرح مے و نغمہ کو "اندوہ ربا" کہہ کر جو دم عیش و مسرت میں گزرے اُسے غنیمت جانا۔ بلاشبہ خیام صوفیوں کی تعلیم کی طرح ان خیالات سے بھی متاثر ہوا۔

اگرچہ خیام کے کلام کے ظاہری مطلب کو مدِ نظر رکھ کر اس کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کیا گیا اور اُسے موردِ عتاب ٹھہرایا گیا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ خود خیام کی رباعیات شاہد ہیں کہ وہ بھی اہلِ ایمان کی طرح خدا کی ہستی کا قائل ہے ؎

[illegible] گفتہ — ترسند ز روز خند دو مالکے بہشت

آنکس کہ ز اسرارِ خدا باخبر است   زیں تخم درا ندرون دل ہیچ نکشت

[illegible]ت یہی نہیں بلکہ اُسے رام (خدائے قدیر) کے رحیم ہونے میں بھی مطلق کلام نہیں ؎

خیام از بہر گنہ ایں ماتم چیست   در خوردن غم فائدہ بیش و کم چیست
آں را کہ گنہ نکرد غفراں نبود   غفراں ز برائے آمد غم چیست

خیام جب دنیا کی نیرنگیوں کی جانب آنکھ اٹھاتا ہے تو اُسکے دل و دماغ میں بیقرارانہ شکوک [illegible] بے شمار لہریں اٹھتی ہیں، اور وہ عالم اضطراب میں یہ سوال کرنے لگتا ہے ؎

ہرچند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا   چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک   نقاشِ من از بہر چہ آراست مرا

[illegible] جب کوئی طمانیت بخش جواب نہیں ملتا تو وہ کاؤنٹ گوبینو کے خیال کے مطابق ایرانیوں کی [illegible]ری زندہ دلی کے مطابق مے نوشی و مدہوشی کی ظلمتوں میں حیات انسانی کا منتہائے مقصود تلاش [illegible]نے لگتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان و جہان سب کچھ فانی ہے اور مستقبل بجز خلک کی نامعلوم [illegible]رائیوں سے بھی زیادہ مبہم و نامعلوم! پس وہ وفورِ یاس اور جوشِ دیوانگی میں پکار اٹھتا ہے۔

زاہد گوید بہشت با حور خوش است   من می گویم شرابِ انگور خوش است
ایں نقد بگیر و ست از آں نسیہ بدار   آوازِ دہل شنیدن از دور خوش است

چوں عہدہ نمی شود کسے فردا را   حالی خوش کن تو ایں دلِ سودا را
مے نوش بنورِ ماہ اے ماہ کہ ماہ   بسیار بیابد و نیابد ما را

لیکن خیام مے گساری کو گناہ خیال کرتا ہے، اسی لئے اس نے یہ اعلان بھی کیا ہے ؎

مے خوردنِ من نے از برائے طرب است   نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے   مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

حیات و ممات کے مسائل کا حل دریافت کرنے میں وہ ارسٹیپیس اور اپی کیورس کا ہمخیال نظر آتا ہے

چوں مردن تو مردن یکبارگی است   یک بار بمیر ایں چہ بیچارگی است
خونے و نجاستے و مشتے رگ و پوست   در کار نبود ایں چہ غم خوارگی است

خیام راحت و آرام کی آرزوئے خراب کو امیدِ موہوم سمجھے ہوئے ہے اور اس بارے میں دنیا سے جو اس کے نزدیک نمود بے بقا اور دار المحن ہے قطعاً مایوس ہے ؎

شادی مطلب کہ حاصلِ عمر دمے است   ہر ذرہ ز خاک کیقبادے و جمے است

احوالِ جہاں و اصلِ این عمر کہ ہست   خوابے و خیالے و فریبے و دمے است

پنیٹر، ہوریس اور ایکلیسسٹس (Ecclesiastes) کی طرح اس کی دانست میں بھی اسی سرّ کا ایک ایک تشنہ لب ذرّہ تغیر پذیر اور جادۂ عدم و فنا پر بسرعت گام زن ہے۔ ہوریس (مشہور اطالوی شاعر) کہتا ہے:۔

"وہ شمیم نوبہار کے ناز پرورد پھول اپنی آب و تاب ہمیشہ اسی طرح قائم نہیں رکھ سکتے، مہتاب کا روئے رنگین اسی طرح درخشاں و تاباں نہیں رہتا۔ دبادش دوریں وہ یکسانیت جمال نظر آتی ہے۔ پھر فضائے دوام کے تیرہ و تار تصور کی کیا حقیقت ہے؟ کون جانے ..."

ہر چند خیام کی نظروں میں رونا بے سود ہے اور حال کی عارضی مسرت، زندہ دلی اور ہنستا ہنسانا زندگی کا ماحصل ہے، اگر میرا خیال ہے کہ اس نے بھی آستوا کس (سقراط وغیرہم) آسنکس (زینو وغیرہم) اور ناگوں کی طرح رنج و راحت سے بے نیاز رہنے کی کنایۃً حمایت کی ہے۔ شاید اسی لئے وہ حال کی عارضی مسرت یعنی گناہ آلود طربیہ زندگی سے برگشتہ ہو کر خود فراموشی و بیخودی کی تمنائے حصول میں شراب کا طالب نظر آتا ہے۔ اور ترک لذات کا دوسرا پہلوئے خداوند دو عالم کی لازوال رحمت کے توکّل کے رنگین گہر میں کھویا رہتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ خیام کا فلسفہ بائرن اور بائرن کی طرح حال کی عارضی مسرت تک محدود ہے مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے یہ فیصلہ ہنوز ناقص و تشنۂ تحقیق ہے۔

بہر حال غالب پر خیام کی رباعیات کا بھی براہ راست اثر ہوا ہے۔ غالب کا فلسفہ اس وقت تک تقریباً نامکمل ہے جب تک کہ خیام کے فلسفۂ حیات کے اثبات کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے چنانچہ حتی الامکان سطور بالا میں اُن نکات کو مجموعی طور پر یکجا کر دیا گیا ہے جن کو مرزا نے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے۔ یہاں غالب کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن کا خیام کی رباعیات سے موازنہ کرکے معلوم ہوگا کہ مرزا نے حکیم موصوف سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

خیام جنت کو "نسیہ" قرار دیکر اس کے وجود سے منکر ہے مگر غالب بیانگ دہل کہہ رہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ابتداءً مرزا نے بھی خیام کی طرح عیش و نشاط کو زندگی کا مقصد اعلیٰ قرار دیا ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

بعد ازاں مایوس ہو کر کہا ہے ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل   زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اسنے خیام سے بڑھکر ترکِ لذات کی تلقین کی ہے، کہتے ہیں ؎

ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم   کچھ مزا اس کا بھی چکھنا چاہیئے

ترکِ لذات کی وادیِ بے پایاں میں غالب کے پائے عقل نے بھی خیام کی طرح لغزش کی

خود مرزا بادۂ انگور کے ایک جرعہ کا طالب ہے مگر اسی نیک نیتی کے ساتھ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ایک اور بات بھی ہے جس میں غالب اور خیام باہم ہمخیال ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ اس حقیقت کے بھی معترف ہیں کہ "رنج و راحت" کے ناخوشگوار و پسندیدہ اثرات ہی تکلیف کا باعث ہیں، پس عیش کی تمنا نہ کرنا ہی غم سے نجات پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ب کا فلسفہ میر سودا اور ان کے سلسلہ کے شعراء نے غزل کو عشقِ حقیقی و مجازی کے دائرہ میں محصور کر دیا تھا۔ لیکن مرزا نے ان تمام قیود کو توڑ کر غزل کی تنگیٔ دامن کی پردہ پوشی کی اور اُسے قدما کے خلاف فلسفۂ حیات و اخلاقیات کی نازک خیالیوں سے مالامال کر دیا۔ تاہم غالب کی تخیل رسائی اور بلند پروازیوں کو جس کشادہ دامانی کی ضرورت تھی، عروسِ فکر آج بھی اس کی تمنائے حصول میں لرزاں ہے

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل   کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب ہم میر، سودا اور ذوق وغیرہ کے مطالعہ سے مضمحل ہو جاتے ہیں تو روح کی تشنگی دور کرنے کے لئے ہمیں غالب کی صحبت یاد آتی ہے۔

پیدائشِ عالم کی ساعت سے لیکر آجتک بشر تکوین و تخلیقِ کائنات اور اپنے وجود کی علتِ غائی دریافت کرنے کی متواتر کوششوں میں منہمک رہا ہے۔ مرزا کے روبرو بھی یہی عقدۂ لاینحل درپیش تھا اور وہ دنیا کے عالمِ اسباب ہونے (اور :- कारण भावात कार्य भाव) کے عالمگیر قانون کی حقیقت کا رازداں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں فخر رازی، افلاطون، جلال رومی، حافظ اور غزالی علم کے اس میں "ما عرفنا" پکار اٹھتے ہیں غالب کمال سکون کے ساتھ کہتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب متصوفین کی طرح توحیدِ وجودی کا معتقد ہے ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ملاحظہ دیکھئے مکمل قطعہ۔

وہ اس راز کا محرم بھی ہے کہ تخلیقِ عالم خالق کے فکرِ عمل کی محتاج ہے۔ اسی لئے کہتا ہے ع

"ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں"

اس کی نظروں میں کائنات کی پیدائش کی علت حسن کی خود بینی کے سوا اور کچھ نہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالب مادہ کے وجود سے منکر ہے اور روح کو خالق کا ایک جزو منفک تسلیم کرتا ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

دوسرے شعر کی تفسیریں تو بہت ہوئیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک بھی غالب کے صحیح مفہوم کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ صاف شعر ہے جس میں فیلسوف شاعر نے تصویر کے پردہ میں روح اور مادہ کی ماہیت کی جانب اشارہ کیا ہے، اور کاغذی پیرہن سے پیکرِ تصویر (روح) کے جسمِ خاکی کو تشبیہ دیکر مادہ کی بے ثباتی کا ثبوت پیش کیا ہے، نہ کہیں خیال فریادی ہے نہ فضول تلاشِ مطالب کی گنجائش۔

غالب روح اور خدا کی ہم رشتگی کے لئے اعلان کرتا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کمار اجیت اور سوامی شنکراچاریہ کا نظریہ بھی بالکل یہی ہے اور بائبل میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے[1]

اپنی حقیقت کو پہچان لینا مرزا کی نظروں میں خدا تک رسائی حاصل کر لینے کے مرادف ہے ؎

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

یہ اس لئے کہ ع — اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے

---

[1] ایک مشہور تامل شاعر نے غالباً سوامی شنکراچاریہ کی تلقین سے متاثر ہو کر بعینہ یہی مفہوم نظم میں ادا کیا ہے۔ یہ تامل گیت گورر (Gorer) کی زبان سے سنئے:-

The wise man saith
That God, the omniscient essence, fills all space.
And time, He can not die or end, In him all things exist.

"عالم کا قول ہے کہ وہ عالم کی وسعت کا ذرہ ذرہ اور وقت کا ایک ایک نا ممکن التقسیم لمحہ خدائے قیوم کی تجلی سے معمور ہے وہ ہر جگہ موجود اور بقائے دوام کا مالک ہے، اسی کی ذات پاک پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے۔"
فرانس کا مشہور فلاسفر اسپینوزا اس بارے میں تامل شاعر کا ہم خیال نظر آتا ہے۔

غالب اپنی حقیقت کے بارے میں یوں گویا ہے ؎

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

نیا کے نزدیک ماسوا ر قطعاً معدوم ہے اس لئے غالب اس نئے انداز سے اپنی لاعلمیِ حقیقت وف کرتا ہے ؎

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ا ہے ؎

کو وہ حیاتِ انسانی کو عارضی و فانی تصور کرتا ہے (ع ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے) لیکن روح کو جزوِ خالق تسلیم کر چکا ہے اس لئے اس کے لافانی ہونے میں ایمان رکھتا ہے ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

شعر کی تشریح بھی صحیح نہیں ہوئی ہے، ورنہ مرزا نے مسئلۂ تناسخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بلاشبہ شاعر مصرعۂ ثانی میں بالِ عنقا سے مادہ مراد لی ہے جو اس کی نظروں میں معدوم ہے۔ اس طرح کمال کے ساتھ مادہ کی فنا اور روح کے ثبات پر استدلال کیا ہے۔ اور یہ یقیناً ہند. و فلسفہ کا ناقابل یدا اثر ہے جس کا رنگ غالب پر بھی غالب ہے۔

مرزا گوتم بدھ کی تعلیم سے بھی متاثر ہوا ہے، چنانچہ خود بھی اسی کی طرح دنیا کو آلائش و آلام ہستی قرار دیتا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

وہ تاثر ہے جو فیضی کی زباں زد ہے:-

"ابرِ باراں کے گنجینۂ پنہاں میں کوئی ایک قطرہ بھی ایسا نہیں جو کبھی انسان کی رگ و پے میں خون بنکر موجزن نہ ہوا ہو، نہ خاک کا ایک ذرہ بھی ایسا ہوگا جو کبھی کسی فرد کا جزو نہ ہوا ہو۔"

اُپنشدوں نے ہستی کے وجود کو "مایا" سے تعبیر کیا ہے۔ ڈے کارٹ جیسے مادہ پرستوں کے ت برکلے نے بھی اس بعید از تردید نظریہ کی تائید کی ہے۔[۱] غالب کی ہمہ گیر طبیعت سے یہ توقع کرنا ہ ثباتِ عالم کے بارے میں کوئی جداگانہ رائے رکھتا ہو موجِ ہوا پہ طلسمِ فریب باندھنے کی سعیِ حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ غالب نے بارہا کہا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

(Nothing exists beyond a percepient mind) 1

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل　　گرمیِ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں اس اعتراض کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ آخر خالق کو ایک فضول شے کی تعمیر کے لئے خواہ مخواہ دردِ سر مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ غالب اس اعتراض سے بے خبر نہ تھا اس لئے اُس نے پیش بندی کر لی ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے، آئینۂ بادِ بہاری کا

گوتم بودھ کی طرح زیست کا ماحصل غالب کے نزدیک بھی بیش از رنج و غم اور کچھ نہیں ؎

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

انسان روزِ ازل ہی سے اس غمکدہ میں بارِ الم اٹھانے کے لئے با دیدۂ پرنم آیا ہے اور اُسے روزِ اول سے موت کا کھٹکا لگا ہے ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے　　سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مرزا کو خیالِ مرگ ہی ملول و آزردہ خاطر رکھتا ہے چنانچہ رقمطراز ہے۔ ع

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے

اور ؎

ملتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

غالب کے یہاں بہر اِس فنا کی رسائی دنیائے دنی کے اُس پار عدم تک ہے ع

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل

موت کے علاوہ حزن و ملال کی ایک اور وجہ بھی ہے جو غالب نے ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے نمایاں کی ہے، اور وہ یہ کہ ہماری بیشتر تکالیف کا سرچشمہ تعیش پرور خواہشات نفسانی ہی ہیں۔ درحقیقت آرام طلبی جوانی کا ایک دلفریب خواب ہے جس کی تعبیر طوفانِ اضطراب ہے۔ چنانچہ ابتداءً (غالباً عنفوانِ شباب میں) مرزا نے بھی فکرِ مآل کو بہ وفِ عدم التفاتی قرار دیا اور خیام اور طبیعہ سوامی کی طرح نفس پرستی و شکم پروری کو دوائے دردِ دل تجویز کر کے کھاؤ پیو اور خوش رہو کا نسخہ تحریر کر دیا ع

[illegible]

ہ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
ب انجام کی جانب نگاہ کی تو ہوش ہوا کہ ع
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
پھر خیال آیا ع ہے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے
دنیا سرائے فانی ہے اور سے
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل گرمیِ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک
ر فیصلہ کیا کہ سے
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ہ غالب نے غم کو جان کا ساتھی اور موت کو وبائے غم کا علاج مان لیا ہے، اور اس طرح خوفِ فنا
ہ سود ثابت کر دیا ہے۔ مرگ کے جاں گسل مسئلہ پر مرزا نے اپنے خیالات کو ذرا شرح و بسط کے
، واضح کیا ہے۔ غالب کے پہلو بہ پہلو براؤننگ کو بھی رکھ لیجئے اور ایک ہی مسئلہ پر دو قول کے
ات کا موازنہ کر کے غالب کی اہمیت کا اندازہ کیجئے ع
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

The best is yet to be ....

The last of life for which the first was ma

انتہائے مقصودِ حیات، ابتدائے زیست جس کی منت کشِ احسان ہے ابھی دور ہے
ہاں کمالِ زندگی کا اتمام ہونا باقی ہے)
غالب مہاتما سقراط کی طرح حدِ مرگ کو وہم و بیم تصور کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ سے
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
غالب ایک محرمِ حقیقت کی حیثیت سے پتہ دیتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصودِ حقیقی عارضی
ں کے سراب سے گذر کر مسرت دوام حاصل کرنا ہے ع
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
ی کا نام حیاتِ جاوید ہے اور اسی کو ہندو فلسفی واصل حق ہونا یا نروان کا حصول کہتے ہیں۔ مرزا
حقائق سے بدرجۂ اتم واقف تھا کہ
حال و قالی از ورائے حال و قال غرق گشتہ در جمالِ ذوالجلال

غرقۂ نے کہ خلاصی باشد شش — یا بجز دریا کسے بشناسد ش

اسی لئے کہا گیا ہے ؎

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہوجائے — کام اچھا ہے وہی جسکا مآل اچھا ہے

اس لافانی سکون و مسرت کے حصول کے جو وسائل و ذرائع مرزا نے بتلائے ہیں اُن میں سے ایک ترک لذات ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی پر ناقدانہ نظر کرکے شاعر نے جو ناخوشگوار تجربہ اخذ کیا اس نے اس کے عقائد میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ع

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو اُس پر رازِ حقیقت کا انکشاف ہوئے بغیر نہ رہا اور اس معرفت آشنا نے بگویم مشکل وگرنہ گویم مشکل جدوجہد پر غالب آکر کہہ ہی دیا ؎

ترکِ لذت بھی نہیں لذت سے کم — کچھ مزا اس کا بھی چکھنا چاہیئے۔

تجوک اور مَل کا بھی یہی مذہب ہے۔ انگریزی کا مشہور شاعر لانگ فیلو دامنِ زندگی کو تمام دکھ سے لبریز پاتا ہے۔ لیکن براؤننگ اور غالب اُسے تمام مسرتوں سے عاری دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے کچھ خوبصورتی نہیں اور نہ کوئی دلکشی ہے۔ اول الذکر کی طرح آخرالذکر بھی ہمت و استقلال کے ساتھ زندگی سے عمر بسر کرنے کے حامی ہیں۔ لیکن ان کے عقائد میں بڑا فرق ہے۔ خدا[ملا] کا توکل تو سبھی کو ہے لیکن ... کی بزرگی یہ ہے کہ اُس نے تلاشِ حق کا صحیح راستہ دریافت کرکے اس کا احساس کیا ہے اور ہر دو حرف مغرب دائرۂ عقیدت سے باہر نہ نکل سکے۔

غالب اور براؤننگ دونوں کے لئے دنیا مصائب اور کلفتوں کی دنیا ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بھی ان آفات و صعوبات سے ہراسان و نڈھال ہوکر جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں بھٹکا۔ براؤننگ کو ہمتِ مرداں کا خیال ہے:۔

Bear the brunt, in a minute pay glad life's arrears,

of pain, darkness and cold." (Prospice)

Then, welcome each rebuff

That turns earth's smoothness rough.

Each sting that bids nor sit nor stand but go,

[ملا] براؤننگ کا نٹ کے نظریہ کا مرید ہے۔ "Trust God" "God is in heaven"

یہی کلمات غالب کے بھی وردِ زبان ہیں۔ ع گر کوئی نہیں ہے تو مری جان خدا ہے۔

Be our joys three parts pain:

(Rabbi Ben Ezr

ں حیات کے مصائب برداشت کرو، اور ایک ہی لمحہ میں رہی سہی دشواریوں کا قرض بڑھنے
ے بیباق کرو)

راستے کے ہر اس روڑے کا خیر مقدم کرو جو ہموار سطح زمین کو دشوار گذار بنا دے اور ہر اُس چٹکی
ٹھنا بیٹھنا محال کردے۔ کاش ہماری تکالیف مسرتوں سے سہ چند ہوتیں۔)

ول غالب :-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
م نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں
نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ع سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

غالب کا مقولہ ہے کہ

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یہاں مرزا نے ایک ایسی زبردست حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس کی مثال براؤننگ کے یہاں
یں ہے۔ غالب کا فلسفہ ہرزہ سرائی سے قطعاً پاک و مبرا ہے۔ دخت رز کی مدح سرائی میں وہ
اور حافظ کا ہم پلہ ہے۔ مگر ع

بہ ہر قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

یہاں شرابخوری اس لئے روا نہیں کہ وہ "دارو ئے اندوہ ربا" ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بیخودی کی کیفیت
ں کر دیتی ہے اور بیخودی قطرہ کو واصل دریا کر دیتی ہے، چنانچہ کہا بھی ہے کہ "بزم قدح سے عیش
نہ رکھ" نشے پرستی و بادہ خواری کے باوجود بھی مرزا کی طبیعت اتنی بے لوث ہے کہ اس کے دامن
ں پر اس نجس چیز کا ایک بھی دھبہ نظر نہیں آتا۔

وجودِ عالم کی طرح اُسے فردوس و عدم سے بھی انحراف ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم

یہ کرم کی فلاسفی ہی کا نتیجہ ہے جو غالب جنت و عدم کے وجود سے منحرف ہے۔
میر نے تو ترکِ اسلام ہی پر قناعت کی تھی مگر مرزا کو بھی دیکھئے ع

نہ حشر و نشر کا قائل نہ دین و ملت کا

وہ موحد ہے اور اس کا کیش ترکِ رسوم ہے اور حقیقت میں ہونا بھی یہی چاہیئے۔ کیونکہ ع

عاشقاں را مذہب و دیں نیستی

نیز ؎ مردِ خدا زاں سوئے کفر است و دیں — مردِ خدا را چہ خطا و صواب

مرزا کا ایمان وفاداری و استواری کے مقدس جذبہ میں مستور ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

متذکرہ شعر کو پڑھکر گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے گیتا کی تعلیم کی مستغنی عن التعریف تشریح کر دی ہے۔ خدا کی بندگی اس کے نزدیک بے وقعت و فضول مشغلہ میں تضیع اوقات کرنے کے سوا اور کچھ نہیں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پھر ع ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

ہاں خداوندِ بے نیاز کی بے غرض عبادت میں کوئی مضائقہ نہیں ؎

گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

مخلصانہ و بے غرضانہ اپنے فرائض کی تکمیل کرنا ہی حقیقی مذہب ہے جس پر خیرِ عالم کا صحیح معنوں انحصار ہے۔ بقول ملٹن

"They also serve who only stand and wait"

(J. Milton, on his blindness.)

(وہ بھی اس احکم الحاکمین کے وفادار خدام ہیں جو انتظار کی خاموش گھڑیاں صبر و سکون کے ساتھ گذار دیتے ہیں۔)

شہور جرمن فیلسوف کانٹ بھی تکمیل فرائض کو زندگی کا اہم ترین پہلو تصور کرتا ہے اور ادائگی
بحیثیت فرض" پر زور دیتے ہوئے اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ "God is Love"
ت مجسم ہے۔ مگر غالب کے یہاں ایسی بات ہونا محال ہے، اُس نے ہندوؤں کے بے عدیل
فلسفے سے استفادہ کیا ہے جہاں بھگوان کو بھی پریم کے بس میں بے بس مانا گیا ہے۔ گوسائیں
اس جی کی شہرہ آفاق تصنیف اسی پریم چرچا سے پُر ہے۔ غالب کو اسکا بھی وقوف تھا یعنی یہ کہ

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں سازسے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

کے بعض معتقدات بظاہر اسلام کے منافی ہیں لیکن اس نے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں
ب و پیش نہیں کیا۔ اسلام نے قدم قدم پر جنت کا لالچ دیا ہے مگر غالب پکار رہا ہے سہ

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

الغرض غالب بادۂ حب وطن سے سرشار، تعمیرِ قوم، مذہبی رواداری اور آزادیِ ملک کے دردسو
ب نوجوانوں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے :-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ! میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے!!

د، وہی لگن اور وہی اضطراب جو گریبالڈی کو خدمتِ وطن کے لئے اُبھار رہا ہے۔ وہی جوش اور
یہ جس نے نپولین، جون آف آرک، پرتاپ، ٹیپو، ناناؔ اور لکشمی بائی کو حیاتِ دوام بخشی اور
یہی تا ابد اسی طرح بروئے کار رہے گا۔ غالب کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔ اگر ایک
التزام ہے تو دوسری طرف خود حقیقت بے نقاب ہو کر چشمِ حقیقت بیں کو دعوتِ نظارہ دے
ہے۔ درایں صورت اگر دیوانِ غالب کو ایک الہامی کتاب کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔

'زمانہ' اگست ۱۹۳۱ء

مرزا غالب اور دیگر شعرا

(از جناب طالب کاشمیری)

مرزا غالب کے کلام پر بیشمار مضامین لکھے گئے ہیں، ان کے دیوان کی بیسیوں شرحیں ملک میں موجود ہیں، ان کی شاعری کے محاسن و معائب پر طویل تحریریں شائع ہوئیں۔ مداح اہل ادب نے ایک ایک شعر کی شرح کرتے ہوئے بال کی کھال نکالی حتیٰ کہ بعض علم دوست اور باریک بیں احباب نے مرزا کے اصلی خیالات و جذبات اور معانیِ اشعار کو بہت بڑھا دیا اور بخلاف اس کے ان کے کمالِ فن سے انکار کرنے والوں نے ان کی معمولی لغزش کو مبالغہ آمیز اور رنگین پیرائے میں نمایاں کیا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے طالبانِ ذوق، نقادانِ فن اور شعر و سخن سے ہر قسم کے مطالب پیدا کر لینے والے تشنہ لب ہیں، اور مرزا کے کلام کی باریکیوں کو پورے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یا دل کھول کر اس پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے مزید سامان بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا کا کلام بحیثیت مجموعی قابلِ قدر ہے بعض صورتوں میں بے نظیر ہے ان کی جدتِ موضوع، تنوعِ مضامین، زورِ تخیل فلسفہ تصوف اور دیگر محاسنِ کلام ہر شاعر کے لئے باعثِ رشک خصوصیات ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے ابھی تک مرزا کی شاعری کے متعلق بعض امور کی طرف اہل قلم کا ذہن پورے طور پر منتقل نہیں ہوا ہے مثلاً اس امر کے متعلق کہ مرزا نے دیگر شعرا کے کلام سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ یا یہ کہ دیگر شعرا نے ان سے اکتسابِ فیض میں کس قدر حصہ لیا ہے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان امور کے علاوہ مرزا کے کلام میں تکرارِ مضمون کا عیب بھی موجود ہے۔ آج ہم ان کے عام محاسن و معائب سے قطع نظر کر کے متذکرہ صدر خصوصیات پر ایک غیر جانبدارانہ سرسری نظر ڈالتے ہیں، اس سے ہماری مراد نہ بیجا نکتہ چینی ہے نہ بلاوجہ مدح سرائی یا طرفداری۔ کوئی صاحبِ عقل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ بقول الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مرزا سہو و خطا سے بالکل مبرا تھے یا یہ کہ ان کے کلام میں بمقابلہ دیگر مستند اور ہر دلعزیز شعرا کے زیادہ عیوب پائے جاتے ہیں۔ نہیں! ہرگز نہیں!! متقدمین متاخرین میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے اپنے پیشرو اور ہمعصر اساتذہ کے دواوین اور تصانیف

یض نہ حاصل کیا ہو (جس طرح بعد میں آنیوالے شعراء نے خود مرزا کے کلام سے فائدہ اُٹھایا) یا ان کے یہاں
مضمون کسی نہ کسی صورت میں مکرر نہ بندھا ہو۔ اس تحریر سے فقط یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرزا جیسے مسلم الثبوت
اور نازک خیال شاعر بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں۔

مرزا نے متقدمین اور ہمعصر شعراء کے بعض خیالات و مضامین اپنے کلام میں اس طرح جذب کئے
ہیں کہ عام لوگ جن کا مطالعہ وسیع نہیں، ان کو مرزا کے زورِ تخیل ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور عش عش کرتے
رہ جاتے ہیں، حالانکہ بعض موقعوں پر وہ سرقہ کے الزام سے بھی نہیں بچ سکتے، بعض اشعار میں توارد
واقع ہوا ہے، بعض ترجمے کے تحت میں آجاتے ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جن کا مضمون تو انھوں نے
کسی اور شاعر سے لیا ہے مگر اپنے اسلوب بیان اور مخصوص طرزِ میں ادا کر کے اس کو بلند تر کر دیا ہے، یا بیان
میں شوخی اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں ہم اس قسم کے اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان خصوصیات
کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

فارسی کے ایک شاعر میر عبداللہ تیاری کا شعر ہے ؎

بیم از وفا ماربود وعدۂ کرمن   از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

مرزا کہتے ہیں ؎

ترے وعدہ پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مرنہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شعر قریب قریب مندرجۂ بالا فارسی شعر کا ترجمہ ہے، لیکن مرزا نے اپنے شعر میں مقابلتہً زور پیدا کیا ہے
میر تقی میر کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دم کے جانے کا نہایت غم رہا

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر یہی مضمون بالفاظ دیگر ادا کرتا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی   دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

ان دو شعروں کے مطلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں، مرزا کا انداز اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن
میر کا شعر زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔

مصطفےٰ علی خاں خوشدل کا شعر ہے ؎

بوسم من بے برگ ونوا برگ حنا را   تا بوسہ بہ پیغام دہم آں کفِ پا را

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا مضمون اس کے ساتھ لڑ گیا ہے ؎

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا   کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ذوق کا شعر ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مرزا کہتے ہیں ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

ان دو اشعار کے مضمون میں زیادہ بایک فرق نہیں، بلکہ ذوق کا شعر مقابلتاً بہتر ہے۔

مرزا سوداؔ کے ایک ہمعصر نوجوان شاعر کا شعر ہے ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مرزا کے ذہن میں اس شعر کی کیفیت سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی رنگ ان کے اس شعر سے ٹپکتا ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مرزا کا شعر مذکورہ بالا شعر کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے۔

انشاءؔ کی مشہور غزل کا شعر ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دونوں شعر اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اگرچہ مضمون واحد ہے۔ اس کو توارد سے منسوب کر سکتے ہیں

ذوق فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرزا نے یہی مضمون ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

یہ لاش بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نظیری کہتے ہیں ؎

تشا طِ رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم	کہ بہ معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

مرزا اسی مضمون کو خفیف سے فرق کے ساتھ یوں باندھتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے	متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

میر تقی میر کہہ گئے ہیں ؎

نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب	نہ تھا چشمِ تر سے خونِ ناب

مرزا کا شعر اسی خیال کو یوں پیش کرتا ہے ؎

جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا	جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

ذوق کا ایک اور شعر ہے ؎

کیا اعتبارِ ہستی ناپائدار کا	چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مرزا نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے[1] ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل	گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

ز ضعفِ تن عجب حال است بیمارِ محبت را	کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ منت را

مرزا تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُردو میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود	قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

ذوق فرماتے ہیں ؎

جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانے کی فکر میں	محفل میں اس کی کیا کوئی چوسر کا رنگ ہوں

مرزا نے دوسرے رنگ میں اسی مطلب کو بیان کیا ہے ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے	لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

فارسی کا ایک شعر ہے ؎

تو ملولی ز ما و ما مشتاق	دل بدل میرود چہ حال است ایں

مرزا کہتے ہیں ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

---

[1] یہ شعر غالب کے کلامِ مطبوعہ میں نہیں ہے (زمانہ)
[2] ذوق و غالب ہمعصر تھے لہٰذا ان پر سرقہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ (زمانہ)

یہ شعر فارسی شعر کا ترجمہ ہے، جو خفیف سا فرق مصرعۂ ثانی میں باعتبار معنی پایا جاتا ہے، بحر کی پابندی اور ترجمے کی قید سے لازمی تھا۔

مثنوی بدماوت میں عبرت کا ایک شعر ہے ؎

نزاکت سے شکم میں بچہ اُس کا ۔۔۔ نظر آوے تھا جوں مینا میں صہبا

مرزا نے اس مضمون کو لے کر فارسی میں اس طرح باندھا ہے ؎

چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت ۔۔۔ آید بنظر بچۂ او از شکم او

عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

کے لازم است بادہ کشیدن ز جام زر ۔۔۔ مقصود تو گرا نیست قصورِ سفال چیست

مرزا کا شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ۔۔۔ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

مرزا کا یہ شعر مشہور ہے اور عرفی کے شعر کے مقابلے میں زوردار بھی ہے۔ لیکن مضمون اس پر بھی ان کا نہیں ہے۔

فسونی تبریزی کا شعر ہے ؎

بادہ چو میرسم آسودہ می شوم از دور ۔۔۔ ندیدہ حال مرا وقتِ بیقراری حیف

مرزا کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر مرزا کے بلکہ اُردو زبان کے بہترین اشعار میں سے سمجھا جاتا ہے اور فی الواقع ہے بھی خوب، لیکن اس میں بھی سوائے زبان اور بندش کے مرزا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

حسن بیگ رفیع کا ایک شعر سنئے ؎

خوش ملازمیں کہ با و نامہ نویسم شب و روز ۔۔۔ مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد

مرزا ہو بہو اُردو میں کہتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔۔۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مضمون یکساں ہے اور طرز بیان میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔

عرفی شیرازی کا ایک اور شعر ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید ۔۔۔ ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ عرفی کا یہی شعر ہے ؎

پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار ‌ رکھ دے کوئی پیانۂ و صہبا مرے آگے

عاقل خاں رازی کہتے ہیں ؎

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا ‌ اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ‌ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر بھی قریب قریب فارسی شعر کا ترجمہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مرزا کے شعر میں اندازِ بیان نے جان ڈال دی ہے۔

متاخرین ایران میں سے کسی کا شعر ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست ‌ چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

مرزا کا مندرجۂ ذیل شعر اسی مطلب کو برنگِ دیگر ادا کرتا ہے ؎

زمانہ عہد میں اُسکے ہے محو آرائش ‌ بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ممنون کہتے ہیں ؎

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون ‌ وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مرزا نے یہی مضمون اپنے کلام میں اس طرح داخل کیا ہے ؎

ترے سرو قامت سے اِک قدِ آدم ‌ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

ذوق کا ایک نہایت مشہور شعر جس کی مرزا بھی خود بڑی تعریف کیا کرتے تھے، یہ ہے۔ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے ‌ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مرزا نے اپنے الفاظ میں اسی خیال کو جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی ہے ؎

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا ‌ لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

گفتم بگو نہ کشتی و زندہ میکنی ‌ از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد

مرزا یہی مضمون یوں باندھتے ہیں ؎

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ ‌ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

فیضی کہتے ہیں ؎

نوشدارو ئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست   سودۂ الماس در زہر ہلاہل میکنند

مرزا ہو بہو اردو میں اسی کا ترجمہ یوں پیش کرتے ہیں ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا   کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

شرف قزوینی کا شعر دیکھئے ؎

بست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا   چوں باین تقریب من آرد بیاد او مرا

مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر کا ماخذ یہی فارسی شعر ہے، جو مقابلۃً زیادہ واضح ہے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ   ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے[۱]

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود   خوش بود گردانہ نبود دام را

مرزا کا یہ شعر اسی فارسی شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مرزا کے فارسی کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں جن کا تذکرہ بطورِ خود ایک علٰحدہ مضمون چاہتا ہے۔ ہم اس سلسلہ کو یہاں بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر ایک دو شعر نذرِ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل   کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

مرزا کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

مرزا کے مصرعۂ ثانی میں بجائے اس کے کہ سبکسارانِ ساحل کو حال معلوم نہیں انھیں مشکلات اور خطرات کا بیان پایا جاتا ہے جن کا ذکر دونوں شاعروں کے مصرعۂ اول میں موجود ہے۔

خواجہ حافظ کے اور دو شعر مختلف بحروں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید   از شافعی مپرسید امثال ایں مسائل

راز درون پردہ ز رندانِ مست پرس   کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

---

[۱] مرزا نے اسی مضمون کو دوسرے رخ سے بھی کہا ہے ؎

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں   غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں   (زمانہ)

رزا نے اپنی دو شعروں کے مضمون کو ایک کر کے دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است — بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

اس میں کلام نہیں کہ مرزا نے یہ شعر اختصار اور خوبی کے ساتھ بہتر الفاظ میں لکھا ہے، ناظرین خود
س فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ مرزا کے کلام سے کن شاعروں نے خیالات اور مضامین اخذ کئے ہیں اس کے متعلق
نا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ ان کی تعداد بے انتہا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کے وہ تمام شاعر
رشاعری میں نام پیدا کر گئے اور خاص کر غزل گوئی میں شہرہ آفاق ہوئے کم و بیش مرزا سے استفادہ کرنے
ں بے نیاز نہیں رہے اور بلا واسطہ و یا بواسطہ مستفیض ہوئے۔ اگر ان تمام اشعار کا ذکر کیا جائے
دیقیناً ہمارا مضمون ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کرے گا۔ لہذا ہم نمونے کے طور پر فقط انہی چند
شعراء کا حوالہ دیں گے جن کے اشعار ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

مرزا کا مشہور شعر ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نا علی خاں نثار مرزا کا یہ شعر تقریباً لفظ بہ لفظ یوں چرا لیتے ہیں ؎

مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے — کوئی پوچھے یہ گفت گو کیا ہے

سرقہ ظاہر کی اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟

مرزا ؎

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ومن خاں مومن کے مندرجہ ذیل شعر کا ماخذ مرزا کا یہی شعر ہے[1] ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مرزا ؎

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

ولانا حسرت موہانی نے اس سے ایک باریک اور عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ؎

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ چاہتے تھے کہ دیکھے کوئی ادا میری

رشد دہلوی کا مندرجہ ذیل شعر بھی مرزا کے اسی شعر سے ماخوذ ہے ؎

---

[1] دونوں معاصر تھے اس لئے سرقہ و اخذ کے بجائے توارد کا محل ہے۔ (زمانہ)

حسن اُن کا تاب سوزِ نگاہ اپنی ناتواں — وہ بے حجابیوں پہ بھی ہیں سو حجاب میں

مرزا: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ارمان دہلوی نے یہی مضمون یوں باندھا ہے

نکالے کیا گئے ان کے مکاں سے — زمیں پر گر پڑے ہم آسماں سے

مرزا: وہ آیا انجمن میں پھر نہ کہیو کہ غافل تھے — شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

سالک نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

وہ زیبِ شبستاں ہوا چاہتا ہے — یہ مجمع پریشاں ہوا چاہتا ہے

مولانا حالی نے بھی استاد کا یہ مضمون اپنے ایک شعر میں داخل کیا ہے

دل چاہتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر — وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

مرزا: حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

مولانا حالی نے بالکل یہی مضمون دو شعروں میں باندھا ہے

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے — پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور بکبک کے جائیگا مفت — اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

مرزا: قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے — اس کی خطا نہیں تھی یہ میرا قصور تھا

عالیجاہ نظام آصف نے یہی مضمون اپنے شعر میں جلوہ گر کیا ہے

ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے — یہ خطاوار تھا قاصد تو خطاوار نہ تھا

مرزا: شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر مرزا کے شعر سے کتنا مشابہ ہے

شوق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے — مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

مرزا: تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا کہ لالہ سری رام ایم۔اے دہلوی مرحوم مؤلف "خمخانۂ جاوید" بغرضِ سیر و تفریح کشمیر تشریف لائے تھے۔ اس تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا، منجملہ دیگر شعرا کے منشی سراج الدین احمد خاں صاحب نے ایک غیر طرحی غزل پڑھ کر سنائی، اس کا ایک شعر جس کو حاضرینِ جلسہ نے داد دی تھی مرزا کے اسی شعر کا چربہ ہے

دکھائی ایسی ہمدردی کہ بے کھٹکے رقیب اپنے — سنا دی داستاں اپنی سمجھ کر رازداں مجھ کو

رزا ؎ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی   کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

ور خاں غافل نے یہی خیال یوں ظاہر کیا ہے ؎

گرم بازاریِ الفت ہے مجھی سے ورنہ   کوئی لینے کا نہیں نام وفا میرے بعد

رزا ؎ مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

خبار "شاعر" آگرہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء میں لالہ گورچرن لال صاحب نامی کی ایک طرحی غزل نظر
ے گزری جس کا یہ شعر مرزا کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

کچھ بے طرح سے آج تو لطفِ خمار ہے   ساقی نے جانے کیا ہے ملایا شراب میں

رزا ؎ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کبر الہ آبادی کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی شعر کی جھلک پائی جاتی ہے اگرچہ دونوں کے مفہوم
یں فرق ہے ؎

میرے سکوت سے مجھے ناداں نہ جانیے   الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

مرزا ؎ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی   سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

حالی اسی مضمون کو لیکر اپنی نظم موسوم بہ "عرضِ حال بجناب رسول صلعم" میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ
یوں لکھتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے   اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مرزا ؎ پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا   اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ڈاکٹر اقبال کی قابلِ قدر نظم "نوائے غم" کا پہلا شعر مرزا کے اسی شعر کا مولود ہے بلکہ ساری نظم کا محرک
یہی شعر کہا جا سکتا ہے ؎

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش   جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

مرزا ؎ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

حالی نے یہ مضمون مرزا سے لیا ہے، اور کسی قدر پہلو بدل کر یوں بیان کیا ہے ؎

دل نہ طاعت میں لگا تب تو لگایا غمِ عشق   کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

مرزا ؎ ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود   قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

مومن نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو   ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

آرشد دہلوی نے بھی یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا — جان اٹکی ہے نفس کے تار سے

راقم مضمون ہذا کا ایک شعر ہے ؎

خواہش سجدہ ہے سنگِ آستانِ یار پہ — پھوڑنا سر کا ہے گویا نقشِ پیشانی مجھے

اپنے استاد نامدار قبلہ علامہ کیفی دہلوی کے سمجھانے سے ہمیں یہ ماننا پڑا کہ یہ شعر مرزا کے مندرجہ ذیل شعر سے لڑ گیا ہے۔ بلکہ یہ کہ یہی مضمون شعر کہتے وقت غالباً ہمارے ذہن میں جاگیر تھا ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہمارا ایک اور شعر ہے ؎

ہے اضطرابِ شوق نقابِ رخِ امید — تا نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں

اپنے ایک سخن فہم دوست نے ہمیں مرزا کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ ہمارے شعر کا مضمون دراصل مرزا کا ہے ہمارا نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں ؎

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

مرزا ؎ ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

امیر مینائی نے مرزا کے اس مضمون کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگا ہے کہ سطحی نظر سے کام لینے والے احباب اس کو امیر کا ہی مضمون سمجھیں گے ؎

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپ کا — دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

یہ شعر واقعی مرزا کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔

مرزا ؎ وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

حالی یہی خیال دوسری صورت میں یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

عجب وعدہ ہے بارِ عام ان کے در پر — مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

مرزا ؎ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

اقبال نے مرزا سے یہ مضمون لیکر ذرا سی تبدیلی کرکے اسمیں جدت پیدا کی ہے ؎

ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا — خود وہ اٹھکر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

اب ہم ان اشعار کا ذکر کریں گے۔ جنمیں مرزا کے یہاں تکرار پائی جاتی ہے۔ اس نقص سے بھی غالباً کسی شاعر کا کلام مبرا نہیں، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بعضوں کے یہاں کم اور بعضوں کے

یہاں زیادہ ہے۔ اصطلاح شعراء میں اسے "تمنا" کہتے ہیں۔ محققین کے نزدیک اس کا کچھ مضائقہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تکرار سے مضمون میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا کے کلام میں جو اشعار ایسے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون مرزا نے فارسی میں بھی باندھا ہے ؎

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

یہی مضمون دوسرے رنگ میں یوں جلوہ گر ہے ؎

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

یہی مضمون بالفاظِ دیگر ملاحظہ ہو ؎

رفو نے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

یہی مضمون ذیل کے شعر میں ہو بہو اس طرح باندھا گیا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

یہی خیال اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یہی مضمون معنی میں کسی قدر تخفیف کے ساتھ یوں لکھتے ہیں ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہی خیال مرزا کے مندرجۂ ذیل شعر سے مترشح ہوتا ہے ؎

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں ملاحظہ فرمائیے ؎

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہی مضمون مرزا کے مندرجۂ ذیل چار اشعار میں پایا جاتا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

اِس آخری شعر میں کسی قدر وسعتِ معنی پیدا کر دی گئی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس کا مضمون مصرعۂ اول میں معنی کا پہلو بدل کر یوں ادا کیا گیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ — یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

ہو بہو یہی مضمون ذیل کے شعر میں دہرایا گیا ہے، بلکہ الفاظ میں بھی نمایاں فرق نہیں ؎

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

ذیل کا شعر بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، البتہ اسکے معنی میں وسعت پیدا کی گئی ہے ؎

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو — شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

اسی مضمون کو دوسرے شعر میں دیکھیے ؎

ہے پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

یہی مضمون بصورتِ دیگر مکرر بندھ گیا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

قریب قریب یہی مضمون برنگ دیگر یوں پیش کیا گیا ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　　مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ذیل کی رباعی اسی مضمون کو دوبارہ پیش کرتی ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　سُن سُن کے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

یہی خیال ذیل کے شعر میں دوبارہ جلوہ گر ہوا ہے ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے　　　مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

ہم بخوفِ طوالت اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں، لیکن معزز ناظرین سے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرزا کے وقت میں شاعری جس قسم کی تھی وہ سرقے یا توارد سے بچ نہیں سکتی تھی[۱] اس لئے اس مضمون کے لکھنے کی غرض غالب یا دوسرے شعراء پر نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ عوام کی واقفیت کے لئے اسکو لکھا گیا ہے۔

---

[۱] سرقہ و توارد کی بحث میں ہمارے کرم دوست حکیم خلیق صاحب لکھنوی کا مضمون مطبوعہ زمانہ بابتہ مارچ ۱۹۳۱ء ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون اس بحث کے متعلق ایک فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (زمانہ)

(زمانہ جون ۱۹۳۱ء)

براؤننگ اور غالب

(از سید مقبول حسن احمد پوری۔ بی۔ اے۔)

اشعار کا مطالعہ عموماً تفریحِ طبع کے لئے کیا جاتا ہے مگر طبائع کے میلان کا انحصار سوسائٹی پر ہے اور سوسائٹی کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی۔ کبھی وہ تمدنِ ہند کی صورت میں روحانیت کے ساتھ تماشا ظاہر کرتی ہے کبھی عقلِ یونان کی ہیئت میں تخئیل و تمثیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کبھی تمدنِ اسلام کی برکت سے وہ حریت و اخوت کی علمبرداری کرتی ہے۔ کبھی مادیت سے ملوث ہو کر ہر چیز میں فائدے کا پہلو مدِ نظر ہوتا ہے۔ نوعِ انسان کے دماغ میں یہ باتیں نسلاً بعد نسل جاگزیں ہو کر تخئیل کا جزو لاینفک ہو جایا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ دماغی تفریح پر بھی ان باتوں کا اثر پڑنے لگتا ہے۔ مثلاً عہدِ حال میں تفریح میں بھی فائدہ حاصل کرنے کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

سوسائٹی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو ان قوموں سے متعلق ہے جن پر ابھی لفظ سوسائٹی کا اطلاق کم از کم اہلِ مغرب کے نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا۔ ہم ہندوستانی بھی انہیں اقوام کے زمرے میں شامل ہیں جو ابھی تک اسی پرانے خدا کی خدائی کے قائل ہیں جس کو اہلِ مغرب نے آثارِ قدیمہ میں شمار کر کے صرف روایات تک محدود کر رکھا ہے۔ شکر ہے کہ ہماری سوسائٹی نے اس معاملہ میں بہت زیادہ ترقی نہیں کی۔ اسی لئے اگر ہم کو خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی خاص شان نظر آتی ہے تو ہمارا خیال فوراً صانعِ حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

غرض ہماری تفریحِ طبع یا تو حقیقت پر مبنی ہے یا ایسے مجاز پر جو حقیقت نما ہوتا ہے چنانچہ ہماری شاعری میں بھی یا تو اسرار و معارف ہیں یا گل و بلبل اور خط و خال سے متعلق خیالات لیکن یہ بھی اسرارِ حقیقی سے الگ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں خسرو کی ایک غزل کے چند اشعار کافی ہوں گے ؎

اے ز خیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد — یا صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد

کنگرِ کبریائے تو ہست فراز لامکاں — طائرِ مادراں ہوا بے پر و بال کے رسد

بر درِ بے نیازیت صد چو حسینِ کربلا — تشنہ بماند و ر گفتہ تا بہ زلال کے رسد

ہست بہ تختگاہِ دل جلوۂ رب روز و شب — لیک بجلوۂ چناں چشم خیال کے رسد

آیتِ رحمت از حرم بست برائے حاجیاں   خسروِ بت پرست را جز خط و خال کے رسد

ان دو شاعرانہ پہلوؤں کے علاوہ ابھی تک فلسفہ اور افادیت کے خیالات صرف چند شعرا کے کلام تک ودرہے، مثلاً ایران میں نظیری اور سعدی اور ہندوستان میں غالب و حالی اس سلسلے میں راقم الحروف ائے میں تو یہی ہے کہ غالب کا مقابلہ شعرائے مغرب میں ابھی تک کوئی نہیں کرسکا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غالب ائے مغرب سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انگریزی شاعر براؤننگ کے خیالات غالب سے ملتے جلتے ہیں عض جگہ غالب براؤننگ سے آگے نکل گئے ہیں تاہم براؤننگ کو انگلستان کا غالب کہنا نامناسب نہ ہوگا۔

یہاں بے جا نہ ہوگا اگر براؤننگ کی چند ایسی خصوصیات پر نظر ڈالی جائے جو غالب سے ملتی جلتی ہیں۔ ول ڈاکٹر "برڈ" صاحب جو لوگ براؤننگ کے کلام کا مطالعہ محض تفریحِ طبع کیلئے کرتے ہیں انکو عموماً خوشی ہوتی ہے کیونکہ براؤننگ کے اشعار اس شخص کو کبھی بھلے نہ معلوم ہونگے جو دماغ پر زور دینے کے خوگر نہیں۔ مگر براؤننگ ے وہ شخص ضرور مستفید ہوسکتا ہے جو ان کے کلام کو ایک بار تفریحاً پڑھے اور دوسری مرتبہ استفادہ حاصل رنے کے لئے غور سے پڑھے۔ پھر تیسری مرتبہ اس کو عقل و بصیرت حاصل کرنے کے لئے دیکھے۔ چوتھی بار پڑھے ہر شخص براؤننگ کا ہم خیال و معتقد ہوجائے گا۔ غالب کے کلام کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر برڈ نے یہاں تک لکھا ہے کہ جو طالب علم براؤننگ کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اپنی محنت سے ہزار چند فائدہ اٹھائے گا۔

رض اہل مغرب کے خیال کے مطابق براؤننگ کا کلام تخیلِ انسانی و دقیق مسائل سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری سے وہی لوگ لطف اندوز ہوسکتے ہیں جو اپنے تخئیل کی ترتیب پر قادر ہونے کے علاوہ س کو عملی جامہ پہنانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ براؤننگ کی تلقین یہ ہے کہ پہلے آنکھیں کھول کر ور سے دیکھو اس کے بعد زبان کھولو۔ شاید اسی فلسفیانہ نصیحت سے متاثر ہوکر ڈاکٹر فرنوال نے براؤننگ ی بابت کہا ہے کہ وہ ایک جوانمرد، بہادر، زندہ دل اور عمیق خیالات رکھنے والا شاعر ہے جس کے لام کا مطالعہ ہر صاحبِ فہم و بصیرت کے لئے ضروری ہے۔"

غالب کی طرح براؤننگ نے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کو خوش کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا، اس کا مسلک ہ زمانۂ ماضی کو بھلا دینا چاہئیے اور حال کی پیچیدگیوں سے بھی بالاتر رہنا چاہئیے لیکن آئندہ کا خیال ری ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"ہماری کیا حالت ہوگی، ہمارا مذہب، ہمارا اخلاق، ہماری تصانیف، ہمارے بچوں کی تعلیم اور ہمارے قوانین ہمیں کس طرف لئے جارہے ہیں اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ یہ فکر ہمارے لئے ضروری ہے۔"

سلک کو براؤننگ نے اپنی شاعری میں خاص طور پر مدنظر رکھا ہے، چنانچہ اپنی مشہور نظم گرامیرینس فیونرل

میں لکھتا ہے :۔

"کم ظرف آدمی جو کچھ تھوڑا بہت کرنا چاہتا ہے کر دکھاتا ہے، عالی ظرف آدمی کی بڑی تمنائیں ہوتی ہیں مگر وہ ان کے پورا ہونے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ معمولی آدمی ایک ایک کر کے جوڑتا رہتا ہے اور اس کے سَو بہت جلد ہو جاتے ہیں۔ لیکن بلند حوصلہ آدمی کے نتیئے جو ایک کروڑ تک پہنچنے کی آرزو رکھتا ہے۔ اکائی کی کمی رہ جانا تعجب کی بات نہیں۔"

غالب نے اس شرح و بسط کے ساتھ کبھی اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے، وہ اسی بات کو رمز کے رنگ میں مجمل طور پر اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　　حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اسی مطلب کو مصرعۂ ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے"

براؤننگ نے ارتقاے روحانی کے حدود پر بہت کچھ خیال آرائی کی ہے، غالب اُس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

براؤننگ کہتا ہے "شکوک سے دل کو خوشی حاصل ہونی چاہیئے کیونکہ ان سے تلاش و تجسس کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے" اسی اعتبار سے ہر حجاب پردۂ ساز ہے کیونکہ حجاب ہی ذریعۂ انکشاف اور حجاب ہی سعی و کوشش کا باعث ہے۔ اس خیال کی مزید تشریح براؤننگ نے اپنی نظم "ربی بن عزرا" میں اس طرح کی ہے :۔

۔ "میں جو ہونا چاہتا تھا　　　اور نہ ہو سکا　　　(یہی) میرے اطمینان کا باعث ہے"

لیکن اس سے مطلب یہ نہیں کہ سعی کو چھوڑ دیا جائے۔ غالب کا شعر ہے ؎

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز　　　ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

کیونکہ اگر وہ گرہ کٹھن ہے تو اس کے کھولنے میں کوشش بلیغ کے علاوہ غیر معمولی قوتِ ارادی بھی ضرور ہوگی۔ بالفاظ دیگر جتنا گہرا حجاب ہوگا اتنا ہی زیادہ انکشاف کا ذوق ہوگا۔ مگر اولوالعزمی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کام کو ادھورا نہ چھوڑا جائے۔ "گرہ نیم باز" کا قرض ادا ہو جانا چاہیئے، ناخن کو خواہ قرضدار ہونا چاہیئے کیونکہ "کام گر رُک گیا روا نہ ہوا" اس لئے براؤننگ کے گریمیرین نے مرتے دم تک قواعد کو حل کئے کہ یہاں جو ہو سکے ہو جائے باقی جو کچھ رہ جائے گا دوسری زندگی میں ہوگا۔ غالب بھی

یالات سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:-

بقدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی　　جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی　　عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

دنیوی حجابات کو براؤننگ (Limitations) کہتا ہے جن کے دُور کرنے کی براؤننگ یہ
یپ ترکیب بتاتا ہے کہ وقت کا پہیا گھومے یا رک جائے مگر خیالات کو کبھی محدود نہ ہونے دو۔
ہار (خالق) اور مٹی (مخلوق) پر وقت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ (ربی بن عذرا) نیز یہ کہ "دماغی توہمات
ا (جو تخیل کی تکمیل میں سدِ راہ ہوتے ہیں) بہادری سے مقابلہ کرکے ان کو شکست دو (کیونکہ زندگی
اوہ حصہ جس کے لئے یہ (یعنی موجودہ حصہ) بنا ہے ابھی آنے کو ہے۔ خدا نے تو ہمیں مکمل بنایا ہے
ور ہماری موجودہ ہستی، ہماری زندگی کا صرف ایک ادنیٰ جزو ہے۔ بقول میر تقی

"یعنی آگے چلیں گے دم لے کر"

کمیل کی آرزو کو مستحکم کرنے اور آگے چلنے کے لئے تیار رہنے کے متعلق غالب کا خیال ہے کہ

"دیتے ہیں ظرفِ بادہ قدح خوار دیکھ کر"

س پر بھی وہ یہی کہے جاتا ہے کہ

"حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا"

ہر نوع براؤننگ کو ایک قسم کا اطمینان ہے۔ غالب میں بجائے اطمینان کے عزم زیادہ ہے۔ براؤننگ کے
یام کا انحصار زیادہ تر اس عقیدے پر ہے کہ دنیا کی ناکامیاں اور مختلف قسم کے شکوک ہی کامیابی اور اطمینان
ی دلیل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "میں تو شکوک کی قدر کرتا ہوں کیونکہ یہ انسانیت کا خاصہ ہیں جانور شکوک سے
متاثر نہیں ہوتے کیونکہ وہ راکھ کا ڈھیر ہیں جس میں کوئی چنگاری نہیں"۔

مسئلہ ارتقا کے متعلق براؤننگ کی نظمیں حضرت مولانا روم کے خیالات سے ملتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں

تو ازاں روزیکہ از ہست آمدی　　آتشی یا خاک یا بادی بُدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا　　کے رسیدے مرترا ایں ارتقا

براؤننگ ایسی کوئی تشریح نہیں کرتا، وہ صرف اپنی حالت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خدا کا شکر کرتا
ہے کہ:-

"(اے خدا) میں تیرے طریقِ عمل کو نہایت کامل سمجھتا ہوں، اور اس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں
کہ میں انسان ہوں"۔ ——— (ربی بن عذرا)

زمانہ ستمبر ۱۹۳۲ء

کلیم اور سلیم

(دونوں شراب کے نشے میں)

غالب کے ایک شعر کے متعلق

(از میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی ایڈووکیٹ پنجاب)

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

کلیم اور سلیم دونوں ایک ہی شہر بلکہ ایک ہی محلہ کے رہنے والے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن قسمتی اس درجہ کے ہیں۔ کہ کئی کئی مہینے اور بعض دفعہ پورے سال بھر ایک دوسرے کو دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ کہاں گذشتہ جنوری کا نصف اور کہاں اب ستمبر کا خاتمہ۔ پھر بھی غنیمت ہے۔ کبھی تو مل بیٹھتے ہیں۔ کل رات دونوں دوست مدت کے بعد ملے۔ سلیم نے کھانا بھی کلیم کے ساتھ کھایا اور کھانا کھاتے کھاتے حسب معمول کچھ پیتے بھی گئے جب بقول شخصے دونوں "آؤٹ" ہونے کے قریب ہوئے تو اثنائے گفتگو میں ادبیات پر اتر آئے۔ ملاحظہ ہو۔

سلیم: بھائی کلیم! آپ کو معلوم ہے آجکل مرزا غالب کے متعلق عجب لے دے ہو رہی ہے"

کلیم: بندہ پرور! اس بیچارے کو دنیا چھوڑے مدتیں ہوگئیں۔ یقیناً وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے لینے دینے کا تصفیہ کر گیا ہوگا۔ اور اگر کچھ باقی بھی رہا ہوگا تو اب عرصے سے زائد المیعاد ہو چکا ہوگا۔ آجکل پھر یہ لے دے کیسے شروع ہوئی۔

سلیم۔ آپ تو ہر وقت آسمان پر ہوتے ہیں اور اس وقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور عرشِ معلیٰ پر ہیں۔

کلیم: اور آپ بھی کرسی سے نیچے نہیں معلوم ہوتے۔ عرش معلیٰ کے ذکر کا یہاں کونسا مقام تھا۔

سلیم: مقام یہ تھا کہ میں نے سیدھی سادی بات کی اور آپ نے تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔ میں نے فقط یہ عرض کیا تھا کہ غالب کے ایک شعر پر آجکل اردو رسالوں میں عجیب بحث مباحثہ شروع ہو گیا ہے۔

کلیم: یہ بحث و مباحثہ آج شروع نہیں ہوا، غالب کے ہر ایک شعر پر اس شعر کے کہے جانے کی تاریخ سے

چنکہ مباحثہ جاری رہا ہے، چچا زندگی میں بھی ان باتوں سے تنگ تھا۔ اب قبر میں بھی غالباً آرام سے نہ
رہتا ہوگا۔ ان نقاد حضرات سے کون کہے کہ اس مرحوم کا پیچھا چھوڑ دو، دنیا میں اور بھی بہت کام ہیں۔ ہاں یہ تو
بتائیے وہ شعر کونسا ہے؟

سلیم: آپ اُردو کے رسالے نہیں خریدتے ہیں؟

کلیم: خریدتا ہوں، لیکن پڑھتا نہیں، اوری اینٹل کالج میگزین یا اور ایک آدھ رسالہ اگر کہیں پڑھ لیا تو پڑھ لیا
نہ خیر ما و نہ خیر شما۔

سلیم: اگر پڑھتے نہیں تو منگواتے کیوں ہو؟

کلیم: اس لئے کہ ادبیات کے ریلیف وایلیس پر روپیہ ضائع کرنے کی عادت ہے وقت ضائع کرنے کی عادت نہیں۔

سلیم: چہ خوب! وہ شعر یہ ہے:-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

کلیم: اس (کیا ہے) کا خدا بھلا کرے، شعر کو بالکل اُردو بنا دیا ہے۔ کیا اور ہے دونوں اُردو لفظ ہیں۔

سلیم: آپ کو معلوم نہیں غالب کے بعض اُردو شعروں میں صرف ایک لفظ اُردو کا ہوتا ہے باقی سب فارسی۔
ں تو دو لفظ اُردو کے ہیں۔

کلیم: غنیمت ہے لیکن سچ پوچھو تو یہاں بھی خالص اُردو لفظ صرف ایک ہی ہے۔

سلیم: خالص اُردو لفظ سے کیا مراد ہے۔ کیا اور ہے میں سے کونسا لفظ خالص اُردو کا نہیں ہے۔

کلیم: ہے خالص اُردو لفظ نہیں ہے، کیونکہ یہ اُردو اور فارسی دونوں میں مشترک ہے۔

سلیم: ہے اُردو اور فارسی میں مشترک ہے؟

کلیم: بیشک مشترک، چنانچہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

ساقی اگرت ہوائے ما ہے   جز بادہ میار در میاں شے

سلیم: (حیران ہو کر) تعجب ہے۔

کلیم: تعجب پر تعجب یہ کہ ہے۔ ہیند۔ ہیی۔ ہییہ۔ ہیم اور ہییم۔ پوری گردان بھی ہو سکتی ہے

سلیم: مثلاً

کلیم: مثلاً یہ کہ مولانائے روم مے فرماید:

گفت یارب کہ ترا خاصان ہیند   کہ مبارک دعوت و فرخ پے اند

تسلیم: یہ تو خیر یہ ہے، بینند، بینی، بینید، بینیم اور بینیم عجیب طرفہ معجون ہے۔ لیکن ہم کدھر جا رہے تھے اور کدھر چل پڑے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ غالب کے اس شعر کے عجیب عجیب معنے بتائے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کا یہ شعر شعر نہیں بلکہ چیستان ہے اور اس کی شرح کرنا محال ہے۔

کلیم: لاحول ولاقوۃ۔

تسلیم: الا باللہ العلی العظیم۔

کلیم: ہاں بیشک الا باللہ العلی العظیم۔ اس شعر میں کونسی چیستان والی بات ہے۔

تسلیم: بڑے بڑے عالم اور مبصر و نقاد تو اس شعر کو حل کرتے کرتے تھک گئے اور کچھ نہ سمجھ سکے۔ آپ کے سامنے یہ شعر بالکل صاف ہے۔ کیوں نہ ہو اس وقت آپ کے سامنے چودہ طبق روشن ہیں۔

کلیم: آپ ناحق ظلمات ثلاث فوق ظلمات میں گرے جا رہے ہیں۔ چودہ طبق روشن ہونے کی ضرورت نہیں صرف تیرہ ہی طبق روشن ہوں تو شعر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہاں یہ تو کہو کہ یہ عالم فاضل مبصر اور نقاد کہتے کیا ہیں۔

تسلیم: کہتے یہ ہیں کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے خود ایک دفعہ اس شعر کے معنی مرزا غالب سے پوچھے۔

کلیم: پھر کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ شعر چیستان ہے۔

تسلیم: اور کیا اگر شعر مشکل نہ ہوتا تو حالی کیوں اس کے معنی پوچھتے۔

کلیم: اچھا مشکل سہی، یہ تو فرمائیے کہ مرزا غالب نے جواب کیا دیا؟

تسلیم: فرمایا کہ "ہے" کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں۔ ان کے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔

کلیم: واہ واہ واہ! یہ صرف ایک فقرہ پورے تین آدمیوں کی تصنیف ہے۔

تسلیم: آپ پھر آسمان پر چڑھے جا رہے ہیں، میں نے یہ فقرہ یادگار غالب سے آپ کو سنایا ہے۔ اپنی طرف سے اس میں کچھ نہیں ملایا۔

کلیم: آپ نے کچھ نہ ملایا ہوگا، پھر بھی اس فقرے کی تصنیف میں کم از کم تین آدمی برابر کے حصہ دار ہیں۔ (۱) مرزا اسد اللہ خاں غالب (۲) خواجہ الطاف حسین حالی اور (۳) یادگار غالب کے لکھنے والے جناب کاتب۔

تسلیم: کیا اس فقرے میں کوئی کتابت کی غلطی ہے، اور اس الزام کے لئے آپ کے پاس کیا دلائل ہیں؟

کلیم: دلائل جانے دیجئے۔ سند پیش کرتا ہوں۔ مولانا جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:-

غلام خامۂ آں کاتبم کہ شعر مرا ... چنانچہ بود نوشت و نہ بر چہ خواست نوشت

گرچہ شرف دروغ از دروغ می گیرد   دروغ و راست درو برچہ بود راست نرفت

سلیم: اچھا آپ فرمائیں تو سہی، کتابت کی غلطی اس عبارت میں کونسی ہے؟

کلیم: صرف اتنی کہ اصل فقرہ یوں تھا کہ "قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس
س سے کم نہیں، ان کے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت الخ

سلیم: لیکن یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔

کلیم: اگر قفس رنگ کی جگہ قفس عنصری بغیر دلیل کے لکھا جا سکتا ہے تو پھر میرے دعوے کو بغیر دلیل کے
ن لینے میں کیا نقصان ہے۔ میرے خیال میں تمام تر فساد اس قفس عنصری کا ہے، سلیم صاحب! دیکھئے، یادگار غالب
۔اس فقرے کو اس طرح پڑھنے کے بعد بھی شعر میں کچھ دقت باقی رہ جاتی ہے۔

سلیم: ہاں یہ دقت باقی رہ جاتی ہے کہ "قمری جب محض ایک راکھ کا ڈھیر ہے۔ تو اس کے چہکنے اور بولنے
ں وہ سوز نہیں ہو سکتا جس سے اس کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت ملے۔ کیونکہ راکھ کا ڈھیر وہی ہے۔
جس میں ایک چنگاری بھی باقی نہ ہو۔ دوسرا سوال اس تعبیر کے متعلق یہ ہو سکتا ہے کہ آخر چہکنے اور بولنے کو اس قدر
اہمیت کیوں دی گئی۔ کہ اس کے سوا کوئی نشان جگر سوختگی کا نہیں مانا گیا۔ پہلے مصرعے میں صاف بتا دیا ہے کہ قمری راکھ
ا ڈھیر ہے، تو ظاہر ہے کہ راکھ کا ڈھیر جب ہی ہوئی جبکہ وہ پہلے شعلہ زن ہوئی، یعنی جگر سوختگی اور سوز کا نشان قمری
کی شکل یعنی خاکستری رنگ میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ بہ نسبت اسکے چہکنے اور بولنے کے۔"

کلیم: میں اس ایجاد بندہ کی داد دیتا ہوں۔ لیکن آپ نے جو کچھ فرمایا وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے، ہاں اتنا
سمجھ سکا ہوں کہ راکھ کے ڈھیر سے آپ کو چنگاری کا خیال آیا، اور پھر چنگاری کو جگر سوختہ کی سوختن والی آگ سے
جا ملایا، اور یہ بھی خوب کہا کہ چہکنے اور بولنے کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی۔ حالانکہ قمری کا خاکستری رنگ زیادہ اہمیت
کا مستحق تھا لیکن بلبل کے قفس رنگ یا بقول آپ کے قفس عنصری کا بھی کچھ حق اہمیت پر تھا، اس کا حق آپ بھول گئے۔

سلیم: آپ میری ایجاد بندہ پر معترض ہیں، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کی ایجاد بندہ کو سمجھ بھی نہیں سکا۔

کلیم: میں نے تو ابھی نہ کوئی ایجاد کی ہے اور نہ موجد ہونے کا مدعی ہوں۔

سلیم: اچھا اس تو تو میں میں سے کچھ فائدہ نہیں۔ فرمائیے کیا آپ کی رائے میں اس شعر کا یہ مطلب
درست ہے کہ "قمری جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی ہے اور بلبل خاک سیاہ اور ان کی شکل ہی گویا ان کے عاشق
کی دلیل ہے۔ لیکن ہمارے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت صرف ہماری نالہ کشی ہے۔"

کلیم: یہ معنی آپ نے کہاں سے نکالے؟

سلیم: ایک رسالے میں پڑھے ہیں۔

کلیم: میں یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے یہ معنی کہاں پڑھے ہیں، یہ پوچھتا ہوں کہ کہاں سے نکالے ہیں، یہ معنی آپ کے ہوں یا کسی اور صاحب کے لیکن اتنا ضرور ہے کہ شعر کے الفاظ سے یہ معنی نہیں نکلتے۔

سلیم: اگر نہیں نکلتے تو لوگ کیوں نکالتے ہیں۔

کلیم: میں اس سوال کے جواب دینے کے نااہل ہونے کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔

سلیم: میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ان معنوں پر اعتراض کیا ہے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ اگر ان معنوں کو صحیح مان لیا جائے تو گویا مرزا غالب اپنے مرتبۂ عشق کو بلبل و قمری کے عشق سے فروتر سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ اگر جگر سوختگی صرف نالہ کشی سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ ادنیٰ درجہ کی ہے۔

کلیم: میں نے ان معنوں پر نہ کبھی یہ اعتراض کیا اور نہ کبھی کچھ فرض کیا، آپ ناحق میری طرف سے سوال پیدا کر کے جواب دینے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں، میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ یہ معنی شعر کے لفظوں سے نہیں نکلتے

سلیم: لیکن آپ نے کتابت کی غلطی نکال کر تو گویا بڑی تلوار مار لی۔ یہ نہ فرمایا کہ "آے کی جگہ جز کیونکر پڑھا جا سکتا ہے" درحالیکہ اردو، فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کسی زبان میں جو ادب اردو سے متعلق ہو کہیں آے کے معنی جز کے کسی لغت میں نہیں لکھے ہیں۔

کلیم: ممکن ہے جامع اللغات میں لکھے جائیں، کیونکہ اس قسم کے معنی اور کسی لغت میں نہیں مل سکتے

سلیم: آپ پھر بھٹکنے لگ گئے۔ یہ فرمائیے کہ "حضرت غالب یا خواجہ الطاف حسین حالی کا کیا حق ہے کہ وہ ہمیں مجبور کر سکیں کہ ہم آے کے معنی جز مان لیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ آے کو ندائیہ ہی مانا جائے۔"

کلیم: حضرت غالب یا خواجہ حالی نے کب آپ کو مجبور کیا تھا کہ آے کے معنے جز مانیے۔

سلیم: پھر یہ کیوں فرمایا کہ آے کی جگہ جز پڑھو۔

کلیم: اگر کیا تو کونسا گناہ کیا۔ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لگا کر معانی کو آسان تر کر کے بتا دیا۔ یہ تو نہیں کہا کہ کسی اردو فارسی عربی ترکی، انگریزی یا فرانسیسی لغت میں آے کے معنی جز لکھے ہیں

سلیم: اچھا اگر میں اس شعر کی اس طرح تعبیر کر دوں تو کیا درست نہ ہوگی کہ جگر سوختہ ہونے کی وجہ سے قمری جو سرو پر عاشق ہے اس کی یہ حالت ہوئی کہ نالہ و آہ کرتے کرتے وہ صرف ایک کفِ خاکستر رہ گئی ہے اور جو چیز خاک کی مٹھی بن جائے گویا وہ فنا فی اللہ ہو گئی۔ کوئی اس کا نشان باقی نہ رہا۔ یعنی قمری کا وجود تو جگر سوختہ ہونے کی وجہ سے تمام تر خاک ہو گیا یعنی کچھ بھی اثر آثار قائم نہ رہا۔ وہ صرف نالہ و آہ کرنے کا ایک آلہ ہو گئی۔ تو اس پر تعجب ہو کر مصنف پوچھتا ہے۔ اے کیا قمری کے سوختہ جگر کا نشان بس ایک نالہ ہی باقی ہے بس سخت افسوس یا از حد تعجب کا مقام ہے۔ اسی طرح بلبل بھی کوئی وجود نہیں رکھتی جیسے کہ روتے روتے کوئی

س آخر اس قدر کا بیہودہ ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا بلبل بھی محض رنگوں کی
ـ پوٹ بنگئی ہے، تو اس پر تعجب اور حسرت کا اظہار کرنے کے لئے شاعر کہتا ہے۔ ـلے کیا نالہ ہی نشان
سوختہ ہے۔ یعنی بلبل وجود سے تو خالی ہو گئی۔ اب وہ صرف رنگوں کا ایک مجموعہ ہے اور اس کے
سوختہ کی یادگار یہی نالہ باقی ہے۔ مراد اس شعر سے یہ ہوئی کہ عشاق آخر روتے روتے اور آہیں بھرتے بھرتے
ود سے خارج ہو جایا کرتے ہیں اور اُن کا کام محض نالہ کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ اور شعر کو نثر میں اس طرح پڑھیے
کیا نالہ ہی نشانِ جگر سوختہ ہے۔ جبکہ قمری کفِ خاکستر سے زیادہ نہیں اور بلبل محض قفسِ رنگ ہو۔

کلیم: سبحان ربی الاعلیٰ۔ وجود سے خالی ہونے اور فنا فی اللہ ہونے کی ایک ہی کہی۔ پہلے سنا کرتے تھے کہ
رف از بہر شعر گفتن خوب است، اب معلوم ہوا کہ تصوف از بہر شرح گفتن ہم خوب است اور پھر آے کو
رعے کے شروع سے اور کیا کو مصرعے کے اخیر سے اٹھا کر اٹھا کر کے آے کیا بنا دیتے ہیں تو آپ نے
تحقیق ہی کی کہ الاماں!

سلیم: اس میں الاماں کی بات کیا ہے۔ "غالب نے "آے کیا" کا مرکب جابجا کبھی حسرت اور کبھی استعجا
نی میں اور بعض اشعار میں بھی اس طرح استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب　　　آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

اور جگہ فرماتے ہیں:-

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے　　　بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

ہر دو اشعار میں آے کیا کہیں حسرت اور کہیں تعجب کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

کلیم: میں کیا کہوں اگر غالب زندہ ہوتا تو آپ سے سمجھتا۔

سلیم: آپ ہر بات پر ہنسی اڑاتے ہیں اور اپنی رائے کو تمام دنیا کی رائے سے افضل قرار دیتے ہیں
ن آپ کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ جس زمانے میں حالی نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی
فت کئے تھے اس وقت نہ تو وہ مصنف یادگارِ غالب تھے نہ اپنے عہد کے ایک زبردست عالم اور مسلم الثبوت
ا، بلکہ وہ غالب کے ایک شاگرد تھے، ممکن ہے مرزا نے کسی فوری تبدیلِ خیال کے زیرِ اثر ان سے کہدیا
ے کی جگہ جز پڑھو:

کلیم: ہاں بیشک اُس وقت حالی شاگرد تھے اور مرزا غالب ایک نومشق شاعر۔ آے کو بیہودہ سمجھ کر
لگا دیا۔

سلیم: میں نے مرزا غالب کے متعلق کچھ نہیں کہا، لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ "اصل شعر میں آے کیوں کہ

اور کس اصول سے آئے یعنی جز مستقل ہو سکتا ہے۔ اگر مرزا نے یوں کہا ہوتا کہ یہاں جز کی جگہ کسی نے غلطی سے لے لکھ دیا ہوگا تو معاملہ صاف تھا۔

کلیم: غالب اگر آپ سے مشورہ کرتے تو ایسا ہی کرتے۔ لیکن اُس وقت آپ نہیں تھے اور اس وقت غالب نہیں ہے۔

سلیم: اور اگر آپ سے بھی مشورہ کرتے تو بلبل کو قفس رنگ نہ کہتے مغریب بلبل تو ایک مٹھی بھر کالے پروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے ہاں وہ بوقلمونی الوان کہاں جس سے ایک قفس رنگ تیار ہو سکے۔

کلیم: آپ نے شاید بلبل نہیں دیکھی۔ اس میں مٹھی بھر صرف کالے پر ہی نہیں ہوتے، اور پھر آپ نے ایران کی بلبل تو غالباً خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔

سلیم: تو کیا ایران میں مور کو بلبل کہتے ہیں؟

کلیم: نہیں مور کو بلبل نہیں کہتے، لیکن ایران کی بلبل جو شاعروں کی بلبل ہے وہ کچھ اور چیز ہے اور ہندوستان کی بلبل کچھ اور۔

سلیم: کوئی سند؟

کلیم: سند کے لئے بہار عجم دیکھیئے۔ وہ ہندوئے ہیچمدان لکھتا ہے کہ "بلبل مرغے ست معروف کہ در ولایت مے باشد و اینکہ در ہندوستان مے باشد مرغے دیگر است۔"

سلیم: اچھا تو میں اس شعر کی ایک اور طرز سے شرح کرتا ہوں۔ اس کے متعلق آپکا کیا خیال ہے؟

کلیم: فرمائیے

سلیم: "نالہ سے عشق مراد ہے، قمری بلبل اور جگر نالوں کے مختلف پیکر ہیں، قمری کو فارسی والے بالعموم کفِ خاکستر لکھتے ہیں بلبل قفس رنگ سو یعنی بلبل مبتلائے عشق گل۔ رنگ سے رنگ گل مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے عشق قمری جو کفِ خاکستر ہے اور بلبل جس کو قفس رنگ کہنا چاہیئے، سرو آزاد اور گل کے عشق میں مشہور ہیں۔ مگر ہمارا جگر جو رنگ خون بھی رکھتا تھا اور جس کو تو نے جلا کر خاکستر بھی کر دیا، اس کے محبوب و مطلوب کا کوئی نشان نہیں۔"

کلیم: سچ پوچھیئے تو میں ہارا اور آپ جیتے۔ یہ نئے معنے تو آپ نے ایسے نکالے کہ قلم توڑ دیئے۔ افسوس کہ آج غالب موجود نہیں ورنہ عش عش کر اُٹھتا۔ اور آپ کو گلے سے لگا لیتا۔ بھائی بتاؤ تو کیا یہ معنے بھی کسی رسالے میں دیکھے ہیں؟

سلیم: نہیں ایک شرح دیوان غالب میں پڑھے ہیں۔

کلیم: شارح نے کمال کیا ہے، ان شرحوں سے خدا بچائے، قطعاً معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ معنی کیوں ہیں؟ کس لئے ہیں اور کس بنا پر ہیں جتنے معنی آپ نے پہلے بیان کئے، یہ ان سب سے نرالے گئے۔ نالہ سے عشق مراد ہے، یہ کیوں؟ قمری بلبل اور جگر نالوں کے مختلف پیکر ہیں، وہ کیسے؟ رنگ سے رنگ گل مفہوم ہے کون کہتا ہے؟ ہمارا جگر رنگ خوں بھی رکھتا تھا اور اسے تو نے جلا کر خاکستر بھی کر دیا۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا؟ ہمارے جگر کے محبوب و مطلوب کا کوئی نشان نہیں، چہ خوب!

سلیم: آپ کی خود رائی بھی حد سے بڑھ گئی، کوئی معنی آپ کو پسند ہی نہیں آتے۔ یہ کیوں، وہ کیسے، کون کہتا ہے اور چہ خوب پر بات کو ٹال دیا۔ خیر آپ کی مرضی۔ لیکن اب اتنا تو آپ مان گئے ہونگے کہ یہ شعر چیستان ضرور ہے۔

کلیم: مجھے تو اس شعر میں چیستان والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

سلیم: اگر چیستان والی کوئی بات نہ تھی تو علامہ اقبال نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی کیوں پوچھے

کلیم: علامہ اقبال نے؟ مرزا غالب سے؟ اس شعر کے معنی پوچھے!

سلیم: ہاں! علامہ اقبال نے مرزا غالب سے اس شعر کے معنی پوچھے

کلیم: کب اور کہاں؟

سلیم: ابھی تھوڑا عرصہ ہوا۔ فلک مشتری پر۔

کلیم: البتہ، ابھی آپ مجھے کہہ رہے تھے کہ تم آسمان پر چڑھے جا رہے ہو، اب آپ بھی فلک مشتری پر جا پہونچے، وہ آسمانی واردات سناؤ تو!

سلیم: وہ اس طرح ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غالب سے کہا:-

اے ترا دادند دردِ جستجو — معنیِ یک شعرِ خود با من بگو
"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ چیست"

کلیم: لیجئے اُردو شعر فارسی شعر بن گیا، غالب نے کیا جواب دیا۔

سلیم: غالب نے کہا:-

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر — ہر کجا تاثیرِ او دیدم دگر
قمری از تاثیرِ او وا سوختہ — بلبل از وے رنگہا اندوختہ
اندرو مرگے بآغوشِ حیات — یک نفس اینجا حیات آنجا ممات

آنچناں رنگے کہ ارژنگی ازوست — آنچناں رنگے کہ بیرنگی ازوست
تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست — قسمت ہر دل بقدر ہائے و ہوست
یا برنگ آیا بہ بیرنگی گزند — تا نشانے یابی از سوز جگر

کلیم: بہت خوب! لیکن یقین جانیئے کہ علامہ اقبال نے مولانا حالی کے تتبع میں مرزا سے اس شعر کے معنی پوچھ لئے۔ ورنہ انھیں ضرورت نہ تھی۔

سلیم: نہ ہوگی۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آخر اس شعر کے معنی ہیں کیا؟

کلیم: آپ کمال کرتے ہیں۔ معنی تو میں نے شروع میں ہی بتا دئے تھے۔ صاف بات ہے، شاعر کہتا ہے کہ قمری بھی عاشق ہے اور جگر سوختہ، بلبل بھی عاشق ہے اور جگر سوختہ، لیکن وہ ایک کف خاکستر یعنی محض بیرنگ چیز اور یہ قفس رنگ یعنی زنگا رنگ شئے۔ گویا ان کی ظاہری شکل و شباہت میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ البتہ آہ و نالہ مشترک ہے۔ قمری بھی ہر وقت فریاد کرتی ہے اور بلبل بھی اس سے معلوم ہوا کہ عشق اور جگر سوختگی کا نشان آہ و نالہ ہے اور بس۔

سلیم: اگر یہی کچھ تھا تو آسے نالہ کی بجائے جز نالہ ہی کہدیا ہوتا۔

کلیم۔ آپ ہوتے تو اسی طرح کرتے۔ وہ مرزا غالب تھے۔ اگر جز نالہ کہتے تو شعر شعر نہ ہوتا۔ محض ارتھمیٹک ہوتی۔ یعنی دو اور دو چار۔ لے نالہ کہکر شعریت پیدا کرلی۔ نالہ ہی نشان جگر سوختہ ہے۔ اور نالے ہی سے پوچھ رہے ہیں کہ نشان جگر سوختہ کیا ہے۔

رات آدھی ہو چکی تھی، ساڑھے بارہ بج چکے تھے، سلیم نے آج پی بھی کچھ زیادہ لی تھی۔ اپنے کلیم کا آخری فقرہ کچھ سنا اور کچھ نہ سنا۔ یہ کہکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی کلیم خدا حافظ! سچ کہتے ہو۔ وہی بات ہے ع

شعر میں کہتا ہوں بہتے تم کرو

●●

زمانہ جنوری ۱۹۳۴

ادبیات

مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ

— از مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کلکتہ ۔ (از الہلال)

مرزا غالب مرحوم کا سال وفات "آہ غالب بمرد" ہے یعنی ۱۲۸۵ ہجری ۔

اس لحاظ سے فی الحقیقت ان کا شمار موجودہ عصر جدید کے عہد میں ہونا چاہیے ۔ ہندوستان

ستر ہوین صدی عیسوی کے اواخر مین رائج ہو چکا تھا اور غدر سے پہلے خود دہلی مین

الدین وغیرہ تجار کتب نے بعض پریس قائم کر دیے تھے ۔ پس ان کو اپنی تصنیف و تالیف

تبدا ہی سے پریس موجود ملا ۔ اور اپنے حاصل عمر کو اشاعت و طباعت کے لیے غیرون پر چھوڑ

. چھپے جانے کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا جو فی الحقیقت کسی صاحب کمال کے لیے

کی سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جانکاہ صدمہ رہا ہے

ن کی کلیات نظم و نثر اور مکاتیب و رسائل اُردو و فارسی کی تمام کتابین باستثنائے اُردوئے

کے انتقال کے بعد مرتب ہوئی) ان کی زندگی مین خود انھین کی زیر نگرانی شائع ہو چکی تھین ۔

ی غالب سب سے پہلے مطبع اودہ اخبار لکھنؤ (نولکشوری پریس) مین خود چھپوایا ۔ اسی طرح

روز، پنج رسع دستنبو د، مکاتیب فارسیہ باسم پنج آہنگ شلح کی رقاطع برہان، درفش

مائہ غالب ۔ تیغ تیز وغیرہ دہلی مین چھپوائین دیوان اُردو بھی غالباً پہلے مطبع اودہ اخبا

ر سے کر دہلی و لکھنؤ مین چھپوا کر شائع کیا ۔

ن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے مین جسقدر اُردو کلام کہا گیا، وہ سب ایڈیشنون مین داخل

لا ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی مین چھپا تھا، اسی کی نقلین چھپتی رہین ۔ بخلاف کلیات نظم فارسی کے

ایڈیشن اور موجودہ ایڈیشن دونون میرے پاس موجود ہین ۔ مگر دونون کے قصائد و

عات وغیرہ کی تعداد مین بہت بڑا فرق ہے ۔ پہلے ایڈیشن مین ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ

انچہ درین روزگار یافت ۔ دور بہ روزگار ہا نتوانند شمار یافت

رسے زمانے مین یہ ایک جدید عنوان قائم کیا جاتا ہے ۔ ہم اسکے ذیل مین اپنے معزز معاصرین کے بہترین

لا اقتباس یا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے رہین گے ۔

اور ۳۳ واں قصیدہ سر اکلنیڈ کالون والا -

بہر کس شیوۂ خاصے ودرا نیار است ارزانی

زمین مدح وزلارڈ ایلن برا گنجینہ افشانی

اور لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ اور عطائے خطابات کی تبریک -

زسال نو دگر اسپے بروے کار آمد

وغیرہ قصائد ہیں - اسی طرح سر سالار جنگ اعظم کی مدح کا مشہور قصیدہ -

شرط است کہ داستان نگویم

بھی نہیں ہے کہ یہ غدر کے بعد لکھا گیا -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلیات نظم کے ہر اڈیشن میں نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا

مگر افسوس کہ اردو دیوان کی قسمت اس بارے میں نارسا رہی اور نیا کلام اسمیں شامل نہیں ہوا۔ کافی ہوت دو شعر، غزلیں، قطعات، رباعیاں، اور بعض اردو قصائد ہیں جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہیں، اور مطبوعہ دیوان میں ان کا پتہ نہیں -

اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے دو اردو رباعیات میں نے اس مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر خود مرزا صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دیکھی ہیں، جو انھوں نے خواجہ فخر الدین حسین دہلوی مصنف سروش سخن کو دیا تھا اور دو قصیدے، اور دو قطعہ ایک قطعہ تاریخ، تین غزلیں دیوان اردو کے اس قلمی نسخہ میں ہیں جو نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی کے پاس موجود ہے۔ (اس مرتبہ دہلی میں وہ نسخہ چند دنوں تک میرے پاس رہا اور میں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ اس کے لیے میں نواب صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔

ان نسخوں میں اردو کا ایک مختصر قصیدہ آج ہدیہ ناظرین ہے یہ بالکل نئی چیز ہے۔ اور غیر مطبوعہ ہونے کے [illegible] اس سے مرزا مرحوم کے حالات و سوانح پر بھی مزید روشنی پڑتی

(قصیدہ)

کرتا ہے [illegible] رخ [illegible] صد گونہ احترام — فرمان روائے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق [illegible] وحق اندیش حق شناس — نواب مستطاب امیر شہ احتشام

[illegible] — تک فلک کے ہاتھ سے وہ چین لیں حسام

ں بزم میں کہ ہوا تعین آئین مے کشی
واں آسمان شیشہ ہے، آفتاب جام

قطعہ

ہا تھا میں نے تم کو مہ چار دہ کو رات
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

ات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

ع ہے تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

ری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام

یا رلودھیانہ پہ میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بند تلخ کام

ے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستین ہے مگر تیغ بے نیام

فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام

ب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ر برس کی عمر میں یہ داغ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

س بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام

ھ سے گراب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام

زت پہ اہل نام کے ہستی کی ہے بنا
عزت بہ جان گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام

قا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

یا تھا وقت ریل کے چھٹنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدہام

س کشمکش میں آپ کا مداح دردمند
آقا سے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

و وقت نہ کر سکا وہ لکھا حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

لک وسپہ ہو تو ہو، کچھ ضرر نہیں
سلطان بر و بحر کا دستور میں غلام

کٹوریا کا دہر میں جو مدح خواں ہو
شاہان عصر چاہیے لیں عزت اس سے وام

و دسبے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالب ہے جس کا نام

امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدہ کا چاہیے قیام

ہے بندہ کو اعادہ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستور فن شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

سب ہے یہ دعا کہ زیرِ نگین آپ کے رہے اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے مین کوئی سرکاری دربار ۱۳ جنوری کو منعقد ہوا تھا۔ جس مین حسبِ معمول مرزا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ لیکن جب وہان پہونچے تو ان کی عزت قدیمانہ کے مطابق نشست و ترتیب کا کوئی انتظام نہ تھا۔ حتیٰ کہ انھین نہایت پیچھے صف مین کرسی ملی یہ دیکھکر سخت متاسف ہوئے۔ کہ قدیمی باتین خواب خیال ہو گئی ہین۔

اُس بزم پُر فروغ مین اِس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست مین از روے اہتمام

"از روے اہتمام" یعنے از روے قاعدہ و ترتیب دربار مین یہ بہت پیچھے اور عام صفوں مین بٹھائے گئے ہونگے۔

اِس حالت کو دوسرون نے بھی محسوس کیا اور اشارے ہونے لگے۔

دربار مین جو مجھ پہ چلی چشمک عوام!

دربار کے بعد انھون نے چاہا کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ملین اور عرض حال کرین لیکن ریل کا وقت کم رہ گیا تھا۔ اور درباریون کا ہجوم بھی بہت تھا۔ ملاقات کا موقعہ نہ ملا۔

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص مین خلقت کا اژدہام
اِس کشمکش مین آپ کا مداح نامور
در آقاے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار دہلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ ہوا ہوگا کیونکہ ریل کے وقت کا ذکر کرتے ہین آپ کا مداح نامور دین پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سے خطاب ہے معلوم نہین آقاے نامور سے بھی خود ہی مین یا کوئی اور ہے تخاطب کے بعد اسطرح کے ضمیر نما و صفت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا

اُس زمانے مین لدھیانہ سے کوئی اخبار نکلتا تھا۔ اِسنے دربار کی روئداد چھاپتے ہوے یہ تمام باتین لکھدین! اس پر مزید ستم یہ کیا کہ ان کا نام اور لقب لکھنے مین کچھ ایسی غلطیان کر دین جیسے ان کا رنج اور دوگنا ہو گیا۔

اخبار لودھیانہ مین میری نظر پڑی تحریر ایک، جس سے ہوا ہے بدو تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھکے تحریر کو جگر کاتب کی آستین ہے مگر تیغ بے نیام

وقت درجہیں نام ہے میرا غلط لکھا — جب یاد آ گئی ہے کلیجا لیا ہے تھام!

معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں انھیں معمولی خلعت بھی نہیں دیا گیا اور اور نذر دینے والوں میں شمار کیے گئے۔

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

لیکن قصیدے سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ کس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ اور کس دربار کا ذکر کر رہے ہیں، صرف اِس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد کا دربار ہے۔ کیونکہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح میں ہے۔ تیر اسوقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید یہ قصیدہ غدر کے بعد کے اُس سہ سالہ عہد سے تعلق رکھتا ہے: جبکہ قیام دہلی، تعلق قلعہ، اور فتح کے بعد عدم حاضری کی وجہ سے اِن کا سرکاری وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ اِن کی وفاداری مشتبہ بھی گئی تھی۔ اور بڑی ہی تکلیف و عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔

مصائب غدر اور مرزا غالب

غدر میں مرزا گھر سے نہیں نکلے اور آخر تک بند رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی سرکار سے سپاہی متعین ہو گئے تھے۔ جو غفران مآب حکیم محمود خان مرحوم اور مرزا غالب، دونوں کے مکان کی حفاظت کرتے تھے۔

غدر کی تمام بربادیاں اور اُس قلعۂ دہلی کی تمام خونریزیاں ایک ایک کر کے اِن کے آنکھوں کے سامنے گذریں۔ جو ہندوستان میں شش صد سالہ حکومت اِسلامی کا آخری نقشِ قدم تھا۔ اور گو بہادر شاہ خود کچھ نہ تھا لیکن اسکے بقا سے عظمت و جبروت اِسلامی کی ایک بہت بڑی یادگار زندہ تھی۔ اُسکے مٹنے سے اکبر و شاہجہان کا گھر بے چراغ ہو گیا۔ اسکا مٹنا درحقیقت سلالہ تیمور و آل بابر کا مٹنا تھا۔ معتصم عباسی خود کچھ نہ تھا لیکن جب فتنۂ تاتار میں بغداد کے محل لوٹے

٭ بلی ماروں میں حکیم صاحب کے مکان کے سامنے مسجد ہے بالکل اُس سے متصل مرزا مرحوم کا کوٹھا تھا جس میں برسوں سے پیشتر آ رہے تھے۔ آجکل ہندوستانی دواخانہ جس مکان میں ہے۔ ٹھیک اسکے مقابل مرزا صاحب رہتے تھے جب کبھی وہاں سے گذرتا ہوں تو شوق و عقیدت کی ایک نظر ڈال لیتا ہوں اسی مسجد کے قریب کی نسبت کہا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے — یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

گئے تو معتصم کی جگہ ہارون و مامون کی عظمت لٹ رہی تھی!

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لا حاصل مدح کی تھی، اور وہ قصیدے جو عرفی اور نظیری کے قصائد سے مقابلہ کا دم رکھتے تھے، ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کئے تھے جسکے سر پر جہانگیر و شاہجہان کا تاج تو ضرور تھا۔ پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زر خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا، اسکا مخاطب خود بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اُس تخت اعظم کی روح صولت و عظمت اسکے سامنے ہوتی تھی جسپر بیٹھکر اکبر نے فیضی سے، جہانگیر نے عرفی و طالب سے، اور شاہجہان نے کلیم سے مدحیہ قصائد سنے تھے، اور جواب بھی نوروز و عید کے دن زرد زرد دھوپ کی طرح جو غروب آفتاب سے کچھ پہلے اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے۔ دیوان عام و خاص کے طلائی ستونوں کے بیچ چند لمحوں کے لئے نظر آجاتی تھی:

کہ با وجود خزان بوسئے یاسمن باقیست.

چنانچہ ان کے اکثر قصائد مدحیہ کی تشبیبوں میں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو مہر نیمروز کے دیباچہ میں حضرت بہادر شاہ کو مخاطب کرکے لکھی ہے۔ اِس سوز دروں اور اُس آتش نہانی کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جسکا شعلہ کاروان عظمت کے اِس آخری مسافر کو دیکھکر بے اختیار اُن کے دل میں بھڑک اٹھتا تھا، اور جسکو وقت کی نزاکت اور انگریزی حکومت کے ذریعہ وظیفہ حاصل کرنے کے تعلق نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ خامی و وارستگی نے غالب اگر بظاہر پوشیدہ و افسردہ کر دیا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ کے بعد جو عالمگیر اور عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیان شہر پر نازل ہوئی۔ اور جس طرح شاہجہان آباد کی اُن سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبقران اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی سے چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اسکے تمام مناظر خونین اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور اُن چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا جو عرصہ تک دار الخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں۔

علی الخصوص قلعہ معلی کی بربادیاں جن کے لیے تمام حیوانات ارضی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور جن کے ماتم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ خاندان جو تیمور اور بابر کی یادگار اور اکبر اعظم صاحبقران ثانی کی خون عظمت و جبروت کے ساتھ جنہوں نے چھ صدیوں سے تخت شہنشاہی اور فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی جنہیں دولت کے عیش و جلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ اُن

انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستان سے لیکر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے۔ کون تھا جو سنگ و آہن کا دل جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا۔ کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور اُن کی لاش اُس عظمت رفتہ کا افسانہ ماتم سنائیں جو چند روز پیشتر تک دنیا میں صرف انہی کے لیئے تھی؟

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے۔ اور دیکھتے رہے تھے۔ یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ ممکن نہ تھا مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اُسکے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں۔

گو ضرورت و احتیاج نے اُن سے انگریز حکام اور گورنروں کی سیلئے مدحیہ قصائد لکھوائے تھے تاہم مرزا صاحب مشفق و مہربان کے خطابات اور ساٹھ ستر روپیہ کا خلعت اُس زخم کاری کا مرہم تو نہیں ہو سکتا تھا۔ جو حوادث غدر سے اِن کے دل پر لگا ہوگا؟ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت و احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے۔ مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے۔

الزام بغاوت

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اِن سب باتوں کا جو اثر ایک مسلمان ہندوستانی کے قلب پر پڑتا تھا۔ مرزا مرحوم پر بھی تھا۔ اور ان کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے جا کر خوشامد و عاجزی کریں۔ وہ خود ہی دل سے پکے تھے۔

ہر جادہ کہ از نقش پئے تست بہ گلشن
جا کیست جیب ہوس انداختہ ما!

مگر ان کا وظیفہ انگریز حکام کے ہاتھ میں تھا۔ اِسلیئے حکام انگریز کے ساتھ اِن کو ابتدا سے خوشامد تعلقات رکھنا پڑے اور اِس وظیفہ کو واگزار کرنے کے لیے اُنھیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح و ثنا میں لکھنے پڑے۔ پھر وقت بھی سخت پُر آشوب تھا۔

اِن حالات کی وجہ سے وہ سخت مجبوریوں میں پھنس گئے تھے۔ تاہم اِن کی طبیعت کچھ اسطرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعوں میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے۔ انعامات و سندات ملیں اُن تمام لوگوں نے بڑی بڑی کوششیں کر کے اپنے تئیں نمایاں کیا جنھوں نے غدر میں حصہ نہیں لیا تھا اور اُسکے بعد بہرہ مالا مال ہوئے۔ مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے۔ اور نہ کسی حاکم کے روبرو

حاضر ہوئے۔

بعد کو اپنی بریت کے لیے انھوں نے اس عدم حاضری کے بہت سے وجوہ بیان کئے تھے مگر اصل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ دل دردمند کے ہاتھوں پاؤں بندھ گئے۔ اور مصلحت و ضرورت کی عافیت اندیشیوں کی بھی کچھ نہ چلی۔ بعد کو ہوش آیا تو عذر ہائے لنگ پیش کرنے پڑے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری حلقوں میں عام طور پر اس ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کی نسبت غیر وفاداری کا یقین ہوگیا۔ اُن کی وہ پنشن بھی بند ہوگئی۔ جو اُن کی زندگی کا اصلی آذوقہ تھی۔ اور چند جام ہائے ”فرنچ“ گلاب آمیز[1] کا وسیلہ تھی۔ انگریزی درباروں میں پرسش و طلب اور عام تعلقات لطف و نوازش بھی یک قلم موقوف ہوگئے۔ اور پوری طرح نیم باغیوں میں شمار ہونے لگا!

مرزا مرحوم کے لیے یہ حالت بڑی ہی سخت مصیبت تھی۔ ایک شاعرانہ کرسی نشینوں کا مرد نہیں ہوسکتا۔ نظیری نے صاف کہدیا ہے۔

حکیم و شاعر و ملا چگونہ جنگ کنند؟

قلعہ کے برباد ہونے سے وہ چند روپئے بھی جاتے رہے۔ جو بہ تعلق تاریخ نویسی تیموری ملا کرتے تھے۔ اس پر سرکاری وظیفہ کا بند ہوجانا قیامت تھا۔ شام کی سرشاری، اور صبوحی کی خمار شکنی دونوں سے محروم ہوگئے۔ ساری زندگی آزادانہ دادو ستد اور یک گونہ فارغ البالی میں بسر ہوئی تو اب فاقہ مستی تک نوبت پہونچ گئی اور صرف دوستوں اور شاگردوں کی خدمت گذاری پر دن کٹنے لگے۔ اس زمانے کے خطوط اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے تنگ آگئے تھے۔ اور سرکاری وظیفہ کی واگذاری اور الزام بغاوت سے بریت کے لئے بڑی بڑی کوششیں کرتے تھے۔

---

[1] مرزا مرحوم اپنے فارسی خطوط میں ولایتی شراب کو "فرنچ" لکھا کرتے ہیں۔ فرانس اور اسپین شراب سازی کا مرکز ہیں کوئی فرانسیسی شراب پی ہوگی۔ جسکو ساختہ فرانس ہونے کی وجہ سے فرنچ کہدیا ہوگا۔ انھوں نے عالم وارستگی میں یہی نام رکھ لیا۔ قاعدہ تھا کہ اسکی تیزی کم کرنے کے لئے گاہ گاہ عرق گلاب ملالیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را!

غیر مطبوعہ قصیدہ

یہ زمانہ تین سال تک رہا اور صفائی کی کوئی کوشش سودمند نہ ہوئی - معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے - دربار و خلعت کا نہ ملنا، نذر وغیرہ کا سلسلہ بند ہو جانا؛ قدیمی عزت و احترام کی یاد - اپنی بے آبروئی و بے عزتی پر حسرت و افسوس، یہ تمام باتیں جو اسمیں پائی جاتی ہیں - صرف اُسی زمانے کی شکائتیں ہو سکتی ہیں - غالباً لارڈ کیننگ نے جنوری ۱۸۶۰ء میں جو دربار آگرہ میں لب دریا جمنا کیا تھا؛ اسی کی طرف اسمیں اشارہ کیا گیا ہے - دہلی سے اس میں شریک ہونے کے لیے شاید آگرہ گئے ہونگے - "لب دریا" خیموں کے لگنے اور ریل کا وقت کم ہونے کے ذکر سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے -

چنانچہ اسکی تصدیق ان کے بعض فارسی قصائد و قطعات سے بھی ہوتی ہے جو اس زمانے میں لکھے گئے تھے - اور جو بالکل اس اُردو قصیدے کے ہم معنے و ہم مطلب ہیں -

مثلاً غدر کے بعد جو فارسی قطعہ مسٹر اڈمنسٹن بہادر لفٹننٹ گورنر صوبۂ شمال و مغربی کو مخاطب کر کے لکھا ہے؛ اور جسکا پہلا شعر -

فرزانۂ یگانہ اڈمنسٹن بہادر
کاموخت دانش از وے آئین کاردانی

ہے - اسمیں اپنی مصیبتوں کا افسانہ سنا کر الزام شرکت بغاوت سے اپنی بریت کی ہے؛ اور کہا ہے کہ حکام کے دل میری جانب سے پھر گئے ہیں آپ مدد کیجئے اور میری صفائی کرا دیجئے -

چنانچہ لکھتے ہیں کہ میرے تعلقات انگریزی حکومت سے نہایت قدیمی ہیں - میں ہمیشہ حکام کی مدح میں قصائد لکھتا رہا اور صلۂ و انعام سے شاد کام ہوا -

از حضرت شہنشہ عالی نشان من بود
در رمز و مدح سنجی صد گونہ کامرانی

یہی حالت تھی کہ

ناگہ تند بادی کان خاست در قلمرو
برہم زد آن بنا را نیرنگ آسمانی

یعنے غدر کا ظہور ہوا -

در وقت فتنہ بودم غمگین بود با من زاری و بے توانی بیری و ناتوانی

حاشا کہ بوذ باشم "باغی" باشکارا　　　حاشا کہ کردہ باشم ترک وفا نہانی!
از تہمتے کہ برمن بستند بدسگالان　　　حکام راست با من یک گونہ سرگرانی

یعنے غدر کے زمانے مین میری ناتوانی کی وجہ سے کہین آجا نہ سکا اور اظہار وفاداری نہ کرسکا باغیون سے مجھے کوئی تعلق ظاہر و باطن نہ تھا۔ محض تہمت تراشی سے مقامی حکام مجھسے بدظن ہوگئے ہین۔

اِسی طرح ۱۸۶۰ء مین جب لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے دربار کیا ہے، تو دو مطلعون کا ایک پُر زور قصیدہ لکھکر پیش کیا۔

زسال تو دگر آب بروے کار آمد
ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آمد

اِس قصیدے کے آخر مین وہ سب شکایتین ایک ایک کرکے لکھی ہین جن کے لیے اِس غیر مطبوعہ اُردو قصیدے مین لفٹنٹ گورنر پنجاب سے فریادی ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ایک ہی وقت کی لکھی ہوئی دونون چیزین ہین فارسی قصیدہ وائسرائے کے پاس بھیجا ہوگا۔ اور یہ اُردو کا غیر مطبوعہ قصیدہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کے پاس۔ اُردو قصیدے مین کم کرسی، خلعت و نذر، وظیفہ انعام، تین چیزون کے بند ہوجانے پر افسوس کیا ہے۔

منبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

یہی دکھڑا اِس فارسی قصیدے مین بھی رویا ہے۔ اپنی قدیمی مداحی و وظیفہ خواری کے بعد لکھتے ہین۔

بہ ہاگرفت چنان سرصرے وزیدہ بہر　　　کزآن بر آئینہ آسمان غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز مغز خاک انگیخت　　　سیاہ رو سپہے کاندرین دیار آمد
درین جگر گسل آشوب کز صعوبت آن　　　سپاہدار سپہرے بہ زینہار آمد
گواہ دعوے غالب بغرض بیگنہی　　　ہمین بس ست کہ ہرگز نہ رستگار آمد

یعنے غدر کی باد صرصر سے مصائب کا غبار چھا گیا۔ اِس زمانے مین میری بے گناہی کا بڑا ثبوت یہی ہے۔ کہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا، اور اِسیلیے کوئی مخالفانہ کارروائی میرے مخالف حکام نہ کرسکے۔

اِسکے بعد کہتے ہین کہ اب آپسے طالب لطف و کرم و تلافی مافات ہون۔

کنون کہ شد ز تو زینت فزائے روئے زمین　　　سواد ہند کہ چون زلف تابدار آمد

خطاب و خلعت و پنشن ز شاہ می خواہم — ہم از نخست بدین مایہ ام قرار آمد
پس از سہ سال کہ در رنج پیچ و تاب گذشت — سر گزارش اندوہ انتظار آمد

یہان بھی انھین چیزون کو طلب کیا ہے - اور لکھا ہے کہ تین سال اس حالت پر گذر چکے ہین غالباً اس قصیدے کے گذرانے کے بعد شملے سے تحقیقات کی گئی اور جب ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو بدستور پنشن جاری کردی گئی - تین سال کی پچھلی مجموعی رقم بھی دیدی گئی تھی - اس سے مرزا صاحب بہت خوش ہوئے تھے - چنانچہ اُردوے معلےٰ مین اسکا ذکر موجود ہے -

جن لوگون نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی! ان مین سید مرحوم بھی تھے - اس واقعہ سے سید صاحب اور مرزا مرحوم مین صفائی بھی ہوگئی جبکہ باہمی تعلقات قدیمانہ آئین اکبری کی تقریظ کے قصے سے کچھ مکدّر ہوگئے تھے -

بہرحال اس غیر مطبوعہ قصیدے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ [illegible]ء مین لکھا گیا ہے - اور ۳ جنوری کے دربار سے مقصود دربار آگرہ ہے - امید ہے کہ مرزا مرحوم کے اُن عقیدت مندان کمال کے لیے جنکی تعداد اب ملک مین روز افزون ہو رہی ہے - یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بہت دلچسپ ہوگا - گو شاعری کے اعتبار سے چندان اہم نہو -

مرزا غالب مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ غزل

ممکن نہین کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہون — مین دشتِ غم مین آہوے صیاد دیدہ ہون
ہون دردمند جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہون
جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیرین ہوا دہن — از بسکہ تلخیِ غمِ ہجران چشیدہ ہون
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ — مین معرضِ مثال مین دستِ بریدہ ہون
ہون خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہون نے دامِ چیدہ ہون
جو چاہیے نہین میری قدر و منزلت — مین یوسفِ بقیمتِ اول خریدہ ہون
ہرگز کسی کے دل مین نہین ہے میری جگہ — ہون مین کلامِ نغز و لے ناشنیدہ ہون -
اہلِ ورع کے حلقے مین ہرچند ہون ذلیل — پر عاصیون کے زمرہ مین مین برگزیدہ ہون
درع
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد — ڈرتا ہون آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہون ؛

(از الہلال)

زمانہ جولائی ۱۹۱۴ء

غالب اور ڈاکٹر سید عبداللطیف

(از سید علی عباس حسینی ایم۔ اے جوبلی کالج لکھنؤ)

ڈاکٹر سید عبداللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) اردو ادب کے ان جدید محسنوں میں سے ہیں جنہوں نے شاید اسکا حتمی طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ وہ معائب کے سوائے اس زبان کی خوبیوں پر نظر ہی نہ ڈالینگے۔ چنانچہ آپ نے لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جس مضمون پر حاصل کی وہ بھی اردو شاعری سے متعلق تھا اور اس میں انگریزی سے مقابلہ کرکے اس نادار زبان کا خوب خوب مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ جب یہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع ہوا تو بعض نقادانِ فن نے اس سرمایۂ تحقیق کی بے مائیگی ظاہر فرمادی۔ مگر ان مخالفانہ تنقیدوں کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ حال میں آپ نے انگریزی میں ایک پوری کتاب غالب کی شاعری پر تصنیف فرما ڈالی ہے اور اسے پرانے مغربی معیار سے پرکھکر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ غالب ہرگز کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کے نظریۂ زندگی پر بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے اور قدردانانِ اردو کو اس مایۂ ناز شاعر کے متعلق غلط فہمیوں میں گرفتار رہنے سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کتاب کو دیکھکر صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو غالب سے کوئی خاص کاوش ہے اور وہ دنیائے ادب سے انکا نام حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر سی تصنیف میں غالب پر بہت سے الزامات عائد کئے ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) کہ غالب ملا عبدالصمد ایرانی کے شاگرد تھے لیکن۔۔ نہایت دیدہ دلیری سے فرماتے ہیں کہ مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ بے استادا کہتے ہیں ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی نام گڑھ لیا۔

(۲) وہ دنیا اور اہلِ دنیا سے نفرت کرتے تھے۔ اور غم و ہم کو انھوں نے طبیعت ثانیہ بنا لیا تھا۔ نہ زندہ دلی انکے کلام میں ہے۔ اور نہ کہیں خوشی کا نام و نشان ہی ملتا ہے۔

(۳) وہ حریص تھے اور حصول زر کے لئے سو جتن کرتے تھے۔ اسی غرض سے قولنیں بھی کرتے تھے اور قصیدے بھی گزرانتے تھے۔

(۴) مذہب جیسے اہم معاملے میں وہ مذبذب تھے اور آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کس مذہب کے پیرو تھے۔
(۵) جب تک بہادر شاہ کی رہی سہی حالت باقی رہی غالب اُنکی خوشامد میں لگے رہے۔ جب وہ رنگون بھیج دیئے گئے تو انگریزوں کی خوشامد کرنے لگے۔ اور خلعت و پنشن کے حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں تدبیریں کر ڈالیں۔

(۶) صوفی بھی وہ محض برائے نام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیِ طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔"

ان الزامات پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ گو مبداء فیاض سے غالب کو بہت کچھ ملا تھا لیکن اُنھوں نے حصولِ زر کی فکر میں سب کھو دیا۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "دولت اور خدا ساتھ ساتھ نہیں ملتے"۔ انھیں نہ تو اطمینانِ قلب حاصل ہوا اور نہ قابلیت کے مطابق شہرت و امتیاز۔ انھوں نے ایک پریشان نظریہ کے ماتحت ایک پریشان زندگی بسر کی۔ اور اس لئے انکی شاعری یکسانیت اور باہمی تطابق سے محروم ہے۔ انکا شمار بڑے شعراء میں نہیں کیا جاسکتا۔

الزامات کی اس طویل فہرست کو اگر غور سے دیکھا جائے اور ان واقعات پر نظر ڈالی جائے جو ڈاکٹر صاحب نے بطور شہادت پیش فرمائے ہیں تو یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ موصوف کے پورے مضمون میں اس علمی و ادبی تحقیق کا کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی امید ہمیں ایک مغربی تعلیم یافتہ محقق سے ہونا چاہئے۔ اب میں ایشیائی تحقیق کے اصول سے انکا جائزہ لیتا ہوں۔

الزام نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت جسارت سے یہ تو تحریر فرما دیا کہ عبدالصمد غالب کے فنِ شعر گوئی میں اُستاد تھے لیکن انھوں نے اُن اُستاد کا حوالہ نہیں دیا جنکے بھروسے پر انکو ایسا فرمانے کا حق حاصل ہوا۔ مثلاً۔

(الف) عبدالصمد کو کن لوگوں نے دیکھا ہے؟ (ب) عبدالصمد نے غالب کو کون کون سے علوم کی تعلیم دی؟ (ج) ان علوم میں فنِ شعر گوئی بھی شامل ہے یا نہیں؟ (د) اور اگر ہے تو غالب نے کس زمانے سے کس زمانے تک ان سے اصلاح لی؟ (ہ) عبدالصمد کے کلام کا کچھ نمونہ بھی کہیں مل سکتا ہے یا نہیں؟ (و) شاگرد و اُستاد کے کلام کی کون سی خصوصیات ایسی ہیں جو دونوں میں پائی جاتی ہیں؟ (ز) عبدالصمد کے اور کون کون شاگرد ہیں!

جب تک مندرجۂ بالا امور کے متعلق تحقیق کرکے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ واقعی عبدالصمد نے غالب کے کلام پر اصلاح دی ہے اُس وقت تک غالب کا قول فیصلہ کُن مانا جائیگا۔ اور محض ڈاکٹر صاحب

کے فرمانے سے غالب پر کاذب ہونے کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا ۔
الزام نمبر ۲ - دنیا سے نفرت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "عدم قناعت ایک جامع
شکل ہے "ربانی" جسکی وجہ سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اسکے گرد و پیش کی دنیا ویسی نہیں
، جیسا اسے ہونا چاہئے اور جس سے کہ انسان میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ایسے اعلیٰ اور برتر خیالا
سے دنیا کو آباد دیکھے جو انسان میں ربانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہوں - عدم قناعت کی دوسری
شکل اور ہے جسکی وجہ سے انسان اپنے ماحول اور اپنے حالات زندگی سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا
ہے - یہ وہ عدم قناعت ہے جو کسی واقعی یا خیالی نقصان یا بے قدری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے
اور یہی عدم قناعت کی وہ صورت ہے جو انسان کو اپنی نوع سے نفرت کرنے والا اور دنیوی لذتوں سے
محروم بنا دیتی ہے - عدم قناعت کی یہی شکل تھی جو غالب کی روح پر پورے طور پر مسلط تھی"۔
غالب پر یہ الزام کہ وہ اپنی نوع سے نفرت کرنے والے اور دنیاوی لذتوں سے محروم تھے
اس طرح کی عجیب بات ہے جس پر بحث کرنا ہی فضول سا معلوم ہوتا ہے - ایک ایسا شخص
جسکی ساری زندگی دوست احباب کی خدمت میں گذری ہو، اور جس نے تمام عمر "مرنجاں و مرنج"
کے طور پر بسر کی ہو - جسکے احباب اور شیدائیوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی، شیعہ، سنی، وہابی
سب داخل ہوں اسکے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنی نوع سے متنفر تھا ایک نئی تحقیق ہے - رہی یہ بات
کہ وہ دنیوی لذتوں سے محروم تھے تو اسکے متعلق بھی انکا کلام اور انکی زندگی دونوں ڈاکٹر صاحب
کے ارشاد کے خلاف شہادت دے رہے ہیں - چوسر، پچیسی، شطرنج، گنجیفہ، شراب و کباب
تصنیف و تالیف غرض کون سی لذت حیات تھی جس سے غالب محروم رہا ہے - کلام سے
خوشی کی جھلک دیکھنا مقصود ہو تو مختصر سا دیوان (الثنۓ) دو چار سو شعر نکل آئینگے میں نے
مشتے از خروارے ڈاکٹر صاحب کی تسکین کے لئے پیش کئے دیتا ہوں:-

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

سبزۂ و گل کے دیکھنے کے لئے　　چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　　بادہ نوشی ہے بادپیمائی

ہر ہر لفظ اسکا داعی ہے کہ شاعر پر ایک خاص کیفیت طاری ہے اور خوشی و انبساط حرف حرف سے ظاہر ہے۔ اچھا پوری غزل صاف صاف رندانہ انداز میں سن لیجئے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب　　دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن　　سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے　　سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب ہی کیا ہے　　موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو　　موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر　　شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال　　ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل　　موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل　　رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

اب بھی کیفیت سرور نہ پیدا ہوئی ہو تو اور لیجئے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل　　جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے　　مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

کہاں تک مثالیں پیش کروں - اچھا پھر وہی شعر سن لیجئے جس میں غالب نے اس بحث کے متعلق خود ہی فیصلہ کیا ہے - فرماتے ہیں ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو غیر از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

الزام نمبر ۳ - ڈاکٹر صاحب کے نزدیک غالب کے غم و ہم کی زندگی کا سبب محض انکو حرص ہے نہ انکا پیٹ بھرتا تھا - اور نہ ان کا دستِ سوال آگے بڑھنے سے رکتا تھا - وہ جھوٹی تعریف

کرتے تھے اور ممدوح کی تعریف میں قصیدے کے قصیدے کہہ ڈالتے تھے۔

واقعی آجکل کی دنیا میں اب پرانی طرز کی باتوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ پہلے شاعروں کا دستور تھا کہ جیسا کماتے تھے ویسا کھاتے بھی تھے۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔ عرفی۔ ظہوری۔ نظیری سب کے سب اسی مرض میں گرفتار تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو کون سمجھائے۔ اچھا شاید یوں سمجھیں کہ حصولِ زر کی خواہش عام ہے اور اسکی کوشش اس وقت تک عقلاء کے نزدیک مذموم نہیں جب تک کہ اس سعی میں اپنی خود غرضی نہ شامل ہو جائے کہ ذاتی فائدہ کے آگے دوسروں کے نقصان کا خیال نہ رہے۔ غالب کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جہاں انہوں نے کسی دوسرے کو نقصان پہونچا کر اپنا فائدہ کیا ہو۔ یا روپیہ حاصل کرکے اس سے خلق اللہ کی خدمت۔ خاندان کی خدمت اور احباب کی خدمت نہ کی ہو۔ پھر بھلا ایسے آدمی کو حریص اور حصولِ زر کو اسکا نظریۂ زندگی قرار دینا ڈاکٹر صاحب کے سوا اور کس کی مجال ہو سکتی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب شاعری پیشہ اور معاش کی صورت ہو تو اس وقت آخر مربی و محسن کی مدح جائز ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بفرضِ محال ناجائز بھی سہی تو اس سے کسی شاعر کے کمال میں کیا بٹہ لگتا ہے؟ [illegible] نے روپیہ لے کر مجلسیں پڑھیں اور کلام سنایا تو کیا اس سے انکی قادر الکلامی مشکوک ہو گئی؟ شیکسپیر نے حصولِ زر کے لئے ڈرامے لکھے اور اپنے مربیوں کی بھی تعریفیں کیں تو کیا اسکی وجہ سے اسکے کمالِ شاعری میں نقص آگیا؟ مصنف "پیراڈائز لوسٹ" ملٹن۔ سا مشہور [illegible] بھی کرامول کی تعریف میں مضامین لکھ لیتا تھا اور گورنر آئرلینڈ سے "بسہ منفعت" کی امید میں "کومس" سا "ماسک" تیار کرسکتا تھا تو کیا اسکی شاعری ہمہ گیر نہیں رہی اور کیا وہ بڑے شاعروں کی صف سے نکال دیئے جانے کا مستحق ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو بیچارے غالب پر ڈاکٹر صاحب کا غصہ محض بیجا ہی نہیں بلکہ طفلانہ ہے۔

الزام نمبر ۵۔ بہتر ہوگا کہ اسی سلسلے میں الزام نمبر ۵ سے بھی نبٹتا چلوں۔ اور وہ یہ ہے کہ غالب زمانہ پرست تھے۔ بہادر شاہ کی نوکری کے زمانے میں انکی مدح سرائی کرتے رہے۔ اور غدر کے بعد نئے آقاؤں کے ہاں قصیدے گزراننے لگے۔ یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک بات جو انکے مطلب کے خلاف تھی حذف کر دی۔ یعنی یہ کہ غالب صرف بہادر شاہ کے نوکر ہی نہ تھے بلکہ وہ انگریزی کمپنی کے درباری امراء میں سے تھے اور اس سرکار سے پنشن بھی پاتے تھے اور خلعتیں بھی۔ انکا طریقہ تھا کہ جب کوئی نیا گورنر جنرل آتا تو وہ انکی مدح میں قصیدہ کہہ کر

بھیجتے اور دہلی کے قریب جو دربار ہوتا انہیں ضرور بلائے جاتے۔ غدر کے بعد جب بہادر شاہ
رنگون بھیج دیئے گئے تو غالب کی پنشن اور خلعت دونوں چیزیں بند ہو گئیں۔ اس زمانے میں
ان پر عتاب تھا۔ جب انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی تو پنشن پھر سے جاری ہو گئی۔
عتاب کے زمانے میں یوسف مرزا صاحب کو یوں رقم طراز ہیں۔

"۳۰ برس کا پنسن۔ مقرر آسکا بجویز لارڈ لیک ۔ منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا خیر احتمال ہے ملنے کا۔"

اور جب مل گیا ہے تو علاء الدین خاں کو اطلاع دیتے ہیں کہ:۔

"صاحب میری داستان سنئے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا۔"

غالب کے لئے "محض شاعری ذریعۂ عزت" نہ تھی بلکہ وہ خاندانی نواب تھے۔ امیر تھے۔ صاحب خلعت تھے۔ صاحب پنشن تھے۔ جس طرح ایک سرکار کی مدح سرائی ان پر فرض تھی۔ اسی طرح دوسری حکومت کی مدح گستری بھی واجب تھی۔ انھوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ غدر میں شامل نہ تھے۔ انکو اغراض بغاوت سے ہمدردی نہ تھی۔ پھر وہ انگریزوں کی تعریف اور اپنی پنشن کے اجراء کی فکر وسعی کیوں نہ کرتے؟

الزام نمبر ۴۔ غالب کا مذہب۔ اس موضوع پر میں اب سے دو سال پہلے "زمانہ" میں ایک بسیط مضمون لکھ چکا ہوں۔ تحقیق یہی بتاتی ہے کہ وہ عقیدتاً شیعہ اثنا عشری تھے۔ اور صوفی۔ انکے خطوط اور حالات زندگی اسکے شاہد ہیں۔ میں جس بنا پر عرض کر رہا ہوں وہ غالب کا حسب ذیل خط ہے جو انھوں نے نواب مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو لکھا ہے۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۳۳)

"حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما + دیکھا چاہیے یوں پاتے ہیں در یہ کے ان کے وضو کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے

محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت
نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ثم حسن ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام
کے۔ بریں زیستم ہم بریں بگذرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو
عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالینگے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی
آنچ کو تیز کرونگا تا کہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اسمیں جلیں۔"

خط کشیدہ حصہ سے انکا اعتقادی حیثیت سے شیعہ اثنا عشری ہونا ثابت ہے۔ رہا صلح کل ہونا اسکے متعلق عرض ہی کرچکا ہوں کہ صوفی صافی صلح کل تھے۔ مولانا حالی بھی آخری حصہ پر زور دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اسپر خفا ہیں کہ اگر وہ شیعہ تھے تو انھوں نے یہ رباعی بہادر شاہ کے سامنے کیوں پڑھی کہ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

جس نے بھی غالب کے حالات کا ذرا غور سے مطالعہ کیا ہوگا وہ اس سے واقف ہوگا کہ ظرافت اُن کا خاص حصہ تھی۔ جہاں موقعہ ملا فقرہ چست کردیا۔ ذرا گنجائش ہوئی اور کوئی چبھتی ہوئی بات چپکا دی۔ غالب کے مذہب سے سب لوگ واقف تھے۔ بہادر شاہ اور اُنکے درباری یہ جانتے تھے کہ یہ شیعہ ہیں۔ لیکن موقع موقع سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور یہ بھی اپنے خاص انداز میں جواب دیتے رہتے ہونگے۔ یہ رباعی بھی اسی طرح کی ظرافت کا نتیجہ ہے۔ لوگ ہنستے ہونگے اور خوب ہنستے ہونگے۔ اور یہی مقصود تھا۔ اس سے نہ بہادر شاہ کی خوشامد ظاہر ہوتی ہے اور نہ خود غالب کا مذہبی حیثیت سے مذبذب ہونا۔

الزام نمبر ۶۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب غالب کی صوفیت سے بھی انکار فرماتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر صوفی ہونا کوئی مذہب ہے تو غالب ہرگز صوفی نہیں تھے۔ وہ شیعہ اثنا عشری تھے۔ لیکن اگر یہ قلبی صفائی کا نام ہے جس میں کدورت۔ حسد۔ بغض و کینہ کا نام نہ ہو اور جس میں محبت کا عنصر اس طرح غالب آجائے کہ بالآخر سارا عالم محبت ہی محبت ہو کر رہ جائے تو یقیناً غالب صوفی تھے۔ آنکی ساری زندگی اسکی شاہد ہے کہ اُن سے ہندو مسلمان۔ شیعہ سُنّی ہر مذہب و فرقہ کے لوگ یکساں طور پر مستفیض ہوتے رہے اور کبھی کسی کو آنکے اخلاص و محبت میں شک نہ ہوسکا۔ خود حالی حنفی المذہب ہونے کے باوجود انکو صلح کل مانتے ہیں۔

صوفی صافی کہتے ہیں۔ رہا غالب کا وہ خط جسکا ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اسمیں سے ڈاکٹر صاحب کا نقل کردہ ٹکڑا "لا تقربوا الصلوٰۃ" والی مشہور حکایت یاد دلادیتا ہے میں خط کے سارے متعلق حصے نقل کئے دیتا ہوں ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے تو صوفی ہونے سے انکار محض انکسار سے ہے۔ نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں صاحب شفق نے اس زمانے میں کوئی دمدار ستارہ نکلا تھا اسکے اثرات دریافت کئے ہیں۔ نواب صاحب کے اس استفسار پر یوں رقمطراز ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دمدار کا لکھوں۔ چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بسبب فقدان اسباب مثل رصد و کتاب کچھ تعین کیا جاتا نا چار مرزا صاحب کا مصرع زبان پر آجاتا ہے مصرع "ازیں ستارۂ دنبالہ دار مے ترسم"۔ یہ مطلع ہے اور یہ پہلا مصرع ہے۔ مصرع "زغالب گرشتہ ابروئے یاری ترسم"۔ کیا آپ مجھکو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے "پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا۔ پیش ہیچ بردو و پیش بردو ہیچ" آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس برج میں یہ نظر آئے اسکا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ ان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی دھوم رہی اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید نظر آتا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی خرابی کی قران النحسین۔ پھر کسوف۔ پھر خسوف۔ پھر یہ صورت پرکدورت۔ معاذ اللہ و پناہ بخدا۔ ۔۔۔۔۔"

سیاقِ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ نجوم و صوفیت سے انکار محض انکسار سے تھا۔ اور انکا صوفی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مزید ثبوت تلاش کرنے کی زحمت اٹھانا پڑیگی۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے اور اس وقت نظر اور تحقیق کا انکی تصنیف میں کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی توقع ایک مغربی تربیت یافتہ محقق سے کیجا سکتی تھی۔ رہا یہ امر کہ غالب آیا کوئی بڑا شاعر تھا یا نہیں اسکے متعلق میں فی الحال پروفیسر صلاح الدین خدا بخش ایم۔ اے (آکسن)

یہ اُن زرّیں خیالات کے ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں جو اُنھوں نے مسلم ریویو دسمبر [illegible]ء میں ظاہر کئے ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:-

"سفرِ انگلستان کے دوران میں غالبؔ میرا جدا نہ ہونے والا ہمراہی تھا۔ رنج و افسردگی کی حالت میں وہ خلوت خانۂ دل کو روشن کرتا ہے۔ یاس و حرماں میں وہ تسکین دیتا ہے۔ اور صبح سویرے سطحِ سمندر پر وہ دماغ کو موت و حیات کے اُن مسائلِ پیچیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جنھوں نے انسان کی قوتِ ادراک کو مسحور اور عاجز کر رکھا ہے۔ غالبؔ کی نظمیں ولولہ آفرینیوں کا سرچشمہ اور مسرتِ دائمی کا خزانہ ہیں۔ متانت۔ بشاشت۔ حاضر جوابی۔ ظرافت بلحن تشنیع و طنز (حد یہ کہ اُن شوخیوں سے خدا بھی محفوظ نہیں) یہ تمام باتیں افراط و بہتات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اور پھر عنوانِ نظم نہایت صاف ستھرا اور چبھنے والا خنجر کا وار۔ دعوتِ جنگ۔ میٹھی چٹکیاں۔ پُر اثر تنکا تھیں۔ جو جی چاہے اُسے کہہ لو۔ یہ ہمارے ادب میں کچھ اپنی طرزی اور چیز ہے۔ شہرتِ دائمی کے مالک دوسرے شعرا کی طرح وہ ہر حالت میں پُر از کیف ہے اور ہر جذبہ میں تسلّی بخش۔ اسکی نظموں میں ہمیشہ تازگی کا جادو بھرا ہوتا ہے اور اُسکا مخاطب انسانی دل ہی ہوتا ہے...... میں اسکے اشعار پڑھنے سے کبھی نہیں تھکتا اور ہر مطالعہ کے بعد مجھے ان میں نئی نئی مخفی خوبیاں اور خیالات کی گہرائیاں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں زبان اور خیال اس خوبصورتی سے اکٹھا کئے گئے ہیں کہ ہر ایک سرمایۂ داد و تحسین حاصل کرنے میں سبقت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ غالبؔ کی نظمیں واقعی زندگی کی ترجمان ہیں۔ اور اسکے گوناگوں کوائف و شئوں۔ اسکے عجیب و غریب خلشوں اور تعجب خیز مندوں۔ اسکی خوش طبعی کی چہلوں اور دردانگیز غم کی داستانوں کی تصویر کشی میں حقیقی رفعتوں تک منتہی ہوتی ہیں۔ اور اپنا اصل مقصد درجہ خوش اسلوبی سے پورا کرتی ہیں۔

مجھ میں ولولہ اور جوش کی کیفیتیں پیدا کرنے والے! میں تیرے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ میرے ملک کے غیر فانی شاعر! میں تیری یاد پر پھول اور ہار چڑھاتا ہوں! ابھی تیرے حقیقی مرتبے سے دنیا روشناس نہیں ہوئی ہے لیکن مستقبل تیرا ہے اور بلاشبہ تیرا ہے۔ تو کسی مفتوح ملک کا شاعر نہیں ہے بلکہ ایک آزاد قوم کا شاعر ہے جسکی نگاہوں میں حریت اور عزتِ زندگی اسکی تونگریوں سے کہیں زیادہ باوقعت ہیں۔

تو نے اپنی نظم کے مختصر مجموعہ میں ہر جگہ غیر مشتبہ لہجہ میں اُس آزادی کے گیت گائے ہیں جو کسی آقا کو رُوحانی ہو یا مادی۔ اطاعت کا حلقہ کانوں میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ اسلام کے سچے فرزند! تیرے لئے سارا خوشیں ہیں! کیا یہ تیرے ہی زمرے نہیں ہیں؟ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور یہ بھی۔ ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم　　گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

اور یہ بھی ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

تو ایک حریت کیش قوم کا علم بردار ہے اور تیری نظمیں حریت کی واضح منادی! تیری زندگی تیری نظموں کے مطابق ہے۔ تیرا پرچم عزت و خودداری کے نشانوں کا حامل۔ تو نے کبھی کسی مطلب کے حاصل کرنے اور کسی غرض میں فتح پانے کے لئے عزت ہاتھ سے نہیں دی اور نہ خودداری کو کھویا۔"

پروفیسر صلاح الدین خدا بخش کے ان جذباتِ عالیہ کے بعد میرے لئے کچھ اپنی طرف سے عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہوگا۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب ہماری شاعری کو مغربی عینک سے دیکھنے کی غیر صحت بخش عادت کو اب سے ترک فرما دیں۔

زمانہ جون ۱۹۲۹ء

غالب[1]

یہ کتاب درحقیقت غالب کی شاعری پر ایک مبسوط تنقیدی مقالہ ہے، جس میں مصنف نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "غالب کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا"۔ مصنف کی اس سعی بے حاصل کی محرک ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحسینی تنقید معلوم ہوتی ہے، اگرچہ مصنف نے صاف صاف لفظوں میں اس کا اقبال نہیں کیا ہے تاہم دیباچہ پڑھکر یہ مستنبط کر لینا چنداں دشوار نہیں ہے۔ بہر نوع شروع سے آخر تک اس کتاب میں مصنف نے غالب پرستی کے خلاف ایک پُرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے اور غالب کے مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ وہ غالب کی شاعری میں "بے اطمینانی کی لے" کے شاکی ہیں۔ غالب کی بے تعصبی کو مذہب کے ساتھ "آنکھ مچولی" سے تعبیر کرتے ہیں اور غالب کی وطن پرستی کے بھی منکر ہیں۔ چونکہ وہ غالب کی کسرِ نفسی کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے اس لئے وہ غالب کے صوفیانہ رنگ کو محض آرائش مضامین کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ جمالیاتی احساس سے محروم ہونیکی وجہ سے وہ غالب کی شاعری کی قدردانی سے معذور ہیں اور طرح طرح کے اتہامات لگا کر غالب کے دامنِ شہرت کو داغدار بنانا چاہتے ہیں لیکن غالب کے کلام کا جادو مصنف کے سر چڑھکر بولتا ہے، اور انھیں شاید بادلِ ناخواستہ غالب کے چند اشعار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن ان اشعار پر بھی وہ "مسلسل بڑی نظم" (معلوم نہیں اس سے مصنف کی مراد مثنوی ہے یا کچھ اور) کی قید لگاتے ہیں، جو مزاجِ اُردو کے سازگار نہیں۔ اس پر بھی یہ ستم ظریفی ہے کہ وہ غیر ملکی سیلاب سے اجتناب کا بھی اعلان کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر مصنف وسعتِ نظر اور غیر جانبداری سے کام لیکر کلام غالب کا از سرِ نو مطالعہ کریں تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونگے۔ بہرحال قدردانانِ غالب کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے اور عہ قیمت یقیناً زیادہ ہے۔

---

[1] مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف پی ایچ ڈی۔ پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ۔ مترجمہ سید معین الدین قریشی۔ مطبوعہ دکن لا رپورٹ پریس۔ جام باغ حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ

رقعاتِ غالب میں کاٹ چھانٹ

(از پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل)

عود ہندی اور اُردوئے معلٰی مرزا غالب کے رقعات و خطوط کے دو اہم مجموعے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کو مجموعۂ خورد اور آخر الذکر کو مجموعۂ کلاں کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہ ضرور خیال رہے کہ پہلے نسخہ میں تقریباً چالیس خطوط ایسے ہیں جو دوسرے نسخے میں نہیں ہیں [۱] باقی سب کے سب رقعات ایک دوسرے میں مشترک ہیں۔

عود ہندی کی تاریخ اشاعت ۲۷۔ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء ہے اور اُردوئے معلٰی کا چھاپہ اگرچہ مرزا کی وفات حسرت آیات ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کے وقت قریب قریب تمام ہو چکا تھا مگر وہ ذات کے کچھ عرصہ بعد ہی یعنی ۶۔ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء کو شائع ہو سکا تھا۔ دونوں نسخوں کی تیاری میں مرزا نے بذات خود دلچسپی لی تھی تاہم یہ امر حیرت و استعجاب کا باعث ہے کہ عود ہندی اور اُردوئے معلٰی کے مشترک خطوط میں کمی بیشی کی عجیب کیفیت ہے جو کسی خاص ایڈیشن تک محدود نہیں بلکہ تمام اڈیشنوں کے حق میں قریب قریب یکساں ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات خطوط کے حدود کے ساتھ وابستہ ہے، چنانچہ جناب میر مہدی حسین صاحب مجروح کے نام اُردوئے معلٰی حصہ اول میں جو اکتالیسواں خط ہے وہ عود ہندی میں دو مقصوص ہے [۲] برعکس اس کے عود ہندی میں جناب مجروح صاحب ہی کے نام جو پہلا خط ہے وہ اُردوئے معلٰی میں دو مقصوص ہے۔ چنانچہ اس مکتوب الیہ کے نام کے نویں اور اٹھارھویں خطوط صریح طور پر شاہد ہیں۔ [۳]

(۲) عبارات و الفاظ میں کہیں کہیں رد و بدل یا تقدیم و تاخیر کی کیفیت نمایاں ہے۔ مثلاً:۔

عود ہندی	اُردوئے معلٰی
(الف) اگر ہانسی حصار کے صاحب کلکٹر بہادر اِن دونوں کو یہاں لے آئے۔	اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر اِن دونوں کو یہاں لے آئے۔
(ب) کنووں کا حال معلوم کرنے گیا تھا	کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔
(ج) میں نے حسب دستور اپنے ہر جگہ نشاء	میں نے حسب دستور اپنے ہر جگہ نشاء اصلاح

---

[۱] مراد اُردوئے معلٰی حصہ اول جسمیں عود ہندی کے رقعات مشترک ہیں۔

[۲] اُردوئے معلٰی حصہ اول میں نواب علاء الدین خاں کے نام کے خطوط ساتویں و تینتیسویں و چالیسویں خطوط اور عود ہندی میں نواب انور الدولہ شفق صاحب کے نام کا پہلا خط ملاحظہ کیجئے۔

[۳] عود ہندی میں جناب میر مہدی مجروح کے نام کے تیرھویں و بارھویں خطوط ملاحظہ کیجئے۔

[۴] عود ہندی کے چوبیسواں اور اردوئے معلی میں اکتیسواں خط بنام میر مہدی مجروح صاحب، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔ "بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں"

اصلاح کر لیا ہے۔ میرا شیخ صاحب سے سلام کہئے گا، اور کہئے گا کہ کیا کروں، قدر معذور ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ امانت کے مراسم تقدیم کچھ نہیں پہنچا سکتا۔	کہہ دیا ہے شیخ صاحب سے میرا سلام کہئے گا اور کہئے گا کہ کیا کروں، قدر معذور ہوں وہ نہیں کر سکتا۔ امانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا۔

(۳) عود ہندی میں بعض الفاظ و عبارات ہیں مگر اردوئے معلیٰ میں ان کا کہیں وجود ہی نہیں:۔

(۱) "جناب ممتاز علی خاں صاحب کہاں اور ماہیرہ کہاں بہر حال میرا سلام"

(ب) "جناب کنہیا لال کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر تعلق ویار سے دست بمعارضہ کا زادہ وسکید وش کر دیا"

(ج) "کہتے ہیں کہ صاحب نے اہل شہر کے فراق کی شکایت حاکم سے کی تھی جواب پایا کہ وہ لوگ مفسد اور معاش ہیں اور تمہاری برادری کے لوگ ان سے ناخوش ہیں ان کے آنے میں فساد کا احتمال ہے وہ نہ آنے پائیں گے"

(د) "یہ تمہی تو پوچھو کہ آپ کے خط کا جواب تھی جلد کیوں لکھا بلکہ مہینہ بھر کے بعد کیا کرتا"

(۴) بعض اردوئے معلیٰ میں ہی بعض الفاظ و عبارات ہیں اور عود ہندی میں انکا [illegible] چنانچہ عود ہندی میں ایک ہی خط مرزا علاء الدین خاں صاحب کے نام ہے اور شروع ہے:

"سنو عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل"

مگر اردوئے معلیٰ میں اس عبارت سے پہلے بعنوان خط کیجئے وہاں اس قدر عبارت:

[illegible] بنام میر مہدی مجروح صاحب جو [illegible]

[illegible] شاہ بنام چودھری عبد الغفور صاحب سرور [illegible] کا شکر بجا لاتا ہوں [illegible]

[illegible] بنام چودھری عبد الغفور صاحب [illegible]

[illegible] عبد الرزاق شاکر صاحب (جس کے [illegible] صاحب شاکر [illegible]

[illegible] میر مہدی مجروح صاحب (جس کے ابتد [illegible]

[illegible] (۲) صاحب [illegible]

[illegible]

مہاں غالب یاد آتا ہے کہ تمہارے علم نامہ سے سنا ہے کہ لغات صاتیر کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی
...کیوں نہ تم بھیج دیتے خیر۔ مصرع

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

...عمر قدس ہو اُس نہال کے کہ میں نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں تمہا خواہ وسا
س نہال کا رہا ہوں کیونکہ تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے۔ رہی دیدہ ودید اس کی نہ صورتیں ایں تم دلّی میں آؤ
ہا ہو آؤں۔ تم مجہد میں معتقد۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عقیدہ نما مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں
ں اور اجرا کیا ہے :

...پال یہ بھی واضح رہے کہ اسی رقعہ میں اختتام سے پہلے کچھ الفاظ (نثر میں) اور دو فارسی و دو اردو
...کا جو عود ہندی میں نہیں ہے۔

...مذکورہ بالا نوعیتوں کے صدہا اختلافات میری نظر سے گزرے ہیں جن میں سے محض چند
...اور حق تو یہ ہے کہ ان اختلافات کے سبب سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عود ہندی و اردوئے
...میں بھی کمی بیشی ہوگی جو ایک دوسرے میں مشترک نہیں ہیں مگر ان کی کماحقہ تصحیح
دشوار امر ہے جب تک کہ مرزا غالب کے اصل رقعات میسر نہ آئیں، اور یہ امر ظاہر ہے
...ت کا دستیاب ہونا ایک امر محال ہے کیونکہ چند مقامات میں میں نے ان کو تلاش کیا
...علم کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر کہیں پر تھوڑے بہت رقعات محفوظ ہوں تو
...سرمایہ سے ایک مناسب صورت اختیار کر سکیں۔ کیونکہ میں مرزا کے تمام رقعات
...ان ایک مناسب صورت میں مدوّن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور خدا کا
...یاب بھی ہو گیا ہوں۔

...مر کا اظہار کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ جس طرح بعض ارباب کمال و قدرشناسانِ
...نے ساتھ نہایت ہی دریادلی و بلند حوصلگی سے کام لیا ہے اسی طرح دیگر
...سے کام لیں اور میری اعانت کی تکلیف گوارا کریں۔ چنانچہ ایسے ادب پرور
...ت کتاب کے دیباچہ میں کروں گا، ان کا احسان مانوں گا۔ مزید براں میرا خیال
...بعد کرم فرماؤں کی عنایتوں کا اظہار شکر قدرشناسانِ غالب بھی

● ●

زمانہ جنوری ۱۹۲۴ء

غالب کا مذہب

اسمین شک نہین کہ غالب کا از روئے اعتقادات ولائے اہلبیت اظہار مین حد درجہ کا غلو انکی مصنفات و مکتوبات سے ثابت ہے جو انکے اثنائے عشری شیعہ ہونے پر ایک حد تک دال ہے لیکن چند انتخاب انکے مکتوبات سے پیش کئے جاتے ہین جس سے غالب کا سنی ہونا ثابت ہے۔

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح - اردوئے معلی صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷ -

ہر چند کو ماہ رمضان کے مسجد مین جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہون شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہون۔

مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح - اردوئے معلی صفحہ ۱۳۶

میان نصیر الدین اولاد مین سے ہین شاہ محمد اعظم کے۔ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور مین مرید ہون اس خاندان کا۔

غالب مرحوم کے اکثر احباب اور انکا خاندان حضرت مولانا فخر الدین کے سلسلہ مین مرید تھے حضرات شیعہ مرید نہین ہوتے مگر غالب مرحوم کا مرید ہونا خود ان کے مکتوب سے ظاہر ہے۔ علاوہ اسکے چشتی نظامی فقرا اور چشتی صابری فقرا اور ان کے مریدین محبت اہلبیت مین بہت غلو رکھتے ہین اور بارہ اماموں سے بھی خاص تعلق رکھتے ہین۔ اسی وجہ سے غالب نے اپنے کو اثنا عشری شیعہ لکھا ہے۔

ماہ رمضان المبارک مین مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھنا خاص دلیل سنی ہونے کی ہے کیونکہ جامع مسجد دہلی مین شیعون کی کبھی با جماعت نماز ہونا معلوم۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ نے اپنی کتاب "غالب کا روزنامچہ" مین غالب کے سنی ہونے پر کافی روشنی ڈالی ہے

ہ لکھتے ہین

"غالب چشتی نظامی تھے۔ شیعہ نہ تھے اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مردان کے قبرستان مین دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے۔ اور جہان اسوقت کے تمام شیعہ امرا دفن ہوا کرتے تھے اور اب بھی ہوتے ہین۔ سنیون خصوصاً چشتیون نظامیون کے قبرستان مین دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطان جی صاحب مین جو نظامیہ سلسلے کے بانی ہین، ان کی میت کا لایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ سنی تھے۔ شیعہ نہ تھے۔ ان کی قبر بھی سنی طریقہ کی بنائی گئی ہے۔ یعنی اُسپر اونچا اونٹ کے کوہان کے شکل کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعون کی قبرین زمین کے برابر ہوتی ہین"

لہذا کوئی گنجائش نظر بحالات و دلائل مندرجہ بالا شک و شبہہ کی باقی نہین رہتی جس سے غالب کو شیعہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی و سچی محبت اہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی اور یہی طریقہ و عقیدہ سنیون کا ہے۔

سید عاشق علی

زمانہ اکتوبر ۱۹۲۹ء

رُوحِ کلامِ غالب

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

غالب غزل کا بادشاہ تھا اُس نے اس صنفِ سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت اوراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جملہ اصنافِ سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے۔ اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستانِ نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیئے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامربوط ہونے کے باوجود بیحد دلکش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پہ چھٹکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور باایں ہمہ نامربوطی و بے نظمی "کل جدید لذیذ" کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شعر نئی تخیّل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیّل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفۂ اخلاق و تصوف کے گوناگوں رموز عالمِ حیرت و استعجاب جاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذباتِ حُسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بیخود بنا دیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اُترے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھیئے نیا لُطف آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوعِ سخن سے خارج ہے کہ یہ شروح و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ غالب کے سوا زبانِ اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیاتِ شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گذشتہ بیست سال زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس

کی مدحت طرازی کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصور چغتائی کا دیدہ وزیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھکر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایۂ تکمیل کو پہونچ رہی ہے کسی شاعر کے لئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تضمین کرکے اپنے کلام میں شامل کرلیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سا مشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجۂ اتم پورا کرے گی اور اس حاظ سے غالب کے توصیفی ذخیرہ میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہئے

اردو ادب میں تضمین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے۔ اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے۔ اکثر شعرا خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس مثلث میں اول مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے۔ اور دو مصرعہ اصل غزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعے اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تضمین کی صرف یہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست و گریباں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور نازک خیال ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کردیا جائے کہ پوری تضمین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تضمین کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں یکساں زور قلم نہ پایا جائے تو الشاذ کالمعدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تضمین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کرکے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادبی خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار

کے معانی اور مطالب اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہے:-

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

جب دو درد رسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتا ہے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سن — کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن
یہ بلبل بے نوا کہتا ہے کیا سن — سخن اے غارت گر جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اب اپنی آرزو پہ مر رہا ہوں — کہ غضب الیں چشم شرمسا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں — نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب — اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امید کرم اور تجھ سے جور کیا خوب — یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہے ؎

جنوں مانع ہوا اُستاد کا احساں اٹھانے سے　　فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیر لا بتانے سے　　تا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالبؔ نے بڑھاپے کا رونا رویا ہے ؎
کہئے مرزا کا حال کیا غالبؔ　　بے طرح ضعف ہو گیا غالبؔ
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالبؔ　　مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالبؔ کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تضمین کے تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے لکھتے ہیں۔
ہیں موحد بجا شرک ہے دل سے مفقود　　ہم سمجھتے ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود　　ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالبؔ نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شبِ وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہے۔ اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہے۔ تضمین نگار نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں:۔
بزم میں جو بنشیں تیرا ہے راتیں اُس کی ہیں　　محو نظارہ میں کر دیتا ہے، راتیں اُس کی ہیں
اس سے بھی جو خوش نصیب اعلیٰ ہے راتیں اُس کی ہیں　　نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو:۔
جنتی یا بیوں نے کیا کی ایک نصیحت مجھکو فرمائی　　نہ اب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی　　نکوہش مانع بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لئے اس اُمید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر نجف اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا۔ اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے۔ کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

عقل حیران ہے کس وجہ سے چھوڑی دہلی — کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چھوڑ دی کیوں الفت و راحت گھر کی — لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں اب کی لہر — بیٹھ رہنا ہمیں اور ترکِ سفر ہے اک قہر
قصد ہے قصد کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر — مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے، اور یہ اُن کی فہم کا قصور ہے۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو کیا خوب کہا ہے :-

میری سخنوری پہ بحث قیل و قال ہے — مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے — گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو سہل ممتنع کا حکم رکھتے ہیں، ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں تضمین کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے — حاصلِ گریہ و بکا کیا ہے
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہے — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تضمین کے نمونے پیش کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین "روح کلام غالب" کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں کہاں تک کامیابی

حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ اُن کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پُورا کیا ہے۔ غالب کے اسی مضمون کے شعر کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل　　کہ طبعِ تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حدِّ تغزّل میں رہ کے جی بیکل　　بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے مخمسے کئے ہیں اُن کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر مہدی مجروح دہلوی کے مخمسوں کو جو غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے مخمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد اِن کو پڑھکر خود رائے قائم کریں:۔

مجروح	مرزا
کام نخوت سے کچھ روا نہ ہوا	یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
در حاجت کسی پہ وا نہ ہوا	کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا	مجھ پہ احساں طبیب کا نہ ہوا
درد منت کشِ دعا نہ ہوا	درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
دے خدا رحم اِن حبیبوں کو	ہو گئے رُسوا تمھیں کہا مانو
کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو	بات بڑھ جائیگی بہت یوں تو
رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو	جل کے سُن لو الگ جو سُنتے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گِلہ نہ ہوا	اِک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
کیوں عبث جاکے اپنا سر ٹکرائیں	اور تجھ سا حسیں کہاں سے لائیں
ناحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں	حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں
اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں	کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پہ کھائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں	ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
رکھتا لذت جو ہے دہانِ حبیب
شہد و مصری کو وہ کہاں ہو نصیب
کیا کہوں بات ہے عجیب و غریب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
فکر کی قسمت آزمانے کی
یعنی اس شوخ کو بلانے کی
یہ سنو بات دل جلانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جبہ سائی تھی
دم بدم عاجزی فزائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی
کچھ تلافی نہ ہم سے ہو سکی
کیا بڑی بات ہم نے دل دے دی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
آن سے جب سحر فکر بیٹھے ہیں
ہم تو مجبورِ عشق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن و طنز سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
سخنِ تلخ لب ہے ان کے قریب
ان سے باتیں سنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
جب ہمیں دھن تھی ان کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی
عینِ احساں ہے اس کی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
شیخ مرزا مصر وہ رہتے ہیں
جی میں گھٹ گھٹ کے چپ بیٹھے ہیں
سب غمِ انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

لا تقنطو نوید ہے اُم الکتاب میں
زاہد گناہ خلق ہیں واں کس حساب میں

ہے عوض یہ جناب تقدس مآب میں
کل کے لئے کر آج نہ خِسّت شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

گو آمد و رفت میں بیقرار ہوں
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں گو طلب کروں

پر کچھ تو شغل چاہیئے بیکار کیوں رہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

شادی و غم کو عشق میں اک رتبہ بات ہو
اس میں کیسی حیات ہے گاہ ہے موت ہے

ہے طُرفہ حال اور نئی واردات ہے
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

حکمِ خدا میں گو سبب چون و چرا ہے بند
مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سر بلند

پہ دل تو اس خیال سے رہتا ہے فکرمند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

ہمدرد قہر تھے بت خانہ خراب کے
اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے

آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

جام سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں
شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں

واں کچھ کمی نہیں کہ ہے تو اضطراب میں
کل کے لئے کر آج نہ خِسّت شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے اُن سے آرزوئے تسلّی تراجتوں

آگاہ اُن کی عادت و خصلت سے خوب ہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

وہ آج میرے گھر یو چلے آئے مست مَے
شکر خدا کہ ہو گئے قصّے تمام طے

جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

یا تو ملائک سے بھی تھا مرتبہ بلند
ہم سا نہیں ہے کوئی اب خوار و مستمند

سوچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے

شعر اور تبادلہ کی ذکر سے مفکر اسنوماہت واردات ۔ ورنہ بات کا ہم قافیہ کرنا صریح غلطی ہے معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے

آثار ہم سمجھ گئے اُن کے عتاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
ہے اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود
ہر ایک کو نہیں خبرِ ہستی و بود
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہوں مگر
میری اذیتوں سے خوش ہے وہ فتنہ گر
ہے یار میرا دشمنِ آزار اس قدر
تا حشر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمالِ نظارہ سوز
سامان زیب رہتا فراہم مگر ہے روز
ہنگامِ شکوہ سے تا درست ہے روئے دل فروز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

تا ہو نہ اُس کو میرے اٹھانے میں اہتمام
محفل میں اُس کی ہم نے نہ رکھا کسی سے کام
یاں توسنِ خیال میں رکھا سدا مقام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گر شرمناک ہو کے پھرانا نگاہ کا

آثار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اشیا کی ہے تصورِ اشیا سے سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کے واہمے کی بدولت ہے ہست و بود
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر
اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
توڑا ستم یہ اور نیا چشمِ شوق پر
تا حشر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہے محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں اُن سے خاص و عام
اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز تشنہ کام
پینے میں آج کچھ تو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آتا ہے یوں تو اُن کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا

انداز دلبری سے جھکانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ سپہر خاص مقدر ہی کا نہ جائے
بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح نہ لائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

مقدور تک تو سعی میں یاں دست و پا ملائے
پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی بر نہ آئے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملک عدم کے دیکھیے عازم یہ کیا بنے
اس رو میں تربت میں نشیب و فراز کے
پر جیسے بس ہی اپنا نہ ان سے کیا کرے
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مجروح کو اس امر سے ہے خوب آگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترک مے ہو یہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

آفت ہے آفت مگر نہ اٹھانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے
مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ جو کہ عرش معلیٰ کو بھی ہلائے
وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے نہ جائے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے
لیتا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرتا کوئی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

زمانہ مئی ١٩٣٥ء

غالب

عام خیال ہے کہ غالب پر مولانا حالی پانی پتی کی "یادگار غالب" سے بہتر اور جامع ومانع
ب اب تک نہیں لکھی گئی۔ مگر "یادگار غالب" کی تصنیف کے وقت غالب کے تمام خطوط اور
ریریں خواجہ حالی کے پیش نظر نہ تھیں۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کسی صورت
ے مرزا غالب کے زیادہ سے زیادہ حالات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ مگر اس کے لئے
رزا غالب کے تمام خطوط، تمام تحریروں، تمام تصنیفات اور ان کے علاوہ یادگار غالب اور
غالب کے متعلق لکھے ہوئے تمام مضامین اور کتابوں پر تحقیق و تدقیق کی ایک نظر ڈالنے کی
ضرورت تھی۔ مگر یہ کام سخت محنت اور انتہائی دیدہ ریزی کا کام تھا جسے مولانا غلام رسول
صاحب مہر بی۔ اے ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب لاہور" نے نہایت محنت و جانفشانی سے انجام
دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غالب کے خطوط اور دوسری تصانیف کی ورق گردانی کرکے اور ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر مطالعہ کرکے حالات کا جمع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی مشکلات سے وہی حضرات واقف ہو سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے ریسرچ کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہو۔ مگر اس کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے نے جملہ واقعات کو تنقید صحیح اور واقعات تاریخ کی روشنی میں بھی جانچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے۔ مثلاً فاضل مصنف نے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:—

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بڑی محققانہ کتاب ہے۔ لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ مثلاً اس میں مرقوم ہے کہ غالب نے اپنے فارسی دیوان میں جا بجا اسد تخلص استعمال کیا ہے حالانکہ غالب کی کچھ اوپر تین سو غزلیات فارسی میں ایک جگہ بھی اسد تخلص

پتہ:- مہر انقلاب لاہور۔ قیمت تین روپیہ [illegible]

نہیں آیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ غالب کا مستقل وظیفہ یا خاندانی پنشن نہ شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپیہ ماہانہ تھی۔ پنشن سرکار انگریزی نے مقرر کی تھی۔ اور فیروزپور جھرکہ کی بقا تک اس سے متعلق رہی۔ بعد ازاں براہ راست انگریزی خزانہ سے متعلق ہو گئی۔ اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپیہ سال تھی۔ شاہ دہلی سے تاریخ نگاری کے صلے میں جو پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتدا جون ۱۸۵۰ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات پر چوالیس برس گزر چکے تھے "

فاضل مؤلف نے اِن بزرگوں سے بھی شرف نیاز حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا جو مرزا غالب سے تعلقات رشتہ داری رکھتے تھے۔ مثلاً نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو وغیرہ۔ فاضل مؤلف نے بڑی تلاش و تجسس سے مرزا غالب کے بعض ایسے خطوط بھی بہم پہونچاتے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اِس کتاب کے اسلوب بیان کی سب سے بڑی خوبی اس کا طریقہ استدلال ہے۔ لائق مصنف جگہ جگہ پختہ دلائل سے سابق تذکرہ نگاروں کی تردید و تصحیح کرتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب پہلے اسد تخلص فرماتے تھے۔ لیکن غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ اِس کے بارہ میں مولانا آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے کہ " (غالب) نے ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا " اس بیان کی تصحیح فاضل مؤلف نے اِس طرح کی ہے :-

" غالب ۱۲۴۲ھ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے ؎

جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو
لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اُردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔"

فاضل مؤلف کی یہ مستم ظریفی ہے کہ تحقیق و تدقیق کے دُھن میں وہ خود مرزا غالب پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً مرزا نے ایک خط میں حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی کو لکھا تھا کہ :-

" میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا "

رمولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھا:۔

نیائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور بہمراہی معین الملک گزید۔ چوں بساط معین الملک در نوشتند بہ دہلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہ در پیوست۔"

ن دونوں بیانوں پر فاضل مؤلف تنقید فرماتے ہیں کہ:۔

شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے ۱۷۵۳ء میں انتقال کر گئے تھے۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ غالب کے دادا احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔"

لکھنے کو تو فاضل مؤلف لکھ گئے لیکن بعد میں خیال آیا کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است"۔ اس لئے یوں لیپ پوت کرتے ہیں:۔

"غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔"

اسی طرح ایک جگہ اور جوش کی ہے:۔

"غالب نے ایک موقعہ پر بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقتہً ان کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو۔"

غرض جہاں تک تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے غالب پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں شائع ہوئی۔ زبان بھی ادبی ہے اگرچہ کہیں کہیں "پنجابیت" کا اظہار ہو گیا ہے۔ قدردانان غالب کے لئے یہ کتاب قابل دید ہے اور اسے بھی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں جگہ پانا چاہیئے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ سائز: حجم دو سو اسی صفحات، غالب کی تصویر اُن کی تحریر کا عکس اور نواب علاؤ الدین احمد خاں نام وثیقہ جانشینی کا عکس بھی ہے۔

زمانہ نومبر ۳۶ء

مرزا غالب کی بے اعتدالیاں

(از مسٹر اقبال انصاری، ایم۔ اے)

تذکروں کے مطالعہ کے بعد ہندوستانی شعراء مثلاً فیضی، بیدل۔ خان آرزو۔ قتیل۔ واقف۔ فاخر مکین وغیرہ ہندوستانی شاعروں کے کمال فن پر ہم فخر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم خود ہندی ہیں ان کے متعلق مرزا غالب کے خیالات پڑھتے ہیں تو ہمارا حوصلہ بڑی حد تک پست ہو جاتا ہے، خان آرزو ہی کے متعلق ایک طرف سروِ آزاد، خزانۂ عامرہ، عقدِ ثریا۔ چمنستان الشعراء۔ ریاض الشعراء سفینۂ خوشگو اور مجمع النفائس رکھیے اور دوسری طرف غالب کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیے

"وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔"

اس جملہ کے وزن نے اگرچہ تحقیق کی روشنی میں ان کی ادبی عظمت کو نہیں گھٹایا ہے۔ پھر بھی ایک فاضل مصنف کی زبان سے نکلنے کی وجہ سے اسے بہت کچھ سبک ضرور کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ خان آرزو بے مایہ ہیں، فارسی دانی سے نابلد ہیں، تحقیق میں غلطیاں کی ہیں تو بھی ان کے لئے یہی شرف کیا کم ہے' وہ فاضل جید تھے، اردو فارسی عربی میں شاعری کرتے تھے۔ صاحب تصنیفات تھے اور فارسی دانی میں شیخ علی حزیں، والہ داغستانی اور قزلباش خاں امید سے ٹکر لیتے تھے۔ سات دیوان اساتذۂ ایران مثلاً بابا فغانی، شفیعا اثر کمال خجندی وغیرہ کے جواب میں کہے۔ ساقی نامہ، مثنویاں، حکیم سنائی، ملا نوعی، زلالی، خوانساری اور ظہوری، ترشیزی کے جواب میں لکھیں، ایران اردو کا ایک بھی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکا جو یہاں کے کسی شاعر کا ہم رتبہ کہا جا سکتا۔ مرزا معز فطرت اور قزلباش خاں امید ضرور ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس میں جو انہوں نے کمال کیا ہے وہ یہ ہے، فطرت:-

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے   در گلشن آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

قزلباش خاں امید:-

در و دیوار سے اب صحبت ہے   یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں   الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

انیسؔ کے اشعار فطرت کے مقابلہ میں زیادہ صاف و سلیس ہیں، لیکن یہ اُردو کا وہ زمانہ تھا جبکہ یہ اپنے شباب پر پہونچ چکی تھی سوداؔ و میرؔ تقی کے اشعار کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے۔ ایرانیوں کی کاوشوں نے یہ چند شعر پیش کئے اور ادھر فیضیؔ۔ غلام علی آزادؔ۔ بیدلؔ و خان آرزوؔ کے ضخیم دیوان دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ شعرائے ایران قابل مدح و ستائش ہیں یا شعرائے ہندوستان۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میں اُردو کا اسکالر نہیں اور نہ غالبؔ سے بغض و عناد رکھتا ہوں، غالبؔ کا معتقد ہوں۔ اُن کے کمال فن کا معترف ہوں، اُن کی عزت اُسی طرح کرتا ہوں جیسے باسویل، ڈاکٹر جانسن کی کرتا تھا مگر جہاں باسویل نے ڈاکٹر جانسن کو Monarch of Literature (تاجدار ادب) کہا ہے۔ وہاں اُن معمولی معمولی واقعات اور غلطیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ادیب سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ جانسن کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ آئیے اسی نظریہ کے ماتحت ہم بھی غالبؔ کا مطالعہ کریں۔

یہاں پر ہم غالبؔ کے چند خطوط پیش کرتے ہیں۔ جن سے اُن کے تنقید کا نظریہ اور بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن قتیلؔ و واقفؔ و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونی طبع کہئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثریں صحیح کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکیؔ و عنصریؔ و خاقانیؔ و رشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن آموجاج کی طرف نہ لے جائے تب تادری جاتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"

ان سطروں میں تکمیل فارسی کے لئے دو چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں، تتبع اہل زبان و مناسبت طبیعت اور آگے چل کر قتیلؔ وغیرہ کی "موزونی طبع" کو مان بھی لیا، تو اب مناسبت طبیعت کی بحث بہت کچھ کم ہو گئی۔ غالباً مرزا صاحب کا خیال مناسبت طبیعت سے فطری ذوق ہے اور یہ بھی واقفؔ و قتیلؔ کے لئے مسلم ہے۔ واقفؔ کے متعلق تو یہاں تک ایرانی کہا کرتے تھے "زاغ ہند زبان طوطی از کجا یاد گرفت" اب تتبع اہل زبان باقی رہ گیا تو اس کے متعلق بھی تذکرے بتاتے ہیں

کہ قتیل و واقف نے نہایت اہتمام کے ساتھ حصول زبان کی طرف توجہ کی۔ قتیل اٹھارہ برس کے سن سے محمد باقر شہید اصفہانی کی زیرِ نگرانی و تربیت رہے اور شہیدی نے مرزا صاحب کے لئے قتیل تخلص پسند کیا۔ (عقد ثریا)

واقف کے تتبع کے متعلق سفینۂ ہندی قلمی پٹنہ لائبریری کا جائزہ لیجیے اور اس میں خود اُن کی شہادت سُنیئے کہ ابتدا میں وہ خوشگو اور آفریں لاہوری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اُن کی اصلاحیں واقف کو پسند نہیں تھیں۔ لہٰذا انھوں نے دیوانِ سعدی و خسرو کو سامنے رکھکر مشق سخن شروع کی۔ سعدی تو مسلمات میں سے ہیں اب رہ گئے امیر خسرو تو اُن کی زباندانی، اہلیت و عظمت کے خود مرزا غالب معترف ہیں اور فرماتے ہیں :-

"خسرو کہ خسروِ قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے"

جہاں تک اُصول تنقید کا تعلق تھا مرزا صاحب کے معیار پر قتیل و واقف پورے اُترتے ہیں، اُس پر بھی وہ تمام ہندوستانی شعراء کو ہیچ و پوچ بتاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی شاعر ایسے ہی جاہل تھے تو جمال اینجو شیرازی اور سرمدی کاشی اُن کے اشعار سند میں نہ پیش کرتے۔ قتیل و واقف نے تو تتبع کیا اور مرزا صاحب نے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اگر یہ فارسی الفاظ میں تصرف بھی کرتے تو بجا تھا اس لئے کہ ایرانیوں نے بیسیوں عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کیا ہے لہٰذا تصرف صاحب قدرتان ہند در فارسی چرا جائز نباشد" (دشمن) اور قتیل و واقف کے صاحب قدرت و قادر الکلام ہونے میں کوئی شک نہیں نہیں رکھو گی۔ عنصری و خاقانی وطوا ط کی مثال تو مرزا صاحب نے دی لیکن شہادت و توضیح سے یکقلم گریز کیا ہے۔ اس کو تعصب کے سوائے اور کیا سمجھا جائے ایک ہی ہو تو نہیں ہے۔ غالب کے اکثر و بیشتر خطوط سے اسی رویّہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح خود فیصلہ دیدیتے ہیں اور شہادت و صاحت سے ہمیشہ اغماض کرتے ہیں۔ وارستہ و خان آرزو ہی کا معاملہ لیجیے کہ اُس نے خان آرزو کا نام احترام سے لیا ہے۔ حاکم لاہوری کی غزلوں پر خان موصوف نے جو اعتراضات کئے تھے اُن کا جواب دیا ہے اور بہت سے اعتراضات کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں دو تین شعر پیش کئے ہیں جن میں انھوں نے بھی خان آرزو کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ مصطلحات میں بھی وارستہ نے خان آرزو پر کافی اعتراضات کئے ہیں لیکن اس کے بھی اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ ہندیوں کا کلام سند نہیں سمجھتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ شیخ علی حزیں کے سلک ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ باینہمہ اپنے قول کی تصدیق میں اُس نے وہی اشعار پیش کئے ہیں جو خان آرزو نے چراغ ہدایت میں دیئے تھے

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وارستہ کا تمام زندگی کا کارنامہ اور بنائے شہرت یہی مصطلحات ہے اور خان آرزو کی ذات مختلف علوم و فنون میں اس سے کئی گنا زیادہ ہے اور کئی گنا بے مثل ان کی تصنیفیں ہیں۔ وارستہ نے خان آرزو پر اعتراضات کرکے اپنے کو کامیاب بنایا مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس کام کے لئے اس نے خان آرزو ہی کی ذات کو منتخب کیا۔ اگر سراج اللغت و چراغ ہدایت نہ لکھی گئی ہوتیں تو غالباً آج وارستہ کے مصطلحات کا وجود بھی نہ ہوتا اور جس فن کے خان آرزو مخترع ہوئے اس کا یہ مکمل اصول بھی اصل و نقل کا جو فرق ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام اعتراضات صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے غلط بھی ہیں۔ اب مرزا غالب کا یہ کہنا کہ سیکڑوں اعتراضات ہیں اور ہر اعتراض بجا ہے بالکل قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں استدلال سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر وارستہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے" مرزا صاحب اگر ان مقامات کو پیش کرتے جہاں اسکو منہ کی کھانی پڑی تو سمجھ میں بھی آتا۔ اس کے علاوہ اپنے متقدم کے لئے یہ لہجہ اختیار کرنا بہت رکیک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

"...اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اس کی تصدیق نہ کردے تب تک اس کا کلام قابل استناد نہ ہو۔ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ آتے اور ہنگامہ آرا ہوتے بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی و قندھاری تھے اور اگر ایسا تھا کوئی عامۂ اہل ایران سے بھی ہو تو تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط او شرف الدین علی نیرودی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید نثریں کیوں خون جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے... میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں تب معلوم ہوگا کہ یہ کتنا لغو گو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے"

مرزا غالب کسی بات کے لئے جو کلیہ قائم کرتے ہیں اس پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ عود ہندی ہی میں ایک جگہ پر عرفی و ابوالفضل کے مباحثہ میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہیں اور یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا۔ گھر کے بڈھوں بڈھیوں سے فارسی سنی۔ یہاں پرشتی؟

تقریر زباں دانی کے لئے لازمی قرار دی گئی، اور پھر سطور بالا میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ تحریر اور ہے اور تقریر اور ہے۔ یہ کلیہ بھی بالکل صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ خسرو، فیضی و سرخوش اہل ایران کی تحریروں ہی کا نتیجہ ہیں۔ خان آرزو اپنی کتاب مثمر میں مرکب الفاظ کی بحث میں اہل زبان سے جو غلطیاں ہوتی ہیں، اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"چوں مرکبات را استعمالہائے خاص باشد عوام را بہ نکات ایں اصطلاح بتوسط بعضے از فضلائے ہند یکے از شعرائے ایران گفتہ کہ فقرائے شما فارسی را از پیرزالہائے خود آموختہ اند و ما از فصحائے شما مثل خاقانی و انوری و مراد فاضل مذکور ہمیں مرکبات است کہ در مقامہائے مختلف گونا گوں آمدہ و عوام ہمراہ آں ماننی، اند پس تربیت کردہ خواص بہتر از تربیت کردہ عوام"

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر غیر زباں دانوں نے اثر ڈالا تو یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ باقر شہید اصفہانی کی تربیت موجود ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر نے کیونکر ایسا غیر منصفانہ تبصرہ کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اعتراضات و تبصرے اُن کے دل کا غبار اور مخالفین کی ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اور ایسی صورت میں قتیل پر اعتراضات کر کے وہ اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ لیکن ہمیں اُن کے یہاں کچھ اور ملتا ہے جو مرزا ایسے مہذب انسان کے لئے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں۔ خیر اگر قتیل کو انہوں نے گالیاں دیں تو اُن کی آڑ لیکر تمام ہندوستانی ادب و شعر کو کیوں معرض تلف میں ڈال دیا۔ غیاث الدین۔ عبدالواسع ہانسوی و واقف وغیرہ کے متعلق کیوں اس قدر ناملائم الفاظ لکھے۔ یہ تو اُن کے ہمعصر بھی نہیں تھے کہ ان کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ معاندت کا نتیجہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعراء و علماء سب کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ اور آخر میں یہ بات بھی رہ جاتی ہے کہ آپ کو گالی دینے کا حق ہی کیا ہے۔ تنقید کا کوئی معیار گالیوں کو جائز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ غالب سے قبل کی صدیاں اس چیز کی متحمل نہیں تھیں کہ ہم اسے سوسائٹی کا نتیجہ کہہ دیں۔ اٹھارھویں صدی کو لیجئے، اس میں حزیں سے و خان آرزو سے معرکے ہوئے۔ آزاد حزیں آرزو ایک دوسرے پر اعتراضات کرتے تھے اور سب کچھ ہوتا تھا لیکن دامن تہذیب کو ہاتھ سے کہیں بھی جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہم کو اُن کی تحریروں میں آج بھی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا ہے جو مرزا صاحب کے ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ شیخ علی حزیں کی ایک ذات ضرور ملتی ہے مگر جن سے خان آرزو کے تعلقات بہت کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بھی مرزا صاحب ہی جیسے تھے۔

اور انھوں نے بھی خان آرزو کو بہانہ بنا کر تمام ہندوستان کی ہجو کر ڈالی اور خود شعرا کو صلواتیں سنائیں۔ لیکن آپ خان موصوف کا تمام کلام دیکھ ڈالئے ایک لفظ بھی علی حزیں کی شان کے خلاف نہ ملے گا۔ کوشش سے بھی آپ کو شیخ کے متعلق اس سے زیادہ سخت الفاظ نہ ملیں گے کہ "شاعر روستائی ایران" کہا گیا ہو۔ جہاں ادب و تہذیب کا یہ لحاظ رکھا گیا ہو وہاں قتیل کے متعلق "کھتری بچہ اُلّو کا پٹھا" "عبدالواسع کے لئے "کماگس آلو" اور غیاث الدین کے لئے "مسلم فرمایہ" وغیرہ کے معزز القاب سننا کون پسند کرے گا۔

یقیناً کسی شخص کی ادبی زندگی اس کے اخلاق سے بالکل علیحدہ چیز نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ غالب کے اخلاق اپنے بیوی، بھائی کے ساتھ عمدہ رہے جس کا ثبوت اُردوئے معلیٰ میں موجود ہے لیکن معاصرین وغیر معاصرین و ہندوستانی شعراء کے ذکر میں اخلاق و ہمہ دانی کے دعوے نے اُن کی شہرت و ادبیت کے پلے کو بہت ہلکا کر دیا ہے۔ اور ہم یہ دیکھ کر گھبراتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اس ذہنیت سے ہندوستانی ادب کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ غالب جہاں اپنی شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے باعث احترام کا مستحق ہے، وہاں اپنے نامناسب رایوں کی وجہ سے صد درجہ قابل الزام بھی ہے۔ اس قسم کی بے اعتدالیاں آپ کو غالب کے یہاں اکثر ملتی ہیں، جو کبھی تنقید کے غلط اصول اور کبھی گالی کے جیسی ہوتی ہیں۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ اگر مرزا صاحب خود بینی و خود پرستی کو دور کر سکتے تو آج تنقید کے وہ شاہکار ہمارے سامنے ہوتے جس کی دنیا میں نظیر نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے غالب جذبات کے سیلاب میں بہہ کر خدا معلوم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ آخر میں ہم عرفی کے چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، جن کو اُس نے غالباً ایسے ہی حضرات کے لئے کہے ہیں:-

بچشم مصلحت بنگر مصاحب نظم ہستی را	کہ ہر خارے درآں وادی در فردوس کا دیدن بینی
نگردد رہبت خاطر فروشو دیدۂ فطرت	اگر خواہی کہ حسن خار و گل یک یکساں بینی
تو سرا دیدۂ بر شعلۂ تابی بہ خاکستر	ببینی عشق خاکستر چو در رو نگاراں بینی
فراز ملک عراقی و اژگوں کن عادت پیشیں	اگر خواہی کہ حسن رونق ہندوستاں بینی

زمانہ جون سنہ ۳۲ء

خطوط غالب (جلد اوّل)

رقعات غالب کی بہت سی جلدیں مختلف ناموں سے شائع ہو چکی ہیں، ان میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ بہت پرانی ہیں لیکن ان میں مرزا کے بہت سے خطوط نہیں ہیں جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور احباب کے نام لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں میں تحریف یا سہو کاتب ہونے سے اکثر اصلی عبارت مسخ ہو گئی ہے شکر ہے کہ مولوی مہیش پرشاد صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس نے تلاش و تحقیق اور عرق ریزی سے سالہا سال کی محنت کے بعد خطوط غالب کے مختلف مجموعوں سے مقابلہ کر کے خطوط کی تصحیح کی۔ انھوں نے غالب کے دیگر خطوط بھی جو مطبوعہ کتب میں موجود نہیں تھے مختلف ذرائع سے جمع کر کے جدید ترتیب کے ساتھ حتی الامکان تاریخوار اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں۔ بعض خطوط کے عکس بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں اب تک جو کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں تھے اور جو خود مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مختلف بزرگوں کے ادبی خزانوں میں محفوظ تھے انھیں میں ایک خط وہی ہے جو مرزا نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا تھا۔

غالب کے خطوط اردو لٹریچر کا خزانہ ہیں۔ جسے جناب منشی مہیش پرشاد صاحب نے اس مجموعہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ شروع میں مولف کا دیباچہ بھی ہے جس میں ان خطوط کے متعلق تلاش و تجسس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب نے اصل میں کیا لکھا ہوگا اور کتابوں میں کیا چھپ گیا ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی توجہ سے یہ مجموعہ خاص طور پر قابل قدر ہو گیا ہے۔ مولوی مہیش پرشاد صاحب نے بھی اس مجموعے کو مرتب کر کے اردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے لئے قدردانان اردو کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ یہ مجموعہ اردو ٹائپ میں چھپا ہے اور چار سو صفحات سے زائد پر ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔

زمانہ اگست ۱۹۴۱ء

انتخاب دیوان غالب

از مسز سلیم جعفر

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کائنات کے ہر فرد کی اصلیت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی تہ تک پہونچنا ممکن نہیں بلکہ خراشی اور سینہ کاوی کے بعد بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمہ را

اکثر تاریخی واقعات بھی اس کلیہ کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ جب تک آنکھوں سے دیکھنے والے ان پر سے پردہ نہ اٹھائیں حقیقت رونما نہیں ہوتی اور وہ بحث و مباحثہ کی جولانگاہ بنے رہتے ہیں۔ "انتخاب دیوان غالب" اور "طباعت دیوان غالب" بھی دنیا کے اسی قسم کے تاریخی واقعات ہیں۔ طباعت دیوان غالب کا مسئلہ حل کرنے کے لئے جناب مظفر حسین صاحب تمیم نے ایک ڈراما تصنیف فرمایا، جو آل انڈیا ریڈیو پر نشر اور ہمایوں بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن اس قدر خراب چھپا کہ غالب تاب نہ لا سکے اور بے ساختہ دل سے آہ نکل ہی گئی۔[1] میرے پاس دیوان غالب کا ایک نسخہ ہے جو غالباً اس کی تیسری و چوتھی اشاعت ہے۔ خاتمۃ الطبع ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت و غفران محمد عبد الرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدیل ہوا۔ اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا، میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۸۲ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی

---

[1]
دیوان بندہ ما کہ آئینا سواد کرد — تنہا درونہ شعر بہ رہ نوشتہ است
از نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ — دیوان بندہ پر ز خوشامہ نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ آید مشکلا دید در سخن — دست تصرفش بہ ہر آید نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوان بندہ است — زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

نوٹ: افسوس ہے کہ یہ مضمون جنوری ۱۹۴۲ء میں وصول ہوا تھا۔ اتفاقی وجوہ کے اسقدر دیر بعد شائع ہو رہا ہے۔

پائیں ہمہ تم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔"

خاتمۃ الطبع میں جن محمد حسین خاں صاحب کا ذکر ہے وہ غالب مرحوم کے گلے کا ہار معلوم ہوتے ہیں غلط دیوان اُنھوں نے چھپوایا۔ تیسرا ایڈیشن جس کا ذکر آگے آئیگا اُنھیں کی "نادانی" کا نتیجہ تھا. اور میرے پاس والے نسخہ کے محرک بھی آپ ہی تھے۔ حاصل کلام میرے پاس ایک دیوان غالب ہے جو اس نسخے کی نقل ہے جسے خود غالب نے طباعت سے پہلے صحیح کیا ہے۔

لیکن اب تک میں جو کچھ لکھ آیا ہوں اُس کو میرے نفس مضمون سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو یہ کہ اس دیوان کے شروع میں ایک فارسی کا دیباچہ بھی ہے اور یہ اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے قصہ پاک کئے دیتا ہے کہ دیوان غالب کا انتخاب کس نے کیا۔ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کا یہ کہنا کہ :-

"مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اُسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا، دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

غلط ہے۔ اگر کچھ صحیح ہے تو مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کا یہ خیال کہ مرزا نے خود اپنے دیوان کا انتخاب کیا۔ آسی صاحب اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں :-

"خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں سے تھے اُن کے کمال سخن کے پورے راز داں تھے وہ جب آزاد کا یہ آب حیات والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصے کے مارے سُرخ ہو جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے۔"

اب اُس دیباچہ کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے جو اس نسخۂ دیوان غالب کے شروع میں ہے جو میرے پاس ہے اور جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے :-

"تمداں ومعدن بسخن افروزنما سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش یافتہ بکاوِ بکاوِ سینہ شکافتہ ام و از نفس دمہ تکاں برنہادہ۔ وکر دانش کی ماہ روزگار آرد ماندہ ام

توانا آمد کہ مجموعہ فرہنگ ستائی چراغ و رائحۂ عود را بال شناسائی۔ فرخ توانا بخشید۔ جانا نگارندہ
این نامہ را آن در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ گرد آمدہ دن سرمایۂ دیوان فارسی
برخیزد۔ وابستۂ منت کمال این فرید من پس زانوئے خویشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایان
سخنور ستائی پراگندہ ابیاتے کہ خارج اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک این نامہ سیاہ
نشناسند و جامہ گرد آوردن را در ستایش و نکوہش آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند یارب
این بیت ہستی ناشنیدہ از ہستی، پیدائی نارسیدۂ یعنی نقش بقعیر آمدۂ نقاش کہ باسد اللہ
خاں موسوم، بمیرزا نوشہ معروف، بغالب متخلص است چنانکہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است
فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔"

میرے نزدیک اس تحریر کے بعد جو بلا شبہ غالب کی اور تصنیف "آبحیات" سے پہلے کی ہے۔
"آزاد مرحوم نے جو دعویٰ کیا ہے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور اب اس کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے کہ
اپنے دیوان کا انتخاب خود غالب مرحوم نے کیا۔ یہ عبارت اُن کے سوا کسی اور کی نہیں، اس کا ثبوت
یہ ہے کہ شروع شروع میں صیغے واحد متکلم استعمال کئے گئے ہیں۔
لیکن منطق کو عقل آرائی کی گنجائش باقی ہے کیونکہ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ غالباً تیسرا ایڈیشن
ہی ہے۔ "دیوان غالب کی طباعت" سے صاف صاف ظاہر ہے کہ پہلا ایڈیشن ناپید ہو چکا تھا۔
جب دوسرا ایڈیشن مولوی محمد حسین صاحب نے شاہدرہ میں چھپوایا۔ مگر نظم طبا طبائی مرحوم کی
شرح دیوان غالب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ایک نسخہ چھپا ہے جس کے ساتھ غالب کا اُردو
کا دیباچہ شائع ہوا ہے، وہ یہ تھا:۔

جو دیوان خود مصنف مرحوم کی تصحیح سے چھپا ہے اس کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:۔
"وداد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و
حاد آئیں میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی
مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع
میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔
اور جناب نظامی بدایونی صاحب نے جو دیوان غالب مطبع نظامی بدایوں سے شائع کیا ہے
اُس کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"اس سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے ہیں

جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔"

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ متضاد مضامین کی وجہ سے بہت کچھ باعث حیرانی بن گیا ہے خاص کر اس سبب کہ دیباچہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے والے خود حضرت غالب ہیں خاتمۃ الطبع ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تصحیح خود حضرت مصنف نے کی ہے۔ اس معنی میں کہ یہ صحیح کئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے۔ یہ اُن کے حیات میں چھپا ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر آزاد "آخر ۷۳ برس کی عمر سنہ ۱۸۶۹ء سنہ ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا۔" اور اس کا سال طباعت سنہ ۱۲۷۸ھ ہے۔

چونکہ اس دیوان غالب کے دیباچہ سے "انتخاب دیوان غالب" کا سا تمنازعہ فیہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوا جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی صاحب مختلف نسخوں کو جمع کر کے جو رائے میں نے ظاہر کی ہے اس سے بہتر نتیجہ تحقیقات پیش فرمائیں تو دلدادگان کلام غالب پر احسان ہوگا۔

اس مختصر مجموعۂ کلام کے بعد نسخۂ حمیدیہ شائع ہو چکا ہے اور مولوی عبدالباری صاحب آسی بھی کلام غیر مطبوعہ مع شرح چھپوا چکے ہیں۔ گلہائے چمنستان غالب سے مشام جاں معطر کرنے والوں پہ لطف و کرم ہے لیکن انھیں ذرا اس دست برداری پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔

"امید کہ سخن سرایان سخنور ستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک ایں نامۂ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورد را درستایش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔"

۵ ماہ ستمبر ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب اُردو کے قلمی نسخے

از پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل ہندو یونیورسٹی

رقعات و حالات غالب کے سلسلے میں جو چیزیں میری نظر سے گذری ہیں۔ انھیں سے مرزا غالب کے اُردو دیوان کے چار قلمی نسخے بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات میں ہیں، مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور مختلف حضرات کے تصرف میں ہیں۔ ممکن ہے کہ ان نسخوں سے بعض شیدائیاں کلام غالب کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ لہذا اُن کے بارے میں کچھ باتیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

۱۔ رام پور

یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء) میں لکھا گیا ہے بہت ہی عمدہ لکھا ہوا ہے۔ ریاست کے سرکاری کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ذکر مکاتیب غالب میں شرح و بسط کے ساتھ ہے۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں جب مرزا رامپور گئے تھے تو اسی نسخے کی نقل لی اور اسے نواب ضیاء الدین خان بہادر کے پاس بھیجا اور بعدہٗ اسی کو منشی شیو نراین صاحب متوطن آگرہ کو دیدیا۔ چنانچہ آیندہ سطور میں اُس کے بارے میں زیادہ لکھا جائے گا۔

۲۔ رام پور

یہ نسخہ بھی ریاست کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہیں تیار کرایا گیا تھا، اس کی ترتیب غالب مروجہ نسخوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ بھی عمدہ لکھا ہوا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا کہ بلفظ عمیق اس کو دیکھتا۔ تاہم میرے لئے ضروری تھا کہ اسمیں چند امور کو دیکھتا۔ چنانچہ میں نے دیکھا اور مناسب نتیجہ پر پہونچا۔ کلام غالب کے قدر دانوں کو اس کو بھی غور و خوض سے دیکھنا چاہئے۔

۳۔ مقبوضہ پنڈت گوپی ناتھ کنزرو

یہ نسخہ رام پور کے نسخہ ۱ (محررہ ۱۲۷۱ھ) سے منقول ہے۔ یہی منشی شیو نراین صاحب کے پاس آگرہ جون ۱۸۶۰ء میں بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا۔ اور اب پنڈت گوپی ناتھ کنزرو صاحب کے پاس الہ آباد میں ہے۔ اِس کے ساتھ ایک اصل خط کا جزو بھی ہے۔ جسے مرزا نے دیوان کے ساتھ

منشی شیونرائن صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں شائع نہیں ہوا اور اس کا جو حصہ محفوظ ہے وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے لہٰذا اس جز کی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے۔

"صاحب، میں تمھارا گنہگار ہوں۔ تمھاری کتاب میں نے دبا ۔۔۔۔[1] بڑی کوشش و محنت سے اس کو وہاں نہ بھیجنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانا[2] کیا ہے۔ تو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا نہ چھاپو۔ جو تمھاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیش جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور چھاپیاں زرا[2] تصحیح کا خیال رکھیو۔[3]"

یہ نسخہ بھی عمدہ لکھا گیا ہے۔ مرزا چاہتے تھے کہ یہ نسخہ آیندہ اشاعت کا موجب ہو۔ لہٰذا صحت کا خاص اہتمام کیا ہے اور مرزا نے اس کو اتم و اکمل بتلایا تھا۔ اسی نسخہ کا ذکر مرزا کے کئی خطوط میں ہے۔ جو اُردوے معلیٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہاں اب میں اپنے کرمفرما جناب پنڈت صاحب کا بہت شکر گذار ہوں۔ جنکی عنایت سے میں دیوان کو کئی مرتبہ بخوبی دیکھ سکا۔ انھوں نے خط کی نقل لینے کی بھی بخوشی اجازت دی۔ اب رہا یہ کہ دیوان و خط کیونکر انھیں میسر آئے۔ ان امور پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

۴۔ مقبوضہ جناب سید آغا محمد میرزا صاحب

یہ بھی ایسا نسخہ ہے جس کے بابت میں مرزا کو کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ یہ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہے اس کے کاتب جناب سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف حسین میرزا صاحب[4] مرزا غالب کے گہرے دوست تھے۔ یہ نسخہ اب جناب سید آغا محمد میرزا صاحب کے پاس ہے جو کاتب موصوف کے پوتے ہیں۔ جن کا اصلی مکان چھتہ چوتیا محلہ فراش خانہ دہلی میں ہے۔ لیکن میں نے جناب سید صاحب اور اُن کے اعزہ کی مہربانی سے اس نسخہ کو مارچ ۱۹۳۶ء میں ٹیلیگراف اسکوائر نئی دہلی میں دیکھا تھا جہاں کہ جناب سید صاحب اُس وقت مقیم تھے۔

اسی نسخہ کو جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد صاحب نے شائع کیا ہے۔ اس

---

[1] مراد جون سنہ ۱۸۶۲ء۔ مضمون نگار

[2] "روانا" اور "زرا" جیسا مرزا نے لکھا ہے۔ ویسا ہی یہاں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار

[3] خط بنام منشی شیونرائن صاحب مورخہ ۲ جولائی ۱۸۶۲ء (اُردوے معلیٰ میں)۔ مضمون نگار

[4] اس کے آخر میں مرزا کی تحریر و مہر ہے۔ مضمون نگار

نسخہ کے زائد اوراق میں مرزا کے کہے ہوئے مرثیے کے وہ تمام بند بھی درج ہیں۔ جس کا محض پہلا بند مولانا حالؔی نے "یادگار غالب" میں درج کیا ہے۔

ہاں یہ بھی واضح رہے کہ رام پور میں جو نسخہ نقل ہوا تھا وہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے گیا۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اُس کی مدد سے تیار نہیں ہوا ہے اور نہ یہ اُس کی نقل ہے۔ بلکہ جناب سید صاحب کی جداگانہ کوشش کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے۔

اِن کے علاوہ دو نسخوں کا پتہ بعض حضرات کی تحریروں سے اور چلا ہے۔ لیکن میں نے یہاں محض اُنھیں نسخوں کا ذکر کیا ہے جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قلمی نسخوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو بعض غزلوں کے وقت تصنیف معین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور بعض لفظوں یا مصرعوں کے باب میں مناسب رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

" زمانہ " فروری ۴۰ء

دیوان غالب

ہمارا مسلمہ ہے کہ کسی شخص کی حقیقی قدر و منزلت سے ہم صرف اسوقت واقف ہوتے ہیں جب وہ ہم سے جدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم کو اپنے زمانہ میں وہ عزت و شہرت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن آج غالب پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہر ذی علم اہل نظر کلام غالب کو حرز جان بنائے ہوئے ہے۔ یہ دیکھکر رشک پیدا ہوتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

غریب اردو کا تو ذکر ہی کیا غالباً دنیا کی کسی زبان میں کسی سخنور کے کلام کی اتنی شرحیں نہ لکھی گئی ہونگی جتنی غالب کے مختصر دیوان اردو کی لکھی جا چکی ہیں اور ابھی تک لکھی جا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ دیوان غالب کے معمولی اڈیشن سے لیکر اعلے درجہ تک متعدد اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دیوان غالب مطبوعہ مطبع شرکت کاویانی برلن (جرمنی) ہے جو اسوقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ اعلے قسم کے کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے۔ ہر صفحہ پر سونے جدولیں ہیں خوبصورت بیل کی تعلیق اور جلد منقش و مذہب ہے۔ غرض حسن صورت کے لحاظ سے یہ نسخہ قابل دید ہے

زمانہ ستمبر

بیان غالب

کلام غالب پر متعدد شرحیں موجود ہیں۔ موجودہ شرح کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں جناب آغا محمد باقر صاحب ایم اے نے اختصار کے ساتھ ان تمام شرحوں کو یکجا کر دیا ہے جن اشعار پر شارحین میں اختلاف ہے ان کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اسطرح پڑھنے والا آسانی سے یہ سمجھ جائیگا کہ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں دیوان غالب کی یہ ایک عمدہ شرح ہے جس نے دوسری شرحوں کی ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ طالب علموں کے لئے اسکا مطالعہ ضروری ہے۔ شروع میں پوری غزل دیدی گئی ہے اسکے بعد ہر شعر کا مطلب درج ہے۔ قیمت مجلد ڈھائی روپیہ۔ غیر مجلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ - لاہور

دانش اگست

روحِ غالبؔ

جتنی شرحیں کلامِ غالبؔ اور جتنی سوانح عمریاں مرزا موصوف کی لکھی جا چکی ہیں اتنی کسی اور اُردو شاعر اور ادیب کی نہیں لکھی گئیں، اور ابھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پہلے خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ لکھ کر مرزا غالبؔ کی خوبصورت تصویر پبلک کے سامنے پیش کی اور حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنا مشہور مقدمہ لکھ کر مرزا غالبؔ کو نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پھر تو دیوانِ غالبؔ کے مختلف اڈیشنوں، دیوان کی شرحوں اور سوانح عمریوں کا تانتا لگ گیا۔ مولانا حالیؔ کی یادگارِ غالبؔ اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمہ کے علاوہ اس وقت تک غالبؔ کی شرحیں اور سوانح عمریاں ایک درجن سے زیادہ منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ حال میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "روحِ غالبؔ" کے نام سے مرزا کے سوانحِ حیات لکھے ہیں اور تحقیقِ واقعات کی داد دی ہے۔ "روحِ غالبؔ" میں ڈاکٹر صاحب نے ان کتابوں اور ان شرحوں کی بھی تفصیل دی ہے جو مرزا غالبؔ اور اُن کے دیوان پر اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد غالبؔ کے مستند واقعاتِ زندگی مختصراً درج کئے ہیں، اور اسی کے ساتھ مرزا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک علیحدہ باب میں غالبؔ کے ادبی کارنامے بیان کئے ہیں جس میں اُردو فارسی اور نظم و نثر دونوں قسم کی تصانیف آ گئی ہیں۔ اس کے بعد غالبؔ کے شاگردوں کا مختصر حال ہے۔ آخری باب میں جو سب سے اہم ہے غالبؔ کے خطوط درج ہیں جو بجائے خود ایک شاندار لٹریچر ہے۔

زورؔ صاحب کے قلم میں زور ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے مختصر مگر تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ شروع میں مرزا غالبؔ کی پُرانی تصویر اور خود ڈاکٹر زورؔ کا فوٹو بھی شامل ہیں۔

زمانہ: ستمبر ۱۹۳۸ء

دیوان غالب اردو

حضرت نظامی بدایونی نے دیوان غالب کو جس حسن ترتیب سے چھپایا اسکی سخت ضرورت تھی بہ نسبت سابقہ مطبوعہ دیوان کے جلی - خوشخط - کاغذ عمدہ - بین السطور واضح یعنی صرف گیارہ سطری صفحہ ہے - مولف نے ابتدا میں غالب مرحوم کے مختصر سوانحی حالات لکھے ہیں اور مختلف مشکل اشعار کی شرح بھی کی ہے - آخر میں کچھ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو دیوان میں نہیں چھپے ہیں -

اردو شعرا میں غالب ہی ایسے خوش نصیب ہیں کہ انکے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں اور ابھی مزید اہتمام سے انکا دیوان مرتب کرانے کا خیال دلون میں ہے -

حضرت نظامی کا مرتبہ دیوان اس قابل ہے کہ تمام علم دوست خصوصاً کلام غالب کے شیدائی ضرور ملاحظہ فرماوین - قیمت عمر

اردو شعرا میں غالب کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے - ارباب ذوق انکے ایک ایک شعر پر سر دھنتے ہیں - دراصل زمانہ حال میں جتنی قدر دانی غالب کی ہوئی ہے کسی دوسرے شاعر کی نہیں ہوئی - اردو دیوان کی کئی شرحیں شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی اسکے اعلی اعلی ایڈیشن چھپ رہے ہیں - ہمارے صوبہ میں سید راس مسعود صاحب بی - اے - ناظم تعلیمات سرکار نظام کی تحریک سے نظامی پریس بدایون نے دیوان غالب کے کئی نہایت قابل قدر ایڈیشن شائع کئے ہیں - حال میں ایک پاکٹ ایڈیشن بھی چھاپا ہے جسمین مرزا غالب کی تصویر اور سوانح عمری ہے اور ایک غیر مطبوعہ عکسی خط اور اصل دیوان کا فارسی دیباچہ بھی درج کیا گیا ہے - ایک طولانی مقدمہ میں کلام غالب کی فلسفانہ تنقید بھی کی گئی ہے - دیوان کے ساتھ مولانا نظامی کی ایک مختصر شرح بھی شامل ہے جسمین خصوصیت سے کوشش کی گئی ہے کہ اشعار کا مطلب خود غالب کے زبان میں ادا کیا جائے - دیوان کی قیمت عہ/ ہے اور نظامی پریس بدایون سے ملسکتا ہے -

مطبع گلاب سنگھ لاہور نے دیوان غالب کا ایک خاص ایڈیشن شائع کیا ہے جسکو ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب بانی مخزن لاہور نے مرتب کیا ہے - اسکی قیمت صرف ایک روپیہ ہے -

'نگار' جنوری ۱۹۲۱ء' جون ۱۹۲۰ء

دیوان غالب (مرقع چغتائی)

یورپ و امریکہ میں ادب و آرٹ دونوں ایک دوسرے کی پیش دستی کرتے ہیں۔ چنانچہ بیسوں مشہور مصوروں نے عمر خیام کی رباعیات کی تشریح و توضیح میں اپنا کمال فن ختم کر دیا ہے۔ ہندوستان کے بعض کاملین فن نے بھی عمر خیام کے نظریہ کے مرقع کھینچ کر فن مصوری کو داد دی ہے۔ مگر ابھی تک کسی اردو شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ شکر ہے کہ اس کمی کو مشہور مصور مسٹر عبدالرحمن چغتائی نے جن کے کمال فن کے اکثر نمونے ہم ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں پورا کر دیا ہے۔ آپ اردو میں بھی آرٹ اور ادب کو ایک مقام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی خیال سے آپ نے اردو کلام غالب کا ایک باتصویر ایڈیشن تیار کیا ہے جس میں صحت، حسن طبع سب ہی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور کلام کے متعلق چار چار، پانچ پانچ رنگوں کی اٹھارہ تصویریں بھی حضرت چغتائی نے بنائی ہیں۔ یہ تصویریں خاص اہتمام سے یورپ سے سنہری [illegible] چھپ کر آئی ہیں۔ [illegible] محض پنسل کی ہیں مگر یہ بھی مختلف رنگوں سے بڑی چھاپی گئی ہیں۔ گیارہ مرقعے کی رنگین تصویریں ہیں جو [illegible] کے طریقے سے نہایت [illegible] انگلستان میں چھپی ہیں۔ گیارہ تصویریں قدیم ایرانی اور مغل مرقعوں کی تقلید میں ایلومینیٹڈ [illegible] ہیں۔ چنانچہ ہر ایک سات سات [illegible] رنگوں میں چھپی گئی ہے۔ غرض ہر طرح سے اس مجموعۂ ادب و فن کو مکمل و خوشنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر اقبال نے پندرہ صفحات کا ایک عالمانہ دیباچہ لکھا ہے۔ تین سو صفحات پر ختم ہوا ہے۔ تقطیع ۱۲×۱۰ انچ ہے۔ جلد مراکو چرم کی ہوگی۔ ایک خاص طور پر نفیس خوشنما ایڈیشن شائع ہوگا جس کی صرف دو سو دس جلدیں ہوں گی اور جس کی قیمت ایک سو [illegible] روپیہ رکھی گئی ہے۔ معمولی ایڈیشن کی قیمت غالباً پندرہ روپیہ ہوگی۔ ہم کو امید ہے کہ قدردانان ادب اس کوشش کی قدردانی کر کے اپنی [illegible] حوصلہ افزائی کریں گے۔ ہم کو امید ہے کہ [illegible] اس ایڈیشن کی قدر افزائی کر کے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیں گے [illegible] زمانہ میں بھی [illegible] کر سکتے ہیں۔

(علمی خبریں اور نوٹ)

غالب پر اہم خبریں

اُردو نثر خصوصاً خطوط نویسی میں غالب کا طرزِ تحریر اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ چنانچہ غالب کے خطوط کے دو ضخیم مجموعے "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلّیٰ" کے نام سے بیسیوں دفعہ چھپ کر مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اب قدردانِ غالب یہ سنکر خوش ہونگے کہ ایک عرصے سے ہمارے دوست پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ عربی فارسی و اُردو بنارس یونیورسٹی خطوطِ غالب کی ازسرِنو ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں یہ مجموعہ اب تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ لیکن فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ ابھی غالب مرحوم کے بعض خطوط انکو جو نہیں پہونچے ہیں۔ یہ خطوط ہز ہائینس نواب صاحب رامپور اور ہز ہائینس نواب صاحب لوہارو کے قبضہ میں بتائے جاتے ہیں۔ ہم کو نواب صاحبان ممدوح کی علم دوستی سے توقع ہے کہ وہ مؤلف کو خطوطِ مطلوبہ کی نقل مرحمت فرما کر ایک بہت بڑی علمی ضرورت کو پورا کرنا پسند فرمائیں گے۔

مولانا سیماب اکبرآبادی نے مرزا غالب کے اُردو کلام کی شرح لکھنی شروع کی ہے جو ابھی حرف "ج" تک پہونچی ہے۔ یہ شرح اُن کے رسالہ "شاعر" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔

رنگپور سے عبداللہ یوسف علی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کو غالب مرحوم کی قلمی بیاض کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جس پر خود غالب کے دستخط موجود ہیں۔

'زمانہ' اگست ۱۹۳۵ء

حیدرآباد دکن کے نوجوان ادیب محمد رفیق صاحب خاور ایم۔ اے نے مرزا غالب کی بعض اُردو فارسی غزلوں کا انگریزی میں آزادانہ ترجمہ کیا ہے جس کا نام "انڈین خیام" رکھا ہے۔ اس ترجمہ پر لندن یونیورسٹی کے پروفیسر گریہم بیلی نے ایک شاندار مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کتاب جلد شائع ہونے والی ہے۔

(علمی خبریں اور نوٹ)

مُباحثہ

قتیل اور غالب

(از حکیم ابوالعلاء ناطق صاحب لکھنوی)

بذکرہ کہ شیے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدن ست مخسپ

سید اسد علی صاحب انوری نے "قتیل اور غالب" کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر مکتبہ جامعہ دہلی میں چھپوایا ہے جس کا اصل مقصد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کو غالب نے جو زبان و قلم سے مقتول کیا ہے اس کا انتقام لیا جائے اسی لئے غالب کی زندگی کا کوئی شعبہ باقی نہیں رہا جس کے پوست کندہ حالات قلمبند نہ کئے گئے ہوں اور ہر بات بڑی قیاسات یا استدلال سے لکھی گئی جس کی وجہ سے یہ کتاب قابل توجہ ہو گئی ہے۔

جن لوگوں نے اس کتاب کو تمام و کمال نہیں دیکھا اُن کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ قتیل اور غالب کا ادبیات میں مقابلہ اور موازنہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ مؤلف نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ غالب فارسی میں تو غالب تھا ہی اردو میں بھی تخئیل کے لحاظ سے قتیل کو کوئی نسبت نہیں تھی، کیونکہ قتیل کا مایۂ ناز کمال شاعری تھا جس سے اردو شاعری سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتا تھا

انوری صاحب نے قتیل پر سے وہ اعتراضات رفع کئے ہیں جو غالب کی طرف سے وارد کئے گئے ہیں، اور غالب پر ہر حیثیت سے اعتراضات کئے ہیں مثلاً چند عنوان پیش کرتا ہوں جو اس کتاب کے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

بداخلاقی، محسن کشی، عشق بازی، عزیزوں سے بے رخی، بے وفائی، نفرت انتقام، خطاب کی ہوس، انگریزوں کی خوشامد، ادبیات میں صحت و سند کا غلط معیار، اساتذۂ سلف کا حسب ضرورت اقرار اور انکار، معروف و مقبول اہل کمال سے رشک و حسد اور دشمنی، قتیل سے دشمنی اور کلکتہ میں غالب پر اعتراضات، غالب کی ادبی نا اہلیاں مکان قاطع برہان و قصہ۔

میں اقبحہ بگار، غالب کا معتقد ہوں، خصوصاً اردو شاعری کی تخئیل و طرز ادا کا، اور فارسی کلام کی قدر و قیمت میں فارسی کا، اور ہمیشہ ان عیوب کو تقریراً اور تحریراً رد کرتا رہا ہوں جو کسی نے ان پر لگائے ہیں مگر انوری صاحب کی تصنیف نے ایسا ہیجان پیدا کر دیا ہے کہ دل گو یہ تن ہے۔ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

تاہم اخلاقی اور ادبی فرق یہ ہے کہ ایک کامل فن شاعر جو مرنے کے بعد دعائے مغفرت کا محتاج ہے۔ یہ اس کی لاش پر ذلت اور رسوائی کی بارش ہو رہی ہے اگر سائبان نہ ہو سکے تو چھتری ہی لگا دی جائے۔ اخلاقی حیثیت سے غالب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے رئیسوں کی خوشامد کی ہے اور سب سے پہلے انگریزوں کی مدح میں قصائد لکھے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلاطین عالم اور حکام وقت کی مدح میں متنبی، ابو نواس، اصمعی سے لیکر انوری، عرفی، خسرو، سودا اور انشا۔ ذوق تک سب ہی نے قصائد لکھے اور سب نے دنیوی منافع کے لئے مدح خوانی کی بلکہ تمام دنیا میں ایسے شعرا بہت کم نکلیں گے جنھوں نے قصیدہ گوئی سے گریز کیا ہو جس کو دیکھنا ہو تذکرۂ عامہ ان کا تذکرہ دیکھ لے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے کچھ زیادہ لوگوں کی مدح سرائی کی یا مدح میں زیادہ قصیدے لکھے تو اس کی ذمہ داری ان رؤسا پر ہے جنھوں نے قدر نہیں کی اور بخل سے کام لیا ورنہ اگر کوئی رئیس قدر دانی کرتا تو وہ کیوں مارے مارے پھرتے۔ امیر خسرو نے کتنی جگہ ملازمت کی، اور کتنی جگہ ایک جگہ سے دوسری جگہ صرف جلب منفعت کے لئے تبدیل ملازمت کر کے گئے، اور اپنے قدیم وطن کو چھوڑا۔

اردو شاعروں میں میر محمد تقی میر کو غالب سے بھی زیادہ در در کے دھکے کھانے پڑے، اور سوائے لکھنؤ کے کہیں پناہ نہ کر سکے۔ غالب کو بھی انھیں لوگوں میں سمجھیے

دوسرا اعتراض غالب پر یہ ہے کہ انھوں نے وطن اور بیوی اور اعزا کی شکایت کی اور ان سے اچھا نہیں کیا۔ ان امور کے متعلق گزارش یہ ہے کہ وطن کیا اگر جنت بھی ہو تو ہر آدمی خصوصاً شاعر جو ایک آزاد سے کم نہیں ہوتا ایک جگہ رہتے رہتے کیوں نہ گھبرا جائے۔ خصوصاً جبکہ وطن میں آمدنی محدود ہو اور مزید میں اضافہ۔ رہ گئیں بیوی وہ بیگانہ طبیعت رکھتی تھیں، یہ رند وہ متقی، ان کی آمدنی میں کوئی حصہ نہ تھا بلکہ کچھ اضافہ ہوتا ہے، وہاں انھوں نے پنشن بھی اپنے نام کرالی تھی۔ پھر اعزا کی کفالت اور کنبہ پروری کہاں سے ہوتی۔

غالب کی فحش کلامی۔ غالب نے غصے میں جو فحش الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ عام و خاص خصوصاً مذاق سلیم رکھنے والے لوگوں کے نقطۂ نظر سے نہ صرف کریہہ بلکہ غیر شریفانہ ہیں۔ مگر دہلی کے عام مذاق سے کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہیں۔ وہاں کے لوگ باہم مزاحیہ طور پر ایسے الفاظ استعمال کرنے کے اکثر عادی ہیں اور شاہ نصیر، سودا اور انشا کے فواحش سخن کو دیکھ کر غالب کا یہ جرم خفیف سمجھنا چاہئے۔ یوں بھی طعن و تشنیع کے پیہم سلسلے نے غالب کے غیظ و غضب کے شعلوں کو اس قدر بلند کر دیا تھا کہ ان کی زبان قابو میں نہ رہ سکی۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ غالب سے زیادہ میر کو قدرت نے در بدر پھرایا تھا۔ اور جو اثر روزگار نے جو صدمات

تیر کو پہنچ گئے تھے وہ غالب تک نہ پہنچے تھے۔ لیکن یہ طبعاً صدمات کے اثر کو دل میں جذب اور ضبط کرتے رہتے تھے اور غالب میں اس قدر نفسی قوت نہ تھی۔ بیشک اُن کا یہ جرم کہ انھوں نے تخیل کی روح تک کو غیر مہذب الفاظ کے شعلے پہونچائے قابلِ معذرت (قبولِ معذرت کے قابل) نہیں ہیں، پھر بھی جس طرح انھوں نے تخیل کی روح کو صدمہ پہونچایا ہے ہم کو مناسب نہیں کہ ہم غالب کی روح کو شرمندہ کریں۔

کلامِ غالب کے ادبی کارنامے چار شکلوں میں ہیں۔ اُردو نثر۔ فارسی نثر فارسی نظم اُردو نظم۔ اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط ہیں، بہت کم حصہ تقریظوں کی شکل میں ہے، جیسے فسانۂ عجائب سرور کی تقریظ، جو کہ بالکل اُسی رنگ میں ہے جس رنگ میں فسانۂ عجائب ہے۔ اور یہ طرزِ عبارت اُس زمانہ کا بہترین اور پُرکار نقشِ انشا سمجھا جاتا ہے۔ جو بعد کو سادہ لباس میں تبدیل ہوا اور جس کے اعلیٰ ترین مناظر خواجہ درد کے سہلِ ممتنع اشعار میں سب سے بلندی پر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کے بعد غالب کی اُردوئے معلیٰ ہے۔ اور ذوق و آتش کے کلیات ہیں۔

غالب کی فارسی نثر، جو کلیاتِ نثرِ فارسی کے نام سے طبع ہو گئی ہے۔ ان کی فارسی نثر و نظم خسرو کے بعد نقشِ ثانی فخرِ ہندوستان ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان گملائے ایران کو ہندیت کے پانی سے غالب نے نہیں سینچا ہے۔

مگر اُردو غزلوں میں اُردو کی بیخ و بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ اگر ذوق و آتش اور خود اُن کے خطوط نہ ہوتے تو اُردو زبان اپنی ترقی اور صفائی و لطافت کی شاہراہ سے گمراہ ہو کر منزلِ تکمیل سے منحرف ہو جاتی۔ انھوں نے اپنی اُردو شاعری کا اصل اصول یہ رکھا تھا کہ جس قافیے کے ماتحت اُن کو ایسا جدید اور لطیف مضمون مل جاتا تھا کہ شعر ممتنع ہو کر نظم ہو جائے اس میں کوئی اغلاق یا ترکیبِ فارسی نامانوس داخل نہیں کرتے تھے، اور اگر ایسا مضمون نہیں ملتا تھا تو شعر کو عام سطح سے بلند کر کے ایسی پیچیدگی ڈال دیتے تھے اور الفاظ اس قدر ثقیل کر دیتے تھے کہ خواہ مخواہ اکثر یہ مرد آدمی معلوم ہوا ہے کہ دیوان میں ایک حد تک کے اشعار ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ فارسی کے ٹکڑے اُردو زبان کے راستے میں روڑے بن گئے، حالانکہ شعر کی تمام لطافتوں نزاکتوں اور تاثیر و کیفیتِ شعری کا دارومدار زبان کی خوبی اور فصاحت ہے۔ جس شعر کے اثر اور برمحل الفاظ کی حقیقت اور فلسفے پر غور کیجئے گا تو اُس کی تہ میں زبان کی خوبیاں پوشیدہ نظر آئیں گی۔

خود غالب نے اپنے اس رنگ کے اشعار میں بے کیفی محسوس کر لی تھی، اور ایک مرتبہ ذوق پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ میں اپنے اس ادبی نقص سے ناواقف نہیں ہوں۔ ع بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است۔

یہ بیرنگی صرف اس وجہ سے تھی کہ اُردو بچپن کے حلق میں فارسی کے لقمے اور سخت نوالے ٹھونسے گئے جو اس قدر ثقیل تھے کہ چالیس سال کے بعد ہضم ہوئے۔ اور اب اُن کی قدر ہوئی۔ مگر ترجمہ کرنے والوں میں

جو شعر معتقدِ غالب ہو گئے اُن کو نہ تو یہ قابلیت ہے کہ جہاں فارسی ترکیب غلط یا صحیح استعمال کرکے شعر کا عام سطح سے بلند کیا ہے، وہاں غالب کی پوری تقلید کرکے غالب کے ایسے سہل ممتنع شعر اور نادر الوجود نکتے بھی پیدا کرکے دکھاتے۔ ورنہ تقلید سہل سے بجز تحصیل سہل اور کیا حاصل۔ اور اُردو کی تخریب کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں کچھ ایسے بھی معتقدِ غالب ہوئے ہیں جو وحشت (کلکتہ) اور حسرت لکھنوی کی طرح غالب کی صحیح ترکیبوں تک غالب کی تقلید محدود رکھتے ہیں، اور جدت اور تجدید بھی رکھتے ہیں۔ بہرحال غالب کی فارسی نما اُردو نے اُس وقت غالب کو ذوق کے مقابلے میں ناکام رکھا۔ ادھر نوجوان اور شوخ مزاج شاعروں نے سہل مکاٹے اور مضحک بے ہودگی کے اشعار جوڑے اور غالب کو چڑھانے کے لئے اُن کے سامنے پڑھے اور تمسخر کرکے اُن کو جلایا۔

اُردو کلام کی تو یہ گت ہوئی اور فارسی کا یہ حشر ہوا کہ باوصف کمال و کامیابی اُن کی عدم ہر دلعزیزی کا ایک سیلاب دہلی سے بنگال تک پھیل گیا۔ ہر طرف سے لے دے ہونے لگی۔ ہر طرف اعتراضوں کے طومار ہول کی آندھیاں اور نفرت و عداوت کے شعلے اُٹھنے لگے۔ اتنا بڑا کامل فن جس نے اُردو میں ایسے شعر کہہ دیئے کہ لاکھوں معتقد منہ چڑھاتے ہی رہ گئے مگر ایک شعر بھی اس رنگ اور اس ترکیب کا نہ کہہ سکے جس میں غالب نے پچاسوں شعر کہہ دیئے۔ بہرحال تمام دنیا نے اس یکتائے روزگار کی دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اس کے کیا اسباب ہیں، ہم کو صرف اسی اُن اسباب کی تلاش کرنا چاہیئے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال اِن بلاؤں میں مبتلا نہ ہوں۔

غالب کی ذہنیت اپنے کلام کے بارے میں یہ تھی کہ اُن کی فارسی قابلیت الہامی ہے اور دوسروں کی اکتسابی جیسا کہ اُن کے اشارات سے ظاہر ہے

ع ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب

ع جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب

اس کے متعلق غالب کو اپنے اوپر اعتماد ہو گیا تھا جس کا اظہار صرف شاعری ہی تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ خطوط میں بے شمار مقامات پر اُنھوں نے اپنی خود اعتمادی اور انا ولا غیری کو صاف صاف ظاہر کیا ہے ان باتوں سے دو خرابیاں پیدا ہوئیں، اول یہ کہ خودستائی کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور عام طبیعتیں نکتہ چینی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ دوسری بلا یہ نازل ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھتا ہے تو وہ دوسروں کی زیادہ تحسین و شہرت سنتا ہے تو رشک و حسد اور صدمہ و ملال پیدا ہوتا ہے جب اُس کی اور ترقی ہوتی ہے تو ایک ہنگامۂ عظیم برپا ہوتا ہے، اپنے آپ کو غم و غصہ اور کوفت، دوسروں کو تذلیل و ملامت سمجھنے لگتا ہے۔ یہ نکتہ دیر تک تسلی کی قابلیت قدردانی کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل بھی تھا بنگال

کے قاضی محمد اختر خاں جن کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا قتیل کے شاگرد ہوئے اور مولوی غلام امام شہید حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور یہ سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔
برہان قاطع کے مصنف نے اپنے دیباچہ میں جو ماخذ اپنے لغات کے تحریر کئے ہیں اُن میں میرزا قتیل کی چار شربت کا بھی نام لیا ہے۔ غیاث الدین نے غیاث اللغات لکھی تو انھوں نے بھی تصانیف قتیل کے حوالے دیئے۔ یہ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ سلسلہ دوست حتیٰ کہ غالب کے شاگرد اور معتقد بھی قتیل کے حضرت نظر آنے لگے۔ غالب جب کلکتہ گئے تو وہاں بھی اُن دنوں اختر اور غالباً یہیں قتیل کا آوازۂ شہرت اس قدر بلند تھا کہ ہر آواز تحلیل ہو کر فانی و نامسموع ہو جاتی تھی۔

ہجرت کی نااُمیدی پر غالب کے غم و غصہ نے اُنھیں بدمزاج اور بدزبان بنا کر عام نفرت و دشمنی پھیلا دی۔ ایسے حوادث میں اگر شاعر کے دماغ میں شعر و شاعری سے کوئی گوشہ بچ رہتا ہے تو وہ موقع کی نزاکت اور زمانہ کی نامساعدت کو دیکھ کر نقل و حرکت کرتا ہے۔ غالب نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ گمان کیا کہ قتیل کو نالائق اور ناقابل بنانے سے لوگ مرعوب و متاثر ہو کر غالب کو قابل سمجھنے لگے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی اُن کی اُمید کے خلاف نکلا اور اُن کے خلاف ایک عام نفرت و عداوت پھیل گئی۔ آخر کار انھوں نے وہ کیا جو پہلے کرنا چاہیے تھا یعنی اپنی سخت مزاجی کی کمان اتاری اور جس طرح ذوق کے مقابلہ میں سہرے کی بنا پر ایک معذرت نامہ اُردو میں نظم کیا تھا اُسی طرح کی ایک نظم کلکتہ میں پڑھی۔ لیکن لوگوں پر اس کا زیادہ اثر اس لئے نہیں ہوا کہ اس سے پہلے برہان قاطع کے قضیہ کو طول ہو چکا تھا اور اس قطعہ نظم میں بھی قتیل وغیرہ کی توہین کا پہلو نمایاں تھا چند در چند شعروں میں اہل فن متشدد علماء کو ناشائستہ الفاظ میں برا بھلا کہا گیا تھا۔

ان عبرت انگیز واقعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں ہر علم و فن اور کمال و کامیابی سے حسن اخلاق ضروری ہے اور اگر بداخلاقی و بدمزاجی شریک حال ہوتی ہے تو کوئی علم کوئی ہنر کوئی کمال کام نہیں آتا، سب کچھ خاک میں مل جاتا ہے۔
اعتراضات۔ غالب نے جو اعتراضات قتیل پر کئے ہیں انوری صاحب نے اُن کے جوابات دیئے ہیں جن پر اب میں ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں۔

(۱) قتیل کی قابلیت پر غالب کا اعتراض یہ ہے کہ قتیل کی نظر ایرانیوں کے کلام پر کافی و وافی نہیں۔
مولوی صاحب کے نزدیک اس اعتراض کی تردید قتیل کے تصنیفات سے بوجہ احسن ہوتی ہے، کیونکہ چار شربت، نہر الفصاحت اور دیگر تصنیفات و کتب تو ایسی ہیں کہ کوئی شخص لکھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اہل ایران کے کلام پر وسیع نظر نہ رکھتا ہو۔ اور رقعات قتیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کی عمر کا زیادہ حصہ شیعہ رو ایرانیوں کی صحبت اور تحصیل زبان میں گزرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایران گئے۔ [illegible] ایرانیوں کی مصاحبت کا یہ اثر تھا کہ جس شخص کے دین و مذہب

نہ معاملہ پڑا اس کی زبان پر کسان تک نہ پڑا ہوگا۔ ایسی حالت میں غالب کا یہ دعویٰ بے دلیل قابل قبول نہیں
قتیل ہو غالب میں یہی بحث کتاب کی جان تھی حالانکہ اسی بحث کو لوگ سہل انگاری سے نظر انداز کر گئے

۲ - غالب کا دوسرا الزام یہ ہے کہ قتیل کی ادبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ ایرانیوں کی گفتگو ہے۔ جو کہ بازاروں میں غلط سلط سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

گو یہ بات سچ ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ قتیل کی تمام معلومات ایرانیوں کی صحبت تک محدود اور گفتگو تک محدود ہوئی ہے۔

۳ - غالب نے مولوی سراج الدین کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "یہ اُلو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ و نشتر کدہ و ہمہ جا و ہمہ دم کو غلط کہتا ہے۔

(۱) اس عبارت میں دو اعتراض ہیں۔ قتیل نے صفوت کدہ اور نشتر کدہ کو غلط بتایا ہے۔

(۲) ہمہ عالم و ہمہ جا کو قتیل نے ناجائز قرار دیا ہے۔

یہ دونوں الزام قتیل پر بہتان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کیونکہ تو انھوں نے قتیل نے کہیں صفوت کدہ اور نشتر کدہ کا نام لیا ہے اور نہ ہمہ عالم و ہمہ جا کو کہیں غلط بتایا ہے ان اعتراضات کی ماخذ قتیل کی یہ عبارت ہے۔

کدہ بمعنی خانہ باشد و پنج لفظ تحقیق شدہ و سوائے آں مسموع نیست بتکدہ، میکدہ، آتشکدہ، میکدہ، گلشن کدہ، وغیرہ ایں چہار آب کدہ، غم کدہ ہم درست یا نادرست است یعنی اینہا اصول اند و سوائے ایں فروع و فروع بہ ہمہ داخل است چوں حیرت کدہ، سنبل کدہ، ویراں کدہ، حسرت کدہ، ماتم کدہ، راحت کدہ، تنفخال کدہ، جنوں کدہ، بہشت کدہ ہر دو در گلشن کدہ داخل است پاکر گلشن جائے گل معنی بود ہم کدہ و عشرت کدہ، وحشت غم کدہ داخل از حصر مقصود نیست الخ

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ لفظ اصول اور باقی الفاظ جو کدہ کے ساتھ مرکب ہیں وہ فروع ہیں اور یہی اصل میں داخل ہیں یعنی ان کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قتیل نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صفوت کدہ، اور نشتر کدہ وغیرہ غلط ہیں۔ مگر میں قتیل کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ پانچ لفظ اصول ہیں سوائے اس کے مسموع نہیں اس سے سمت کے بارے میں حسب ذیل گزارش ہے۔

تسکین کدہ و وحشی دا لکش :-

کہ بہ تسکین کدہ دیدار تسلی ما دست   نادر سر کن بہ جا خانۂ فریاد رس ست

جفا کدہ - سراج الدین خاں آرزو -

دریں جدا کردہ از کس بجوے رنگ ثبات — کہ طفل اشک ہم اینجا چو نالہ بر جا نیست

پروین کردہ: حکیم قاآنی :-

ز دیبا پروین کردہ چندان بجا نم — کہ شعرے چند بر شعرے فشانم (دستارہ)

پریشاں کردہ: جلال اسیر :-

در پریشاں کردہ یاس بود فیض ما — سایۂ بید خوش آیند شمائے دارد (بہار عجم)

مجھے اصول و فروع کی تقسیم سے بھی اختلاف ہے۔ غالب نے جو منتشر کردہ، صفوت کردہ و شہرت کردہ کے متعلق لکھا ہے کہ قتیل ان الفاظ کو غلط بتاتے ہیں۔ قتیل نے تو کہیں ان الفاظ کا ذکر بھی نہیں کیا، یہ اس غریب پر تہمت ہے بلکہ انھوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے۔ میں نے ساقط، منتشر الفاظ کردہ سے مرتب دیکھے ہیں، تو ان میں یہ الفاظ ہیں اور نہ میرا ذاتی ذوق ان الفاظ کو قبول کرتا ہے جب تک کسی ایرانی کے کلام میں دیکھ نہ لوں۔

۴۔ غالب کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قتیل نے نثر مسجع و عاری کی تعریف غلط بتائی ہے۔ حالانکہ خود غالب نے نقل اکوری صاحب عبدالغفور کے نام ایک خط میں وہی تعریف لکھی ہے جو قتیل نے چار شربت میں لکھی ہے اور جو صحیح ہے۔ یعنی نثر مسجع وہ نثر ہے جس کے فقرے مقفیٰ ہوں، مرجز وہ ہے جس کے دو دو فقرے ہم وزن ہوں، اور نثر عاری میں نہ قافیہ کا التزام ہوتا ہے نہ وزن کا۔ اس کی تفصیل قتیل اور غالب کے صفحات ۳۰۰۔۳۰۵ پر ناظرین ملاحظہ کریں۔

۵۔ اس کے بعد ایطا کی بحث ہے۔ غالب نے قتیل پر اعتراض کیا ہے کہ قتیل کہتا ہے کہ ایطائے جلی وہ ہے کہ پایا تکرار ظاہر ہو جائے اور ایطائے خفی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود غالب نے یہ تعریف کی ہے کہ مطلع میں ہو تو ایطائے جلی ہے اور غزل یا قصیدہ کے اشعار میں موجود ہو تو خفی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غالب کی تعریف ایطائے جلی و خفی غلط ہے اور قتیل کی تعریف صحیح ہے مگر تفصیل نہیں کی ہے۔ ایطا کی صورت یہ ہے کہ مطلع میں اس وقت ایطا ہوگا جب دونوں قافیوں کے حروف مکرر جو ما قبل روی ہوتے ہیں، اگر علٰحدہ کر دیں تو دو لفظ با معنی رہ جائیں اور باہم مقفیٰ نہ ہوں جیسے ایک مصرع میں گلستاں ہو اور دوسرے میں بوستاں دونوں قافیوں میں ستاں مکرر ہے دونوں کو جدا کرنے کے بعد ایک گل رہ جاتا ہے دوسرا بو، یہ دونوں لفظ بامعنی ہیں اور باہم مقفیٰ نہیں لہٰذا ایطا ہے۔

اشعار میں ایطا یہ ہے کہ بار بار قافیہ کو لائے یا ایسے قافیے لائے جیسے مطلع میں بیان کیے گئے۔ گلستاں بوستاں شبستاں وغیرہ۔ ایطائے خفی کی صورت یہ ہے کہ بقول قتیل ... ذرا مشکل سے اٹھتا ہے

دکھاتا ہے۔ وہاں "ا" ظاہر رہ گیا۔ یہاں "دکھ" رہیگا۔ دکھ صاف خفا کوئی لفظ معنی دار نہیں ہے۔ مگر چونکہ اصل میں عز دیکھا ہے اور یہ معنی دار ہے تقطیعاً "دکھ" بنا یا گیا اس لئے ایطا خفی ہے۔

اُردو شعرا صرف مطلع میں ایطا سے احتیاط کرتے ہیں۔ بقیہ اشعار میں ایطا کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ عربی میں جائز ہے کہ ایک مصرع میں معرفہ ہو اور دوسرے میں نکرہ۔ جیسے "جبل" "الرجل" اور عربی میں علامات نحوی ہٹا لینے کے بعد اگر با معنی لفظ بچے اور دونوں باہم قافیہ ہوں تو بھی ایطا ہے جیسے شائق و عاشق "الف" علامت فاعل نکالنے کے بعد شوق، اور عشق رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ایطا ہے

غالب نے قتیل پر آٹھ اعتراضات کئے ہیں جن میں سے صرف ایک اعتراض صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ اور وہ یہ کہ قتیل نے فارسی میں ایک جگہ اُردو کا محاورہ ترجمہ کر دیا ہے ؎

یک وجب جائے بکوئے تو زخوں پاک نبود   کشتہ ناشستہ تپاں بود وگر خاک نبود

صحیح "نبود" کی جگہ "خاک نبود" قتیل نے لکھا ہے۔ یہ ہندوستان کا محاورہ ہے "خاک" کا یا ان کا۔

اس محاورہ کی غلطی کو انوری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ دیگر حضرات تبصرہ نگار انھیں اعتراضات اور جوابات کو نظرانداز کر گئے ہیں حالانکہ انھیں پر محاکمہ کی ضرورت تھی

قتیل پر جو اعتراضات غالب کی طرف سے ہوئے ہیں اُن کے جوابات دینے کے بعد سید ابوالاعلیٰ صاحب نے غالب کے چند اُردو اشعار پر شبہات وارد کئے ہیں جن میں سے بعض غلط ہیں اور بعض صحیح مگر ان کا ذکر کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ ضروری مسئلہ کتاب کے آخر میں ایک طویل بحث اہلِ زبان اور زبان داں کے متعلق ہے جس پر غالب اور حالی نے بھی بحث کی ہے اور انوری صاحب نے بھی یہ مسئلہ ہندوستان میں مدتوں سے معرکۃ الآرا رہا ہے اس لئے میں اسی بحث پر اپنے تبصرہ کو ختم کروں گا۔

ہر ملک میں ایک دو شہر ایسے ہوتے ہیں جہاں دارالحکومت کی قدامت کی وجہ سے اہلِ علم و ادب جمع ہو کر زبان کی اصلاح اور ترتیب کرتے ہیں ان مقامات پر تمام ملک کے علما و ادبا جمع ہوتے ہیں اور یہیں رہ جاتے ہیں ان کے اہل و عیال اور یہاں کے باشندے جو ان علوم سے ذوق و مناسبت رکھتے ہیں وہ اہلِ زبان کہلاتے ہیں اُن کے اقوال و محاورات مستند سمجھے جاتے ہیں اور نظیر میں پیش ہونے کے قابل ہیں۔ مثلاً ایران میں اہلِ زبان شیراز اور اصفہان مانے گئے ہیں اور دوسرے شہروں کے ادیب ان کے مقلد تھے مگر اہلِ زبان نے اُن کو تسلیم کیا ہے ہزاروں کا شمار انھیں میں رہا ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی اردو زبان کے معیار کا تعین پہلے دہلی میں رہا اور اس سے قبل آگرہ میں بھی تھا۔ دوسرا وقت تک

[illegible] اشت [illegible] کا اس سے وقت

میں بھی اُردو شاعری کا زور شور رہا۔ لیکن یہاں زبان کی اصلاح اور ترمیم نہ ہوئی۔ ہر شاعر مابعد اپنے ماقبل شعرا کا مقلد رہا۔ تصرف اور ترمیم سے ڈرتا تھا، مگر جب لکھنؤ میں ہندوستان بھر کے ادیب جمع ہوئے خصوصاً دہلی اور آگرہ کے سخنوران کامل تو ان سب نے بکمال سعی کے صدہا قابل ترک الفاظ چھوڑ دیئے اور ہزاروں کی تعدیل کرکے اُن کو فصیح بنایا۔ جیسے "میرے کو" سے "مجھ کو" "کرا" سے "کیا" اور "آوے" سے "آئے" بنا کر استعمال کیا۔ یہی اصلاح شدہ الفاظ و ترقی یافتہ زبان لکھنؤ میں ہر عام و خاص بولتا ہے۔ ہر لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعر کا معمول یہی ہے نہ کوئی اس کے خلاف سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ دوسرے شہروں میں اب تک وہی قدیم زبان بولی جاتی ہے مگر بہت کچھ وہ مصنف اپنے تصانیف میں بھی لکھنوی زبان جو اصلاح یافتہ ہے استعمال کرتے ہیں۔ ان ہی اسباب سے لکھنؤ کے ادیب اہل زبان مانے جاتے ہیں۔ اور دہلی چونکہ لکھنؤ کا ماخذ ہے اس لئے وہ بھی ادبا کا زاد بوم تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس بحث میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ اگر دہلی اور لکھنؤ کو اہل زبان اور مستند نہ مانا جائے تو ہر شہر یکہ و تنہا اور ہر گاؤں یہ دعویٰ کر سکے گا کہ ہماری زبان ہے ہمارے یہاں کا محاورہ یہی ہے اُس کے اس دعوے کا کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ کیونکہ جب تک مرکز نہ ہوگا زبان کی غلطی و صحت کا کوئی معیار نہ رہے گا اس لئے مرکز اور اہل زبان کا ماخذ کسی نہ کسی شہر کو ضرور متعین کرنا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہل زبان اُسی کو کہہ سکتے ہیں جو زبان داں بھی ہو یعنی ادب و ادبا پر گہری نظر رکھتا ہو۔ ورنہ جو اہل زبان کا بچہ ہے لیکن اہل زبان ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم اہل زبان اُن زندہ دلوں کے ممنون و مرہون منت ہیں جنہوں نے لغات و قواعد اور ہزاروں ادبی، علمی کتابیں تصنیف کرکے اہل زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہونچایا ہے۔

[illegible]

غالبؒ

(از حضرت نوش صدیقی)

فروغِ انجمنِ عشق ہے کلام ترا
ربابِ شوق کو مضراب ہے پیام ترا
چھلک رہا ہے مئے آرزو سے جام ترا

وہی نسیمِ غزل کیف بار اب بھی ہے
ترے چمن میں خراماں بہار اب بھی ہے

دیا وہ کیف تجھے زندگی کی صہبا نے
کہ جس کی موج سے برہم ہزار میخانے
خودی فروز تری بیخودی کے افسانے

شکستِ ہوش سے تجھکو عجب سرور رہا
خود اپنی گم شدگی پہ تجھے غرور رہا

جھکی ہوئی سی تھی کچھ چشمِ نیم خوابِ غزل
فتیلۂ شعر سے اُٹھتا نہ تھا نقابِ غزل
پھر ایک بار تھا خاموش سا ربابِ غزل

کہ تو نے حسنِ تغزل کو بے حجاب کیا
سکوتِ شوق کو مانوسِ اضطراب کیا

بسائے نرگسِ اردو میں تُو نے خواب کچھ اور
بڑھائے گیسوئے پُرخم میں پیچ و تاب کچھ اور
اُٹھا اُٹھا کے گرائے بھی ہیں حجاب کچھ اور

جمالِ شعر کو تمکیں فروز تو نے کیا
صدائے ساز کو ہم رنگ سوز تو نے کیا

کہیں تصورِ روئے نگار کا عالم
کہیں نشاطِ غمِ انتظار کا عالم
ہر اک سکوں میں نہاں اضطرار کا عالم

گدازِ عشق کی تصویر ہے غزل تیری
کتابِ درد کی تفسیر ہے غزل تیری

•

تباہِ شکوۂ ماضی و حال تھا ہر چند
خرابِ کیفِ نشاط و ملال تھا ہر چند
اسیرِ حلقۂ دامِ خیال تھا ہر چند

مگر جہاں بھی رہا تو بہت بلند رہا
فلک کو شکوۂ کوتاہیِ کمند رہا

ترا سرور رہا کیفِ غم سے محرم بھی
لبوں پہ موجِ تبسم بھی، چشمِ پُرنم بھی
ہے سوزِ برق بھی تجھ میں گدازِ شبنم بھی

رخِ نشاط کو اشکوں سے تو نے پاک کیا
مذاقِ درد کو کچھ اور تابناک کیا

تری نظر کبھی بربادِ امتیاز نہیں
تری مراد صنم خانۂ مجاز نہیں
تو رازداں ہے، اسیرِ حجابِ راز نہیں

خودی میں بھی تھا ذوقِ بیخودی پیدا
کیا نہ مرگ نے بھی تجھ کو زندگی سے جدا

زمانہ ستمبر ۳۶ء

مثنوی

حالنامہ

گوی و چوگاں

تصنیف

عارفی ہروی

(۱۲- ۹۵ھ)

مرتبہ

ڈاکٹر متین احمد صبا

معروف فارسی شاعر عارفی ھروی کی معروف ترمثنوی گوی وچوگان یا حالنامہ ایک متصوفانہ تمثیلیہ ہے۔

عارفی تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے عہد کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں، ان کی وفات طبقات شاہجہانی کے مصنف نے ۱۴۴۹/۸۵۳ھ لکھی ہے۔ چارلس ریو (برٹش میوزیم) نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔

مثنوی "گوی وچوگان" میں جتنی بار اور جس جس طور سے گوی اور چوگان کا ذکر ہے، اور جس طور سے تانا بانا ان دو کے گرد بُنا گیا ہے، اس کے پیش نظر اس کا نام اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ (گوی وچوگان قدیم بادشاہوں اور امیروں کا دل پسند کھیل تھا۔ آج کے پولو کے کھیل سے ملتا جلتا)، لیکن بعض نسخوں میں اس کا نام "حالنامہ" بھی ملتا ہے۔

یہ مثنوی جو ۱۴۳۸/۸۴۲ھ میں لکھی گئی (گوی خورشید سے تاریخ نکلتی ہے)، خدا بخش لائبریری میں اس کے دو قدیم نسخے موجود ہیں، ان میں سے ایک تو مشہور کاتب میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا بھی خوبصورت نسخہ ہے اور لگ بھگ اسی عہد کا ہے۔ (اشعار ۴۶۷) بقول شاعر مثنوی ۵۰۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن علی الکاتب کے لکھے ہوئے متن میں ۴۹۵ اشعار ہیں۔ علی الکاتب کا نستعلیق کتابت کے مشاہیر کاتبوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۲۵/۹۵۰ھ کے آس پاس ہوئی۔ (استفادہ عبدالمقتدر، خدا بخش لائبریری کیٹلاگ، جلد ۲، ص ۲۱-۲۲) علیگڑھ میں بھی علی الکاتب کا لکھا ہوا گوی وچوگان کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جسکا تعارف ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کرایا تھا۔ یہ ۹۲۶ھ کا مکتوبہ ہے۔

خان بابا مشار (فہرست کتابہای چاپی فارسی) کی تحقیق کے مطابق ۱۳ صفحات پر مشتمل یہ مثنوی ایک بار لندن سے ۱۹۳۱ء میں گوبن سلز کے اہتمام میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ (ص: ۴۴۳۳)

ڈاکٹر متین احمد صبا نے خدا بخش لائبریری کے دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک متن تیار کیا ہے اور چونکہ دونوں نسخے خاصے قدیم ہیں اور بہت اہتمام سے لکھے ہوئے ہیں، یعنی متن بڑی حد تک قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہے، اس لیے یہ مجوزہ تدوین بھی معتبر سمجھی جا سکتی ہے۔

—— طارب

"حالنامہ" مولانا عارفی ہروی کی ایک عارفانہ تمثیلی مثنوی ہے اور فارسی شاعری میں مناظرہ گوئی کا ایک نمونہ ہے۔ موضوع بحث کی مناسبت سے یہ "گوی و چوگان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک نہایت اور قدیم قلمی نسخہ کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ کے قلمی ذخیرہ میں محفوظ ہے جس کا نمبر شمار فارسی ۴۳۶ ہے اور میرے اس مرتبہ مثنوی کی بنیاد ہے۔ اس نسخہ میں سال کتابت درج نہیں ہے، فہرست نگار نے — — — لکھا ہے کہ اس کا کاتب دور صفویہ کا مشہور و معروف خطاط میر علی ہے۔ چوں کہ میر علی کے انتقال تاریخ ۹۵۰ھ ہے اس لیے یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مخطوطہ کی کتابت ۹۵۰ھ سے قبل عمل آئی ہوگی، پروفیسر براؤن کے بیان کے مطابق 'حالنامہ' کا ایک عمدہ نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری لندن ہے جو ان کی نگاہ سے گذرا ہے۔ یہ نسخہ ۱۵۴۶ء/ ۹۵۲ھ میں تحریر ہوا ہے، میری اطلاع کے مطابق، سالار جنگ میوزیم لائبریری، حیدرآباد میں اس کے پانچ قلمی نسخے محفوظ ہیں جن میں ایک ۲۲ جمادی الاول ۹۸۲ھ تحریر کردہ ہے اور دوسرے پر سن کتابت ۹۸۹ھ تحریر ہے، اس طرح دریافت شدہ نسخوں کو سال تحریر روشنی میں کتاب خانہ خدا بخش کا متذکرہ بالا مخطوطہ سب سے قدیم قرار پاتا ہے اور اہمیت کا حامل ہے۔

چوں کہ یہ مثنوی ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے اور اہل نظر کی نگاہ سے پوشیدہ ہے نیز فارسی میں مناظرہ گوئی روایت اور اس کے ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کی ترتیب و تدوین و اشاعت کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ اس مثنوی کی نقل اور مطالعہ کے دوران ایک اور قدیم نسخہ کا علم ہوا جو "گوی و چوگان" کے نام سے اسی کتاب خانہ کی زینت ہے اور اس کا نمبر شمار ۱۸۶۱ ہے۔ مثنوی کی ترتیب و تدوین کے لیے ان دونوں نسخوں سے باہم مقابلہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ محب محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے جب میں نے رجوع کیا تو انھوں نے نہایت گرم جوشی کا اظہار فرمایا اور ازراہ محبت اور

قدر افزائی میری الجھن کو آسان کر دیا، نیز مخطوط موسوم بہ "گوی و چوگان" کی ایک عکسی کاپی مجھے تحفتاً ارسال فرمائی۔ موصوف کی اس علم دوستی اور کرم فرمائی کے لیے ان کا سپاس گذار ہوں۔ ان دونوں قلمی نسخوں کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ ان کے متن میں نہ صرف لفظی اختلافات ہیں بلکہ اشعار کی تعداد، ان کی ترتیب، مصرعوں کی تقدیم و تاخیر اور مختلف عنوانات کے الفاظ میں بھی نمایاں فرق موجود ہے۔ مرتبہ مثنوی میں ان دو مختلف نسخوں کے مقابلہ کے دوران جو اختلافات سامنے آئے ہیں انھیں حاشیہ میں تفصیل سے درج کر دیا گیا ہے۔ تعداد اشعار کے اعتبار سے کوئی نسخہ مکمل نہیں ہے۔ داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں پیش کردہ نسخہ اب مکمل شکل میں آپ کے سامنے ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حاشیہ میں جہاں کہیں نسخہ "الف" آیا ہے اس سے مراد مخطوطہ "حالنامہ" نمبر شمار ۳۶۴ اور نسخہ "ب" سے مراد مخطوطہ "گوی و چوگان" نمبر ۱۸۶۱ ہے۔

کچھ عارفی کے بارے میں

نویں صدی ہجری آل تیمور کی فرمانروائی کا دور ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ ایرانی تاریخ میں ظلم و بربریت اور قتل و خونریزی کے المناک دور سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن فارسی شعر و ادب اور فنون لطیفہ کو اس دور میں جو نمایاں فروغ حاصل ہوا وہ اس عہد کی تاریخ کا زرّیں عنوان ہے۔ امیر تیمور کے بعد اس کا بیٹا شاہ رخ مرزا (۷۷۹ — ۸۵۰ھ) تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک خو اور علم دوست تھا۔ علما، فضلا اور شعرا کا بے حد قدر داں تھا۔ فارسی زبان و ادبیات کی ترقی و ترویج سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ اس کا بیٹا بایسنغر (م۔ ۸۳۷ھ) بھی فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ خوش نویسی میں استادِ کامل تھا۔ اس کے دربار میں شاعروں، مورخوں، خوش نویسوں اور نقاشوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ شاہرخ کے زمانہ میں ادبی رونق کے اعتبار سے شیراز کی جگہ ہرات شعر و ادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس عہد کے بیشتر اکابر ہرات میں ہی نظر آتے ہیں جن میں مغربی تبریزی، عصمت بخاری، شاہ نعمت اللہ ولی، قاسم الانوار تبریزی، کاتبی نیشاپوری، کمال خجندی، بساطی سمرقندی اور مولانا جامی صف اول کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مولانا عارفی ہروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جنھیں اس دور کے شاعروں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولانا عارفی کا ذکر اگرچہ اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن ان کی اطلاع اتنی مختصر اور تشنہ ہے کہ اس سے عارفی کے حالاتِ زندگی پر کوئی تفصیلی روشنی نہیں پڑتی۔ ان کا پورا نام معلوم نہیں۔ وہ اپنے تخلص عارفی سے

مشہور ہیں۔ ڈاکٹر سعید نفیسی[۱] اور ہرمان ایتھے[۲] نے ان کا نام مولانا محمود اور تخلص عارفی لکھا ہے، فہرست مخطوطات کتاب خانہ خدا بخش، پٹنہ کے فہرست نگار نے بھی ان کو مولانا محمود عارفی ہی لکھا ہے۔ البتہ تقی اوحدی نے اپنے تذکرہ میں ان کا نام صرف مولانا عارفی لکھا ہے ساتھ ہی اس غلطی کی بھی نشان دہی کی ہے کہ کچھ لوگوں کو محمود عارفی کے نام سے اشتباہ ہوا ہے اور انھوں نے مولانا عارفی کو محمود عارفی سمجھ لیا ہے جو ایک دوسرے شاعر ہیں اور "دہ نامہ" کے مصنف ہیں۔ تقی اوحدی لکھتے ہیں[۳]:

"واکثر مردم ویرا محمود عارفی مذکور متحد دانند"

مولانا عارفی کے تذکرہ سے پہلے تقی اوحدی نے اسی صفحہ پر محمود عارفی کا بھی ذکر کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی، امیر علی شیر نوائی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بھی اپنے تذکروں میں مولانا عارفی ہی لکھا ہے۔ دونوں مستند اور قریب العہد تذکرہ نگار ہیں، اس لیے ان کے بیانات کی روشنی میں تقی اوحدی کا قول ہی قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عارفی کی تاریخ پیدائش کا ذکر بھی کہیں تذکروں میں نہیں ملتا، البتہ "حالنامہ" کی داخلی شہادت کی روشنی میں ان کے سال ولادت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ عارفی کے قول کے مطابق "حالنامہ" ۱۴۳۸ء/۸۴۲ھ میں لکھا گیا اور اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال تھی جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

پنجاہ گذشت سال عمرم　　یک نیم شکست بال عمرم
چوگانی فکر آزمودم　　گوی سخن از میان ربودم

اس اعتبار سے عارفی ۱۳۸۹ء/۷۹۱ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے جو ناخدائے غزل خواجہ حافظ شیرازی کا سالِ وفات ہے۔ آقای سعید نفیسی اور پروفیسر براؤن[۴] نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ عارفی کے حالاتِ زندگی، ان کے آباؤ اجداد، تعلیم و تربیت، مشاغل اور دیگر امور پردۂ خفا میں ہیں، تذکروں کی ورق گردانی کے باوجود مایوسی کے سوا

---

(۱) تاریخ نظم و نثر ایران، جلد اول طبع ایران۔ ص ۳۰۲
(۲) تاریخ ادبیات فارسی، ترجمہ رضا زادہ شفق طبع ایران، ص ۱۸۲
(۳) عرفات العاشقین، قلمی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ
(۴) تاریخ ادبیات ایران، جلد سوم (انگریزی) ص ۴۹۵

کچھ ہاتھ نہ آیا، دولت شاہ سمرقندی، تقی اوحدی اور میر علی شیر نوائی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عارفی اس دور کے ارباب فضل و دانش میں شمار کیے جاتے تھے، شاعری کا نہایت اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ شاہرخ مرزا (۸۵۰ - ۷۷۹ھ) کے عہد کے شاعروں میں معتبر مقام کے حامل تھے۔ شاعری کی جملہ اصناف خصوصاً غزل اور مثنوی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ میر علی شیر نوائی ان کے علم و فضل اور شاعرانہ بلاغت کی یوں داد دیتے ہیں[1]

"شخصی در غایت فضل و کمال بودہ و در نہایت فصاحت و بلاغت و شعر روان او صافی و روان تر از آب زلال، بسیار خوش محاورہ و مجادلہ"

دیوان غزلیات کے علاوہ ان کی مثنوی 'حالنامہ' جو گوی و چوگان کے نام سے مشہور ہے، خاصی مقبول رہی ہے اور اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی جیسے بلند پایہ شاعر اور سخن سنج نے اپنی کتاب "بہارستان" میں اس مثنوی کو ان کی سب سے بہتر نظم قرار دیا ہے، جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں :

"صاحب کتاب گوی و چوگان و آن نظم سرآمد ویست"[2]

مولانا عارفی کو ان کے مداح "سلمان ثانی" کے لقب سے پکارتے تھے، اس کی دو وجہیں تھیں، جیسا کہ میر علی شیر نوائی نے لکھا ہے، اوّل یہ کہ عارفی کا رنگ شاعری سلمان کے طرز سے مماثل تھا اور دوسرے یہ کہ سلمان کی طرح عارفی بھی ضعف بصارت اور درد چشم میں مبتلا تھا، چنانچہ سلمان جب عارضہ چشم میں گرفتار تھا تو اس نے ایک قصیدہ کہا تھا جس میں اس تکلیف کا ذکر تھا، عارفی نے بھی اس کی تقلید میں ایک قصیدہ اسی زمین میں قلم بند کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

بر یک سرخ دیدۂ من دارو ئی سفید ÷ باشد بعینہ نمک سودہ بر کباب

تقی اوحدی اور میر علی شیر نے اس مطلع کی بہت تعریف کی ہے۔ متذکرہ بالا تذکرہ نگاروں کی آرا اور خود عارفی کے کلام کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ پیش نظر مثنوی ان کے صوفیانہ اور عارفانہ مزاج و میلانات کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا تمام تر حصہ ہرات میں بسر کیا۔ ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۹ء میں لگ بھگ ۶۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا اور بقول مصنف مجالس النفائس اور عرفات العاشقین ہرات ہی میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) مجالس النفائس، مطبوعہ۔ ص - ۱۹۳

کچھ مثنوی کے بارے میں

"حالنامہ" عارفی کے زورِ تخیل کا نتیجہ ہے جسے انھوں نے صرف دو ہفتہ میں مکمل کیا۔ کہتے ہیں :

کردم بدو ہفتہ بہر نامش ٭ ہمچو مہ چاردہ تمامش

مثنوی کے آخر میں شاعر نے مثنوی کا نام اور اپنا تخلص پیش کیا ہے :

این نامہ کہ ساختم تمامش ٭ حالی شدہ و حالنامہ نامش

این حال کہ شعر عارفی راست ٭ ناید صفتش بہر قلم راست

یہ مثنوی خاقانی کی مثنوی "تحفۃ العراقین" اور نظامی کی "لیلیٰ مجنون" کی بحر یعنی بحر ہزج مسدس اخرم مقبوض محذوف میں لکھی گئی ہے اور اس کا وزن مفعول مفاعلن فعولن ہے۔

اس مثنوی کا زمانۂ تصنیف سلطان شاہرخ مرزا (م - ۸۵۰ھ) کا عہد ہے۔ عارفی نے یہ مثنوی شاہ کے انتقال سے ۸ سال قبل اس کے پوتے سلطان محمد بن بایسنقر کے لیے لکھی اور اس کے نام سے معنون کی۔ وہ لکھتے ہیں :

تا گوی سخن تراشم از جان ٭ در خدمت شہ برم بہ میدان

خورشید سریر ماہ مسند ٭ سلطان جہانیان محمد

مثنوی کا موضوع

اس کا موضوع وصال صوفی بہ عشق الٰہی ہے۔ مقام وحدت تک پہنچنے اور درجہ احدیت کے حصول کے لیے اپنے آپ سے گذر جانا اور عالم جسمانی اور رمت خواہشات نفسانی کو فنا کر دینا لازمی ہے۔ عاشقان الٰہی راہ عشق میں پروانے کی طرح اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ گو اور چوگان دراصل دو عاشق عرفانی ہیں جو بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کی تمثیل سے ر نے اس عارفانہ نکتہ کی وضاحت کی ہے :

پی گوہر معرفت مدارم ٭ تا نام بعارفی برآرم

مثنوی کا قصہ روایتی اور فرضی ہے جسے عارفی کے جادو نگار قلم نے واقعیت کا رنگ دے دیا ہے جس آورد میں آمد کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

این گفتہ کہ سر بسر خیال است ٭ سحریست کہ آن مرا حلال است

چوگان بازی جسے انگریزی میں POLO کہتے ہیں ایشیائی ملکوں میں امیروں اور بادشاہوں کا محبوب

رہا ہے۔ جیسا کہ اس مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے سلطان محمد بن بایسنغر چوگان بازی کا شیدائی تھا اور اس فن میں اسے بڑی مہارت تھی۔ عارفی نے مثنوی کی ابتداء میں "در مدح شاہی شہزادہ" کے عنوان سے ۲۸ اشعار لکھے ہیں جن میں شہزادہ کی چوگان بازی کے مناظر کی نہایت دل کش تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ شہزادہ کی تیزی و طراری، فنی چابکدستی اور صلابت و قوت کے نمونے ملاحظہ ہوں :

شاہی کہ چو بر گرفت چوگان   مرگوی شد و سپہر میدان
آن لحظہ کہ پا بزین در آورد   گرد از کرۂ زمین برآورد
آن صحن فلک کہ گوی ماہ است   جولانگہ بادپای شاہ است
گوی کہ ہلال آسمانش   چوگان شہ است و صولجانش

چوگان اور گیند کی زد و گیر اور گیند کی ضرب سے جبین ماہتاب کے زخمی ہونے کی یہ حسین شاعرانہ توجیہ دیکھیے :

گوی کہ شہ از رہ ہنر زد   بر لوح جبین ماہ سر زد
آں داغ کہ بر جبین ماہ است   گوئی تو کہ زخم گوی شاہ است

شہزادہ کا گھوڑا جس کا نام اُبرش تھا اپنی برق رفتاری میں صرصر کو پیچھے چھوڑ جاتا تھا، اور اس کی ٹاپ سے جو چنگاریاں پھوٹتی تھیں آگ اس سے گریزاں رہتی تھی :

چون اُبرش بادپا برانگیخت   گوی کہ بہ باد آتش آمیخت
آویختہ صرصر از دُم او   بگریختہ آذر از سُم او

قصہ کا اجمال | چونکہ یہ مثنوی شاہزادہ محمد بن بایسنغر کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے عارفی نے اس کی طبعی مناسبت کے خیال سے ایک ایسے زمنی قصے کا انتخاب کیا جو گو اور چوگان کے کھیل سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں چین میں ایک بادشاہ تھا، بڑی شان و شوکت اور جاہ و حشم کا مالک تھا، اس کو ایک بیٹا تھا، حسن میں چندے آفتاب چندے ماہتاب، ماہ رو، پری پیکر اور شیریں سخن تھا

چون ماہ دو ہفتہ یک پسر داشت   کز مہر جمال بیشتر داشت
ماہی کہ تمام دلبری بود   در صورت آدمی پری بود
شیرین سخنی کہ دادہ برباد   از سنگدلی ہزار فرہاد

اس کی زلفِ سیاہ کے مجنوں کی طرح ہزاروں اسیر تھے :

لیلیٰ زلفی کہ داشت مفتوں　　　در سلسلۂ ہزار مجنوں

[چو]گان بازی سے اس کو بڑی رغبت تھی وہ ہر روز گوی بازی کے شوق میں میدان کی طرف جاتا اور اپنے شوق کا مظاہرہ کرتا تھا:

همراہی اسپ تاختن داشت　　　ہم میل بہ گوی باختن داشت

بیرون رفتی بگوی بازی　　　جولان دادی سمند تازی

[ای]ک روز وہ اپنے حشم و خدم کے ساتھ چوگان بازی کے لیے صحرا کی طرف گیا اور کھیل میں مشغول ہوگیا۔ ناگاہ ایک [گو]شہ سے ایک غریب و نامراد اور دل‌شکستہ حال فقیر ادھر آنکلا۔ مفلسی اور بیکسی کی مجسم تصویر تھا اور حسرت و مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ شاہزادہ پر پڑی وہ ہزار جان و دل سے اس پر عاشق ہوگیا پھر اس کو اپنے گرد و پیش کی کچھ بھی خبر نہ رہی:

شہ را چو زدور یک نظر دید　　　حیراں شد و حال خود دگر دید

شاہزادہ اس صورت حال سے بے خبر تھا۔ لیکن درویش کا صبر و قرار رخصت ہوچکا تھا اور ہر لمحہ فراق محبوب میں آنکھیں اشک بار رہا کرتی تھیں:

ہر بار کہ سوی شہ نظر کرد　　　صد گوی سرشک رو برو کرد

پیراہن صبر چاک میکرد　　　خود را ز غمش ہلاک میکرد

شاہزادہ جب کھیل سے فارغ ہوکر میدان سے واپس ہوتا تو فقیر زمین پر پڑے ہوئے شکستہ چوگان اور گیند کے قریب جاتا۔ اسے ہاتھ میں لیتا، ان کی قسمت پر رشک کرتا، اپنی نامرادی اور نارسائی پر الحاح و زاری کرتا ہوا یوں گویا ہوتا:

مرغ دل من شکستہ بالست　　　چوں گوی شکستہ خستہ حالست

ای بارخدای حال گردان　　　ہجران مرا وصال گردان

فردا کہ شہ این طرف نہد روی　　　خواہم بر پش فتاد چوں گوی

یا گوی بروں برم ز میدان　　　یا سر بہ نہم چو نا امیدان

[دو]نوں زبان حال سے اپنا اپنا درد دل بیان کرتے تھے۔ شہزادہ اپنے حسن و جمال میں مست و مغرور تھا وہ درویش کی طرف التفات نہ کرتا تھا۔ ادھر درویش اپنی کم نصیبی اور نامردی پر خون کے آنسو روتا اور فراق محبوب میں جلتا تھا۔ جب ٹوٹی ہوئی گیند کو دیکھتا تو آہ سرد بھرتا اور دل میں کہتا کہ کاش اس گیند کی جگہ میرا دیدہ و سر ہوتا جو شہزادہ کے چوگان کی ٹھوکر کھاکر سرخرو ہوتا:

کاشم سرد دیدہ گری بودی   تا شاہ بہ صولجان ربودی

آخر دن رات کی گریہ وزاری سے تنگ آکر راہِ محبوب میں وہ اپنی جاں نثار کر دیتا ہے۔ دوسرے دن شاہزادہ و
کھیل کے لیے وہاں پہنچتا ہے تو اس کو اس سانحہ کا علم ہوتا ہے، وہ درویش کی لاش کے پاس پہنچتا ہے، گھ
سے نیچے اترتا ہے، درویش کی موت پر اس کے دل سے بھی آہ نکل پڑتی ہے، وہ چوگان کو توڑ دیتا ہے اورُ
کو ایک کنارے پھینک دیتا ہے، سیر و تفریح سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے، آتشِ محبت اس کے دل پر
ہوتی ہے، اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب رواں ہو جاتا ہے۔ فقیر کی پاک محبت اور جذبۂ وفا کے ا
میں شہزادہ کے حکم سے اس کو ایک بلند مقام پر سپردِ خاک کیا گیا اور اس کی لوح پر خونِ دل سے یہ لکھا گ
"یہاں ایک عاشقِ صادق آسودہ خواب ہے جس کی محبت پر محبوب بھی نازاں ہے۔" :

کیں بود کہ داد داد در عشق   ویں بود کہ سر نہاد در عشق
این بود کہ جاں بہرد درحال   شد زندۂ عشق و مرد درحال
اور :   زین گو نہ کسی کہ عشق بازد   معشوق بہ عشق او نبازد

یہاں قصہ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

تعدادِ اشعار

مثنوی کے مختلف نسخوں میں تعداد اشعار میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تقی اوحدی نے ا۔
تذکرہ عرفات العاشقین میں اشعار کی تعداد ۵۱۰ بتائی ہے، عصرِ حاضر کے مشہور را
ادیب و محقق آقای سعید نفیسی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ نظم و نثر فارسی جلد اول میں ۸۰۰ اور پروفیسر براؤ
اپنی تاریخ ادبیات ایران جلد سوم میں اشعار کی تعداد ۵۰۰ بتائی ہے لیکن خود عارفی کے قول کے مطابق یہ
۵۰۱ اشعار پر مشتمل ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

چون بر عددش قلم نہادم   بر پانصد و یک رقم نہادم

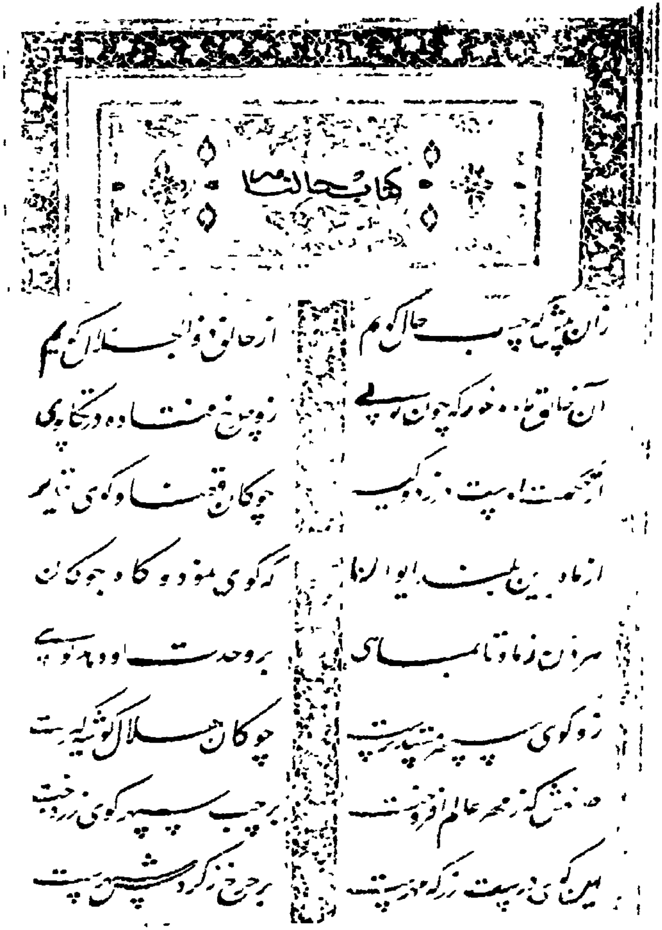
پیشِ نظر دو مختلف مخطوطوں یعنی نسخہ "الف" اور نسخہ "ب" میں علی الترتیب اشعار کی مجموع
۴۹۵ اور ۴۶۷ ہے۔ ان دونوں نسخوں کے باہم تقابل کے بعد نسخہ "ب" سے ۱۵ ایسے اشعار ا
کیے گئے ہیں جو نسخہ "الف" میں نہیں تھے۔ اس طرح میرے مرتبہ نسخہ میں اشعار کی مجموعی تعداد ۵۱۰ ہو
جو تقی اوحدی کے بیان کے عین مطابق ہے، کیونکہ تقی اوحدی کے پیشِ نظر جو نسخہ تھا اس میں بھی ۵۱۰ اش
عارفی کے بیان کے مطابق پیش کردہ مثنوی میں ۹ اشعار فاضل ہوتے ہیں۔ اس تضاد یا شعر کی زیاد

سبب یہ ہے کہ مثنوی اصلاً ۱۰۵ اشعار پر ہی مشتمل ہے لیکن اصل مقصود کے بعد بطور خاتمہ ۹ اشعار کا اضافہ کر دیا گیا ہے
مثنوی ۱۰۵ اشعار پر ختم ہو جاتی ہے، اختتام کے بعد "در خاتمۂ کتاب" کے عنوان سے جو ۹ اشعار ہیں وہ بعد میں
نے شاہانہ صلہ کے حصول کے اعتراف میں اضافہ کیے ہیں جیسا کہ ان اشعار کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے :

بخشید مرا بہ لطف بسیار　　　چوگان زر و ہزار دینار

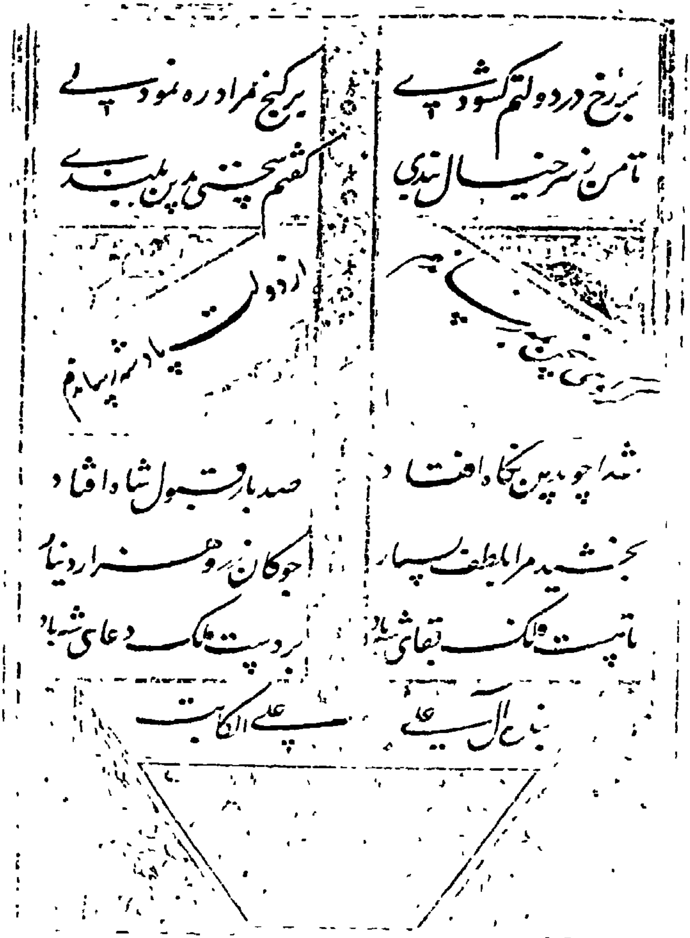
عکس حالنامہ صفحۂ اوّل

نسخۂ خدابخش


کتاب حالنامه

عکس حالنامہ صفحۂ آخر

نسخۂ خدا بخش



خاتمه

زان پیش که حسب حال گویم از خالق ذوالجلال گویم
آن خالق ماه و خور که چون گوی زو چرخ فتاده در تکاپوی
زو گوی سپهر مستدیر است چوگان هلال گوشه‌گیر است
از حکمت اوست در زد و گیر چوگان قضا و گوی تقدیر
از ماه برین بلند ایوان گر گوی نمود و گاه چوگان
هر ذره ز ماه تا بماهی بر وحدت او دهد گواهی
صنعش که ز مهر عالم افروخت بر جیب سپهر گوی زر دوخت
این گوی درست زر که مهر ست بر چرخ ز گردش سپهر ست
از شرق به غرب داده راهش کانجاست محل جایگاهش

در مناجات قاضی الحاجات[1]

ای گوی خور از تو سپند روی چوگان شب از تو آبنوسی
هم[2] گوی زمین مدور از تو هم صحن فلک مصور از تو
برگردش چرخ لاجوردی چوگان زر از هلال کردی
بر روی بتان ماه تمثال از خط سیاه و نقطهٔ خال
چوگان عبیر و گوی[3] سازی وز عنبر سوده[4] پوتی سازی
چوگان تو کشتی ز آب هر سوی در صحن صدف تو دُر کنی گوی
از حکم تو گشته بی سر و پای این گوی سپهر سیم سیمای
در صنع تو این دو گوی زرین گردیده برو دو صحن سیمین
در لطف تو برده در سخن پی چوگان زبان هر سخن گوی[5]

---

۱ نسخہ ب: یہ عنوان نہیں ہے۔ ۲ ب۔ این ۳ ب۔ مصرع ثانی مقدم اور مصرع اول موخر ہے۔
۴ "روی" کی جگہ "گوی" ۵ ب۔ سادہ ۶ "گوی" کی جگہ "روی"۔ ۷ صد ... سیمے۔

در مناجات دوم و تمهید نعت

ای لال زبان عالم از تو — خالی نبود خیالم از تو
ای از تو ربوده حالی من — سودای سر خیالی من
روشن بودت که حال من چیست — در آیینه خیال من کیست
توفیق رفیق حال من کن — دُر در صدف خیال من کن
تا هر چه ز روی حال گویم — آمیخته با خیال گویم
حال تو و حالت توم بخش — شیرینی شعر خسروم بخش
تا سفته دُری ز بحر دُرم ده — شایسته گوش گوهرم ده
بی گوهر معرفت بدارم — تا نام به عارفی برآرم
در صبح هدایتم صفا ده — گویای نعت مصطفی ده

در نعت خلاصه موجودات صلی الله علیه وسلم

آن پیشرو بساط لولاک — وآن کرده گذر ز کوی افلاک
آن کوکبه بر سپهر برده — وان گوی ز ماه و مهر برده
هم سیر مه و ستاره کرده — هم قرص قمر دو پاره کرده
هم برده ز جنبه و فلک گوی — هم کرده دو صولجان یک گوی
میدان سپهر در نوشته — در حال ز قدسیان گذشته
یکران چو برین بساط رانده — زو طایر قدس باز مانده
یک خانه مه نواز کمانش — یک گوشه فلک ز صولجانش
در عالکهش (کذا) سپهر گوی — وز مملکتش دو کون سوی
گوی سر من نثار بادش — خاک ره مشت وخار باکش

---

۱ ب - یہاں کوئی عنوان نہیں ہے ۲ ب - او ۳ ب - ہمت پیمبر کرم ۴ ب - گوی
۵ - اصل میں یہ شعر نسخہ الف میں نہیں ہے -

در خطاب به عشق گوید

ای عشق بحال من نظر کن — وز سرّ حقیقتم خبر کن
تا گوی وصال سر بر آرم — ماهیت حال بر سر آرم
گوی ز خیال بر تراشم — تا چند فسرده حال باشم
چوگانی فکر بیش رانم — وز دست خرد عنان ستانم
بر گوی خیال خوب بندم — دست همه را بچوب بندم
گویم سخنی مناسب حال — بر روی سخن ز گو نهم خال
چوگان ز زبان حال سازم — با گوی سخن خیال بازم
میدان سخن تمام گیرم — در نظم چو دُر نظام گیرم
در چشم جهان شوم گرامی — از گوهر نظم چون نظامی

در سبب نظم کتاب گوید

روزی که ز موسم بهاران — بود ابر دلی نبود باران
خورشید ز ابر پرده بسته — در خرگه غنچه گل نشسته
فراش صبا بساط رفته — هر سوی شکوفه شگفته
گل غرّه بخوب روی خویش — بلبل بسرود گوی خویش
در آب فتاده اضطرابی — گوی شده راست هر حبابی
آب از سر لطف و مهر و خوبی — سبزه بهزار تازه روئی
این روی بپای گل نهاده — وان در قدم سمن فتاده
از بس که دمیده سنبل تر — گوی شده خاک گوی عنبر

صحرا خوش و دلکش و هوا خوش
از خوی آن هوای دلکش

اندیشهٔ گشت در دلم گشت
رفتم چو صبا به عزم گلگشت

تا گر گذرم فتاد جائے
چون باغ بهشت دلکشائے

هر سو سمنے و یاسمینے
چون گلشن آسمان زمینے

گردون چو نظر وران زمین کرد
از مهر گشت و قصد کین کرد

گردید کبود و بس برآشفت
وز غایت کبر با زمین گفت

در خطاب آسمان با زمین گوید

کای نادرهٔ در برابر من
بنشین که نهٔ تو در خور من

با من تو برابری چه جوئے
کز دولت من بر آب روئے

تیغ تو ز من بود بهر یاب
در جیب تو من کنم دُر ناب

تو پستی و من بلند پایه
بر فرق تو از منست سایه

هر جا که خدای والسما گفت
والارض نگر که در قفا گفت

فرقی بتوام که در میان است
مابین زمین و آسمان است

من دایره ام ز گوهر پاک
تو نقطه و لیک نقطهٔ خاک

بازار من از چراغ کوکب
هم روز مزین است و هم شب

فیروزی من ز ماه و مهر است
زانم شب و روز جاه و قدر است

جای که منم کهٔ تو یارے
در پای فتاده خاکسارے

آباد تو سر بسر خرابست
پیوسته کو رخ تو در آبست

بس کز تو بدل غبار دارم
نی روز و نه شب قرار دارم

با سنگ دلی و تیره رای
در معرض من تو چون درآی

اینها به زمین چو آسمان گفت
لرزید زمین و در زبان گفت

[illegible]

در خطاب زمین با آسمان گوید[1]

از کوکب اگر مزینی تو | یا از گل مهر گلشنی تو
من نیز بدور لاله و گل | دارم ز تو بیشتر تجمل
در تو شب تیره می نمائی | از آئینه شمع[2] روشنائی
بنگر که مرا هم از سیاهی | در عین صفا چنانکه خواهی
چون چشمهٔ خضری درخشد | آبی که حیات خضر بخشد
گر هست ترا نجوم ظاهر | آراسته ام من از جواهر
گر کوکبهٔ تو از بلندیست | در پستی من صد ارجمندیست
من گویم اگر تو صولجانی | بر من ز چه خنگ می دوانی
هر چند تراست خود نمائی | یاری همه گرد من برآئی
اینجا چه مقام خود ستائیست | پیداست که این سخن هوائیست
گر فخر تست زماه و مهر است | فخرم به بتان ماه چهر است
من سرمهٔ چشم مهر و ماهم | زان روی که خاک پای شاهم
این بس بودم که ابرش شاه | چون آب بروی من کند راه
چون هست صد آبرو برینم | روی تو درد است بر زمینم
چون گفت زمین جواب گردون | دیدم که چو آفتاب گردون
از هر طرفی سوار دیگر | گل روی سمن عذار دیگر
جولان دادی سمند تازی | مشغول شدی بگوی بازی
در دست چو سیم هر جوانی | بود از زر ناب صولجانی
آن سر به فلک چو سرو سوده | این میل چو شاخ گل نموده

۱۔ انکار زمین مر آسمان را ۲۔ گل و لالہ ۳۔ ماہ ۴۔ عرفات میں ۵۔ ... ۶۔ ... دانی ... خضر ...
۔ گر فخر تو خود ... سرخ و سفید رنگ کا گھوڑا ... ماہ

این جانب گوی روی کرده — قصد زد و برد گوی کرده[1]
آنها به یکی دگر نموده — در گوی زدن هنر نموده
این گوی ز پیش آن ربوده — آن در خم صولجان ربوده[2]
هر گوی که این ز راه بردی — آن بر سر جایگاه بردی
در بر زدن و ربودن گوی — دیدم که دو صولجان ز هر سوی
قلاب صفت فتاده درهم — انداخته خم[3] چو زلف پرخم
چوگان شده همچو سایه داری — دیوانه ز دست هر سواری
از تاب هر آفتاب روئی — گو از سر حال کرده سوی

در صفت[4] پادشاه عصر گوید

القصه چون این بساط دیدم — قوتی همه پر نشاط دیدم
صدگونه خیال داد دستم — در حال میان بعذر بستم
چون گوی بگوشهٔ دویدم — چون تیشه روان[7] زبان کشیدم
تا گوی سخن تراشم از جان — در خدمت شه برم به میدان
خورشید سریر و ماه مسند — سلطان[9] جهانیان محمد
شاهی که چو برگرفت چوگان — مه گوی شد و سپهر میدان
آن لحظه که پا بزین در آورد — گرد از کرهٔ زمین بر آورد
چون ابرش باد پا برانگیخت — گوی که بباد آتش آمیخت
چوگانی[10] شه که در تکاپوی — از توسن چرخ می برد گوی
درجستش ار نه سر کشیدی — بر گوی سپهر[11] بر دویدی

۱. الف - یہ شعر نہیں ہے - ۲. ب - در ۳. ب - در مدح شاہی شاہزادہ ۵. ب - خلقی ۶ - ہر ۷. الف - فی الحال ۸. ب - بزبان خود کشیدم ۹. اشارہ بہ شاہزادہ محمد بن بایسنغر ۱۰، ۱۱. یہ دونوں اشعار نسخہ الف میں نہیں ہیں۔

چون گوی سپهر کرد پستی ‌‌ ‌ میدان میدان چو گوی جستی
هر گاه که در عرق شدی غرق ‌ باران بودی و در میان برق
آویخته مرمر از دُم او ‌ بگریخته آذر از سُم او
گوئی ست در دست گاه جولان ‌ بر گوی زدم کشیده چوگان
هر پی که دو دیده در پی گوی ‌ گردیده ز سر عقش سر گوی
هر بار که در نورد رفته ‌ صد باد صبا بگرد رفته
از کوه چو سیل در گذشته ‌ وز بحر چون باد بر گذشته
آن کوه نورد زور تاورد ‌ هر گو که بدست و پا در آورد
دیده فلک از کنار میدان ‌ یک گوی میان چار چوگان
آن عرصه که شاه گوی بازد ‌ با تازی تیز گوش بازد
میدان سعادتش توان گفت ‌ دُر دیده دولتش توان گفت
آن صحن فلک که گوی ماه است ‌ جولانگه باد پای شاه است
گوی که هلال آسمانش ‌ چوگان شه است و صولجانش
چوگان فلک که زر نگار است ‌ سر گشته گوی شهریار است
گوی که شه از ره هنر زد ‌ بر لوح جبین ماه سر زد
آن داغ که بر جبین ماه است ‌ گوی تو که زخم گوی شاه است
نا آمده بر زمین برد تاخت ‌ زد باز و بر آسمانش انداخت
از ضربت صولجان سلطان ‌ گردون شده نیز گوی غلطان
هر گوی که زد شه جوان مرد ‌ خورشید نهفته گشت در گرد
چوگان سر خود به مه رسانده ‌ خود را به گوی شه رسانده
هر گوی چو صولجان رساندی ‌ فریاد بر آسمان رساندی

۱۔ یہ شعر نہیں ہے ۲۔ ب۔ بار ۳۔ مصرع اول کو موخر اور مصرع دوم کو مقدم کیا ہے ۴۔ ج ۵۔ یہ شعر نہیں ہے ۶۔ ب۔ کہ جای ۷۔ ب۔ جدا
۸۔ ب۔ سرو ۹۔ ب۔ صولت ۱۰۔ ب و ج۔ یہ شعر نہیں ہے ۱۱۔ ب۔ آواز

گوی مه از آسمان فتاده — رخ بر سر گوی شه نهاده
زیبد ز برای عرصهٔ شاه — کز غایت مهر آورد ماه
هم گوی ز گوهر کواکب — هم میل زر از شهاب ثاقب
دارند چو بر قبولش امید — چوگان هلال و گوی خورشید
تا گوی زمین آسمان است — چوگان هلال درمیان است
آن شاه سوار عرصهٔ رزم — وان گنج نثار مجلس بزم
پیوسته خجسته حال باده — چوگانی او هلال باده

در آغاز داستان شاهزاده و درویش

گویای سخنور سخن سنج — کز دُرج سخن برون دهد گنج
فرمود که در آوان پیشین — از جملهٔ خسروان پیشین
در عرصهٔ عشقه بود شاهی — دارای جهان جهان پناهی
چون مهر به تیغ چین گرفته — آرام دران زمین گرفته
تنها نه همان گل زمین داشت — صد ملک دگر ورای چین داشت
هر جا شتگهی بر آستانش — صد ترک خطا کشیده خوانش
زیبندهٔ چستر بود و چوگان — گو از همه برده روز میدان
گردون زخشی ستاره خیلی — هر لمعه ز تیغ او سهیلی
بر ماه کشیده بارگاهش — مشکین شده چین ز گرد راهش
محتاج درش هزار خاقان — فغفور یکیش از وشاقان
آن شاه که از بلندی بخت — بالاتر از آسمان زدی تخت
چون ماه دو هفته یک پسر داشت — کز مهر جمال بیشتر داشت

۱- فتاده است ۲- رخ بر سُم اسپ او نهاده ۳- یہ شعر اس طرح ہے چوگان زر او شہاب ثاقب + ہر گوی ز گوہر کواکب ۴- آ ماد
حال نامہ ۵- ہنرور ۶- دہر ۷- شہر ۸- یہ دو اشعار نہیں ہیں

ماهی که تمام دلبری بود / در صورت آدمی پری بود

شایستهٔ تاج و تخت شاهی / رستهٔ گل از درخت شاهی

شیرین سخنی که داد بر باد / از سنگدلی هزار فرهاد

لیلی زلفی که داشت مفتون / در سلسلهٔ هزار مجنون

صد ترک ختن غلام درویش / صد فتنه چین ز تار مویش

هرگه که سمند بر نشستی / زلفی چو کمند بر شکستی

آهو به کمندش او فتادی / در پای سمندش او فتادی

در زلف هزار چین نهان داشت / در هر چین هزار جان داشت

جان داده بتان چین برایش / آهوی ختن سبک سرایش

رویش ز غبار خط شبرنگ / آئینهٔ چین نموده در رنگ

نافه گرهی ز گیسوی او / چین فتنه شده ز ابروی او

ماه آمده هندوی کمینش / وز خرمن حسن خوشه چینش

در چین قبا هزار جانش / آویخته موی تا میانش

هر لحظه ز چشم آهوانه / بر هم زده صد نگار خانه

بت پیش رخت سجود کرده / رخ سوده بخاک و سود کرده

زلفش که فتاده بر زمین بود / در هر شکنش هزار چین بود

صورت گر چین که هر زمانی / بدلکشش برو زمانی

چون صورت لعل او کشیدی / انگشت هزار پی گزیدی

نقش قد ابرویش چو بستی / از حیرت او قلم شکستی

آن مهر سپهر شهریاری / کز ماه گذشت در سواری

همراهی اسب تاختن داشت / هم میل بگوی باختن داشت

---

(۱) ان مصرعوں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہے (۲) ب۔ شلم (۳) ب۔ یہ شعر نہیں ہے (۴) ب۔ بندہ ای (۵) ب۔ جان داشت (۶) ب۔ سها داشت

یک دم بهوای گوی شاباش — از دست نمی نهاده چوگان
باحسن و جمال عالم افروز — بر صورت آفتاب هر روز
بیرون رفتی بگوی بازی — جولان داده سمند تازی
گویند که بود یک غلامش — چون بدر ولی هلال نامش
همچو مه چارده تمامی — در صورت خسروی غلامی
بر گوشهٔ ابرویش هلالی — بر ماه ز شب نهاده خالی
در حسن شکست ماه کردی — چوگان داری شاه کردی
چون رغبت بازیش فتادی — چوگان ز رشش هلال دادی

رفتن شاهزاده بگوی بازی

روزی به نشاط کامرانی — شهزادهٔ چین چنانکه دانی
بر خنگ سبک عنان برآمد — چون مه که بر آسمان برآمد
با خیل و سپاه خود برون رفت — با کوکبه ز حد برون رفت
از بهر نشاط گوی بازی — آراست بساط گوی بازی
وانگه ز هلال خواست چوگان — بر گوی گرفت راست چوگان
چوگان چو بگوی سر در آورد — در معرکه گوی سر بر آورد
چون پای نهاد بر سر گوی — گوی از همه روی شد سخن گوی

در حالت عشق و گوی چوگان

گفت ای سر من فدای پایت — بر باد دهم سر از برایت
چون از قدم تو سر فرازم — سر در قدمت چرا نبازم
بر لطف و فاز سر گرفتی — از خاک مرا تو بر گرفتی

ب علامہ دیدنی ہے دونوں مصرعوں میں "ی" کی گئی ہے۔ یہاں کوئی عنوان نہیں ہے۔ [illegible]

برداشته توام درین کوی — بر خاک رهت ازان نهم روی
از خویشم اگر دهی رهائی — باز از پی من دو اسپه آئی
در پای توام که سرسری نیست — بشنو سخنم که سرسری نیست
دست تو ز من همیشه بالاست — هر جا قدمت سر من آنجاست
بر تارک اگر زنی نزارم — سر از قدم تو بر ندارم
خالی نه کنم سر از خیالت — عمریست که می پرم بیالت
از دست تو گر نفیر دارم — خود از تو کجا گزیر دارم
با آنکه نه تو پای بر جا — دارم سر آنکه بوسمت پای
گر تو ز سر دراز دستی — صد بار سر مرا شکستی
بی دیدنم اگر سر از تو پیچم — جز سر که بدست نیست هیچم
در هیئت اگر درست ماهم — زیر قدم تو خاک راهم
تا بود بدین صفت وجودم — در تحت تصرف تو بودم
زین سان تو ام ارجمند کردی — آوازهٔ من بلند کردی
بر فرق تو ام که راه داری — این پایه ز دست شاه داری

فی الحال بگوی گفت چوگان

از گوی چو این شنید چوگان — فی الحال زبان کشید چوگان
کای خستهٔ روزگار چون من — گرد سر تو هزار چون من
زین گونه که سرخ رویم از تو — پیوسته چرا نگویم از تو
از تو سر من بچرخ ساید — پایم ز تو بر زمین نیاید
در پای فتادهٔ ز دستم — من قدر ترا چنین شکستم

ـــ رہِ تو ہے۔ جدائی ہوسکتی ہے۔ یہ مصرع اس طرح ہے " چون جیتو قرار نیست ہیچم " ـــ قصمت ـــ سرم ہے۔ کردی
ـــ کردی ـــ یہاں کوئی عنوان نہیں ہے مضموں کی مناسبت سے اب کا یہ عنوان درست ہے۔

قدم که خمیده همچو دالست | بر دوستیت گواه حالست
از هر طرفی که می توانم | خود را بسر توی رسانم
هر لحظه مرا ز دست دیگر | از بهر تو سوده بر زمین سر
دست من و گردن تو محالست | پای من و دامن خیالست
دنبال تو جز بسر نگردم | تا سر بود از تو بر نگردم
کار من اگرچه در هم از تست | اصل من و فرع من هم از تست
بی تو قد من شکست گیرد | خود بی تو مرا که دست گیرد
این سرکشیم ز پستی تست | وین هستی من ز پستی تست
چون نیست قرار هیچم از تو | بر خویش چو مار پیچم از تو
من در پی تو بسر دویده | تو بر طرف دگر دویده
از پی ز نگاه کردن من | کج مانده ز دور گردن من
این سر که مراست بر سر دوش | بهر قدم تو دارمش گوش
چون آرزوی تو در سرم هست | دارم سر خود نگه بدو دست
جای من اگرچه دست شاهست | در حال تو شاه را نگاهست
چون پاسخ یکدگر شنودند | آیین وفا ز سر نمودند
در خدمت شاهزاده آن گاه | بر شکل هلال و هیکل ماه
این از سر خویشتن قدم کرد | وان پشت ز روی مهر خم کرد

در دیدن درویش شاهزاده را

شهزاده در اوج سرفرازی | مشغول شده بگوی بازی
ناگاه ز گوشه فقیری | در کوی نیاز گوشه گیری

---

۱ ب ـ دستی ۲ ب ـ ی دوانم ۳ ب ـ دامن ۴ ب ـ بر خویش [illegible] ۵ ب ـ [illegible] ۶ ب ـ [illegible] پادشاه ۷ ب ـ در رفتن دل ز دست درویش ۸ ب ـ مشغول گوی ـ

آوارۂ مفلسی غریبی وز نقد مراد بی نصیبی
سودا زدۂ سیاه بختی افتاده چو سایۂ درختی
هم چشم ترش سپه بهاری هم چهره زگریه لاله زاری
برهم زدۂ خراب حالی وز دست زمانه پایمالی
برپای دلش ز عشق بندی در گردنش از هوا کمندی
شه را چو ز دور یک نظر دید حیران شد و حال خود دگر دید
دیوانه شاهزاده آمد وز اسپ خرد پیاده آمد
هر بار که سوی شه نظر کرد صد گوی سرشک رو بدر کرد
چوگان چو گرفتی آن پری رو آن شیفته ربوده چون گو
گرد آمدی دلبر دویدی هر دم طرفی دگر دویدی
در بازی شه نگاه کردی[1] فریاد زدی و آه کردی
پیراهن صبر چاک می زد در عشق دم از هلاک می زد
از دیده دُر خوشاب می ریخت نی دُر که عقیق ناب می ریخت
بر[2] چهرۂ زرد داز خط آل گویا شده بود صورت حال
چاووش که بود محرم شاه آن حال نگاه کرد ناگاه
نالان سوخته خواست حال پرسید دیدش دُر اشک و مهره برچید
گفت آه چه بازی فتادش زین مهر کجا بود کشادش
صد گونه بلا بود درین کوی در کوی بلا کسی نهد روی
زین ورطه که عقل پی نبرد جان مشکل ازین توان برون برد
این بادیه را کران نباشد بیرون شد ازین بجان نباشد
ترسم که بجان رسد زیانم کاین قصه بگوش شه رسانم

۱ - یہ شعر نسخہ د میں نہیں ہے۔ ب میں یوں ہے: بی کرد ج میں اس کے بجای یہ مصرعہ ہے "میریخت سرشک و آه می کرد"۔
۲ - بر چہرۂ زردش از خط و خال؛ ب: یہ شعر نہیں ہے۔

کاں دلشده را بخون نشاند　　گر باد بگوشش رساند
چادوش اگرچه سر نگهداشت　　از حسن فراستی کرشمه داشت
حال دل آں زپا فتاده　　دریافته بود شاهزاده
برگوی که صولجاں رساند　　کو حالت گوی را نداند
دل را که به دلبری سپارد　　کز مهر دلش نگه دارد
بر صید که زد خدنگ کاری　　کش دل نکشید بر شکاری

در نالیدن درویش تمام شب گوید

شهزاده بدلنوازی آں روز　　بهر دل آں غریب دلسوز
گو از همه روز بیشتر تاخت　　آں روز برغبت دگر باخت
بر چرخ چو گوی مهر بگذشت　　شهزاده عناں کشید و برگشت
درویش چو گوی بر زمیں ماند　　حیراں شد و روی بر زمیں ماند
جائی که نشان گوی شه یافت　　آنجا سر خود چو خاک ره یافت
جائی که اثر زگوی شه داشت　　برداشت بدیده و نگه داشت
افتاده چو گوی بود برجست　　زد بر سر خود چو صولجاں دست
کرد از سر حال ناله آغاز　　وز ناله بلند کرد آواز
گفت از خودی خودم ملالست　　حالم دگرست این چه حالست
بد حالم و همچو گوی پامال　　یارب که مباد کس بدیں حال
زاں به که فسانه گوی گشتم　　افسانهٔ شهر و کوی گشتم
گوی دل خود ز دست دادم　　در معرض گفت و گو فتادم
از من برشه سخن که گوید　　من کیستم و ز من که گوید
مرغ دل من شکسته بالست　　چوں گوی شکسته حالست

۱۔ یہ شعر نہیں ہے ج۔ ۲۔ یہ عنوان نہیں ہے ج ب ۳۔ ب ج ۔ یہ شعر نہیں ہے ج ب ۔ درد ۔ ۔ ۔ ۴۔ یہ دونوں اشعار ہیں

پا از سر و سر ز پا ندانم سرگردانم بگوی مانم
سرگشته و خسته دل چه گویم حال دل خویش با که گویم
عشقم چپ و راست می دواند حالی که مراست گوی داند
گرز آنکه رسم بگوی حالی با او گویم که کیف حالی
ای بار خدای حال گردان هجران مرا وصال گردان
فردا که رسد این طرف شهدری خواهم بر هش فتاده چوی گوی
یا گوی بردن برم ز میدان یا سر بنهم چو ناامیدان
زین گونه بخود خیال می بست صد نقش ز روی حال می بست
هردم غم نو نواله میکرد وز جور فراق ناله میکرد
شخصی همه سال همدمش بود کو در همه حال محرمش بود
چون همدم دید سالهٔ او از دور شنید نالهٔ او

در آمدن رفیق درویش گوید

از راه وفا بسویش آمد چون آینه روبرویش آمد
در گرد نهفته دید رویش برهم زده یافت موبمویش
گفتا که بگو چه حال داری سودای که در خیال داری
گوی ذقن که در خیالت گردید و ربوده گشت حالت
بهر که نشستهٔ بدین روز در آتش کیستی بدین سوز
آخر تو سگی کدام کوی سودا زدهٔ کدام روی
تو مهر کدام ماه داری تو رو به کدام راه داری
در عهد کدام بی وفائی در عشق کدام دلربائی
تو صید کدام شهسواری آهوی کدام لاله زاری

۱- کند ب- دل ب- دست ب- آتش ۵ الف- ب- شعر نیست

این ناله و آه زاریت چیست / بی صبری و بیقراریت چیست
آن شیفته حال در جوابش / گریان به هزار اضطرابش
گفت از رخ زرد و اشک آلم / معلوم کن و مپرس حالم
حال دل خویش با که گویم / گوید دگر اشک من چه گویم
هم کار دل من بجان رسیده / هم کارد باستخوان رسیده
این دیدهٔ اشکبار بنگر / وین روی چو لاله زار بنگر
روز من و روزگار من بین / بستان من و بهار من بین
ره گم شده در دلم نفس را / این حال مباد هیچکس را
این حال چو دید همدم او / زد آه و گریست از غم او
دانست که حالش از چه زارست / در قید کدام شهسوارست
کرد از رهِ یاریش ملامت / کای رفته ز کوچهٔ سلامت
اینجا قدم استوار باید / گر سر برود قرار باید
از رفتن سر بکوی درِ عشق / آخر چه سر و چه گوی درِ عشق
بحری که درو دو کون غرقست / اینجا سر و گوی را چه فرقست
این گوی محبت است ازین کوی / نتوان سر خود گرفت چون گوی
چون گوی بکوی عِشق بازی / سرباز که نیست عِشق بازی
زین درد که هر نفس توان مُرد / یک تن نه شنیده ام که جان بُرد
گر تیغ رسد بکش سر از یار / صد سر بکوی بود درین کار
چون این سخنان شنید درویش / خط بر سر و جان کشید درویش
زان حال بصورت دگر گشت / وان درد که داشت بیشتر گشت
بر صبر و قرار داد دل را / بر دادن جان نهاد دل را
با دل غم روزگار خود گفت / و آنگاه ز جان نثار خود گفت

۱ب۔ حال دل ریش رو بمدیم۔ گوید دگر اشک مو بمویم ہے۔ بخوده تا ۔ کشته ہے۔ حال ۲ب۔ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے ۳۔ گفت ۔ ب
زجان نثار می گفت۔

یک سرمہ گرم ہزار باشد
صرف رہ شہریار باشد

جانم چو رود ز پیکر من
خواہم کہ ز دیدہ و سر من

در عرصہ شاہ گوی سازی
تا شاہ کند بگوی بازی

و آنگاہ مرا ز روی یاری
در منزل خاک چوں سپاری

از روی وفا و مہربانی
بر تربت من اگر توانی

گوی نہی و صولجانی
کز پاد سرم بود نشانی

زینسان چو بہمدمش سخن رفت
بس بر سر حال خویشتن رفت

ہر سوی بہ جستجوے می گشت
بر روی زمیں چو گوی می گشت

می تاخت چو گوی گرد میداں
می ساخت ز دود آہ چوگاں

بر ہر طرفی کہ راہ کردی
حیراں بہ زمیں نگاہ کردی

گفتن درویش حال خود با گوی

ناگاہ ز دور دیدہ گوی
سرگشتہ و خستہ دل چو اوی

سرگشتہ گوی بے قراری
رقاص بساطِ خاکساری

بر خاک نیاز رو نہادہ
وز سر ہمہ آرزو نہادہ

از چرخ بسی جفا کشیدہ
در عاشقی آزہا کشیدہ

گرد ستمش برو نشستہ
آوازۂ او بدو نشستہ

خشک و تر روزگار دیدہ
دردسر بے شمار دیدہ

صد کو بہ روزگار خوردہ
صد زخم ز دست یار خوردہ

در کوی وفا دویدہ عمری
با باد ہوا دویدہ عمری

ہم کردہ بباد ہم عنانی
ہم کردہ بخاک سرگرانی

ب۔ک ۔ د سہ برسود کار ہ ۔ در گفتن راز گوی در درویش ہے ۔ بلاد ۔ معف ۔ یہ دونوں اشعار نہیں ہیں ۔ ۔

درویش دوید بر سر او — وز پای نشست در بر او
تا حال گذشته باز گوید — با گوی شکسته راز گوید
القصه بگوی راز دل گفت — وز عجز خود و نیاز دل گفت
چون گوی شنید گفتگویش — بر خاک قدم نهاد رویش
از فرق نخست راه رفتش — وآنگه بزبان حال گفتش
کای شیفته ستم کشیده — صد گونه بلا و غم کشیده
بردار ز خاک راه رویم — تا پیش تو سرگذشت گویم
گویم چه گذشت بر سر من — وز چرخ چه گشت بر سر من
من نیز دل شکسته دارم — همچون تو درون خسته دارم
آن روز که حال من نکو بود — در پیش شهم صد آبرو بود
می کرد چو شه نگاه در من — حسرت می خورد ماه بر من
صد بار بدور من مه و خور — از رشک زدند بر زمین سر
امروز که ریخت آبرویم — فرقی نبود ز خاک کویم
از گردش روزگار دوار — ناگاه بسر آمدم بدیوار
از بازی چرخ این عجب نیست — دنبال کدام روز شب نیست
گر روز و شب است وگر مه و سال — پیوسته کجا بود بیک حال
مه گرچه بدان کمال باشد — گه بدر و گهی هلال باشد

خطاب کردن درویش با چوگان

از کوی چو درگذشت درویش — چوگان شکسته دید در پیش
افتاده و پا دراز کرده — پیوند ز غصه باز کرده
از دست شده ز کار مانده — وز پای فتاده زار مانده

۱- برسر ۲- [illegible] می برد ۳- [illegible] قصه چوگان و درویش [illegible]

سرباختن اختیار کرده — سر در سر عشق یار کرده
چون زلف بتان فتاده در پای — سر داده بباد و پای برجای
از جور سپهر خم گرفته — در پیش ره عدم گرفته
پا در گذر بلا نهاده — سر خیره بجای پا نهاده
پا در گل و مانده سر بزانو — نی زور قدم نه زور بازو
بر خاک نهاده پهلوی خویش — انداخته خم در ابروی خویش
درویش که حال ازو بتر داشت — از مهر سرش ز خاک برداشت
در صورت حال او نظر کرد — آری ز دو حالتی دگر کرد
آن بیهده گوی درد پرورد — برداشت خروش از سر درد
حال دل خود بصولجان گفت — از دل نه که از میان جان گفت
چوگان چو شنید حالت او — پر حال شد از مقالت او
سر تا بقدم همه زبان شد — آنجا همه تن زبان توان شد
گفتا که برین خمیده قامت — روزی گذرد بعد قیامت
من هم غم[1] روزگار دارم — صد شکوه ز دست یار دارم
روزی که بدست شاه بودم — سر بر سر گوی ماه بودم
که بر سر دوش شاه بودم — گه فرق سرم بماه سودم
گه سرزنش هلال کردی — گه در پی گوی حال کردی
امروز که مانده بر زمینم — بر خاک نشسته این چنینم
کس را چه خبر ز زاری من — وز خواری و خاکساری من
درویش چو دید زاری او — وان زاری و بیقراری او
اشک و مژه گوی و صولجان کرد — هر گوی بگوشه روان کرد

[illegible]

از سیم سرشک گوی می ساخت — در صحن دو دیده گوی می باخت
چندان که ز حال خویش می رفت — آتش ز دو دیده پیش می رفت
می رفت و زمین بدیده می رفت — حال دل غم رسیده می گفت
با خود همه شب مقال می کرد — می گشت چو گوی و حال میکرد
میدان ز دو دیده آب می زد — وز هر مژه راه خواب می زد
چون گوی بهر سبیل می گشت — وز دیده بگرد میل می گشت
گه بر سر و دیده خاک می کرد — گه خاک بدیده پاک می کرد
گه بر سر جایگاه می رفت — گه بر سر راه شاه می رفت

در چوگان بازی شاهزاده گوید

تا روز دگر که خسرو چین — از مهر نمود گوی زرین
شهزاده چنین ز خواب خواست — چون مهر برخ جهان بیاراست
پوشید یکی قبای چینی — وز غایت لطف و نازنینی
بر فرق نهاد تاج شاهی — بربست کمر چنانکه خواهی
از زر کمری که بر میان بست — گوی که بقصد آن جوان بست
خالی چو نبود از خیالش — می خواست نظر کند بحالش
زان روی بدی چو آفتابش — آن روز بر فتن اضطرابش
زین گفت نهند بر سمندی — کس بود سپهر نعل بندی
زین نرم روی فراخ گامی — آراسته از زرش لگامی
گردون گردی زمین نوردی — کز چشمهٔ مهر آب خوردی
آهو روشی پلنگ خوی — چوگانی کرد همچو گوی
در پویه ز باد گوی بردی — میدان هوا زمین شمردی

۱- یہ شعر نہیں ہے ۲- چوگان بازی ۳- دگر روز ۴- شعر نہیں ہے ۵- بحوں

نی آب بر ابرش دویدی
نی باد بگرد او رسیدی

بر گوی بجائیکی ستادی
چابک‌تر ازو نبود بادی

چون باد اگر بتد قرارش
شهزاده چو باد شد سوارش

پیش و پسش از بتان سپاهی
هر یک چو ستاره او چو ماهی

بر دوش گرفته هر جوانی
مانند هلال صولجانی[۱]

در حسن زمه زیاده بودند
هم بازی شاهزاده بودند

این حلقهٔ زر کشیده در گوش
وان حلقهٔ زلف در بناگوش

این جعد سیاه تاب داده
وان خنجر غمزه آب داده

این طرف کلاه برشکسته
وان بر گل تر کلاله بسته

این دست ز سیم ناب برده
وان گوی ز آفتاب برده

این گوی نموده از زنخدان
وان از سر زلف کرده چوگان

این کرده بزه کمان ابرو
وان بسته گره کمند گیسو

این صف‌شکن بتان چینی
وان غیرت لعبتان چینی

این هر دو بگوی سیم غبغب
صد دست کرو زماه نخشب

آن برده ز لعبت خطای
صد بار سبق بدلربای

شهزاده د آن بتان که بودند
چون ماه و ستاره می‌نمودند

نظارگیان ز هر کناره
دیدی مه و گرد او ستاره

شهزاده چو از کنار میدان
انداخت نظر بگوی و چوگان

چون شه سر خود نهاد بر دست
گوی از شادی زجای برجست

در خدمت آن بتان بروی
آرام نداشت بر زمین گوی

شاه از همه گوی حسن می‌برد
می‌دید ز دور و خلق می‌برد

گوی کرشمه از میان ربودی
آن در خم صولجان نمودی

---

۱ ب ت ب - یہ دونوں اشعار نہیں ہیں

چوگان هلال و گوی گردون   چون صورت لام و نقطهٔ نون
یا معز و الف برابر هم   افتاده نموده در خور هم
یا ماه ببرج تواماں رفت   یا مهر بخانهٔ کمان رفت
یا طرّه و خال در بر او   یا قامت عاشق و سر او
شهزادهٔ چیْن و گوی بازی   درویش چو شمع جانگدازی
شهزاده و صولجان و خوبی   درویش و چو گوی پای کوبی
شهزاده و قصد گوی بردن   درویش و خیال جان سپردن
شهزاده و گوی و حال کردن   درویش و سماع و حال کردن
شهزاده بحسن خویش مغرور   درویش بعشقبازی از دور
شه گوی زدی و حال گفتی   درویش به صد خیال گفتی
کاشم سر و دیده گوی بودی   تا شاه به صولجان ربودی

در فوت گدای زار گوید

ناگاه چو نگاه شاهزاده   افتاده بران ز پا فتاده
صد شوخی و دلبری نمودش   وز چستی و چابکی که بودش
گوی به کرشمه سویش انداخت   آن گاه بناز بر سرش تاخت
بر خاک نشسته بود درویش   انداخته سر چو صولجان پیش
آتش زده بود و مضطرب حال   افتاده چو لاله بر زمین لال
زان بی سر و پا چو گوی خود جست   برجست چو گوی از زمین جست
بر آتش دل چو آب زد جوش   کآواز شهش رسید در گوش
اول بدو دیده و سر آمد   گرد سر گوی شه بر آمد

[illegible]

وآن گاه بگریه آه برداشت　　وان گوی ز خاک راه برداشت
چون بود ز جام بیخودی مست　　جان گوی صفت نهاد بر دست
با گوی بدست شاه جان داد　　جان خوشتر ازین کجا توان داد
جان باخت رواں وا ز جہاں رفت　　آسان تر ازین کجا توان رفت
درویش که حالتی چنین داشت　　گوی تو که جان در آستین داشت
از هر که درین بساط سر باخت　　چوگان عشق بیشتر داشت
از عالم سر چو با خبر بود　　گوی که نخست باخت سر بود
زین حال خبر نیافت مجنون　　وین سلسله در نیافت مجنون
این درد کجا کشید فرهاد　　وین زهر کجا چشید فرهاد
این بیهده کرد بی سر و پا　　وان خاک نشین باد پیما
می گشت بهر طریق چون گوی　　ناگاه نهاد سر درین کوی
چون گوی هزار پی سرش گشت　　تا حال چنین میسرش گشت
جان داد و کران از جهان برد　　دستی زد و گوی از میان برد
دلدار بجست جان بدنبال　　آخر همه را بود همین حال
در راه وفا قدم ز سر ساخت　　تا آخر حال گوی سر باخت
تا مرحله که هست در پیش　　رخت از سر حال بست درویش

در حالت شاه بهر درویش

آن حال چو دید شاهزاده　　فی الحال ز اسپ شده پیاده
چوگان بشکست و گوی انداخت　　میدان دل از نشاط پرداخت
سر رشتهٔ عشق داد از دست　　چوگان طرب نهاد از دست

ب ـ یہ شعر نسخہ ۲ ، آ ، ۃ میں ہے ـ یہ اشعار 'ب' میں نہیں ہیں ـ یہ عنوان تو ہے مگر یہ سات اشعار جو اس عنوان کے تحت نسخہ 'الف' میں ہیں
وہ یہاں نہیں ہیں۔ اس حصہ کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے "چوں قامت من ز دست دوران"

بر خاک نشست و زار بگریست — چون ابر که در بہار بگریست
بر برگ سمن گلاب می ریخت — سیارہ بر آفتاب می ریخت
از تاب دل اضطراب می کرد — سر گرمیٔ آفتاب می کرد
وز عشق اگرت خبر ز خویش است — از جانب دوست عشق بیش است

در[۱] خاک سپردن درویش

شہ را چو بحال او نظر بود — ہم بر سر جایگاہ فرمود
کز راہ وفا کنید خاکش — جای ز برای جسم پاکش
آمن چو بدین طرف گر آیم — گرد سر خاک او بر آیم
در خاک چو پیکرش سپارید — بر لوح بخون دل نگارید
کین بود که داد داد در عشق — وین بود که سر نہاد در عشق
این بود که جان فدای دل کرد — سر صرف رہ ہوای دل کرد
این بود که قدر عشق دانست — برخواست ز کوی سر توانست
این بود که جان ببرد در حال — شد زندۂ عشق و مرد در حال
این بود که عشق پاک درزید — کس چو سر جان جوی نیرزید
این بود که نقد جان روان باخت — دل کرد گرو به عشق و جان باخت
زین گونہ کسی که عشق بازد — معشوق به عشق او بنازد

در[۲] صفت عشق بازی گوید

ای بستہ میان به عشق بازی — در عشق بود کمینہ بازی
نقد دل و جان ز دست دادن — سر باختن و ز پا فتادن

۱؎ ب میں نسخہ میں نہ تو یہ عنوان ہے اور نہ یہ اشعار ملتے ہیں یہ سارا نسخہ میں یہ عنوان بھی نہیں ہے اس کے ابتدائی چار اشعار بھی نہیں ہیں البتہ آخری تین اشعار جان باختن والے درویش کے عنوان کے تحت اس نسخہ میں موجود ہیں

عاشق بود آنکه جان ببازد — وز بهر گوی روان بتازد
عاشق ز بلا گذر ندارد — اندیشهٔ جان و سر ندارد
عاشق که بترک سرش گوید — در عشق به از دگر نه گوید
زین حال که گفتمت نشانی — گر عاشق و عارفی بدانی
آنرا که به عشق اهتمام است — در عشق همین قدر تمام است

در[1] حسب حال و تاریخ اتمام کتاب گوید

چون قامت من ز دست دوران — خم گشته مثال نون و چوگان
پنجاه گذشت سال عمرم — یک نیم شکست بال عمرم
چوگانی فکر آزمودم — گوی سخن از میان ربودم
ز اندیشهٔ در خیال سفتم — وین نامه ز روی حال گفتم
گفتم سخنی که زو بگویند — ارباب سخن بدیده گویند
گوی سخنم که حال دارد — هم صنعت و هم خیال دارد
زین رو سخنم همه خیال است — زان روی دگر تمام حال است
خالی ز خیال نیست حرفی — بی نقطهٔ خال نیست حرفی
حرفی ز خیال نیست خالی — میدان سخن مراست حالی
هر بار که یک خیال بستم — صد بار ز جا چو گوی جستم
هر شب که درین خیال بودم — گه بدر و گهی هلال بودم
یعنی که ز فکر تم تن و جان — گه گوی نمود و گاه چوگان
آنکو سخنی چو موی دارد — با من سر گفتگوی دارد
اینک ره شه عماد کی سخن دان — اینک من و او و گوی و چوگان

[1] «در حالت شاه بهر درویش» عنوان ہے جو مضمون سے مطابقت نہیں رکھتا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے سہو ہوا ہے اس لیے نہ تو اس لہٰذا اس عنوان کے تحت جو اشعار اصل نسخہ یعنی «الف» میں ہیں ان سے لکھا ہے اور نہ ہی پیش نظر عنوان لکھا ہے [illegible] یہ اشعار نہیں

حاشیہ — ماسن

کو در نظر آی اگر تواند | تا چند ز دور قصه خواند
دانم که چون این خیال بازد | برخیزد و کار خود بسازد
این نامه که ساختم تمامش | حال شده و حالنامه نامش
صدره ز خیال حالنامه | از حال به حال رفت خامه
از حیرت حال نامه من | دیگر شده حال خامه من
این حال که شعر عارفی راست | ناید صفتش بهر قلم راست
این گفته که سر بسر خیال است | سحریست[1] که آن مرا حلال است
در اوج بلندی آن مه نو | کز مشرق جان گرفته پرتو
کردم بدو هفته بهر نامش | همچو مه چارده تمامش
این نظم که چون دریست غلطان | در رشته برای گوش سلطان
چون بر عددش قلم نهادم | بر پانصد و یک رقم نهادم
گفتم که کنم زیاده گویی | دل گفت ز روی مهر جویی
کم گوی و لطیف همچو درگویی | کز اهل صواب نیست پرگوی
ای آنکه معاینه ندانی | تاریخ بیان این معانی
چون کوکبه سحر نماید | روشن بتو گوی خور[2] نماید
این نقش که طبع بنده پرداخت | این گوی که از زر سخن ساخت
بادا همه وقت دست گردان | تا گوی سپهر هست گردان

در خاتمه کتاب گوید

ای بخت سرم بلند کردی | زین نامه ام ارجمند کردی
این حال نبود در خیالم | تا گر تو شدی قرین حالم

---

۱ ب۔ یہ شعر نہیں ہے ۲ گوی خور سے سال تصنیف مثنوی ۸۴۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

باعث شدیم بدین رساله | کردی بجناب شه حواله
بر رخ در دولتم کشودی | بر گنج مراد ره نمودی
تا من ز سر خیال بندی | گفتم سخنی بدین بلندی
گر گوی سخن به مه رساندم | از دولت پادشه رساندم
شه را چو بدین نگاه افتاد | صد بار قبول شاه افتاد
بخشید مرا به لطف بسیار | چوگانی [1] و صد هزار دینار

تا هست فلک بقای شه باد
بر دست ملک دعای شه باد

---

[1] یہ شعر یوں ہے۔ یا "چوگان زر و ده هزار دینار"۔ "چوگان" بمعنی تربیت یافتہ گھوڑا جو چوگان بازی میں مشاق ہوتا ہے یہاں چوگانی ہی زیادہ مرجح ہے۔

منیر عالم
اورینٹل کالج
یونیورسٹی لاہور

دیوانِ میر سوز کا نسخہ کراچی

سید محمد میر سوز ۱۱۳۶ھ/۲۴-۱۷۲۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی اور عربی علوم کی تعلیم کے ساتھ فنون کی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کے والد اپنے زمانے کے اچھے تیر انداز تھے۔ سوز نے بھی تیر اندازی میں کمال پیدا کیا۔ احترام الدین[1] شاغل نے "صحیفۂ خوش نویساں" میں ان کا ذکر ایک اچھے خوش نویس کے طور پر کیا ہے[2]۔ قائم چاندپوری[3] اور بہت سے دوسرے تذکرہ نگاروں کے ہاں ان کے شفیعا اور نستعلیق میں کمال کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے پاس ان کے دیوان کا ایک خود نوشتہ نسخہ کا عکس محفوظ ہے جس کا ہر ورق میر سوز کی خوش نویسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شہسواری اور سپہ گیری سے بھی شغف تھا۔ اسپرنگر[4] نے مردانہ کھیلوں میں مہارت کا تذکرہ کیا ہے۔ محمد حسین آزاد[5] کے مطابق ان کی طاقت خداداد اس قدر تھی کہ ہر ایک ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ ستار نوازی میں بھی دست رس رکھتے تھے۔

اپنے عہد کی فضا سے متاثر ہو کر شعر گوئی کا آغاز کیا اور میر تخلص سے متخلص ہوئے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ سوز نے میر تخلص میر تقی میر سے متاثر ہو کر رکھا لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ ہماری اس تردید کی تصدیق کرتے ہیں[6]۔ تاہم جب میر تقی میر نے ملک سخن کی تاجوری حاصل کر لی تو سید محمد میر نے تخلص تبدیل کر لیا اور میر سے سوز کہلانے لگے۔ ہماری تحقیق کے مطابق تخلص کی یہ تبدیلی ۱۱۷۵ھ/ ۶۲-۱۷۶۱ء کے اواخر یا ۱۱۷۶ھ/ ۶۳-۱۷۶۲ء کے آغاز میں عمل میں آئی[7]۔

سوز نے احمد شاہ کی حکومت کے زمانے (۱۱۶۱ھ/۴۸-۱۷۴۷ء تا ۱۱۶۷ھ/۵۴-۱۷۵۳ء) میں شاہی توپ خانے کی ملازمت بھی اختیار کی۔ اس ملازمت میں قائم چاندپوری بھی ان کے شریک تھے[8]۔ نادر شاہ کے حملوں سے جب سلطنت کا رہا سہا اعتبار بھی ختم ہو گیا تو سوز نے بھی دہلی کو خیرباد کہا اور تلاشِ روزگار میں فرخ آباد جا پہنچے۔ یہاں قسمت نے یاوری کی اور انھیں نواب احمد خاں بنگش کے چہیتے رکن دربار مہربان خاں رند کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ ان کے بعد سودا بھی وہاں آ گئے اور اس طرح رند، سودا اور سوز میں گاڑھی چھننے لگی۔ رند یار باش اور مجلس پسند آدمی تھے۔ میر حسن نے رند کو "با اہلِ سخن ہمیشہ سرگرمِ سخن و با صاحبِ ہر فن چوں روح در تن"[9] قرار دیا ہے۔

رند کو بقول مفتی ولی اللہ فرخ آبادی "دیوان کی سرکار میں بہت عزت[10] حاصل تھی" اور یوں بھی ان

ریاستوں میں خوش حالی نے دم نہیں توڑا تھا اس لیے یہ قیام بہت یادگار رہا لیکن نواب احمد خاں بنگش کی وفات (۱۷۷۱ء / ربیع الاول ۱۱۸۵ھ) کے ساتھ جہاں یہ دیوانی ختم ہوئی وہاں رنگین و سوز کی صحبت بھی برہم ہو گئی۔

سوز یہاں سے فیض آباد اور فیض آباد سے لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں انھیں نواب آصف الدولہ کی اُستادی نصیب ہوئی۔ سوز اور آصف الدولہ میں جلد تعلق خاطر پیدا ہو گیا احمد علی خاں یکتا نے دستور الفصاحت میں لکھا ہے کہ:

"آصف الدولہ سچے دل سے ان کی بامزہ صحبت کے عاشق تھے اور بہت عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔"

میاں میر تقی میر بھی ان کی طرح آصف الدولہ کی ملازمت میں تھے لیکن ان تینوں اصحاب کے درمیان، کوئی مصالحت قائم نہ ہو سکی جس نوع کی صحبت رنگین، سوز اور سودا کی رہی۔ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کے انتقال سے یہ صحبت بھی برہم ہو گئی۔ سوز اس حادثے سے دل برداشتہ ہوئے، انھوں نے مرشدآباد اور ٹانڈہ وغیرہ کا رُخ کیا لیکن پریشان خاطری کے تسلسل کے باعث واپس لکھنؤ چلے آئے یہاں انھیں زندگی کا سب سے بڑا سانحہ پیش آیا۔ سوز کے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کا جواں سال بیٹا میر مہدی انتقال کر گیا۔ اس صدمے نے سوز کو ہلا کر رکھ دیا۔ میر مہدی کی یاد میں لکھے ہوئے سوز کے اشعار ان پر اس حادثہ کے اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔ بیٹے کی وفات کے دو ماہ بعد ہی سوز (۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء) نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ناسخ نے تاریخ کہی:

اٹھ گیا میر سوز دنیا سے ہائے صاحب کمال واویلا
سال تاریخ ہے یہی تاریخ شاعرِ بے مثال واویلا

سوز کی زندگی کا اہم ترین اور یادگار دور وہی ہے جو انھوں نے مہربان خاں رند اور مرزا رفیع الدین سودا کی صحبت میں بسر کیا۔ یہ دور جہاں سوز کی خوش حالی کے اعتبار سے اہم ہے وہاں سوز کے فنی مطالعے میں بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مہربان خاں رند شعر و سخن سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے لیکن غالباً خود موزونیِ طبع کی نعمت سے محروم تھے۔ ملازم (یا اس دور کی اصطلاح میں اُستاد) شعرا سے کلام لکھوایا کرتے تھے۔ سوز نے ان کے لیے کلام لکھا۔ آیا یہ کلام سوز نے انھیں لکھ کر بخش دیا یا بعد ازاں اسے پھر اختیار کر لیا؟

آج کی صحبت میں ہم دیوان میر سوز کے جس قلمی نسخے کی بابت معلومات فراہم کر رہے ہیں اس کا مطالعہ اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

دیوان میر سوز اب تک مرتب ہو کر شائع نہیں ہوا ہے البتہ اس کے مختلف قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں

محفوظ ہیں جن کا مفصل تعارف ہم نے دیوانِ میر سوز کی ردیف الف کے مقدمے میں کرا دیا ہے۔[11]

اس وقت میر سوز کے جس مخطوطے کا عکس ہمارے پیشِ نظر ہے وہ ۲۱.۵ سم × ۱۵.۵ سم سائز کے ۲۴۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ سید میر (کاتب) کا صاف نستعلیق میں لکھا ہوا یہ نسخہ ترقی اردو بورڈ کراچی (پاکستان) کی لائبریری میں محفوظ ہے چونکہ ہمارے محققین اور نقادوں نے سوز کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اس لیے دیوان میر سوز کا یہ مخطوطہ بھی بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہا ہے اس کا اولین بالوضاحت تذکرہ فائق رام پوری نے اپنے ایک مضمون میں بدین الفاظ کیا تھا:

"ایک نسخہ غالباً ۱۲۴۵ھ کا مکتوبہ احسان دانش صاحب کی ملکیت رہ چکا ہے۔"[12]

یہاں غالباً کے لفظ سے گمان ہوتا ہے کہ جب یہ تحریر لکھی گئی فائق صاحب نے وہ نسخہ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ احسان دانش کی ملکیت میں رہا تھا کیونکہ "رہ چکا ہے" کے الفاظ نسخہ کے دانش کے ہاں عدم وجود کو ظاہر کر رہے ہیں۔

جب ہم اس عبارت کو اردو نامہ کے اولین شمارہ میں شائع شدہ ایک مختصر تحریر سے ملاتے ہیں تو ہمیں اس نسخے کے سفر کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے احسان دانش کے ہاں سے کدھر کا رخ کیا۔ اردو نامہ کے اولین شمارہ کی ایک مختصر تحریر بعنوان نادرات (لکھنے والے کا نام درج نہیں) میں ذیل کا جملہ موجود ہے۔

"میر سوز کا کلام ان دنوں نایاب ہے لیکن ترقی اردو بورڈ نے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۵ھ حاصل کر لیا ہے"[13]

اس کے بعد یہ تذکرہ پھر وقت کی گرد تلے گم ہو گیا اور قریباً بیس برس بعد مشفق خواجہ کے مرتبہ و محققہ جائزہ مخطوطات اردو جلد اول کے ذریعے اس کا نہ صرف یہ کہ تذکرہ زندہ ہوا بلکہ مفصل تعارف بھی اہل علم تک پہنچا[15] کہ اس میں غزلیات کی تعداد ۲۷۰ ہے اور اشعار کی مجموعی تعداد ۲۱۳۱ ردیف الف ۱۳۹، نون ۸۵، واو ۶۴، را ۳۲، تا ۱۱، لام ۱۵، میم ۱۳، ہائے ہوز ۱۷، ثا، جیم، ذال، معجمہ، صاد، ضاد، طوئے ایک ایک، خا، شین، عین، غین، قاف میں دو دو اور باقی ردیفوں میں دو سے زائد اور دس سے کم غزلیات ہیں۔

مشفق خواجہ نے اس کے اوراق کا شمار دیا ہے جو ا، الف تا ۲۴۸ ب ہے۔ ہمارے پاس اس نسخے کا جو عکس موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس نسخے پر صفحات کے نمبر بھی لگا دیئے گئے ہیں اور یوں اس کے صفحات کی تعداد ۴۹۶ ہے۔

آغاز: جو شکر قلم صفحۂ خلاق جہاں کا | چاہے جو کرے وصف تو منہ کیا ہے زباں کا

اختتام: ہیں میں مت کہ چپ ہو سوز | تو میں میں بہانہ سوز

ترقیمہ: تمت تمام شد کار من نظام شد کاتب الحروف احقر العباد سید میر عفی اللہ عنہ تحریر فی التاریخ شہر جمادی الثانی روز شنبہ ۱۲۴۵ھ (نومبر دسمبر ۱۸۲۹ء)

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زانکہ من بندۂ گنہ گارم

اس نسخے کا احسان دانش کی ملکیت میں رہنا صفحۂ آخر پر احسان دانش کے دستخطوں سے ثابت ہے ــــ "احسان دانش کاندھلہ ضلع مظفر نگر ۱۸ جولائی ۱۹۳۹ء" علاوہ ازیں صفحہ اول پر بھی احسان دانش کی ایک تحریر ہے:

"اب تک جتنے مضامین میں حوالے دیئے گئے ہیں ان میں سب سے مکمل ترین نسخہ ہے۔"[۱۷]

اب ہم اس نسخے کے سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو کی جانب آتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس میں آغاز سے لے کر صفحہ ۳۰۷ تک کی غزلیات کے تمام مقطعوں میں تخلص پر سیاہی پھیر دی گئی ہے ــــ اس طرح کہ یہ تخلص بالکل پڑھنے کے قابل نہیں رہا گو بعد میں کسی اور شخص نے ایک دوسرے اور نسبتاً بھدے قلم سے سطور کے اوپر سوز لکھ رکھا ہے لیکن غالباً یہ زمانہ بعد کی اصلاح ہے۔

گذشتہ اوراق میں واضح کیا جا چکا ہے کہ سوز، رند کے ہاں ملازم رہے اور اس حیثیت میں وہ رند کو کلام لکھ کر دیتے رہے۔ ہم زیر نظر مخطوطے کے مقطعوں میں مٹائے گئے تخلص پر رند کا قیاس کرتے ہیں کہ کاتب نے یہ غزلیات کلام رند سمجھ کر کتابت کی ہوں گی لیکن بعد ازاں کسی قاری یا مصحح نے حقیقت حال سے واقفیت کی بنا پر ان میں تخلص درست کر دیا۔ لیکن ہمارے اس قیاس پر دو اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ جو کلام سوز نے رند کے لیے کہا اسے پھر دیوان سوز میں کیونکر شمار کیا جا سکتا ہے۔ دوم یہ کہ سوز کی طرح سودا بھی رند کے ملازم تھے کیا ضروری ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز سے ہی ہو وہ سودا کا کلام بھی ہو سکتا ہے!

پہلے اعتراض کا جواب ہمیں سعادت خاں ناصر کے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا سے ملتا ہے۔ ناصر نے ترجمہ رند میں لکھا ہے:

"الا وہی غزلیں میر سوز صاحب کے دیوان میں موجود اور نام رند کا ان میں سے نابود یہ رہ جیسے ... بالعوض کی ہو اس کا دعویٰ انصاف سے بعید ہے واللہ اعلم بالصواب"[۱۸]

مشفق خواجہ کی تحقیق کے مطابق سعادت خاں ناصر تیرہویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں پیدا ہوئے[۱۹] یہ زمانہ میر سوز کے انتقال کا ہے اس اعتبار سے ناصر سوز کے قریب تر تذکرہ نگار ہیں اور ان کی بات بنیادی اہمیت دیے جانے کی مستحق ہے اور ناصر کے متذکرہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رند کی راجدھانی ختم ہونے پر سوز نے وہ

دہ رند کو لکھ کر دیتے سے خود اختیار کر لیا تھا اور اسی بات پر ناقر نے ترجمہ رند میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

اب آیئے دوسرے ممکنہ اعتراض کی طرف:

میر حسن نے ترجمہ رند میں لکھا ہے:

"بسیاری کلامش راچوں کلام سودا و میر سوز سرلوح دیوان خود می انگارد"[19]

ت اللہ شوق نے طبقات الشعرا کے ترجمہ رند میں لکھا:

"اکثر اشعار در دیوان او یافتہ شد کہ آں را میر سوز نسبت بطرف خود می کند و بعضی گویند کہ از مرزا رفیع است والعلم عند اللہ"[20]

ت اللہ شوق نے کسی قدر ملحقات کی تفصیل بھی دی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"علیٰ ہذا القیاس اکثر غزلیات مربوط و مضبوط کہ داخل دیوان اوست آنرا بہ مرزا رفیع و میر سوز وغیرہ نسبت می کنند۔ خدا داند کہ واقعہ از کیست"[21]

بد الودود نے ایک مضمون میں شوق کا جو اقتباس دیا ہے اس کے مطابق:

"رند کے دیوان میں جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے سودا و سوز کے بکثرت اشعار ہیں۔"[22]

یہی وجہ ہے کہ مختلف تذکروں میں رند کا انتخاب دیتے ہوئے متعدد تذکرہ نگاروں نے سوز کے اشعار درج

کچھ یہی حال سودا اور سوز کے کلام کا بھی ہے کلیات سودا مرتبہ عبدالباری آسی اور نسخہ مصطفائی میں متعدد غزلیں ب جو مقطعوں کے مصرعہ اولیٰ کے علاوہ) بعینہٖ دیوانِ سوز میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے بھی ایک مختلف بحث میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

"سوز اور سودا کا کلام خلط ملط ہو گیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم نسخہ سودا کا ہے یا سوز کا جس میں متنازعہ فیہ کلام شامل ہے اس سے اندازہ ہو گا کہ مہربان خاں رند کے کلام میں صرف سوز کا حصہ ہے یا سودا کا بھی۔ میری تحقیق کے مطابق بہت سی غزلیں جو سوز کی قرار دی جا رہی ہیں وہ حقیقتہً سوز کی ہیں۔"[23]

یہ تمام اقتباسات و نکات اس اعتراض کی تائید کرتے ہیں کہ کیا ضروری ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز ہو وہ کلام سودا کا بھی ہو سکتا ہے! اب ہم اس اعتراض کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

سودا کے کلام کے ضمن میں نسخہ جانسن کو سب سے زیادہ مستند مانا گیا ہے کیونکہ یہ سودا کی زندگی میں کتابت ہوا نہ کی تاریخ کتابت ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اکتوبر ۱۷۸۰ء (مطابق شوال ذی قعدہ ۱۱۹۴ھ) اور جول

۱۷۸۱ء (مطابق جمادی الآخرہ ۱۱۹۵ھ) کے درمیان قرار دی ہے۔ میر سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء میں ہوا۔ گویا اس نسخے کی کتابت کے وقت سوز بھی زندہ تھے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کے نتائج تحقیق ہمیں بتلاتے ہیں کہ کلام سودا کے نسخ :

"نسخۂ جانسن تمام نسخوں میں بہتر اور معتبر نسخہ ہے کیونکہ یہ سودا کی زندگی ہی میں اس کی عمر کے آخری حصے میں انہی کی ہدایات کے تحت لکھا گیا اور سوائے مثنوی در ہجو فدوی کے اس نسخے میں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے الحاقی یا مشکوک قرار دیا جا سکتا ہو۔"[۲۴]

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ کلیات سودا میں جہاں سودا کا محقق کلام درج کیا ہے وہاں منسوب اور ملحق کلام بھی دیا ہے۔[۲۵] لیکن غزلیات کے چھ حصوں میں کسی حصے میں بھی ایسی غزلیات نہیں ہیں جو سوز سے بھی منسوب ہوں یا جن کا انتساب رند کی جانب بھی کیا جاتا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق صرف سوز سے ہے سودا سے نہیں۔[۲۶]

قاضی عبدالودود اپنے ایک مضمون میں ملحقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اردو میں سودا کے کلیات مطبوعہ میں میر سوز کی سو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں اور ناقدین کرام کلام سودا کی خصوصیات کے بیان میں بے تکلف ان سے کام لیتے رہے ہیں۔"[۲۷]

قاضی صاحب کے اس بیان سے بھی کلام سوز کا سودا سے الحاق معلوم ہوتا ہے قاضی صاحب نے ہی ایک اور جگہ اس بارے میں لکھا :

"دیوان رند کے نسخہ مذکورہ (یعنی نسخہ کلکتہ۔ ناقل) کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخے میں نہ ہو لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کلیات سودا کے کسی معتبر نسخے میں موجود ہو۔"[۲۸]

یہ تمام شواہد ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق میر سوز سے ہے سودا سے نہیں۔ کلیات سودا کے جن نسخ میں سوز یا رند کا کلام پایا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں۔ کم از کم ایک سو سات غزلیں ایسی ہیں جو سوز کی ہیں لیکن کلیات سودا کے غیر معتبر نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔[۲۹]

الحاقات کی اس بحث کے بعد ہم پھر مخطوطے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مخطوطے کا املا نستعلیق ہے اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

● کاتب الف ممدودہ کی جگہ الف مقصورہ استعمال کرتا ہے ● یائے مجہول اور معروف میں کسی قاعدے کی پابندی نہیں کرتا جہاں یائے مجہول لکھی جا سکتی ہے وہاں معروف اور جہاں مجہول لکھی جا سکے معروف لکھتا ہے۔ اس میں بالعموم کتابت کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے ● ضمہ کی جگہ اس عہد کے رواج علم کے مطابق واؤ معدولہ لائی گئی ہے ● کاف فارسی کی جگہ کاف تازی کا استعمال کیا گیا ہے ● نون غنہ کی جگہ اعلان نون کرتا ہے ● ہائے ملفوظ سے گریز اور ہائے مختفی کی ترجیح

الفاظ کی حد بندیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ جا بجا مرکبات وضع کیے گئے ہیں ● تکرار حروف کے مقامات پر تشدید

ہے ● الفاظ کی حد بندیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

ستعمال کی گئی ہے۔

جہاں تک غزلوں میں تعداد اشعار کا تعلق ہے تو یہ نسخہ متعدد انتخابات پر فضیلت رکھتا ہے لیکن بجائے خود
کامل تر نسخہ کہلانے کا حق دار نہیں ہے اس کے مقابلے میں برٹش میوزیم لندن میں محفوظ دیوان سوز کا نسخہ کامل تر ہے اس اعتبار
سے نسخہ کے آغاز میں احسان دانش کی یہ اطلاع کہ "اب تک جتنے مضامین میں حوالے دیئے گئے ہیں یہ ان میں مکمل ترین نسخہ
ہے" درست نہیں ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد اگرچہ لندنی نسخہ سے زیادہ ہے لیکن نسخہ لندن پندرہ سطری سطر پر لکھا گیا
ہے اور نسخہ کراچی کا مسطر گیارہ سطری ہے ہر صفحہ میں چار سطریں زیادہ ہونے کی وجہ سے ۲۷۸ صفحات کے اس مخطوطے میں
تعداد اشعار ۵۶۷۰ ہو گئی ہے جبکہ نسخہ کراچی ۴۹۶ صفحات کے باوجود قریباً ۵۴۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔
نسخہ کراچی میں کہیں بھی غزلوں میں در آنے والے قطعات کو ممیز نہیں کیا گیا جبکہ نسخہ لندن میں اس امر کا
بہت اہتمام ہے۔

اس نسخہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں کلام بالعموم میر سوز کے خود نوشتہ نسخہ کے مطابق ہے۔ اگرچہ اشعار کی
تقدیم و تاخیر سے یہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ نسخہ زمانی اعتبار سے میر سوز کے عہد سے زیادہ قریب ہے۔
ترقی اردو بورڈ کراچی کے کتب خانے میں اس مخطوطے کا داخلہ نمبر ۴۳۲ ہے اور مختلف قارئین نے اپنے مطالعے
کی یادداشت درج کر رکھی ہے آغاز میں چار صفحات پر مشتمل خلیق نقوی اسکالر اردو بورڈ نے ایک تصحیح نامہ اضافہ کر دیا ہے
اب ہم اس نسخے سے ایک غزل پیش کرتے ہیں اور پھر اس کے مقابلے کے لیے لندنی نسخہ اور خود سوز کے نوشتہ
نسخوں کا متن بھی دیا جائے گا تاکہ نسخے کی متنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

بعہد میر سوز ایک وقت میں شیخ علی حزیں کی غزل:

می گرفتیم بجاناں سر راہی گاہی — او ہم از لطف نہاں داشت نگاہی گاہی

کا چرچا تھا مختلف شعراء نے اس زمین طبع آزمائی کی۔ سودا نے کہا:

نہیں جوں گل ہوس ابر سیاہ گاہے — گیاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گاہے

قلندر بخش جرأت نے کہا:

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے — صحبت غیر میں گاہے سر راہے گاہے

آزاد نے زمانہ بعد سے ذوق (یا بہادر شاہ) کا یہ مطلع بھی دیا ہے:

اس طرف بھی تمھیں لازم ہے نگاہے گاہے دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

میر سوز نے اوّلاً یہ مطلع کہا:

نہیں نکلے ہے مرے دل کی ایاہے گاہے اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

سودا نے اس بندش پر طنز کی اور بقول آزاد کہا "میر صاحب! بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں ا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا"۔

آزاد نے آب حیات میں سوز کا یہی مطلع درج کیا ہے لیکن مختلف قلمی نسخوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوز بعد کو یہ مطلع تبدیل کر دیا تھا۔ اس تبدیل شدہ مطلع کے ساتھ پوری غزل نسخۂ کراچی سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

یوں تو نکلی نہ مرے دل کی ایاہے گاہے اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے
جز تری خاک در اے دوست بہ رب کعبہ دل میں ہو گر ہوس عزت وجاہے گاہے
نہ شفاعت ہو پیغمبر کی نہ تیرا دیدار ہو جو فردوس بریں پر بھی نگاہے گاہے
ہے وہ عشاق میں گردن زدنی سوختنی الم زخم سے جو دل کے کراہے گاہے
نعش کو میری سر راہ ہی رہنے دینا گر کرے قتل گناہے گاہے [20]
منت باد صبا خاک کو ہے میری مار ایں روندے گا وہ پامال سیاہے گاہے
خرمن عمر بصد جان کروں میں قرباں اس طرف دیکھے اگر برق نگاہے گاہے
میں تری تیغ کی برش کی کروں سب میں ثنا تو مرے زخم اٹھائے نہ سراہے گاہے
ایک نے سوز سے پوچھا کہ منہ سے اپنے اب بھی ملتے ہو بتو کہ گاہے گاہے
دیکھ منہ اس کا گھڑی ایک میں بھر کر دم سرد یوں اشارت سے بتایا سر راہے گاہے
بولو اے دوزخیو جھوٹ نہ کہیو اب بھی سوز سا تم میں ہوا نامہ سیاہے گاہے [21]

اب اسی غزل کی صورت نسخۂ لندن میں ملاحظہ ہو:

یوں تو نکلی تو مرے دل کی ایاہے گاہے اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے
جز تری خاک در دوست بہ رب کعبہ دل میں ہو گر ہوس عزت وجاہے گاہے

۳ بشفاعت ہو پیمبر کی نہ تیرا دیدار ق ہو جو فردوس بریں بھی ملا ہے گا ہے (کذا)

۴ جان پر برق پڑی کھاتے ہوئے تیری گاہ دل میں شیشے کے بھی کرتے ہو پنا ہے گا ہے

۵ ہے (کذا) عشاق میں گردن زدنی سوختنی ہ الم زخم سے جو دل کے کرا ہے گا ہے

۶ نعش کو میری سرِ راہ ہی بہائے دینا ق گر گرے قتل وہ کچھ رکھ کے گنا ہے گا ہے

۷ منت بادِ صبا خاک کو ہے میری بیمار (کذا) ابھی روندے گا وہ نا اہل (کذا) سیا ہے گا ہے

۸ خرمنِ عمر بعد جان کروں میں قربان ق اس طرف دیکھے اگر برق نگا ہے گا ہے

۹ میں تری تیغ کی برّش کی کروں سب ثنا تو میر (ا) زخم اٹھائے نہ سرا ہے گا ہے

۱۰ بولو لے دوزخیو جھوٹ نہ کہیو اب بھی سوزِ ساتم میں ہوا نامہ سیا ہے گا ہے

۱۱ ایک نے سوز سے پوچھا کہ صنم سے اپنے ق اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گا ہے گا ہے

۱۲ دیکھ کر منہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دمِ سرد یوں اشاروں سے بتایا سرا ہے گا ہے

اب ہم اس غزل کے دونوں متنوں کا موازنہ میر سوز کے خود نوشتہ متن سے کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ کس نسخے کا متن اصل متن سے قریب تر ہے اور کس میں غزل کے اشعار کی تعداد کا اختلاف ہے

مخففات کی توضیح۔

ل = لندن، نسخۂ لندن۔ ک = کراچی، نسخۂ کراچی۔ س = سوز، میر سوز کا خود نوشتہ نسخۂ سوز۔

پہلا شعر: ل: نکلی تو۔ ک: نکلی نہ۔ س: نکلی نہ

دوسرا شعر: ل: خک درو دوست

ک: خاک در اے دوست

س: خاک در اے دوست

تیسرا شعر: ل: بشفاعت ہو پیمبر

ک: نہ شفاعت ہو پیغمبر

س: نہ شفاعت ہو پیمبر

مصرعۂ ثانی

ل: فردوس بریں بھی نگا ہے

ک: فردوس بریں پر بھی نگا ہے

س: فردوس بریں پر بھی نگا ہے

چوتھا شعر: ک: میں یہ شعر موجود نہیں

ل:

چوتھا شعر: مصرعۂ ثانی

ل: دل میں شیشے کے بھی کرتے ہو پنا ہے گا ہے

ک: پورا شعر موجود نہیں ہے

س: دل سے سینے کے لیے گرہ بنا ہے
پانچواں شعر: ل: ہے عشاق میں
ک: ہے وہ عشاق میں
س: ہے وہ عشاق میں
چھٹا شعر: ل: سر راہ ہی بہلائے دینا
ک: سر راہ ہی رہنے دینا
س: سر راہ ہی رہنے دینا
مصرعۂ ثانی
ل: گر کرے قتل وہ کچھ رکھ کے گنا ہے گا ہے
ک: گر کرے قتل گنا ہے گا ہے (؟)
س: گر کرے قتل وہ کچھ رکھ کے گنا ہے گا ہے
ساتواں شعر ل: منت باد صبا خاک کو ہے میری بیلد
ک: " خاک کو ہے میری عار
س: " خاک کو ہے میری ننگ
مصرعۂ ثانی
ل: آپ ہی روندے گا وہ نامل سیا ہے
ک: ابھی روندے گا وہ پاخیل سیا ہے
س: آپ ہی روندے گا وہ پاخیل سیا ہے
آٹھواں شعر ل: میں قربان

ک: میں قربان
س: میں تو نثار
نواں شعر: ل: کی پرسش کی کروں سب میں ثنا
ک: کی پرسش کی کروں سب میں ثنا
س: کی پرسش کا کروں سب میں ثنا
مصرعۂ ثانی
ل: میرا زخم اٹھاتے —
ک: مرے زخم اٹھاتے
س: مرے زخم اٹھائے
دسواں شعر: ک میں "دیکھ منہ اس کا — الخ" ل میں "بولو لے دوزخ — الخ" س میں ترتیب ل کے مطابق ہے
گیارہواں شعر: (ک میں یہ شعر نویں نمبر پہ ہے)
بارہواں شعر: (ک میں یہ شعر دسویں نمبر پہ ہے)
ل: دیکھ کر منہ کو
ک: دیکھ منہ اس کا
س: دیکھ کر منہ کو
مصرعۂ ثانی: ل: یوں اشاروں سے بتایا
ک: یوں اشارت سے بتایا
س: یوں اشارت سے بتایا

نسخۂ لندن میں اس غزل کو چار قطعات میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن نسخۂ کراچی میں کسی قطعے کا نشان نہیں ملتا اور یہی معاملہ نوشتۂ سوز کا ہے البتہ ایک فرق بہت واضح ہے کہ درج ذیل قطعہ بند دو اشعار:

ایک نے سوز سے پوچھا — الخ   دیکھ کر منہ کو — الخ

غزل میں آٹھویں اور نویں اشعار کے مقام پر دیے گئے ہیں جبکہ لندنی نسخہ میں ان کا مقام گیارہویں بارہویں شعر کا ہے۔

ناچیز میں نوں دونوں نسخۂ کراچی میں چونکہ اس غزل کا ایک شعر کم ہے اس لیے اس کی ترتیب اشعار نسخۂ سوز کے قریب تر ہے یہی حال اشعار کے متن کا بھی ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر سوز، ان کے کلام اور ۔۔۔ کے سلسلہ میں نسخۂ کراچی بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس نسخے سے مقابلہ کیے بغیر دیوانِ سوز کا کوئی مطالعہ نہیں ہو سکتا۔

لہ جات و حواشی

نرام الدین احمد صاحب علی عثمانی : صحیفۂ خوش نویساں نئی دہلی، ترقی اردو بیورو ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۱۔

نیام الدین قائم چاند پوری : مخزن نکات مرتبہ اقتدار حسن لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۶۔

اسپرنگر : یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۵ء، ص ۹۵۔

محمد حسین آزاد : آبِ حیات، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۴۔

۔ رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا محمد عسکری مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لاہور، علمی کتب خانہ ص ۱۱۴۔

اس موضوع پر ہمارا مقالہ "میر سوز — تبدیلی تخلص کا مسئلہ" کے عنوان سے رسالہ "اردو" میں زیر اشاعت ہے

۔ قائم چاند پوری : محولہ بالا ص ۱۲۱۔

۔ میر حسن : تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ حبیب الرحمن شروانی دہلی، انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء، ص ۷۵۔

۹۔ ولی اللہ فرخ آبادی : عہد بنگش مترجمہ شریف الزماں شریف مرتبہ محمد ایوب قادری کراچی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۵ء، ص ۳۸۸۔

۱۔ احمد علی خاں یکتا : دستور الفصاحت مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی رام پور، ۱۹۴۳ء، ص ۵۲۔

۱۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ "میر سوز — درویش یا اداکار"۔

۔ زاہد منیر عامر، دیوانِ میر سوز (تدوین ردیف الف) تحقیقی و تنقیدی مقالہ (غیر مطبوعہ) مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۱۳۔ فائق رام پوری : میر سوز مقالہ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور یونیورسٹی اورینٹل کالج ایڈیٹر سید عبداللہ ج ۳۸ عدد ۱۵۰ ص ۸۰ (اگست ۱۹۶۲ء)

۱۴۔ نادرات : اردو نامہ (پہلا شمارہ) نگراں ممتاز حسن اگست ۱۹۶۰ء، ص ۴۸

۱۵ مشفق خواجہ : جائزہ مخطوطات اردو لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۹ء، ج اول ص ۵۲۸

۱۶۔ میر سوز : دیوان میر سوز (قلمی) مکتوبہ ۱۲۲۵ھ مملوکہ اردو لغت بورڈ کراچی صفحۂ اول

۱۷۔ سعادت خاں ناصر : خوش معرکۂ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ لاہور : مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء ج اول ص ۲۱۵

۱۸۔ مشفق خواجہ : تحقیق نامہ' لاہور : مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۹۱ء ص ۱۷۴

۱۹۔ میر حسن : تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ حبیب الرحمن شروانی' دہلی : انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء ص ۵۷

۲۰۔ قدرت اللہ شوق : طبقات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی' لاہور : مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء ص ۴۸۵

۲۱۔ قدرت اللہ شوق : محولہ بالا ص ۴۸۸

۲۲۔ قاضی عبدالودود : کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ (مقالہ) در سویرا شمارہ ۲۹ لاہور سویرا آرٹ پریس (۱۹۶۱ء) ص ۱

۲۳۔ ولی الحق انصاری، ڈاکٹر : مقالات پر بحث مشمولہ تدوین متن کے مسائل (خدابخش سمینار) پٹنہ : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۸۲ء ص ۳۴

۲۴۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر : مستملہ مخطوطات کی تفصیلات / کلیات سودا از مرزا رفیع سودا' لاہور : مجلس ترقی ادب ۱۹۷۴ء ج اول ص ۱۷

۲۵۔ شمس الدین صدیقی : پیش لفظ کلیات سودا محولہ بالا ص ۸

۲۶۔ قاضی عبدالودود : اصول تحقیق (مقالہ) اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد : مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۸ء ج دوم ص ۲۲

۲۷۔ قاضی عبدالودود : کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ مشمولہ سویرا۔۲۹ لاہور : سویرا آرٹ پریس (۱۹۶۱ء) ص ۵۵

۲۸۔ ان غزلیات کی فہرست قاضی صاحب کے محولہ بالا مضمون میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ زاہد منیر عامر

۲۹ محمد حسین آزاد : آب حیات لاہور : شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۷ء ص ۱۹۶

۳۰۔ یہاں حاشیہ لکھا گیا ہے "دکھ کے مرے کچھ"

۳۱۔ میر سوز : دیوان میر سوز (قلمی) مملوکہ اردو لغت بورڈ کراچی ص ۳۲۱۔ (املائی ترامیم : مرکبات کا انفصال، ہائے مخلوط کی جگہ دو چشمی ہ کا استعمال، ہائے مختفی کی جگہ ی کا استعمال، نون غنہ کی بجائے نون کے اعلان کی بجائے نون غنہ، کاف تازی کی جگہ کاف فارسی کا استعمال، دیہوا لی باہم تبدیلی)

۳۲ میر سوز : دیوان میر سوز (قلمی / عکسی) مملوکہ برٹش میوزیم لندن ص ۳۲۰

ڈاکٹر کلیم سہسرامی
پروفیسر راجشاہی یونیورسٹی
بنگلہ دیش۔

دیوانِ ہاشم

بنگلادیش میں خصوصاً ڈھاکا یونیورسٹی کا کتب خانہ قلمی نسخوں کے لیے بہت اہم ہے۔ یہاں تصوف سے متعلق ب تک جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ویسے تو مختصر سے بہت سارے منظوم نسخے میری نظر سے گذرے ہیں لیکن یوانِ ہاشم واحد نسخہ ہے جس کی ضخامت کافی ہے اور ہر طرح مکمل کہا جاسکتا ہے۔ اس دیوان کا یہ نسخہ دنیا کے قدیم ترین سخوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈھاکا یونیورسٹی کی ملکیت ہے اور قلمی نسخوں کی فہرست میں اس کا نمبر (۲۸۶) ہے۔ اس کے و اور نسخوں کا انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطہ نمبر (۲۸۹۸) اور روسی مستشرق ایوانوف کی فہرست مخطوطات کے نمبر ۲۷) سے پتا چلتا ہے۔ نسخۂ زیر بحث کے آغاز و اختتام پر بعض مہریں لگی ہوئی ہیں، جن میں ایک مہر کی تاریخ (۱۰۸۴ھ/ ۱۶۷۳ء) درج ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری کے مکتوبہ (۱۰۸۰ھ/۱۶۷۶ء) سے چار سال لے تحریر کیا گیا۔ لیکن ایوانوف نے جس نسخے کا تذکرہ کیا ہے اس پر سنہ کتابت (۱۰۶۶ھ، ۱۶۵۵ء) درج ہے۔ یعنی ایوانوف ے کوئی اکیس سال بعد ترتیب دیا گیا گویا ایوانوف اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں کی درمیانی مدت میں یہ نسخہ لکھا یا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نسخے پر کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔

اس نسخے میں کل ۱۹۸ اوراق ۳۹۶ صفحات ہیں۔ دیدہ زیب نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ سرخ و سیاہ جدولیں نی ہوئی ہیں۔ بعض جگہ کرم خوردہ لیکن مرمت شدہ ہے۔ شاعر کے حالات کی تفصیل اس میں نہیں ملتی۔ البتہ اس کا نام یوں رج ہے "خواجہ محمد ہاشم ابن محمد قاسم الکشمی البدخشانی برہان پوری"۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جانا ہوگا کہ شاعر کا تعلق دستان سے تھا، اور یہ خاندان وہاں سے ہجرت کر کے برہان پور (ہند) میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اس امر کا داخلی ت خود اس کے اس شعر سے ملتا ہے:

زنقش آں صنم برگشت ہاشم، بہر سریم
بعد ستاں مدام تا اُما تماشا خواہم شد

بہرکیف دیوان سے شاعر کے ایک بھائی محمد اسحاق کا بھی پتا چلتا ہے جس کی وفات پر انہوں نے مرثیے لکھے ہیں

موجودہ نسخے کے شروع میں شاعر کی تاریخ وفات کا جو قطعہ درج ہے اس پر بیکار مالی کے دستخط ہیں اور اس سے ۱۰۴۲ھ یعنی ۱۶۳۳ء نکلتے ہیں۔ قطعہ ملاحظہ ہو:

آں قطبِ زمانہ خواجہ ہاشم — در کشورِ ملک خود می شد
تاریخِ وصالِ گفت ہاتف — گو، نزدِ رسولِ ہاشمی شد

لیکن اسپرنگر کے خیال میں خواجہ ہاشم ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء میں زندہ تھے۔

دیوان کی ورق گردانی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو مختلف اصنافِ سخن پر عبور تھا، آغازِ دیوان میں اس نے پیرِ طریقت خواجہ بہاء اللہ محمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کے روحانی شجرے کی تفصیل پیش کی ہے، اس کے بعد ترجیع بند اور ایک ساقی نامہ مسمّی بہ سبعہ سیارہ مرغان آتشخوار ہے اور سبعہ سیارہ کی تفصیل اختر اول سے اختر ہفتم تک درج ہے اس کے بعد غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے، پھر رباعیات و فردیات اور تاریخی قطعات ہیں، حصہ غزلیات کا آغاز، اس غزل سے ہوتا ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

بسملِ دلہا بود، بسم اللہ عنوانِ ما — مایۂ دیوانگی، موی سرِ دیوانِ ما
ہست ہر سطری ز ما، ابروی معشوق تحت — گوشۂ ابرو، اشارتہای بی پایانِ ما
ہر کہ دید آں خندۂ پنہاں نگاہی کرد — یابد از رازِ نہفت و قصۂ پنہانِ ما
رشحِ کلکِ ماست ہاشم سیل و در دلہا برکہ — کافر از مومن نداند، موجۂ طوفانِ ما

اس امر کی وضاحت بیجا نہ ہوگی کہ خواجہ ہاشم کو سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھی، اور اپنے پیرِ طریقت حضرت مجدد الف ثانی سے انتہائی عقیدت کی بنا پر "مکتوباتِ احمد فاروقی (مجدد الف ثانی)" کے عنوان سے ان کے مکتوبات کی تیسری جلد تدوین کی ہے۔ اور ان کی حیات سے متعلق "زبدۃ المقامات و برکاتِ احمدیہ" کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی ترتیب دی ہے۔ اس سلسلۂ بیعت کا اثر اس پر اس قدر گہرا اور پختہ ہے کہ سارا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے پیرِ طریقت کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے:

تا عیسیٔ جانہا بشد، از عالمِ پاک — دلہا شدہ، چون پیرہنِ یوسف چاک
چوں رفت بسوی روضۂ پاکِ بہشت — تاریخِ وصالِ او بگو "روضۂ پاک" شد
بہار و باغِ عرفاں، ابرِ رحمت — گزیں گلشن، بتعجیل صبا رفت
مگر صبحِ قیامت سر برآورد — کہ از مشکوٰۃ دیں شمعِ ہدیٰ رفت

چو شاہ اولیائی عہد خود ، بود   خرد گفتا کہ شاہ اولیا رفت

دیوان ہاشم میں مجموعی طور پر غزلیات و رباعیات کے حصے جاندار اور قابل توجہ ہیں شاعر کی کہنہ مشقی، ت کلام اور زبان و بیان پر اس کے عبور کا یہ عالم ہے کہ کوئی شعر کہیں سے پڑھیے ہر جگہ کلام میں یکسانی، رنگ میں پختگی ، زبان و بیان میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شاعر نے بعض اشعار میں متداول عربی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں لیکن اس خوبصورتی اور چابک دستی سے نبھایا ہے کہ کلام بوجھل نہیں ہو پایا اور اس کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ بطور مثال چند الفاظ درج کیے جاتے ہیں، تعجیل، ترشح، مستور، سبعہ، اربعین، درۃ التاج، سواد اعظم وغیرہ۔

اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ شاعر نقشبندی طریقۂ تصوف سے منسلک ہی نہیں بلکہ غایت درجہ تعقت بھی رکھتا ہے اور عبادت و ریاضت میں چالیس سال گذارنے کے باوجود بھی مطمئن نہ تھا، وہ خود کہتا ہے:

چل سال رفت و رہ بحقیقت نیافتیم   زین اربعین نتیجۂ طاعت نیافتیم

بس از سنان آہ شکستیم قلب خویش   خوشتر ز درد ، ہیچ غنیمت نیافتیم

ہاشم کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عارفانہ اور صوفیانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں معرفت و حقیقت اور طریقت و شریعت کے مسائل بھی ہیں جذب و کیف اور درد و عشق کی باتیں بھی ہیں۔ کہ جوں آتش ییں، سینۂ صدپارہ، دل دیوانہ، سرگذشت عشق، دیدۂ بے خواب، شکست دل، صہبائے دل، داد عشق، جوشش درد، آب تیغ، آب زندگانی، اور عمر جاودانی جیسی ترکیبیں بھی نظر سے گذرتی ہیں جن سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے یہ داز خیال کا مرکز ایک ہی ذات اور اس کے فکر و نظر کا محور معرفت و حقیقت ہی سے عبارت ہے۔ اس پر ایسی وارفتگی کیفیت طاری رہتی ہے کہ شاعر خود کہہ اٹھتا ہے:

جہاں در خواب خرگوش است ، ہاشم پاک دامن است

راستی بر زبان آورده ... موجود را

ایک غزل کے مقطع میں شاعر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کا دیوان دفتر اسرار معرفت ہے ... دیوان ہاشم کا قاری اسے تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پوری غزل بعد میں پیش کی جائے گی، اس کا صرف مقطع یہ ہے:

دیوان نوا ہاشم دیوانہ چہ باشد   سرتا بقدم دفتر اسرار معرفت

شاعر نے اپنے آپ کو ایک جگہ فارسی شعر و ادب کے عارف و صوفی حضرت فرید الدین عطار اور ... کے ... سے مماثلت و مشابہت دی ہے۔ اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہوں کہ یہ محض تعلی ہے یا حقیقت ...

کی زبان میں ادعا پیش کیا جاتا ہے:

در سخن ہاشم فریدالدین عطار ولی ‏— از درد باست، شمیم طبلۂ عطار کو

بعد از ہزار، ہاشم اندر عجم لبید است ‏— پیش از ہزار اگر بود، اندر عرب لبیدی

ایک اور مقطع میں شاعر نے اپنی غزل کے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے:

رتبۂ شہپر زدہ عقل، برتر آمدہ عشق ‏— ہاشم این غزل پر ہنر، ز تحفہ بری

اب دیوان ہاشم سے چند منتخب غزلیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)

چناں دیوانہ می خواہم، دلِ فرزانۂ خود را ‏— کہ اندر خانۂ خود می نیابم، خانۂ خود را

ز ہر مو صد زباں رویند و راز دل نشد روشن ‏— مگر از شمع پرسم، قصۂ پروانۂ خود را

بہر در چوں گدایان، از مراد دل سخن گفتم ‏— دریغا آشنا نشناختم، بیگانۂ خود را

بجز داغی تو، گنجی نیست، در گنجینۂ سینہ ‏— بسی از آماج، ناخن کاوفتم، ویرانۂ خود را

تو بد عہدی و من بدمست، در عشق و دل شاہر ‏— تو ہر دم بشکنی پیمان و من پیمانۂ خود را

جہاں در خواب خرگوش است ہاشم یا کلمن بات ‏— ز مستی بر زباں آوردہ افسانۂ خود را

(۲)

مجروح شود گر دلت از خارِ محبت ‏— گرد دُبن ہر موی تو، گلزار محبت

تا سیم بری و سرکشی نہ ستانی ‏— ہرگز نہ بری سود ز بازارِ محبت

از نقطۂ خالی کہ بر آں صفحۂ سیمین است ‏— سرگشتہ دلی آمدہ بہ کارِ محبت

دانم کہ محبت بہ کسی ہست خریدار ‏— اماں بجہاں کیست خریدارِ محبت

کشتم بہ از سوز جگر داغ کہ روید ‏— چوں باغ براہیم، گل از نارِ محبت

در کفر جنوں، آتش ایمن شدہ سود ‏— سر رشتۂ شمع آمدہ زُنار محبت

دیوانِ تو ای ہاشم دیوا چہ باشد ‏— سر تا بقدم دفتر اسرارِ محبت

(۳)

سینۂ صد پارہ دارم، گرچہ دلم پارہ نیست ‏— جلگی چشتم و لیکن رخصت نظارہ نیست

عشق فتح اندر شکست کار پنهان کرده است   چارهٔ این غم نماند، هر که او بیچاره نیست
یک دل و یک دوست باشد، صد کتاب این سخن   گفت صد بار بشنو، زندگی صد پاره نیست
دیده یک شو ده گردون، از پی شمع رخت   این که می بینی تو هر شب، این همه استاره نیست
هفت بیت آمد غزلهای تو هاشم بیشتر   هر ترا این سبعه، کم از سبعه سیاره نیست

(۴)

خیال کنج می بندم، مگر دیوانه خواهم شد   پری در خواب می بینم مگر دیوانه خواهم شد
در آغاز حدیث من، خرد را خواب می آید   همانا از شب موی کسی افسانه خواهم شد
کنون حرفی که می گویم زبان بر خویش می پیچد   بدان ماند که زین پس، از سخن بیگانه خواهم شد
ز نقش آن صنم برگشت هاشم هر سر مریم   به هندوستان ندانم تا کجا بتخانه خواهم شد

(۵)

ما ز بس عقل، این دل، پیدا کرده ایم   شور صحرا از متاع خانه پیدا کرده ایم
سرگذشت سرگذشتن عشق می گوید به گوش   دیدهٔ بی خواب از این افسانه پیدا کرده ایم
چاکها افگنده ایم از آه دل، بر لخت دل   گیسوی آشفتگی را شانه پیدا کرده ایم
در قفس ای مرغ دل، فارغ نشین خوشتر ز باغ   کت ز اشک ناب، آب و دانه پیدا کرده ایم
دید طاعت را بسی پیمان چو دل بشکسته ایم   تا به صهبای فنا، پیمانه پیدا کرده ایم
از شکست دل رسد هاشم، سخنهای درست   این گدای گنج، از ویرانه پیدا کرده ایم

(۶)

چل سال رفت در راه حقیقت نیافتیم   زین اربعین نتیجهٔ طاعت نیافتیم
در عمر نوح شیوهٔ طفلی ز ما نرفت   لقمان شدیم و نبض طبیعت نیافتیم
دیدم به خلد و بس قرن را بگریه گفت   اینجا فراغ گوشهٔ عزلت نیافتیم
داود عشق، دست به معزلت زد و گفت   به زین کلید قفل شریعت نیافتیم
بس از ستان آه شکستیم طلب خویش   خوشتر ز درد هیچ غنیمت نیافتیم

(۷)

آب تیغ، آب زندگانی من   مرگ من، مرجا و دانی من

آہ دل، برگ تن، نجاک افگند چند از مرور خزانی من
سرِ باریک آں میاں نیافت خاک بر فرقِ نکتہ دانی من
اولیں حرفِ عشق انیست کہ نیست در ہمہ کائنات ثانی من
ہاشما کی بدل فتد سروکار ملی شود دفتر زبانی من

رباعی ایک مشکل فن ہے جس میں شعرا کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی اور نہ ہر شاعر فنی طور پر اس سے د[illegible] بچا کر کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ لیکن خواجہ ہاشم کی رباعیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے [illegible] نے رباعی کے تمام لوازم کو بطورِ احسن برتا ہے اور جہاں تک مواد و ہیئت، زبان و اسلوب کا تعلق ہے کہیں بھی [illegible] بیانی کا اظہار نہیں ہوتا اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شاعر کو اس صنفِ سخن پر پوری گرفت اور فنی مہارت حاصل ہے۔ غزلیات کی طرح شاعر نے رباعیات میں بھی کچھ خاص ترکیبیں استعمال کی ہیں جن سے اس کے مخصوص مزاج اور [illegible] و ماحول کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً مرہم جان، دل سوختہ، کشت کار، جم بادہ، نقش تن، دود آہ اور سایۂ بید وغیرہ۔

رباعیات میں بھی غزلیات کی طرح بڑی یکسانی و روانی اور ہم آہنگی و ہمواری پائی جاتی ہے۔ عار[illegible] او[illegible] دل گداختہ کی دھیمی آنچ کا احساس ہوتا ہے۔ جذب و کیف کا عالم، تصوف کی چاشنی اور شرابِ معرفت کی سرمستی و سرشار[illegible] رباعیات کے مرکزی موضوعات ہیں۔ چند رباعیوں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، لیجیے کام و دہن اور ذوقِ سخن کی آ[illegible]

(۱)

ای [illegible] تعالیٰ والای ترا سرتاپای جہاں بسر اپای ترا
در قدرت [illegible] کمال حق [illegible] [illegible] اندام کہ نمود ذات والای ترا

(۲)

[illegible] سوای سایہ مرا جز موی سپید نیست پیرایہ مرا
شد [illegible] ہوس [illegible] مرا [illegible] کودک صد سالہ مرا

(۳)

ای دوست رخی [illegible] پریشاں ہما ور لب [illegible] سینہ پریشاں ہما
سررشتہ جمعیت دل ای طلسم یک تار از آن زلف پریشاں ہما

(۴)

ای مرهم جان، این همه آزار چرا   وی گل ز تو بر پای جگر خار چرا
ای آبحیات کشتن خلق از چه   وی مه ز تو روز ما شب تار چرا

(۵)

خون گشت ز مخموری من جان شراب   بگداخت ز گرمی شبم مستی خواب
زان سان که چراغها ز روغن سوزد   ز آب مژه‌ام سوخت دل شعله‌تاب

(۶)

رمزی بشنو ز نوبهاران شباب   عهد سیبت کز و برق برد رسم شتاب
سرگشته غم درو بحر سو چو صبا   با جامهٔ آسمان و با چشم سحاب

(۷)

ای هر دو جهان قافلهٔ سودایت   سررشتهٔ کار، موی عنبرسایت
معراج تو آنکه پا نهی بر سر عرش   معراج من آنکه سر نهم بر پایت

(۸)

ای آنکه خیالات پی تاراج من است   خاک قدم تو ذرهٔ التاج من است
معراج تو صد راز بباید گفتن   حرف شب معراج تو معراج من است

(۹)

جانان سمت قبله بجز موی تو نیست   محراب جبایان جز ابروی تو نیست
دیدم سواد اعظم ملتهبا   سوگند بموی تو که جز موی تو نیست

(۱۰)

بسیار مگو که یک سخن بسیار است   وین خرقهٔ کهل کرتن بسیار است
زنهار بقصد قاطع این ره مپوی   کین بادیه سخت در دامن بسیار است

(۱۱)

چون دل نگشود بهر نگار تو عبث   نشگفت چو این غنچه بهار تو عبث

گرداند آشکی بزمین نقشانی   ای خواجہ تمام گشت کار تو عبث

(۱۲)

ای دل کہ مصاحب نکوخوی من   سرگشتۂ عالمی و درد کوی من

شد عمر، بکار من نبرد ماہی   با آنکہ شب و روز بہ پہلوی من

خواجہ ہاشم کے یہاں بعض بعض جگہ عمر خیام کے رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا مخصوص رنگِ کلام قائم و دائم رہتا ہے۔ اس رنگ کی چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں:

(۱۳)

چون جان من از قید تن آزادہ شود   وز نقش ثم، لوح جہان سادہ شود

گر یک رگ دل نجاک بگشادہ شود   ہر ذرۂ خاک من، خم بادہ شود

(۱۴)

دل دو جہت دود آہ، جاوید غنود   چون خستہ کہ زیر سایۂ بید غنود

افسانۂ عمر رفت و کسی ندمید   ما ما کہ ازین فسانہ خورشید غنود

(۱۵)

زخم دل ما نجون بہ ساختہ زند   جام مے ما، بتو بہ ساختہ زند

لعلت (بہ) شتاب، عمر ما خندہ زند   چون غنچہ کہ باد صبا خندہ زند

دیوانِ ہاشم کی آخری رباعی یہ ہے:

(۱۶)

ان واعظ و فریاد ستودن تا کی   سرخوش بحدیث غیر بودن تا کی

بردار سر از خواب کہ شب آخر شد   افسانہ شنودن و غنودن تا کی

ڈاکٹر نورالسعید اختر
لکچرار شعبۂ فارسی
راشٹر کالج، بمبئی ۸

شیخ غلام محمد داول اور ان کا ناری نامہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دکن میں قدیم اردو کی داغ بیل صوفیائے کرام کے ہاتھوں پڑی۔ ان کا منشا اسلام کی توسیع و اشاعت تھا۔ لہذا قدیم اردو کی ابتدائی تصانیف کا ورثہ ہمیں ملفوظات، اقوال اور چھوٹے چھوٹے منظوم و منثور رسالوں کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ان دستیاب شدہ کارناموں پر مذہبیت کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ بالفاظ دیگر ان مختصر کتابوں کی زبان ملی جلی (مخلوط) ہے۔ باقاعدہ طور پر تصنیف و تالیف کی روایت سترہویں صدی کے نصف سے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں دلچسپ ادبی تحریروں کو قابل اعتنا سمجھا گیا اور غیر ادبی تخالیق پس منظر میں چلی گئیں جس کا اثر یہ ہوا کہ قدیم اردو کا مذہبی ادب ایک مدت تک شائقین ادب کی خصوصی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ دکن میں میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) ایسی قدآور صوفی منش ہستیاں ہیں جن کی قائم کردہ ادبی روایتیں دکن میں مدتوں رہنمائی کے لائق رہیں۔ ان بزرگوں نے روحانی مطالب کی ترویج و اشاعت میں ادبی راہوں پر ایسے چراغ روشن کیے جن کی ضو تابانی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ روحانیت کی اس شمع کو ان کے مریدوں نے خداشناسی کے روغن سے منور رکھا۔ ان برگزیدہ مریدوں میں شیخ محمود خوش دہان، شاہ امین الدین اعلیٰ کے علاوہ شیخ داول بھی قابل ذکر ہیں۔

دکن کی تاریخ میں تقریباً چار نامور ہستیاں ایسی ہیں جو شاہ داول اور سید داول کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں سب سے پہلا منسوب و معروف ہستی شیخ عبداللطیف داور الملک کی ہے۔ مرآۃ احمدی، مرآۃ سکندری اور تذکرۂ اولیائے دکن میں ان نامور شخصیات کے حوالے ملتے ہیں۔ البتہ ان کے صاحب تصنیف یا شاعر ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بزرگان دین رشد و ہدایت کے متوالے تھے اور علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔ ایسے ہی ایک بزرگ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی رقمطراز ہیں کہ:

"درگاہ قلی خاں نے سالار جنگ نے نیک اور شاہ داول پورہ کا نام شاہ غلام محمد داول پورہ بتایا ہے اور انھیں شاہ سعد اللہ گلشن کا معاصر کہتے ہیں لیکن تفصیلات میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ محمود گجرہ ۔

(بیگڑہ۔ حاکم گجرات: متوفی ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء) کے امراء عظام میں تھے۔ ان کی ایک مثنوی موسوم بہ ناری نامہ (ناری نامہ) نظر سے گزری ہے جو ۲۵۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں حقوق شوہر کو مختلف عنوانات سے دلچسپ پیرایہ میں سمجھایا گیا ہے اور نمونتاً ذیل کے شعار دیئے۔

ابتدا۔ ناریاں سنو پیو کا بیان
بن سرگری نا تجے ایمان ہے
نا چیز ہے دنیا خیال
پیو باج کوئی پیارا نہیں

اختتام۔ زن تھے ہوا جو کون دکھیا
دکھ نار تھے سینا پکیا
ڈوبین یوں داول لکھیا
پیو باج کوئی پیارا نہیں[۱]

مرقع دہلی کے مصنف نے مزید صراحت کی ہے کہ شاہ غلام محمد داول پورہ جیسا کہ ان کے لقب سے ظاہر ہو اسی سلسلے کے (یعنی شاہ عبداللطیف داور الملک) کے ایک فرد ہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے کہ حضرت غفرت مآب میر قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ اول متوفی ۱۱۶۱ھ/۴۸ء ان کی محفل سماع میں حاضر ہوتے تھے۔

راقم عظیم المرتبت ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہیں ہے اسکی تین وجوہات ہیں۔
پہلی وجہ یہ ہے کہ مرقع دہلی کے مصنف نے شاہ غلام محمد داول کے نام کے ساتھ لفظ "پورہ" کا استعمال کیا ہے لفظ پورہ کسی محلے یا گاؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے گمان غالب ہے کہ لفظ "داول پورہ" شہر دھاول پورہ (دھول پور) کی تخریب شدہ شکل تو نہیں ہے؛

دوسرے یہ کہ مرقع دہلی میں درگاہ قلی خان نے وہ اشعار حوالے کے طور پر نہیں دیئے ہیں جن کی بنا پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو یہ تسامح ہوا ہے۔

تیسرے یہ کہ "ناری نامہ" کی زبان کا کینڈا گیارہویں صدی کی زبان کی نمائندگی کرتا ہے۔ بارہویں صدی کے نصف دوم کے بعد قدیم اردو کی روایت فارسیت سے نکل کر خود ساختہ راستوں پر گامزن ہو چکی تھی۔

لہٰذا مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ غلام محمد داول پورہ کی شخصیت شیخ ملا محمد داول

---

[۱] مرقع دہلی، درگاہ قلی خاں، مترجمہ مع حواشی از ڈاکٹر نورالحسن انصاری (مرحوم) — نوٹ حضرت شاہ ملک عبداللطیف سلطان محمود بیگڑہ کے ایک سردار کے لڑکے تھے۔ آپ کا لقب داول شاہ پیر ہے اور آپ کا خطاب داور الملک ہے۔ آپ کا مزار جوناگڑھ کے قریب ہے دیکھئے تاریخ صوفیائے گجرات، ڈاکٹر ابوالحسن ... ص ... ، اور اولیاء و صوفیہ اردو ترجمہ اخبار الاخیار ص ... — [۲] کتب خانہ موجود تذکرہ شاہ داول مرتبہ ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی ص ... (قدیم اردو) ... شاہ داول ... شاہ محمد ... ایضاً۔

(۲) شعر ... حضرت شاہ برہان ... کتب خانہ ... داول ص ... شعر ... داول ... کتب خانہ ... داول ص ... شاہ داول کے ... ایضاً ... ص ...

...ل ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء سے علیحدہ تھی جیسا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے "کشف الوجود" کے مقدمے کے صفحات نمبر ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰ میں ظاہر کی ہے۔

شیخ غلام محمد داولؔ بیجاپوری :- شیخ غلام محمد داولؔ کا تعلق بیجاپور کے معروف صوفیائے کرام سے ہے ... ذات خود ایک ثقہ صوفی اور اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے پیر و مرشد شاہ برہان الدین جانم کے مسلک کی پیروی کی ہے اور انھیں موضوعات کی نمائندگی کی ہے جن کی جھلک میراں جی اور اسی قبیل کے بزرگوں کے یہاں موجود ہے۔ شیخ داول نے اپنی نظم "چہار شہادت" میں واضح طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) کے مرید تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

حق تھی بولوں چہار شہادت ساچی گر گیان   ساچا گر پیر و مرشد میرا حضرت شاہ برہان[1]

اس بیان سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ شیخ داولؔ کا تعلق عہدِ اصغر جاہی سے نہیں تھا۔ البتہ ہم ان کے سال پیدائش اور وفات کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں بہم پہنچا سکتے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مصنف تاریخ ادبِ اردو (حصہ اوّل) کے تحقیقی مشاہدات ان حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ :

"ان کے سنہ وفات کے سلسلے میں تاریخ اور تذکرے خاموش ہیں لیکن قدیم مخطوطات اور بیاضوں کے مطالعے کے دوران "شرحِ تمہیداتِ ہمدانی" (فارسی) کا ایک مخطوطہ نظر سے گذرا جس کے آخر میں :

"مرتب شد بفرمان اللہ تعالیٰ بتاریخ بست دوم ماہ رجب ۱۰۶۷ھ کاتب الحروف شیخ داول"

کے الفاظ تحریر تھے۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور مخطوطہ "رسالہ حقیقیہ قاضی ناگوری" نظر سے گذرا جس کے آخر میں :

"کاتب الحروف فقیر الحقیر فتح محمد ابن شاہ داول قادری" کے الفاظ تحریر تھے۔ یہ مخطوطہ ۱۰۸۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان دو حوالوں سے دو باتوں کا پتہ چلا۔ ایک تو یہ کہ کتابت شاہ داول کا پیشہ تھا جسے ان کے بیٹے فتح محمد نے بھی اختیار کیا۔ دوسرے یہ کہ شاہ داول ۱۰۶۷ھ تک زندہ تھے۔ اسی عرصے میں ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ[2] نظر سے گذرا جس میں میرانجی شمس العشاق، جانم، امین اور شاہ داول وغیرہ کا کلام شامل ہے۔ اس میں شاہ داول کی نظم "کشف الانوار" کے اوپر یہ الفاظ درج ہیں۔

"کشف الانوار از تصنیف شیخ داول رحمۃ اللہ علیہ" ——— لیکن "چہار شہادت" پر جو اسی بیاض میں لکھی ہوئی ملتی ہے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" کے الفاظ درج نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاہ داول نے ۱۰۶۸ھ میں وفات پائی جبکہ یہ بیاض لکھی جا رہی تھی"[3]

---

[1] چہار شہادت، از شیخ داول۔ بیاض قلمی، انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی۔

[2] شمس العشاق: بیاض قلمی، ۱۰۶۸ھ، مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔ [3] تاریخ ادب اردو حصہ اوّل، ص ۲۹۹

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں شاہ داول کے سال وفات کا تعین ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے پیشے اور فرزند متعلق ہمیں معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

شاہ داول کے فنی شہ پاروں کی جستہ جستہ چھان بین کے بعد اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی نظم "چہار شہادت" دراصل مریدوں کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے جس میں شاہ داول شاعری کے ذریعہ عشق کی سرفرازی اور سربلندی کی تشریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے انسان چاروں تن پر قابو پا لیتا ہے۔ اور وہ حق کی شہادت حق سے پکھ لیتا ہے۔ ان خیالات کی وضاحت سے وہ طالبان حق کی بخوبی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حق پرستی اور حق شناسی کے تصور کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

چاروں تن سوں جیسے اچکر موت کا پیالا پیتا — حق کی مارگ دے سبس اپنا حق میں حق ہو جیتا
داول اپنے چاروں تن پر لوجن پرچت بوجھیا — حق کی شہادت حق تھی پایا عشقوں جھگڑا بوجھیا

شاہ داول کا دوسرا منظوم کارنامہ مثنوی "کشف الانوار" ہے۔ اس مثنوی کا آہنگ پیر و مرید کے سوال جواب پر منحصر ہے۔ مرید اپنے مرشد کامل سے راہ حقیقت کی پیچیدگیوں کی کشادگی پر زور دیتا ہے۔ شاہ داول اپنے سلسلۂ تصوف کے رموز و خواص کی توضیح شاہ برہان الدین جانم کے فکری پیمانوں، لہجہ اور بیان کے مطابق کرتے ہیں۔ جس طرح جانم نے اپنی مثنوی میں پانچ عناصر اور تن، روح اور عرفان کی تشریح کی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "داول نے نور نبی کی اہمیت و لطافت پر روشنی ڈال کر چار تن کے موضوع کی تشریح کی ہے۔ اس نظم کے شروع میں امین الدین اعلیٰ کی نظم "رموز السالکین" کے تو اللہ پاک منزہ ذات سے شروع ہوتی ہے۔ چند اشعار بھی دیئے گئے ہیں اور پھر اپنے اشعار کی روشنی میں نور ظہور، جسم، تن اور عرفان کی تشریح کی گئی ہے[۱]۔

شاہ داول نے کشف الوجود میں جانم کا تتبع کیا ہے۔ حتیٰ کہ نظم کی ساخت پرداخت پر جانم ہی کے فکر و اسلوب کی گہری چھاپ ہے۔ شاہ داول نے جو اور موضوع بھی وہی منتخب کیا جو ان کے پیر و مرشد جانم نے "معرفت الایمان" میں اپنایا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں جانم کے کلام پر ویدانت اور سنسکرت زبان کے آثار نمایاں ہیں اس کے باعث ان کے زبان و بیان پر ہندوی رنگ غالب ہے۔ جس کے باعث ان کا اسلوب قدرے گنجلک ہے۔ اس کے برخلاف داول کے یہاں بھی رنگ ڈالنے کی آب و تاب کے ساتھ "فارسی کے زیر اثر" زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بیان کی تائید میں ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی رقمطراز ہیں کہ

"شاہ داول کا علم و فضل اتنا زیادہ نہیں اس لیے وہ مشکل مسائل بھی پیش نہیں کرتے اور اسی لیے زبان قدرے آسان ہے۔

۱۔ تاریخ ادب اردو، حصہ اول، از جمیل جالبی، ص [illegible]

ان کی مثنوی "کشف الوجود" مترنم بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تصنع اور ترصیع نہیں ہے۔ انھوں نے ابتدا سے آخر تک[1] تدریس و تفہیم کا انداز قائم رکھا ہے۔ (تصوف کی باتیں پیر و مرشد کی ہی ہیں) مثلاً: از کشف الوجود:

جیتا ہے کچھ مخلوقات — کل شئے عالم ہر ہر دھات
سب جگ پیدا جس کے نور — عرش کرسی چندر سور
بہشت ہور دوزخ ہیں آسمان — لوح، قلم، جن ہور حیوان
سات سمندر و ڈونگر پہاڑ — بن کھنڈیا جے جنان جھاڑ
حوران، طیران، بجلیاں مور — ایسے بھی کئی لاک کروڑ
ظاہر باطن دیک بچار — نور نبی تھے سب اظہار
پرگٹ نور کون دیا فضل — جوں جگ عالم اس کے تل[2]

شاہ داول نے راگ اور سمتے بھی نظم کیے ہیں۔ انھیں وہ "خیال" کا نام دیتے ہیں۔ شاہ داول کے "خیال" غزل کے لوازمات کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ ان کی ہیئت غزل سے ہم آہنگ ہے۔ مطلع اور مقطع رکھنے والے خیال، مجازی عشقیہ جذبات سے لبریز ہونے کی بجائے اخلاقی موضوعات، صوفیانہ خیالات اور عشق حقیقی کا والہانہ انداز میں اظہار کرتے ہیں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"خیال" محفلِ حال و قال میں گانے کے لیے ہوتا تھا۔ اسی لیے اکثر خیال مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق ترتیب دیئے گئے ہیں۔ شاہ داول کے "خیال" میں ترک دنیا، بے ثباتی دہر دنیا کے دول، خوفِ خدا، روح، نور کو موضوع سخن بنایا گیا ہے شاہ داول کے خیال کو غزلیہ گیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس میں غزل کی ہیئت بھی ہے اور گیت کا مزاج بھی مثلاً چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

دنیا یو باغِ شاہی ہو دھات بلا آئی — کچھ یادگار بھائی سے وہاں لیجاں ہارے
میہمان ہیں یہاں کے رہن ہار ہیں ہاں کے — بعد از دنیاں تمی بھاگئے نہیں کوئی پان ہارے
دے دان بچہ دیدار کا بھو کا پیا بھوجن کر دول — داول کہے اس دان تمی نہیں دان ہی کوئی توریتے[3]

---

[1] کشف الوجود از شاہ داول مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی (قدیم اردو جلد اول ۱۹۶۵ء) ص ۲۹۰
[2] ایضاً ص ۳۰۱ ـ ۳۰۲
[3] تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی لاہور ۱۹۷۵ء ، ص ۳۰۴ .

ناری نامہ: تقریباً دو سال قبل تحقیق و جستجو کا جنون لیے راقم کراچی (پاکستان) پہنچا تھا جہاں انجمن ترقی اردو اور نیشنل میوزیم کراچی کے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور یہیں دکنی شہ پاروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ خوش قسمتی سے میوزیم کے ڈائریکٹر نے ان شہ پاروں کے زیراکس حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ راقم انجمن ترقیِ اردو اور نیشنل میوزیم پاکستان کے عملے کا تہِ دل سے ممنون ہے۔ اِن جواہر پاروں میں شاہ داول کا "ناری نامہ" بھی ہے۔ جو ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ ۹ سطری ہے۔ کاغذ قدیم آب زدہ اور کرم خوردہ بھی ہے کاتب کم سواد ہے لیکن خط نستعلیق ہے۔ مخطوطہ میں آخری دو بند نہیں ہیں اور سال کتابت نہیں ہے۔ شاید اس مخطوطے کا آخری صفحہ ضائع ہو گیا ہے۔ راقم نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ اس مخطوطے کو بار بار پڑھا ہے اور حسبِ استطاعت اس کا متن تیار کیا ہے۔

مرتب شدہ "ناری نامہ" میں کل ۳۱۵ بند ہیں ایک بند میں دو شعر ہیں اس لحاظ سے اس نظم میں ۶۳۰ اشعار ہیں ایک شعر کرم خوردگی کی نذر ہو گیا ہے۔ لہٰذا پیشِ نظر نظم میں صرف ۶۲۹ اشعار ہیں اشعار ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "شاہ داول نے تقریباً ۱۲۳۰[2] اشعار پر مشتمل ایک نظم "ناری نامہ" مربع ترجیع بند کی ہیئت میں بھی لکھی ہے جس میں مربع کا چوتھا مصرعہ ٹیپ کے مصرعہ کے طور پر بار بار آیا ہے۔ مثلاً۔ • "پیو بارج کوئی پیارا نہیں"

راقم کا خیال ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے کسی تسامح کے باعث اشعار کی تعداد ۱۲۳۰ لکھدی ہے۔ غالباً یہ مصرعوں کی تعداد ہے یعنی ۳۱۵×۴ = ۱۲۳۰

شاہ داول کی زود گوئی اور ناری نامہ کے مناصر ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی گرانقدر رائے کا اظہار ذیل کے الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

• داول نے یہ نظم ایک رات میں لکھی تھی: ع کیتاں فکر یک رات میں[3]

اس نظم میں دنیا کی بے ثباتی، دوزخ، جنت، روزِ حشر اور قیامت کا ذکر کر کے سنّت کی پیروی اور اخلاقِ حسنہ کا درس دیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر بیوی کو اپنے شوہر سے، خواہ وہ کیسا بھی ہو محبت کرنی چاہیئے۔ اس طویل نظم میں مختلف حالات و کوائف پر اظہارِ خیال کر کے، جو عام خاندانی زندگی میں پیش آتے ہیں، بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کو سکون بہم پہنچائے، اس کی وفادار اور جاں نثار رہے۔ وہ کام کرے جو شوہر کو پسند ہوں۔ غصہ اور سختی سے پرہیز کرے اور سوکن کے ساتھ بھی مل کر رہے۔ اس نظم میں ایک ایسی روانی ہے اور الفاظ ایسے سیدھے سادے روزمرہ کے استعمال کیے گئے ہیں کہ

---

[1] ناری نامہ ـــ ب، نیشنل میوزیم، کراچی پاکستان ۔ [2] تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی لاہور ص ۳۰۴ ۔

[3] ناری نامہ، شاہ داول مرتبہ راقم صفحہ ۳۱۴ ۔

ا صرف ترنم کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے بلکہ وہ آسانی کے ساتھ یاد بھی ہو سکتے ہیں۔ ساری نظم میں بات چیت کا سا لہجہ ہے
یک ایسا گمبھیرپن اور لوچ ہے کہ نظم دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کا ناصحانہ انداز دل کو مٹھی میں لے لینے والی کیفیت کا حامل ہے
ہے جو بند نقل کیے ہیں وہ بالترتیب نہیں ہیں۔ (۱) ۱۳۰، (۲) ۱۳۲، (۳) ۸۲، (۴) ۸۳، (۵) ۸۵،

"ناری نامہ" کی زبان و بیان پر عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ "یہ زبان و بیان تقریباً سوا تین سو
برانے ہیں۔ شاہ داول کی زبان فارسی کے زیر اثر آنے کے باعث ہمارے لیے آج بھی اجنبی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے
ین درسی کوشش سے آج بھی ہم تک پہنچ رہا ہے۔ وہ جانم کی روایت کے مبصر و مفسر ہیں اور جب بھی جانم کا نام آئے گا، داول کا نام
جس کے ساتھ لیا جائے گا یہی وہ روایت ہے جو جانم، داول، خوش وہاں سے ہوتی ہوئی امین الدین اعلیٰ تک پہنچی ہے اور وہ
ہے مکمل کر دیتے ہیں۔"[۱]

"ناری نامہ" دراصل شاہ برہان الدین جانم کی صوفیانہ تعلیمات کی صدائے بازگشت ہے۔ داول کا مخاطب براہ
راست عورتوں سے ہے جن کی گود تعلیم و تہذیب کا گہوارہ اور جن کی زندگی ایثار و محبت کا پیکر ہوتی ہے۔ داول کا طرز تخاطب ناصحانہ
ہے۔ زبان بے حد عام فہم ہے۔ ان کا ذہن گھر کی چہار دیواری کی گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے لہٰذا انھوں نے مخصوص قسم کا صوتیاتی نظام
بنتا ہے جس میں مختلف زبانوں (پنجابی، ہریانی، برج، راجستھانی، گجراتی اور مراٹھی) کے اثرات نمایاں ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں
کی مقدس کتابوں سے بھی خوشہ چینی کی ہے اور عورتوں میں پائی جانے والی چھتیس خصوصیات (لکشنوں) کی طرف بھی اشارہ کیا ہے
وہ عورت کو ہندوی فلسفے کے مطابق "پتی ورتا" ہونے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ کہیں ان کا انداز نہایت سبک ہے اور کہیں کہیں
پر اس میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی نظم میں اپنائیت کا عنصر کارفرما رہتا ہے۔ اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ
شاہ داول کو عامیانہ زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ شاہ داول نے اپنی نظم میں مسلم معاشرے کی بے باکانہ عکاسی کی ہے۔ انھوں نے
مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی ہے۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والے شوہروں کے ساتھ ساتھ
برے کی تلقین کی ہے۔ اپنے اور سوکن کے بچوں میں تمیز نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ان خیالات کی نمائندگی کے لیے شاہ داول
کا ذخیرۂ الفاظ کسی ایک زبان تک محدود نہیں رہا۔ حتیٰ کہ انھوں نے مراٹھی اور سنسکرت الاصل الفاظ سے بھی اپنی نظم کو زینت بخشی
ہے۔ ان زبانوں کے محاورے اور کہاوتیں بروئے کار لائے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا جوں کا توں ترجمہ استعمال کیا ہے۔ فارسی اور مراٹھی الفاظ
کے مرکبات سے نئی ترکیبیں اختراع کی ہیں۔ زبان و بیان کا یہ گنگا جمنی امتزاج شاہ داول کے "ناری نامہ" کی اہم خصوصیت ہے۔
شاہ داول نے نصیحت آمیز باتیں نہایت سلیس پر مغز جملوں اور پرکشش انداز میں کہی ہیں۔ وہ ایک شیریں بیاں مصلح کی طرح عورتوں

۱۔ تاریخ ادب اردو، از جمیل جالبی ص ۳۰ ۔ ۲۔ تاریخ ادب اردو، از جمیل جالبی ص ۳۰ ،

سے مخاطب کرتے ہیں گویا وہ اپنی ہی بیٹی (بیٹی) سے مخاطب ہوں لہذا وہ کٹر واعظ کی طرح درشت گو نہیں ہیں بلکہ ان کے لہجہ
سے خیر خواہی کا احساس ہوتا ہے اس لیے ان کی باتیں دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہیں۔ بہرکیف شاہ داول کی نصیحتیں عورتوں کے لیے بہشتی زیور سے
کم نہیں ہیں۔ "ناری نامہ" کے ابتدا میں شاہ داول نے فارسی میں پیش لفظ کے طور پر چند جملے تحریر کیے ہیں۔ ان جملوں کا مطلب یہ
ہے کہ ایک نیک صالح اور خدمت گزار بیوی اپنے شوہر کے لیے بہشت کی متقاضی ہے اور بدخصال عورت اپنے شوہر کے لیے
جہنم کی آگ سے مشابہ ہے۔"

شاہ داول کی نظم میں استعمال شدہ بیشتر الفاظ فی زمانہ متروک ہو چکے ہیں ان میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو مروجہ املا
اور معنی کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ قدیم اردو کے ابتدائی نقوش میں اس نظم کا شمار ہوتا ہے کیونکہ اس نظم کو کم و بیش ۵۰۰ سال
گذر چکے ہیں۔ گیرائی اور گہرائی کے لحاظ سے یہ نظم ایک مخصوص تاثر پیدا کرتی ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنی نور چشم کو زندگی کے نشیب
اور نشیب و فراز سے آگاہ کر رہا ہو۔ ان تقاضوں کی تکمیل میں شاہ داول نے شعری قواعد کی سختی سے پابندی نہیں کی ہے۔ ان
غلطیوں کے باوجود لسانی نقطۂ نظر سے اس نظم کا مطالعہ قدیم اردو کے ارتقائی عمل کے رازہائے سربستہ کو فاش کر سکتا ہے۔
زبان کو ٹکسال کے معیار پر کھرا اترنے کے لیے کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے یہ اندازہ بھی اس نظم کا تحقیقی جائزہ ثابت کرتا
ہے شاہ داول ضرورت شعری کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر صحت لفظی کا خیال نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بیشتر
الفاظ کو توڑ مروڑ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ناموزوں مصرعے بھی پائے جاتے ہیں بلکہ شاہ داول بحر کے مطالبہ
کی بھی پروا نہیں کرتے۔ وہ ان خامیوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔ بس ان کا پیغام گوش گذار ہو جائے یہی ان کی سچی نیت رہتی ہے
شاہ داول کے یہاں غلط قافیہ بندی کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ ان ادبی اور لسانی نقائص کے باوجود "ناری نامہ" قدیم اردو کا
گرانمایہ ہے اس کی اشاعت سے نئے گوشوں پر روشنی پڑے گی اور نئی اصطلاحیں، تراکیب اور الفاظ کا ذخیرہ میسر آئیگا۔

ناری نامہ کا جائزہ:- "ناری نامہ" کے ابتدائی بندوں میں "شوہر کے حقوق" کی تشریح کی گئی ہے اور باور
کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا فانی ہے لہذا "پیو" یعنی شوہر ہندی شاعری کے زیر اثر سے ناراضی، بے رخی، بیزاری، بےوفائی
اور نافرمانی گناہ عظیم کے مترادف ہے۔

چوتھے بند میں اہل ہنود کے مذہبی عقائد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

؎ جیمیں جنم کا ہے بنا (بند نمبر ۴)

شاہ داول نے ایک سے زائد جنم (زندگی) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہندو عقائد کے بموجب خوشحال میاں بیوی ستوتہ
سات زندگیوں، سات جنموں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے اور تب کہیں جا کر انھیں "موکش" ملے گا۔ ایک لحاظ سے

ول نے یہاں پر فلسفۂ آواگون کی ترجمانی کی ہے۔

اسی فلسفہ کی شاہ داول نے بند نمبر ۵ میں نفی بھی کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں: ؎

وہی بت ہے تیرا صنم　　　　پیو نا ملے جنمیں جنم

اسلامی تعلیمات کے پیش نظر خدا اور اس کا محبوب رسولؐ اس عورت سے زیادہ خوش ہیں جو شوہر کی خدمت گذار ہے اور شوہر کی زیادتیاں سہ لیتی ہے۔ شوہر کے غصے اور کڑوی کسیلی باتوں کو صبر کے ساتھ پی جاتی ہے۔ تند خوی اور درازی سے دور رہتی ہے۔

وہ عورت جو گھر کو لڑائی جھگڑے کی آگ سے دور رکھے، شوہر کے غصہ کی آگ کو مسکراہٹوں کے پھولوں سے بجھاتی رہے اور شوہر کے عیوب کی پردہ پوشی کرتی رہے، ایسی عورت کا اللہ کے نزدیک بڑا درجہ ہے۔

اہل ہنود کے یہاں عورت کا شوہر پرست ہونا لازمی ہے۔ ان کے یہاں "پتی" ہی "پرمیشور" ہے۔ دُنیوی خدا ہے لہذا عورت کا پتی ورتا ہونا لازمی ہے۔ شاہ داول بھی اسی فلسفہ کے قائل نظر آتے ہیں۔ ذیل کا بند ملاحظہ کیجیے: ؎

پت ورت بی بی پاک عمل　　　　انصاف کرنا سگل

تب ہوئے خاصو میں دخل　　　　پیو باج کوئی پیارا نہیں　　(بند نمبر　)

نیک صفت عورت کو شاہ داول نے "پاک ذتی نار" کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایسی عورت نہایت صابر، نو بردار اور فادیکش ہوتی ہے۔ اس عورت کا رتبہ ہر لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ہے وہ ایک مثالی عورت اور بیوی ہے کیونکہ وہ نیک صفت، وفا شعار اور ایفائے وعدے کی پابند ہے۔ اس کی پیش بینی سے مرد کی زندگی سنور سکتی ہے۔ ایسی عورت کی شوہر کی بھگتی کا روپ دھار لیتی ہے جیسا کہ ویدانت میں عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے ؎

نس دن کر پیو کی بھگت　　　　تن ماس سب کالی رگت

سکھ دکھ ستی پیو کے سنگت　　　　پیو باج کوئی پیارا نہیں　　(بند نمبر ۲۶)

شاہ داول تلقین کرتے ہیں کہ بیوی ایسے کام کرے جو اس کے شوہر کو پسند خاطر ہوں۔ شوہر کے روبرو وہ خود کو خوبصورت انداز میں پیش کرے کیونکہ بقول شاہ داول "جوگن صفت" عورت، شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی لہذا وہ کہتے ہیں ؎

جوگن پیا کو بھائے ناں　　　　سوکن کدھیں دکھلائے ناں

من نبہ پیا کوں پائے ناں　　　　پیو باج کوئی پیارا نہیں　　(بند نمبر ۲۷)

شاہ داول سمجھاتے ہیں کہ بیوی کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ شوہر سے اپنی بے رضا رہے اس کی نافرمانی نہ کرے۔ ایسی

نیک عورت سے شوہر تو شوہر ملائک ارض و فلک بھی خوش رہتے ہیں۔ ساس کی سلامتی اور خیر و برکت کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ عورت اگر ایثار و قربانی کی مورت بن جائے تو وہ اپنے شوہر کے دل پر راج کر سکتی ہے۔ ایسی عورت میں شاہ داول کے نزدیک کئی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک مثالی اور ہندوستانی بیوی میں جس قدر صفات ضروری ہیں ان کی طرف شاہ داول کا اشارہ ملاحظہ فرمائیے۔

جو نار نطل، بھوگنی[1] جو سار سمرت، پدمنی

مقبول بتیس لکھنی[2] پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۴۲)

مندرجہ بالا بند میں عورت کی ۳۲ صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ 'شرنگار رس' میں پائے جانے والے نائک بھید کے مطابق عورت میں جن ۳۲ لکشنوں (صفات) کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تفصیل پر غور کیجیے۔

۱۔ بھاؤ (پریم)
۲۔ ہاؤ
۳۔ ہیلا
۴۔ شوبھا
۵۔ کانتی
۶۔ دیپتی (چمک)
۷۔ مدھر (مٹھاس)
۸۔ سبنشیل
۹۔ اودارتا
۱۰۔ دھیریہ
۱۱۔ لیلا
۱۲۔ ولاس
۱۳۔ سندروشی سوشادل
۱۴۔ پریم میں گرو کرنے والی
۱۵۔ ہنسنے والی (خوش مزاج)
۱۶۔ کونیں (خاندانی)
۱۷۔ مدگا مینی
۱۸۔ پان کے جیسے چہرے والی
۱۹۔ چھریری
۲۰۔ کرلو کنے والی
۲۱۔ پدم گندھا
۲۲۔ گنونتی
۲۳۔ کلاوتی
۲۴۔ سوکشم بھوجن (کم کھانے والی)
۲۵۔ ترالس (جو سست رہی)

+ ۷

۳۲

[سا موورک لکشن[3] جو جوتش کے حساب سے ہوتے ہیں (مجموعی خصوصیات)]

شاہ داول کا صالح مشورہ ہے کہ ایک غلط کار اور بے راہ رو شوہر کو ایک صالح بیوی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ شوہر کو بری اور نازیبا حرکتوں سے باز رکھ سکتی ہے۔ اگر وابستگی سے کام لے تو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ ایک نیک، فرشتہ صفت اور خاموش طبیعت بیوی کی پہچان بھی یہی ہے۔

اس کے برخلاف باتوں کی حامل بیوی شاہ داول کے خیال میں دوزخ نشیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

جیو نار بے فرمان ہے شیو یاں بھری شیطان ہے

دوزخ منیں اس ٹھان ہے پیو باج کوئی پیسا نہیں

اسلام میں ایک سے زائد شادیاں جائز ہیں۔ اسی مناسبت سے شاہ داول نصیحت آمیز لہجے میں عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ نہ صرف سوکنوں سے بلکہ ان کی اولاد سے بھی اپنی اولاد کی طرح پیار کریں۔ انھیں اچھی تربیت دیں۔

---

[1] بھوگنی (متعدد صفات رکھنے والی) [2] لکھنی، لکشنی [illegible] [3] بشکریہ پروفیسر مرزا گی ہوتر شعبہ ہندی مہاراشٹر کالج ممبئی

وقت کھانا کھلائیں۔ نہلائیں دھلائیں اور کپڑے پہنائیں، روٹھے ہوتے بچوں کو منائیں اور ان کو دل و جان سے خدمت کریں
اس طرح وہ اپنے شوہر کے علاوہ اہل خانہ کے دل موہ سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

نہلا، دُھلا کسوتِ[1] پنا — بھوت چاؤ کران کو منا
پیرپنچ نہ کران سے تھ پنا(ہ) — پیٹو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۹۰)

شاہ داول نیک طینت بیوی کو غرور، سُستی اور غیر سے وابستگی نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ چالاکی سے زندگی بسر کرنے کے طریقے کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں ؎

مغرور ہو مستی نہ کر — دل غیر سوں بستی نہ کر
چالانکہ ہو سستی نہ کر — پیٹو باج کوئی پیلا نہیں (بند نمبر: ۹۵)

شاہ داول کا کہنا ہے کہ زبان درازی اچھی بیوی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس سے گھر کا سکھ چین جاتا رہتا ہے۔ تو تحمل جو سے پیا اللہ کی رحمت برستی ہے۔ میاں بیوی میں بے بناؤ زندگی کو وہ بے مزہ بنا دیتا ہے۔ دراصل عورت کی کامیاب زندگی کا راز اسی نکتہ میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ زندگی میں کڑواہٹ کا زہر پھیل جاتا ہے۔ عورت کو شوہر اس کی قسمت سے ملتا ہے۔ لہٰذا اسے بالخصوص اپنے شوہر کے ساتھ نباہ کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ بقول شاہ داول، اندھا، مجذوب، بدشکل بھی اس کیلئے محبوب ہے۔

؎ اندلا اگر مجذوب ہے — صورت طمع ناخوب ہے
جیسا اچھو محبوب ہے — پیٹو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۰)

؎ کانا، بوچا، تھوتنا اچھو — پانگل اگر لنگڑا اچھو
کپٹی، کھوچڑ، کھوٹا اچھو — پیٹو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۱)

؎ جیسا اچھو جس دھات کا — تجھ میں پیم کی رات کا[3]
روشن طمع ظلمات سا[2] — پیٹو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر: ۱۳۲)

شاہ داول ہدایتاً کہتے ہیں کہ خوب سیرت عورت منتر، سحر، جادو ٹونے[4] سے اپنا اور دوسروں کا گھر نہیں جلانا چاہیے۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے اور اس سے ایمان کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں مکر و فریب کے چکر میں اپنا گھر تباہ کر لیتی ہیں۔ اللہ ان کو ناشائستہ حرکتوں سے باز رکھے ؎

---

۱ کپڑے ، ۲ گھو اجاڑا ، ۳ سیاہ کام ، ۴ سفلی عمل کے مطابق دوسروں کا گھر جلانے پر مادی راغب ہیں۔

ایساں بڈھیاں مکر زناں   اللہ رکھے گن تھے نہاراں
سمجھے نہ کوئی ان کی فناں   پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۱۸۱)

بیوی کو چاہیئے کہ وہ اپنے دل سے کدورت دور کرے۔ خود کو نور اور اللہ کی دیگر نعمتوں سے معمور کرے۔ یہی ں کی معراج ہے ؎

دل کا کپٹ دور کر   سب نور سوں معمور کر
نعمت بہتر بھرپور کر   پیو باج کوئی پیارا نہیں

بیوی گھر کی چہار دیواری تک حاکم ہوتی ہے۔ اسے اپنے اور شوہر کے عزیز و اقارب سے بدسلوکی نہیں کرنی چاہیئے ل کی با پردہ آواز بھی اس کی عفت کی پاسدار ہے۔ لہٰذا اسے اس پر بھی قابو رکھنا چاہیئے۔ عورت کے لیے زیور اس کے اخلاق ہیں اندری مسمنے کے زیورات نہیں۔ یہ اس کی عارضی زیب و زینت ہیں۔ چنانچہ شاہ داول کہتے ہیں ؎

زیبا زینا تن اوپر   کئی صد گہنایاں من اوپر
لعنت اہے اس زن اوپر   پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۱۸۳)
صورت شکل جوں شہری   پہنے اوڑھے کسوت کری
کیا کام آئے خصلت بری   پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۱۸۴)
صورت اہے خصلت نہیں   خوبوں سنے حرمت نہیں
دل سوں کرے قربت نہیں   پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۱۸۵)

ایک باوفا بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سکھ اور دکھ میں اپنے شوہر کا برابر ساتھ دے۔ اس سے گھر میں سکون اور نان کے علاوہ خوشحالی قائم رہتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو شاہ داول کے نزدیک اس گھر کی عورت عورت نہیں بلکہ جہنم کی مثل ہے ؎

ناری نہ ہوئی یو نار ہے   اس نار تھے بیزار ہے
دوزخ میں اس کا ٹھار ہے   پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۱۹۹)

سگھڑ، وفاشعار اور اچھے رنگ ڈھنگ والی بیوی نہایت مقبول ہوتی ہے۔ اس کے کردار کی خوشبو سے سارا گھر ہے۔ اگر اس میں یہ خوبی نہیں ہے تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس کا حال شاہ داول کے نزدیک کچھ ایسا ہے ؎

۔ کی طرح

سوگند نہیں صندل بہتر — ہیزم ہے ناچیز تر
پس جانتا چھ لیے بہتر — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۰۴)

شاہ داول نے ایک وفادار، خوش مزاج اور حلیم الطبع شوہر کے لیے بھی کچھ باتیں کی ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ ہمی اپنی بیوی کا ہر طرح سے خیال رکھے اس سے محبت کرے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اس کی جائز فرمائشوں کو رد ے ان خوبیوں کی وجہ سے وہ بیوی کا محبوب بن سکتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

جو نامرد اسس سار کا — خاطر رکھے اس نار کا
تو وہ مرد ہوئے پیار کا — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۰۷)

زن کا جتا ہٹ تت چلا — جب ہوئے گرم کرتا گلا
تو وہ مرد اس کوں بھلا — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۰۸)

اگر شوہر ہوشمندی سے کام نہ لے تو وہ ضرور دھوکا کھائے گا۔ شوہر کی مثال ایک چابکدست سوار کی سی ہے۔ لہذا ے۔ کام پر چوکنا رہنا ضروری ہے ورنہ اسے نقصان کا احتمال ہے۔ چنانچہ شاہ داول کہتے ہیں ؎

عورت ہتی ٹٹے سوار توں — کھائے گا دغا ہشیار توں
بدھ سوں اسے لیا تھار توں — پیو باز کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۱۱)

عورت کو چاہیئے کہ وہ جھوٹ، مکر اور بدگوئی سے پرہیز کرے۔ زندگی کو خوشیوں سے نکھارے۔ غیروں سے پردہ کرے۔ ضد سے باز رہے۔ کیونکہ عورت کی کج فہمی خوشحال زندگی اور عاقبت کو خراب کرسکتی ہے۔ سماج بھی اس سے متنفر رہتا ہے۔ اگر وہ ان باتوں سے دور رہے تو خاندان بھر میں اس کا بول بالا رہتا ہے۔ سماج میں اسکی عزت دوچند ہوجاتی ہے۔ بیوہ عورت کی زندگی بقول شاہ داول کسمپرسی سے دوچار رہتی ہے ؎

جیو لگ مرد کی چھاؤں ہے — تو لوگ سہاگن ناؤں ہے
گذریا لو رنڈایا نو ہے — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۶۱)

صالح عورت بہتر سے بہتر ازدواجی زندگی بسر کرسکتی ہے۔ اس کے لیے ہر قسم کا آرام اور سکھ اسی دنیا میں میسر ہے عورت میں وہ جنتی بن سکتی ہے ؎

کرتی خوشی کا کاج وے — بھوگ بھوگتی سکھ راج وے
جنتی دنیا میں آج وے — پیو باج کوئی پیارا نہیں (بند نمبر ۲۴۳)

ے۔ ہتی: ہاتھی — ے بدھ: بدھی، عقل و ہوش۔

اس نظم کے آخری دو بندوں میں شاہ داول نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انھیں یہ نظم کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر اپنے صوفیانہ مزاج کے مطابق انھوں نے ایک رات میں یہ نظم مکمل کی۔ ان کا مدعا عورتوں اور مردوں کی ازدواجی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے پیشِ نظر بہتر سے بہتر بنانا تھا۔

(۳۱۴) دیکھیا دنیا کی دھات میں
کیتاں فکر ایک رات میں
بولیا زناں کی بات میں
پیو باج کوئی پیارا نہیں

(۳۱۵) زن تے ہوا جو دکھیا
دکھ نار تے سنیا پکیا
دو بین یوں داول لکھیا
پیو باج کوئی پیارا نہیں

لسانی خوبیاں :- "ناری نامہ" میں پائے جانے والے مراٹھی الفاظ :

مراٹھی الفاظ :- گھرن [illegible] ، بھاگ ، گمبھیر ، پت دست ، سوسنا ، جوڑا ، کنے ، اوگرہ ، کاڑنا ، گوت ، گوتی ، بھیں ، دمنی ، سنگلے (سنگٹے) جھالو جیبو سمرت۔ [illegible] ۔ خوشحال ، ناکد (ناکدھیں) ، کمان (کان) ، رگت کنول ۔ [illegible] ، بونب ، اگن (اگنی) ، لکھن (لکشی) ۔ [illegible] ، لابہ ، بوڑنا ، موکلا [illegible] شتت ۔ [illegible] ، بھگنا [illegible] ، پرینی ۔ گرستی ، ٹوٹ [illegible] ، جوسی ، ناتی [illegible] ، ککھن ،

دکنی اثر :- دکھلاچہ ، نکو ، اچہ ، کنے ، گرتیاں (گرتی) ۔

نئی تراکیب و الفاظ :- لوچا (پست قد ، اداس (روتا بیٹھنا) ، منصالا (عیسلی) ۔ چیڑالا (چینا ہوا) ، جوکن یا تت ترک (توت تراک) ، ہم یار (ساتھی) ، پر بجری (پرائی عورت) ، پریم رس (پریم رس) ، پاک ذتی ۔ تیس لکشنی (۳۲ خصوصیات رکھنے والی) ، کھوٹی کھرڑ (جھوٹی اور کھرڑ) ، پرم باس (پریم باس) ، سکھ پال ، پٹ پٹانا (تڑتڑانا) ، سکھ راج ،

غلط املا :-

فعلن (فتنہ)	منا (منع)	غصا (غصہ)	انک (آنکھ)
سچی (صحیح)	وعدا (وعدہ)	اُپر (اوپر)	بھل (بھلا)
بچا (بچھا)	خار (خوار)	اپ (آپ)	ِتنا (اتنا)
سوکا (سوکھا)	خش (خوش)	بزار (بیزار)	پناں (پناہ)
اسطراب (اضطراب)	قرب (قریب)	بزاں (بعدازاں)	بھنور (بھنورا)
علا (علّی)	جاب (جواب)	دنو (دونو)	
حلا (حیلا)	راہ راس (راہ راست)	بی (بھی)	
نفا (نفع)	پرت (پریت)		

ضرب المثل :۔ جیسا پریا ویسا گنڈھے (بند نمبر ۵۳)

(جیسا بوؤگے ویسا کاٹو گے)

فارسی ضرب المثل کا ترجمہ: گندم از گندم بروید جو از جو

حدیثِ نبوی :۔ (بند نمبر ۲۱۵) "زن کی عقل میں نہیں نفا" (عورت ناقص العقل ہے)

قولِ حضرت علیؓ (بند نمبر ۲۲) :

شاہ وادل کی نظم میں تشبیہ، تلمیح، استعارہ اور مختلف تجانیس کے علاوہ صنعت تعلی بھی پائی جاتی ہے۔

مثلاً ۔ "یو بول جوں ہیرے رتن"

عربی فقرہ :۔ فوق القہر (بند نمبر ۱۶۱) (غصّے کے عالم میں)

پنجابی اثر :۔ تا ہوسی، توڑسی، چنگے،

واؤ زائد کے ساتھ الفاظ :۔ روح بجائے رخ، دوکھ بجائے دکھ،

الف زائد :۔ راکھ بجائے رکھ ۔ زہار بجائے زہر،

نون غنہ بڑھا کر بنائے گئے الفاظ : فناں بجائے فنا۔ پنہاں بجائے پناہ، ناں بجائے "نا"

نئے محاورے :۔ بول پکڑنا، دسا اترنا، جیب کھولنا، پھلے کرنا، کھٹوئی لینا، ہٹ تٹ چلانا، بول مکھ آنا، گلا باندھنا، ٹوٹ ہونا، پرم کھولنا، سفر پکڑنا (راہی اجل ہونا)، باٹ لیانا، دشکوں تلملا)، بستی کرنا (دل بستن سے)، باراں جھڑنا، ماؤ کرنا (پھر جانا) فہام کرنا (فہم کردن سے)، روس اترنا۔ غصہ ٹھنڈا ہونا، دلبست ہونا۔ دل بستن سے، جیو جوڑنا۔ دل لگانا، امر توڑنا۔ حکم عدول کرنا، انجھو پوتنا۔ آنسو پرونا، منہ سونٹ کرنا۔ سونٹھ کی طرح سے سانا، منہ کھٹا کرنا۔ تلخی ظاہر کرنا، مکھ جیب جتن کرنا۔ زبان کو قابو میں رکھنا۔

پروفیسر مختار الدین احمد
سابق صدر شعبۂ عربی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

دیوانِ مصحفی کا خدا بخش ایڈیشن

آپ نے بہت اچھا کیا کہ دیوان مصحفی (قدیم ایڈیشن) کو دوبارہ شائع کر دیا جو بہت کمیاب تھا۔

دیوان ہفتم و ہشتم پنجاب یونیورسٹی میں نہیں۔

انجمن سے مقدمۂ ریاض ہی نہیں تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا بھی شائع ہوئے ہیں۔

آپ کی تحریریں بھی دیکھیں، بہت محنت کر کے بہت مفید معلومات آپ نے درج کیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ مصحفی پر کام کرنے والے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ مختلف عنوانات کے تحت اشعار کے انتخاب میں آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی، لیکن اس طرح یہ ایک مفید کام ہو گیا۔ فرہنگ فرنگی محل و دخل پر دو تین شعر مشہور تھے آپ نے دس شعر تلاش کر لیے ہیں۔

عہد مصحفی کے کچھ متفرقات اور فرہنگ مصحفی میں بڑے کام کی باتیں آپ نے لکھی ہیں اور شعر خوب تلاش کیے ہیں اس کی میں داد دیتا ہوں۔ الفاظ و فقرات پر صفحہ نمبر بھی دے دیتے تو یہ فہرستیں اور مفید بن جاتیں۔ شعر بہرحال لکھ دیے ہیں اس طرح اس مجموعے سے نکالے جا سکتے ہیں۔

لق لق والا شعر پورا نقل نہیں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا کہ مصحفی نے یہ کس مفہوم کو ادا کرنے کیلیے استعمال کیا ہے۔ لق لق دبلا پتلا پرندہ ہے بگلے کی طرح۔ ہم نے بچپن میں بہار میں کئی لق لق شکار کیے ہیں۔ لاہور کے صحافی حاجی لق لق دبلے پتلے آدمی تھے اس لیے وہ اس نام سے مضامین لکھتے رہے۔

مصرع لکھا ہے ع۔ خوش آئی کب ہے یہ لق لق کسی کو

یہ لق لق (بک بک) تو نہیں۔ پہلا مصرع میرے سامنے نہیں اسلیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویسے لق لق اڑ گیا بولتے ہیں؟ لق لق اڑ گئی نہیں۔ انتخاب دیوان مصحفی دیکھا تو اس میں یہ شعر ہی نہیں ملا۔ اس سے خیال ہوا کہ آپ نے مصحفی کے سات دواوین پیش نظر رکھے ہیں۔ ورنہ مصحفی کی مثنوی طفل حجام کا مصرع: ع منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال۔ نقل کر سکتے۔ یہ مثنوی وہاں کے دیوان میں ہے اور میں نے کوئی پچاس سال پہلے سالنامہ "نگیا" میں شائع کی تھی اس کا پہلا مصرع مجھے اب تک یاد ہے۔

ع سنے ہے مصحفی اک تو بھی فی الحال۔ اس زمانے میں میں مثنویات مصحفی مرتب کر رہا تھا لیکن یہ ایک لمبا قصہ ہے۔

سرور صاحب کی فرمائش پر قاضی صاحب نے آٹھوں دواوین کا انتخاب مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا اچھا ہے اس طرح مصحفی کے بہت اچھے اشعار پڑھنے کو مل جائیں گے۔ کہنے لگے انتخاب بہترین اشعار کا نہیں بلکہ انتخاب میں

متعدد امور پیش نظر رکھے ہیں میں نے۔ کہتے تھے چار دواوین کا انتخاب کر لیا ہے۔ مجھے دو تین چھوٹی چھوٹی کاپیاں پوسٹ کارڈ سائز کی پنسل سے لکھی ہوئی دکھائیں جن سے صرف وہی کام لے سکتے تھے، افسوس ہے وہ یہ کام مکمل نہ کرسکے۔

معصیت کا دو جگہ ذکر ملا (صحیح چھتیس سینتیس) یہ ان کی محبوبہ تھیں۔ آپ نے "مزاری" پر اوپر خط کیوں کھینچا ہے؟ (ص تنتالیس)۔

کیا آپ کو یقین ہے کہ گلزار ابراہیم سے علی ابراہیم خاں خالؔ کا تذکرہ مراد ہے؟

"کاٹ" کو میں مونث سمجھتا تھا۔ ع: نہ دیکھیں ہم نے کاٹ ایسی کسی شمشیر براں میں۔ لیکن مصحفی کے یہاں "تلوار کا کاٹ" ملا۔ ہم بندوق کی نال بولتے ہیں، اس زمانے میں بندوق کا نال کہتے ہوں گے۔ "ابتدا" کو مذکر استعمال کیا ہے "درد کا ابتدا"۔ لسانی حیثیت سے یہ باتیں اہم ہیں۔

آپ نے بعض شعروں کو قلابین [ ] میں کیوں رکھا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔

مضمون کے بارے میں کچھ مزید باتیں:

دیوان قصائد سے مراد نسخہ رام پور سے ہوگی۔ قصائد کے دیوان کا ایک نسخہ کئی سال پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ نے خریدا ہے اچھا نسخہ ہے اس پر ایک تفصیلی مضمون غالباً نثار احمد فاروقی کا شائع بھی ہوا ہے۔ مستند نسخہ ہے اس کا عکسی اڈیشن شائع کرسکتے ہیں۔ قصائد کا ایک نسخہ شاید ڈھاکا میں بھی ہے اگرچہ میں نے نہیں دیکھا قاضی صاحب ذکر کرتے تھے

دیوان فارسی نسخہ رام پور جس کا آپ نے ذکر کیا ہے غالباً غیر مکمل ہے۔ دیوان کا ایک نسخہ جامعہ ڈھاکا کے کتب خانے میں میری نظر سے گذرا ہے اس کا عکس بھی میں نے حاصل کر لیا ہے نسخہ رام پور میرے پیش نظر نہیں یہ غیر مکمل دیوان ممکن ہے وہی ہو جو نظیری کے جواب میں انھوں نے مرتب کرنا چاہا تھا۔ اب اگر دیوان فارسی نسخہ ڈھاکا جس کا عکس میں نے حاصل کیا ہے وہی ہو جو جلال، اسیر اور ناصر علی کے تتبع میں تھا اور جو پوری ہو گیا تھا، تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔

ہاں نگار کا مصحفی نمبر بہت قیمتی ہے اور اب کبریت احمر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا عکسی اڈیشن آپ چھاپ دیں تو کیا کہنا! اس پر میں نے ایک طویل مکتوب نیاز صاحب کو لکھا تھا اور تحقیق۔ مضامین پر سخت تنقید کی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ انھوں نے اس ناچیز خط کو مضمون بنا کر اگلے ماہ شائع کر دیا۔ افسوس ہے کہ یہ شمارہ میرے پاس نہیں رہا علاوہ مصحفی پر بھی میرا مضمون نگار کی متعدد اشاعتوں میں چھپا جو مصحفی نمبر کے لیے میں نے لکھا تھا لیکن تاخیر سے پہنچا تھا۔ آپ مصحفی نمبر کے ساتھ ان دونوں تحریروں کو بھی شائع کرسکتے ہیں۔

جناب عارف نوشاہی
معارف نوشاہیہ
اسلام آباد، پاکستان
حال مقیم تہران،

تصوّف مخطوطات

جرنل کا مخطوطات نمبر (۶۹-۳-۷) دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کے ادارے نے مخطوطات سے دلچسپی برابر قائم رکھی ہے بلکہ علاقے کے بہت سے محققین اور طلاب کو بھی اس طرف لگا رکھا ہے۔ مخطوطات سے یہ اعتنا یقیناً تحقیق کی نئی راہیں کھولے گا۔ ہمارے ہاں پاکستان میں ایرانی حکومت کی دلچسپی سے فارسی مخطوطات پر تو توجہ دی جا رہی ہے مگر عربی اور اردو مخطوطات کی فہرست نویسی پر خاطر خواہ کام نہیں ہو پا رہا ہے۔ خدا جانے کیا عمرانی تبدیلیاں آئی ہیں کہ ہمارے اُمّہات ادارے (انجمن ترقی اردو، پنجاب یونیورسٹی) ساٹھ اور ستّر کے عشروں میں مخطوطات شناسی پر کچھ کام کر کے اب اس سے لاتعلق بیٹھے ہیں۔ حالانکہ جس طرح مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے فارسی مخطوطات کی مشترک فہرست تیار کروائی ہے اُسی نہج پر پاکستان میں عربی اور اردو مخطوطات کی مشترک فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ عربی مخطوطات کے سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر احمد خان صاحب (رکن ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) کسی عرب ملک کے ایما پر تن تنہا جامع فہرست تیار کر رہے ہیں، خدا انھیں اس کی تکمیل کی توفیق بخشے، فارسی کو ایرانیوں کی اور عربی کو عربوں کی سرپرستی میسّر آ گئی، کیا اردو ہی اپنے وطن میں غریب الوطن رہے گی؟ راقم السطور کی یہ تجویز ہے کہ خدا بخش لائبریری اپنے وسائل اور ہمت افزائی سے کم از کم ہندستان میں عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی الگ الگ جامع فہرستیں بنوائے۔ عربی اور فارسی مخطوطات کی فہرست نویسی کے لیے یقیناً اسے ہندستان میں قائم عرب۔ ایران ثقافتی مراکز سے بھی مدد مل جائے گی۔ مخطوطات پر سیمینار منعقد کروانا اور ان میں خواندہ مقالات کی اشاعت یقیناً مفید اور مخطوطات شناسی کی تحریک کو زندہ رکھنے کی عمدہ کوشش ہے، لیکن شائع شدہ مقالات اور ملحق فہارس دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے اور کچھ کام ایسا ہی لشکر بڑھانے کے ذیل میں بھی آتا ہے۔ جب اتنا وقت اور سرمایہ صرف ہو ہی رہا ہے تو اس علمی منصوبے میں فنی باریکیوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ کیا ہی بہتر ہوتا مخطوطات نمبر کا اشاریہ بھی تیار کر کے ساتھ لگا دیا جاتا، تاکہ اس خاص شمارے کے پہلے ۳۰۶ صفحات سے بھی بسہولت استفادہ ہو سکتا۔

ہندستان کے کتب خانوں میں فارسی و عربی مخطوطات اس اعتبار سے تو مفید ہے کہ کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں

ہندستان میں موجود ہے لیکن اگر کوئی ان کی عکسی نقل حاصل کرنا چاہے تو کس نمبر کا حوالہ دے۔ ایک ہی کتاب کے متعدد نسخوں کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نسخے کی اہمیت بھی معلوم نہیں ہوتی۔

احقر نے پہلے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ آپ کا ادارہ یہ فہرست "غیر مطبوعہ" کتابوں کی تخصیص کے ساتھ شائع کر کے ایک شدید علمی مغالطے اور مبالغے کا شکار ہو رہا ہے۔ اس خاص شمارے میں بھی ہندستان اور پاکستان میں مخطوطات تصوف کی جو فہرستیں پیش کی گئی ہیں وہ اسی دعوے کے ساتھ پیش کی گئی ہیں حالانکہ یہ سراسر گمراہ کن ہے ہمیں مندرجہ ذیل حقائق کو مدنظر رکھنا ہوگا:

اولاً، ابھی تک تمام فارسی مطبوعات کی فہرست تیار نہیں ہوئی؛

ثانیاً، جو فہرستیں تیار ہوئی ہیں وہ بھی تمام کی تمام ایک شخص کی دسترس میں نہیں ہیں؛

ثالثاً، فارسی زبان کی قلمرو اس قدر وسیع ہے کہ ہم ایک دوسرے کی اشاعتی سرگرمیوں سے بے خبر ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ غیر فارسی ممالک میں بھی فارسی کتابیں چھپ رہی ہیں اور ان کی اطلاع بھی کم ہی پہنچتی ہے۔

"پاکستان میں تصوف کے مخطوطات" کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ "جو طبع نہیں ہوئے اور صرف پاکستان میں موجود ہیں"۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ ان میں سے طبع بھی ہو چکے ہیں اور ہندستان میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حسب ذیل کتب طبع ہو چکی ہیں۔

چہار بہار، حسنات الحرمین، حورائیہ از عبید اللّٰہ احرار، حورائیہ از یعقوب چرخی، خلاصۃ العارفین، رشف الالحاظ فی کشف الالفاظ، شرح اسماء الحسنیٰ یعقوب چرخی، نسایم گلشن، مفاتیح الاعجاز، شرح مثنوی معنوی شاہ داعی شیرازی، شرح فصوص الحکم خواجہ محمد پارسا، معارف تصوف، نی نامہ جامی و چرخی، یواقیت الحرمین۔

یہ چند نام حافظے کی بنیاد پر لکھ دیے ہیں ورنہ اور بھی رسائل ہیں جو طبع ہو چکے ہیں

احسن الشمائل کے ایک نسخے کا ذکر صفحہ ۹۷ پر ہوا ہے جو علی گڑھ میں ہے جب کہ فہرست پاکستان ص ۱۹۷ پر اسے منحصر بہ پاکستان بتایا گیا ہے۔

اشاریہ مصنفین مخطوطات تصوف کی ترتیب میں مزید دقت نظر کی ضرورت تھی ایک ہی نام مختلف شکلوں میں درج ہو گیا ہے۔ مثلاً عبید اللّٰہ احرار کا نام صفحہ ۲۰ پر بذیل عبداللّٰہ بن محمود شاشی، صفحہ ۳۰ پر عبید اللّٰہ احرار اور اسی کے نیچے بذیل عبداللّٰہ بن محمود شاشی الکذا (ضبط تحریر ہوا ہے۔ شمارہ ۵۰ کے تحت خوارق کا ذکر ہے اور خواجہ عبید اللّٰہ احرار کو اس کا مصنف بتایا گیا ہے چونکہ احقر کے اس نسخے کا عکس موجود ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ احرار کی تصنیف نہیں بلکہ ان کے خوارق ہیں جو مولانا شیخ نے جمع کیے ہیں۔ شمارہ ۱۱۹

کے تحت رسائل سماع مکتوبہ خواجہ عبداللہ احراری کا ذکر ہے اور اشاریہ میں اسے عبیداللہ احرار کی تصنیف قرار دیا گیا۔
مخطوطات نمبر کے پہلے حصے میں جو متفرق مقالات چھاپے گئے ہیں ان میں سے بعض بالکل قلم برداشتہ ہیں اور تعارف مخطوطات کے بنیادی تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتے مثلاً صفحہ ۳۶۳ پر بنگلہ دیش کے نوادر ماس مقالے میں کہیں نہیں بتایا گیا کہ یہ مخطوطات کس کتب خانے میں ہیں۔ صفحہ ۳۸۳-۳۸۴ پر جواہر الاسرار کے تعارف میں اس کے کاتب کے بارے میں تو بحث کی گئی ہے مگر کتاب کے مندرجات پر دو سطریں ہی لکھی گئی ہیں اگر اس کتاب کی دس فصول کا تعارف لکھ دیا جاتا تو اس مجہول المؤلف کتاب کی شناخت میں مدد ملتی۔ صفحہ ۱۴۴ پر مقالہ تصوف میں ہندستانی علاوہ خراسانی کچھ اہم غیر مطبوعہ تصانیف میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کو خلط کر دیا گیا ہے اور نہایت درجہ ابہام پایا جاتا ہے کہ مقالہ نگار کس کس کو متعارف کرانا چاہتا ہے۔ مقالہ نگار نے جن تصانیف کو ۱۲ اہم کے طور پر پیش کیا ہے ان میں سے بیشتر مجہول الاسم غیر اہم مختصر رسائل ہیں اور مصنف کی طرف ان کا انتساب بھی محل نظر ہے۔ مثلاً معین الدین چشتی کا رسالہ عمر فاز ضیاء الدین نخشبی کی تصنیف سلک السلوک تہران سے باہتمام غلام علی آریا چھپ گئی ہے چراغ دہلی کا رسالہ تصوف شرف الدین احمد منیری کا رسالہ عرفانی، گیسو دراز کا رسالہ عرفانی، راجو قتال کا تحفۃ النصائح متعدد بار چھپ چکا ہے ابو العلا اکبر آبادی کا رسالہ تصوف۔ ان مجہول رسائل کی کیا اہمیت ہے؟

مختلف مقالات میں جن مخطوطات کا تعارف ہوا ہے ان میں سے حسب ذیل طبع ہو چکے ہیں۔ السباب الفر طبع تہران (ص ۲۸)، فصل الخطاب (ص ۱۲۸)، مرصاد العباد (ص ۱۷۸)، چہل مجلس سمنانی (ص ۳۷۸)، رسالہ کیفو بن عثمان غزنوی در سیرت بہاء الدین نقشبندی (کذا) (درست نقشبند) (ص ۳۷۸) یہ غالباً رسالہ ابدالیہ یا انسیہ اور یہ دونوں چھپ چکے ہیں۔ ان کا مقام وفات حرف (کذا) ایران بتایا گیا ہے یہ غلط ہے۔ غایۃ الامکان (ص ۳۷۹) یا غایۃ البیان (ص ۳۸۰) یہ کراچی، تہران، ایک سے طبع ہو چکا ہے۔ صفحہ ۴۴۵ پر سطحیات (کذا) (درست شطحیات) کا ذکر ہے۔ یہ دراصل ان کی کتاب حسنات العارفین ہے جو تہران سے طبع ہو چکی ہے۔

مخطوطات تصوف پاکستان کا ایک مآخذ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان جلد پنجم بتایا گیا ہے یہ جلد سوم ہے۔ اس کی ضخامت ۲۱۳۲ صفحات نہیں بلکہ از صفحہ ۱۲۰۹ تا ۲۱۳۲ ہے۔

اس خردہ گیری کے باوصف راقم السطور آپ کے اس اہتمام کے لیے رطب اللسان ہے جو آپ مخطوطات شناسی میں کر رہے ہیں۔ اس کی تقلید ہمارے پاکستانی علمی اداروں کو بھی کرنا چاہیے۔

امید ہے مستقبل قریب کی کوششیں بہتر انداز میں پیش کی جائیں گی۔ ہم سب طالب علم آپ کے مرہون منت ہیں

••

تاریخ ہند: عہد وسطیٰ

شہنشاہ اکبر کا دار الترجمہ

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی، ڈی لٹ

ترجمہ:۔ جناب سید حسن عباس، ایم اے

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی (آسٹریلیا)

ترجمہ: جناب سید حسن عباس (تہران)

شہنشاہ اکبر کا دار الترجمہ*

مسلمانوں کی ابتدائی علمی اور فکری سرگرمیوں کی تاریخ کی توسیع تین واضح مرحلوں میں ہوئی ہے۔ پہلے مرحلے میں مسلمانوں نے یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ دوسرے مرحلے میں مختلف ہندستانی اور یونانی نظاموں میں ہم آہنگی پیدا کی اور تیسرے مرحلے میں انھوں نے خود علمی اور فکری تحقیقات کا کام شروع کیا۔ سنسکرت کی جن کتابوں نے سب سے زیادہ مسلمانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی وہ "ہیئت و نجوم، ریاضیات اور مواعظ و نصائح" کی کتابیں تھیں۔ نجوم میں "سدھانتا" اور مواعظ میں "کلیلہ و دمنہ" جن کا پہلے ہی ترجمہ کیا جا چکا تھا اس کا دوبارہ ترجمہ ہوا۔ یونانیوں کی فکری میراث جو صدر اسلام کی عقلی فلسفے کی تحریکوں سے بیشتر ہم آہنگ تھی سنسکرت کے وسیع فلسفیانہ اور مذہبی کاموں سے مکمل پوشیدگی کا باعث ہی۔ ہندوازم کے کچھ نکات اور اس کے آداب و رسوم، جن کا ذکر ابوسعید عبدالحئی گردیزی کی کتاب "زین الاخبار" میں آیا ہے۔ دراصل ان کی اساس ابن خرداذبہ (۲۱۱-۳۰۰ھ/ ۸۲۵-۹۱۱ء) کی نایاب کتاب "المسالک والممالک" ہے۔

ابوریحان البیرونی (۳۶۲-۴۴۲ھ/ ۹۷۳-۱۰۵۰ء) نے سنسکرت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور اپنی تحقیقات اپنی جاوید کتاب "تاریخ الہند" میں پیش کیں۔ شہرستانی نے اپنی معروف کتاب "الملل والنحل" میں ہندستان میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے بارے میں جو مقالہ تحریر کیا ہے، اس میں ہندوازم کا مختصر تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے البتہ ان کاموں کا ہندستان کی بعد کی مسلمان نسلوں پر کوئی خاص شدت اثر نہیں ہوا۔ ان سیاحوں اور عرب جغرافیا کی تحریروں کو بھی ہم تحقیق و تجزیہ سے خالی پاتے ہیں جنھوں نے پانچویں ساتویں صدی ہجری کے وقفے میں ہندستان کا سفر کیا انھوں نے صرف مجہول اور عام اطلاعات فراہم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ہندوازم کی تفصیل جو مانکتی (متوفی ۱۰۳۰ ہجری) اور

* یہ مقالہ رضوی کی کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ ہے Rizvi S.A.A. Religious and Intellectual History of Muslims in Akbar Reign (Delhi 1975)

اس مقالے کا فارسی ترجمہ رسالہ مشکوۃ مشہد (ایران) کے شمارہ [illegible] سال ۱۳۶۶ [illegible] شمسی میں شائع ہو چکا ہے فارسی میں ترجمہ سید حسین السادات نے کیا ہے

حافظ ابرو[۳] کی تخلیقات میں پیش کی گئی ہے، آٹھویں سے دسویں صدی ہجری تک درمیان ہندستان اور ایران کے مو مسلمانوں کے ذریعے ایک ایسا تحلیل و تجزیہ ہے جو خلط ملط اور غلط ہے۔

بعض صوفیوں نے زاہدانہ ہندستانی افکار کے سلسلے میں اپنی خاص دلچسپی کا اظہار کیا تھا[۴]۔ سید محمد بن سید یوسف گیسو دراز کہتے ہیں کہ انھوں نے ہندوؤں کے مذہبی آثار کا اس خاص مقصد کے تحت مطالعہ کیا ہے کہ برہمنوں سے مذہبی (مناظرے) کیے جا سکیں[۵]۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کو ۷۶۳ھ/ ۶۲-۱۳۶۱ء میں فتح نگرکوٹ کے دوران جوالا مکھی مندر سے تقریباً ایک ہزار تین سو سنسکرت کے قلمی نسخے ہاتھ لگے۔ اس نے ان میں سے بعض کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے سنسکرت میں نجوم اور ریاضیات کے موضوع پر ہونے والے کاموں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ عزالدین خالد خانی نے سلطان فیروز شاہ کی زندگی میں ہی "دلائل فیروز شاہی" کے نام سے نجوم اور طب کے موضوع پر ایک کتاب کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اب نہیں ملتا لیکن اکبر کے عہد میں موجود تھا اور نظام الدین احمد نے اس پر نظر ثانی کی تھی[۶]۔

سنسکرت سے فارسی میں ہونے والا ایک دوسرا جدید ترجمہ فیروز شاہ کے عہد میں ہوا، مشہور ہندستانی منجم VARAHAMIHIRA فرزند ADIT YADASA کی کتاب "بریہات سمہتا" ہے۔ اس کا ترجمہ عبدالعزیز شمس سہالوری نے کیا[۷]۔ اگرچہ بیرونی نے پہلے ہی اس کا ترجمہ کر ڈالا تھا[۸]۔ لیکن عبدالعزیز کو بیرونی کے ترجمے کی خبر نہیں تھی۔ سلطان زین العابدین کشمیری (۸۰۰-۸۷۴ھ/ ۱۴۲۰-۱۴۷۰ء) سلطان سکندر لودھی اور دیگر مسلم حکمرانوں نے سنسکرت سے ترجمے کے سلسلے میں اپنی خاص دلچسپی دکھائی ہے، لیکن اکبر نے مختلف زبانوں کی گرانقدر تالیفات کے فارسی ترجمے کرا کے ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اکبر کے نزدیک اس کی دو وجوہات تھیں۔

۱۔ اپنی تجسس حس کی تسکین۔ ۲۔ دانشور طبقے کے درمیان معلومات کا تبادلہ۔

فارسی ترجمہ اس لحاظ سے قابل توجہ تھا کہ یہ بہرحال فارسی ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج زبان تھی[۹]۔

اکبر بچپن میں لکھنے پڑھنے کی نعمت سے محروم رہا تھا لہٰذا مولوی اور حافظ کے دلکش اور دلپذیر اشعار سن کر لطف اندوز ہوتا تھا اور جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو معمولاً اس کے لیے کتابیں پڑھی جاتی تھیں جن میں تاریخ اور داستان کی کتابیں اسے بہت پسند تھیں۔ ان کتابوں میں اسے "حمزہ نامہ" سے عشق تھا۔ "حمزہ نامہ" دو تاریخی شخصیت کی شجاعت کی داستان ہے۔ پیغمبرؐ کے چچا حمزہ جو جنگ احد میں کام آئے (سال دوم ہجرت) اور اور حمزہ (متوفی: اوائل تیسری صدی ہجری) جنھوں نے عباسی خلیفہ کے خلاف ایک تحریک کی قیادت کی اور جن

کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان حتیٰ کہ سیلان پر لشکر کشی کی ہے۔

تقریباً ۹۷۵-۷۶ھ/۱۵۶۸ء میں اکبر نے درباری مصوروں کے ایک گروہ کو ایک بڑے پردے پر امیر حمزہ کی داستان کی تصویر کشی کا حکم دیا۔ سو افراد پر مشتمل ایک گروہ اس کام میں مشغول ہو گیا۔ ابتداء میں یہ کام معروف ایرانی مصور "میر منصور" کے بیٹے میر سید علی جدائی کی زیر نگرانی شروع ہوا۔ اس کے بعد اسے پورا کرنے کی ذمہ داری خواجہ عبدالصمد شیرازی[10] کو سونپ دی گئی۔ عطاء اللہ قزوینی نے تصویری واقعات کی وضاحت کے لئے "داستان امیر حمزہ" کے موضوعات کو نظم کا جامہ پہنایا[11]۔ اسی طرح ابو مسلم خراسانی (مقتول: ۱۳۷ھ/جنوری فروری ۷۵۵ء) کے افسانوی واقعات بھی اکبر کے لیے دلچسپ تھے۔ ابو مسلم خراسانی نے عباسیوں کے مفاد میں امویوں کی مخالفت کا علم بلند کیا تھا۔ اسکے علاوہ اکبر "شاہنامہ فردوسی" اور "جوامع الحکایات" سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا۔

۹۸۲-۸۳ھ/۱۵۷۴-۷۵ء کے برسوں میں اکبر کی مذہبی اور فکری آرزوؤں نے علمی کاموں میں اس کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا تھا۔ جمادی الثانی ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں جب وہ مغربی ہندوستان کے سفر سے واپس آ رہا تھا تو قنوج میں اس نے مولانا عبدالقادر بدایونی کو "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ سنگھاسن بتیسی، بکرماجیت اور بتیس مجسموں کی داستان ہے۔ ایک باخبر برہمن کو بھی متون کی تشریح و تفسیر کے لئے بدایونی کے ساتھ کر دیا۔ اکبر کے حکم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے بدایونی نے اسی دن کتاب کے دو صفحات کا ترجمہ کر کے اکبر کو پیش کیا جسے اس نے پسند کیا۔ "نامۂ خرد افزا" ایک سال میں مکمل ہوا[12]

دوسرے سال اکبر نے عربی کتاب "حیات الحیوان" کا فارسی ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ کتاب حیوان شناسی میں ایک اہم تالیف ہے۔ اس کا مؤلف کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری (متوفی: ۸۰۸ھ/۰۶-۱۴۰۵ء) ہے۔ بدایونی کہتے ہیں کہ "پہلے اس کا ترجمہ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک نے کیا تھا۔"[13]

ان ہی ایام میں بدایونی کو شیخ بھاون کی تفسیروں کی اساس پر "اتھروید" کا ترجمہ کرنے کا حکم ملا[14] لیکن مغز کو مطالب کی تفسیر و توضیح میں کافی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بدایونی نے مشکلات کا ذکر اکبر سے کیا تو اکبر نے پہلے فیضی پھر حاجی ابراہیم سرہندی کو اس کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی لیکن ان میں سے کسی کو کامیابی نہیں ملی۔[15]

جب "عبادت خانے" کی فعالیت کا میدان وسیع ہو گیا اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کو بحث و مباحثے کی اجازت مل گئی تو پھر مختلف مذاہب کی کتابوں کے صحیح فارسی ترجمے کی ضرورت در پیش ہوئی۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں ابوالفضل کو فارسی میں انجیل کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا MACLAGAN کہتا ہے کہ یہ بات مشخص نہیں ہے آیا یہ حکم عموماً چاروں مقدس انجیل سے متعلق ہے یا براہ راست پادریوں کی طرف سے صادر ہوا ہے[16]۔ ایسا معلوم دیتا ہے

کے بارے میں خط لکھا تھا تو یہ کتابیں دربار میں موجود نہیں تھیں لہٰذا اکبر نے پرتگال کے بادشاہ سے مذکورہ تینوں کتابوں کے ہمراہ عربی فارسی کی دیگر جو کتابیں ان کے پاس ہیں، بھیج دینے کے لئے کہا[17]۔ ابوالفضل کا ترجمہ کردہ کتاب مقدس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے لیکن یوں معلوم دیتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی مبلغ کے تعاون سے (اس کا) ترجمہ کیا تھا، اور بسم اللہ کے بجائے جس کا مسلمان ہر کام سے پہلے استعمال کرتا ہے، ابوالفضل نے یہ ٹکڑا لکھا تھا " اے وہ جس کا نام عیسیٰ اور مسیح ہے" اور شیخ فیضی نے " سبحانک لا سواک یا ھو " کا اس پر اضافہ کیا[18]۔ یوں لگتا ہے کہ ان تراجم نے اکبر کو سنسکرت کے مذہبی کاموں کے وسیع پیمانے پر ترجمے کے لئے اکسایا اور نتیجے میں فتح پور سیکری میں ایک منظم "دارالترجمہ" قائم کیا گیا[19]۔ بدایونی کہتے ہیں۔

> " شاہنامہ اور داستان امیر حمزہ کے استنساخ اور مصور ہونے اور ابومسلم نیز "جوامع الحکایات" کی داستانیں مکرر سننے کے بعد اکبر نے قدیم ہندی کے کاموں کا فارسی ترجمہ کرانے کا فیصلہ کیا۔"

اور بقول بدایونی، شہنشاہ کا خیال تھا کہ :

> " اکثر اینہا شاعری و ساختگی است، اما چون در ساعت خود گفتہ شدہ و اختر در گذر بودہ شہرت تمام گرفتہ اکنون کتابہای ہندی را کہ دانایان مرتاض عابد نوشتہ اند و ہمہ صحیح و نص قاطع است و مدار دین و اعتقادیات و عبادات این طایفہ بر آن است ترجمہ از ہندی بہ زبان فارسی فرمودہ، چرا بہ نام خود نسازیم کہ غیر مکرر و تازہ است و ہمہ مثمر سعادات دینوی و دینی و مبیح حشمت و شوکت بی زوال و مستوجب کثرت اولاد و اموال چنانچہ در خطبہ آن کتب نوشتہ اند[20]"

ابوالفضل نے مہابھارت کے فارسی ترجمے کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کن چیزوں نے اکبر کو سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمے کرانے پر مجبور کیا جو خود اس کی زیر سرپرستی انجام پائے تھے۔ یہ دلچسپیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ رعایا کے مختلف عقائد و ادیان کی شناخت کے لئے منظم منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اکبر کے مقاصد اور محرکات کے جائزے سے قبل ابوالفضل اظہار افسوس کرتا ہے کہ ماضی کے حکمران، رعایا کی مذہبی ضرورتیں پورا کرنے کے فریضے سے پوری طرح غافل تھے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب رعایا کے مذہبی مسائل ان کے کانوں تک پہونچتے تو وہ ان مسائل پر توجہ نہیں دیتے تھے انہیں زیادہ گروہوں کی جنگ و جدال کے خوف نے مذہبی مسائل پر ذاتی طور پر توجہ دینے سے باز رکھا تھا۔ انھوں نے (بادشاہوں نے) یہ مسائل ان لوگوں کے حوالے کر رکھے تھے جو فتویٰ کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تھے یا بیہودہ اہل کلام کے حوالے کر دیئے گئے تھے، جنہیں خود اپنے مذہب کی حقیقی روح کا علم نہیں تھا۔

لیکن ابوالفضل کہتا ہے کہ اکبر نے ...

جس نے اس کی پوری زندگی میں تمام کوردل ارکان کو مایوس کر دیا تھا، مذہبی موضوعات کی تحقیق و تحلیل کی ایک نئی فضا قائم ہوئی۔[۲۱] اکبر کی جانب سے کئے جانے والے نئے انتظامات کے سلسلے میں ابوالفضل مزید کہتا ہے :

" مختری کہ در انتظام امور سلطنت و ارتسام نقوش خلافت چندان اختراع قوانین و ابداع قواعد نمودہ کہ دانایان کار آگاہ چوں بہ قدر فہم خود وامی رسند متفکر و متحیر می مانند کہ با این ضوابط سلاطین ماضی چہ نوع جہانبانی و ملک رانی می کردہ باشند "[۲۲]

اب پھر (مہابھارت کے فارسی ترجمے کے بارے میں) اکبر کے محرکات کی جانب واپس آتے ہیں۔ اکبر اپنی قوم (رعایا) کے تمام فرقوں کے درمیان دوست، دشمن میں امتیاز ختم کرنے کے لئے اصلاحات کئے جانے کی طرف مائل تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہرے اختلافات تھے اور اس مسئلے کو سمجھنے کے بعد کہ اس پیچیدہ جنگ و جدال کا کوئی انجام متصور نہیں ہے، اس نے دونوں مذاہب کے اہم متون کے ترجمے کرانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس طرح دشمنیاں ختم ہوں اور ہر مذہب کا ماننے والا حقیقت کے حصول کی کوشش کرے۔ اس کام کے ذریعے وہ اپنی خامیوں کی شناخت اور اصلاح کر سکیں گے۔ مستزاد یہ کہ اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ ہر مذہب میں ایسے لوگ کم ہیں جو خود کو کامل اور بے عیب جانتے ہوں۔ وہ لوگ بھی جو حتی الامکان اپنے مذہب کو صحیح طور سے نہیں پہچانتے اور کم سے کم ایسی کتابیں پیش کرنے سے بھی عاجز ہیں جو لوگوں کے سمجھنے میں معاون بن سکیں اور ایسی اعتقادی روح پردۂ ابہام میں باقی رہتی ہے۔ اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ یہ طریقہ ضرور تاً عوام فریبی کی روک تھام کرے گا جو دین کے ٹھیکیداروں کی مذموم چالوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ اس نے نتیجہ نکالا کہ اگر مختلف مذاہب کے بنیادی متون آسان اور سادہ زبان میں ترجمہ ہوئے ہوتے تو وہ حقیقت پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کی علمی معیار[۲۳] کا امتحان بن سکتا ہے جو اپنے مذہب کی حقیقی روح سے اپنے مومن اور عزیز پیروکاروں کو واقف کرانے کی کوشش نہیں کرتے۔

ابوالفضل اپنے معاصرین کے محدود کائناتی مشاہدے (جہان بینی) اور بے خبری پر دوبارہ تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہندو علماء نے اپنے مذاہب کے تعصب آمیز نظریات اختیار کر لئے ہیں جو جہل اور بالادستی کے عقیدے کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ انھوں نے اس بدترین اعتقادی روش سے چشم پوشی نہیں کی ہے جو توہین، سرزنش اور اندھی تقلید ہے۔[۲۴] اور عجیب و غریب چیزوں سے سادہ لوح لوگوں کے اذہان پر کر کے انھیں مذہب کی تحقیق سے منحرف کر دیا تھا۔ دین محمدی کے پیروکار جو ہندو ازم کے حقائق سے بے خبر تھے، ہندو مذہب کو مسترد کر دیتے تھے اس لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رائج مختلف مذاہب کے اصلی متون کی معتبر اطلاعات تک ان کی دسترس نہیں تھی اور ط

اپنے مذاہب کی امام جعفر صادق[۲۵] (۸۰-۱۴۸ھ / ۷۰۲-۷۶۵ء) اور ابن عربی[۲۶] جیسی اہم شخصیتوں کی تالیفات کا مطالعہ نہیں تھا اور عقیدہ تھا کہ انسان تقریباً سات ہزار سال قبل موجود تھا اور انسان کی تمام ثقافتی میراثیں ان ہی ایام میں تشکیل ہوئی ہیں۔[۲۷]

سب سے پہلے "مہابھارت" کا ترجمہ کرانے کی کئی وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ یہ کتاب ہندو ازم کا ایک بنیادی متن ہے اور " ہندوستان کے برہمنوں کے عقیدے[۲۸] کے اکثر اصول و فروع اس میں موجود ہیں اور اس قوم میں اس کتاب سے زیادہ معتبر، مفصل اور بڑی کوئی اور کتاب نہیں ہے۔"

دوسرے یہ کہ (اس میں) ماضی کی بیکراں دنیا کو اس کے تمام فعل و انفعالات اور رفتار و کردار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ خاص کر مطالعہ تاریخ کے نقطہ نظر سے :

" ایضاً خواطر جمہور انام علی الخصوص سلاطین عظام را باستماع تواریخ میل تمام است، چہ حکمت شاملہ الہی علم تاریخ را کہ موجب عبرت اہل خبرت است، بر دلہا محبوب گردانید تا از گزشتہ حاپندی گرفتہ زمان حال را غنیمت شمردہ، اوقات گرامی را در مرضیات الہی صرف نمایند و لهذا ملوک باستماع احوال گذشتگان از ہمہ محتاج تر باشند۔"

ابوالفضل مزید لکھتا ہے :

" بناءً علی ہذا جمعی از دانشوران زباندان کہ بہ وفور دانائی و کثرت تدوین اتصاف داشتہ واز تعصب و عناد در روبہ انصاف و اعتدال نزدیک بودہ اند، جمع شدہ کتاب مذکور را از روی تأمل و تعمق بہ عبارات واضح و کلمات مانوس ترجمہ کردند و طوایف انام جمیل، تمام نسخہ ہا گرفتہ باطراف و اکناف عالم بردند۔"[۲۹]

مہابھارت کے قلمی نسخے کے آخری صفحے کے مطابق CHATURBHUJ MISRA ، DEBI MISRA ، MADHUSUDAN (MISRA) ، SATUWANI اور SAHIKH BHWAN جیسے لوگوں نے اس کے ترجمے میں علمائے اسلام کا ساتھ دیا۔ ترجمے کے کام کی ابتدا ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء کے اواخر میں نقیب خان نے شروع کیا تھا۔ چند راتوں تک خود اکبر نے نظارت کی تھی اور تیسری رات میں مولانا عبدالقادر بدایونی کو نقیب خان کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیا۔ بدایونی کہتے ہیں :

" وچند شب بنفس نفیس معانی آن را بہ نقیب خان خاطرنشان ساختند تا حاصل را بنگارد

املاری کرد و شب سوم فقیر را طلب فرموده حکم کردند تا باتفاق نقیب خان ترجمہ کرده باشم و در مدت سہ چہار ماه از هژده فن آن مزخرفات لاطائل کہ هژده هزار عالم در آن متحیر است دو فن نوشتہ شد۔"

اس کے بعد ملا شیری اور نقیب خان نے ترجمہ کا ایک حصہ اور دوسرا حصہ حاجی سلطان تھانیسری نے مکمل کیا۔ اس سلسلے میں شیخ فیضی کو بھی ترجمے کو فارسی میں نظم کرنے کا حکم ملا لیکن وہ دو حصے سے زیادہ نہ کر سکے۔ حاجی سلطان نے مذکورہ دونوں حصوں کو پھر سے لکھا اور پہلے ترجمے کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ بہر حال کتاب سو اجزاء میں پوری ہوئی (ایک جز ۱۶ اوراق پر مشتمل ہے) اور بقول بدایونی "اصل متن کا کوئی نکتہ فروگذاشت یا قلم زد نہیں ہوا۔" [۳۰]

یقیناً ایسا معلوم دیتا ہے کہ "حصہ اول" کے دو "پروان" کو جنھیں فیضی نے منظوم کیا تھا، ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں دوبارہ لکھا گیا۔ اور بقیہ ترجمہ نقیب خان، بدایونی، ملا شیری اور حاجی سلطان تھانیسری نے کیا۔ بدایونی کی یادداشتیں ہر ایک کے دقیق تعاون کی تشخیص میں غیر معمولی مشکل پیدا کرتی ہیں۔ بہر حال مجموعی طور پر اس کا ترجمہ ایک ہم آہنگی سے کیا گیا اور ایسا لگتا ہے کہ آخر کار نقیب خان نے از سر نو لکھا اور ترجمہ کا کام پورا کیا ہو۔ اور اسے ایک مجموعہ کی صورت دی۔ اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" رکھا گیا۔ بدایونی کہتے ہیں کہ :

"شیخ ابوالفضل علی رغم آنچہ کہ در تفسیر آیۃ الکرسی [۳۱] آورده بود خطبہ ای نیز بہ مقدار دو جزو بر آن نوشت۔" [۳۲]

"مہابھارت" کے اکثر قلمی نسخوں میں ابوالفضل کا مقدمہ ملتا ہے۔ یہ مقدمہ مطبوعہ نسخے میں بھی ہے جو نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ نول کشور پریس نے اس مقدمے کو ۲۶ صفحات اور دو حصوں میں شائع کیا ہے :-

الف : وہ حصہ جس میں کتاب کے ترجمہ میں اکبر کے محرکات کا ذکر شامل ہے۔

ب : کتاب کے موضوعات کا تحلیل و تجزیہ۔

ابوالفضل نے کہیں بھی "آیۃ الکرسی" کی اپنی تفسیر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے البتہ اس کو مسترد بھی نہیں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بدایونی نے بلحاظ تاریخ کی تحریف کی کوشش کی ہے۔

اکبر مہابھارت کے ترجمے میں تحریف پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے اکثر یوں ہی شک تھا کہ بدایونی ترجمے میں مداخلت کی کوشش کر رہے ہیں اور جیسے ہی کبھی ادھر ادھر ہو جاتے تو وہ انھیں ٹوک دیتا اور انھیں حرام خوار اور شلغم خوار کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ خود بدایونی نے اکبر کی اس تنقید کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جو اس نے رمضان ۱۰۰۳ھ (مطابق مارچ اپریل ۱۵۹۵ء) میں کی تھی۔ وہ کہتے ہیں :

خیال می کردیم اما او خود چنان فقیه متعصب ظاهر شد که به هیچ شمشیری رگ گردن تعصب او را نتوان برید. شیخ پرسید که صاحب در کدام کتاب نوشته که حضرت این چنین می فرمایند، فرمودند که در همین رزم نامه که عبارت از مهابهارت باشد و دوش برین معنا نقیب خان را گواه گرفته ام. شیخ به عرض رسانید که تقصیر کرده است. به ضرورت پیش رفته معروض داشتم که بنده مترجمی بیش نیستم، هرچه دانایان هندی تعبیر کرده اند بی تفاوت ترجمه نموده ام و اگر از خود نوشته باشم تقصیر من خواهد بود و بد کرده باشم. شیخ همین مدعا عرض کرد تا خاموش ماند و باعث برین اعتراض آن بود که نقل حکایتی در رزم نامه کرده بودم به این مضمون که استادی از اهل هند در وقت نزع به نصیحت با حاضران می گفت که آدمی را لازم است که قدم از حد جهل و غفلت بیرون نهاده، اول از همه، صانع بیچون را بشناسد و راه دانش بپیماید و تنها بر علم بی عمل اکتفا نماید که نتیجه نمی دهد و طریقه حسنه را اختیار نموده، از سیئات حسب الامکان دست کشیده دارد و به یقین داند که هر فعلی را بازپرسی خواهد بود و در آن جا این مصرع نوشته بودم:

مصرع: هر عمل اجری و هر کرده جزایی دارد

این معنا را حمل بر سؤال منکر و نکیر[۳۴] و حشر و نشر و حساب و میزان و غیر آن نموده مخالف قرار داد خویش که به غیر تناسخ به هیچ چیز قایل نیستند نموده مرا متهم به فقاهت و تعصب داشتند:

تا کی ملامت مژهٔ اشک بار من ... یک بار هم نصیحت چشم سیاه خویش

آخر خاطرنشان مقربان نمودم که همهٔ اهل هند قایل به جزا و سزای حسنات و سیئات اند و اعتقاد ایشان این است که چون شخصی می میرد محرری که نامهٔ اعمال بندگان را در مدت عمر می نویسد پیش فرشته ای که قابض ارواح است و پادشاه عدل نام دارد می برد و او بعد از ملاحظهٔ نیکی و بدی و غلبهٔ یکی بر دیگری حکم می کند که این شخص مخیر است، از او می پرسند که اول ترا به عوض نیکی ها در بهشت بریم تا آن جا استیفای لذت بر قدر حسنات خویش بکنی، بعد از آن، در دوزخ فرستیم تا تلافی آن گناهان شود یا برعکس، و چون آن مدت را به سر برد آن گاه حکم می کند که باز در دنیا رفته در به قالبی مناسب افعال خویش درآمده جسد دوره می گردد و هم چنین الی ماشاء الله تا زمانی که نجات مطلق یابد و از آمدن و رفتن در دنیا خلاص گردد.»[۳۵]

بوالفضل کا مقدمہ :-

"رزم نامہ" پر ابوالفضل کا مقدمہ جو ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں لکھا گیا ہے، اہم اور قابل قدر ہے۔ یہ مقدمہ خدا ور رسول کی تعریف و ستایش کے بجائے "شری گنیش نامہ" سے شروع ہوتا ہے، لیکن اکبر کا نام فراموش نہیں کرتا۔ وہ ۔ جے کو قارئین خاص کر مسلمانوں کے لئے بڑے استادانہ اور محققانہ طریقے سے متعارف کراتا ہے۔ ہندیوں کے اقوال کو س نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، علمائے ماورالطبیعہ، زہاد اور دکلا :-

"بر مخبران آثار و مستبصران اخبار و ناقدان سخن و راصدان نو و کہن اند مخفی نماند کہ در ممالک ہند چہ از خانوادۂ حکمت و چہ از زمرۂ ریاضت و چہ از اصحاب فقاہت در کیفیت آفرینش عالم اختلاف بسیار منقول است۔" [36]

بوالفضل کو ہند و جہاں بینی کے نظریات سے معلوم ہوا کہ تیرہ نظریے موجود ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی اسے پوری رح قانع نہیں کیا۔ اس کی نظر میں ان میں سے بعض میں عقلی تناقض نہیں پایا جاتا جبکہ ان پر کچھ غور و خوض کے بعد [37] ہے کو مسترد کیا جا سکتا ہے اور بقیہ پر توجہ دی جا سکتی ہے مثلاً مقدمہ لکھنے کے وقت تک بے شمار دیوتا یا برھا آئے اور گئے [38] اور اسے معلوم ہوا کہ یہ نظریہ امام جعفر صادق کے قول سے قابل موازنہ ہے جنھوں نے فرمایا ہے کہ اس ات پر توجہ دینی چاہیئے کہ انسان کی پیدائش سے قبل ہزاروں دیگر انسان پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ ابن عربی کہتا ہے سے پہلے کہ انسانی نسل نابودی کی طرف گامزن ہو، دیگر انسان پیدا ہو گئے تھے۔" [39]

مزید یہ کہ ابوالفضل اپنے قارئین کو داستانوں کے اندر موجود تضادات سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے ور اعادہ کرتا ہے کہ ان کی توجہ داستانوں کی تصویری روح کی جانب مبذول ہو۔ [40] وہ کہتا ہے :

"اگر بگویم کہ ایں قصہ ہا بطولہا راست است، از دائرۂ امکان قدیم بیرون نہادہ باشم واگر بافسانہ محض نسبت دہم، چہ دور گفتہ باشم۔" [41]

آئین اکبری" میں وہ اسی نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ :

"اگرچہ این اثر شامل داستانہا و اساطیر متعدد و غلوآمیزی می باشد کہ بر تخیلات اساس یافتہ است اما این کتاب دیدگاہہای آموزشی اخلاقی بدست می دہد کہ سندی برای تحقیقات تاریخی می باشد۔" [42]

س کی نظر میں کتاب کا اہم ترین حصہ جس میں دو تہائی کام شامل ہے اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ تعلیم و تربیت ہے

مشتمل ہے۔ بہرحال وہ قارئین سے کتاب کے اس اہم حصے پر توجہ دینے کی سفارش کرتا ہے نہ کہ داستان پردازیوں پر۔ چھٹے (حصے) کے پروان میں بھیشم (BHISHMA) کی فلسفیانہ، سیاسی، روحانی اور معنوی تعلیم، ابوالفضل کے لئے بڑی دلچسپ تھی۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ مترجمین اس حصے میں یکساں انصاف کرنے پر قادر نہیں تھے اور اس کی خواہش تھی کہ عرب و یونان کے پرجوش فکر مفکرین کے نظریات کے تحت کام کا جائزہ لیا جائے لیکن اس بات کے ذکر کے لئے اس نے "دور و دراز" اور اکتا دینے والا مقدمہ لکھا ہے۔[۴۳]

یہ صحیح طور پر واضح نہیں ہے کہ "مہابھارت" کے اتنے متون میں جو مختلف جگہوں سے حاصل ہوئے ہیں، مترجمین نے کس متن سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح یوں معلوم دیتا ہے کہ انھوں نے آگرہ میں متداول متن سے استفادہ کیا ہوگا بہرحال جب پونہ کے بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین نے "مہابھارت" کے قلمی نسخوں کی جمع آوری اور مقابلے کا کام شروع کیا تو انھیں سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک کے ایسے نسخے ملے جن کی تاریخ تحریر کی تعداد سولہ (مختلف تاریخ) تھی قدیم ترین نسخہ وہ نیپالی نسخہ تھا جو ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء سے متعلق تھا۔ ۱۵۱۹ء اور ۱۵۲۸ء میں دو دیگر نسخوں کی نسخہ برداری ہوئی تھی[۴۴] چوتھا نسخہ ۱۵۹۸ء سے متعلق تھا جو فارسی ترجمے کے بعد مرتب و مکمل ہوا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "مہابھارت" کا فارسی ترجمہ متن کی شناخت کے اعتبار سے ایک بڑی مدد ہے اس لئے کہ اس متن کے بارے میں جس سے اس میں کام لیا گیا ہے۔ ایک نظریہ ہاتھ آتا ہے۔

رامائن :-

۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں اکبر کے حکم پر عبدالقادر بدایونی کو رامائن کے ترجمے کی ذمے داری سونپی گئی اور وہ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔ مرہمی تعبیرات کے سلسلے میں دیگر اشخاص سے مدد حاصل کرنے کے سوا ایسا لگتا ہے کہ خود بدایونی نے اس مہم کو سر کیا ہے۔ یہاں بھی عبدالقادر بدایونی محسوس کرتے ہیں کہ ایک عالمی مقابلے (مجادلے) کی بہت پرانی داستان میں ان کے عقیدہ و احساس کے مدمقابل ہیں :

"در عم این طایفہ (ہندوان) آن است کہ عالم قدیم است و ہیچ گاہ از نوع بشر خالی نیست و از واقعہ (دورہ ٔ رامایانا) صد ہزار سال گذشتہ و بہ وجود این آدم ابوالبشر کہ از خلقت او ہفت ہزار سال گذشتہ قائل نیستند و ظاہر این است کہ این واقعات یا راست نیست و افسانہ و تخیل محض چون شاہنامہ و قصۂ امیر حمزہ یا در زمان تسلط بنی آدم و جنیان بودہ۔"[۴۵]

حکم ابوالفضل کی نظر میں رامائن کی فلسفیانہ تعلیم سب سے زیادہ ثقافتی اہمیت کی حامل ہے ترجمہ کا مسودہ، سترجمے

، لیکن مکمل متن ایک سو بیس جزو پر مشتمل تھا۔ بدایونی کو حکم ملا کہ جیسا کہ "مصنفین کی رسم" ہے ایک مقدمہ سی طرح جیسا کہ ابوالفضل نے "مہابھارت" کا مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ مقدمہ نعت حضرت پر لکھا جانا چاہیئے اور یہ ان کے لیے مشکل تھا جس سے انھوں نے صرف نظر کر لیا۔[۴۶]

"ہری وامسا پوران" مہابھارت کا تکملہ یا انیسواں پران کا ترجمہ فارسی گو شاعر فرزانہ ملا شیری[۴۷] نے کیا (والمیکی) کی سنسکرت کتاب "یوگ وشسٹ" کے ترجمہ کی نسبت معمولاً فیضی سے دیدی گئی ہے۔ لیکن ل ایسے اکبر کی زیر نگرانی ہونے والے تراجم کے ذیل میں نہیں سمجھتا ہے۔ اس کا مصوّر نسخہ جس کا سال ۱۶۰۲ء بخانہ چسٹربیٹی ڈبلن میں محفوظ ہے۔ اس کی تصویروں پر اکبر کے عہد کے مصوروں کے دستخط ہیں۔[۴۸] اگرچہ ہم یقین تھ ترجمے کو فیضی سے منسوب نہیں کر سکتے لیکن سنسکرت کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے اس کی شہرت نے ناس دانشوروں کو سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمے اور فروخت پر اکسایا ہے۔ ایسی تالیف و تصنیف وشسٹ[۴۹]، یگ وتاپوراں اور سنسکرت کے دیگر کام' فلسفہ' ویدانتا کی شرح کی اساس بن گئے' اور اس کا نام بارق العارفات" رکھا گیا جسے فیضی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ پوری طرح واضح ہے کہ شاہجہاں کے ریں انجام پایا۔

سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم کرانے پر مبنی اکبر کا کامیاب منصوبہ قابل توجہ ہے کسی بھی مترجم کا سنسکرت مطالعہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ فیضی کو سنسکرت بہت سطحی آتی تھی اس طرح سنسکرت کے علما فارسی زبان کے علما کے لیے اصلی تن کی وضاحت کرتے اور وہ انھیں ادبی زبان میں لکھتے تھے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سنسکرت کے کچھ دانشور اصلی متن کے مشکلات کی تفصیلات فارسی میں بیان کر سکتے تھے۔ مترجمین کی اکثر میں شامل تھے۔ مزید یہ کہ فارسی ی صوفیانہ اصطلاحات نے اپنے تراجم کو بامفہوم بنانے میں بہت حد تک مترجمین کی مدد کی ہے۔ فیضی، ابوالفضل' نقیب خان اور فتح اللہ شیرازی کے سوا، کوئی مسلمان مترجم اصلی متون کی جمع آوری میں شریک و سہیم نہیں تھا لاشک بدایونی ایک بہترین مترجم تھے مگر انھوں نے اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے دیکھا تھا کہ سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمہ کا کام، واضح طور پر اسلام کے سلسلے میں خیانت کرنے کے مترادف ہے لہٰذا جب بھی انھیں کسی کام کی تجویز پیش کی جاتی وہ بڑی تلخی سے جو ان کی پریشانی کی مظہر تھی مسترد کر دیتے تھے اور ہر وقت خداوند عالم سے اس کی مغفرت طلب کرتے تھے کہ خود کو پست ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ترجمے میں شریک کیا ہے۔ وہ "مہابھارت" کے ترجمے کے بارے میں اپنے مجموعی خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

مشتمل ہے۔ بہرحال وہ قارئین سے کتاب کے اس اہم حصے پر توجہ دینے کی سفارش کرتا ہے نہ کہ داستان پردازی پر چھٹے (حصے) کے پروان میں بھیشم (BHISHMA) کی فلسفیانہ، سیاسی، روحانی اور معنوی تعلیم، ابوالفضل کے لئے بڑی دلچسپ تھی۔ البتہ اس نے محسوس کیا کہ مترجمین اس حصے میں یکساں انصاف کرنے پر قادر نہیں تھے اور اس کی خواہش تھی کہ عرب و یونان کے روشن فکر مفکرین کے نظریات کے تحت کام کا جائزہ لیا جائے لیکن اس بات کے ذکر کے لئے اس نے "دور و دراز" اور اکتا دینے والا مقدمہ لکھا ہے۔[۳۳]

یہ صحیح طور پر واضح نہیں ہے کہ "مہابھارت" کے اتنے متون میں جو مختلف جگہوں سے حاصل ہوئے ہیں، مترجمین نے کس متن سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح یوں معلوم دیتا ہے کہ انھوں نے آگرہ میں متداول متن سے استفادہ کیا ہوگا بہرحال جب پونے کے بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین نے "مہابھارت" کے قلمی نسخوں کی جمع آوری اور مقابلے کا کام شروع کیا تو انھیں سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک کے ایسے نسخے ملے جن کی تاریخ تحریر کی تعداد سولہ (مختلف تاریخ) تھی

قدیم ترین نسخہ وہ نیپالی نسخہ تھا جو ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء سے متعلق تھا ۱۵۱۹ء اور ۱۵۲۸ء میں دو دیگر نسخوں کی نسخہ برداری ہوئی تھی[۳۴] چوتھا نسخہ ۱۵۹۰ء سے متعلق تھا جو فارسی ترجمے کے بعد مرتب و مکمل ہوا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "مہابھارت" کا فارسی ترجمہ متن کی شناخت کے اعتبار سے ایک بڑی مدد ہے اس لئے کہ اس متن کے بارے میں جس سے اس میں کام لیا گیا ہے۔ ایک نظریہ ہاتھ آتا ہے۔

راماین :-

۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں اکبر کے حکم پر عبدالقادر بدایونی کو راماین کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی گئی اور وہ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔ مذہبی تعبیرات کے سلسلے میں دیگر اشخاص سے مدد حاصل کرنے کے سوا ایسا لگتا ہے کہ خود بدایونی نے اس مہم کو سر کیا ہے۔ یہاں بھی عبدالقادر بدایونی محسوس کرتے ہیں کہ ایک عالمی مقابلے (مجادلے) کی جہت یہاں داستان میں ان کے عقیدہ و احساس کے مدمقابل ہیں۔

"در عمر این طایفه و هندوان، آن است که عالم قدیم است و هیچ گاه از نوع بشر خالی نیست و از واقعه [illegible] سال گذشته و به وجود این آدم ابوالبشر که از خلقت او هفت هزار سال گذشته قائل نیستند و ظاهر این است که این واقعات یا راست نیست و افسانه گوئی است و خیال محض چون شاه نامه و قصه امیر حمزه [illegible] بوده"[۳۵]

حکا ابوالفضل کی نظر میں راماین کی فلسفیانہ تعلیم بہت زیادہ ثقافتی اہمیت کی حامل ہے ترجمہ کا مسودہ، ستر جدوں سے

۔تھا۔ لیکن مکمل متن ایک سو بیس جزو پر مشتمل تھا۔ بدایونی کو حکم ملا کہ جیسا کہ "مصنفین کی رسم" ہے ایک مقدمہ
ں۔ اسی طرح جیسا کہ ابوالفضل نے "مہابھارت" کا مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ مقدمہ نعت حضرت
ے بغیر لکھا جانا چاہیئے اور یہ ان کے لئے مشکل تھا جس سے انھوں نے صرف نظر کر لیا۔[۴۶]

"ہری وامسا پوران" مہابھارت کا تکملہ یا انیسواں پران کا ترجمہ فارسی گو شاعر فرزانہ ملا شیری نے کیا۔[۴۷]
ہیکی (وال میکی) کی سنسکرت کتاب "یوگ وششٹ" کے ترجمہ کی نسبت معمولاً فیضی سے دیدی گئی ہے۔ لیکن
لفضل اسے اکبر کی زیر نگرانی ہونے والے تراجم کے ذیل میں نہیں سمجھتا ہے۔ اس کا مصور نسخہ جس کا سال ۱۶۰۲ء
ہے کتب خانہ چسٹر بٹی ڈبلن میں محفوظ ہے۔ اس کی تصویروں پر اکبر کے عہد کے مصوروں کے دستخط ہیں۔[۴۸] اگر چہ ہم یقین
ے ساتھ ترجمے کو فیضی سے منسوب نہیں کر سکتے لیکن سنسکرت کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے اس کی شہرت نے
اشناس دانشوروں کو سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمے اور فروخت پر اکسایا ہے۔ ایسی تالیف و تصنیف،
یوگ وششٹ،[۴۹] یگ وتا پوراں اور سنسکرت کے دیگر کام، فلسفہ، ویدانتا کی شرح کی اساس بن گئے اور اس کا نام
"شارق العارفات" رکھا گیا جسے فیضی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ پوری طرح واضح ہے کہ شاہجہاں کے
دور میں انجام پایا۔

سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم کرانے پر بھی اکبر کا کامیاب منصوبہ قابل توجہ ہے کسی بھی مترجم کا سنسکرت
کا مطالعہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ فیضی کو سنسکرت بہت سطحی آتی تھی اس طرح سنسکرت کے علما و فارسی زبان کے علما کے لیے اصلی
متن کی وضاحت کرتے اور وہ انھیں ادبی زبان میں لکھتے تھے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سنسکرت کے کچھ دانشور
واصلی متن کے مشکلات کی تفصیل فارسی میں بیان کر سکتے تھے مترجمین کی انجمن میں شامل تھے۔ مزید یہ کہ فارسی
کی صوفیانہ اصطلاحات نے اپنے تراجم کو با مفہوم بنانے میں بہت حد تک مترجمین کی مدد کی ہے۔ فیضی، ابوالفضل،
نقیب خان اور فتح اللہ شیرازی کے سوا کوئی مسلمان مترجم اصلی متون کی جمع آوری میں شریک و سہیم نہیں تھا۔ ملا
بدایونی ایک بہترین مترجم تھے مگر انھوں نے اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس سلئے انھوں نے
دیکھا تھا کہ سنسکرت کے قدیم متون کے ترجمہ کا کام واضح طور پر اسلام کے سلسلے میں خیانت کرنے کے مترادف ہے
لہذا جب بھی انھیں کسی کام کی تحویر پیش کی جاتی وہ بڑی تلخی سے جو ان کی پریشانی کی مظہر تھی مسترد کر دیتے تھے
اور ہر وقت خداوند عالم سے اس کی مغفرت طلب کرتے تھے کہ خود کو بہت ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ترجمے میں
شریک کیا ہے۔ وہ "مہابھارت" کے ترجمے کے بارے میں اپنے مجموعی خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

" ہمہ آن دانشورانی کہ شارحین و مترجمین این اثر بودند بہ خاطر اعمال شان در پی مرگ باز خواست می شوند، مانند یاری دہندگان "کردھا" و "پندوھا"۔ "

" لیکن جو ابھی زندہ ہیں خدا انھیں نجات دے، انھیں بخش دے اور ان کی توبہ قبول کرلے۔ جو خدا پر یقین رکھتے تھے اور بعد میں مشرک ہو گئے اگرچہ انھیں شرک پر مجبور کیا گیا تھا اور ان کے دل ایمان پر برقرار تھے۔ درحقیقت وہ قصوروار نہیں اور بلاشک پروردگار بخشندہ مہربان ہے۔ " [۵۰]

بدایونی ترجمے کی تکمیل کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے بعد پھر یوں گویا ہوتے ہیں:

" و از آن نامۂ سیاہ رزمنامہ، کہ چون نامۂ عمر من تباہ است پناہ بہ خدا می برم، نقل کفر کفر نیست و کلمۂ رد کفری خوانم چہ می ترسم کہ مبادا این نسخہ کہ ہمہ بہ کرہ و حسب الامر نوشتہ شدہ نفرین بار آرد۔ " [۵۱]

ایک بار ایک شخص نے حاجی سلطان تھانیسری سے "مہابھارت" کے ترجمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جو چیز دس ہزار سال پہلے شناخت کی گئی اور اس وقت قابل فہم تھی، میں نے موجودہ زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ [۵۲] ملا شیری نے محسوس کیا کہ مہابھارت کی دوراز کار اور خوارق العادات داستانیں خوف و وحشت میں مبتلا شخص کی خیال بافیوں سے مشابہ ہیں۔ [۵۳] بالفاظ دیگر درواقع فیضی اور ابوالفضل اس پروژے کے اصلی حامیوں میں ہیں۔ چنانچہ فیضی نے مہابھارت کے دو پروان کا آزاد منظوم ترجمہ کیا اور پھر اسے منثور عطا کیا۔ اس نے اسی طرح چار ہزار اشعار کی ایک رزمیہ مثنوی "نل دمن" کہی۔ اس میں بیشارا یا مالوا کے بادشاہ نالا اور بادشاہ ویدبا کی بیٹی دمیانتی کی عشقیہ داستان پیش کی گئی ہے۔

درحقیقت "نل دمن" کی تصنیف "خمسۂ نظامی گنجوی" (۵۳۵-۶۰۵ھ/۱۱۴۱-۱۲۰۹ء) کی تقلید ایک خمسہ لکھنے کے پروگرام کا حصہ تھی۔ اس نے ایک ساتھ پانچ مثنویاں لکھنا شروع کیا اور ہر ایک کے کچھ حصے مکمل کر "نل دمن" چار ماہ میں پوری کی اور اوّل دی ماہ سال ۳۹ الٰہی مطابق ۱۱ دسمبر ۱۵۹۴ء کو اکبر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ [۵۴] بلاشک یہ مثنویاں جو کچھ تین سو سال قبل امیر خسرو دہلوی نے لیا تھا اس سے مشابہ ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیق ہے کہ ہندستان کے کم ہی شاعر اس کی تصنیف میں کامیاب ہوئے ہیں۔ [۵۵] یہ کام غیر ترجمہ شدہ کاموں کا ہے لیکن داستان کے پیش نظر اس کی تکمیل مہابھارت کے ترجمے کے بغیر ناممکن تھی۔ فیضی کی نل دمن کا آغاز اسم نکتہ حمد ست بعد از کرم کی نعت اور حمد و ستایش اور روایتی طور پر دانشِ ہوا کی بحث ہے۔ بدایونی کہتے ہیں

"ونزدیک به موت، به مبالغه والحاح بعضی از آشنایان بیتی چند در نعت و معراج حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نوشتہ درج کرد (در خاتمۂ کتاب نلدمن)۔"[۵۵]

فیضی کا رسول اکرمؐ کی ستائش کرنا بعد میں اضافہ شدہ کاموں کا جز نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان مطالب کے لکھنے کی کوشش اس کے ابتدا اور خاتمے کی حیثیت رکھتی ہے اور بہرحال یہ تصنیف، ہندو اور مسلمان علما کے ذریعے ہندو موضوعات و مطالب پر ہند کے شعری آثار کی تدوین کے لئے ایک نمونہ تھی۔

اکبر کے دور حکومت میں سنسکرت کے جتنے ترجمے ہوئے درباری مصوروں نے ان کے نقش و نگار بنائے اور راجپوت اور مغل سرداروں نے بھی اپنے ذاتی کتب خانوں کے لیے مصور نسخے تیار کرائے تھے مہابھارت کا ایک نسخہ جو شاہی کتب خانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، اس وقت مہاراجہ جے پور کے پاس ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس نسخے کی تصویریں ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء کے برسوں کے دوران تیار کی گئی ہیں[۵۶]۔ چنانچہ رامائن کا ایک مصور نسخہ جو اکبر کے اصل نسخے کی اساس پر، ۱۰۰۷ھ/۹۹-۱۵۹۸ء میں عبدالرحیم خانخاناں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اب بھی واشنگٹن کی فریر گیلری میں محفوظ ہے[۵۷]۔ بلاشک تصویریں موضوعات کو جذب کرنے میں کامیاب ہیں۔

اکبر کے دور کے سنسکرت تراجم نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی (گیارہویں اور بارہویں ہجری) میں ہند کے فارسی زبان کے دانشوروں کی حوصلہ افزائی اور تقویت کے لئے ثقافتی میدان فراہم کیا۔ جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور میں سنسکرت کی کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ان کاموں کے علاوہ ہے جو دارا شکوہ نے فارسی میں کئے ہیں۔ عبدالرحمٰن چشتی (متوفی: ۱۶۸۳ء/۱۰۹۴ھ) نے ہندی فلسفے میں خلقت اور عالم وجود کی تخلیق کو اپنی کتاب "مرأۃ المخلوقات"[۵۸] میں بیان کیا اور "مرأۃ الحقائق"[۵۹] میں بھگوت گیتا سے اسلامی تفسیر کی۔ مثنوی "راما اور سیتا" بھی بعض آزاد تراجم کی جمع بندی سے تیار کی گئی تھی اور GIDHAR KAYATH اور شیخ سعدالدولہ کے اہم مطالب در واقع عہد جہانگیری کی رونق اور جلوہ افروزی کا باعث تھے۔ سترہویں صدی کے وسط دور تلسی داس نے ترجموں کی طرف خصوصی توجہ کی اور خود بھی رامائن کا ایک تازہ ترجمہ کیا۔

کچھ کام ہندو علوم و فلسفے اور فائن آرٹس کے موضوعات پر بھی کئے گئے جن میں سب سے اہم "تحفۃ الہند" ہے جسے اورنگ زیب کے دور میں میرزا محمد بن فخرالدین محمد نے مدون کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کے بیٹے شہزادہ محمد معزالدین کے لئے KUKUL TASH KHAN کی خواہش پر لکھی گئی۔ شہزادہ محمد معزالدین نے جہاندار شاہ نام سے گیارہ مہینوں تک حکمرانی کی۔[۶۰]

فارسی نسخوں پر ابتدا اور انتہا میں موجود یادداشتیں نشاندہی کرتی ہیں کہ ہندو اور مسلمان ـــــ دونوں ہی نسخہ برداری، مصوری اور نسخوں کی خریداری میں شریک تھے۔ ہندوؤں نے خاص کر ان ہندوؤں نے جو دفاتر میں امور کی دیکھ بھال کرتے تھے، مثلاً کایستھوں اور برہمنوں نے اس کام کے سلسلے میں اپنی حد درجہ دلچسپی دکھائی ہے۔ ان ترجموں نے انھیں اپنے مذہب کی روح کو سمجھنے میں مدد کی۔ مسلمانوں کے مہذب طبقے میں جن کو علما کے پاس ہندوؤں کی مذہبی کتابیں موجود تھیں۔ بعد میں یعنی بیسویں صدی کے اوائل میں صوبۂ اتر پردیش کے کائستھ گھرانوں سے ہمیشہ ہی ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے ایک دو فارسی ترجمے مل جاتے تھے۔

راج ترنگنی :- (RAJATARANGINI)

اکبر صرف مذہبی کتابوں کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ تاریخی کاموں پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ راج ترنگنی کشمیر کی تاریخ ہے جسے کلہن نے ۱۱۴۸ اور ۱۱۴۹ء کے برسوں میں تالیف کیا۔ اس کتاب کے موضوعات نے اکبر کو کشمیر کی قدیم تاریخ و ثقافت کی طرف مائل کیا۔ کشمیر ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں شاہی حکومت کا جز بن گیا تھا۔ شاہ محمد شاہ آبادی جو ایک عرصے تک پنجاب کے صدر رہ چکے تھے، اس کتاب کا فارسی ترجمہ کرنے کیلئے منتخب کیا گیا۔[۹۱] جیسا کہ ابوالفضل کہتا ہے کہ کشمیری زبان سے ترجمہ ہوا ہے۔[۹۲] اور یوں معلوم دیتا ہے کہ سنسکرت سے کشمیری میں اس کا ترجمہ پہلا ہر سلطان زین العابدین کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کے بعد بدایونی کو اسے ادبی زبان میں لکھنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے اسے ۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں دو ماہ میں مکمل کیا۔[۹۳] (تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں مقدمہ راج ترنگنی، محمد صابر آفاقی شائع کردہ پاکستان

کتھا سرت ساگر :- (KATHASARIT SAGAR)

بدایونی نے ۱۰۰۳ھ/۹۵-۱۵۹۴ء میں سنسکرت داستانوں کے ایک مجموعے کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ حصہ تھا جو تقریباً سلطان زین العابدین کے عہد میں "بحرالاسمار" کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے آخری حصے کے فارسی ترجمے کا کام، جو رہ گیا تھا سب سے پہلے بدایونی کو سونپا گیا۔ انھوں نے اسے پانچ مہینے میں مکمل کیا۔ ایک رات جب بدایونی ترجمے میں مشغول تھے، اکبر نے انھیں اپنی آرام گاہ میں طلب کیا اور صبح تک اس کتاب کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ آخر میں پہلی جلد کو قدیم فارسی سے موجودہ فارسی میں منتقل کرنے کا دیا۔ بدایونی کو امید تھی کہ دو تین مہینے میں وہ اس کام کو کر ڈالیں گے، لیکن "منتخب التواریخ" میں انھوں نے اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں کوئی واضح بات نہیں لکھی ہے۔ اصلی متن کا عنوان بھی انھوں نے نہیں رکھا ہے۔[۹۵] "منتخب التواریخ" جلد دوم کا مترجم لاؤ (LOWE) کہتا ہے کہ یہ کتاب راج ترنگینی ہے۔[۹۶] لیکن

اس کا ترجمہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس کے دوبارہ ترجمے کی بات کچھ عجیب سی ہے۔ بہرحال احتمال ہے کہ وہ کتاب "کتھا سرت ساگر" ہی ہو۔

کلیلہ و دمنہ :۔

سنسکرت کی یہ کتاب ہندوستانی شہزادوں کے لیے ایک آئینہ (یا نصب العین) کے طور پر لکھی گئی تھی جو مملکت کے امور میں ان کی رہنمائی کرے۔ یہ کتاب فسانوی طرز میں حیوانات کے بارے میں ہے جس کا عہد اکبر سے برسوں قبل عربی زبان میں کئی بار ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی میں اس کا پہلا مکمل ترجمہ (البتہ عربی سے) نظام الدین المعالی نصر اللہ بن محمد نے ۵۳۸ھ میں کیا تھا اور حسین واعظ کاشفی نے اسے دوبارہ لکھا لیکن سادگی کی جگہ انھوں نے طوالت اور لفاظی سے کام لیا۔ اکبر نے بھی ابوالفضل کو سادہ فارسی زبان میں اسے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا اور ابوالفضل نے اسے سولہ فصلوں اور ایک خاتمہ کے ساتھ ۱۵، شعبان ۹۹۷ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۵۸۸ء کو "عیار دانش" کے نام سے مکمل کیا۔[97] "اکبر نامہ" کے سیاسی مکتوبات کے پیچیدہ اور طویل جملوں کے باوجود اس کتاب میں اس کے مختصر جملے اور سادہ نثر نویسی قابل تعریف ہے۔

نجوم و ریاضیات :۔

تاریخی اور مذہبی موضوعات کے علاوہ اکبر کو ریاضیات اور نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ امیر فتح اللہ شیرازی اور شیخ ابوالفضل نے نجوم سے متعلق تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ کشن جوشی (KISHN JOSHI)، گنگا دھر (GANGA DHAR)، اور مہیش مہانند (MAHESH MAHAMAND) جن کا ذکر "آئین اکبری" میں آیا ہے[98] لگتا ہے کہ یہ نجوم کی کتابوں کے مصنفین ہیں۔[99] باسکراچاریہ (BASKARACHARYA) کی تخلیق "لیلاوتی" کا ترجمہ فیضی نے کیا جس کا موضوع حساب و ہندسہ ہے۔ فیضی نے اس کا ترجمہ ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں مکمل کیا[100]

عربی تالیفات :۔

اگرچہ سنسکرت کے کاموں نے کافی حد تک اکبر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رکھی تھی لیکن اکبر نے عربی تالیفات کو فراموش نہیں کیا حکیم ہمام نے کتاب "معجم البلدان" کا ذکر اکبر سے کیا۔ یہ ایک قسم کا انسائیکلو ہے اور اس کا موضوع جغرافیا اور اس میں دنیا کے عجائبات سے متعلق کہانیاں ہیں۔ اکبر نے جس کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو چکی تھی، تقریباً بارہ افراد کو اس کے ترجمے پر مامور کیا۔ ان میں ملا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور مولانا عبدالقادر بدایونی کا نام قابل ذکر ہے۔[101]

ربیع الاول ۱۰۰۱ھ مطابق دسمبر ۱۵۹۲ء میں بدایونی نے شیخ ابوالفضل کے مشورے پر ترجمہ جامع رشیدی کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ یہ کتاب کافی ضخیم ہے اور اس میں پیغمبر، بنی امیہ اور خلفائے عباسی کا ذکر ہے۔ عربی تالیفات میں جن کتابوں کو ترجمے کے لئے منتخب کیا گیا تھا صرف وہ کتابیں اکبر کی دلچسپی کا مرکز بنی تھیں جو تاریخ اور علوم کے بارے میں تھیں۔

ترکی :-

"بابرنامہ" جو ترکی چغتائی میں تحریر کیا گیا تھا اور جس میں مرکزی ایشیا، کابل اور ہندوستان کے بارے میں اہم معلومات موجود ہیں، دراصل بابر کی سوانح حیات ہے جس کا مؤلف وہ خود ہے۔ ضیاءالدین خوافی نے ۹۹۸ھ مطابق ۱۵۸۹ء میں اس کتاب کا فارسی ترجمہ کیا۔ میرزا پایندہ حسن غزنوی نے بہروز خان کے اصرار پر اس کتاب کا ایک اور ترجمہ شروع کیا۔ یہ بہروز خان وہی ہیں جنھیں بعد میں اکبر نے "نورنگ خان" کا خطاب عطا کیا تھا وہ جوناگڑھ کی حکمرانی کے دوران ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۳ء میں فوت ہوئے۔ لیکن میرزا پایندہ نے چھ سال بلکہ ساتویں سال کے اوائل تک ترجمے کا کام مکمل نہیں کیا۔ اس کے بعد محمد قلی مغل حصاری نے اس کام کو سنبھالا اور ۹۳۵ھ مطابق ۲۹-۱۵۲۸ء تک کا ترجمہ کیا۔ بہرحال اکبر نے آخر میں عبدالرحیم خانخاناں کو اس کے ترجمے کا کام مکمل کرنے کا حکم دیا اور خانخاناں نے ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء میں اس کام کو مکمل کیا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے ۲۴ نومبر ۱۵۸۹ء کو اس وقت یہ ترجمہ اس کی خدمت میں پیش کیا جب سلطان کابل سے واپس آرہا تھا اس طرح خانخاناں کو پہلے کے تمام مترجمین پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

عیسائیت :

اکبر کے دارالترجمہ میں عیسائیت سے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا تھا، جبکہ اکبر کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ "فادر جیروم خاویر" نے جو پانچ مئی ۱۵۹۵ء میں لاہور کے تیسرے عیسائی مبلغ کی حیثیت سے دربار میں پہنچے اور آخر وقت تک اکبر کے ساتھ رہے، تقریباً سات سال تک فارسی زبان سیکھی اور احتمالاً بائبل سے متعلق کتابوں کے فارسی ترجمے کئے۔ انھوں نے پرتگالی زبان میں انجیلوں کی اساس پر ایک کتاب لکھی پھر اکبر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری کے تعاون سے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "مرأت القدس" یا "داستان مسیح" رکھا۔ یہ کام ۱۶۰۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کام نے حواریوں کی زندگی کے بارے میں اکبر کی دلچسپی بڑھا دی اور اس نے فادر خاویر کو ان کی سوانح لکھنے کا کام سونپا۔ فادر خاویر نے پہلے تو پرتگالی زبان میں لکھا پھر مولانا عبدالستار کے تعاون سے فارسی میں منتقل کیا جس کا نام "داستان احوال حواریوں" رکھا گیا۔ اس میں پطرس، شاؤل (پولس)، آندرو، یعقوب، یوحنا، تھامس، فلپ، بارتولمی، متی، شمعون، یہودا اور برنابا کے

حالات ہیں۔ اول الذکر چار افراد کے حالات اکبر کی وفات سے پہلے ہی لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کئے جا چکے تھے در بقیہ ۱۰۱۶ھ مطابق ۱۶۰۷ء میں لاہور میں اور اس کے بعد ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں آگرے میں جہانگیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

مناظرے کی ایک بڑی کتاب " آئینۂ حق نما " ہے جسے فادر خاویر نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں (عہد اکبر میں) شروع کیا اور جہانگیر کے عہد میں مکمل کیا اور اس کی خدمت میں پیش کیا۔[47] مالا گان کے بقول " یہ رسالہ اس گفتگو کا ماحصل ہے جو ایک پادری اور ایک آزاد منش مفکر یا فلسفی کے درمیان بقول مؤلف، دربار میں ہوئی تھی"[48] کتاب کی نسبتاً زیادہ ضخامت نے فادر خاویر کو " منتخب آئینۂ حق نما " کے نام سے اس کا خلاصہ کرنے پر مجبور کیا۔[49] ایسا لگتا ہے کہ اس کا مآخذ کتاب "دبستان المذاہب" ہے۔ اس لئے کہ اس میں مؤلف نے مختلف فرقوں کے پیرو کاروں کی زبانی ایک بحث پیش کی ہے اُسی طرح جیسا کہ اکبر کے دربار میں ان مسائل پر بحث کی روایت تھی[50]

ثمرۃ الفلاسفہ :-

ادیان و مذاہب، فلسفہ اور تاریخ سے اکبر کی گہری دلچسپی نے اسے سرزمین مغرب کے فلسفے کی جانب متوجہ کیا۔ وہ بادشاہ پرتگال کے نام ایک خط میں دانشوروں کے اُس وفد کو بھیجے کی درخواست کرتا ہے جو دربار پرتگال میں مذہب اور تاریخی موضوعات پر ہونے والی بحثوں میں غیر جانبداری سے شرکت کرتے تھے۔ اس نے ان پادریوں کی بتدریج حوصلہ افزائی کی جن کے بارے میں توقع کی جاتی تھی کہ مورد تہمت وافترا قرار پائیں گے اور عبدالستار نے پرتگالی زبان سیکھ کر اس زبان سے اس کے لئے کتابوں کے ترجمے کئے۔ بعد میں اس محرک کے نتیجے میں پرتگالی زبان سے ترجمے کا کام شروع ہوا جن میں یونان، روم، اور یونانی فلسفیوں کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں اور اسے " ثمرۃ الفاسفہ[51] " کا نام دیا گیا ہے۔

بہرحال اکبر کی زیر نگرانی ہونے والے تراجم نے ہندستان میں فارسی زبان میں ایک نئی روح پھونکی یہ وہ زبان ہے جس نے تقریباً اپنے لئے ایک خصوصیت حاصل کر لی تھی اور اکثر تعلیم یافتہ لوگ اس کی برتری کا احساس کرتے تھے۔ چنانچہ اس زبان کے فلسفیانہ اور اداراتی مفاہیم نے مقامی زبانوں پر برتری حاصل کر لی اور انھیں غنی بنایا۔ مختصر یہ کہ اگر یہ لوگ (علماء و ادباء و مترجمین) نہ ہوتے تو ہندستان کی مغلیہ ثقافت بہت ناچیز ہوتی۔

●●

حواشی

۱۔ "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب"۔ جو تاریخ بناکتی سے مشہور ہے۔ آدم سے لیکر سلطان ابو سعید تک کی ایک عام تاریخ ہے۔ اس کے ساتویں حصے میں سلطان علاء الدین خلجی کے قلم سے ہندوؤں کے بارے میں تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔

۲۔ شہاب الدین عبداللہ معروف بہ حافظ ابرو کا مجموعۂ حافظ ابرو بلعمی کے ترجمہ تاریخ طبری، رشید الدین کی "جامع التواریخ" اور نظامی شامی کے "ظفرنامہ" پر مشتمل ہے۔

۳۔ ماخذ فوق

۴۔ "جوامع الکلام" (مخطوطہ برٹش میوزیم)

۵۔ خواجہ نظام الدین احمد "طبقات اکبری" (کلکتہ ۱۹۱۳ء) جلد اول ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

۶۔ I.O London. Ms.1262

۷۔ SACHAU, Alberuni's India, Preface P.20

۸۔ ابوالفضل علامی: آئین اکبری جلد اول ص ۷۶

۹۔ شاہ طہماسپ صفوی (۹۸۴-۹۳۰ھ / ۱۵۷۶-۱۵۲۴ء) کے دربار کا معروف مصور۔ ایران میں اپنی اقامت کے دوران ہمایوں نے میر مصور کو اپنے ساتھ کرنے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ کابل میں ہمایوں سے ملا ہو۔ اس کا بیٹا میر سید علی اکبر کے دور کا اہم مصور تھا اور خود کو ایک ماہر مصور کی حیثیت سے پیش کیا۔

۱۰۔ عبدالصمد کو بھی ہمایوں نے دعوت دی تھی اور وہ کابل میں اس سے جا ملا۔ اس کو مصوری کے لیے اکبر کا مربی بنایا گیا۔ ایک مصوری کا نمونہ جس میں اکبر، ہمایوں کو اپنی مصوری دکھلا رہا ہے، تہران کے "کاخ گلستان" میں محفوظ ہے۔ جس کے بارے میں احتمال ہے کہ ہمایوں کی موت سنہ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کچھ ہی عرصہ قبل بنایا گیا ہو۔
Barret, Douglas and Basil Grey Indian Painting, p 78

۱۱۔ محمد عارف قندھاری: "تاریخ اکبری" رامپور (ہندوستان) ۱۹۶۲ء، ص ۴۶-۴۵

۱۲۔ عبدالقادر بدایونی: "منتخب التواریخ" (کلکتہ ۱۸۶۵ء) جلد دوم، ص ۳۲۰۔ اصل متن یوں ہے: "و کمرۂ چند خواندن و نوشتن آں را ہبا عبارت، عادت عظیم می دانند و از مسلمانان بیجان می دارند و باعث آں ایں بود کہ تا بنامہ و قصۂ امیر حمزہ را بہ ہفدہ جلد در مدت پانزدہ سال نویسانیدند و زر بسیار در تصویر آں خرچ شد۔ ہمچنین قصہ ابو مسلم و جامع الحکایات و غیر آں را مکرر شنیدند۔"

۱۳۔ بدایونی - "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۲۸۸

۱۴۔ وہی ماخذ۔ ص ۳۰۳۔ "درایں ایام ترجمہ کتاب حیوۃ الحیوان را کہ نقیب خاں اکثر اوقات در ملازمت می خواندند و معانی آں خاطر نشان می ساخت، پیش ابوالفضل فرمودند و شیخ مبارک آں را مترجم۔ فارسی ساخت۔"

۱۵۔ بدایونی۔ "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۳۲۰ "۔ و فرمودند تا "سیدا تھربن" (اتھروید) را کہ کتاب چہارم است

در چہار کتب مشہور اہل ہند کہ بعضی احکام آن موافق ملت اسلام است، تغییر کنند و فقرآن را از زبان ہندی بفارسی ترجمہ سازند"
Maclagan, E - The Jesuits and the Great Mogul, London, 1932, p.213

۱۷۔ ابوالفضل علامی: مکاتبات علامی (دہلی ۱۸۴۶ء) ص ۳۰-۳۸
۱۸۔ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۲۶۰۔ "... و شیخ ابوالفضل در ترجمۂ آن مامور گشت و بجای "بسم اللہ" این فقرہ بود کہ "ای نام وی ژر و کرسیتو" یعنی ای آن کہ نام تو مہربان و بسیار بخش است و شیخ فیضی مصرع دوم را چنین گفت "سبحانک لا سواک یا ہو"
۱۹۔ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۳۴۴۔ مکتب خانہ کے موضوع پر جدید محققین نے توجہ نہیں دی ہے۔ "... وحمان خانان را در وقت رسیدن مکتب خانہ کہ در دیوان خانۂ فتح پور برای ترجمہ گری معین بود یک باری دیدہ واو سزودی بہ جاگیرات مرخص شد۔ م
۲۰۔ بدایونی: "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲۔
۲۱۔ میر غیاث الدین علی قزوینی مشہور بہ نقیب خان (مترجم): مہابھارت بہ تصحیح جلالی نائینی و ڈاکٹر شکلا (تہران۔ انتشارات طہوری ۱۳۵۸ھ) مقدمۂ ابوالفضل علامی، ص ۴
۲۲۔ وہی ماخذ
۲۳۔ "مہابھارت" مقدمۂ ابوالفضل ص ۱۹۔ "ایضاً متعصبان کیش و پیشوایان اہل تقلید ہندرا بر این بود عقیدہ کہ بالا تر از اندازہ است و مزخرفات معتقدات خود را چہ از روی بی تمیزی وجہ از سر بی انصافی مسرہ از نقص دانستہ راہ تقلید سپری بردہ و بسادہ لوحان مقدمہ چند خاطر نشان کردہ از تحقیق مطالب باز داشتہ در اعتقادات باطلہ راسخ می سازند و حسبان دین احمدی را کہ بر شرایف مطالب و نفایس علوم آنہا اطلاعی نیست، این طایفہ را صاحب ترہات محض داشتہ بحد قیاس انکار این طایفہ می نمایند۔ بنا بر علی ہذا، عقل خردہ دان خواہش کہ کتاب مہابھارت کہ سرعت و بیش اکثر مطالب این طایفہ اشتمال دارد، بعبارت روشن ترجمہ کردہ آید تا منکران عنان انکار خود گرفتہ از بی اعتدالی باز آیند و معتقدان سادہ لوح در اعتقادات خود بہ قدری شرمگین شدہ طالب حق شوند ایضاً عوام الناس مسلمانان کہ اوراق کتب آسمانی و دینی را یک مطالعہ کردہ و دیدہ عبرت بین خود را بر تواریخ مختلفہ روزگار و احاطہ یان و بدیان و غیرہ لک تکشودہ اند (۲)"
۲۴۔ بقول بدایونی۔ ہندو یا مطالب مدوّن مذہبی خود را از مسلمانان پنہان می داشتند "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲
۲۵۔ حضرت محمد بن جعفر صادق، متولد ۸۳ یا ۸۰ ہجری ششمین امام شیعیان
۲۶۔ یہاں شناسی اور فلسفۂ اشتمام گیتی کے نظریات کے لیے "رسائل اخوان الصفا" بیروت، ابن سینا اور ابن عربی کی تالیفات سے رجوع کریں۔ اور ڈاکٹر سید حسین نصر کے مقدمہ برنگاہ جہان شناسی اسلامی کو دیکھیں
۲۷۔ مہابھارت مقدمۂ ابوالفضل ص ۱۹
۲۸۔ مہابھارت مقدمۂ ابوالفضل ص ۱۹ (مہابھارت کے تحت انگریزی مضمون سے کچھ زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں)
۲۹۔ وہی ماخذ ص ۲۰
۳۰۔ بدایونی۔ منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۳۲ ۳۲۱ یہاں بھی اصل انگریزی متن سے چند سطریں زیادہ لکھی ہیں۔
۳۱۔ INDIA OFFICE MS 761
۳۲۔ قرآن فقرہ ۲۵۶
۳۳۔ بدایونی "منتخب التواریخ" جلد دوم ص ۳۲۱
۳۴۔ تو وہ ایسے موقع میں قریب سے سوال و جواب کرتے ہیں
۳۵۔ بدایونی "منتخب التواریخ" ص ۲۹۹

۳۶ جیا سارت ۔ مقدمۂ ابوالفضل، ص ۲۰

۳۷ ہندؤں کے ما قبل ودا، جو خالق اور ہندؤں کے تین خداؤں یعنی برہما، شیوا اور وشنو میں سے پہلا خدا ہے۔

WALKER, BENJAMIN HINDU WORLD (LONDON) I P.P 164-66

۳۸ جیا سارت ۔ مقدمۂ ابوالفضل، ص ۲۳۔

۳۹ ابوالفضل علامی " اکبر نامہ" جلد اول (کلکتہ ۸۰ - ۱۸۷۳ء) ص ۵۰۔

۴۰ جیا سارت مقدمۂ ابوالفضل۔ ص ۳۴

۴۱ وہ تاکید کرتا ہے کہ انسانی حالات کے اختلاف کو لوگوں کے ذہن میں غلط فہمی اور شکوک و شبہات کا باعث نہیں ہونا چاہیئے اس لیے ماضی کے تاریخی حوادث کا عقلی تحلیل و تجزیہ کرنا چاہیئے۔

۴۲ ابوالفضل علامی " آئین اکبری" جلد دوم، ص ۱۳۷۔

۴۳ جیا سارت " مقدمۂ ابوالفضل" ص ۱۷ - ۱۸

۴۴ Sukthankar, Vishnu S The Mahabharatha, I (Poona, 1933) P.VI

۴۵ بدایونی ۔ " منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۲۰

۴۶ ایضا ایضا ایضا ص ۳۲۲ " بسیار مستحس افتاد و چند جزو شدہ ۔ عرض رسانیدم کہ اداول کلاً و یب بعشادہ جزو و مصلاً و بہ تہ تالی صدو میست جزو ستدہ حکم فرمود کہ دیباچہ چنانچہ رسم مصنفین است تحریر بیس و چون اتفاق چنداں ساختت و نیز خطبۂ نعت بایست نوشت اعلاص نمودم" ختم

۴۷ ابوالفضل علامی آئین اکبری، جلد اول، ص ۸۸

۴۸ Barret Douglas and Basil Crey Indian Painting

۴۹ اس کا ترجمہ ملا تقی یاں بی نے شہزادہ سلیم کے لیے عہد اکبر کے اواخر میں کیا تھا ۔ اس کا دوسرا ترجمہ جہانگیر کے حکم پر صوفی تہریف نے کیا جہانگیر اور سترہویں صدی کے دیگر داستان تھے ۔ جیسے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے کہ ذریعے تصوف کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

۵۰ بدایونی منتخب التواریخ جلد دوم، ص ۳۱۲

۵۱ وہی ماخذ ۔ ص ۳۶۶

۵۲ وہی ماخذ جلد سوم ص ۱۱۹

۵۳ CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN INDIA OFFICE 2 Vols

۵۴ ابوالفضل علامی " اکبر نامہ" جلد سوم ص ۲۴۱

۵۵ بدایونی " منتخب التواریخ " جلد دوم، ص ۳۹۶

۵۶ ایضا ایضا جلد سوم ص ۳۰۹

۵۷ Indian Painting, pp.83 84

۵۸ وہی ماخذ ص ۹۶

۵۹ ۹۰-۱۵۸۹ء میں لکھی گئی ۔ اس میں ہندو مسلمانوں کے موضوع پر " مباحثہ" اور تاریخی گفتگو ہے ۔ (فہرست ریو، جلد سوم، مخطوطہ نمبر 1036a

۶۰ فہرست ریو جلد سوم، مخطوطہ نمبر 1044a

۶۱ برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر 1483 یا فہرست ریو جلد سوم مخطوطہ نمبر 1033

۶۲ بدایونی ۔ " منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۰۳

۶۳ ابوالفضل علامی " آئین اکبری" جلد اول، ص ۷۷

٦٤ بدایونی : "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۷۲
٦٥ ایضاً . ایضاً ایضاً ، ص ۴۰۱
٦٦ Lowe, p.415, n.2
٦٧ ابوالفضل علامی: "آئینِ اکبری" جلد اوّل ص ۷۷
٦٨ ایضاً ایضاً ، ص ۷۹
٦٩ CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE INDIA OFFICE, 1968
٧٠ بدایونی۔ "منتخب التواریخ" جلد دوم، ص ۳۷۵
٧١ ایضاً ایضاً
٧٢ STOREY, PP.532-33
٧٣ وہی ماخذ ، ص ۵۳۲
٧٤ ابوالفضل علامی: "اکبر نامہ" جلد سوم، ص ۵۷۰
٧٥ SACHAU AND ETHE, CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE BODLEIAN LIBRARY No.364
٧٦ وہی ماخذ نمبر ۳۶۵ (No.365)
٧٧ BRITISH MUSEUM Ms Harl 5478, Rieu,I,4.
٧٨ The Jesuits and the Great Mogul, p.207
٧٩ British Museum Ms Add-23,58
٨٠ دبستان المذاہب ص ص ۳۱۹، ۳۱۴
٨١ The Jesuits and the Great Mogul, p.204

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو ● من موہن کی باتیں (قرآن مجید کا ترجمہ) مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی۔ ۵۰ روپے ● مرآۃ المستقیم: مولانا آزاد، مرتبہ پروفیسر [illegible] ۳۰ روپے ● مولانا ابوالکلام آزاد کا نادر اخبار پیغام (مکمل فائل)۔ ۱۰۰ روپے ● تصوف برصغیر میں: ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں تصوف پر مطبوعات، نادر اور اہم غیر مطبوعہ مخطوطات پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۵۰ روپے ● طب اسلامی: ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات طب پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۷۵ روپے ● قطعات دلدار (عہد میر و سودا کے صوفی شاعر شاہ دلدار کا کلام)۔ ۵۰ روپے ● یادگار روزگار (تذکرۂ مولانا [illegible]) از سید بدرالحسن (دو حصے ایک جلد میں)۔ ۲۰۰ روپے ● قومی یکجہتی کی روایات: بشمبر ناتھ پانڈے۔ ۵۰ روپے ● ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل از سید حامد۔ ۳۰ روپے ● اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر (از ڈاکٹر اوم پرکاش پرشاد (اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت پر لگائے گئے الزامات کا مدلل اور مفصل جواب)۔ ۵۰ روپے ● مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں: رشید احمد صدیقی۔ ۳۰ روپے ● ایک نادر روزنامچہ (از مولوی ظفر علی اسندیلوی، انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اول تک) تحقیق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ۳۰ روپے ● داستاں میری: از ڈاکٹر اقبال حسین: ہمارے مسلمانوں کی پچھلے سو برسوں کی ادبی، تہذیبی، سماجی تاریخ۔ ۳۰ روپے ● ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کی روشنی میں: (پہلی جلد) آزادی کے بعد علی گڑھ کی کہانی۔ ۱۰ روپے ● فارسی اور ہندوستان: از پروفیسر نذیر احمد۔ ۱۰ روپے ● الناظر لکھنؤ: ۱۹۱۳-۱۹۱۷ (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● ادیب الہ آباد: ۱۹۱۰-۱۹۱۳ (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● صبح امید لکھنؤ: ۱۹۱۸-۱۹۲۱ (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● معیار: قاضی عبدالودود کا رسالہ (مکمل فائل) ۱۹۳۶۔ ۵۰ روپے ● نگار کا جدید نمبر ۱۹۴۳ء۔ ۲۵ روپے ● زبان گجرات: ۱۹۲۶-۲۹ (مکمل فائل)۔ ۵۰ روپے ● پنڈت موتی لال نہرو کا ۱۹۲۰ کا خطبۂ صدارت۔ ۱۰ روپے ● رقعات رشید صدیقی: مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ ۳۰ روپے ● مقدمہ طلسم ہوشربا: ۲۰ روپے ● طلسم ہوشربا مع مقدمہ (آٹھ جلدیں)۔ ۸۰۰ روپے ● ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت: منشی رام سہائے تمنا (علیگ)۔ ۲۰ روپے ● [illegible] احمد کی [illegible]: ۱۰ روپے ● دیوان مصحفی: منتخب [illegible] اسیر۔ ۵۰ روپے ● شخصیات و واقعات جن سے میں متاثر ہوا: سعید احمد۔ ۲۵ روپے ● گیتا اور قرآن: پنڈت سندر لال۔ ۲۵ روپے ● تحفۃ السعداء: خواجہ کمال [illegible] پیشکش حکیم حبیب [illegible] شفا۔ ۲۰ روپے ● بہار اردو لغت: یوسف الدین احمد بلخی۔ ۱۵ روپے ● تواریخ نادر العصر منشی نولکشور، تقدیم ڈاکٹر [illegible]۔ ۲۵ روپے۔

مطبوعات فارسی ● قطعات حسرت: ۱۰ روپے ● کنز التواریخ، شاہ [illegible] کے تاریخی قطعات۔ ۱۰ روپے ● مجمع النفائس: سراج الدین علی خان آرزو۔ ۱۰۰ روپے ● باغ معانی: تذکرۂ شعرائے فارسی (نقش علی)۔ ۳۰ روپے ● صحف ابراہیم: تذکرۂ شعرائے فارسی، علی ابراہیم خان خلیل۔ ۴۰ روپے ● فرہنگ زفان گویا: [illegible] ۵ روپے ● دیوان حافظ (شاہان مغلیہ کے ذاتی نسخے کی عکسی اشاعت)۔ ۲۰۰ روپے۔

مطبوعات ہندی ● من موہن کی باتیں: مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کا ترجمۂ قرآن۔ ۴۰ روپے ● دلدار کے دوہے: ۱۱ویں صدی ہجری کے مشہور صوفی کا کلام۔ ۱۰ روپے ● اورنگ زیب: ایک نئی درشٹی: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد۔ ۱۵ روپے ● بھارت میں قومی ایکتا کی پرمپرائیں: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۵ روپے ● مولانا آزاد کی یاد میں: ۱۵ روپے ● اقبال ہندوستان اور پاکستان: پروفیسر سید حسن احمد۔ ۱۵ روپے ● بھارتیہ راشٹریہ آندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد: ڈاکٹر [illegible]۔ ۲۰ روپے ● سامپردایکتا اور دیش کی ایکتا: ہندو مسلم فسادات کو کیسے روکا جائے (قومی یکجہتی پر سیاسی سماجی دانشوروں کے مقالات کا مجموعہ)۔ ۱۵ روپے ● خدا بخش لائبریری ایک پریچے، لائبریری پر پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریز [illegible] نے ساٹھ سال قبل لکھا تھا جسے اب ترمیم [illegible] کیا گیا ہے۔ ۱۵ روپے

مطبوعات انگریزی ● ایک مشرقی کتب خانہ: ۵ روپے ● اسلام اور ہندوستانی تہذیب: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۱۵ روپے ● عہد سلطنت کے صوفی ادب کا جائزہ: [illegible]۔ ۱۰ روپے ● صوفیا کے مکتوبات اور ملفوظات: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● ملفوظ [illegible]: ڈاکٹر [illegible]۔ ۱۰ روپے ● افکار اسلامی بدلتی دنیا میں: پروفیسر سید وحید الدین۔ ۱۰ روپے ● مجموعۂ مقالات: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● بہار میں اسلام اور مسلمان عہد وسطیٰ میں: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● بہار عہد سلطنت اور مغل دور میں: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۵ روپے ● اسلامی تقویم کی تشکیل نو: ڈاکٹر ہاشم امیر علی۔ ۱۰ روپے ● مشرق و مغرب: پروفیسر [illegible]۔ ۱۰ روپے ● خدا بخش: ۱۰ روپے ● مغل آرٹ: ۱۵ روپے ● حضرت امیر خسرو: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● فارسی ادب [illegible] ہندوستان میں: پروفیسر [illegible] عابدی۔ ۱۰ روپے ● وہابی تحریک اور دوسرے مقالات: [illegible]۔ ۱۵ روپے ● ٹیپو سلطان: [illegible] ● کشمیر: ڈاکٹر [illegible]۔ ۱۵ روپے ● خدا بخش لائبریری میں محفوظ عربی، فارسی، اردو مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ ۳۳ جلدیں، قیمت ہر جلد ۵۰ روپے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

جناح صاحب

محمد علی جناح ملتان کے ایک نومسلم خواجہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو نقلِ وطن کے کاٹھیاواڑ چلا گیا تھا۔ ان کے والد کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے تھے اور وہاں رہ کر تجارت کرتے تھے۔ یہیں محمد علی ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بچپن سے تنہائی پسند، سنجیدہ مزاج اور حوصلہ مند تھے اور یکسوئی کے ساتھ مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ ہائی سکول کی تعلیم ختم کر کے وہ سولہ برس کی عمر میں قانون کی تعلیم پانے کے لیے انگلستان چلے گئے۔ روانگی سے پہلے ان کے والدین نے ہندوستانی خاندانوں کے دستور کے مطابق انکی مرضی کا لحاظ کیے بغیر ان کی شادی کر دی تھی۔ مگر کم سن بیوی تھوڑے ہی دن میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔

لندن میں جناح صاحب نے بیرسٹری کا امتحان دو ہی سال میں پاس کر لیا۔ مگر عمر کم ہونے کی وجہ سے ڈپلوما حاصل کرنے کے لیے دو برس اور رہنا پڑا۔ انگلستان کے قیام کے زمانے میں انھیں سیاسیات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آگے چل کر سیاسی زندگی اختیار کریں گے۔ اور اس کے لیے تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر محمد اشرف نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنے قیام کے آخری دو سال میں سیاسی زندگی کے لیے جو ان کے پیشِ نظر تھی تیاری کے سلسلے میں اپنے طور پر مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ جناح صاحب نے فرمایا "قسمت نے یاوری کی اور مجھے کئی اہم انگریز لبرل سیاست دانوں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ ان کی مدد سے میں لبرلزم کے نظریے کو سمجھنے لگا۔ ان دنوں لارڈ مارلے کی لبرلزم کا دور دورہ تھا۔ میں نے اس لبرلزم کو اچھی طرح جذب کر لیا۔ وہ میری زندگی کا جز بن گئی اور اس نے میرے اندر بڑا جوش اور سرور پیدا کر دیا۔"

۱۸۹۶ء میں محمد علی جناح کراچی واپس آئے اور اگلے سال انھوں نے بمبئی میں وکالت شروع کی۔ پہلے تین سال کس مپرسی اور تنگدستی میں گزرے۔ مگر ۱۹۰۰ء میں ان کو پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے عارضی ملازمت مل گئی جس سے وہ قانونی حلقوں میں معروف

ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو دل و جان سے وکالت کے پیشے کے لیے وقف کر دیا اور اس میں کامیابی اور ترقی حاصل کرنے لگے۔ کچھ اپنی انتہائی مصروفیت اور کچھ کم گوئی اور خود پسندی کی وجہ سے وہ سماجی زندگی سے الگ تھلگ رہتے تھے اور تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر ان کی قابلیت، محنت اور دیانت داری کی بدولت لوگ انھیں قدر و عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں جب جناح صاحب اپنی مالی حالت کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے سیاسی زندگی جس کی انھیں دس سال سے آرزو تھی شروع کر دی اور دادا بھائی نوروجی کی رہنمائی میں انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کی آئینی ساز کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ یہاں وہ گوکھلے کے دوش بدوش آئینی سازی کے مسائل میں کانگریس کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے وقف علی الاولاد کے قانون کے پاس کرانے میں نمایاں حصّہ لیا اور اس طرح مسلمان زمینداروں کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دی۔ ان دنوں عمر میں پہلی اور شاید آخری بار جناح صاحب کے کسی شخص سے اتنے قریبی تعلقات ہو گئے تھے جسے دوستی کہا جا سکے۔ یہ گوپال کرشن گوکھلے تھے جن کی دلکش شخصیت کی موہنی نے ان کو رام کر کے چھوڑا۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں وہ اور گوکھلے کچھ دن آرام کرنے کے لیے انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور موسم بہار اور گرمیوں کے مہینے وہاں گزار کر واپس آئے۔ وہاں ان کی ملاقات مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن سے ہوئی اور ان دونوں لیڈروں کے اصرار پر جناح صاحب مسلم لیگ میں شریک ہونے پر راضی ہو گئے "تاکہ لیگ کی پالیسی کو کانگریس کے ترقی پسندانہ اور قوم پرورانہ مقاصد کے مطابق بنایا جائے"۔

اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ کانگریس اور لیگ دونوں کے ایک معتمد لیڈر تھے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ ہندوستانی قوم کے سفیر کی حیثیت سے انگلستان بھیجے گئے کہ ہندوستان کو سیاسی اصلاحات دینے کے لیے جو بل زیر غور تھا اس کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے خیالات کی نمائندگی کریں مگر ان دنوں آئرلینڈ کی شورش

دوراعظم یورپ میں سیاسی کشیدگی کی وجہ سے فضا سیاسی اصلاحات کے لیے سازگار نہ تھی۔ چنانچہ بل پھر ملتوی ہوگیا اور وہ ناکام واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔

جناح صاحب مسلم لیگ میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ اسے کانگریس سے قریب لائیں۔ ان کی تحریک سے دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کانگریس کے اجلاس کے ساتھ بمبئی میں ہوا جس میں گاندھی جی، مسز بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو نے بھی شرکت کی۔ رجعت پسند مسلمانوں نے لیگ کے عام جلسے میں گڑبڑ مچائی جس کی وجہ سے اسے برخاست کر کے تاج محل میں دوسرا جلسہ کرنا پڑا۔ اگلے سال لکھنؤ میں پھر مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس ساتھ ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان کو سیاسی اصلاحات دینے کا ملتوی شدہ بل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۵ء کے نام سے پاس کر چکی تھی اور کانگریس اور لیگ دونوں نے اسے ناقابل قبول قرار دیا تھا اور دونوں کی ایک مشترک کمیٹی اس پر غور کر رہی تھی کہ ہندوستانیوں کی طرف سے حکومت کی نئی تشکیل کے بارے میں کیا مطالبہ کیا جائے اور اس میں مسلمانوں کے مخصوص حقوق کیا ہوں۔ اس کمیٹی کی متفقہ سفارش، جس کی کانگریس اور لیگ دونوں نے اپنے اجلاس لکھنؤ میں تصدیق کی، یہ تھی کہ ہندوستان کو برطانوی سلطنت کے اندر ایک خود مختار ڈومینین کا درجہ دیا جائے اور مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات، جن کی تصریح کر دی گئی تھی، رکھے جائیں۔ اس کے مطابق مسلمانوں کے لیے پنجاب اور بنگال میں جہاں ان کی اکثریت تھی ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ کم اور دوسرے صوبوں میں اس تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں رکھی گئی تھیں اور ایک اہم شرط یہ تھی کہ اگر مرکزی یا صوبائی کونسلوں میں کوئی غیر سرکاری تجویز پیش ہو جس کا اثر متعلقہ کونسل کے ہندو یا مسلمان ممبروں کے نزدیک ان کے فرقے کے مفاد پر پڑتا ہو اور ان میں سے تین چوتھائی اس تجویز کے مخالف ہوں، تو اس تجویز کو نظر انداز کر دیا جائے۔

قومی تحریک کی تاریخ میں معاہدہ لکھنؤ کی یہ اہمیت ہے کہ پہلی بار نیشنل کانگریس

نے فرقہ وارانہ سیاست کو باضابطہ منظوری دی اور اس کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ جناح صاحب کی زندگی میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا اور دونوں کے محترم اور معتمد لیڈر بن گئے تھے۔

ادھر اعتدال پسند کانگریس اور لیگ آئینی طریقے سے خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کر رہی تھیں ادھر انتہا پسند ہوم رول لیگ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پبلک ایجی ٹیشن سے کام لے رہی تھی اور کچھ خفیہ جماعتیں تخریب پسندی کا ہتھیار استعمال کر رہی تھیں۔ ان سب واقعات کے دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۹۱۷ء میں وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو بتدریج ملک کے انتظام میں شریک کرنا اور آگے چل کر اسے سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری دینا چاہتی ہے۔ اگلے سال مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ جن میں کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد بڑھانے اور ان کے اختیارات میں کچھ اضافہ کرنے کی تجویز تھی۔ کانگریس اور لیگ دونوں میں اعتدال پسند عناصر نے ان تجویزوں کا خیر مقدم کیا لیکن انتہا پسند اکثریت نے ان کو رد کر دیا اور ذمہ دار حکومت کے مطالبے پر اصرار کیا۔

اب تک جناح صاحب مسلم لیگ کو کانگریس کے ساتھ ساتھ آئینی سیاست کی راہ پر چلا رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ کانگریس عوامی تحریک کے طوفان میں جو ایک دم سے بڑے زور شور کے ساتھ اٹھا تھا بہہ گئی۔ وہ ایک آئینی جماعت کے بجائے ایک انقلابی جماعت بن گئی اور اس نے ایک حد تک لیگ کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ جناح صاحب کے لیے جنھوں نے لارڈ مارلے کی لبرلزم اور انگریزوں کے آئینی طریقوں کو اس طرح جذب کیا تھا کہ وہ ان کی "زندگی کا جز" بن گئے تھے، اس طوفانی سیاست کا ساتھ دینا دشوار ہو گیا۔

اس کی وجہ مقاصد کا یا جذبات کا اختلاف نہیں بلکہ صرف طریقِ کار کا اختلاف تھا۔ جناح صاحب خود برطانوی حکومت کی جابرانہ پالیسی سے سخت بیزار تھے۔ وہ ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے ایکٹ سے

بالکل غیر مطمئن تھے، رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی احتجاج کے طور پر امپیریل لیجسلیٹو کونسل سے استعفا دے چکے تھے۔ خلافت کے "غارت کرنے" اور پنجاب میں وحشیانہ مظالم کے خلاف بھی وہ غم و غصے کا اظہار کر چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں انھوں نے کہا تھا۔ "ایک کے بعد ایک ذلت آمیز اقدام (مایوسی پر مایوسی) جڑ کے پر چڑ کا۔ ان باتوں کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ روس میں ان سے بالشویک تحریک اٹھی تھی، آئرلینڈ میں سن فین تحریک' خدا کرے ہندوستان میں ان کا نتیجہ آزادی ہو۔"

یہاں تک وہ کانگریس اور مسلمانوں کی نیم سیاسی، نیم مذہبی جماعتوں کے ساتھ تھے۔ لیکن عدم تعاون کی "رہ قلندر" جو خود ان کی "رہ و رسم پارسائی" کے یکسر خلاف تھی ان کو سخت ناپسند تھی۔ انھیں اندازہ تھا کہ خود مسلم لیگ کے بہت سے ممبر زمانے کی ہوا سے متاثر ہو چکے ہیں، اس لیے مصلحت اندیشی سے کام لے کر انھوں نے اپنے ساتھیوں سے اپنی رائے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھیں یہ ہدایت کی کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر خود فیصلہ کریں۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے اپنے اجلاس ناگپور میں عدم تعاون کی پالیسی کو سرکاری طور پر منظور کیا تو جناح صاحب تنہا شخص تھے جنھوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے الگ ہو گئے۔ ہوم رول لیگ سے پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کے معمولی ممبر رہے مگر اس سے بھی ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اگلے چند سال کا زمانہ ان کی ذاتی اور عمومی زندگی میں سخت کلفت اور افسردگی کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ایک رومانی کیفیت میں جوان پر عمر میں پہلی اور آخری بار گزری تھی۔ دوسری شادی سر ڈنشا پٹٹ کی ۱۸ برس کی لڑکی سے کر لی تھی۔ مگر میاں بیوی کے درمیان نہ صرف عمر میں بلکہ مزاج اور مذاق میں اس قدر فرق تھا کہ شروع سے ہم آہنگی نہ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ جناح صاحب اپنے گہرے احساس فرض کی وجہ سے اپنی کمسن دولہن سے نبھانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے مگر ان کی زندگی کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ انھیں اپنی طبیعت اور عادت کے خلاف اپنی بیوی کی خاطر بمبئی میں سوسائٹی کی عیش و نشاط کی زندگی میں حصہ لینا پڑتا تھا اور سیر و تفریح کے لیے یورپ کے سفر کرنے پڑتے تھے۔ لاابالی نوجوانی اور متین و پروقار کہولت کا

---

al. Jinnah, by Bolitho p 82

ساتھ زیادہ دن نہ نبھ سکا اور ۱۹۲۸ء میں میاں بیوی میں علٰحدگی ہو گئی۔ مصالحت کی ساری کوششیں ناکام رہیں یہاں تک کہ بیگم جناح مہینوں کی شدید علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں دنیا سے رحلت کر گئیں۔ اور جناح صاحب دس سال کی اہلی زندگی کی شیریں اور تلخ یادوں کے ساتھ پھر تجرد کی ستان زندگی بسر کرنے لگے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک جناح صاحب کے لیے گھر کی پرشور فضا کی طرح ملکی سیاست کی پرآشوب فضا بھی سخت ناخوشگوار اور تکلیف دہ تھی۔ کانگریس کے چھوڑنے کے بعد تین سال تک تو وہ سیاسی زندگی سے بالکل الگ تھلگ رہے مگر ۱۹۲۳ء میں جب اس مرکزی اسمبلی کے جو ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت قائم ہوئی تھی، دوسری مرتبہ انتخابات ہوئے تو وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے اس کے ممبر چنے گئے۔ اسمبلی میں آئندہ چھ سات سال تک کبھی چند رفیقوں کے ساتھ اور کبھی تن تنہا وہ اپنی جداگانہ آزاد پالیسی پر چلتے رہے جس کے دو بنیادی مقاصد تھے ایک یہ کہ آئینی طریقوں سے کام لے کر ہندوستان کے لیے خود اختیاری حکومت حاصل کی جائے، دوسرا یہ کہ قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دے کر ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد قائم کی جائے۔ جہاں تک پہلے مقصد کا تعلق ہے اس کے حصول کے لیے کانگریس اور مسلمانوں کی انتہا پسند جماعتیں اب جناح صاحب کی محفوظ مگر دور دراز آئینی راہ پر چلنے کو تیار نہ تھیں بلکہ گاندھی جی کا دکھایا ہوا عملی جدوجہد یعنی عدم تعاون اور سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر چکی تھیں جسے جناح صاحب نامناسب اور تباہ کن سمجھتے تھے۔ دوسرے مقصد کے بارے میں اصولی حیثیت سے قریب قریب سب جماعتیں جناح صاحب سے متفق تھیں مگر اس کو عملی شکل دینے میں سخت دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں جو معاہدہ لکھنؤ میں جناح صاحب کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ میں ہوا تھا اس سے اب کوئی بھی مطمئن نہ تھا۔ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی انھیں یہ شکایت تھی کہ اس معاہدے کی رو سے انھیں آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی دی گئی ہے۔ دوسرے صوبوں میں ہندوؤں کو اعتراض تھا کہ مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے جتنی نشستیں ملنی چاہیئے تھیں اس سے دو گنی تگنی ملی ہیں۔ قوم پرور ہندو مسلمان جداگانہ انتخابی حلقوں کے اصول کو جو معاہدہ لکھنؤ میں تسلیم کر لیا گیا تھا فساد کی جڑ سمجھ کر

منسوخ کرانا اور مشترک انتخابی حلقے قائم کرانا چاہتے تھے۔ اس عام بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر رجعت پسند فرقہ وارانہ جماعتیں عوام کو بھڑکا کر فرقہ وارانہ فسادات کرا رہی تھیں جنھوں نے ملک کی ساری فضا کو مسموم کر دیا تھا۔ جناح صاحب کئی سال سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب فرقہ وارانہ مسئلے کو نئے سرے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے اصول نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ شعور کو بہت تیز اور شدید کر دیا ہے اور قومی اتحاد کی راہ میں بڑی زبردست رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو مخلوط انتخابی حلقوں کے اصول پر راضی کریں اور اس کیلئے ضروری سمجھتے تھے کہ انھیں ان تحفظات سے بہتر اور زیادہ قابل عمل تحفظات دیئے جائیں جو معاہدۂ لکھنؤ کے مطابق دیئے گئے تھے۔

گو قومی سیاست کے نئے دور میں جو ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا تھا جناح صاحب کا اثر عام طور پر ملک میں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بہت کم ہو گیا تھا پھر بھی قریب قریب ہر پارٹی کے لوگوں کو ان کے حب وطن اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ پر پورا اعتماد تھا چنانچہ مارچ ۱۹۲۷ء میں جب ۳۰ مسلمان لیڈروں نے جن میں مختلف سیاسی خیالات کے لوگ شامل تھے دہلی میں جمع ہو کر فرقہ وارانہ مسئلہ پر غور کیا تو جناح صاحب جلسے کے صدر بنائے گئے اور جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ مجموعی طور پر ان کے نقطۂ نظر کے مطابق تھیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں :-

(۱) آئین ساز مجلسوں کے لیے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہوں مگر ہندو مسلمانوں کے لیے ایک مقررہ تناسب سے نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔

(۲) سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے مسلم اکثریت کا ایک نیا صوبہ بنایا جائے۔

(۳) دو اور صوبوں کو جن میں مسلم اکثریت ہے یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو سیاسی اصلاحات دی جائیں۔

(۴) مرکزی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

(۵) مسلم اکثریت کے سب سے بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں

کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو۔ جہاں تک اور صوبوں کا تعلق ہے مسلم اکثریت کے صوبوں میں کونسلوں میں نمائندگی اور نشستوں کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں ہندوؤں کو وہی رعایتیں دی جائیں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے صوبوں میں حاصل ہوں۔

انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس مدراس (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں ان تجویزوں کو منظور کر لیا۔ اور اس رزولیوشن نے جو اس سلسلے میں پاس ہوا اس بات کی بھی ضمانت دی کہ ہر فرقے کو مذہبی عقیدہ و عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور کوئی مسودہ قانون جس کا اثر ایک خاص فرقے کے مفاد پر پڑتا ہو مجلس قانون ساز میں اس وقت تک پیش نہیں ہو سکے گا جب تک اس فرقے کے منتخب شدہ ممبروں میں سے تین چوتھائی اس کے پیش ہونے پر راضی نہ ہو جائیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ۱۹۱۶ء کی طرح ایک بار پھر کانگریس اور مسلمانوں کے نمائندوں کے اتفاق رائے سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ محض دھوکا تھا۔ ۱۹۲۷ء کی دہلی کی تجویزوں پر مسلمان تو سبھی متفق ہو گئے تھے لیکن ہندوؤں کا ایک بڑا حصہ خصوصاً پنجاب اور بنگال میں جو کانگریس کے ساتھ نہیں بلکہ ہندو مہاسبھا اور دوسری فرقہ پرور جماعتوں کے ساتھ تھا، ان تجویزوں کا سخت مخالف تھا خصوصاً اس بات کو سراسر خلاف انصاف سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پنجاب اور بنگال میں بھی جہاں ان کی اکثریت ہے نشستیں محفوظ کی جائیں۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں کانگریس ان حلقوں کی مخالفت کی پروا نہ کرتی۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں ایسی غیر معمولی صورت حال پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کانگریس کو ملک کے لیے نیا آئین مرتب کرنے میں ہر خیال کے لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرنا پڑا اور اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے لیے حاصل کرنے کی خاطر دہلی کی تجاویز میں ترمیم کر دی گئی۔

کچھ دن پہلے دہلی میں مرکزی اسمبلی نے یہ رزولیوشن پاس کیا تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کے نمائندے م

کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ پر غور کریں۔ حکومت برطانیہ نے اس رزولیوشن کو قطعاً نظر انداز کرکے نومبر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے مسئلے کی تحقیقات کے لیے اپنی طرف سے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ اس کے صدر سر جان سائمن اور چھ ممبر تھے جن میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ ہندوستان کی سبھی پارٹیوں نے، جن میں جناح صاحب کی مسلم لیگ بھی شامل تھی، کمیشن کے تقرر کو قوم کی توہین سمجھا، اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس مدراس میں جس میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کیلیے دہلی کی تجویزیں منظور کی تھیں، سائمن کمیشن کے توڑ پر یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجالس کے ارکان اور ملک کی کل سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے جو ملک کے لیے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرے۔ اس کانفرنس نے اپنے پہلے اجلاس میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی کہ آئین کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرے۔ چونکہ کانفرنس نے دہلی کی تجویز کو نظر انداز کرکے فرقہ وارانہ مسئلے پر بھی نئے سرے سے غور کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے مسلم لیگ نے احتجاج کے طور پر نہرو کمیٹی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کمیٹی کی رپورٹ میں جو اگست ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی، فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایسا حل تجویز کیا گیا جو دہلی کی تجاویز سے بہت مختلف تھا۔ رپورٹ پر آخری مرتبہ غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس نے مسلمانوں میں قوم پروری کی تحریک کو ایسی کاری ضرب لگائی جس سے وہ کبھی پوری طرح سنبھل نہ سکی۔ اجلاس کے دوران میں سب سے بڑے کانگریسی مسلمان لیڈر مولانا محمد علی کو اس طرح دق کیا گیا کہ وہ نہ صرف کنونشن کے جلسے کو چھوڑ کر چلے گئے بلکہ کانگریس سے بھی بددل ہو گئے۔[a] سب سے بڑے غیر کانگریسی مسلمان لیڈر محمد علی جناح صاحب کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک ہوا۔ نہ صرف ان کی پیش کی ہوئی ترمیموں کو جو جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہیں، ایک ایک کرکے رد کر دیا گیا بلکہ یہ طعن بھی کیا گیا کہ ان کو مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں۔ جناح صاحب کا دل ٹوٹ گیا اور انھیں ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے، جو ان کی زندگی کا مشن تھا، مایوسی ہو گئی۔ ان

---

[a] Indian Muslims, by Ram Gopal pp 205-206

ایک پارسی دوست کہتے ہیں کہ اس موقع پر انھوں نے خود پسند، خوددار جناح کو عمر میں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا۔[۵]

جناح صاحب کی خاندانی زندگی کی بربادی کا جو کچھ دن پہلے رتن بائی جناح کی وفات کے ساتھ انتہا کو پہنچ چکی تھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اب انھیں اپنی عمومی زندگی بھی ویران اور سنسان نظر آنے لگی۔ چنانچہ وہ جون ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سکونت ترک کرکے لندن میں مقیم ہو گئے۔ اس سال اور آئندہ سال جو گول میز کانفرنس ہندوستان کے آئینی مسئلے پر غور کرنے کے لیے لندن میں منعقد ہوئی اس میں جناح صاحب بھی ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پہلے اجلاس کے بعد انھیں کچھ امید بندھی کہ شاید اس کانفرنس کا کچھ مفید نتیجہ نکلے لیکن دوسرے اجلاس کی ناکامی دیکھنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو سیاست سے بالکل الگ کرکے اپنے قانونی پیشے میں کھو دیا۔

مسلم لیگ کے ایک قابل اور مخلص جوان العمر لیڈر لیاقت علی خاں نے جو اپنی دولہن کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں لندن گئے تھے جناح صاحب کو یہ یقین دلایا کہ مسلم لیگی خیال کے مسلمانوں کو ان کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور وہ اس ضرورت کو شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ اگلے دو سال میں جناح صاحب کئی بار ہندوستان آئے گئے اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے ان کی غیر موجودگی میں انھیں ایک بار پھر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر منتخب کیا اور اکتوبر ۱۹۳۵ء میں وہ مستقل طور پر ہندوستان واپس آکر بمبئی میں رہنے لگے۔

(ماخذ: ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں)

ان سرسید

مؤید الاسلام
حال ڈیون پورٹ

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن" کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی، خود اپنے روپے سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپے سے اُس کو چھپوا کر شائع کردے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سُنے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپے کی تدبیر کرکے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوادی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندستان بھجوادیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہوگئے۔

ماخذ ——— حالی حیات جاوید ص ۱۴۲

کچھ جان ڈیون پورٹ کے بارے میں

لندن سے سرسید کے دو خط محسن الملک کے نام

ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے، حمایتِ اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام اور الزام انگریزوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں، اُن کا جواب دیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی (اس لیے) اس کا چھاپا ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ میں نے کل لاگت چھاپے کی دینی قبول کی اور احباب سے پچاس پچاس روپے اس کی لاگت ادا کرنے کو طلب کیے۔ اور بعوض اس کے بارہ بارہ کتابیں دی جاویں گی۔ اسی (کی) بابت پچاس روپے آپ سے بھی طلب کیے تھے۔ پس اگر وہ خط نہ پہنچا ہو تو اب فی الفور پچاس روپے بھیج دو۔ وہ کتاب تیار ہو گئی، چھپ چکی۔ آئندہ میل میں روانہ کروں گا۔ تصویر مسٹر ڈیون پورٹ کی بھیجتا ہوں۔ نہایت تعظیم و ادب اور محبت رکھنے کے لائق آدمی ہے۔

(لندن، روز جمعہ ۶ اگست ۱۸۶۹ء)

جس کتاب کے چھاپے ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتے کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس روانہ کروں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے۔ گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے موافق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے، انگریز ہے۔ جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو کتاب چھپ چکی ہے اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کتب خانۂ مصر کا نسبت حضرت عمرؓ کے لگایا جاتا ہے، غلط ہے۔ اور یونانی اور رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر کے وقت میں جلا (بے وقوف شیخی پسند بعض ناواقف مسلمان موخوں نے اسی واقعے کو، مسلمانوں نے جب مصر فتح کی، اُس کے ساتھ لگا دیا) اس امر کا ایسا مستحکم ثبوت دیا ہے کہ وہ کتب خانہ جولیس سیزر نے جلایا۔

(لندن، ۲۳ جولائی ۱۸۶۹ء)

مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ

هزار شکر بدرگاه کارساز که نسخهٔ عزیب ورسالهٔ عجیب موسوم به

[illegible]

مؤیّد الاسلام

واقع دهلی کوچه تتوان گذر چاندنی چوک متصل عجائبخانه

در مطبع بدر الدجی باهتمام خواجه قمر الدین خان طبع شد

مؤلف

مولف اف جون ڈیون پورٹ صاحب مصنف کتب مفصلہ ذیل

وقائع عمری علی پاشا والی جنانہ ——— رسالہ ابرائی اہل اودہ ———

رسالہ دربیان ملک گورک ور اجہائی گورک سوید سوانح تاریخ ہند ———

مجموعہ تواریخ و تصانیف مختلفہ بمفید طلبا ———

فہرست مضامین کتاب ہذا ———

آنحضرت کا ذکر اور آپ کی وقائع عمر —

قرآن مجید اور اوس کی تہذیب کا بیان —

بطلان الزامات درباب آنحضرت —

محاسن قرآن شریف —

مین اقرار کرتا ہون کہ اس زمانہ کی عیب اون لوگونکی بات ہرگز میری سمجھہ مین نہین آئے جو کہتی ہین کہ آنحضرت معاذ اللہ جعلساز تہی اور اونہون نی عمدا قرآن بنایا تہا اور قرآن ایسا لکھا ہی جیسی کوئی جعلساز لکھی میری رای مین جو منصف حسب آدمی قرآن کو پڑہیگا اوس کا یقین اس قول سی بالکل مختلف ہوگا — از کتاب کارل صاحب جلد ۶ صفحہ ۳۴۱۲ مطبوعہ لندن **مولف** ذیوی ڈلوی وغیرہ تجاسکی فایدہ کیلئے طبع ہوی مقام ۱۲۷ لونگ ایکر

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سزاوار پرستش اوس وحدہ لاشریک کی ذات ہی جسکی ایک لفظ کن کی یہ
ساری کائنات ہی اوس کی دریائی کمال مین آسمان سی ہزارون حباب
اوس کی بیرتی نورا جالا سی مہر و ماہ سی لاکھون کواکب ضیایاب ہین آب اوسکی
نسیم سی فنایاب ہو جاتا ہی پتھر اوس کی عنایت صمیم سی یاقوت ناب
ہو جاتا ہی وہ دانہ خشک سی سبزہ تر نکالتا ہی اوسکے حکم سی خاک سی آب پاک
جاری ہو جاتا ہی کبھی شام سی پیدا صبح ہی کبھی دن ہی کبھی شب ہی غرض اوس
صانع مطلق کا جو کار ہی وہ عجب ہی جب اوس کا دریائی غضب جوش مین
آتا ہی فرعون سا انا ربکم الاعلی کہنی والا غرقہ طوفان فنا ہو جاتا ہی جب وہ
اپنا زور جبروت دکہاتا ہی پشہ سی نمرود کا مغز نکلواتا ہی اوس کی بزرگی
کی ایوان کی رسائی مین مرغ خیال شکستہ بال ہی اور اوس کی قصر عظمت
تک کمند اوہام پہنچنی کی کیا مجال اوس کی افزایش رحمت کا ہرگز

شمار

نہ بیان ہو اگرچہ مرہوی تن زبان ہو اوسنی آدمیکو اشرف المخلوقات بنایا جوہر
قابلیت عطا فرمایا دیدہ بینا دیا تا اوس کی صنایع و بدایع کو نظر تامل سے
دیکھین اور عبرت پذیر ہون اور گوش شنوا عنایت کیا تا اوس کا کلام
ہدایت فرجام سنین اور صراط مستقیم پر رہگیر ہون اوس نے پیغمبر و
رسول بھیجے اور انہین معجزات باہرہ عنایت فرمائی تا رہروان وادی ضلالت
کو راہ پر لائین اور گم گشتگان طریق گمراہی کو رستہ بتائین ہر چند اون
نعمان خدا نے ابلاغ رسالت مین سعی تمام فرمائی ہر ایک کو راہ رستگاری
دکھائی مگر شیطان نے انسانون کو ایسا بہکایا تہا کہ طریق نجات کی طرف کو
نہ ہونے پاتا تہا حضرت نوح علیہ السلام کی ہزار برس کی پند و نصایح نے یہ
نتیجہ دکھایا تہا کہ ایک گروہ قلیل سات ستر آدمیون کا ایمان لایا تہا پھر
حضرت خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام نے شیوع ملت حنفی مین سعی بی پایان اور
کوشش فراوان کی مگر ضلالت و گمراہی بالکل نہ گئی بعد اوسکی حضرت موسی
علیہ السلام نے زبان تیغ و تیغ زبان سی کام لیا مگر مشرکین نے نمانا اور اوس
برگزیدہ خدا کا سمجہانا افسانا جانا باوجود تمام عمر اعلان کلمہ حق مین بسر کی مگر
بت پرستی کی موقوفی کی کوئی صورت نہ بنی اون کی بعد حضرت عیسی علیہ السلام
نے آکر تعمیر او ہدایت خلق کیلیے مامور ہوئی اون حضرت نے کمال بعث و
ہدایت ہر ایک کو سمجہایا خدائی یکتا کی بندگی کا شیوہ بتایا مگر سوائی چند

اشخاص کی کسینی اوس احد مطلق کی یکتائی نمانا اور طریق راستی کو بجھا نابس

جبکہ کار تبلیغ رسالت ہر نبی مرسل کے وقت مین ناتمام رہا اس واسطی غیرت

ایزدی مقتضی اس امر کے ہوئی کہ اب جہان کو اوس کی وجود با وجود سی رونق

بخشی کہ وہ سالکان مسالک گمرہی کو شاہراہ ہدایت پر لائی اور واپسان قافلہ

تیہ جہالت کو منزل مقصود دکھائی اور بموجب آیۃ وافی ہدایۃ الیوم اکملت

لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی اتمام نعمت و استکمال دین کا باعث ہو

نعت وہ وہ جس کے سبب جہان کی نمایش و آدم کی پیدایش ہوئی

لراقمہ ہو ثابت یہہ پیدایش سی اوس کی خداوند نیہ اپنی مہربانی

وہ جس کی نعلین تاج سر عرش برین وہ جس کی ادنا خدمتگارون مین روح الامین

وہ جسکی خاک آستان پر سر عجز آسمان وہ جسکا محکوم زمین و زمان وہ کہ اگر اوسکا

قدم مبارک زمین پر نہ آتا کار رسالت یوہین ناتمام رہجاتا وہ اوج رسالت کا

ماہ دو ہفتہ وہ سپہر کرامت کا مہر رخشندہ وہ جسکا زمین سی بالای عرش

یکدم مین گذار ہوا وہ جسکا براق برق رفتار راہوار ہوا وہ خدا جس کا خود

طالب دیدار ہی وہ باعث نازش ربِ دوجہان ہی وہ جسکی تحت لوا پیغمبران

مرسلین وہ کون یعنی حضرت ابوالقاسم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

خاتم النبیین میر ممنون سے محمد عربی بادشاہ عرش حریم ٭ کری ہی روح

قدس جسکی در کی دربانی ٭ اوسی خدا تو نہین کہہ سکون پہ کہتا ہون ٭ کہ اوس کے

مرتبہ عالی مین ہی خداداد ای بندہ لباس بشریت مین نور خدا تہا واللہ اعلم کیا ماجرا تہا

بندہ ہوکر خدا کا حبیب ہو یہہ رتبہ کس کو نصیب ہو غالب تمنائی دیرینہ

کردگارش بود یزدان خویش امیدوارش زراز نہان پردہ فیرندہ پر ذات خدا

معجزی مہرزدہ خاتم نگین رسالت وہ گوہر دریائی جلالت قصر اسلام کو اوسکی

معمار شرع نی قوی اساس بنایا ظلمت جہل کو اوسکی نور جمال نی مٹایا اوس ذات

مقدس کا اگر دنیا مین ظہور نہوتا تو قیامت تک جس اصنام بیت الحرام سی نہ

دور ہوتا وہ نو پاک نہا اگر اس جہان ظلمت بنیاد کی رونق نہ بڑہاتا اور جو وہ

قدم مسعود زمین کو آسمان نہ بناتا تو گم کردہ راہون کو راہ نجات کون دکہاتا

باغ نعیم یوہین خالی رہجاتا بہشت اوس کی محبونکی فرش راہ ہی چشمہ کوثر کو اوسکی

خادمونکی چاہ ہی جب وہ اپنا رتبہ شفاعت دکہائیگا طاعت کو گناہ پر رشک

آئیگا خسرو سہ پردہ کش امت شوریدہ کار ضامن آمرزش پروردگار

عذر ز عاصی بود اندر گناہ حلقہ کہ من عاصی او عذرخواہ اگر موسی کی ید بیضا کا قصہ

آ با نگر و بیا دست قمر شگاف کسیکی بنا پایا رسالت نی اوسکی نسبت ذاتی زینت

پائی نبوت نی اوسکی سبب سی بیحد عزت دکہائی مہر انور کو اسی بات کی جلن ہی کہ

اوسکی وضع اقدس زمین مین نہین اور شمع روشن ہی آسمان کو زمین سی اسکا

غبار ہی کہ اسیر کیون حضرت کا مزار ہی اوسکی حکم سی جہت آفتاب کا کیا آجانا

اگر وہ اپنی اب معجز نماسی فرمائی تو زمین آسمان و آسمان زمین ہو جائی شجر و حجر

وانسان وحیوان اوس کی اثبات رسالت کی گواہی مین ہمہ تن زبان ہی ہر ایک
عہد مین اوس خاصہ کردگار کی دین کی بہتری کی سامان ہوی ہیں ہی محبت حق ای
کہتی رہین اور اثبات دعوی راستی کی یہی معنی ہین حضرت کی علویت مرتبہ کو منکران
نبوت بھی مانجاتی رہین اور اہل استخفاف کی زبان سی بھی کلمات حق نکلجاتی ہین چنانچہ
فی زماننا دارالسلطنت لندن مین صاحبان انگلشیہ مین سی ایک صاحب کہ جنکا نام
نامی جون ڈیون پورٹ صاحب ہی اور نہایت اپنی علم مین ذی استعداد و مورخ بی
بدل مع انصاف دوست و راستی آشنا ہین اونہون نی کچھہ ہماری حضرت رسالت
پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقایع عمری تحریر کیا ہی اور بعض بعض الزامات کا
جو غیر مذہبوان نی بسبب تعصب مذہبی کی آنحضرت کی نسبت لگای ہین اون کا
جواب لکہا اونکو دفع کیا ہی جب وہ کتاب چہپا ہندوستان مین آئی تو اوسکی نسخی کو
ہمراہ ایک دوستدار نبوی کی طبیعت لہرائی جو کہ زبان انگریزی ہمراہ ایک نہین جانتا استاذی
مشفقی خواجہ قمر الدینخانصاحب عرف خواجہ مرزا صاحب خلف الصدق خواجہ بدر الدینخان حسب
عرف خواجہ امانصاحب مترجم بوستان خیال کہ جوان سنجیدہ و فہمیدہ ہین اونہون نی جیسا
چاہیے کتاب زبان انگریزی سی اردو زبان مین ترجمہ کیا تا ہر ایک مشتاق اوسکی ترجمہ سی [illegible]
اوٹہاوی اور اس کار خیر کی انصرام مین [illegible]
موصوف اسکی درستی کمر ہمت چست باندہی او [illegible]
ترجمہ نگار مین [illegible]

کہا اور مقصد انطباع کیا اور اس خاکسار یعنی محمد ان مہدی تخلص حسن سے دیباچہ لکھنے کو فرمایا
بندہ خواجہ صاحب کا حکم بسر و چشم بجا لایا کہ واسطے کہ رضا جوئی احباب و کار ثواب ہے
اب آگے اصل مطلب کتاب ہے فقط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب کے تصنیف سے میری غرض یہ ہے کہ آنحضرت کی وقائع عمری پر جو جھوٹی
الزامات اور بے انصافانہ بہتان ہوئی ہیں اون کو رفع کروں اور یہ ثابت کروں
کہ آپ فی الحقیقت خلق اللہ کے بڑے مربی اور نفع رسان تھے وہ حضرت جنہوں نے
تعصب کی سبب اس سچی عبادت واحد مطلق کی شمع پر دانہ لگایا ہے اونہوں نے
یہی نہیں ظاہر کیا کہ ہم نا منصف اور اوس عقل سے خالی ہیں جسکی اتباع کے واسطے
حضرت عیسی نے بقدر شد و مد سے تاکید فرمائی ہے بلکہ اونہوں نے اپنی رائے میں یہ بھی ظاہر کیا
ہے کہ یہ اون کی ذات اونکو یقین ہو جاتا کہ یہ عیسائیوں اور اس زمانہ کے عقلا کا
طریقہ نہیں ہے کہ کسی نبی اور اوسکے معمولات پر نکتہ چینی کریں بلکہ مشرقی لوگوں کا طریقہ ہے
—— یا بہ تبدیل الفاظ ہم اس مطلب کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ آنحضرت کو ایک
شارع مذہب اور مقنن ملت خیال کرنا چاہیے ——

جہانِ ودود

◉ یادداشتہاے ودود

قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اچھا خاصا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔

آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی نوشت کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ اَن گنت موضوعات پر ان کی یہ یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا تا شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آچکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیز ملیں گی

ادارہ ———

آشفتہ، آرنگ، آوازگشتن کی تحقیق

— آلفتہ (غ ص ـ) "نوعیت مستور ... در عبارات ، و نہ ہر زبانہا مشہور"
، اگر واقعی ایسا ہوتا تو اردو میں الفتا اس سے نہ پیدا ہوتا۔ اسناد: معیار
"ز احداث فلک آلفتہ ام شکر ... شانی "من آلفتہ را تماشا کن (مصطلحات کم
شیر کی مثال ... دیوان شانی میں نہیں ملا۔ محو قی کی ایک سند بہار عجم ا ص میں ہے' در
یہ ہیں: لولی آلفتگان را یار و مونس ... "آلفتگی = کلیات یغما ص ہم فقرہ طرز
وقتی ... آلفتہ سامان طوبی خدائی کرد ... قاآنی
چہ شود گر شود ز رحمت تو ... مستفیض این روان آلفتہ
فرہنگ معین میں آلفتن و آلفتہ دونوں ہیں' آلفتہ = آشفتہ پریشان

— آرنگ (غ ...) برہان میں ایک معنی پندارش "قاطع میں غالب سند کے طالب ہو
میں شعر ردکی دیکھا، تو قاطع ۲ میں لکھا کہ آرنگ = ہرگز نہیں = پنداری
سنی

— آوازگشتن (غ ... تا ...) = مشہور گردیدن (برہان) " بلند آوازگشتن یعنی
شہرت مستم، تنہا آواز یا آوازہ گشتن یعنی شہرت شہرت ندارد۔ ناس شنیدہ ام' در
کس شنیدہ باشد (قاطع ۱ محرق میں شعر فخر گرگانی نو جہانگیری میں بھی ہے' دیکھا
تو قاطع ۲ میں یہ اضافہ کیا: اگر گفتہ آید کہ فخر گرگانی میفرماید
اگر نومید زین در بازگردم ... ببر کنی در جہان آوازگردم
گویم گویم این نادرست و بنا بر حکم نتوان کرد، کلامیکہ معین در لغتہا مذکور ہا لتہ ذات نیز
خلاف عقیدۂ جمہور باشد' پذیرفتن آن کرام شود باشد نہ در گفتار معاصرین فخر ازین
ترکیب ... تا بکہ بعد از دی در فن کسی کوئی آنا ... بلند آوازہ ساختن
این کلمۂ غریب منزل "
فخر کی دلیں در راھن میں ' آوازگردم بھی ایک لفظ آیا' ہے = آوازگردم ہے
کسی گوید ہم الیوں بازگردم ۔ بہل تا در جہان آوازگردم

لفظ بابو اور بیبی کے بارے میں

— بابو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال اور بہار میں زیادہ رائج ہے۔ اردو کے ۲ شعروں میں بھی ملتا ہے اور دونوں کلیات جرأت ۲ (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن) میں ہیں۔ ایک مخمس ردیف وار میں ہے اور ایک سلیمان شکوہ کی ایما پر کہا ہے اور جس کی تضمین جرأت نے کی ہے :

کہا درویش نے آ بیٹھ بابو ۶۳ تنہا مجھ کو کہاں سے آیا تو
گر ہیں یہ تعلق سے ہم تنگ آ کر ہوا رہتا ہے جو زمانے جب گردش میں بابو
مری درد کا بڑا ہے ان کا بابو دیکھو کہ اس کو بابو
ہنر و کا ہے مرگ ہے والا چاہیے

بابو ایرانی فارسی میں مقامی ہے جو کہ از ایران سے ہندوستان سے گیا ہے وہاں باپ = پدر پر اضافہ ... سے قبل ... ہے۔ اسرار التوحید جس جو چھٹی صدی ہجری میں تصنیف ہوئی ہے ابو سعید کے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بابو الخیر کہلاتے تھے بادشاہ ... میں بھی ہے۔

— بیبی: عورت ہونی میں ... ایک ... میں شرق ... اخذ ... ان ... ایک بیبی ... مگر ... دو ... کے ساتھ ... صنف ... اور اس میں ... ذکور ... دیگر ... سند قدیم ترا کرتا ... کیا ... اپنی زوجہ کو لحاظ رکھتے ہیں :

لفظ 'امرود' کے بارے میں

[illegible] امرود یا ناشپاتی [illegible] (تحفۃ

اس دلیل میں ایک [illegible] ترجمہ

الادویہ ص [illegible]) [illegible] پانچویں صفحے میں یہ لفظ

عبدالرحیم خان خاناں [illegible] اصل نسخہ [illegible] (ص ۳۴) کو دیکھیں

میں مولوی نذیر احمد کا مضمون [illegible] ایرانی [illegible] ناشپاتی [illegible]

کی [illegible] ایرانی [illegible] اردو میں [illegible]

اس کی دیوان میں یہ مصرع ہے [illegible]

[illegible] میوہ ہای [illegible]

لغات فرہنگ معین [illegible] امرود

[illegible] ناشپاتی [illegible] میوہ [illegible] گلابی

[illegible] فرہنگ [illegible] - Pear [illegible] پھل [illegible]

وہ پھل [illegible] انگریزی میں [illegible]

[illegible] وہ [illegible] ([illegible])

ٹی۔ ایس ایلیٹ، مولوی عبدالحق

تاریخ میں لکھا جا سکتا، زمانۂ وفات

مسز ڈکنسن کی بیلیفی سوسائٹی کا باعث ہوئی کس طرح ایک اچھا ماخذ

متعلق اپنی ماں پر اس کی قائم ہوں

ایلیٹ نے جواب لکھا آورده خاکہ را ولنگا دیکھو، ہر ا نے لفظوں کی ترتیب کو ہر اہم

کام سمجھتے ہیں اور لگا کرتا ہے ان کے نزدیک اپنی ایسی کچھ نہیں۔ اہمیت ہو اسکا یقین

کیا جا سکتا، لیکن یہ کام ان لوگوں کا ہے جو ذمے لینا چاہتے اور جو اس کا اہل ہیں اس کی بہت قدر کی

خود وہ اس شکل میں ہو کہ اخلاقی جرم ہے اردو کی بدقسمتی ہے ہندوستان و پاکستان میں تو اکثریت

اس کام کو انجام دینے والوں کی ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کی مرتب کی ہوئی کئی کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں تذکرۂ گردیزی کے متعلق

اب تک میں نے کچھ نہیں لکھا اس کا حال دیکھئے پابانے ترجمے کے بعد اپنی روش کے مطابق ان کے اشعار

پیش کئے ہیں جن میں سے ایک کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خوشحال خان خٹک کا ہے ڈاکٹر عبدالحق نے یہاں

اور اس کو پابانے کے مختصر شعر ہیں خوشحال خان کی طرف منسوب کرتے ہیں، اسی جگہ انہی خبر کے

متعلق ہیں انہیں شامل کر لیا ہے حالانکہ ان کا ذکر اور فہرست شعرا میں بھی ہے داخل ہیں

حالانکہ اگر انہیں گردیزی کو یہ منظور ہوتا تو الف یا قاف میں ان کا ترجمہ یا اشعار

یا صرف اشعار سے نام و تخلص درج ہوتے نہ معلوم ڈاکٹر عبدالحق خوشحال کو کیا سمجھے

گردیزی نے اس پسندیدہ کی جگہ استعمال کیا ہے۔

دیوان یقین مرتبہ فرحت اللہ بیگ

دیوان یقین

دیوان یقین مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے مرتب کیا تھا اور اس پر ایک طویل مقدمہ (   ) لکھا تھا جو بعض احباب کی رائے میں تحقیق و تنقید کا ایک شاہکار ہے۔ مرزا صاحب کی لاثانی انشاپردازی اور ظرافت مسلم ہے لیکن اس مقدمے میں یا کہیں اور تحقیق و تنقید کا حق ان سے ادا نہیں ہو سکا، اور افادی حیثیت سے بھی اس کا مرتبہ بلند نہیں۔

لفظیات ناسخ: سراج نظم سے

ناسخ دبستان لکھنؤ کے بانی کی ایک مثنوی "سراج نظم" ہے جو کہ ۱۲۵۴ھ میں تمام ہوئی نام تاریخی

ہے۔ اسی سال ناسخ کی وفات ہوئی۔ اس میں ایک عربی کتاب کے مطالب نظم ہوئے ہیں۔ اس

میں بکثرت عربی الفاظ میں تخصیص اردو قبول نہیں کیا۔ بطور رشاد ہیں اور بعض تو کہیں سے نا—

— ... ایک لغتیہ لکھ میں پائے ہیں ... ایک ... مثالیں باقی ہیں اور کہ

الک" یہ بات ... ناسخ کا قول صریحاً قرآن کے خلاف ہے

... ایک ... (...) ... آیات ... واضح ... — ...

... جو ابر حو ... ہیں ... میں ... — لبن ... مندرجہ ...

... — ... شخص بلیغ کا شخص ... —

... آب و طعام

صفحہ — ... "ناخن ... ہوتی ہیں اکثر ... جاتے ہیں ما برا

— استیلاء ... استیلاء ... کی تاکی کی"

(تاکی ... بیان آیا ہے) ... عربی الفاظ سراج نظم میں اور بھی ہیں

دساتیر

ساتیر کہتی ہے کہ فردوس جہاں ملازمین جہاں کو حکم ہوتی ہے [illegible] ایک ستارہ ہزار برس تک تھا جہاں
ردیں کا بادشاہ ہوتا ہے اسی کے ہم ہزار سال کے لیے ایک دوسرا ستارہ حکومت میں اس کا شریک
ہوتا ہے اسی طرح ترتیب بہ نوبت ہر ستارہ ہزار ہزار سال بادشاہ اول کا شریک ہوتا ہے یہاں تک
بھی اس میں داخل ہوئے اور قمر کی شرکت پر بادشاہ اول کی حکمرانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اسی کا عمل
شریک ہزار [illegible] اور اسی کے بعد ترتیب نوبت سے تمام سیاروں کی شرکت ہو، بادشاہ
اول کی طرح [illegible] ہر ستارہ [illegible] اور شرکت بادشاہی کرتا ہے یہاں تک
کہ بادشاہی [illegible] ہوتا ہے اس پر ایک [illegible] = دور ختم کا [illegible] دوسرے کا آغاز

[illegible]

مدظلہ العالی رحمۃ اللہ علیہ

تھا۔ اور حضرت مجدد۔ [illegible] پرچے کا [illegible] تھا۔ لیکن مشغولی [illegible] اور رسالہ کی بجٹ
میں [illegible] بتلایا کرتے تھے۔ [illegible] کے لیے [illegible] چلا گیا
ایک [illegible] اور [illegible] اردو [illegible] جاتا ہوں [illegible] ارادہ
[illegible] حسن [illegible] پہلا شمارہ [illegible]
اور اس کے [illegible] شاہ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] گیا [illegible]
[illegible]
[illegible] (زبان [illegible]) [illegible]
[illegible] الاسلام [illegible] حضرت
[illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible]
[illegible] ہے [illegible] حیات
[illegible] کا [illegible]
[illegible] صاحب اب تو نا ممکن [illegible] کا بلاک بن گیا ہے [illegible] فی الحال اسی
طرح چلاؤ دیکھے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی طرح چل رہا ہے [illegible]
بقیہ [illegible]

آل احمد سرور، اردو ادب آزاد نمبر

( ) [illegible] آزاد" [illegible] اور انگریز پرستی سے [illegible]
[illegible] آل احمد سرور آزاد [illegible] اردو ادب [illegible]
[illegible] کا کلکتہ میں دلچسپ [illegible] کے عنوان سے
ابوالکلام آزاد کی [illegible] سے [illegible] جس میں عبارات ذیل
موجود ہیں :

"آپ (آزاد) [illegible] آزاد [illegible] انقلاب کی صفوں میں
[illegible] کی حکومت [illegible] صورت [illegible] اسی قلعہ کی
وجہ سے [illegible]
آزادی کی [illegible] سلطنت [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] (کلام) [illegible] آزادی کی
[illegible] آزادی [illegible]
[illegible] صفحہ ۱۸۱

آزاد نمبر میں ایک نظم بھی ہے جو [illegible] جشن تاجپوشی کے موقع پر کہی گئی
تھی۔ یہ انگریز پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ [illegible] صاحب کو [illegible] مدیر
ہونے کے باوجود اردو ادب کے مضامین کو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔

کہہ دو [illegible] کی [illegible] یہ [illegible] پتا چلتا ہے کہ [illegible]
[illegible] کی [illegible] ان کی زندگی [illegible] میں کہا تھا
[illegible] لسان الصدق میں [illegible] ان کی [illegible]
میں [illegible] کہ ان کے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس
ایک ہندو جماعت تھی ، اور سید احمد خاں مسلمانوں کی سیاسی نجات [illegible]
میں [illegible] ان سے یہ بھی کہا تھا کہ یہ تحریک [illegible] کی [illegible]
[illegible] کا [illegible] یہ [illegible] اور ان کی نظر [illegible]
[illegible] یہ آزاد [illegible] ہوا تھا [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] کہ وہ [illegible] انھوں نے جواب میں [illegible]
[illegible] اور اس کی ہماری زبان
[illegible] آزاد [illegible]
[illegible] ان کی [illegible] کی ضرورت [illegible]
[illegible] اور اس میں [illegible]
[illegible]
[illegible] یا [illegible] کہا [illegible] کی [illegible] میں جو
[illegible]
[illegible] میں
[illegible]

ابوالکلام آزاد پر کچھ یادداشتیں

۳ے تحریر ص ۱۲ "۔ ۱۸۹۸ تا ۱۸۹۹ء میں یعنی دس گیارہ برس کی عمر میں انہیں شعر گوئی
کا شوق پیدا ہوا ۔۔ ایک خاتون عالیہ بمبئی کی رہنے والی تھی ۔۔ عالیہ کا بھائی عبدالواحد
خاں سہسرامی اس سے ملنے آیا کرتا تھا ۔۔ یہ ۔ شعر بھی کہتے اور ادیب تخلص کرتے
تھے ۔ انہیں کی بدولت مولانا آزاد کو شعر گوئی کی ترغیب ہوئی ۔ آزاد تخلص بھی عبدالواحد
خاں ہی نے تجویز کیا تھا (حاشیہ تذکرہ ص ۲۴۹) ۔۔ وہیں یہ بھی کہ ۔ گلدستوں
میں شعرا کا کلام ان کے تخلص کی ابجدی ترتیب سے چھپتا تھا، اس لیے ان کا نام بالکل
آغاز میں چھپا کرتا تھا ۔۔ کی پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے ارمغان فرخ میں
چھپی تھی؟

بیان خصائص ص ۲ تا ۴ : سولہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گیا، اس کے کچھ بعد
سر سید احمد خاں کی تحریروں سے پہلے پہل آشنا ہوا، اور جدید تعلیم سے متعلق ان کے خیالات
کا مجھ پر شدید اثر ہوا ۔ میں نے انگریزی سیکھنی شروع کی، اور جلد ہی اس زبان سے اتنی واقفیت
حاصل کر لی کہ انگریزی کتابیں پڑھنے لگا، [illegible] تاریخ کا مطالعہ
کرنے لگا ۔ یہ میرے لیے ذہنی بحران کا زمانہ تھا، پرانے عقائد کے خلاف اپنے
اندر بغاوت کا احساس پیدا ہوا ۔ پہلی بات جس نے مجھے پریشان کیا مسلمانوں
کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات تھے، سب کا منبع ایک ہے، تو اتنی نزاع کیوں
اور اس کی کیا وجہ کہ ہر فرقہ دوسرے فرقوں کو بدعتی قرار دیتا ہے ۔ ان اختلافات
پر غور کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مذہب کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے ۔ دو تین سال
بڑی بے چینی میں گزرے، اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ پرانے عقائد کچھ بھی ہوں مجھے اپنی راہ
خود نکالنی چاہیے ۔ یہ کہ میں نے آزاد تخلص اختیار کیا
کا فیصلہ کیا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ میں موروثی عقائد کا پابند نہیں رہا ۔۔

~~[illegible]~~ تحریر یہ ابو الکلام [illegible]

گذارش/گزارش، کاغذ، ماتم، ماتمی

— گذارش و گزارش، [illegible]

—گزارش، گذارش۔ اوّل گزاردن کا حاصل مصدر، آخر [illegible]، اور دونوں کے معنی مختلف ہیں (دیکھیے فرہنگ معین) اوّل اردو میں مستعمل تھا، اور ہے، آخر کا اردو سے کچھ علاقہ نہیں۔ گزارش پہلے سب لوگ 'ز' سے لکھتے تھے، مگر ذال فارسی کے متعلق غالب کا [illegible] عام ہو گیا، تو کچھ لوگ اسے ذ سے لکھنے لگے ہیں

— کاغذ کو عربی سمجھتے تھے، اور خود غالب ذ سے لکھا کرتے تھے کہ یہ کہ دال یا ذ سے لکھنا تو لوگ مسخرہ [illegible] حالانکہ قبل اس کے کہ یہ بات ان کے قلم سے نکلے، وہ [illegible] چکے تھے۔ کاغذ کو کاغذ دال سے لکھتے تو اس کی سند مثنوی روی [illegible] کے مصرع ہے "[illegible]" دوسرے مصرع کا [illegible] یاد ہے۔ کاغذ اصلاً چینی لفظ ہے، شکل [illegible] اور ترکی سے عرب

— ماتم (= ماتم) عربی، لیکن غالب اسے فارسی سمجھتے تھے، چنانچہ دستنبو میں آیا ہے۔

— ماتمی عربی فارسی [illegible] میں ہے اور عرفی کے ایک قصیدہ کا یہ شعر ہے:
سحر را ماتمی صورت دنیا دیدم — چون عشرت کدۂ گردوں [illegible]
آصفیہ میں یہ اردو، مگر اس میں کوئی سند نہیں پیش ہوئی۔ کلیات میر میں ملی

بعد دیگر [illegible]
[illegible]
[illegible]

ں، کاغذ، غنچہ پیشانی، قشعریرہ وغیرہ

[illegible]

[illegible]

۲ گزارش حاصل مصدر گزاردن کا ہے اور اردو میں مستعمل تھا، اور گزارش کا کاغذ کا حاصل مصدر اردو میں مستعمل تھا۔ پھر دونوں کے معنی مختلف ہیں (دیکھو فرہنگ آصفیہ)۔ لوگ گزارش کو زیادہ استعمال کرتے تھے، لیکن وہ فارسی کو استعمال غالب کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے، تو بعض لوگ گزارش کو بجائے رز کے شعر سمجھے گئے

۳ کاغذ کو فارسی سمجھنے کے باوجود غالب ذرا کو عربی لفظ سمجھتے تھے، اور لوگ مسعود شاہ کے دور میں تو مثنوی رومی کا ایک نسخہ پیش کر سکتے تھے۔ ایک مصرع ہے "مثنوی لنشاد تا کاغذ شود" دوسرا مصرع یاد نہیں۔ اس طرح فرہنگ میں کاغذ دونوں۔ کاغذ دراصل ترکی لفظ ہے میں اس کی شکل بدلی

۴ غنچہ پیشانی "چین بر ابرو و غمناک" صائب:

"تا گلی در باغ داری غنچہ پیشانی مباش
در رکاب سرو دارد پای حسن تو بہار"

(چراغ ہدایت مؤلفہ خان آرزو) ۔ یہ معنی فرہنگ میں ہیں۔ کلیات میر جلد ا (شائع کردہ) کے سو شعروں میں آیا ہے اس قابل ہے کہ شعرای اردو اس استعمال کو برتیں

۴ قشعریرہ (ق مضموم، ش مفتوح، ع ساکن، ر مکسور، ی معروف، ر مفتوح، عربی میں حرف آخر ۃ) کلیات میر میں دو جگہ آیا ہے اور معنی ہیں وہ استعمال کیا ہے دلاور نگار ش ساکن ع متحرک۔ اردو میں استعمال ٹھیک طرح کیا ہم نے مولانا کی صحرائی عاشقی کی حالت سے شعروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ

— چو دانی ایک زیور ہے۔ اس کی جمع چو دانیاں ہے اور خاص صورتوں میں چو دانیوں کلیات ذوق مرتبہ ... میں یہ مصرع ہے "دیکھو ہے گھر تری چو دانیو"

جلد ۲ ص

مکتوبات غالب سے لفظیات

مہاراج ۱، بھائی ۲، شفیق بالتحقیق ۵، بندہ پرور، کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ صاحب ۱۶، منشی صاحب ۲۵، از مردودلت برخوردار بالکرم ۳۰، جان من ۳۳، میرزا تفتہ ۳۵، بھیّا عزیز الشعرا ۳۶، نور نظر لخت جگر ۴۵، مشفق میرے کرم فرما میرے ۴۶، برخوردار ۵۰، اجی مرزا تفتہ ۶۶، میاں ۷۲، میری جان ۷۵، ۷۸، برخوردار سعادت آثار ۷۹، مرزا صاحب میرزا تفتہ ۸۳، میاں مرزا تفتہ ۸۵، مرزا تفتہ صاحب ۸۸، صاحب مشفق ۹۶، حضرت ۹۹، بھائی صاحب ۱۰۴، نور چشم غالب لخت جگر مرزا تفتہ ۱۰۶، آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ ۱۱۰، منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۱۷، میرے مہربان میری جان میرزا تفتہ سخندان ۱۱۸، او صاحب ۱۱۹، میرزا تفتہ صاحب

اصطلاح کلام [illegible]

[illegible]

[illegible] ۹۰ [illegible]

[illegible] 99 [illegible] 95 [illegible]

[illegible] ۱۰۰ [illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۰۳ [illegible] ۱۰۲ [illegible] ۱۰۱

[illegible] 110 [illegible] ۱۰۵ [illegible]

122 [illegible] 121 [illegible] 105 [illegible] 106 [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جہانِ آزاد

◉ فتنۂ ارتداد اور مسلمان

—— مولانا ابوالکلام آزاد

جب شدھی اور سنگٹھن کی تحریک ۱۹۲۳ء اور بعد کے سالوں میں سوامی شردھانند کی قیادت میں زور و شور سے چل رہی تھی، اس موضوع پر اسی زور شور سے پریم چند اور ان کے ہم خیال اہل قلم (اور کچھ اختلافی رائے رکھنے والوں) نے رسالہ زمانہ کے ذریعہ اپنے خیالات قوم کے سامنے رکھے۔ یقین ہے ان تحریروں کا اچھا ہی اثر ہوا ہوگا۔ خدا بخش لائبریری نے زمانہ کے ان تمام مضامین کو 'ہندو مت (ج ۳) میں جمع کر دیا ہے۔ پریم چند کے علاوہ جنھوں نے اس بحث کا آغاز کیا، سریرام، عبدالحق، سحر بنگالی، چودھری پربھودیال، مہر عاشق لکھنوی، مسٹر نویدتا لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ابوالکلام آزاد نے بھی اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا جو غلام رسول مہر کی ترتیب تبرکات آزاد میں شامل ہے۔ اسے خدا بخش کی کتاب 'ہندو مت' (ج ۲) کے اس باب کے تکملے کے طور سے جہانِ آزاد کے تحت پیش کر دینا مناسب لگا۔

ع ر ب

فتنہ ارتداد اور مسلمان

آگرہ کے آس پاس ایک گروہ راجپوتوں کا مقیم تھا جنھیں ملکانہ راجپوت کہتے تھے اور ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی۔ یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے ۱۹۲۲ء کے اوائل میں ہندوؤں نے انھیں از سر نو ہندو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ آریہ سماج نے یہ سلسلہ جاری کیا اور سوامی شردھانند اصل تحریک کے لیڈر تھے۔ غالباً ابتدا میں اسے بہت مخفی رکھا گیا مگر اوائل مارچ میں راز منکشف ہو گیا۔ اس پر مسلمانوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی اور بہت سی تبلیغی جماعتیں اطراف ملک سے آگرہ پہنچ گئیں۔ یہ واقعہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ایک بہت بڑا موجب بنا۔

تحریک ترک موالات پر پہلی ضرب اس وقت لگی جب گاندھی جی نے چوری چورا میں پولیس کی چوکی پر عوام کے حملے سے متاثر ہو کر اعلان کیا کہ ملک میں ابھی تک عدم تشدد کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ اس بنا پر مجوزہ سول نافرمانی غیر معین مدت کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔ اس سے مختلف حلقوں میں افسردگی و دل شکستگی پیدا ہوئی۔ حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے چھ سال کی قید کی سزا دیدی۔ تحریک پر دوسری ضرب فسادات سے لگی ملکانہ راجپوتوں کو ہندو بنانے کی تحریک نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہندو کسی بھی حالت میں مل جل کر کام کرنے کے خواہاں نہیں۔ چنانچہ فضا اتنی بگڑی کہ پھر وہ ۱۹۲۱ء کے انداز پہ نہ آسکی۔ جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس بات پر معترض ہوں۔ ان کیلئے صرف ایک ہی بات صحیح اور برمحل ہو سکتی ہے۔ وہ بھی اپنا مذہبی فرض انجام دیں اور ملکانہ راجپوتوں کو اسلام میں مضبوط اور مستقل بنانے کی کوشش کریں۔ اپنے کام سے غفلت کرنا اور غفلت کے سبب قدرتی نتائج پیدا ہوں تو غیروں کا گلہ کرنا نہ تو عقل و دانائی کی بات ہے نہ غیرت و شرف کی۔

ملکانہ راجپوتوں کا معاملہ :

لیکن موجودہ مسئلہ حق اور آزادیٔ انتخاب کا سوال نہیں ہے۔ معاملے کے جس پہلو نے عام جذبات پر اثر ڈالا ہے وہ دوسرا ہے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنی پسند سے ایک مذہبی حلقہ چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس غرض سے ایک باقاعدہ منظم اور جماعتی کوشش بطور ایک موومنٹ تحریک

کے شروع کی جائے۔ آریہ سماج کی جانب سے جو کوشش شروع ہوئی ہے وہ دوسری قسم کی ہے، پہلی صورت نہیں ہے قدرتی طور پر اس کے اثرات پہلی صورت سے مختلف شکل میں نمایاں ہوں گے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ رائے رکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے موجودہ وقت میں یہ تحریک شروع کی۔ انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کر دیا۔ ان کا فرض تھا کہ اس بات سے غفلت نہ کرتے اور سمجھتے کہ اس وقت ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے جو ملک کے جذبات اور توجہ کو ملکی اتفاق اور مشترک جدوجہد سے ہٹا کر کسی اشتعال انگیز مقصد کی طرف لے جائیں۔ یہ بات کہ سیاسی اور ملکی اتفاق ایک دوسری چیز ہے اور اپنی اپنی مذہبی تبلیغ کی سرگرمی دوسری چیز، ایک کا اثر دوسرے پر نہ پڑنا چاہیئے، کتنی ہی معقول اور صاف ہو لیکن عملی طور پر قوموں اور جماعتوں کی سائیکولوجی (نفسیات) پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جن لوگوں نے یہ تحریک شروع کی۔ انھوں نے ملک کی متفقہ فضا کو مکدر کرنے اور عام جذبات کو ہیجان میں لانے کی بہت بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ سوامی شردھانند کہتے ہیں کہ ملکانہ راجپوت دراصل ہندو ہی ہیں۔ ہندوؤں نے اب تک چھوڑ رکھا تھا۔ اب شدھی کرنے سے یہ مقصد ہے کہ بطور ہندو رک آگنائز (تسلیم) کر لیا ہے۔ میں ان کی بات تھوڑی دیر کے لیے مان لوں گا اور کہوں گا کہ اگر یہ صحیح ہے تو ان کا پہلا کام یہ تھا کہ ان کروڑوں اچھوت جماعتوں کی خبر لیتے جن کی مظلومانہ حالت نہ صرف ہندستان بلکہ تمام نوع انسانی کے دامن پر وحشت و قساوت کا سب سے بڑا دھبا ہے کیا وہ اس کام سے فارغ ہو گئے ہیں کہ اب ان کے لیے صرف ملکانہ راجپوتوں ہی کا ایک میدان عمل باقی رہ گیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرائض:

بلاشبہ معاملہ کا یہ پہلو ایسا ہے جسے ہم افسوس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں لیکن صرف محسوس ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ بہتر ہے کہ کرنا چاہیں۔ یہ بات مسلمانوں کے سوچنے کی نہ تھی۔ ان لوگوں کے سمجھنے کی تھی جنھوں نے یہ کام شروع کیا ہے۔ اب بھی صرف انہی کے سمجھنے کی ہے یا ملک کے ان ہندو لیڈروں کے غور کرنے کی ہے جن سے حقیقت حال پوشیدہ نہ ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کو۔ چاہیئے کہ شکوہ و شکایت کریں یا اپنے لئے کوئی ایسا پوزیشن (رویہ) اختیار کریں جس سے توقع اور خواہش نکلتی ہو۔ یہ کام شروع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا لیکن جب شروع کر دیا گیا ہے تو مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی چارہ کار رہ گیا ہے۔ یعنی وہ بھی اپنا فرض سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیں۔ دوسروں کے لیے یہ نیا قدم ہے لیکن ان کے لیے ان کا اصلی اور دائمی فرض ہے اگر انھوں نے اپنا فرض ادا کیا ہوتا تو آج یہ نتائج پیش نہ آتے۔

حالات کا نقشہ:

دوسرا مسئلہ ان حالات کا ہے جو اس تحریک کے سلسلے میں وہاں پیش آ رہے ہیں عام مسلمانوں کے دلوں پر

وجیز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، وہ صورتحال یہ ہے کہ ملکانہ راجپوتوں کا ایک پہلا گروہ اس بات کے لیے تیار کر لیا گیا تھا کہ شدھی ہونا قبول کر لے، وہ ہو گیا۔ اب باقی جماعتیں اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔ ایک طرف شدھی سبھا اور وہ لوگ ہیں جو شدھی ہو گئے ہیں اور دوسری طرف اپنی قدیم حالت پر قائم ملکانہ راجپوت ہیں۔ پہلی جماعت کوشش کر رہی ہے کہ سب کے سب شدھی ہونا قبول کریں۔ دوسری اس بات پر جمی ہوئی ہے کہ اپنی قدیم حالت پر باقی رہے تیسری جانب وہاں کی قدیم ہندو آبادی ہے اور قدرتی طور پر وہ پہلی جماعت کے ساتھ ہے یہ بالکل واضح ہے کہ جب کبھی ایسی صورتحال پیدا کی جائیگی تو ضرور کشمکش اور جبر و اکراہ کی صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔ مذہب اور قومیت کے معاملہ میں کبھی انسان حق و انصاف کے حدود کے اندر نہیں رہ سکتا۔ قدرتی بات ہے کہ جو لوگ شدھی کرنیکے خواہشمند ہیں، وہ ہر طرح کے وسائل کام میں لائیں گے جو ہو گئے ہیں وہ ضرور چاہیں گے کہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی اسکے لیے مجبور کریں۔ اطراف کی ہم مذہب جماعتیں بھی پوری طرح اپنا زور لگائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ طرح طرح کی حق تلفیاں ہونگی، جبر و اکراہ سے کام لیا جائیگا ناجائز دباؤ ڈالا جائیگا، ناجائز ترغیبیں دی جائیں گی اور اس طرح ایک پوری آبادی امن و سکون اور معاشرتی عافیت کی جگہ بدامنی و کشاکش میں مبتلا ہو جائیگی۔

کسی جگہ ننانوے آدمی شدھی ہو جائیں گے، ایک نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس پر کیا گزریگی؟ شوہر ہو جائیگا، بیوی نہ ہوگی۔ عجب نہیں اسے مجبور کرنے کے لیے طرح طرح کی سختیاں کی جائیں۔

شدھی سبھا سے سوال:

میں سوامی شردھانند اور شدھی سبھا کے ارکان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ان خرابیوں کے روکنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ اور کیا ازروئے حق و انصاف اس کی ذمہ داری ان کے سر عائد نہیں ہوتی؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ ایک ایسے نازک اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر دینے والے کام کی دعوت لیکر اٹھے تو انھوں نے انسان کے حق و امن کے تحفظ کے لیے بھی اپنا کوئی فرض محسوس کیا یا نہیں؟ اگر از خود نہیں کیا تو جب کبھی کوئی ایسا واقعہ ان کے علم میں آیا۔ انھوں نے اس کے انسداد کیلیے کوئی کوشش کی۔

یہ معاملہ اس قدر واضح اور قدرتی ہے کہ واقعات کے ظہور سے پہلے ہی ہر ذی عقل اور انصاف پسند دماغ اس کی ضرورت تسلیم کرے گا۔ لیکن اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ یہ محض قیاس ہی نہیں ہے۔ واقعات کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اخبارات میں متعدد اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ساتھ جبر و اکراہ اور ناجائز دباؤ اور ترغیب کی صورتیں پیش آئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمام واقعات صحیح ہیں یا نہیں؟ لیکن ان میں سے چند آدمی میرے سامنے بھی آگرہ میں آئے۔ انھوں نے اپنی سرگزشتیں سنائیں۔

دو جماعتوں کی زیادتی :

ان لوگوں نے دو جماعتوں کی طرف سے زیادتی کی شکایت کی۔ ان کی طرف سے جو شدھی ہو گئے ہیں اور ان ہندوؤں کی جانب سے جو وہاں پیشتر سے آباد ہیں۔ ایک مسلمان درزی کو میں نے دیکھا جو اپنی دکان اور مشین چھوڑ کر آگرہ بھاگ آیا ہے۔ اس کے گاؤں میں تمام آدمی شدھی ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اور پرانے ہندوؤں نے مل کر اسے مجبور کیا کہ وہ بھی ہو جائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اس کا بیان ہے کہ مارنے پیٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک اور ملکانہ راجپوت ہے جو اپنی زمین اور مکان چھوڑ کر چلے آنے پر مجبور ہو گیا۔ اسکے گاؤں میں اکثر خاندان شدھی ہو گئے ہیں یہ نہیں ہوا اس لیے اسکے خلاف سب نے جتھا بندی کر لی۔ آخر مجبور ہو کر بھاگ آیا۔ اب اسکی زمین پر دوسروں نے قبضہ کر لیا ہے۔ ایک عورت میرے پاس آئی جس کا تمام گاؤں شدھی ہو گیا ہے چونکہ وہ اور اس کا لڑکا شدھی نہیں ہوئے اس لیے وہاں کے آدمیوں نے ایکا کر لیا ہے کہ اسکی زمین پر کوئی آدمی کام نہ کرے۔ ایک دوسری جگہ کی نسبت بیان کیا گیا کہ شوہر شدھی ہو گیا، بیوی نہیں ہوئی وہ دوسرے گاؤں کی ہے۔ شوہر نے اسے مکان میں بند کر دیا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ شدھی ہونا منظور کرے۔

کنور عبدالوہاب کا بیان :

آخری واقعہ سوامی شردھانند اور بعض دیگر ارکان شدھی سبھا کے سامنے بیان کیا میں نے جب ان سے پوچھا تو انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسا واقعہ ان کے سننے میں بھی آیا ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے لڑکی کے شوہر کی جانب سے ہوا ہے سبھا کے آدمیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی افراد کا یہ حال ہے کہ جن آدمیوں کے گزرے میں خود انھوں نے میرے سامنے بیان کیا مجھے اسکی مہلت نہ ملی کہ موقع پر جا کر تحقیقات کرتا۔ ان کا انداز بیان، حالات کا توافق اور میرے جرحی سوالات کے جوابات ایسے تھے کہ میں سمجھتا ہوں وہ اپنی شہادت میں جھوٹے نہیں ہیں۔ انکے علاوہ ناجائز ترغیب اور دباؤ کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر ان کے سننے کا موقع نہیں ملا۔ میں انکی نسبت بطور تحقیق و شہادت کے کچھ نہیں کہ سکتا۔

کانگریس کے نائب صدر کی شہادت :

جس دن میں آگرہ پہنچا اسی دن سوامی شردھانند وہاں سے جا رہے تھے باوجود میرے اصرار کے وہ ٹھہر نہ سکے میں نے مسٹر چاند مل سے جو آگرہ کانگریس کمیٹی کے وائس پریزیڈنٹ اور شدھی سبھا کے بانی ہیں پوچھا کہ ان کی سبھا نے آج تک کوئی کوشش ایسے واقعات کے انسداد کی کی ہے؟ انھوں نے تسلیم کیا کہ نہیں کی۔ البتہ وہ معترف تھے کہ ایسا کرنا چاہیے اور آئندہ کیا جائے گا۔

بلاشبہ معاملہ کا یہ پہلو ملک کے ہندو رہنماؤں کیلیے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ انکا فرض ہے کہ اسکے انسداد کی کوشش کریں۔ یہ فرض یا مسٹر چاند مل اور شدھی سبھا کا تھا وہ کانگریس میں ہیں۔ ورنہ تری تو ہندو پریس اور ہندو لیڈروں کا فرض ہے کہ بے تکلف اپنے حق و صداقت کا اعلان کریں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی انصاف پسند ہندو اسے پسند نہ کریگا کہ غریب و بے زبان ملکانہ جو توں میں سے کسی ایک آدمی پر بھی سختی ہو کہ وہ اپنا پسندیدہ مذہب ہے پر قائم رہنے اور بدلنا نہیں چاہتا۔

۱۵ تحریک آزادی ... سول میرس ... ۲۱۳

نو مسلم ... تھے

اشاریے

سہ ماہی **فکر و نظر** (علی گڑھ) کا اشار

ڈاکٹر ضیاءالدین ال

ڈاکٹر یوسف حسین نے جنوری ۱۹۶۰ء میں 'فکر و نظر' کے نام
سے علی گڑھ یونی ورسٹی کے پہلے علمی مجلہ کی اشاعت شروع کی۔
۱۹۶۵ء تک یوسف صاحب علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہے
اور 'فکر و نظر' ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر مسعود حسین
اس کے باقاعدہ ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے بعد شعبۂ اردو سے اس کی
ادارت وابستہ رہی۔ ۱۹۸۷ء سے ایک مستقل انتظام کے تحت ڈاکٹر شہریار
اس کے ایڈیٹر ہیں۔ —— (ادارہ)

سہ ماہی فکر و نظر (علی گڑھ)

کا

اشاریہ

۱۹۶۰ء ــــ ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

O

علی گڑھ سے اردو کا تعلق بڑا قدیمی اور گہرا ہے۔ سرسید نے جب اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا مرکز علی گڑھ کو بنایا تو اس کے اثر سے جدید اردو کا مرکز بھی رفتہ رفتہ علی گڑھ ہی بن گیا۔ سرسید نے اپنی تحریک کے ترجمان کے طور پر سرزمین علی گڑھ سے ہی ۱۸۶۶ء میں اخبار "سائنٹیفک سوسائٹی" جاری کیا۔ اس کے بعد یہیں سے انھوں نے ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ اور اس طرح جدید اردو نثر کے ساتھ جدید اردو صحافت کی بنیاد بھی ڈالی۔ ان رسالوں نے اصلاح معاشرہ کے علاوہ اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دیں، وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان رسائل نے خود ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور مختصر سے عرصہ میں ملک گیر اثرات مرتب کر دیے۔

اپنی اسی علی گڑھ کی شاندار روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے دانشوروں نے، جن کی قیادت، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کر رہے تھے، ایک علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اور جنوری ۱۹۶۰ء کو "فکر و نظر" کے عنوان سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا۔ اس نے جلد ہی اپنا مقام بنا لیا۔

اس کے بنیادی مقاصد میں طبیعاتی حیاتیاتی اور اجتماعی علوم، نیز عالمی ادبیات میں جدید میلانات سے اردو دنیا کو روشناس کرانا تھا۔ رسالہ کے مدیر خود یوسف حسین خاں صاحب تھے، اور ادارۂ "فکر و نظر" کے معتمد پروفیسر نذیر احمد، صدر شعبۂ فارسی تھے۔ یوسف صاحب اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے اور نہ صرف انتظامی امور کی سربراہی کر رہے تھے، بلکہ یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی بھی فرما رہے تھے۔ آپ نے یونیورسٹی میں دانشوروں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ جس کی مرکزی شخصیت خود یوسف صاحب کی تھی۔ اس حلقہ نے اپنی علمی کاوشوں اور تحقیقی کاموں سے یونیورسٹی کے وقار کو بلند کیا اور اپنے اپنے میدان میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ ان حضرات نے "فکر و نظر" کے معیار کو بلند کرنے اور اسے استحکام بخشنے میں یوسف صاحب کی مدد کی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یوسف اپنی خود نوشت "یادوں کی دنیا" میں لکھتے ہیں :

" باوجود ان انتظامی مصروفیات کے میں نے اپنے ذمے رسالہ "فکر و نظر" کی ادارت کا کام لیا۔ اور ادارۂ "فکر و نظر" کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی کی ذاتی دلچسپی

اور محنت کی وجہ سے میں رسالہ کی اشاعت اور طباعت کی طرف سے بے فکر رہا۔ میں نے خود فکر و نظر کے لیے مضامین لکھے، جنھیں مکتبہ جامعہ دہلی نے "کاروانِ فکر" کے نام سے شایع کیا۔ مجھے مسرت ہے کہ رسالہ کا معیار کافی اونچا رہا۔ چنانچہ اس کے بعض مضامین کے حوالے روس، ایران اور ترکی کے رسایل میں دیے گئے، اور ان ملکوں میں اس قدر افزائی ہوئی۔ ہمارے ملک کے اہل نظر نے بھی رسالے کو سراہا۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس کی تعریف و تحسین کی۔

یوسف صاحب ۱۹۶۵ء تک علی گڑھ میں رہے۔ جب تک آپ علی گڑھ میں رہے، "فکر و نظر" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے زمانے میں رسالہ نے بہت ترقی کی اور غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس عہد میں رسالے کی دو خصوصیات بڑی نمایاں رہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہر شمارے میں سرسید سے متعلق مضامین بالالتزام شایع ہوتے۔ چنانچہ سرسید کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط سے علمی دنیا پہلی بار "فکر و نظر" کے ذریعہ ہی آشنا ہوئی۔ اس کے علاوہ یوسف صاحب کی کوششوں سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج اور سرسید کی قایم کردہ سائنٹفک سوسائٹی سے متعلق مراسلت بھی پہلی بار مربوط طریقہ پہ "فکر و نظر" ہی میں شایع ہوئی۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں SELECTED DOCUMENTS FROM THE ALIGARH ARCHIVES کے عنوان سے بھی شایع ہو گئی۔

"فکر و نظر" کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری) کے شعبۂ مخطوطات میں قلمی نسخوں کا جو عدیم النظیر اور بیش بہا خزانہ موجود ہے، اس میں سے کسی نہ کسی اہم مخطوطہ کا تعارف ہر شمارے میں شامل ہوتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے تعارفی مضامین مسلسل شایع ہوتے رہے۔ ان کے ذریعہ ایک طرف تو علمی دنیا ان نوادر سے واقفیت ہوئی اور دوسری جانب مولانا آزاد لائبریری کی وقعت اور قدر و قیمت سے لوگ متعارف ہوئے۔

"فکر و نظر" کے قلمی معاونین کا حلقہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر رہا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں علی گڑھ کے فضلا کے علاوہ ملک کے نامور ادیب، عالم اور محقق بھی شامل رہے ہیں۔ جس کی بنا پر "فکر و نظر" کا حلقہ خالص یونیورسٹی کے حدود سے نکل کر ملک گیر حیثیت اختیار کر گیا۔

یوسف صاحب کے علی گڑھ سے چلے جانے کے بعد جناب فضل الرحمٰن یونیورسٹی کے پرو وایس چانسلر رہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے "فکر و نظر" کی ادارت کے فرایض بھی انجام دیے۔ لیکن زیادہ عرصہ تک یہ سلسلہ نہ چل سکا، اور ۱۹۶۶ء میں مدیر کا عہدہ ختم کر کے ایک مجلس ادارت بنا دی گئی جس

کے صدر فضل الرحمٰن صاحب مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء کے تعلق میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی:

"جدید تنظیم کے مطابق "فکر و نظر" کا ایک ادارہ بنا دیا گیا ہے، جس کی صدارت محمد فضل الرحمٰن صاحب پرو وائس چانسلر کریں گے۔ مجلس ادارت میں مختلف علوم کی نمائندگی بڑی حد تک ملحوظ رکھی گئی ہے۔"

اس طرح اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے سے رسالہ پر مدیر کے نام کی بجائے مجلس ادارت کے ارکان کے اسمائے گرامی دیے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ایک انقلابی تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ "فکر و نظر" اب تک ٹائپ میں طبع ہوتا تھا، لیکن اب اسے لیتھو میں چھاپنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی اکتوبر ۱۹۶۶ء والے شمارے میں اس فیصلہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی گئی:

"نسخ ٹائپ کی افادیت کے ہم قائل ہیں، مگر ہمارا تجربہ یہ ہے کہ باوجود ہر ممکن کوشش کے یہ اب تک زیادہ مقبول نہیں ہو سکا ہے، اور لیتھو کی چھپائی کے مقابلے میں جگہ بھی زیادہ لیتا ہے اور گراں بھی پڑتا ہے۔ اس لئے ہم نے لیتھو کی طباعت کو ترجیح دی ہے۔"

اس جدید انتظامی تنظیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس میں خالص ادبی، علمی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ سماجی اور سائنسی علوم کو بھی شامل کیا جانے لگا چنانچہ اب اس میں معاشیات، سیاسیات، نفسیات، ارضیات، جغرافیہ اور ملک کی تعلیمی پالیسی وغیرہ سے متعلق موضوعات پر بھی مضامین شائع ہونے لگے۔ اس طرح اس کے مندرجات میں وسعت تو ضرور پیدا ہو گئی، لیکن کسی حد تک یہ اپنے بنیادی دائرے سے باہر آ گیا۔

۱۹۷۲ء کے بعد اس میں غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس کی اشاعت اب مستقل نہیں رہی اور اشاعتوں کے درمیان طویل وقفے ہونے لگے۔ ۱۹۷۱ء میں پروفیسر مسعود حسین خاں اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے مجلس ادارت برقرار رہی۔ آپ کے بعد پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر نورالحسن نقوی یکے بعد دیگرے اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آجکل اس کی ادارت کے فرائض پروفیسر شہریار انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں — جلد ۱ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۶۰ء تا جلد ۶ شمارہ ۲ اپریل ۱۹۶۵ء

۲۔ جناب فضل الرحمٰن — جلد ۶ شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۵ء تا جلد ۷ شمارہ ۴ جولائی ۱۹۶۶ء

مجلس ادارت — جلد ۹ شمارہ ۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء تا جلد ۱۰ شمارہ ۴ x ۱۹۷۰ء

۳۔ پروفیسر مسعود حسین خاں — جلد ۱۱ شمارہ ۱ ۱۹۷۱ء تا جلد ۱۳ شمارہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء

۴۔ پروفیسر خورشید الاسلام — جلد ۱۴ شمارہ ۴ دسمبر ۱۹۷۳ء تا جلد ۱۰ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء

پروفیسر عتیق احمد صدیقی — جلد ۱۸ شمارہ ۱-۲ جنوری/جون ۱۹۸۱ء تا جلد ۲۱ شمارہ ۱-۲ جنوری/جون ۱۹۸۴ء

پروفیسر نور الحسن نقوی — جلد ۲۲ شمارہ ۱-۲ جنوری/ستمبر ۱۹۸۵ء تا جلد ۲۳ شمارہ ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر شہریار — جلد ۲۴ شمارہ ۱۹۸۷ء تا حال

"فکر و نظر" نے کچھ خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔ یہ سب معیاری ہیں اور اپنے اپنے موضوعات پر اہم دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غالب نمبر، گاندھی نمبر، سائنس نمبر، عربی ادب نمبر، تحریک آزادی نمبر اور نامورانِ علی گڑھ نمبر شامل ہیں۔ ان کا گوشوارہ حسب ذیل ہے:

۔ غالب نمبر	جلد ۹	شمارہ ۲		۱۹۶۹ء
۱۔ گاندھی نمبر	جلد ۹	شمارہ ۴		۱۹۶۹ء
۲۔ سائنس نمبر	جلد ۱۴	شمارہ ۱-۲	مارچ/جون	۱۹۷۵ء
۴۔ عربی ادب نمبر	جلد ۱۶	شمارہ ۱-۴		۱۹۷۹ء
۵۔ تحریک آزادی نمبر	جلد ۲۲	شمارہ ۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء
۶۔ نامورانِ علی گڑھ (پہلا کارواں)	جلد ۲۲	شمارہ ۱-۳	جنوری/ستمبر	۱۹۸۵ء
۷۔ " " (دوسرا کارواں)	جلد ۲۳	شمارہ		۱۹۸۶ء
۸۔ " " (تیسرا کارواں۔ جلد اول)	جلد ۲۴	شمارہ	جنوری ۱۹۸۷ء - جولائی ۱۹۸۸ء	

"فکر و نظر" ۲۹ سال سے نکل رہا ہے۔ اس دوران اس کی پچیس[۲۵] جلدیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۸ کا آخری پرچہ جلد ۲۵ کا شمارہ ۲-۳ ہے۔ اس پر مہینہ درج نہیں ہے۔ لیکن یہ دسمبر کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ اسلیے یہ بات یقینی ہے کہ یہ ۱۹۸۸ء کا آخری شمارہ ہے۔ اس ۲۹ سال کے عرصہ میں اس میں پانچ سو سے زاید مضامین شائع ہوئے۔ ان میں ایک جہان معانی پنہاں ہے۔ ان تمام مضامین کو ان رسالوں میں تلاش کرنا اور مطلوبہ مضامین کا انتخاب کرنا بڑا پیچیدہ اور دقت طلب کام ہے، اور مزید یہ کہ ابتدائی دور کے زیادہ تر رسالے اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ان تمام رسالوں کے مندرجات کا ایک توضیحی اشاریہ تیار کر دیا جائے تاکہ اسکالرز، دانشور اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات ان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ اور اپنے علمی و ادبی کاموں میں ان سے مدد لے سکیں۔ اسی خیال کے پیش نظر یہ اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔

••

فہرست

[illegible] سے فروغ میں اشاریہ کا اشاریہ [illegible] انصاری نے مرتب کر دیا ہے تاکہ محقق [illegible] پوری ہو جائے (ادارہ)

مذاہب، ۲۴
اسلامیات، ۵
اخلاقیات، ۱
تصوف، ۸
نفسیات، ۲۶
فلسفہ، ۲۲
منطق، ۲۶
تعلیم، ۹
سماجیات، ۱۳
معاشیات، ۲۴
سیاسیات، ۱۳
تاریخ نگاری، ۷
تاریخ: عہد قدیم، ۷
ہندستان، ۲۷
ہندستان، تاریخ تحریک آزادی، ۲۹
پختونستان، ۷
مشرق وسطیٰ، ۲۳
مصر، ۲۶
وسط ایشیا، ۲۷
ترکی، ۷

سائنس، ۱۰
علم الانسان، ۶
ماحولیات، ۲۳
جغرافیہ، ۹
ارضیات، ۵
طبعیات، ۱۳
حیوانیات، ۹
نباتیات، ۲۶
علم طب، ۱۶
علم جراحت، ۱۹
صنعت و تجارت، ۱۴
بنکاری، ۷
روسی ادب، ۱۰
رومانیوی ڈراما، ۱۰
لسانیات، ۲۳
ادب، ۱
ادب: تاریخ و تنقید، ۱
اردو زبان، ۲

اردو زبان: قواعد، ۳
: لغات، ۴
اردو ادب: تاریخ و تنقید، ۲
تاریخ و تنقید: افسانہ، ۲
اردو ناول: تاریخ و تنقید، ۲
اردو شاعری، ۳
دکنی شاعری، ۱۰
مشاہیر: تذکرہ، ۳۰
: غالب، مرزا اسد اللہ خاں، ۱
: سر سید، ۱۱
سر سید: سائنٹفک سوسائٹی، ۱۰
: علی گڑھ تحریک، ۱۷
ذاکر حسین: کتابیات، ۲۳
اقبال، سر محمد اقبال، ۶
گاندھی جی، ۲۳
ڈراما: ناٹک، ۱۰

ترکی ادب، ۸
عربی ادب، ۱۵
فارسی زبان، ۲۱
فارسی لغت، ۲۱
فارسی ادب، ۱۸
ہندی ادب، ۲۹
بنگالی ڈراما: تاریخ، ۷
تلگو ادب، ۹
یونانی ڈراما، ۲۹
انگریزی ڈراما، ۷
فرانسیسی ادب، ۲۲
علم کتاب خانہ، ۱۶
کتاب خانے، ۲۲
تبصرے (کتابیں)، ۲۲

فکر و نظر (۱۹۶۰ء — ۱۹۹۰ء)

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	افتتاحیہ	یوسف حسین خاں	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۲ - ۱
	اخلاقیات						
۔	اخلاقیات کا ارتقاء	البرٹ شوائتسر، مترجمہ عبدالحق	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۰۷-۹۶
۲۔	اسلام میں اخلاقی فکر کی ابتدا	عمر الدین	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۷۴-۵۷
۳۔	جدید مسلک انسانیت	سیّد عابد حسین	۱	۱	"	۱۹۶۰ء	۴۴-۳
۴	حضرت بابا فرید کا فلسفۂ انسانیت	محمد نور نبی	۱۸	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۷۸-۶۴
۵	معراج انسانیت سیرۃ نبوی کی روشنی میں	علی نقی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۹۲-۸۸
	ادب						
	ادب کی قدریں	اسلوب احمد انصاری	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۴۵-۲۲
۲	شمالی ہندوستان کا ایک علمی و ادبی مرکز۔ اکبرآباد (آگرہ)	ولی الحق انصاری	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۱۱۰-۸۰
	ادب — تاریخ و تنقید						
۱	ادب اور تاریخ	اسلوب احمد انصاری	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۴-۱
۲	ادب اور نفسیات	ظفر احمد صدیقی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۸۲-۵۹
۳۔	ادب میں شخصیت	شمس الرحمٰن فاروقی	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۹۲-۸۹
۴	ادبی تاریخ اور ادبی تنقید	اولاد احمد صدیقی	۸	۲	"	۱۹۶۷ء	۴۲-۳۳
۵۔	ادبی تنقید کے چند مسائل	اسلوب احمد انصاری	۳	۲	"	۱۹۶۲ء	۱۸-۱
۶۔	تحقیق متن کے اصول	صلاح الدین المنجد، مترجمہ محمد فضل الرحمٰن	۲	۲	"	۱۹۶۱ء	۱۰۰-۸۲
۷۔	تدوین کے اصول و مدارج	محمد انصار اللہ	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۶۲-۵۱
۸۔	دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے	رشید احمد صدیقی	۴	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۹۷-۷۷
۹۔	عملی تنقید	محمد یٰسین	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۶-۲۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰	لوکاچ اور جدید ادب	انڈیور کے کینیڈی: ترجمہ عقیل احمد	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۵۹-۵۰
۱۱	مشرقی نظریات تنقید	سید محمد ہاشم	۱۰	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۴-۳

اردو ادب ۔ تاریخ و تنقید

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	آثار ابوالکلام ۔ ایک تنقیدی جائزہ	محمد علی کاظمی	۱۱	۴		۱۹۶۷ء	۹۲-۹۵
۲	اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال	آل احمد سرور	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۲۴-۹
۳	اردو میں جدید تحقیق کا آغاز	محمود الٰہی	۵	۲	جولائی	۱۹۶۴ء	۳-۴۳
۴	اردو نثر کا بنیادی اسلوب	رشید احمد صدیقی	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۴-۸۷
۵	رجب علی بیگ سرور کی مسلّمہ تالیفیں و تحقیق	سید نیر مسعود	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۱۷-۴۷
۶	" " " (قسط ۲)	" "	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۳-۶۰
۷	رشید صاحب کا اسلوب	منظر عباس نقوی	۲۵	۲-۳		۱۹۸۸ء	۹-۲۲
۸	قدیم ایرانی و زرتشتی عناصر اردو ادب میں	نذیر احمد	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۵-۱
۹	کربل کتھا ۔ ۔	محمد انصاراللہ	۹	۲		۱۹۶۹ء	۹-۴۷
۱۰	مولوی نذیر احمد کے لکچر	محمد عزیر	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۷-۲۰

افسانہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	اعصابی افسانہ	محمد یٰسین صدیقی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۵۴-

اردو زبان

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	اردو رسم الخط	رشید احمد صدیقی	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۹-۵
۲	اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ	مسعود حسین خاں	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱-۷
۳	اردو زبان کی تدریس کا جدید لسانیاتی طریق کار	عبدالغفار شکیل	۲۰	۱-۲	جنوری جولائی	۱۹۸۳ء	۱-۲۵
۴	ترکی زبان کا مشہور لفظ اردو	اکمل ایوبی	۱	۳-۴		۱۹۷۰ء	۔۔۱

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵	موجودہ ہندوستان میں اردو کی حیثیت۔	سید مقبول احمد	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۹۰-۸۹
۶	مشینی دماغ اردو کی خدمت میں۔	سید توصیف الحسن نقوی	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۹۴-۸۴
۷	ہندوستان میں اردو کا عروج و زوال	مسعود حسین خاں	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۹۷-۷۳
۸	ہندوستان میں اردو کا مستقبل	محمد محمود فیضی	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۷۶-۵۹
	اردو زبان — قواعد						
۱	اردو فعل کا تعریفی تجزیہ	اقتدار حسین خاں	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۹۱-۸۵
۲	فارسی صرفی و نحوی اثرات اردو زبان پر	نذیر احمد	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۲۱-۱
۳	قواعد صرف و نحو زبان اردو	سید احمد خاں، مرتبہ عبدالغفار شکیل	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۱۲۰-۸۷
۴	ماضی تمام کے تین صیغے	سونیا چیرنی کووا	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۴۸-۱۸
	اردو شاعری						
۱	اردو اور ہندی شاعری میں رثائی کا نیا رجحان	سمیع اللہ اشرفی	۲۵	۲-۳		۱۹۸۸ء	۶۴-۵۱
۲	اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر ۱۶۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک	محمد حسن	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۰۴-۶۷
۳	اردو شاعری میں آسمان (غالب اور اقبال)	شمس الرحمٰن فاروقی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۱۸-۱۰۸
۴	اردو شاعری میں ایہام گوئی	محمد حسن	۲	۳	"	۱۹۶۱ء	۳۹-۱۳
۵	اصوات اور شاعری	مغنی تبسم	۷	۴	"	۱۹۶۷ء	۴۷-۲۸
۶	بارہ ماسہ کا ارتقائی سفر	الطاف حسین ندوی	۲۰	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۳ء	۴۷-۲۴
۷	لوک کہانی کا مصنف اور اس کا وطن	عبدالغفار شکیل	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۱۱۴-۸۱
۸	تخلیق شعر	منظر عباس نقوی	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۷۶-۶۵
۹	جدید اردو اور ہندی کی رومانی اور چھایاوادی شاعری کے اہم رجحانات (قسط ۱)	سمیع اللہ اشرفی	۱۸	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۸۰-۶۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰-	جدید اردو اور ہندی کی رومانی اور چھایا وادی شاعری کے اہم رجحانات (قسط ۲)	سمیع اللہ اشرفی	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۱-۱۲
۱۱-	ڈرامائی شاعری	محمد تحسین صدیقی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	,,	۵۵
۱۲-	سماج اور شعر	مسعود حسین خاں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱-۴۰
۱۳-	قائم چاندپوری (انتخاب کلام)	رشید احمد صدیقی	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۹۰
۱۴-	قصۂ مہر افروز و دلبر	نثار احمد فاروقی	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۲۴
۱۵-	محمد شاہی دور کا پس منظر	محمد حسن	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۹

اس مضمون میں اردو ادب کے ایک مخصوص دور سے بحث کی گئی ہے۔ جسے ادبی لحاظ سے دہلی میں اردو شاعری کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۶-	میر انیس کا کلام اور اس میں رنگا رنگی موضوعات	نائب حسین نقوی	۱۵	۳-۴	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۲۸
۱۷-	میر انیس کی منظر نگاری	سلام سندیلوی	,,	,,	,,	,,	۱
۱۸	ناسخ کے غیر مطبوعہ قصیدے	گیان چند	۱۳	۱-۲		۱۹۷۳ء	۴۵
	اردو لغات						
۱-	فرہنگ بلخی	یوسف الدین احمد بلخی	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۴۳
۲-	,, ,, (حصہ دوم)	,, ,,	۱۰	۲		,,	۴۶
	اردو ناول ـ تاریخ و تنقید						
۱-	اردو میں ناول نگاری کا آغاز ـ ایک نیا زاویہ	اقتدار عالم خاں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۱۲۱
۲-	بیدی کی زبان	مرزا خلیل احمد بیگ	۲۵	۲-۲		۱۹۸۸ء	۱۵
۳-	شریف زادہ	خورشید الاسلام	۷	۳	اپریل	۱۹۶۷ء	۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	اکوَوان ــــ تصنیف یا ترجمہ	مسعود حسین خاں	۱۱	۲		۱۹۶۱ء	۴-۲۷
[illegible]							
۱۔	اگونڈوانا لینڈ	فخرالدین	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۶۵ء	۵۵-
[illegible]							
۱۔	اسعد میں اسلامی علوم	نذیر احمد	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۶۷-
۲۔	اسلام اور فنون لطیفہ	محمد نجات اللہ صدیقی	۱۱	۲		۱۹۶۱ء	۵۹
۳۔	اسولہ واجوبہ رشیدی	خلیق احمد نظامی	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۲۵

"اسولہ واجوبہ رشیدی" ایران کے مشہور فاضل رشیدالدین فضل اللہ کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ خواجہ رشیدا فضل اللہ عہداللہ ایرانی کے زبردست علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جن کی فہم و بصیرت اور علم و دانش کی منگولا نے سب سے زیادہ قدر کی۔ ان کو خواجہ نصیرالدین طوسی اور علاء الدین عطا ملک جوینی کا ہم پلہ قرار دیا "اسولہ واجوبہ رشیدی" کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔ زیر نظر مضمو اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	الامیون	سعید احمد اکبرآبادی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۶۳ء	۱

لفظ "اُمّی" اس کی جمع اُمّیون، قرآن کریم میں ان کے محل استعمال اور معانی و مفاہیم سے سیر حاصل بحث کی گ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	الصابئون	سعید احمد اکبرآبادی	۴	۲	جولائی	۱۹۶۳ء	۱

قرآن کریم میں چند مقامات مشکل سمجھے گئے ہیں۔ ان میں وہ آیت بھی شامل ہے جس میں صابئون کا ذکر اہل کتاب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور ان کو ایک ہی حکم کے تحت رکھا گیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں لفظ صابئون کے معا سے بحث کی گئی ہے۔ اور قرآنی آیت کی تفسیر کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	ایک فکر انگیز تصنیف کا تعارف	(ایک مبصر)	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	

زیل ہے۔ کولسن کی انگریزی تالیف A HISTORY OF ISLAMIC LAW کا تعارف۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۔	حدیث لا تسبّوا الدھر کا تاریخی پس منظر	شبیر احمد خاں غوری	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۷۴-۲۱
۸۔	حکمت و دانش (نہج البلاغہ کی روشنی میں)	وحید اختر	۲۵	۳-۴		۱۹۸۸ء	۵-۲۱
[redacted]							
۱۔	اقبال اور ان کے شارحین کے تسامحات	ایچ۔ ایم ضیاء الدین شمسی طہرانی	۷	۴	اپریل	۱۹۶۷ء	۸۵-۷۴
۲۔	" " " (قسط ۲)	" " "	۸	۱	اکتوبر	"	۶۶-۳۸
۳۔	" " " (قسط ۳)	" " "	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۶۱-۲۲
۴۔	اقبال اور شارحین اقبال کی سہل انگاریاں	" " "	۸	۳	اکتوبر	"	۱۲۳-۸۸
۵۔	اقبال اور روحانیت	محمد یٰسین	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۸۰-۶۶
۶۔	اقبال کا انسان کامل اور اسلامی تہذیب کی روح	محمد عمر	۴	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۳۸-۱
۷۔	" " " (قسط ۲)	" "	۴	۳	جولائی	"	۶۶-۳۸
۸۔	اقبال کا تصور انقلاب	فخر الاسلام	۱۸	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۲۳-۶
۹۔	اقبال کا تصور تعلیم	غلام عمر خاں	۵	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۷۷-۴۹
۱۰۔	اقبال کا تصور عشق	" "	۵	۱	جنوری	"	۹۵-۲۸
۱۱۔	اقبال کا فلسفۂ خودی	نیاز فتحپوری	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۱۱-۱۰۱
۱۲۔	اقبال کی شاعری کا حرکی پہلو	قمر غفار	۲۰	۱-۲	جنوری جولائی	۱۹۸۳ء	۶۴-۳۸
۱۳۔	ٹیگور کا ایک خط		۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۸-۱۱۶

۷ فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا حیدر آباد (دکن) کے ایک ادیب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام ٹیگور کا ایک خط جس میں انھوں نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اصل خط انگریزی میں تھا یہاں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۴۔	شاعر اعظم اقبال	رحم علی الہاشمی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۲۲-۱۱۰
[redacted]							
۱۔	زمین پر زندگی کی ابتدا	محمد معین فاروقی	۹	۳		۱۹۶۹ء	۸۶-۷۷

عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
عالمیاتی ارتقا کا مفہوم	رعایت خاں بترجمہ حبیب الرحمن چغتائی	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۲۲-۱۵
[redacted]						
ابسن کا گڑیا گھر ایک مطالعہ	اطہر پرویز	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۳۳-۲۲
ابن دحن	اگست اسٹرنبرگ بترجمہ عتیق احمد صدیقی	۱۵	۳-۴	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۹۳-۵۴
[redacted]						
بنکوں پر سماجی کنٹرول	قمر حسین فاروقی	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۹۸-۹۳
قومیائے گئے بنکوں کے مسائل و مقاصد	" " "	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۷۹-۷۳
[redacted]						
بنگالی ڈرامے کا آغاز	سید محمد ناظم	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۷۲-۴۳
[redacted]						
۱۔ پختونستان ایک تاریخی جائزہ	سید حسن علی شاہ جعفری	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۲۳-۱
[redacted]						
۱۔ احمدیہ تحقیق کی تاریخ اور اس کے مصادر	محمود حسن قیصر امروہوی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۳۳-۱
[redacted]						
۱۔ عربوں کی تاریخ نویسی۔ (قسط ۱)	ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ بترجمہ مختار احمد فاروقی	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۱۱۰-۷۷
۲۔ " " (قسط ۲)	" " "	۱۳	۱-۲		۱۹۷۳ء	۱۹-۱
۳۔ " " (قسط ۳)	" " "	۱۳	۳	اکتوبر	۱۹۷۳ء	۴۳-۲۳
[redacted]						
۱۔ ترکی میں فکر جدید کا ارتقاء	محمد صادق	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۳۷-۲۳
۲۔ ترکی نے کب اور کس طرح آذربائیجان میں راہ پائی	احمد کسروی بترجمہ کبیر احمد جائسی	۹	۳		۱۹۶۹ء	۷۹-۶۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	[illegible]						
۱۔	جدید ترکی ادب	الکسل ایرنی	۵	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۸۷-۷۸
۲۔	عاشق پاشا کی ایک مثنوی	" "	۶	۲	"	۱۹۶۵ء	۱۱۹-۱۱۱

عاشق پاشا (۱۲۷۲ء-۱۳۳۲ء) کا شمار ترکی زبان کے بلند پایہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی مشہور ترین مثنوی غریب نامہ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس مثنوی کے فنی محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۔	مولانا روم کے ترکی اشعار	الکسل ایرنی	۵	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۴-۹۹
	[illegible]						
۱۔	بحر زخار اور اس کا مصنف	مفتی محمد رضا انصاری	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۷۲-۳۵
۲۔	تصوف اور اس کے غیر اسلامی ماخذ	وحید اختر	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۴۸-۵
۳۔	تصوف پر ایک نظر	حبیب الرحمٰن شاستری	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۱۹-۱۰۵
۴۔	تصوف قبل از اسلام	محمد عرفان	۲۰	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۲۳-۱
۵۔	تصوف کی حقیقت	" "	۱۸	۲-۱	" "	۱۹۸۱ء	۴۸-۳۰
۶۔	رموز السالکین	شمیم شاہد	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۲۲-۱
۷۔	سراج المعرفت	قاضی عبدالودود	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۰-۹۰

سراج معرفت و منہاج رحمت پیری و مریدی کے سلسلہ کی ایک اہم تالیف ہے۔ اس کے مؤلف مولوی مفتی سید رحمت علی خاں ہیں۔ اس پر مرزا غالب کا دیباچہ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس کے مندرجات سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	سرور الصدور و نور البدور	خلیق احمد نظامی	۲	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۳۰-۱۲۶

سرور الصدور و نور البدور شیخ حمید الدین ناگوری اور آپ کے صاحبزادے شیخ فرید الدین محمود کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اسکا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	شیخ نظام الدین اولیاء کا متصوفانہ فلسفہ	محمد نور نبی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۸۹-۷۰

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	عروض المعانی کے قدیم فارسی ترجمے	سخاوت مرزا	۴	۳	جولائی	۱۹۶۳ء	۱۰۲-۹۸
	,, ,, ,, (تکملہ)		,,	,,	,,	,,	۱۱۱-۱۰۳
۱۰	مخ المعانی	خلیق احمد نظامی	۴	۱	جنوری	,,	۱۲۶-۱۲۱

"مخ المعانی" امیر حسن علائی سجزی معروف بہ حسن سجزی دہلوی کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۹۷ھ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱	مکتوبات شاہ محب اللہ الہ آبادی	خلیق احمد نظامی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۱۵-۱۱۲

تعلیم

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	آداب المتعلمین اور طوسی	امتیاز علی عرشی	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۲-۱
۲	جائزہ کوٹھاری کمیشن کی چند سفارشات پر ایک نظر	صابرہ زیدی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۷-۱

مشروب

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	الکحل اور ادب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں (۱۵۸۰ء-۱۶۱۲ء)	ہارون خان شروانی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۸-۱۱۳

جغرافیہ

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	جغرافیہ میں مقداری انقلاب اور اس کے مضمرات	سید محمد رفیع اللہ	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۵۴-۲۷
۲	عہد وسطیٰ میں ہندوستان اور مشرق بعید عرب جغرافیہ دانوں کی نظر میں	محمد ضیاء الدین علوی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۹۵-۸۷
۳	گذشتہ آب و ہوا و براعظموں کا کھسکنا	فخر الدین احمد	۸	۲	اپریل	۱۹۶۸ء	۶۲-۴۷

حیوانات

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	الظبی مل	ہارون رشید	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۳۲-۱۲۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	چند جھلک حیوانات ابتدائی (PROTOZOA)	رفعت محمود آفریدی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۲۱-۲۹
۳۔	حیواناتی خلیہ اور اس کے افعال	شاہ مسعود عالم	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۸۱-۹۰
۴۔	طفیلی کیڑے	نگہت ریاض	۱۳	۲	"	۱۹۷۳ء	۴۵-۵۲
	دکنی شاعری						
۱۔	حافظ تاج الدین مشتاق	ثمینہ شوکت	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۲۰-

مشتاق دکن کے ایک اہم شاعر تھے۔ یہ نابینا تھے۔ چندو لال شاداں کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کو ناسخ کا شاگرد بتایا جاتا ہے دہلی کی تباہی اور زوال پذیر ہونے کے باعث دیگر شعرا کی طرح یہ بھی شمالی ہند سے دکن ہجرت کر گئے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	[illegible]						
۱۔	ہندوستانی ہوائی ٹاک اور ریڈیشیا	محمد یٰسین	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۹۳-۱۰۱
	روسی ادب						
۱۔	چیخوف اور وجودی صورتحال	سلامت اللہ خاں	۱۵	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۸ء	۱-۱۴
	[illegible]						
۱۔	لیڈر	یوجین آئیونیسکو / مترجم عتیق احمد صدیقی	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۷۳-۸۲
	سائنس						
۱۔	سائنس اور سائنسداں	محمد معین فاروقی	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۲۷-۴۰
۲۔	سائنس اور ہم	رئیس احمد	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۱-۸
	سائنسی مسائل						
۱۔	سائنٹفک مسائل سے متعلق فرہنگ مطبوعہ خطوط (انگریزی) قسط ۱	یوسف حسین خاں	۴	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱-۵۰
۲۔	" " " (قسط ۲)	" "	۴	۳	جولائی	"	۱-۵۱
۳۔	" " " (قسط ۳)	" "	۴	۴	اکتوبر	"	۱۰۱-۱۴۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق غیر مطبوعہ خطوط (قسط ۴) (مکمل)	یوسف حسین خاں	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۱۹۰-۱۴۱
۵۔	" " " " (قسط ۵)	" "	۵	۲	اپریل	"	۲۵۰-۱۹۲
۶۔	" " " " (قسط ۶)	" "	۵	۳	جولائی	"	۳۰۰-۲۵۱
۷۔	سائنٹفک سوسائٹی میں سرسید کی پہلی تقریر	مشتاق حسین	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۱۳۴-۱۲۷

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں سرسید کی تقریر جو ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو غازیپور میں کی گئی تھی

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی	اصغر عباس	۱۳	۳		۱۹۷۲ء	۹۸-۸۱

سرسید احمد خان

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اخبار الاخیار مظفر پور اور سید احمد خاں	قاضی عبدالودود	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۳۱-۲۴
۲۔	حالی کے خطوط سرسید کے نام	اصغر عباس	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۱۴۰-۱۱۳
۳۔	زادِ راہ اور راہنما	سید حامد	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۸-۱۳
۴۔	سرسیدؒ اور قومی تحریک	نورالحسن	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۸۰-۶۳
۵۔	سرسیدؒ کا ایک لکچر	مشتاق حسین	۳	۲	جولائی	۱۹۶۲ء	۱۲۵-۱۱۹

لکچر سنہ فصلی پر، یہ لکچر سرسید نے یکم جون ۱۸۶۶ء کو سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام علی گڑھ میں دیا تھا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	سرسیدؒ کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	رشید احمد صدیقی	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۶۷-۳۵
۷۔	" " " " (قسط ۲)	" "	۶	۳	جولائی	"	۹۵-۵۶
۸۔	" " " (قسط ۳)	" "	۶	۴	اکتوبر	"	۲۷-۱
۹۔	" " " (قسط ۴)	" "	۷	۱	"	۱۹۶۶ء	۶۲-۳۱
۱۰۔	" " " (قسط ۵)	" "	۷	۳	اپریل	۱۹۶۷ء	۱۶-۱
۱۱۔	" " " (قسط ۶)	" "	۸	۱	اکتوبر	"	۸۰-۶۰

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۔	سرسید کا منفرد تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں	رشید احمد صدیقی	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۸۵-۶۷
۱۳۔	سرسید کا تصور مذہب اور اس کی عصری معنویت	وحید اختر	۲	۱-۲		۱۹۷۳ء	۴۴-۱۴
۱۴۔	سرسید کے تعلیمی تصورات	آفتاب شمسی	۱۰	۳-۴		۱۹۷۰ء	۱۰۰-۸۵
۱۵۔	سرسید کے چند خطوط	محمود الہٰی	۴	۴	اکتوبر	۱۹۹۳ء	۵۰-۲۷
۱۶۔	سرسید کے چند غیر مطبوعہ خطوط	مشتاق حسین	۴	۱	جنوری	"	۱۲۱-۱۱۷

خواجہ محمد یوسف (م۔ ۱۹۰۲ء) رئیس علی گڑھ کے نام سرسید کے سات (۷) خطوط۔

۱۷۔	سرسید کے دو غیر مطبوعہ خطوط	مختار الدین احمد	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۱۴-۱۱۳

۲۶ ستمبر ۱۸۸۴ء اور ۲ جنوری ۱۸۸۵ء کے تحریر کردہ دو نجی خط۔

۱۸۔	سرسید کے تین غیر مطبوعہ خطوط	ہارون خاں شروانی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۳-۱۰۱
۱۹۔	سرسید کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط	مختار الدین احمد	۱	۱	جنوری	"	۱۰۵-۲۴
۲۰۔	سرسید کے مخالفین	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۴۳-۲۱۱
۲۱۔	سوانح سرسید کا ایک قدیم ماخذ	محمود الہٰی	۶	۱	جنوری	۱۹۷۵ء	۵۵-۴۹
۲۲	سید احمد خاں کی مہم پنجاب - ایک صدائے بازگشت	سید حسن احمد	۲۵	۲-۳		۱۹۸۸ء	۴۲-۳۰
۲۳	معمار قوم	عتیق احمد صدیقی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۴۳-۳۲
۲۴	مکاتیب سرسید	(ادارہ)	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۳۰-۱۲۹

نواب محمد مزمل اللہ خاں شروانی رئیس بھیکم پور کے نام سرسید کے تین خطوط جو علی الترتیب اگست ۱۸۹۴ء ستمبر ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۵ء کو لکھے گئے۔ ان میں سے پہلے خط میں منزل میں روشنی کے لیے چندے کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ دوسرے خط میں غبن کا تذکرہ ہے اور تیسرے خط میں نواب صاحب کی اہلیہ کی وفات پر تعزیت کی گئی ہے۔

۲۵۔	مکاتیب سرسید	اکبر علی خاں	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۳۶-۱۲۵

نواب قلب علی خاں والی رامپور کے نام سرسید کے دو خطوط۔ پہلا خط اردو میں ہے اور دوسرا انگریزی میں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۶	مکتوب سرسید	مختار الدین احمد	۲	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۹۹-۹۸

۲۹ اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھا گیا وقار الملک کے نام سرسید کا ایک خط۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۷	مکاتیب سرسید (مکتوب ۱۸ تا ۳۱)	مختار الدین احمد	۱	۲	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۳۰-۱۰۵
۲۸	" " (مکتوب ۳۲-۴۴)	" "	۱	۴	اکتوبر	"	۱۴۸-۱۲۵
۲۹	" "	نورالرحمٰن	۵	۲	جولائی	۱۹۶۴ء	۱۰۷-۱۰۳

نورالرحمٰن صاحب کے دادا مولوی منظہر اللہ متوطن بچھرایوں ضلع مرادآباد کے نام سرسید کے تین خطوط۔

سماجیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	امداد باہمی اور ہمارا سماج	عشرت حسین فاروقی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۷۳-۶۶
۲	انسانیت کا عروج و زوال	یوسف حسین خاں	۱	۲	جولائی	۱۹۶۰ء	۲۲-۱
۳	" " " (قسط ۲)	" "	۱	۴	اکتوبر	"	۱۱۵-۸۹
۴	" " " (قسط ۳)	" "	۲	۲	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۴۴-۱۰۹
۵	" " " (قسط ۴)	" "	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۲۷-۱
۶	پولیٹکل سوشیالوجی	ابوالفضل عثمانی	۸	۲	"	۱۹۶۸ء	۷۳-۶۲
۷	پولیٹکل سوشیالوجی کے بنیادی مسائل اور پولیٹکل کلچر	" "	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۵۰-۳۷
۸	سماجی تحفظ اور ہندوستانی مسلمانوں کی رقابت	نجم الحسن	۱۲	۳	اکتوبر	۱۹۷۲ء	۲۲-۱
۹	مارکس اور ہیگل کے فلسفوں کی تطبیق	ظفر احمد صدیقی	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۲۰-۵
۱۰	لسانی تعصب اور قومی یکجہتی	انوار الحق حقی	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۶۴-۵۳

سیاسیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	ارسطو کے سیاسی نظریے	معین المظفر	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۰۹-۶۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲	امن عالم اور قومی اقتدار اعلیٰ	انوار الحق حقی	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۳۰-۱۶
۳	بین الاقوامی سیاست سرد جنگ	" "	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۳۲-۱۰
۴	سیاسی نظام اور اثر انداز سماجی گروپ	ابوالفضل عثمانی	۱۰	۴-۳		۱۹۷۰ء	۱۰-۵۹
۵	علم طبقات سیاسی	" "	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۹۳-۵۴
۶	فارابی کے سیاسی افکار	شبیر احمد خاں غوری	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۹۳-۷۹
۷	محکوم اقوام کی بہبود کا اور بین الاقوامی ذمہ داری	سید حسن احمد	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۶۳-۲۰
۹	میکیاویلی کے سیاسی نظریے	انوار الحق حقی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۲۹-۱

میکیاویلی (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء) اٹلی کا مشہور سیاست داں اور مفکر تھا۔ اس کی دو کتابیں "حکمران اور مقالات" بہت مشہور رہیں۔

صنعت و تجارت

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	تجارتی اداروں کی سماجی ذمہ داریاں	نفیس بیگ	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۵۲-۴۸
۲	ہندوستان میں صنعتی و تجارتی تعلیم	قمر حسین فاروقی	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۱۸-۷

طبیعیات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	پلوٹونیم: حرارتی مفاعلوں کے لیے ایک اور ایندھن	حبیب الحق انصاری	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۲۵-۳۳
۲	تصورات مروزی جدید طبیعیات	عبدالسلام	۱۴	۲-۱	" "	"	۲۶-۱
۳	تلاش حق	رئیس احمد	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۹-۱
۴	خلا سے جان پہچان	سید المظفر چغتائی	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۲۰-۱۰۷
۵	کائناتی شعاعوں، ابتدائی ذراتی طبیعیات اور نجمی طبیعیات کا دوسرا سمپوزیم	رئیس احمد	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۹۲-۹۱

...وان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
...علی وجود ہے؟ (QUARK	محمد ظل الرحمٰن خاں	۱۱	۱	مئی	۱۹۷۱ء	۱۱۲-۱۱۰
...ت	سید الظفر چغتائی	۱۳	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۲۸-۱۲۱
...یروں کی ادبی حیثیت	محمد راشد ندوی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۴۶-۳۲
...عباسی کا شہرۂ آفاق شاعر عمر ریشہ)	مسعود انور علوی کاکوروی	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۵۸-۲۱
" " (قسط ۲)	" " "	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۶۶-۲۷
...حیات اور کارنامے	سمیع اللہ اسد	۱۶	۱-۴		۱۹۷۹ء	۱۸۲-۱۶۱
...جاہلی دور کا نامشدہ شاعر	غلام مصطفیٰ	۱۶	۱-۴		"	۳۲-۱
...ربی شاعری کی قدر و قیمت	حامد علی خاں	۲۰	۳-۴		۱۹۸۳ء	۹۲-۵۹
...ثر نگاری اور محمود العقاد	محمد راشد ندوی	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۶۰-۴۵
...اعری اور فنی نقائص	عبد الباری	۱۶	۱-۴		۱۹۷۹ء	۸۴-۵۰
...ہیم (عصر جدید کا ایک سماجی شاعر)	سید احتشام احمد ندوی	۴	۲	اپریل	۱۹۶۴ء	۷۲-۶۰
...کا فنکار (توفیق الحکیم)	محمد راشد ندوی	۱۶	۱-۴		۱۹۷۹ء	۲۱۶-۱۸۴
...بانی عربی ناول نگاری تک	بدر الدین	۱۸	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۱ء	۵-۱
...میں تنقیدی رجحانات		۹	۳		۱۹۶۹ء	۴۵-۳۴
...بارے میں سرسید کے خیالات	سید احمد خاں	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۰-۹۰
	حامد علی خاں	۱۶	۱-۴		۱۹۷۹ء	۱۲۰-۸۵
...ادب میں قصہ گوئی	محمد مہدی انصاری	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۱۴۰-۱۲۷
	غلام مرتضیٰ	۱۶	۱-۴		۱۹۷۹ء	۴۹-۳۳
...جدید عربی ناول نگاری کا علم بردار	بدر الدین	۱۷	۱	جنوری	۱۹۸۰ء	۹-۱

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۸۔	مصر کا ایک نامور مصنف — احمد امین	مختار الدین	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۸۱-۷۵
۱۹	مصری ادب میں ڈراما نگاری کا ارتقاء	محمد اسلم اصلاحی	۱۷	۱	"	۱۹۸۰ء	۴۴-۱۰
۲۰۔	مصری افسانہ نگاری کے جدید رجحانات	محمد راشد	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۴۵-۲۷
۲۱۔	نہج البلاغہ	خلیق احمد نظامی	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۸-۱۰۵

"نہج البلاغہ" کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۲۔	نہج البلاغہ کا تنقیدی مطالعہ	سید محمود حسن قیصر	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۲۹-۱۷
۲۳۔	ہندوستان میں عربی شاعری کا ارتقاء	محمد اسلم اصلاحی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۲۵-۱۲

جراحیات [illegible]

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	رموز جراحت	نسیم انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۲۶-۲۰
۲۔	سرجری	" "	۱۴	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۱۰۶-۹۵

طب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	تسمم درقی (THYROTOXICOSIS)	سید مسعود اشرف	۸	۴		۱۹۶۸ء	۹۹-۹۲
۲۔	دو نادر طبی مخطوطات	کمال الدین حسینی	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۴ء	۲۴-۱۷
۳۔	صحت قلب	" " "	۱۹	۳-۴	" "	۱۹۸۲ء	۱۱-۱
۴۔	کینسر	نسیم انصاری	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۲۶-۲۳
۵۔	معالجات بقراطیہ اور طبی [illegible]	شفقت اعظمی	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۱۶-۱

[illegible]

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	اشاریہ فکر و نظر	احتشام بن حسن	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۱۲۷-۱۱۴
۲۔	تنسیق علوم کی اجمالی تاریخ	محمود حسن قیصر امروہوی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۱۰۷-۷۳

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
.	کتاب نمبر	محمود حسن قیصر امروہوی	۴	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۷۳-۱۰۷
	مشرقی کتب خانے اور ان کی جدید تکنیکی تنظیم	″ ″ ″	۱۵	۱-۲	مارچ جون	۱۹۷۸ء	۷۱-۹۸
	[illegible]						
	ایم۔اے۔او۔ کالج سے متعلق غیر مطبوعہ خطوط	یوسف حسین خاں	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۲۰۱-۲۰۵
.	″ ″ ″ (قسط ۲)	″ ″	۶	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۲۵۱-۲۶۹
۱۔	پیر بہیر احسن نے اپنا قصہ	رشید احمد صدیقی	۳	۳	جولائی	۱۹۶۳ء	۴۷-۷۹
۴۔	سلام ہو تجھ پر	″ ″ ″	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۵۶-۸۱
۵۔	سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	″ ″ ″	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۶۵-۱۱۹
۶۔	″ ″ ″ ″ (قسط ۲)	″ ″ ″	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱-۴۸
۷۔	عزیزانِ علی گڑھ	″ ″ ″	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۹۹-۱۰۶
۸۔	″ ″ ″ (قسط ۲)	″ ″ ″	۱۲	۳		″	۱۴۱-۱۸۲
۹۔	″ ″ ″ (قسط ۳)	″ ″ ″	۱۳	۱-۲		۱۹۷۳ء	۷۵-۱۰۲
۱۰۔	علی گڑھ اور عصر حاضر	آل احمد سرور	۲۲	۱-۳	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۹-۲۴
۱۱۔	وقار الملک اور محسن الملک کے خطوط	مشتاق حسین	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۸۰-۹۲
۱۲۔	یہ کارواں ہمارا (اداریہ)	نور الحسن نقوی	۲۲	۱-۳	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۵-۷
۱۳	″ ″ ″ ″	″ ″	۲۳			۱۹۸۶ء	۵-۶
	غالب، مرزا اسد اللہ خاں						
۱۔	آب حیات میں مرزا کے ذاتی حالات	محمد انصار اللہ	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۰۵-۱۱۱
۲۔	پورے غالب	آل احمد سرور	۹	۲		″	۱۱۲-۱۶۶
۳	غالب کا محبوب	شمس الرحمٰن فاروقی	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۸۲-۹۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	غالب کی فارسی غزل گوئی	کبیر احمد جائسی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۳۶-۲۷
۵۔	غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ	قاضی عبدالودود	۱	۲	اپریل	۱۹۷۰ء	۹-۱
	غالب کے کلیات نظم فارسی کے قلمی نسخہ مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کا تعارف۔						
۶۔	غالب کے کچھ سن و سال	حامد حسن قادری	۱۷	۴		۱۹۷۲ء	۴۴-۱
۷۔	کلام غالب کا جمالیاتی مطالعہ	نور الحسن نقوی	۲۵	۳-۲		۱۹۸۸ء	۵۰-۴۳
۸۔	لکھنؤ کی شاعری پر غالب کا اثر	رحم علی الہاشمی	۹	۲		۱۹۶۹ء	۶۸-۵۷
۹۔	مثنوی ابر گہر بار کا تنقیدی مطالعہ	سید وحید اشرف	۹	۲		"	۵۶-۲۷
۱۰۔	مرزا غالب کا بچپن	واقف مراد آبادی	۹	۲		"	۹۶-۷۹
۱۱۔	مغنی نامہ	خورشید الاسلام	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۹۰-۸۱

"غالب کی ایک فارسی مثنوی جس کا عنوان "یا اسداللہ الغالب" ہے، بے تال و بے تکلف دنیا کی چند اچھی نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ "مغنی نامہ" اس کا ایک حصہ ہے جس میں غالب نے شعر اور موسیقی، فن اور فرد خلاق کی سیرت اور خود اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ چونکہ ایک مختصر مضمون میں اس کے ظاہری اور معنوی پہلوؤں پر جامع تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس مثنوی کے چند بنیادی خیالات پیش کرنے پر قناعت کرتا ہوں۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۔	نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب	آل احمد سرور	۹	۲		۱۹۶۹ء	۱۰۴-۹۷
۱۳۔	نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب	اشرف رفیع	۱۱	۴		۱۹۷۱ء	۱۱۲-۹۳

فارسی ادب

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	ابوالقاسم لاہوتی	کبیر احمد جائسی	۲۱	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۴ء	۱۶-۱
۲۔	الحاق اور دیوان انوری مرتبۂ پروفیسر نفیسی	نذیر احمد	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۲۲-۱۰۹
۳۔	ایران کی دو معاصر شاعرات	منیب الرحمٰن	۸	۱	اکتوبر	۱۹۶۷ء	۹۸-۹۱

"پروین اعتصامی" اور "فرخ زاد" کی شاعری اور فن پر تبصرہ۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴-	تذکرہ مخزن الغرایب کا ایک مکمل اور قدیم ترین مخطوطہ	اکبر حیدری کاشمیری	۱۲	۳	اکتوبر	۱۹۷۲ء	۸۲-۶۵

"مخزن الغرایب" مولفہ شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی' فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس کا قدیم ترین قلمی نسخہ ۱۲۱۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ راجہ محمود آباد صاحب کے کتابخانہ میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵-	حافظ شیرازی کی ایک نایاب تاریخی غزل		۱۲	۴		۱۹۷۲ء	۹۳-۷۳
۶-	حافظ شیرازی کے دو قدیم ترین ماخذ یعنی لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی	نذیر احمد	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۸۶-۷۳
۷-	دیوان حافظ	خلیق احمد نظامی	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۱۵۲-۱۳۷

"دیوان حافظ" کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸-	دیوان سراجی	نذیر احمد	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۰۵-۱۰۰
۹-	دیوان نوعی	قاضی عبدالودود	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۷۱-۵۸

"دیوان نوعی" کا ایک نادر مخطوطہ مکتوبہ ۱۰۱۹ھ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰-	سامانی عہد کا نثری ترجمۂ کلیلہ و دمنہ	راج اینل پرشاد جلیسل	۳	۴	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۶۴-۴۶
۱۱-	سلاطین و اُمرائے مغلیہ کا نیا کلام	نذیر احمد	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۷۵-۴۹
۱۲-	شاہان شرقی کے دور کا ایک شاعر (ملک عزیز اللہ بسطامی)	" "	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۵۳-۴۳
۱۳-	شیراز ہند جونپور کا مایۂ ناز صوفی شاعر نور محمد شاہ کامیاب جبرحدی	شمس عالم خاں	۱۷	۲	اپریل	۱۹۸۰ء	۵۸-۴۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۴۔	عبد العظیم قریب	کبیر احمد جائسی	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۱۰۵-۷۹
۱۵۔	عرفی شیرازی	نبی ہادی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۸۷-۷۵
۱۶۔	عہد حافظ کی ادبی روایت	کبیر احمد جائسی	۶	۳	جولائی	۱۹۶۵ء	۱۰۳-۸۶
۱۷۔ ۱۷۔	عہد شاہجہانی کا ایک قابل توجہ شاعر یمن سعید قریشی	امیر حسن عابدی	۳	۱	جنوری	۱۹۶۲ء	۱۰۳-۹۵
۱۸۔	فرائد غیاثی اور ہندوستان	نذیر احمد	۶	۴	اکتوبر	۱۹۶۵ء	۱۱۲-۸۷

فرائد غیاثی فارسی رقعات کا ایک اہم اور ضخیم مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب جلال الدین یوسف ہیں۔ اس میں دوسری صدی ہجری کے اواسط نویں صدی ہجری کے تقریباً دو سو مشاہیر کم و بیش آٹھ سو خطوط شامل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۹۔	مثنوی شمع و پروانہ	اکبر الدین صدیقی	۱۲	۳	اکتوبر	۱۹۷۲ء	۶۴-۵۳
۲۰۔	" " (قسط ۲)	" "	۱۲	۴	دسمبر	"	۱۸-۱

"شمع و پروانہ" اہلی شیرازی کی مشہور مثنوی ہے۔ قسط اول میں اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اور دوسری قسط میں اس کا متن پیش کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۱۔	محاکمات الشعراء	عبد القادر سروری	۴	۲	اپریل	۱۹۶۳ء	۵۹-۴۹

محاکمات الشعراء میر محمد محسن محسن کا ایک اہم رسالہ ہے جس میں شیخ علی حزیں اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ادبی تنازعے پر محاکمہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۲۔	مرگِ مادر (افسانہ)	علی دشتی، مترجمہ راشد حسین	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۶۸-۶۰
۲۳۔	مولانا حمید الدین قلندر اور ان کے چند ہم عصر شعرا	نذیر احمد	۶	۲	اپریل	۱۹۶۵ء	۲۴-۱
۲۴۔	عرض احوال مولانا احمد بن محمد کاتب اصفہانی	" "	۲	۳	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۵۲-۱۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

"مونس الاحرار" فارسی اشعار کی نہایت اہم بیاض ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۲۵۔	نفائس المآثر۔	خلیق احمد نظامی	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۱۲۹-۱۴۲

"نفائس المآثر" عہد اکبری کے مشہور ادیب اور مورخ میر علاء الدولہ کامی قزوینی کی تالیف ہے جس میں سولہویں صدی عیسوی کے فارسی شعراء اور شاہان مغلیہ کے حالات درج ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں اس کا قدیم ترین نسخہ محفوظ ہے۔ یہاں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۲۶۔	طوطی ہند (حضرت امیر خسرو)	قمر غفار	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۵۹-۶۸
۲۷۔	چہار مقالہ کا سال تصنیف	شبیر احمد خاں غوری	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۵۵-۷۱
۲۸۔	چہار مقالہ	نذیر احمد	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۷-۱۱۲

"چہار مقالہ" کا اصل نام "مجمع النوادر" ہے۔ اس کا شمار فارسی نثر کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی ہے جس نے ۵۵۰ھ کے قریب اسے تالیف کیا۔ زیر نظر مضمون میں اس کی فنی اور ادبی حیثیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

فارسی زبان

۱۔	امیر خسرو کا فارسی تلفظ (بحث و تحقیق)	امتیاز علی خاں عرشی	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۳۲-۵۲
۲۔	پہلوی زبان	سید وحید اشرف	۹	۳		۱۹۶۹ء	۴۶-۶۴
۳۔	فارسی املا کے مسائل	نذیر احمد	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۴۷-۷۲
۴۔	فارسی زبان کا ارتقاء	علی اصغر حکمت، مترجمہ ضیاء الدین انصاری	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۴۵-۵۵
۵۔	ہائے مختفی اور اس سے متعلق دستور علم و املا کے مسائل	نذیر احمد	۱۲	۱-۲		۱۹۷۲ء	۵۳-۷۶

فارسی لغات

۱۔	تیغ تیز	قاضی عبد الودود	۲	۳	جولائی	۱۹۶۱ء	۴۰-۵۴

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	فارسی کی ایک قدیم فرہنگ زفان گویا	سید حسن	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۸۰-۹۵
۳۔	فرہنگ نامۂ قواس	نذیر احمد	۷	۳	"	۱۹۶۵ء	۱-۵۵
	فرانسیسی ادب						
۱۔	بالزاک کا آرٹ*	یوسف حسین خاں	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۸۱-۹۲

*بالزاک (BALZAC) فرانس کا مشہور ناول نگار تھا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	فلسفہ						
۱۔	ابن تیمیہ بحیثیت مفکر و مصلح	محمد عمر الدین	۳	۳	جولائی	۱۹۶۲ء	۲۵-۴۶
۲۔	برٹرینڈ رسل کا تحلیلی فلسفہ	انتظار الحق	۱۸	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۱-۲۹
۳۔	" " " (قسط ۲)	" "	۱۸	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۲۵-۴۳
۴۔	جدیدیت کے بنیادی تصورات	وحید اختر	۸	۳	جولائی	۱۹۶۸ء	۱۵-۴۲
۵۔	جی۔ ای۔ مور۔ بیسویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی فلسفی	محمد انتظار الحق	۱۹	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۲۴-۴۳
۶۔	" " (قسط ۲)	" "	۲۰	۳-۴		۱۹۸۳ء	۱-۳۲
۷۔	" " (قسط ۳)	" "	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۱-۲۹
۸۔	فلسفہ سائنس اور مذہب	ذوالفقار احمد	۲۱	۳-۴	جولائی دسمبر	"	۷۶-۸۱
۹۔	مسکویہ کا تصور ارتقاء	عبید الحق	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۵۵-۶۹
	کتب خانے						
۱۔	کتاب خانۂ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد	سید فیضی علی	۱۹	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۲ء	۴۷-۵۴
۲۔	کتاب خانۂ حبیب گنج	نذیر احمد	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۹۳-۱۱۸

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	کتابیات						
۱۔	نقشِ ذاکر ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصانیف کی وضاحتی فہرست۔	محمد ضیاء الدین انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	۲۹-۱۹
	گاندھیات						
۱۔	گاندھی جی	برہم دت	۹	۴		۱۹۶۹ء	۵۰-۴۳
۲۔	گاندھی جی اور اسلام	سید مقبول احمد	۹	۴		"	۴۳-۲۴
۳۔	گاندھی جی اور قومی تعلیم	سید محمد ضیاء الدین علوی	۹	۴		"	۹۸-۸۵
۴۔	گاندھی جی اور مسئلہ تعلیم	" "	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۷۷-۶۶
۵۔	گاندھی جی اور ہندوستان کا لسانی مسئلہ	عبدالغفار شکیل	۹	۴		۱۹۶۹ء	۱۲۶-۹۹
۶۔	گاندھی جی کا تصورِ حق	سعید احمد اکبرآبادی	۹	۴		"	۱۶-۷
۷۔	گاندھی جی کا سیاسی فلسفہ	محمد ہاشم قدوائی	۹	۴		"	۷۷-۵۱
۸۔	گاندھی جی کا فلسفۂ تعلیم	سید محمد ضیاء الدین	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۸۷-۸۱
۹۔	گاندھی جی کی عظمت کا راز	ریاض الرحمٰن خاں شروانی	۹	۴		۱۹۶۹ء	۸۴-۷۸
۱۰۔	مہاتما گاندھی اور فرقہ واریت	ہربنس لال شرما	۹	۴		"	۲۳-۱۷
	لسانیات						
۱۔	اردو مارفالوجی کا خاکہ	اقتدار حسین خاں	۱۵	۴-۳	ستمبر دسمبر	۱۹۷۸ء	۵۲-۴۴
۲۔	زبان اور بولیاں	عبدالغفار شکیل	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۴۵-۴۱
۳	زبان کیا ہے	عتیق احمد صدیقی	۸	۳	اپریل	"	۹۰-۶۹
۴۔	لسانیات - عہد بہ عہد	" " "	۸	۴	جولائی	"	۱۱-۷۵
	ماحولیات						
۱	ہندوستان میں کثافتِ آب و ہوا - ایک جائزہ	محمد اجمل	۱۸	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۱ء	۰-۴۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	مذہب						
۱۔	احوال نامہ بایزید انصاری	خلیق احمد نظامی	۱	۱	جنوری	۱۹۶۰ء	۱۲۵-۱۴۷

"حالنامہ" تحریک روشنائی کے بانی بایزید انصاری (۱۵۲۸ء تا ۱۵۸۱ء) کے حالات میں ایک اہم تالیف ہے اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	دساتیر پر ایک نظر	نذیر احمد	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۰-۴۲
۳۔	فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر	" "	۱	۳	جولائی	"	۴۳-۵۸
	مشرق وسطیٰ						
۱۔	عرب قوم پرستی۔ ایک تاریخی جائزہ	محمد اقبال انصاری	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۴ء	۵۴-۷۲
۲	مغربی ایشیا میں فوجی انقلاب	شاہ عبدالقیوم	۱۲	۳		۱۹۷۲ء	۶۵-۸۰
	معاشیات						
۱۔	ابو یوسف کا معاشی فکر	نجات اللہ صدیقی	۵	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	۶۹-۹۵

قاضی ابو یوسف خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ "کتاب الخراج" ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انتظامی اور معاشی امور بالخصوص محاصل اور ان کی شرعی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۔	بیرونی امداد اور ہندوستان کی اقتصادی ترقی	محمد شمیر خاں	۸	۳	اپریل	۱۹۶۸ء	۲۱-۴۶
۳۔	بین الاقوامی اقتصادی عدم مساوات اور تجارتی پالیسی	ادریس احمد قریشی	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۲۳-۳۶
۴۔	ترقی کے دس برس میں مجلس اقوام متحدہ کا حصہ	محمد شمیم خاں	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۷-۱۵
۵۔	جواہر لال نہرو اور ہندوستان کی معاشی ترقی	اولاد احمد صدیقی	۷	۳	اپریل	۱۹۶۷ء	۴۴-۵۲

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	راناڈے کا معاشی فکر	اولاد احمد صدیقی	۸	۲	جنوری	۱۹۶۸ء	۲۱-۵
۷۔	قدیم ہندوستان میں اقتصادی نظام	نور محمد	۱۵	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۸ء	۷۰-۶۲
۸۔	کینز اور ہم	اولاد احمد صدیقی	۱۲	۲-۱		۱۹۷۲ء	۱۱۱-۴۹

"مشہور ماہر اقتصادیات مے نارڈ کینز کے اقتصادی نظریات اور اس کی تصانیف سے بحث۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	اگرکھلے اور ان کا عہد	اولاد احمد صدیقی	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۴۰-۲۵

"اس مضمون کا مقصد اُن اہم معاشی مسائل کا تنقیدی جائزہ لینا ہے جو انیسویں صدی کے نصف آخر سے لیکر پہلی جنگ عظیم تک ہندوستان کی معیشت پر اثر انداز رہے۔ ان مسائل پر جن اشخاص نے اظہار خیال کیا ہے ان پر مہادیو گووند راناڈے، دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمیں اس وقت گوکھلے کے کارنامے اور شخصیت سے بحث ہے۔"

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۔	مبادلات خارجہ کی ترتیب نو پر ایک نظر	نجم الحسن	۱۲	۲-۱		۱۹۷۲ء	۱۹-۵
۱۱۔	معاشی جائزہ: چوتھے پنج سالہ منصوبہ کا خاکہ	اولاد احمد صدیقی	۷	۱	اکتوبر	۱۹۶۶ء	۱۲-۹۱
۱۲۔	معاشیات پس ماندگی	" "	۱۱	۳		۱۹۷۱ء	۴-۴۹
۱۳۔	نظریۂ قدر محنت	" "	۱۳	۴	دسمبر	۱۹۷۳ء	-۴۶
۱۴۔	ہمارا تیسرا پنج سالہ منصوبہ	نجات اللہ صدیقی	۳	۱	جنوری	۱۹۶۴ء	-۱
۱۵۔	ہماری معاشی منصوبہ بندی	محمد شبیر خاں	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	-۱
۱۶۔	ہندوستان کی منصوبہ بندی میں حکمت عملی	" " "	۷	۴	جولائی	۱۹۶۷ء	-۱
۱۷۔	ہندوستان کے سرکاری منطقہ میں متوازن بورڈ کی ضرورت	قمر حسین فاروقی	۷	۳	اپریل	"	۸۳
۱۸۔	ہندوستان میں حالیہ معاشی پس روی	مسعود حسن	۱۰	۱		۱۹۷۰ء	۱۳

شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
-	ہندوستانی معیشت ۱۹۸۰ء میں	امداد احمد صدیقی	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۹-۱
	مصر						
-	انیسویں صدی میں مصر کے تعلیمی رجحانات اور شیخ محمد عبدہ	محمد راشد	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۷۳-۵۱
-	مصر کی ایک سیاسی اور سماجی تحریک	" "	۱۰	۳-۴		"	۱۷۸-۱۰۸
	منطق						
-	جدید ریاضی میں منطق کی اہمیت	محمد ابوالکاظم	۱۴	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۸۲-۷۹
	نباتات						
-	جنین شجر کی مصنوعی پرورش اور اس کی اہمیت	رعایت خاں	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۸۸-۷۸
	نفسیات						
-	آپ وسوسوں کو روک سکتے ہیں۔	مترجمہ: سید صدیق حسن کرد[illegible]	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۰۹-۱۰۱

YOU CAN RESIST TEMPTAION BY SMILEY BLANTON کا اردو ترجمہ

شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲-	انسانی فطرت کے حدود و ثغور	اے۔ ایچ۔ میسلو؛ مترجمہ معزز علی بیگ	۹	۳	-	۱۹۶۹ء	۳۳-۲۲
۳-	انگریزی حکمراں طبقہ کا کردار کا نظریاتی پس منظر	امداد احمد صدیقی	۸	۴	جولائی	۱۹۶۸ء	۱۴-۷
۴-	ایک نفسیاتی مسئلہ	اے۔ ایچ۔ میسلو؛ مترجمہ معزز علی بیگ	۹	۱	اکتوبر	"	۲۸-۷

A.H. MASLOW کے ایک مضمون کا ترجمہ۔

شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵-	جدید نفسیات اور انسان کے اخلاقی کردار کا مسئلہ	معزز علی بیگ	۷	۲	جنوری	۱۹۶۷ء	۶۵-۲۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
-	جدید نفسیات اور انسان کے اخلاق کردار کا مسئلہ (قسط ۲)	معز زعلی بیگ	۷	۳	اپریل	۱۹۶۷ء	۶۲-۵۳
۷	علامت کا تصور	ابن فرید	۸	۴	جولائی	۱۹۶۸ء	۷۳-۴۴
۸	فرائڈ کا نظریۂ لاشعور	ظفر احمد صدیقی	۷	۲	اپریل	۱۹۶۷ء	۶۲-۵۲
۹	فلسفہ اور تحلیل نفسی	" " "	۱۰	۲		۱۹۷۰ء	۳۲-۱۹
۱۰	مضطرب طالب علم	اولاد احمد صدیقی	۱۰	۴-۳		"	۷۷-۷۲
۱۱	وجودی تحلیل نفسی	ظفر احمد صدیقی	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۴۶-۲۷

وسط ایشیا

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	عہد وسطیٰ میں یورپ اور وسطی ایشیا	سید محمد ضیاء الدین علوی	۷	۴	جولائی	۱۹۶۷ء	۶۴-۵۴

ہندوستان

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱	براعظم گونڈوانہ لینڈ کے خاکے میں افریقہ کے بالمقابل ہندوستان کا مقام	فخرالدین احمد	۱۰	۴-۳		۱۹۷۰ء	۵۸-۲۵
۲	تاریخ بیہقی — ایک مطالعہ	قمر غفار	۲۱	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۴ء	۳۶-۲۵
۳	ذخیرۃ الخوانین کا ایک اہم نسخہ	محمد شمعون اسرائیلی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۵۲-۳۳

ذخیرۃ الخوانین دور اکبری سے عہد شاہجہانی تک کے امراء و خوانین کا تذکرہ ہے اس کے مصنف شیخ فرید بھکری ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نسخہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴	ذکر ملوک	خلیق احمد نظامی	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۳۴-۱۳۱

"ذکر ملوک" شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تالیف ہے جس میں سلطان معزالدین محمد بن سام کے زمانے سے لے کر عہد اکبری تک کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ جو ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء کا مکتوبہ ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی مخطوطہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	سترہویں صدی کے ایک فرانسیسی سیاح کے تاثرات	خلیق احمد نظامی	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۵۰-۴۳

فرانسیسی سیاح برنیر (BERNIER) کے ہندوستان کے سفر نامے پر تفصیلی بحث۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۔	سلاطین گجرات کی ایک نادر تاریخ	نذیر احمد	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۔۴۲

تاریخ گجرات کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی مخطوطہ کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۔	طبقات اکبری	خلیق احمد نظامی	۱	۲	اپریل	۱۹۶۰ء	۱۴۷-۱۴۱

طبقات اکبری عہد اکبری کے مشہور مورخ نظام الدین احمد بخشی کی تالیف ہے جس کا قدیم ترین قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مضمون میں اسی نسخہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	محمود شاہ تغلق کے ایک فرمان کی بابت آزاد بلگرامی کی شہادت	نذیر احمد	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۸۹-۸۴
۹۔	مرزا عزیز کوکہ	ام ہانی فخر الزماں	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۲۰-۱۱۹
۱۰۔	عربوں کے ہندوستان پر احسانات	سید مقبول احمد	۷	۳	جولائی	۱۹۶۷ء	۸۲-۷۷
۱۱۔	ہندوستان قزوینی کے بیانات کی روشنی میں	محمود حسن قیصر امروہوی	۹	۱	جنوری	۱۹۷۵ء	۱-۸۴
۱۲۔	ہندوستان میں انسانی معیار کی بلندی اور بقا کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت	قمر حسین فاروقی	۱۰	۲		۱۹۷۱ء	۶۲-۵۵
۱۳	ہندوستان میں جمہوریت اور اس کا مستقبل	معراج احمد	۱۷	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۱۶-۱۰

[redacted]

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۔	انڈین نیشنل کانگریس کی صد سالہ تاریخ	محمد انظار الحق	۲۲	۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء	۱۰۵-۹۹
۲۔	اودھ اور جنگ آزادی	میرزا کوکب قدر	"	"	"	"	۴۹-۴۶
۳۔	جنگ آزادی میں اردو کا حصہ	محمد قاسم صدیقی	"	"	"	"	۵۲-۵۰

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	چند مسلم مجاہدین آزادی	سید مشرف علی	۲۲	۴	اکتوبر	۱۹۸۵ء	۱۴۸-۱۴۳
	خلافت تحریک	اخلاق احمد	"	"	"	"	۶۵-۵۴
	ریشمی رومال تحریک	محمد صلاح الدین عمری	"	"	"	"	۳۱-۲۶
	سراج الدولہ۔ایک مدبر حکمران	ریشماں سہیل	"	"	"	"	۱۴۲-۱۲۸
	شاہ ولی اللہ کا مجاہدانہ اور قائدانہ کارنامہ	سید ابوالحسن علی ندوی	"	"	"	"	۲۰-۱۳
	شہید آزادی۔سید احمد شہید	عتیق احمد صدیقی	"	"	"	"	۲۵-۲۰
-۱	علی گڑھ اور تحریک آزادی	وصی الرحمٰن	"	"	"	"	۱۲-۶
-۱	مجاہد آزادی۔ٹیپو سلطان	ظفر الاسلام	"	"	"	"	۱۳۷-۱۲۶
-۱۲	مسلم لیگ کی تاریخ	عبید اللہ فہد	"	"	"	"	۱۲۵-۱۱۹
-۱۳	ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی	شجاع الدین فاروقی	"	"	"	"	۴۵-۳۲
-۱۴	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جمعیۃ علما کا حصہ	محمد ضیاء الدین انصاری	"	"	"	"	۱۱۸-۱۰۶
	ہندی ادب						
۱	چھایاواد	زیدی جعفر رضا	۱۵	۲-۱	مارچ جون	۱۹۷۵ء	۹۲-۱۷
-۲	سید غلام نبی رسلین بلگرامی کے متفرق ہندی گیت	" "	۶	۱	جنوری	۱۹۶۵ء	۱۲۰-۵۶
-۳	مولانا داؤد اور ان کی چنداین	الطاف حسین ندوی	۱۷	۴-۳	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۴۹-۳۱
-۴	میرابائی اور راس کے گیت	نورالحسن نقوی	۱۹	۲-۱	جنوری جون	۱۹۸۲ء	۹۶-۷۷
۵	نرالا کی شاعری	سری نواس لاہوٹی	۵	۳	جولائی	۱۹۶۴ء	۱۰۳-۹۴
	[illegible]						
-۱	ہندی ناٹک المیہ	اسلوب احمد انصاری	۱	۱	جنوری	۱۹۷۰ء	۶۲-۴۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	مشاہیر [illegible]						
۱۔	آرزو بلگرامی۔ صفیر بلگرامی (خط کے آئینے میں)	مرتضیٰ حسین بلگرامی	۱۷	۳-۴	جولائی دسمبر	۱۹۸۰ء	۰
۲۔	اقبال سہیل	اخلاق احمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱۸-۲۰۹
۳۔	اوٹو اسپیس: علی گڑھ کا ایک جرمن مستشرق	اکمل ایوبی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۷۰-۲۶۳

OTTO SPEASE یہ اصلاً جرمنی کی یہودی نسل سے تھے۔ مشرقی علوم بالخصوص اسلامیات سے خصوصی شغف تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہو کر واپس اپنے وطن جرمنی چلے گئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۔	ایل کے۔ حیدر	مختار مسعود	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱۶-۲۰۵

ڈاکٹر لودی کریم حیدر مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ لندن میں انتقال کیا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۔	بابائے اردو مولوی عبدالحق	ابن علی بدایونی	۹	۱	اکتوبر	۱۹۶۸ء	۹۸-۸۹
۶۔	" " " مرحوم	رشید احمد صدیقی	۲	۴	"	۱۹۶۱ء	۱۱۲-۹۳
۷۔	بابو جادو چندر چکرورتی	ایم۔ اے پٹھان	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۶۲-۲۵۷

آپ علی گڑھ کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۸۷ء میں کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۶ء کو کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کالج کے رجسٹرار کی حیثیت سے بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ریاضی پر آپ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۔	پرنسپل تھیوڈور بیک	نفیس بانو	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۷۰-۲۵۹

THEODORE BECK علی گڑھ کالج کے تقریباً پندرہ سال تک پرنسپل رہے۔ یکم فروری کو اپنے عہدہ کا چارج لیا ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء کو انتقال کیا آخر وقت تک بحیثیت پرنسپل کام کرتے رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۔	پرنسپل تھیوڈور مارisن	ظفر الاسلام	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۹۲-۲۶۱

THEODORE MORISON (۱۸۶۳ء - ۱۹۳۶ء) اکتوبر ۱۸۸۹ میں کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں کالج کے پرنسپل بنے۔ ۱۹۰۴ء میں سبکدوشی حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان واپس چلے گئے۔

صفحات	سال	ماہ	شمارہ	جلد نمبر	مضمون نگار	عنوان	نمبر
۲۶۸-۲۶۱	۱۹۸۶ء			۲۳	قمرالہدیٰ فریدی	پرنسپل جے۔ایچ۔ٹول	۔

J. H TOWEL یکم نومبر ۱۹۰۹ء کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ اس وقت وہ تقریباً سات سال سے پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۹ء کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

صفحات	سال	ماہ	شمارہ	جلد نمبر	مضمون نگار	عنوان	نمبر
۲۹-۲۸۳	۱۹۸۵ء	جنوری ستمبر	۲-۱	۲۲	قمرالہدیٰ فریدی	پرنسپل ڈبلیو اے۔جے۔آرچبولڈ	۱۱۔

H A J ARCHBOLD ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یکم نومبر ۱۹۰۹ء کو مستعفی ہوئے۔

صفحات	سال	ماہ	شمارہ	جلد نمبر	مضمون نگار	عنوان	نمبر
۲۹۳-۲۸۷	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	جنوری جولائی		۲۳	جلیل قدوائی	پروفیسر ابوبکر حلیم	۱۲۔

پروفیسر ابوبکر احمد حلیم ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ و سیاسیات کے پروفیسر و صدر مقرر ہوئے۔ بعد میں یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنے۔ یہاں سے سبکدوش ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں پہلے سندھ یونیورسٹی اور بعد میں کراچی فیڈرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔

صفحات	سال	ماہ	شمارہ	جلد نمبر	مضمون نگار	عنوان	نمبر
۲۵۹-۲۴۳	۱۹۸۵ء	جنوری تا ستمبر	۲-۱	۲۲	عبدالباری	پرنسپل سر ٹامس واکر آرنلڈ	۱۳۔

SIR THOMAS WALKER ARNOLD دسمبر ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے علی گڑھ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل بن گئے۔ ۱۹۰۴ء میں وہ لندن واپس چلے گئے۔ اسلامیات سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ "PREACHING OF ISLAM" اُن کی مشہور کتاب ہے۔

صفحات	سال	ماہ	شمارہ	جلد نمبر	مضمون نگار	عنوان	نمبر
۳۰۴-۲۲۶	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	جنوری جولائی		۲۳	مالک رام	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۴۔
۲۹۳-۲۰۵	" "	" "		"	عبدالباری	پروفیسر سالم کرنیکو	۱۵۔

PROF S. KRENKOW ۱۲ اگست ۱۸۷۲ء کو شمالی جرمنی کے ایک شہر شون برگ (SCHONBURG) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں لندن چلے گئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی ادبیات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں مہمان پروفیسر بن کر آئے۔ ۱۹۳۰ء میں سبکدوش ہو کر وہ وطن واپس چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء BONN یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ریٹائر ہو کر کیمبرج چلے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں تالیفات بے شمار ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۶۔	پروفیسر عبدالمجید قریشی	جمال آرا نظامی	۲۳		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۵۹-۱۵۱
۱۷۔	پروفیسر کفیل احمد چودھری	محمد اقبال	"		" "	" "	۴۴۱-۴۳۳
۱۸۔	پروفیسر محمد بابر مرزا	الہمہ صدّیقی	۲۳		" "	" "	۴۴۲-۴۴۳
۱۹۔	پروفیسر ہادی حسن	کبیر احمد جائسی	"		" "	" "	۴۴۶-۴۲۵
۲۰۔	پروفیسر ہارون خان شروانی	حسن الدین احمد	"		" "	" "	۲۰۴-۱۹۹
۲۱۔	ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی! کچھ اپنے متعلق خیالات	رشید احمد صدیقی	۴	۳	اکتوبر	۱۹۶۲ء	۹۹-۵۱
۲۲۔	تری یاد کا عالم	" " "	۱	۴	"	۱۹۷۰ء	۱۲۴-۱۱۹

اردو کے مشہور شاعر علی سکندر جگر مرادآبادی پر تاثراتی مضمون۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۳۔	جسٹس سید محمود	جسٹس ہدایت اللہ بحوالہ منظر عباس نقوی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۷۵ء	۱۴۴-۱۲۳
۲۴۔	" " "	فرح علی جلالی	"	" "	" "	"	۱۶۰-۱۴۵

جسٹس محمود سرسید احمد خاں کے منجھلے بیٹے تھے۔ ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ پہلے کوئنس کالج بنارس میں اور بعد ازاں کرائسٹ چرچ کالج کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۲ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آکر قانون کا پیشہ اختیار کیا۔ ترقی کرکے الہ آباد ہائی کورٹ کے جج بنے۔ ۱۸۹۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ آپ کا شمار ملک کے قابل ترین ججوں میں ہوتا ہے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک میں ان کے دست راست رہے۔ ۱۸۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی کا جامع منصوبہ تیار کیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے سکریٹری اور بعد میں صدر بنے۔ ۸ مئی ۱۹۰۳ء کو سیتاپور میں وفات پائی۔ مسلم یونیورسٹی کی مسجد میں دفن ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۵۔	جسٹس کرامت حسین	سید کمال الدین حسین	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۳۴-۲۲۷
۲۶۔	چارلس ایمبروز اسٹوری	محمد سالم قدوائی	۲۳		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۰-۲۳۵

CHARLES EMBROSE STOREY مشہور مستشرق ہیں۔ ۲۱ اگست ۱۸۸۸ء کو انگلستان میں پیدا ہوئے

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

۱۰ کو علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں علیحدگی اختیار کرلی۔ اور انڈیا آفس لائبریری
ں کے اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں لائبریرین بنے۔ ۱۹۳۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے
وفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انگلینڈ
ں وفات پائی۔

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۰	چودھری خلیق الزماں	شان محمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۵۰-۱۲۵
۲۱	حاجی اسمعیل اور چند غیر معروف رفقا	فرخ علی جلالی	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۰۱-۲۷۱

حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی (ضلع علی گڑھ) سرسید کے مخلص احباب میں شامل تھے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ سرسید اپنے انتقال سے ایک ہفتہ قبل ان کی کوٹھی دارالامن، واقع سول لائن علی گڑھ میں منتقل ہو گئے اور یہیں انھوں نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کیا۔ حاجی اسمٰعیل خاں کی وفات ۱۹۲۱ء میں آگرہ میں ہوئی۔

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۹	حالی کی دو کمیاب تحریریں	مختار الدین احمد	۱۰	۳-۴		۱۹۷۰ء	۲۳-۷
۲۰	حبیب الرحمٰن خاں شروانی	عبد الباری	۲۲			۱۹۸۶ء	۶۴-۵۱
۲۱	حسرت کے سن و سال	حامد حسن قادری	۱۵	۳	اکتوبر	۱۹۷۳ء	۸۹-۸۵
۲۲	حسرت موہانی	نور الحسن نقوی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۶۴-۱۴۵
۲۳	حکیم احمد شجاع	شہپر رسول	"		" "	" "	۱۸۸-۱۸۳

حکیم احمد شجاع ۱۸۹۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۱۱ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کیا اس کے بعد میرٹھ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں یہیں انگریزی اور تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ مشہور ڈرامانگار آغا حشر کاشمیری کے ساتھ متعدد ڈرامے لکھے۔ اور اسٹیج بھی کئے۔ ۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۲۴	حضرت امیر خسرو۔ افکار و شخصیت	خلیق احمد نظامی	۵	۴	اکتوبر	۱۹۶۴ء	۲۶-۱
۲۵	حیدر کا صاحب	اسعد خاں شروانی	۱۲	۱-۲		۱۹۶۲ء	۳۱۴-۲۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

سر محمد اکبر نذر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ کے حالات زندگی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۶۔	خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں	شجاع الدین فاروقی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۸۴-۲۷۷

خان بہادر صاحب جنوری ۱۸۶۸ء کو شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ آپ کو علی گڑھ اور علی گڑھ والوں سے تعلق خصوصی تھا۔ آپ اتر ولی میں نائب تحصیلدار اور بعد میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائرڈ ہوئے۔ تمام عمر علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں صرف کی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔ یونیورسٹی کے حاطے میں آپ کی کوٹھی ولایت منزل بہت مشہور ہے آج کل اس میں دینیات فیکلٹی ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۳۷۔	خان بہادر مولوی بشیر الدین	محمد الدین مارہروی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۷۷-۲۷۱
۳۸۔	خان عبدالغفار خاں	محمد محمود فیض آبادی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۹۴-۱۸۴
۳۹۔	خلیفہ عبدالحکیم	محمد انتظار الحق	"		" "	" "	۲۲۴-۲۰۵

خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۵۹ء) ممتاز فلسفی اور ادیب۔ علی گڑھ سے ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے ۱۹۱۵ء میں بی۔اے اور ۱۹۱۷ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۱۹ء میں لاہور سے ایل ایل۔بی کیا۔ جرمنی سے فلسفہ میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک جموں و کشمیر میں ڈائریکٹر تعلیمات رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ فکر اقبال، حکمت رومی، افکار غالب مشہور تصانیف ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۰	خواجہ الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین	۲۲	۲-۱	جنوری تا ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۱۰-۱۰۵
۴۱۔	" " " " "	جمال آرا نظامی	"	" "	" "	"	۱۱۶-۱۱۱
۴۲۔	خواجہ غلام الثقلین	خواجہ غلام السیدین	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۰۷-۹۳
۴۳۔	خواجہ غلام السیدین	صالحہ عابد حسین	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۳۱-۲۱۹

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۴۔	خواجہ محمد یوسف	فرخ جلالی	۲۳			۱۹۸۶ء	۸۵-۹۲

خواجہ صاحب سرسید کے رفیق خاص تھے۔ علی گڑھ کے روسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۵۔	خواجہ منظور حسین	اسلوب احمد انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۵-۲۵۲

خواجہ صاحب ۲۱ مئی ۱۹۰۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا ۱۹۲۹ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ریڈر اور پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک انٹر یونیورسٹی بورڈ پاکستان کے سیکریٹری رہے۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۴۶۔	خوشی محمد ناظر	انوار احمد	۲۳			۱۹۸۶ء	۴۱۹-۴۳۰
۴۷۔	ڈاکٹر ضیاء الدین	عشرت علی قریشی	"			"	۱۴۷-۱۶۴
۴۸۔	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	رشید احمد صدیقی	۱۱	۲		۱۹۷۱ء	۵-۲۶
۴۹۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱۷-۲۲۴
۵۰۔	ڈاکٹر سید محمود	عبدالباری	۲۳			۱۹۸۶ء	۹۵-۱۲۶

علی گڑھ کے نامور فرزند۔ ڈاکٹر سید محمود ۱۸۸۹ء میں غازیپور کے ایک گاؤں سید پور بھیتری میں پیدا ہوئے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی۔ بیرسٹری کا امتحان کیمبرج سے پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں واپس آ کر وکالت شروع کی۔ اسی زمانے میں تحریک آزادی میں شامل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شامل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے جنرل سکریٹری بنے۔ کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ متعدد بار جیل گئے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے نائب وزیر خارجہ بنے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۱۔	ڈاکٹر عابد حسین	صغریٰ مہدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۶۷-[illegible]۸۰
۵۲۔	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری	خورشید الاسلام	"		" "	" "	۹۳-[illegible]
۵۳۔	ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	ضیاء الحق چودھری	"		" "	" "	۲۶۱-[illegible]۸

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۴	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۵۴-۱۴۹
۵۵	راجہ جے کشن داس	محمد انظار الحق	۲۲	۲-۱	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۶۹-۱۹۱

راجہ جے کشن داس (ولادت: ۲۴ نومبر ۱۸۳۲ء - وفات ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء) مراد آباد کے ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ رئیس ابن رئیس تھے۔ سرسید کے بہترین دوست اور رجال نثاروں میں تھے۔ سرسید کے پوتے راس مسعود کا ۱۸۹۳ء میں جب مکتب ہوا ہے تو انھوں نے بسم اللہ راجہ جے کشن داس کی گود میں بیٹھ کر پڑھی تھی۔ انھیں علی گڑھ تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد سے بے پناہ لگاؤ تھا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۶	راجہ راؤ	محمد یٰسین	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۳۶-۲۲۷

راجہ راؤ میسور میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اس کے بعد نظام کالج حیدرآباد سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں فرانس چلے گئے، اور سوربان (SORBONNE) یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے انگریزی کے مصنف ناول نگار اور افسانہ نویس تھے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۵۷	راجہ غلام حسین	ضیاء الدین احمد برنی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۵۲-۴۹
۵۸	راجہ مہندر پرتاپ سنگھ	محمد انظار الحق	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۵۴-۲۲۵
۵۹	رفیع احمد قدوائی	محمد ہاشم قدوائی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۴-۲۲۷
۶۰	سر آغا خاں	نسیم انصاری	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۴-۷
۶۱	سر راس مسعود	ارشد مسعود	۲۳			۱۹۸۶ء	۳۰۰-۲۹۳

سرسید کے پوتے اور جسٹس محمود کے بیٹے۔ ۱۹ فروری ۱۹۲۹ء سے اکتوبر ۱۹۳۴ء تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۶۲	سر رضا علی	صبیحہ انور	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۶۲-۲۵۵
۶۳	سر سکندر حیات خاں	عبدالمجید سالک	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۹۸-۱۹۵

نمبر	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم، سر سکندر حیات ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج اور لندن میں تعلیم حاصل کی۔ قانون ساز اسمبلی کے رکن اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں حکومت پنجاب کے ریونیو ممبر بنے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک پنجاب کے گورنر بھی رہے۔ اس کے بعد ریزرو بنک آف کلکتہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

۶۴۔	سرسید کے ایک رفیق۔ منشی نجم الدین	مختار الدین احمد	۲۲	۱-۳	جنوری تا ستمبر	۱۹۸۵ء	۶۲-۴۵
۶۵۔	سر شاہ سلیمان	اخلاق احمد	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۴۲-۲۲۱
۶۶۔	سر محمد فیض علی خاں بہادر	الطاف حسین ندوی	"			"	۲۳۰-۲۲۱
۶۷۔	سر والٹر رالے	اقبال احمد انصاری	"			"	۲۵۰-۲۴۳

SIR WALTER RALEIGH انگریزی کے ادبیات کے مشہور اسکالر کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کالج میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے لیکن خرابیٔ صحت کے باعث صرف ڈیڑھ سال رہ کر وطن واپس چلے گئے۔ سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

۶۸۔	سلطان حیدر جوش	وحید احمد	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۹۴-۱۵۹
۶۹۔	سید سجاد حیدر یلدرم	ثریا حسین	"		" "	" "	۲۷۴-۲۶۹

اردو کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار۔ ۱۸۸۰ء میں قصبہ کانٹھ ہر ضلع جھانسی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۹ء تک مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ اسی دوران شعبۂ اردو کی سربراہی بھی کی۔ ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

۷۰۔	سیدنا ابو محمد طاہر سیف الدین	حامد علی خاں	۲۴		جنوری تا جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۴۷۳-۴۵۵
۷۱۔	شفاء الملک حکیم عبد اللطیف	سید فضل الرحمٰن	"		" "	" "	۲۷۰-۲۶۱
۷۲۔	شمس العلماء مولوی نذیر احمد	نور الحسن نقوی	۲۲	۱-۳	جنوری تا ستمبر	۱۹۸۵ء	۱۲۸-۱۱۷
۷۳۔	شیخ عبد اللہ	آل احمد سرور	۲۴		جنوری تا جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۹۲-۲۸۵

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کیا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۷۴۔	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۳			۱۹۹۶ء	۴۰-۶۵
۷۵۔	عبدالماجد دریا بادی	ظفر حسین خاں	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۴-۲۱۷
۷۶۔	علامہ شبلی نعمانی	خورشید الاسلام	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۲۰-۸۷
۷۷۔	" " "	سید محمد ہاشم	"	" "	" "	"	۲-۹۳
۷۸۔	فانی اور ان کی شخصیت	ابن علی نقوی بدایونی	۱۱	۱		۱۹۷۱ء	۹-۹۵
۷۹۔	فانی بدایونی	ظہیر احمد صدیقی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۴-۱۲۷
۸۰۔	قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی	مختار الدین احمد	۲۳			۱۹۹۶ء	۰-۲۳
۸۱۔	کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی	رشید احمد صدیقی	۵	۲	جولائی	۱۹۶۴ء	۲-۱

پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک تاثراتی مضمون۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۲۔	کے۔ ایم۔ سردار پانیکر	محب الحسن	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۰-۲۵۵

پانیکر ۳ جون ۱۸۹۵ء کو کیرالہ کے امبالا پورہ تعلقہ کے کوالم گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مدراس سے میٹرک کا
پاس کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی اے آنرز کیا۔ ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ
کالج میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۲۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ آزادی کے بعد اقوام متحدہ میں
ہندوستان کی نمائندگی کی اپریل ۱۹۴۸ء میں چین میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں
مصر اور جون ۱۹۵۶ء میں فرانس میں ہندوستان کے سفیر بنائے گئے۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی اور بعد میں
میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۸۳۔	محسن الملک سید مہدی علی خاں	سید محمد طارق	۲۲	۱-۲	جنوری ستمبر	۱۹۸۵ء	۰-۶۲
۸۴۔	محمد حسین آزاد	اسلوب احمد انصاری	۱	۳-۴		۱۹۶۰	-۲۳
۸۵۔	محمود احمد عباسی امروہوی	مالک رام	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	-۱۷۷

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹	مسٹر سڈنس	ظفر الاسلام	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۵۱-۲۵۶

HENRY GEORGE IMPEY SIDDON علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ ۱۸۷۵ء میں اپنے عہدے کا چارج لیا۔ اگست ۱۸۸۴ میں استعفا دیا۔ آپ کالج کے کامیاب ترین پرنسپل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ طلبا کی یونین آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹	مسز ممتاز حمید	ثریا حسین	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۷۹-۲۸۴
۸	مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد	الکسل ایدیل	۲۱	۱-۲	جنوری جون	۱۹۸۴ء	۷۷-۸۴
۸	مقتدیٰ خاں شروانی	مالک رام	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۸۹-۹۲

مولوی مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ کی مقتدر شخصیات میں تھے۔ ۱۸۸۰ء میں ولادت ہوئی۔ زیادہ تر تعلیم گھر پر دی۔ ۱۹۰۷ء میں منشی محبوب عالم کے مشہور زمانہ روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی پریس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں یونیورسٹی پریس سے بہت اعلیٰ پیمانے پر کتابیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی پریس قائم کر لیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹	مولانا ابوبکر شیث	محمد صابر صبر صدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۱-۲۴۶
۹	مولانا احسن مارہروی	ظفر الاسلام	"		" "	" "	۲۹۵-۳۰۸
۹۱	مولانا اسلم جیراجپوری	محمد سالم قدوائی	"		" "	" "	۱۱۵-۱۲۶
۹۲	مولانا حمید الدین فراہی	عبید اللہ فہد	"		" "	" "	۷-۲۰
۹۴	مولانا سید طفیل احمد منگلوری	یٰسین مظہر صدیقی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۸۷-۲۰۴
۹۵	مولانا شوکت علی	قمر الہدیٰ فریدی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۱-۳۰
۹۶	مولانا ضیاء الدین احمد بدایونی	مالک رام	"		" "	" "	۲۷۱-۲۷۸

پروفیسر ضیاء الدین احمد بدایونی ۱۲ ستمبر ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہلے اردو کے پھر فارسی کے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر و صدر شعبۂ بنے ۱۹۵۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۹۰-	مولانا ظفر علی خاں	محمد ضیاء الدین انصاری	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۱۰۴-۹۱
۹۸-	مولانا عبدالرزاق کانپوری	سعیدہ بانو	"		" "	" "	۹۰-۵۳
۹۹-	مولانا عبدالعزیز میمن	شیخ نذیر حسین	"		" "	" "	۲۶-۲۵۴

عہد حاضر کے عربی کے مشہور ادیب، محقق، عالم اور انشا پرداز (مولانا عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸ء-۱۹۷۸ء) ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی معروف تھے۔ ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے ۱۹۵۰ء میں پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۲۷، اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۰-	مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی	مفتی نورالحسن راشد کاندھلوی	۲۳			۱۹۸۶ء	۳۱۸-۲۹۷

مولانا عبداللہ انصاری ایم۔ اے۔ او کالج کے پہلے ناظم دینیات تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے۔ ۱۹۲۵ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۰۱-	مولانا محمد علی جوہر	مشرف علی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۴۸-۳۱
۱۰۲	مولانا وحیدالدین سلیم	منظر عباس نقوی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۸۴-۱۶۵
۱۰۳-	مولوی چراغ علی	کبیر احمد جائسی	۲۲	۲-۱	جنوری دسمبر	۱۹۸۵ء	۲۱۰-۲۰۱
۱۰۴	مولوی ذکاءاللہ	یٰسین مظہر صدیقی	۲۲	۲-۱	" "	"	۲۰۰-۱۸۷
۱۰۵-	مولوی زین العابدین	اخلاق احمد	"	" "	" "	"	۱۸۶-۱۶۷
۱۰۶-	مولوی سمیع اللہ خاں	شجاع الدین فاروقی	"	" "	" "		۱۴۲-۱۲۹
۱۰۷	مولوی عبدالحق	ابوالکلام قاسمی	۲۳			۱۹۸۶ء	۸۶-۱۷۳
۱۰۸	مولوی عنایت اللہ دہلوی	محمد صابر	"			"	۲۰۰-۲۹۳

مولوی عنایت اللہ (۱۸۶۹ء - ۱۹۴۳ء) مولوی ذکاءاللہ کے فرزند تھے۔ اردو کے صف اول کے مترجمین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے تراجم کی تعداد ۶۰ سے متجاوز تھی۔ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱۰	مولوی محمد عزیز مرزا	حبیب الرحمٰن چغتائی	۲۳			۱۹۸۶ء	۱۴۹-۱۲۷
۱۱۱	مہاراجہ محمد علی خاں	محب الحسن	"			"	۲۰۶-۲۰۱
۱۱۲	میر محفوظ علی بدایونی	شمس بدایونی	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۹۶-۷۵
۱۱۳	میر ولایت حسین	مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۹۱-۲۸۵
۱۱۴	عظیم بیگ چغتائی	محمد علی جوہر	۲۴		جنوری جولائی	۱۹۸۷ء ۱۹۸۸ء	۲۴۴-۲۳۷
۱۱۵	نواب احمد سعید خاں چھتاری	الطاف حسین ندوی	۲۴		" "	" "	۱۱۴-۱۰۱
۱۱۶	نواب حمید اللہ خاں	سید ظل الرحمٰن	۲۳			۱۹۸۶ء	۴۴-۴۳۱
۱۱۷	نواب سلطان جہاں بیگم	نفیس بانو	"			"	۲۹۲-۲۷۹
۱۱۸	نواب سید محمد علی	محمد ابو صالح	"			"	۴۴۸-۴۴۱

نواب سید محمد علی سرسید کے بڑے بھائی سید محمد کے پوتے اور سرسید کے بیٹے سید حامد کے داماد تھے۔ یہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۰ء تک علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۱۹	نواب محمد اسحٰق خاں	کبیر احمد جائسی	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۲۱-۲۰۵

نواب صاحب (۱۸۶۰ء - ۱۹۱۸ء) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے صاحبزادے تھے۔ جولائی ۱۹۱۲ء سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء تک علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۰	نواب محمد اسماعیل خاں	ظفر الاسلام	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۱۸-۲۰۷

نواب اسماعیل خاں (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۸ء) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے اور نواب محمد اسحٰق خاں کے بیٹے تھے۔ آپ ۲۴ جولائی ۱۹۴۱ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۲۵ء تک مسلم یونیورسٹی کے خازن اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء تک وائس چانسلر رہے۔

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
۱۲۱	نواب مزمل اللہ خاں	اسلوب احمد انصاری	۲۳			۱۹۸۶ء	۲۲-۱۵
۱۲۲	وقار الملک مولوی مشتاق حسین	ثاقب حسن رضوی	۲۲	۳-۱	جنوری ستمبر	۱۹۱۵ء	۱۶-۰۳

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	جلد نمبر	شمارہ	ماہ	سال	صفحات
	تبصرے						
	آگ کا دریا از قرۃ العین حیدر	اسلوب احمد انصاری	۱	۴	اکتوبر	۱۹۶۰ء	۱۴۳-۱۵۵
	اقبال کا نظریۂ اخلاق از سید احمد رفیق	محمد نور نبی	۲	۲	اپریل	۱۹۶۱ء	۱۱۲-۱۲۶
	تاثرات و تعصبات از منیر صدیقی	اسلوب احمد انصاری	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۲۷-۱۳۰
	دیوان غالب (نسخۂ عرشی) مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	مالک رام	۲	۱	جنوری	۱۹۶۱ء	۱۳۵-۱۵۷
	شعلۂ آواز از سراج لکھنوی	سی ہادی	۲	۴	اکتوبر	۱۹۶۱ء	۱۱۹
	فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم	اسلوب احمد انصاری	۱	۳	جولائی	۱۹۶۰ء	۱۰۹-۱۱۹
	متاع تسکین از تسکین قریشی	محمد حسن	۴	۱	جنوری	۱۹۶۳ء	۱۳۱-۱۳۲
	مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر ہارون خاں شروانی	انوار الحق حقی	۳	۲	اپریل	۱۹۶۲ء	۱۱۵-۱۲۶

جناب عبدالرؤف خاں
حمیدیہ لائبریری
اودی کلاں، سوائی مادھوپور

خدا بخش لائبریری جرنل ۶۹-۴ ء کے بارے میں

امید کہ آپ عافیت سے ہوں گے خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۶۹-۴ء مشتمل بر تعارف مخطوطاتِ تصوف بڑی اہمیت کا حامل ہے جسے آپ نے نہایت عرق ریزی سے مرتب فرما کر پیش کیا ہے۔ اس کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ اگر اجازت ہو تو اس شمارہ کے بعض مادہ ہائے تاریخ کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں:۔

● ص ۲۲ سطر ۲ پر حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ المتوفی ۹۹۸ھ کے مادۂ وفات "ولہم جنّٰت الفردوس نزلاً" میں "لہم" سے پہلے "واو" زائد ہے بایں سبب اعداد کا میزان ۱۰۰۳ ہوتا ہے۔ اگر "جنّٰت" کے کھڑے الف کو بھی شمار کریں تو ۱۰۰۴ ہوگا۔ چنانچہ مادہ "لہم جناتِ الفردوس نزلاً" ہونا چاہیئے۔ گو اس صورت میں "جنّٰت" کا املا قرآنی املا کے برعکس ہوگیا ہے لیکن تاریخ گو مادہ میں ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس املا سے ۹۹۸ھ نکلے گا ورنہ بصورت "جنّٰت" ۹۹۷ھ۔

● ص ۲۰۷ سطر ۱۱-۱۰ پر شیخ محمود چشتیؒ کی وفات کے دو مادے ہیں: "کلید طریقت بہ لطف معبود ۱۰۲۶ھ" لیکن اس میں "بلطف" کو "بہ لطف" لکھنے سے پانچ عدد زاید ہوگئے لہٰذا میزان ۱۰۳۱ ہوتا ہے نیز مادۂ "محمود خوش وہاں نام مبارک" کے آگے کوئی سنہ درج نہیں اور سنہ اس مادے سے ۱۰۲۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

● ص ۲۲۵ پر (سطر ۱۹-۱۸) خانقاہ زڈی بل کی تعمیر شروع کرنے کے قطعہ کا آخری شعر یہ دیا ہے:

خردُ اللہ ذوالبقا نوشت
بر درِ ایں مقام ہمچو بہشت

فی الاصل یہی تاریخی شعر ہے۔ لیکن مصرعِ ثانی کے نیچے یا سامنے سنہ ۹۰۲ھ ثبت نہیں ہے۔ دراصل یہ مادہ

نہایت حسین تعمیہ تخرجہ سے کہا گیا ہے یعنی مادہ "الشہ ذوالبقا" (۹۰۶) عقل نے بہشت جیسے اس مقام کے "در" پر لکھدیا چونکہ حساب جمل کی رو سے "در" کا دروازہ (پہلا حرف) دال ہے جس پر مادہ لکھنے کے سبب (دال) پوشیدہ ہو گئی گویا لطیف اشارہ چار عدد کے اسقاط کا کیا گیا ہے۔ اس طرح (۹۰۶-۴) ۹۰۲ برآمد ہوں گے جو مطلوبہ سال ہے اس تاریخی شعر کے لطیف تعمیے کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ اس طرف صاحب مقالہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا ذہن منتقل نہ ہو سکا۔

● ص ۲۲۵ پر (سطر ۲) حضرت شیخ یعقوب صرفی کاشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ کا مادۂ وفات "فخر الامم" رقم کیا ہے جس سے صرف ۹۹۲ برآمد ہوتے ہیں۔ مکمل مادہ "فخر الامم بود" ہے جو بزیادتِ یک سدد ہے۔ یہ مادہ صرف سترہ اٹھارہ دن کے فصل از سے کہا گیا ہے (وفات ۱۲ ذیقعدہ ۱۰۰۳ھ تاریخ دعوت عزیمت ۴: ۱۳۹ حاشیہ ۲)

● اسی صفحہ ۲۲۵ کی سطر ۶ پر تاریخی شعر ہے

یافتم بہر سال تاریخش   پنج و ہفتاد سالہ آں شاہ

کے مصرعۂ ثانی (مادہ) سے بھی ۱۰۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ظن غالب ہے کہ یہ مادہ ۱۰۰۳ھ کے پیش نظر مکمل اعداد ۱۰۰۳ لیے نکالا گیا ہے جس کا املا "پنج و ہفتاد سالہ آں شہ" ہوگا۔ مدت عمر ۷۵ سال یعنی مادہ میں حسنِ تاریخی ہے۔

● ص ۲۲۹ - سطر ۱۴ پر شیخ عبدالکریم (م ۱۰۵۷) کے انتقال کے بارے میں "یقو" آپ کے انتقال کا قطعہ ذات اللہ ہے۔ جبکہ یہ نہ تو قطعہ ہے اور نہ اس سے مطلوبہ اعداد ۱۰۵۷ ہی نکلتے ہیں مادہ "ذات اللہ" سے جس پر بھی نہیں ہیں۔ ۱۱۶۷ برآمد ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سہو الکاتب ہے یا صاحب مقالہ کے نوکِ خامہ کی لغزش (کذا)

● ص ۲۵۰ سطر ۲ پر حضرت پیر محمد سلوتی (م ۱۰۹۹ھ) کے بارے میں بھی مادہ کے لیے "آپ کے انتقال کی تاریخ ذات محمد ہے۔ (؟) (کذا) "ذاتِ محمد" بھی قطعہ نہیں مادہ ہے اور نہ اس مادہ سے ۱۰۹۹ برآمد ہوتے ہیں بلکہ ۱۱۹۳ دونوں مقامات پر قطعہ اور مادہ میں فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

● ص ۹۴ سطر ۱ مصرعۂ اولیٰ "چو پرسیدم زہاتف سالِ توریف" میں "تاریخ" "تعریف" ہو گیا ہے

● فہرست صحت چار پر (سطر ۴) ص نمبر ۴۶۸ کے بجائے سہواً ۴۸۱ لکھا گیا ہے۔

● ص ۲۴۱ سطر ۱۵ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا جو شیخ یعقوب صرفی نے نقل کی ہے "اے اللہ محمد صلعم کی امت میں سے "اٹھا" پر حاشیہ ۱ لکھ کر ڈاکٹر شمس الدین احمد صاحب نے اشکال کرتے ہوئے بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ "راقم کی نظر آئی وسیع نہیں لہذا اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیش نہیں کی جا سکتی ہے البتہ آناہ

موں کہ ناقل نے نسخہ مذکور کو نقل کرتے وقت "عیسیٰ" کے بجائے "موسیٰ" لکھا ہوگا (ص ۲۴۲ حاشیہ) گویا یہ حضرت موسیٰ
نہیں ہو سکتی۔ دلیل میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب کی تصنیف "پاکستان میں فارسی ادب ۱: ۴۹۳" کا حوالہ دیا ہے (ص ۲۴۲)
حضوں نے اس حدیث کو وضعی قرار دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حدیث پاک کے سلسلے میں کسی محدث جلیل کا اسم گرامی اور ان کی عبارت
استناداً پیش فرمایا ہوتا نہ کہ کسی ڈاکٹر اور پروفیسر کا فرمایا ہوا۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب نے تو مذکورہ دعا کو حضرت موسیٰ
کے بارے میں اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں آنا چاہتے ہیں۔ لیکن مذکورہ دعا کا مفہوم دوبارہ دنیا میں آنے سے
ہو کر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حشر فرمانے سے بھی تو ہو سکتا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔ کہ یہودی قوم کے ساتھ
حشر، اٹھنا کون پسند کرے گا۔ بہرحال حدیث بالا کے مستند و وضعی ہونے کے بارے میں ہو سکا تو انشاء اللہ پھر عرض کرونگا۔
کیونکہ اس میدان میں تخمین و ظن کو دخل نہیں۔ فقط۔ والسلام مع الاکرام۔

نیاز مند
عبدالرؤف خاں

جناب مصطفیٰ خاں شروانی
... حیات نگر
...

عرصہ بعد آپ کا شرف نامہ ۱۱۸۵ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۹۲ء نظر نواز ہوا مشکور فرمایا۔ دراصل مجھے اس کا قطعی علم نہیں
تھا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر شخصیات کو بھی نمبر ایک اور نمبر دو کے زمروں میں تقسیم فرمایا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس نوع
کا شمار تو بالائی اور زیریں آمدنی کے سلسلہ میں ہوا کرتا تھا۔ بہرحال اب سے متوقع رہوں کہ جب بھی کسی اہم نمبر ایک والی شخصیت
کا سرفراز نامہ صادر ہو اس کی xerox آپ کی تنقیح ("یا تنسیخ") کے لیے پیش خدمت کروں انشاء اللہ العزیز
جناب طیب بخش صاحب مرحوم و مغفور بدایوں کے ایک شگفتہ تحریر کے مصنف گذرے ہیں ان کی ایک تصنیف
اعتقادات سرسید اور شرر بدایونی" پر اتر پردیش اردو اکیڈیمی کا انعام بھی عطا کیا گیا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سعید
طیب نے ایک اشاعتی ادارہ "طیب پبلشنگ ہاؤس" بدایوں میں کھولا ہے جہاں سے جناب طیب بخش مرحوم کی ایک اچھوتی
تصنیف "رشحات قلم" شائع ہوئی ہے۔ میں ڈاکٹر سعید طیب کو اس کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کرنے کے لیے لکھ
رہا ہوں اس میں ایک انشائیہ "ایک طوائف کا خط" کا یہ فقرہ بہت معنی خیز ہے: "جب میری بہن نے "محمد شمع محفل بود شب
جائے کہ من بودم" گایا تھا نہ جانے کتنے اہل اللہ اس مصرعہ کو سن کر وجد کرنے لگے تھے اور ایک بزرگوار تو یہ مصرعہ سن کر جاں حق

ہوگئے تھے۔ لیکن آج کے یہ سینما اور ٹی وی کے کارن کمسن لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ فرار ہو جاتی ہیں۔ !!!

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص

مصطفیٰ شروانی

O

کل میں آپ کی خدمت میں نیاز نامہ بمعہ ۴ آٹوگراف کے xerox (محترمہ ارونا آصف علی صاحبہ اور ۳ مکاتب جناب بھیشم نرائن سنگھ سابق مرکزی وزیر امکنہ اور حالیہ گورنر تامل ناڈو) روانۂ خدمت کیا تھا اور آج خدا بخش لائبریری جرنل (۴۳ تا ۴۸) موصول ہوا جو حسب سابق مختلف النوع موضوعات پر محیط ہے خصوصاً "ہند عہد اورنگ زیب میں" کا دوسرا حصہ اور اس اہم تصنیف پر میرا ناچیز تبصرہ بہت بروقت ہم عصر ہوا اس لیے کہ آج ہی کے *The Hindu* میں شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر میرا ایک مکتوب شائع ہوا ہے، جو حسب ذیل ہے:

Pandey on Aurangzeb

Sir, — Mr V Sagar in his letter (The Hindu, May 12) disputes the contention of Mr Bishambhar Nath Pandey, former Governor of Orissa, of Emperor Aurangzeb's rule (1658-1707) being 'just and benevolent' No doubt there is some substance in what Mr Sagar says about Aurangzeb's punishment to the Mahant of Vishwanath Temple and of the extraordinary action in the demolition of the sacred temple for the misconduct of the Mahant in dishonouring a Hindu Princess Unfortunately, however, Aurangzeb has been painted as an utterly orthodox ruler which is not quite true A person who in 1659 fought and defeated his eldest brother, Dara Shikoh, paraded him through the streets of Delhi in ragas and finally put him to death could not be considered either orthodox or pious Then later Aurangzeb forcibly dethroned his father, Emperor Shah Jahan and held him prisoner in Agra Fort until Shah Jahan's death This could not be treated as just or benevolent action Actually Aurangzeb was a seasoned politician who would set his goals and try to reach them by means fair or foul This tendency is reflected in some of the Emperor's actions in granting Jagirs to some of the temples like the Temple of Someshwar Nath Mahadev in Allahabad The matter had legal ramifications as late as in 1950 when a dispute arose over the property dedicated to this tempale and

the supporting documents contained a Firman of Emperor Aurangzeb conferring a Jagir and cash gift on this temple

It would therefore be a distortion of historical facts to paint Emperor Aurangzeb as just another Muslim fanatic

Mustafa K. Sherwani, Hyderabad

(The Hindu, May 20, 1992)

علیگڑھ کے حالیہ سیمینار میں جناب بشمبر ناتھ پانڈے نے اورنگ زیب عالمگیر کو منصف اور دور اندیش حکمراں قرار دیا تھا اس پر ایک جناب V. sagar نے اورنگ زیب کی بدحکومتی "اور اس کے "متعصب" دور پر پانڈے صاحب کے احساسات پر تنقید فرمائی تھی میں نے اس تنقید کا "درپردہ" جواب دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کو آج تک صحیح کسوٹی پر جانچا ہی نہیں گیا۔ اسے متعصب اور سخت گیر حکمراں کا درجہ دے کر اس کے دورِ حکومت کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا امید ہے آپ میرے اس شائع شدہ خط کے مندرجات سے اتفاق فرمائیں گے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص مصطفیٰ شروانی

۲۰ مئی ۱۹۹۲ء

"خدابخش لائبریری جرنل" کے شمارہ ۹۳ تا ۹۰ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محترمہ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے اپنے تحقیقی مقالہ "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" میں میری ایک خالہ صاحبہ مرحومہ ز۔ خ۔ ش (زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ) پر ایک سوانحی مضمون شامل فرمایا ہے جس کے لیے میری والدہ ماجدہ محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کی تصنیف "حیات ز۔ خ۔ ش" مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۴۰ء) اور محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ مرحومہ و مغفورہ کے زیر نگرانی دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے "دیوان" ز۔ خ۔ ش سے استفادہ فرمایا ہے۔

محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ مغفورہ کے "ز۔ خ۔ ش مرحومہ" کے متعلق جناب نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "خواتین دکن" (۱۹۴۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی عمر کے ابتدائی بارہ سال زیادہ تر ننہالی ماحول میں گزرے جہاں آپ کی سہیلی زاہدہ خاتون مرحومہ شروانیہ (ز۔ خ۔ ش) بنت نواب مزمل اللہ خاں مرحوم تھیں جن کی علمی قابلیت اور شاعرانہ بلند پروازی کا ڈنکا ہندوستان کے گوشے گوشے میں بج چکا ہے موصوفہ بھی ابتدائی عمر ہی سے شعر گوئی کرتی تھیں اس لحاظ سے انیسہ بیگم بھی بوجہ دوستی یکجائی اور ہمدمی متاثر ہوئیں۔"

ز۔خ۔ش مرحومہ ۸ دسمبر ۱۸۹۴ کو پیدا ہوئیں اور صرف ۲۸ سال کی عمر میں ۲ فروری ۱۹۲۲ کو انتقال ہوا اور خود ان کا یہ شعر صادق آگیا جو اپنے والد کی شفقت سے متاثر ہو کر ز۔خ۔ش مرحومہ نے کہا تھا:

جب کبھوں میں خیرباد اس عالم حق پوش کو　　روح چل دے سونپ کر قالب تری آغوش کو　(ز۔خ۔ش)

اپنے پہلے مجموعہ کلام "آئینہ حرم" کو ز۔خ۔ش مرحومہ نے اپنے والد گرامی محترم نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم سے معنون کیا تھا۔

جب نواب عثمان علی خاں آصف جاہ سابع فرمانروائے حیدرآباد نے ۱۹۱۹ میں ہندوستان کی پہلی اردو زبان میں تعلیم کی جامعہ عثمانیہ قائم کی، اس وقت ز۔خ۔ش مرحومہ نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ جس کا عنوان تھا "سپاسنامہ بحضور بانی جامعہ عثمانیہ" "جذبات اردو" کا یہ شعر اردو زبان کی بےکسی کی تصویر ہے جو آج بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے بامقصد ہے:

میں ستانے سے در گزری آئینے سے باز آئی　　اب دل ہی نہیں جس میں ہو ذوق خود آرائی

اور پھر: آخر در حسن تک قسمت مجھے لے آئی　　ہاں تجھ کو بشارت ہو اے ذوق جبیں سائی

چوں شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اس کا　　ہے نام خدا حسیں نورین کی یکجائی

ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ　　عثمان علی خاں کا آویزۂ یکتائی

اور یہ سپاسنامہ اور اس میں سلطان حیدرآباد میر عثمان علی خاں مرحوم کی توصیف ایک ایسی صرف ۲۲ سالہ شاعرہ کے موقلم کا نتیجہ تھا جو علیگڑھ سے ۲۵ میل دور ایک گاؤں میں ایسی شاعرانہ عظمت کا لوہا اردو داں دنیا سے منوا رہی تھی۔

محترمہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ مرحومہ نے ز۔خ۔ش مرحومہ کے لیے فرمایا تھا:

جو ہو سدا بہار وہ گلشن ہے تیرا ذکر　　دائم جو اوج پر ہو وہ قسمت ہے تیری یاد

نیازمند

مصطفیٰ شروانی

In this inscription the importance of the epigraph has be lost owing to a free translation of the first couplet in whi all the important points have been left out.

The line reads :—

بنال فرقتی خستــه دل بماتـم او
که مرد زوجه خوبت محمدی خانم

which Mr. Syed Muhammad translates :—

'My heart is broken with lamentation for the separati of the good lady Muhammadi Khanam who is dea

The correct translation of the couplet should, in my humb opinion, be as follows :—

'Cry (بنال) *O broken hearted Furqati* in mourning ov her, for *thy good wife* (زوجه خوبت) Muhamma Khanam is dead.'

Thus the line contains the poetic name, Furqati, of t composer of these verses who was the husband of the decea lady. The author's translation does not bring out this relatio ship and the *takhallus* which invest the epitaph with co siderable human interest.

Some of the inscriptions dealt with by Mr. Syed Muham mad are of great historical importance and it would have be better to publish their facsimiles and also to give brief accoun of the careers of the personages mentioned therein.

(7) *Inscription No. 79 on Kazim Ali's mosque*:—Here again, as in the case of No. 4", the 2nd hemistich has been read as the 3rd and *vice versa*. Moreover the word *sininash* in the third hemistich meaning 'its date' has been misread as *sina ash*, 'its chest'. The difference is obvious. Again, the closing words of the second line seem to be quite clear on the stone and read (که بود فرق عرش سا) 'of which the pinnacle touches the heavens'. Lastly the alphabetical value of the Arabic line (فولوا وجوهکم شطر المسجد الحرام البسیط) which is a slightly altered form of the Quranic verse 143, Chapter II with an additional word (al-basit) at the end, comes to 1242 A.H., and is just one unit too much compared with the date given in the closing words of the main inscription which is in Persian verse. It was no doubt with the object of recording the date of the construction of the Mosque in Arabic that these alterations were made in an important Quranic verse.

(8) *Inscription No. 105 on Mir Abdullah's tomb*.—The words which have been read by Mr. Syed Muhammad as 'Amthal-i-wafiran' 'the richest men who were examples for it' are really 'Amthal-o-Aqran' (امثال و اقران) 'equals and compeers'.

(9) *In inscription No. 108 on Mian Khan's tomb in the compound of Shaikh Barkat's Mosque*, the first couplet reads :—

میاں خاں که در عنفوان شباب
بساط حیاتش قضا در نوشت

which Mr. Syed Muhammad translates as :—

'Mian Khan in the beginning of whose youth,
Death was written on the carpet of his life.'

But (در نوشت) means 'rolled up', so the verse should be translated as follows :—

'Mian Khan, whose carpet of life Death rolled up in the prime of youth.'

(10) *Inscription No. 110 on the tomb of Muhammadi Khanam in the Shia cemetery situated near the Gulzarbagh Railway Station*:—

related to Shaista Khan; but the *Yai nisbat* (ی) in Shaista-khani (شایسته خانی) leaves no doubt whatsoever that the builder, Haji Chand, was a slave or a personal servant of Nawwab Shaista Khan. This construction is of frequent occurrence in Muslim inscriptions and we find even ruling kings such as Qutbuddin Aibak and Shamsuddin Altamish mentioning the fact that they were the slaves of the Sultan (Shihābuddin Ghauri) by adding the epithet *Sultani* at the end of their names.

(5) *Inscription No 47 on the Lodi Katra Mosque.*—In this inscription the 2nd hemistich has been read as the 3rd and *vice versa.* The two couplets, of which the inscription consists, should be read as follows:—

(۱) چو این مسجد بتائید الهی
طفیل شاه ارزانی بنا یافت
(۲) بتاریخ همایون کلک تقدیر
رقم زد کعبه ثانی بنا یافت

And the translation would be:—'When with the help of God, and through the grace of Shah Arzāni, this mosque was constructed, the pen of Fate wrote down on an auspicious date " A second Kāba has been erected ".'

(6) *Inscription No. 72 on Shah Rustam Ali's tomb in the compound of a mosque in the Nanmuhia* quarter:—

In the third hemistich of this inscription Mr. Syed Muhammad has read Na-Jawānmardam as Najawan Murdam. The translation should therefore be '*if I have not been a* (جوانمرد) *i.e., a brave or an ideal man in deeds*, pass thou by me like a brave man (جوانمرد)'. Mr. Syed Muhammad's translation '*if I died unmanly in action*' gives a different sense from that which the composer of the verses intended to convey.

The verse in question reads —

اگر من نا جوانمردم بکردار
تو بر من چون جوانمردان گذر کن

(۵) کردم سوال سال بنایش ز پیر عقل
گفتا بگو خرامی خیر المقام جای

which the author translates as :—

In the reign of the Emperor *Jahangir the light of the eye*,
The just, generous, wise and intelligent Parvez Shah,

* * * *

Constructed this choice building *under his supervision* and *which* is
As firm as a rock in the pursuit of the precepts of Mohammad

* * * *

I asked about the date of construction from the old wisdom,
Which said 'Say, it is a place *to walk to* paradise'.

In the light of the readings offered by me, however, the translation of the verses should be as follows :—

'*During the viceroyalty of* Prince Parvez, *the light of the eyes of the Emperor Jahangir*, who is just in judgment and generous with wisdom.

* * * *

This especial (خاص) building was *constructed by Nazar Khweshgi who is* steadfast like a mountain, in obeying the Law (شرع) of Muhammad.'

* * * *

I questioned the old man of wisdom about the year of its construction and he replied, *Say O Khirāmi* 'This place is the best resort'.

The inscription might be *in situ*; but there is nothing in he inscription to indicate that it was originally put up on a nosque.

(3) *Inscription No. 9 on the Idgah of Saif Khan.*—The last ut one word in the sixth line of this inscription should be *Thush*, not *Arsh.*

(4) *Inscription No. 12 on Haji Chand's Mosque.*—Mr. Syed Iuhammad finds it difficult to make out how Haji Chand was

amended. According to Mr. Syed Muhammad the mosque was built in 1036 A.H. 'by Prince Parvez under his supervision', but as that Prince died in 1035 A.H. at Burhanpur, the author believes that although the Prince began the construction of the mosque it was finished after his death. As a matter of fact, however, the inscription clearly mentions in the 3rd line the construction of the building by a highly respectable officer of the Prince named 'Nazar Khweshgi', i.e., Nazar Bahadur, a Khweshgi Afghan of Qasur, near Lahore, who later on held a rank of 1,500 under Jahangir and of 4,000 under Shah Jahan and died in the year 1062 A.H. at Lahore (Maathirul Umarā, Vol. III, pages 818 ff.). The syllable *Ba* read by the author of the article at the beginning of the name Nazar Khweshgi does not appear on the stone as will be seen from the facsimile published with this note.

The chief reason why Mr. Syed Muhammad falls into this error, seems to be his failure to read the *izafat* at the end of the word *chashm* in the first line of the inscription. Obviously it was Prince Parvez and not the Emperor Jahangir who was the light of the other's eyes.

Lastly the fact that Khirāmi (خرامی) in the last line was the poetic name of the composer of the verses has been lost sight of altogether with the result that the author is faced with a construction quite unusual in Persian and has to give a translation which he would not have given otherwise.

The lines in question read :—

(۱) در عهد نور چشم جهانگیر بادشاه
پرویز شاه عادل ، با ذل بعقل و رائی

(۲) ... ...
... ...

(۳) کرد این بنای خاص نظر خویشگی که هست
در پیروی شرع محمد چون کوه پای

(۴) ... ...
... ...

A Note on 'Old Muslim Inscriptions at Patna'.

By M. Hamid Kuraishi, Esq., B.A., Archæological Survey of India.

In the recent (September–December, 1930) issue of the Journal of the Bihar and Orissa Research Society Mr. Syed Muhammad, B.A., B.L., has published a lengthy article on 'Old Muslim inscriptions at Patna' complete with bibliography, index, etc. An effort has been made by the author to include in the article all available Persian and Arabic inscriptions from the time when the town formed part of the extensive kingdom of Sultan Husain Shah of Bengal to the year 1857 A.C. Much as the work is to be appreciated, certain defects have crept in here and there which it is the object of this note to correct. In the first place there are a number of Printer's mistakes in the Persian and Arabic texts of the inscriptions, which it is hoped will be duly rectified in the errata. Secondly in some of Mr. Syed Muhammad's readings of the inscriptions the requirements of Persian grammar and idiom have been apparently overlooked. It is not my purpose here to deal with each individual inscription; but a few of the more obvious emendations have been made in the hope that the author who seems to take a keen interest in Muslim epigraphy may be encouraged to be more careful in future.

(1) *Inscription No. 6 on the Mausoleum of Shah Arzāni.*—The reading شاد جنت ارزانی '*Beautiful* paradise of Arzāni', neither rhymes properly nor gives good sense; nor indeed does it yield the date 1028 which should be the alphabetical value of the chronogram and which is written in figures at the end of the epigraph. Obviously the phrase should be read as 'Shah-i-Jannat Arzāni'. This reading would rhyme properly, make the chronogram equivalent to 1028 A.H., and give the full name of the saint at the same time.

(2) *Inscription No. 8 on the Patthar-ki-Masjid.*—In this important inscription some serious mistakes require to be

W

Wahid Ali 102
Waiz 85

Z

Zahid 91
Zakir 93
Zulfaqar Ali 84
Zulfaqar Ali Khan 103

R

Rahim-un-nissa 29
Ramzan 41
Razzak 24
Reza 30
Rustum Ali (Shah) 72

S

Sadiq Zakir, Mohammad 99
Sadir 63
Saif Khan 9, 10
Sakin 46
Shadman 84
Shafai (Imam) 89
Shafi-ud-din Hosain 78
Shahab-ud-din Mohammad (Emperor Shah Jahan) ... 9
Shah Abul Barkat 72
Shah Alam (Emperor) 34, 40, 58
Shah Gholam Hosain 56
Shah Gholam Husain 90
Shah Hamza Ali 76
Shah Hassan Ali 69
Shah Jahan (Emperor) 9
Shah Kaley 24
Shah Karim Bux 87
Shah Karimullah 32
Shah Sajawal 15
Shah Shahabaz 25
Shah Tikia 92
Shaikh Ali 89
Shaikh Badri 23
Shaikh Heengan 109
Shaista Khan 12, 21
Shakir 78
Sikandar (=Alexander) 3
Syed Ahmad Hosain, Hakim 42
Syed Hedayat Ali Khan Asad Jung 62
Syed Shah Mahfuz 45

T

Tabarak Ali 111
Tajo 28

Meerat 66
Mehdi Ali Khan 106
Mian Khan 108
Mir Abdullah... 106
Mir Afzal 81
Mir Ashraf 85
Mir Farzand Ali 48
Mir Madarullah 58
Mir Saadat Ali 98
Mirza Aziz 67
Mirza Masum 3
Mirza Nuri 18
Mohammad (Prophet) 8, 12, 40, 47, 58, 59, 61, 72, 74, 82, 83, 88, 89, 94
Mohammad 13
Mohammad Ali 88
Mohammad Ali Kashmiri 10
Mohammadi Khanum 110
Mohammad Moqim 16
Mohammad Murad Shahanshah Sufi 2
Mohammad Yahya Khan 85
Mohammad Yusuf Meshedi 29
Mohan 101
Mohiuddin 13
Moniruddowlah 80
Muradunnissa 72
Murtuza II 24
Murtuza Nanahravi 99
Mustafa=Prophet Mohammad) 89

N

Najaf 23
Najaf Ali 99
Nazir Khan, Khan Muczzam 1

O

Omar (Caliph) 12, 40, 74, 89
Osman (Caliph) 12, 40, 74, 89

P

Paember Baksh 104
Parvez Shah 6
Patna 11

I

Ibadullah Shah ... 97
Ibrahim (Abraham) ... 87, 88
Ibrahim, Syed or Mir ... 87, 88, 89, 49
Ibrati ... 95, 97, 98, 105, 106
Ishki ... 58

J

Jafar ... 19
Jahangir ... 3, 8
Jam ... 9
Jamaluddin ... 66
Jamshed ... 8
Jibrail ... 105
Jumman ... 94
Junaid ... 97

K

Kaaba ... 34, 95, 99
Kazim Ali ... 79
Kai-Khusro ... 8
Karim Bux (Shah) ... 87
Karimullah Shah ... 82
Khadim Ali ... 96
Khairunnissa ... 91
Koka Khan ... 33
Kulsumunnissa ... 107

L

Lutfullah ... 13

M

Madaroo ... 64
Maftun ... 38
Mahzun ... 105
Majhauli ... 8
Makhmelunnissa Begam ... 47
Manvi ... 12
Mariam (=Mary) ... 45
Mazharul Haque ... 21

C

Calcutta 68
Coombs and Co. 68

D

Daud Khan 19

F

Fakhruddowla 26
Farhat 101
Fatma 29
Fatma 36
Fazal Ali 92
Feroz Jung 46
Furrukh Sayar (Emperor) 84

G

Gholam Husain 98
Gholam Husain, Shah 56
Gholam Husain, Shah 90
Gholam Mohiuddin 66
Gholam Mohammad 77
Gholam Yehya 43, 50, 51

H

Hafiz Roshan Mohammad Khan 61
Haider (Caliph Ali) 40, 89
Haider 66
Haider Baksh 37
Hairat 41
Haji Chand 12
Haji Manzoor Ali Khan 63
Haji Saadat 46
Hambli (Imam) 89
Hassan 29
Hassan Ali 26
Himmat 94
Husain 29
Husaini Begam 62

INDEX TO NAMES IN INSCRIPTIONS.

(REFERENCE IS TO THE NUMBER OF THE INSCRIPTION.)

A

Aalimunnisa Begam 81
Abdollah Khan 16
Abdur Rasul 12, 16
Abu Hanifa 89
Abdur Rahman Sajjad 27
Abu Bakr (Caliph) 12, 40, 74, 89
Afzal Hosain 45
Ahmad 76
Ahmad Malik (Imam) 89
Akramul Haque 83
Alamgir (Emperor Aurangzebe) 20, 21
Ali (Caliph) 12, 29, 74, 84, 89
Ali Azim 98
Ali Ibrahim Khan Bahadur Nasirjung, Aminuddoula Azizul Mulk 44
Ali Qasim Khan 85
Allauddunia-wad-din Abul Mozaffar Hosain Shah 1
Ambar, Khwaja 21
Anis Ahmad 20
Arzani, Shah 6, 47, 97
Asalat Khan 83
Atai 9
Aurangzebe (Emperor) 20
Azimabad 66

B

Balal (Hazrat) 84, 98
Barh 66
Basant (Shah) 23
Baqar 27
Beji 100
Bag Mohammad 11
Bibi Latifan 112
Bibi Man 59, 63
Bibi Mannoon 75
Bibi Nooran 74
Bulaki 55
Buzurg Umed Khan 22

Inscription.

مسجدے مرتفع بنا فرمود چون تبارک علی پاک سرشت
کلک نکہت بسال تعمیرش کعبہ نو بہند ساخت نوشت
فی سنہ ۱۲۷۵

Translation.

When Tabarak Ali of holy disposition
Built this high mosque,
The odoriferous pen for its date of construction
Wrote " He built a new Kaaba in India ".

In 1275 A. H.

No. 112.

Headstone of Latifan's tomb.

There is a headstone of a tomb of a lady named Bibi Latifan kept in a niche in Haji Chand's mosque which seems to have been brought from the grave-yard to the north of the mosque which has been turned into vegetable garden. She died in 1276.

Inscription.

چو رفتہ سیدہ بی بی لطیفاً سوے باغ ارم با صد تاسف
بجستم عبرتی سال وفاتش سوے خلد برین شد گفت ہاتف
۱۲۷۶

Translation.

When Syeda Bibi Latifan went
Towards the garden of paradise, with great regret
Ibrati, I searched the date of her death.
" She went toward sublime paradise " said the latent informer.

1276.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

بنال فرقتے خستہ دل بماتم او
که مرد زوجه خوبست محمدی خانم

چو او بوده زنے پاکدامنے بجہان
فداے عصمتش وان نیکخو دل و جان

ربیع اول و تاریخ بود سیزدهم
که ریخت خاک مصیبت به فرق سا یان

درین کشاکش ماتم که هر نفس ملک
چو شعله بر بکشیدست آه و فغان

به فکر سال رحلتش جگر طپان بودم
که سوے خلد برین شد گفت رضوان

۱۲۷۲ ھ

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

My heart is broken with lamentation for the separation of a good lady Mohammadi Khanum who is dead.

As she was a pious lady in this world, my heart is a sacrifice for her chastity.

It was the thirteenth of the first Rabi that this calamity fell on my head.

In mourning intensely for her all the people of the country are drawing sighs like flames.

My heart was palpitating in search of the date when Rizwan[1] said "She went towards the paradise."

1272 A.H.

No. 111.

Baqargunge lane mosque.

The mosque in Baqargunge lane which is about 6 furlongs of Gola was built by one Tabarak Ali in 1275 A. H.

---

[1] The angel at the gate of the paradise.

Translation.

Mian Khan in the beginning of whose youth
Death was written on the carpet of his life,
Started on Monday the fourth of month of fast[1]
For a walk in the garden of paradise.
On the headstone of his tomb about the date of his dea
wisdom
Wrote " the death of the youth ".

1271 Hijri of the Prophet may be blessing of God b
him and peace.

No. 109.

Shaikh Heingan's mosque.

Shaikh Heingan's mosque is situated in Nagla about
miles east of Gola. It was built by him in 1271 A.H.

Inscription.

با صدق و صفا چو شیخ هینگن کرد از سر نو بنائے خانه
شهر ست پیے یاد گار عالم تاریخ بگو خدائے خانه
فی ۱۲۷۱ هجری

Translation.

As Shaikh Heingan with truth and conviction
Newly constructed the house
Which is famous for being a monument of its time,
Say its chronogram " House of God ".

In 1271 A. H.

No. 110.

Mohammadi Khanum's tomb.

The Shia cemetery situated near the Gulzarbagh railw
station has some old tombs the inscription of two[2] of whi
have already been described. In it there is the tomb of a la
named Mohammadi Khanum who died in 1272 A.H.

[1] i.e. the month of Ramzan.
[2] Those of Mir Abdullah (no. 105) Mehdi Ali Khan (No. 106).

No. 107.

Nai Sarak mosque.

The Nai Sarak mosque is on the main road at Hajigunj where the Nai Sarak or the New Road joins it. It is about 6½ miles east of Gola and was built by Kulsum-un-nisa in 1270 A.H.

Inscription.

مسجد عالی بتوفیق خدا کان عبادت خانه باشد گدا و شاه را
هاتف غیب ......این تاریخ بگفت کرد کلثوم النساء بنیاد بیت الله را
۱۲۷۰

Translation.

The great mosque which by the grace of God
Is a house of prayer for the rich and poor,
The latent informer......said its chronogram[1]
"Kulsum-un-nisa constructed the house of God."
1270.

No. 108.

Mian Khan's tomb.

Mian Khan was the son of Shaikh Barkat in the compound of whose mosque he is buried. Shaik Barkat's mosque is in Moghalpora, a quarter of the city. Mian Khan died in 1271 A.H.

Inscription.

میاں خاں که در عنفوان شباب
بساط حیاتش قضا در نوشت
دوشنبه چهارم ز ماه صیام
روان شد پسے سیر باغ بهشت
بلوح مزارش خرد سال فوت
قضا نوجواں پسے هي نوشت
۱۲۷۱ هجری النبی صلی الله علیه و سلم

[1] Some words in the third line could not be read.

سه شنبه بد و چارم شوال که چون گل

داعی ......زین لاله ستان رفت

بنگاشت سن رحلت او عبرتی زار

والا مسمی با کرمی سوے جنان رفت

بروز سه شنبه چهارم ماه شوال سنه ۱۲۶۶ الدوران مهدی علی خان

ازاین جهان فانی رحلت فرمود -

Translation.

O the best of forgivers

In the name of God the Merciful and Clement

Why should I not weep? Mehdi Ali Khan passed away from this world.

Why should I not lament? The generous Hatim[1] of his time is dead.

He had a desire to go to paradise, it was for this that

His bier was carried rapidly on the cloud;

He was very generous to all the people,

Therefore every one of them was crying with sorrow;

The ears of the angels were swollen like oyster,

As all the people were lamenting for him.

How is it that the sky has become black in mourning for him?

It seems that the smoke of lamentation from his friends went up to the heaven.

Ever since he died, young and old were much oppressed.

Every burnt heart that came on his grave

Went away shedding tears like the candle on his tomb.

It was Tuesday the fourth of Shawwal when like a rose

[2].. ... . he went away from this garden.

The son of Ibrati, wrote the date of his death

" The well known generous person went to the paradise."

On Tuesday the 4th of Shawwal 1266 of the era Mehdi Ali Khan passed away from this transient world.

[1] Hatim is name of Arabian King proverbial for generosity.

[2] This could not be read in the inscription as it was not clear.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
When the worthy and magnificent Abdullah
Slept below the earth by God's command,
From the heaven Gabriel said in Ibrati's ears
About the date of his death " His patrons are the five holy persons[1] ". 1265.

No. 106.

Mehdi Ali Khan's tomb.

Mehdi Ali Khan was the brother of Mir Abdullah the inscriptions on whose tomb are recorded above. He lies buried near the tomb of his brother in the cemetery near Gulzarbagh railway station. He was the father of Nawab Vilayet Ali Khan who became very prominent in the Mutiny of 1857 A.D. Mehdi Ali Khan died in 1266 A.H.

Inscription.

یا خیر الغافرین
گریم نه چرا مهدی علی خان ز جهان رفت
نالم نه چرا حاتم فیاض زمان رفت

در سر هوس خلد برین داشت کز اینجا
برابرش تابوت چلیپ کرم عنان رفت

میکرد بهر خلق خدا بسکه مروت
هر فرد بشر در غم او نعره زنان رفت

شد گوش ملائک چو صدف آبله زارے
تا نوحه او اهل جهان را بزبان رفت

در ماتم او گشت فلک از چه سیه پوش
بر عرش ز یارانش مگر دود فغان رفت

تا لوحه از سنگ شده زیب مزارش
صد کوه ستم بر سر پیر و جوان رفت

هر سوخته جانے که سر تربتش آید
چون شمع مزارش ز الم اشک فشان رفت

---

[1] پنجتن or the five holy persons are Prophet Mohammad, Ali, Fatma, Hassan and Hosein.

رئیس زمان میر عبدالله چون
دلش گشت مشتاق سیر جنان
بپاراست بر تن قبای ممات
بعزم سفر بست محکم میان
نورد دید مرگش بساط حیات
برون رفت ازین بزم دامن فشان
بمن گفت محزون زسال رحیل
هزار در صد شصت پنجم بدان

Translation.

The person buried here was a believer with pious intentions. He amassed a vast fortune for eighty-seven years and he spent much in charity and beneficence over the mourning for the fifth *Aly aaba* [1] and exceeded the richest men who were example for it. At last on the night of Thursday the 30th Moharram ..he passed to the holy region empty handed leaving all the wealth and dignity and he did not carry with him anything except the wealth of religion. Ponder over this, oh people of vision !

When the heart of Mir Abdullah, the prince of his time became fond for the paradise,
He put on his body the robe of death and he bound his waist fast for the journey,
Death folded the carpet of his life and he passed away from this showy assembly.
About the date of his death Mahzun told me " Know it to be one thousand one hundred and sixty-four ".

Inscription on the other side of the stone.

بسم الله الرحمن الرحیم
چو عبدالله والا قدر ذی جاه
بحکم ایزدی زیر زمین خفت
بگوش عبرتی از چرخ جبرئیل
سن رحلت شفیعش پنجتن گفت
۱۲۶۵

1 By fifth آل عبا is meant Imam Hussain, the grandson of the Prophet.

No. 104.

City Court mosque.

The mosque known as City Court mosque which is on the main road near the Patna City Court was built by one Paember Bux in 1265-A. H.

Inscription.

یافت چون مسجد خجسته بنا اختتام از ید پیمبر بخش
خامه تاریخش از سر برکات زد رقم مسجد پیمبر بخش[1]

Translation.

When the construction of this auspicious mosque,
Ended from the hands of Paember Baksh,
The pen through blessings,
Wrote "Mosque of Paembar Baksh".

No. 105.

Mir Abdullah's tomb.

Mir Abdullah who was also called Mir Gadahis was the father of Nawab Lutf Ali Khan, C.I.E., of Guzri family[2]. He left a very large fortune when he died in 1265-A. H. Both the side of the headstone of his tomb have got inscriptions.

Inscription on one side.

صاحب این قبر مرحوم بود پاک عقیده تا عمر هشتاد و هفت
سال زر فراوان اندوخت و بعزائے خاص آل عبا خیرات مبرات
بسیار خرچ ساخت و از اصدل راقران گوئے سبقت ربود آخرکا
بتاریخ ۳۰ محرم بگذشت[3] ......کهنه...... از شب پنجشنبه هما
جاه و دولت را گذاشته تہی دست بعالم اقدس ارتحال نمود
و جز دولت دین چیزے با خود نبرد فاعتبروا یا اولی الابصار

[1] سر برکات ب is which is equal to 2 thus the total مسجد پیمبر بخش = 1263 is 1265.

[2] For the description of Guzri family see Mr. James' Patna Gazetteer pages 130-140

[3] Some words are missing.

Inscription.

بهنگام احسن بفضل الله   چو واحد علی تاجر با سخا
بنا کرد مسجد ز هاتف بگفت   در آیند عابد بخانه خدا
سنه ۱۲۶۳

Translation.

In an auspicious time by the grace of God,
When Wahid Ali the generous merchant,
Constructed the mosque, the latent speaker said,
"The devotees may come in the house of God",
1263.

No. 103.

Shish Mahal private mosque.

The private mosque at Shish Mahal was constructed by one Hakim Zulfaqar Ali Khan of Agra in 1264-A. H. It is in Shish Mahal, a quarter of the City about 5½ miles east of Gola.

Inscription.

کرد بهر نماز خود تعمیر   نه پے غیر مذهبان کثیر
مسجد بیتی ذوالفقار علی   از براے رضاے رب قدیر
دو صد و یکهزار شصت چهار   بود از هجرت رسول کبیر
حکیم ذوالفقار علی خان رضی الحسینی اثناے عشری اکبرآبادی
بصرف یکهزار و دو صد و پانزده روپیه مسجد در سنه ۱۲۶۴ هجری
بعرصه یک سال تیار ساخت

Translation.

For the gratification of God,
Zulfaqar Ali constructed the private mosque,
To say his own prayers,
And not for the numerous followers of other beliefs,
It was one thousand two hundred and sixty-four,
Of the Hijri of the great Prophet,

Hakim Zulfaqar Ali Khan Raziul Husaini Asnai Ashri Akbarabadi built this mosque in 1264-A. H. in one year at a cost of rupees one thousand, two hundred and fifteen.

No. 101.

Dafali's mosque.

The mosque built by Mohon, the wife of a *dafali* or drum aker, which is known as the *Dafali's* mosque is on the main road the north-side of it in Sultangunge about 2¼ miles east of ola. It was built in 1263-A. H.

Inscription.

بجد رجهد چو تعمیر کرد مسجد خام
نکو سرشته موهن زن ربانه ساز
بگفت سال بنایش ز روے دل فرحت
بیا بمسجد حق با ادب نماز گذ
سنه ۱۲۶۳
تعمیه چار عدد

Translation.

When the good natured Mohon, the wife of a drum-maker,
Constructed the mud built [1] mosque with great endeavour,
Farhat said from his heart the date of construction (thus),
"Come in the mosque of God and pray respectfully,[2]

1263,

Addition 4.

No. 102.

Wahid Ali's mosque.

The mosque known as Wahid Ali's mosque is on the main ad in Chowk about 6 miles east of Gola. The inscription ows that it was built by a merchant named Wahid Ali in 263-A. H. but the mosque seems to have been only rebuilt in at year and as its plinth and the shops attached to it are ery old. Perhaps this is the mosque which was known as haista Khan's mosque and was built by Nawab Shaista Khan the close of the seventeenth century.[3]

---

[1] the mosque is brick built.

[2] بیا بمسجد حق با ادب نماز گذار gives 1259.

[3] Both Mr. O'Malley and Mr James mention it in their Patna Gazetteers Shaista Khan's mosque. Mr R. L. Sinha in "Pataliputra" speaks of as such, but it is locally known as Wahid Ali's mosque.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

دریغا آن امام و قبله دین چراغ افروز راه بزم ارشاد
فقیه و عالم و علامه عصر اساس ورعه را بوده است بنیاد
نجف را با علی چون [1] که نام نامی پاکش دهد یاد
سروش غیب سال رحلتش خواند ستون کعبه دین حیف افتاد

۱۲۶۱

کتبه السید مرتضی النونهروی محمد صادق ذاکر کنده نمود
سبط سید مرحوم

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
Alas! that priest and leader of religion,
The kindler of the lamp of society of religious orders,
The theologian, the sage and the most learned of his time,
Who was the foundation of piety (died).
When Najaf is (joined) with Ali [2]
Whose name reminds to the holy name, [3]
An angel of paradise said his date of death,
"Alas the pillar of Kaaba of religion (thus) fell down"

1261.

Written by Syed Murtuza Nohnabravi, son of Syed deceased. Mohammad Sadiq Zakir inscribed it.

No. 100.

Heengan's Mosque.

Heengan's mosque is in Kamangar Gali about 5½ miles east of Gola. It was built in 1261 A. H. by Heengan who was a dancing girl.

Inscription.

این خانهٔ خدا هست ز بیجی قایم

۱۲۶۱

Translation.

This "house of God" exist through the help of Beji.[4]

1261.

---

1. One of the words of the third verse in the inscription could not be read.
2. This line is not clear in the inscription.
3. The reference about holy name is to Ali, the son-in-law of the prophet.
4. Beji was Heengan's daughter.

Inscription.

آں مسجدیکہ بہر سجود نمازیان
زل علي عظيم بنايش نهاده
از هم شکست مثل دل حضرت بلال
چون فرق سجده زیر بخاک افتاده
بار دگر چو میر سعادت علي بدهر
بهر درستیش کف همت گشاده
از امر او غلام حسین خوش اعتقاد
تعمیر آن بطرز خجسته نهاده
جز خانه خدا سنه تعمیر زیر چرخ
در گوش عبرتی نه ز هاتف فتاده
سنه ۱۲۶۱

Translation.

'he mosque which for the prayer of the devotees,
.li Azim had at first constructed,
roke down like the heart of Hazrat Balal, [1]
Vhen it fell head like in prostration.
second time Mir Saadut Ali
Iad shown generosity by constructing it.
·y his order Gholam Husain of good belief
uilt it in an auspicious way.
or its date of construction except the "house of God"
Iothing did reach Ibrati's ears from the latent informer.
1261.

No. 99.

Najaf Ali's Tomb.

'ajaf Ali died in 1261 A. H. and his tomb is near Moghal-
in the city.

[1] Iazarat Balal was the Abyssinian companion of the prophet who used to
e call of prayers in mosque. The reference is to the fact that he was very
distracted after the death of the prophet.

built in 1258 A. H. The inscription has come out of its place and is kept in a house near by.

Inscription.

مسجدے خادم علي كرده بنا

كان پسند چشم هر كس آمده

از خرد جستم چو تاريخش بگفت

ثانی بيت المقدس آمده

سنه ۱۲۵۸ هجري

Translation.

Khadim Ali constructed the mosque,
Which was liked by every body,
When I enquired of its date from wisdom, it said,
"It is a second temple of Jerusalem."

1258 A. H.

No. 97.

Ibadullah Shah's Mausoleum.

Ibadullah Shah's mausoleum is within the compound of Shah Arzani's *dargah* about 3 miles east of Gola. He died in 1260 A. H.

Inscription.

جانشين شاه ارزان چون جنيد * يافته: تا دولت قرب الله

گفت سال رحلتش را عبرتی * زين جهان رفته عباد الله شاه

سنه ۱۲۶۰ ھ

Translation.

When the Junaid like successor of Shah Arzan,
Found the wealth of proximity to God,
Ibrati said the chronogram of his death,
"Ibadullah Shah passed away from this world".

1260 A.H.

No. 98.

Alamgunge Mosque.

The Alamgunge mosque is on the main road in Alamgunge about 4 miles east of Gola. It belongs to the Shia Community and was built in 1261 A. H.

[illegible]

In the name of God the Merciful and Clement. Oh God forgive the sins of both, by the grace of the Prophet may the blessing of God be on him and peace.

Translation.

God is Great.
Two brothers with pious intentions,
Constructed the house of prayer,
The fond heart for its chronogram
Was engaged for an hour,
For the sake of unity it deleted the conjunction " and ".
(And) said " Construction of Jumman " *and* Himmat ",
1258 A. H. Constructed by Jumman and Himmat Barbers.

In the name of God the Merciful and Clement. I declare that there is no God but God and I declare that Muhammad is his servant and Prophet.

No. 95.

Idgah of Dargah.

Within the compound of the mausoleum of Shah Arzani is the *idgah* constructed by Ibadullah Shah who was seventh in succession to the saint Shah Arzani. It was built in 1258 A. H.

Inscription.

کعبه نظیر عید گہہ عرش وسعتے
تعمیر چوں خلیفه شیم ...... لمود
پرسید عبرتی سنه ارارا زغیب گفت
سنه یکہزار ردو صد پنجاه و هشت بر

Translation.

The Kaaba like *idgah* which is as extensive as heaven,
When the caliph like...............constructed it,
Ibrati asked its date and he was told invisibly,
"It was one thousand two hundred and fifty-eight."

No. 96.

Khadim Ali's Mosque.

Khadim Ali's mosque is in Golakpur about 2 miles east of la. The mosque which is now in a ruinous condition was

. The second verse of the inscription could not be read properly. It seems some word is missing.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement
Fazl Ali, the Syed[1] of high parentage
Having constructed the great mosque provided with a house of piety.
Although its beginning was with the help of the faithfuls,
But by Fazl Ali its construction was completed.
When Zakir consulted from his heart about the date of its construction,
A voice came from the latent speaker that it was a "second Holy House".

1257 Hijri of the prophet, may the blessing of God be on him and peace.

No. 94.
The Lawn mosque.

The mosque known as "Lawn mosque" is to the south of the Bankipore Maidan on the main road. It was built in 1258 A. H. by two hairdressers Himmat and Jumman who were brothers.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده و رسوله

الله اکبر

هر برادر به نیت صادق
کرد بنیاد خانه طاعت
پے تاریخ او دل مشتاق
رفت در بحر فکر یکساعت
بہر توحید واز عطف فکند
گفت تعمیر جمن و همت
سنه ۱۲۵۸ هجری تعمیر جمن و همت حجام

اللهم اغفر ذنوبنا بحرمت نبی صلی الله علیه وسلم

بسم الله الرحمن الرحيم

هو الغفار

[1] Syeds are the descendants of the prophet.

که مجذوب حق شاه تکیه گذشت
گلستان جنت شدش خوابگاه
کرامات او شهره عالم است
برین عالمی را بیارم گواه
چو شب تیره بودش تن از خاکمال
و لیکن دلش بود روشن چو ماه
ملائک پے سال رحلت بعرش
نوشتند مجذوب عشق الله[1]

Translation.

All things are transitory and the face of your God the Gracious and Merciful will remain for ever.

Why should not the world flute like lament with sorrow
Why should not sighs arise from the hearts of people,
For the saint Shah Tikia passed away, (and)
The garden of paradise became his resting place.
His miracles are so well known throughout the world that
I can bring the whole world to bear witness to this.
His body was black like night from the dust
But his heart was as bright as moon.
The angels in the heaven for the date of his death
Wrote "the saint of the love of God".

No. 93.
Fazl Ali's mosque.

Fazl Ali's mosque which is in the City was built in 1257 A. H. by him.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحیم
کرد چو فضل علي سید عالی نسب
خانه تقرول درست مسجد عالي بهم
از مدد مومنین گرچه شد آغاز او
لیک ز فضل علي گشت بنایش اتم
فکر بتاریخ او کرد چو ذاکر زدل
گفت ز هاتف ندا ثانیه بیت الحرم
سنه ۱۲۵۷ هجری النبی صلی الله علیه و سلم

[1] مجذوب عشق الله gives 1267 as the date.

No. 91.

Bakergunge mosque.

The mosque which is on the Lower Road about a furlong east of the Bankipore Maidan was built by a lady named Khairunnissa in 1257 A. H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

لمسجد أسس على تقوى من اول يوم احق ان تقوم فيه [1]

بہر رضاے ساختہ خیر النسا

مسجد عالی بنا چوں حرم محترم

خامہ زاہد چو کرد سال بنایش طلب

ہاتفش آواز داد ثانیہ بیت الحرم

سنہ ۱۲۵۷

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

Verily the mosque has been founded on purity, from the first day. You have the full right to pray in it.

For God's pleasure Khairunnissa built

The great mosque like the holy Kaaba.

When Zahid's pen wanted the date of construction

The latent informer cried "A second Holy House".[2]

1257.

No. 92.

Tikia Shah's tomb.

Tikia Shah's tomb is in Diwan Mahalla, a quarter of the city about 5 miles east of Gola. Tikia Shah who was saint died in 1257 A. H.

Inscription.

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذوالجلال والاكرام [3]

جہاں ہمچو نے چوں لنالد زغم

نہ خیزد ز دلہا چرا دود آہ

---

[1]. Holy Quran portion of verse 14, Part 11, Chapter IX, entitled the "Repentance".

[2]. Holy House, the temple at Mecca.

[3]. Holy Quran, Part 27, Chapter LV, entitled the 'Merciful", verse 26.

Translation.

God the holiest is Great. Mohammad the chosen one is true Prophet.	God is sufficient. In the name of God the Merciful and Clement.	The lamp, mosque, *mihrab* and the pulpit. (? re so to say) Abu Bakr, Omar Usman and Haider.

Only he constructs mosques for God who believes in God and the day of judgment and performs prayer, gives alms, and did not fear.

He who builds a mosque for God, paradise is for him.	There is no God but God and Mohammad is His prophet.	Abu Bakr, Omar, Usman and Ali.	The caliphs of the prophet of God, may God be pleased with them.

Abu Bakr, Omar, Usman and Ali were the four caliphs after the prophet.	Sheikh Ali for God's sake and through the grace of God constructed the mosque.	Hijri 1255	When I searcl ed for the date from the chronogram a "house of righteousness" was the hidden cry.	Bu Hanifa, Shafai, Humbli and Ahmad Malik were the four *imams*.

No. 90.

Shah Gholam Husain's mosque.

Shah Gholam Husain's mosque is in Nagla about 7 miles east of Gola. It was built by him in 1255 A. H.

Inscription.

مسجد بنا چو شاہ غلام حسین کرد

چون گلشن ارم شدہ مطبوع دلکشا

تاریخ او چو فکر نمودم ندا رسید

ترکش حروف او بگو خانه خدا

سنه ۱۲۵۵ ھجری

Translation.

When Shah Gholam Husain built the mosque.

It was as pleasant as the garden of paradise.

When I wanted a chronogram, a voice said.

Delete the letters of " that " and say " House of God ".

1255 A. H.

1. خانه خدا gives 1262 and if the equivalent of او (=7) is deleted it becomes 1255.

No. 89.

Gulzarbagh mosque.

The Gulzarbagh mosque is situated on the main road on the north side of it about 4½ miles east of Gola. It was built by one Sheikh Ali in 1255 A.H.

Inscription.[1]

چراغ و مسجد و محراب و ممبر	الله کافي	خدا سه پاک ور الله اکبر
ابوبکر و عمر عثمان حیدر	بسم الله الرحمن الرحیم	محمد مصطفي برحق پیمبر

انما یعمر مساجد الله من امن بالله والیوم الاخر و اقام الصلوة واتي الزکواة
و لم یخش [2]

من بنی الله مسجداً　　　　ابو بکر عمر
خلیفه رسول
فله الجنه [3]　　　　لا اله الا الله محمد رسول الله　　　　عثمان علي
الله رضوان الله علیهم

هجری	شیخ علي زبهر خدا	ابو بکر و عمر و عثمان و علي
سنه ۱۲۵۵	کرد مسجد بنا بمهر خدا	بعد پیمبر خلیفه چار شد

بو حنیفه شافعی هم حنبلی	سال تاریخ از همی جستم
احمد مالک امام چار شد	بیست بالخیر شد زغیب ندا

[1]. The writing in the corner should be read together. The four lines in the upper portion in both the corners form a quatrain similarly the four lines in the lower portion form another quatrain

[2]. The quotation in Arabic in the middle is from the Holy Quran, Part X, Chap. IX, entitled "Repentance."

[3]. This is abridged from the saying of the prophet من بني مسجدالله بني الله له بيتاً في الجنة

No. 88.

Kaua Khoh mosque.

In Kaua Khoh [1], a quarter of the city about 6¾ miles east of Gola is mosque known as Kaua Khoh mosque which was built in 1253 A. H. by Shaikh Ali Baksh Qadiri or Ahmad Chisti or both, as both the names are mentioned in the inscription. Although the inscription is in Persian it contains two Urdu words [2] of pure Hindi origin.

Inscription[3]

بسم الله الرحمن الرحیم

لا اله الا الله محمد رسول الله

شیخ علی بخش قادری را بخش رب العالمین
سرخ رو احمد چشتی هو یا مالک دیار و دین

دوازده صد سال هجرت سال در پنجاه و تین
مسجدے آراسته نو کرد بر روے زمین

Translation.

In the name of God, the Merciful and Clement.

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

O, Creator of the universe! pardon Shaikh Ali Baksh Qadiri.

O Master of world and faith triumph Ahmad Chisti,

It was twelve hundred fifty-three of the Hijra

When he made a new mosque and adorned it on the face of the earth.

---

1 Kaua Khoh is corruption of Kaiwan Shikoh or "the Splendid Palace" which was the name of the palace built by Prince Azimushan while he was governor of Bihar. The palace no longer exists now but the quarter of the city where it stood is called as such after it.

2 هو and تین are Hindi words.

3 This inscription is also given in an article in Patna College Magazine (March 1913, page 96) but is mentioned as an inscription from dargah of Shaikh Shakri in *mahalla* Shakri.

Translation.

Abu Bakar.	In the name of God the Merciful and Clement.	Omar.
Say the date of the construction of the beautiful old mosque rebuilt. The latent informer cried from merciful heart "O righteous, come and say your prayer."		
Usman.	1251 prophet's Hijri.	Ali.

No. 87.
Shah Karim Bux's Mausoleum.

Shah Karim Bux who was sixth in succession to Shah Arzani died in 1252 A.H. His mausoleum is in the compound of Shah Arzani's mausoleum.

Inscription.

آں کریمے کہ بود بحر کرم
کرد رحلت ز کہنہ دیر فنا
بود مقبول خالق اکبر
ماتمش کرد عالم بالا
قدسیان عدن همی کردند
سال تاریخ فوت او انشا
گفت رضوان بخلد تاریخش
اے جناب کریم بخش بیا
سنہ ۱۲۵۲ ہجری

Translation.

That benevolent who was an ocean of charity
Passed away from the transitory world.
He was a chosen one of the Great Creator, (so)
The world above mourned for him.
The pious of paradise were trying
To write the chronogram of his death
(When) the angel of paradise said its date
"Come on, Your Honour, Karim Bux."

1252 A.H.

Public Library, Patna. The inscription belongs to some bath in Patna City[1], and it appears from the inscription that it was built in 1249 A.H.

Inscription.

محمد يحيى خان ابن علي قاسم خان بهادر مغفور
بماه ربيع الاول سنه ۱۲۴۹ هجري حمام سنگي تعمير نمود

Translation.

Mohammad Yehya Khan, son of Ali Quasim Khan Bahadur deceased, constructed the stone bath in the month of Rabi I, one thousand two hundred and forty-nine Hijri.

No. 86.

Chowk mosque.[2]

The Chowk mosque is on the main road at Chowk about 6¼ miles east of Gola. The inscription in figure has 1251 as the date of construction but the chronogram gives 1221 A.H.

Inscription.

<table>
<tr><td>يا عمر</td><td>بسم الله الرحمن الرحيم</td><td>يا ابو بكر</td></tr>
<tr><td colspan="3">مسجدے خوب کهنه نو تيار
سال تهذيب كن برين اظهار
زدل رحم بانگ زد هاتف
اے مصلي بيا نماز گذار [3]</td></tr>
<tr><td>يا علي</td><td>سنه ۱۲۵۱ هجري النبوى</td><td>يا عثمان</td></tr>
</table>

[1] There is a quarter of the City of Patna known as Hammam or the Bath, near the residence of Ali Ibrahim Khan. It seems probable that the stone belongs to the bath from which the quarter of the city derives its name.

[2] The inscription of this mosque has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine for March 1913, page 95, but has wrongly been mentioned as an inscription from Fakhruddowla's mosque. Fakhruddowla's mosque the inscription of which has been noticed before (No. 46 supra) is situated about a furlong west of this mosque.

[3] اے مصلي بيا نماز گذار gives only 1213 but we have to add 8 (= ح) according to the hint.

No. 84.

Golakpur mosque.

The mosque called Golakpur mosque is in Golakpur, a quarter of the city about 2 miles east of Gola. It was repaired in 1248 A.H. by Zulfaqar Ali and has again recently been repaired. From the inscription it appears that Emperor Farrukh Sayair said his prayer in this mosque.

Inscription.

کرد احیا چو ذوالفقار علي
دوستدار علي امام هدی
مسجد شادمان را که درو
کرد فرخ سیر نماز ادا
بانگ زد سال حی بلال دلم
ساز آباد خانه تقوی
سنه ۱۲۴۸ هجري

Translation.

When Zulfaquar Ali
The friend of Ali, the *imam* and true leader,
Rebuilt Shadman's mosque in which
Farrukh Sayair performed his prayer.
The Balal [1] of my heart cried the date of renovation
" May this house of piety flourish well ".
1248 Hijri.

No. 85.

Inscription of a Bath.

An inscription of a stone bath built by Mohammad Yehya Khan son of Ali Qasim Khan Bahadur[2] is in the Oriental

1 Balal was the companion of the Prophet who used to cry the call of prayer in the mosque

2 Ali Qasim Khan was the brother of the famous Ali Ibrahim Khan (Syerrul Mutaakh in English translation, 1789 edition, Volume II, page 348). Mr. James thinks that Mohammad Yehya was the brother of Ali Ibrahim Khan (Patna Gazetteer, page 40).

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. There is no God but God and Muhammad is his Prophet. I declare verily that there is no God but God, the One having no equal and I declare that verily Muhammad is his servant and prophet. Constructed by Asalat Khan, Subedar, in one thousand two hundred and *forty-four* of holy Hijri.

No. 83.

Balkhi Saheb's mosque.

There is a small mosque in Bakshi Mahalla about 5¼ miles ..st of Gola known as Balkhi Saheb's mosque after Hafizuddin ..alkhi Saheb who repaired it. It was originally built by ..kramul Haque in 1247 A.H.

Inscription.

لا اله الا الله محمد رسول الله

اکرم الحق چو کوفت بر سر راه

میخ اسلام مسجد دلخواه

گفت واعظ زسال تاریخش

فا ذکروا فیه واسجدوا لله

من بنی مسجداً لله بنی الله له بیتاً في الجنه [1]

سنه ۱۲۴۷ هجری

Translation.

There is no God but God and Muhammad is his Prophet.
When Akramul Haque struck on the road
The peg of Islam—the beautiful mosque,
Waiz said its date by chronogram (thus)
" Pray to God and recite His name in it."
God will build a house in heaven for him who will build
mosque for God.

1247. A.H.

1. This is from the sayings of the prophets.

No. 81.

Nagla mosque.

The mosque called the Nagla mosque was built by a lady named Aaliunnissa Begam in 1244 A.H. It is situated in mahalla Nagla about 7 miles east of Gola.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

کرد چون مسجد علی نسا بیگم بنا

از پئے شاه وگدا باب عبادت درکشود

گشت این تاریخ از فضل امیر دو جهان

شد بنا بهر نمازی درجهان دارالسجود

سنه ۱۲۴۴ نبوی

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
When this great mosque was built by Aaliunnissa Begam
The gate of worship was opened to the king and beggar alike,
By the help of the Master of the two worlds
" The house of worship was built for those who pray".
1244 the year of the Prophet.

No. 82.

Asalat Khan's mosque.

The small mosque of Asalat Khan is in *mahalla* Fakirbara about a mile to south-east of Gola. Asalat Khan as it appears from the inscription was a subadar, probably in the British Indian army.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

لا اله الا الله محمد رسول الله - اشهد ان لا اله الاالله وحده لا

شريک له و اشهد ان محمداً عبده ورسوله تعمير ساخته اصالت

خان صوبه دار یکهزار دو صد چهل و چهار عیسوی قدسی

چون ساخت مسجدے کہ ....
بشکستہ فرق کفر بگو خانہ خدا ۂ [1]

سنہ ۱۲۴۱ یکہزار و دو صد و چہل یک ہجری

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.
Turn your faces towards the extensive Holy Mosque
Kazim Ali who is a Shia (built this mosque).
The angel gave a cry from his chest to my ear
When he constructed this mosque ... .
Breaking the head of unbelief say 'house of God'.
1241 A.H. one thousand two hundred forty-one Hijri.

No. 80.

Bam Saheb's mosque.

The big mosque in Jaggi Chauraha Moghalpura about 5½ miles east of Gola known asB am Saheb's mosque was built by one Zahoran said to be the mistress of one Bam Saheb who according to local tradition was in the service of Government about one hundred years ago.

Inscription.

مسجدے نو ساخت چو آراستہ شد
در بلندي برد از گردون سبق
هاتفے تاریخ تعمیرش بگفت
معبد با رفعت از انوار حق
سنہ ۱۲۴۳ هجري

Translation.

When this new mosque was constructed
It even went higher than the sky.
A latent informer said its chronogram of construction,
" An elevated place of worship from the light of God".
1243 A.H.

---

[1] خانہ خدا 1261 but according to the hint ک (=20) is to be deducted.

Translation.

When Gholam Muhammad, the great physician
Ordered the construction of this mosque
Its chronogram was cried out
" The mosque was well made on the road."
1240.

No. 78.

Shaikh Bihari's mosque.

The mosque of Shaikh Bihari is in Moghalpura, a quarter of the city. It was built by Shafiuddin Hosain *alias* Shaikh Bihari in 1240 A. H.

Inscription.

آں شفع الدین حسین با صفا — واں برنخل رفیع حلم وجود
حسب امر قدرت و توفیق او — چوں نظم مسجدے عالی نمود
گفت شاکر سال تعمیرش همین — حبذا دار حقیق بالسجود
۱۲۴۰ یکهزار دو صد و چهل هجری

Translation.

That pure Shafiuddin Hosain
The product of sublime humility and beneficence,
According to his power and grace
When he constructed this great mosque,
Shakir said its date of construction thus
" What a fine house to pray to God ".
1240. One thousand two hundred and forty Hijri.

No. 79.

Kazim Ali's mosque.

The large mosque of Kazim Ali is on the main road in Hajigunge about 6¼ miles of Gola. It was built in 1241 A.H.

Inscription.[1]

بسم الله الرحمن الرحیم
فولوا وجوهکم شطرالمسجد الحرام البسیط * [2]
کاظم علي که دم زند از حب اهل بیت
بانگ بگوش من زسنیش سروش زد

1 Only a portion of the third verse of the quatrain could be read.

2. In Holy Quran, Part II, Chapter II entitled " the Cow" are the following verses — فولوا وجوهکم شطر verse III, فول وجهک شطرالمسجدالحرام verse VII, فول وجهک شطرالمسجدالحرام و حیث ما کنتم فولوا وجوهکم شطر verse VIII,

No. 76.

Shah Hamza Ali's tomb.

The tomb of Shah Hamza Ali is in Shah Baqar-ki-takia, a quarter of the city about 4 miles east of Gola. Shah Hamza Ali died in 1236 A.H.

Inscription.

الف الله

عاشق حق مجرد و آزاد شاه حمزه علی پاک وجود
چون ز مولی صدای عشق شنید در ره وصل کام ذوق کشود
برد در جستجوے تاریخش سر فرو برده احمد بے بود
از لب یاس گفت هاتف غیب برده بستر بدرگه معبود

۱۲۳۹

Translation.

Begin with Allah.

The lover of God, the celebate and free
Shah Hamza Ali of pure existence,
When he heard the voice of love from God,
He became desirous to meet Him.
The lowly Ahmad bending his head
Was in search of the date,
(When) the latent informer said with the lips of despair
" He carried his bedding to the house of God."

1236.

NO. 77.

Choti Masjid, Gurbatta.

The mosque known as Choti Masjid or the small mosque is Gurbatta, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola. is on the main road and was built by Hakim Gholam ›hammad in 1240 A.H.

Inscription.

غلام محمد حکیم بزرگ چو فرمود تعمیر این سجده'
شد از سر بانگ تاریخ او بخوبی بناکرد مسجد بر

۱۲۴۰

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم الله اكبر الله اكبر لا إله الا الله و الله
اكبر و لله الحمد لا اله الا الله محمد رسول الله
تعمير بتاريخ پانزدهم شهر جمادي الاول سنه ۱۲۳۳ هجري
روز سه شنبه بوقت صبح مسماة بي بي نوران رحلت فرمودند
ابو بكر عمر عثمان علي ابو بكر عمر عثمان علي

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. God is Great, God is Great, there is no God but God and God is Great and all praises are due to God. There is no God but God and Mohammad is his prophet.

Constructed fifteenth Jamadi I 1233 A.H. Tuesday, in the morning Musammat Bibi Nooran died.

Abu Bakr, Umar. Abu Bakr, Umar.
Usman, Ali. Usman, Ali.

No. 75.

Moradpur mosque.

The mosque known as Moradpur mosque is on the main road in Moradpur about a mile and a quarter east of Gola. It was built by Bibi Mannoo Khanum who was the mistress of Mr. Boilard, the then owner of Chajju Bagh, now the residence of the Chief Justice. The mosque was built in 1234 A.H.

Inscription

لا اله الا الله محمد رسول الله

مسجدے عالی بناکرده تمام بی بی منوں خانمی فرزانه
گفت دل تاریخ از هجر رسول پاک بنیادی عبادت خانه
سنه ۱۲۳۴

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
This great mosque was constructed.
By the wise Bibi Mannoo Khanum.
The heart said its date by the prophets Hijri.
" A house of worship " of clean foundation.

1234 A.H.

No 73.

Muradunnissa's mosque.

Muradunnissa's mosque is in Lodikatra's quarter of the city about 6 miles from gola. She built it in 1233 A.H.

Inscription.*

جل شانه	بسم الله الرحمن الرحيم	سبحانه

چون مراد النساء بحق آگاه خوش بناکرد مسجدے دلخواہ
یافتم سال ارز روے طلب فاذ کرو وافیه دائما لله
۱۲۳۳

Translation.

He is praiseworthy.	In the name of God the Merciful and Clement.	His state is glorious

When godly Muradunnissa
Beautifully constructed the pleasant mosque,
I got its date as I wanted it, (which is)
" Pray to God in it for ever "
1233.

No. 74.

Pagal Khana mosque.

The Pagal Khana mosque is so called because it is opposite to the compound in which formerly there was lunatic asylum. It is about a mile east of Gola and was built by Bibi Nuran as is given in the inscription. The inscription which is on the building of the mosque strangely shows the construction of the building as well as relates about the death of the lady as if it were a tombstone.

* فاذ کرو وافیه دائماللّٰه gives 1 24 but according to the hint 9 (the equivalent f letter (ط) should also be added which makes up the total 1233.

No. 72.

Shah Rustum Ali's Tomb.

In the compound of a mosque in Nanmohia, a quarter of the city about 3½ miles east of gola, is the tomb of the saint Shah Rustum Ali who died in 1230 A. H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

لا اله الا الله محمد رسول الله

بتاریخ بست و یکم شهر جمادی الاول سنه ۱۲۳۰ هجری المقدس روز سه شنبه گنهگار رستم علی وفات ، از برکات روح پر فتوح حضرت شاه ابوالبرکات قدس سره درین مقام آرام و نجات یافت توقع از پارسایان و ناظران همین که بنظر شفقت جانب مزارم نگرند و دعاے مغفرت یاد آرند

متاب اے پارسا رو از گنهگار بـبخشایندگی دروے نظر کن
اگر من نا جوانمردم بکردار تو برمن چون جوان مردان گذر کن

۱۲۳۰

اشهد ان لااله الاالله و اشهد ان محمداً عبده ورسوله

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

On Tuesday the twenty first Jamadi I, 1230 of holy Hijri Rustum Ali the sinner died and from the favour of the conquering soul of Shah Abul Barkat, may his remains be sacred, took his rest and salvation here. From the pious men and the readers it is expected that they cast an affectionate look towards my tomb and pray for my pardon.

O pious man don't turn thy face from the sinner,
(But) look at him with forgiveness.
If I died unmanly in action,
Thou shouldst pass by me like a brave man.

1230.

I declare that verily there is no God but God and I declare that verily Mohammad is His servant and prophet.

No. 71.

Qilla mosque.

The Qilla mosque is in *mahalla* Qilla or the Fort [1] about 6¾ miles east of Gola. It was built in 1229 A.H. by some one who is said to be a religious person but whose name is not mentioned in the inscription.

Inscription. [2]

ذلک بیت‌الله

سنه ۱۲۲۹

مسجدے ساخت مرد دیندارے   از مقیمان آستانه حق

سال تعمیر از زدل جستم   دل بمن گفت هست خانه حق

سنه ۱۲۲۹

Translation.

"This is the house of God."

1229.

A religious person whose residence is the threshold of God [3] constructed this mosque.

I searched the date of construction from heart which said "This is the house of God."

1229.

---

[1] The quarter of the city known as Qilla or the Fort is near the fort built by her Shah which was the residence of the provincial governors during the Moghal times. The fort no longer exists now but its site is occupied by the eautiful mansion of Rai Bahadur Radha Krishen Jalan.

[2] ذلک بیت‌الله and هست خانه حق are chronograms which give 1229 as the ate. Both mean "this is the house of God" but the former is Arabic and the atter in Persian.

[3] By "residence is the threshold of God" is meant that he is dead

It was Thursday, the second of Shaban,
That she went from this transient world to the pleasant paradise.
Rizwan[1] said this for the date of her death,
" Bibi Man made her place a garden of Eden ".

Coombs and Co.,
Calcutta.

No. 69.

Shah Hassan Ali's tomb.

Shah Hassan Ali who was a saint is buried in Khawja Kalan, a quarter of city about 5¼ miles east of gola. He died in 1224 A.H.

Inscription.

کرد آرام در ریاض بهشت شاه حسن علی که بود ولی
سال تاریخ رحلتش هاتف گفت مخدوم شاه حسن علی
۱۲۲۴

Translation.

Shah Hassan Ali who was a saint took this rest in the garden of paradise,
The latent informer said the chronogram of the date of his death " Shah Hassan Ali, the saint "
1224.

No. 70.

Dhoulpura Mosque.

The mosque known as Dhoulpura mosque is situated in Dhoulpura, a quarter of the city. It was built in 1227 A.H.

Inscription.

ان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً
اجمع المومنون وحدہ والباقي
سنه ۱۲۲۷ ھ
۱۲۲۷

Translation.

Verily mosques are for God. Don't call any body equal to God. The believers were collected and they narrated about the unity of the Everlasting one.

1227 A. H.
1227

[1] Rizwan, the angel of paradise.

No. 68.

Bibi Man's tomb.

Bibi Man who was the mistress of Christopher Keating, senior Judge of the Provincial Court of Appeal, died in 1223 A. H. as the chronogram of the tombstone of her grave shows. The inscription on the mosque built by her has been described before (no. 59). Her tomb is in the mosque compound and the stone is affixed in the wall to the west of the tomb.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

غني چون مان بی‌بي خلق را کرد از سخنهاے خود
بسے نعم البدل بنمود حاصل از خداے خود
بے تعزيت آل عبا مصروف بود از جان
همين اں در فردوس بکشاد از براے خود
زبس اعمال نيکو کشته رو صادر ازاں درياقت
غريق بحر غفران خدا سر تا بپاے خود
بروز پنجشنبه کان ز شعبان بود بردہ در
برفت از دهر فاني در بهشت دلکشاے خود
پے تاريخ سال رحلتش زينگونه رضوان گفت
گلزار عدن بنمود بي بی مان جاے خود

COOMBS & Co.
Calcutta.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement,
When Man Bibi made the people rich by her words,
She got its full recompense from God ;
She was heartily engaged in mourning for Aal-i-aba. [1]
And this opened the gate of paradise for her.
With all good motives Sadir asked lamenting about her
Who was head to foot submerged in the sea of mercy.

---

[1] Fatma, the daughter of the prophet, Ali his son-in-law, Hassan and Hossein his grand sons are called Aal-i-aba.

Translation.

He is Forgiving and Everlasting,

Gholam Mohi-ud-din who by chance came to Azimabad wrote this.

His old native place was the city of Meerut but Barh is known as the place of his birth.

He begot a beautiful son after the desire of an age.

He fondly named him Jamal-ud-din which was followed by the word " Haidar ".

Death became desirous of his face and it did not give a chance of life.

The strong and cold wind of death arose and the tree of his life fell head long from the feet

A common chronogram was said " Ah Poor "

1219.

" May every one be his intercessor and recommender "

1219.

SECTION IV.

Inscriptions from 1807 to 1857.

No. 67.

Mirza Aziz's tomb.

In the grave yard to the north of Sher Shah's mosque in Dhaulpura, a quarter of the city is the tomb of one Mirza Aziz who died in 1223 A.H. The inscription consists of beautiful lines in Persian.

Inscription.

چو شد میرزا عزیز از امر تقدیر
مقامات عدم را جاده پیما
بر آمد از زبان خامه تاریخ
عزیزم رفت از مصر دنیا
۱۲۲۳ ھ

Translation.

When Mirza Aziz with fates' command,
Went to the realm of eternight.
This chronogram came out of the tongue of pen,
" My friend went away from the regions of the world. "

1223 A.H

Inscription.

هو الله الغنی الودود

۱۲۱۹

بمسجد بکن ذکر حق با ادب

۱۲۱۹

Translation.

"He is God, the Benevolent and the Loving."
1219.

"In mosque recite the name of God respectfully."
1219.

No. 66.

A child's tomb near Pir Damaria.

Near Pir Damaria mosque, which is very beautifully situated on a high plinth, by the side of the river are several tombs, one of which is of a child whose name was Jamal-ud-din Haidar. It has an inscription from which it appears that he died in 1219 A.H.

Inscription.

هوالغفور و الباقي

شده راقم غلام محی الدین

از قضا وارد عظیم آباد

شهر میرٹ بود قدیم وطن

هست مشهور بارة میلاد

بعد عمری بآرزوے نزلك

پسر خوب روے صورت زاد

لفظ حیدر فزود نام اورا

به تمنا جمال دین نهاد

موت مشتاق صورتش گردید

بر من فرصت حیات ندادا

صرصر تند تیز اجل برخواست

نخل عمرش بسر زپا افتاد

عام تاریخ گفت آه غریب ۱۲۱۹

هر یک شافع و مشفع باد

۱۲۱۹

Inscription.

اضعف العباد حاجی منظور علي خان خواجه سراے سيد هدايت
علي خان بهادر اسد جنگ طبا طبائی در سنه يکهزار دو صد و هفده
هجري تعمير اين مسجد نمود از جميع المومنين اميدوار دعاے
مغفرت است سنه ١٢١٧ ه

Translation.

The weakest of the slaves Haji Manzoor Ali Khan, eunuch of Saiyid Hedayet Ali Khan Bahadur Asad Jung Tabatabai[1] constructed this mosque in the year one thousand two hundred and seventeen Hijri. He expects from every believer a prayer for the pardon of his sins, 1217 A.H.

No. 64.

Madaroo's mosque.

Madaroo's mosque is in Danka-ki-Imli, a quarter of the city about four miles east of Gola. It was constructed by her in 1217 A.H

Inscription.

تاريخ تعمير مسجد مدارو مهترانی هفتم شوال سنه ١٢١٧ه

Translation.

The date of the construction of Madaroo Mehtarani's mosque seventh Shawwal 1217 A.H.

No 65.

Kashmiri Bagh mosque.

The mosque in Kashmiri Bagh, a quarter of the city, has an inscription of two lines the first of which is in Arabic and the second in Persian. Both the lines are chronograms and give 1210 A.H. as the date.

---

[1] Saiyid Hedayet Ali Khan was the father of Saiyid Gholam Husain Khan author of Syeerul Mutakhirin and he is referred at several places in that book. He was made pay master by Zain-ud-din Ahmad Khan (Volume I, page ...) and was subsequently appointed as deputy governor of Patna (Volume I, page 448). He was superseded by Rai Chintaman Das but when the Marhattas made havoc, "the citizens of Patna were very much alarmed and asked him to take the reins of government" (G. P Sen—Patna during the last days of Muhammadans, Calcutta Review, Volume LXXIV, 1352)

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم اشهد ان لا اله الا الله وحده لاشریک له
و اشهد ان محمداً عبده و رسوله حافظ روشن محمد خان غفرالله له
سنه ۱۲۱۳ هجري *

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. I declare that verily there is no God but God, the One, who has no equal, and I declare that verily Mohammad is His servant and prophet. Hafiz Roshan Mohammad Khan, may God pardon him. 1213 Hijri.

No. 62.

Husaini Begam's m sque.

Husaini Begam's mosque is in D aulpura, about 6½ miles east of Gola. It was built in 1214 A.H.

Inscription.

بحسن طینت و صدق و صفا چو کرد بنا
حسینی بیگم ذی رتبه یک عبادتگاه
ندا رسید ز هاتف بگوش هر مومن
ز دل نماز کن اینجا که هست بیت الله

Translation.

When with good disposition, truth and piety,
Husaini Begam of high position constructed the place of worship,
On the ears of every believer a voice reached from the latent informer,
" Pray here heartily for this is the house of God ".

No 63.

Hajiganj mosque.

The beautiful mosque in mahalla Hajiganj, Patna City, which is known as Hajiganj mosque was built by Haji Manzoor Ali Khan in 1217 A.H.

* There is no date in figures in the inscription but ز دل نماز کن اینجا که هست بیت الله gives 1214.

لا اله الا الله محمد رسول الله تعمير ساخته
بی بی مان في سنه ۱۲۱۲ هزار و دو صد و دوازده هجری

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement. God is Great, God is Great, there is no God but God, and God is Great, God is Great, and all praise is due to God. There is no God but God and Mohammad is his prophet. Constructed by Bibi Man in 1212 A.H. One thousand two hundred and twelve Hijri.

No. 60.

A tomb in Sultan Dumba's mosque.

In Moghalpura, a quarter of the city about 5¼ miles from Gola, is a very large and old mosque without any inscription called Sultan Dumba's mosque. There is a tomb of a person whose name is not known, but it appears from the inscription that he died in 1212 A.H.

Inscription.

هوالکریم
بجنت چو بشتافت آن نیک تن
بسال رفانش شدم راه زن
زحوران شنیدم بتعظیم او
بیا و بیا باغبان عدن
سنه ۱۲۱۲

Translation.

He is benevolent.

When that good natured one went away to the paradise
I enquired of the date of his death.
I heard it from the *houris* who received him (and said)
" Come one, come on, the gardener of Eden "

1212 A.H.

No. 61.

Roshan Monammad Khan's tomb.

In the cemetery of Kashmiri Bagh near Moghalpura is the tomb of Roshan Mohammad Khan who died in 1213 A.H.

Nos. 57 and 58.

Mir Madarullah's mosque.

Mir Madarullah's mosque is in Dhoulpora, a quarter of the City. It has two inscriptions and was built by Mir Madarullah in 1211 A.H.

Inscription on *mihrab*.

افضل الذکر لااله الاالله محمد رسول الله

Translation.

The best of the sayings is "There is no God but God and Mohammad is his prophet".

Inscription on inner gate.

چون مدار المهام خانه دین ‎ ‎ میر عالی نسب مدار الله
مسجد نو باعتقاد آراست ‎ ‎ سال تاریخ شد ضرور آنگاه
از سر زهد گفت هاتف غیب ‎ ‎ شده موسوم کعبه دلخواه [1]
در عهد ‎ ‎ (۱۲۱۱) ‎ ‎ شاه عالم بادشاه

Translation.

When the minister of the house of religion,
Mir Madrullah of high lineage,
Constructed the new mosque out of faith,
The chronogram of its construction was necessary,
The latent informer with pious head said.
"It became known as a pleasant Kaaba".
In the reign of (1211) Emperor Shah Alam.

No. 59.

Keating's mosque.

The mosque known as Keating's mosque was built by Bibi Man, the mistress of Christopher Keating who was judge of Provincial Court of Appeal at Patna. It is on the main road near the Patna Civil Court within the compound of the house built by Christopher Keating. The house has recently under-gone much change. The mosque was built in 1212.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحیم الله اکبر الله اکبر لااله
الاالله و الله اکبر الله اکبر و لله الحمد

---

[1] شده موسوم کعبه دلخواه gives 1204 but accordingly to the hint ز =7 is to be added to it.

No. 55.

Bulaki's mosque.

In Jaggis Chauraha, a quarter of the city about 5½ m. east of the Gola, is Bulaki's mosque which was built in 1203. A

Inscription.

اقی داشت در دل این خیالے   که سازد مسجدے الله والله
مادم گفت هاتف این زغیبش   عبادت خانه الله الله [1]
١٢٠٨ هجرالنبوی صلی‌الله علیه وسلم

Translation.

Bulaki had the idea in his heart,
That he might construct a mosque for God,
The latent informer said immediately,
- " A house for the prayer to God."
1208 Hijri of the prophet may the blessing of God be on him and peace.

No. 56.

Shah Gholam Husain's mausoleum.

Shah Gholam Husain who was fifth in succession to Shah Arzani died in 1211 A.H. and was buried within the compound of mausoleum of that saint.

Inscription.

شاه حق آشنا غلام حسین   حیف زین خاکدان محنت رفت
خواست عشقی چو سال رحلت او   گفت هاتف بسوے جنت رفت
١٢١١

Translation.

Shah Gholam Hussain the lover of God,
Alas ! went away from this world of labour ;
When Ishki wanted the date of his death,
The latent informer said " He went towards paradise " 1211.

---

1 عبادت خانه الله الله gives only 1205.

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.		
"May this place of worship be peopled for ever."		
The date when construction ended.	1208 Hijri.	In bayanat.

Inscription on outer gate.

لااله الا الله محمد رسول الله

درزمان سعید این مسجد   که بناشد ز فضل ربانی
هاتف غیب سال تاریخش   گفت بیت المقدس ثانی

فی سنه ۱۲۰۸ھ

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
At the auspicious time when the mosque
Was built by God's grace,
The latent informer said its date of construction,
" A second temple of Jerusalem ".
In 1208. A. H.

The founder was buried after his death in the compound of the mosque but no date is given on the inscription, nor any of the line is a chronogram.

Inscription.

پس از من بر سر خاکم چو آئی   دعائے از برائے من نمائی
زبان اهل دل تأثیر دارد   بود شاید ز عصیانم رهائی

Translation.

When you come to my tomb after I have passed away,
Say prayer for me ;
The tongue of the pious has effect,
It may that I be absolved of my 'ns.

No. 47.

Uparka Bazar Mosque.

In Uparka Bazar, a quarter of the city near Gulzarbagh about 4½ miles east of Gola, is the Uparka Bazar mosque which was built in 1203 A.H.

Inscription.

لااله الاالله محمد رسول‌الله

سنه ۱۲۰۳ ھ

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet 1203 A.H.

Nos. 50—54.

Gholam Yehya's mosque.

The Mosque of Gholam Yehya[1] which is in Moghalpura, a quarter of the city, was built in 1207 A.H. It has several inscriptions.

Inscription above *mihrab*

مسجد گاه غلام یحیی سنه ۱۲۰۷ ھ

Translation.

Gholam Yehya's place of prayer, 1207 A.H.

Inscription on inner gate.

مائل تواریخ غلام یحیی بانی مسجد

Translation.

Apt in history Gholam Yehya the founder of the Mosque.

Another inscription on inner gate.

بسم الله الرحمن الرحيم		
این عبادت گاه ابداً آباد باد		
در بنیات	۱۲۰۸ الهجریه	سال العام

1 This Gholam Yehya who in the inscription is described as "apt in history" may be the same learned man who is described in Syarul Mutakhrin as "prince of the learned of Azimabad, Mullah Gholam Yehya" (Volume I, Section VII, Page 13) and "learned and eminent men such as Gholam Yehya" (Volume I, Page 660).

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.

When this mosque through the help of God,
Fortunately on an auspicious date
Was built through the agency of Shah Arzani,
It was written "A second Kaaba was constructed"
1202.

Constructor Makhmalunnissa Begam,
1202.

No. 48.

Nurpur Imambarah.

To the west of Mir Jumla's mosques in Nurpur, a quarter of the city about 7½ miles east of Gola, on the main road is a private cemetery on the gate of which is an inscription from which it appears that there was formerly an *imambarah* built in 1203 A.H. The imambarah building had also an inscription which is now buried in the debris.

Inscription on the gate.

میر فرزند علی مکاں امام
ساخت مقبول خاص و عام شدہ
سال تاریخ از ہاتف غیب
تعزیہ خانہ امام شدہ

Translation.

Mir Farzand Ali constructed the house of *imam*[1]
Which became popular with high and low.
The date of its construction by the latent inform
Became "a house for the *tazia* of the *imam*"
1203.

[1] Imam means a patriarch or a leader in religious matters. The reference here is to Imams Hasan and Husain, the grandsons of the prophet whose martyrdom is commemorated by mourning and making *tazias* or model of their tombs annually in the month of Moharram.,

تمام از دولت فیروز جنگ است   که او را ست این دولت خدا داد

رسیده از حضور اقدس او   برای سال تعمیرش چو ارشاد

نموده سجده شکرانه ساکن   بگفتا این عبادت خانه آباد

۱۲۰۲

Translation.

May the construction of the beautiful mosque be auspicious to Begam Saheba.

It was finished through the labour and exertion of Haji Saadat. May he have full recompense.

This is all by the wealth of Ferozjung for he has got it as a God-send.

When an order was received from his honour for the chronogram of its construction,

Sakin prostrated in thanks giving, and said "May this house of prayer flourish"

1202.

No. 47.

Lodikatra mosque.

The mosque in Lodikatra, a quarter of the city about 6½ miles east of Gola, was built by a lady called Makhmalunnisa Begam in 1202 A.H.=1788 A.D. Its inscription has fallen from the mosque and is kept with a local zamindar.

Inscription.

لا اله الا الله محمد رسول الله

چون این مسجد بنالیه الهی   بتاریخ همایون کلک تقصیر

طفیل شاه ارزانی بنا یافت   رقم زن کعبه ثانی بنا یافت

۱۲۰۲

مسجد آرا مخمل النساء بیگم

۱۲۰۲

Translation.

That [1]

the last of the prophets

Daughter of Syed Shah Mahfuz, alas!
Wife of Afzal Hosain of the holy religion
When she had passed the age of sixteen only
She went from this world to reside in heaven.
The parents and the husband of that Mary like lady,
All the three were full of grief.
Pity! it was only a year after her marriage
That she took her abode in the lap of the grave.
The day, date, month and the year of her death
When I enquired with intense sorrow,
On the headstone of her tomb was written fourteenth,
Friday and the month of Jamadi II

1201 A.H.

No. 46.

Fakhruddowla's mosque.

The mosque known as Fakhruddowla's mosque is situated on the main road about 6 miles east of Gola in Patna City. It was perhaps built by his wife who is called Begam Saheba in the inscription but her name is not mentioned. Fakhruddowla was Governor from 1725 to 1729. The mosque was built in 1202 A H = 1788 A. D. and has three domes.[2]

Inscription [3]

به بیگم صاحبه فرخنده بانو   بنا کی مسجدے پاکیزه بنیاد
به سعی و کوشش حاجی سعادت   مرتب گشت اجرش بیشتر باد

[1] Some of the words of the inscription could not be read

[2] Both Mr. James in Patna Gazetteer and Mr. R L Sinha in Pataliputra say that the mosque had originally 5 domes but its construction does not support the view

[3] This inscription has also been given in Patna College Magazine (March 1918, page 96) but has been so wrongly recorded as to make it meaningless. It is mentioned as being from "an uninteresting mosque situated in Machrahatta" and no translation of the inscription has been given.

No. 44.

Dooly Ghat Mosque.[1]

The mosque called Dooly Ghat mosque is in Dooly Ghat, a quarter of the city. It was built in 1200 A. H. by Aminud-dowla Azizul Mulk Ali Ibrahim Khan Bahadur Nasir Jung who was the "trustiest friend" of Mir Qasim and whose name appears in Syarul Mutakhrin at several places.[1]

Inscription.

هو الاحد

در سنه یکهزار دو صد هجری امین الدوله عزیز الملک علی ابراهیم
خان بهادر نصیر جنگ تعمیر نمود -

Translation.

He is one.

In the year one thousand two hundred Hijri, Aminuddowla Azizul Mulk Ali Ibrahim Khan Bahadur Nasir Jung constructed this mosque.

No. 45.

A Lady's Tomb.

In the Muslim cemetery near Moghalpura, a quarter of the city about $5\frac{1}{2}$ miles east of Gola, is an old tomb of a young lady who was daughter of Syed Shah Mahfuz. She died in 1201 A. H.

Inscription.

آں   آں ختم المرسلین
بنت سید شاه محفوظ (ء   زوجه افضل حسین پاک دین
چوں بعمر شانزده ساله گذشت   زیں جهان گشت در جنت مکین
والدین وزوج آں مریم صفت   هر سه تن گشتندش اندوهگین
حیف چوں یکسال رفتار ازدواج   گشت در آغوش مرقد جاگزین
روز و تاریخ و مه و سال وفات   چوں طلب کردم برنجهاے حزین
بر سر قبرش رقم زد ده چهار   جمعه ماه جمادی آخرین
سنه ۱۲۰۱ ھ

---

[1] Gholam Hosain Khan never lacks in praising him. He says "the illustrious and high born Khan, the beneficent, the munificent, the excellent and learned, the lord of one way of seeing (that is the sincere) Ali Ibrahim Khan, the Valiant, son to Doctor Mohammad Naseyr"—Syarul Mutakhrin, Volume I, section VII, page 12, English translation, 1789 edition.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

كل من عليها فان و يبقي وجه ربك ذوالجلال و الاكرام [1]

حكيم سيد احمد حسين ماه عيد يكشنبه سنه ۱۱۹۸ ه

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

All things are mortal and the face of God, the Powerful and Benevolent shall remain for ever. Hakim Syed Ahmad Husain. Month of Id, Sunday, 1198 A.H.

No. 42.

Mir Ibrahim's Tomb.

In the Shish Mahal mosque (Nos. 35—37) there is the tomb of Mir Ibrahim its founder who died in 1199 A.H.

Inscription.

جمل از قلم غلام
تعمیه

در شب هفتم ماه شعبان
مرشد کامل ازین عهد که رفت
گفت تاریخ دل از روی جمل
بود قطب در عهد که رفت [2]

۱۱۹۹ در جمل یعنی ابجد

سال انتقال پیر و مرشدی حضرت میر ابراهیم سنه ۱۱۹۹ در بینات

Translation.

Addition of the body of Jamal. By Gholam

On the night of the seventh of Shaban
When the perfect guide passed away from this world,
The heart said the date according to *jamal*.
"He was a great saint of the time he died"

1199 in *jamal*, i.e., *abjad*.

The year of the death of religious monitor and preceptor Hazrat Mir Ibrahim 1199 A.H in *bayanat* [3]

---

[1] Holy Quran, Part 27, chapter LV entitled "the Merciful," verse 26.

[2] The chronogram بود قطب در عهد که رفت gives only 1103 but if we add the ل م according to the hint in margin still the total is 1179 which is short by 20.

[3] For *jamal* and *bayanat*, see introduction.

Abu Bakr, Umar, Usman and Haider.[1]
During the reign of Emperor Alam Shah
When the strayed persons of the world were shown the correct path,
It was one thousand one hundred ninety-one of the Hijri era
That the wisdom of the world founded this house of religion.

No. 41.

Danka-ki-Imli Mosque.

The mosque known as Danka-ki-Imli mosque is in Danka-ki-Imli, a quarter of the city about 5 miles east of Gola, and was built in 1196 A.H

Inscription.[2]

از کرم کریم گوید حیرت
۱۱۹۶ ھ
برمضان روز جمعه چون گلاب بنا کرد محراب رب الخلیق
چنین ملہم غیب تاریخ گفت بود مسجد همچو بیت العتیق
سنه ۱۱۹۶ ھ

Translation.

"Hairat says this by the grace of the Benevolent"
1196 A. H.

In the month of Ramzan on a Friday like a rose
The arch of the house of Creator was constructed ;
The latent voice said this chronogram,
" May this mosque be like the Old House ".[3]

1196 A.H.

No 42.

Hakim Syed Ahmad Hosain's Tomb.

Hakim Syed Ahmad Hosain's tomb is in Lodikatra about 6 miles east of Gola. He died in 1198 A.H.

---

[1] Ali the fourth Caliph his also called Haider.

[2] Both the lines از کرم کریم گوید حیرت and بود مسجد همچو بیت العتیق are chronograms and give 1195 as the date.

[3] Old House meaning Kaaba, the temple at Mecca.

Inscription.

۱۱۹۰	ذلک المسجد مسجدالحرام	در بنیات
سنه ۱۱۹۰ ه	مسجد ابراهیم درجه دارد بکعبه ابراهیم	در ابجد و بنیات

Translation.

In Bayanat.	"This mosque is the Holy Mosque."	1190.
In Abjad and Bayanat.	"The mosque of Ibrahim has the position of Abraham's Kaaba."	1190

No 40

Gurhatta Bari Masjid (Mosque)

In Gurhatta, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola, on the main road is the mosque known as Gurhatta Bari Masjid or the big mosque of Gurhatta which was built in 1191 A.H.

Inscription. [1]

بسم الله الرحمن الرحیم

لا اله الا الله محمد رسول الله

ابوبکر و عمر عثمان و حیدر

زمان سلطنت بادشاه عالم شاه

که گمرهان جهان را نموده راه یقین

هزار و صد و نود و یک زسال هجرت بود

که کرد راے جهان این بناے خانه دین

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement

There is no God but God and Mohammad is his prophet.

[1] This inscription has also been described in Patna College Magazine (March 1918, page 93).

Translation.[1]

<table>
<tr><td>By Hazrat Haidar Baksh.</td><td>In the name of God the Merciful and Clement.</td><td>May his greatness prosper long.</td></tr>
<tr><td colspan="3">Our exalted Syed Ibrahim
Constructed this house of God which is pleasant to us.
I set this beautiful line
" For us the house of Abraham is the house of God."[2]</td></tr>
<tr><td>...</td><td>" This is the place of Abraham."</td><td>1190 A. H.</td></tr>
</table>

Inscription.[3]

كاتبہ محمدعلي	بسم الله الرحمن الرحيم	قايله غلم يحيى
سنه ۱۱۹۰ ھ	مسجد ابراهيم ازعنايت كريم آباد باد	درابجد

Translation.

Composed by Gholam Yehya.	In the name of God the Merciful and Clement.	Inscribed by Mohammad Ali.
In Abjad ...	" May the mosque of Ibrahim flourish by the bounty of God."	1190.

[1] The corners of the inscription are to be read together.

[2] The founder of this mosque was Ibrahim or Abraham and there is a pun on it as Abraham constructed the Kaaba, the temple at Mecca.

[3] It seems that the engraver began with the reverse side of the slab but left it, for the following inscription is on that side.

بسم الله الرحمن الرحيم
لااله الاالله محمد رسول الله

....

تاریخ عرش جائے رضوان بگوش جانم
گفتا که والفاطمه في جنت ما وا

۱۱۸۹ ع

Translation.

God is Great.

There is no God but God and Muhammad is His prophet.

....

The angel in the ear of my heart said the date of her reaching the paradise (thus)

" Verily Fatma is in paradise of rest. '

1189.

Nos. 37—39.

Shish Mahal mosque.

In Shish Mahal, a quarter of the city about 5½ miles east of Gola. there is a mosque called Shish Mahal mosque which was built by Syed Ibrahim in 1190 A.H. There are three inscriptions two of which have come out from the building and are kept there.

Inscription.[1]

از حیدر بخش	بسم الله الرحمن الرحيم	مد ظله العالي
سید ابراهیم عالی جاه ماه	کرد بیت الله بنا دلخواه ما	
مصرع دلخواه را کردم درست	بیت ابراهیم بیت الله ما	
دمه	ذالک مقام ابراهیم	سنه ۱۱۹۰ ه

[1] ذالک مقام ابراهیم and بیت ابراهیم بیت الله ما both are chronograms and give 1190 A. H. as the date. The word in the lower right-hand corner of the inscription could not be read.

—O God ! be merciful to the founder
For this has been a cause of his happy return
(to the next world)—
The latent informer exclaimed the cry of its date,
" May it be the best of the mosques till the world lasts."
1187.

No. 35.

Mir Ashraf's Tomb.

The tomb of Mir Ashraf lies in the same compound in which his mosque is. The inscription of date of his death is on the gate of the enclosure where also is the inscription of that of Mir Afzal. Mir Ashraf died in 1189 A.H.

Inscription.

یا رحیم یا غفار یا کریم
چو انصل نسب سید نامور بدارالبقا شد ز ملک عدم
چو گل بیرهن چاک رضوان بگفت بیا میر اشرف میان ارم
۱۱۸۹

Translation.

O Merciful ! O, Forgiver ! O Benevolent !
When that famous Syed[1] of high extraction
Went to the permanent abode from the transient place,
The angel of paradise flower like torn of his garment said,
" Mir Ashraf come in the paradise."
1189.

No 36.

A lady's tomb in Mir Ashraf's compound.

To the south-west of the enclosure in which are the tombs of Mir Afzal and Mir Ashraf (nos. 29 and 33) there is a tomb of a lady on a high platform along with others which has an inscription from which it appears that she died in 1189.

Inscription.[2]

الله اکبر
لااله الا الله محمد رسول الله

....

[1] The descendants of the prophet are called Syeds.

[2] After لااله الاالله محمد رسول الله there are some lines in Arabic which could not be read.

jokes which were sometimes aimed at Mohammad Shah, which necessitated his exile from Delhi to Patna where he died in 1186 A.H.

Inscription.

کوکه خان آن بهار باغ سخن
سوے خلد برین زدنیا رفت
کرد مفتون چو فکر تاریخش
گفت هاتف سرور دلها رفت

ھ ۱۱۸۶

Translation.

Koka Khan that beauty of the garden of language
Went away from the world to paradise.
When Maftun thought of its chronogram
The latent informer said " The delight of hearts passed away "

1186 A.H.

No. 34.

Mir Ashraf's mosque.

The mosque of Mir Ashraf which was built in 1187 A.H. is in Chowk Shikarpore in the same compound in which he and his father lie buried. It is a very large and beautiful mosque with a big compound, in the middle of which is a reservoir and a fountain. The mosque is paved with Gaur tiles.

Inscription.

چون بعهد خجسته حامی دین   شاه عالم بهادر باداد
مسجدے همچو کعبه اشرف   معدن فیض خوش شده بنیاد
یا الهی بپادش رحمت   کن که وقف است شده بخیر معاد
بانگ تاریخ گفت هاتف غیب   تا جهان اشرف المساجد باد

۱۱۸۷

Translation.

When it was the auspicious reign of the defender of the faith,
Shah Alam, the valiant and the just,
This mosque like the holy Kaaba
A fountain of benevolence was beautifully constructed,

Inscription.

هو الله اكبر جل جلاله و عم نواله و عظيم شانه و اعلى برهانه
اللهم اغفر للمؤمنين و المؤمنات والمسلمين والمسلمات يا
مجيب الدعوات

در جنت کشاده رضوان گفت   میر افضل بیا که منتظرم
۱۱۷۴

Translation.

God is Great, Majestic is His dignity, Common is His grace, Supreme is His proof.

Oh God pardon the faithful men and women and Muslim men and women! Oh the acceptor of prayers!

The angel of paradise opening its gate said.
" Come on Mir Afzal, I am waiting for you "

1174.

No. 32.

Shah Karimullah's Mausoleum.

Shah Karimullah who was fourth in succession of Shah Arzani died in the year 1185 A.H. and was buried in the compound of Shah Arzani where his mausoleum was erected over his tomb.

Inscription.

مالک ملک فقر شاهنشاه   زده در کشور بقا خرگاه
گفت تاریخ رحلتش تقدیر   یافت قرب نبی کریم الله
سنه ۱۱۸۵

Translation.

The lord of the province of saintliness, rather its emperor,
Pitched his camp in the country of eternity
Fate said his date of death,
" Karimullah found proximity to the prophet."

1185.

No. 33.

Koka Khan's Tomb.

To the east of the mosque of Sher Shah in Dhaulpora about 6½ miles east of Gola is the tomb of Ashraf Ali Khan *alias* Koka Khan who was the foster brother of Emperor Mohammad Shah. Koka Khan was famous for his witty sayings and pointed

Because his name was Rem[1] and he was his chosen servant.

When the eighth of the twelve (*imams*) became his leader and guide,

The angel of paradise cried "You have become holy. Enter in it".[2]

No. 21.

Mir Afzal's Tomb.

The burying ground of Mir Afzal which is now known as the burying ground of Mir Ashraf[3] is at Chowk Shikarpore, Patna City, about 6½ miles east of Gola. Mir Afzal who was probably father[4] of Mir Ashraf, died in 1174 A.H. His tomb along with that of his son is within an enclosure over the entrance of which is the inscription. Mir Afzal who was a Kashmirian merchant was buried at the feet of the saint Shah Rustam Ali who also lies burried in the said enclosure. "It was for this following reason: The Merchant, who intended to embrace the same kind of life, and was attached to him personally, got him buried in that spot which he had bought for his own burial; and on his deathbed he ordered that himself should be buried at his feet".[5]

---

[1] Ali Reza was the eighth imam.

[2] The chronogram [illegible] gives 1173 as the date of his death.

[3] Mohammad Habibullah's Tazkira-tos-Salhin, page 10.

[4] In spite of best efforts I could not learn from anybody the relationship of Mir Afzal with Mir Ashraf but there are certain facts which indicate that Mir Afzal was the father of Mir Ashraf. Both of them have the affix Mir and both of them lie buried within the same inclosure. The burying ground of the father which was once known after him, is after the burial of his son known after him (the son). The inscription of the date of death of Mir Ashraf (no. 85) has the words افضل نسب which means "of high extraction", as well as "of the extraction of Afzal". Mr. James while describing the river front at Patna in 1812 thinks that in Buchanan's map the word Afzal has been used by mistake for Ashraf and the diara surveyor correctly gives Ashraf (J. B. O. R. S., Volume XI, part I, page 83). It seems that in Buchanan's map the name of the father has been given while in surveyor's that of the son. Mir Afzal who was a big trader of his time was not less known than his son who was a gomasta of the company. But this Mir Afzal is a distinct person from Mir Afzal whose tomb is in Gulzarbagh and after whom the name of a quarter of Patna, viz., Afzalpur, is derived.

[5] Syarul Mutakhrin, Volume I, pages [illegible]. (English translation, 1789 edition)

Junge "[1]. He was the minister of Shah Alam and under the modest title of the steward of the household was his most trusted counsellor. After the battle of Baxar he assisted in the negotiations with the English which led to the grant of Diwâni in August 1765.[2] He died in 1173 A. H. as the chronogram indicates at Benares but was burried here.[3] His family [4] was once one of the greatest land owners in the district but although little is now left it still enjoys high social standing in Patna .[5]

Inscription.

چونکه نواب منیرالدوله گردون وقار
داعي حق را اجابت گفت وپنهان کرد رو
خلق عالم هرطرف درماتم آن ذیجناب
دائما در سوگواری وفغان جستجو
بردرجنت معیلش شد امام هشتمین
چونکه نامش بد رضا وهم قلم خاص او
نامی اثنای عشر چوشد معین ورهبرش
داد رضوان بهشت آواز طبتم فادخلوا

Translation.

As Nawab Moniruddowla of lofty position
Responded to the call of God and hid his face,
The people of the world lamented for him everywhere,
Always mourning and full of grief.
The eighth imam became his guide at the door of the paradise.

---

[1].Syerul Mutakhrin, volume 2, page 110.

[2].H. Beveridges' "The City of Patna" (Calcutta Review, Volume LXXVI. 1883.)

[3].After his death the title of Nawab Moniruddowla was given to his son and from a return, dated the 20th April 1782, it appears that his son was given Ba wank, Rampur, Shahjahanpore, out of estates confiscated from Raja Kyaliram—J. Reginald Hand, Early English Administration of Bihar, 1781—1785, page 32.

[4] .It is now called the Bhikhnapahari family.

[5] Patna Gazetteer (J.F.W. James), page 136.

Translation.

He died on Wednesday the nineteenth Rajab.

The latent informer said "Basant the saint of God and of high parentage" 1158.

No. 29.

Rahimunnissa's Tomb.

There is a tomb of a Muslim lady in the compound of Patna City charitable dispensary. The lady, whose name was Rahimunnissa and who was the daughter of Muhammad Yusuf Meshedi died in 1160 A.H.

Inscription.

بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ وفات مرحومه مسماة رحیم النسا بنت آقا محمد یوسف
مشهدی یازدهم شهر محرم الحرام سنه ۱۱۶۰ اللهم اغفرلها وتجاوز عنها
سیاتها و احشرها مع النبی و علی و فاطمه و الحسن و الحسین
و جمیع الایمة المعصومین صلواة الله و سلامه علیهم اجمعین

Translation.

In the name of God the Merciful and Clement.

Date of the death of Musammat Rahimunnissa, deceased—the daughter of master Muhammad Yusuf Meshedi—11th of the month of holy Moharram 1160. Oh God forgive her, and pardon her sins and congregate her on the day of resurrection with the prophet, Ali, Fatma, Hassan and Hosain and all the innocent *imams*. May the blessings of God and peace be on all of them!

SECTION III.

Inscriptions from 1757 to 1857 A. D.

No. 30.

Moniruddowla's tomb.

Nawab Moniruddowla's tomb is in the house of Nawab Vilayet Ali Khan in mahalla Guzri, Patna City. Moniruddowla's real name as the inscription indicates was Gholam Reza and his full title was "Moniruddowla Reza Cooli Khan Nadyr

Translation.

The servant of praiseworthy Nawab Fakhruddowla.

Who has got Hasan in conjunction with Ali in his name [1]

Constructed this court of justice, a fine place for administration of justice;

Its date of construction is one thousand, one hundred and forty-two.

No. 27.

Malsalami Mosque.

The mosque near the Malsalami police-station on the main road about seven miles east of Gola was built in 1150 A.H. by one Abdur Rahman Sajjad.

Inscription.

از فضل‌الله عبدالرحمان سجاد
با صدق و صفا نمود مسجدے بنیاد
باقر بدعا بگفت تاریخ
این خانۂ دین همیشه آباد

Translation.

By God's grace Abdur Rahman Sajjad,
Founded this mosque with truth and piety;
Baqar praying, said this chronogram,
"May this house of religion be always populous" 1150.

No. 28.

Shah Basant's mausoleum.

The mausoleum of Shah Basant, who was third in succession to Shah Arzani, is within the compound of Shah Arzani at *mahalla* Dargah about two miles east of Gola. He died in 1158 A.H.

Inscription.

کرد رحلت چار شنبه نوزده ماه رجب
گفت هاتف عارف یزدان بسنت عالی نسب
۱۱۹۸

---

[1] Hasan was the grandson of the prophet and Ali his father, was the prophet's son-in-law.

Translation.

He, who was illustrious in the life of resignation
Passed away to the garden of paradise,
Shah Shahbaz the perfect holy man
Who was daring in the path of acquiescence to God.
The bird of the lote tree [1] said this chronogram
" He was a falcon [2] soaring in heaven "
1126.

No. 26.

Hassan Ali's court of justice.

The court of justice built by Jafar who was in the service of Daud Khan Qureshi has been already noticed (no. 19). It was either repaired or rebuilt by Hassan Ali who was in service of Nawab Fakhruddowla, governor from 1725 to 1729 A.D. No trace of the building now remains and its inscription which is dated 1142 A.H. is at present affixed in one of the tombs in the Khwja Kalan police-station where the court of justice stood. The tombs are said to be of the kazis or judges of the court. This is the stone referred by Buchanan Hamilton in his report [3] while describing how soon even traces of large buildings in India are obliterated.

Inscription.

بلده نواب فخرالدوله ممدوح زمان
آنكه مرلطفش حسن را با علي باشد قران
ساخت دار العدل جائيكه مناسب داد
در هزار و يكصد و چهل و دو بناكرد [4] تاريخ آن

---

[1] By سدره which means lote tree is meant سدرة المنتهى the lote tree in the heaven.

[2] There is a pun on the word Shahbaz which means a falcon and which was also the name of the saint.

[3] Buchanan's report, J.B.O R.S., Vol. VIII, parts III and IV, page 257, Mr B. L. Sinha in his nice articles on the buildings of Patna in " Pataliputra ", page 42, wrongly mentions that the stone was found near the Chehelsatoon. The mistake seems to have arisen by the fact that Buchanan cited both Chehelsatoon and this court of justice as examples of buildings soon forgotten in India and a police-station also stands near the site of the Chehelsatoon.

[4] بناكرد is not clear in the inscription.

SECTION III.

Inscriptions from 1707 to 1757 A. D.

No. 24.

The mausoleum of Shah Kaley.

The mausoleum of Shah Kaley is near Pachim Darwaza or the western gate of the city about 5 miles east of Gola. Shah Kaley died in 1124 A.H.

Inscription. [1]

شاه کلے حبیب یزدانی   یافت نعمت ز مرتضی ثانی
گفت رزاق سال تاریخش   کو محب الست ربانی
۱۱۲۴

Translation.

Shah Kaley the friend of God,
Got the wealth (of saintliness) from Murtuza, the second [2].
Razzak said the date of his death (thus),
" Where is the divine loving ascetic "
1124.

No. 25.

The mausoleum of Shah Shahbaz.

Within the coumpound of the mausoleum of Shah Arzani is the mausoleum of Shah Shahbaz who was second in succession to him. He died in 1126 A.H.

Inscription.

کرد رحلت بسوے باغ جنان
آنکه در فقر بود ممتازے
شاه شهباز عارف کامل
که براه رضاست جا نبازے
طایرے سدره گفت این تاریخ
بود شهباز عرش پروازے [3]
۱۱۲۶

---

[1] This inscription has also been described in Patna College Magazine (March 1913) but the Sanskrit word "*asit*" meaning "ascetic" which occurs in the last line has been taken to be "*bast*" and has been translated as "house".

[2] Ali, the son-in-law of the prophet is known as Murtuza. Shah Kaley was perhaps a disciple of some saint whose name was Murtuza who is styled here as Murtuza II.

[3] بود شهباز عرش پروازے gives 1123 and not 1126 which is the date of his death, perhaps there is mistake of calculation.

the main road which is generally known as Pather-ki-masjid or the stone mosque was built in 1100 A.H. = 1688-89 A.D. by Buzurg Umed Khan who was Governor from 1685 to 1693 A.D. It is partly built of stone and stands on a high plinth and it seems that it was surrounded by garden. The people of the locality say that formerly the road passed near the mosque but has been diverted after the mutiny.

Inscription.

تاج و العظمت بزرگ امید خاں
آں که برخلق جہاں کرمش عمیم
چوں ز هاتف خواست تاریخش نجف
زود گفتا باد بیت المستقیم
۱۱۰۰

Translation.

Buzurg Umed Khan, (is) the Crown and the dignity
Whose generosity is common for all the people of the world.
When Najaf wanted the date of its construction from the latent informer,
He said immediately " May it be an erect house "

1100.

No. 23.

Sultangunj Mosque.

The mosque at Sultanguaj on the main road about 2 miles and 6 furlongs east of Gola was built by Tajo, the wife of Shaikh Badri. About 40 years ago there was some litigation about it and some words and the date in the inscription were mutilated but the last line which is a chronogram gives 1114 A.H = 1701 A.D. as the date.

Inscription.

شیخ بدری زنش تاجو نام
• • • • خداسے
مسجدے ساخت همچو بیت حرام
گفت هاتف ز غیب این پیغام

Translation

Shaikh Badri whose wife's name is Tajo
God is, * * *
She constructed this house like the sacred House
The latent informer mysteriously said "this message ".†

---

* این پیغام which means " this message " gives the date 1114.

Translation.

The fortunate Emperor out of belief constructed this mosque for the delight of God.

The wisdom with much supplication said its chronogram "He showed a Kaaba for necessities in this world"

Under the superintendence of Anis Ahmad.

In the middle of the inscription—

Founder Aurangzebe, Alamgir, may God perpetuate his kingdom.

No 21.

Ambar's Mosque.[1]

The mosque built by Khwaja Ambar, *nazir* of Shaista Khan, the Governor of Bihar,[1] is on the main road about 6¼ miles east of Gola. This beautiful mosque was built in 1100 A H.[2]=1685-89 A.D.

Inscription.

در زمان پادشاه دین پناه

شاه عالمگیر غازی ذو الکرم

خواجه عنبر ناظر شایسته خان

مسجد نو ساخت چون بیت الحرم

مظهر الحق سال تاریخ بنایش

معدن فیض الهی زد رقم

١١٠٠

Translation.

In the time of the Emperor who was bulwark of religion
Shah Alamgir, the victorious and generous,
Khwaja Amber, the nazir of Shaista Khan
Built this new mosque like the Holy House.
For its date of construction Mazharul Haque
Wrote "A mine for the bounty of God"

1100.

No. 22.

Buzurg Umed Khan's Mosque.

The large and beautiful mosque in Nagla, a quarter of the city of Patna about 7¼ miles east of Gola, a little to the south of

---

[1] The inscription from this mosque is also described in an article in Patna College Magazine for March 1913 at page 94.

[2] Mr. R. L. Sinha (Pataliputra, page 43) gives 1102 A.H.

[3] i.e., Kaaba, the temple at Mecca.

No. 19.
Court of Justice (Jafar's).

There was a court of justice where the Khwaja Kalan police-station now stands. It was built by Jafar who was in the service of Daud Khan as the inscription which is now in the building of the police-station shows. Daud Khan Kuraishi was governor from 1660 to 1665 A.D. The court of justice was built in 1074 A.H.=1664 A.D as the inscription indicates. It was rebuilt in the time of Nawab Fakhruddowla by Hasan Ali the inscription of which is also recorded (no. 26).

Inscription.

بهر عدل و داد مظلومان ز دست ظالمان
ساخت دارالعدل جعفر بندهٔ داؤد خان
سنه ۱۰۷۴

Translation.

For justice and equity of the oppressed against the hands of the oppressor,
Jafar the servant of Daud Khan built this court of justice.
1074.

No. 20.
Roza Mosque.

The mosque called the Roza mosque is situated near the *roza* or tombs of two saints Taj and Mangan. Aurangzebe built this mosque in 1078 A.H.=1668 A.D. There are many tombs near the mosque and there is an *akhara* attached to it. The inscription on stone outside the hall is chronogram and gives 1078 A.H. as the date of construction. There are also some verses from the Quran above *mihrab* on the masonry but without any date.

Inscription on stone.

آراست مسجدی بیکی خشوعی خدا ؎ از راه اعتقاد شهنشاه کامران

بادشاه
اورنگ زیب عالمگیر
خلدالله سلطنته

تاریخ او خرد بهزاران نهار گفت ؎ بر پا نمود کعبهٔ حاجات هر جهان

باهتمام انیس احمد

The founder of this great mosque is the door keeper of Nawab Abdullah Khan. Inscribed by Mohammad Moqim, son of Mir Syed Abdur Rasul.[1] 1070 Hijri.

Inscription on masonry.

قل هو الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً احد [2]

Translation.

Say, God is one God; the eternal God, he begetteth not, neither is he begotten: and there is not any one like unto him.[3]

No. 18.

Dhai Kangura Mosque.

The Dhai Kangura mosque or the mosque having two turrets and a half is so named because it has a stone slab in the roof resembling two and a half turrets. It is in Dhaulpora, a quarter of Patna City about 6¼ miles south-east of Gola. It was built in 1072 A.H. by one Mirza Noori.

Inscription.

ساخت مسجد مرزا نوري آنچنان
وصف او شد در جهان افسانه
قدسیان شادند از تاریخ آن
بهر ایزد چون بنا شد خانه
سنه هزار هفتاد و دو

Translation.

Mirza Noori built such a mosque
That it became famous throughout the world;
The pious are happy from that date
When the house was built for God.[4]
The year one thousand and seventy-two.

---

[1] Abdur Rasul inscribed no. 12 in Haji Chand's mosque.

[2] Holy Quran Chapter CXII, entitled " The declaration of God's unity".

[3] This is G. Sale's translation.

[4] The part of the line چون بنا شد خانه gives the date 1072

Inscription.

عاشق مولا سجاول شاه شاه دین پناه ٭
چون ازین دار فنا شد جانب دارالسلام
سال تاریخ وفات آن سریر آرای فقر ٭
گفت دل جا یافته بر مسند وصل امام
در سنه ۱۰۶۴ ھ

Translation.

When Shah Sajawal, the lover of God, and the royal bulwark of religion

Passed away from this transient world to the abode of peace,

The heart said the date of the death of that king of the saints,

" He found place on the chair of the society of Imam."

In 1064 A.H.

Nos. 16 & 17.

Dargah mosque

The large mosque which is south-east of the dargah of Shah Arzani (no. C) was built in 1070 A.H. by the door keeper of Nawab Abdullah Khan, who was governor from 1637 to 1639 A.D. The inscription which is very beautiful is on a large slab of black stone and is in Arabic. It does not give the name of the founder but says that the mosque was built by the door keeper of Abdullah Khan. It is possible that the founder might have been in the service of the governor and out of humility he styled himself as the door keeper. There is another inscription on the masonry inside the hall.

Inscription on stone.

و ان المساجد لله
فلا تدعو مع الله احد
بانی هذا المسجد العالی دربان نواب عبدالله خان کتبه
محمد مقیم ولد میر سید عبدالرسول سنه ۱۰۷۰ هجری

Translation.

Verily mosques are for God,

Do not call any body equal to God.

Translation.

....one thousand and fifty-nine
Had passed that sorrow increased in the heart. ....
He was courage from top to toe
Mohammad... ... .transitory
He soon passed to the dominion of eternity.
I enquired of wisdom about the date of the death,
Wisdom said that its date "was from sorrow".
Composed by Lutfullah. Inscribed by poor Mohiuddin.

No. 14.
Doondi Bazar Mosque.

The mosque known as the Doondi Bazar mosque called after the quarter of the city of Patna where it is situated is about a furlong west of the Mangle's Tank in Patna City. It is a unique mosque in the city as it has only one dome. It was built in 1061 A.H. = 1651 A.D.

Inscription.

ساخت خوشنود از پے خوشنودی حق مسجدے
کز شرف کرو بیاں رو بند صحنش را ز بال
بہر تاریخ بنائے او خرد گفت از ادب
قبلہ ارباب طاعت کعبہ اصحاب حال

سنہ ۱۰۶۱ھ

Translation.

Such a mosque was built for the delight of God
That the angels for their honour sweep its door by (the lock of) their hair.
The wisdom said respectfully for its date of construction,
"An altar for the worshippers, a temple for the apostles of ecstasy,"

1061 A. H.

No. 15.
Shah Sajawal's mausoleum.

Shah Sajawal was the successor of the saint Shah Arzani the inscription on whose mausoleum has already been noticed (no. 6). Shah Sajawal died in 1064 A.H. = 1653-1654 A.D. and his mausoleum is in the compound of Shah Arzani.

Translation.

God, Mohammad, Abu Bakr, Umar, Usman, Ali.	There is no God but God and Mohammad is His prophet.	God, Mohammad, Abu Bakr, Umar, Usman, Ali.

Whoever in this world became generous and wisely made gift from beneficence and liberality got eternal life. For this reason Haji Chand founded this mosque that his mark may be remembered.	When for the chronogram of its date of construction Manvi was making calculations bending himself like a bow, After all he found one increasing from "May this house of goodness be ever populous".

The founder of this great mosque is Haji Chand Shaista Khani. Inscribed by Abdur Rasul Hasani.[1] One thousand fifty-six 1056.

No. 13.

A tombstone in a Shaikh Rajab's Mosque.

In Shaikh Rajab's mosque which is situated in *mahalla* Fasabat-ka-maidan about one half mile west of Patna City school, there is an old tombstone dating 1050 A.H. = 1640 A.D., which was probably brought from the grave yard of the Karis which is near-by. When Shaikh Rajab built the mosque about 150 years ago he thought that an inscription was necessary for it, as many other mosques had, but being an illiterate man did not realise its significance and instead of having one describing the construction he brought it from one of the graves and affixed it in the mosque. When the mosque was extended and rebuilt about thirty years ago the inscription which was out of place was removed and it is kept there ever since. The mason in removing it has injured it very much and many of the words are missing.

Inscription.

یکهزار و پنج و ده - گذشته بود کین غم بهر دل افزود

- سرا... همت و سرتا قدم بود

محمد فاضی - بملک جاودانی رفت او زود

بهستم از خرد سال وفاتش - خرد گفتا که تاریخش زغم درد

قایله لطف الله کتبه غریب محی الدین

[1] Abdur Rasul's son Mohammad Moqim engraved inscription no 16 which is also large and beautiful.

Translation.

The wise Beg Mohammad constructed
This beautiful place of worship in the city of Patna.
The architect wisdom said its date,
" A beautiful and splendid mosque was built "
1056.

No. 12.

Haji Chand's mosque.

The mosque of Haji Chand is in Colonelgunj about four miles east of Gola. It is cut off from the main road by a few shops. The mosque which is itself beautiful and large has got a fine inscription on a big slab of black stone. Haji Chand is mentioned in it as Shaista Khani but how he was related to him is not made out. Shaista Khan was Governor from 1639 to 1648 A.D. The mosque was built in 1056 A.H. = 1646 A.D.

Inscription.

الله محمد ابوبكر عمر عثمان علي	لا اله الا الله محمد رسول الله	الله محمد ابوبكر عمر عثمان علي

معدوي از پے تاريخ بنايش	يافته عمر ابد هر كه بدهر داد
چون كمان خم شده ميكرد اعداد *	جود وكرم از دانش داد *
آخرش امر يكے افزون يافت	زين سبب كرد بنا حاجى چاند
بقعه خير همى باد آباد [1] *	مسجدے تا اثرش ماند ياد *

بانى المسجد العالى حاجى چاند شايسته خانى كتبه
عبد الرسول الحسنى الف وخمسين وستة سنه ١٠٥٦

[1] بقيه خير همى باد اباد gives 1057 but there is a hint in the previous line that it is greater by one.

Inscription.

صفی، خدا سیفخان آنکه توفیق

....

....

بگفتا که مجموعهٔ خیر دنیا

....

کاتبه محمد علی کشمیری غفر الله ذنوبه پیر کار این عمارت

Translation.

Saif Khan, the friend of God, by whose grace * *

* * * *

* * * *

He said " A collection of wordly benefactions "[1] * *

* * * * * * *

written by Mohammad Ali Kashmiri May God forgive his sins! The decorator of this building * *[2]

No. 11

Mohammad Beg's inscription in Begu Hajjam's mosque

Nazir Khan's inscription in the Begu Hajjam's mosque has already been described above (no. 1). The mosque has another inscription of the year 1056 A.H. = 1646 A.D. by Mohammad Beg, who repaired it. The inscription unfortunately instead of indicating the repairs shows that the mosque itself was built by him

Inscription.

ساخته بیگ محمد نیک رای

معبد در شهر پتنه روشن نمای

گفت معمار خرد تاریخ آن

مسجد زیبا و روشن شد بنای

سنه ۱۰۵۶

---

[1] مجموعهٔ خیر دنیا is the chronogram which gives 1080 as the date of construction.

[2] It seems that there were some more lines in 1913 which do not exist now. In an article on the mosques of Patna in the Patna College Magazine (March 1913) the following lines of the inscription are given —

San-i-Khudá Saif Khan ánke tawfie * * * —sa o shud wa sákhtash (.)
Kashe ánke (?) Bamulk-i-Bihar az imarat-i-áli, Barah-i-khudá sákht chande * * * Namáz-i-tahajjud guzarend shoma, Ke guftah (?) .... inja .... . Begufta ke majmua-i-khair duniá Katibau-i Mohammad Ali Kashmiri, ghafarallah zunubahu wa ....ar (?) i-in-imarat.

Translation.

Thank God that this matchless and beautiful building.
Was constructed in the reign of Shah Jahan Sahebkaran II[1]
Emperor Shahabuddin Mohammad[2] a king like Jam[3] in dignity,
To whose orders even land and sky have become obedient.
Saif Khan, that wise ruler, with a magnificent heart,
By God's grace became the founder of this heaven-like structure.

Its elegance is more life increasing than the breeze of the garden of paradise,

Its space is more exhilirating than the eternal life.

When Atai wanted the date of construction, the heart said,

" May the foundation of the Idgah of Saif Khan remain for ever. "

No. 10.

Madrasa mosque.

The Madrasa mosque is situated by the Ganges about 6½ miles east of the Gola. This beautiful and large mosque and the madrasa (school) building near it were built in 103 A.H = 1629-30 A.D. by Saif Khan who built the Idgah the inscription which is recorded above (no. 9). Its beautiful situation " made the place so remarkable for its coolness, retirement, salubrity and umbrage that it became the general resort of the best company[4] ". There was richly decorated writing inside the mosque running along the walls which has now been obliterated, the only lines left are the chronogram which gives the date of construction as 1039 A.H. and those which show the names of the founder of the building and the scribe.

---

[1] Sahebkaran means the lord of conjuction i.e., one born under peculiarl favourable aspect of the planets, as was the case with Timurlane who is called a such by his biographers. Timurlane being the first Sahebkaran, Shah Jahan i styled as the second

[2] Shahabuddin Mohammad was the real name of Shah Jahan. He assumed the latter name after his accession to the throne.

[3] Name of the ancient king of Persia famous for pomp and dignity.

[4] Syerul Mutaqrin, Vol. I, page 489 (English Translation, 1789 Edition).

Kai Khusro [1] of his time, and Jamshed [2] of his Kingdom (who)
On the royal throne (is) like the world conquering Alexander
Constructed this choice building under his supervision and which is
As firm as a rock in the pursuit of the precepts of Mohammad.
He demolished the fort and temple of Majhowli
And from the stone and wood of the temple
Was constructed this beautiful building.
I asked about the date of construction from the old wisdom,
Which said "Say, It is a place to walk to paradise"

1036 A.H.

No. 9.

Idgah of Saif Khan.

Saif Khan who was Governor of Bihar from 1621—1631 built this spacious idgah which is situated about 4½ miles east of Gola between the Main Road and Inglis Road. His real name was Mirza Safi and he had married Malika Banu, the eldest sister of Mumtaz Mahal, the lady of the Taj. He built this idgah in 1038 A.H = 1628-29 A. D. as the chronogram in the inscription shows. He also built the *madrasah* and the large mosque near it the inscription of which has also been recorded [3]

Inscription.

شکر ایزد کاین بنای دلکشا و بے نظیر
شد بعهد ثانی صاحب قرآن شاهجهان
شاه جم حشمت شهاب‌الدین محمد بادشاه
آنکه حکمش را مسخر شد زمین و آسمان
سیف خان آن داور دانا دل والا شکوه
شد بتوفیق الهی بانی این عرش مکان
زینت او جان فزا تر از هوای باغ خلد
وسعت او دلکشا تر از حیات جاودان
چون عطائی خواست تاریخ بنایش گفت دل
دائما بادا بنای عیدگاه سیف خان

[1] and [2] Kai Khusro and Jamshed were two famous Kings of Persia.

[3] Vide no 10, *infra*.

Translation.

I went to the threshold for the date,
I said "It is the holy door of pure truth"
1052.

No. 8.

Stone Mosque. [1]

The Pathar-ki-masjid or the stone mosque which is on the main road three miles east of Gola was built by Prince Parvez. The date on the inscription is 1036 A.H. = 1626 A.D. but as Prince Parvez died on 6th Safar 1035 A.H at Burhanpore it seems that although he began the construction it was finished after his death. Prince Parvez was the son of Emperor Jahangir and was Governor of Bihar from 1621 to 1624. The materials for the mosque were brought from Majhowli in Gorakhpur district.

Inscription.

لا اله الا الله محمد رسول الله

در عهد نور چشم جهانگیر بادشاه
پرویز شاه عادل و باذل بعقل راے
کیخسرو زمانه و جمشید سلطنت
بر تخت مملکت چو سکندر جهان کشاے
کرد این بناے خاص بدطار هر یشکی که هست
در پیروی شرع محمد چو کرد پاے
معمار ساخت قلعه مجهولی و بتکده
ز سنگ و چوب بتکده شد این نکو بناے
کردم سوال سال بنایش ز پیر عقل
گفتا بگو خرامی خیر المقام جاے
سنه ۱۰۳۶

Translation.

There is no God but God and Mohammad is His prophet.
In the reign of Emperor Jahangir, the light of the eye,
The just, generous, wise and intelligent Parvez Shah,

---

[1] The inscription from this mosque has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine (March 1913, page 93) but some words are wrongly recorded and no translation has been given

Translation.

O, true believers, when you are called to prayer on the day of assembly, hasten to the commemoration of God, and leave merchandizing. This will be better for you if ye knew it. And when prayer is ended then disperse yourselves through the land as ye list, and seek gain of the liberality of God.[1] 1025 A.H.

Below it is the following inscription :—

فنادته الملائكة وهو قائم يصلى فى المحراب [2]

Translation.

The angel called them when they were praying in the *mihrab*.

Nos. 6 and 7.

Mausoleum of Shah Arzani.

The mausoleum of Shah Arzani, who is held in great reverence by both Hindus and Muhammadans, is situated in mohalla Dargah, south of Sultangunge, about two miles east of Gola. Shah Arzani died in 1028 A H = 1619 A.D.

Inscription.

رفت قطب زمان به آسانی * بریاض بهشت ارزانی

سال فوتش زفیض ملهم غیب * گفت دل شاه جنت ارزانی

سنه ۱۰۲۸

Translation.

The universal saint passed away peacefully
To the effulgent garden of paradise.
With the favour of mysterious inspiration about the date of his death
The heart said " Beautiful paradise of Arzani "
1028

At the outer gate of the mausoleum is the following inscription :—

بهر تاریخ درگهش رفتم * پاک درگاه خاص حق گفتم

سنه ۱۰۵۴

---

[1] G Sale's translation.

[2] This is from the Holy Quran, Part III, Chapter III, entitled *Family of Imran*, part of verse 9.

Nos. 3, 4, 5.

Mirza Masum's mosque.

The mosque of Mirza Masum is situated on the main road at Pachchim Darwaza at Patna City about five miles east of Gola.[1] It is a large mosque built on a high plinth with shops to the north of it. The gate of the mosque has six carved blocks of stones which seem to belong to Gaur. The chronogram on the stone inscription gives 1023 A.H. (1614 A.D.) as the date of the construction but inside the hall there are two inscriptions in Arabic one of which is followed by the date 1025 A.H. It is possible that the work inside the hall was finished two years later.

The inscription on stone.[2]

بدور شاه جهانگیر میرزا معصوم
بساخت مسجد جامع بفیض باد رفیق
چو سال او خرد خواستیم زهاتف غیب
ندا رسید که بیت العتیق شد تحقیق

Translation.

In the time of Emperor Jahangir, Mirza Masum

Constructed the *Jama* mosque with the favourable circumstances.

When I wanted the date of its construction from the invisible speaker,

A voice said that verily it had become the " Old House "[3]

The inscription inside the hall above *mihrab* is the following.[4]

يا يهاالذين آمنو اذا نودي للصلواة من يوم الجمعة فاسعوا
الى ذكر الله وذرو البيع ذالكم خير لكم ان كنتم تعلمون ٥ فاذا اقضيت
الصلواة فانتشروا فى الارض وابتغوا من فضل الله ١٠٢٥ ﻫ

---

[1] Gola or the granary erected in 1786 is a very prominent landmark in Patna from which distances are calculated and mile and furlong stones set up on the roads of the city

[2] This inscription has also been given in an article on mosques of Patna in Patna College Magazine (March 1913 p 93) but some words have been wrongly recorded and the translation is incorrect

[3] Old House meaning Kaaba, the temple at Mecca.

[4] This is from the Holy Quran, chapter LXII, entitled the " Assembly "

Shah. May God preserve his dominion and rule. Founded by Khan Muazzam Nazir Khan, may his eminence be everlasting, in the year nine hundred and sixteen.

No. 2.
Muhammad Murad Shahanshah Sufi's tomb.

The mosque of Sher Shah which is situated in mahalla Dhaulpora, Patna City, is a massive structure unique in shape and construction in Patna. There is a large dome in the middle which is surrounded by four others but smaller in size which are constructed in such a way that not more than three can be seen at a time from any direction the building is observed. Inside at the base of the middle dome there are flowers made in masonry but at the four cardinal points between the flowers there seems to be inscriptions which are quite illegible from the floor. An attempt to read them from a ladder was not found possible as the persons there thought it to be dangerous as the building has become weak having suffered in earthquake and there was fear of its giving way. In the enclosed yard of the mosque near the southern gate is the tomb of Muhammad Murad Shahanshah Sufi who is regarded as a saint and his tomb is held in veneration. From the inscription on the octagonal tombstone it appears that he died in 949 A.H. = 1543 A.D. in the time of Sher Shah but the position of the tomb does not indicate that the mosque was built in his honour.

Inscription

محمد
مراد
شہنشاہ
صوفی
۹۴۹

Translation.

Muhammad
Murad
Shahanshah
Sufi
949

SECTION I.

Inscriptions up to 1707 A. D.

No. 1.

Nazir Khan's inscription in Begu Hajjam's mosque.

The oldest Muslim inscription in Patna is that in Arabic in the mosque known as that of Begu Hajjam which was built by Khan Muazzam Nazir Khan in 916 A.H.=1509-1510 A.D.,[1] in the reign of Allauddin Hosein Shah, King of Bengal, who built mosques and other buildings of utility in every district.[2] The floor of the mosque is paved with glazed tiles of Gaur and there is a beautiful stone doorway at the southern face of the mosque. The building on the other side of the road opposite to the mosque known as Satgharva or seven chambers seems to belong to the same period. Muhammad Beg who is commonly known as Begu Hajjam repaired it in 1056 A.H. = 1616 A.D (no. 11 *infra*). The presence of this mosque, as has already been observed, indicates that Patna was not neglected even before th time of Sher Shah, who finding it to be of strategic importance built the fort and made other improvements and thus from an insignificant town it rose to a large city.

Inscription.

قال النبی صلی الله علیه و سلم من بنی مسجداً لله بنی الله
له بیتاً مثله فی الجنة بنی هذا المسجد الجامع فی عهد السلطان
علاء الدنیا والدین ابوالمظفر حسین شاه السلطان خلد الله ملکه و سلطنة
بنیه خان معظم ناظر خان دام علوه فی سنه تسعمائیه و ستة عشر

Translation.

The prophet may the blessing of God be on him and peace said "God will make a house for him like it in the heaven wh will make a mosque for God" This *Jama* mosque was built in the reign of Sultan Allaudunia-wad-din Abul Muzaffar Husain

---

[1] Mr. J. F. W. James gives 1429 A.D as the date of constru... 1654 A.D. of the repair by Begu Hajjam (Patna Gazetteer) while Mr R. L... gives 1489 and 1654 respectively (Pataliputra). Mr. Sinha has taken 1065 A.H. instead of 1056 A.H to be the date of repair

[2] Gholam Hosain Salim's Reazus Salatin, page 133.

Prince Parvez, Abdullah Khan, Shaista Khan, Daud Khan Quriesbi, Saif Khan, Buzurg Umed Khan and Fakhruddowla are the governors whose names are found on them. Amongst others the names of grandees, noblemen (e.g., Monirnddowlah, Koka Khan, Ali Ibrahim Khan, Syed* Hedayet Ali Khan, Ali Qasim Khan), poets (e g., Israti, Gholam Yehya), saints (e g Shah Arzani) appear which throw a flood of light on the local history of the time.

Numeration of dates.

The inscriptions generally show the dates in chronograms according to the *Abjad* or *Jamai* system in which each of the letters has got a numeral. Some of the chronograms give the date according to *Bayanat*. The chronograms are also followed by date in figures. Generally the poet asks the *hatif* or the invisible informer or the wisdom or his heart about the date to which a reply is made in the chronogram. Sometimes when the figures are in excess or if there is any deficiency a hint is given in the previous lines to take out the excess or make up the deficiency, as the case may be, which is called *tamsa* and *takhraja*. It is also mentioned in some of the inscriptions not by way of hint but explicitly (e.g., no. 101 *infra*).

No record has been made either of the size or the kind of stone but indication has been given where the inscription is particularly large. The inscriptions are chronologically arranged and have been translated literally. The total number of inscriptions recorded is 112 which is composed as follows:—

Mosques	71
Idgahs	2
Tombs	35
Courts of Justice	2
Imambara	1
Bath	1
Total ..	112

doubt improved the fortifications and assigned separate quarters to nobles, clerks of the government and others and aspired to make the city a second Delhi, "but his ambition was cut short by the fracticidal war that broke out on the death of Aurangzeb in course of which he met his death (1712) by being swallowed up alive in quicksand ". Kaleidoscopic changes took places when the Saiyid brothers began to play the part of king-makers. The Mayis pillaged the city more than once. There being no settled life it is not strange that so little mater. is forthcoming for the period. Only six inscriptions have been recorded, which are thus composed—four from tombs, one from a mosque and one belongs to a court of justice.

(iii) Third section.

After the grant of the Diwani in 1765 there was normal life in the city, so for the period 1757—1807 we have got many inscriptions from mosques and tombs. The beautiful mosque with large courtyard and fountains built by Mir Ashraf, the *gomasta* of the East India Company, and the mosque known as that of Fakhruddowla belong to this period. Ashraf Ali Khan, who was foster brother of Muhammad Shah, died in 1186 A. H. and the inscription on his tomb has been described under this head.

(iv) Fourth section.

Sufficient material is also found for the fifty years ending with 1857 as there was perfect calm before the disturbance of the Mutiny. The rise of the democracy is noticeable as there are mosques built by barbers, drum-makers and the like. Co-operation is also visible as some of the mosques were built by subscription as their inscriptions indicate. Another characteristic is that many of the mosques under this section were built by women. The inscription in Golakpur mosque (no. 80) which informs that Farrukh Saiyar said his prayer there, belongs to this period.

Important names.

Of the sovereigns, the names of Allauddin Hosain Shah (King of Bengal), Emperors Jahangir, Shah Jahan, Aurangzebe, Farrukh Saiyar, Shah Alam appear in the inscriptions recorded

Burmah. The inscriptions belonging to later years, although numerous have not been noticed, as being modern and of little historical value.

Chief characteristics:

(i) First section.

The inscriptions of the first period are the most important not only because they are the oldest but also as they refer to the royalties, governors, their deputies and other servants. Mostly the inscriptions themselves are beautiful and are found in buildings that are characterised by strength, beauty and grandeur. The oldest inscription found is in the mosque popularly known as Begu Hajjam's mosque on the main road in the city dating 916 A.H. =1509-1510 A.D. The presence of this mosque goes to show that Patna was not neglected even before the days of Sher Shah. The next inscription in point of time is the octagonal headstone dated 949 A.H. = 1543 A.D. on the tomb of Muhammad Murad Shahanshah Sufi who lies buried in the compound of the mosque of Sher Shah. No other inscription has been found of pre-Akbar days. Although the Emperor Akbar was himself for sometime in Patna, he was too much engrossed with the war against Daud Khan to construct any building here. Khwaja Kalan's mosque, which bore an inscription as the construction indicates, is now without it. All other inscriptions of this section belong to the reign of Jahangir, Shah Jahan and Aurangzebe. The Roza mosque (Inscription no. 20 *infra*) constructed by Aurangzebe is perhaps the only building in the city which is built by a Moghal emperor.

(ii) Second section.

The next fifty years after the death of Aurangzebe are not marked with any great building and the reason is not far to seek There was a succession of weak rulers who were not great builders. The governors and their deputies generally imitated their sovereigns. This accounts for the presence of so many buildings of the time of Shah Jahan who was himself fond of them and their absence during the reign of these weaklings. Azimushan, who was governor from 1704 to 1712, no

religious institutions would be acquired for that purpose. The doubts of such persons had to be cleared and correct motive explained to them before the work began at any place. The vastness of the area and the situation of the buildings in lanes increased the difficulty. The main thoroughfare of the old city, the only one which can tolerably be called a street, is much frequented and notice has been taken of the buildings on it but the narrow lanes and the winding alleys which join it were practically unexplored. The ignorance of people of the locality made it necessary to go through all of them to find out any inscription worth recording and although an attempt has been made to make the list complete, owing to the nature of lanes it cannot be claimed that it is exhaustive, as some of the buildings must have escaped notice specially in the eastern part of the city where the work was pushed on hastily.

Divisions of the subject—4 sections.

The subject deals with inscriptions from the earliest t[illegible] to 1857, the year of the Indian M[illegible] after which no inscriptions hav[illegible] included as being comparatively mod[illegible] Without denying the continuity of the subject it is convenie[illegible] to divide it into four sections. The first has been taken [illegible] commence from the earliest time and to end with the death Aurangzebe, the last of the Great Moghals in 1707, which i[illegible] a prominent landmark in Indian history being the date when the Muslim power in India, then at its zenith, began to follow a rapid decline. The remaining one hundred and fifty years are divided into three periods of fift[illegible] years each. Thus the next section commencing with the d[illegible] in 1757, another memorable year in the histo[illegible] when the battle of Plassey determined the [illegible] of B[illegible], [illegible] and Orissa and made the British supreme th[illegible]. Th[illegible] tion ends after another fifty years, i.e. [illegible] last commencing in that year ends [illegible] Mutiny broke out after which the East In[illegible] exist and the Crown assumed direct management of t[illegible] and the last of the Moghal kings was deposed and deported to

replace it by his own which instead of showing the repair gloriously indicates the construction of altogether a new structure. Many mosques which were formerly known by a certain name are now called by quite a different one,[1] and if perchance the older inscription is left undisturbed and a new one affixed, both of them show the different names of the founder of the same building! [2]

Difficulties in recording inscriptions.

The condition of most of the inscriptions recorded was such that it was impossible to make out anything and some of them were said to be written in obsolete characters and even attempts to decipher them were laughed at. But on close examination it was apparent that years of deposit of dust and lime had made them illegible and after careful washing and scraping they could be easily read. The time taken for it was considerable which can be well understood from the fact that it took no less than five hours to make the old inscription of Dhai Kangura mosque (no. 18 *infra*) perfectly clear. This difficulty was also experienced by Father Gille while recording the inscriptions in Patna Church although only five of the inscriptions were prior to the nineteenth century and the oldest of them belonged to the year 1772. It took his mali "a full day to rub off the chunam and earth in which the lettering of no. 19 lay imbedded ".[3] Difficulty in recording the inscriptions was also experienced by the hostile attitude shown by most of the trustees and managers of the mosques and *dargahs* who wrongly thought that it was an attempt to bring them under the arms of law to deprive them of the trust properties which they were misappropriating. The ignorant mass thought that it was a part of the scheme of widening the streets and their

---

[1] *e.g.*, Shaista Khan's mosque at Chowk, Patna City, is now known as Wahid Ali's mosque (vide inscription no 102).

[2] Bega Hajjam's mosque has got two inscriptions, one showing the construction by Khan Muazzam Nasir Khan (Inscription no. I, and the other by Muhammad Beg (Inscription no. 11).

[3] Record of the Inscriptions at the Catholic Church at Patna, p [illegible]

(iii) Scarcity of stones.

Another reason for the inscriptions being not so numerous is the scarcity of stone in the locality which makes it a valuable object. Instances are numerous where for this reason stone has been carried to places far off. "The old Lakhnauti was robbed to build the medieval capital of Pandua, and later Gaur probably to build Rajmahal while in more recent times their brick and stone were transported as merchandise to Malda, Moorshedabad, Hoogly, Rungpore and even (as regards the more valuable kind of stone) to Calcutta."[1] Even in Patna "ancient carved stones of Gaur, hundreds of miles to the east are found built up into the mosques, *dargahs*, private houses and such fragments of Asoka's city of stone as have been dug up, have been turned to various ignoble uses such as *dhobis* washing stones."[2] When any inscription on stone comes out of its place no opportunity is lost by persons in the neighbourhood to appropriate it to their private use. Father Hosten could not find in the Patna Church 20 out of 30 tombstones mentioned by Father Anthony Mary only 45 years before although there were only seven which could not be deciphered.[3] This is in spite of the fact that the church is enclosed by a high compound wall and is guarded by a gate and servants reside there permanently. The old Muslim buildings being comparatively unguarded there was a greater opportunity to rob them of their inscriptions Thus large and ancient mosques,[4] tombs of saints,[5] princes[6] and governors[7] and other buildings[8] have been deprived of their inscriptions which they originally must have contained.

(iv) Changes during repairs.

The absence of old inscriptions is also due to the fact that when old buildings are repaired, the repairer often removes the original to

---

[1] Encyclopædia Britannica, ninth edition, Vol. X, page 114, article Gaur

[2] L. S. S. O'Malley, Patna Gazetteer, page 207.

[3] A record of the inscriptions at Catholic Church at Patna, page vii.

[4] *e.g.*, Khawja Kalan mosque, Mitan Ghat mosque, Mir Jumla's mosque, etc.

[5] *e.g.*, Pir Mansur.

[6] *e.g.*, Mirza Murad.

[7] *e.g.*, Jahangir Quli Khan.

[8] *e.g.*, At the gate of the fort (J.B.O.R.S., Vol. VIII, Pts. III and IV, page 349).

greatest city of the time in the province. Sher Shah from whose reign the greatness of Patna ranks built a fort and planned the city and from that time " Patna became the largest city of the province."[1] Akbar, who was for some time in Patna, left Monim Khan and after him Patna became the residence of the provincial governors of the Moghal emperors and was adorned with beautiful buildings. Thus it is not surprising that with the exception of two, no other inscription previous to the time of Akbar could be recorded.

But the lack of material is not only due to the fact that the subject has to be dealt with mainly from the sixteenth century. The want of archæological interest in the people allows the buildings to decay and no attempts have been taken in the past for their preservation. " The occupancy of men totally regardless of antiquity ", says Dr. Buchanan, " soon obliterates every trace and it is only in remote and wild parts of the country that the buildings are allowed to remain undisturbed or amongst nations very far civilized that an attention is bestowed on the preservation of monuments of arts. Chehelstoon,[2] the palace of the viceroys of Bihar which has accommodated many personages of royal birth and which fifty years ago was in perfect preservation and occupied by the king's son, can now be traced in a few detached portions, retaining no marks of grandeur and the only remains of a court of justice that had been erected in the year of the Hijri 1142 is a stone[3] commemorating the erection which was dug up in the year 1221 (A.D. 1807) when a police office was about to be erected on the spot where the other had formerly stood which in 79 years from its foundation had been completely obliterated "[4]

(ii) Want of interest in old buildings.

[1] " Tarikh Daudi "—Elliot, History of India, Vol. IV, page 478.

[2] Chehelstoon was to the west of the Madrasa mosque on the bank of the river in Patna City. Its western wall is still standing.

[3] It is now affixed in a tomb in Khwaja Kalan police-station, vide inscription no. 26, *infra*.

[4] Buchanan's Journal, J. B. O. R. S., Vol. VIII, parts 3 and 4, page 257; Martin's Eastern India, Vol. I, pages 42-43.

Introduction.

A RECORD of the inscriptions of a city like Patna which has played such an important part in the history of the country cannot but be interesting and useful reading. The inscriptions of the Hindu times are very rare in the city and notice has been taken of them from time to time when the buildings in which they are found have been described or reference has been made to them.[1] A record of the inscriptions at the Catholic Church at Patna has been prepared by the Rev. A. Gille, S. J., with the help of rubbings taken by Mr. J. F. Blakiston, Assistant Superintendent of Archæological Survey, with notes by the Rev. H. Hosten, S. J., and published by the Government of Bihar and Orissa. Father Hosten had also published some of the inscriptions from this church and from other Christian tombs in the city in Bengal: Past and Present, even before it.[2] Father Gille when engaged in recording the inscriptions of the Catholic Church at Patna copied 26 inscriptions in graveyards other than those of the church which Father Hosten promised to publish in some historical review.[3] Thus it will be seen that the inscriptions on the Christian monuments of Patna have also been fully described and published by this time. It is unfortunate that although the city played no mean part during the Muslim times no record of the inscriptions of the Muslim buildings and the monuments has been prepared as yet.

Paucity of materials and its reasons.

(i) Late rise of the city.

In spite of the fact that the city covers a large area the number of inscriptions recorded is not as great as might be expected. This is due to several reasons. Although there are proofs that Patna had already risen from the state of wilderness described by the Chinese traveller Yuang Chwang and was inhabited before Moghal rule it was not a large city. The chief centre of activity whether commercial, political or religious in the locality during that period was Bihar town which was perhaps the

---

[1] *E.g.*, L. A. Waddell, Report on the Excavation of Pataliputra, page 18.

[2] Vol. IX, part I, 1914, pp. 28—34; Vol. IX, part II, 1914, pp 176—180.

[3] Record of Inscriptions at the Catholic Church at Patna, p. ii.

Books referred in this work.

The Quran.
Encyclopædia Britannica.
Bengal : Past and Present.
Journal, Bihar and Orissa Research Society.
Patna College Magazine.
Beveridge, H. ... The City of Patna (Calcutta Review, Vol. LXXVI, 1883)
Elliot, H. M. ... History of India.
Gille, Rev. A. ... Record of Inscriptions at the Catholic Church at Patna
Gholam Husain Khan Syarul Mutakhrin
Ghosh, M. } Pataliputra.
Sinha, R. L. }
Hamilton, Buchanan Journal.
Hand, J. Reginald ... Early English Administration of Bihar.
Hasibullah, Muhammad Tazkiratus Salihin.
James, J. F. W. ... Patna Gazetteer (1924).
Martin, R. M. ... Eastern India.
O'Malley, L. S. S. ... Patna Gazetteer (1907).
Sale, George ... Translation of the Quran.
Salim, Gholam Husain Reazus Salatin.
Sen, G. P. .. Patna during the last days of the Muhammadans (Calcutta Review, Vol. LXXIV, 1882).
Waddell, L. A. ... Report on the excavation of Pataliputra.

Abbreviation.

J.B.O.R.S. ... Journal, Bihar and Orissa Research Society.

Serial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
86	Chowk mosque	1251
87	Shah Karim Bux's mausoleum ...	1252
88	Kaua Kheh mosque	1253
89	Gulzarbagh mosque	1255
90	Shah Gholam Husain's mosque ...	1256
91	Baqargunge mosque	1257
92	Tikia Shah's tomb	1267
93	Fazl Ali's mosque	1257
94	Lawn mosque	1258
95	Idgah (Dargah)	1258
96	Khadim Ali's mosque	1258
97	Ibadullah Shah's mausoleum ...	1260
98	Alamgunge mosque	1261
99	Najaf Ali's tomb	1261
100	Heegan's mosque ...	1261
101	Dafali's mosque	1263
102	Wahid Ali's mosque	1263
103	Shish Mahal private mosque ...	1264
104	City Court mosque	1265
105	Mir Abdullah's tomb	1265
106	Mehdi Ali Khan's tomb	1266
107	Nai Sarak mosque	1270
108	Mian Khan's tomb	1271
109	Shaikh Heegan's mosque	1271
110	Muhammadi Khanum's tomb ...	1272
111	Baqargunge lane mosque ...	1275
112	Headstone of Bibi Latifan's tomb ...	1276

Serial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
59	Keating's mosque	1212
60	A tomb in Sultan Dumba's mosque ...	1212
61	Roshan Muhammad Khan's tomb ...	1213
62	Husaini Begum's mosque ...	1214
63	Hajigunge mosque	1217
64	Madaroo's mosque	1217
65	Kashmiri Bagh mosque	1219
66	A child's tomb	1219
67	Mirza Aziz's tomb	1222
68	Bibi Man's tomb	1223
69	Shah Hassan Ali's tomb	1224
70	Dhoulpora mosque	1227
71	Qilla mosque	1229
72	Shah Rustum Ali's tomb ...	1230
73	Muradunnissa's mosque	1233
74	Pagal Khana mosque	1233
75	Moradpore mosque	1234
76	Shah *Hamza* Ali's tomb	1236
77	Gorhatta choti masjid	1240
78	Shaikh Bihari's mosque	1240
79	Kasim Ali's mosque	1241
80	Baam Saheb's mosque	1243
81	Nagla mosque	1244
82	Asalat Khan's mosque	1244
83	Balkhi Saheb's mosque	1247
84	Golakhpur mosque	1248
85	Bath	1249

S M no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
25	.ah Shabaz's mausoleum	1128
26	Court of Justice (Hasan Ali's) ...	1142
27	Malsalami mosque	1150
28	Shah Basant's mausoleum	1158
29	Rahimunnissa's tomb	1160
30	Moniruddowla's tomb	1173
31	Mir Afzal's tomb	1174
32	Shah Karimullah's mausoleum ...	1185
33	Koka Khan's tomb	1186
34	Mir Ashraf's mosque	1187
35	Mir Ashraf's tomb	1189
36	A lady's tomb in Mir Ashraf's compound	1189
37—39	Shish Mahal mosque	1190
40	Gorhatta Bari Masjid	1191
41	Danka-ki-imli mosque	1196
42	Hakim Saiyid Ahmad Husain's tomb ...	1198
43	Mir Ali Ibrahim's tomb	1199
44	Dooly Ghat mosque ...	1200
45	A lady's tomb	1201
46	Fakhruddowla's mosque	1202
47	Lodikatra mosque	1202
48	Nurpur imambara	1203
49	Uparka Bazar mosque	1203
50—54	Gholam Yehya's mosque	1207, 1208
55	Bulaki's mosque	1208
56	Shah Gholam Husain's mausoleum ...	1211
57 & 58	Mir Madarullah's mosque ...	1211

Old Muslim Inscriptions at Patna.

By Syed Mohammad, B.A., B.L

List of inscriptions.

Serial no.	Inscription.	Date according to Hijri era.
1	Begu Hajjam's mosque (Nazir Khan's inscription).	916
2	Muhammad Murad Shahanshah Sufi's tomb.	949
3—5	Mirza Masum's mosque ..	1023, 1025
6 & 7	Mausoleum of Shah Arzani ...	1026, 1032
8	Stone mosque	1[illegible]2[illegible]
9	Idgah (Saif Khan)	1[illegible]8
10	Madrasa mosque	1[illegible]9
11	Begu Hajjam's mosque (Muhammad Beg's inscription).	[illegible]56
12	Haji Chand's mosque	1056
13	Tombstone in Rajab's mosque ..	1059
14	Doondi Bazar mosque	1061
15	Shah Sajawal's tomb	1064
6 & 17	Dargah mosque	1070
18	Dhai Kangura mosque	1072
19	Court of Justice (Jafar's)	1074
20	Roza mosque	1078
21	Ambar's mosque	1100
22	Buzurg Umed Khan's mosque ...	1100
23	Sultangunge mosque	1114
24	Shah Kaley's mausoleum	1124

Editor's Note

The present work "Old Muslim Inscriptions of Patna" by Late Syed Mohammd, was published in 1930 in the "Bihar and Orissa Research Society Journal", Patna, in the form of an article. Publication of the work, independently, in a book form, was long overdue. Khuda Bakhsh Library, while publishing Fasihuddin Balkhi's Urdu work on the subject, considered it desireable that Syed Mohammad's be also published afresh to enable a scholar and an interested reader to have a comprehensive study.

A.R.B.

Sir Syed Encyclopaedia

Two letters of Sir Syed addressed to Mohsinul Mulk regarding John Davenport the author of "An Apology for Mohammed and The Koran"		261
Mu'ayyidul Islam (An Urdu version of 'An Apology for Mohammed and The Koran')	John Davenport	263

Qazi Abdul Wadood

Notes & Jottings	Qazi Abdul Wadood	[illegible]

Abul Kalam Azad

Problem of Apostasy & Muslims (Fitna-e-Irtidad aur Musalman)	Maulana Abul Kalam Azad	[illegible]

Indexes of Periodicals

Index of Fikr-o-Nazar (Quarterly), Aligarh	Dr Ziauddin Ansari	[illegible]

Letters to the Editor

Regarding Journal Nos 69-74	Mr Abdur Rauf Khan	[illegible]
Regarding Journal Nos.63-68	Mr Mustafa Khan Sherwani	[illegible]

•

Contents

Old Muslim Inscriptions at Patna	Syed Mohammad	1

rdu/Persian Section

ialib Encyclopaedia

Ghalibiyat· As Selected from the Urdu Monthly "Zamana" (1903-42) of Daya Naraian Nigam		1

e Manuscripts

Masnavi "Hal Namah" : "Gui-u-Chaugan"	Dr.Mateen Ahmad Saba	145
Diwan-e Mir Soz · Karachi Ms.	Mr Zahid Munir Amir	185
Diwan-e Hashim	Dr.Kalim Sahasrami	197
haikh Mohd.Dawal & his lari Namah"	Dr.Nurus Said Akhtar	205
wan-e Mushafi . Khuda khsh Edition	*Prof.Mukhtaruddin Ahmad*	220
nuscripts on Sufism	*Mr.Arif Naushahi*	

il Indian History

Imperial Bureau of ation as founded by	*Dr.A.A.Rizwi (Australia) Trans. Mr.S.Hasan Abbas (Tehran)*	*227*

Ali Jinnah

:b	*Dr.S.Abid Husain*	*249*

1992

Price Rs.75/-

Printer	Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	Mustafa Kamal Hashmi for Khud Bakhsh Library, Patna (Phone 650109, Tlx 22-430 KB
Editor	Dr. A. R Bedar
Annual Subscription	: Rs.300/- (Inland) U$ 60 (As Countries) U$ 120 (Other Price (this issue) Rs. 75/

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

78 - 80

'uda Bakhsh Oriental Public Library

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۸۱ — ۸۳

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۲۳۳۲۴/۷۷

شمارہ : ۸۴ تا ۸۵

قیمت: پچھتر روپے

سالانہ : ۳۰۰ روپے (ہندوستان)

۶۰ ڈالر ایشیا

۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۳ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

• چند اہم اخبارات و رسائل — قاضی عبدالودود — ۱

طب

• مقدمہ معدن تجربات — پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی — ۲۲۳

ممالک اسلامیہ کے سفرنامے

• جادۂ حق — سید اعظم علی عظیم آبادی — ۲۵۹

علوم اسلامیہ

• ہندستان اور مغرب میں فلسفے کی شرح نگاری کا روایتی انداز اور مسلمانوں کی شرحیں۔ — مولانا محمد عبدالسلام خاں — ۲۷۸

جہانِ سرسید

• سرسید کی دینی برکتیں — مولانا عبدالحلیم شرر — ۲۹۵

جہانِ اقبال، جہانِ آزاد

ہندستان کا ہجرت مسئلہ: اقبال و آزاد کے دو اہم خطوط

• علامہ اقبال کا ایک نایاب مکتوب گرامی بنام شیخ الازہر قاہرہ (محمد اکرام چغتائی) — ۳۱۵

• مکتوب آزاد — بنام سید سلیمان ندوی — ۳۳۹

جہانِ ودود

- یادداشتہائے ودود — قاضی عبدالودود — ۲۳۱

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

- بابر کا وصیت نامہ — جناب مصطفٰی خاں شروانی — ۲۵۹

اشاریے

- سوغات بنگلور کا اشاریہ — ڈاکٹر سلمان عابد — ۲۷۳

مراسلات

- جرنل ۷۵-۷۷ کے بارے میں — ڈاکٹر عبدالرب عرفان — ۹۷

حصہ انگریزی

- جب میں جناح کا سکریٹری تھا — ایم۔آر۔اے بیگ
- کچھ مسٹر جناح کے بارے میں — سیلیش کمار بندو پادھیائے — ۱۲

چند اہم اخبارات و رسائل

قاضی عبدالودود

فہرست

اسعد الاخبار	معاصر ۱۹۴۲-۴۳ء	۷
قران السعدین	ماحول فروری-اپریل ۱۹۶۰ء	۵۲
پٹنہ ہرکارہ	معاصر (عہد جدید) ح ۱۵	۵۵
اخبار الاخیار مظفرپور	مجلس حیدرآباد، اپریل-جولائی ۱۹۶۰ء	۶۱
اخبار الاخیار مظفرپور اور سید احمد خاں	فکر و نظر جولائی ۱۹۶۰ء	۶۶
گلدستۂ شعرا پٹنہ	معاصر (عہد جدید) ح ۱	۷۴
گلدستہ بہار	بہار کی خبریں ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء	۷۷
اردو انڈین کرانکل پٹنہ ۱۸۸۵ء	معاصر (عہد جدید) ح ۳	۸۴
اردو بہار ہیرلڈ و انڈین کرانکل	معاصر (عہد جدید) ح ۵	۱۷۷
ماہنامہ ادیب، پٹنہ	اشارہ، پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء	۱۸۰
الپنچ ۱۹۰۲ء	معاصر (عہد جدید) ح ۱۷	۱۸۸
الپنچ پٹنہ (جنوری تا جون ۱۹۰۲ء)	چراغ راہ کلکتہ، جون-جولائی ۱۹۵۹ء	۱۹۹
بہار (ماہنامہ)	ماہنامہ اشارہ پٹنہ نومبر ۱۹۶۰	۲۰۴
لسان الصدق	سالنامہ شاعر بمبئی ۱۹۶۰ء	۲۰۹
نوائے کیمبرج	چراغ راہ کلکتہ اپریل مئی ۱۹۵۹ء	۲۱۲

حرفے چند

قاضی صاحب کے کارناموں کو ان کی خواہش کے مطابق یکے بعد دیگرے پیش کرنے کا منصوبہ بن گیا، جس میں اوّلیت مختصر ذات تحریروں کو دی جانی تھی۔ ان میں بحیثیت محقق محمد حسین آزاد، عبدالحق اور غالب کا جائزہ تھا؛ کلام دلدار اور دیوان رضا عظیم آبادی کی تدوینات تھیں، اور ایک منتخب مجموعہ 'اثبات بہار' کی ترتیب تھی جس میں ان کی ہر نوع کی ایک تحریر شامل رہے۔ بحیثیت محقق محمد حسین آزاد والا جائزہ اور دیوان رضا کی تدوین، مکتبہ جامعہ کے لائق سربراہ شاہد صاحب کی جانسوزی سے جنوری ۸۴ء ن قاضی صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھیں۔ اثبات بہار کی وہ صرف پہلی کاپی دیکھ پائے (کہ یہ ابھی کتابت کی منزلوں سے رہی تھی) — یہ ہے نام ذات حق کا! اور بے نام حق کی جستجو کرنے والے اس بے لاگ محقق کا جس نے سچ کی تلاش میں، سچ سے، سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو موت تک اس کو نبھا دیا!! سچ، صرف سچ، اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں!!

یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب نے وقتاً فوقتاً اردو کے بعض اہم رسائل اور اخبارات کے بارے یں لکھے۔ ان میں اکثریت بہار سے نکلنے والے پرچوں کی ہے۔ (استثنیٰ: اسعد الاخبار آگرہ، لسان الصدق کلکتہ، نوائے کیمبرج)۔

یہ مضامین بیشتر اسی شکل میں پیش کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلی بار مختلف رسالوں میں چھپے۔ نوائے کیمبرج والے مقالے ـــ ایک آف پرنٹ پر قاضی صاحب کی اصلاحیں بھی ہیں، اُسے جوں کا توں لے لیا گیا ہے۔ اسی مضمون کا ایک صفحہ تمام و کمال ن کے خط میں مل گیا ہے، اس کا عکس آخر میں شامل ہے۔

———— ع ر ب

اسعد الاخبار آگرہ

یہ سلسلۂ مضامین اسعد الاخبار کے حسب ذیل نمبروں کے مطالعہ پر مبنی ہے: ۱۲۶۵ھ: نمبر ۸۰ (۱۴ محرم مطابق ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء) تا نمبر ۱۲۸ (۲۶ ذی الحجہ مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء)۔ ۱۲۶۶ھ: نمبر ۱۲۹ تا نمبر ۱۶۲ (۱۶۱ اور ۱۶۲ کے آخری ورق غائب ہیں)، نمبر ۱۴۳، نمبر ۱۶۷ (۲۵ رمضان مطابق ۵ اگست ۱۸۵۰ء)۔ ۱۲۶۷ھ: نمبر ۱۸۳ (۲۷ محرم مطابق ۲ دسمبر ۱۸۵۰ء) تا نمبر ۱۹۲ (۱ ربیع الآخر مطابق ۳ فروری ۱۸۵۱ء)، نمبر ۱۹۴، نمبر ۱۹۵، نمبر ۲۰۱ تا نمبر ۲۰۶ (۹ رجب مطابق ۱۲ مئی ۱۸۵۱ء)۔ سب پرچے ایک ہی جلد میں ہیں، اور جناب سید حسن عسکری صاحب کی وساطت سے مستعار ملے ہیں۔ میں ان کا نہایت ممنون ہوں۔

اسعد الاخبار آگرہ سے نکلتا تھا، اور اس کے مہتمم قمر الدین خاں تھے۔ پہلا نمبر[1] غالباً دوشنبہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۶۳ھ مطابق ۷ جون ۱۸۴۷ء کو نکلا تھا۔ عبارت ذیل سے جو ضروری تغیر کے ساتھ ہر ہفتہ اخبار کے پہلے صفحے پر ہوا کرتی تھی۔ اخبار کی قیمت، یوم اشاعت وغیرہ کا حال معلوم ہوگا:

یا رحیم اسعد الاخبار نمبر ۸۰ جلد اول تاریخ چودھویں محرم ۱۲۶۵ھ مطابق گیارھویں دسمبر روز دوشنبہ یہ اخبار ہفتے میں ایک بار دوشنبے کے دن چھاپا جاتا ہے۔ قیمت اس کی آٹھ آنے مہینہ اور محصول ڈاک ذمہ خریدار۔ نمبر ۸۰ میں اس عبارت نے صفحۂ اول کا قریب قریب نصف لے لیا ہے۔ اخبار کا کاغذ سفید تقطیع ۱۱$\frac{1}{4}$ × ۷$\frac{1}{4}$ انچ، صفحات ۴ — اور ہر صفحے میں دو کالم ہوا کرتے تھے۔ اس اخبار کا صفحۂ اول و دوم اسلامی تاریخ کے لیے وقف ہوتا تھا۔ عبارت ذیل بطور عنوان ہر ہفتے چھپا کرتی تھی: اس اخبار میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے زمانۂ متبرکہ کا حال واقعۂ اصحاب فیل سے شروع کر کے تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھاپا جاتا ہے۔ جب بفضلہ یہ حال تمام ہوچکے گا تو اہل بیت طاہرین اور خلفائے راشدین اور معرکۂ جگر سوز کربلا اور دوازدہ امام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات بے کم و کاست بہ تدریج و تفریق لکھے جائیں گے، تا خلائق کو ان حالات فیض سمات پر بخوبی آگاہی ہو۔ نمبر ۸۰ میں سریۂ رجیع کی کیفیت اور حضرت عاصم کی شہادت کا ذکر ہے، نمبر ۲۰۶ میں محاصرۂ طائف کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے۔ عبارت ذیل نمبر ۹۹ سے نقل کی جاتی ہے:

---

[1] نمبر ۸۰ ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء کو نکلا تھا۔ اس حساب سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کوئی ہفتہ ناغہ نہ ہوا ہو پہلے نمبر کی تاریخ اشاعت ۷ جون ۱۸۴۷ء ٹھہرتی ہے۔ پیش نظر نمبروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تہواروں کے موقع پر بھی یہ اخبار برابر نکلا کرتا تھا۔ [2] طرفین ذیل دونوں میں کچھ کاغذ جلد بندی میں کٹ گیا ہوگا۔

غزوۂ خندق ایک عجیب مصائب خیز معاملہ تھا کہ مشرک بڑی شوکت و حشمت سے نوبت بہ نوبت لڑتے آتے اور آنحضرت کے خیمے کا قصد کرتے تھے، لیکن، اللہ تعالیٰ ان کو اتنی فرصت وقابو نہ دیتا کہ خندق سے اتر آئیں۔ بہادرانِ اسلام راہِ خدا میں جاں بازی پر آمادہ ہوکر ان کا مقابلہ اور آں حضرت بہ نفس نفیس راتوں کو خندق کے بعض مواضع کی نگہبانی میں معروف رہتے۔ چنانچہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایام غزوۂ خندق میں سعد ابن ابی وقاص نے بڑی بڑی کوششیں کیں اور خندق میں ایک ایسا موضع تھا کہ تعجیل کے سبب اُسے اچھی طرح نہ کھود سکے تھے، ہوا دھر سے دشمنوں کے آجانے کا خوف تھا حضرت رسالت پناہ ہر شب آپ اس موضع پر جاکر وہاں کی حفاظت کیا کرتے۔ جب سردی سے دست وپا ٹھٹھرنے لگتے تو خیمے میں میرے پاس آتے۔ میں ان کے تاپنے کو آگ جلاکر انھیں گرم کر دیتی۔ حضرت سردی رفع کرکے پھر واپس چلے جاتے۔ ایک رات آپ خیمے میں گرم ہونے کے لیے آگ تاپ رہے تھے کہ باہر کسی شخص کے اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ سنی گئی۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کہ... نے عرض کیا کہ سعد ابن ابی وقاص ہے، آپ نے فرمایا کہ آج کی رات خندق کے اس موضع کی حفاظت سعد ابن ابی وقاص کرے۔ سعد نے قبول کیا، اور وہاں چلے گئے۔"

اخبار کے تیسرے صفحے کے پہلے کالم میں (کبھی نصف کالم، کبھی، اس سے زیادہ) پہلے حکمائے متقدمین کے حالات و مقالات شائع ہوتے تھے۔ پھر حکمائے متاخرین کے حالات و مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جب یہ ختم ہوگیا تو کتاب اخبار الاخیار سے اخذ کرکے صوفیہ کے حالات لکھے جانے لگے۔ اقتباس ذیل نمبر ۷۸ سے ماخوذ ہے:

"اس نے (یعنی جالینوس نے) کہا ہے کہ جس آدمی میں عقل نہ ہو علم اُسے کچھ فائدہ نہیں دیتا اور کہا ہے جو بیمار اشتہائے طعام رکھتا ہو بہتر ہے اس تندرست سے جو اشتہا نہ رکھتا ہو اور کہا ہے بدترین لڑکوں کا وہ لڑکا ہے جسے وحیا نہ ہو اور کہا ہے جو کہ اپنے تئیں عاقل ترین مردم سمجھتا ہو وہ بے عقل ترین مردم ہے اور فرمایا کہ حلیم اور بردبار آدمی ہے کہ ظلم وستم کرنے پر قادر ہو اور نہ کرے اور زیردستوں کا جور اٹھائے۔ ایک دن حکیم نے ایک بڑے جسیم و فربہ آدمی کو کہ لوگ اس کی نہایت تعظیم کر رہے تھے۔ پوچھا کہ اس شخص میں کیا بزرگی ہے جو تم اس کی اتنی تعظیم کرتے ہو۔ لوگ بولے نے ایک مری ہوئی گائے کو کمر پکڑ کر زمین سے اٹھالیا تھا۔ حکیم بولا کہ اگر اس میں بزرگی ہے تو تم گائے کی تعظیم کیوں نہیں کرتے جو ہمیشہ اپنے جسم کو لیے پھرتی ہے۔"

خبروں، اشتہاروں، گورنمنٹ گزٹ کے، اقتباسوں اور نظموں وغیرہ کے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ جو اس میں نکل سکتی تھی وہ ۲½ کالم تھی۔ اپنے ناظرین کو دنیا کے حالات سے باخبر رکھنا اخبار کا پہلا فرض ہے۔ یہ فرض کیسے انجام دیا جاتا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوگا:

بل سے متعلق خبریں: ۱۰ ایک یلک ٹرین یعنی ریل کی ڈاک گاڑی دہلی اور انبالے کے درمیان جاری ہوگی
ہے اور سنا جاتا ہے کہ لدھیانہ تک مقرر کی جائے گی"۔ الحقائق۔

۱۰ مہاراجہ سندھیا راؤ نے بہ تقریب شادیانۂ فتح پنجاب کے جشن کیا اور شہر دہلی اور چھاؤنی کے سب شرفا
لوگوں کو اپنے ہاں بلاکر ضیافت کی' دہلی اردو اخبار

۱۱ اخبار الحقائق میں دہلی گزٹ سے منقول ہے کہ منشی عمو جان جو پہلے دہلی کی ایجنسی میں سررشتہ دار تھے،
اور اب سدرلینڈ صاحب کی سفارش سے راجا الور کے مختار رہے۔ ان دنوں الور سے دہلی میں آئے، الور
کے کار پردازوں نے اُن کی غیبت میں راجا کے آگے اُن کی رشوت ستانی اور غبنِ مالِ سرکار کی بہت سی
بدیاں کیں (کرم خوردہ) نے انھیں دہلی سے بلاکر قید کر لیا، اور بلا ثبوت جرم دس لاکھ۔ بیس تاوان اُن سے
مانگا اور حکم دیا کہ دہلی کا رہنے والا کوئی ملازم تا انفصالِ مقدمہ الور سے کہیں جانے نہ پائے۔

۱۲ ان دنوں دہلی میں فقیروں بھکاریوں کی کثرت ہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ زیور (کرم خوردہ)
گلی کوچے میں تنہا پاکر پھسلا لے جاتے ہیں۔ ہر شہر و قصبہ میں شرفا کو چاہیے کہ لڑکوں کی احتیاط کریں
یا زیور نہ پہنائیں۔ ممکن ہے کہ ایسے فقیر اور شہر و قصبات میں بھی پہنچیں۔ (الحقائق)

۱۳ حضور والا نے بہ سبب کثرتِ باراں اور سرسبزی دشت و بیاباں کے مواد عشرت و شادمانی
دیکھ کر ۱۰ شوال کو پھول والوں کی سیر پھر مقرر فرمائی، کیوں کہ پہلی سیر میں بہار کے یہ سامان نہ تھے
چناں چہ پھول والوں کے چودھری کو پنکھے کی تیاری کا حکم دیا، اُس نے فوراً تیار کیا، اور ۱۰ شوال کو
پنکھا چڑھا' اور کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے، دہلی اُردو اخبار۔

۱۴ از روئے خط دہلی کے معلوم ہوا کہ منشی عمو جان ریاست الور میں تین لاکھ روپے ادا کر چکے ہیں اب تک
اُن کی رہائی نہیں ہوئی اور روپیا طلب ہوتا ہے۔ ستم رسیدگان اور شہر دہلی میں مکانات اور زیور
بیچ بیچ کر ز ر تاوان ادا کرتے ہیں، الحقائق۔

۱۵ بادشاہ دہلی نے ایک خط واسطے مقرر ہونے ولی عہد کے ملکہ معظمۂ انگلستان کے نام پر لکھا تھا۔ سو
وہ خط نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ملاحظے میں گزرا۔ انھوں نے اس خط کو صاحب ایجنٹ دہلی کے پاس
واپس بھیج کر لکھ بھیجا کہ بلا واسطہ خط و کتابت فی مابین ملکہ و بادشاہ نا ممکن ہے۔ نواب لفٹنٹ
گورنر ۲۰ اکتوبر کو دہلی میں داخل ہوں گے۔ دو روز وہاں قیام کرکے بہ سبیل ڈاک آگرہ میں آئیں گے۔ الحقائق

۱۶ ۲ ذی حجہ کو حضور والا خواجہ صاحب سے تشریف لاکر باغ روشن آرا میں رونق افروز ہوئے۔ دہلی اخبار

۱۷ بموجب حکم عالی سرکار کے خاص کوتوالی میں یا اُس کے قریب ایک عدالت مقرر ہوئی ہے
جس میں ایک صاحب اسسٹنٹ مجسٹریٹ اجلاس فرماتے ہیں' اور انھیں اجازت ہے کہ وہاں ہر روز

جلوس فرما کر مقدمات خفیفہ ہر روز فیصل کریں آج کا کام دوسرے دن پہ نہ رہے اور چونکہ اہل مقدمات کو صاحب مجسٹریٹ کی کچہری میں شہر باہر جانا پڑتا تھا تو آمد و رفت میں بڑی تکلیف اور ہرج ہوتا تھا، اور جو لوگ کہ اکثر اوقات ناحق حوالات اور قید میں دو چار روز رہ جاتے تھے۔ اُن کے لیے یہ بندوبست مفید ہوگا، اور صاحب مجسٹریٹ کو بھی شہر ہی میں رہنے کا حکم ہے۔ اور ان دنوں حکام کی طبیعت انسداد اس پر متوجہ ہے اور اس باب میں احکام سخت جاری ہوئے ہیں۔ دہلی اردو اخبار۔

۱۴۸ دہلی اردو اخبار میں مجمع الاخبار بمبئی سے منقول ہے کہ درخواست نواب گورنر جنرل بہادر کی دربارۂ موقوفی ولی عہد شاہ دہلی اور موقوف کرنے خطاب بادشاہی کے اس خاندان سے اور انقطاع آداب مناسب بادشاہی کے دارالسلطنت لندن میں بھیجی اور وہاں کے اعیان و ارکان کے ملاحظے سے گزری۔ مرضی خاص ملکۂ معظمۂ انگلستان کا یہ ہے کہ خطاب القاب اور آداب بادشاہی خاندان تیموریہ میں قائم رہے تقرر ولی عہد کا بموجب مرضی بادشاہ دہلی کے ظہور میں آئے۔ لیکن اعیان سرکار کمپنی بہادر اس باب میں انکار ہیں۔ اور اس مقدمے میں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ مرضی جناب ملکۂ معظمہ کی قائم رہتی ہے یا خواہش بلا

۱۴۹ حضور والا نے صاحب ریزیڈنٹ کے نام حکم دیا ہے کہ قطب صاحب سے روشن چراغ دہلی کی درگاہ تک راہ میں پل اور سڑک تیار کروا دیں، جو کچھ اس میں خرچ پڑے، بادشاہی جاگیر سے مجرا لے لو۔ زبدۃ الاخبار

۱۵۰ اخبار الحقائق میں مرقوم ہے کہ اندی باز لوگ جو ماخوذ عدالت ہوئے تھے الحال پیشی گاہ صاحب سے ان کے واسطے حکم قید شش ماہی اور دو دو سو روپے جرمانے کا صادر ہوا۔

۱۵۱ صادق الاخبار میں لکھا ہے کہ ان دنوں بدر الدین علی خاں مہرکن نے جو اس فن میں وحید الدہر بموجب فرمائش ملکۂ معظمۂ انگلستان وایماے جناب صاحب ایجنٹ دہلی کے دو مہر کندہ کی ہیں ایک تو ملکۂ کے نام کی، دوسری شاہزادہ البرٹ شوہر ملکۂ معظمہ کے نام کی۔ ملکۂ معظمہ کی مہر میں یہ عبارت ہے، شہنشاہ سما کیواں بارگاہ، خاقان البر سلطان البحر، مورد الطاف ایزد رحمٰن، بادشاہ انگلستان و ایرلنڈ و فرمان فرما ہندوستان، ملکۂ معظمہ وکٹوریا، اور شاہزادۂ موصوف کی مہر میں یہ عبارت ہے ''المؤید۔ فخر خاندان شہنشاہی برنسوک، انیس معزز ملکۂ معظمہ۔ رفیع القدر، والا شان، سرآمد بارگاہ و انگلستان البرٹ فرانسس، الکسس، چارلس ایمانوئل'' از زبدۃ الاخبار

سے قمار بازی کے جرم میں غالب کو سزا اسی زمانے میں ملی تھی۔

لے دہلی سے متعلق قریب قریب کل خبریں جمع کردی گئی ہیں جن میں غالب کا نام آتا ہے

ہسعد الاخبار میں اودھ کے متعلق ذیل کی خبریں ملتی ہیں :
۲۸ ۱۰ر جنوری (۱۸۴۷ء) " دہلی اردو اخبار میں مرقوم ہے کہ کرنیل رچمنڈ صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ کلکتہ کو
تشریف لے گئے، اور کپتان برڈ صاحب رزیڈنسی کے کام کا انجام دیتے ہیں، اگرچہ ابھی تقرر کرنیل سلیمن
گورنمنٹ گزٹ میں نہیں چھپا، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک صاحب ممدوح عہدۂ رزیڈنسی اودھ پر
مقرر ہوں گے۔ ان دنوں انتظام مالی اس ریاست کا بہت ابتر ہے، اور خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے
اور اخبار الحقائق میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی ریاست کے دخل و خرچ میں ایسی کمی بیشی ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ
اس سال کے آخر شاہ اودھ (اودھ) اپنا تھوڑا ملک سرکار کمپنی پاس گروی رکھیں، اور کچھ روپیہ قرض لیں
اور افواہ سنا جاتا ہے کہ غلام رسول خاں جو سابق میں کوتوال تھے، بالفعل لکھنؤ میں بہ عہدۂ بخشی گری مقرر ہوئے
۲۸ ماہ صفر کی ۲۴ تاریخ کرنیل سلیمن صاحب بہادر جو بہ عہدہ رزیڈنسی لکھنؤ مقرر ہوئے ہیں، لکھنؤ میں داخل ہوئے
اور چونکہ وزیر دولتمدار بہ سبب کوفت سلطانی بیمار ہیں، رزیڈنٹ بہادر سے اولاً ملاقات نہیں ہوئی، ولی عہد
نے مراسم تعظیم و مدارات ادا کیے، بعد از آں حضرت سلطانی سے ملاقات ہوئی"۔
۲۹ نواب سید حامد علی خاں بہادر[1] سخت پریشان خاطر ہیں کہ سلون اور بیسواڑہ سے روپیہ وصول نہیں ہوتا، بلکہ
سرکشی پر آمادگی کو تیار ہوتے ہیں، مگر روپیہ نہیں دیتے۔ سال گذشتہ کے کئی لاکھ روپیہ باقی تھے، سال حال کی قسطیں بھی
اور کارگزاران شاہی کا یہ حال ہے کہ اگر سرکش لوگ روپیہ دیتے بھی ہیں تو کارگزار کھا جاتے ہیں۔ ان دنوں نوا
ب کی نسبت بادشاہ کا یہ حکم ہوا کہ اپنے قبائل لکھنؤ میں بلالو، سو بادشاہ کو یہ وغدغہ ہوا ہے کہ ایسا نہ ہو
کہ چل دیں، اور حضرت سلطانی کسل و ناتوانی کے سبب محل سے نہیں نکلتے۔ بہت دنوں سے امراء کا دربار
عام نہیں ہوتا۔ نواب[2] وزیر کبھی کبھی در دولت تک باریاب ہو جاتے ہیں، سو پس پردہ ہی سے سلام کر کے باہر
آتے ہیں عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)
۳۰ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ طویلۂ خاص سلطانی کے سائیسوں نے جن کی آٹھ سات مہینے سے تنخواہ نہیں دی
گئی، ہو کر وزیر الممالک کو دربار جاتے ہوئے گھیر لیا، اور جو کچھ ان کے دل میں آیا سو کہا۔ آخر کار یہ ہوا کہ مہینے کی
کل تنخواہ بانٹ دی گئی تب جھگڑا رفع ہوا۔

---

[1] اس زمانے میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ تھے [2] ان کے خسر اعتماد الدولہ امجد علی خاں عرف نصیر الدین حیدر کے
زمانے میں اودھ کے وزیر رہ چکے تھے۔ حامد علی خاں مرزا غالب کے احباب میں تھے۔ ان کا نام خطوط غالب میں
ہے۔ علی نقی خاں وزیر تھے۔

جلوس فرما کر مقدمات خفیفہ ہر روز فیصل کریں آج کا کام دوسرے دن پہ نہ رہے اور چونکہ اہل مقدمات کو صاحب مجسٹریٹ کی کچہری میں شہر باہر جانا پڑتا تھا تو آمد و رفت میں بڑی تکلیف اور ہرج ہوتا تھا اور جو لوگ کہ اکثر اوقات ناحق حوالات اور قید میں دو چار روز رہ جاتے تھے۔ اُن کے لیے یہ بندوبست مفید ہوگا، اور صاحب مجسٹریٹ کو بھی شہر میں رہنے کا حکم ہے۔ اور ان دنوں حکام طبیعت انسداد قمار بازی پس متوجہ ہے اور اس باب میں احکام سخت جاری ہوئے ہیں۔ دہلی اردو اخبار۔

۱۴۸ دہلی اردو اخبار میں مجمع الاخبار بمبئی سے منقول ہے کہ درخواست نواب گورنر جنرل بہادر کی درباب موقوفی ولی عہد شاہ دہلی اور موقوف کرنے خطاب بادشاہی کے اس خاندان سے اور انقطاع آداب و القاب مناسب بادشاہی کے دار السلطنت لندن میں پہنچی اور وہاں کے اعیان و ارکان کے ملاحظے سے گزری۔ سو مرکوز خاطر ملکۂ معظمہ انگلستان کا یہ ہے کہ خطاب و القاب اور آداب بادشاہی خاندان تیموریہ میں قائم رہے اور تقرر ولی عہد کا بموجب مرضی بادشاہ دہلی کے ظہور میں آئے، لیکن اعیان سرکار کمپنی بہادر اس باب میں انکار رکھتے ہیں۔ اور اس مقدمے میں دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ مرضی جناب ملکۂ معظمہ کی قائم رہتی ہے یا خواہش سرکار کمپنی کی۔

۱۵۳ حضور والا نے صاحب رزیڈنٹ کے نام حکم دیا ہے کہ قطب صاحب سے روشن چراغ دہلی کی درگاہ تک اثنائے راہ میں پل اور سڑک تیار کروا دیں، جو کچھ اس میں خرچ پڑے، بادشاہی جاگیر سے مجرا لے لو۔ زبدۃ الاخبار

۱۵۰ اخبار الحقائق میں مرقوم ہے کہ بانڈی باز لوگ جو ماخوذ عدالت ہوئے تھے الحال پیش گاہ صاحب مجسٹریٹ سے ان کے واسطے حکم قید شش ماہی اور دو دو سو روپے جرمانے کا صادر ہوا۔

۱۵۴۔ صادق الاخبار میں لکھا ہے کہ ان دنوں بدر الدین علی خاں مہرکن نے جو اس فن میں وحید العصر ہیں، بموجب فرمایش ملکۂ معظمہ انگلستان و ایمائے جناب صاحب ایجنٹ دہلی کے دو مہر کندہ کی ہیں، ایک تو ملکۂ معظمہ انگلستان کے نام کی، دوسری شاہزادہ البرٹ شوہر ملکۂ معظمہ کے نام کی۔ ملکۂ معظمہ کی مہر میں یہ عبارت ہے، شہنشاہ سلیمان جاہ کیواں بارگاہ، خاقان البر، سلطان البحر، مورد الطاف ایزد رحمٰن، پادشاہ انگلستان و ایرلنڈ و نوبان فرما ملک ہند ناصر دین مسیحا، ملکۂ معظمہ وکٹوریا، اور شاہزادۂ موصوف کی مہر میں یہ عبارت ہے، "المؤید بتائید فخر خاندان شہنشاہی برنسوک، انیس معزز ملکۂ معظمہ، رفیع القدر، والا شان، سر آمد بارگاہ انگلستان البرٹ فرنسس ایلبرٹس، چارلس ایمانوئل" از زبدۃ الاخبار

سه قمار بازی کے جرم میں غالب کو سزا اسی زمانے میں ملی تھی۔

۵ه دہلی سے متعلق قریب قریب کل خبریں جمع کر دی گئی ہیں جن میں خطوط غالب میں ان کا نام آتا ہے۔

اسعد الاخبار میں اودھ کے متعلق ذیل کی خبریں ملتی ہیں:

۲۸ (۱۸ جنوری ۱۸۴۹ء) "دہلی اردو اخبار میں مرقوم ہے کہ کرنیل رچمنڈ صاحب رزیڈنٹ لکھنؤ کلکتہ کو تشریف لے گئے، اور کپتان برڈ صاحب رزیڈنسی کے کام کا انجام دیتے ہیں؛ اگرچہ ابھی تقرر کرنیل سلیمن صاحب کا گورنمنٹ گزٹ میں نہیں چھپا، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شک صاحب ممدوح عہدۂ رزیڈنسی اودھ پر مقرر ہوں گے۔ ان دنوں انتظام مالی اس ریاست کا بہت ابتر ہے، اور خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے۔ اور اخبار الحقائق میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی ریاست کے دخل و خرچ میں ایسی کمی بیشی ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ اس سال کے آخر شاہ اود (اودھ) اپنا تھوڑا ملک سرکار کمپنی پاس گروی رکھیں اور کچھ روپیہ قرض لیں۔ اور افواہاً سنا جاتا ہے کہ غلام رسول خاں جو سابق میں کوتوال تھے، بالفعل لکھنؤ میں بہ عہدۂ بخشی گری مقرر ہوئے"

۲۷ "ماہِ صفر کی ۳ تاریخ کرنیل سلیمن صاحب بہادر جو بہ عہدۂ رزیڈنسی لکھنؤ مقرر ہوئے ہیں، لکھنؤ میں داخل ہوئے اور چوں کہ وزیر دلا، مدار بہ بندگانِ سلطانی بیمار ہیں، رزیڈنٹ بہادر سے اولاً ملاقات نہیں ہوئی، ولی عہد نے مراسم تعظیم و مدارات ادا کیے۔ بعد ازآں حضرت سلطانی سے ملاقات ہوئی۔"

۴۹ نواب سید حامد علی خاں بہادر سخت پریشان خاطر ہیں کہ سلون اور بیسواڑہ سے روپیہ وصول نہیں ہوتا۔ سلون کے سرکش لڑائی کو تیار ہوتے ہیں مگر روپیہ نہیں دیتے۔ سالِ گذشتہ کے کئی لاکھ روپیہ باقی تھے، سالِ حال کی قسطیں بھی رکیں۔ کارگزاران شاہی کا یہ حال ہے کہ اگر سرکش لوگ روپیہ دیتے بھی ہیں تو کارگزار کھا جاتے ہیں۔ ان دنوں نواب ممدوح کی نسبت بادشاہ کا یہ حکم ہوا کہ اپنے قبائل لکھنؤ میں بلا لو، سو بادشاہ کو یہ دغدغہ ہوا ہے کہ ایسا نہ ہو بھاگ کر چل دیں، اور حضرت سلطانی کسل و ناتوانی کے سبب محل سے نہیں نکلتے۔ بہت دنوں سے امرا و اعیان کا سلام نہیں ہوتا۔ نواب وزیر کبھی کبھی در دولت تک باریاب ہو جاتے ہیں، سو پس پردہ ہی سے سلام کر کے باہر آتے ہیں۔ عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ طویلۂ خاص سلطانی کے سائیسوں نے جن کی آٹھ سات مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی، تنگ ہو کر وزیر الممالک کو دربار جاتے ہوئے گھیر لیا، اور جو کچھ اُن کے دل میں آیا سو کہا۔ آخر کار یہ ہوا کہ صبح کو [...]ں کی تنخواہ بانٹ دی گئی تب جھگڑا رفع ہوا۔

۱؎ اس زمانے میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ تھے۔ ۲؎ ان کے خسر اعتماد الدولہ فضل علی خاں [...] نصیرالدین حیدر کے عہد میں اودھ کے وزیر رہ چکے تھے۔ حامد علی خاں مرزا غالب کے احباب میں تھے۔ ان کا نام خطوط غالب میں [...]
۳؎ علی نقی خاں وزیر تھے۔

۹۲ نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر کو علاقہ سلون و بیسواڑہ کا اجارہ ملا، اور انھوں نے اپنی طرف سے نواب ممتاز الدولہ غلام علی خاں بہادر کو دیا۔ ممتاز الدولہ نے اپنی خوش تدبیری سے ایسا بندوبست کیا کہ بیسواڑہ کے سب سرکشوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور خراج سلطانی وصول کر کے نواب سید حامد علی خاں بہادر ناظم علاقہ کے واسطے سے خزانۂ عامرہ میں داخل کیا۔ اُن کی کارگزاری اعیانِ سلطانی کو بہت پسند آئی۔ سارے لشکر کی کمان افسری کا عہدہ نواب ممتاز الدولہ کے لیے تجویز کیا، اور یہ منصب ایسا ہے کہ سات چکلہ دار اس کے مطیع ہوتے ہیں۔ نواب سید حامد علی خاں نے جب دیکھا کہ ممتاز الدولہ کی ترقی ہوئی، آتشِ رشک میں جلے اور انواع و اقسام کے حیلے اٹھا کر نواب ممتاز الدولہ کو کان پور بھیجا اور نواب ممتاز الدولہ باوجودے کہ نواب سید حامد علی خاں سے انھیں کچھ سروکار نہ رہا تھا، مگر بہ پاسِ محبت اپنے فوائد سے قطع نظر کر کے کان پور کو روانہ ہوئے۔ جب وہ چلے گئے تو نواب سید حامد علی خاں نے صورتِ حال اپنے حسبِ مراد دیکھ کر وزیر الممالک سے عرض کیا کہ نواب ممتاز الدولہ نے میرے ساتھ دغا کی، اور زرِ خراج سلطانی لے کر کان پور چلے گئے اور مجھے مواخذے میں ڈال گئے اور اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لیے ضلع کان پور کی دیوانی کچہری میں ممتاز الدولہ کے نام نالش کروا دی۔ اب دیکھیے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ افسوس صداقت و راستی بہت کم رہ گئی اور دغا بازی و حیلہ سازی جہان میں پھیل پڑی۔ جب ناظم و اکابر میں یہ معاملے ہونے لگے تو عوام الناس کا کیا اعتبار رہا (من ایضاً یعنی زبدۃ الاخبار)

۹۳ دریں ولا لکھنؤ کے خط سے معلوم ہوا کہ نواب سید حامد علی خاں بہادر نے قریب پانچ لاکھ روپے کے خزانۂ شاہی میں داخل کیے اور پانچ لاکھ روپے بہ سبب عدمِ گنجایش کے حضور والا نے از راہ پرورش و سادات پروری کے بہ سفارش بعض اراکین سلطنت کے معاف فرمائے، اور دو لاکھ روپیہ کی تخفیف سابق میں فرمائی تھی۔ بعد اس کے نواب علی نقی خاں بہادر نے نواب موصوف کو خلعت دلوا کر علاقے پر بھیجا (از اخبار الحقائق)

۹۶ سلون کا پرگنہ نواب سید حامد علی خاں بہادر کے اجارے سے خارج ہو گیا، اور مرزا قدرت اللہ بیگ خاں سے متعلق ہوا۔ اب اُن کی کوشش و تدبیر سے اُس پرگنے کی بدانتظامی کچھ کم ہوئی، اور سرکش لوگ راہ پر آئے اور سرکاری روپے ادا کرنے میں مستعد ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ وہاں کی بدانتظامی خوش انتظامی سے مبدل ہو جائے اور کچھ فتنہ و فساد باقی نہ رہے (من ایضاً یعنی زبدۃ الاخبار)

۹۹ اس شہر کے ساکنین میں سے ایک کے ہاں لکھنؤ کا خط آیا، اس سے معلوم ہوا کہ شاہِ اودھ کو مرض لاحقہ سے صحت ہوئی۔ غسل صحت کے دن جمیع ارکان ریاست نے نذریں گزاریں۔ حضرت شاہ نے فقرا و مساکین کو بہت سی خیر خیرات دی۔ استماع کیا گیا کہ مرزا قدرت اللہ بیگ خاں سے پرگنہ سلون کا بندوبست نہ ہو سکا۔ ناچار کنارہ کش ہو کر اپنے تئیں صحیح سلامت جریدہ کان پور پہنچایا اور مواخذۂ سلطانی سے ایمن ہوئے (من ایضاً یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۰۲ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ بہ نسبت ایامِ گزشتہ کے بادشاہ کی بیماری کو افاقہ ہے، مگر ابھی

صحت کلی نہیں ہوئی کیوں کہ حضرت سلطانی پرہیز کرنے میں قاصر ہیں، اور کان پور میں مشہور ہے کہ عاملوں کی خیانت سے بادشاہ کا مزاج سخت درہم برہم ہے، کسی کے ہاتھ سے انتظام دل خواہ نہیں ہو سکتا، اب حضرت سلطانی کا ارادہ مصمم ہے کہ صاحب ریذیڈنٹ کی رائے پر بندوبست کریں اور ریاست کے امور کا حل و عقد اور جمیع مہمات جزوی و کلی انھیں کے تفویض کریں تاکہ بندوبست کی صورت ہو اور سلطنت کا کچھ ٹھیک ٹھکانا لگے۔ الحاصل جو کچھ شدنی ہے چند روز میں ظاہر ہوئی جاتی ہے۔ اور اخبار الحقائق میں مندرج ہے کہ صاحب مہتمم دہلی گزٹ لکھتے ہیں کہ سال آئندہ سے اس ملک میں انگریزی انتظام ہوگا"

۱۱۰ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ شاہزادہ ولی عہد نے اس جہان سے انتقال کیا۔ اس کا سن ہنوز حد بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ اب شاید دوسرے شاہزادے کو جو پانچ برس کا ہے ولی عہد کریں۔ اور وہاں کے بندوبست کی بابت جو خبریں کہ ہمارے پاس آرہی ہیں اس وقت ان کا لکھنا مصلحت نہیں، پھر کبھی لکھیں گے"

۱۱۱ ایک بزرگ کے خط سے معلوم ہوا کہ محاصل لکھنؤ جو ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیا تھا، اب صرف ساٹھ لاکھ روپیا رہ گئے ہیں اور بس۔ ان دنوں مولوی نہال الدین اور قاضی محفوظ علی خاں اور مولوی عنایت حسین اور ونیز ایک اور شخص جن کا نام معلوم نہیں، رعایائے حدود ممالک سرکار کمپنی بہادر اور رعایائے ملک لکھنؤ کے تصفیۂ تنازع کے واسطے امین مقرر ہوئے ہیں اور ہر ایک کا پانسو درماہہ ٹھہرا ہے۔ حضرت سلطانی کبھی علیل کبھی تن درست رہتے ہیں۔ صحت کامل ابتک نہیں ہوئی۔ از زبدۃ الاخبار

۱۱۲ اطراف کے خطوں سے واضح ہوتا ہے کہ بارش کی وہاں بھی شکایت ہے۔ گرد و پیش تو البتہ بارش ہوئی ہے۔ مگر لکھنؤ میں نہیں برسا، اگرچہ آثار نمایاں ہیں۔ غلہ تحفہ اور اسہال و بدہضمی کا اکثر ہونے لگا ہے بالبعض بعض کو ہیضہ بھی ہوا ہے۔ اور پورب میں وبا ہے۔ الحقائق

۱۱۳ میر مہدی داروغۂ سرکار ولی عہد اور مولوی نوازش علی میر منشی اپنے لڑکے سمیت نکالے گئے اور کان پور میں داخل ہوئے۔ وہ لوگ جو کوٹھے سے وظیفہ پاتے تھے، ایک برس نہ ملنے کے سبب در دولت پر پڑے شور و غل کر رہے ہیں۔ الغرض لکھنؤ کا حال تباہ ہے۔ بعض تو فاقے سے جاں بلب ہیں بعض (کرم خوردہ) وغیرہ امراض کے حال پر نہیں ہوتے۔ سال گذشتہ میں تنخواہوں کے ذمے ایک زر خطیر باقی رہ گیا تھا، امسال بھی دو ثلث قریب معطل ہوا ہے۔ ایسی ریاست کو خدا حافظ۔ از زبدۃ الاخبار

۲۲ رمضان تک لکھنؤ میں بارش نہ ہوئی تھی، خلائق پریشان اور آسمان کی طرف نگراں تھی، مگر ۲۳ سے ایسا برسا کہ ہر طرف ندی نالے بہہ نکلے اور ہوا کی برودت سے تپش کم ہوئی۔ ان دنوں لکھنؤ میں ہیضہ اور بائی کی شدت ہے۔ ایک خط کی رو سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالغنی، مصنف تحفۂ لغتاں جو اکثر بلاد میں کتاب فروشی کو آتے جاتے تھے، مبتلائے ہیضہ ہو کر اس جہان سے رحلت کر گئے۔

ں کے ظلم سے مظلوموں کا ناک میں دم ہے۔ نہ راہ و رفتن نہ روئے ماندن۔ اگر کوئی مظلوم لکھنؤ میں جانا
ہے تو راہ کے محافظ جانے نہیں دیتے کہ مبادا رزیڈنٹ پاس جاکر فریاد کرے اور رزیڈنٹ بہادر
ں کے ظلم سے آگاہ ہوں۔ ۱۲ رمضان کو کہ وہ دن جناب علی کی شہادت کا دن ہے، لکھنؤ کے ہر
ہ چے میں تبرا ہوتا تھا۔ اور آدمیوں کے غول کے غول شہر میں تبرا کہتے پھرتے تھے۔ حضرت سلطانی
۔ دونوں محل میں رہتے ہیں، اور کارپردازان سلطنت کام میں معروف ہیں عن الغد (یعنی زبدۃ الاخبار
اب وہاں کی آب و ہوا بہ اعتدال ہے۔ باران رحمت خوب برسا، ہیضہ دبائی بالکل نیست و نابود ہوا
خبر تازہ یہ ہے کہ ان دنوں حضرت سلطانی کی توجہ سخن گوئی کی طرف بہت ہے۔ چاہتے ہیں کہ کتاب
م حملہ حیدری کو اپنی فکر رسا سے اردو میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ بعض علمائے دانش مند اور خوش نویس
ہر کام مامور ہوئے ہیں کہ ہر وقت حاضر رہ کر مسودہ صاف کرتے رہیں۔ صاحب زبدۃ الاخبار کی
باب میں یہ رائے ہے کہ بادشاہوں کا کام نظم ملک میں مشغول ہونا ہے، نہ نظم سخن میں۔ اگر حضرت
سلطانی اس کام کو جناب ملک الشعرا قاضی محمد صادق خاں، اختر کو سپرد کریں تو کیا خوب ترجمہ ہو، اور
بہ دولت امور سلطنت کے نظم میں توجہ کریں تو کس خوبی سے ملک آراستہ ہو۔ جناب موصوف
اسے اس امر میں کیا خوب صحیح و سلیم ہے۔

زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ دربی ولا بسبب شروع ہونے سال کے جمیع ناظر اور چکلہ دار لکھنؤ
حاضر آئے ہیں، اور نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر اور چودھری حشمت علی جو سرکار کے
ں کی بابت قید تھے، ضامنی پر چھوٹ گئے، اور پھر چکلہ داری اور نظامت کے امیدوار ہیں۔ ۱۰ شوال کو
ں کو نظامت کا خلعت نہ ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت اکثر محل میں رہتے ہیں دربار میں بہت کم آتے ہیں
یان سلطنت میں سے وزیر الممالک نواب علی نقی خاں کبھی کبھی باریاب ہو جاتے ہیں۔ باقی سب سلام مجرے
ام ہیں۔ شرف الدولہ غلام رضا خاں معروف بہ جگناتھ نیابت وزارت کا کام انجام دیتے ہیں اور
ب منور الدولہ احمد علی خاں بہادر بہ اتفاق نواب ممتاز الدولہ خویش نواب ملکہ زمانیہ کے کربلا جانا
چاہتے تھے، بادشاہ نے منع کیا کہ چند روز اس سفر کو ملتوی رکھو۔ اور ان دنوں بہ حکم بادشاہی لکھنؤ کے سات
چھاپے خانے بند ہو گئے، اور حکم ناطق ہے کہ جو کوئی لکھنؤ کے مطبع والوں میں ظاہر یا پوشیدہ کچھ چھاپے گا
دربار بادشاہی کا مجرم ہوگا۔ اس حکم سے اہل مطبع کی جان سی نکل گئی ہے، مگر صاحب زبدۃ الاخبار کو
چھاپہ خانوں کی اس خبر پر ہنوز اعتماد کلی نہیں ہے۔ فقط۔

۱۱ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ ہفتۂ گذشتہ میں مسموع ہوا تھا کہ بادشاہ کے حکم سے جمیع چھاپہ خانے
کا کام بند ہو گئے۔ اس ہفتے میں ایک خط سے اس بات کی صداقت ہوئی اور معلوم ہوا کہ سب چھاپہ خانے
ثبوت رضے سے بیزار ہو دل برداشتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ لکھنؤ سے کانپور میں جا رہیں، لیکن

ت یہہ ہے کہ مبادا جاتے وقت علاقۂ لکھنؤ کے راہ دار اور گزربان بادشاہی حکم کے بہانے سے آلات طبع
ین لیں، سو اب اس تدبیر میں ہیں کہ رزیڈنٹ بہادر کا توسل پیدا کر کے وہاں سے نکلیں، تا کان پور تک
ے سلامت پہنچیں۔

۱۲ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ افواہاً سنا گیا کہ جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر نے اس ریاست
مصلحت اندیشی کی راہ سے یہہ تجویز کی ہے کہ منصب وزارت نواب منور الدولہ احمد علی خان بہادر کو ملے
ر نواب شرف الدولہ بہادر نائب وزیر ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنی یہہ رائے نواب گورنر جنرل کے
سند لکھ بھیجی"

۱۲ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ ان دنوں صاحب رزیڈنٹ بہادر اور وزیر اعظم مدار الدولہ نواب
رفیق بہادر کے درمیان کچھ شکر رنجی ہے۔ وصی علی خاں جو صاحب رزیڈنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے نکالا گیا تھا،
رکان پور میں جا کر اُس نے قیام کیا تھا، بادشاہ سے پھر کچھ مخفی مخفی سازش کر کے لکھنؤ میں آگیا۔ وزیر اعظم
احب کو صاحب رزیڈنٹ بہادر کی رنجیدگی کا بڑا رنج ہے۔ چاہتے ہیں کہ کسی طرح صفائی ہو جائے۔ اور
ر ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر تمام ممالک محروسۂ لکھنؤ کا دورہ کریں گے، تا رعایا کا احوال اور ناظموں کا
عاملہ بچشم خود دیکھیں۔ حضرت بادشاہ سلامت معاملات سلطنت سے بالکل دست بردار ہو کر رات دن
حل میں عیش کرتے ہیں۔

۱۲۴ زبدۃ الاخبار میں ایک خط کی رو سے مرقوم ہے کہ نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر سرکار
ادشاہی کے باقیات بابت جو بیس لاکھ سے زیادہ ہے محبوس ہوئے اور تمام اثاث البیت از قسم اسپ و فیل
نقرۂ آلات و ملبوسات و شال و دوشالہ کے نیلام ہو گیا، اور اس کا زر قیمت بادشاہی خزانے میں
داخل ہوا، مگر افسوس ہے کہ ہزار روپے کا مال سو کو اور سو کا دس کو بکا۔ نواب موصوف کا بڑا نقصان
احب زادے ان کا نائب بھی بند بلا میں پڑ گیا، اور بیسواڑہ کا علاقہ نواب موصوف کی مستاجری سے نکل گیا،
ور اُس کے تین حصے کیے گئے۔ ایک حصہ قطب الدین خاں کو ملا اور دو حصے اور دو آدمیوں کو کہ ان کے
معلوم نہیں سپرد کئے گئے۔ حضرت بادشاہ رات دن رضی الدولہ کے مکان میں جو ایک مطربا بچی
ے ہے۔ جلوس فرما رہتے ہیں، اور مہمات سلطنت کا حل و عقد وزیر اعظم مدار الدولہ نواب علی نقی خاں
ے حوالے ہے۔ ممالک محروسہ میں ہر طرف لوٹ مار ہو رہی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ مسافر مارے نہ جاتے ہوں
ر کوئی رات نہیں کہ دولت مندوں کے گھروں میں چور نہ پڑتے ہوں۔ اکثر مظلوم و ستم دیدہ لوگ نواب
ی ڈیوڑھی پر داد و فریاد کو جاتے ہیں، مگر ڈیوڑھی بان اور پہرے چوکی والے اُن بے چاروں کو
ب تک جانے نہیں دیتے۔

ایک شخص لکھنؤ سے صاحب دہلی گزٹ کو یوں لکھتا ہے، تم نے جو دریافت کیا ہے کہ سرکار انگریزی

بعد بند و بست کر دینے ملک اودھ کے وہ ملک آپ رکھ لے گی' یا نواب کو سونپ دے گی۔ میری یہ رائے ہے کہ سرکار وہ ملک نواب سے جو ہمارا قدیم دوست ہے اور جنگ برما اور نیپال میں ہمارے شامل رہے اور دوستی رکھی اور کبھی ہمارے آزار کا خواہاں نہیں ہوا' نہیں لے لے گی۔ ہم نے یہ ملک نواب کو سنہ ۱۷۶۵ء میں دیا تھا' اور سنہ ۱۸۰۱ء میں نواب سعادت علی خاں نے دوام کے واسطے کمپنی کو اپنا ملک دے دیا کہ جس کا محاصل ایک کروڑ دو لاکھ روپیہ سالانہ تھا، لیکن اب کمپنی کو اس میں دگنا بلکہ تگنا اس سے وصول ہوتا ہے۔ اس سال میں بھی دوبارہ ملک باقی ماندہ نواب کو دیا گیا کہ وہ اور اس کے ورثا اس پر قابض رہیں گے اور اپنا اختیار اس پر رکھیں گے۔ ان مواثیق پر مہریں لارڈ ہیسٹنگز اور گورنر فراسس بیزلی اور لارڈ مورنگٹن کی ہیں' کیا ان لوگوں کے نہ ہونے سے اور وقت گزر جانے سے یہ عہود اور مواثیق بھول جائیں گے؟ میرے نزدیک تو ایسا نہ ہوگا۔ علاوہ اس کے طریق کرنیل سلیمن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ نہیں ہے۔ وہ فقط یہ چاہتے ہیں کہ شاہ اودھ کو نصیحت نیک واسطے مقرر کرنے ایک اچھے وزیر اعظم کے دیویں اور اگر وہ نہ مانے تو بہ جبر ایک وزیر معقول مقرر کرا دیں اور جس شخص کو کرنیل صاحب نے مناسب سمجھا ہے وہ حقیقت میں لائق اس عہدے کے ہے۔ یہ سچ ہے کہ بیماری سے شاہ اودھ کی کرنیل سلیمن صاحب کو بہت سے خیال ہیں' لیکن جب کہ گورنر جنرل نے دوسرے بیٹے شاہ اودھ کو ولی عہد مقرر کیا تو اب کچھ اندیشے کی بات نہیں ہے' از اخبار النواح۔

۱۲۹ پہلے سنا گیا خبر مشہور ہوئی تھی کہ لکھنؤ کے چھاپے خانے جو بند تھے پھر جاری ہو گئے۔ اب اخبار باغ سے معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی، ہنوز ویسے ہی بند ہیں۔ غرۂ ذی حجہ کو خلعت وارد گی مطبع سلطانی کا شیخ مذہب علی کو ہوا اور چھاپا خانہ حاجی محمد حسین کا بند ہو گیا، اور داروغہ جدید نے سب چھاپے خانے والوں کو بلا کے اسی وقت حکم دیا کہ سب یا تو آ کر سلطانی مکان میں چھاپیں، یا چھلکا دیں کہ تمام عمر اس شہر میں پھر کبھی نہیں چھاپیں گے۔ از اخبار الحقائق

۱۳۳ بعض معتمدین کی تحریر و تقریر سے معلوم ہوا کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر ملک کے انتظام پر متوجہ ہیں' اور نواب وزیر الممالک . . ملک کا بند و بست امانی ساٹھ لاکھ سے زیادہ کر چکے ہیں' اور انتظام ملک پر متوجہ نائبان معزولین بسبب اپنی منفعت کے جو مستاجروں سے ہوتی تھی ملک کو امانی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اب جو مدار المہام نے بند و بست کیا' اور سرکار کے حکم کو اپنی منفعت پر مقدم سمجھ کر بند و بست امانی کیا سب اہلکار اُن سے برخلاف ہو گئے کہ ملک کے امانی ہونے سے اُن کی منفعت ہاتھ سے گئی۔ اور وصی علی خاں جو موافق حکم صاحب رزیڈنٹ بہادر کے فیض آباد چلے گئے تھے' نواب مدار الدولہ بہادر نے ان کے اہل و عیال کی رنج و بیچارگی صاحب رزیڈنٹ بہادر سے زیادہ از حد التماس کر کے انھیں فیض آباد سے بلایا۔ چناں چہ خاں موصوف حسب الحکم دونوں سرکار کے لکھنؤ میں آئے۔ یقین ہے کہ جب صاحب رزیڈنٹ بہادر ان کی لیاقت

کا گزاری سے مطلع ہوں گے، موافق عرض نواب وزیر اور ارشاد حضرت بادشاہ کے حکم اُن کی بحالی کا صادر فرمائیں گے فقط۔

۱۴۱ لکھنؤ کا حال بھی کچھ حیدر آباد کی ریاست سے ابتری اور بے انتظامی میں کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہے ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا کہ نواب وزیر الممالک بہادر نے سپاہ وغیرہ کی تنخواہ بانٹنے کے لیے بارہ لاکھ روپیہ کی درخواست کی اور حضرت سلطانی حکم عطائے زر مطلوبہ وزیر الممالک بہادر کا خزانچی کے نام نافذ ہوا۔ ہنوز روپیا تقسیم نہ پایا تھا کہ انیس الدولہ و رضی الدولہ وغیرہ مقربان خاص نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کر کے حضرت سلطانی کے مزاج کو درہم برہم کر دیا اور اُس روپے کا ملنا موقوف کرا دیا۔ علی ہذا القیاس اور امور سلطنت کا انتظام بھی کچھ ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ افسوس کی بات ہے کہ جب شاہ و وزیر کسی امر نیک کی صلاح و تدبیر ٹھہراتے ہیں مشیر بد تدبیر چکنی چپڑی باتیں کر کے بادشاہ کا مزاج اس طرف سے پھیر دیتے ہیں۔ من ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۴۲ افواہ ہے کہ جناب رزیڈنٹ بہادر جو ماہ دسمبر ۱۸۴۹ء میں گھاگرہ کے اُس پار کے ملکوں کا دورہ کرنے کے لیے تشریف فرما ہوئے ہیں، آخر فروری تک مراجعت فرما کے رونق افزائے لکھنؤ ہوں گے۔ ان کے تشریف لانے کے بعد عجب نہیں کہ اس ملک کا بہ وجہ احسن بندوبست کیا جائے اور ساری بے انتظامی اور خرابی رفع ہوئے۔ کہتے ہیں کہ صاحب رزیڈنٹ کا دورہ خالی از مصلحت نہیں ہے۔ ارباب گورنمنٹ کو وہاں کی بے انتظامی دیکھ دیکھ کر ایک مدت سے خیال لگ رہا تھا۔ اب خدا نے چاہا تو وہاں کی ساری خرابیاں اُٹھ جائیں گی، اور سپاہ و رعیت کو امن چین ملے گا۔ از زبدۃ الاخبار

۱۴۳ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ لکھنؤ کے خط سے معلوم ہوا کہ حکیم علی حسن کو جو اُس سرکار کے ایک بڑے نامور معتمد و مقرب ہیں حسب رضامندی صاحب رزیڈنٹ کے متوسطی کے عہدے پر مقرر کیا، کیوں کہ رزیڈنٹ بہادر کو یہ منظور تھا کہ اس خدمت پر کوئی ایسا شخص مامور ہو جو وزیر کے بے وساطت بادشاہ کے حضور جا سکے۔ سو حکیم مذکور کے سوا ایسا اور کوئی نہ ملا۔ اس لئے انھیں کو اس خدمت پر مقرر کیا، گو وزیر الممالک اُن کے تقرر سے مکدر ہیں۔ کیا کریں۔ صاحب رزیڈنٹ کی مرضی سے چارہ نہیں۔

۱۴۴ ایک خط سے معلوم ہوا کہ دیوہ جہاں گیر آباد کے علاقے میں جو صف شکن خاں پسر مینڈو خاں کے تحت حکومت ہے، زمین داروں نے بسبب گاؤ کشی کے مسلمانوں پر بلوہ کیا، جدال و قتال کی نوبت پہنچی۔ مسلمان کم تھے مغلوب ہوئے۔ صف شکن خاں لکھنؤ میں تھا، یہ حال سن کر جلد روانہ ہوا اور مفسدوں سے لڑائی ٹھان دی، جب یہ خبر رزیڈنٹ کو پہنچی، تو دو توپ اور دو کمپنی جہازی منڈیاؤں سے صف شکن خاں کی کمک کو رزیڈنٹ بہادر نے بھیجیں۔ نواب وزیر الممالک نے صاحب رزیڈنٹ سے کہا کہ

مفسدوں کی کثرت ہے اور فوج سرکاری کم ہے اس جماعت کثیر سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گی۔ فوج سلطانی کے تیار ہونے تک دونوں کمپنیاں متوقف رہیں صاحب رزیڈنٹ نے اس بات پر کچھ توجہ نہ کی، اور کمپنیوں کو روانہ کیا گیا۔ گیارھویں جمادی الاولیٰ کو خبر آئی کہ سپاہ انگریزی بھی بہت مقتول ہوئی اور سردار فوج بھی جو کمان افسر ہو کر گیا تھا، مارا گیا۔ صاحب رزیڈنٹ نے برہم ہو کر ایک پلٹن بہت سے میگزین کے ساتھ روانہ کی اور بادشاہی پلٹنیں بھی روانہ ہوئیں دیکھا چاہیے کہ اس فوج کے پہنچنے کے بعد کیا معاملہ ہوتا ہے

عن ایضاً (اخبار کا نام کرم خوردہ)

۱۵۱ وہاں کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ نواب گورنر جنرل کیلئے ضیافت کا سامان تیار ہو رہا ہے۔ نواب وزیر اپنے سفر کا سامان درست کر رہے ہیں۔ جس وقت گورنر جنرل کانپور میں داخل ہوں گے، نواب وزیر استقبال کے لئے لکھنؤ سے کانپور جائیں گے۔ ان دنوں ایک رات کو حضرت سلطانی وزیر الممالک کے گھر محفل جشن میں گئے۔ وہاں جو حرکات کہ ملازمان حضرت سلطانی سے ہوئیں اُن کے لکھنے کی ادب اجازت نہیں دیتا، یعنی جو کچھ مطرب لوگ کرتے ہیں اُس سے ہزار درجہ بہتر بندگان حضرت عالی نے کیا

عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۵۲ باغیوں کی گڑھی پر جو انگریزی اور سلطانی فوج گئی تھی، اُس کا حال مطلع الاخبار میں یوں درج ہے: لفٹنٹ اور ایڈجوٹنٹ صاحب اور دس سپاہی مقتول اور ۲۰ آدمی مجروح ہوئے، اور توپ خانے کے ۱۱ آدمی مقتول ہوئے، اور بادشاہی فوج کے ستر آدمی مارے گئے اور باغیوں میں سے قریب پانسو آدمی کے قریب آدمی کام آئے، آخرکار رات کو باغی چھوڑ کر بھاگ گئے فقط۔

۱۵۳ وہاں کے ایک خط سے واضح ہوا کہ ایک شخص محمد نام نے ایک اینٹ پر چند سطریں لکھ کر صاحب رزیڈنٹ کی کوٹھی کے احاطے میں ڈال دی۔ اس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ جس وقت صاحب رزیڈنٹ بہادر ملک اودھ کے دورے کو گئے تو رعیت خوش تھی کہ اب خوب بندوبست ہو کر فتنہ موقوف ہو جائے گا، لیکن ایک وقت ہوئی کہ رزیڈنٹ ادھر اُدھر سے پھر پھرا کر اپنے بنگلے میں آن بیٹھے، اور خلق کو کچھ آسائش و بہبودی نہ ہوئی۔ پس صاحب رزیڈنٹ نے اس تکلیف کرنے سے کیا مصلحت سوچی تھی۔ الحاصل وہ اُس اینٹ کو صاحب رزیڈنٹ پاس لے گئے، انھوں نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کر کے گورنر جنرل کو بھیجا اور اینٹ حضرت سلطانی کے پاس بھیج دی۔ عن ایضاً (یعنی زبدۃ الاخبار)

۱۵۴ اس ریاست کا مآل کار جو کچھ سال ہا سال سے عقلا[1] اور دانشمندوں کے ذہن میں آیا کرتا اب اس کے ظہور کا وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے، یعنی جو کچھ ہونا ہے غالباً اسی سال کے کتوبر نومبر تک

---

[1] اہل دانش کو خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے، لیکن واجد علی شاہ کو اپنے دوسرے مشاغل سے فرصت کب تھی کہ ان امور سے باخبر رہتے۔

ارباب گورنمنٹ نے تو ہرچند از راہِ شفقت لکھنؤ کے رئیس کو سمجھایا، مگر کوئی نصیحت اثر پذیر نہ ہوئی۔ اب سرکار انگریزی کی جانب سے وہاں رفع شر ہونے کو جو تدبیر کہ عمل میں آئے گی مستحسن ہوگی۔ ۲۴ تاریخ مئی کے ایک خط سے واضح ہوا کہ امرائے بادشاہی میں سے چھ شخص جو خلوت و جلوت میں ہر وقت بادشاہ کے انیس تھے قہر سلطانی میں مبتلا ہو کر محبوس ہوئے، اور ان کے گھروں کا سارا مال و متاع ضبط ہو گیا۔ محبوسوں کے یہہ نام ہیں۔ رضی الدولہ، قطب الدولہ، وحید الدولہ، ثابت الدولہ، نجیب الدولہ، نشاط الدولہ۔ اور اس خط میں لکھا ہے کہ عجب نہیں کہ چند روز میں انیس الدولہ، مصاحب الدولہ، مستقیم الدولہ، مطیع الدولہ یہہ چاروں آدمی بھی کہ ہنوز مصاحبت سلطانی میں گرم ہیں مبتلائے بند و زندان ہو جائیں۔ از زبدۃ الاخبار

۱۵۰ کہتے ہیں کہ نواب عالی جناب امیر اعظم گورنر جنرل بہادر موسم زمستاں کے شروع میں لکھنؤ کی طرف تشریف لے جائیں گے اور ریاست کا بندوبست نئی طرز پر کریں گے، اور عجب نہیں کہ رایات دولت و اقبال حدود نیپال تک جائیں، اور اُس ملک کے مفسدوں سے بھی اطمینان کلی حاصل کی جائے۔ از زبدۃ الاخبار

۱۶۶ رضی الدولہ وغیرہ مصاحبان شاہ اودھ جو موقوف ہوئے۔ سو ایسا مسموع ہوتا ہے کہ حضرت ظلِ سبحانی ان لوگوں کے فراق میں ایسا رویا کرتے ہیں کہ رونے کی آواز محل کے باہر تک جاتی ہے۔ از دہلی اخبار

۱۶۷ درین ولا بمقام موہان علاقہ لکھنؤ کے خلیل خاں صاحب اہل تسنن اور غلام محمد خاں اہل تشیع سے نزاع و جنگ ہوئی۔ خلیل خاں کی تلوار سے غلام محمد مارا گیا۔ اور خلیل خاں قید ہوا، یہہ مقدمہ مجتہد کے سپرد ہوا ہے اور خلیل خاں پر انواع انواع ایذا رسانی ہوئی ہے۔ دیکھا چاہیے انجام کیا ہو۔ از مطلع الاخبار

۱۶۹ درمیان رزیڈنٹ بہادر و حضرت سلطانی کے جو ایک شخص متوسط رہا کرتا تھا سو اب یہہ عہدہ موقوف ہوا۔ مگر اس خبر میں اختلاف ہے، بعضے کہتے ہیں کہ حضرت سلطانی ہی کو متوسط کا رکھنا منظور نہ تھا، اور بعضے کہتے ہیں کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کو متوسط کا عہدہ اور اس کا رہنا پسند نہ تھا، اس سبب سے موقوف ہوا۔ بادشاہ کو تو اس عہدے کا قائم و برقرار رہنا منظور تھا۔ بہرحال اس بات کی صداقت پیچھے سے معلوم ہو جائے گی۔ نواب اعتماد الدولہ سید حامد علی خاں بہادر کا معاملہ بھی عن قریب طے ہوگا اور مطالب و مواخذہ سے نجات پائیں گے۔ از زبدۃ الاخبار۔

۱۹ وہاں کے خط سے معلوم ہوا کہ ان دنوں سرفراز و کنچنی کے گھر مستی کی تقریب بڑی دھوم دھام کی محفل تھی حضرت سلطانی بھی وزیر الممالک سمیت اُس کے ہاں تشریف لے گئے اور کچہری کی ساری کچنیاں تب اس کی قدر و منزلت بڑھائی۔ فی الحقیقت حضرت سلطانی کا رتبہ تو کچھ کم نہ ہوا مگر اس کنچنی کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ بہ قول سعدی علیہ الرحمت: ز قدر و شوکت سلطان نگشت چیزے کم الی آخرہ۔ جب حضرت سلطانی وہاں سے مراجعت کر آئے تو باغ دل کشا میں اُس کنچنی کو بلوا کر عیش و سرور کی خوب

اودھ عن ایضاً (زبدۃ الاخبار)

۲۰۵ ان دنوں حضرت سلطانی جہات سلطنت کی طرف کچھ توجہ فرماتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ وزیر عظیم نواب علی نقی خاں بہادر سے انتظام سلطنت کا بہ وجہ احسن نہیں ہو سکتا، اس واسطے یہ مرکوزِ خاطر ہے کہ جو شخص لائق اس منصب بزرگ کے ہو، اس خدمت پر مامور اور ممتاز فرمایا جائے، اور لکھنؤ میں مشہور ہے کہ عن قریب نواب روشن الدولہ بہادر کان پور سے طلب فرمائے جائیں گے اور خلعت وزارت کا عنایت ہوگا، مگر یہ بات ابھی معتبر نہیں ہے۔ عن زبدۃ الاخبار

۲۰۶ وہاں کے خط سے معلوم ہوا کہ ان دنوں بادشاہ کی طبیعت وزیر سے ناراض ہے، اور ناراضی کے سبب مختلف سُنے جاتے ہیں۔ بقول شخصے جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ مگر قوی تر سبب یہی ہے کہ وزیر سے ملک کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ حاصلِ مُلک بہت کم وصول ہوتا ہے اور جو کچھ وصول ہوتا بھی ہے تو بے جنگ و جدل نہیں ہوتا اور لڑائی بھڑائی سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے سو فوج کشی میں خرچ ہو جاتا۔ الحاصل وزیر و امیر، عامل و ناظم سے جو ہے سو آلودۂ غرض ہے۔ مُلک کی سود و بہبود کسی کو کچھ کام نہیں۔ اس صورت میں ملک کا بندوبست کہاں سے ہو۔ از زبدۃ الاخبار۔

---

۱ سعد الاخبار میں "روپیا" کا املا ہر جگہ روپیہ ہے اور کبھی کبھی اس کے ساتھ فعل جمع آنے پر بھی اس کی جمع نہیں
اس کی مثالیں غالب کے خطوط میں بھی ملتی ہیں۔

دہلی اور اودھ کے متعلق خبریں نقل کی جا چکی ہیں، اب ہندوستان کے دوسرے حصوں، ممالک اسلامی اور یورپ کے متعلق خبروں کا انتخاب دیا جاتا ہے:

۸۰۴۔ ایک راجا یا رئیس نے پانچ روپے درماہے کا ایک شخص نوکر رکھ کر رزیڈنٹ کے دربار میں برسم وکالت حاضر رہنے کو مقرر کیا اور موکل صاحب خود بھی دربار جایا کرتے تھے۔ ایک دن موکل خود نہ گئے۔ صاحب رزیڈنٹ نے اس سے پوچھا کہ آج تمہارا موکل کیوں نہیں آیا۔ وکیل صاحب اول دفعہ تو کچھ نہ کہے خاموش بیٹھے دیکھا کیے صاحب نے دوسری دفعہ پوچھا تو وکیل بہادر نے جواب دیا کہ حضور ۲ و ۵ اس لطافت سے ادا کیا کہ اس کی کیفیت کا ادراک ساعت تلفظ پر منحصر ہے۔ صاحب رزیڈنٹ نے ان کی ہوں سن کر انہیں دربار سے نکلوا دیا۔ جب راجا یا رئیس۔۔ پانچ روپے کا وکیل دربار میں رکھیں تو بجز ایسے شخصوں کے کون اس مشاہرے پر ایسا عہدہ قبول کرے گا، جس کا یہ نتیجہ نکلے۔ از دہلی اردو اخبار۔

۵۔ ۔۔ جس دن سے۔ سراج الملک بہادر مہمات وزارت سے دست کش ہوئے ہیں اطراف و جوانب حیدرآباد میں بڑی ہی انتظامی ہے۔ چنانچہ نواب اعتضاد الملک کے تعلقہ میں ۔۔ ا عاغنہ نے یورش کر کے قلعے کو اپنے تصرف میں کر لیا اور قلعہ دار کو اسیر کر لیا اور دو لاکھ روپے کا مال و متاع جو قلعے میں فراہم تھا سب پر قابض ہو گئے بڑی خرابی اور کشت و خون سے پھر قلعہ ہاتھ آیا، زبدۃ الاخبار

۔۔ ۔ ۔ محمد وزیر کوتوال ۔۔ نے خود پسندی کی راہ سے جوانان عرب کو شہر (حیدرآباد دکن۔ د) کے دروازہ پر تعین کر کے حکم دیا کہ انگریزوں کو شہر میں مت آنے دو۔ رزیڈنٹ بہادر نے یہ خبر سن کر بندگان عالی کو اطلاع کی۔ حضور کوتوال پر بہت خفا ہوئے اور چار ہزار روپے جرمانہ کیا۔ مشہور ہے کہ حضرت بندگان عالی کو نواب سراج الدولہ بہادر کی معزولی سے حسرت و پشیمانی ہے۔ دوسرا کوئی انہیں ایسا نہیں ملتا جو سرانجام امورات کر سکے۔ زبدۃ الاخبار

۹۰ حلیہ دیوان مولراج، عمر ۳۰ سال کم و بیش پانچ فٹ ساتھ انچ (کذا) کا قد، دست و پا متوسط گندم رنگ ملیہ بیشانی چھوٹی آنکھ وضع سے وقار و تمکین ظاہر اور چہرے سے عزت و حیا نمایاں ریشمی نارنگی قبا سے اور رنگین پگڑی باندھے تھا ایک اس کا ماموں سردار پیچھے اور دو گورے اور منشی صاحب (کذا) اس کے داہنے ہاتھ۔۔۔

۱ ایک اخبار سے معلوم ہوا کہ شاہ خان ایران نے شاہ مرحوم کے شہزادوں کو اضلاع مختلفہ ایران کے تقسیم کر دیے ہیں۔ در حقیقت چونکہ شاہ زادے قریب چار سو کے ہیں، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ ہر ایک شہر، تحت حکومت ان شہزادوں کے ہو گیا ہوگا۔ سو یہ امر انتظام رعایا کے حق میں بہت مضر تصور کیا جاتا ہے کیونکہ غالباً اب رعایا پر ظلم بہت ہوگا۔ دہلی اردو اخبار۔

.. تحت حکومت ان شاہزادوں کے ہو گیا ہوگا۔ سو یہ امر انتظام رعایا کے حق میں بہت مضر تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ غالباً اب رعایا پر ظلم بہت ہوگا" دہلی اردو اخبار

۱۰۱ مجمع الاخبار سے صاحب زبدۃ الاخبار لکھتے ہیں کہ قیصر روم اور شہنشاہ روس کی مصالحت کی میعاد گزر گئی سو اب شاہ روس نے .لڑائی پر کمر باندھی ہے اور روس کی تین لاکھ فوج نے قسطنطنیہ کا عزم کیا ہے سلطان روم بھی جنگ کا سامان کر رہے ہیں اور جمیع سلاطین فرنگستان خصوصاً ارکان دولت ملکہ معظمہ انگلستان اور وزرائے سلطنت فرانس و اسپین واسطریہ (کذا) وغیرہ سلطان روم کی مدد کو تیار ہوئے ہیں اور جمیع سلاطین نے بیچ بچاؤ کرنے کو آئے ہیں تاکہ پھر نئے سرے سے مصالحت کرا دیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی کوشش کا نتیجہ بخشے اور خلق اللہ کی خوں ریزی نہ ہو اور اگر ان کی سعی کارگر نہ ہوئی تو لڑائی ہوگی اور فرنگستان کے سب سلاطین شاہ روم کی طرف ہوکر روسیوں کی لڑائی میں مردانگی کریں گے۔

۱۰۲ تعبیر خواب مہاراجا رنجیت سنگھ متوفی: صاحب زبدۃ الاخبار رقم فرماتے ہیں کہ ہمیں خوب یاد ہے کہ ۲۳ء میں کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار میں لکھا تھا کہ انہیں دنوں مہاراجا ... نے خواب میں دیکھا کہ ایک جوان فریدوں فر با سپاہ بے کراں مشرق سے نکل کر پنجاب پر حملہ آور ہوا اور سکھوں کو متواتر شکست دے کر سارا ملک پنجاب لے لیا اور سکھ لوگ خستہ و زبوں ہو گئے۔ اور خود مہاراجہ بھاگ کر آوارۂ دشت و بیاباں ہوا ہے اور راہ بھٹکنے مغموم کھڑا ہوکر ہر چند رو تا چلاتا ہے مگر کوئی اس کی نہیں سنتا مہاراجا۔ یہ خواب دیکھ کر مت پریشان خاطر تھا اور مصاحبوں سے یہ واقعہ بیان کیا سب نے دلاسا دی اور خواب کی تعبیر بالعکس بیان کی۔ اللہ تعالیٰ نے سولہ برس بعد اب وہ تماشا دکھا دیا اور اس خواب کی تعبیر ظہور میں ہوئی کہ لشکر انگریزی کی قوت قاہرہ سے تمام ملک پنجاب مسخر و مفتوح ہوا اور سکھوں کی حکومت تمام ہوئی۔

۱۰۳ . حسب اس ۔ اخبار الحقائق میں مرقوم ہے کہ اس مقام میں لوہے کا راستہ تیار ہونا شروع ہوا ہے مگر ... بسبب نقصان اراضی و کشت کاری کے معترض ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس کے فوائد سے آگاہ نہیں ورنہ معترض نہ

۱۰۳ . خبر فرنگستان ملکہ اسپین نے پوپ کی کمک کو اور رعایائے روم کی تنبیہ کو سپاہ بے کراں روانہ کی ہے کیوں کہ رعایا نے روم نے پوپ کو سلطنت سے خارج کر دیا ہے۔

۱۰۴ . بمبئی۔ زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار سے منقول ہے کہ ان دنوں بحر تلاطم کے کنارے ایک مچھلی ہوائی مچھلی نکلی ... جس کے دونوں دانت مثل دندان فیل منہ سے باہر نکلے (کرم خوردہ) طول اس کا ۶۰ فٹ اور عرض ۱۲ فٹ تھا۔

۱۰۵ . صاحب اخبار الحقائق نے اس جوہر بیش بہا (کوہ نور) کا حال شملہ اخبار سے مفصل لکھا ہے ..

احمد شاہ کابل میں لایا' شاہ شجاع الملک کے ہاتھ لگا... جس وقت شجاع الملک نے لاہور میں آکر رنجیت سنگھ کے پاس پناہ لی' رنجیت سنگھ نے شاہ کا کھانا پانی بند کرکے پہرا گھر پر بٹھلا کے یہ ہیرا.. چھین لیا۔ اب وہی۔ صاحبان عالی شان انگریز بہادر نے بہ زور شمشیر اُس کی اولاد سے لے لیا اور تمام ممالک پنجاب کو خس و خاشاک سے پاک کرکے عدل و داد سے معمور کیا۔ وہ ہیرا ملکۂ معظمہ کی نذر کو بھیجا جائے گا۔ کیا خوب ہو اگر سرکار یہ حکم دے کہ لیجاتے وقت لاہور سے کلکتہ تک ہر ایک بڑے شہر میں وہاں کے باشندوں کو دکھاتے جائیں..؟

۱۰۶ " کوئی شاہزادہ خاندان تیموریہ کہ اپنے تئیں مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا بیان کرتا ہے، ڈونے حال سے وارد بھوپال ہوا ہے' کربلائے معلیٰ اور مکۂ معظمہ میں جانے کہتا ہے، مختار ریاست نے چالیس روپے زادِ راہ دئے' عمر حضرت کی ساٹھ برس کی ہوگی۔ بدن لاغر اور قوٰی ضعیف ہیں؟ مطلع الاخبار

۱۰۷ زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ ایک خط حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا ہے، کہ ساہوکار اِن امور.. دولت پر حاضر ہوئے اور... اپنے قرض کا رُپیا مانگا۔ حضور نے ہر ایک کو فہمائش کرکے فرمایا کہ دو مہینے اور صبر کرو.. فوج کے لوگ رات دن دولت پر دھرنا دے کر تنخواہ کے لیے واویلا کرتے ہیں۔

۱۰۸ نابھہ: نواب گورنر جنرل بہادر.. والی نابھہ کی خدمت گذاری سے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ راجا صاحب نے مبلغ سات لاکھ روپیہ بہ وقت سپاہ کے خزانے میں داخل کیے۔ حق تو یہ ہے کہ ممالک پنجاب کے راجوں میں سرکار انگریزی کا ایسا دلی خیرخواہ اور خالص دوست کم ہوگا۔ بندگان نواب گورنر جنرل بہادر نے بھی.. اُن کے القاب میں نسبت سابق تعظیم و تکریم زیادہ فرمائی چنانچہ سابق " رفعت و عوالی مرتبت خصوصیت و محبت دستگاہ سلمہٗ ربہ" لکھا جاتا تھا، اب.. یہ القاب مقرر کیا " رفعت و عوالی مرتبت استظہار مخلصاں راجا بھرپور سنگھ راجا نابھہ سلامت"

۱۰۹ بمبئی: فوائد الناظرین میں ٹیلی گراف سے منقول ہے کہ.. وہاں پانچ لاکھ چھبیس ہزار ایک سو اکیس آدمی ہیں۔

۱۱۰ کلکتہ: سلطان الاخبار مطبوعہ یکم جولائی سے معلوم ہوا کہ حاکمان فوجداری کلکتہ نے حکم دیا ہے کہ کوئی ہتھیار باندھ کر شہر میں نہ نکلے مگر اجازت لے کر اور ہر قوم کے امیر و فقیر ہندو و مسلمان اپنے تعزیے اور بت اور برات کو ڈھول اور نقارہ بجا کر نہ نکالیں، خصوصاً دریا کنارے اور بہو بازار اور قصاب ٹولہ اور چورنگی محلے چاروں طرف' کیوں کہ ان مقاموں میں انگریزان نامور رہتے ہیں اور باجے کی آواز سے ان کی طبیعت ملول اور نیند اُچاٹ ہوتی ہے؟

۱۱۲ فرانس سے ایک فوج واسطے بچانے پوپ کے.. گئی ہے ...اہل روم نے اس فوج کو بار بار شکست دی اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ رومیوں نے تمام مکانات عالی کے نیچے نقب کھود دی ہیں اور یہ ارادہ پختہ باندھا ہے کہ بصورت نصیب ہونے شکست کے شہر کو اڑا دیویں گے۔ دیکھا چاہیے کہ شوق آزادی کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے حاصل ہونے کی خاطر آدمی جان و مال کا بھی دریغ نہیں کرتا ہے مگر برعکس اس کے بعض جگہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

مال و دولت کی طمع سے لوگ نوبت آزادی کو ہاتھ سے ڈال دیتے ہیں۔ الحقائق

۱۱۴ فہرست آبادی شمالی مغربی اضلاع: دہلی ایک لاکھ، ۶۰ ہزار نو سو ستہتر۔ بنارس ۱۸۰۴۴۵۱۔
تمام ممالک مغربی میں ایک کرور چھیانوے لاکھ ۵۰ ہزار ہندو اور ۴۲ لاکھ سینتالیس ہزار مسلمان ہیں۔

۱۱۵ نرخ اناج جو الحقائق نے لکھا ہے: گندم ۲۴ سیر، نخود ۳۴ سیر، برنج ۱۴ سیر، ارد ۲۰ سیر، مونگ ۱۲
ارہر ایک من دس سیر، جو بشمول ۲ سیر، جوار ایک من، باجرا ۳۶ سیر، چنا ایک من ۱۰ سیر، سرسوں ۲۱ سیر
تیل ۸ سیر، مسور ۳۰ سیر۔

۱۱۶ اخبار انگریزی سے واضح ہوا کہ روم فرانسیسیوں کے تصرف میں آگیا۔ الحقائق۔

۱۱۸ پرچہ اسعد الاخبار مطبوعہ ۲۹ رمضان نمبر ۱۱۶ میں مرقوم ہوا ہے کہ روم فرانسیسیوں کے تصرف میں
آگیا، اس کو بعض ناظرین اخبار ولایت روم کی خبر سمجھے سو ایسا نہیں بلکہ یہ لفظ روم ایک شہر کا نام ہے جو قوم
روم کا ملک کے پوپ کا دار الحکومت ہے۔

۱۱۹ دیوان مولراج: جزیرہ سنگاپور میں نفی ہیں کہ مدت العمر وہیں۔ اپنے ملک و دیار کی مفارقت
میں بسر کرے۔ زبدۃ الاخبار

۱۲۲ فی الحال انگلستان میں ایک ایسی کل بنی ہے جس سے خود بخود روٹی پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ الحقائق
وتعلیم الخلائق۔

۱۲۴ الحقائق سے واضح ہوا کہ کئی برس سے ایک شخص امریکہ سے برف جہاز پر لاد کر کلکتہ میں لاتا تھا اور
دو آنے سیر بیچتا تھا۔ اب ایک اور بھی سوداگر لانے لگا اور اس نے ایک آنہ سیر کر دی، تعجب کی بات ہے
کہ برف سی چیز آٹھ دس ہزار کوس سے کس کس حکمت و احتیاط سے لاتے ہیں اور کوڑی سستی بیچتے ہیں۔

۱۲۷ الحقائق میں مندرج ہے کہ مسٹر اندرسن صاحب نے جو لندن میں ایک بڑا نامی بازی گر ہے ملکہ معظمہ
کے روبرو عجیب عجیب تماشے اور بازیاں کیں۔ شاہزادہ البرٹ کا رومال لے کر جلتے روبرو آگ میں ڈال
دیا، رومال جلکر خاک ہو گیا تھوڑی دیر میں رومال جوں کا توں آگ میں سے نکال کر شاہزادے کے ہاتھ
دوسری یہ کہ شاہزادے کا ٹوپا اپنے ہاتھ میں لے کر رنگ برنگ کے کھلونے اور انواع انواع پھول ٹوپی
سے نکال کر سب کو دکھائے۔ تیسری یہ کہ ایک پیالے قہوہ سے تمام حاضرین کو پیٹ بھر بھر پلایا اور پیالہ ویسا
بھرا رہا۔ ... عہد جہانگیر میں ہندوستان کے بازی گروں نے حضور شاہی میں بھی ایسی ایسی بازیاں اور شعبدے
کیے تھے جو ... اندرسن کی بازیوں سے زیادہ عجیب غریب تر تھے۔ زبدۃ الاخبار۔ اس تیسری بازی کی کیفیت
خوش نہ آئی کیوں کہ بازی گران شعبدہ پیشہ کے ایسے کھیل جو بزرگ کردہ ایزدی کے افعال سے
مشابہ ہوں، میں پسند نہیں۔ غالب کہ صاحبان پادری ہماری اس رائے کو پسند فرمائیں، کیونکہ ایسے
ایسے کھیل دیکھ کر یہود ... کو حضرت عیسیٰ ... کے بعض افعال کی تکذیب کے لئے ایک لاجواب حجت ہاتھ

اور اُن کی گمراہی بڑھتی ہو۔ پس اے مسلمانو اور اے ہنود و عیسائیو تم دنیا کے کھیل کو د لہو و لعب پیا
ہوشیاری سے کام کرو۔ اپنے اپنے بزرگان دین کے افعال کی نقل کرکے شستے اور ظرافت میں مت پڑ ا
حضرات ملوک و امراے والاشان جو بہ ظاہر ایسے امور پر توجہ فرماتے ہیں۔۔ تو اُن کو اسی ذریعے سے
غریبوں کی پرورش منظور ہوا کرتی ہے۔

۱۲۲ گوالیار ؛ الحقائق میں مالوہ اخبار سے منقول ہے۔۔ کہ ۲۱ تاریخ کو خریطہ اسمی مہاراجا صاحب کا پڑ
اس میں لکھا تھا کہ مہاراجا صاحب کی مہر کلاں میں "فدوی شاہ عالم بادشاہ" درج ہے سو اب بجاے ان
کے "فدوی شاہ انگلستان" کھدوانا چاہیے۔

۱۲۳، ۲۶ تاریخ اکتوبر [illegible] کو۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس میں ایک صاحب نے انگریزوں جلیل القدر میں سے
بطور تذکرہ یہ بات بیان کی کہ امیران سندھ کو ناکردہ گناہ مجرم۔۔۔ قرار دے کر اور ان کی حکومت اور ریاست
گرا دیا اور بہ کمال بے رحمی۔۔ جلاوطن کیا۔۔۔ اگر قصور اُن کا ثابت ہو تو لے لینا اُن کے ملک و مال کا بجا
اور اگر ان کی بے قصوری ظاہر ہو تو۔۔ اُن بے چارے بے گناہوں کو ملک و مال ان کا پھیر دینا اور ہر ایک کو
ان کے وطن مالوف میں پہنچا دینا عین عدل و انصاف ہے دہلی اردو اخبار

۱۲۴ حیدرآباد دکن ؛ اُس طرف کی تحریرات سے واضح ہوا کہ شہر صفر سنہ حال کی ۲۹ تاریخ اُس
دارالحکومت میں بڑا فساد مچا۔۔ جوانان لشکر مسلح ہو کر آستانِ دولت پر چڑھ آئے اور لوگوں کی
آمد و رفت بند کر دی، اور اپنی تنخواہ کے لیے دھرنے کر بیٹھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی سائیس اور فیلبان
اور رتھبان بھی اکٹھے ہو آئے اور۔۔ رستہ رک گیا، صبح سے شام تک ایک قیامت مچی رہی، آخرالامر
عمدۃ الدولہ بہادر نے ان سب کی تسلی کی اور۔۔ دو دن کا وعدہ کیا۔ لیکن، بہ اسباب ظاہر کوئی ایسی
صورت نظر نہیں آتی کہ یہ وعدہ صورت ایفا دیکھے، کیوں کہ جب اہالیان سرکار۔۔ نے دو سال تک
کچھ تدبیر تقسیم تنخواہ کی نہیں کی تو دو دن میں کیا کریں گے۔ بالجملہ وہاں۔۔ بڑی ابتری اور بے انتظامی
ہو رہی ہے۔ زبدۃ الاخبار

۱۲۵ - جو فتنہ اور فساد کہ آپس میں سلطان روم اور شہنشاہ روس کے واقع تھا بڑی کوششوں
اور تدبیروں سے ایلچیان کاردان اور وزیروں خرد مند نے باہم صلح کروا دی ۔۔۔ از زبدۃ الاخبار

۱۴۵ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے مقرر ہونا بورڈ ایڈمنسٹریشن ملک پنجاب کا ناپسند فرمایا۔ کس واسطے کہ اس کے
انتظام اور بندوبست سے کچھ سرکار کو فائدہ حاصل نہ ہوا۔ غالب ہے کہ جناب شوکت مآب لفٹنٹ ٹامسن صاحب بہادر
ملک پنجاب میں بھی مدارالمہام مقرر ہوویں۔ اخبار النواح۔

۱۴۶ ۔ حیدرآباد دکن: معلوم ہوا کہ باسٹھ لاکھ روپیا سپاہ انگریزی کی تنخواہ کی بابت جو سرکار حیدرآباد کی نوکر ہے ...
باقی ہے .. ان دنوں صاحب رزیڈنٹ بہادر نے بہ ناچاری کپتان ڈیوسن صاحب کو راجا رام بخش بہادر کے پاس
بھیج کر یہ کہلا بھیجا کہ آج تک بہتیرے وعدے ہوئے اور ایک بھی پورا نہ ہوا یہ سب لوگ گھبرائے جاتے ہیں ۔ زر نقد
نہ ہو سکے تو صوبہ برار میں سے تھوڑا سا ملک علیحدہ کر دو کہ اس کے محاصل سے زر قرضہ وصول کر لیا جائے گا ... ابھی یہ حال
نہیں کھلا کہ حضور والا نے اس باب میں کیا ارشاد فرمایا ۔ زبدۃ الاخبار۔

۱۴۷ ۔ خبر مدرسہ اکبرآباد: جمعرات کے دن جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مدرسے میں تشریف لا کے امتحان سالانہ کی
رپورٹ سنی ... بعد اس کے پہلے دخانی گاڑی کا بیان کیا گیا اور پھر وہ گاڑی مدرسے کے احاطے کے اندر آہنی سڑک پر
چلائی گئی .. صدہا ہندوستانی و انگریز یہ تجربہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے ۔

۱۴۹ ۔ اخبار النواح میں بہ حوالہ انگلشمین کے مرقوم ہے کہ نواب رضا حسین خاں والی مرشدآباد کی بی بی بہ عارضہ
چیچک فوت ہوئی۔ بی بی کے غم میں نواب صاحب بہادر کا برا حال ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ڈھائی برس ہوئے کہ اس
نواب کی والدہ بھی اسی طرح مری تھی ۔

۱۵۰ ۔ حیدرآباد (خلاصہ) میر امام علی اور میر ببر علی روہیلوں کے جمعدار کے درمیان بڑی خانہ جنگی ہوئی امام علی اپنے
۱۷ ہمراہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ زبدۃ الاخبار ۔

۱۵۱ ۔ خبر لاہور۔ تبرکات اسلامیہ جو تمیناً توشہ خانہ مہاراجا صاحب میں ہے بہ حکم سرکار انگریز بہادر کے کسی سید کو مرحمت
ہوگا۔ زمانہ سابقہ میں اس تبرکات کے عوض کسی نواب نے کئی لاکھ روپے مہاراجہ صاحب کو دینے تجویز کیے تھے۔ مگر مہاراجہ
صاحب نے تبرکات کو علیحدہ کرنا پسند نہ کیا تھا۔ اخبار الحقائق ۔

۱۵۲ ۔ (خلاصہ) سید قربان علی رئیس بہتر ولی کو ۱۸۴۸ء میں منصفی کی سند ملی تھی ۳ مئی ۱۸۵۰ء کو حکام صدر نے انہیں عہدۂ
صدر اعلیٰ کیا۔ وکالت کا کام ہر شخص کر لیتا ہے لیکن یہ ہر شخص کا کام نہیں کیونکہ وکیل میں قناعت، خلوص، اتحاد (یعنی موکل کے
فائدے کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھنا) خدا ترسی، دینداری، علم، متانت، تحریر، خوش تقریری و قافیہ

راست گفتاری یہ سب ہونی چاہییں اور ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے سید قربان علی صاحب ان سب صفات کے متبع ہیں

۱۵۵۔ اکبر آباد: مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ مرحوم کا مقدمہ جو بر صیغہ اپیل صدر نظامت میں دائر تھا۔ تمام دوران کے حق میں دور سے جو سات برس کی قید با مشقت پابہ جولاں کا حکم ہوا ہے سو وہ حکم بحال رہا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔

۱۵۹۔ مجمع الاخبار بمبئی میں انگریزی اخبار لندن سے منقول ہے کہ ملکۂ معظمہ کے وزیروں کا اختیار و اقتدار روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ اور ارباب پارلیمنٹ کے مصوران کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا اس بات سے سب کو معلوم ہوتا ہے کہ عن قریب وزیروں کی تغیر و تبدل ہو اور نئے مقرر ہوں۔ زبدۃ الاخبار۔

۱۶۰۔ زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار بمبئی سے منقول ہے کہ عمدۃ التجار حبیب ابن یوسف نے حاجیوں کی آسائش و آسانی کے لیے ۔ ۔ ۔ عالی جہاز مقرر کیا ہے جس سے ساڑھے تین مہینے میں حج و زیارت سے بہرہ اندوز ہو کر پھر آیا کریں۔ سو ایسا ہوگا کہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۷۰ کو بمبئی سے جہاز کا لنگر اٹھے گا اور بیسویں پچیسویں تک جدہ میں پہنچ جائیں گے۔ جہاز کا کرایہ اس تفصیل سے ہوگا کہ ڈیوسہ کا مقام جو بہت اعلیٰ ہوتا ہے فی سفر ڈیڑھ سو روپیہ، اور مقام چھتری فی کس سوا سو روپیہ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پچھتر روپیہ۔

۱۶۱۔ ۔ ۔ ڈاکٹروں نے میسمریزم کا اسرار ایجاد کیا ہے اس سے جس کو چاہیں بے ہوش کر کے غائبات کا حال پوچھ لیں چنانچہ ۔ ۔ ۔ ایک لڑکی کو بے ہوش کیا پھر اس سے شہر لیفا اور وہاں کی کلیسیا پھر شہر ۔ ۔ ۔ انگلستان میں بڑا ۔ ۔ ۔ حال پوچھا لڑکی نے سب جگہ کا حال پتا دار سنایا کہتے ہیں کہ میسمریزم کا کمال یہ ہے کہ جس وقت کسی کو بے ہوش کر کے ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھیں باندھ دیں اور جس علم اور جس زبان کی کتاب کو اس کے آگے رکھ دیں ۔ ۔ ۔ پڑھے اور اوروں کو اس کا ۔ ۔ ۔ لکھا دے۔ زبدۃ الاخبار۔

۱۶۲۔ حیدر آباد دکن: نظام الملک نے ایک نہایت عمدہ کوچ اور ایک کرسی ہاتھی دانت کی کہ جس پر زر کا کام بہت ۔ ۔ ۔ ہے ملکۂ معظمہ کو بطور تحفے کے بھیجے ہیں۔ (اخبار الحقائق)

۱۶۳۔ حیدر آباد دکن: ان دنوں حضرت بندگان عالی نے جمیع اعیان و ارکان سلطنت پر جو ملازم قدیم ہیں حکم دیا ہے کہ اپنی اپنی وسعت کے لائق زر نقد داخل خزانہ حضور کریں۔ یہاں تک کہ پچاس لاکھ روپے جمع ہو جائیں تا کہ ۔ ۔ ۔ خدمت سے نجات حاصل ہو چنانچہ اکثر ملازموں نے روپیہ داخل کیا ہے اور راجا رام بخش پر سر اول متعین ہیں۔ ۔ ۔ ۔ یہ حال ہے کہ روپیہ دینا ان پر دشوار ہے۔ زبدۃ الاخبار

۱۶۴۔ لاہور: مسٹر ۔ ۔ ۔ صاحب سکرتر اعظم نے تواریخ کی کئی کتابیں پرانی خوش خط مہاراجا رنجیت سنگھ کے کتب خانہ

ناگئی سو روپے کو خرید کی ہیں اور ایک روز صاحب موصوف جناب نقیر سید نورالدین احمد کے گھر جا کر ان کے کتب خانے میں سے چند جلد تواریخ عاریتہً لے آئے۔ اخبار الحقائق

۱۸۰ ۔ صاحب زبدۃ الاخبار تحریر فرماتے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ اعیان وارکان سلطنت انگلستان کو منظور ہے کہ گورنمنٹی آگرہ کا اختیار و اقتدار نسبت سابق کے زیادہ تر ہو جائے۔ سو نواب عالیجناب امیر کبیر فرماں روائے کشور ہند کو ایما کیا ہے کہ ریاست ہائے عظیمۂ راجستان جو نربدا اور ستلج کے اس پار واقع ہیں ان سب کے معاملات کو آگرہ کی گورنمنٹ سے متعلق کر دیں جیسے کہ پہلے بعہد حکومت لارڈ مٹکیف صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر آگرہ سے متعلق تھے خدا کرے کہ یہ خبر سچ ہو۔ بموجب اس کے ملکۂ معظمہ کے اقتدار کی ترقی موجب آبادی اکبر آباد متصور ہے۔

۱۸۸ ۔ احمد آباد: اخبار آفتاب عالم تاب میں یوں لکھا ہے کہ ایک مہاجن نے واسطے تعلیم ہندو لڑکوں کے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہا جب اس بات کی اطلاع صاحب کلکٹر کو ہوئی تو صاحب مذکور نے اس کو بہت تحسین و آفرین کی اور سردار بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اخبار الحقائق۔

۱۰۰ ۔ حیدر آباد: اخبار گلشنین میں بحوالہ ایک چٹھی آمدہ حیدر آباد کے مرقوم ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر نے نواب نظام الملک بہادر کو واقف کر دیا ہے کہ اگر زر قرضہ تاریخ معہودہ پر ادا نہ ہوگا تو صاحب رزیڈنٹ کو حکم ہے کہ پھر اس معاملے میں تحریک نہ کریں عوام کی رائے یہ ہے کہ بعد اس کے کچھ تک من جملہ قلم رو نواب صاحب بر سرکار اپنا دخل کرے گی۔ فرزانہ

۱۹۵ ۔ اکبر آباد: جناب ولایت حسین خاں صاحب بہادر نامی انتصات صدر جو اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر بحصول پنشن تعلقات سے کنارہ کش ہوئے ہیں ان کی جگہ مولوی محمد اسد اللہ صاحب منصفی عدالت فتح پور مقرر ہوں گے۔ زبدۃ الاخبار

۲۰۱ ۔ حیدر آباد دکن: کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ملک حیدر کو شامل کرنا ممالک سرکاری میں نامنظور کیا۔ اخبار السواح

۲۰۴ ۔ مو تھے راجا گلاب سنگھ نے لاٹ صاحب کو پیش کش بھیجے تھے لاہور میں سب کا نیلام ہو گیا۔ دہلی اردو اخبار

۲۰۵ ۔ ان دنوں ڈاکٹر سپرنگر صاحب پرنسپل مدرسہ کلکتہ نے چاہا تھا کہ علم طبیعی اور جغرافیہ اور فارسی اور اردو طلبہ کو سکھایا جائے لیکن طلبہ نے نہ مانا اور مقابلہ کیا۔ ارباب کونسل تربیت نے اس بات پر سرکش لڑکوں کو مدرسے سے نکال دیا لیکن وہ بہیئت مجموعی آکر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھ گئے اور آخر کار ارباب پولس نے انہیں نکال دیا۔ دہلی اردو اخبار

۲۰۶ ۔ حیدر آباد دکن کے خط سے واضح ہوا کہ علی یار جنگ کی جمعیت کے سپاہیوں نے کئی برس تنخواہ نہیں پائی تھی لاچار تنگ ہو کر در دولت پر مجمع کر کے داد فریاد کرنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی لشکر کے اور لوگ بھی شامل، لنگوں اور سکھوں کے جو تنخواہ کو ترستے تھے۔ در دولت پر حاضر ہوئے۔ حق بجانب لشکریوں کے ہے کہ جب برسوں سے تنخواہ نہ پائیں؟

بھوک سے مارے بلوہ نہ کریں تو کیا کریں لیکن بندگان عالی نے ان بیچاروں کے حال تباہ پر رحم نہ کر کے حکم دیا کہ ان لوگوں کو پلٹن سے نکال دو۔ جب وہ نہ ٹلے تو توپ خانہ منگوا کر اڑا دینے کا حکم دیا اور ایک باڑ بھی چلوا دی کئی آدمی چھرے سے مر گئے۔ باقی ماندوں نے جب یہ حال دیکھا تو اپنی اپنی چھاؤنیوں کو چلے گئے۔ بعد ازاں حضرت نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو موقوف کرو اور تنخواہ دے دے کر نکال دو۔ زبدۃ الاخبار

(۵۰) شہر کلکتہ کے نافہم لوگوں میں مشہور ہے کہ ڈاکٹری مدرسے میں موٹے اور جسیم آدمیوں کو پکڑ کر خون اور چربی نکالتے ہیں کہ اس سے کچھ ایسی شے بنائیں گے جس سے ملتان فتح ہو جائے سو اس خوف سے جسیم اور فربہ آدمی چھپے پھرتے ہیں۔ ایک دن چند کہاروں کے پکڑنے کو برق انداز دوڑے۔ کہار ڈرے کہ ہمیں چربی نکالنے کو پکڑیں گے بازار کی طرف بھاگے اور ان کے بھاگنے اور غل شور کا ہنگامہ برپا ہوا کہ بازار لٹ گیا۔ واہ کلکتہ کے لوگ بھی کتنے بیوقوف ہیں۔ سلطان الاخبار ۱۳ دسمبر

(۹۳) اس طرف کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ جزیرہ امریکہ میں ایک ملک ہے مکسیکو وہاں کے رہنے والوں اور امریکہ کے لوگوں میں ایک سال سے لڑائی تھی آخر کو اہل امریکہ غالب آئے، اور ایک ملک کالیفورنیا چھین لیا۔ وہاں ایک دن ایک سوداگر نے کسی کام سے گڑھا کھودا، سو مٹی میں سونے کے دانے نکلے۔ لوگوں کو تعجب ہوا۔ سوچنے لگے کہ شاید یہاں سونے کی کان (کذا) ہو۔ تلاش و جستجو کی تو ایک خطہ پانسو کوس لمبا اور اسی قدر چوڑا ایسا پایا گیا اس میں جہاں کھودا خالص سونے کے دانے نخود کے برابر سے لے کر آدھ سیر کے ٹکڑوں تک نکلے۔ سرکار انگریز بہادر نے اب تک اس ملک کا بندوبست نہیں کیا، کیونکہ پایہ تخت سے بہت دور اور نیا قبضے میں آیا ہے، غالب کہ چند روز بعد کچھ بندوبست کیا جائے۔

۱۰۸ (خلاصہ): اخبار الحقائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرداِبج کے مقدمے کی کارروائی اُردو میں ہوتی تھی (ص ۶۲ الفاظ مرتضیٰ)

۱۱۵: زبدۃ الاخبار میں دہلی اُردو اخبار سے مرقوم ہے کہ .. لاہور سے عن قریب اس مضمون کے اشتہار جاری ہوں گے کہ پنجاب کی ساری رعیت .. ہتھیار - سرکار میں داخل کرے اور جو یکم اکتوبر سنہ حال تک کسی کے گھر میں ہتھیار نکلیں گے اُسے سزا ہوگی اور قید کیا جائے گا -

۱۱۵: حکام الہ آباد نے بہ نظر دور اندیشی کوتوالی الہ آباد کی ایک انگریز کو دی ہے " اس واسطے کہ وہ طرفدار نہ مسلمان کا ہوگا نہ ہندو کا - اور کوتوال حال نے حکم دیا ہے کہ جامع مسجد میں لوگ بغیر اجازت کے نماز پڑھنے نہ پائیں - باعث اس حکم کا فساد سال گزشتہ ہے " اخبار الحقائق -

۱۱۷: زبدۃ الاخبار میں مرقوم ہے کہ رمضان کی ۱۰ ار .. کو صاحب رزیڈنٹ بہادر حسب الطلب .. دربار میں تشریف لے گئے اور دو گھنٹے تک .. مشورہ کرتے رہے - اس خلوت میں نواب وزیر الملک شمس الامرا بہادر بھی باریاب نہ ہونے پائے .. جب صاحب ممدوح رخصت ہوگئے حضور والا نے نواب شمس الامرا کی نسبت حکم دیا کہ آج سے تم اپنے تئیں معزول سمجھو اور اپنے گھر بیٹھو' دربار میں آنا ضرور نہیں .."

۱۲۲: " .. دانایان فرنگ نے اب نئی وضع اور انداز کا اوزار چھاپنے کو ایجاد کیا ہے .. نئی کل بلا وسیلے آدمی کے خود بخود بہ زور دخان کے چلتی ہے اور ۲۵ ہزار سے کم کاغذ ایک دن میں نہیں نکلتا -

۱۲۸، خبر حیدر آباد: جماعت افغانان نے .. جو قدیم نوکر ہیں، تنخواہ کا تقاضا کر کے .. در دولت پر مستعد خونریزی ہوئے - بعض سرداران صلاح اندیش نے .. دم دلاسا دے کے در دولت سے ٹالا - راجا رام بخش نے ساٹھ لاکھ روپیا جو بندگان عالی کو نذرانہ دینا مقرر کیا ہے اُس کی ادا کا دو مہینے وعدہ کیا ہے -

۱۳۰: اسی مہینے (فروری ۱۸۵۳ء) کی ۱۰ر تاریخ کو شاہ سلطان بخش صاحب .. جو دنیا و مافیہا سے دست بردار اور بڑے عامل زبردست تھے - طرف ملک بقا کے روانہ ہوئے .. نعش بسبیل ڈاک گاڑی گھر گھر یا روانہ فرخ آباد ہوئی "

۱۳۱: رعایائے کشمیر مہاراجا گلاب سنگھ .. کے ہاتھوں بہت تنگ آگئی ہے .. محصول - مال اور زمین - وغیرہ پر اب دوگونہ لیا جاتا ہے شال بافوں پر تو یہ تباہی آئی ہے کہ یعنی پرانی کملی بھی ان کے پاس نہیں رہی، کہتے ہیں کہ مہاراجا .. شال اور چاول .. آدھی قیمت پر مول لے کر دور دور ملکوں کو بھیج دیتے ہیں - (خلاصہ) شکایت کا کوئی اثر نہ ہوا - مہاراجا نے یہ جواب دیا کہ اگر اس طرح تم راضی نہیں تو انگریزی کلکٹر تم پر مقرر کرا دیں گے - زبدۃ الاخبار

۱۳۲ ؛ خلاصہ: زبدۃ الاخبار میں مجمع الاخبار کے حوالے سے لکھا ہے کہ کلکتہ میں ایک نیا قانون مرتب ہوا ہے کہ تبدیل مذہب سے کوئی شخص محروم الارث نہیں ہو سکتا۔ اس قانون کے جاری ہونے میں بڑی بڑی قباحتیں ہیں۔ لوگ اس کی تردید و تنسیخ کی کوشش کر رہے ہیں۔

اسعد الاخبار خبروں کی بہم رسانی کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتا تھا۔ مقامی خبروں کو چھوڑ کر اس کی قریب قریب کل خبریں دوسرے اُردو اخباروں سے ماخوذ ہوتی تھیں۔ قمر الدین خاں غالباً انگریزی نہیں جانتے تھے اس لئے انگریزی اخباروں سے براہ راست استفادہ بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسعد الاخبار میں بہ ظاہر اس کا التزام تھا کہ کسی اخبار سے کوئی خبر بغیر حوالہ دیے ہوئے نقل نہ ہو۔ اس کے دفتر میں غالباً کل اُردو اخبار بھی نہیں پہنچتے تھے۔ اکثر خبروں کے آغاز میں اس قسم کا کوئی فقرہ نظر آتا ہے۔ "فلاں اخبار میں فلاں اخبار سے مرقوم ہے"۔ خبریں اکثر باسی ہوا کرتی تھیں، اور اس میں ان کے لیے اتنی کم جگہ تھی کہ اکثر اہم خبریں چھوٹ جایا کرتی تھیں۔ صرف اس اخبار کو پڑھ کر کوئی شخص اپنے احول سے باخبر رہنے کا مدعی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسعد الاخبار کو بیرون ہند کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ دل چسپی تھی، اور برطانوی ہند کے مقابلے میں یہ اخبار دیسی ریاستوں کی خبریں زیادہ دیا کرتا تھا۔ جنگ کی خبریں بھی بالالتزام دی جاتی تھیں۔ یورپ کی خبریں باوجود اس کے کہ یورپ میں اس زمانہ میں سیاسی بے چینی بہت زیادہ تھی، کم ملتی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں ہندوستانی یورپ کے حالات سے اس قدر کم واقف تھے کہ تشریح و تفسیر کے بغیر خبروں کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ممالک اسلامی کی خبروں سے کسی غیر معمولی دل چسپی کا اسعد الاخبار سے پتا نہیں چلتا۔ باوجود اس کے کہ وہ زمانہ روم و روس کی لڑائی کا تھا، اس جنگ کی کم خبریں اس اخبار میں ملتی ہیں۔ عجائب و غرائب اور جدید ایجادات کا ذکر اخبار میں بہت ہے۔ اور خبروں کے کالموں سے وکلا اور حکام کی مدح سرائی کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ اسعد الاخبار میں مقالات افتتاحی نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی خبروں کے ساتھ رائیں بھی ہوا کرتی تھیں، ان کا نمونہ اوپر گزر چکا ہے۔

اسعد الاخبار کو سیاسیات سے (حکام کی وقتاً فوقتاً مدح سرائی کے سوا، اور یہ بھی زیادہ نہیں) دل چسپی نہ تھی۔ لیکن بعض دوسرے اخباروں کی رائیں جو اس اخبار میں نقل ہوئی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ سیاسی آزادی کے تصور سے لوگ قطعاً ناآشنا نہ تھے۔ انگریزوں کی زر پرستی اور ہوس ملک گیری سے بے خبر نہ تھے، گو محض دبی زبان سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ دیسی ریاستوں میں رعایا پر جو ظلم ہوتا تھا، اس کے متعلق زیادہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا تھا۔

ذیل کے اقتباسات سے یہ معلوم ہوگا کہ اس اخبار میں ادبی دل چسپی کا کیا کیا سامان ہوتا تھا، اور ادب یا ادیبوں سے متعلق کون کون سی خبریں شائع ہوئی تھیں؛

میرزا غالب ص ۹۲ و ۹۳ میں پیام آجکل غالب کا منظوم اشتہار درج ہے۔ اس کے متعلق مہتمم صاحب اخبار بیان ہے کہ "یہ اشتہار پنسل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا" یہ اشعار بظاہر غلام نجف دعلیم غلام نجف خاں کے ہیں۔ لیکن ان کے شاعر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ عجب نہیں کہ یہ اشعار خود میرزا غالب کے ہوں: "نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ نثر مصنفہ حضرت مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب جو اپریل مہینے میں قیمت پیشگی تین روپے اور جو اس کے بعد بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔ نظم:

مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن — پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن
طے کرو راہ شوق زود از زود — آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
پاس ہے اب سوادِ اعظم نثر — دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کو سواد ارزانی — چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا — جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہ راہ دہلی ہے — مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ — گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ
ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار — بار ور جس کا سرو گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں — نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر — اخذ کرتا ہے آسمان کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری — حبذا رسم و راہ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم — ہے مقرر جو اب پئے تعلیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے — کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے — ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
ورزش قصۂ کہن کب تک — داستان شہ دکن کب تک
تا کجا درس نثر ہائے کہن — تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسداللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے درست — ہر کرا پنج روز نوبت اوست
ہم وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدردانِ معنی ہے — پادشاہ جہانِ معنی ہے

نثر اُس کی ہے کارنامۂ راز　　　نظم اُس کی نگارنامۂ راز
دیکھو اس دفترِ معانی کو　　　سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا　　　سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری　　　کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست　　　تین بھیجے رُپے دو بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب　　　زرِ قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت　　　اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے　　　احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہارِ ریاضِ مہر و وفا　　　جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پے حصولِ شرف　　　نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصلِ تحریر　　　کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے　　　ابتدا سے ورق شماری ہے"

ان تفتہ ۱۸ ؛ ان دونوں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور دیوان تفتہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۲ء میں دیا گیا تھا۔ بسبب فرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔۔ شعرائے متاخرین میں ایسا فارسی کلام کسی کا کم دیکھنے میں اس فصاحت کے اعتبار سے اگر تفتہ کو صائب وقت اور اس کے وطن سکندر آباد کو ہان کہیے تو بجا ہے اور اس کا چھاپا اس کیفیت سے ہوتا ہے کہ ولایتی لیتھو کا غذ نہایت ت و آب دار اور اکیس سطر کا صفحہ بہ خط نستعلیق بہ قلم متوسط لکھا جاتا ہے۔ اس کی ت ۵۴ جزو سے زیادہ ہوگی اور اشعار پندرہ ہزار سے زیادہ ہیں۔۔ اس کی قیمت بالفعل پے ہیں اور آج سے دو مہینے کے بعد چار رُپے آٹھ آنے اور پھر دو مہینے کے بعد پانچ رُپے ہو جائے گی درخواست مع قیمت کے اس مطبع میں بھیج دیں۔ دیوان موصوف بعد اختتام بہ سبیل ڈاک بہ صیغۂ بیرنگ بھیجی جائے گی (کذا) اور اس دیوان میں ہر غزل دو غزلہ ہو زمین کی دو غزلیں دی ہیں۔ دوسری غزل کا مقطع یہ ہے

ساقی بیار مے کہ نہ من تفتہ ام کنوں　　　نواب عہد خویشم و با خانم آشنا

م کے متعلق لکھا ہے کہ دریں لفظ چہ خوش ایہام ست۔ یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ منشی محمد خاں صاحب بہادر نائب و مختار کل ریاست ٹونک نے دیوان کے چھپوانے میں مالی مدد اور راجے جگل کشور وکیل محکمۂ عالیہ صدر دیوانی نے بہ نظر اعانت مصارف طبع ۲۰

بلدوں کی قیمت اشاعت سے پیشتر ادا کردی تھی) نمبر ۱۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء اب دیوان ریختہ سے کچھ زیادہ چھپ چکا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ہی ثنا خواں ہیں" نمبر ۱۲۰ سے پتا چلتا ہے کہ بارھویں نومبر ۱۸۴۹ء تک ۲۰۴ صفحے چھپ چکے تھے۔ اس نمبر میں نمونۂ کلام بھی ہے۔

غلام امام شہید: نمبر ۱۱۶ میں یہ خبر درج ہے: بظاہر اس کا تعلق اسی مقدمے سے ہے جس کا ذکر نمبر ۱۱۲ وغیرہ میں ہے۔ "۱۰ اگست کو محکمۂ صدر دیوانی میں نو اشخاص بڑے ذی عزت کہ بعض ان میں اپنے عہدے کی رو سے سررشتے کے ایک رکن رکین تھے، مراد آباد کے کسی مقدمے میں باشتباہ رشوت ستانی حوالات میں گئے اور کہتے ہیں حکم یہ ہوا ہے کہ تحقیقات کے لیے مراد آباد بھیجے جائیں۔ امید کہ بعد تحقیقات کے بثبوت بے جرمی کے رہائی پائیں" ۱۲۵ "ہولسن صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ مراد آباد اکبر آباد میں داخل ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اب یہاں رہ کر عملۂ صدر کے مقدمات کی تحقیق کریں گے"

۱۲۶ "ہولسن صاحب .. جس کام پر .. مامور ہوئے ہیں اس کی تحقیقات میں سرگرم ہیں"۔

۱۳۴ "منشی رسول بخش اور نہال الدین محرر نے جو عملۂ صدر سے مراد آباد کی فوجداری میں ماخوذ ہوکر دورہ سپرد ہوئے تھے دورے سے سزا پائی۔ منشی موصوف چار سال کی میعاد اور محرر مذکور کو تین سال کو بلا مشقت قید ہوئی۔ اور اور لوگ جو ہولسن صاحب کے حسب الطلب مراد آباد گئے ہیں ان کا مقدمہ وہاں درپیش ہے۔ نہیں معلوم انجام کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے"

۱۴۷ "یہ کمترین .. (یعنی مہتمم اسعد الاخبار) جو بہ تقریب ادائے شہادت نیک معاشی مولوی آل حسن صاحب منصف کے مراد آباد کو گیا تھا سو بعد ادائے شہادت مراد آباد سے رخصت ہو کر ہفتۂ گزشتہ میں وارد اکبر آباد ہوا" ۱۴۰ "عمال صدر کا مقدمہ جو مراد آباد میں دائر تھا صاحب سشن جج کے محکمے میں اس نہج سے فیصل ہوا۔ مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و مولوی غلام امام صاحب پیش کار و منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں تین سال، اور مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن صاحب منصف دو دو سال۔ اب ان صاحبوں کا اپیل صدر میں دائر ہوا اور مسل مقدمہ مراد آباد سے صدر میں طلب ہوئی۔ اللہ اپنے فضل و کرم سے سب صاحبوں کو بری کرے" ۱۵۳ (۲۰ مئی ۱۸۵۰ء) "عملۂ صدر ماخوذہ مراد آباد کا مقدمہ جو صدر نظامت آگرہ میں اپیل ہوا تھا، اس میں تین شخصوں کی باتفاق رائے دو حاکم کے رہائی ہوئی، وہ تینوں اشخاص یہ ہیں: مولوی سید آل حسن صاحب منصف، مولوی غلام امام صاحب شہید پیش کار صدر، منشی محمد قاسم صاحب مسل خواں صدر۔ اب تین اشخاص مولوی غلام جیلانی صاحب وکیل صدر و منشی سراج الدین صاحب پیش کار، و مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں جو باقی رہے، بفضلہ تعالیٰ

حاکم سوم کی رائے سے یہ بھی رہائی پائیں گے" ۱۵۵ "مولوی سید آل حسن .. و منشی سید محمد قاسم جنھیں .. رہائی ہوئی ہے داخل اکبر آباد ہوئے۔ اغلب کہ اب اپنے اپنے کام پر بحال ہو لیں گے مولوی غلام امام صاحب .. بالفعل مراد آباد سے رام پور کو چلے گئے ہیں، جس وقت کہ یہاں آئیں غالباً وہ بھی اپنے کام پر بحال ہوں گے" ۱۵۶ "مولوی غلام جیلانی .. اور منشی سراج الدین .. اور مولوی بدر الحسن .. کے حق میں فیصلہ ضلع کا بحال رہا۔ اکثر اشخاص اس سانحے کا ملال و افسوس کرتے ہیں۔ اب ظاہرا ان کی بریت کی بجز اس کے کہ فضل ایزدی شامل حال ہو اور اپیل ولایت رہائی کا حکم ہو اور کون صورت باقی ہے۔ اللہ ان بزرگواروں کی مشکل آسان کرے"۔

گلدستۂ انجمن مصنفہ منشی واجد علی خاں صاحب مہتمم زبدۃ الاخبار۔: ۹۰ "ہر ایک خاص و عام پر ظاہر ہے کہ ایک مدت سے حکام وقت کی کچہریوں میں تحریر زبان اردو کی جاری ہے اور کاغذات حالات و مقدمات دیوانی و فوجداری و کلکٹری اس زبان میں لکھے جاتے ہیں اور تحریر فارسی یک قلم موقوف ہوگئی ہے مگر اہل دفتر کہ نوشت و خواند فارسی کے عادی تھے جو کچھ مطلب اور مضمون زبان اردو میں لکھتے ہیں وہ بعینہٖ گویا ترجمہ فارسی کا ہوتا ہے اور اردو کے محاورے اور روز مرے کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ زبان اردو زبان اہل ہندوستان کی ہے مگر تحریر اور تقریر میں بہت فرق اور تفاوت ہے .. ہر ایک زبان کے اہل علم جب کچھ مطلب لکھتے ہیں تو بہ نسبت ان کی تقریر کے تحریر کی فصاحت اور بلاغت کچھ اور ہی ہوتی ہے اور وہ بغیر پڑھے کسی کتاب کے کہ جس میں تمام ایسے اور اصول اور محاورات اور اصطلاحات اور کنایات .. مندرج و منضبط ہوں ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔ زبان اردو میں بہت سی تذکرے اور دیوان اور قصے کہانی کی کتابیں تصنیف ہوئیں اور ان کتابوں میں مصنفوں نے محاورات .. کو بڑی خوبی و لطافت سے بیان کیا ہے مگر ایسی کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہوئی کہ جس کے پڑھنے سے جو لوگ کہ زبان اردو سے ناواقف ہیں اور شوق سیکھنے کا رکھتے ہیں ان کی زبان درست اور آراستہ ہو اور محاورات سے بخوبی واقف ہوں اور جو کہ محاورات اردو سے واقف ہیں ان کی بھی آنکھیں کھل جائیں۔ اس واسطے اس خاکسار مہتمم زبدۃ الاخبار نے ایک کتاب کہ جس سے وہ سب فائدے حاصل ہوں تصنیف کی اور نام اس کا گلدستۂ انجمن رکھا ہے۔ خوبی اور لطافت اس کتاب کی دیکھنے پر موقوف ہے اگر ہم کچھ اپنی زبان سے بیان کریں تو مناسب اور زیبا نہیں ہے۔ اور اس کتاب کی تیرہ سطر کے صفحوں سے بیس جز کی ضخامت ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس ہفتے سے مطبع زبدۃ الاخبار میں اس کتاب کا چھاپا شروع ہوگا اور کوئی مانع پیش نہ آئے تو دو ڈھائی مہینے میں چھپ کر تیار ہو جائے گی ... قیمت اس کی آج کی تاریخ سے پندرہویں دسمبر سنہ حال تک کہ

ایک مہینا کامل ہو چار رُپے ہیں اور بعد اس کے کچھ بڑھ جائے گی۔ اس کتاب کی اس قیمت قلیل میں بہت ارزاں سمجھیں۔۔ اس کی خریداری سے دریغ نہ فرمائیں کہ اس خاکسار نے کیا کیا خون جگر کھا کر۔۔ اس کو بہ بے بہا کو مرتب کیا ہے اور لوگوں کے فائدے کے واسطے قیمت اس کی کم کر کے نقصان اپنے ذمے لیا ہے۔ اگرچہ میر انشاء اللہ خاں مرحوم نے ایک رسالہ کہ نام اس کا دریائے لطافت ہے محاورات اُردو میں تصنیف کیا ہے اور جان گلکرسٹ صاحب نے چند اوراق قواعد صرف و نحو اُردو میں لکھے ہیں۔ اگر ہم اس کی شرح کریں تو زیبا نہیں، مثل مشہور ہے چھوٹا منہ بڑی بات مگر جب جونسے دریائے لطافت اور رسالۂ جان گلکرسٹ کو ملاحظہ فرمایا ہے جب اس گلدستۂ انجمن کو بچشم انصاف مطالعہ فرمائیں گے تو اس وقت حقیقت ہر ایک کی اُن پر بہ خوبی ظاہر اور روشن ہو جائے گی۔ تفصیل اس کتاب کے بابوں کی۔ پہلے باب میں حروف تہجی کے قاعدے ہیں اور ہندی کے مصدروں کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ہندی مثلوں کا بیان ہے جو اہل اُردو کے محاورے میں آتی ہیں تیسرے باب میں مصدر اور لغات محاورہ کے معنیوں وکذا کا بیان ہے چوتھے باب میں اصطلاحات اور کنایات کا بیان ہے پانچویں باب میں ہندی صرف و نحو کا بیان ہے۔ چھٹے باب میں علم معانی و بیان کا ذکر ہے۔ ساتویں باب میں علم حساب کا بیان ہے۔ آٹھویں باب میں مراسلات و مکاتبات ہیں نویں باب میں دلی اور لکھنؤ کے ہر ایک فرقے کے محاورات کا بیان ہے" ۱۹ اس نمبر میں مہتمم اسعد الاخبار نے گلدستۂ انجمن کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں: "تحصیل قواعد زبان اُردو کی ایسی کتاب اب تک دیکھنے میں نہیں آئی مخفی نہ رہے کہ زبان اُردو کا عجب حال ہے اگرچہ یہ زبان اہل ہند کی بولی ہے مگر اس کی تحریر میں اکثر اشخاص عاری ہیں" مولوی منشی واجد علی خاں صاحب نے جن کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا حال ہندوستان میں ہر فرد بشر خصوصاً اہل علم پر اظہر من الشمس ہے ایسی کتاب تصنیف کی کہ گویا اُردو کی شاہ راہ میں ایک چراغ روشن کر دیا" ۱۲۱ د ۲۴ ستمبر ۱۸۴۹ء: اس نمبر میں کتاب پر تبصرہ مہتمم اسعد الاخبار کی طرف سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا انطباع حسب وعدہ دو مہینوں میں نہ ہو سکا۔ چند فقرے یہ ہیں" گلدستۂ انجمن۔ جو بہ اہتمام جناب مصنف کے طبع ہوتی تھی اور کئی بار اخبار ہذا میں اس کے اوصاف حمیدہ سے کچھ کچھ مرقوم ہو چکا ہے اب۔۔ اختتام کو پہنچی۔ ساری کتاب تیرہ سطر کے صفحے سے ۲۷ جز کی ضخامت ہوئی۔۔ پہلے باب میں حروف تہجی اور مصادر ہندی کا بیان ہے۔ دوسرے میں ضرب المثل ہندی تیسرے میں مصادر و لغات ہندی۔ چوتھے میں اصطلاحات و کنایات اردو پانچویں میں تذکیر و تانیث لغات عربی و فارسی و ہندی بہ موجب محاورہ اردو چھٹے میں اردو صرف و نحو۔ ساتویں میں علم معانی و بیان۔ آٹھویں میں حساب کے اصول و ضوابط۔ نویں میں علما و حکما و شعرا وغیرہ کے محاورات۔ دسویں میں آداب تحریر مراسلات و مکاتبات علی حسب مراتب

.. جناب مصنف کی ہمت اور سیر دلی یہاں تک ہے کہ ہرچند کہ ضخامت دونی ہوگئی لیکن ۔ وہی پہلی قیمت رکھی ہے۔ ۱۲۲ ۔ اس نمبر میں گلدستۂ انجمن سے ایک خط بہ طور نمونہ نقل کیا گیا ہے:

میر صاحب عالی قدر سلامت، ایک ہنڈی آنب (کذا) جو بہ کمال شفقت سیکشن کہار کے ہاتھ آپنے بھیجا ہے بہ سلامت پہنچے۔ رقعے میں جتنے دانے کہ شمار میں لکھے تھے وہ سب گنتی میں درست نکلے حق یہ ہے کہ کہار ہنڈی کو بڑی خبرداری سے لایا کہ ایک دانے کو بھی ان میں سے ضائع و خراش ہونے دیا سبحان اللہ کیا خوب آنب ہیں کہ ان کی شادابی و چاشنی کے بیان سے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور حلاوت و شیرینی کے بیان میں لبیسے لب وصل ہوجاتا ہے۔ اگر حوران بہشتی دنیا میں آکے ایک قاش اس کا کھائیں تو اس قدر محو لذت ہو جائیں کہ دنیا سے بہشت بریں کو ہرگز پھیر (کذا) نہ جائیں۔ سیندریا اگرچہ چاشنی دار و نہایت لذیذ ہے مگر بدل کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس لطف و ذائقہ کا آنب آج تک اس دیار میں کھانے میں نہیں آیا اور نہ کسی جگہ سراغ و نشان اس کا پایا۔ وصف میں اس کے دل میرا سرور ہے اور ادائے شکر میں اس نعمت کے زبان میری معذور ہے۔ حق تعالیٰ کی عنایت سے خانۂ شفقت آباد اور دل آپ کا ہمیشہ خرم و شاد رہے فقط زیادہ والسلام"

اس نمبر میں ایک قطعۂ تاریخ اختتام کتاب خود مصنف کی تصنیف سے شائع ہوا ہے۔ آخری بیت یہ ہے: سر و جد سے عقل نے دی نشاں جہاں میں ہے یہ گلشن بے خزاں (۱۲۵۹+۶)

مطلع العلوم و مجمع الفنون مصنفۂ منشی واجد علی خان: اس نام کی ایک کتاب مطبوعہ مطبع زبدۃ الاخبار[۵] اشتہار نمبر ۵۵ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اواخر دسمبر ۱۸۴۳ء میں یہ کتاب چھپ کر تیار ہوگئی تھی اور اس کی قیمت دس روپے تھی۔

دیوان نیاز بریلوی فارسی و اردو: ۸۶ میں سید جعفر علی بے تاب اکبرآبادی طالب علم مدرسہ اکبرآباد کی طرف سے یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ نیاز کا دیوان مطبع قطب الاخبار میں خط شیخ احمد حسین ناز (خوش نویس کامل شاعر شیریں زبان) اور بہ اہتمام منشی محمد امیر خاں چھپنا شروع ہوگیا ہے۔ ربیع الاول کے آخر تک قیمت ایک روپیا، ربیع الآخر تک سوا روپیا، اور اس کے بعد ڈیڑھ روپیا مقرر کی گئی تھی۔ ۹۵ میں اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ضخامت قریب ۷ جز کے ہے اور نصف کے قریب چھپ چکا ہے۔ ۱۰۲ (۱ جمادی الاخریٰ ۱۲۶۹ھ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک چھپ چکا تھا، لیکن قیمت صرف ایک روپیا تھی۔

سکندر نامہ اردو سید اعظم علی: ۱۳۱ میں یہ اشتہار مہتمم اسعد الاخبار کی طرف سے مندرج ہے: سکندر نامہ بہ قلم اردو (کرم خوردہ) جناب سیادت مآب عمدۂ منشیان شہر اکبرآباد سید اعظم علی صاحب

---

۵ ۱۸ میں یہ اطلاع ہے کہ چھپ کر تیار ہے "تمام علوم و فنون سے اس میں بحث کی ہے"۔

میر منشی سابق مدرسۂ سرکار جو ابتدا میں بہ مطبع اکبری واقع آگرہ چھپنا شروع ہوا تھا اور قریب بہ نصف وہاں چھپا، بعد ازاں اس مطبع میں آیا تھا، اب اختتام کو پہنچا۔۔ جس صاحب کو خریدنا منظور ہو تا عرصۂ یک ماہ فی جلد تین رپے۔۔ بعد یک ماہ فی جلد چار رپے قیمت ہو جائے گی، اور لطف کیفیت کتاب اس کے دیکھنے پر منحصر ہے۔ جناب مترجم نے گویا سحر کیا ہے کہ ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کیا ہے۔"

مفتاح التواریخ مصنفہ بیل ۱۸۴۹ء میں اس مشہور کتاب کے طبع اوّل کا اشتہار درج ہے جس کے اقتباسات یہ ہیں: "نسخۂ دل پسند مفتاح التواریخ جو اس مطبع میں منطبع ہوتا تھا اختتام کو پہنچ کر مجلد و مرتب ہو گیا۔۔ تیاری میں دیر جو واقع ہوئی اس کا سبب یہ ہے کہ۔۔ مسٹر طامس ولیم بیل صاحب ملازم محکمۂ صدر بورڈ کو اوّل تو یہ منظور ہوا کہ۔۔ ملتان کے حال پر تمام کریں سو فتح ملتان کے انتظار انتظار میں مسودے کا اتمام ملتوی رہا۔۔ بعد ازاں فہرست بنانے میں دیر لگی ورنہ یہ کتاب اوائل ۱۲۶۵ھ میں تمام ہو جاتی۔۔۔ اب تک اس کی قیمت فی جلد آٹھ رپے تھی، جس جس نے قیمت پیشگی داخل کی تھی اب ان کے پاس بھیجی جائے گی اور آیندہ سے فی جلد عہ قیمت ہوئی۔ اس کی تقطیع شیو رام پوری کاغذ کے تختے کے چار ورق ہیں اور ۲۵ سطر کا صفحہ ہے۔"

"تذکرہ گلشن بے خزاں مصنفہ حکیم قطب الدین باطن اکبرآبادی: اس ہیچ مداں نے ایک تذکرۃ الشعرا گلستان بے خزاں نام بہ جواب تذکرۂ گلشن بے خار تالیف نواب محمد مصطفیٰ خاں دہلوی شیفتہ تخلص کے تالیف کیا ہے اور طرز اس کی برعکس طرز گلشن بے خار کے ہے کہ اس کے مؤلف نے بہ راہ استغنا مزاجی کے شعرا کی تحقیر اور اکثر ترک اسم نویسی شاعران ذوی الاقتدار اور صفت اپنی اور اپنے دوستوں کی لکھی ہے اور اس احقر نے۔۔ سب کو حسب مراتب بہ تعظیم یاد کیا ہے۔۔ وے صاحب جن کی نظر سے۔۔ گلشن بے خار بھی گزر گیا ہوگا وہ جانیں گے کہ مؤلف تذکرہ ثانی نے مؤلف اوّل کے کلام کو کس منصفی و لطافت سے رد کیا ہے۔۔ اس کی ضخامت تخمیناً ۲۴ جزو اور قیمت فی جلد ۳ رپے ہوگی۔ جس کو اس کی خریداری منظور ہو خالی درخواست بلا زر ثمن بہ طور پوسپیڈ دکذا، بہ پتہ دکذا، و نشان تاج گنج محلہ کٹرۂ عمر خاں کے میرے پاس بھیج دیں جب اس کا چھپنا شروع ہوگا تو قیمت اہل درخواست سے منگوالی جائے گی۔"[119]

میرزا کلب حسین خاں ڈپٹی کلکٹر نادر تخلص : ۵۸ء میں مرزا غلام زین العابدین رئیس نامور شہر اکبرآباد کی طرف سے اشتہار مندرج ہے کہ خلاصۂ قانون مال وکلکٹری مصنفۂ میرزا کلب حسین خاں، (ان سے مجھے تلمذ سخن بھی حاصل ہے) جسے پہلی بار منشی عبدالرحیم خاں محرر محکمۂ عالیۂ کمشنری نے مطبع اسعد الاخبار میں چھپوایا تھا، اور جو تا اختتام طبع دو روپے اور بعد کو تین تین چار چار روپے کو بکی ہے، دوبارہ مطبع اسعد الاخبار میں زیر طبع ہے۔ لیکن اس بار قیمت تا اختتام طبع عہ اور بعد کو عہ مقرر کی گئی ہے۔ اس اشتہار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ منشی عبدالرحیم بھی اس کتاب کو کسی اور مطبع میں چھپوا رہے تھے اور انھوں نے اس کی قیمت تین روپے قرار دی تھی۔ ۱۱۷ء میں ایک اشتہار منشی عبدالرحیم خاں کی طرف سے اس مضمون کا درج ہے کہ کتاب توصیف زراعت مصنفۂ مرزا کلب حسین خاں جس میں تمام احوال متعلق دیہہ و حال پیداوار ہر ایک جنس و ترکیب کاشت غلہ و اصطلاحات و محاورہ مردمان سکنۂ دیہہ و خواص اکثر چیز ہائے روئیدگی و احوال بارش و نچھتر و اقسام اراضی وغیرہ اکثر امور متعلقۂ زمینداری و کاشتکاری درج ہیں" مطبع مطلع الاخبار آگرہ میں چھپی ہے۔ قیمت دو روپے ہے۔ ۱۲۳ میں نادر کے دو قطعے اختر کے متعلق مرقوم ہیں، جن کا ذکر آیندہ ہوگا۔ ۵۷ء و ۱۵۹۔ فضائل الشہدا مطبع اسعد الاخبار میں چھپ کر ضخامت قریب ۱۴ جزنی صفحہ ۱۱ سطر یکم جون ۱۸۶۸ء میں شایع ہوئی۔ قیمت آخر جون تک دو روپے بعد کو ۳ روپے قرار دی گئی تھی۔ ۱۵۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹ درخواستیں ۱۷ جون تک آ چکی تھیں۔

قاضی محمد صادق علی خاں اختر ۱۲۳: اگرچہ ضلع اٹاوہ مرزا کلب حسین خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کے اقدام سے رونق بے اندازہ رکھتا تھا مگر اب بسبب قدوم میمنت لزوم جناب حشمت و شوکت مآب قاضی محمد صادق علی خاں اختر جو وہاں کی تحصیل داری پر مقرر ہو کر تشریف لائے بحکم نور علیٰ نور شہر اٹاوہ کی کچھ اور ہی رونق ہو گئی ہے از آں جا کہ جناب قاضی صاحب کے اوصاف حمیدہ سے ہر دیار کے لوگ خوب واقف و آگاہ ہیں اس شہر کے رہنے والے ان کے تشریف لانے سے ایسے خوش ہوئے ہیں کہ گویا خضر ملا۔ میرزا کلب حسین خاں صاحب نے ان کے تشریف لانے اور عہدۂ تحصیل داری پر مقرر ہونے اور مکان کچہری کے آراستہ کرنے کی تاریخ مستخرج فرمائی اور سخن دانوں سے مورد احسنت ہوئے۔ قطعۂ تاریخ

تہنیت ورود ۔ شدہ جلوہ افروز شہر اٹاوہ بود آں کہ اہل سخن را سرآمد
نے نوبہار گلستان احساں کہ از فیض او در کف گل زر آمد

ہمہ تن لطیف و سراپا مصفا   کہ آئینہ آسا پُر از جوہر آمد
حلاوت بود در کلامش بداں ساں   کہ ہر لفظ شیریں تر از شکر آمد
قدومش سرور دل خستہ بادا   کہ گویند احباب او خوشتر آمد
فیوض حضورش ہمی خواہمت خاطر   پس از مدتے ایں تمنا برآمد
چو سال ورودش بجستم ز نادر   بگفتا باوج اپہ اختر آمد ۱۲۶۵ھ

قطعۂ تاریخ مکان کچہری بیت آخر: "تاریخ بنائے او بہ فکر نادر + آمد ز سر اوج بنائے اختر"
قطعۂ تاریخ منظوری عہدۂ تحصیل داری "منظور حکام" سے تاریخ نکالی ہے۔

مرزا حاتم علی مہر ۱۱۷: تاریخ تقرر عہدۂ منصفی از حافظ بلاقی اکبرآبادی متخلص بہ زر:

انگریز نے حکومت جب مہر کو عطا کی   چو تھے فلک سے عیسیٰ بولے خوشی مبارک
تاریخ زر نے لکھی ہے آب زر سے یوں ہم   اے مہر تجھ کو ہوئے یہ منصفی مبارک ۱۲۶۵ھ

امراؤ علی ہمدم ۱۴۰: ایک شخص امراؤ علی خاں نام عمدہ رئیس سکندرآباد ضلع علی گڈھ جو سید امام علی شاہ اکبرآبادی کے مریدوں میں سے تھے اور ۳۴ برس سے اپنے پیر کے مکان میں رہتے تھے ماہ ربیع الاول کی ۶ تاریخ پیر کے دن رہ گرائے عالم بقا ہوئے۔ یہ شخص بڑے ظرافت پسند تھے اور یاوہ گوئی میں ایک کمال بہم پہنچایا تھا۔ ان کی غزلیں دو دو مشہور ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اپنے وقت کے جعفر زٹلی تھے۔ سید نثار علی شاہ جو ان کے مرشد زادے ہیں انھیں حسب وصیت ان کے تاج گنج میں مرشد کی پائینتی دفن کیا، اور محفل سوم میں لالا چھوٹے مل رکذا، کو جو خان مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اور مزخرفات گوئی میں استاد سے بڑھ کر قدم رکھتے ہیں پگڑی بندھوائی۔"

سید محمد علی تپش اکبرآبادی: ۹۷ میں ۱۲ شعروں کی ایک فارسی غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ز خوش قدان سیہ چشم مدعا مطلب   دلا کنارہ ازیں آن و ز وفا مطلب

۹۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تپش نے فارسی زبان کے قواعد اور عروض و قافیہ پر ایک رسالہ اردو میں "مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت صدر دیوانی" کی نذر کے لیے لکھا تھا اور ان سے اس کی درخواست کی تھی کہ اسے چھپوا دیں۔ ۱۰۰ سے پتا چلتا ہے کہ معیار الشعرا کی ترتیب تہذیب انھیں کے ذمے تھی۔

سہ تشنہ عدہ اس شخص کی ایک غزل (۱۲ شعر) اسی زمانے کے ایک اخبار میں (جس کے ابتدائی ورق غائب ہیں اور جو غالباً قطب الاخبار آگرہ ہے) نظر آئی۔ مقطع میں تخلص کی جگہ نام ہے

ہے ارادہ یہ عشق درگا ہیں + جار ہوں آگرے سے متھرا میں
ہم کو کافی ہے چینی بھر پانی + بے حیا ڈوبتے ہیں دریا میں

عبدالرحمٰن خاں انصاف رئیس اکبرآباد : ۸۸ میں ۵ شعروں کی ایک غزل ہے۔

عشق کس کو ہے محبت کا اثر کس کو ہے — حضرت دل کہو اب درد جگر کس کو ہے
عذر بے جا نہ کرو وعدۂ فردا نہ کرو — آج کی بات کہو کل کی خبر کس کو ہے
اس کے نقاد ہیں بازارجنوں کے نقاد — سکۂ داغ جو پرکھے یہ نظر کس کو ہے

لالا بابو لال واثق رئیس نواح کالپی مقام کدورہ : قدسی کی مشہور نعتیہ غزل پر مخمس ۹ بند :

جو نہ ہوتا ترے اقدام مقدس کا ظہور — کشور دیں متین سے سبھی رہتے دور
حضرت حق کو ہوا کفر مٹانا جو منظور — ذات پاک تو در ملک عرب کرد ظہور الخ

قاضی محمد قاسم قلی خاں ناظر جہان آباد قاسم تخلص : ۱۰۲ میں ایک ہی مضمون کی ۴ رباعیاں عربی فارسی اردو اور بھاکھا میں ہیں :

ہے سخی کون زمانے میں بھلا تیرے سوا — تو نے تو حاتم طائی کو بھی شرمندہ کیا
ہر کوئی تیری سخاوت سے جہاں میں بے شک — رات دن تیری صفت از تہ دل ہو کرتا
داتا کو سنسار مان داتا تو ہیں چھوڑ — حاتم مارے لاج کے پڑت ہے تورے گوڑ
دماری پن کا تورے جگ مان بہت بکھان — ہرا جیٹھا کرت ہے سیر دو ہرا جوڑ

۱۰۵ میں ایک قصیدہ فارسی اور ۱۲۴ میں ایک غزل فارسی مرقوم ہے۔

شرح قصائد و قطعات انوری مصنفہ ابوالحسن مدرس اول درجۂ فارسی مدرسۂ آگرہ ۸۰ و ۸۵ : ۸۰ میں قصائد مع شرح کا اشتہار ہے ۸۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حل طلب مقامات کی شرح تھی۔ اور ۲ مئی سنہ ۱۸۴۹ء کو اس کا چھپنا شروع نہ ہوا تھا۔ ۱۸ جزو، ۱۷ سطریں فی صفحہ، قیمت ۴ روپے۔

شرح مقامات حریری مع متن مصنفہ کریم الدین مدرس دوم درجۂ اردو مدرسۂ آگرہ : مصنف نے اعلان کرایا ہے کہ اس کے چھپوانے کا ارادہ ہے۔

افسانۂ رنگین مصنفہ نواب امجد علی خاں رئیس قصبۂ دیوئی فتح پور ہسوا : پہلا اشتہار اس کا قصۂ رنگین کے نام سے ۱۰۱ میں چھپا تھا۔ ۱۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپریل سنہ ۱۸۴۹ء میں اس کا چھاپا تمام ہوا۔ "جس قدر دانی نے اس کی عبارت نثر اردو اور نظم قصائد کو دیکھا بہ دل و جان پسند کیا" فسانۂ عجائب کی طرز کا قصہ تھا۔ ضخامت ۱۰ جز قیمت ایک ماہ تک ایک روپیا۔

مثنوی فارسی مصنفہ منشی واجد علی خاں مہتمم زبدۃ الاخبار ۱۲۶ یہ مثنوی زبدۃ الاخبار میں چھپی تھی موضوع "شکایت گردش فلک" قمرالدین خاں نے اسے معیار الشعرا میں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

وفات منشی شیخ مصلح الدین عمدہ رؤسائے فتح پور سیکری مدرس مدرسۂ اکبرآباد : ۲۹ : سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۵ھ کو وفات ہوئی۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور فارسی دانی کی بہت تعریف

کی ہے۔ اسی نمبر میں ایک فارسی مثنوی مہتمم زبدۃ الاخبار کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کے آخری مصرع میں مادۂ تاریخ ہے: "آہ و افسوس و غم"۔ ۱۳۰ میں مہتمم اسعد الاخبار کی تصنیف سے دو قطعے فارسی میں ہیں پہلے قطعے کے دو شعر یہ ہیں: "چوں اوستادم از جہاں رفت ✤ مرا در فرقت خود کرد غمگیں
چو استاد شفیع جاں نواز ے ✤ بہ روا لے بزمے شفقت آگیں"

وفات شاہ سلیمان صاحب مہتمم تونسہ: کوہ نور کے حوالے سے لکھا ہے کہ ماہ صفر ۱۲۶۷ھ کی ساتویں تاریخ شب جمعہ کو بعد ادائے نماز تہجد "رہگرائے عالم قدس ہوئے" ۲۰۱ میں دو قطعات تاریخ وفات فارسی میں ہیں۔ پہلا مولوی حسین علی صاحب رئیس فتح پور ہنسوہ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا منشی نہال الدین، سررشتہ دار صدر الصدوری فتح پور کی تصنیف سے ہے۔

وفات حافظ محرم علی خیر آبادی: ۲۰۱ میں منشی نہال الدین کی تصنیف سے ایک فارسی اور ایک اردو قطعہ ہے۔ "ہوا ماہ غروب" سے تاریخ نکلتی ہے۔ ۱۲۶۷ھ۔

وفات شیخ خدا بخش کوتوال لاہور: ۱۸۸ میں بلاقی چند مترجم بورڈ پنجاب کی تصنیف سے ایک قطعہ تاریخ ہے ۱۲۶۷ھ سال وفات ہے۔

گلزار نسیم: ۱۳۵ میں مطبع اکبری کی طرف سے اس مثنوی کے متعلق یہ اشتہار چھپا ہے کہ ایک مصور نسخہ ولایتی کاغذ پر جس کی ضخامت بارہ جز کے قریب ہوگی، ۱۵ جنوری ۱۸۵۲ء تک طبع ہو جائے گا۔ قیمت ۳۱ دسمبر ۱۸۵۱ء تک ایک روپیہ اس کے بعد ڈیڑھ روپیہ۔ مثنوی کا نام گل بکاؤلی لکھا ہے۔

فوائد جلالیہ: عربی کے قواعد نحو فارسی نظم میں نہایت اختصار کے ساتھ عبدالشکور ساکن فتح پور ہنسوہ نے لکھے تھے۔ اس کے متعلق اطلاع ۱۳۲ میں ہے اور کل اشعار یہ اقساط ۱۳۳ تا ۲۰۶ میں چھپے ہیں۔ مصرع اول: "بعد تحمید الٰہ العالمین رب السما" ۱۸۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے چھپوانے کا ارادہ تھا۔

مثنوی عجیب: "منشی موہن لعل غالب نے سنگھاسن بتیسی ہندی کے قصوں کو اردو میں نظم کیا تھا ان کی وفات کے بعد راد ھا گوبند محافظ دفتر کمشنری آگرہ نے مطبع اسعد الاخبار میں اس کے چھپنے کا ارادہ کیا تھا۔ ۲۰۳ میں اس کا اشتہار ہے ضخامت ۲۵ جز کے قریب، قیمت قبل الطباع ایک روپیہ بارہ آنے، بعد الطباع ڈھائی روپے۔

رامائن ہندی: ۱۹ میں اشتہار ہے کہ رامائن خط ناگری جس کی قیمت ۳ روپے ہے مطبع اسعد الاخبار یا مطبع زبدۃ الاخبار سے مل سکتی ہے۔

محمد رضی الدین خاں بہادر صدر الصدور کول ۱۱۰: "منشی درگا پرشاد نشاط رئیس سکندرآباد نے جناب ممدوح کے ضلع علی گڑھ کی عدالت دیوانی میں اجلاس فرمانے کی تاریخ نہی ہے

فارسی میں ہو، لفظ "خداترس" سے تاریخ نکلتی ہے۔

شبر علی خاں عاجز رئیس مراد آباد: عاجز کا کلام فارسی (قصیدہ) ۱۵۳ اور ۱۵۵ میں ہے۔

قمر الدین خاں قمر و سید حسین شاہ بخارائی واصف متیم کول: ۱۰۶ " ان دونوں جناب .. واصف .. نے اپنی ایک پانچ شعر کی غزل میرے پاس بھیجی .. کہ میں بھی اس زمین میں غزل کہوں ہرچند کہ فکر سخن عالی طبعوں کا کام ہے، مجھے اس کوچے سے کیا آشنائی ہے۔ مگر بہ پاس خاطر .. میں نے بھی غزل کہی" قمر کی غزل کے چند شعر یہ ہیں،

گنج در ریخت بہ قرباں تو گل از شبنم — یکے از نذر گذاران تو گل از شبنم
گرمی حسن تو تنہا جگر لالہ نہ سوخت — گشت غرق عرق از شان تو گل از شبنم
گل ز شبنم بہ چمن گاہ نہ دست است قمر — خامہ ات ریخت بہ دیوان تو گل از شبنم

استخراج نام حضرت علی ۱۵۶: سید عباس علی مصنف سنبھل رئیس کول کی اشعروں کی ایک .. مثنوی جس میں ایک ایسا قاعدہ نکالا ہے کہ اس پر عمل کرکے جس چیز کے نام سے چاہو علی کا نام نکال لو

مظہر العجائب مصنفہ سید فخر الدین احمد ریڈرن نویس محکمۂ صدر آگرہ: ۸۸ و ۹۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فن طب میں بہ زبان اردو لکھی گئی تھی اور زیر طبع تھی، قیمت دو روپے۔

مشاعرۂ اکبر آباد ۸۰: ۹ نومبر [illegible] کی شب کو "منشی سید ابوالحسن صاحب مدرس اول درجۂ فارسی مدرسۂ آگرہ کے مکان پر محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ .. کلام شعرا .. معیار الشعرا .. میں مطبوع ہوگا"

مشاعرۂ اکبر آباد (معیار الشعرا: ۱۰۸، ۲۵ جون [illegible]) پرسوں شب کو مشاعرہ ہوا۔ اکثر شعرائے اکبر آباد اور بعض سخنوران عجم تشریف لائے .. وہ شائقان سخن جو مشاعرے میں تشریف نہ رکھتے تھے بہ ملاحظۂ معیار الشعرا جو اس مطبع میں چھپتا ہے اور سید مدد علی تپش اس کی تہذیب و ترتیب کا اہتمام کرتے ہیں محظوظ ہوں گے۔ ہر شاعر کی غزل منتخب ہو کر لکھی جاتی ہے اور قیمت اس کی چار آنے ماہوار ہے ... سید مدد علی تپش کے پاس بہ محلہ زین خانہ یا بہ مطبع ہٰذا درخواست بھیجیں۔

مشاعرۂ اکبر آباد ۱۳۴: " بہ محلہ پیپل منڈی ایک اور مشاعرہ مقرر ہوا ہے، اور شہر کے نامی شعرا سب اس میں تشریف لے جاتے ہیں۔ میر مشاعرہ کا ارادہ ہے کہ طرح کی غزلیں پندرھویں دن چھپوا دیا کریں اور چار آنے ماہوار اس کی قیمت رکھیں۔ .. ناظرین بنسی دھر کے مکان پر جگت نرائن کے پاس رقعہ بھیج کر منگا لیں"

خلاصۂ قانون دیوانی مولفہ طفیل احمد وکیل محکمۂ صدر دیوانی: ۹۵ میں اس مضمون کا اشتہار
ہے کہ مطبع اسعد الاخبار سے اپریل ۱۸۵۲ء تک چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ قیمت قبل انطباع آٹھ اور
بعد انطباع دس روپے۔

خلاصۂ سررشتۂ مال از محمد تقی الہ آبادی: ۱۰۴ قیمت جون ۱۸۵۲ء تک عہ بعد کو ۔

خلاصۂ قوانین دیوانی مسمّی بہ مسائل قوانین مولفۂ لالہ ایسری پرشاد منصف، لالہ چندی پرشاد منصف
و لالہ نند بہاری لعل وکیل: ۱۲۱ و ۱۲۵ مطبوعۂ مطبع اسعد الاخبار، ضخامت ولایتی کاغذ پر ۲۰ جز قیمت ۵ روپے

۱۴۲: اس مضمون کا اشتہار کہ سید عباس علی منصف سنبھل ضلع مراد آباد نے کتاب فیصلجات صدر کا
جو بموجب آئین ۱۲ ۱۸۴۳ء لکھے جاتے ہیں ایک خلاصہ .. تیار کیا ہے .. ضخامت .. قریب ۲ جز کے ہوگی
اب .. اس کو چھپوایا چاہتے ہیں اور قیمت اس کی ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے"

۱۵۵: مطبع اکبری کی طرف سے اشتہار ہے کہ سید قربان علی وکیل عدالت صدر دیوانی نے قانون دیوانی
ترتیب دیا ہے جس میں ڈاک کے قانون کا خلاصہ بھی شامل ہے مطبع مذکور میں چھپے گا۔ ضخامت ۱۲
یا ۱۴ جز قیمت قبل انطباع عہ سے بعد کو للعہ۔

۲۰۴: محمد عبدالکریم کی کتاب بندوبست پرگنہ جات جب مختار ریاست بھوپال کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے
مصنف کو سو روپے دیے۔

گلستان: ۱۱۹ و ۱۲۰۔ ایران سے ایک صاحب جلیل القدر کی ایک صحیح نسخہ مطبوعۂ طہران اپنے ساتھ لائے تھے مطبع اسعد الاخبار نے
اس کی نقل ۱۸۵۲ء میں چھاپنی شروع کی تھی جو نومبر ۱۸۵۳ء میں تمام ہوئی ضخامت بارہ جز، قیمت عہ روپیہ، باوجود اس کے
کہ اشتہار میں یہ لکھا تھا کہ قیمت بعد انطباع بڑھ جائے گی، ۲۴۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ جنوری تک یہی قیمت تھا
یہ علم نہیں کہ اس کے بعد قیمت میں اضافہ ہوا یا نہیں۔

تفسیر عزیزی مطبوعہ لکھنؤ ۲۰۵: اس کی قیمت ۱۲ روپے تھی۔

کتب فارسی مطبوعۂ کلکتہ ۹۸: "اگرچہ سنگین چھاپے کی حسن لطافت (کذا) و صفائی واضح ہے مگر ان کتابوں کی بھی
خوبی، اور قیمت ایسی ارزاں ہے کہ چھاپہ سنگین کے نصف سے بھی کم ہے" مجموعۂ نعمت خاں عالی مشتمل بر جنگ نامہ
و حسن و عشق و وقائع حیدر آباد ۱۲، سہ نثر ظہوری مع مینا بازار و پنج رقعہ ۱۲، توقیعات کسریٰ ۱۲، مجموعۂ مشتمل بر
مشعب تعریف زبدہ ۸، رقعات عالمگیری ۶، وقائع حیدر آباد ۵، مجموعۂ مشتمل بر نو طرز مرصع ترجمۂ عبارت

تواریخ نبوی: ۹۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر الدین خاں کا ارادہ تھا کہ وہ تاریخ جو اسعد الاخبار میں بہ اقساط شائع ہو رہی

بعد اختتام کتاب مکمل میں چھپوائی جائے، اور اس کے دیباچہ میں مستقل خریداران اسعد الاخبار کے نام بھی لکھے جائیں تاکہ ان کا نام "ابد الدہر صفحۂ روزگار پر قائم و یادگار رہے"۔ پتا نہیں کہ یہ کتاب چھپی یا نہیں۔ اس تاریخ کی وجہ سے بہت سے لوگ اسعد الاخبار کے پرانے پرچوں کی تلاش میں رہتے تھے، یہاں تک کہ انھیں دوبارہ چھپوانا پڑا تھا۔

پادری جی جی مور مترجم قوانین گورنمنٹ گزٹ آگرہ: ۱۲۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ ستمبر ۱۸۴۹ء کو ان کی وفات ہوئی انھوں نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ اُن کی جگہ لیڈلی صاحب کے سپرد ہوئی۔ ۱۰۷ میں جی پی لیڈلی صاحب بہادر مترجم گورنمنٹ گزٹ آگرہ کی طرف سے اشتہار ہے کہ گورنمنٹ گزٹ کی قیمت ۱۸۴۹ء سے للعہ سالانہ ہے، لیکن یہ تجویز قرار پائی ہے کہ سوائے رخصت اور تقرر بعہدہ داران متعہد و غیر متعہد و اشتہارات زائدہ کے نقل گزٹ کی بجنسہ بہ چھاپہ سنگ چھپوا کر فروخت کی جائے اور قیمت فی ماہ آٹھ آنے مقرر کی ہے۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا۔

مولود شریف مؤلفۂ مولوی محمد حیات علی صاحب افضل علمائے فرقۂ امامیہ: ۱۹۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد صفدر علی کو ... نے مطبع اسعد الاخبار میں چھپوا کر وقف کر دیا تھا۔

نہر فتح پور سیکری: مسٹر جیکسن کلکٹر و مجسٹریٹ آگرہ نے فتح پور سیکری میں مرزا احسان علی بیگ تحصیل دار کے اہتمام سے ایک نہر جاری کرائی تھی۔ قطعۂ تاریخ نوشتۂ واجد علی خاں ۱۱۰ میں اور مرزا محمد علی منصف فتح پور سیکری اور مرزا غلام زین العابدین عابد اکبر آبادی کے قطعات تاریخ ۱۲۳ میں مندرج ہیں۔ عابد کے قطعۂ تاریخ کی آخری بیت یہ ہے:

"ہے سر حرف جیکسن پھر دیکھ سیل رحمت کی نہر جاری ہے" ۱۲۶۵ھ

قرآن مجید مع ترجمۂ اردو و فارسی ۱۰۱ اور ۱۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ "عالم العلّامہ... قاضی القضاۃ سید ... خان بہادر" نے مطبع حسینی آگرہ میں قرآن مجید کا ایک نسخہ بڑی تقطیع پر چھپوایا تھا، جس میں شان نزول اور فوائد مولوی عبد القادر وغیرہ کے علاوہ فارسی اور اردو کے ترجمے شامل تھے۔ اس کی قیمت بعد انطباع ... مقرر کی گئی تھی۔ اس کا اشتہار فارسی زبان میں علامۂ زماں مولوی سید محمد بدر الحسن صاحب سل خوان کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

اسعد الاخبار میں جو نظمیں شائع ہوئی ہیں، ان میں پنج آہنگ کے منظوم اشتہار کے سوا کوئی قابل اعتنا نہیں۔ اس کی اہمیت بھی اس بنا پر نہیں کہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، بلکہ اس سبب سے ہے کہ غالب کی ایک مشہور تصنیف سے اس کا تعلق ہے اور غالبًا خود غالب کی لکھی ہوئی ہے۔ شاعروں سے متعلق جو اطلاعات اس اخبار میں ملتی ہیں وہ محض اتفاقی طور پر ملی ہیں۔ کتابوں کے بارے میں جو کچھ نقل ہوا ہے وہ زیادہ تر اشتہارات سے ماخوذ ہے۔ یہ خبر نہیں کہ اشتہارات مفت چھپتے تھے یا ان کی اجرت لی جاتی تھی۔ اس زمانے میں پتھر کا چھاپا ٹائپ کے چھاپے سے بہتر سمجھا جاتا تھا اور اس کے مطبوعے کی فوقیت تسلیم کی جاتی تھی (ملاحظہ ہو کلام اللہ مطبوعۂ لکھنؤ کو دیکھ کر پسند کیا جاتا تھا ۱۴۱)۔ کتابوں کی قیمت آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی تھی، لیکن ٹائپ کی چھپی ہوئی کتابیں نسبتًا سستی ہوتی تھیں۔ عمومًا یہ کوشش کی جاتی تھی کہ قیمت کتاب چھاپے جانے سے قبل ہی وصول کر لی جائے۔ بیشتر کتابوں کے اشتہار میں یہ لکھا ہوا ہوتا تھا کہ بعد انطباع قیمت بڑھا دی جائے گی۔ لیکن ہمیشہ اس پر عمل ہوتا تھا یا نہیں، یہ مشتبہ ہے۔

۱۸۴۷ء میں آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور اس کی اہمیت آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اس زمانے میں یہاں بہت سے مطابع تھے، اور متعدد اخبار نکلتے تھے جن میں سے کم از کم ایک انگریزی میں تھا۔

قمر الدین خاں ایک لفٹنٹ گورنر کی تعریف میں لکھتے ہیں (۱۰۶) "خصوصاً اہل مطابع تو ان کے حسن توجہ اور التفات کے از بس ثنا خواں ہیں اور یہ انھیں کی قدر شناسی کے سبب سے ہے کہ اس شہر میں کئی مطبع جدید قائم ہوئے ہیں، کیوں کہ ہر ایک مطبع کی چھپی ہوئی کتاب بہ قدر دانی تمام خریدتے ہیں اور اپنے حضور میں طلب فرماتے ہیں، اور جمیع مطابع کے اخبار بھی لیتے اور جناب محمد اسمٰعیل منشی محکمہ لفٹنٹی سے ان کا خلاصہ کروا کے اپنے حضور منگواتے ہیں۔"

اس زمانے کے آگرہ میں جو مطابع تھے، ان میں سے حسب ذیل کا ذکر اسعد الاخبار میں ہے: مطبع اسعد الاخبار جس میں اسعد الاخبار اور معیار الشعرا چھپتے تھے، پہلے پھلتی بازار میں تھا، بعد کو اسی کے متصل دوسری جگہ منتقل ہوا (۱۰۸)، اس کی ابتدا ایک کل سے ہوئی تھی، لیکن، اس کی توسیع اس حد تک ہوئی تھی کہ ستمبر ۱۸۴۹ء پانچ کلیں آگئی تھیں (۱۰۹)۔ اس مطبع میں اپنی کتابوں کے علاوہ باہر کی کتابیں بھی چھپتی تھیں اور بقول قمر الدین خاں یہ مطبع "ناموراعصار و دیار" اور "دوستوں کو خوشی کا موجب اور دشمنوں کو رشک و حسد کا باعث" تھا۔ مطبع زبدۃ الاخبار، مطبع قطب الاخبار (مطبع قادری کا بھی نام آیا ہے، لیکن غالباً مطبع قطب الاخبار کا دوسرا نام ہے۔ مطبع اکبری، مطبع مصدر النوادر (غالباً آگرہ ہی میں تھا)، مطبع جام جمشید غالباً جنوری ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ جاری ہوا۔ اس کے مالک بابو شیب چند ناتھ تھے جن کا ایک مطبع اسی نام کا میرٹھ میں بھی تھا۔ مطبع حسنی قاضی القضاۃ میر ولایت حسین خاں بہادر کے مکان میں تھا۔

ذیل کے اخباروں کے نام تینوں سال کے پرچوں میں ملتے ہیں: اخبار الحقائق و تعلیم الخلائق دہلی اردو اخبار، زبدۃ الاخبار آگرہ، مجمع الاخبار بمبئی، نزہت الارواح و اخبار النواح آگرہ (اوائل ۱۸۴۹ء سے جاری ہوا، مہتمم حکیم جواہر لعل تھے "عجب کیفیت اور لطف و خوبی سے مطبوع ہوتا ہے")، قطب الاخبار آگرہ (اواخر دسمبر ۱۸۴۸ء سے جاری ہوا۔ اس کے مہتمم منشی محمد امیر خاں ہیں اور وہ بہت شائستگی اور تہذیب سے چھاپا جاتا ہے)، آگرہ مسنجر، قران السعدین، انگلشین، جام جمشید میرٹھ، دہلی گزٹ۔

۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء کے پرچوں میں: سلطان الاخبار، کلکتہ، عمدۃ الاخبار بریلی، مطلع الاخبار حقیقت (ایک جگہ معصلیث)، انڈین ٹائمس۔

۱۸۴۶ء اور ۱۸۵۰ء: کوہ نور لاہور (۲۰ جنوری ۱۸۵۰ء "جنوری ۱۸۵۰ء کی چودھویں تاریخ سے منشی ہرسکھ رائے کے اہتمام سے جو پیشتر جام جمشید میرٹھ کے مہتمم تھے، جاری ہوا ہے۔"

از آں جاکہ پنجاب اور کشمیر اور کابل کی خبروں کے اکثر لوگ شائق رہتے ہیں، اب اس اخبار کے ذریعہ سے وہاں کے حالات .. بے دقت دریافت ہوجایا کریں گے اور اخبار انگریزی سے ترجمہ نہ کرنا پڑے گا .. مہینے میں چار بار پیر کے روز چھپا کرے گا۔ قیمت عہ سالیانہ اور بہ رسم از دانش الخ) عہ .. چھ ورق کا اخبار ہوا کرے گا" زبدۃ الاخبار، مالوہ اخبار، ٹیلی گراف اور کوریر بمبئی،

صرف ۱۸۶۵ء : مفتاح الاخبار، فوائد الناظرین، خیرخواہ ہند مرزاپور، رئیس الاخبار مدراس، فرینڈ آف انڈیا، بنارس ریکارڈ، ٹیلی گراف (ایک جگہ تیلگریف، غالباً بمبئی کا ٹیلی گراف اور کوریر سپکٹیٹر (اسپکٹیٹر؟)، اخبار میرٹھ بمبئی اخبار، شملہ اخبار

صرف ۱۸۶۶ء : باغ و بہار، اعظم الاخبار، ہند و انٹلیجنسر، محتشم الاخبار جاورہ (۱۴ رجب ۱۲۶۶ھ ان دنوں .نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر والی جاورہ نے ایک مطبع سنگین قائم اور محتشم الاخبار دو ورقہ بہ عبارت فصیح اردو جاری کیا ہے ۔منشی مرزا نصراللہ بیگ .. مہتمم .. قیمت بارہ روپے سالیانہ) ، انگلش کرانیکل کلکتہ، انڈین میں؟ نزہت الاخبار (نزہت الارواح؟) اخبار گلشن، ہرکارہ بنگال

۱۸۶۷ء : صادق الاخبار، آفتاب عالم تاب، سٹیزن، دریائے نور لاہور، ہرکارہ، جام جمشید آگرہ (۶ جنوری ۱۸۵۱ء کے پرچے میں اشتہار ہے کہ جنوری ۱۸۵۱ء سے ہر ہفتے سنیچر کے دن زیر اہتمام بابو شیب چندر ناتھ آگرہ سے ۸ صفحوں پر شائع ہوا کرےگا ۔قیمت سالانہ پیشگی ۹ روپے)

ے اگرہ بہ قرن دتا سی عہ جس کے نیچے نشان ہے اس اخبار سے متعلق یا تو علم ہے کہ انگریزی میں تھا یا قیاسا ایسا سمجھا گیا ہے۔ ۳ محرم ۱۲۶۶ء کے پرچے میں نام آیا ہے۔ یقیناً ۱۲۶۶ء کے قبل سے وجود میں تھا للعہ سب سے پہلے ۱۰ موم ۱۲۶۶ء کو اس کا ذکر آیا ہے۔ یقیناً ۱۲۶۶ء کے قبل سے وجود میں تھا۔ صہ یہ مشتبہ ہے کہ اس نام کے اخبار تھے بمبئی اور میرٹھ میں اخبار تھے، لیکن نام کچھ اور ہوگا۔ لہ اسعد الاخبار کے ساتھ اسی تقطیع پر ایک اخبار ۸ صفحوں کا ہے جس کے ابتدائی ۴ صفحے غائب ہیں، اس کے مہتمم کا نام امیر خاں تھا اور یہ مطبع قادر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری دو صفحوں میں احمد خاں سرفی کی فارسی غزل اور ولی اللہ صبا، رضا علی، مہوش محمد یار خان تخار، نایاب نیاز محمد خاں، نثار، زیرنا، دریر، ذکی منشی متخلص بہ وحشی، لالہ چھوٹے لعل کی طرحی غزلیں اردو میں ہیں۔ ۱۸۵۳ء میں جو خبر اس اخبار کے حوالے سے درج ہے، اس کے ساتھ یہ تصریح نہیں کہ جام جمشید آگرہ سے ماخوذ ہے یا جام جمشید میرٹھ سے۔ لہ مترجم و محشی قرآن مطبع قادری میں بھی چھپا تھا۔ ۱۵۔

اُس عہد کے اخبار نویسوں میں جس قسم کی نثر رائج تھی اور جس کے نمونے اسعد الاخبار میں ملتے ہیں اس کی کیفیت یہ ہے:

(۱) اخبار نویسوں نے عام طور پر مقفیٰ نثر کو ترک کر دیا ہے اور نثر عاری لکھتے ہیں۔ گلدستۂ انجمن کا ایک خط جو اسعد الاخبار میں چھپا تھا اور جسے میں نے بھی نقل کیا ہے بڑی حد تک نثر مقفیٰ میں ہے۔ اس زمانے میں جو لوگ خط پردازی کے مدعی تھے وہ اسی طرح لکھتے تھے۔ یہ خیال کہ نثر مقفیٰ تکلف محض ہے کم لوگوں کے دماغ میں آیا ہوگا۔ اخبار نویسوں کا نثر عاری کو اختیار کرنا صحت بی بی ست از بے چادری کا معاملہ ہے۔

(۲) اسلوب بیان پر انگریزی کا اثر مطلق نہیں گو انگریزی کے الفاظ زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔

(۳) اسلوب بیان پہ فارسی کا اثر اس حد تک نمایاں ہے کہ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملے کا جملہ فارسی زدہ کر لیا:

الحمدللہ کہ کار گزاران مطبع سعد الاخبار و طبع کنندگانِ حائل فیض آثار چمنستان ثلث اول کی بہ چشم ادب سیر کر کے گلزار ہمیشہ بہار ثلث دوم تک جا پہنچے:

(۴) مقفیٰ جملے متروک ہیں لیکن ہم قافیہ اسماء و صفات متروک نہیں، اور ان سے اکثر محض آرائشِ کلام مقصود ہوتی ہے: اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ، حالات فیض سمات، طرزِ خوب چھاپۂ مرغوب، صفحۂ زیبا گلدستۂ گلستانِ صدق و صفا، لشکر ظفر پیکر کرامات ظاہر و اور برکات باہرہ۔

(۵) کسی لفظ کے ساتھ اس کا ہم معنی لفظ اکثر بے ضرورت استعمال کیا جاتا ہے: شائقان حکایاتِ عجیبہ و مشتاقان قصص غریبہ۔

(۶) تعظیمی اور تعریفی الفاظ اس قدر زیادہ استعمال ہوتے ہیں کہ لکھنے والے پر درباری شاعر کا گمان ہوتا ہے۔ گورنر جنرل کی طرف اکثر ان لفظوں میں اشارہ کیا جاتا ہے "نواب معزالیہم" "جناب محتشم الیہ" واجد علی شاہ کی بیماری کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے: "مزاج بدگمانِ سلطانی بیمار ہے" ضلع علی گڑھ کے ایک رئیس کی شان میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں: خان صاحب والا شان عمدۃ خوانین بلند مکان امیر الامرائے زمان فخر رؤسائے ہندوستان گل سر سبد دیارِ اسلام، مشتاق طواف بیت اللہ الحرام، عاشق زیارت روضۂ منورہ حضرت رسولِ انس و جان، اعنی جناب محمد داؤد خاں سلمہ الرحمٰن۔

(۷) اکثر اخبار نویس اداے مطالب پر قادر ہیں لیکن ان کی نثر عموماً بے رنگ اور بے جان ہوتی ہے۔ بعض کی نثر میں تعقید اور کہنگی اوروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ واضح رہے کہ جب ایک چھاپہ خانہ جدید

کہ روکش نگارخانہ چیں ہے ساتھ نام جام جمشید کہ واقعہ میں خبر دینے والا ہر عجیب و غریب کا ہے ۔ بیچ مقام ۔۔ اکبرآباد کے اس صحیفت بابو شب چندر ناتھ غریب نے تیار کیا ہے اور اس میں کتابیں ۔۔ اور اخبارات اطراف منطبع ہوں گے بالفعل واسطے رفاہِ خاص و عام کے قیمت اخبار کی ۱۲ ر ماہواری کہ جس کے نو روپے سالیانہ ہوتے ہیں اور بہ شرط پیشگی دینے کے بہ حساب ۱۰ ماہیانہ کے کہ جس کا سات روپیا سالانہ ہوتا ہے علاوہ خرچ ڈاک کے کہ وہ ذمے خریدکنندۂ اخبار کے ہے مقرر کی گئی ۔۔ اور وہ اخبار بھرے ہوں گے ساتھ اچھی اچھی خبروں کے اور صحیح صحیح احوالوں کے کہ جس میں مو لغو اور جھوٹ نہ ہوگا بلکہ بے اختیار جی سامعت اس کے لگے گا"

ذیل کے انگریزی الفاظ اسعد الاخبار میں ملتے ہیں :

براعظم، ملک اور قوم : فرنگستان (یورپ کے لیے ہر جگہ یہی مستعمل ہوا ہے)، فرنگی، امریکہ (جزیرۂ امریکہ میں مکسیکو) امریکا (دو کے ساتھ بھی ممالک متحدہ کے لیے)، انگلستان (ملکۂ وکٹوریا کی مہر میں یہی نام تھا) انگلنڈ، انگلستانی انگریز (" جتنے انگلستانی انگریز ۔۔ سپریم کورٹ کے محکوم تھے" زبدہ) جوانان انگلستانی (زبدہ) انگلش انگلش بڑے فہمیدہ ۔۔ جیسا سلطان الاخبار)، عہد دولت انگلشیہ، تاجران انگلشیہ، انگریز (" انگریز عدالت حسب مہر کو عطا کی" ، سرکار انگریز بہادر سرکار انگریزی، انگریزی بولی، انگریزی ... (النواح)، انگریزی سوداگر (النواح)، افسر انگریزی (اردو) فرانس، فرینس، فرانسیس (فرانسیسی کہیں ... آیا)، فرنچ (صرف ایک جگہ کمپنی فرنچ ایکو سٹرنر)، روس، پروشیہ، اسپین، ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک ... اسکاٹ لینڈ، ... لنڈ (شاہی مہر میں بھی اسی طرح) ارلنڈ، رعایائے روس، اسٹریا، اسٹریہ ... ت کے ساتھ بھی)، پنیا، کرانی (" اکثر انگریز ولایتی و کرانی صرف بہ شوق تماشا کچہری میں آتے" اسعد ... ب اور لقب : ملکۂ معظمہ کوئین وکٹوریا، زار یعنی شہنشاہ روس، ڈیوک، مارکوش، مارکوئیس، ارل، ... ٹ آنریبل گورنر جنرل بہادر، مراتب باتھ (اردو)، لیڈی صاحبہ (گورنر جنرل کی بی بی کے لیے ... ہوا ہے)، لارڈ (دو کے ساتھ بھی)، شاہزادۂ والا تبار پرنس البرٹ، آنریبل کمپنی بہادر ۔ ×

... مذہب سے متعلق : پوپ یعنی پادری اعظم، پادری، رومن کا تھلک، گرجا ۔ گرجا گھر ۔

... سے متعلق : کمانڈر انچیف (کمانڈر کی جگہ کمندر اور کمنڈر بھی)، جرنیل، جرنل، برگیڈیر جنرل (برگیڈیر کے ساتھ بھی)، برگڈیر (دو کے ساتھ بھی)، برگیڈ (... النواح)، میجر جنرل، اجیٹن جنرل، صاحب اجیٹن ... ٹ، کرنیل، میجر، کپتان، گذشہ کپتان (" گذشہ کپتان لوگ ۔۔ پیمایش کرتے ہیں کہ جہاں مناسب ہو ... ن پڑے" النواح) لفٹنٹ (دو ت کے ساتھ بھی)، کمان افسر، افسر کمان، کمان افسری ... میدان (یہ لفظ کسی انگریزی فوج کے سردار کے لیے استعمال نہیں ہوا)، سارجنت، سارجن (اردو) ... پ سنتری، کمپنی، کنپنی (دوت اردو) پلٹن (دوت، پلاٹن (الحقائق)، رسالہ باری گارڈ (باڈی گارڈ؟)

گارد، سپاہیاں گارڈ، افواج کنجنٹ (کنٹنجنٹ) سپرمینا (کوہ نور) سپرمنیر (مطلع)، رجمٹ، رجمنٹ (ٹ اردو) ونگ رجمنٹ، بیٹری، میگزین (میگزین کے چھکڑے "ایک میگزین میں ۴۰ من بارود") یعنی ٹرین (ٹ) پانسو سوار ... رسالے سے بڑے ہی ؟ سیج پڑیں یعنی قلعہ کشا توپ ... ملتان کو آتے ہیں" مسکوٹ، مسکوٹ گ آریگلر رجمنٹ، اور گیولر، رسالہ چہارم اریگلر، لام ٹوٹنا (زبدہ والنواح ذ۔ لام کو صاحب نوراللغات نے انگریزی لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا لفظ بگڑ کر لام ہو گیا) بم کا گولہ، پریٹ، احاطہ کانٹین، برشتہ ملٹری فنڈ، کمپو، کمپنو ۔ ۔ کمپ (ذ اردو) کنپ، کیمپ (کیمپ ایک آدھ جگہ) کورٹ مارشل (ٹ اردو) کمیدانی، کسریت کا گودام (ذ اردو)، پلٹن (ت سے بھی ٹ)، پلاٹن (الحقائق)، لفٹنٹ، لفٹنٹ

لین (ٹ سپاہ کو بہ مجبوری اپنی لینیں چھوڑنی پڑیں" اردو) ہم کو شکست ہوئی
کورٹ مارشل (ٹ اردو) "کورٹ (فوجی جرائم کے لیے "کورٹ واسطے تحقیقات کے مقرر ہوئی ہے" اردو)، گو

انجینیر (ذ اردو)

حکومت کے ادارے، قانون اور سرکاری ملازمتوں سے متعلق: گورنر جنرل (ان کے لیے لات صاحب، لاٹ صاحب اور لاٹ صاحب بھی مستعمل ہوا ہے)، لفٹنٹ گورنر (لفٹنٹ کی طرح لکھا ہے) محکمہ لفٹنٹ گورنری، لفٹنٹی گورنری آثرہ، گورنر بمبئی، کمشنر، کمشنری، کلکٹر (کلکٹر) اور کلکٹر (دیبہ کئی جگہ ہے۔ نہ معلوم محض کاتب کی غلطی ہے یا اس زمانے میں کچھ لوگوں کی زبان پر اس طرح بھی تھا۔ ایک جگہ یہ الفاظ ہیں، ریاست کی خبر ہے: انگریزی کلکٹر تم پر مقرر کروائیں گے)، ارباب پارلمنٹ، صدر بورڈ، احتساب بورڈ (بورڈ ذ) ڈپٹی کلکٹر، صاحبان سول یعنی ارباب قلم، سرکار کمپنی بہادر، بورڈ اینڈ منسٹریشن، (ذ اور ت کے ساتھ) مجسٹریٹ (ٹ و ت کے اختلاف کی ہر ممکن صورت)، مجسٹریٹ (دیبہ بھی کئی جگہ ملتا ہے، پتا نہیں کہ کاتب کی غلطی ہے یا یہ تلفظ بھی رائج تھی)، گورنمنٹ، گورمنٹ (دونوں ت کے ساتھ بھی)، کاغذ اشامپ،

صاحبان کونسل نیچر، ارباب کونسل لندن، انڈیا ہوس کورٹ اف ڈائرکٹرس، کورٹ دایرکٹرس، کورٹ ڈائرکٹرس ؟، کورٹ آف ڈائرکٹرس (ذ کے ساتھ بھی ایک جگہ ہے)، سلیکٹ کمیٹی، ارباب کونسل ولایت

گورمنٹی (ت کے ساتھ، کمیٹی کے دن (مال کمیٹی کے دن پیش کیا جائے تا جروں منت گورنمنٹ) پنشن، کلکٹری (ت کے ساتھ بھی قانون اور عدالت، کمشنری، صدر بورڈ، جنرل آرڈر (گورنر جنرل کا، کمشنر کلکنی، گورنمنٹ گزٹ کے خلاصے میں کمشنر کشن، سرکیولر، سرکولر، سرکلر (زیادہ سرکیولر) سپریم کورٹ، کورٹ، رپورٹ، رپوٹ (دیروہ ہدوٹ)، رپورٹ نویس، ڈکری نویس، ڈگری (او، ڈکری) اس خبار میں ڈگری ایک جگہ کے ساتھ لکھی ملتی ہے۔ غالباً صرف ڈگری مروج تھا، صاحب رجسٹر (جسٹرا اہم تی بمعنی منشی صدر، رسید منشا، مہر (دونوں اس کمیٹی کے لیے جو موراج کے مفت ...کے واسطے مقرر ہوئی تھی)، ڈپٹی کلکٹر (وہی اور ڈپٹی بھی)، سکرتر، سیکرٹر، سکرتر اعظم، ...

جیلخانہ، پولیس، پولس، سپرنٹنڈنٹ دو اورت کے جملہ اختلافات کے ساتھ، اپیل (ذ)، اسسٹنٹ کمشنر (لفظ اسسٹنٹ
کی ایک شکل ایسسٹنٹ)، عہدۂ پریسیڈنسی کونسل پنجاب، ممبر کونسل ڈپٹی گورنر، اسسٹنٹ مجسٹریٹ، صاحب اندر سیکرٹری
متفرق امور: بوتل، ساشن، بسکٹ، زرونیاں قسم تلیچہ (کذا) جس کو سکٹ کہتے ہیں الحقائق، الک ٹریں (ریل سیل کے
ڈاک کی گاڑی الحقائق)، ییلام (ذ اسواح الحقائق)، نمبر (جیسے سرکلر نمبر ۲)، گھی کوئے، گودام (ذ اردو)، فرو ار (ا آہنی جیسے ابیپا کی
جمع اسعد)، استر (مشر صرف ایک جگہ)، لیڈی (عام خواتین کے لیے)، میم (کسی فرنگی کی بی بی یا کوئی فرنگی عورت)، آیا (اسعد الاخبار؛
یہ لفظ مغربی نہیں، لیکن اہل مغرب کے ذریعے ہندوستان میں پھیلا ہے)، اردلی کے سوار
علم و تعلیم سے متعلق: پرنسپل مدرسہ، آگرہ کالج (صرف ایک جگہ عموماً مدرسہ)، اسکالرشپ (اسعد الاخبار اعلم)، بیسنرگ گورنمنٹ
آف ماڈ سٹری، ارباب کونسل تربیت، ڈپلومہ (معنی کا ڈپلومہ)
ڈاک اخبار اور طبع سے متعلق: پریس (د اسعد)، کاپی اور کاپی نویس (اسعد)، برسم اڈواس (زندہ) لوسینڈ، پوسٹ سینڈ)
چھاپا، چھاپا خانہ، ضمیمۂ اخبار، نمبر کہیں کہیں ملا، ایڈیٹر، کاغذ، ضمیمہ، بیرنگ، ڈاک پارسل (ث اردو اسعد) گورنمنٹ گزٹ،
کرت، میل میل ولایت سے آئی ہو (فوائد الناظرین)، پوسٹ ماسٹر جنرل (پوسٹ بھی)، جنرل پوسٹ ماسٹر، چھاپنا، چھپا، چھاپا
لو و العات جس پر ٹکٹ سے آخود لکھا ہے)
نماز سے متعلق: بکیتاں، نیمٹ، نیٹ، مستول۔
مال سے متعلق: محصول، پرمٹ، ٹیکس، ریس محشریت، بہادر، کوتوال [illegible] بہت خوش ہوئے اور علاوہ
ریس کے کچھ اور بھی [illegible] اقرار کیا، کوتوال کو زر ریس لیا؟ [illegible]
پیمائش سے متعلق: انچ (INCH) [illegible] فٹ [illegible] گز [illegible]
[illegible] دیہات کے ۔

ڈاکٹر دو اورت کے تلفظ اختلافات کے ساتھ، ایک جگہ ڈاکٹر [illegible] مستعمل ہوا ہے، ڈاکٹری، مدرسہ ہسپتال
[illegible] ہسپتال [illegible] ہسپتالیں [illegible] اسسٹنٹ [illegible]
[illegible] سے متعلق [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible] اسسٹنٹ [illegible] بہادر [illegible] صاحب اسسٹنٹ
[illegible] اسسٹنٹ دوم [illegible] اسسٹنٹ [illegible] ذکر [illegible] کے مکمل نام نہیں لکھے گئے ۔

گارد، سپاہیاں گارڈ، افواج کنجنٹ (کنٹنجنٹ) سپر منیا (کوہ نور) سپر منیر (مطلع)، رجمٹ، رجمنٹ (ث اردو)
ونگ رجمنٹ، بیٹری، میگزین (میگزین کے چھکڑے "ایک میگزین میں بہ من باردت") سیج ٹرین (ٹ پانسو سوار
.. رسالۂ سندھ سے بکرے؟ سیج ٹرین یعنی قلعہ کشا توپ ... ملتان کو آتے ہیں) مسکوٹ، مسکوٹ گھ
آرٹلری رجمنٹ، اور گیدر، رسالۂ چہارم آرٹلری، لام ڈوٹنا (زبدہ والنواح ف۔ لام کو صاحب نوراللغات نے
انگریزی لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا لفظ بگڑ کر لام ہو گیا) بم کا گولہ، پریڈ، احاطۂ کانٹین، رشتۂ
ملٹری فنڈ، کمپو، کمپنی، کمپ (ذ اردو) کنپ، کیمپ (کیمپ ایک آدھ جگہ) کورٹ مارشل (ث اردو،
کمیدانی، کمسریٹ کا گودام (ذ اردو)، پلٹن (ت سے بھی ث) پلاٹن (الحقائق) لفٹنٹ، لفٹنٹ
لین (ث "سپاہ کو بہ مجبوری اپنی لینیں چھوڑنی پڑیں" اردو) ہ کو ٹر شکست ہونا
کورٹ مارشل (ث اردو)، کورٹ (فوجی جرائم کے لیے "کورٹ واسطے تحقیقات کے مقرر ہوئی ہے" اردو)، گور.
انجینیر (ذ اردو)

حکومت کے ادارے، قانون اور سرکاری ملازمتوں سے متعلق: گورنر جنرل (ان کے لیے لات صاحب، لاٹ
صاحب اور لاڈ صاحب بھی مستعمل ہوا ہے)، لفٹنٹ گورنر (لفٹنٹ کی طرح لکھا ہے) محکمۂ لفٹنٹ گورنری اگر
لفٹنٹ گورنری آگرہ، گورنر بمبئی، کمشنر، کمشنری، کلکٹر (کلکتر) اور کلکر (دیبہ کی جگہ ہے نہ معلوم محض کاتب کی
غلطی ہے یا اس زمانے میں کچھ لوگوں کی زبان پر اس طرح بھی تھا۔ ایک جگہ یہ الفاظ ہیں، ریاست کمتر
کی خبر ہے، انگریزی کلکٹر تم پر مقرر کروائیں گے)، ارباب پارلمنٹ، صدر بورڈ، اعضائے بورڈ (بورڈ مجمع
ڈپٹی کلکٹر، صاحبان سول یعنی ارباب قلم، سرکار کمپنی بہادر، بورڈ ایڈمنسٹریشن (ذ اور ت کے ساتھ،
مجسٹریٹ (ت و ت کے اختلاف کی ہر ممکن صورت)، مجسٹریٹ (دیبہ بھی کئی جگہ ملتا ہے، پتا نہیں کہ کاتب کی
غلطی ہے یا یہ تلفظ بھی رائج تھی)، گورنمنٹ، گورمنٹ (دونوں ت کے ساتھ بھی)، کاغذ اشامپ،
صاحبان کونسل نمبر (ر)، ارباب کونسل لندن، انڈیا ہوس کورٹ اف ڈائرکٹرس، کورٹ دایرکٹرس، کورٹ
ڈائرکٹرس؟، کورٹ آف ڈائرکٹرس (ذ کے ساتھ بھی ایک جگہ ہے)، سلیکٹ کمیٹی، ارباب کونسل ولایت
کورمنٹ (ت کے ساتھ) کمیٹی کے دن (ذ "مال کمیٹی کے دن پیش کیا جائے" تاجرون) منشی، پنشن
کلکٹری (ت کے ساتھ بھی قانون اور عدالت)، کمشنری، صدر بورڈ، جنرل آرڈر، گورنر جنرل کا، کمشنر
(لیکن گورنمنٹ گزٹ کے خلاصے میں کمشنر کش)، سرکیولر، سرکولر، سرکار (زیادہ سرکیولر)، سپریم کورٹ، سر
کورٹ، رپورٹ، رپوٹ (رپورٹ ہوت) رپورٹ نویس، ڈگری نویس، ڈگری اور دکری مع
ہی اخبار میں آتا ہے ایک جگہ کے ساتھ لکھی جاتی ہے۔ غالبا صرف ڈگری مروج تھا)، صاحب جج، جسٹس
(جج انگریز) بمعنی منشی امداد، پریسیڈنٹ، ممبر (دونوں اس کمیٹی کے لیے جو موز اج کے معدے کی
کے واسطے مقرر ہوئی تھی)، ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی اور ڈپٹی بھی) سکرتر، سیکرٹر، سکرتر اعظم، سب کلر

جیلخانہ: پولیس، پولس، سپرنٹنڈنٹ دواورت کے جملہ اختلافات کے ساتھ، اپیل (ذ) اسسٹنٹ کمشنر (لعطا اسسٹنٹ کی ایک شکل ایسسٹنٹ) عہدہ پریسیڈنسی کونسل پنجاب، ممبر کونسل ڈپٹی گورنر، اسسٹنٹ مجسٹریٹ، صاحب، ادر سیکرٹر

متفرق امور: بوتل، ساٹن، بسکٹ، ذرو ٹیاں قسم قلچہ (کذا) جس کو سکٹ کہتے ہیں الحقائق، ایک سٹریں (یعنی بیل کے ڈاک کی گاڑی المقائق) نیلام (ذ اصلاح الحقائق، نمبر (جیسے سرکلر نمبر ۳، بگھی، کوچ، گودام (ذ اردو) نمبر وار، ناہتی پیسے (بیا کی جمع اسعد) استر (مٹر صرف ایک جگہ) لیڈی (عام خواتین کے لیے) میم (کسی فرنگی کی بی بی یا کوئی فرنگی عورت) آیا (اسعد الاخبار یہ لفظ مغربی نہیں لیکن، اہل مغرب کے ذریعہ سے ہندوستان میں پھیلا ہے، اردلی کے سوار

علم و تعلیم سے متعلق: پرنسپل مدرسہ، آگرہ کالج (صرف ایک جگہ عموماً مدرسہ) اسکالرشپ (اسعد الاخبار، اعلم) بعیز نگ گورنمنٹ آف انڈسٹری، ارباب کونسل تربیت، ڈپلومہ (منصفی کا ڈپلومہ)

ڈاک اخبار اور طبع سے متعلق: پریس (د اسعد) کاپی اور کاپی نویس (اسعد) رسم اڈوانس (ر دہ) بوسپیڈ (پوسٹ سیڈ) چھاپا، چھاپا خانہ، بسوا خبار لمبر کہیں نہیں ملا، ایڈیٹر کا عہدہ بہ صیغہ بیرنگ، ڈاک پارسل (ت اردو اسعد) گورنمنٹ گزٹ، گزٹ، میل، میل ولایت سے آئی (مرفوا مدا الناظریم) پوسٹ ماسٹر جنرل (پوسٹ کی) جنرل پوسٹ ماسٹر، چھاپنا، چھپا، چھاپا (ہو بعات میں یہ تینوں سے ماخوذ کلمات)

مدارات متعلق: ہسپتال، نیٹ نیٹ، مستول۔

مال سے متعلق: معمول پرمٹ، ٹیکس، رئیس مجسٹریٹ بہادر، کوتوال، بل مارک، اسی سے بہت خوش ہوئے اور علاوہ رئیس نے کچھ اور بھی اقرار کیا، کوتوال کو ذر میس لیا، ٹریژری بل، داسوات۔

زمین اور پیمائش سے متعلق، ایکڑ (ACRE) انچ (INCH) فٹ ۱۰۰۰ تک لیے گئی حلکہ منٹ، نیز ہندی اور باب سے ہندی دیہات کے۔

ڈاکٹر دواورت کے تمام اختلافات کے ساتھ، ایک جگہ ڈاکٹر سے حد منٹ بھی مستعمل ہوا ہے، ڈاکٹری مدرسہ ہسپتال سلطان الاخبار، اسپتال (ت اسپتالیں اردو) سب اسسٹنٹ سرجن کلورو فارم، کلوروفارم

ریاستوں سے متعلق: ریذیڈنٹ دواورت کے تمام اختلافات کے ساتھ، ریذیڈنسی، ریذیڈنسی، ایجنٹ، ایجنٹ ات کے ساتھ ہی ایجنسی، ایجنسی ایسسٹنٹ، ایجنٹ گورنر جنرل بہادر، نائب ایجنٹ، پولیٹیکل ایجنٹ، صاحب اسسٹنٹ ... ایسسٹنٹ دوم اسسٹنٹ دہلی الوابع ... وغیرہ ... اخباروں کے مکمل نام نہیں لکھے گئے۔

قران السعدین

(۱) نواب محمد شریف خاں (۲) آزردہ کی دو غزلیں (۳) "لفظ تبدیلی" (۴) کتاب کریم الدین متعلق محاورات و امثال اردو (۵) زبان اردو، دہلی لکھنؤ (۶) لفٹنٹ سدرلینڈ - اجنٹ گورنر جنرل (۷) مردم شماری دہلی و تعداد مساجد (۸) عنایت علی خاں والد نواب رامپور (۹) حافظ قاری سید جعفر علی (۱۰) میر قاسم علی (۱۱) معیار شعرا اکثر و (۱۲) غلام رسول سابق کوتوال۔

"قرآن السعدین" دہلی کے ۱۸۴۴ء کے شمارے نیشنل آرکائوز دہلی میں موجود ہیں اور میں نے انھیں سرسری نظر سے دیکھا ہے مقالۂ ہذا اس یادداشت پر مبنی ہے جو میں نے اس کے متعلق چند ہفتے قبل لکھی تھی۔

(۱) نواب محمد شریف خاں انگریزوں کے حامیوں میں تھے۔ ان کی وفات پشاور میں بتاریخ ۲۰ دسمبر ۴۳ء کو ہوئی۔ (شمارہ ۲۱ فروری)

(۲) شمارہ ۲۰ مارچ میں آزردہ کی دو غزلیں ہیں۔

(۱)

انصاف کر کر لاؤں میں پھر کو نسا وہ دن — محشر کے روز بھی جو نہ دادِ جگر ملے
پروانہ وار ہے حد پرواز شعلے تک — جلنے ہی کے لیے مجھے یہ بال و پر ملے
آنے سے خط کے جاتے رہے وہ بگاڑ سب — بن آئی اب تو حضرت دل تو خضر ملے
کیا شکر کا مقام ہے مرنے کی جا ہے دل — کچھ مضطرب سے آج وہ بیرون در ملے
عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے — نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے
ہے شام ہجر آج تو او ظالم او فلک — گردش وہ کر کہ شام سے آ کر سحر ملے
گر پاس ہو پہ چین تو ہے اس بگاڑ میں — کیا لطف تھا لڑے وہ ادھر اور ادھر ملے
دل نے ملا دیں خاک میں وہ وضعداریاں — جوں جوں رُکے وہ ملنے سے ہم پیشتر ملے
ٹوٹے یہ بخیہ زخم کا ہمدم کہیں سے لا — خنجر ملے کٹار ملے نیشتر ملے

تھا اصل میں مراد ڈبونا جہان کا
قابل سمجھ کے گویہ ہیں چشم تر ملے

اس کی گلی میں لے گئے آزردہ کو اسے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

(۲)

اک بات پر بگڑ کے نہ جو عمر بھر ملے
اس سے طریق صلح کی کیا صلح مر ملے

باہم سلوک تھا ترے دورِ حسن میں
یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

دل محو چشم یار تھا بسمل پر گیا
کچھ ان پرستشوں کا بھی آخر ثمر ملے

اے نالہ تو نے ساتھ دیا آہ کا تو کیا
امید کیا اثر کی جو دوا بے اثر ملے

صدمہ جگر پہ پہنچے تو ہو دل میں کیوں نہ درد
کیا فرق کچھ جدا نہیں ہیں دل جگر ملے

ہم کو ہمارے طالع بد نے ڈبو دیا
اچھے تھے گر نصیب تو کیوں چشم تر ملے

دھوؤں صد آب تیغ سے اے ہمنشیں جو کبھو
دامن سے تیرے دامن داغ جگر ملے

امید اپنی یوں اس کی ملے یوں صبا سے ہم
جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے

جو کچھ نہ دیکھا تھا سو وہ دیکھنا پڑا
اس بیوفا سے پہلے تھے کیا دیکھ کر ملے

دیکھے ہنر جو اپنے ہے وہ جانے اس کا نام
ہم کو تو عیب دیکھ کے اپنے ہنر ملے

مہر جہاں فروز دکھا دوں جبیں کو میں
گر سنگ آستانۂ خیر البشر ملے

ملنے سے اس کے گھٹتی ہے کیا شان تیری حسن
آزردہ خستہ حال بھی ملے تو گر ملے

(۳) ۱۱ گیارہ اپریل کے شمارے میں "لفظ تبدیلی" مستعمل ہوا ہے۔ ص ۱۷۰

(۴) ۱۷ اپریل۔ کریم الدین، مدرس اردو مدرسۂ آگرہ کی کتاب متعلق محاورات امثال اردو تالیف
کی ہے۔ یادداشت کے بعض الفاظ جو کتاب کے موضوع کے بارے میں ہیں۔ پڑھے نہیں جاتے۔

(۵) زبان اردو، دہلی و لکھنؤ کی بحث۔ ص ۲۰۶، شمارہ ؟

(۶) ۲ جولائی، بتاریخ ۲۴ ماہ گذشتہ بھرت پور میں لفٹنٹ سدرلینڈ اجنٹ گورنر جنرل کی وفات ہوئی۔
آگرہ میں دفن ہوئے۔

(۷) تعداد مساجد دہلی ۲۶۱ قلعہ کو چھوڑ کر باشندگان دہلی کی تعداد ۱۳۷۰۹۰ تھی: ہندو ۷۲ مسلمان
۶۶۱۲۰، جلد ۲، ص ۱۵۷، شمارہ ؟

(۸) ۲۲ اگست شب دوشنبہ گذشتہ عنایت علی خاں داماد نواب رامپور کو باورچی ہدایت اللہ نے زہر دیا مر گئے۔

(۹) ۵ ستمبر، ۲۹ رمضان ۱۲۶۴ھ "مولوی حافظ سید جعفر علی نے حامد علی خاں کی مسجد میں قرآن ختم کیا۔ محفل ختم میں کالے صاحب (بہادر شاہ کو ان سے "بیعت") صدر الدین صاحب اور امین الدین خاں شریک تھے۔

(۱۰) میر قاسم علی منصف پانی پت قران السعدین کے خریدار تھے۔ شمارہ ۹

(۱۱) اشتہار معیار شعرا (کذا) از ابوالحسن مشتہر کے مکان میں ہر پندرھویں دن مشاعرہ ہوتا ہے۔ ہر مشاعرہ کی غزلیں "دو ورقہ" میں طبع کرائی جائیں گی۔ "نصف آخر صفحہ" میں علم عروض و قافیہ کی بحث، غزل سے پہلے شاعر کا حال ہوگا۔ پہلا پرچہ ۲۱ نومبر کو طبع ہوگا۔ شمارہ ۹ ص ۷، ۵

(۱۲) غلام رسول خاں سابق کوتوال فی الحال بخشی لکھنؤ مقرر ہوئے ہیں۔ شمارہ ۹

پٹنہ ہرکارہ ۱۸۵۵ و ۱۸۵۶ء

"پٹنہ ہرکارہ" صوبہ بہار کے قدیم ترین اخباروں میں ہے۔ اس کے حسب ذیل ۱۶ شمارے جن میں سے کچھ ناقص (ن) پیش نظر ہیں۔ ۱تا۶ کتب خانۂ خدابخش پٹنہ میں ہیں، باقی ماندہ منیر کی پرانی خانقاہ کے کتب خانے سے ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی نمائش کے لیے آئے ہیں۔ (۱) جلد ۱ نمبر ۱ بابت ۱۱ اپریل ۵۵ء ۲۰ شعبان ۱۲۷۱ھ (۲) ۱/۲ (۳) ۱/۳ (۴) ۱/۴ (۵) ۱/۵ (۶) ۱/۶ (۷) ۱/۷ (۸) ۱/۸ (۹) ۱/۹ (۱۰) ن (۱۱) ن (۱۲) (۱۳) (۱۴) ن ۵۶ء ن (۱۵) (۱۶) - بہار ہرکارہ ستمبر ۵۶ء سے اخبار بہار کے نام سے موسوم ہوا، اور اس کے بھی کچھ شمارے موجود ہیں، اس کا حال کبھی اور مرقوم ہوگا۔ ذیل میں پٹنہ ہرکارہ کے شمارہ ہائے مذکور کے بعض مندرجات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) "قبل اس کے اشتہار دیا گیا تھا کہ تین پیمانہ کبیر الاخبار مقام کٹرہ کھر دوھر لعل علاقہ تھانہ گھاٹ خواجہ کلاں محلات شہر پٹنہ باہتمام شاہ امید علی بزبان اردو طبع ہو کر خدمت میں ناظرین اخبار کے پہنچا کرے گا اور قیمت اس کاغذ کی ایک روپیہ ماہواری اور بطور پیشگی سالانہ نو روپیہ لیا جائے گا، مگر شاہ امید علی مہتمم نے قبل اجرائے کاغذ کبیر الاخبار کے بتاریخ ششم صفر ۱۲۷۱ھ سفر آخرت اختیار کیا۔ اس سبب سے اس قدر توقف اجرائے اخبار میں ہوا۔ الحال اشتہار دیا جاتا ہے کہ نام اس اخبار کا پٹنہ ہرکارا (کذا) مقرر کیا گیا اور ہر مہینے انگریزی کی پہلی اور گیارھویں اور اکیسویں تاریخوں کو اخبار بزبان اردو جس میں خبریں ہفت اقلیم کی اور آئین اور قانون اور تبدیلی اور بحالی و رخصت وغیرہ حکام اور علاوہ اس کے اشعار و لغز و حکایات نادرہ اور اصول ہر علم و فنون طبع ہوا کریں گے اور سوائے اس کے جیسے ہر موسم مع تصویر و بے تصویر طبع ہو کر فروخت ہوگی چنانچہ بالفعل نسخۂ چہار گلزار طبع ہوتی (کذا) ہے۔۔ واضح ہو کہ جو خبر متعلق ہجو کسی شخص کے جس میں تذلیل و تحقیر کسی کی ہو ہرگز طبع نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے کہ جو خبر ایسی صحیح کہ وقوع اس واقعہ کا بلا تشکیک و تمہید ہو۔ چند وہ محمول ہو اوپر قدح یا مدح کے چار و ناچار طبع ہونا اس کا ضرور ہوگا۔"

۲۰ فروری کو کچھ گورے رنگروٹ واسطے بھرتی پلٹنوں براہ جگراؤن انبالہ کو جاتے تھے۔ انھوں نے گجراؤن میں نواب علی خاں بہادر رئیس جگراؤن سابق میر منشی پریسیڈنسی پنجاب کے پرودہ کبوتروں پر بندوقیں چلائیں۔

ان کے نوکروں نے شور کیا اور انھیں پکڑنے لگے، تین بھاگ نکلے لیکن ایک پکڑا گیا۔ اسے .. خوب پھڑک (کذا) ذ
وکر قفس تھانہ میں بند کیا" گوروں نے اپنے افسر کو جاکر خبر دی اس نے "طرم یعنی بگل تیاری کا بجوایا" اور پلٹن
جگمادن ہوا۔ یہاں خبر آئی تو تھانے کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے، لیکن، اس کے قبل ہی گورے آگئے اور انھوں
نے سنگین سے زخمی کیا۔ گورے رجب علی خاں بہادر کے یہاں پہنچ کر انھیں نہایت زیر و زبر کر بری طرح پیش
کہ تحریر حالات میں شگاف دہان قلم مفتوح نہیں ہو سکتا اور عزم بالجزم کیا کہ گلشن خانہ کو رشک لالہ زار کریں
مولوی صاحب (رجب علی خاں بہادر) نے انطفا اس آتش غضب کا آب زر کیا" گوروں نے شہر میں لوٹ م
"پچیس آدمی زخمی ہوئے جن میں گوبند لعل تھانیدار بھی ہیں۔ رپورٹ صاحب ضلع لدھیانہ کو گئی ہے اور تحقیقات
ہے" سپاہیان گورہ (کذا) رعایا پر نہایت ظلم و تعدی کرتے ہیں، چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ شہر لاہور میں
شام ایک گورے نے نمستے لیے (کذا) رام .. سررشتہ دار جوڈیشل کمشنر کے سر پر چوبدستی ماری کہ جوتے کیوں اتا
اور قصور اس کا اسی قدر تھا کہ صاحب کو آتے دیکھ کر راستے میں نہ بچا اور ادب نہ کیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مرد
ولایت کو احتراز انھوں سے نہایت ضرور ہے ورنہ مضرت اپنی متصور، بمصداق مثل اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے"

لکھنؤ کی خبریں: قریب ..۲ فقیر وب مسلمان ہوئے اور "بکمال کر و فر سینہ زناں برہنہ سر واسطے زیارت
.. امامین لے گئے" ان کی موت کے اخراجات شاہ اودھ نے دیے۔ ان کی شناخت کے لیے "ایک قسم کا تاج گو
شاہی سے عنایت ہوا"۔ دوسری خبر یہ ہے کہ مجتہد نے "جگر ناتھ گاذگر کے قتل کا فتویٰ بدیں دلیل نہیں دیا کہ ایک
مسلمانوں کے ایک آدمی کو قتل کرے تو البتہ اس پر از روے شرع .. قصاص لازم آوے گا .. ایک آدمی بہت
قتل کرے تو قاتل بمکافات جرم قاتل حبس دوام کے مستوجب ہوگا"

۱۲۷۱ھ کی ۲۵ رجب کو قاسم علی خاں کے صاحبزادے کی شادی فرزند علی خاں کی بیٹی سے ہوئی۔ اور ۵
(مطابق جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ) حکیم ابوالحسن کی وفات ہوئی۔ انکا تخلص محزوں رائج کے شاگرد تھے۔

اس شمارے میں حسب ذیل اخباروں کے حوالے ہیں: الحقائق، دوربین، آفتاب ہند بنارس،
ہرکارہ (یہ غالباً انگریزی)۔

(۶) اخلاف سید عبداللہ اور راج بتیا کے معاملات داد و ستد کا ذکر۔ "ایک چٹھی انگریزی کلکتہ سے مرسلہ
پادریان متضمن بدعوت دین عیسائی بکمال شدومد ہر اضلاع وامصار میں بہ شکل اکثر حکام ہندستانی و عقلائے
ومسلمانی کے مشتمل بطلب جواب پہنچی ہے چنانچہ ان دنوں عظیم آباد میں .. اس کا چرچا ہو رہا ہے" آئندہ ہفتے

کا ترجمہ شائع کرنے کا وعدہ۔

ایک حکایت متعلق گنا بیگم و عمدۃ الملک یہ صحیح ہو یا فرضی "عمدہ" کی جگہ "عماد" چاہیے۔

اس شمارے میں حسب ذیل اخباروں کا ذکر: مرآۃ الاخبار و کوہ نور (بحوالۂ دوربین) عمدۃ الاخبار سورت آفتاب ہند، لاہور کرانکل۔

(۳) جواب تحریر عیسائیاں (فارسی) از عبداللہ۔

"مخبر ہمارا خبر دیتا ہے کہ بتاریخ ۱۱ شعبان.. صاحب مجسٹریٹ بہادر (شاہ آباد) جیل خانہ میں تشریف لے گئے اور چاہا کہ قیدیان ظروف گلی میں کھانا کھاویں اور پانی پیویں مگر قیدیان نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ نوبت کشت و خون کی پہنچی۔.. مخبر تفصیل مجروحین و مقتولین نہیں لکھتا ہے.. بلکہ اسی قدر کہ اس وقت تک قیدیان بے آب و دانہ جیل خانہ میں بند ہیں۔" جو کچھ صاحب اخبار دوربین نے.. لکھا ہے نہایت خوب.. ہے.. خلاصہ اس کا یہ ہے چند روز ہوئے کہ گروہ نصاری کلکتہ نے ایک مجلس ملقب بہ ینگ منس کرسچین اسوسی ایشن.. واسطے شیوع ملت عیسائی .. ترتیب دی ہے، بلکہ اکثر جلسہ انھوں کا ٹون ہال میں ہوتا ہے، چنانچہ ان دنوں ایک اعلی جلسے.. کئی ہزار نسخے دو ورقی .. شندگان قلمرو سرکار کے پاس بھیجا ہے" پٹنہ ہرکارہ کی رائے، "سرکار نے اب تک کوئی زبردستی بہ نسبت رعایا نہیں فرمائی .. ہمیشہ عدل و انصاف ہی رہا.. اور یہی باعث تھا کہ قیام سلطنت تا ہنوز باقی ہے.. بالفعل کہ دعوت سوئے ملت .. یسائی ناموں میں لکھی گئی ہے عجب نہیں کہ یہ امر فتنہ پردازوں نے برپا کیا ہو اور نمائش استحکام بنائے ملت منظور ہے .. پردہ انہدام خانۂ ریاست مقصود اور اگر بالفرض کوئی اشہب زباں کو میدان بیاں میں یوں دوڑائے کہ خود سرکار .. منظور ہے کہ تمام اقوام دین عیسائی بزور شمشیر قبول کریں جیسا کہ زمانۂ نبی صلعم سے زمانے تک شاہان اسلام کے یہ طریقہ .. رہا۔ پس اگر سرکار نے بوقت سلطنت دعوت طرف دین اپنے کے کیا قباحت تو یہ بات اس کی ناشی عن الغفلت .. قیاس اس کا قیاس مع الفارق ہے اس لیے کہ زمانہ نبی صلعم میں ہرگز اولاً شمشیر علم نہیں ہوئی بلکہ معجزے اور .. سے اتمام حجت کی گئی.. مگر صرف بجبر و عناد کی راہ سے انکار کرتے گئے اور درپے ایذا ہوئے تب.. لاچار دست قبضۂ شمشیر پر لے گئے۔"

(۴) تفاصیل متعلق قیدیان شاہ آباد۔

اخبار اڈسیشن ورڈ (کذا) دہلی سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ بخت سنگھ والی جودھپور دہلی آئے اور لفٹننٹ گورنر .. سے اجازت چاہی کہ بادشاہ سے ملیں، جواب آیا کہ بدون اجازت گورنر جنرل کوئی ہندوستانی رئیس بادشاہ سے

ملاقات نہیں کر سکتا۔ ۱۰ شعبان کو مسلمانان کلکتہ کا ایک جلسہ محلہ تالتلا میں محمد مظہر خلف قاضی غلام سبحان مرحوم سابق قاضی القضات صدر کلکتہ کے مکان پر زیر صدارت قاضی عبدالباری قاضی کلکتہ منعقد ہوا اور عبدالرؤف اور محمد مظہر نے تقریریں کیں۔ یہ قرار پایا کہ صلاح و فلاح اہل اسلام کے لیے انجمن بنائی جائے۔ قاضی القضات فضل الرحمن خاں بہادر اس کے صدر، قاضی عبدالباری نائب صدر، حاجی محمد خاں میر مہتمم، اور محمد وجیہ، عبدالصمد، عبداللطیف، عبدالرؤف، عبدالجبار، فضل کریم، غلام عیسیٰ، رحمت علی، احمد جواد علی، عبدالحمید اور غلام یحییٰ (سب کے نام کے قبل باستثنائے منشی فضل کریم، مولوی ہے) اہالیان جلسہ منتخب ہوئے۔

ایک ہاتھی چار سو ستائیس روپوں میں خریدا گیا۔

(۵) جواب رسالۂ دعوت نامۂ عیسائی (اردو)۔

(۶) "میر ہدایت علی باشندۂ دہلی کہ ... کسی کو اتنی جرأت نہیں کہ ان سے مرغبازی کر سکے۔ تمام عمر ... اسی شغل میں صرف کی اور کل املاک خبرگیری میں کھلاڑیاں اس فن کے تباہ ... کیا اور ... دقیقات اس فن کے مرزا احمد علی سے کہ لکھنؤ میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا سیکھے اور مرشد آباد میں جا کر نواب ... مرغ لڑا کے بہت کچھ حاصل کیا ... بالفعل ایک بازی میر کفایت علی خلف میر رحم علی ساکن محلہ گرہٹہ کے رؤسا اس شہر کے ہیں، ان سے دھوکے میں ہار گئے ... بعد ازاں ۹ عدد بچۂ مرغ میر کفایت علی کے یہاں پیدا ہوئے۔ ایک کو میر ہدایت علی نے مرغی کہا، اس پر شرط ہو گئی۔ میر ہدایت علی بولے کہ یہ مرغ نکلے تو میں سید نہیں۔ اس کے بعد کچھ مذہبی گفتگو ہوئی، یہ بولے کہ مرغی نکلے تو سید کفایت علی شیعہ ہو جائیں، اس کے خلاف ہو تو ہدایت علی سنی ہو جائیں۔ یہ بات قلمبند بھی کر لی گئی اور فریقین نے اس پر دستخط کر دیے، لکھا کہ تبدیل مذاہب نہ کرے تو کافر و مشرک ہو۔ بہتوں نے بچے کو دیکھا اور اسے مرغی بتایا لیکن دو ماہ بعد مرغ نکلا ہدایت علی نے اب تک اعلان تبدیل مذہب نہیں کیا۔

خبر قید خانۂ شاہ آباد۔

اس شمارے میں جام جہاں نما کا ذکر۔

(۷) سوتاروں کے بلوے سے متعلق تفاصیل جہت سے سپاہیان افواج سرکاری اور دو صاحبان انگ۔ اہل ولایت "مقتول ہوئے تھے۔ ڈھاکہ میں عیسائیوں کو لوٹنے، زخمی کرنے اور کئی کو مع زن و فرزند پکڑے جانے کی خبر (بحوالۂ بنگال ہرکارہ) خبر متعلق بھرت پور بحوالۂ چشمۂ فیض۔ فتح جنگ یکے از پسران شاہ شجاع الملک لندن جاتے تھے اطراف لکھنؤ میں پہنچ کر رہ گئے۔ تابوت لدھیانہ گیا۔ وفات حکیم ایوب علی بتاریخ ۱۰ اگست "طبیبوں میں بے نظیر

ملاب عظیم آباد میں طبیب کہہ مشاق باقی نہ رہا۔"

(۸) ہنومان گڑھی کی خبر "آفتاب ہند" سے جزاً متعلق آمد و رفت لساً، منقول اس میں مشیر الدولہ رائے امید سنگھ
لم اس شمارے میں چشمۂ فیض و دوربین کا حوالہ بھی ہے۔

(۱۱) "احسان حسین خاں ۔۔ کو بعد انتقال وصی علی خاں کے حسب مشورہ ۔۔ بڑے صاحب ۔۔ اس مقدمے میں مشیر
بنایا۔ اب دونوں یہ دونوں ۔۔ (چونکہ شمارہ ناقص ہے، یہ پتا نہیں کہ احسان حسین کے علاوہ کون شخص مشیر تھا) مشیر
ن وزیر اعظم کے ہیں، مگر بعضے مفتریوں نے حضرت شاہ اودھ کے مزاج کو مولوی صاحب کی طرف سے منحرف کر
ہے اس واسطے چاہتے ہیں کہ وعدہ مندرجہ اقرار نامہ کو باطل کر دیجئے اور بڑے صاحب بھی امتناع شر و فساد میں
نش کرتے ہیں اور باطن میں ۔۔ معاون ہندوؤں کے ہیں لیکن مجتہدین لکھنؤ ہمہ تن معروف بمدد۔ مسلمانان مجاہدین
ہیں اور مرزا منعم ۔۔ کوتوال فیض آباد کو وزیر اعظم نے اپنے حضور میں طلب کر لیا ہے اور مرزا آغا علی ۔۔ بھی لشکر میں
نے کا بہانہ کر کے دیہات پر چلے گئے۔ خبر ہے کہ وہ بھی لکھنؤ جاویں گے اور ۔۔ لکھنؤ کا یہ حال ہے کہ اکثر شعرائے شہیدان
ہان گڑھی کے حال میں مرثیہ لکھا ہے ۔۔ وہ ۔۔ ہر کوچہ و بازار میں شہر والے پڑھتے پھرتے ہیں ۔۔ مجلسوں میں رشوت
راں مقدمہ مسجد پر برملا تبرا ہوا کرتا ہے مگر مدرشوت خوار ۔۔ غیرت پذیر نہیں ہوتے اور مقام کھری علاقہ خیر آباد میں
یہ ہندوؤں و مسلمانوں میں خونریزی ہوئی اس کی کیفیت بھی ۔۔ علیحدہ لکھی جاتی ہے" (یہ کیفیت علیحدہ مرقوم ہے)۔
بر سیہرلم "کئی ماہ قبل شاہ رحیم الدین سجادہ نشین" آستانۂ حضرت شاہ دیوان لودھن فوت ہوئے تھے اور ان کے
شاہ عبدالرزاق ان کے جانشین ہوئے تھے شاہ کبیر الدین احمد سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ درویش نے ایک
سہ جدید واسطے حفاظ قرآن ۔۔ کے سوائے مدارس علوم عربی و فارسی ۔۔ سابقہ کے جاری کیا ہے"

(۱۲) "لکھنؤ سے معلوم ہوا کہ شاہ اودھ نے شمسی مہینوں کے عوض حسب ذیل نام مہینوں کے مقرر کیے
، سرکاری کاغذات میں یہی لکھے جائیں گے : وجدی، مہدی، اختری، سکندری، سلیمانی، نبی (کذا)، امامی، منوبری،
ب، منصوری، حسنی، اثنا عشری۔ بنارس میں بعلت گاؤکشی بڑا فساد ہوا۔ خاص شہر لکھنؤ کیا بلکہ تمامی قلمرو میں شاہ
ھ کے ۔۔ نہایت غدر عظیم پیدا ہوا ہے" وزیر الملک نے امیر علی سے مسجد متنازع " ہنومان گڑھی کے تیار کرا دینے کا
ہ کیا تھا، اس کی مدت ۲۵ محرم کو منقضی ہو گئی اور تعمیل شرائط اقرار نامہ عمل میں نہ آئی۔ امیر علی نے عزم فیض آباد
وزیر الملک نے جہاد سے باز رکھنے کے لیے مفتی سعد اللہ دہلوی یوسف کو مع افواج سلطانی و ۵۲ ضرب توپ، بھیجا
لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان سپاہی امیر علی سے ملے ہوئے ہیں اور خود ان کے ساتھ ہزاروں مجاہدین ہیں۔ خاص لکھنؤ"

میں بھی "فسادِ عظیم برپا ہے۔ کسی نے ایک تہخانے میں گائے کی ایک ران اور دوسرے کو میں سر ڈال دیا۔ اس سبب سے کل ہندو اور مسلمان مستعدِ فساد ہیں۔ شاہ اودھ نے منادی کر دی ہے کہ مہاجن جوہری اور صراف اپنی دکانوں سے ہوشیار رہیں۔ یہ سب چشم دیدہ ہے۔ سنا ہے کہ "خراج گاں دیگر بلاد مثل حیدرآباد وغیرہ" رزیڈنٹ کے پاس پہنچے ہیں۔ "فریقین اپنی قوم کے سائی اور ۔۔ معاون ہیں۔" مشہور ہے کہ رزیڈنٹ نے کہوا بھیجا ہے کہ اگر مہاراجہ نیپال اس بلوے میں شریک ہوئے تو "ہم کو بجز سکوت" چارہ نہ ہوگا۔ اس شمارے میں کسی نئے اخبار سے کوئی چیز لینے کا ذکر نہیں۔ اخبار دوربین سے ایران کے متعلق جو کچھ نقل ہوا ہے وہ دوربین نے گلشن نوبہار سے لیا تھا۔

(۱۳) قاسم علی خاں کے بیٹے احمد نواب کی شادی ولایت علی خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ قاسم علیخاں کی بیٹی نے والدین کی مرضی کے خلاف ولایت علی خاں سے نکاح کر لیا۔ تفاصیل درج ہیں، جن کا معتد بہ حصہ ضائع ہو گیا ہے۔

(۱۴) بعد شہادت امیر علی میر محمد نے خروج کیا ہے۔ بنگال ہرکارہ لکھتا ہے کہ شاید ان کے لیے بھی شاہ اودھ نے قتل کا حکم دیا ہے۔ بعض خبروں کے لیے قرآن السعدین دہلی کا حوالہ (قران السعدین نے بحوالۂ مالوہ اخبار خبر درج کی ہے۔) شہر روم سے متعلق معلومات صادق الاخبار سے منقول۔

(۱۵) تاریخ انگلستان مسلسل چھپ رہی ہے، آغاز یکم فروری ۵۶ ء سے۔ سید امیر خاں فرقتی مختار عدالت دیوانی پٹنہ کا ذکر۔ اخبار آگرہ سے متعلق اطلاع۔ غزل فارسی سید منور علی پیر بیگھہ ضلع بہار۔" ایک خط کا یہ خلاصہ ہے کہ شاہ اودھ نے تمام شہر لکھنؤ میں منادی کی ہے کہ کوئی فرد بشر ایسا لفظ زبان پر نہ لاوے کہ اب سرکار انگلشیہ۔۔ اودھ کو اپنے تحت دتصرف میں لاوے گی ورنہ ناک کاٹ لی جاوے گی چنانچہ دو آدمیوں کی ناک بعلت اسی جرم کے کاٹی گئی۔۔ خلاصہ دوسرے خط کا مطابق خلاصہ قطعۂ اول کے ہے مگر اس قدر اختلاف ہے جو کوئی ایسا لفظ زبان پر لاوے گا وہ بسواری خر شہر میں تشہیر کیا جاوے گا چنانچہ کوتوال شہر نے حضور میں وزیر اعظم کے عرض کی کہ یہ خبر ہر خاص و عام کی زبانوں پر جاری ۔۔ ہے، اس قدر گدھے کہاں سے میسر آویں گے جو اس قدر عوام الناس سزا پاویں گے۔"

(۱۶) غزل فارسی (کرم خوردہ)، انشاء متخلص تماشا، غزل مداح۔

کسی شمارے کا ایک ٹکڑا الگ سے ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوداگروں نے اپنا سکہ بھی جاری کر دیا تھا۔

(بحوالۂ دوربین)

پٹنہ ہرکارہ کسی نقطۂ نظر سے اچھے اخباروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اخبار الاخبار مظفرپور

اخبار الاخبار کے صفحۂ اول میں مرقوم ہوا کرتا تھا کہ یہ "سائنٹفک سوسائٹی (کذا) صوبہ بہار کا اخبار تھا اور مطبع چشمۂ نور" واقع قصبہ مظفرپور ضلع ترہت" میں چھپا کرتا تھا۔ یہ مہینہ میں دو بار نکلتا تھا اور اس کی سالانہ قیمت جس میں ڈاک کا محصول شامل نہ تھا، بارہ روپے تھی۔ اسکے صفحہ (۱) میں یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا۔

چشمۂ نور لمعۂ طور است   ہر چہ بینی ضیاء آں نور است

ایک شمارے میں ۱۶ صفحات (تقطیع) ہوا کرتے تھے اور کاغذ اتنا برا استعمال ہوتا تھا کہ اب "ہاتھ لگائیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے" کا معاملہ ہے۔

شمارہ ۱۴، ۱۵۔ اپریل ۱۸۶۹ء: (۱) " ایک صاحب استفسار فرماتے ہیں کہ یہ اخبار بائیں طرف سے کیوں لکھا جاتا ہے۔ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ بہت تھوڑے دنوں میں انگریزی اور اردو دونوں میں چھاپا جائیگا اس واسطے پہلے سے بائیں طرف سے لکھا جاتا ہے" (۲) نیر اکبر بجنور کی تعریف بظاہر سید زین العابدین احمد مہتمم مطبع زین المطابع بجنور کا اخبار تھا۔ (۳) بیان تحقیقات بارز صاحب درباب زمین" از اخبار نسیم جونپور (۴) " جوابات سوالات اسکندر از مسٹر مارسخ فشن بہادر جاگیردار ہر صدیپور وغیرہ (۵) " نواب ناظم بنگالہ جو انگلستان کو تشریف لے گئے ہیں۔۔ مارسیلز میں پہنچ گئے ہیں"۔ (۶) " ایک ہراسار (کذا) رسالہ حال میں کلکتہ میں انڈین اسٹوڈنٹ کے ______ نام سے چھپا ہے۔ قیمت تین روپے بارہ آنے سالانہ" از علیگڈھ ۳۰ (۷) " پنڈت بابو دیو شاستری مدرس علم ہندسہ مدرسہ سنسکرت واقع بنارس نے علم ہندسہ میں وہ کمال بہم پہنچایا کہ فضلائے یورپ نے بھی ان کی لیاقت کو تسلیم کیا، علاوہ امتیاز صلۂ حسن استعداد دیا ۲ برس ہوئے کہ مسٹر [illegible] ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے ایک جبر و مقابلہ کی پنڈت صاحب سے فرمائش کی جناب ڈائرکٹر نے بہت پسند فرمایا اور بموجب اشتہار مجریہ ۳۰ اگست ۱۸۶۸ء گورنمنٹ سے ایک ہزار روپیہ انعام دلایا۔" از میورگزٹ (۸) تتمہ مضمون۔ درباره اخبار سوت نویس" از سید وارث علی (۹) " ترغیب تعلیم نسوان و اطفال" از میور گزٹ (۱۰) خبر متعلق [illegible] منقول از مفید [illegible] والاخبار عالم

شمارہ ۱۵ یکم مئی (۱) " تقریر سید امداد علی خاں سیکریٹری سائنٹفک سوسائٹی در باب تعلیم زناں" (۲) اخبار ریفلکٹر سے واضح ہوا کہ پنڈت جگت نرائن منصف درجہ اول مقرر بمشاہرہ چھ سو ماہواری جس کی ترقی ہزار تک ہو سکتی ہے۔ عدالت ہائی کورٹ

شمارہ ہائے ۱۴ تا ۴۴ پیش نظر ہیں۔ اخبار الاخبار کا پہلا شمارہ جیسا کہ شمارہ سے معلوم ہوتا ہے ۶۸ء کی ۱۰ ستمبر کو نکلا تھا۔ ۲ شمارہ ۴۴ تک انگریزی کا پتا نہیں۔ ہر شمارہ ۱۴ تا ۳۱ میں جن اردو فارسی اخباروں کے نام در [illegible]

ممالک مغربی و شمالی کے ڈپٹی رجسٹرار مقرر ہوئے ہیں۔ پنڈت متا دل آگرہ کی عدالت ججی میں مترجم ہوئے تھے۔ (۳) بعض کیا بلکہ اکثر آدمی ایسے ہیں کہ وہ خاص مشہور انگریزی خواں اور اپنے آپ کو بھی وہ بڑا مستعد اور لیئق سمجھتے ہیں مگر جب ان سے کوئی چھٹی پڑھوائی جاتی ہے یا کسی اخبار کا ترجمہ کرانے کی نوبت آتی ہے تو غوطے کھانے لگتے ہیں۔ از جلوہ طور (۴) اس شمارے میں کوہ نور اور چشمۂ علم سے بھی کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں۔ (۵) جلوہ طور کی ایک تحریر نقل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار کے کئی سو پرچے گورنمنٹ نے خریدنا منظور کیا تھا۔ اور میور گزٹ کو ہدایت کی تھی کہ نصف اردو اور نصف ناگری میں مضامین علمی و ترغیب و تحریص تعلیم نسواں کی شائع کرو۔ پس آئندہ سے میور گزٹ میں ناگری کا التزام رہے گا۔"

شمارہ ۱۹ ۱۵ مئی: (۱) تقریر سید وارث علی۔ دربارہ بحالی رواج زبان اردو "(۲) فروری سنہ ۹ء سے اخبار منید علم آگرہ سے جاری ہوا ہے۔ مہینے میں دو بار۔ قیمت مع محصول (۲) روپے (۸) آنے۔ ہمراہ اخبار دو دو ورق .. تزک جہانگیری کا بلا قیمت پہنچا کرے گا۔ مشتہرہ احمد خاں صوفی (۳) پنڈت شیو ناتھ سکریٹری لٹریری سوسیٹی فتحپور کا خط حمایت اردو میں بنام مہتمم علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شمارہ ۲۰

۱۰ جون: (۱) قطعہ و بیت شاہ محمد یحییٰ ابو العلائی:

مرزا نوشہ جناب غالب — در فن سخن وری یگانہ

از اہل سخن ربود دلہا — در شعر بطرز جا دوانہ

کیفیت نثر او چہ گویم — دارا ند از دلبرانہ

از کشور ہند تا بفارس — زد کوس کمال خسروانہ

بگذاشتہ خاک پاک دہلی — در شوق بہشت جاودانہ

سال آں بے نظیر یحییٰ — گو بود نظیری زمانہ

غالب ناماور کہ گرفتے از قلم خود کار سیف — رحلت کرد و سالش گفتم حیف جناب غالب حیف

(۲) رباعی متعلق وزارت منشی امیر علی خاں بہادر:

عالی منصب میر با مجد و علا — نایب شاہ اودھ از لطف خدا شد

تاریخ وزارتش پیششش یحییٰ — خوا ہیم وزارتت مبارک شد باد

(۳) " مرزا رجب علی بیگ سرور .. کی وفات۔ سے نہایت رنج ہوا مرزا صاحب .. مہاراجہ بنارس کے پاس نوکر اور اس زمانے میں بڑے نامی گرامی شعرائے اردو میں شمار کیے جاتے تھے جن کی کتاب فسانہ عجائب بھی اردو میں مشہور تالیف۔

(۴) انعامات سنہ ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء۔ سار جبر و مقابلہ (ہندی) از پنڈت بابو دیو شاستری جبر و مقابلہ ہندی (۱۰۰۰) روپئے کا

تہذیب مضامین اخلاق (اردو) از کالیچرن ندیم الطلبا (کذا) (اردو ڈائشری) از جانسن مدرس علم تشریح، مدرسہ ڈاکٹری آگرہ، مفید خلائق (اردو تعلیم زنان) از عنایت حسین ۔ ۲۰۰ روپے "ایک درویش کے قصہ از ایک شاعر کی تصنیف انگریزی کا ترجمہ نظم میں بزبان اردو" از محمد عبداللہ خاں امین عدالت الہ آباد ۔ ۱۰۰ روپے، زیب النسا (اردو مبتدی لڑکیوں کے لیے اردو) ۵۰ روپے، قواعد زبان ترکی (اردو) از محمد مرزا مدرس ضلع اسکول کانپور ۵۰ روپے (کتابوں کی خریداری اور سرکاری چھاپے خانے میں چھپوائے جانے کے متعلق اطلاعات بھی ہیں مگر اس طرح کے بیشتر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کس کا کس سے تعلق ہے) از علیگڈھ (۵) "مطبع ہاشمی میرٹھ نے ایک بہت بڑی خیر و برکت کا کام کیا ہے .. یعنی بعد ختم قرآن مجید مع التفسیر دو ترجمتین کے حمائل شریف مترجم خیالی اور مظاہر الحق ترجمہ مشکوٰۃ شریف .. طبع فرما رہے ہیں .. قرآن میں ایک ترجمہ اردو .. شاہ عبدالقادر ... کا اور دوسرا ترجمہ فارسی المسمی بہ فتح الرحمان ... شاہ ولی اللہ .. کا اور حاشیے پر تفسیر حضرت ابن عباس .. طبع ہو کر تیار ہے .. مظاہر الحق .. تین ماہ سے چھپتی ہے .. مؤلف یعنی .. محمد قطب الدین .. نے بذریعہ تحریر شتہلی (کذا) خاص . اجازت الطباع دی ہے .." از جلوہ طور (۶) خبر سیول سروس از اردو گائیڈ۔

شمارہ ۱۹، یکم جولائی ۷۰: انتخاب اسپیچ لفٹننٹ گورنر۔ ممالک مغربی و شرقی بتقریب دربار عام الہ آباد بتاریخ ۲۲ مئی ۱۸۷۰ء "زبان ۵۰ ہندوستانی" .. "میں منت و سماجت کرتا ہوں کہ ان تمام امور میں آپ کے فیاضی قابل تحسین کے ظہور میں آئی، جو اشخاص کہ بہت آمدنی رکھتے ہیں، وہ کئی سو روپے لکھ کر اس پر اکتفا کرتے ہیں اور پھر اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی فیاضی کی گویا حاتم وقت ہوگئے، لیکن، اے صاحبو، جو عالی ہمتی اور فیاضی کہ دوسرے ملک مثل بمبئی وغیرہ کے دولتمندوں نے اپنے ملک کے لوگوں کے فائدے کے لئے اس قسم کے امور مفید عام میں کرنے سے کی ہے اس پر نظر کرو۔" از علیگڈھ

شمارہ ۲۰، ۱۵ جولائی ۷۰: "ہندوستانی اب کی دفعہ سول سروس میں پاس ہوئے .. رامیش چندر دت بہاری لال گپتا، سریندر ناتھ بنرجی، سری بدھا باجی ٹھاکر، از علیگڈھ (۲) اخبار نور الابصار و اخبار روہیل کھنڈ (۳) پٹنہ میں .. ہے کہ وہابیوں سے جیل خانہ آباد ہوتا جاتا ہے۔ ایک پیرا شدہ دلہا پور اور دو مشہور وہابی راج شاہی کے اور ایک مشہور مولوی مالوہ کا جنوب سرحد کے پٹھانوں بھرتیاں اور روپیہ بھیجا تھا اور شہادت کا خیال خام کیا تھا .. ہر ایک جیل خانے میں پہونچا اور .. گورنر جنرل .. کی تمیز ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے جو در پردہ لڑائی کا سرکار .. سے رکھتے تھے اور قید سے سزایاب ہوئے ..ان .. کو قرار واقعی سزا دی جائے اور ایسی تحقیقات کی جاوے کہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہو۔ اسکے واسطے جناب جنرل بیگوولی صاحب بہادر مقرر ہوئے ہیں" از روزنامچہ پنجاب لاہور۔

شمارہ ۲۲ یکم ستمبر: (۱) حوالہ برق خاطف بمبئی، (۲) اعلان من جانب "اس ،ای فیلن انسپکٹر مدارس قسمت شمالی و مغربی بمقام دلہا پورہ: رسالہ انجنیری مؤلف صادق علی جس کو بہار سینٹفک سوسائٹی نے یہاں تصنیف کیا تھا۔ ملاحظہ کیا گیا۔

رسالہ مفید .. ہے اور عبارت سلیس ہیں .. ہے .. نقول سالہ کو کہ کتب خانے میں رکھی جاویں کہ طالب العلم اس کو .انعام میں دی جاوے گی

شمارہ ۲۴، ۱۵ ستمبر: (۱) " مضمون .. سید وارث علی .. در بارہ تحقیق حقوق متعلق اراضی " (۲) " تشریف فرمائی

لفٹنٹ گورنر بنگالہ بدولت سرائے .. منشی امیر علی خاں بہادر " " ہم کو یاد نہیں آتا کہ ایک قرن کے اندر کوئی گورنر یا لفٹنٹ گورنر

شہر کلکتہ کے معززات اسلام حیثیت کسی کے کاشانہ اقبال میں نزول اجلال فرمائے ہوں ، ہوا اور سو انواب امیر علی خاں اور شاہزادہ غلام محمد کے

تیسری ستمبر سب شنبہ کو .. سرولیم گری لفٹنٹ گورنر .. کی تشریف فرمائی کی تقریب میں ایک عمدہ جلسہ منعقد ہوا تھا .. گیارہ یا

ساڑھے گیارہ بجے کو .. گورنر ممدوح رخصت ہوئے .. منشی امیر علی خاں .. عبداللطیف خاں بہادر اور .. کبیر الدین احمد .. سواری تک

مشایعت کر کے رخصت کرائے .. عمدہ ساز جو وہاں بجے تھے یہ تھے سارنگی ، سرود ، رباب ، بین ، اسرار ، ستار جن کے بجانے والے ..

ایک یکتائے روزگار تھے .. ایسے یکتایان عصر کا اس بنگال میں آنا فقط .. بادشاہ اودھ کی قدر دانی .. کے طفیل سے ہے .

(۳) مطلع واجد علی شاہ اور اس پر امیر علی خاں کی غزل .. ف چند اشعار اس بعد ترکیب بند شسا ختم گلہائے مضمون رابیہ ..

لیلی ول نخلہ رسید مجنوں را موقع پر نقل کئے جاتے ہیں .

دل از جا .. دم دوادم بخت عشق جگر خوں را   بہار ناقہ لیلے اسیر دم دست مجنوں را

لب ہر کس نیار دو استان عشق سنجیدن   شنواز باتفی افسانۂ لیلے و مجنوں را

امیر افتد چوں برمن یک نگاہ حضرت اختر   نخواہم بر سر خود سایۂ مرغ ہمایوں را

(۵) امیر علی خاں کا ایک قصیدہ بھی مدح واجد علی شاہ میں ہے جس کا مصرعہ یہ ہے : اے خسرو یگانہ اقلیم سروری (۶) " بادشاہ ..

درگمن کوٹھی اسد منزل سعد رمنہ جانوران محوبہ .. وزگار ہم تب فرمودہ اند .. اندرون رمنہ .. بت تالاب ہو سم بہ چشمہ حیات کوٹھی ..

فرمودہ درو دیوار آراستہ کوٹھی .. نقش و نگار .. از کار طلا طیار ساختہ و ابائی تو گنبد مطلا .. قطعہ تاریخ نو منزل کوٹھی شاہی ، مصنفہ امیر علی خاں کی بیت ..

جہانداری کہ باشد جان عالم   ود واجد علی سلطان عالم

مادہ تاریخ ، عشرت گہ سلطان عالم .. ۱۲۸۷ -

شمارہ ۲۵ اکتوبر ، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس امر پر مامور ہوتے تھے کہ ایک کتاب تالیف کریں جس میں صوبجات مذکور (انگرا یور ..

کے کل اضلاع .. کے مشہور و شریف خاندان بلکہ اہل اسلام کا احوال بخوبی بیان کیا جائے ..

شمارہ ۲۶، ۱۵ اکتوبر ، بمبئی میں ایک نیا مذہب صرف یا بندہ جاری ہوا ہے .. ہندو اور مسلمانوں دونوں کی شرکت سے اور مقتہ

اسکا شری کرشن جی کو بھی مانتے ہیں اور حضرت محمد .. کو بھی ..

شمارہ ۲۸ یکم نومبر : (۱) موزہ کربلائے معلی " " حاجی ندمان علی دین شیرازی نے لکھا ہے .. اور اسکے صحیح ہونے پر ہم نہیں ہے .

کی کذا ہفتہ وار تعلیمانہ تحریر ہوئی مطبوعہ ۱۱ اکتوبر کذا) جلوہ طور صاحب ایڈیٹر پانیر نے معرفت صداقت مجنو تحریر کی ہے اور کچھ حال نہیں لکھا اگر ایڈیٹر جلوہ طور کو کشف ہو (اخبار کی مطبوعہ ۳۰ ستمبر ہے کہ اس اخبار کے مہتمم نے بھی اسکی صحت کا ثبوت کامل تر سے ترے تاجروں اور معززوں کی جنی کا دیا ہے معلوم ہوا ہے۔ بے جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ کو، قیصر روم کی فوج ـ نظام کا ایک شخص۔ کمر بستہ و شمشیر بدست حرم ۔۔ روضہ امام مظلوم کے دروازے پر گیا حضرت کا کفش بردار جو دروازہ اول پر رہتا تھا اس نے منع کیا۔ اس بے ادب نے روضے میں جانا خلاف ادب ہے تب اس بے حیا نے جواب دیا کہ میں ...... دروازہ اول سے گذر کر ۔ دروازہ دوم کے قریب آیا کہ ۔۔ ایک ہاتھ نمودار ہوا اور ایک تمانچہ اس روسیاہ کے چہرے پر لگایا کہ گردن پھر گئی اور زبان باہر نکل آئی، چکر کھا کر دروازے سے دور جا کر ۔۔ گر پڑا، اسکا علاج ممکن نہ ہوا اور مر گیا (۲) وفات اعظم خاں امیر کابل (۳) افرینڈ آف انڈیا لکھتا ہے کہ ایک مہر دستیاب ہوئی ہے جس میں الفاظ ذیل کندہ ہیں :- افتخار الدولہ معتمد الملک ولیم ڈگیس نکسن بہادر شہامت جنگ ۱۲۲۵ھ “ (۳) ” نامہ نگار انگلش مین رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ ۔۔ ایک جہاز جس میں ...۔ اس کوین صاحب سوار تھے، متصل جزیرہ ملیا کے تباہی میں آ گیا تھا۔ اور قبل اسکے وہ انگریزی لنگر گاہ تھا، وہاں سے بہت سے آلات و اسباب لوگ چھوڑ کر چلے آئے تھے جب صاحب موصوف وہاں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ اس جزیرے میں بندروں کی بود و باش ہے اور جو سرکاری مکان وہاں تھے اس مکان کے ایک گوشہ میں قریب سو بندروں کے میزوں پر سر جھکائے ۔۔ ہاتھ میں قلم لیے مثل کرانیوں کے بیٹھے دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر کچھ لکھتے تھے جب ایک بندر کاغذ کو بالکل لکھ چکا تب اس نے اس ورق کو بطور تحریر معزز بندروں کے ہاتھ میں دیا انہوں نے بعد ملاحظہ اور دستخط (کذا) کے ایک اور بندر کے حوالے کیا، اس بندر نے بعد دستخط کے ان بندروں کے ہاتھ میں دیا جو اہلکار تھے۔ ان بندروں نے بذریعہ ڈاک اور بندروں کے بڑے پرانے بندر کو جو محافظ دفتر تھا پہنچایا،،

شمارہ ۲۸ ۱۵۔ نومبر: (۱) مضامین علم طبیعات (۲) نصر اللہ خاں تعلقہ دار مقرر ہوتے مشاہرہ ... روپیہ مقرر ہوا۔

شمارہ ۲۹، ۱۰۔ دسمبر: (۱) تقریر .. سید فرزند احمد صفیر بلگرامی فوائد علم و علماء کے بیان میں ” (۲) پنڈت کاشی ناتھ ساکن ... نے علم اخلاق کی ایک کتاب کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ سر ولیم میور کی رائے میں مفید ہوگی۔ در بار عام ” خلعت فاخرہ “ اور .. ۵ روپے انعام میں گے (۳) امداد علی خاں جج اسپال کاز کورٹ سکریٹری سوسائٹی کے بڑے صاحبزادے سید ابو الحسن خاں مصنف علیگنج سیوان کی شادی بہار شریف میں شاہ لطافت حسین کی صاحبزادی سے ہونے والی ہے۔

شمارہ ۳۰ ۲۰ دسمبر: (۱) ترجمہ قصیدہ (عربی) بو علی سینا الحکیم آغا علی خاں طبیب مظفر پور (۲) بکو صفیر بلگرامی فسادِ زبان میں“

” شمارہ ۳۱ تا ۴۴ کے بارے میں کبھی اور لکھا جائے گا۔ وہ مطالب جو میرے مضامین ۔ سید احمد خاںؒ اور اخبار الاخیار “ اور سینٹفک سوسائٹی ” بہار میں پیش ہوتے ہیں اس مقالے میں اسی صورت میں درج ہوئے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

ا شائع کردہ فکر و نظر علیگڑھ۔ ۲ شائع کردہ بہار کی خبریں، پٹنہ (خاص نمبر)

اخبار الاخیار مظفر پور اور سید احمد خاں

٭

اخبار الاخیار ، سائنٹیفک سوسائٹی صوبہ بہار ، قصبہ مظفر پور ضلع ترہٹ
پانزدہ روزہ اخبار تھا ۔ یہ سوسائٹی تاریخ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۶۸ء قائم ہوئی تھی
کے صدر سید محمد تقی خاں اور سکریٹری سید امداد علی تھے ۔ اس کا ایک مجلد
میں ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء کے شمارے ا
۱۴ تا ۴۴) موجود ہیں ، جناب شاہ مقبول احمد (سنٹرل کالج کلکتہ) نے کتب خانۂ
تحقیقات اردو پٹنہ کی نمائش کے لئے مستعار دئیے تھے ، اور میں نے انکا مطالعہ کیا
ذیل میں وہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں ، جن کا تعلق سید احمد خاں سے

«عطائے خطاب ۔ جناب مولوی سید احمد خاں بہادر کو حضور ملکہ معظمہ
تمغائے اسٹار آف انڈیا اور خطاب کمپینین اسٹار آف انڈیا سے معزز و ممتاز ہ
بلاشبہہ اس بات سے ہماری سوسائٹی کے ممبروں اور ان کے دوستوں کو بیحد
ہوگی ۔ صاحب سکرٹر انڈیا آفس نے جو چٹھی سید احمد خاں کے نام لکھ
اس کی نقل ذیل میں مندرج ہے : چٹھی ۔
چٹھی ا ر مقام دفتر ہند مورخہ ۳ جون سنہ ۱۸۶۹ء ۔ میرے دوست
احمد خاں سی ایس آئی ، میں اس بات کے بیان کرنے میں نہایت خوش ہوں
معظمہ دام اقبالہا نے آپ کو اسٹار آف انڈیا کا کمپینین مقرر فرمایا اور میں
آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ راقم آپ کا دوست ، جی ۔ ڈبلو ۔ کرے (۱۵
سنہ ۱۸۶۹ء) ۔

٭سفر ولایت کی ترغیب: ٭۔۔ فی زمانا ہماری سوسیٹی کے لیف اریر سکرٹری جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی اپنی ذاتی ہمت کی بدولت لندن میں پہنچے اور ۔ اولوالعزمی ہمسائیوں کی چال سب کے لیے رحلا ہوئی، جب تک ہندوستانی رعایا خاص لندن میں جاکر اپنی ملکہ معظمہ کی دلی و اور امن یورپ کے اس ذاتی اخلاق کو جو وہ اپنے ملک میں مصروں کے حال مبذول فرماتے ہیں، آنکھ سے نہ دیکھ لیگے، ہرگز اس کے حق میں اپنی گورنمنٹ بکا خوص پیدا نہ ہوگا اور جو حق گورنمنٹ کا اس پر واجب ہے اس سے پورا ادا نہ ہوگا۔ جب مولوی صاحب ۔ لندن ۔ گئے تو تمامی ممبران انڈیا کونسل سے ملاقات ہوئی اور چند ممبران پارلیمنٹ بھی ان سے ملے اور یہ سب صاحب نہایت اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ اور یقین ہے کہ اب وہ حضور ۔ سکرٹری آف اسٹیٹ سے روبرو ہونے ہونگے۔ جب مولوی صاحب وہاں کسی جلسے میں بلائے جاتے ہیں تو اراکین جلسہ ان کی خاطرداری ۔ میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے ۔ جناب لارڈ بہادر گورنر جنرل سابق کی عنایتیں ہرگز بیان میں نہیں آسکتیں ۔ ۔ ۔ حضور مولوی صاحب کی فرود گاہ پر تشریف لائے اور ایک جلسے میں خاص مولوی صاحب کی نسبت اپنی ایک اسپیچ میں بہت کچھ فرمایا اور بدرجۂ غایت تعریف و توصیف کی علی گڑھ (۱ ستمبر) ۔

٭برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب سید احمد خاں لیف اریری سکریٹری نے بموجب ہدایت ایسوسی ایشن کے تمام عرضداشتیں جو ایسوسی ایشن نے واسطے فلاح ہندوستان کے وقتاً فوقتاً گورنمنٹ ہندوستان کے روبرو پیش کی تھیں، اور جن کو سوسی ایشن نے علاحدہ علاحدہ رسالوں میں چھاپا ہے حضور ۔ ۔ سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا یعنی وزیر ہند کے گزرانیں، چنانچہ ان کی عرضداشت اور اس کا جواب جو پیشگاہ ۔ وزیر ہند سے مرحمت ہوا ۔ ۔ اخبار میں مندرج ۔ ہے٭ اس کے بعد عرضداشت اور اس کا جواب) علی گڑھ (۱ ستمبر) ۔

٭خطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ ٭حضرت کے حالات زندگی اور ان مصنفین میں جو ان کے حالات سے متعلق ہیں ایک کتاب کی اول جلد مشتہر ہوگی جس کو سید احمد خاں بہادر مصنف تبیین الکلام نے جواب مضمونوں کے سلسلے کے مطابق تیار کیا ہے نہایت فکروتردد کے ساتھ بلا تعصب و حمایت امر تصنیف میں بڑی تحقیقات کی ہے ۔

اس بات پر اس نے اپنا دلی افسوس ظاہر کیا ہے کہ ان مضمون (انگریز سیرت نگاران پیغمبر صاحب) میں سے کسی نے وضعی اور اصلی حدیثوں میں امتیاز نہیں کیا، چنانچہ اس مصنف نے ان تمام وضعی اور غیر صحیح احادیث کو جن کو ہر ایک تعلیم یافتہ اور صاحب تمیز مسلمان نے پہلے ہی سے باطل اور غیر سند سمجھکر مدتوں سے خارج کر رکھا ہے، ان روایتوں اور مقبولوں سے صاف ممتاز کر دیا ہے جن پر اس وجہ سے اعتماد کلی کرنا چاہیے کہ ان کے خالص اور صحیح سمجھنے کے واسطے بہت سے دلایل موجود ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے، لیکن جو عبارت عربی . یا عربی . سے لی گئی ہے وہ بجنسہ نقل کردی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بہت صاف اور نہایت صحیح ہوگا، اس وجہ سے کہ مصنف . کے ایک دوست یعنی عالم انگریز نے اس پر نظر ثانی کرنا اپنے ذمہ لیا ہے۔ اول جلد میں مضامین مندرجۂ ذیل ہونگے اول ملک عرب کا وارینی جغرافیہ، دوم مذہب اسلام سے پیشتر جو عرب تھے ان کے طور طریق اور دستور، سوم عرب میں جو اسلام سے پہلے مذہب رائج تھے ان میں سے اسلام کس مذہب سے نہایت مشابہ ہے اور آیا اس تعلق سے اسلام کی صلیب ربانی ثابت ہوتی ہے یا صرف بناوٹ پر اس کی بنا ثابت ہوتی ہے، چہارم مذہب اسلام عموماً لوگوں کے حسن معاشرت اور مذہب عیسوی اور یہود کے حق میں مفید ہوا ہے یا مضر، پنجم مسلمانوں کا علم الہیات، ششم مذہبی روایتیں اور بحث اس امر کی کہ ان پر کس قدر اعتبار کرنا چاہئے، ہفتم قرآن مجید، ہشتم تاریخ مکہ شریف مع بیان ان مشہور باتوں کے جن کو آنحضرت کے بزرگوں نے مکہ شریف کی نسبت شرعاً قرار دیا ہے۔ نہم بیان حسب و نسب آنحضرت کا، دہم توریت اور انجیل میں آنحضرت کی نسبت جو پیشگوئیاں ہوئیں، ان کا بیان، یازدہم معراج و شق قمر، دوازدہم آنحضرت کی پیدایش اور لڑکپن کا حال۔ اس کتاب کی اول جلد جو بہت جلد مطبع سے نکلیگی بلا انتظار دوسری جلد کے ہم بھیج سکینگے اور جلد اول کی قیمت ۱۰ روپیہ ۸ آنہ مقرر ہوئی ہے اور مسٹر ٹرنر کمپنی . لندن کے پاس مل سکتی ہے اور علی گڑھ۔

*اخبارالاخیار خدا سید احمد خان . کی سعی کو مشکور کرے . ابھی تک نظر سے نہیں گزری، مگر جی قبول کرتا ہے کہ داد صداقت دی ہے۔ خدا کرے اس کا ترجمہ فارسی یا اردو بھی جلد ہو جائے * (۱ مارچ ۱۸۷۰ء)۔

*توقیر سید احمد خان بمقام لندن. سائنٹیفک سوسیٹی علی گڑھ کے اخبار سے

واضح ہوا کہ ۱۱ مارچ . . . کو . . . ملکہ معظمہ . . . نے . . دربار فرمایا اور اس . . میں . . . سید احمد خاں بہادر . . . باریاب مجرا و ملازمت ہوئے . . . ملازمت کے لئے ہماری سوسیٹی کے آنریبل پیٹرن جناب ہز گریس ڈیوک آف آرگائل وزیر مملکت ہند نے تحریک فرمائی تھی . . . شمالی مغربی اضلاع کے صیغہ غیر منتظم میں سید احمد خاں ہی پہلا شخص ہے جس نے انگلینڈ میں جاکر اسٹار آف انڈیا پایا اور حضور ملکہ معظمہ کی دست بوسی سے تمام اپنے ملک کے لوگوں کو فخر کرنے کا موقع دیا ۔ اخبار الاخیار نے بھی اس پر اظہار مسرت کیا ہے ۔ (۱۵ مئی)

«روداد جلسہ خاص سینٹیفک سوسیٹی صوبہ بہار مقام مظفرپور ، واقع ۸ مئی . . . : سکرٹری . . . نے . . خط . . . سید احمد خاں . . . بہادر . . . کا مرقومہ ۶ اپریل . . . جو . . . لندن سے آیا تھا ، درپیش کرکے اس قدر مضامین جو خریداری کتب عربیہ[1] مترجمہ زبان انگریزی و جرمنی و فرنچ سے متعلق تھے ، پڑھکر سنائے ۔ بعد مباحثہ یہ بات قرار پائی کہ مبلغ ہزار روپیہ واسطے خریداری کتب عربیہ کے جو متعلق امتحان درجہ اعلیٰ یونیورسٹی سے ہیں اور زبان انگریزی خواہ جرمنی خواہ فرانسیسی سے بزبان عربی ترجمہ ہوکر ولایت انگلستان یا مصر خواہ دوسرے ملکوں سے میسر ہوں . . . سید احمد خاں . . . بہادر کی خدمت میں روانہ ہوں اور ہنڈوی اس کی بذریعہ پریسیڈنٹ . . . بنک بنگال سے طلب کی جائے اور ایک خط اطلاعی خدمت . . . خاں . . ممدوح کو بھیجا جائے اور انتخاب . . خط . . . اخبار الاخیار میں مندرج ہو» (۱۵ مئی) ۔

«انتخاب خط . . سید احمد خاں . . . بنام مولوی سید امداد علی خاں بہادر سکریٹری بہار سینٹیفک سوسیٹی جو لندن سے آیا ہے . . . : رسالہ کہ درباب نقصان تعلیم هندوستان نوشتہ بودم شاید روانہ کردہ بودم ، چوں معلوم شدہ کہ نرسیدہ است ، گماں بردم کہ نوشتم و روانہ ساختم ۔ الحال دو جلد آں روانۂ خدمت شریف است بملاحظہ خواہد رسید ۔ الحال مصلاح وصوابدید بعض احباب اینجا عریضداشتے تیارمیشود ، ویک رسالۂ دیگر مینویسم ، آں ہمہ کاغذاتٔ بذریعہ سوسیٹی محضور حکام هند پیش خواهم ساخت ، واگر ضرورت شد تا پارلیمنٹ خواهم رسانید ، و بندوبست این جملہ امور درینجا بخوبی نمودہ ام ، زیادہ امرمشکل انتخاب کتب انگریزی برائے ترجمہ بودہ است ۔

---

۱ ـ ان کتابوں کی فہرست جو سوسائٹی کو مصر سے وصول ہوئی کسی شمارے میں نہ ملی ۔

صلاح احباب چنین قرار یافته که در انتخاب کتب رای علماء اینجا گرفته شود، و فهرست کتب همین جا تیار شود و چند احباب درین امر ساعی اند که از پروفسران یونیورسٹی کیمبرج و اکسفورڈ در انتخاب کتب اعانت خواسته شود، چنانچه بتائید بعض احباب فهرست عام که ترجمهٔ کتب آن ضروریست، تیار شده و سرکیولر بتحریر در آمده چهاپه میشود. در سه چار روز آن سرکیولر همه فهرست علوم ذریعهٔ چهپیات احباب بخدمت پروفسران یونیورسٹی کیمبرج و آکسفورڈ و لندن و آسرا و ایرلنڈ فرستاده خواهدشد و در هر علم کتب سه درجه یعنی ادنیٰ قابل مبتدیان و درجهٔ اوسط و درجهٔ اعلیٰ انتخاب خواهد (کذا) ساخت بعد آن فهرست مکمل همه (کذا) نعمیه ترجمه ولاگت چهاپه تیار خواهد شد. و سوسیٹی هاے هندوستان را اگر ممکن باشد باهم متفق ساخته، آمادهٔ ترجمهٔ آن خواهم ساخت و از گورنمنٹ درخواست عطاے نصف خرچ نموده خواهد شد - یقین است که گورنمنٹ منظور خواهد کرد و نیز تا سکرٹری آف اسٹیٹ استمالت خواهد شد. فهرست علوم تا خواندگی ایم - اے مرتب شده است. علاوه آن بعد ملاحظهٔ مدارس این جا یک رساله درباب طریق تعلیم نوشته‌ام، خصوصاً طریق تعلیم مسلمانان که تمام علوم دنیوی مثل حساب و جغرافیه و ریاضی ... و پولٹکل اکانمی و تاریخ و علم زمین و نباتات وغیره جمله علوم بزبان اردو تعلیم شوند، و علاوه آن دو زبان دیگر آموخته شوند، عربی و انگریزی یا فارسی و انگریزی تا خواندگی بی - اے این هر دو زبان قدر کاروائی روزمره آموخته شوند، و زیاده از آن صرف اوقات بر آن کرده نشود، و در زمانهٔ همین خواندگی مسلمانان را علوم دینیهٔ شان مثل عقائد و فقه آموخته شوند، بعد ازان که امتحان بی اے پاس کرده شود، هر یک طالبعلم را اجازت و اختیار خواهد بود که منجملهٔ علوم خواندهٔ خود یک زبان و دو علم را براے تکمیل پسند و اختیار نماید - اگر کسے میخواهد که در زبان عربی کامل شود، اورا اختیار خواهد بود که زبان عربی اختیار نماید و اگر اورا خواهش باشد که منجمله علوم خواندهٔ خود علم دین را تکمیل سازد، آن را اختیار نماید - هر کسیکه خواهد زبان انگریزی را اختیار نماید و آن را تکمیل سازد - از روے حساب خواندگی معلوم میشود که طالبعلم متوسط الذهن اگر بعمر یازده و دوازده سالگی در مدرسه داخل خواهد شد تا بعمر هیجده سال یقینی امتحان بی - اے پاس خواهد ساخت - بعد ازان تا سه سال دیگر

۱ ــ نام علماء و کتب منتخبه شماره یکم دسمبر سنه ۱۸۷۰ع میں مر

اجازت خواندن جهت تکمیل دو علم و یک زبان پسندکردهاش باقی خواهدماند، و یقینی
مر بیست و یک سال عالم متبحر خواهد شد و مدرسهٔ ایمہائے خواهد رسید۔

بدریافت حالات ترقی سوسیٹی بهار و شرکت و امداد حکام عالیمقام که صرف
عالی و تدابیر و سعی حمیلهٔ سامی شده است، بسیار بسیار خشنود شدم۔ الله تعالیٰ
روزافزون نصیب نماید، وآں مخدوم رااجزائے خیر دهد۔ رڈ آف انڈیا ازکلہائے بسیار
نوشته است، هداست شده این کرامات جناب عالی است وبس فقط» (١٥ مئی)

«اشتہار خطبات الاحمدیه علی العرب والسیرة المحمدیه: اس کتاب کو راقم آثم نے
، کیا هے اور میرا اراده هے که آں حضرت صلی الله علیه و آله وسلم کے حالات ابتداے
ں سے وفات تک لکھوں، اور علاوه اس کے ان باتوں سے بھی بحث کروں جو
ضرت صلی الله علیه وسلم سے اور اسلام سے علاقه رکھتی هیں اور اصلی واقعات کو
۔ و مشتبه اور غیر سند باتوں سے تمیز کروں اور جو الزام آنحضرت صلعم کی
، یا اسلام کی نسبت منسوب کئے گئے هیں ان سب کا جواب دوں۔ چو که یه
، زیاده تر ان نوجوان مسلمان لڑکوں کے لئے لکھی جاتی جو انگریزی علوم کی
ل میں مصروف هیں، اس لئے انگریزی زبان میں اس کا ترجمه تیار هوا هے اور
کی انگریزی عبارت ایک نہایت لائق اور قابل اور عالم میرے یورپین دوست نے
ت کی هے، جس کے سبب سے وه کتاب مسلمان طالبعلموں کی انگریزی تحصیل
لئے بھی بہت مفید هے۔ یه کتاب کئی جلدوں میں ختم هوگی، مگر بالفعل جلد
اس کتاب کی انگریزی زبان میں چھپکر تیار هوئی هے اور قیمت اس کی ١٥ روپیه
پائی هے۔ جس شخص کو اس کا خریدا هو وه مسٹر ٹربنر اینڈ کو سے جن کا
دانه لندن میں پیٹر ناسٹررو محلے میں به نمبر ٦٠ واقع هے، زرقیمت بھیج کر طلب کرے،
ل ڈاک بذمه خریدار هے۔ هندوستان کے خریداروں کی آسایش کے لئے یه بھی
ع کیجاتی هے که اگر هندوستان کے خریدار زرقیمت جناب راجه جیکشن داس بہادر
جمع کرکر مجھ کو اطلاع دیںگے تو کتاب مذکوره میں ان کی خدمت میں بھجوادونگا۔

اس جلد اول میں جس کا یه اشتہار هے ایک دیباچه اور باره باب هیں جو
خطبه تعبیر کئے گئے هیں، یعنی بجائے لفظ باب کے لفظ خطبه استعمال کیا گیا
، چنانچه مختصراً تفصیل مضامین ان باره خطبوں اور دیباچهٔ کتاب کی اس مقام پر
ی جاتی هے: دیباچے میں مختصراً ان عربی اور انگریزی کتابوں کا ذکر هے ان کے

میں بھی "فسادِ عظیم برپا ہے۔ کسی نے ایک بتخانے میں گائے کی ایک ران اور دوسرے میں سر ڈال دیا۔ اس سبب سے کل ہندو اور مسلمان مستعدِ فساد ہیں۔ شاہ اودھ نے منادی کر دی ہے کہ مہاجن جوہری اور صراف اپنی دکانوں سے ہوشیار رہیں۔ یہ سب چشم دیدہ ہے۔ سنا ہے کہ خراج گاں دیگر بلاد مثل حیدر آباد وغیرہ " رزیڈنٹ کے پاس پہنچے ہیں۔ " فریقین اپنی قوم کے ساتھ اور . . معاون ہیں۔ یہ مشہور ہے کہ رزیڈنٹ نے کہوا بھیجا ہے کہ اگر مہاراجہ نیپال اس بلوے میں شریک ہوئے تو " ہم کو بجز سکوت " چارہ نہ ہوگا۔ اس شمارے میں کسی نئے اخبار سے کوئی چیز لینے کا ذکر نہیں، اخبار دور بین سے ایران کے متعلق جو کچھ نقل ہوا ہے وہ دور بین نے گلشن نو بہار سے لیا تھا۔

(۱۳) قاسم علی خاں کے بیٹے احمد نواب کی شادی ولایت علی خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ قاسم علیخاں کی بیٹی نے والدین کی مرضی کے خلاف ولایت علی خاں سے نکاح کر لیا۔ تفاصیل درج ہیں، جن کا معتدبہ حصہ ضائع ہو گیا ہے۔

(۱۴) بعد شہادت امیر علی میر محمد نے خروج کیا ہے۔ بنگال ہرکارہ لکھتا ہے کہ شاید ان کے لیے بھی شاہ اودھ نے قتل کا حکم دیا ہے۔ بعض خبروں کے لیے قران السعدین دہلی کا حوالہ (قران السعدین نے بحوالۂ مالوہ اخبار خبر درج کی ہے۔) شہر روم سے متعلق معلومات صادق الاخبار سے منقول۔

(۱۵) تاریخ انگلستان مسلسل چھپ رہی ہے، آغاز یکم فروری ۵٦ ء سے۔ سید امیر خاں فرقی مختار عدالت دیوانی پٹنہ کا ذکر۔ اخبار آگرہ سے متعلق اطلاع۔ غزل فارسی سید منور علی پیر بیگھہ ضلع بہار۔ " ایک خط کا یہ خلاصہ ہے کہ شاہ اودھ نے تمام شہر لکھنؤ میں منادی کی ہے کہ کوئی فرد بشر ایسا لفظ زبان پر نہ لاوے کہ اب سرکار انگلشیہ . . اودھ کو اپنے تحت و تصرف میں لاوے گی ورنہ ناک کاٹ لی جاوے گی چنانچہ دو آدمیوں کی ناک بعلت اسی جرم کے کاٹی گئی۔ . خلاصہ دوسرے خط کا مطابق خلاصہ قطعۂ اول کے ہے مگر اسی قدر اختلاف ہے جو کوئی ایسا لفظ زبان پر لاوے گا وہ بسواری خر شہر میں تشہیر کیا جاوے گا چنانچہ کوتوال شہر نے حضور میں وزیر اعظم کے عرض کی کہ یہ خبر ہر خاص و عام کی زبانوں پر جاری . . ہے، اس قدر گدھے کہاں سے میسر ہوویں گے جو اس قدر عوام الناس سزا پاویں گے۔"

(۱٦) غزل فارسی اکرم خوردہ، الشذ، متخلص خالد، غزل مداح۔

کسی شمارے کا ایک ٹکڑا الگ سے ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوداگروں نے اپنا سکہ بھی جاری کر دیا تھا۔

(بحوالۂ دور بیں)

پٹنہ ہرکارہ کسی نقطۂ نظر سے اچھے اخباروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اخبار الاخیار مظفرپور

اخبار الاخیار کے صفحہ اول میں مرقوم ہوا کرتا تھا کہ یہ "سینٹفک سوسیٹی (کذا) صوبہ بہار کا اخبار تھا اور مطبع چشمۂ نور" واقع قصبہ مظفرپور ضلع ترہت" میں چھپا کرتا تھا۔ یہ مہینہ میں دو بار نکلتا تھا اور اسکی سالانہ قیمت جس میں ڈاک کا محصول شامل نہ تھا، بارہ روپے تھی۔ اسکے صفحہ (۱) میں یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا۔

چشمۂ نور ملو سطور است　　　ہر چہ بینی ضیاء آں نور است

ایک شمارے میں ۱۲ صفحات (تقطیع) ہوا کرتے تھے اور کاغذ اتنا برا استعمال ہوتا تھا کہ اب "ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے" کا معاملہ ہے۔

شمارہ ۱۴، ۱۵۔ اپریل ۱۸۶۹ء: (۱) "ایک صاحب استفسار فرماتے ہیں کہ یہ اخبار بائیں طرف سے کیوں لکھا جاتا ہے۔ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ بہت تھوڑے دنوں میں انگریزی اور اردو دونوں میں چھاپا جائیگا اس واسطے پہلے سے بائیں طرف سے لکھا جاتا ہے" (۲) نیر اکبر بجنور کی تعریف بظاہر اسید زین العابدین احمد مہتمم مطبع زین المطابع بجنور کا اخبار تھا۔ (۳) "بیان تحقیقات بارز صاحب درباب زمین" از اخبار نسیم جونپور (۴) "جوابات سوالات اسکندر از مسٹر مارچ فخن بہادر جاگیردار ہرچندپور وغیرہ (۵) "نواب ناظم بنگالہ جو انگلستان کو تشریف لے گئے ہیں.. مارسیلز میں پہنچ گئے ہیں"۔
(۶) "ایک ہر ماسا (کذا) رسالہ حال میں کلکتہ میں انڈین اسٹوڈنٹ کے ______ نام سے چھپا ہے۔ قیمت تین روپے بارہ آنے سالانہ" از علیگڈھ۔ (۷) "پنڈت بابو دیو شاستری مدرس علم ہندسہ مدرسہ سنسکرت واقع بنارس نے علم ہندسہ میں وہ کمال بہم پہنچایا کہ فضلائے یورپ نے بھی ان کی لیاقت کو تسلیم کیا۔ لعابہ امتیاز صلہ حسن استعداد دیا تا برس ہوئے کہ مسٹر ... ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے ایک جبر و مقابلہ کی پنڈت صاحب سے فرمائش کی۔ جناب ڈائرکٹر نے بہت پسند فرمایا اور بموجب اشتہار مجریہ ۲۰ اگست ۱۸۶۸ء گورنمنٹ سے ایک ہزار روپیہ انعام دلایا۔" از میور گزٹ (۸) تتمہ مضمون۔ درباره اثبات حرکت زمین۔ از سید وارث علی (۹) "ترغیب تعلیم نسواں و اطفال" از میور گزٹ (۱۰) خبر متعلق ... منقول از منصیف ... و الاخبار عالم
شمارہ ۱۵ یکم مئی: (۱) تقریر سید امداد علی خاں سیکریٹری سینٹفک سوسیٹی در باب تعلیم زناں" (۲) اخبار رفاہ سے ... ہوا کہ پنڈت جگت نرائن منصف درجہ اول تعز ابشاہرہ چھ سو ماہواری جس کی ترقی ہزار تک ہو سکتی ہے۔ عدالت ہائی کورٹ ... ۱۲ تا ۴۴ پیش نظر ہیں۔ اخبار الاخیار کا پہلا شمارہ جیسا کہ شمارہ سے معلوم ہوتا ہے ۱۸۶۸ء کی ۱۰ ستمبر کو نکلا تھا۔ ۳ شمارہ ... تک انگریزی کا پتا نہیں۔ سو شمارہ نمبر ۱ تا ۳ میں جن اردو فارسی اخباروں کے نام درج ہیں وہ اس مقالے میں موجود ہیں شمیمہ لازم نہیں کہ ان کے حوالے سے کچھ منقول ہے سب کا ذکر ہو۔ فی الحال منشی نوبت گزٹ؟

ملک مغربی و شمالی کے ڈپٹی رجسٹرار مقرر ہوئے ہیں۔ پنڈت مہا تا دل آگرہ کی عدالت ججی میں مترجم ہوئے تھے۔ (۳) بعض کیا بلکہ اکثر آدمی ایسے ہیں کہ وہ خاصے مشہور انگریزی خواں اور اپنے آپ کو بھی وہ بڑا مستعد اور لیئق سمجھتے ہیں مگر جب ان سے کوئی چٹھی پڑھوائی جاتی ہے یا کسی اخبار کا ترجمہ کرانے کی نوبت آتی ہے تو غوطہ کھانے لگتے ہیں۔ (۴) جلوہ طور (۵) اس شمارے میں کوہ نور اور چشمۂ علم سے بھی کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں۔ (۵) جلوہ طور کی ایک تحریر نقل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار کے کئی سو پرچے گورنمنٹ نے خریدنا منظور کیا تھا۔ اور میور گزٹ کو ہدایت کی تھی کہ نصف اردو اور نصف ناگری میں مضامین علمی و ترغیب و تحریص تعلیم نسواں کی شائع کرو۔ پس آئندہ سے میور گزٹ میں ناگری کا التزام رہے گا۔"

شمارہ ۱۹ ۱۵ مئی: (۱) تقریر سید وارث علی۔ درباہ بحالی رواج زبان اردو" (۲) فروری ۱۸۶۹ء سے اخبار مفید علم آگرہ سے جاری ہوا ہے۔ مہینے میں دو بار، قیمت مع محصول (۲) روپے (۸) آنے، ہمراہ اخبار دو دو ورق .. تزک جہانگیری کا بلا قیمت بہنچا کرے گا۔ مشتہرہ احمد خاں صوفی (۳) پنڈت شیو ناتھ سکریٹری لٹریری سوسیٹی فتحپور کا خط حمایت اردو میں بنام مہتمم علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شمارہ ۷ (جون: (۱) قطعہ و بیت شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی۔

مرزا نوشہ جناب غالب   در فن سخن وری یگانہ
از اہل سخن ربود دلہا   در شعر بطرز جا دوانہ
کیفیت نثر او چہ گویم   دارا ند از دلبرانہ۔
از کشور ہند تا بفارس   زد کوس کمال خسروانہ۔
بگذاشتہ خاک پاک دہلی   در شوق بہشت جاودانہ
سال از سبب نظیر یحییٰ   گو بود نظیری زمانہ
غالب نادر کہ گرفتہ از قلم خود کا سیف   رحلت کرد و سالش گفتم حیف جناب غالب حیف

(۲) رباعی متعلق وزارت منشی امیر علی خاں بہادر۔۔

عالی منصب میر با مجد و علا   نایب شاہ اودھ از لطف خدا شد
تاریخ وزارتش بہ پیش یحییٰ   خوانیم وزارت مبارک باد

(۳) مرزا رجب علی بیگ، سرور۔۔۔ کی وفات۔ سے نہایت رنج ہوا۔ مرزا صاحب۔ مہاراجہ بنارس کے پاس نوکر تھے اور اس زمانے میں بڑے نامی گرامی تحریر اردو میں تسلیم کئے جاتے تھے جن کی کتاب فسانہ عجائب بھی اردو میں مشہور آفاق ہے۔
(۴) اطلاعات سنہ ۱۸۶۸ و ۱۸۶۹۔ سار جبر و مقابلہ (ہندی) پنڈت باپو دیو شاستری جبر و مقابلہ (ہندی) (۱۰۰۰) روپیہ کا۔

زیب مضامین اخلاق (اردو) از کالیچرن ندیم الطلبا سرکنڈا) (اردو ڈاکٹری) از جانسن مدرس علم تشریح، مدرسہ ڈاکٹری آگرہ؛ بد خلاق (اردو تعلیم زناں) از عنایت حسین، ..سو روپے ایک درویش کے قصہ یا رنل شاعر کی تصنیف انگریزی کا ترجمہ نظم بزبان اردو" از محمد عبداللہ خاں امین عدالت الہ آباد، ... روپے زیب النساء (اردو مبتدی لڑکیوں کے لئے اردو) معہ قواعد زبان ترکی (اردو) از محمد مرزا مدرس ضلع اسکول کانپور ۵۰ روپے) کتابوں کی خریداری اور سرکاری چھاپے خانے میں چھپوائے جانے کے متعلق اطلاعات بھی ہیں مگر اس طرح کے بیشتر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کس کا کس سے تعلق ہے) لیگڑھ (۵) "مطبع ہاشمی میرٹھ نے ایک بہت بڑی خیر و برکت کا کام کیا ہے .. یعنی بعد ختم قرآن مجید مع التفسیر دو تین کے مسائل شریف مترجم خیالی اور مظاہر الحق ترجمہ مشکوٰۃ شریف .. طبع فرما رہے ہیں .. قرآن میں ایک ترجمہ اردو شاہ عبدالقادر... کا اور دوسرا ترجمہ فارسی المسمی بہ فتح الرحمان ... شاہ ولی اللہ .. کا اور حاشیے پر تفسیر حضرت ابن س . طبع ہو کر تیار ہے ..مظاہر الحق .. تین ماہ سے چھپتی ہے .. مؤلف یعنی.. محمد قطب الدین.. نے بذریعہ تحریر ملی (کذا) خاص اجازت انطباع دی ہے ..." از جلوہ طور (۶) خبر سیول سروس از اردو گائیڈ۔

شمارہ ۱۹، یکم جولائی : "انتخاب اسپیچ لفٹننٹ گورنر .. ممالک مغربی و مشرقی بتقریب دربار علم الہ آباد بتاریخ ۲۲ ۱۸۶۹ء" زبان مد ہندوستانی "۔ " .. میں منت و سماجت کرتا ہوں کہ ان تمام امور میں آپ نے فیاضی قابل تحسین ظہور میں آئی، جو اشخاص کہ بہت آمدنی رکھتے ہیں، وہ کئی سو روپے لکھ کر اس پر اکتفا کرتے ہیں اور پھر اس بات پر فخر کرتے ہیں نے ایسی فیاضی کی گویا حاتم وقت ہو گئے، لیکن، لائے صاحبو، جو عالی ہمتی اور فیاضی کہ دوسرے ملک مثل بمبئی وغیرہ دولتمندوں نے اپنے ملک کے لوگوں کے فائدے کے لئے اس قسم کے امور مفید عام میں کرنے سے کی ہے اس پر نظر کرو۔" از علیگڑھ

شمارہ ۲۰، ۱۵ جولائی : "۔ ہندوستانی اب کی دفعہ سول سروس میں پاس ہوئے .. رامیش چندر دت بہاری لال، سرندر ناتھ بنرجی، سری پد بابا جی ٹھاکر، از علی گڑھ (۲) اخبار نور الابصار و اخبار سویل کمنڈ (۳) پائیر میں ..ہے کہ وں سے جیل خانہ آباد ہوتا جاتا ہے ۔ ایک پیر باشندہ دیناپور اور دو مشہور وہابی راج شاہی کے اور ایک مشہور مولوی مالوہ کا جنوب سرحد کے پیر کو بھرتیاں اور روپیہ بھیجا تھا اور شہادت کا خیال خام پکایا تھا .. ہر ایک جیل خانے میں پہونچا اور .. گورنر جنرل .. کی ہے کہ ایسے لوگوں کے سے جو در پردہ لڑائی کا سرکار .. سے رکھتے تھے اور قید سے سزایاب ہوئے "ان .. کو قرار واقعی سزا اور ایسی تحقیقات کی جاوے کہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہوئے .. اسکے واسطے جناب جنرل سیگور ولی صاحب بہادر مقرر ہوئے ہیں" از دوہیں و جلوہ طور۔

شمارہ ۲۳ یکم ستمبر : (۱) حوالہ برق خاطف بمبئی، (۲) اعلان من جانب" اس، ای فیلن انسپکٹر مدارس قسمت شمالی و مقام دانا پور" : رسالہ انجنیری مؤلفہ صادق علی جسکو بہار سینٹنک سوسیٹی نے یہاں تصنیف کیا تھا۔ ملاحظہ کیا گیا۔

رسالہ مفید .. ہے اور عبارت سلیس ہیں... ہے .. نقول رسالہ نگار کے کتب خانے میں رکھی جاویں کہ طالب العلموں مدارس کو .. انعام میں دی جاوے گی

شمارہ ۲۴، ۱۵ ستمبر: (۱) "مضمون .. سید وارث علی .. دربارہ تحقیق حقوق متعلق اراضی" (۲) "تشریف فرمائی لفٹنٹ گورنر بنگال بدولت سرائے .. منشی امیر علی خاں بہادر" "ہم کو یاد نہیں آتا کہ ایک قرن کے اندر کوئی گورنر یا لفٹنٹ گورنر شہر کلکتہ کے معززات اسلامیہ میں کسی کے کاشانہ اقبال میں نزول اجلال فرمائے کذا، ہوا اور سوا نواب امیر علی خاں اور شاہزادہ غلام محمد کے تیسری ستمبر سب شنبہ کو .. سر ولیم گری لفٹنٹ گورنر .. کی تشریف فرمائی کی تقریب میں ایک عمدہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے کو .. گورنر ممدوح رخصت ہوئے۔ منشی امیر علی خاں .. عبداللطیف خاں بہادر اور .. کبیر الدین احمد .. سواری تک مشایعت کر کے رخصت کراتے .. عمدہ ساز جو وہاں بجے تھے، یہ تھے سارنگی، سرود، رباب، بین، اسرار، ستار جن کے بجانے والے ایک یگانۂ روزگار تھے .. ایسے یکتایان عصر کا اس بنگال میں آنا فقط .. بادشاہ اودھ کی قدردانی .. کے طفیل سے ہے .. .

(۳) مطلع واجد علی شاہ اور اس پر امیر علی خاں کی غزل (صرف چند اشعار اس بعد ترکیب بندش ساختم گلہائے مضمون رابہ رہ لیلی دل نخلند بید مجنوں را موقع پر نقل کئے جاتے ہیں۔

دل از جا بردم و دادم بکف وحشی جگر خوں را — بہار ناقۂ لیلے اسیر دم دست مجنوں را
لب ہر کس نیارد داستان عشق سنجیدن — شنواز ہاتفی افسانۂ لیلے و مجنوں را
امیر افتد چوں بر من یک نگاہ حضرت اختر — نخواہم بر سر خود سایۂ مرغ ہمایوں را

(۴) امیر علی خاں کا ایک قصیدہ بھی مدح واجد علی شاہ میں ہے جس کا مصرع یہ ہے: اے خسرو یکتائے اقلیم سروری (۵) "بادشاہ در صحن کوٹھی اسد منزل سعد رمنہ جانوران عجوبہ روزگار مرتب فرمودہ اند۔ اندرون رمنہ .. لب تالاب موسم بہ چشمہ حیات کوٹھی . فرمودہ در و دیوار آراستہ کوٹھی۔ نقش و نگار۔ از کار طلا یا ساختہ و بالائے آں گنبد مطلا۔" قطعہ تاریخ نو منزل کوٹھی شاہی، مصنفہ امیر علی خاں کی ہے:

جہانداری کہ باشد جان عالم — ہو واجد علی سلطان عالم

مادہ تاریخ: عشرتگہ سلطان عالم۔ ۱۲۸۶۔

شمارہ ۲۵ اکتوبر: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس امر پر مامور ہوئے تھے کہ ایک کتاب تالیف کریں جس میں "صوبجات مذکور (بنگال و بہار و اڑیسہ) کے کل اضلاع .. کے مشہور و شریف خاندان ہائے اہل اسلام کا احوال بخوبی بیان کیا جائے۔"

شمارہ ۲۶، ۱۵ اکتوبر: بمبئی میں ایک نیا مذہب مہراج پنتھ جاری ہوا ہے۔ ہندو اور مسلمان مت دونوں کی شرکت سے اور حقہ اکثر کرشن جی کو بھی مانتے ہیں اور حضرت محمد .. کو بھی۔

شمارہ ۲۸ یکم نومبر: (۱) "موزہ کربلائے معلی .." حاجی ندمان علی دین شیرازی نے لکھا ہے .. اور اسکے صحیح ہونے پر انھوں نے!

کی (کذا) مختصر ترجمہ یا تبصرہ بروز مطبوعہ ۱۱ اکتوبر (کذا) جلوہ طور صاحب ایڈیٹر پانیر نے صرف صداقت مجنوں تحریر کی ہے اور کچھ حال نہیں لکھا۔ اگر ایڈیٹر جلوہ طور کو کشف الاخبار بمبئی مطبوعہ ۲۰ ستمبر سے کہ اس اخبار کے مہتمم نے بھی اس کی صحت کا ثبوت کامل تر سے تاجروں اور معززوں کی چٹھی کا دیا ہے، معلوم ہوتا ہے۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ کو، قیصر باغ کی فوج نظام کا ایک شخص کمر بستہ و شمشیر بدست حرم .. روضہ امام مظلوم کے دروازے پر گیا حضرت کا کفش بردار جو دروازہ اول پر رہتا تھا اس نے منع کیا۔ اس بے ادب نے روضے میں جانا خلاف ادب ہے تب اس بے حیا نے جواب دیا کہ میں ...... دروازہ اول سے گذر کر ۔ دروازہ دوم کے قریب آیا کہ .. ایک ہاتھ نمودار ہوا اور ایک طمانچہ سر و سیاہ کے چہرے پر لگایا کہ گردن پھر گئی اور زبان باہر نکل آئی، چکر کھا کر دروازے سے دور جا کر .. گر پڑا، اس کا علاج ممکن نہ ہوا اور مر گیا (۲) وفات اعظم خاں امیر کابل (۳) فرینڈ آف انڈیا کلکتہ سے کہ ایک مہر دستیاب ہوئی ہے جس میں الفاظ ذیل کندہ ہیں: "افتخار الدولہ حشمت الملک ولیم ڈگلس خان بہادر شہامت جنگ سنہ ۱۲۲۵ھ" (۳) "نامہ نگار انگلش مین رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ .. ایک جہاز جس میں مدراس کورٹ صاحب سوار تھے، متصل جزیرہ ملیا کے تباہی میں آگیا تھا اور قبل اس کے وہ انگریزی لنگر گاہ تھا، وہاں سے بہت سے آلات و اسباب لوگ چھوڑ کر چلے آتے تھے جب صاحب موصوف وہاں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ اس جزیرے میں بندروں کی بود و باش ہے، جو سرکاری مکان وہاں تھے اس مکان کے ایک کونے میں تقریباً سو بندروں کے میزوں پر سر جھکائے .. ہاتھ میں قلم لیے مثل کرانیوں کے بیٹھے دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھتے تھے جب ایک بندر کاغذ کو بالکل لکھ چکا تب اس نے اس ورق کو بطور معزز بندروں کے ہاتھ میں دیا انہوں نے بعد ملاحظہ اور دستخط (کذا) کے ایک اور بندر کے حوالے کیا، اس بندر نے بعد دستخط کے ان بندروں کے ہاتھ میں دیا جو حاضر تھے۔ ان بندروں نے بذریعہ ڈاک اور بندروں کے بڑے پرانے بندر کو جو محافظ دفتر تھا پہنچایا۔،،

شمارہ ۲۸ ۱۵ ۔ نومبر: (۱) مضامین علم طبیعات (۲) نصر اللہ خاں تعلقہ دار مقرر ہوئے تنخواہ ۱۰۰۰ روپے مقرر ہوا۔

شمارہ ۲۹، ۱۰ دسمبر: (۱) تقریر .. سید فرزند احمد صفیر بلگرامی فوائد علم و عاملان علم کے بیان میں" (۲) پنڈت کاشی ناتھ ساکن بجنور علم اخلاق کی ایک کتاب کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ سر ولیم میور کی رائے میں مفید ہوگی۔ در بارہ علم "خلعت فاخرہ" اور .. ۵ روپے انعام میں گے (۳) امداد علی خاں جج اسمال کاز کورٹ و سکریٹری سوسائٹی کے بڑے صاحبزادے سید ابوالحسن خاں مصنف علیگنج سیوان کی شادی بہار شریف میں شاہ لطافت حسین کی صاحبزادی سے ہونے والی ہے۔

شمارہ ۳۰ ۱۵ دسمبر: (۱) ترجمہ قصیدہ (عربی) بو علی سینا از حکیم آغا علی خاں طبیب منظور ہوا (۲) پیکر صفیر بلگرامی تنازبان میں؟

"شمارہ ۳۱ تا ۳۴ کے بارے میں کبھی اور لکھا جائے گا۔ وہ مطالب جو میرے مضامین۔ سید احمد خاں اور اخبار الاخیار" اور سینٹفک سوسائٹی" بہار میں پیش ہوئے ہیں اس مقالے میں اسی صورت میں درج ہوئے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

۱ شائع کردہ فکر و نظر علیگڑھ۔ ۲ شائع کردہ بہار کی خبریں، پٹنہ (خاص نمبر)

اخبار الاخیار مظفر پور اور سید احمد خاں

اخبار الاخیار "سین ٹیفک سوسائٹی صوبہ بہار، قصبہ مظفر پور ضلع ترہت" کا پانزدہ روزہ اخبار تھا ۔ یہ سوسائٹی تاریخ ۲٤ مئی سنہ ۱۸٦۸ء قائم ہوئی تھی ؛ اس کے صدر سید محمد تقی خاں اور سکریٹری سید امداد علی تھے ۔ اس کا ایک جلد جس میں ۱۵ اپریل سنہ ۱۸٦۹ء سے لیکر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء کے شمارے (شمارۂ ١٤ تا ٤٤) موجود ہیں، جناب شاہ مقبول احمد (سنٹرل کالج کلکتہ) نے کتبخانۂ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی نمائش کے لئے مستعار دئیے تھے، اور میں نے اسکا مطالعہ کیا ہے ۔ ذیل میں وہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں، جن کا تعلق سید احمد خاں سے ہے ۔

"عطائے خطاب ۔ جناب مولوی سید احمد خاں بہادر کو حضور ملکہ معظمہ . . نے تمغائے اسٹار آف انڈیا اور خطاب کمپینین اسٹار آف انڈیا سے معزز و ممتاز فرمایا ۔ بلاشبہ اس بات سے ہماری سوسیٹی کے ممبروں اور ان کے دوستوں کو بیحد خوشی ہوگی ۔ صاحب سکرٹر انڈیا آفس نے جو چٹھی سید احمد خاں کے نام لکھی تھی اس کی نقل ذیل میں مندرج ہے چٹھی ۔

چٹھی از مقام دفتر ہند مورخہ ۲ جون سنہ ۱۸٦۹ء ۔ میرے دوست سید احمد خاں سی اس آئی، میں اس بات کے بیان کرنے میں نہایت خوش ہوں کہ ملکہ معظمہ دام اقبالہا نے آپ کو اسٹار آف انڈیا کا کمپینین مقرر فرمایا اور میں اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ راقم آپ کا دوست، جی ۔ ڈبلو ۔ کرہ (۱۵ جولائی سنہ ۱۸٦۹ء) ۔

«سفر ولایت کی ترغیب» ... فی زمانا ہماری سوسائٹی کے لیف اریری سکرٹری جناب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی ایس آئی . اپنی ذاتی ہمت کی بدولت لندن میں پہنچے اور . اولوالعزمی ہندوستانیوں کی خیال ... کے برخلاف ہوئی . جب تک ہندوستانی رعایا خاص لندن میں جاکر اپنی ملکہ معظمہ کی دلی ... اور اہل یورپ کے اس ذاتی اخلاق کو جو وہ اپنے ملک میں مسافروں کے حال پر مبذول فرماتے ہیں، آنکھ سے نہ دیکھ لیگی، ہرگز اس کے حق میں اپنی گورنمنٹ کا ٹھیک خوص پیدا نہ ہوگا اور جو حق گورنمنٹ کا اس پر واجب ہے اس سے پورا پورا ادا نہ ہوگا - جب مولوی صاحب . لندن . . گئے تو تمامی ممبران انڈیا کونسل سے ملاقات ہوئی اور چند ممبران پارلیمنٹ بھی ان سے ملے اور یہ سب صاحب نہایت اخلاق کے ساتھ پیش آئے - اور یقین ہے کہ اب وہ حضور . سکرٹری آف اسٹیٹ سے ... ہوئے ہونگے - جب مولوی صاحب وہاں کسی جلسے میں بلائے جاتے ہیں تو ... ان کی خاطرداری . میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے ... بہادر گورنر جنرل سابق کی عنایتیں ہرگز بیان میں نہیں آسکتیں ... مولوی صاحب کی فرود گاہ پر تشریف لائے اور ایک جلسے میں ... صاحب کی نسبت اپنی ایک اسپیچ میں بہت کچھ فرمایا اور مدرسۂ عنایت ... تعریف و توصیف ... علی گڑھ» (۱ ستمبر) -

«برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب ... سید احمد خان لیف اریری سکرٹری نے بموجب ہدایت ایسوسی ایشن کے تمام عرضداشتیں جو ایسوسی ایشن نے واسطے ... ہندوستان کے وقتاً فوقتاً گورنمنٹ ہندوستان کے روبرو پیش کی تھیں، اور جن کو ... ایسوسی ایشن نے علحدہ علحدہ رسالوں میں چھاپا ہے حضور . سکرٹری آف اسٹیٹ ... انڈیا یعنی وزیر ہند کے گذرانیں، چنانچہ ان کی عرضداشت ... اور اس کا جواب جو پیشگاہ . وزیر ہند سے مرحمت ہوا . اخبار میں مندرج ... ہے» ... کے بعد عرضداشت اور اس کا جواب) علی گڑھ (۱ ستمبر) -

«خطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ» حضرت ... کے حالات ... اور ان مضامین میں جو ان کے حالات سے متعلق ہیں ایک کتاب کی اول جلد مشتہر ہوگی جس کو ... احمد خان بہادر ... مصنف ... تبیین الکلام نے جواب مضمونوں کے سلسلے کے مطابق ... ہے ... نہایت فکر و تردد کے ساتھ بلا تعصب و حمایت امر تصنیف میں بڑی تحقیقات کی ہے .

س بات پر اس نے اپنا دلی افسوس ظاہر کیا ہے کہ ان مصنفوں (انگریز سیرت نگاران
مر صاحب) میں سے کسی نے وضعی اور اصلی حدیثوں میں امتیاز نہیں کیا، چنانچہ اس
صنف نے ان تمام وضعی اور غیر صحیح احادیث کو جن کو ہر ایک تعلیم یافتہ اور
صاحب تمیز مسلمان نے پہلے ہی سے باطل اور غیر سند سمجھکر مدتوں سے خارج کر
کہا ہے، ان روایتوں اور مقولوں کے صاف صاف ممتاز کر دیا ہے جن پر اس وجہ سے
متضاد کلی ذکر نا چاہیے کہ ان کے خالص اور صحیح سمجھنے کے واسطے بہت سے
دلایل موجود ہیں ۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے، لیکن جو عبارت عربی
اعربی . . سے لی گئی ہے وہ بجنسہ نقل کردی ہے ۔ امید ہے کہ اس کتاب کا
نگریزی ترجمہ بہت صاف اور نہایت صحیح ہوگا، اس وجہ سے کہ مصنف . کے ایک
دوست یعنی عالم انگریز نے اس پر نظر ثانی کرنا اپنے ذمہ لیا ہے اول جلد میں مضامین
مندرجۂ ذیل ہونگے اول ملک عرب کا تواریخی جغرافیہ، دوم مذہب اسلام سے پیشتر
جو عرب تھے ان کے طور طریق اور دستور، سوم عرب میں جو اسلام سے پہلے مذہب
رائج تھے ان میں سے اسلام کس مذہب سے نہایت مشابہ ہے اور آیا اس تعلق سے
اسلام کی صداقت زیادہ ثابت ہوتی ہے یا صرف بناوٹ پر اس کی بنا ثابت ہوتی ہے، چہارم
مذہب اسلام عموماً لوگوں کے حسن معاشرت اور مذہب عیسوی اور یہود کے حق میں مفید
ہوا ہے یا مضر، پنجم مسلمانوں کا علم الہیات، ششم مذہبی روایتیں اور بحث اس امر کی
کہ ان پر کس قدر اعتبار کرنا چاہئے، ہفتم قرآن مجید، ہشتم تاریخ مکہ شریف مع بیان ان
مشہور ناموں کے جن کو آنحضرت کے بزرگوں نے مکہ شریف کی نسبت شرعاً قرار دیا
ہے ۔ نہم بیان حسب و نسب آنحضرت کا، دہم توریت اور انجیل میں آنحضرت کی نسبت
جو پیشگوئیاں ہوئیں، ان کا بیان، یازدہم معراج و شق قمر، دوازدہم آنحضرت کی پیدایش
اور لڑکپن کا حال ۔ اس کتاب کی اول جلد جو بہت جلد مطبع سے نکلیگی بلا انتظار
دوسری جلد کے ہم پہنچ سکیگی اور جلد اول کی قیمت ۱۰ روپیہ ۸ آنہ مقرر ہوئی
ہے اور مسٹر ٹرنر کمپنی . . لندن کے پاس مل سکتی ہے ار علی گڑھ ۔

ہاخبارا لاخیار خدا سید احمد خان . کی سعی . کو مشکور کرے . ابھی
تک نظر سے نہیں گزری، مگر جو قبول کرتا ہے کہ داد صداقت دی ہے ۔ خدا
کرے اس کا ترجمہ فارسی یا اردو بھی جلد ہو جائے ۔ (۱ مارچ ۱۸۷۰ء) ۔

ہتوقیر سید احمد خان بمقام لندن سائینٹفک سوسیٹی علی گڑھ کے اخبار سے

واضح ہوا کہ ۱۱ مارچ . . . کو . . . ملکہ معظمہ . . . نے . . دربار فرمایا اور اس . . . میں . . . سید احمد خاں بہادر . . . باریاب مجرا و ملازمت ہوئے . . . ملازمت کے لئے ہماری سوسیٹی کے آنریبل پیٹرن جناب ہز گریس ڈیوک آف آرگائل وزیر ممالک ہند نے تحریک فرمائی تھی . . . شمالی مغربی اضلاع کے خرمہ غیر متعبد میں سید احمد خاں ہی پہلا شخص ہے جس نے انگلینڈ میں جاکر اسٹار آف انڈیا پایا اور حضور ملکہ معظمہ کی دست بوسی سے تمام اپنے ملک کے لوگوں کو فخر کرنے کا موقع دیا ۔ اخبار الاخیار نے بھی اس پر اظہار مسرت کیا ہے ۔ (۱۵ مئی)

«روداد جلسہ خاص سینٹیفک سوسیٹی صوبہ بہار مقام مظفرپور ، واقع ۸ مئی . . . : سکرٹری . . . نے . . . خط . . . سید احمد خاں . . . بہادر . . . کا مرقومہ ۶ اپریل . . . جو . . . لندن سے آیا تھا ، درپیش کر کے اس قدر مضامین جو خریداری کتب عربیہ[1] مترجمہ زبان انگریزی و جرمنی و فرنچ سے متعلق تھے ، پڑھکر سنائے ۔ بعد مباحثہ یہ بات قرار پائی کہ مبلغ ہزار روپیہ واسطے خریداری کتب عربیہ کے جو متعلق امتحان درجہ اعلیٰ یونیورسٹی سے ہیں اور زبان انگریزی خواہ جرمنی خواہ فرانسیسی سے زبان عربی ترجمہ ہوکر ولایت انگلستان یا مصر خواہ دوسرے ملکوں سے میسر ہوں . . . سید احمد خاں . . بہادر کی خدمت میں روانہ ہوں اور هنڈوی اس کی بذریعہ پریسیڈنٹ . . . بنک بنگال سے طلب کی جائے اور ایک خط اطلاعی خدمت . . . خاں . ممدوح کو بھیجا جائے اور انتخاب . . خط . . . اخبار الاخیار میں مندرج ہو» (۱۵ مئی) ۔

«انتخاب خط . . . سید احمد خاں . . . بنام مولوی سید امداد علی خاں بہادر سکریٹری بہار سینٹیفک سوسیٹی جو لندن سے آیا ہے . . . : رسالہ کہ درباب نقصان تعلیم هندوستان نوشتہ بودم شاید روانہ کردہ بودم ، چوں معلوم شدہ کہ نرسیدہ است ، گمان بردم کہ نوشتم و روانہ ساختم ۔ الحال دو جلد آں روانۂ خدمت شریف است بملاحظہ خواهد رسید ۔ الحال بصلاح وصوابدید بعض احباب اینجا عرضداشتے تیارمیشود ، ویک رسالۂ دیگر مینویسم ، آں همه کاغذات بذریعہ سوسیٹی بحضور حکام هند پیش خواهم ساخت ، واگر ضرورت شد تا پارلیمنٹ خواهم رسانید ، و بندوبست ایں جملہ امور درینجا بخوبی نمودہ ام ، زیادہ امرمشکل انتخاب کتب انگریزی برائے ترجمہ بودہ است ۔

---

[1] ان کتابوں کی فہرست جو سوسائٹی کو مصر سے وصول ہوئی کبھی شائع نہ ہو سکی ۔

صلاح احباب چنین قرار یافته که در انتخاب کتب رائے علماء اینجا گرفته شود، و فهرست کتب همین جا تیار شود و چند احباب درین امر ساعی اند که از پروفسران یونیورسٹی کمبرج و اکسفورڈ در انتخاب کتب اعانت خواسته شود، چنانچه بتائید بعض احباب فهرست علوم که ترجمهٔ کتب آن ضروریست، تیار شده و سرکیولر تحریر در آمده چهاپه میشود. در سه چهار روز آن سرکیولر معهٔ فهرست علوم بذریعهٔ چهپیات احباب بخدمت پروفسران یونیورسٹی کیمبرج[1] و اکسفورڈ و لندن و اڈنبرا و ایرلنڈ فرستاده خواهد شد و در هر علم کتب سه درجه یعنی ادنیٰ قابل مبتدیان و درجهٔ اوسط و درجهٔ اعلیٰ انتخاب خواهد (کذا) ساخت بعد آن فهرست مکمل معه (کذا) تخمینه ترجمه ولاگت چهاپه تیار خواهد شد. و سوسیٹی هاے هندوستان را اگر ممکن باشد باهم متفق ساخته، آمادهٔ ترجمهٔ آن خواهم ساخت و از گورنمنٹ درخواست عطاے نصف خرچ نموده خواهد شد. یقین است که گورنمنٹ منظور خواهد کرد ورنه تا سکرتری آف اسٹیٹ استغاثه خواهد شد. فهرست علوم تا خواندگی ایم. اے مرتب شده است. علاوه آن بعد ملاحظهٔ مدارس این جا یک رساله درباب طریق تعلیم نوشته ام. خصوصاً طریق تعلیم مسلمانان که تمام علوم دنیوی مثل حساب و جغرافیه و ریاضی و جرثقیل و پولیٹکل اکونمی و تاریخ و علم زمین و نباتات وغیره جمله علوم بزبان اردو تعلیم شوند. و علاوه آن دو زبان دیگر آموخته شوند، عربی و انگریزی یا فارسی و انگریزی تا خواندگی بی. اے این هر دو زبان بقدر کاروائی روزمره آموخته شوند، و زیاده از آن صرف اوقات بر آن کرده نشود. و در زمانهٔ همین خواندگی مسلمانان را علوم دینیهٔ شان مثل عقائد و فقه آموخته شوند، بعد ازان که امتحان بی اے پاس کرده شود، هر یک طالبعلم را اجازت و اختیار خواهد بود که منجملهٔ علوم خواندهٔ خود یک زبان و دو علم را براے تکمیل پسند و اختیار نماید. اگر کسے میخواهد که در زبان عربی کامل شود، اورا اختیار خواهد بود که زبان عربی اختیار نماید و اگر اورا خواهش باشد که منجملهٔ علوم خواندهٔ خود علم دین را تکمیل سازد، آن را اختیار نماید. هر کسیکه خواهد زبان انگریزی را اختیار نماید و آن را تکمیل سازد. از روے حساب خواندگی معلوم میشود که طالبعلم متوسط الذهن اگر بعمر یازده و دوازده سالگی در مدرسه داخل خواهد شد تا بعمر هیجده سال یقینی امتحان بی. اے پاس خواهد ساخت. بعد ازان تا سه سال دیگر

۱ــ نام علما و کتب منتخبه شماره یکم دسمبر سنه ۱۸۷۰ع [illegible]

اورا اجازت خواندن جهت تکمیل دو علم و یک زبان پسند گردماش باقی خواهدماند، و یقینی در عمر بیست و یک سال عالم متبحر خواهد شد و بدرجهٔ ایم‌اے خواهد رسید ـ

بدریافت حالات ترقی سوسیٹی بہار و شرکت و امداد حکام عالیمقام که صرف متوجه عالی و تدابیر و سعی جمیلهٔ سامی شده است، بسیار بسیار خشنود شدم ـ الله تعالیٰ ترقی روزافزون نصیب نماید، وآن مخدوم رااجزائے خیر دهد ـ رپٹ آف انڈیا ارکلہائے بسیار خوب نوشته است، بدانست بنده این کرامات جناب خالی است وبس فقط (۱۵ مئی)

• اشتہار خطبات الاحمدیه علی العرب والسیرة المحمدیه: اس کتاب کو راقم آثم نے تالیف کیا ہے اور میرا ارادہ ہے که آں حضرت صلی الله علیه و آله وسلم کے حالات ابتداء پیدائش سے وفات تک لکھوں، اور علاوہ اس کے ان باتوں سے بھی بحث کروں جو آں حضرت صلی الله علیه وسلم سے اور اسلام سے علاقه رکھتی ہیں اور اصلی واقعات کو معتبر و مشتبه اور غیر سند باتوں سے تمیز کروں اور جو الزام آنحضرت صلعم کی نسبت یا اسلام کی نسبت منسوب کئے گئے ہیں ان سب کا جواب دوں ـ جو که یه کتاب زیادہ تر ان نوجوان مسلمان لڑکوں کے لئے لکھی جاتی جو انگریزی علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں، اس لئے انگریزی زبان میں اس کا ترجمه تیار ہوا ہے اور اس کی انگریزی عبارت ایک نہایت لائق اور قابل اور عالم میرے یوروپین دوست نے درست کی ہے، جس کے سبب سے وہ کتاب مسلمان طالبعلموں کی انگریزی تحصیل کے لئے بھی بہت مفید ہے ـ یه کتاب کئی جلدوں میں ختم ہوگی، مگر بالفعل جلد اول اس کتاب کی انگریزی زبان میں چھپکر تیار ہوئی ہے اور قیمت اس کی ۱۵ روپیه قرار پائی ہے ـ جس شخص کو اس کا خریدنا ہو وہ مسٹر ٹربنر اینڈ کو سے جن کا کارخانه لندن میں پیٹر ناسٹر رو محلے میں به نمبر ۶۰ واقع ہے، زرقیمت بھیج کر طلب کرے، محصول ڈاک بذمه خریدار ہے ـ ہندوستان کے خریداروں کی آسایش کے لئے یه بھی اطلاع دیجاتی ہے که اگر ہندوستان کے خریدار زرقیمت جناب راجه جیکشن داس بہادر کے پاس جمع کرکر مجھ کو اطلاع دینگے تو کتاب مذکورہ میں ان کی خدمت میں بھجوادونگا ـ

اس جلد اول میں جس کا یه اشتہار ہے ایک دیباچه اور بارہ باب ہیں جو لفظ خطبه تعبیر کئے گئے ہیں، یعنی بجائے لفظ باب کے لفظ خطبه استعمال کیا گیا ہے، چنانچه مختصراً تفصیل مضامین ان بارہ خطبوں اور دیباچهٔ کتاب کی اس مقام پر لکھی جاتی ہے: دیباچے میں مختصراً ان عربی اور انگریزی کتابوں کا جن سے ان کے

درجۂ اعتبار کے ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کے حالات زندگی کے باب میں لکھی گئی ہیں، اور اخیر دیباچہ میں چند بڑے بڑے انگریزی عالموں کی رائیں نقل کیگئی ہیں، جنھوں نے اسلام کا مقدس اور پاک اور ایک نہایت عمدہ مذہب ہونا تسلیم کیا ہے، جیسے کہ ایک سویلیزڈ ملک کے بیدیا عالموں سے توقع تھی - خطبۂ ۱ میں عرب کی قدیم قوموں اور نسلوں کا جن کا توریت مقدس میں بھی ذکر ہے اور عرب کے جغرافیے کا بیان ہے - اس خطبے میں توریت مقدس سے اور انگریزی کتابوں کے مصنفوں کی رائے سے اور خود جغرافیۂ عرب سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت اسمعیل خاص مکۂ معظمہ میں آکر آباد ہوئے اور فاران جس کا ذکر توریت میں ہے اور جس جگہ سے خدا کے نور کے چمکنے کی توریت میں خبر تھی، وہ وہی ہے جو اب حجاز کہلاتا ہے اور جہاں مکۂ معظمہ واقع ہے - خطبہ ۲ میں ان رسموں اور رواجوں کا ذکر ہے جو اسلام سے پہلے عربوں میں مروج تھے - خطبۂ ۳ میں ان مذہبوں کا ذکر ہے جو اسلام سے پہلے عربوں میں رائج تھے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان مذہبوں میں سے اسلام کس مذہب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اس مناسبت سے اسلام کی اصلیت ربانی ثابت ہوتی ہے یا صرف ساوث پائی جاتی ہے - خطبہ ٤ اس بات کا بیان ہے کہ اسلام عموماً انسان کے حسن معاشرت کے لئے مفید ہے یا نہیں اور یہودی اور عیسائی مذہب کو اس سے کیا فائدہ پہنچا ہے - اس خطبے میں مفصلۂ ذیل مسائل کی اصلیت بیان کی گئی ہے : کثرت ازدواج ، طلاق ، غلامی، جبر نہ ہونا دوسرے مذہبوں پر - خطبۂ ٥ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور یہ کہ کس اصول پر لکھی گئی ہیں اور کہاں تک وہ مسلم ہیں، بیان ہے - خطبہ ٦ میں روایات مذہبی اور ان کا درجۂ اعتبار باعتبار روایت اور باعتبار راویوں کے بیان کیا گیا ہے ، اور عیسائی مصنفوں کے تمام اعتراضوں کا جواب دیا ہے جن میں سے بڑے اور مقدم اعتراض مفصلۂ ذیل تھے : جھوٹ ہونا الزام تعظیم بتوں کا آنحضرت کی نسبت ، جھوٹ بولنے کی اجازت کا الزام غلط ہے - خطبۂ ۷ میں قرآن مجید کے نازل اور جمع ہونے اور تقسیم ہونے کا اور یہ کہ بجنسہ بلا کم و کاست ویسا ہی بیان ہے - عمدہ مسائل جو اس خطبے میں معرض بحث میں آئے ہیں یہ ہیں: اختلاف قرات، ناسخ منسوخ، منسوخ التلاوت آیتوں کا ہونا غلط ہے اور کوئی آیت ایسی نہیں جو نازل ہوئی ہو اور قرآن میں نہ ہو - خطبہ ۸ میں مکہ معظمہ کی تاریخ اور ابراہیم سے اس کی تعمیر کا ثبوت اور حجر اسود کی اصلیت کا اور آنحضرت صلعم کے بزرگوں کو جو اس سے تعلق

... اس کا اور اس بات کا کہ کعبے کی طرف نماز پڑھی اور طواف کرنا اور بوسہ ... ت پرستی نہیں ہو سکتی، مفصل بیان ہے۔ خطبہ ۹ میں آں حضرت صلعم کے نسب نامے ... اور جو بحثیں کہ اس سے متعلق ہیں ان کا بیان ہے۔ خطبہ ۱۰ میں بشارات ... حضرت صلعم جو توریت اور انجیل میں میں بیان کی گئی ہیں اور موجود ہونا آپ کا نام ... مد توریت میں اور احمد انجیل میں ثابت کیا گیا ہے۔ خطبہ ۱۱ میں معراج اور شق صدر کی اصلیت اور حقیقت کا بیان ہے اور تمام روایات مختلفہ اور اقوال علما جمع کر کے ... صحیح نکالا گیا ہے۔ خطبہ ۱۲ میں آں حضرت صلعم کی پیدائش سے لیکر آپ ... ۱۲ برس کی عمر تک کا بیان ہے۔ نہایت صحیح حال علحدہ بیان کیا ہے ... نامعتبر روایتوں کو تمیز کیا ہے اور عیسائی مصنفوں کے اعتراضوں کا جواب دیا ہے ... میں سب سے مقدم یہ اعتراض تھا کہ آں حضرت صلعم کو مرض صرع چھاہیں سے ... حق تھا۔ راقم سید احمد از مقام لندن مارچ ۱۸۷۰ء (۱۵ مئی)

"ایڈریس سید امداد علی خاں": سید احمد خاں کے پاس ہزار روپے کی ہنڈوی بھیجی جانے ... ذکر کے بعد "سید صاحب.. بمشورہ پروفیسران یونیورسٹی کیمبرج واکسفورڈ، ڈاؤن، راڈیں ... لندن کے ایک فہرست ان کتابوں کی تیار کر رہے جن کا ترجمہ ہونا .. ضرور ہے .. ہم لوگ ... کرتے ہیں کہ اب اہتمام ترجمہ کا .. بہت ضابطے کے ساتھ عمل میں آئے گا" (۱۵ جولائی)

سائنٹفک سوسائٹی صوبہ بہار مقام مظفرپور: "بتحریک سید احمد خاں ... ... ہنگام قیام، لندن بڑے بڑے امرائے عالی مقام انگلستان نے ایک سرکلر بنام علمائے ... یونیورسٹی اکسفورڈ، کیمبرج وغیرہ جاری فرمایا ... وہ فہرست تجویز علمائے موصوفین مرتب ... کر شامل .. سید احمد خاں ... بہادر کے پہنچی - اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ... مورخہ ۱۱ اکتوبر میں مع اسمائے علمائے موصوفین کے چھاپا گیا ... اور سید احمد خاں ... ... نے چند قطعات فہرست .. عندالملاقات مقام علی گڑھ ... سید امداد علی خاں بہادر کے ... لے کیا، اس مطلب کہ بعد مشورہ ہردو سوسائٹی وہ فہرست بحضور نواب گورنر جنرل بہادر ... اس کونسل بامید عطائے نصف خرچ ترجمہ کے بذریعہ درخواست ہردو سوسائٹی روانہ ... جائے اور واسطے ترجمہ کرانے بڑی بڑی دقیق کتابوں کے یہ تجویز ہوئی .. کہ .. ... صاحب مقیم جرمنی کو مہتمم کیا جائے" اس کے بعد یہ کہ سید صاحب نے ... مراجعت بلدہ مصر میں ۵۰۰ کی کتابیں خرید کر بھیجیں اور اس کا انتظام کردیا ہے ... مثل ۵۰۰ روپوں کی کتابیں بھی وہاں سے بھجوائی جائیں (۱ دسمبر)۔

گلدستۂ شعرا پٹنہ

محمد اکبر خاں جری حاجی پوری جو شیدا (نوروز علی خاں لکھنوی تلمیذ امیر اللہ تسلیم) کے شاگرد تھے، لکھتے ہیں کہ "اس نیاز کیش نے صحبت مشاعرہ ہر ماہ انگریزی کی یکم و پانزدہم کو قرار دی ہے اور غزلیں مجتمع ہو کر بطور گلدستہ ہٰذا کے مطبع عالی میں بتاریخ دہم و بست پنجم حسب ایمائے والا ارسال ہوا کریں گی۔۔ ملتمس ہوں کہ آپ بھی بوقت مقررہ بعد غروب آفتاب محلہ لودی کٹرہ واقع عظیم آباد بمکان سید شاہ مبارک حسین .. رئیس (تخلص بہ مبارک شاگرد وحید اللہ آبادی)، قدم رنجہ فرما کر بندے کو ممنون فرمائیں .. مصرع طرح "ہے دل میں اشتیاق شہادت بھرا ہوا" منضوابط گلدستۂ شعرا۔۔ جو حضرت کسی وجہ سے شریک مشاعرہ نہ ہو سکیں وہ .. تاریخ .. مشاعرہ سے دو روز قبل ارسال فرمائیں تا کہ مشاعرے میں پڑھی جائیں اور درج گلدستہ ہوں۔۔ اپنی اپنی غزلوں سے گیارہ گیارہ شعر منتخب کر کے ارسال فرمائیں.. گیارہ شعر طرح کے بلا قیمت اور اشعار غیر طرح اور گیارہ شعر سے زائد کے لیے فی شعر ایک پیسہ اجرت ہے اور جو زیادہ چھپوائیں گے ان سے مطبع بکفایت پیش آئے گا... چار آنہ ماہواری بطور اعانت مطبع لیا کرے گا.. یہ مشاعرہ و گلدستہ کبھی موقوف نہ ہو گا.. رمضان .. میں نعت اور محرم.. میں سلام کی طرح ہو گی۔"

گلدستۂ شعرا کا صرف پہلا شمارہ میری نظر سے گزرا ہے (نمائش ادارۂ تحقیقات اردو) اور یہ ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۷ء کا ہے۔ محمد اکبر خاں کے مطبع کا نام مطبع انتظامی تھا اور گلدستہ ۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بعض ایسی غزلیں ہیں جن کے کہنے والے اس وقت تک زندہ نہ تھے، مثلاً غزل زند لکھنوی۔ آغاز جری کی غزل سے ہوتا ہے، پہلا شعر یہ ہے:

کھلے حمد حق میں دہن کیسے کیسے — زباں سے بر آئے سخن کیسے کیسے

اس کے بعد اسی زمین میں غزلہائے ذیل درج ہیں: غزل نعت جری، غزل زند، غزل شمس الدین احمد اللہ شمس، غزل سید حامد حسین نکہت عظیم آبادی

فنا ہو گئے اہل فن کیسے کیسے — ہوئے بند باب سخن کیسے کیسے

غزل امیر اللہ تسلیم لکھنوی، غزل نوروز علی خاں شیدا لکھنوی

ہوئے گلفشاں یاں دہن کیسے کیسے — کھلے آج باغ سخن کیسے کیسے

نہ بہکا طریق محبت کا رہرو　　　　ملے راہ میں راہزن کیسے کیسے

مولیٰ بخش مسیحا عظیم آبادی، غزل صغیر بلگرامی

ثبات گل و لالہ کیا پوچھتے ہو　　　　اڑے رنگ ہو کر چمن کیسے کیسے

غزل سید احمد حسین احمد عظیم آبادی

صغیر سخنور کی شفقت سے احمد　　　　کھلے ہم پہ راز سخن کیسے کیسے

یار علی متخلص بہ جان صاحب ریختی گو۔ طرحی غزلوں کے بعد شاہ محمد یحییٰ یحییٰ عظیم آبادی کے ۲ قطعات تاریخ جن میں سے ایک یہ ہے:

شیدا و حزیں کہ عمر ہر دو بزیاد　　　　کردند چو بیت شعر خوانی بنیاد

تاریخ مشاعرہ دعا گو یحییٰ　　　　برخواند کہ بزم شعر خاقانی آباد

= ۱۲۹۴ - قطعات کے بعد شمس الدین شمس کی نعت جو "بعد ادائے فیس" داخل ہوئی۔ نظموں کا خاتمہ مخو چوبے متخلص بہ بہار عظیم آبادی کے مسدس پر ہوتا ہے اس کی تمہید یہ ہے:

" یہ مسدس.. ایک شاعر ہمہ داں ملک بلبل ہندوستاں ان کو کہنا چاہیے کیونکہ ان حضرت نے جو صنعت مسدس مذکور میں فرمائی ہے راقم گلدستہ کے دیکھنے.. میں کیا بلکہ سننے میں بھی نہیں آئی ہے۔ مصنف نے فیس ادا کرکے جز گلدستہ فرمایا ہے.. اور حضرت لودی کٹرہ خاص کے رہنے والے ہیں"۔

نٹ بازی اس کی دیکھیے دو دن کی کھیل ہے　　　　حضرت طلسم دنیا کی کشن وکلیل ہے..

ایسے غافل نہ رہو غافلو کچھ گیان کرو　　　　بشنو برہا کی خوشبو کی کوئی دھیان کرو..

درشن سے تمرے اس گھڑی آنند ہو گیا　　　　کلیوں کے تئیں پھول کے پرشند ہو گیا

آخر میں وہ "التماس" جس کے عبارات مقالہ لہٰذا کے آغاز میں درج ہیں۔ پہلا شمارہ کچھ اچھا نہیں، یہ رسالہ کب تک جاری رہا اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ حاشیہ شاگرد و برادر خرد نایاب مطبوعہ ۱۲۹۲ھ میں ان کے کہے کی قطعات تاریخ ہیں جن کے عنوان میں انھیں شاگرد تسلیم بتایا گیا ہے ص ۲۹۔ ذکر السعدین ایک مذہبی مثنوی ہے جس کا آغاز اس بیت سے ہوتا ہے:

لکھتا ہوں جو حمد کبریائی　　　　خامہ بھی ہے صرف جبہہ سائی

ہے۔ آخر میں تسلی کا ایک قصیدہ اور غزل وغیرہ ہے، یہ سب نعت یا منقبت میں ہیں۔ نایاب صاحب دیوان

مطبوعہ ہیں اور ریاض حسن خاں خیالؔ مرحوم کے والد۔ قصیدۂ تعلّی کے ابتدائی اشعار :

فرحتِ دل کے لیے کل جو گئے باغ تلک — گل و غنچہ کی ہر اک سمت کو پھیلی تھی مہک
نکہتِ گل سے معطر تھا تمامی گلشن — کہیں بیلے کی لپٹ تھی کہیں جوہی کی گمک
چشمِ نرگس کا وہ عالم کہ اشارہ جس کا — حور کی آنکھ پہ ہر مرتبہ مارے چشمک
ایسا ہر نخل ہوا بادِ بہاری سے ہرا — جس کے پرتو سے نظر آنے لگے سبز فلک
ٹہنیاں بار سے پھولوں کے وہ جھکی جاتی تھیں — جیسے کھائیں کمر یاغنچہ دہانوں کی لچک
غنچے ہنستے تھے بجاتے تھے جھلا جل پتے — چشمِ انجم سے سماں دیکھ رہا تھا یہ فلک

لہ واضح رہے کہ شیداؔ کا شاگردِ تسلیمؔ ہونا اس گلدستے سے ثابت نہیں، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے تسلیمؔ کا ایک خط جو حیاتِ تسلیم معنفہ وحشتؔ میں ہے اس پر مشعر ہے۔ ذکر الشعرا میں معنفہ مہدی حسن خاں، تعلّی۔ قران السعدین جس کا ذکر حاشیہ میں ہے مہدی حسن خاں تعلی شاگرد و برادر خرد نواب مطبوعہ ۱۲۹۲ھ میں نوروز علی خاں شیداؔ کے کہے ہوئے کئی قطعات تاریخ ہیں جن کے عنوان میں انھیں شاگرد تسلیمؔ کہا گیا ہے ص ۲۹
ٰلہ یہ سید شاہ محمد حسن بسملؔ شاگرد مسعود کے جد مادری تھے۔ ان کا کلام پرانے گلدستوں میں ملتا ہے ان کا دیوان مرتب تعداد کے اشعار کی ایک بیاض تھی جو ان کے دولتخانے سے ہی غائب ہو گئی تھی۔

گلدستۂ بہار

گلدستۂ بہار کے ۷ شمارے (اپریل ۱۸۸۹ء تا اکتوبر) جو خدابخش لائبریری میں موجود ہیں، پیش نظر ہیں۔ اس پرچہ میں مضمون اور نثر کے مطالعہ کی بیں۔ اسکے "اشتہار" کے عبارات ذیل ملاحظہ ہوں:-

" ان دنوں بتجویز شرکائے شیخ احمد کمپنی لمیٹڈ ایک مطبع موسوم بہ وکٹوریہ پریس مکان میں شیخ احمد علی ... کے واقع محلہ [illegible] مطبع جو اکثر ہے ... یہ ... ہر انگریزی مہینے کی ۲۰ کو شائع ہوتا ہے۔ اس میں کلام اُردو و فارسی مع (کذا) تذکرۂ شعرائے عرب و ہند و بہار وغیرہ اخبار متفرقہ چھپتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تحریریں جو خلاف تہذیب یا ہجو شخصی یا مضمون طعن و فحش نہ ہو، اور کیفیت مصرع طرح اُردو و فارسی الف کی ردیف سے (کذا) تک ... رسال خدمت کئے جائینگے۔ اور عبارت نثر جسے کہ مفید عام ہو (کذا)۔"

ایک گلدستہ کی حیثیت سے اشتہار میں تو نہیں، کلام ساقہ سید شاہ عطا حسین، عطا، آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر ہوا کرتا ہے۔ لیکن اشتہار میں دو شخص مالک مطبع بتائے گئے ایک تو احمد دوسرے شیخ خیرات حسین (منصف) کاتب سید محب حسین محب ساکن شیخپورہ تھے۔ سالانہ قیمت معہ محصول بہار سے ۳ روپئے۔ احد یا بردالوں سے وصول کی جاتی تھی۔

گلدستہ میں طرحی (اُردو و بہت زیادہ فارسی طرح شامل) اور غیر طرحی (اُردو زیادہ فارسی کم) غزلیں شائع ہوا کریں۔ اس کے علاوہ بعض دیگر اصناف سخن کے نمونے بھی چھپتے ہیں حسب ذیل شعراء کی غزلیں ان شماروں میں موجود ہیں: (۱) عطا (۲) محب۔ (۳) ارشاد، سید ارشاد حسین بہاری شاگرد خلیفہ[1] (۴) امجاد، شاہ امجاد حسین خلف سید ارشاد حسین (۵) بقا، سید اولاد علی ساکن دائرہ بہار (۶) برق، سید یعقوب حسین دائرہ (۷) سید، حکیم میر سید حسین بزنی باغ بانکی پور (۸) جوہر، جوہر التوحید بلد ماسٹر اسکول لبید بنگلہ (۹) حسرت، اساوت حسین خاں رئیس بڑکی برانواں (۱۰) حکیم، محمد اسمٰعیل سب رجسٹرار بلیہ، خلف اوسط محمد بخش خاں[2]۔ (۱۱) وحرم، وحرم لال ... در یا پور ... (۱۲) صفا، عبد الحی وکیل عدالت دیوانی بلاری ضلع مراد آباد[3] (۱۳) صابر، صابر علی خاں تاجر بارہ دری بہار (۱۴) عرفان، شاہ محمد کبیر دانا پوری، پسر شاہ محمد ... عطا ... خود اکبر دانا پوری (۱۵) فدا، سید شاہ فدا حسین بارہ دری (۱۶) فنا، شیخ عنایت حسین محلہ ... بہار (۱۷) اکبر، دانا پوری (۱۸) باسط، عبد الباسط ساکن برنگیہ (۱۹) احمد سید شرافت کریم، دائرہ۔ (۲۰) فقیر، ... سبانے۔ حالمقامی، محلہ خندق بہار (۲۱) ... ساکن بہن سگہ، حالمقامی بارہ دری ... (۲۲) ...

---

[1] بعض شماروں کے کچھ اوراق غائب معلوم ہوتے ہیں۔ [2] شاگرد۔
[3] مراد آبادی۔ [4] پدر خدا بخش خاں، بانی کتب خانہ

بالاکش، عرف دمون، ساکن بالہ، حالمقامی ادا بارہ چھگی۔
(۲۳) انجم، کلیت غلام محی الدین احمد (۲۴) فخری، ابوالبا فخر، عرف محمد تقی
ساکن میدنی، ش آزل (۲۵) حقیر، حکیم شاہ فضل حسین حبیب گنج، ش
بابات بہار، ش رنگی (۲۶) قاسم، سید قاسم حسین، ش سخی ساکن
آرہ (۲۷) قاقی، سید ناظر حسین عرف میر و دیگھیباری، ش رنگی
(۲۸) عزیز، شاہ عبدالعزیز خلف اکبر شاگرد رنگی (۲۹) خوب، محمد یار
حالمگنج بہار (۳۰) کیفی، شیخ اسماعیل (۳۱) فدا، شیخ فدا حسین ساکن ...
(۳۲) ظہیر، محمد ظہیر پسر محمد امیر مختار (۳۳) آزل، حکیم مرزا آغا جی
لکھنوی (۳۴) عوینہ، قاضی سید عبدالوحید، عرف سید درگاہی رئیس
ضلع مونگیر، ش آزل (۳۵) اختر، شاہ سید حسین ش آزل (۳۶)
آزاد، سید شاہ عبدالعظیم دانا پوری (۳۷) نشاط، وزیر خان، آگرہ
حالمقامی اجمیر، ش اکبر (۳۸) شوق، امیر اللہ ساکن اجمیر ش اکبر۔
(۳۹) فخر، سید محمد شفیع قادری ساکن اجمیر (۴۰) اکرم، اکبر الحق
سررشتہ دار منصفی بہار (۴۱) نہال، سید شاہ الفت حسین ساکن محلہ
کاشی تکیہ (۴۲) مشتاق، سید محمد حسین، عرف منشا حسین بہاری ش رنگی
(۴۳) فیاض، مرزا محمد فیاض ساکن اجمیر (۴۴) نشاط، نثار علی
آگرہ ش اکبر (۴۵) بسمل، شیخ ریاض الدین آگرہ، ش ابراہیم
(۴۶) باقر، باقر خاں عطر فروش ش آزل (۴۷) انجم، جوگی۔
(۴۸) وحید الہ آبادی (۴۹) اعظم، محمد اعظم استاذی (۵۰) اثر
سیاہ پوس ش آزل (۵۱) حجنی، سید سبط الحسنین باڑھ پاری (۵۲)
ظہیر، منصور سید ظہیر الحسن رضوی عظیم آبادی (۵۳) رمضان
سید رمضان علی ساکن رجہت ش راحت (۵۴) ذوق، حکیم سید
قمر الحسن، محلہ خواجہ اختیار ترسیٔہ کلم بہار (۵۵) رکن، سید
شاہ عبدالکریم رئیس بہار تکیہ خرد (۵۶) متین، شاہ معین الدین
احمد خلف محی الدین احمد سجادہ نشین خانقاہ شہسرام ش ...
(۵۷) جرأت، لطیف حسین خاں رئیس پکری بجاوان (۵۸)
رسا، سید غلام محی الدین (۵۹) لطیف، سید لطافت حسین ساکن
گراٹ (۶۰) برق، حکیم اظہر حسین ش دنج ساکن سمانوال
(۶۱) برق، ... حسین خاں عظیم آبادی (۶۲) سید ل،
بوآن سمل انگریزی ٹیچر اسکول برہنگیہ (۶۳) جرأت، سعید اشعر

استاذی، ش انت نام الفت عظیم آبادی (۶۳) حسنی، محمد حسین شہ
... (۶۴) ادریس، شاہ محمد ادریس ساکن گرولو، ش اکبر (۶۵) زیبی
عبدالحی ... زمیں مقام دربھنگہ (دکن) (۶۶) شمسی، شاہ شمس الدین
ش، حسن علی خاں راحت، شہسرام (۶۸) انجبوبہ، شیخ محمد انجبوبہ عظیم آبادی
ش اکبر (۶۹) ذوقی (دکن) نذیر الحق پھلواروی (۷۰) نصر، سید
نصر اللہ دانا پوری ش اکبر (۷۱) شیو، شیو سہائے، ساکن برا ...
پور ضلع گیا، حالمقامی بارہ دری (۷۲) رسول، رسول یار خاں حالمقامی
دربھنگہ (۷۳) عطا، شاہ عطا امام کاشی تکیہ بہار (۷۴) انشر، یار ...
اور بخش خاں، ساکن سلطان پور ضلع سارن (۷۵) چھوٹی، چھوٹی
طوائف لکھنوی حالمقامی بہار (۷۶) مظاہر، مظاہر امام انجم
(۷۷) مشتاق، واحد علی ناظر (۷۸) حسن، محمد علی حسن، ساکن
بہڑیا (۷۹) ضیا، سید شاہ احمد امام دائرہ (۸۰) مبارک، سید
مبارک حسین، ش اکبر (۸۱) یاس، شیخ ماجد حسین لکھنوی ...
(۸۲) عطا، سید شاہ عطا امام کاشی تکیہ

(۳) غزلوں کے ردیف و قوافی حسب ذیل ہیں: ردیف ...
قوافی یاد، خار، وغیرہ۔ ردیف آج، قوافی، کبھی، زمیں وغیرہ
ردیف کھینچ دل، یار وغیرہ۔ ردیف کسی طرح، قوافی سامان، ...
وغیرہ۔ ردیف سنج قوافی خار وغیرہ۔ ردیف صیاد قوافی کر، ...
جہاں وغیرہ۔ کچھ طرحی اور کچھ غیر طرحی اشعار جو حصہ نظم میں ہیں، بطور
نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

شیخ — وہ کہا عرب شباب آنے سے صورت نکل
دور صورت بھی وہ نکل کر قیامت نکل

مشتاق — دل جو ہے مائل زلف دوتا کس سے کہیں
آپ سے میں نے خرابی اپنا یہ بلا کس سے کہیں

متین — سناؤں کیا میں تجھے اپنی داستاں صیاد
کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد

کیفی — بچ رہا جو ہم سے وہ غیروں کا سارا مال ہے
تو جو ہم کہتے ہیں جس کو وہ ہمارا مال ہے

... کلیمی ... معلوم ... دونوں ... ایک ...
... صرف فارسی کلام ... سبق ... اردو
... ہے۔

مانگے جو دل تو تیک جان تو تمہارا مال ہے
جان سے زیادہ کسی کو پیارا مال ہے
تم نقاب الٹو بھی اپنے عارض پر نور سے
لن ترانی کی صدا کیا دیتے ہو دور سے
دیکھ لیں گے جلوۂ حق ان حجابوں کے تلے
چھپ کے جاؤ گی کہاں آخر تجلی طور سے
ہم وہ میکش ہیں نہ اٹھیں جو ساقی [illegible]
جوش کھا کر خود بخود پیتے شراب انگور سے
کیا جانے لگی ہے کیا بے خودی مجھے
کہتی ہے آگہی کہ مجھے کچھ خبر نہیں
[illegible] گلستاں میں سب غنچہ و گل
کھوتی بلبل ناشاد ہے منقار عبث
[illegible] باغ سبز میں یاں [illegible] رنگ
جس گل کو دیکھتا ہوں نیا ایک رنگ ہے
[illegible] میں جان بھر کے صدیوں سے تنگ ہے
جھگڑا اجل سے [illegible] ہر وقت جنگ ہے
یاد آتی ہے مجھے ہائے جوانی تیری
جاڑے کی دن میں جیسے چاندنی [illegible]
اے فلک تو نے یہاں تک مٹایا مجھ کو
خاک ہوئی نہ مری کر دیا تربت برباد
جو تکتا ہے مجھے نقش قدم سے یقیں آتا
رشک گل حسن ان سے مدینہ کی زمیں آتا
معمور جو گلوں سے گلستاں کی طرح
پھر بنتیں جو عیش کا سامان کس طرح
لٹ کے دل کو [illegible] آئے تھے اک امید پر
[illegible] ہے تری [illegible] کا کیا معلوم تھا
ہمسر بان ہوگا جرس کا قافلہ میں کون
یاں آہ ورنہ ضعف سے ہے نالے کا دشوار کھینچ

[illegible] مکانات دو [illegible] کی ہے [illegible] کر دی جائے مگر اس صورت میں [illegible] ۔ [illegible] کھینچ ۔ [illegible]

بجرۃ غم ذکر فصل بہاری کا کبھی اے بلبل
خوف گلچیں کا بھی اندیشۂ صیاد بھی ہے
بدلی چھوٹی بھی ہے سنبل میں شرارت بھی ہے
شکر قہر بھی ہے چشم عنایت بھی ہے

سیدی سلسلہ الفت کا لے دل کسی کے ڈالا پاؤں میں
ناتوانی میں ہے بیڑی خوب پہنایا پاؤں میں

حسرت ابرو میں [illegible] پر قسمت خنجر تہ خنجر [illegible]
ہیں خاطر عشاق پہ خنجر تہ خنجر

آزل کیا کبھی ہو یہ ہر دم لاکھوں مرے عاشق ہیں
دیکھوں میں ذرا صورت اے دل [illegible]
اب ملا ہے مجھے محبوب وہ نایاب [illegible]
آپ کیا حضرت یوسف کو بھی آداب [illegible]

اختر بگڑے ہوئے وہ بیٹھے ہیں ہم کیا کریں اختر
سمجھائیں کسے دل بھی تو پہلے میں نہیں ہے

گرم جب چل نہ سکے خود تو جھٹے چار کے کاندھے
یوں پہنچے ہیں ہم منزل اول کے قریب آج

آزل آزمائیں آؤ یا ہم ہے کشش کس کی سوا
میں تجھے کھینچوں یا ادھر یا تو ادھر لے یار کھینچ

گرم تحقیق اپنی چاہئے علم دبستاں میں گرم
مشکل ہے [illegible] بہند الامام روز

غیر طرحی کلام کے ساتھ سیدی کا ایک مخمس بھی ہے اس میں ناسخ کی غزل (آب تو دے، داب تو دے) کی تضمین کی ہے ۔

مضامین نثر کے ساتھ بھی کچھ اشعار ہیں ۔ ایک نثر بھی غزل بعنوان "قول حق" کسی شاعر کی ہے ۔ جو اپنے کو "حقگو" کہتا ہے ۔ غزل دانا پور سے بھیجی گئی تھی ۔ اسکے دو شعر یہ ہیں ،

[illegible] تو اسلام ہو شر غزال [illegible] دوسرا کوئی ہے دعوی بیکار عبث
کیسی گمراہی ہوئی ہے یہ شامت زدہ قوم ا بسیں ایسا کوئی [illegible] عبث

دو مختلف شماروں میں اکبر دانا پوری کے دو قصیدے کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں ہیں ۔ ان میں سے ایک صنعت مہملہ میں ہے لیکن کلب علی خاں کے نام کے ساتھ دو جگہ لفظ "شاہ" آیا ہے ۔ قصیدہ اولی

کی بیت اول یہ ہے:

دور ایام سعادت یہ ہوا گر گیا ہر ستارہ مگر الہ طرف سے کیے

پہلا قصیدہ کے بعد دو رباعیاں و لی اللہ راہبر سے تعلق

رکھتی ہیں۔ آخر میں جو قطعہ ہے اس میں اکبر کے بارے میں مرقوم ہے کہ

اپنے والد سید شاہ محمد سجاد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے

تھے۔ اس کے متعلق ایک قطعہ ہے جس کی بیت آخر یہ ہے:

سال سجادگیش گشت کہ اکبر حق

شدہ سجادہ نشیں جائے محمد سجاد ۱۲۹۸ھ

اس قطعہ میں اکبر کے بڑا اور بیر کا نام شاہ محمد قاسم بتایا گیا ہے

اور ان کے رسالے "نجات قاسم" کا ذکر ہے۔

تذکرۂ شعرا کے سب ملا کر ۱۲ صفحے ہیں (۲۲ تا ۳۹) ۲۱ صفحے

قبل کے شماروں میں شائع ہوئے ہوں گے [illegible] تا [illegible] میں جو شعرا ہیں

شعرا کا حال و کلام حسب ذیل ہے:

بقا۔ سید شاہ اولاد علی ابو العلائی، سجادہ نشیں خانقاہ دائرہ

بہار شریف۔ متولد ۹ رجب پنجشنبہ ۱۲۵۱ھ۔ از اولاد سید شاہ

احمد امام عکرا ہی معاصر فرخ سیر۔ مرید و خلیفہ خود سید شاہ

اصالت علی۔ دو غزلیں:

خوب دنیا کی ہوا کرتی ہے منزل ٹھنڈی

کیا ہوا چلتی ہے دل کش لب ساحل ٹھنڈی

جب حجاب اٹھتا ہے کھلتا ہے پردہ راز کا

ایک ہو جاتا ہے پردہ مکان کا اور ساز کا

بہجت۔ شیخ غلام محی الدین احمد، پسر شیخ مولا بخش۔ مسکن عظیم آباد

عمر چند روز سولہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر فارسی کی استعداد بہت اچھی

ہے۔ بالفعل انگریزی پڑھتے ہیں۔ ش۔ شاہ محمد حسین عظیم آبادی

ایک غزل۔ جب ہو جلوہ اس کی برق عارض پر نور کا

پھر چلانا کیا ہے مشکل ایک قند فل طور کا

برق۔ میر مقبول حسین، ساکن دائرہ۔ پیچ و شی میر ارادت علی

نواب بخش بہار کچہری کے تھے۔ بالفعل ترک کیا۔ ایک غزل:

کہ وہ بولے جو کر کے کیا ہے جان جان ہمارا کا

تذکرہ کا ہو جو جان تم جان ہماری ہے

اکسیر۔ حکیم سید محمد بنگوی عالی خاندان۔ اکثر شعرائے

کے شاگرد۔ تخلص فاروقی بخش مرحوم مفتون۔ عمر قریب ۶۵ سال

بلیغ۔ سید سبط الحسین، خلف خادم حسین ساکن بادشاہی

زمین الدین حسین خان کو ڈپٹی کلکٹری اور ان ماہ چشت

کے زمانہ میں جو جلسہ مشاعرے کا اسکول بہار میں قرار پایا

کیفی کے شاگرد ہوئے اور تا قیام جلسہ داخل جلسہ رہے۔

سید شاہ آل احمد سجادہ نشیں خانقاہ مولانا کے نشی میں

باسط۔ عبد الباسط ساکن برگچہ ضلع مونگیر۔ یہ مولانا

خان بہادر کے حقیقی نواسے ہیں۔ ان کے نانا ایک مدت

عالیہ کلکتہ میں مدرس رہے کر مفتی عدالت گیا۔ اس کے بعد

میں اعلیٰ ہوئے تھے۔ گیا میں فوت ہوئے۔ باسط کے والد

مرحوم قصبۂ نو آبادہ ضلع گیا کے قاضی تھے۔ باسط

سرکار میں۔ ایک غزل۔

جو ہر۔ جوہر التوحید ساکن برگچہ۔ وہاں کے

مولوی احمد گویا بانی ہیں۔ مرید پیر و مرشد یا چند رسالہ

دو غزلیں۔

جدید اخبارات کے تحت شمارہ ۱۶ بارک کے

شیخ امام علی تاجر کتب کو چند روز سے خبیث کا

جن کا شور خیر بیان نہیں ہو سکتا۔ کوئی ظروف بنے

خود ٹوٹ جاتے ہیں۔ صندوق وغیرہ جو رکھا جاتا

ہے۔ مکان چھوڑ کر دوسری جگہ گئے تو اور بھی

اتنے روڑے پتھر برسے کہ اگر جلد سابق مکان میں

تو کوئی عضو بدن باقی نہ رہتا۔ جو شخص بے تعلق

بدن سے کپڑے نکل کر اتر گئے ہیں اور اس کا جوتا

خود بخود پٹنے لگتا ہے۔ اور وہ خبیث اس کے تمام

لیے لگتا ہے۔ (شمارہ ۱۸ میں اسی محلہ کے ایک

متعلق مرقوم ہے کہ مکان میں دو آسیب کی خلش

نمائش ہے۔ (۲) محلہ مرداد میں ایک کلب کا مکان

ل ۳۰ صفحے ایک شمارہ میں بدال چند سرا اجس ۳۰ تا ۳۲ کے گئے۔

۲ بعد کو بہار شریف میں رہے دوست محمد فرخ الدین حسن صاحب والد۔

(۳) شمارہ ۲ (۳) بہار کے رئیس میر سعادت علی کی وفات۔ مر
عارجون۔ شمارہ ۱۱۔ بہار کے رئیس اعظم کی اکلوتی لڑکی کی وفات۔
اشتہارات اور تبصرے: شمارہ ۱ (۱) تذکرہ گلدستۂ انجمن
الموسوم بہ شمیم سخن۔ (۲) پیام یار، لکھنؤ جو ۱۸۸۰ء سے نکلتا
رہا تھا۔ (۳) زینت سخن (اخبار جاثب خاں صوفی)
(۴) اخبار تحفۂ ہند۔ شمارہ ۵ (۵) اشتہار اخبار امپیریل
گزٹ (اردو) اشتیاق حسین نظم کیم ستمبر ۱۸۸۸ء سے جاری ہو کر
مہینے میں دو بار شائع ہوا کریگا۔ (۵) سراج غوث، کتاب بابۃ
مسائل نکاح اس کی تعریف لیکن مصنف کا نام نہیں دیا۔ شمارہ ۱۱
(۷) اشتہار رئیس بہار کے اڈیٹر سید یاقت علی (۸) اشتہار
مثنوی تصویر سخن از مرزا [illegible] جانب مرزا نظم بادریزم دو بولے
قطعات تعلیق، مؤلفہ منشی عبدالکریم۔

مضامین نثر: شمارہ ۱ "قومی ہمدردی بذریعہ باہمی ترقی"۔ از
محمد احمد صاحب رئیس موضع ڈومری" اس کا آغاز یوں ہوتا
ہے میں اپنے سچے دل اور پورے یقین اور اسکو دیکھ کر دوربین
اور خوردبین دونوں میں خوب تامل کر کے جو دیکھتا ہوں تو
بہت اور کامل طور سے اپنی قوم میں اچھے اچھے ملکی لوگوں میں سمجھ رہا ہوں
دکھائی دے کی بمقامات ترقی نہایت درجے پر پاتا ہوں۔
یعنی الفاظ ادبی ہے: حکماؤں علماؤں " دکھیں قوم
عالموں پرس کر حسرتوں کیں خوب دلاویں " سے میری شائستہ
قوم قوت ومالی کی ترقیوں کو بدخیالوں میں ضائع کرنے والے
میری محمد قوم... کر حد بناؤ عقلوں قواریخ نا انبار
افسوس اسوں نے شمارہ کے صفحہ میں ایک فارسی تحریر مولوی
یحییٰ الشاغانی کی ہے۔ جو بقول الحسید نگار (مہتمم مطبع
کلا البذ) مؤرخ بہت بڑے عالم اور فیلسوف تھے۔ اور
۲۳ زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔ عنوان " سیاست، مدن
و۔ خدابخش خاں (بانی کتب خانہ) کے ایک رسالے کا بہ منحہ
(مع خاتمہ) ایک قسط کے ساتھ میں صفحہ ۲ صفحوں سے تین کے
صفحات [illegible] شماروں کے ساتھ شائع ہونگے۔ غالباً
مولف نے اس مختصر رسالے میں اپنی تحقیقات بہم پہنچائی ہے

اور بڑی جانفشانی اور محنت سے بڑے بڑے محققوں کی تحقیقات
سے خلاصہ کر کے لکھا ہے، اس کتاب سے تمام لوگوں کو فائدہ حاصل
ہوا بخصوصاً عظیم آباد کے باشندوں کو مصنف۔ ایک عنوان یہ ہے
" احوال راجاؤں کا جارا سندیہ سے ماہر اسکے": اسکے تحت رقم
ہے: جارا سندیہ اپنے وقت کا بہت قوی راجہ تھا، اور اسکے
وقت میں سلطنت مگدھ دیش کی نہایت زینت و قوت دکھتی تھی
چنانچہ آثار اسکے فتوحات کے بابوں میں بنے ہوئے تھے۔ جو مہابھارت
نے شامیہ۔ ولفورڈ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے آثار
اور بجا گنگا کے کنارے پر تھے۔ اور قبیلے اسکا یونانیوں کی تاریخ کی
کتابوں سے ملتا ہے۔ راجہ کنس متھرا کا راجہ جارا سندیہ کا داماد
تھا اور دو لڑکیاں جارا سندیہ کی ایک زمانے میں اسکی زوجیت میں
تھیں جب کنس کرشن کے ہاتھ سے مارا گیا اور اسکی جورواں (لڑکیاں) اپنے
باپ پاس (لڑکیاں) خبر بادی آئیں اسوقت جارا سندیہ کو نہایت غصہ
ہوا۔ اور ایک بڑی لڑائی درمیان جارا سندیہ اور کرشن کے ہوئی
اگرچہ یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ جارا سندیہ اس لڑائی میں مارا
گیا یا بعد لڑائی کے مگر ہلاکت جارا سندیہ کی کرشن کے ہاتھ سے ہوئی
بعضے مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ بالا کرشن کے بھائی نے جو نہایت قوی
اور تندرست تھا جارا سندیہ کو چیر ڈالا تھا " الی آخرہ "
صدیہ بہار کے کئی شاعر جو ۱۸۸۸ء میں اہمیت حاصل کر چکے تھے، ان
شمارہ ۱۱ سے غیر حاضر ہیں۔ خاص عظیم آباد کے جو شعرا ہیں ان میں
بجز آزاد کے سوا شاید ہی کوئی ہو جسے آجکل دس پانچ آدمی بھی جانتے
ہوں مقصد بہار کے بہت سے شعرا کا کلام ان شماروں میں موجود ہے
ان سبھی کی نسبت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ نواح عظیم آباد کے شعرا میں
اکبر کی اس گلدستہ پر نظر عنایت تھی ان کا اسد تک سارہ کا کلام
میں ملتا ہے۔ بیرون بہار کے دو اہم شاعروں کا کلام ان شماروں میں ہے
اور یہ وحید الہ آبادی اور آتش لکھنوی ہیں مگر آزاد اس زمانے میں بہار
ہی میں مقیم تھے۔ نثر میں اگر خدابخش خاں کی تحریر نکال دی جائے تو
کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی حد تک بھی اہمیت رکھتی ہو۔ اس گلدستے
کا شمار اپنی قسم کے اچھے رسالوں میں نہیں ہو سکتا۔

اُردو انڈین کرانکل پٹنہ ۱۸۸۵ء

انیسویں صدی کے اواخر میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار انڈین کرانکل پٹنہ سے نکلتا تھا، اور وہ شخص یا اشخاص جو اس کے مالک تھے اردو انڈین کرانکل بھی انھیں کی ملک تھا۔ انگریزی اخبار کب نکلا تھا اس کے بارے میں میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں لیکن اردو انڈین کرانکل کے شمارہ ۲ جلد ۵ (۹ جنوری ۱۸۸۵ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ اوائل ۱۸۸۵ء میں اس کی زندگی کا پانچواں سال شروع ہوا تھا جس سے ظاہر ہے کہ جلد اول کا پہلا شمارہ جنوری ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا ہوگا۔ اُردو انڈین کرانکل کا آخری شمارہ جو میری نظر سے گزرا ہے ۲۲ نومبر ۱۸۸۶ء کا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ اواخر سال تک اسی نام سے نکلتا رہا ہوگا۔ اوائل ۱۸۸۷ء میں اس نام کا اخبار نکلنا بند ہو گیا اور ایک دوسرا اخبار اردو بہار ہرالڈ و انڈین کرانکل[1] جاری ہوا۔ مؤخر الذکر کے بعض چند شمارے میں نے دیکھے ہیں اور [illegible] جنوری ۱۸۸۷ء سے ۲۶ فروری ۱۸۸۷ء تک کے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر شمارے کے صفحہ ۲ کی پیشانی میں نمبر ۲۰ تاریخ روز شنبہ ۱۸۸۷ء جلد ۱ مرقوم ہے۔ ۸ جنوری کے شمارے سے مطلق پتا نہیں ملتا کہ اُردو انڈین کرانکل سے اس کا کیا تعلق ہے اور ۲۶ فروری کے شمارے میں کوئی اطلاع اس کے بارے میں نہیں کہ یہ بند ہو رہا ہے۔ اُردو بہار ہرالڈ و انڈین کرانکل کا خاتمہ کب ہوا، میں نہیں کہہ سکتا مگر میرا قیاس ہے کہ زیادہ [illegible]

---

[1] کرانکل بابت ۲۲ مارچ ۱۸۸۶ء میں ایک خبر بہار ہرالڈ کے حوالے سے مندرج ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہار ہرالڈ و انڈین کرانکل دوسرا اخبار نہیں بلکہ وہی اردو انڈین کرانکل ہے۔

۱۸۵۵ء و بعد کے شمارے ۱۶ صفحوں پر چھپا اور تقطیع ۱۲½ × ۹¾ انچ ہے۔ ۱۸۵۶ء
کے شماروں کے ہر صفحے میں ۳ کالم ہیں اور اس کے بعد ۲۔ سنہ مذکور میں شہر والوں سے
سالانہ قیمت ۱۲ روپے اور باہر والوں سے ۱۰ لی جاتی تھی جو اس کے بعد گھٹ کر
علی الترتیب ۵ اور ۶ روپے رہ گئی تھی۔ اردو اخبار کے ساتھ جو لوگ انگریزی اخبار
بھی خریدا کرتے تھے، ان سے قیمت میں رعایت کی جاتی تھی۔ انگریزی اخبار کا حال معلوم
نہیں لیکن اردو کا روز اشاعت ۱۸۵۵ء و ۱۸۵۶ء میں روز دوشنبہ تھا، اردو ہرلڈ و
انڈین کرانکل نے اپنا روز اشاعت سنیچر رکھا تھا۔

کرانکل کے مدیر کا نام اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، اور ۱۳ اپریل ۱۸۵۵ء کے
شمارے میں (اور اس سال کے اور بہت سے شماروں میں بھی) مدیر کی ترجمہ کی ہوئی
ایک کتاب کا اشتہار نہ ہوتا تو کوئی ذریعہ یہ معلوم کرنے کا نہ تھا کہ کرانکل کی عنان
ادارت کس کے ہاتھ میں تھی۔ شمارہائے مذکور میں مدیر کا نام سید عبدالغنی درج ہے
اور ان کے نام سے پہلے لفظ "مولوی" اور اس کے بعد "ایڈیٹر اردو و انڈین کرانکل"
مرقوم ہے۔ ۱۳ اپریل ۱۸۵۵ء سے اواخر دسمبر ۱۸۵۵ء تک تو یہ ضرور مدیر تھے
اور قریب بہ یقین ہے کہ "نوائے وطن" کا تبصرہ جو اواخر دسمبر ۱۸۵۴ء میں چھپا تھا
(اس کا ذکر باب ۲ میں آئے گا) انھیں کے قلم سے ہے، اور اس زمانے میں بھی یہی
مدیر تھے۔ ۱۸۵۶ء کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، "اردو ہرلڈ و انڈین کرانکل"
سے یقیناً ان کا کچھ سروکار نہ تھا۔ یہ غالباً وہی بزرگ ہیں جو کستھانواں ضلع پٹنہ
کے رہنے والے تھے، اور بعد کو ریاست حیدرآباد میں ملازم ہو گئے تھے۔

۱۸۵۵ء و ۱۸۵۶ء کے شماروں کے صفحۂ آخر میں آخری الفاظ یہ ہیں "مطبع اردو
انڈین کرانکل میں باہتمام منشی لیاقت حسین کے چھپا" اور ۱۸۵۵ء کے تمام شماروں کے

صفحہ ۱ میں بابو بشیشر سنگھ "منیجر مطبع" بتائے گئے ہیں اور ہدایت کی گئی ہے کہ اخبار کی قیمت اشتہار کی اجرت انھیں کے نام سے بھیجی جائے۔ یکم اگست ۱۸۸۵ء کے شمارے میں بشیشر سنگھ منیجر مطبع کی طرف سے اطلاع ہے (اور یہ اطلاع ۲۲ دسمبر تک چھپتی رہی ہے) کہ مولوی محمد یحییٰ وکیل عدالت دیوانی پٹنہ کرانکل کے اسسٹنٹ منیجر ہو گئے ہیں اور کسی کو کوئی چیز چھپوانی ہو تو ان کے پاس بھیجے یا ان سے زبانی گفتگو کرے۔ ۱۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کے شمارے میں یہ اعلان ہے کہ ۲ ستمبر سے کل کاروبار مطبع کا متعلق بابو بشیشر سنگھ مالک مطبع اردو انڈین کرانکل و انڈین کرانکل انگریزی و اردو وغیرہ کا ہوا... روپیہ وغیرہ... براہ راست بابو صاحب موصوف کے (نام) روانہ کیا کریں۔" ۱۸۸۶ء کے شماروں کے ص ۱ میں بشیشر سنگھ کا نام بحیثیت مالک مطبع مندرج ہے اور اردو ہرلڈ و انڈین کرانکل کی بھی یہی کیفیت ہے لیکن مؤخر الذکر کے شمارہ ۲۹ جنوری میں پبلک سروس کمیشن کی کارروائیوں کی جو روداد چھپی ہے اس میں (ص ۱۱) زیر عنوان "اظہار" یہ عبارت ہے۔ "بابو بشیشر سنگھ وکیل عدالت دیوانی پٹنہ و زمیندار ضلع شاہ آباد جو اسسٹنٹ پروپرائٹر[۱] بہار ہرلڈ و انڈین کرانکل کے ہیں" اس کے مہتمم بھی لیاقت حسین نہیں رہے ان کی جگہ نرائن چندر چکربتی کا نام ملتا ہے۔ میں فی الحال اس اخبار کی ملکیت اور انتظام کے بارے میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا اور اس بحث کا خاتمہ عبارت ذیل پر کرتا ہوں جو ۱۷ ستمبر ۱۸۸۶ء کے شمارے سے لی گئی ہے: "چونکہ ہمارے مطبع کے اکثر ملازم ہندو ہیں... ابتدا ہی سے درگا پوجا میں یہاں تعطیل ہوا کرتی ہے... اس مرتبہ بھی

۱؎ اسسٹنٹ پروپرائٹر کی اصطلاح میری سمجھ میں نہ آئی۔

سو و ہفتے کے لیے مطبع بند۔۔ ہے۔ ۱۴ اکتوبر[1] کا پرچہ نہ پانے سے بھیانک نہ ہوں؟

جلد پنجم میں مختلف مقامات میں ان اصحاب کے نام ملتے ہیں جن سے اخبار کی قیمت وصول ہوئی تھی۔ جہاں تک نام سے معلوم ہو سکتا ہے، ان میں ۱۹۶ (یا ۱۹۷) ہندو، ۱۶۲ (مسلمان، ۵ (یا ۴) عیسائی تھے۔ کچھ نام ان میں مکرر بھی ہوں گے۔ اس زمانے کے بکثرت عمائد اس کے خریدار تھے۔

دوسرے اخباروں کی طرح کرانکل بھی اشتہارات چھاپتا تھا، اور میرا خیال ہے کہ سال بھر کے اشتہارات نے جو جگہ لی ہے اس کا حساب کیا جائے تو اوسط فی شمارہ ۳ صفحے نکلے گا۔ اس میں ایسے اشتہارات بھی برابر شائع ہوا کرتے تھے جو عام اخباروں کی بہ نسبت طبی اخباروں اور رسالوں کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ کرانکل خبریں بھی دیتا تھا اور جمہور کے خیالات کی ترجمانی اور رہنمائی بھی کرتا تھا۔ عموماً اہم امور کی طرف زیادہ اور غیر اہم کی طرف کم توجہ کی جاتی تھی، مگر خبروں کے متعلق اتنی احتیاط نہ ہوتی تھی کہ کوئی غلط بات شائع ہی نہ ہونے پائے (دیکھیے باب آخر کی تمہید)۔ مقالات افتتاحی[2] عموماً بصیرت افروز ہوا کرتے تھے اور بڑی بے باکی سے لکھے جاتے تھے۔ میرے نزدیک اس زمانے

۱۔ پہلا شمارہ کے پرچے میں ہے کہ عشرۂ محرم اور دسہرا کی پوجا کی وجہ سے دو پرچے نہ نکلیں گے۔

۲۔ کچھ خبریں تو صریحاً مدیر اردو وانڈین کرانکل کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں لیکن اس کا امکان ہے کہ کچھ چیزیں اس کا ذکر کیے بغیر انگریزی انڈین کرانکل سے ترجمہ کر لی جاتی ہوں۔ متعدد مقالات افتتاحی کی عبارت اس کی غماز ہے کہ یہ ترجمہ ہے، مگر جب تک شمارہ کا انگریزی کرانکل نہ ملے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔

کے اُردو اخباروں میں شاید ہی کسی کے مقالات افتتاحی کرانکل کے مقالات افتتاحی کا مقابلہ کرسکتے ہیں، اور ان میں متعدد ایسے ہیں کہ اس زمانے میں بھی کسی کے قلم سے نکلیں تو مستحق تحسین قرار پائیں۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہندو مسلمان دونوں کا اخبار تھا۔

ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت اس کے کچھ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔ واوین کے اندر جو الفاظ یا عبارات ہیں وہ اخبار سے لیے گئے ہیں، میں نے کسی عبارت کا خلاصہ اپنی عبارت میں دیا ہے یا کچھ اپنی طرف سے لکھا ہے تو وہ واوین کے باہر ہے۔ انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے: اخبار کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے؛ ثانیاً ادب سے سروکار رکھنے والی وہ باتیں جو کسی کتاب میں یک جا نہیں مل سکتیں اکٹھا کردی جائیں۔ ایسی باتیں جو بہ آسانی سہل الحصول مآخذ سے معلوم کی جاسکتی تھیں، نظر انداز کی گئی ہیں۔

یہ مقالہ عجلت میں لکھا گیا ہے، اس لیے ترتیب مطالب حسب دلخواہ نہ ہوسکی۔ ناظرین معاف فرمائیں۔ کرانکل کے کس شمارے سے کیا لیا گیا ہے یہ بالالتزام بتایا گیا ہے باقاعدہ یہ رکھا گیا ہے کہ نشان کے اوپر کے ہندسے سے انگریزی مہینے کی تاریخ اور نیچے کے ہندسے سے مہینے کا شمار معلوم ہو، مثلاً ۳ فروری کے شمارے کا حوالہ اس طرح دیا جائے گا: ۳/۲ ۔

ناول ڈراما اور شاعری (الف) فطرت انسانی کی رو سے کسی قوم کے اخلاق و عادات، خیالات و معتقدات ان قصے کہانیوں کا کیسا زبردست اور لازوال اثر ہوتا ہے، ہر شخص اپنے خاہ

تجربے اس ۔۔ کی شہادت دے گا۔ اس کے سوا عموماً نظم میں بھی ایک ایسا
دل فریب۔ تسخیر ہے جس کے اثر سے ممکن نہیں کہ کوئی بچا ہو۔ ۔۔ مگر افسوس
کہ ہماری قوم نے اگر اس کی گردن پر چھری پھیری تو اس کا گلا گھونٹا۔ دنیا کی
کل شائستہ قومیں زمانے کے ساتھ ان دونوں قوتوں کو، اگر ہم ان کو قوی سے تعبیر
کر سکیں کیسی رونق دے رہی ہیں روز بہ روز کیسی خوش آیند تبدیلیاں واقع ہوتا
ہیں لیکن اس انیسویں صدی میں بھی ان کی اصلاح کی ضرورت ہمارے ملک کے
قصہ گویوں اور شاعروں کی سمجھ میں نہ آئی۔ قصے ہیں تو انھیں عجائب اور خلاف
قیاس باتوں سے بھرے ہوئے جن کو یورپ کا ایک قلی بھی ۔۔ سر تا پا جھوٹ سمجھے
اور مخرب اخلاق کہے۔ نظم ہے تو ایسی جس کے گندہ خیالات اور گمراہ کرنے والی
تاثیر سے شیطان بھی پناہ مانگے" (اقتباس تبصرہ جوان بخت و شمس النہار از مدیر ۲۷)

(ب ۲) ناول ڈراما و تھیٹر۔ سیاست و اخلاق کے اصول پر ہوں تو ان ۔
سے ملک اور قوم کو اس قدر فائدہ ہو سکتا ہے ۔۔ جتنا بڑے بڑے آرٹیکلوں،
انجمنوں اور وعظوں سے بھی ممکن نہیں ۔۔ اور ۔۔ اس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو
وہ ناول و ڈراما اندر سبھا اور زہر عشق و لذت عشق وغیرہ ۔۔ سے بڑھ کر اور وہ
تھیٹر ہمارے ناچ اور گانے کی محفلوں اور بھانڈ کے تماشوں سے زیادہ
ہمارے ملک کی اصلاح و ترقی میں کام نہیں آ سکتے۔ پچھلے سال جو ایریل
تھیٹریکل ٹروپ کے "ظالم اثر نے ۔۔ ہونہار و معصوم طلبہ کی تحصیل و نیک چلنی کی
گردن پر کند چھریاں چلائی تھیں، وہ اب تک نہیں بھولیں" (بہار تھیٹریکل
ٹروپ از مدیر ۱۴۸)

(ج ۲) حال میں وہاں (کلکتہ میں) برہمو کے مشہور ریفارمر بابو پرتاب چندر

مزدار کی صدارت سے ایک مجلس منعقد ہوئی اور.. بہ اتفاق.. طے پایا کہ لڑکوں سے اس کا عہد لیا جائے کہ وہ ایسے لوگوں کی صحبت سے اپنے کو کنارے رکھیں جن میں بداخلاقی کی باتیں پائی جاتی ہیں اور جو تھیٹروں میں جایا کرتے ہیں.. تحریک زیر بحث کے ہواخواہوں کی قوی رائے ہے کہ دیسی تھیٹر مع ان بدوضع عورتوں کے جو ان میں شامل ہوتی ہیں اخلاق کو بہت سخت ضرر پہنچا رہے ہیں.. کچھ دنوں سے وہاں کے اخبار بے طرح ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور.. صرف انڈین نیشن ہی ان کی پشت پناہی کے لیے مستعد ہے ایسا نہیں ہے کہ یہ.. دیسی تھیٹروں کے مفید.. ہونے کا.. قائل ہو.. وہ صرف اس کو ناپسند کرتا ہے کہ نقل لانے والوں اور.. لانے والیوں کی خانگی حالتوں کی تفتیش کی جائے.. ہر ملک میں اور چیزوں کی طرح سے تھیٹر کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے.. غریب ہندوستان خالی خزانوں اور غیر ملک کی زبردست حکومت کے ساتھ دل لگی کے عمدہ سامان.. بہم پہنچا ہی نہیں سکتا بدحالی و افلاس کے زمانے میں یہ امید ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ ناٹک کے عمدہ اشعار لکھے جائیں اور علوم و فنون لطیفہ عمدہ حالت کو پہنچیں.. دیسی تھیٹر سے بالفعل کوئی عمدہ غرض حاصل نہیں ہوتی.. نوجوان دل اس سے راحت طلبی و عیش پسندی پر مائل ہوتے ہیں.. یہاں عیش پسند و آرام دوست لوگوں کی.. کمی نہیں ہے پھر.. کیا ضرور ہے کہ نکمے دیسی تھیٹروں کی صورت میں ایک اور سُست کرنے والی چیز بڑھائی جائے؟" (لڑکوں کے اخلاق اور تھیٹر از مدیر ۱۲/۹)

اقتباسات بالا سے صاف ظاہر ہے کہ مدیر اس ادب کو پسند کرتا ہے جس میں سود مندی اور واقعیت ہو، ایسا ادب جو مخرب اخلاق ہو اور

جس میں خلاف عقل و قیاس باتیں ہوں اسے پسند نہیں۔ تھیٹر کے بارے میں
جو کچھ اس نے لکھا ہے، وہ اور فنون لطیفہ پر بھی منطبق ہوسکتا ہے۔
کرانکل میں اشعار بالکل نہیں، کچھ قطعات تاریخ وفات ہیں (یہ بھی
بہت کم) مگر انہیں شاعری نہیں کہہ سکتے۔ نثر میں صرف ایک چیز ہے جو ادب
لطیف سمجھی جا سکتی ہے اور یہ سرشار کے قلم سے ہے، گو اس کا نام اس
کے ساتھ موجود نہیں۔ اس کا نام بنگالیوں کی ہملت کی سچی تصویر ہے (۲۱/۹
۲۶/۹)، اور کوہ نور سے ماخوذ ہے۔ یہ چیز فسانۂ آزاد میں شامل ہے، مگر یہ
ن ہے کہ کہیں کہیں الفاظ مختلف ہوں۔

ردو کتابیں

۵۰ء میں کتابوں کے تبصرے بہت کم ہیں، لیکن
جو ہیں وہ بڑے نہیں، گو ان کے متعلق قطعی رائے اس وقت
جا سکتی ہے، جب کتابیں خود دیکھی جائیں۔ بعض کتابوں کی اشاعت کا
اشتہارات سے بھی ملتا ہے۔

"جواں بخت و شمس انہار یہ ۴۲ صفحوں کا.. ناٹک نظم
دو میں اوپرا کے طور پر لکھا گیا ہے.. ہم اس.. کو بڑی
بستگی کے ساتھ اول سے آخر تک یہ یک جلسہ پڑھ گئے اور سچ تو یہ
کہ.. یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ہم اس کو بغیر ختم کیے ہوئے چھوڑ دیتے۔
بخت و شمس النہار کے مصنف مولوی محمد نواب صاحب نے..
دونوں باتوں کا خیال رکھا ہے.. نہ اس میں کہیں کوہ قاف کی پریوں طلسم
خیال کا بیان ہے اور نہ کہیں بدکاریوں کی ہدایت ہے۔ روزمرہ کی
سادی باتیں ہیں.. ایام غدر کا تذکرہ ہے.. ہم.. بہت خوش ہوئے

ر ناول یا ڈرامے کے بعض مصنفوں کے دستور کے خلاف. شمس النہار کے . .
چال چلن کا سارے قصے میں پوری طرح سے خیال رکھا گیا ہے کہیں بیخودی
میں کوئی حرکت ہوئی بھی ہے، تو بھی اسی قدر جتنا. محبت کے پرزور انہیں
ہونا فطری اور ضروری تھا۔ اس کے علاوہ تناسب وقت تناسب مقام اور
تناسب بحث ان تینوں باتوں کا جو ڈرامے کی جان ہیں ہر جگہ نہایت ہوشیاری
کے ساتھ پاس و لحاظ رکھا گیا ہے۔ بیان کا پیرایہ اور زبان بھی بہت دل فریب.. ہے
اور خاص کر آپس کی گفتگو کی زبان تو وہ بلا کی ہے کہ پناہ بر خدا. قصے کا خاتمہ
ایسے مؤثر طور سے کیا گیا ہے کہ دل ہل جاتا ہے.. ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس وقت
یہ ڈراما ۔۔ ایکٹ کر کے دکھایا جائے گا۔ تو حاضرین پر کتنا بڑا اثر ہوگا۔ اس میں
شک نہیں کہ اہل یورپ جیسے خوش قسمت و خوش دل لوگوں میں.. ایسی چیز در
کی ضرورت ہوگی ٹریجیڈی جو اعلیٰ درجے کا قصہ سمجھی جاتی ہے اور واقعہ یہ ہے
بھی ایسی ہی مگر.. دل شکستہ لوگوں کے لیے.. یہ طرز اور بھی سونے میں سہاگے کا
کام کرتا ہے۔ اس رنگ کی یہ پہلی ہی کتاب ہے جو نظم اردو میں ہم نے دیکھی
ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ناول ڈراما لکھنے والے اس
اپنے لیے نمونہ بنائیں گے." (۲۱ مارچ سے اس کتاب کا اشتہار شائع ہو
شروع ہوا ہے۔ مشتہر: مولوی سید محمد نواب مختار فوجداری و کلکٹری بہ مکان
الف خاں مرحوم سابق گماشتہ افیون بادشاہی گنج، علاقہ تھانہ
پیر بہوڑ، ناقی پور)

قصۂ مہتاب بیگم: ۲۹ انگریزی کے مشہور ناول (کذا) ٹیلس آف دی جن
کا سلیس با محاورہ اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب ایک بڑے لائق انگریز

تصنیف اور سادگی و عمدگی میں مشہور ہے۔ اس۔۔ میں ہندوستانی روٗسا اور ان کے مصاحبین کے افعال و حرکات و جذبات کا صحیح فوٹو کھینچا گیا ہے، جیسا کہ انگریزی ناولوں کا دستور ہے، یہ کتاب بھی محالات و غیر ممکنات سے پاک ہے، مگر سانحہ ہیں۔۔ ایسی دلچسپ کہ بغیر تمام کیے ہوئے چارہ بھی نہیں۔۔ بعض بعض جگہ نہایت پسندیدہ مزاح جو سادہ و بے تصنع کلام میں نمک کا لطف دیتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ۔۔ محض قصہ ہی۔۔ نہیں ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کی معلم۔ ترجمہ بھی برا نہیں ہے۔ زبان موٹے موٹے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اس سادگی و بے تکلفی کا سچا نمونہ جو دہلی کی اُردو کے خصائص میں سے ہے۔۔ بعض جگہ انگریزی ترکیب باقی رہ گئی ہے، لیکن اس سے اس قدر ہرج نہیں۔۔۔ مترجم۔۔ لالہ فقیر چند دلش (کذا) دہلوی۔۔"

"تہذیب النساء معروف بہ سگھڑ سہیلی اس کا ریویو آئندہ پرچے میں درج ہوگا" (مگر یہ وعدہ وفا نہ ہوا)

انشاے اشہری: ۲۰×۲۶/۱۶ ۲۰ صفحوں کا فارسی رسالہ فن انشا میں از سید امجد علی اڈیٹر اخبار دبیر الملک بھوپال۔

۲۵/۵ ایک نامہ نگار سید احمد (کوچہ لنگر شہر پٹنہ) نے "حکیم سید شاہ احمد حسین۔۔ صوفی تخلص رئیس پٹنہ" کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے دو قاعدے بطور الف بے کے نئے طور پہ ترتیب دے کر چھپوائے ہیں"۔ فرط نظام ابجدی اور ترقی دولت علمی ان کے حاشیوں پر معلم کے لیے ہدایتیں ہیں۔۔ پہلا قرآن کے لیے اور دوسرا اُردو کے لیے۔ نامہ نگار نے کئی کالموں میں تعریف کی ہے، اور آخر میں مدیر نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

۴/۲ مثنوی داغ جگر مصنفۂ سید باقر شمس کا اشتہار۔ ۲۱/۴ اشتہار رسالۂ شطرنج مجید از بابو شام کشور بنارس ۵/۱ ترجمہ مجموعۂ قواعد رخصت ملازمان سول، مجموعۂ قواعد تنخواہ و مواجب قائم مقامی از جگت نرائن منیجر کوہ نور پریس لاہور کا اشتہار۔ ۲/۲ متعدد قانونی کتب کا اشتہار از امیر سنگھ مالک رسالۂ مفید ہند دہلی۔ ۱۳/۲ و مابعد میں نیا قانون لگان یعنی ایکٹ ۱۹۰۵ء کا ترجمے کا اشتہار ہے۔ مترجم مدیر کرانکل سے بعد کو اشاعت ثانی کا بھی اشتہار ہے۔

نوائے وطن شاد کی تصنیف ہے اور اواخر ۱۸۹۳ء میں طبع ہوئی تھی، اس کا ایک طویل تبصرہ کرانکل نے اسی زمانے میں شائع کیا تھا، اور یہ ان رسائل میں سے ایک میں جو نوائے وطن کی مخالفت میں لکھے گئے تھے شامل ہے۔ مدیر نے شاد کی غلط بیانیاں تو بہت کم پکڑی تھیں لیکن کتاب کی ترتیب، غلط مبحث، لفظی تسامحات اور مصنف کے بعض نظریات پر جو اعتراضات کیے تھے ان سے اس کی بالغ النظری ہویدا ہے۔ اس تبصرے کے متعلق اسی قدر لکھنے پر اکتفا کروں گا، اس لیے کہ اس کا ۱۸۹۵ء سے تعلق نہیں، لیکن اس کتاب کے بارے میں جو کچھ کرانکل میں سنۂ مذکور میں چھپا تھا وہ بجنسہٖ یا ملخصاً درج ذیل ہے۔

۵/۱ (معلوم ہوتا ہے کہ شاد نے تبصرے کے باب میں مدیر کو خط لکھا تھا اور متعدد اشخاص نے نوائے وطن کے بارے میں اظہار رائے کیا تھا) "نامہ نگاروں کو اطلاع" کے زیر عنوان جو عبارات ہیں ان سب کا تعلق نوائے وطن سے ہے:

"سید علی محمد شاد پٹنہ شہر آپ کا مراسلہ پہنچا، زیر تجویز ہے۔ نوائے وطن کا ستایا مونگیر زیر تجویز۔ دل جلا آرہ زیر تجویز۔ نوائے وطن سے بیزار پٹنہ شہر آئندہ

بیٹھے میں ضمیمہ خوانے وطن۔۔ ہمارے السید مصنف نوائے وطن نے جو فہرست فصیح اور غیر فصیح الفاظ کی۔۔ دی ہے۔۔ اس میں اکثر غلطیاں ایسی ہی لوگوں کی مدرج۔۔ ہیں جو رموز ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔۔ میں ایک فہرست ایسے الفاظ کی لکھتا ہوں جن کو شاد صاحب نے شاید سہواً۔۔ درج نہیں فرمایا۔۔ ارض و طول[1] = عرض و طول، ان ایرین = ننِ ایرین، کتوڑ جیا = پست ہمت، شرفا زادے = شریف زادے، کانس = کارنس، ناواقفیاں = ناواقفیتیں، بلٹن (ایک نامی انگریزی شاعر) = ملٹن باقی آیندہ راقم نوحہ خوان وطن ۔۔[2] آالعبد والالام الاڈیٹر الانڈین الگزانکل، التسلیم میں اس بات پہ اپنی بہت بڑی الخوشی ظاہر الکرتا ہوں کہ الکتاب النوائے الوطن المصنفہ السید العلی المحمد الشاد جو الصرف ہمارے الصوبہ البہار کی الزبان سدھارنے کی الغرض سے چھاپی گئی ہے، الغرصہ البہار کے التمام لوگوں کو الفصیح بنا دے گی۔ الراقم العبد المذنب الفقیر الخاکسار الہیچمدان الجاہل الذلیل الکمینہ نگار[3]

بقیہ مضمون نوائے وطن کا بے سراپن: میں نے پہلے آپ کو اطلاع دی تھی کہ مصنف۔۔ اپنی کتاب کی آپ اصلاح کر رہے ہیں، اس لئے میری تحریروں کی اشاعت۔۔ ملتوی رکھے مگر پھر۔ سوچا۔۔ کہ اپنی غلطیوں کی آپ

ص ـــ کا حاشیہ ـ [1] کچھ عبارتوں کا تعلق مرثیہ ثابت ہے کچھ کے بارے میں میں نے قیاس سے کام لیا ہے

[2] اگر عرض کی جگہ ارض ہے تو یہ کاتب کا سہو ہے۔ باقی الفاظ جن پر راقم مضمون کے اعتراض ہیں شاد کے استعمال کردہ ہیں یا شاد انہیں مقابل کے لفظوں پر ترجیح دی ہے۔ نوائے وطن ص۲۰۱ و ص۱۱ و ص۳۲ و ص۱۴۷ و ص۱۸۱ و ص۱۲۳۔ [3] شاد نے سید کی جگہ السید لکھا تھا یہ اس پر چوٹ ہے۔

اصلاح .. محال ہے خصوصاً جب کہ غلطیوں کی کوئی انتہا ہی نہ ہو .. ایک ..
خبر .. یہ بھی ہے کہ میرے .. مراسلے کے سبب .. مصنف مجھ سے بہت کچھ
بیزار ہو گئے ہیں .. نکتہ چینی سے میرا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ کسی .. کو اس سے
کسی قسم کا رنج پہنچے .. صـ میں ایک نیا محاورہ ارشاد ہوتا ہے "اندھے
سے اندھا جب اپنے مقام سے چلے الخ" .. صـ میں لکھتے ہیں: "یہ صحیح
ہے کہ دہلی و لکھنؤ و عظیم آباد وغیرہ شہروں کی زبانیں شاہ جہانی اُردو کی
بیٹیاں اور ایک ہی چمنے کی دو ڈالیں ہیں ایک ہی پیٹ سے نکلیں،
اور ایک ہی جگہ کھیل کود کر بڑی ہوئیں، ایک ہی طرح کے لباس پہنے اور ایک
ہی قسم کے جہیز پائے۔ کوئی بیاہ کر پورب گئی کوئی پچھم کوئی اُتر کوئی دکن۔
بس تو یہ تفرقہ اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا کہ دو بھائیوں میں یا دو بہنوں میں
نہ کہ اس بلا کا فرق الخ"۔ دہلی و لکھنؤ .. بیٹیاں ہیں یہ تشبیہ سمجھ میں ..
نہیں آنے کی .. جب تک شاہ جہانی اُردو اور دہلی کی زبان میں کوئی واقعی
فرق ثابت نہ کر لیا جائے .. یہ رشتہ سخت بے ڈھب نظر آتا ہے .. "یہ زبانیں
ایک ہی چمنے کی دو ڈالیں ہیں" .. چند شہروں کی مختلف زبانوں کے لیے ان دو
ڈالوں کے محاورے کا استعمال .. صحیح نہیں .. کہتے ہیں کہ یہ مختلف شہروں کی
زبانیں ایک ہی پیٹ سے نکلیں لیکن یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دہلی کی زبان کی
نسبت یہ کہنا کہ شاہ جہانی اُردو کے پیٹ سے نکلی ہے اسی وقت صحیح
ہو سکتا ہے جب ان دونوں میں کوئی .. ما بہ الامتیاز ثابت کر لیا جائے ۔
پھر فرماتے ہیں کہ "دہلی .. وغیرہ .. کی زبانیں .. دکن" شاید اس کے معنی یہ ہوں گے
کہ لکھنؤ .. وغیرہ کی زبانیں قبل اس کے کہ لکھنؤ .. وغیرہ شہروں میں بولی جائیں

اوران خاص ناموں کے ساتھ پکاری جائیں.. پہلے ہی سے انہیں خاص خاص
ناموں کے ساتھ سب کی سب ایک ہی جگہ بولی جاتی تھیں.. اس تشبیہ کو
خاص طرح پر یوں سمجھیے کہ جس وقت شاہ جہانی اُردو کسی ایک مقام میں
بولی جاتی تھی تو اس کی یہ بیٹیاں یعنی دہلی لکھنؤ.. وغیرہ کی زبانیں بھی وہیں
اس کے پیٹ سے نکلیں یعنی اسی جگہ یہ سب.. بھی بولی جانے لگیں.. معاذاللہ
تیرا استغنا نہ ہن۔ 'بس بہنوں میں'.. دو بھائیوں کے تذکرے پر آپ بھیانک
نہ ہوں.. یہ منہ بولے بھائی ہیں ورنہ شاہ جہانی کے تو بیٹیاں ہی تھیں
اور.. یہ جو صرف دو ہی بہنوں کا فرق ذکر کیا گیا اس کی وجہ شاید یہ
ہوگی کہ دو ہی زندہ ہوں گی ورنہ.. یوں لکھتے کہ تو یہ تفرقہ اتنا ہی ہونا
چاہیے تھا، جتنا ماں بھائی بہنوں میں۔ وہی ص۲ 'میرے ہم وطنو تم سرسری
نظر سے دیکھ کر ہماری اس بات کی حقارت نہ کرو۔ اگر ایک بلند زینے پر
کھڑے ہو کر چار طرف ملکوں کی آوازیں سنو الخ'.. ایک جگہ.. میرے.. اور دوسری
جگہ ہماری.. اس اول جلول نگارش کے صدقے۔.. ساری کتاب اسی صنعت سے
مزین ہے۔ 'اگر.. سنو' ہمارے مثنوی شاعر نے.. مسدس حالی سے اس خیال کو
اُڑانا چاہا تھا مگر۔ ٹیلے کو زینے سے بدل کر مضمون ہی کو کوڑی کا تین کر دیا...
ص۶ .. : 'جو جو کچھ وہ کر رہے ہیں'۔ 'جو' کو مکرر کیوں لائے ؟.. 'وہمی فراق اور
خیالی وصل کی اس بدولت غم یا خوشی کر لیں اور چند اسی قسم کے شعروں پر جھوٹی
واہ واہ کی صدائیں الخ'.. فرمائیے غم ہے نا مؤنث اور نہیں تو پھر 'یہ کی' کیوں؟
'اس بدولت'۔ بتلائیے تو سہی کہ یہ درمیان سے 'کی' کا لفظ کہاں اُچھو ہو گیا..
'چند اسی قسم کے'.. 'چند'.. اگر 'قسم' کی صفت ہے تو لفظ 'اس' کو 'انھیں' بنا دو

اور.. لفظوں کی ترکیب یوں رکھو: "انھیں چند قسم کے شعروں الخ" اور اگر "چند کو شعروں" کی صفت ٹھہرائیں تو اس فقرے کو یوں لکھنا چاہیے: "اسی قسم کے چند شعروں الخ".. صفحہ ۵ میں اکسید صاحب یوں تحفہ سنجی کرتی ہیں کہ "اگر نادان سا نادان جاہل سا جاہل لکھنو دہلی کا رہنے والا آپ کے کسی شعر دل پر اعتراض کر بیٹھے تو آپ الخ".. اگر آپ کے اس ایجاد پر کوئی الدہاتی سا الدہاتی اعتراض کر بیٹھے تو کیا ہو؟.. بھائی خدا کے لیے لکھتے ہو تو یوں لکھو کہ "اگر لکھنو و دہلی کا کوئی نادان سے نادان جاہل سے جاہل باشندہ الخ الراقم الدہاتی یاقی آیندہ"

(۳) ہندوستانی اخبار نویسی اور اخبارات و رسائل

مدیر کرانکل کے نزدیک ایڈیٹر کو اعلیٰ اخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہیے (رجوع بہ رفیق ہند کا مقدمہ) اور اس کا خیال تھا کہ آزادانہ اخبار نویسی خطرے سے خالی نہ تھی، اس لیے کہ حکومت نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں ہندوستانی اور اینگلو انڈین اخباروں سے متعلق حکومت کے رویے کے اختلاف پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا،

جس کے عبارات ذیل لائق توجہ ہیں:

"ایک بار پھر بھی عالی جناب لفٹنٹ گورنر بنگالہ نے دیسی اخباروں پر لعنت و ملامت کرنے کا موقع حاصل کیا۔ بنگالہ کے پچھلے سالانہ رپورٹ میں جو ابھی شائع ہوا ہے.. فرماتے ہیں: "پچھلے.. سالانہ رپورٹ میں جو یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ اعلیٰ درجے کے اخباروں میں وقائع نگاری کی اصلی ذمہ داریوں کی قدر رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے اس کا کوئی بہت ہی نمایاں ثبوت یا تائید اس سال جس کی نسبت ہم رائے ظاہر کرتے ہیں نہیں پائی گئی.. سال گذشتہ میں

بعض دیسی اخبار ہمہ تن پولیٹکل مباحث میں منہمک اور ایک ایسی زبان کے استعمال میں مشتغل رہے جس کو کوئی دوسری گورنمنٹ رعایت وعفو کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھی.. وہ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ.. انگلو انڈین اور دیسی دونوں.. اخبار سخت زبانوں کے استعمال میں منہمک رہے لیکن.. ان کی بوچھار صرف دیسی اخباروں پر ہے اور انگلو انڈین اخباروں کے خلاف میں بولنے کو انہیں ایک لفظ بھی نہیں ملتا، مگر اب لوگوں کو.. ممدوح کی پالیسی کی ماہیت معلوم ہوگئی ہے اور ان کے اس ریمارک کی وہی قیمت لگائیں گے جو اس کی حقیقت میں ہے"

اس زمانے کے انگلو انڈین اخباروں میں انگلش مین حکومت بنگالہ کی زبان سمجھا جاتا تھا اور اسٹیٹسمین ہندوستان کا دوست۔ (و ۱۹/۱) انگلش مین اور پانیر کی نسبت ۲/۹ کی یہ عبارت بھی دیکھیے: 'پانیر انگلش مین کو بے عزت کہتا ہے کہ جس کا جواب وہ بھی یوں نہیں دیتا ہے۔ ہندوستانیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اقلیدس کی رو سے دونوں بے عزت"

اردو اخبارات و رسائل کے بارے میں جو کچھ ملتا ہے درج ذیل ہے:

"نہایت افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ہم عصر جن کے اخباروں سے ہمارے اخبار کا مبادلہ ہے، روانگی اخبارات کا عمدہ انتظام نہیں فرماتے' مثلاً السلام ومحشر وغیرہ وغیرہ تو آتے ہی نہیں اور ان کے سوا چند اخباروں کی یہ حالت ہے کہ یا تو وہ ایک ہفتہ پہنچے ہی نہیں' یا پہنچے بھی تو روز اشاعت سے سات آٹھ روز کے بعد"..

البنچ: ۲/۲ اس ہفتے میں ایک اور ظریف اخبار.. البنچ کی آمد آمد ہے.. اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی.. بہ طور آزمایش.. چار مہینے کے لیے جاری ہوگا۔ قیمت اہل شہر سے ڈیڑھ روپیہ اور مفصل والوں سے دو۔ مہتمم منشی محمد اعظم صاحب

ہیں ۔ اس وقت تک اس کے ۳ پرچے شائع ہو چکے ہیں ۔۔ چند تعلیم یافتہ نوجوانوں
کی کوشش و محنت کا نتیجہ ہے ۔۔ ہفتہ وار ہر پنج شنبے کو ۳ ورقوں پر شائع ہوتا ہے
اس کی تحریریں اکثر ملکی معاملات پر ہوتی ہیں اور ایسے سرکے پھیکے مضامین میں جہاں
تک ظرافت ممکن ہے ۔۔ موجود ہے ۔ سوشیل مضامین بھی اس میں ۔۔ ہوتے ہیں ۔۔
ہر پرچے میں تھوڑی سی نظم ہوتی ہے ۔۔ اس میں بھی سوشیل یا پولیٹکل کوئی مضمون
ہوتا ہے ۔۔۔ ہر پرچے میں ۔۔ ایک تصویر بھی ہوتی ہے ۔۔ ہمارے شہر میں ۔ ایک
پنچ کی ضرورت تھی ، اور چند برس پیشتر دو پنچ شائع بھی ہوئے تھے لیکن ۔۔ ایک
بھی جاری نہ رہا ۔۔ نہایت معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ تیسرے ہی پرچے
سے اشاعت ساڑھے سات سو ۔ تک پہنچ گئی ہے ۔۔ پہلے پرچے کی تصویر
سے قانون لگان کے متعلق بنگال کے زمیندار و رعایا کی نسبت سچی رائے
ظاہر ہوتی ہے ۔ بندوبست دوام ایک بہت ہی فربہ گائے ہے جس سے
رعایا دودھ دوہ رہی ہے ۔۔ ایک انگریز اس گائے پر قانون لگان کا تیر
لگایا چاہتا ہے اور کہہ رہا ہے کہ دو تہائی کے تین گن ، دے ، نہ دے ، دے کے
چھین لے ۔ زمیں دار ۔ کہتے ہیں :

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن ؛ اجابت از در حق بہر استقبال می آید

اس پرچے میں لارڈ ڈفرن کی دورایوں پر دو تحریریں بہت ہی دلچسپ
ہیں ۔ ایک ۔۔ اس کی نسبت کہ ہندوستانی انگریزی لباس نہ پہنیں دوسری ۔۔
اس ۔۔ کی نسبت کہ ہندوستانیوں کو ترکیوں کی طرح پاشا وغیرہ کا خطاب
دیا جائے ۔۔ پورے چار مہینے کی قیمت اہل شہر سے ڈیڑھ ۔۔ اور باہر کے
لوگوں سے دو روپے ۔ نشان ۔۔ : باکی پور ، ہندو ، منشی محمد اعظم ۔۔

بہ مکان مولوی سید شرف الدین۔۔ بیرسٹر ایٹ لا"

آزاد: ۱۳/۳ اس نام کا ایک اخبار لکھنؤ۔۔ گولہ گنج سے منشی احمد علی۔ شوق کے اہتمام سے ۲۳ مارچ کو شائع ہوا۔ جو سچی مسرت۔۔ اس۔۔ کے پڑھنے سے حاصل وہ ابھی تک شاید کسی نئے پرچے کے پڑھنے سے نہیں ہوئی۔۔ اردو اخبار نویسی جن اصلاحوں کی محتاج تھی وہ۔۔ اس میں موجود ہیں۔۔ اردو اخباروں کی عام حالت یہ ہے کہ اکثر میں ایڈیٹوریل آرٹکل عموماً اور موجودہ ملکی مباحث پر خصوصاً نہیں ہوتے اور جن اخباروں میں بالالتزام۔۔ لکھے بھی جاتے ہیں تو بعض کی زبان محض خراب اور بعض کا طرز تحریر۔۔ زوائد سے مملو ہوتا ہے۔۔ اس۔۔ میں اکثر موجودہ ملکی مباحث پر خاص ایڈیٹوریل ؟ موجود ہیں اور یہ۔۔ کیا بہ حیثیت رائے۔۔ اور کیا بہ حیثیت صفائی و صحت محاورۂ زبان۔۔ نہایت تعریف۔۔ کے لائق ہیں۔ حجم بارہ صفحوں کا۔۔"

بنگال پنچ کلکتہ۔ ۲۳/۱۲ ۔ محمد قمر الدین احمد وکیل عدالت گیا نے مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی گیا میں ایڈیٹر سے مصالحہ کر لیا، مگر یہ اخبار اس پر بھی ایک ہفتے کے بعد بند ہو گیا۔ عدالت نے ۸ دسمبر کو اخبار کے نامہ نگار ا۔ ح شیدا یعنی الطاف حسین کو ۳ ماہ قید با مشقت کی سزا دی۔

بوقلموں صدق بہار: ۹/۱۱ ایک مراسلہ نگار نے اس کے چوتھے شمارے کا ذکر کیا ہے۔

رفیق ہند کا مقدمہ: ۲۷/۳ کو ء نور لکھتا ہے کہ رفیق ہند کے لائبل کے مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ ایڈیٹر کو ایک ماہ کی سزا ہوئی" ۱۳/۳ "رفیق ہند لاہور کے نوجوان ایڈیٹر محرم علی چشتی کا واقعہ ایسا نہیں ہے۔ جس پر۔۔ افسوس نہ آئے۔ جن لوگوں نے

بیان واس ل کے مقدمے کی کارروائیاں۔ پڑھی ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں ریہ ایڈیٹر اس سزا کا مستحق نہ تھا۔ مسٹر پارکر کا دل برے جذبات سے خالی ہوتا تو صرف جرمانے کی سزا بھی کافی ہوتی، اور اگر ان کے دل کے پھپھولے بغیر قید کے نہیں ٹوٹ سکتے تھے، تو قید ہی کی ایسی سزا کیوں نہیں دی۔ جو اپیل کے قابل ہوتی؟.. عموماً اُردو اخباروں اور پنجاب کے عوام و خواص نے.. مظلوم ایڈیٹر کی ہم دردی کی۔ جو دیسی ایڈیٹر آزادی کا دل دادہ، سچائی کا عاشق، پبلک کا بہی خواہ، حکام کا نکتہ چیں، خوشامد سے بیزار، جھوٹ سے متنفر ہوگا، وہ اس تعصب کے زمانے میں ضرور.. ایسے روز بد کے لیے آمادہ ہوگا؛ البتہ جس نے اپنے اخبار کو صرف ٹکا کما کھانے کا ذریعہ اور بھیک کا ٹھیکرا بنا رکھا ہے وہ.. اپنے کو محفوظ سمجھ کر ایسے آزاد منشوں۔ پر ہنسے گا۔ کہ وہ نور کی جگر خراش تحریروں کو جو اس مقدمے کے بارے میں چھپی ہیں، ہم نے برابر نہایت حیرت و افسوس کے ساتھ پڑھا۔ کسی شریف اور فیاض دل سے ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی انسان کی مصیبت پر گو وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو، خوشی منائے۔"

رسید رسائل و اخبارات: ۱۹/۱ رسالہ مفید ہند، جواہر خانہ شہری، اخبار اختر اودھ، اخبار ملا دو پیازہ رسالہ نور بصیرت۔ مدیر نے لکھا ہے کہ ان میں "بعض کے ریویو آیندہ ہفتے میں درج اخبار ہوں گے" لیکن یہ وعدہ وفا نہ ہوا۔

شرف الاخبار بہار کا حوالہ ۲۴/۱ اور ۲۵/۱ دفعہ میں ہے سنہ ۱۸۵۵ء میں جاری تھا۔
فرید الاخبار رنگون کا حوالہ ایک خبر کے لیے ۹/۲ ۔

۱/۲ جنوری میں خاص شہر پٹنہ سے ایک اُردو اخبار ''نسیم سحر جاری ہوا''۔
۱/۹ میں ہے کہ حیدرآباد دکن کے اخبار شفق کے کسی نامہ نگار نے جنگلوں کے محکمے کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ جس پر مدیر و نامہ نگار دونوں پر ''اہانت'' کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔

نالۂ عشاق ایک ماہانہ گلدستہ تھا جس کا اشتہار عابد علی عابد مقامی عظیم آباد۔ محلہ کوچۂ صدر بمکان مولوی حاجی سید احمد حسین رئیس کی طرف سے ۱/۲ وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔ مشتہر لکھتا ہے کہ استادان حال لکھنوی، پریشان عظیم آبادی وغیرہ کا کلام ضرور شائع ہوگا۔ پہلے پرچے کا مصرع طرح: بے نشاں لوگ کہاں نام و نشاں رکھتے ہیں۔

۴۴ ہندوستان

(۱) انگریزی حکومت: ہندوستانی ۱۸۸۵ء میں صرف اصلاحات کے طالب تھے اور اس کا مطالبہ نہ تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں یا نو آبادیوں کی وضع کی حکومت ہندوستان میں رائج کریں۔ ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ وفاداری اعدان کا اور ان کے خاندان سے اظہار محبت بھی بڑی جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ کرانکل ایک طویل مقالے میں جو ۱۲ و ۱۹ میں سنہ ۱۸۸۵ء کے عنوان سے شائع ہوا تھا، لکھتا ہے: ''جب تک اس ملک میں آزادی و راست بازی کی مطابق حکم رانی کی جاتی ہے اور یہاں اندرونی شکایتوں اور آفتوں کا وجود نہیں.. روس چاہے جس قسم کی چال چلے.. ہندوستان کی سرحد پر اس کا پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، لیکن اگر آئندہ.. اتفاقات سے جن کا بالفعل کوئی قرینہ نہیں.. انگلستان کی طرف سے ہندوستان کے دل میں کاوش پیدا ہو جائے اور گورنمنٹ کے تعلقات

بیوں کے ساتھ مربیانہ نہ رہیں تو اس کی سازشیں جو وسط ایشیا میں ہو رہی ہیں
شک ہند میں انگلستان کی حکمرانی کے لیے بہ غایت خطرناک ہوں گی"۔ اس مضمون میں
لٹوریا کے داماد کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "ہندوستان سے قیصرۂ ہند
واس سانحے میں سچی محبت و وفاداری کا پورا ثبوت ملا۔ ہندوستانیوں نے اپنی
لہ اور اس کے خاندان کی محبت کے جوش میں۔۔ اپنی ہمدردی کے مؤثر ثبوت
دکھلائے" یہ اظہار وفاداری اصلی ہو یا نمایشی، ایسے انگریز ضرور موجود تھے، جو
اے شبہے کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جیسا کہ عبارت ذیل سے جو "دکھلائے" کے بعد
ہی ہے، ثابت ہے: "گویا ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی وفاداری کا امتحان لیا گیا
اور خدا کا شکر ہے کہ وہ ناقابل الزام ٹھہرا، جس سے ان نامعلوم انشا پردازوں
کی قابل نفرت جماعت کو شکست فاش ہوگئی جو۔۔ بے بنیاد الزاموں کا طومار
باندھتے رہتے ہیں"۔ ایسے ہندوستانی اب بھی ہیں جو انگریزوں کی تسلط ہند سے
حاصل شدہ فوائد پر ورق کے ورق سیاہ کر سکتے ہیں (رجوع بہ تاریخ بنگال جلد ۲
مرتبہ سر جدو ناتھ سرکار و شائع کردہ ڈھاکہ یونی ورسٹی) اور اس زمانے میں بھی
تھے۔ سنہ ۵۲ء میں بمبئی کے ایک جلسے کی روداد ہے جو ایک سیاسی انجمن نیشنل
ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں اس
زمانے کے متعدد سیاسی اہمیت رکھنے والے اصحاب موجود تھے۔ جلسے کی سب
سے اہم قرارداد بدرالدین طیب جی نے پیش کی تھی۔ ان کی تقریر کے یہ الفاظ
کرانکل میں ہیں: "تاج انگلستان سے ہر طرح فرماں برداری کا برتاؤ کرنا چاہیے"
سر ٹی مادھو راؤ کا ایک مضمون اسی شمارے میں نقل ہوا ہے، اس میں یہ عبارت
ہے جو اس صورت میں کیوں نہیں ہند بھی شاہی سلطنت قرار دی جاتی تاکہ وہ

روس سے بھی زیادہ زبردست ہو۔ شاہزادۂ ویلز اوّل بادشاہ ہوں۔۔ ہندوستان کو اس کے شاہ کے انتظام پر چھوڑ دینا چاہیے" کرانکل کی رائے میں جو جھگڑا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں تھا وہ جزئیات سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ وہ چند باغیانہ اشتہارات کا جو بعض مقامات میں پائے گئے تھے' ذکر کرتے ہوئے اور اس سے انگلو انڈین جو نتیجہ نکالنا چاہتے تھے' اس سے بحث کرتے ہوئے ۲۳/۴ میں لکھتا ہے: "یہ اشتہار۔۔ اسکول کے کسی لڑکے جو بے کار اور ہلچل کی تلاش میں ہوں' طبع زاد معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔ ہندوستان کی وفاداری پر دھبا لگانا آسان نہیں ہے ہندوستان کو موجودہ گورنمنٹ کی جزئیات سے جھگڑا ہے نہ کہ خود موجودہ گورنمنٹ سے اور اینگلو انڈین جو خوف اور بے اعتمادی کا ذکر جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں کہ گویا۔۔ بغاوت پھیلی جاتی ہے یہ مصلحت۔۔ کے خلاف ہے۔۔ اگر وہ روز بد جس کو خدا کبھی نہ لائے اور جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ کبھی نہ آئے گا کبھی آئے گا تو نہ بغاوت انگیز اشتہار اور نہ اخباروں کی فتنہ انگیز تحریریں اس بغاوت کا جز ہوں گی' لیکن وہ وقت آگیا ہے۔۔ کہ ہندوستان و انگلستان دونوں کے فائدے کے لیے۔۔ گورنمنٹ کی جزئیات جو۔۔ جھگڑے کی وجہ ہے درست کی جائیں۔۔" یہ تو انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات تھے' ایک خبر یہ بھی دیکھیے جس کا تعلق پرانی تعلیم پائے ہوئے پنڈتوں سے ہے: ۱۵ مئی کو بدیا ناتھ کے مشہور مندر واقع دیوگھر میں۔۔ پنڈتوں کے سردار نے۔۔ دیوتا سے التجا کی کہ ملکہ معظمہ و مسٹر گلیڈ اسٹن و لارڈ ڈفرن و سر ریورس ٹامسن پر برکتیں بھیجے۔ یہ تماشا بڑا مؤثر تھا' ہر شخص کے چہرے سے مذہبی جوش ظاہر ہوتا تھا' بعد رسم۔۔ پنڈت نے سلطنت انگریزی کی بہتری کے لیے خیرات تقسیم کیا" ۲۵/۵ ۔

(۹) لارڈ رپن اور لارڈ کرزن: اس شریف دل مارکوئس (رپن) نے اس ملک
کے لیے چند پائیدار بھلائیاں کیں اور ان کا ارادہ اس سے بھی زیادہ کرنے کا تھا۔۔
مگر بعض میں ناکام رہے۔۔ انھوں نے۔۔ غلطیاں بھی کیں لیکن۔۔ ہم کو مجموعے پر
خیال رکھنا چاہیے۔۔۔ ہندوستان کی گذشتہ تواریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں
گزرا ہے جس میں ملکی معاملات پر خاص اس ملک میں ایسی مستعدی ظاہر ہوئی ہو
جیسی کہ گذشتہ چار پانچ برسوں میں ظاہر ہوئی ہے۔۔ لارڈ رپن کے انتظام کا عام
نتیجہ ہے۔۔ اس ملک کے لوگوں نے کسی گورنر جنرل کی ایسی پرستش تو کیا عزت نہیں
کی تھی، جیسی کہ لارڈ رپن کی کی۔“ (۱۸۸۴ء) ۱۹؎ کمشنر پولیس بمبئی کہتے ہیں کہ ۲۰
سال سے اب تک پولیس بمبئی کو اس قدر محنت کا موقع نہیں پڑا تھا جس طرح
کہ۔۔ بروقت تشریف بری۔۔ لارڈ رپن۔۔ کے پڑا اور پرنس آف ویلز کا آنا تو اس کے
مقابلے میں بچوں کا کھیل ہے“ ۲۰؎ ”اسٹیشن سہور کو کئی سو دیسیوں نے خوب
آراستہ کیا تھا۔ چند برہمن۔۔ پوجا کا سامان لے کر بیٹھے تھے۔ لارڈ رپن کے آنے
کے وقت ان لوگوں نے مثل دیوتاؤں کے لارڈ رپن کی پوجا کی اور دعائیں دی“
۲۱؎ ”سنا ہے کہ جس دن لارڈ رپن یہاں سے روانہ ہوئے۔۔ گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے
آنکھوں میں آنسو بھر لائے“ ۲۲؎ ”کلکتہ میں۔۔ لارڈ اور لیڈی رپن کے چھوٹے بت
عام فروخت کے لیے منگا لیے گئے۔“ ۲۳؎
لارڈ کرزن ایسے شخص ہیں جو۔۔ ایسی لیاقت رکھتے ہیں جو شاذ و نادر ہی کسی
میں ہوتی ہے اور جتنی تقریریں انھوں نے ہندوستان پہنچنے کے بعد کی ہیں
ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حکومت ناکامی کی صورت دیکھے گی
لیکن موصوف نے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس سے کوئی قول فیصل

کر سکیں؛ لیکن جہاں تک ظاہری باتوں اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے ابھی تک سب باتیں ٹھیک ہیں" (۵ مئی ۱۸۸۲ء ۱۹/۱)

(۳) سر ریورس ٹامسن لفٹنٹ گورنر بنگالہ: "لارڈ رپن یہاں موجود ہی تھے اسی وقت گورنمنٹ بنگال نے جو سر ریورس ٹامسن کی عجیب و غریب نگرانی میں ہے ایسی جرأت و دانائی دکھلائی کہ کلکتہ کے کارپوریشن کو جہاں کچھ دنوں، پہلے سے میونیسپل سلف گورنمنٹ کے اصول جاری ہیں صدمہ پہنچانا چاہا۔ سر ریورس ٹامسن نے اپنے قانونی و طبی و اخباری مشیروں کی مدد سے دفعۃً یہ بات ڈھونڈ نکالی کہ کلکتہ کے میونیسپل کمشنروں نے اپنے شہر کو صحت و تندرستی کا پورا دیوتا نہیں بنایا ہے اور فوراً یہ فرمان واجب الایقان صادر ہوا کہ کمیشن تحقیقات کے ذریعے سے ان کا مقدمہ تجویز ہو۔ بحث اس میں نہ تھی ان لوگوں نے کیا کیا کام نہیں کیے ہیں بل کہ اس میں کہ چند برس کے عرصے میں کیا کیا کام ان لوگوں نے کیے ہیں، ساری میونیسپل کمشنروں نے ایک دم استعفا کر دیا اور چوں کہ منتخب کرنے والوں کا ان پر پورا اعتماد تھا۔۔ دوبارہ منتخب ہوئے جس سے لفٹنٹ گورنر کو بھاری شکست ہوئی" (۳ مئی ۱۸۸۲ء ۱۹/۱) "مسٹر ریورس ٹامسن اب سر ریورس ٹامسن ہو گئے اور اگر انھیں امیرانہ پہلے سادہ اور عامی بل کہ اگلے کل اعزازی ملقبوں سے۔ اچھا معلوم ہوتا ہے تو وہ خوشی سے اس نئے لباس کو زیب بدن فرمائیں۔ یہ کہنا کہ وہ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کے مستحق ہیں یہ کہنے کے برابر ہے کہ وہ لفٹنٹ گورنر ہیں۔۔ اگر یہ خطاب بجائے شخصی خطاب ہونے کے لفٹنٹ گورنری بنگال کے عہدے کا جزو لازم قرار دیا جائے تو بہتر ہو" (نئے سال کے اعزاز ۱۹/۱) سر ریورس ٹامسن نے سالانہ جلسہ تجار کلکتہ میں جو تقریر کی تھی اس کے چند جملے ورکرانکل کی

؟" تو ہم سب لوگوں کے یہاں بہت سے اصول ہیں جن کو عمل میں لانے کا اگر ہم
یال کریں تو وہ خطرناک بن جائیں، مثلاً ہم سب لوگوں کا مسئلہ ہے کہ ہم کو لازم
ہے کہ اپنے ہمسائے کو ویسا ہی دوست رکھیں جیسا کہ ہم اپنے کو دوست رکھتے
ہیں، لیکن کوئی شخص اس سے خائف نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کبھی ایسا کریں گے۔
ہمارا سچا خیال یہ ہے کہ سر ریورس ٹامس کی اسپیچ سے انگلو انڈین اور دیسیوں کی
آگ جو بجھنے والی تھی اب اور بھی بھڑک اٹھے گی۔ [۱۲۱] ... سر ریورس ٹامس اپنے
تئیں ایک پاکباز عیسائی کہتے ہیں۔۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کے ایک مقولے پر حملہ کیا
ایسے شخص سے کیا ہندوستانی امید رکھ سکتے ہیں؟ [۱۲۲] (یہ شاید منقول)

(۴) ہندوستانی ریاستیں: کرانکل ریاستوں کا ہمدرد ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں
کئی ریاستوں کو بہ خوبی یاد کیا ہے، ازاں جملہ نظام و مہاراجہ اودے پور کے بارے
میں جو کچھ لکھا ہے وہ علی الترتیب یہ ہے: "ہندوستان کا ہر باشندہ نظام ۔ کی ۔
صحت و عافیت کا خواہاں ہے اور اس وقت لوگوں کو نہایت خوشی ہوئی جب
کہ اسپیشن کے افشا سے بدنیت سازش کرنے والوں یوروپین و ہندوستانی
دونوں کے گھونسلے اجڑ گئے اور۔۔ نظام اس قابل ہوئے کہ عمدہ حکومت میں
کامیاب ہوں۔" "اودے پور۔۔ کو اس کے ہونہار نوجوان رئیس ۔ کی وفات سے
بڑا نقصان پہنچا۔ اس رئیس نے قلیل عرصے میں۔۔ بہت سے ایسے کام کیے
جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہایت ہی لائق و عمدہ رئیس ہوں گے۔" [۱۲۳] "کشمیر
کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے: "کشمیر کی ریاست پر انگریزی اخبار اپنے جلے پھپھولے
پھوڑ رہے ہیں۔" اس سے مدیر کی ہمدردی صاف ظاہر ہے، لیکن بھوپال کے
متعلق ایسی تحریریں دوسرے اخباروں سے نقل کی ہیں جو وہاں انگریزی ریذیڈنٹ کو

مداخلت کو جائز قرار دے سکتی ہیں مثلاً ۱۸۸۲ء میں آزاد کی ایک تحریر منقول ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے: سر لیپل گریفن سے ملنے کے لیے بھوپال کے ایک ملازم محمد رضا جو پہلے کہیں وکیل تھے بھیجے گئے (کراکل کہتا ہے کہ یہ شاید احمد رضا ہیں یہ صحیح ہے تو یہ پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ بعد کو حیدر آباد سے سکندر نواز جنگ کا خطاب ملا)۔ واپسی پر صدیق حسن خاں نے پوچھا کہ میرے متعلق کیا گفتگو ہوئی۔ محمد رضا خاں نے کہا کہ آپ کے بارے میں کچھ بات ہی نہیں ہوئی۔ صدیق حسن خاں کو اعتبار نہ آیا اور انھوں نے ان کا استعفا طلب کیا۔ یہ منکر ہوئے تو پروانۂ موقوفی جاری ہوا۔ یہ پروانہ لے کر سر لیپل گریفن سے ملے اور بھوپال کا کچا چٹھا لکھوایا جس میں خزانے کا ابتر حال اور بہت سے خون کے مقدمات تھے جن کو مخفی رکھ کر درگذر کیا گیا تھا اور صدہا طرح کے مظالم کی سچی خبریں تھیں"۔ جواب دہی ہوئی تو پہلے بے اعتنائی کی، اور جواب بہ تاکید مانگا گیا تو لکھا کہ ملک آزاد ہے اور اس کو معافیٔ خون کا اختیار ہے، حال آں کہ قاتلوں کی معافی کیسی تحقیقات بھی نہیں کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "سلامی اور خطاب سب چھین لیا گیا، اب مولوی صاحب خالی خولی صدیق حسن رہ گئے"

(۵) سول سروس: "ہندوستان کی زندگی کے لیے سول سروس آفت ناگہانی ہے.. ہمارا مطلب خود سول سروس کا عہدہ نہیں.. بل کہ ایسے سویلین ہیں جن کے دماغ میں خیالات بیہودہ بھرے ہوئے ہیں اور جن کا دبانا.. بڑے بڑے قوانین.. اور ملکی حقوق تا باقاعدہ آزادی کی لمبی چوڑی تقریروں سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ سویلین کی زیادتیوں.. کی مثالیں.. فطرت انسانی کی معمولی ابتری و خرابی کی مثالیں نہیں بل کہ وہ لگاتار اور بالارادہ اصرار و ہٹ کی مثالیں ہیں" مدراس ۱۸۸۴ء ۱۹،

باوجود اس کے کہ ڈال کے ٹپکے ہوئے سویلین اس قدر زیادہ تنخواہیں پاتے ہیں کہ
کسی ملک میں نہیں ملتیں اس پر بھی اپنی بدنصیبی کی شکایت ہی کرتے ہیں آسلم اور
اضلاع متوسط کے چیف کمشنر اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چھوٹے چھوٹے جج۔ برطانیہ
کے وزیر اعظم کے برابر اور اول درجے کے مجسٹریٹ ضلع۔۔ جرمنی کے چانسلر کے برابر
تنخواہیں پاتے ہیں(۱/۲)

(۶) ہندوستان میں مقدمات فوجداری: اس کی بہت سی وجہیں ہیں کہ
کیوں وہ مقدمات فوج داری کا انتظام قابل اطمینان نہیں ہے۔ خود قوانین
فوج داری فاتح و مفتوح کے لیے یکساں نہیں ہیں۔ قوانین یورپ کے بسنے والوں
کی زیادہ حمایت کرتے اور ان کو زیادہ حقوق بخشتے ہیں۔ ناطرف داری نہ انصاف
کے لیے ضرور ہے کہ حاکموں کے دل میں یہ اعتماد متمکن ہو کہ جن لوگوں نے ہم کو
مقرر کیا ہے ان کی خوشی۔ صرف اسی پر منحصر ہے کہ بے رو و رعایت سب کے ساتھ
یکساں انصاف کیا جائے۔ اس ملک کے حکام فوج داری کے دلوں پر یہ بات
منقش ہو ہی نہیں سکتی کیوں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے یہ بدیہی امر موجود ہے
کہ قوانین اپنے مصنفوں کے ہم وطنوں کی حمایت کرتے۔ اور ان کو زیادہ حقوق
عطا کرتے ہیں۔ بفصلہ ذیل اصلاحوں کی سخت ضرورت ہے: ۱۔ دیسیوں او
یورپ کے رہنے والوں کا فرق جو قوانین فوجداری میں ہے اس کو اٹھا دیا
۲ فوج داری کے حکام کی تقرری لفٹنٹ گورنر وغیرہ کے اختیار میں نہ رہے
ان کی تقرری کا اختیار ہائی کورٹ کو دینا چاہیے اور یہ بھی۔ کہ اگر یہ حکا
لیاقت و ناطرف داری و حسن اخلاق کے ساتھ انصاف نہ کریں تو ان
سزائیں دی جایا کریں ۳۔ جو مجسٹریٹ کہ انگلش افسر کو اس کو ہر گز مقدمات

فیصل کرنے کا اختیار نہ دیا جائے... ہم متعہد سول سروس کو موقوف کر دینا چاہیے اور کل حکام یورپین اور دیسی بیرسٹروں اور وکیلوں سے جو ہندوستان میں کام کرتے ہیں چنے جائیں" ([illegible])۔

(۷) ہندوستان کی دیوی یا دیوتا: .. مغربی روشنی اور حکومت نے بیشک بت پرستی دیو پرستی وغیرہ چھڑوادی' لیکن مردم پرستی پر لوگوں کو مجبور کیا۔ دیومالا کی جگہ انگلو انڈین مالا یا انگریزی اصطلاح میں انگلو انڈین ارسٹوکریسی قائم کی —
ہندو مائی تھولوجی کے دیوی دیوتے.. نہ.. شکار کھیلنے جاتے تھے اور نہ دیسی بندگان خدا ان کی.. رائیفل کے.. نشانہ بنتے تھے۔ نہ انھوں نے کبھی فٹن دوڑائی اور نہ کبھی دیسی نوجوانوں کو پہیے تلے کچل مارا نہ کبھی وہ برانڈی اور ایکشا سے بدمست ہوئے اور نہ کبھی انھوں نے غریب بے گناہ دیسی چوکیداروں کا خون ناحق کیا۔ ان کے دور حکومت میں غریب پنکھا قلیوں کے پھیپھڑے کبھی نہ پھٹتے تھے.. ان کے حضور میں گورا کالا سب ایک تھا" (رفیق ہند [illegible])۔

(۸) عدالتوں میں انگریزوں کی پاس داری اور انگریزوں کا ہندوستانیوں سے ناروا سلوک۔

ہندوستانیوں کی شکایت تھی کہ ایک معمولی انگریز بھی معزز ہندوستانی بے تامل ذلیل کر دیتا ہے اور اسے اس کا خمیازہ نہیں اٹھانا پڑتا۔ انھیں اس کا بڑا غم و غصہ تھا کہ فوجداری مقدموں میں اگر ایک فریق انگریز ہو اور دوسرا ہندوستانی، تو ان رعایات سے قطع نظر جو انگریزوں کو قانوناً حاصل ہیں ہندوستانیوں کے ساتھ سخت نامنصفانہ برتاؤ ہوتا ہے۔ کرانکل ۱۸۸۴ء میں اس سال کے مقدمات کی کثرت کا باعث اس متعصب آمیز جوش کو بتاتا ہے جو اس

زمانے میں انگریزوں اور ہندوستانیوں میں موجود تھا' اور یہ امید کرتا ہے کہ تعلقات بہتر ہوئے تو ایسے "مقدمات.. بجائے قاعدہ ہونے کے مستثنیات" میں داخل ہو جائیں گے، لیکن اس نے اسی سال رفیق ہند سے ایک مضمون زیر عنوان "مجسٹریٹوں پر سر اجلاس جوتوں وغیرہ کی بارش" نقل کیا ہے اس پر اس نے کوئی راے نہیں دی لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس کی ہمدردی ملزم کے ساتھ ہے مجسٹریٹ کے ساتھ نہیں:

"بالا شور کے مجسٹریٹ پر بر سر اجلاس ایک ملزم نے اینٹ چلائی.. پوچھا گیا کہ کیوں ایسی حرکت کی تو جواب میں کہا کہ میرا مطلب صرف مجسٹریٹ.. کو اس طرف توجہ دلانے کا تھا کہ میرا مقدمہ انھوں نے عرصۂ دراز سے.. فلکار رکھا ہے۔ الہ آباد کے قریب.. مجسٹریٹ کو ملزم نے یہ عزت دی کہ ایک پرانا، سڑا گلا غلاظت سے بھرا.. ہندوستانی جوتا.. سر مبارک پر رسید کیا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارے بعض مجسٹریٹوں کو ہوش میں لانے کا کوئی ذریعہ جوتوں کی بارش سے بہتر نہیں... ان لوگوں کو حکومت کی فرعونی چوکی پر بیٹھ کر کوئی پروا انصاف.. کی نہیں ہوتی.. پس جو ہندوستانی ملزم ایسے صاحبوں کے ریفارمیشن کے لیے اس طرح جان پر کھیل جاتے ہیں وہ اپنی قوم کے لیے ایک ایسی اعلیٰ خدمت بجا لاتے ہیں جو بیسیوں اخبارات کے سیکڑوں آرٹکلوں سے بھی ممکن نہیں۔ اخبار پانیر ایسے ہندوستانی ملزموں کا مخالف ہے جو دیسی جوتوں سے مجسٹریٹوں کی خبر لیتے ہیں لیکن غالباً ہمارے ہم عصر کو انگریزی جوتے کام میں لانے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا" (۲۳)

اب دیکھیے کہ خود کرانکل ایسے انگریزوں کا جو ہندوستانیوں سے بدسلوکی

کرتے ہیں کیا علاج تجویز کرتا ہے:

۔ تارکسور ریلوے کو گورنر جنرل.. نے کھولا۔ دیسی مہمانوں میں سے ایک مشہور راجہ راجندر نرائن دیب تھے.. واپس آنے کے وقت یہ بڑھے اور نابینا راجہ.. اسی ٹرین کے درجۂ دوم کی ایک گاڑی میں بیٹھ گئے جس میں گورنر جنرل.. کی گاڑی تھی۔ دعوت کے رقعے میں.. کوئی بات ایسی نہ تھی، جس سے یہ معلوم ہوتا کہ دیسی مہمان اس ٹرین سے نہ جائیں گے اور.. آخر کار وہ ٹرین دیسی مہمانوں سے بھرا.. کلکتہ واپس آیا لیکن، مسٹر بنکر جوان اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولس.. راجہ کے پاس آیا اور اُن سے اُتر جانے کو کہا۔ انکار پر لال پگڑی والوں کی دھمکی دی گئی۔ مجبوراً راجہ.. مع بابو سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ کے.. اُتر پڑے۔ گورنر جنرل کو.. خبر دی گئی اور بیکر کو معافی مانگنے کا حکم ہوا، راجہ تو بڈھے اور نابینا تھے.. حیرت یہ ہے کہ کیوں سریندر ناتھ بنرجی نے.. اس وقت گھونسوں سے مسٹر بیکر کی خبر نہ لی۔ معافی شریفوں کے لیے ہے، مسٹر بیکر جیسے آدمی کے لیے.. اور کوئی چیز بجز تازیانے کے نہیں۔ اور جب تک ہندوستانی.. ایسے موقعوں پر تازیانوں کا استعمال شروع نہ کریں گے.. ہندوستانیوں کی توہین کم نہ ہوگی۔ اگر کوئی پنجاب کا آدمی ہوتا تو ضرور.. مسٹر بیکر کو ایسا مزا چکھاتا کہ آسانی سے بھول نہ سکتے۔"(۴۳)

۲۔ مسٹر ہیکس اور مسٹر برگمیں.. نے گوالگھاٹ میں ایک مسلمان لڑکے پر پتا گھونسہ چلا دیا تھا، جس سے وہ.. مرگیا، بستی میں یورپی جوریوں نے بے جرم ہندوستانی نے مجرم قرار دیا۔ حکومت ہند نے اخباروں میں اس کی کیفیت لیکر چیف کمشنر سے مسل اور ان کی رائے طلب کی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ امر نہایت

مدعا علیہا۔
ہ ہے کہ آیا مسٹر ہیکس نے جیسا کہ بیان میں ہے کوڑا چلایا ہاں
ت نے لے والی کے مجرم ہیں اور ان دونوں نے انسانیت کے معمولی قواعد کو
پس پشت ڈال دیا۔ حکومت ہند نے اس رائے کو پسند کیا اور سانحے کے بعد
دونوں نے لڑکے کی طرف سے جو بے پروائی برتی ہے اس پر اپنی ناپسندیدگی
وافسوس کا اظہار کیا ہے۔

انگریز قاتل اور دیسی مقتول " ۲۲ انگریز قاتلوں کی بریت کی چند گذشتہ نظیروں
، قدرتی طور پر ہندوستانی طبائع کو بہت برافروختہ کر دیا ہے۔۔ ایک یوروپین
رم کو دیسی کے قتل میں صرف ۵ سال کی قید ہوئی اور پھر بھی کلکتہ ہائی کورٹ
س بنیاد پر صرف ایک سال قید رہنے دیتی ہے کہ مجرم سرد ملک کا باشندہ
ہے اور اس کے لیے گرم ملک میں ایک سال سزا بس ہو گئی۔ عجب نہیں کہ رفتہ رفتہ
سی طرح یوروپین صاحبوں کے لیے ایک علیحدہ تعزیرات ہند اور علیحدہ مجموعہ
ضابطۂ فوجداری مرتب کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اگر صرف سرد ملک کا
باشندہ ہونا سزا کم کرنے کے لیے کافی ہے تو ہم اپنے کشمیری اور پہاڑی بھائیوں
کے لیے بھی اس رعایت کی سفارش کریں گے " (یہ مضمون اس جگہ درج نہیں
جہاں مدیر کے مضامین ہوتے ہیں، مگر یہ بھی نہیں کہ کہاں سے لیا گیا)،

" مسٹر گرانٹ مجسٹریٹ پر اینٹ پھینکنے کے جرم میں ملزم سشن سپرد ہوا تھا،
اس پر کرانکل کی رائے: "اینٹ چلانے پر اور سشن سپرد! اور ہندوستانی معزز مسٹر
وائسریگل کونسل کے ممبر کو مارنے پر صرف ۱۰ آنے جرمانہ " مگر یہ آخری بات
شدہ کے کسی اور شمارے میں درج نہیں، غالباً اس سے قبل کا واقعہ

۲۴ سفید مدعی بنام سیاہ مدعا علیہ " اخبار رئیس و رعیت کے ایک نامہ نگار نے

ایک مقدمے کی یہ کیفیت لکھی ہے: چند روز ہوئے کہ ضلع پورنیہ میں قتل انسان یا.. دونالی بندوق سے زخمی کرنے کا ایک مقدمہ ہوا۔ اس جرم کا مرتکب ایک شخص تھا جس کو یوریشین کہو یا جب تم کو اس کے نسب کا حال معلوم ہو جائے تو کسی اور نام سے.. پکارو۔ اس مرتبہ صرف یہی نہیں ہوا کہ تلی پھٹ جانے کے عذر پر اصل مجرم رہا کر دیا گیا بل کہ بے گناہ ملزموں کو قید بھی ہوئی.. تلبارٹی.. کے ایک زمیں دار آورت سنگھ نے.. ناجائز ابواب.. کا مطالبہ کیا جس کے دینے سے.. انکار کیا۔ اس پر زمیں دار نے ایک شخص مسٹر ویتھریل کو اس کام پر مامور کیا اور.. معاہدہ کیا کہ.. ناجائز رقم سے ہم تم کو اس قدر دیں گے۔ ویتھریل ہمین.. ہاتھی اور گیارہ لٹھیالوں کو.. ساتھ لے کر گیا اور رعایا کو بلا بھیجا... ان لوگوں نے اپنی مجبوری بیان کی معاف کیے جانے کی استدعا کی لیکن ویتھریل نے.. کہا کہ.. ابواب.. دینے پڑیں گے۔ ان لوگوں نے.. انکار کیا اور.. جانا چاہا تو اس نے لٹھیالوں.. کو ان کے پکڑنے کا حکم دیا۔ اس وقت بے شک ان لوگوں نے مزاحمت کی اور ویتھریل نے اس بھروسے پر کہ ہم انگریزی ٹوپی اور کوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ چند دیسیوں کو مار بھی ڈالیں گے تو.. کچھ.. نہیں ہو گا اپنی بندوق فیر کر دی اور جس قدر.. ہو سکا اتنے دیسیوں کو مجروح کیا۔ یہ مقدمہ.. مسٹر بیبر پورنیہ کے جنٹ مجسٹریٹ کے یہاں.. آیا.. حاکم موصوف نے صرف یہی نہیں کیا کہ ویتھریل کو بری کر دیا، بل کہ.. گاؤں والوں پر جو اس موقع پر جمع ہوئے تھے اور جن لوگوں نے شاید.. حفاظت خود اختیاری میں بانس کے چھوٹے چھوٹے ڈنڈیں (کذا) سے کام لیا ہو، مجمع خلاف قانون اور بلوہ یا صرف بلوے کا چارج قائم کر دیا۔ جنٹ مجسٹریٹ نے.. اس بنا پر رہا کر دیا کہ

س نے حفاظت خود اختیاری میں ان لوگوں کو بندوق سے زخمی کیا اگرچہ یہ ثابت ہے کہ اس کی بندوق پہلے سے بھری تھی۔۔ ویتھہل۔۔ خاندانی توی ہیکل شکاری کشتی گیر اور لڑنے والا آدمی ہے۔ اس کا باپ ایڈی ویتھہل رسٹرا مضافات جہیش کا باشندہ اس قرب وجوار پر رعب ڈالے ہوئے تھا۔ یہ بڈھا ویتھہل کتا گڈھو کے ایک۔۔ دیسی گوالے کی خوبصورت بیٹی کو جس کا نام کرشتی تھا لے بھاگا تھا۔۔ گوالہ بہت غریب تھا۔۔۔ نہ نالش کر سکا اور نہ۔۔ لڑکی کو اس کے پنجے سے چھڑا سکا اور اس زمانے میں ہگلی سے قریب کوئی کچہری بھی نہ تھی۔ بہرکیف بیکر سٹی مس ویتھویل ہو گئی اور اس کے بچے ادھر ادھر پھیل گئے۔"

مسٹر لیڈمن: انڈین سول سروس کے ایک لائق ممبر مسٹر لیڈمین کی عادت تھی کہ ان کی عدالت میں جو۔۔ دادخواہ ہوا کرتے، تو ان سے نہایت مہربانی کے ساتھ لفظ بدمعاش، سور، حرام زادہ وغیرہ سے خطاب فرمایا کرتے۔۔ کپتان جیرے کو ایسے مہذبانہ الفاظ چند معتدد دیسیوں کے حق میں استعمال کرتے دیکھ کر رنج ہوا اور انہوں نے۔۔ گورنمنٹ۔۔ کو اطلاع دی۔ سر الفرڈ لائل صاحب نے یہ سمجھ کر کہ سول سروس کے ممبر پر ایسے سخت الزام لگانا نہایت معیوب ہے، حکم دیا کہ کپتان ازالہ حیثیت عزت کی نالش کریں۔ مگر۔ کپتان نے ثابت کر دیا کہ مسٹر لیڈمن فی الواقع الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور مقدمہ خارج ہو گیا۔ ہم کپتان۔۔ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔۔ دیکھنا چاہیے کہ اب گورنمنٹ مسٹر لیڈمن سے کیا برتاؤ کرتی ہے۔ اگر وہ۔۔ دیسی ہوتے تو ہم کہہ سکتے کہ گورنمنٹ۔۔ کیا۔۔ کرے گی

از شفیق ہند۔

مسٹر ہوالیس اور راجہ رام پال سنگھ ہندوستانی لکھتا ہے کہ ۵ ماہ

حال کو لیڈی لائل صاحبہ کی جانب سے ایک ایوننگ پارٹی ہوئی تھی .. من جملہ اور شرکا .. کے راجہ رام پال سنگھ تعلقہ دار کالاکنکر اور ایڈیٹر ہندوستان تھے اور راجہ چھتر پال سنگھ جو آج کل یہاں اسسٹنٹ کمشنر ہیں شریک تھے مسٹر بوالیس۔ ڈپٹی کمشنر بھی .. تھے۔ راجہ چھتر پال سنگھ نے راجہ رام پال سنگھ کی مسٹر بوالیس سے ملاقات کرائی۔ خیر، راجہ صاحب نے دستور کے موافق ہاتھ ملانے کے واسطے بڑھایا مسٹر بوالیس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ ولایت کا جانا ہاتھ ملانے کا مستحق ہندوستانیوں کو نہیں بناتا۔ جس پر راجہ صاحب نے بھی نہایت حقارت سے ان کی جانب پیٹھ پھیر لی .. راجہ رام پال سنگھ ولایت میں تو پرنس آف ویلیس مسٹر گلیڈاسٹن، لارڈ رپن لارڈ ڈفرن اور ہندوستان میں سر الفرڈ لائیل اور خود لیڈی صاحبہ سے ہاتھ ملانے کے قابل خیال کئے جائیں لیکن ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر جس کی آمدنی ۱۸ سو روپیہ ماہوار ہو ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی سے جس کی علاوہ ذاتی قابلیتوں کے خود چار چند آمدنی ہو ہاتھ ملانے سے انکار کرے .. سر الفریڈ لائل کو دیکھنا چاہیے کہ بہت سے لیڈمن ممالک مغربی و شمالی میں ہیں۔"

کپتان لوچ اور ہریداس جج ہائی کورٹ بمبئی: ۲۶ مسٹر جسٹس نانا بھائی ہریداس مع اپنے بیٹے کے سورت سے بمبئی جاتے تھے اور لیڈیوں کے خاص کمرے کے سوا اول درجے کا صرف ایک ہی کمرا تھا جس میں ایک انگریز کپتان لوچ مع اپنی بی بی کے سوار تھا .. ابجڈ انگریز .. اڑ ا رہا کہ .. پورے کمرے پر قبضہ رکھیں گے اور اگر ضرورت پڑے گی تو قانون کو اپنے اختیار میں کر لیں .. مسٹر ہریداس نے .. اس گاڑی کو کھولا .. اس .. انگریز نے انھیں اس وجہ سے اندر آنے نہیں دیا کہ

وہ نیٹو (دیسی) تھے۔ اسٹیشن ماسٹر بلایا گیا۔۔ وہ اس کمرے کے اندر (ایک
لفظ پڑھا نہیں جاتا) اور۔ گستیں کیں اور اس سے کہا کہ تمہاری حرکتیں کمپنی کے قواعد کے
خلاف ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وحشیانہ زور عذر خواہی سے مبدل ہو گیا۔ لیڈی
بیمار ہیں اور پورے کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہیں اور آخر کار اس انگریز نے
پورے کمرے کو ریزروڈ۔۔ کر لیا۔ ہرپیاس مجبور ہوئے کہ مع اپنے بیٹے کے
بمبئی تک سکنڈ کلاس میں جائیں۔ جب بمبئی پہنچے تو کپتان لوچ نے مسٹر ہرپیاس سے
معافی مانگی اور کہا کہ اگر اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کون ہیں تو۔۔ اس کمرے کو
ریزروڈ۔۔ نہ کرتے۔ اس کے بعد۔ ہرپیاس نے ٹریفک منیجر کو لکھا کہ زائد کرایہ
واپس کردو اور ریلوے کے کل افسروں کو ہدایت کرو کہ نیٹو اور انگریزوں میں
کچھ فرق نہ کریں۔ بعض انگریزی اخبار والوں نے ہرپیاس پر نکتہ چینیاں کی ہیں
ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے صرف اسی قدر کیا جو ہر ایک شریف آدمی کو۔ چاہیے
اسٹیشن ماسٹر کو مناسب نہ تھا کہ جس حالت میں کہ اول درجے کا ایک ہی کمرا تھا
اور اول درجے کا ٹکٹ دیا جا چکا تھا اس کو ریزروڈ کر دے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس دربھنگہ [۲۳] اسٹیٹسمین سے منقول ہے کہ اسے ایک
انگریز جنٹلمین سے اطلاع ملی ہے کہ دربھنگہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ کے اس
حکم کے خلاف کہ مختار لوگ "ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس جانے میں
عدالت پولیس کے برآمدے سے نہ گزرا کریں" کلکٹر کے یہاں نالش ہوئی تھی، اور
کلکٹر کے حکم سے اس ممانعت کا خاتمہ ہو گیا، اب اس نے یہ حکم صادر کیا ہے
کہ "عام دیسی لوگ اس کی عدالت کے سامنے سے نہ گزریں"۔ خبر دینے والا انگریز
لکھتا ہے: "میں نے خود عمدہ لباس پہنے ہوئے دیسیوں کو دیکھا ہے کہ جب

انھوں نے ادھر سے گزرنے کا قصد کیا تو. کانسٹبل نے ان کو گردنیا دے کر نکال دیا۔ بے شبہہ جو دیسی کہ فریق مقدمہ یا گواہ.. ہیں ان کو عدالت پولیس سے گزرنے کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ مجسٹریٹ کی عدالت سے۔"

۴/۹ پاخیر میں ایک انگریز کا خط چھپا ہے کہ انگریز ریل کے سفر میں اپنا اخلاق بدل دیتے ہیں اور "فرعون بے سامان" بن جاتے ہیں۔

۲۳/۴ غارج (جارج ؟) موریسن.. یوروپین نے غصے سے اپنے خدمت گار کو چھری ماری تھی.. تین ماہ قید سخت کی سزا ملی۔"

۲۱/۹ جسٹس نانابھائی ہری داس اور سر ولیم ویڈربرن جج ان ہائی کورٹ بمبئی نے سی پی فوکس اسسٹنٹ انجنیر ملازم جنوبی مرہٹہ ریلوے (جس کی مرتکب غفلت کی وجہ سے ایک ریلوے کا ملازم مر گیا تھا) کی سزا میں جو صرف ۵ روپیہ جرمانہ تھی ایک ماہ کی قید محض کی سزا کا اضافہ کیا۔

۲۶/۹ مسٹر ہریداس.. سے انگلو انڈین اخبارات بہت ناراض ہیں کہ انھوں نے کئی مقدموں میں یوروپین لوگوں پر سزا زیادہ کر دی ہے۔"

۵/۱ کچھ دن ہوئے کہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کو ۳ یوروپین: ایک گارڈ ایک ڈرائیور اور ایک لائن انسپکٹر نے اتنا مارا کہ قریب مرگ ہو گیا اور ایک ماہ کے قریب اسپتال میں رہا۔ بعد تحقیقات ریلوے افسروں نے رائے دی کہ گارڈ تو اس میں شریک ہی نہ تھا "شاید ڈرائیور نے کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہوگی اور انسپکٹر کو بری کر دیا۔ کیا انصاف ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ انگلستان کی ایک خبر کے بارے میں کہ بوڈل الوجن نے مسٹر گلیڈ اسٹون کو دھمکی کا خط لکھا تھا ۶ ماہ کی قید با محنت کی سزا ملی، کرانکل ۱۴/۹ میں کیا لکھتا ہے:

لیکن اگر ہندوستان کے کسی سویلین کے ساتھ یہ حرکت ہوتی تو یہ شرط میلو ہونے
کے اس کو دو تین برس سے کیا کم کی سزا ملتی؟

(۹) انگریزی پولیس ازادوھر پیچ ۔۔ پولیس عرف رعیت سے خوب کسر
نکالتا ہے۔ ابھی ذرا خانہ جنگی ہو جائے انسپکٹر موجود جن نے ادھر ادھر سے
مٹی گرم کر لی اور لیے ہوئے۔ کنوئیں میں کوئی معزز عورت گر پڑی اور ان کی بن آئی
کوئی لاوارث کسی طرح مر اور ان کے مزے ہیں ۔۔۔ نکالنا لگا ہے
افیون دکان میں پھینک کر گرفتار ۔۔۔ کھلے بانس لیے
زنا بالجبر کی تہمت لگانا پولیس ۔۔۔ (اس مضمون کا ابتدائی
حصہ باب ۹ میں زیر عنوان تا تیا تفصیل ہو گا)

(۱۰) آنریری مجسٹریٹ۔۔ ہندوستان میں تنخواہ دار مجسٹریٹ عموماً بڑے سخت
امتحان علمی کے بعد مقرر ہوا کرتے ہیں لیکن خوبی تقدیر سے آنریری مجسٹریٹوں کے لیے
کوئی جانچ۔۔ مقرر نہیں ہے کوئی کاہل نوجوان امیرزادہ آنریری مجسٹریٹوں کی سامنے میں
جگہ پا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہر ہفتے میں دوبار کلکٹر کے گئے اور خانساماں کو
خوش کر دیا کرے۔ وہ شخص افیون کھانے والا ہو یا شراب پینے والا اور عام اس سے
کہ وہ مشتبہ صورت مردوں اور ناگفتہ بہ عورتوں کی صحبت میں رہتا ہو اور گو اس کو
مجموعہ تعزیرات ہند اور مجموعہ ضابطۂ فوجداری سے زیادہ تر مہارت مرغ بازی
اور کنکوے اڑانے کے قوانین سے ہو اور معمولی عقل سے بھی بے بہرہ ہو لیکن اس پر
بھی وہ آنریری مجسٹریٹ ہو سکتا ہے۔ ہم۔۔ سارے ملک ۔۔ کی نسبت عموماً گفتگو
کر رہے ہیں لیکن جب ہم قریب آکر نظر دوڑاتے ہیں تو۔ یہ دیکھ کر بہت افسوس
ہوتا ہے کہ پٹنہ جیسے مرکز علم و فہم میں بھی آنریری مجسٹریٹوں کا انتخاب بعض اوقات

اس طرح سے ہوتا ہے کہ اس مسئلے کی عظمت و وقعت کا کچھ بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد ایک فیصلے کا ذکر ہے جس کے ذریعے مولوی یوسف حسین خاں ۔ پٹنہ کے ایک بہت مشہور زمیں دار اور عوام کے بہی خواہ پر ۱۲ آنہ جرمانہ اور ان کے ملازموں کو ایک ہفتے کی قید بامحنت شدید ہوئی۔ جج پٹنہ کے یہاں موشن ہوا اور افیڈ وٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خلاف ضابطہ باتیں ہوئیں ان میں سے ایک یہ کہ فہرست گواہان مستغیث میں ایک نام ایک آنریری مجسٹریٹ تجمل حسین کا تھا مگر انھوں نے گواہی نہ دی اور یہ خود رائے بجے کشن گرجا پت سہائے اور رام کشن پانڈے کے ساتھ مقدمے کی سماعت کرنے لگے۔ مقدم الذکر کے بارے میں یہ بھی بیان ہے کہ وہ خود اس کے باپ، چچا زاد بھائی اور ولیعہد کے رشتہ داروں کے ساتھ اصل مستغیث ننھی بیگم کے بیٹوں کی دوستی ہے۔ جج نے معاملہ ہائی کورٹ بھیجا جس نے فیصلہ منسوخ کر دیا اور اس پر سخت اعتراض کیے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس مقدمے کے واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غیر تعلیم یافتہ بے وقوف کم سن امرا کے آنریری مجسٹریٹ ہونے سے سخت خطروں کا اندیشہ ہے؟ یوسف حسین خاں کے مقدمے کی تحقیقات چند جنٹلمینوں نے کی جن میں سے کل معزز اشخاص تھے لیکن بسا اوقات معزز اشخاص احمق ہو سکتے ہیں۔ (۱۵۹)

(۱۶) حکام کا دورہ: انگریز نہ تو ارسطو کے مذاق کے ہوتے ہیں اور نہ سولین لوگ ہمیشہ تنگ حلال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے باوجود لفٹننٹ گورنر کی تاکید کے موسم سرما کے دورے محض ایک تکلیف دہ ضابطہ ہو گئے ہیں جس کو بہت سے انگریز بڑے جبر و اکراہ سے تعمیل کرتے ہیں وہ لوگ کچھ بھی نہیں دیکھتے، کام بہت

تھوڑا کرتے ہیں اور جب تک باہر رہتے ہیں اپنے کو حد درجہ آفت رسیدہ بنائے
رہتے ہیں اور جب مارچ .. میں .. صدر مقام میں واپس آتے ہیں تو تہ دل سے
خوش ہوتے ہیں۔ تھوڑے انگریز افسر ایسے بھی ہیں جو موسم سرما کے آنے سے
خوش ہوتے ہیں اور جو ہیں .. نومبر کا مہینہ .. پہنچتا ہے نہایت شوق سے شکار
کرنے کی بندوقیں صاف و کارتوس وغیرہ تیار کر لیتے ہیں۔ شکار دوست
اسسٹنٹ کلکٹر کو اتنی فرصت بھی نہیں رہتی کہ مفصل کے کالے لوگوں کی
ضرورت .. کی تفتیش کریں اور اگر اتفاق سے ایک آدھ آدم خوار تیندوا اس
افسر کے ہاتھ سے مارا گیا تو پھر کیا ہے؟ اپنے دوستوں کے نزدیک ہندوستان کے
بڑے محسنوں میں داخل ہوئے اور نہایت خوش خوش دار الحکومت میں واپس
آئے کہ ہم نے کالے لوگوں کے ساتھ اپنے ذمے کا فرض ادا کیا۔ تھوڑے
سے جو عموماً بن بلیے ہوتے ہیں ان دوروں کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ
ان میں دوسرے لوگوں کی جورؤں سے رمز و کنایہ کی باتیں کرنے کا بہت
عمدہ موقع ملتا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بال روم .. اور ٹینس کورٹ .. میں جو
ناز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی ہیں وہ بھی لطف دیتی ہیں لیکن جو باتیں کہ مثلث
مثلاً راج گیر کے پہاڑ پر جہاں چھوٹے چھوٹے نالوں کے بہنے کی دھیمی صدا
اور گرم چشموں کے ابلنے کی کم زور آواز آتی ہے وہ اور زیادہ مزہ دیتی ہیں بعض
جن کو علم ادب کا مذاق اور زمانہ قدیم کی چیزوں کی دریافت کا شوق ہوتا ہے
ان کو سب .. سے زیادہ انھیں میں مزہ آتا ہے کہ صدر سے باہر رہیں اور زمانہ
قدیم کے قلعوں اور مندروں کے ویرانوں میں چپ چاپ پھرا کریں یا دیہات کی
گھوسنوں .. کے سادے گیت نوٹ بک پر لکھتے جائیں لیکن ہمارے اکثر افسر

جو دورے کرتے بھی ہیں تو اصلی غرض حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں تک تو خیر ہے، اگر کوئی بھلائی نہیں۔۔ تو۔ کوئی ایسی برائی بھی نہیں۔۔ لیکن ہمارے افسر دورے میں اکیلے نہیں نکلتے، نوکروں کی پوری فوج ساتھ جاتی ہے اور پولیس کی ایک پلٹن ان کے ساتھ رہتی ہے اور اگر کوئی افسر پوری نگرانی نہ رکھے تو جو قیمت مرغی گھی وغیرہ کی دی جاتی ہے اس کو یہ لوگ اپنے پاکٹ میں رکھتے ہیں بعض افسر الیسے بھی ہیں جو بہت ہی نرم تام طبیعت ہیں جس کی صورت میں ہر ایک زمیں دار سے جن کے گاؤں میں دورہ ہوا ہے بڑی بڑی نذریں لیتے۔ ہیں۔۔ اب دیکھنا چاہیے کہ وہ دورے جن کے لیے لفٹننٹ گورنر صاحب ہر سال اس قدر اصرار کرتے ہیں ان سے صرف وہ بھلائیاں نہیں ہوتیں جن کے لیے وہ قائم ہوئے ہیں، بل کہ وہ برائیاں ہوتی ہیں جو ہرگز مقصود نہ تھیں۔" ۱۲۴

(۱۱۴) ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات:۔ لال موہن گھوش کو انگریزی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے لبرلوں نے چنا تھا اور کنسرویٹو انھیں بلیک لبرل کہتے تھے۔ سینٹ جیمس گزٹ نے ان پر متعدد الزام لگائے تھے جن کے جواب میں کرانکل نے ایک مضمون ۱۱۵ میں لکھا تھا، اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات سے بحث کی ہے: "وہ اخبار کہتا ہے کہ ہندوستانی کوئی قوم نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایک۔ اختلاف مذہب کے سبب سے سخت متنفر ہیں اور ان لوگوں کے آپس میں کوئی امر مشترک نہیں ہے (انگلستان کے مذہبی اختلافات کے ذکر کے بعد)۔۔ ہم دعوے کے ساتھ اس کی تکذیب کرتے ہیں، اگرچہ تھوڑے دنوں سے ہمارے انگلو انڈین خود سروں کی یہ حکمت عملی ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں حسد و عداوت پیدا کردیں، لیکن ہندوستان کے لوگ۔۔ انگلو انڈین کی خود غرضانہ

پالیسی کو باطل کرنے کے لیے متفق ہو کر سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔ مگر اس سال محرم اور دسہرا ساتھ پڑا اور بہ کثرت فسادات ہوئے اور ۱۹۰۹ء کے کرانکل میں خبروں کی ضمن میں یہ عبارت ملتی ہے: "ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہندوستان کی طرف نفاق سخت میں بدل دیا ہے" اب سطور ذیل میں یہ دیکھو کہ ۱۹۰۹ء میں دو متضاد میلانات کس طرح کام کر رہے تھے:

۱۔ ۱۱ جنوری کو انجمن اسلامیہ الہ آباد کے ایک جلسے میں طے ہوا کہ صوبۂ مغربی و شمالی میں ہندوؤں کی ۳۰ سالہ کوششوں کو جو اردو کی جگہ ہندی کو رواج دینے کے لیے کی گئی ہیں، دیکھتے ہوئے ہندی کے نقائص پر ایک عرض داشت حکومت کو بھیجی جائے۔

۲۔ بلگام کے ہندو مسلمانوں میں ہولی کے موقع پر بہت جھگڑا ہوا۔

۳۔ ایک انجمن محلہ دستہ نشاط جولائی ۱۹۰۸ء میں قائم ہوئی تھی ۱۹۰۹ء میں اس کا نام انجمن اتحاد رکھا گیا، اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کا نفاق دور کر کے ان میں اتفاق پیدا کیا جائے کہ دونوں "ایک دوسرے کے مددگار ہوں" اور جس کام میں قوم کا فائدہ متصور ہو بلا تعصب خلوص نیت کے ساتھ کیا کریں" اس کے صدر رام کشن پانڈے آنریری مجسٹریٹ شہر پٹنہ اور سکریٹری سید کاظم حسین خاں عرف سید علی نواب تھے ۱۹۰۹ء میں ارکان کی تعداد ۶۶ تھی مکمل فہرست جو اخبار میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ کثرت ۶۱ افراد اس میں شریک تھے لیکن ہندو ارکان صرف ۵ تھے۔ اس انجمن نے ایک مختصر تجارتی کارخانہ کھولا تھا اور اپنی خاص عمارت بنانے کی فکر میں تھی۔

۴۔ اورنگ زیب اور ہندو از بنگالی ۴ اپریل: اورنگ زیب کے زمانے میں

جب ہندوؤں پر ظلم شروع ہوا تھا.. راجہ جسونت سنگھ نے ان کو.. لکھا تھا کہ
آپ کے بزرگ.. اکبر نے شہنشاہیت کے معاملات ۵۲ سال تک نہایت
حفاظت و شان سے چلائے.. کل شخصوں سے یکساں برتاؤ ہوتا تھا یہاں تک
کہ ان کی رعایا نے ان کا خطاب محافظ بنی نوع انسان رکھا تھا" جہانگیر و
شاہ جہاں کے عہد میں انصاف رہا۔ اب کہا جاتا ہے کہ آپ ہندو بیچاروں سے
بلا خیال عزت خاندان تیموریہ ٹیکس وصول[۲۲] کرنے والے ہیں اگر آپ کو خدا کے
کلام پر ایمان ہے تو سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کل بنی نوع انسان کا ہے نہ کہ مسلمانوں کا
اس کے سامنے ہندو مسلمان یکساں ہیں۔ دوسرے لوگوں کے مذہبی خیالات پر
حملہ کرنا خدا کے حکم کو توڑنا ہے..[۲۳] کیا اس زمانے میں یہ ممکن ہے کہ کوئی دیسی
شاہزادہ انگریزی گورنمنٹ سے ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے ؟.. یہ اس
زمانے کا حال ہے کہ جب سخت سے سخت ظلم کیے جاتے تھے اور جس سے ہندو
مسلمان دونوں کو اقبال ہے"۔

[۲۴] "بہ قول نجم الاخبار اٹاوہ' کے ہندو مسلمان انتظام محرم سے خوش نہیں ہیں"
[۲۵] "ریاض الاخبار سے معلوم ہوا کہ ، محرم کو اعظم گڈھ میں بھی ہندو مسلمانوں
کے مابین فساد ہوا قریب ..۱ آدمیوں کے زخمی ہوئے جن میں کسی کا حال ابتر ہے
قردونی ایک مقام ہے.. جہاں دسہرے اور محرم میں بیس آدمی مارے گئے اور
سی قدر زخمی ہوئے[۲۶] دسہرے میں میلگام (کذا) میں بہت جھگڑا ہوا بہت سے
ہندو زخمی ہوئے اور اہل اسلام نے ہندوؤں کو نقصان پہنچایا[۲۷] اعظم گڈھ میں
بہت سے آدمی محرم کے جھگڑے میں جاں بحق تسلیم ہوئے شاہجہاں پور کے
اہل اسلام انتظام سرکاری سے ناخوش رہے وہ کہتے ہیں کہ اہل ہنود کے ساتھ

رعایت کی گئی ہے" شہر کان پور بھی اتفاقاً فساد محرم و دسہرہ سے خالی نہ رہا صاحب
کلکٹر نے ۵۰ پچاس مسلمانوں کو قید کر لیا جو بلوے کی دھمکی دیتے تھے مسلمانوں نے
ایک مہاجن کی ناک ایسی کاٹی کہ نشان تک باقی نہ چھوڑا" ۹/۱۱ فساد محرم پر
کرنول مدراس میں ۲۰ آدمی قتل اور بہت زخمی ہوئے" اعظم گڑھ کرنال بمبئی
میں سخت خوں خوار فساد محرم میں ہوئے" بمبئی میں دسہرے پر سخت بلوہ ہوا،
جنگی فوج آئی۔ پولیس نے کام نہ دیا" رائے بریلی میں بوجہ فساد رام لیلا نہیں
کی گئی" بارہ بنکی میں بالکل تعزیہ داری نہیں ہوئی حکم تھا کہ کوئی باجا نہ بجائے"
بریلی میں رسی باندھ کر نصف نصف سڑک ہندو و مسلمانوں کو دی گئی" ۲۱/۱۱
دسہرہ و محرم کے فساد لاہور کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو جیل خانہ ہوا اور جرمانہ مزید
۲۴/۱۱ گورکھ پور کے مقدمے میں جو ایک مسلمان کی طرف سے اہانت مذہبی
کی بابت سوہن پرشاد ایک ہندی رسالے کے مصنف پر دائر ہوا تھا، تصفیہ
ہو گیا بہت اچھا ہوا"

۳۰/۱۲ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کرنول میں ایک ایسوسی ایشن قائم کیا ہے
جس کا منشا یہ ہے کہ ان دو فریق کے درمیان اتحاد قائم ہوئے"

۹/۱ داؤد نگر ضلع گیا کے ایک ہندو مہاجن نے ایک مسجد کی بنا ڈالی تھی
اور نہایت سرگرمی سے اس کی تعمیر میں مصروف تھا لیکن تھوڑے دنوں سے
اس نے کنارہ کشی کی۔ معلوم ہوتا ہے قومی دباؤ نے اس کار خیر سے اس کو محروم رکھا"

(۳) ہندوؤں کی خاص خبریں اور معاملات: ۹/۱ جلسہ تخفیف اخراجات شادی
قوم کائستھ از پیارے لال صدر انجمن ہند

۲۶/۱ قواعد تخفیف خرچ شادی قوم کائستھ امسال ۲۷ دفعات جو ۶ ماہ کا

آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ تلک "مع لوازمہ" لعہ روپیوں سے زیادہ
کا)

؎ "اصلاح رسوم شادی قوم کائستھ" (از: مدیر ۲ کالم)

؎ "مرحبا۔ بابو جیا پرسہائے ساکن ہنومان گڑھ کے بیٹے کی شادی
…نے والی ہے، فریقین کائستھ ہیں۔ "تلک سولہ سو" مقرر ہوا تھا لیکن …نے
…کے موافق اب اس کی تعداد صرف لعہ روپیہ رہ گئی۔ اور شگون کی رسم
…کے پروہت کو صرف پانچ روپے کر عمل میں آئی۔"

گروتا پاٹھ شالا: ؎ "یہ نہایت عمدہ فال ہے کہ چھپرہ کا گروتا پاٹھ شالا
…ور مسٹر ٹامسن کے قبل حمایت کھولا گیا۔ دیا کرن، سمرتی ویدانتا وغیرہ سنسکرت
…ب کی تعلیم کے واسطے گودنا میں ایک سنسکرت اسکول قائم ہوا یہ جگہ قدیمی ہے:
ہندوستان کے ارسطو یا افلاطون کے بانی گوتم نے پہلے پہل اپنے پیرو وں
…امنے اپنے مسائل فلسفہ کی تشریح کی تھی۔"

؎ سورت میں ایک بہت بڑا جلسہ از دواج ثانی بیوگان کے واسطے
ایک بیوہ کا خط بابا جتاں (کذا) کے نام پڑھا گیا کہ اس کی شادی پھر سے
…جائے بہت جوش و خروش پھیلا ہوا تھا، کوئی مخالف رائے نہ تھی۔ ایک
…الم ہوئی کہ گجرات میں اس کی تشہیر خوب بحث کی جائے۔"

؎ "جگ برادران کائستھ سری باستب کو مژدہ ہو کہ شادی لوزلیعر…
…ئے رئیس اعظم شہر پٹنہ محلہ سلطان گنج ا منعقد ہو کر حسب ضابطہ جدید
مسودہ جلسہ کائستھ ادبکار سبھا میں ہوا ہے۔ بابو صاحب کیسے والا
…عالی نسب ہیں، اور اس گھر میں زمانہ قدیم میں کیسی کیسی شادیاں نکلیں

ہا ہوگئیں۔۔"

"اصلاح شادی قوم کاشتہ" اور "خاندانی رئیس" کالی چرن چوہان

۔، ممبر کمیٹی

"ہم کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ پنڈت دیانند سرستی کے آریا سماج میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس سماج نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار "آریا تیریکا" جاری کیا ہے ہم اپنے نئے ہم عصر کی کامیابیوں کی دعا کرتے ہیں"

پٹنہ میں کرنل اولکٹ کی تقریریں: کرنل نے کہا کہ قدیم ہندوؤں نے "انسانی علم کی حد قریب (تقریباً؟) کل شاخوں میں ایسی ترقی کی تھی کہ عقل میں نہیں آتی۔ وہ دیووں کی طرح عمارت بناتے اور جوہریوں کی طرح اسے انجام کو پہنچاتے تھے۔ موسیقی کو "حیرت انگیز درجے تک پہنچایا" طبعیات دکھیا میں ترقی کی۔ یہ یقینی نہیں کہ ان کے زمانے میں ریلوے اور تار برقی تھا یا نہیں، لیکن "ان کی کتابوں پر یقین کیا جائے اور اس کی کوئی وجہ نہیں کہ کیوں "یقین نہ کیا جائے" تو وہ اس سے بہتر چیز رکھتے تھے یعنی ہوائی کشتی طب اور ریاضی میں، انھیں کمال تھا اور "ادب میں کوئی ان سے نہ بڑھ سکا" پیتی سے بڑھ کر صرفی و نحوی کسی اور قوم میں نہیں، اور کسی کے پاس رامائن، مہابھارت سی "مثنویاں" نہیں۔ فلسفے میں یورپ محض بتدی ہے پر اہنے ہندو اس میں "درجۂ کمال" پر تھے، اور روحانیات میں تو یورپ کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ کرنل نے "تمام ہندوں سے التجا کی کہ اپنے آباد اجداد کے قدم بہ قدم چلو" ہر شخص کو بھاگوت گیتا کی ایک جلد خریدنی چاہیے اصل نہیں تو انگریزی

ترجمہ :- اپنا دوسری تقریر میں جس کا عنوان تھا "ہندوستان اپنے نوجوانوں سے کیا امید رکھتا ہے ؟" کرنل نے کہا کہ میں دس برس سے ہندوستان میں ہوں" اور جس قدر میں نے تمہاری عادات و رسوم و زبان کا مطالعہ کیا اسی قدر وہ مجھے خوب صورت و غامض و بلند پرواز معلوم ہوئے" یہ بتانے کے بعد کہ مجھ کو کیا بے اطمینانی ہے انہوں نے آخر میں کہا : "سنسکرت کے علوم کو پھر زندہ کرو اور اپنے عادات و اخلاق کو انہیں اصول کے سانچے پر (کرنا) ڈھالو جو بھاگوت گیتا میں قائم کیے گئے ہیں"

سنسکرت کی تعلیم ۱۸۸۵ء "... آج کل کا زمانہ اگر ہندوستان کی دوبارہ ترقی کے آغاز کا زمانہ نہیں ہے تو اس کی علامتوں کے آغاز کا زمانہ ضرور ہے + مغربی علوم کے دروازے ہم پر کھل چکے ہیں۔ سنسکرت کی تحصیل کا بھی اب پہلے سے بہت زیادہ شوق ہوتا جاتا ہے .... اگر سنسکرت دل لگا کر حاصل کی جائے تو اس کا نتیجہ بہت بڑے فائدے کا ہوگا۔ یورپ کے اعلیٰ ترین علما اٹھارہویں صدی کے آخر سے اس امر کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ ہندوستان کے قدیمی عقلا ... نے اعلیٰ درجے کے فلسفے کی بنا ڈالی تھی اور یہ لوگ جیسے وسعت خیال میں مشہور تھے ویسے ہی دقت نظر میں مشہورِ آفاق تھے اور یہ کہ سنسکرت کا علم ادب انسانی دلچسپی کے کل مضامین کا بے انتہا ذخیرہ ہے۔ ساری دنیا میں مشہور و معروف علما کی متفق علیہ رائے یہ ہے کہ جتنی زبانیں ہیں۔ زندہ ہوں یا مردہ سب سے زیادہ مکمل سنسکرت ہے .. اس وقت ہمارے لیے نہایت ضرور ہے کہ سنسکرت کی تصنیفات کا ہندوستان کی دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش

کریں اور اگر کسی وجہ سے نہ ہو تو یہ درجہ آخر صرف آپ کے لیے نہایت مناسب ہے کہ ہم لوگ اب سنسکرت کے علم کو دوبارہ زندہ کریں" (مدیر کا مقالہ ۲ کالم)

مئی ۱۲ "جلسۂ اصلاح شادی قوم کالستھ" (از مدیر)

"... ۹ سال قبل کے ایک پنڈت کی پیشین گوئی از انڈین ایکو ۔ ہمارے ایک دوست نے ایک بہت پرانا سنسکرت میں لکھا کرم خوردہ کاغذ دیا ہے یہ چیز ... کا ہے اور اس پر پرانے زمانے کی مہریں لگی ہیں! (اس میں مصر و سوڈان وغیرہ کے واقعات ماضی قریب کا ذکر ہے، مگر تمام نہیں دیئے گر اشارے صاف ہیں۔ آخری پیشین گوئی یہ ہے کہ "یہ بھارت کھنڈ آریا لوگوں کے واسطے ہوگا اور یہ ساتویں تاریخ بھادوں بدی سمت ۱۸۰۰ سے شروع ہوگا" بعض باتیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے ان کا ذکر میں نے نہیں کیا)

کرنل اولکٹ کا لیکچر لکھنؤ میں مئی ۸: "... فی زمانا جرمنی میں فلسفے کی جانب خیالات رجوع ہیں ... وہاں سنسکرت کی ترقی ہو رہی ہے ... ہمارے ہشاستروں میں جس قسم کی فلاسفی ہے اسی کے معتقد جرمنی والے ہیں۔"

مئی ۸ "انڈین مرر کی رائے ہے کہ ہندو کو مچھلی یا گوشت نہ کھانا چاہیے۔"

۹/۱۱ "ہندوستانی لکھتا ہے کہ ایک صاحب سے دریافت ہوا کہ موجودہ کمشنر صاحب سیتاپور (کذا) کو بہت کچھ اہل ہنود کے عقائد سے ہمدردی ہے ... اس کی تصدیق ہوئی ہے کہ انھوں نے ایک ... برہمن .. لاکر رکھا ہے جو سنکھ روز صبح و شام بجاتا ہے اور آپ نہایت مسرور ہوتے ہیں"

۲۶/۸ گجرانوالہ میں ایک مسلمان شدہ برہمن پھر ہندو بنا لیا گیا"

۲۸/۸ دہلی میں برف کی ایک کل صرف اس لیے "قائم ہوئی ہے" کہ ہندو کو بہت ارزاں برف ملے۔" برہمن وغیرہ برف تیار کرتے ہیں"

(۱۴) مسلمانوں کی خاص خبریں اور معاملات: مدیر مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے بھلے برے سے بے نیاز نہیں، لیکن، نہ کبھی اشتعال آمیز باتیں اس کے قلم سے نکلتی ہیں اور نہ وہ "مذہبی جھگڑوں" میں پڑنا چاہتا ہے جیسا کہ اس نے ۱/۹ میں ایک نامہ نگار کو مخاطب کر کے لکھا ہے

کلکتہ ہائی کورٹ اور مسلمان جج: ۱/۲۲ "ہم لوگ بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ اس وقت مسٹر امیر علی میں .. قابلیت اعلیٰ درجے کی ہے .. انھوں نے ہمارے حضرت پیغمبر کی سوانح عمری لکھ کر تمام انگلستان میں کس قدر نام پیدا کیا اور اب اسی قابلیت ہی کے باعث کیسے عالی خاندان کی لڑکی بیاہ لائے ہیں۔ اس وقت بہ نسبت مسٹر ہورلی کے ان کا استحقاق زیادہ ہے۔ مسٹر ہورلی کے مقرر کرنے سے صرف یہی بات حاصل ہوگی کہ بیرسٹروں میں سے ایک شخص مقرر کیا گیا ان میں یہ بات موجود ہے" امیر علی کے تقرر کے لیے جو دلائل پیش کیے ہیں، ان میں سے ایک ان کا مسلمان ہونا بھی ہے: "پندرہ ججوں میں سے یہ ضرور ہے کہ کم سے کم ایک .. تو مسلمان ہو" (یہ مضمون غالباً مدیر کا نہیں کسی دوسرے اخبار سے ماخوذ ہے، مگر یہ عبارت جو الگ ہے ہے اور جس کے آخر میں لفظ آرٹیکل درج ہے، مدیر کی ضرور ہے: "اور مولوی محمد یوسف صاحب کا استحقاق بھی خیال کرنے کے قابل ہے" یہ ہماری ہے)

۱۹/۱ .. یہ امر کسی قدر حیرت انگیز ہے کہ گورنمنٹ ہند نے کسی مسلمان

کے لیئے سفارش نہیں کی'.. امیر علی یا۔ محمد یوسف.. میں سے ایک کی تقرر
سے فائدہ اس کے کہ اس علاقے کی جماعت اسلامیہ کی دلجوئی ہوتی ہا
کورٹ کو یہ فائدہ ہوتا کہ قوانین وکارروائی اسلامیہ کا بھی ایک عنصر اس
میں شامل ہوتا"

ہائی کورٹ کی ججی اور شیعہ سنی کا جھگڑا: پچھلے" ۱۴ جنوری کے.. اد
کا پیڈ میں مفصلہ ذیل آرٹیکل پڑھ کر. نہایت حیرت ہوئی۔ خدا کی شان
لوگ جو اس قدر کوتاہ بین اور بغض وحسد سے بھرے ہوئے اور صا
وصریح مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں کانٹے بوتے ہیں وہ قوم کے مصلح
خیر خواہ ہونے کا دعوی کریں.. وہو ہذا: یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہائی
میں ایک مسلمان جج کا تقرر ضرور ہے اور مستحق آنریبل محمد یوسف اور
سید امیر علی ہیں۔ مگر نواب عبد اللطیف نے حکومت کو ایک" یادداشت
بھیجی جس کی دفعہ ۱۱ کا خلاصہ یہ ہے کہ" اس وقت کوئی مسلمان اس قابل
نہیں ہے کہ ہائی کورٹ یا اضلاع کی ججی کے لیئے منتخب ہوسکے یہ یادداشت"
کا سم قاتل یا زہر ہلاہل یا کالی ناگن کا سر رنگ یا افعی دو گرا دم و نیش
جس مسلمان نے دیکھی ہے' تفریق کی ہے۔ ۱۵ جنوری کے اسٹیٹسمین
ایک نامہ نگار نے' اپنا نام" محامڈن" قرار دے کر ایک خط چھپوایا
محمڈن آبزرور اور اردو گائیڈ کی بڑی غلطی ہے کہ ایک شیعی" نو
امیر علی" کی سفارش کی ہے! اگر یہ ہوتا تو حنفیوں کو برادر کشی ہوگا
خانہ تھا' لیکن جبکہ ایک" معتبر انگریزی کاغذ" میں شائع ہوا ہے
محمڈن آبزرور میں اس کے باب میں کچھ لکھنا پڑا کہ عیسائی اور

سمجھیں کہ سنی شیعوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں یا ان سے
اس قدر عناد رکھتے ہیں کہ ان کو کسی بلند منصب پر دیکھنا پسند نہیں کرتے
دونوں میں محض "فروع" کا اختلاف ہے۔ شیعوں کی مجالس عزا میں سنی اکابر
شریک ہوتے ہیں اور" آپس میں شادی بیاہ بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ اکثر جا ابھی
تک دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی سنی ہے اور ایک۔ شیعہ"
طرفہ یہ کہ کلکتہ میں مسلمانوں کی جو دو مشہور انجمنیں انجمن مذاکرہ علمیہ اور انجمن
عمومیہ اسلامیہ ہیں' ان دونوں کے صدر دو شیعے ہیں اور ارکان میں سنی و
شیعہ تعداد میں برابر ہیں۔

۵/۱ لکھنؤ کی خبر کہ آئندہ جنوری" میں مجوزہ اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی جائے گی جس کے واسطے
"قابل اطمینان چندہ ہو گیا ہے" (پھر کبھی اس کا ذکر نہیں آیا)

۶/۱ سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کے سپاسنامے کے جواب میں لارڈ ڈفرن نے کہا کہ "میرا
مقدم فرض... تمام فرقوں کا بالکل بے طرف دارانہ طور پر لحاظ کرتا ہے تاہم میری دلی ہمدردی ان مخصوص
کے ساتھ ہو گی جو کسی وجوہات سے جن پر ان کا قابو نہیں رہا ہے ترقی کی۔ دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔"

۱۲/۲ الہ آباد کی خبر۔ دو یورپی نو مسلم "مذہب اسلام پر وعظ کہتے ہیں"

۱۴/۲ "ترقی خواہاں قوم کی خدمت میں ایک عرض داشت"؛ مدرسۃ العلوم
مسلمانان علی گڈھ کے لئے مدیر کے طرف سے چندے کی اپیل" انگریزوں اور
ہندوؤں نے بھی شرکت فرمائی ہے" اس کے بعد سید احمد خاں کی جانب سے
" ایک عرض بزرگان قوم کی خدمت میں"

۵/۳ جلسہ تخفیف اخراجات شادی وغیرہ مسلمان بیگم ولیلہ (کل ۱۰ کالم۔
بہار کے جلسے کی روداد شرف الاخبار سے نقل کی ہے۔ دو مسودے منظوری

نے پیش ہوئے۔ ایک میں منجملہ اور باتوں کے یہ تھا کہ لڑکوں کی شادی میں کوئی شخص سالانہ آمدنی
ایک چوتھائی سے زیادہ خرچ نہ کرے اور لڑکیوں کی شادی میں اس سے پچاس فی صدی زیادہ خرچ کا اختیار ہوگا
میں پابندی شریعت کی بھی قید تھی۔ دونوں میں سے کوئی منظور نہ ہوا ایڈیٹر نے
ن پر تعجب اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ پہلا مسودہ اگرچہ خود ان سے اس
ے کامل اتفاق نہیں۔ خاص طور پر اس دفعہ کا ذکر کیا ہے جس میں پابندی
شریعت کا ذکر ہے جب بڑی کثرت رائے اس کے ساتھ تھی کیوں منظور نہ ہوا۔

حیدر آباد دکن میں ایک اسلامیہ کالج بنانے کی تجویز۔ جلسے میں
شرکت نظام۔

مدرسۂ اسلامیہ پٹنہ ۱۸ مارچ (۱۸۸۳ء) کو کھلا اور اوائل ۱۸۸۴ء میں
اس میں کی تعلیم کا بھی انتظام ہو گیا اس سال اس کے صدر سید محمد حسین اور سکریٹری محمد حسن تھے

گورنمنٹ ہند اور تعلیم مسلمانان" (ایڈیٹر نے حکومت کے رزولیوشن
متعلق تعلیم۔ تعلیم مسلمانان و ملازمت سرکاری سے اپنا اطمینان ظاہر کیا ہے)

کرنیل اولکٹ کا لکھنؤ میں اسلام پر لکچر: عیسائی مذہب سے میرا اطمینان
نہ ہوا اور جب تک مجھ کو مذاہب مشرقی سے واقفیت نہ ہوئی تھی میں لامذہب
تھا۔ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے مذہب سے (کو) انیسویں صدی اور
سائنس کے اثر سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے "پیغمبر اسلام کی ملاقات
چند موحد عیسائیوں سے ہوئی" ان کے خیالات سن کر ان کے دل میں جو
مذہبی شعلہ جل رہا تھا وہ اور بھی بھڑک اٹھا" وہ خود اُمّی تھے مگر "قرآن
شریف جو ان کے ذریعہ سے نازل ہوئی ہے وہ اس لیاقت سے لکھی گئی ہے
کہ لاثانی ہے۔ مصر میں ایک میرے مسلمان دوست ہیں جن کے ذریعے سے

جس نے بہت سی روحانی باتیں لکھیں۔۔ الف لیلہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے روحانی قوتوں میں کس قدر ترقی کی۔۔"

۳۱/۸ ریاست پالن پور میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک جلسہ ہوا جس میں من جملہ اور ریزولیوشن کے ایک یہ منظور ہوئی کہ شادی کی تقریبوں میں دن تک افیون پینا آج سے موقوف کیا جائے"۔

مسلمانوں کا جو تھا انگریزی اخبار دکن جرنل۔۔ حیدرآباد سے جاری ہوا ہے۔ یہ ہفتے میں دو مرتبے۔۔ چھپتا ہے خدا اس کو ترقی دے"

مسلمان اور انگریزی تعلیم" از مدیر (مدرسہ اسلامیہ پٹنہ کے لیے چندے کی اپیل)

۲۲ وائسرائے کو درخواست دی گئی ہے کہ جامع مسجد دہلی میں انگریز "جوتا اتار کر آئیں"

۲۲ ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس خبر کو مشہور کرتے ہیں کہ مدراس کے سربرآوردہ مسلمانوں نے کرنل انڈیسوڈ کے مکان میں ایک مجلس منعقد کرکے یہ تجویز ٹھہرائی کہ مسلمانوں کی ترقی کی تدابیر ٹھہرانے کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہیے۔ خداوند ذوالجلال ان عالی ہمم مسلمانوں کا معین۔۔ ہو"

از مدیر"۔۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ جو دیسی سویلین اور ڈپٹی مجسٹریٹ منتخب ہوئے ہیں ان کی فہرست میں کسی ہمارے مسلمان کا نہ ہونا قابل افسوس

---

۱ اس وقت تک طلسم ہوش ربا شائع نہ ہوئی تھی ورنہ ہم دان دہم کیپر ریٹل کو اس میں بھی روحانیت کا بڑا سرمایہ مل سکتا تھا۔۔

یکیا جائے گا۔۔۔ ہم کو خوف ہے کہ کھلے ہوئے مقابلے کے ذریعہ سے
ل سروس کی اونچی شاخوں پر پہنچنے کے لیے ابھی ان کو بہت مدت چاہیئے
اصول امتحان مقابلہ کے خلاف۔۔ نہیں۔۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اگر ایسے
متحان کے ذریعے سے وہ لوگ اپنے ملک کی ملازمتوں سے خارج کیے جائیں
ن کا پیچھے رہ جانا بے رحمانہ واقعات کی وجہ سے ہو اور جو اپنے نقص کو دور
رنے کے لیے قابل تعریف کوشش کر رہے ہوں' تو یہ صریح نا انصافی ہے۔"

نمبر۱۲ انجمن اسلامیہ احمد آباد کی پہلی رپورٹ پر مدیر کا اظہار مسرت۔

نمبر۱۳ مسٹر محسن بی طیب جی خلف مسٹر بدر الدین طیب جی پہلے مسلمان ہیں
جنہوں نے آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ انتہا
مسرت کا موقع ہے

" امسال کا [illegible] لوگوں نے تخفیف اخراجات شادی کے لیے جو کوشش
کی تھی اس کا نتیجہ نظر آنے لگا ہے۔۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو ان باتوں
کا خیال نہیں ہوتا" نمبر۱۴

بمبئی عرب و مسلمان گو ظاہرا کوئی خیال ظاہر نہیں کرتے لیکن بیچ میں مہدی کی کامیابی پر خوش
ہیں عرب کہتے ہیں کہ مہدی بڑا طاقتور ہے انگریز اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ وہ پہنچا سکتا ہے دہلی ہوشیار
مسلمان مہدی کو فرضی خیال کرتے ہیں اور کامیابی پر بہت خوش ہیں [illegible] بالکل اس
کے خلاف ہے۔ لاہور۔ مسلمان کہتے ہیں کہ کامیابی تو پیشتر ہی سے معلوم تھی
نمبر ۔ رتلے میں غالباً اس کا ترجمہ یوں کیا گیا تھا مسلمانی جماعتوں میں یہ بیان
کیا جاتا ہے کہ مہدی کی فتح یابی کی نسبت آگے سے پیشین گوئی تھی"

نمبر۱۵ "ہمارا معزز ہم عصر اخبار پنجابی لاہور لکھتا ہے: مظلوم کے نکل جانے

پر انگریزی اخبارون کو مسلمانوں پر حملے کرنے کا موقع ملا مختلف شہروں سے تار برقیاں مشتہر کر دی گئیں.. اہل اسلام اس فتح سے بہت خوش ہوئے ۔ اور۔ جوش پیدا ہو گیا حالانکہ یہ سب .. بناوٹی باتیں تھیں۔ مسلمانوں نے مہدی کو کبھی مہدی موعود تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ ابتدا ہی سے اس کو مہدی کذاب .. قرار دیتے رہے ہیں ۔.. لکھنؤ کے اہل اسلام نے ایک بڑے عالی شان جلسے میں اخبار ایکسپریس کے ۔ الزام کی تردید کی جو اس نے مسلمانوں پر شکست خرطوم پر لگایا تھا (اس کے بعد بمبئی کے ایک وفد کا ذکر جو گورنر بمبئی کے پاس گیا تھا) ..“

(۴) کم سنی کی شادی کے خلاف ایک مقالہ۔ افتتاحیہ:

(۱۰) قانون لگان بنگالہ“ : ”انڈین کانسٹی ٹیوشنل ایسوسی ایشن کل زمینداروں کی ہمت کا قومی مرکز، مہاراجہ دربھنگہ کی .. کوششوں سے قائم ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں رسوخ و اقتدار کا ایسا منصب حاصل کر لیا کہ شاذ و نادر ہی کسی انجمن کو حاصل ہوتا ہے ۔ اور انگلستان کا پروپرٹی ڈیفنس لیگ جس کو اصل چلانے والے لارڈ ویمس اور لارڈ سینڈلی اور دوسرے نہایت ذی اقتدار رؤسا ہیں کانسٹی ٹیوشنل ایسوسی ایشن کے ساتھ اس لئے ہوا کہ زمانۂ حال کی سب سے بڑی غلطی یعنی قانون لگان بنگالہ کی مخالفت کرے ۔ ۔ اور اخباروں میں سے الینس میل .. زمینداران بنگالہ و بہار کی ایسی خدمت .. کر رہا ہے کہ .. وہ بہت قدر کے قابل ہے ۔ مگر وہ ٹائمس جس نے نہ صرف .. قانون کی توضیع کی دقتوں کو سمجھا بلکہ ان خطروں کو بھی جو موجودہ مسودے کو قانون بنانے میں تھے .. بنگالہ

کے چیف جسٹس اور اسٹیفن کے قابل تعلیم ایڈیٹر نے پچھلے سال زمینداروں کو اپنی حمایت کے سائے میں لیا۔۔ گورنمنٹ ہند کھلے میدان میں سر رچرڈ گارتھ کا مقابلہ نہ کر سکی تو ان کی بے ضابطگی کی شکایت میں ایک مراسلہ انگلستان روانہ کیا اور وہ بے ضابطگی یہ تھی کہ سر رچارڈ گارتھ نے ایک مقدمے کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہائی کورٹ میں زیر تجویز تھا۔۔ گورنمنٹ ہند کے دل میں چوٹ لگی اس واسطے کہ یہ مید ناپور بہ خاص محل کی رعایا کا مشہور مقدمہ تھا جس میں گورنمنٹ پر یہ الزام تھا کہ اس نے بہ حیثیت زمینداری اپنی رعایا پر ۴۰ سے ۔۔۔ اگونہ تک اضافہ لگان کیا تھا (۱۸۸۹ء) "فتوی صادر ہو گیا اور ٹیننسی ایکٹ اب اس سرزمین کا قانون ہو گیا تبدیل وزارت سے تھوڑے ہی پہلے جس وقت کہ ۔۔ گلیڈ اسٹن نے استعفا بھیجا تھا اور لارڈ سالسبری نئی وزارت قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے، لارڈ ڈفرن نے مناسب سمجھا کہ ۔۔ اس غیر ضروری ونا منصفانہ
بے وقت قانون کی منظوری کا مراسلہ بھیج دیا جائے" ۔۔

(۲۶) "کونسل واضعان قوانین بنگالہ": عبد الجبار کو لفٹننٹ گورنر بنگالہ نے اس کونسل کا رکن مقرر کیا تھا اور جس خط میں اس کی اطلاع تھی اسی میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ لفٹننٹ گورنر بٹوارے بل کے معاملے میں ان کی حمایت کے متوقع ہیں" صرف اسی ایک واقعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کونسل کی کیسی ترکیب ہے"

(۲۷) "ہندوستانی دالنیشن": مقالہ افتتاحیہ: "۔۔ پٹنہ کے نامی گرامی لوگوں میں سے تخمیناً ۵۰ ۔۔ نے ۔۔ درخواست بھیجی ہے کہ ۔۔ ان کو دیسی والنفہ

ی پلٹن قائم کرنے کی اجازت عطا کرے .." ۷/۴ "والنیٹر ہونے کی تحریک
سارے ملک میں عام ہو گئی ہے متعدد جلسے .. ہوئے اور بہت سی
درخواستیں بھی گئیں" اسپکٹیٹر بھی اس کا موئد ہے۔

(۱۷) بہار انی جمنا بائی: "مہارانی جمنا بائی نے .. درخواست کی تھی
کہ روس کے خلاف جنگ میں شریک کی جائیں .."

(۱۸) ریلوے ۲۲/۱۲: "ادنیٰ ادنیٰ ملازمان ریلوے کے ہاتھوں ہندوستانی
مسافروں کی توہین اتنی کثرت سے ہوتی ہے کہ اس کے موقوف کرنے کے لئے
کچھ کرنا ضروری ہے۔ .. ہندو پیٹریٹ نے لکھا ہے کہ دو معزز ترین ہندوستانی
مسافران درجۂ دوم کو ہگلی اسٹیشن میں ویٹنگ روم سے نکال دینے کی
دھمکی دی گئی کیوں کہ وہ پاک جگہ صاحب لوگوں کے واسطے مخصوص ہے۔"

(۱۹) صوبہ بہار کی خبریں اور معاملات: ۲/۱۲ ایک بہاری باشندۂ خاص
پٹنہ نے دو ہفتے ہوئے ایک کمپنی امپریل تھئیٹریکل ٹروپ کے نام سے
قائم کی ہے جس کے بعض ایکٹروں کو پٹنہ والے امپریل تھئیٹریکل ٹروپ
میں دیکھ چکے ہیں ۱۲/۲ میں اس کی شکایت کہ یہ کمپنی شائقین کو دھوکا دیتی ہے۔
۹/۲ کراجل نے شکایت کی ہے کہ پٹنہ میں "ڈاک بہری" کے مشتہر
رقوم کی زمینداروں کو اطلاع نہیں ہوتی اور اس وجہ سے ان کا نقصان
ہوتا ہے۔

۲۳/۲ بہار کے زمینداروں کا ایک وفد گورنر جنرل سے کلکتہ میں
لگان کے قانون کے سلسلے میں ملا جواب بالکل لطائف الحیل سے بھرا ہوا تھا۔
۲۳/۲ "وائسرائے کی حال کی تقریروں سے اور اس واقعے سے کہ

انھوں نے قانون لگان کے اخیر مباحثے میں کونسل کے ایک ممبر کو نامناسب .. طریقے سے مہاراجہ دربھنگہ پر حملہ کرنے دیا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بالفعل مہاراجہ ... سے گورنمنٹ خوش نہیں ہے' لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مہاراجہ کو اس کی کچھ پرواہ بھی نہیں ہے کہ ایسی گورنمنٹ جس نے اپنے کو ایسی ناشائستہ حرکت کے قابل ثابت کیا جو بیان سے باہر ہے بجا ہے.. خوش رہے اور چاہے ناخوش ..." مدیر

[illegible] میک کینی تنخواہ دار وائس چیرمین پٹنہ میونسپلٹی کے مشاہرے میں تخفیف کی تحریک از مدیر۔

[illegible] ۱۱ اپریل کو زمینداران پٹنہ کا "ایک بہت بڑا جلسہ" بانکی پٹنہ میں زیر صدارت نواب سید لطف علی خاں سی۔ آئی۔ ای منعقد ہوا۔ بنگال ٹیننسی بل کے پاس کیے جانے پر اظہار رنج کیا۔ تجویز سید ولایت حسین عرف مہدی نواب نے پیش کی اور رائے رادھا کشن' قاضی رضا حسین وغیرہ نے اس کی تائید ؛ اس کی مخالفت کے لیے اسی وقت ۲ ہزار روپے جمع ہوئے۔

[illegible] ایک معتبر نامہ نگار نے لکھا ہے کہ ضلع مظفرپور کے ، زمینداروں سے سرکاری مویشی کے ساتھ الہ آباد جانے کے لیے تیس تیس آدمی مانگے گئے ہیں علاوہ الہ آباد جانے کو کوئی آمادہ نہیں۔ "کیا لیفٹننٹ گورنر بنگال نے اسی ایکٹ کی بھی جس کے نام ہی نے زمینداروں کو وجود معطل بنا دیا ہے زمیندار ایسی خدمتوں سے معاف نہیں رکھے جائیں گے ؟ کیا گورنمنٹ کو شرم نہیں آتی کہ زمینداروں کے ساتھ ایسی بدسلوکی کرنے کے بعد بھی ان سے یہ وہ کرنے کی فرمائش کرتی ہے ؟"

پ۔ کرک وڈزج پٹنہ کی شکایت میں ایک مقالۂ افتتاحیہ۔ وہ بدعنق ہیں اور خلاف ضابطہ کارر وائیاں کرتی ہیں۔

۱۹؎ ۱۴ جون کو باؤلی پٹنہ میں زیر صدارت نواب لطف علی خاں اس پر غور کرنے کے لیے جلسہ منعقد ہوا کہ روس سے جنگ ہونے کی صورت میں "ملک کی حفاظت کے لیے کون سی تدابیر اختیار کی جائیں" صدر نے اعلان کیا کہ جنگ ہوئی تو "مجروحوں اور بیماروں کی خبرگیری کے لئے میں ایک لاکھ رُپئے دوں گا۔

۲۰؎ بہار انڈیکاری نے " منشی جواہر لال اور مولوی عبدالوہاب پر تین لاکھ کے لئے اور منشی موتی لال پر ایک لاکھ۔ کے لئے جو ان کے خزانے سے چوری گیا ہے نالش دائر فرمائی ہے "

۲۱/۸ پٹنہ میونسپلٹی بنگالے کی کل دوسری میونسپلٹیوں سے خراب ہے

۲۲/۹ اور دوسرے شماروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کمپنی بہار زمیوسے کمپنی لمیٹڈ کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ مدیر نے اس پر ۱۲ میں ایک مقالہ لکھا ہے کہ جس قدر جلد رُپے جمع ہوں گے اسی قدر جلد کام شروع ہو سکے گا۔

۲۳/۴ جلسہ بہ تاریخ ۶ اپریل ۱۸۷۸ء: اف ام ہیلیڈے صدر انجمن، سی ای کوین، جی اے گریرسن، خدا بخش خاں بہادر، ولایت حسین عرف بدی نواب، ر اے بجے کشن، نواب امیر حسن، سید فضل الرحمن، بجے نرائن اے کاشی پرشاد، گور پرشاد سین، محمد احسن، اند دخاں بھانگاں صاحب لن الدین حسین، حاجی کریم حسین، رام چرن پرشاد، جوگل کشور، سشنکر سہائے،

گپت پرشاد، گورسہائے لال، گنگا دھر پرشاد، گھگوتی پرشاد، عنیش چند رائے صدر نے بتایا کہ بہار میں ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ قائم کرنے کی غرض سے اس وقت تک پانچ ہزار کے چندے کا وعدہ ہوا ہے۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ مسٹر گریرسن کی "غیبوبت" میں مسٹر کومٹن سوسائٹی کا کام کریں۔ سوسائٹی کے قیام سے متعلق گریرسن نے جس دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس کو شکریہ ادا کیا گیا۔

"پٹنہ میونسپلٹی کی ابتری و خرابی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس کو سارے ہندوستان کی میونسپلٹیوں کا بدترین نمونہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔" مدیر

۵ ممالک غیر (۱) انگلستان: "کاش ہمارے ہندوستانی اس کو سن لیتے" کے عنوان سے ۹۳ میں مرقوم ہے: "ملکۂ معظمہ کے خاندان کا قاعدۂ کلیہ ہے کہ بیکار رہنا بالکل فضول تصور کرتے ہیں بلکہ وہ کام کرتے ہیں کہ اپنی قوت بازو سے پیدا کرکے اپنی ذات خاص پر صرف کرتے ہیں۔" لیکن ۹۵ء میں خبروں کے ساتھ عبارت ذیل اور اس کے اس سے متعلق کرانکل کی رائے ہے:

"ایک اخبار لندن کو دوزخ کا نمونہ بتلاتا ہے۔ کرانکل ہماری رائے میں اس کو تخریب اخلاق کے اعتبار سے بہشت شداد دوزخ کہنا زیبا ترزیبا ہے"

مدیر نے صراحت نہیں کی، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ اخلاق سے جنسی اخلاق ہے، ورنہ انگریزوں میں جو خوبیاں ہیں ان سے وہ ناوا

ذیل کی ایک خبر کرانکل میں ایک طنزیہ عنوان "مہذب قوم کی مہذب باتیں" کے تحت صادق الاخبار سے (بحوالہ روہیلکھنڈ تریخ) نقل ہوئی ہے۔ واقعہ انگلستان کا نہیں پٹنہ[1] کا ہے، مگر یہ واضح ہے کہ مدیر کے نزدیک یورپی عورت اپنے اخلاق اپنے وطن سے ساتھ لائی تھی اور وہ بات جس کا ذکر ہے، وہاں مستثنیات میں نہیں۔

"دانا پور کے ایک یورپین نے پٹنہ کے مجسٹریٹ کی عدالت میں استغاثہ پیش کیا کہ ہماری لیڈی ایک گوالے سے محبت رکھتی ہے.. لیڈی.. نے برسر اجلاس یہ کہہ دیا کہ میں ہرگز اس کے پاس جانا ترک نہ کروں گی اور نہ.. وہ میرے پاس آنا چھوڑے گا.. صاحب بہادر اپنا سا منھ لیکر واپس گئے" ۵/۳

ہندوستانی اپنی محکومی کی وجہ سے انگریزوں کے مقابلے میں اپنے کو بہت ذلیل سمجھتے تھے اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ انگریزوں کی اصلی یا فرضی بداخلاقیوں کا ذکر انھیں خوش کرے، چنانچہ ۱۸۸۵ء میں لندن کے اخبار پال مال گزٹ نے جو انکشافات کیے تھے، ان سے کرانکل کو بڑی دلچسپی تھی:

"پال مال[2] گزٹ نے پایتخت کی بعض حیرت انگیز بدکاریوں کو طشت از بام کرکے انگلستان میں بڑا جوش پھیلا دیا ہے.. کہا جاتا ہے کہ بعض بڑے بھاری سرکاری عہدہ دار بھی اس میں شامل ہیں۔ ہم بھی پال مال گزٹ کی

۱؎ پٹنہ کا واقعہ جس کی تحقیق یہ اخبار نہ کر سکتی تھی وہ ایک یورپی اخبار سے جو خود اسے دوسرے اخبار سے لیتا ہے، نقل کرنا مناسب نہ تھا۔ ۲؎ [illegible] پریس کو ہدایت

رپورٹ دیکھنے کے نہایت مشتاق ہیں ۸؎ "پال مال گزٹ نے پرپورٹ طور سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ انگلینڈ میں بھی لڑکیوں کی تجارت ہوتی ہے غریبوں کی لڑکیاں امیروں کے مصرف میں آنے کے لئے پالی جاتی ہیں اور صرف یہی نہیں کہ انگلینڈ میں بلکہ غیر ملکوں میں چالان کی جاتی ہیں" ۹؎ انگلستان سے عورتوں کو دھوکا دیکر باہر بھیجنے کے حالات ۲ کالم ۲۴/۸)

خود مدیر کو انگلستان سے ذاتی واقفیت نہ تھی اور کبھی کبھی ایسی باتیں شائع ہو جاتی تھیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی مثلاً ۱۸۸۵ء میں رفیع الاخبار سے نقل ہوا ہے کہ انگلستان میں شوہر کو بیوی بیچنا ایک جائز رسم ہے ۱۰؎ انگلستان کی سیاسی جماعتوں کے بارے میں ۱۸۸۵ء میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے: "چاہے کوئی فرقہ غالب ہو جائے ہمارے لئے کچھ ایسا فائدہ نہیں۔" تا رائج ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت۔ ہمارے لئے گلیڈسٹن، سیلسبری، چرچل، پارنیل، سب ایک ہی ہیں۔۔ ہمارے بعض ہموطن یہ امید کئے ہوئے ہوں کہ لبرل فرقہ ہندوستان کے ساتھ انصاف کریگا لیکن ہم ہرگز ایسی امید نہیں کر سکتے ہم جو کچھ امید کرتے ہیں وہ خاص خاص شخصیتوں سے ہے نہ کہ فرقوں سے۔"۱۱؎ مگر اس کے باوجود رجحان لبرلوں کے طرف ہے جیسا کہ خود کرسچن ہیرالڈ کے عنوان سے ظاہر ہے جس کی تحت ایک مختصر سے اس حقیقت پر بحث کی ہے کہ انتخاب میں لبرل کامیاب ہوں گے ۱۲؎ ۱۸۸۵ء میں انگلستان

۸؎ کا لکھا ہے کہ مسٹر اسٹیڈ اڈیٹر پال مال گزٹ اور بعض دوسرے اشخاص نے خلاف ورزی کو چھپانے کے مقدمہ دائر کیا ہے۔ ۹؎ اڈیٹر پال مال گزٹ کو بجرم اغوا تین ماہ کی سزا ملی ہے۔ مذکورہ کے خلاف نہایت ناراضگی پھیلی ہے اس کی فروخت ریلوے اسٹیشنوں پر ممنوع کر دی گئی ہے کلبوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ۱۰؎ اس اخبار کا ایک ایک پرچہ آسٹریلیا میں ۲۵ شلنگ کو بکا ہے۔ وسارہ تمام انگلستان میں مشہور ہو گیا ہے۔ ۱۱؎ یہ اشتہار کسی تمام اخبار میں نہیں نکلا ایک خاص گزٹ رہا اسی قسم کا کوئی اور نہ تھا ہے جس میں اس قسم کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں

عام انتخاب تھا' اور ایک ہندوستانی لال موہن گھوش بھی جنھیں کنسرویٹو کا لابرل کنتھو' برلوں کی طرف سے امیدوار تھے' جن کی شکست پر کرامکل نے اظہار افسوس کیا تھا[۲۱] - ایک انگریز جون برائٹ سے بھی ہندوستانیوں کو ہمدردی تھی' چنانچہ ان کے انتخاب کے اخراجات کے لیے ام گھوش' محمد یوسف' سالگرام سنگھ' امیر علی' وغیرہ کے دستخط سے اپیل کی گئی تھی[۲۲] اور کچھ روپے جمع بھی ہوئے تھے' لیکن سر جون برائٹ نے اس کے لینے سے انکار کر دیا[۲۳]

(۲) جرمنی: "جرمنی کو نوآبادیوں کا جنون" از مدیر[۲۴]

(۳) "برہما" جنرل پرنڈرگسٹ قیصر کے اس مشہور مقولے کو جس کا ترجمہ رسیدیم و دیدیم و کردیم فتح ہے بخوبی استعمال کر سکتے ہیں۔ منڈلے مسخر ہو گیا تھیبا قید کیا گیا اور اس کا ملک سلطنت برطانیہ میں ملحق کر لیا گیا بس انھیں چند لفظوں میں اس مختصر لیکن پر سانحہ جنگ کا نتیجہ ہے جو کچھ خوشی ہو سکتی ہے وہ صرف اس امر سے کہ یہ نتیجہ بہت سی جانیں ضائع کیے بغیر حاصل ہوا۔ اگر سچی آزادی خون سے خریدی جاتی ہے تو یہ بہت کم خون بہا کر بیچی بھی جا سکتی ہے اور برہما والوں نے دنیا کے سامنے ایک پر تاثیر مثال اس کی پیش کی ہے کہ کیونکر ایک قوم اپنی آزادی چپ چاپ اجنبیوں کے نذر کر دیتی ہے لیکن برہما کی کمزوری و بزدلی کی نسبت چاہے جو کچھ کہا جائے ہم تو اس فتح و الحاق کی وجہ نہیں سمجھ سکتے اور ہم انگریزی مدبروں کی راستبازی کے چاہے جس قدر قائل ہوں۔۔اس کارروائی کے قرین عقل و انصاف ہونے پر گفتگو کرنے سے باز نہیں رہ سکتے سلطنت برہما و لکڑی کے تاجروں کا اختلاف۔۔ ایک خانگی معاملہ تھا اور کوئی عقل والا

آدمی اس حیلے سے .. مداخلت کو قرین انصاف نہیں کہہ سکتا۔ عقبیا اک خراب حکمران اور ظالم وجابر بادشاہ تھا .. اس کو علیحدہ کر دینا نہایت مناسب .. ہم .. تسلیم کرتے ہیں لیکن صرف انگریزی گورنمنٹ کو اس اصلاح کے عمل میں لانے کا کون ساحق تھا؟ کیا انگلستان چپ چاپ رہتا اگر اس کی ہمسایہ سلطنت چین عقبیا کو تخت سے اتار دیتی؟ .. ہم اس الحاق پر جس پہلو سے نظر کرتے ہیں ہر طرح سے غیر منصفانہ و زبردستی کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ منجملہ اور برٹش انٹرسٹ یعنی برطانیہ کا نفع .. مقصود اصلی تھا، کیونکہ یہی بیرونی نفع ہر جگہ موجود رہتا اور ہر بات کو جائز کرتا ہے' بعض ظریفوں نے بڑے عمدہ طور سے یہ بیان کیا ہے کہ انگلستان نے یہ ہما کو اس غرض سے لیا ہے کہ تجارت کے بے مزاحمت راہیں کھل جائیں اور چند سو انگریزوں کو نوکریاں مل جائیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ مصر و افغانستان میں جو ڈیچے خالی ہوئے اور ذلت نصیب ہوئی اس کا مکافات ہو جائے' اور شیر انگلستان غریب عقبیا پر اس لئے جھپٹا کہ مہدی و علی خان نے اس کو نیچا دکھایا تھا۔ اگرچہ ظریفوں نے ہماری گورنمنٹ کے فیاضانہ ارادوں کو بالکل غلط کہا لیکن زبان کون روکے'۔[۱۲]

مصر و سوڈان: دارمستتر نے جو کچھ کہا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا؛ اس کے باوجود مہدی علی مینر لا از جنگ کے اس قول کو صحیح سمجھنے سے چارہ نہیں کہ مہدی موعود کی وہ تمام نشانیاں جو احادیث میں درج ہیں مہدی سوڈانی میں موجود نہ تھیں اور یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے کچھ مسلمان اس کے دعویٰ امامت پر قہقہہ لگاتے ہوں[۱۳] لیکن 'تاویل میں بڑی گنجائش ہے' اور افریقہ

وعرب وغیرہ کے بہت سے مسلمان اس کے دعوے کو قبول کرنے لگے
ہوں تو تعجب نہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ انگریزوں کے خلاف اس کی
کامیابیوں نے عالم اسلامی میں ہلچل مچا دی تھی اور ہندوستان میں بھی اس
سے ہمدردی رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ کم از کم کرامر ضرور اسے ایک
بڑا آدمی سمجھتا تھا، جس کے ذریعے افریقہ کے وحشی متمدن بنائے جا رہے
تھے رد قات پر جو مضمون نکلا تھا اس کا خلاصہ دیکھئے، گو ممکن ہے کہ اپنی اور
تحریروں میں اس قدر صاف اظہار رائے نہ کیا ہو)

"مصر کی حالات انگلینڈ کے لئے سال بھر بڑے انتشار کا باعث
رہے اور اگر مسٹر گلیڈ اسٹون کی جگہ کوئی دوسرا وزیر ہوتا تو اس ضعیف
و غیر مستقل پالیسی کی بدولت جو خدیو کے ملک کی نسبت اختیار کی گئی ہے اس کی ساری
شہرت و عزت کب کی تباہ ہوئی رہتی۔۔ یہ پالیسی اس لئے ناکامیاب ہوئی
کہ یہ خود ان کی پالیسی نہیں ہے، یورپ کی سلطنتوں اور انگلستان کے دیوان
خاص اور خاص اپنی رائے و فہم و فراست کے اثر میں مبتلا ہو کر مسٹر
گلیڈ اسٹون سال بھر۔۔ دو دلی میں پھنسے رہے اور اس لئے کوئی حیرت
کی بات نہیں ہے اگر ایک وقت مصر کو خالی کر دینے کی پالیسی اور
دوسرے وقت معاملات مصر میں حد سے بڑھ کر دست اندازی کرنے
۔۔ کی صلاح اس انتشار و دو دلی کا نتیجہ ہوئی۔ عرابی پاشا کو سر کرنے کے بعد،
مہدی کی متعصب جماعت کے ہاتھوں سے مصر کے سلامت رہنے کی کل امیدیں
جس پر منحصر تھیں، خدیو کو تنہا چھوڑ دینا انگلستان کی۔۔ ایک نا منصفانہ کارروائی
ہوئی اور یہی مدد جواب۔۔ دی گئی اگر کچھ پہلے دی جاتی تو۔۔ اس وقت

دو مہدی کے سر کرنے میں دقت ہوتی اور نہ سنقات و ٹوکر کی شکست
نصیب ہوتی۔" ۱۴/۲ "ڈنگولا میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ مہدی نے جنرل
گارڈن کی درخواست کے بموجب اپنے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ تم لوگ
دریائے نیل پی جاؤ تاکہ دریا خشک ہو جائے گا' چنانچہ اس کے تیس ہزار
سپاہی غرق ہو کر فنا ہو گئے" ۱۱/۲ "مسٹر ولفرڈ بلنٹ نے جو۔ مہدی و مصر کے
درمیان بیچ بچاؤ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اس کو مسٹر گلیڈسٹون نے نامنظور
کیا۔۔ بہت اچھا۔ کیونکہ ممکن تھا کہ مسٹر بلنٹ بھی۔۔ کسی اور شہر کو دوسرا خرطوم
بنا کے اور اپنی رہائی کے لیے دوسری فوج کی روانگی کی ضرورت پیش
لاتے" ۲/۲ "لبرل گورنمنٹ کی خود غرضانہ پالیسی مصر میں" (ایک طویل مضمون)
ہے غالباً ماخوذ۔ اس میں ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار اور مصر کے
"معزز اور مقتدر" عہدہ دار کی گفتگو بھی شامل ہے 'جس کا خلاصہ یہ ہے
کہ انگریزوں کو مصر سے نکل جانا اور وہاں کے معاملات میں مداخلت سے
گریز کرنا چاہیے" ۳/۲ "مصیبت سوڈان" گورڈن کی گرفتاری پر اظہار رنج
اس سلسلے میں مہدی کی دغابازی کی طرف بھی اشارہ ۴/۲ "مصر" اگر سوڈان
میں لڑائی جاری ہی رکھنے کا ارادہ ہے تو مجوزہ لشکر سے "کہیں بڑا"
بھیجنا چاہیے ۵/۲ ۔ "مہدی کو برابر یورپین سے مدد ملتی ہے' چنانچہ اس وقت
مہدی کے کیمپ میں دو اعلیٰ درجے کے یوروپین کام کرتے ہیں" ۹/۲ مہدی
نے مسٹر الیورپین فرانسیسی کو اپنا وزیر مقرر کر کے خاص سفارت کے لیے
ملادوبین دربار میں بھیجا ہے" ۷/۲ "الیورپین ۔۔ نے ۔۔ اسلام قبول کر لیا
ہے" ۸/۲ مہدی کے ایک ایلچی" وارد انگلستان کے عربی اعلان کا ترجمہ انگریزی کا

اخباروں میں چھپا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مہدی صرف ایسی شرطیں قبول کر سکتا ہے جن سے مسلمانوں کا فائدہ ہو" اس کی سفارت یہ ہے کہ مسلمانی دنیا میں تہذیب پھیلائے نہ کہ تباہی۔" ۲۳

عثمان دغما "مہدی کا داہنا ہاتھ" کے والدین فرانسیسی تھے اور وہ فرانس میں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کی اور بعد کو وہ مسلمان ہو گیا۔ یہ فنون سپہگری سے واقف اور متعدد زبانوں سے آشنا ہے۔ خدیو نے اسے سپہ سالار مقرر کیا تھا لیکن "چند روز کے بعد" ناراض ہو کر نکال دیا۔ یہ مہدی کا داماد ہے اور "اس کی ہمت و جرأت کا خوف بڑے بڑے انگریزوں پر غالب ہے" ۲۴ دغما کی موت کی خبر پایہ صداقت کو پہنچ گئی ۲۳/۱۱

"مہدی۔۔ سلطان۔۔ کو اصول ملت سے ہٹا ہوا بیان کرتا ہے" ۱۵/۴ ۔
فرانسیسی پروفیسر دارمستتر نے اپنی ایک تقریر میں بتایا تھا کہ مہدی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو پیغمبر اسلام میں تھیں اور پیشین گوئیوں کے مطابق مہدی موعود میں ہونی چاہئیں ۱/۴ ۔

"حسرتیں اس کی سرنگوں ہیں   مرگ مہدی یہ کیا کیا تو نے

اس بڑے شخص کی وفات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔۔ سچا جان نثار قوم اور غایت درجے کا اولوالعزم تھا۔ دنیا کی تواریخ میں جو کام اس نے کیے وہ معدودے چند ہی لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں اور اگر اس کو بہتر موقع ہاتھ آتے تو۔۔ بنی نوع انسان کے ساتھ اور بھی بھلائی کرتا۔ سلطنت انگلشیہ نے بے ضرورت اس بڑے شخص کے۔۔

کاموں میں دست اندازی کی جن کے مقاصد یہ تھے کہ سوڈانیوں میں بناجوش پھیلے اور وہ لوگ وحشیانہ زندگی چھوڑ دیں۔۔ دست اندازی نہ ہوتی تو وہ ضرور۔۔ کامیاب ہوتا۔۔"

(۵) روس: ۱۸۵۵ء میں اس کا بڑا اندیشہ تھا کہ سرحد ہند سے بہت قریب آجانے کی وجہ سے روس و انگلستان میں جنگ ہو جائے دونوں میں سمجھوتا ہوگیا، لیکن اس سے ہند میں انگریزوں کے وقار کو صدمہ پہنچا (دیکھئے کرامکل کی رائے دربارۂ الحاق برما)

وصیت نامہ پیٹر اعظم زار روس: "مخفی نہ رہے کہ خدائے پاک نے قوم روسی کو تمام یورپ کی حکمرانی کے لائق پیدا کیا ہے، یورپ کی بہت سی قومیں اب پرانی ہوگئی ہیں۔ ایک وقت ہوگا کہ ان کے ملک نئی اور جوان قوموں سے آباد ہوں گے۔۔ ہدایت نامہ = (۱) قوم روسی ہمیشہ جنگ و جدل میں گرم رہے، تاکہ عزم اس کا سرد نہ ہو جائے۔ ۲۰۰۔ یورپ کے کل جھگڑوں۔ میں حتی الامکان روسی شریک ہوں خاص کر جرمنی میں۔۔ اس سے روس کا بڑا فائدہ ہے۔ ۳۔ پولینڈ میں تنازعہ کرادیں۔۔ فوج روس کے پولینڈ میں داخل کرنے کے لیے۔۔ بہانہ ڈھونڈتے رہیں، بہ شرط ضرورت ملک مذکور کو افواج کے حاکموں میں تقسیم کریں۔۔ بعد ازاں حسب موقع عمل کریں۔ ۵۔ سویڈن کا جو ملک ملے اسے لیں اور اس کو ڈنمارک سے علیحدہ کریں۔۔ ۶۔ جہاں تک۔۔ ہو سکے قسطنطنیہ دارالخلافہ ترکی اور ہندوستان تک پہنچ جائیں۔ جو شخص ان دونوں ملک پر حکمرانی کرے گا وہ تمام دنیا کا فرماں روا ہوگا۔۔

مناسب ہے کہ ہمیشہ ترکی اور ایران سے لڑتے رہیں۔ ۱۱۔ جب سویڈن
کی طاقت ٹوٹ جائے گی۔ ایران اطاعت اختیار کرے گا، پولینڈ محکوم
اور ترکی مفتوح ہو جائے گا۔۔ تب فتح کے طور پر شاہنشاہ فرانس اور
پھر بادشاہ دا انا سے یہ پیغام ڈالیں کہ آؤ ہم۔۔ تینوں مل کر تمام عالم کو زیر
کریں اور بعد فتح۔۔ آپس میں تقسیم کریں۔ اگر ان دونوں۔۔ میں سے کوئی۔ قبول
کرے تو اس کی مدد سے دوسرے بڑے بادشاہ کو زیر کرنے کی تدبیر
کریں، پھر اور چھوٹی سلطنتوں کو کالعدم کریں۔۔ ۱۲۔ اگر۔۔ ان دونوں بادشاہوں
میں سے کوئی۔ منظور نہ کرے تو وہ تدبیر کرو کہ جس میں اُن کے آپس میں
تنازع پیدا ہو اور جب۔۔ لڑ لڑ کر کمزور ہو جائیں اس وقت روس
کی فوج کو خبر دا انا۔ پر محیط ہو۔۔ اس طرح تمام یورپ فتح ہو جائے گا اور
ساری دنیا میں ایک اکیلا شہنشاہ روس کا سلطنت کرے گا"

ٹائمز کے نامہ نگار سینٹ پیٹرزبرگ نے ایک چٹھی کا ترجمہ دیا ہے
جس کا لکھنے والا این ایس ہے جس کی نسبت عموماً خیال تھا کہ یہ دراصل
جنرل سوبیلاف کی ہے۔ یہ سول ملیٹری گزٹ میں چھپا تھا اور اس کا اردو
ترجمہ کوہ نور نے شائع کیا تھا۔ کراشل میں پوری چٹھی ہے۔ ذیل میں اس
کے جستہ جستہ فقرے درج ہیں: "ہمیں خود ہندوستان کی ضرورت نہیں،
ہم۔ چاہتے ہیں۔۔ کہ باسفورس پر قبضہ حاصل کریں اگر انگلینڈ۔۔ سد راہ
نہ ہو تو ہم ہندوستان میں اس کی حکومت کو مدد دینے کے لیے مستعد ہیں
۔۔ رہی ہندوستان پر فوج کشی۔۔ کی مشکلات، سو کیا صاف ظاہر نہیں ہے کہ وسط
ایشیا کی موجودہ حالتوں اور ہمارے اعلیٰ رتبے سے جو ہمیں وہاں حاصل

ہے، روسی فوج کو اسکندر اعظم، چنگیز خان، تیمور، نادر شاہ اور دوسرے حملہ آوروں کی نسبت بہت ہی کم مشکلات پیش آئیں گے۔ اور اگر ہم ہندوستان میں داخل ہو کر منادی کر دیں کہ اہل ہند کو انگریزی جوئے سے خلاص کیا گیا' اور جب انگریزوں کا اس ملک سے استیصال ہو جائے تو ان کو مختار کر دیں تو کیا اعتراض ہے؟ ہندوستان میں ہمارے دوست اس کثرت سے ساتھ ہوں گے، جیسے آسمان پر ستارے۔ انگریز اس پر غور کریں۔"

کالم انگلش مین یہ۔۔ سن کر کہ گورنمنٹ روس دیسی اخبارات کی خریداری کیا چاہتی ہے از حد ناراض۔ ہے"

"وسط ایشیا کی نازک حالت (مدیر کا مضمون)، کالم ۲: عزت کے ساتھ جنگ کرنا بے عزتی کی صلح سے بہتر ہے اور وہ صلح جو مسٹر گلیڈسٹون۔۔ روس کے ساتھ۔ چاہتے ہیں' وہ علاوہ بھی برا ہانت ہونے کے چند روزہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وسط ایشیا میں لڑائی ضرور ہونی چاہیے۔ روسی چڑھائی کی نسبت مسلمانان ہند کی رائے؛ کالم ۳ و ۴؛ جنرل گل' میز لو از جنگ کی چٹھی جو بمبئی گزٹ میں چھپی تھی اس کا ترجمہ ۱۱ کالم ماخوذ از اردو گائیڈ۔ جو لوگ باشندگان ہندوستان کو آمادۂ بغاوت کہتے ہیں وہ مسلمانان ہند کو سب سے زیادہ آمادۂ بغاوت بتاتے ہیں' اس کو میں رد کرتا ہوں۔ مسلمانان ہند پر برٹش گورنمنٹ کا مطیع ہونا ایک فرض واجب ہے۔۔"

"وسط ایشیا کی نازک حالت" (از مدیر): کالم ۱؛ روس نے وسط

ایشیا میں جنگی دھمکی دے کر۔۔ اس بات کا بہت عمدہ موقع دیا کہ ہم لوگ اپنی وفاداری کا۔۔ قوی ثبوت دیں۔۔"

۲۷/۴ " سینٹ پیٹرسبرگ کے بڑے بڑے اخبار یہ رائے دیتے ہیں کہ افغانستان و بلوچستان پر کامل قبضہ کر لیا جائے"

۲۲/۴ " خبر ملی ہے کہ شہنشاہ روس عن قریب سابر یا اور زیا سہاے وسط ایشیا کے بادشاہ کا خطاب اپنے لیے حاصل کریں گے"

۲۲/۴ " پیرس کا ایک اخبار فرنگیتس لکھتا ہے کہ ایک ہندوستانی جو اپنے تئیں مشہور ناناصاحب کا لڑکا قرار دیتا ہے روسی فوج کا افسر ہے اور وہاں اس نے بہت اعزاز حاصل کیا ہے"

۱/۴ " کلکتہ میں روس کا خوف بزدلی سے نمایاں ہو رہا ہے"

۲/۸ یورپ کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بالآخر انگلینڈ کو روس سے ہار ماننا پڑے گا"

۲/۸ "اخبار ٹریبیون میں ایک اینگلو انڈین نے انگریزی اور روسی حکومت کے مقابلے پر اپنی تحریر شائع کی تھی جس میں روسی انتظام کو ترجیح دی۔۔ تھی ۔۔۔"

"جنگ روس کے لیے ہماری تیاریاں" ۲/۴ اخبار عام کا طویل مقالہ

۹/۳ " زار روس کا شہنشاہ وسط ایشیا کا خطاب لینے کا جشن آئندہ سال تک ملتوی رہا کیوں کہ ٹرینس کاسپین ریلوے جب مرد اور بخارا میں جاری ہو جائے گی تب یہ جشن سمرقند میں کیا جائے گا"

۱/۵ " خیال کیا جاتا ہے کہ ہال مال گزٹ۔ جو روسیوں کی تائید ۔۔

میں لکھتا ہے اس کو روسی گورنمنٹ نے .. رشوت دی ہے"

۱۲/۵ "حال میں ایک بنگالی بابوؤں کا ڈپوٹیشن پوسٹ ماسٹر دیناپور کے پاس یہ دریافت کرنے گیا تھا کہ اگر یہاں روسی آ کر قابض ہو گئے تو ان کی پنشنوں کا کون ذمہ دار ہوگا"

۱۳/۴ "کرنیل علی خانوف کی سوانح عمری": (اس کا نام نزلے روس (انگلستان کے سلسلے میں آ کا رہا ہے) اصلی نام مقصود علی خاں ہے۔

۱۲/ ہند اور وسط ایشیا کی انگریزی حکومت پر جنرل انگلاف کے خیالات از رفیق ہند:۔ مقدم الذکر کی مذمت "خود ایک انگریز نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمان فاتح بہ نسبت انگریزوں کے .. رعایا کی بہبود کا زیادہ تر خیال رکھتے تھے ۔ وہ اعلیٰ درجے کی شہنشاہی عمارتیں جو مسلمان فاتحوں نے تعمیر کرائی تھیں انگریزوں کے عہد میں تباہی کی حالت تک پہنچ گئی ہیں") زراعت پیشہ لوگوں کی حالت خراب، صنعت تباہ غرض صرف انگریز تاجروں کے فائدہ سے ہے"۔ جنرل انگلاف نے لکھا ہے کہ میرا مضمون ہندوستان میں بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا اور مختلف اخباروں نے اسے نقل کیا۔ میں شکر گزار ہوں۔ (اس مضمون میں روسی حکومت کا ذکر اور اس کی تعریف)

۱۲/۸ " روس کے ساتھ لڑائی کا احتمال روز بروز قوی ہوتا جاتا ہے"

۱۲/۹ "زار روس شہنشاہ وسط ایشیا کا خطاب قیصر ہند کی ضد سے لیتے ہیں"

۱۲/۱۱ مظفر الدین امیر بخارا نے جو روسیوں کے ہاتھ میں ایک

کھلو نا مجھے قضا کی گمان ہے کہ روس بخارا پر قبضہ کرے گا۔

؂ ایک سیاح کہتا ہے کہ روسی سپاہی اول درجے کا جاہل متعصب اور بہادر ہوتا ہے خوراک اور پوشاک کے بارے میں۔۔ شدید سے شدید تکلیف برداشت کرتا ہے۔" ؂

؂ "قسطنطنیہ کے اخبار ہندوستان کی پیشقدمی پر روس کے ہمدرد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روس ہندوستان پر مسلمانوں کے حقوق کی طرف [illegible] متوجہ ہوا ہے"

(۶) ترکی ؂ "جس وقت کہ وسط ایشیا اور سوڈان کے معاملات کی سرگرمی تھی جو سلطان روم کی روس و انگریز دونوں خوشامد کرتے تھے۔۔ اس کا تصفیہ بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ ایک دم سے دو صوبے رومیلیا و البانیا باغی ہو گئے، ایک طرف سے یونان نے دھمکی دی اور دوسری طرف سے سرویا نے سر اٹھایا۔ سلطان المعظم نے صبر و تحمل سے کام لیا اور یورپ کی سلطنتوں سے ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی درخواست کی۔ انگلستان نے یونان و رومیلیا۔ کو سرزنش کی، رومیلیا تو مان گیا لیکن یونان ابھی دروں نیچے بزدلی کی حالت میں ہے۔ سب سلطنتوں کے اتفاق سے رومیلیا کے بارے میں۔۔ مجلس شوریٰ منعقد ہونے والی تھی، ابھی تک اس کے نتیجے کی اطلاع نہیں آئی۔" مدیر

"اخبار انڈین اسپکٹیٹر لکھتا ہے: انگلینڈ کو ترکی سے جو کچھ تعلق ہے اس کو معاملات بلغاریہ کے انفصال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہ تعلق نہ صرف مصر سے ہے بلکہ ہندوستان کے مسلمان شہزادے اور

مسلمان باشندوں کے ساتھ ہے۔۔ اگر سلاطین یورپ سلطنت عثمانیہ کی تباہی کے درپے ہوں گے تو مسلمان کو بڑا صدمہ پہنچیگا۔ یہ خطرہ روسی پیش قدمی کے خطرے سے بہت زیادہ ہے۔۔"

(۷) افغانستان: روس کے اقدام کی وجہ سے ۱۸۸۵ء میں افغانستان کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ امیر عبد الرحمٰن نے راولپنڈی میں لارڈ ڈفرن سے ملاقات کی تھی؛ ان کے متعلق ہندوستان میں متضاد خبریں شائع ہوا کرتی تھیں، کبھی یہ کہ دراصل وہ روس سے ملے ہوئے ہیں ۱؎ اور کبھی یہ کہ وہ دل سے انگریزوں کے ساتھ ہیں ۲؎ ۳؎ ۔

۱؎ "رسالدار میجر مرزا عطاء اللہ خاں سردار بہادر نے افضل خاں کی جگہ پر کابل میں انگریزی سفیر مقرر ہوئے ہیں"

۲؎ "پایونیر لکھتا ہے: کرنل اسٹوارٹ کی پارٹی ہرات میں پہنچی تو ہرات کے خاص خاص ملاؤں نے مسجد میں۔۔ دعا مانگی کہ ان کا آنا ۔ بعبور برکت ہو۔ ۔ملا۔۔ ہمارے طرفدار ہو جائیں تو افغانستان ایک معتبر رفیق ثابت ہوگا"

۳؎ افغانوں کا خیال تھا کہ انگریزوں کا ارادہ راولپنڈی میں امیر کو بہکانے کا تھا بہت سے تحائف اور "نئی نئی عورتیں" لے کر افغانستان واپس جانے کا بہت عمدہ اثر پیدا ہوا ہے۔ (یہ خبر بھی عجب نہیں کہ پائنیر ہی سے لی گئی ہو" "ارادہ" سے پہلے لفظ "ہمارا" ہے۔

۴؎ کابل کی وحشیانہ سزائیں۔ ۔سزاؤں کے نام یہ ہیں قین قانا، کنڈا شقہ، مزغزا، بندی، پوست کشیدن، ٹکر ٹکر کردن، بر توپ پراندن

"قین قانا سزا" اقرار جرم کے لیے دی جاتی ہے۔۔ زمین میں ایک بڑی موٹی ہنٹر گاڑ دیتے ہیں یہ درمیان سے شگاف دار ہوتی ہے، اس کو پہلے۔ کھولتے ہیں، پھر اس کے اندر مجرم کا پاؤں دیا جاتا ہے۔ تمام انگلیوں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں"۔۔ اس پر بھی + اقبال نہ کیا تو اسے۔۔ تورہ پر پلٹ دیتے ہیں۔ اس تقریب سے اکثر مجرم مرجاتے ہیں شقہ کی سزا کابل کے زنجیر دروازے میں دی جاتی ہے جو خاص اسی کام کے لئے ہے۔ اس دروازے کے درمیان ایک آہنی زنجیر لگی ہے۔۔ مجرم۔ کو اس زنجیر سے۔ لٹکا دیا جاتا ہے اور دو تیز گھوڑوں کو ایک رسی سے باندھتے ہیں اور اس رسی کو مجرم کی کمر سے لپیٹ دیتے ہیں اور پھر ایک گھوڑے کو ایک طرف اور دوسرے۔۔ کو دوسری طرف چابک مار کر دوڑا دیتے ہیں کہ جس سے مجرم کا بدن شق ہو جاتا ہے، اور اس سے اس کا نام کنڈا (کذا)۔ کاٹھ مارنے کی سزا ہے جو کسی زمانے میں یہاں بھی جاری تھی۔ بندی کی سزا قید ہے، مگر قیدیوں کو اندھیرے کوئیں میں ڈال دیتے ہیں اور پھر ان کی کوئی خبر گیری نہیں کی جاتی غرغرہ کی شکل انگریزی پھانسی سے ملتی ہے۔۔ مجرم کو زمین پر کھڑا کرتے ہیں اور اس کے گلے میں ڈال کر کھینچ لیتے ہیں"

مارننگ پوسٹ لکھتا ہے کہ امیر کے خزانے سے جو دس کروڑ چوری گیا ہے یہ روپے کہاں سے آئے؟ خیال ہے کہ روسیوں سے رشوت ملی ہو گی۔

آمرت بازار پتر کا نے حال میں دربار راولپنڈی کے متعلق ایک مکالمہ درج کیا ہے جو خالی از لطف نہیں:

وائسرائے: آپ میرے بریسنے میں آئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خوش طالع ہیں، جیسے کہ پیاسی زمین پانی پی کر سرد ہو گئی ہے اسی طرح سے آپ کے دوست بھی۔

امیر: لیکن کل رات کو میرے پلاؤ میں نمک بہت زیادہ پڑ گیا، میں اپنے ملک میں اس شخص کو مار ہی ڈالتا کہ جو اس طرح سے پلاؤ پکواتا۔ میں چاہتا ہوں کہ روسی میرے واسطے اس سے اچھا پلاؤ پکوائے۔

وائسرائے: لیکن مجھ کو بہت سے دقیق امور پر آپ سے بحث کرنا ہے، آپ کو۔۔۔ پلاؤ کی سب سے زیادہ فکر ہے معاف کیجئے، ہندوستان میں ہم لوگ زیادہ نمک کھاتے ہیں، آیندہ سے بہت کم نمک آپ کے کھانے میں ہوا کرے گا۔

امیر: تو ہم کو نمک کھلا کر اپنا وفادار بنانا چاہتے ہیں، میری ۲۱ ضرب کی سلامی آپ نے کیوں کی؟ کیا میں نظام اور مہاراجہ کشمیر کے برابر نہیں ہوں؟ کیا میں سلطان سے دوسرے رتبے میں خود مختار بادشاہ نہیں ہوں؟

وائسرائے: اگر آپ کو توپوں کی زیادہ پروا ہے تو جس قدر کہیے دغا کریں۔

امیر: اچھا آیندہ سے ایک سو ضرب توپ کی سلامی ہوا کرے اب ہم کو اتفاق کی بابت گفتگو کرنا چاہیے۔

وائسرائے: اب حالات بیان کیجیے اور اتفاق کی بابت امور کا کچھ ذکر کیجیے۔

امیر: ہمارا اور آپ کا اتفاق دائمی رہے۔

وائسرائے: آمین۔ آپ کا مزاج شل بہت بڑے سمندر کے ہے کہ اس میں تھاہ ہی نہیں۔

امیر: قیصر ہند۔۔ کا سن بہت ہو لیے میں نے سنا ہے کہ ان کی لڑکیاں بہت سی ہیں۔۔ دو یا تین حوریں میرے حوالے کی جائیں۔ قیصر میری ماں ہوں اور میں ۔۔ ان کا لڑکا۔

وائسرائے: قیصر ہند تو بے شک اس میں خوش ہوں لیکن شاہزادیوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔

امیر: یہ ایک چھوٹی سی بات ہے۔۔ ملا فتویٰ پڑھ دیں گے اور طلاق ہو جائے گی۔

وائسرائے: شاہ زادیاں انگلینڈ میں اور ان کے خاوندوں کو قیصر ہند سے کوئی تعلق نہیں اور علاوہ اس کے ہمارے یہاں کا قانون طلاق بالکل آپ کے یہاں سے جداگانہ ہے

امیر: میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر ہے۔ اچھا صلح بیام (کذا) ہند مجھے کابل جانے دیجئے۔

وائسرائے: لیکن آپ واپسی کے وقت روسیوں کو ہرات پر قابض دیکھیے گا۔ اس پر امیر صاحب کو غصہ آیا اور وہ بے ہوش گر پڑے۔ عرق گلاب چھوڑا گیا تب ہوش میں آئے۔ اس کے بعد دوسرے اور تیسرے روز کی فرضی گفتگو) ۱۸۸۵ء مگر یہ غلط ہے ۱۸۸۶ء ہونا چاہیے (

تھے کھلے اخبار میں وہ اشتہار۔۔ ناظرین دیکھ چکے ہیں جو امیر کابل نے اسی

خون (جنگ روس) کے متعلق اپنے ملک میں دیا ہے۔ آج ایک۔۔ ہم عصر صاحب نے دوسرا اشتہار اسی بارے میں دیا ہے جو امیر۔۔ نے دیا ہے اور جس میں لکھا ہے کہ آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی کو دور کریں اور سب متفق ہو کر خواہ روسیوں سے یا انگریزوں سے، یعنی ان میں سے جو کوئی کہ افغانستان پر قبضہ کرنا چاہے اس سے مقابلہ کریں۔ جو قومی قبیلہ بہ وقت جنگ امیر کے ساتھ۔۔ ہوگا اس کو ہتھیار اور آذوقہ امیر کی سرکار سے مفت دیا جائے گا۔۔ وہی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک سیاح کابل کا بیان ہے کہ امیر کے وزیر کا قول ہے کہ امیر۔۔ کو راول پنڈی کے دربار سے۔۔ خوشی اور تسلی حاصل نہیں ہوئی۔ وائسرائے کے باب میں ان کا یہ قیاس ہے کہ یہ جس قدر زیادہ گویا ہیں، اتنے ہی بخیل بھی ہیں۔ ان کو یہ امید تھی کہ۔۔ بیس لاکھ روپیہ اور لاکھ ۲۵ ہزار سے کم نہ دیویں گے۔۔" از اخبار عام ۲۲

اشخاص ۶ | پرنس آف ویلز: ۱۱۸۲ "مخالف اخبار اب لکھتے ہیں کہ پرنس آف ویلز کو ضرور قتل کرنا چاہیے (نہ معلوم "قتل کی جگہ دراصل کیا تھا)"

۲ اپریل "حکیم حاذق الزماں مرزا اشرف علی خاں۔ بہادر دہلوی شاگرد رشید حکیم امام الدین خاں دہلوی مرحوم جو سابقاً۔ دکٹوریا گنج لکھنؤ میں ۹ سال سے مطب فرماتے تھے جن کی نسبت اڈیٹر اودھ اخبار وغیرہ نے بھی اشتہارات دیے تھے، مگر کچھ عرصہ سے ... باکی پور میں مطب فرماتے ہیں۔۔" اشتہار از جانب مدیر

آزاد: "۲۹ ۸۵ کو وہ لوز ۱۸۸۵ لکھتا ہے: اس ہفتے میں۔۔ مولوی محمد حسین

.. آزاد بہ حصول رخصت بہ نیت زیارت عتبات عالیات و سیاحت فارس و عربستان روانہ ہونے والے ہیں؛ غالباً آج شام کو روانہ ہوں۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ .. اس سفر میں تو تصنیف کتب علوم و فنون کی بہم پہنچائیں گے .. اور قدیم .. بھی تلاش فرما کر .. ہمراہ لائیں گے .. مولانا .. نے ایک معتد بہ حصہ رُوپے کا یعنی کل اپنی عمر کا حاصل ایسے خیر محض کاموں کے لیے وقف فرمایا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بر وقت مراجعت لاہور میں ایک کتب خانۂ آزاد کھولیں گے۔"[۱۱] آزاد بہ پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور ۲۰ اکتوبر کو بخیر پہنچ گئے۔

شاہ امجد حسین سجادہ نشین منیر:[۱۲] اکبر دانا پوری کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات ۱۳۰۷ھ

سشمہ یافتہ از دست قضا مات شد افسوس ... ان شاطر بے مثل زمانہ بد و ساعت
بشکست بیک چشم زدن نقشہ تیش ... منصوبۂ خود راست کند یا نتہ فرصت
از کجرو شان تافتہ رخ گشت بیکسو ... چوں بادشہ گوشہ نشیں رخ بہ خلوت
اکبر چہ کنم حالت ایں واقعہ تحریر ... شاطر از اجل مات شدہ شد سن رحلت

احسن الدین احمد:[۱۳] "مولوی احسن الدین احمد بسرسولی .. نواب امیر علی خاں بہادر جو اس وقت .. سول سروس میں بہ عہدۂ اسسٹنٹ مجسٹریٹی مقرر ہیں، امتحان مقررۂ قانون میں کامل العیار نکلے اور امید قوی ہے کہ عن قریب ہم لوگ ان کو عہدۂ جوائنٹ مجسٹریٹی اور ججی پر فائز .. دیکھ کر شکر منعم حقیقی کریں کہ ہم مسلمانوں میں سید محمود .. کی طرح اور ایک مسلمان اس منصب عالی شان پر مرتقی ہے۔"

کرنیل اولکٹ: کرنیل اولکٹ تھیوسوفسٹ تھے، اور دوسرے
مقامات کے علاوہ پٹنہ میں بھی ان کا لکچر ہوا تھا۔[۲۶] انھوں نے پٹنہ میں
اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "میں ہندوستان کا دوست ہوں، اور میں نے
اس کو اپنا گھر بنا لیا ہے"

تانیتا بھیل: ۱۸۸۹ء "آج کل تانیتا بھیل کی شرارت نے انگریزی پولس
کو الو بنا رکھا ہے۔ تانت باجی اور راگ بوجھا خل مشہور ہے "تانیتا بولا
پولس بھاگا۔ اب بھی ہندوستان کی بعض... نیتاپوس (کذا) دقیانوسی ریاستو
میں۔ چوری کا وہ انتظام عمدہ ہے کہ بایدوشاید، مگر ہماری گورنمنٹ
نے چوری کے... انسداد کو پولس کی دُم (کذا) کے بھروسے رکھا ہے جس
میں اکثر ذلیل لوگ ہوتے ہیں... بسا اوقات بیٹھے ہیں اور چپ ہو جاتے
ہیں، چنانچہ تانیتا نے عجب دُم میں گھنگھٹا باندھا ہے، کبھی تو پولس انسپکٹر
بن جاتا ہے، اور گاہ سپرنٹنڈنٹ کا سا نگ لاتا ہے، بہت سے افسران
پولس کو... ناک کاٹ کر برہنہ چھوڑ دیا... ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ رہتک کے
علاقے میں ایک ٹپو نامی جاٹ نے پولس کی دُم میں ہتکڑی باندھ دی تھی۔
اور ۲۰ کنسٹبلوں کو مع پولس انسپکٹر کے جو اس کے گرفتار کرنے جاتے تھے
انھیں ہتکڑیوں سے جکڑ کر رکھ دیا، اور آپ تو دو گیارہ ہوا، پولس صرف
رعیت پہ خوب کسر نکالتا ہے... از اودھ پنچ - ۱۸۸۹ء "پاینیر کے پاس چٹھی کے
ایک نامہ نگار نے لکھا ہے کہ مشہور ڈکیت تانیتا بھیل کی روز بہ روز شہرت
ہوتی جاتی ہے اور لوگ اس سے خائف ہیں... دو فقیر دل سے... ملاقات
ہوئی ان میں سے ایک نے کہا کہ تانیتا بھیل غریب محتاجوں کو نہیں ستاتا...

امیروں کو لوٹتا ہے"۔ ایک مرتبہ ایک ہیڈ کانسٹبل کے بارے میں اسے معلوم ہوا کہ اس کا دعویٰ ہے کہ میں تانتیا کو گرفتار کر لوں گا۔ حجام کے روپ میں اس کی حجامت بناتے ہوئے۔ اس کی تصدیق کر لی اور وہیں استرے سے ناک کاٹ لی اور یہ کہتا ہوا بھاگا کہ میں ہی تانتیا ہوں گرفتار کرو۔

از دار السلطنت: ۱۸۸۹ تانتیا نے کھنڈوا کے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی تھی کہ میں خزانہ لوٹنے آؤں گا (یہ ذکر نہیں کہ پھر کیا ہوا)

جمال الدین افغانی: ۲۵ ۱۸۸۱ء میں ہم نے اخبار عروۃ الوثقیٰ پر ریویو لکھتے وقت شیخ۔ کا کچھ تذکرہ کیا تھا۔ مگر وہ صرف قیاسی تھا۔ اسی زمانے میں صاحب ایڈیٹر کوہ نور نے ان کی نسبت لکھا اور ذاتی تعارف کا ذکر بھی کیا جو۔ حیدر آباد دکن میں ایک معقول عرصے تک ان کو حاصل رہا۔ اب پال مال گزٹ کے کارسپانڈنٹ نے پیرس سے ان کا کچھ حال لکھا ہے جس کا ترجمہ ہم سول سے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں: شیخ جمال الدین حسینی الافغانی جو آج کل پیرس میں ہیں ۱۸۳۸ء میں۔ کابل کے درمیان ایک معزز خاندان سادات میں متولد ہوئے۔ سال (اس کے بعد ہندسہ غائب) کی عمر میں انہوں نے عربی زبان کی تحصیل شروع کی اور علم فقہ و اخلاق و فلسفہ وغیرہ میں کمال مہارت پیدا کی۔ جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا مفسدہ ہو چکا، تو شیخ نے ہندوستان میں آکر اس کے ہر ایک حصے کی سیر کی بعد ازاں مکہ معظمہ کو حج کو گئے اور وہاں سے براہ بغداد فارس اپنے وطن افغانستان کو واپس آگئے یہاں اس وقت۔ شیر علی خاں۔ اور۔ عبد الرحمٰن خاں۔ کے درمیان رقابت کی جنگ ہو رہی تھی شیخ نے۔ عبد الرحمٰن خاں۔ کی طرف داری کی عبد الرحمٰن

خان کو شکست ملی تو شیخ قسطنطنیہ کی طرف بھاگ گیا۔۔ اس کے علم وفضل کا شہرہ۔۔ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا، علمائے قسطنطنیہ نے اس کو بڑی عزت وتعظیم سے قبول کیا، اور کوشش کرکے اس کو قسطنطنیہ کے محکمۂ تعلیم کی جماعت منتظمہ کا ممبر مقرر کرایا۔ کچھ عرصے کی سکونت کے بعد شیخ کو سلطنت ترکی۔۔ بد نظمی وبے انتظامی کا حال معلوم ہوگیا۔ انھوں نے ترکی کے خلاف مضامین لکھنے اور وعظ کہنا شروع کردیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کو حدود سلطنت عثمانیہ سے ۱۸۷۱ء میں بدر کردیا گیا۔ اس کے بعد یہ مصر گئے، وہاں، مصر اور سوڈان کے بڑے بڑے علما ان کے شاگرد ہوئے۔ ان شاگردوں میں ایک۔۔ نامی گرامی شاگرد شیخ محمد احمد تھے جو اب مہدی کا سوڈانی کے نام سے مشہور ہیں شیخ نے قاہرہ میں اسمٰعیل پاشا کے برخلاف حملے کرنے شروع کیے اور اس کو۔۔ اسلام اور مصر کا ویران کرنے والا قرار دیا۔ شیخ نے اسمٰعیل پاشا کی معزولی میں سخت کوشش کی تھی، جب توفیق پاشا خدیو حال تخت نشیں ہوئے تو ان کے برخلاف بھی شیخ نے وعظ کہنا شروع کردیا اور بیان کیا کہ یہ۔ عیسائی سلطنتوں۔۔ کے ہاتھ کا پتلا ہے۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۰ء میں۔ مصر کی حدود سے بدر کردیا گیا اور ان کا کل اسباب ضبط کیا گیا اس کے بعد شیخ پھر ہندوستان میں آئے، اور یہاں تین سال اقامت کرکے پھر پیرس کو گئے۔ اب دو سال سے پیرس میں مقیم ہیں۔ شیخ اوقات کے نہایت پابند ہیں، علی الصباح بیدار ہوکر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں۔ بعد اس کے انگریزی وفرانسیسی اخباروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور مختلف مضامین کے رسالے دیکھتے ہیں۔ پیرس میں۔ ایک رسالہ عروۃ الوثقیٰ

جاری کیا تھا۔ روس و انگلستان کی نسبت ان کی قطعی رائے ہے کہ اگر اب جنگ ہوئی تو۔ اس کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔۔ اس معاملہ میں جس قدر دیر ہوگی اسی قدر روس کا فائدہ ہے۔ مہدی کی نسبت یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی عمر میں نہایت ذہین تھا اور علوم فقہ فلسفہ اور اخلاق وغیرہ میں مہارت تام رکھتا ہے۔۔ مذہب اسلام کی تاریخ میں وہ مستند استاد خیال کیا جاتا ہے۔ عروۃ الوثقیٰ کے بہت تھوڑے پرچے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ اس سے ان کے اعلیٰ درجے کی فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے معلومات کے نہایت وسیع ہیں، علی الخصوص اسلام کی حمایت میں ان کے مضامین نہایت۔۔ پرزور ہوتے ہیں۔ یہ شیخ۔۔ بڑا اولوالعزم آدمی ہے' ترکی اور مصر کی رعایا کی نسبت ان کی خدمتیں قابل تحسین ہیں۔ ترکی کی نسبت ان کی یہ رائے ہے کہ یہ سلطنت جمہوری ہو جائے یا کم سے کم اتنا ہو کہ سلطان اہل حل وعقد کی رائے سے منتخب ہو۔ مصر کی نسبت ان کا منشا ہے کہ یورپین سلطنتیں اس میں مداخلت نہ کریں' (پنجابی لاہور سے ماخوذ)

مرزا داغ: شحنہ "یہ مشہور و معروف شاعر آج کل نہایت۔۔ علیل ہیں ان کی پشت میں ایک پھوڑا نکلا ہے۔۔۔ شگاف ہوا قریب ایک سیر کے۔۔ مواد نکلا' بعدہٗ چند مسہل ہوئے۔۔ نواب رام پور کی جانب سے معالجے کے لیئے نہایت تاکید ہے۔ خدا حضرت داغ کو صحت بخشے۔۔ ان کے سبب سے اردو کی شاعری کو زیادہ عروج ہو رہا ہے" از کوہ نور

رام پال سنگھ: شحنہ "راجہ رام پال سنگھ تعلقدار رام پور اودھ جو کہ عرصہ سے انگلستان میں مقیم تھے۔ اور ایک اخبار بھی مسمیٰ ہندوستان نکالا تھا' اب

انگلینڈ سے .. مدراس میں حکیم صاحب پہنچے .. وہاں سے دہلی جائیں گے"

سٹی والے: ۲۴ "سٹی والے بھی اتفاق سے اسی وقت مرگیا جب کہ سربارٹل نے وفات پائی (ظاہرا واقعہ ۱۸۸۶ء) .. افریقہ کی ایک وحشی قوم کا بادشاہ تھا' لڑائی میں انگریزی فوج پر فتح پائی - اور آخر کار نہایت حیرت انگیز عجلت سے قید ہو گیا اور پھر اسی حیرت انگیز عجلت سے لندن میں ایک شریف عورت کا محبوب بنا اور پھر فوراً ہی بادشاہ بن کر شان وشوکت کے ساتھ اپنے ملک میں واپس آیا"

سلطان نواز جنگ: ۲۵ "سلطان نواز جنگ جن کے لیے ایک مہینے کے عرصے میں حیدرآباد سے پچاس میل کے فاصلے سے نکل جانے کا حکم ہوا ہے ریاست پچاس ساٹھ لاکھ روپے کے اوسط میں ان کی قرض دار ہے علاوہ اس کے اور بھی متفرق لوگوں پر قریب چالیس لاکھ .. کے ان کا پاتا ہے .. دربار نے .. بالفعل .. ایک کمیشن مقرر کیا ہے .. کہ قرضے کی تحقیقات کی جائے سنا ہے کہ گورنمنٹ نظام .. باون لاکھ قرضے پاک کردے گی تو وہ .. اپنے خاص وطن میں جو کہ بحر احمر پر ہے چلے جائیں گے" ذکر ۲۶ میں ہے کہ گورنمنٹ نظام ۷۰ لاکھ کی مقروض ہے اور دس کروڑ کے قریب ان "ان کا شہر میں پھیلا ہوا ہے۲۷)

سید احمد خاں: ۲۸ "نومبر کے اسٹیٹسمین میں کرنیل جی گراہم نے سید احمد خاں کے حالات زندگی پر جو کتاب لکھی تھی اس کا تبصرہ چھپا تھا - کرانکل نے اس کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی میں دیا تھا: "جس مسرت و دلچسپی کے ساتھ ہم نے کرنیل گراہم کے کوائف متعلقہ سوانح عمری و تصانیف قابل تعظیم

روبیہ مسلمانان - بڑھے اس کا اظہار کرنا بغیر اس کے کہ مبالغہ آمیز زبان
کے استعمال کا شبہہ ہو مشکل ہے۔۔ کوئی کام جو ایک انگلش مین ہندوستان
میں کرسکتا ہے اس سے زیادہ قیمتی نہیں جو کرنل ۔۔ نے کیا ہے یعنی ایک
ہندوستانی کی صحیح و زندہ تصویر عوام انگلستان کی نظروں کے سامنے
رکھنا"۔ سید صاحب کی زندگی کے ابتدائی حالات جو اس میں ہیں کم لوگوں
کو معلوم ہیں - غدر کے صحیح حالات کا ہندوستانی نقطہ نظر سے لکھنا تعلیم یافتہ
ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ "تاریخی صداقت کا پلہ برابر ہو جائے" (گرنیل
کی کتاب میں اسباب بغاوت ہند مصنفہ سید احمد خاں کے بہت سے مطالب
کا خلاصہ دیا ہے - اسٹیٹسمین نے اس میں سے کچھ نقل کیا ہے اور اس
کے بعد لکھا ہے) "لیکن اینگلو انڈین کی حالت کبھی بدلنے والی نہیں ۱۸۵۸ء
میں جیسا کہ ۱۸۵۷ء اب ان کا پہلا اصول توضیح قوانین میں ہے کہ حکام۔۔
کی ایجاد کی ہوئی باتیں فطرت انسانی سے بھی زیادہ برامن راہ تا ہیں اور یہ
لوگ اس خیال کو کہ قوانین جو اپنے سے پیدا ہوں ان واقعات اور ان لوگوں
کے عادات کے جن کے لیے وہ بنائے جائیں مطابق ہونا ضروری ہے اپنی
شان کے خلاف سمجھ کر رد کر دیتے ہیں" تبصرے میں سید نے مسلمانوں
میں انگریزی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے جو کوشش کی تھی اس کی طرف بھی
اشارہ ہے' اور آخر میں ہندوستان کے زرعی نظام کے متعلق سید صاحب
کی آراء نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "ہمارے بڑی بھاری آخری کوشش
اب یہ ہونے والی ہے کہ جو باتیں ان اصلاح میں ۱۷۹۳ء کے قوانین کی رو
سے عموماً محفوظ رکھی گئی تھیں وہ کل جماعت کے اختلاف پر بھی معدوم کر دی

جائیں۔ جو لوگ اس حماقت میں گرفتار ہیں' وہ ایسے ہی اندھے ہیں جیسے ان کے متقدمین تھے' اور اس وقت سے ۵ یا ۱۰ سال بعد طوفان آپہنچے گا"

سید حسین بلگرامی: [illegible] "مولوی سید حسین خان ملقب بہ علی یار خاں بہادر موتمن جنگ' پرائیوٹ سکریٹری نظام پٹنہ میں دو روز نواب سید احمد علی خاں بہادر کے مہمان رہے۔

سید علی بلگرامی: [illegible] "مولوی سید زین الدین حسین خاں بہادر مرحوم۔ کے صاحبزادے۔۔ تین سال سے زیادہ انگلستان میں رہ کر بہت سے علوم و فنون حاصل کیے۔۔ معدنیات کے بڑے ماہر ہیں۔ اب یہ حیدرآباد دکن میں کمشنر ہیں۔۔ نواب حیدرآبادی نے ان کو۔۔ انگلستان روانہ فرمایا تھا۔ تار سے پٹنہ کو۔ ممدوح نے۔۔ اس لیے رونق بخشی تھی کہ اپنے لکچر پوری پلورسنے کر دیں۔۔ اپنا لکچر پورا کر کے آج حیدرآباد روانہ ہوئے۔۔ لوکل کالج کے طلبہ نے اپنی ینگ مینس ایسوسی ایشن کی طرف سے۔۔ مدعو کیا تھا اور۔ وہاں ایڈریس بھی دیا گیا۔۔ موصوف نے بھی بہت ہی پاکیزہ۔۔ انگریزی میں اس ایڈریس کے جواب میں اور نیز تہذیب مغربی پر جو اس روز۔ مقررہ بحث تھا' تقریر فرمائی۔ مستقل ارادہ ہے کہ اس سال سنسکرت میں ام اے اور قانون میں بی ال کا امتحان دیں۔۔"

ڈاکٹر شاد [illegible] میں ڈاکٹر شاسول رحمن پٹنہ کی مرگ ناگہانی کی خبر ہے

حافظ عبد الکریم [illegible] میں حافظ عبد الکریم کے متعلق مرقوم ہے کہ پہلے حاجی پور ضلع پٹنہ (کذا) میں منصف تھے' پھر صدر اعلیٰ ہو کر حیدرآباد گئے۔ بعد ازاں حیدرآباد چلے گئے' اور وہاں وفات کے وقت [illegible] روز دوشنبہ اپیل

کے حاکم اعلیٰ یعنی میجوت جسٹس تھے۔

محمد عبید اللہ : ۳/۲ مولوی محمد عبید اللہ ڈھاکہ کے بڑے لائق و فائق عالم و فاضل مصنف مفتاح الادب وغیرہ کتب درسیہ عربی کی وفات۔

غلام حیدر خان: ۳/۱۴ غلام حیدر خاں نے پریسیڈنسی کالج سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔ بی اے کے بعد قاضی رضا حسین انھیں چالیس روپے ماہوار وظیفہ دیا کرتے تھے (یہ بعد کو گیا کے سربر آوردہ وکیلوں میں ہوئے)

ڈاکٹر فرخ : ۱۴/۹ میں ہے کہ چند ماہ قبل ڈاکٹر فرخ سول سرجن پٹنہ بہت دنوں تک بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئے تھے۔

پروفیسر فوسٹ : ۱۱/۶ "پروفیسر فوسٹ کی وفات نے جو ہندوستان کا سب سے بڑھ کر خیر خواہ اور انگلینڈ میں قانون سیاست مدن کا سب سے بڑھ کر عالم اور زمانۂ حال کے مدبروں میں سب سے بر آوردہ تھا انگلینڈ اور ہندوستان کو کچھ کم رنج میں نہیں ڈالا" "اس ہند کے جانب دار مبر نے ہندوستان کی جو خدمت پارلیمنٹ میں انجام دی تھی اس کی طرف مجملاً اشارہ" پہلے یہ ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش ہوئے تو اپنا ہاتھ بڑھا دیا ملکہ نے خوشی سے ہاتھ ملایا ان کی بی بی نے بتایا کہ یہ غلطی ہوئی اور پرنس آف ویلس کی وساطت سے اس کی تشریح کی گئی۔ ملکہ نے پیام بھیجا کہ آپ سے ہاتھ ملانا میں بڑی عزت سمجھتی ہوں

مرزا قادر بیگ : ۴ مرزا قادر بیگ نے جو حیدر آباد کے بڑے تعلقدار اور لائقوں میں شمار کیے جاتے تھے قضا کی یہ "مولوی مہدی علی.. نظام کے سکریٹری کے سالے" تھے۔

گوپال راؤ: یہ سرکاری ملازم تھے، مگر قبل برطرف ہوئے۔ ان
کے مقدمے کا ذکر اخبار میں آیا ہے (بظاہر اشتہار سے پہلے) ان کا ارادہ
تھا کہ وہ غریب طالب علموں کے لیے بانکی پور میں بورڈنگ ہاؤس
قائم کرنے کا ہے۔ جو کچھ یہ اُمرا سے حاصل کرتے ہیں بے تامل غربا کو دیتے
ہیں (دراصل میں ان کی طرف سے اشتہار شائع ہوا کرتا تھا کہ کوئی کلکتہ یا انگلستان
سے کچھ منگوانا چاہے تو وہ کمیشن ایجنٹ کے طور پر منگوا دے سکتے ہیں)
سید محمد حسین لطیف: "مولوی سید خیرات احمد صاحب وکیل عدالت
دیوانی ضلع گیا نے مضمون ذیل بھیجا ہے۔۔: ۔۔ اردو کی زینت جیسی۔۔
انیس۔۔ کی زبان سے ہوئی احاطۂ تحریر دلفریب سے باہر ہے۔۔ بالفعل
اتفاقات۔۔ سے سید محمد حسین صاحب لطیف۔۔ از ارشد تلامذۂ۔۔
انیس صاحب گنج میں وارد ہوئے۔ ایک مجلس میں اپنا کلام کچھ ایسا پڑھا
کہ سبحان اللہ۔ یہاں تک کہ بعضوں نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس کی
۔۔ میر صاحب۔۔ کو خبر ہوئی اس لیے انھوں نے۔۔ دو چار روز میں گویا
فی البدیہہ ایک مرثیہ ۱۰۰ کا تصنیف فرما کر پڑھا اور بعدہٗ غریب خانے
پر تشریف لائے اور مجھ سے مصر ہوئے کہ کوئی روایت ایسی تھی کہ جس
کو کبھی تو نے منظوم نہ سنی ہو لکھا ان دے کہ میں نظم کروں۔ ہرچند میں نے۔۔
انکار کیا لیکن موصوف۔۔ نے نہ مانا، بہ درجۂ مجبوری میں نے خلاصۃ المصائب
کی روایت شصت و پنجم۔ جس میں۔۔ مضامین بہت کی گنجایش نہیں تھی عرض
کی۔ موصوف۔۔ نے چار دن کے عرصے میں میرے غریب خانے پر گویا
میرے سامنے پوری روایت کو نظم فرمایا۔۔ دو چار روز میں موصوف ایسا

عظیم آباد تشریف لے جائیں گے.. شائقین کلام سن لیں.. [illegible]

حاجی مرزا انشتری: [illegible] اس ایرانی شاعر کو شاہ ایران نے حسام الشعرا کا خطاب دیا ہے۔

سر ولیم میور: [illegible] - وفات بعمر ۸۶ سال۔

[illegible] مسٹر جسٹس سید محمود ایک برس کی رخصت لینے والے ہیں.. ان کا ارادہ ہے کہ تا اختتام رخصت اپنی کتاب محمڈن لا کا خاتمہ کر دیں"

نواب بہاول پور: [illegible] شحنۂ ہند ذیل کی خبر کا ذمہ دار ہے: نواب بہاول پور راول پنڈی کے دربار میں حسب دستور سرکار دیجا عمامہ اور مرصع سرپیچ باندھ کر شامل ہوئے جس میں چار طرف لاکھوں رُپے کے سونے کے زیور مرصع بہ جواہر لگے تھے۔ امیر کابل نے ان کا زرق برق دیکھ کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انگلش افسر نواب.. کو امیر کے ڈیرے میں لے گیا۔ نواب.. کا چہرہ زرد ہو گیا ہوائیاں اڑنے لگیں.. امیر نے کہا السلام علیکم جواب نہ دارد' امیر نے کہا بسیار خوش جواب میں خاموش۔ امیر نے کہا حالت انتظام مملکت شما چیست بجواب میں خاموش' امیر نے کہا نواب! چہ گونہ وجہ حال داری دِتراچہ شد؟ جواب میں وہی سکوت.. پھر تو امیر جھلا گئے اور بہ آواز بلند اس قسم کے الفاظ کہے کہ ایں بیچارہ را بگذارید کہ با طفلاں یا زناں بازی و ملاعبت نماید یا بگوے دچوگان مشغول شود.."

نواب مرشد آباد: [illegible] دارالسلطنت سے منقول ہے کہ ناظم بنگالہ حال (نواب مرشد آباد) اپنی سوتیلی بہن وحیدالنسا سے جس کی عمر ۱۰ سال کی

بے محمل کرنا چاہتے ہیں اور اس کی یورپی ماں نے اس کے روکنے کیلیے انگلستان میں مقدمہ دائر کیا ہے۔ نواب سالار کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی "۲۰ اولادیں تھیں۔

وکٹر ہیوگو: ۴۸؎ "معلوم ہوا ہے کہ مشہور شاعر وکٹر ہیوگو دو لاکھ پونڈ کی جائیداد چھوڑ کر مرے کہ جس میں دو بہت سا غربا کو دے گئے۔"

شاہ محمد یحییٰ الیحییٰ: ۴۹؎ "شاہ محمد یحییٰ .. کامل تاریخ گو، صوفی سجادہ نشیں درویش متوکل، صاحب علم و فضل شاہ کی الی (یہ قدیم شہر پٹنہ کا ایک محلہ ہے) میں تشریف رکھتے تھے، دو شنبہ گذشتہ کو .. ذی قعدہ کی ۲۶ تاریخ عارضہ فصلی میں مبتلا ہوئے اور دو پہر کے عرصے میں قضا کی۔"

صاف کہہ دو یہ مصرع موزوں   آہ یحییٰ نے کی قضا اے مرد

سنہ ۱۳۰۲ھ، راقم شیخ محمد علی شمشاد تلمیذ جناب شاہ ۶ ستمبر ۱۸۸۵ء"

(۷) متفرقات

اس باب میں کچھ باتیں ایسی بھی درج ہو گئی ہیں جو دوسرے ابواب میں شامل ہو سکتی تھیں:

۵۰؎ "مقام پوسا میں ۷۰ سالہ مسلمان عورت نے ۱۱ سالہ بچے سے شادی کی"

۵۱؎ "دانتا کے کتب خانے میں ایک عربی نسخہ تین ہزار برس کا لکھا ہوا موجود ہے یہ کتاب حضرت عیسیٰ کے ۱۰۵۸ برس پہلے لکھی گئی تھی، اس کا نام الف لیلہ ہے جس میں علم فلاحت کا بیان ہے" (یہ کسی طرح صحیح نہیں)

۵۲؎ "یونا کے اسکول میں دو سو طلبہ پڑھتے ہیں جن کا سن ۱۴ اور ۱۸ کے وسط میں ہے، ان میں سے ۴۰ کی شادی ہو چکی ہے"

۵۳؎ "کوئی شاعر تعزیرات ہند کو نظم کر رہے ہیں"

۲۶/۱ "ہندوستان سے جاتے وقت لارڈ رپن مہاراجہ ہلکر سے مشرقی طور پر بغل گیر ہوئے"

۲۴/۲ "انگلستان میں ہندوستانی حاجیوں کی تعداد مجموعی ۱۲۰ ہے"

۹/۲ "ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک عورت کے تین برس میں مردہ لڑکا ہوا ہے جس کے پاؤں گردن میں لپٹ کر جسم خشک ہو گیا تھا"

۱۱/۵ "بمبئی میں ایک مسلمان حاجی کو غلام خریدنے کے لیے ۴ سال کی قید ہوئی"

۲۹/۶ "آشام کا آخری شہزادہ اور حکام کی زبردستی" (اس کا نتیجہ موت تفاصیل درج ہیں)

۱۱/۸ "امرتا بازار پتریکا کا بیان ہے کہ بنارس کے مجسٹریٹ نے ایک پردہ نشین شریف عورت کو اس جرم میں جیل خانے بھیج دیا کہ اس کے "مختار اور کارندوں نے کچھ جعل یا دروغ بیانی اس کے مقدمے میں اس کی جانب سے کی تھی"

۱۲/۸ مدیر نے کلپٹومینیا کا ترجمہ دزدی خونیا تجویز کیا ہے

۱۳/۹ "ولایت کو جو پارسی تھیٹریکل کمپنی گئی ہے اس میں ۲۴ تماشا گر ہیں"

۱۵/۱۰ "ایک تصویر قیمتی ۶ روپے اور کچھ جائیداد کے لیے جس کی قیمت کچھ زیادہ نہیں فریقین نے دو لاکھ.. سے زیادہ صرف کیے"

۱۲/۱۰ "ایک لہار نے اپنی بی بی کو سربازار اودی ٹیں ۹ پیسے پر نیلام کیا"

۱۲/۱۱ بارہ بنکی کے ایک برہمن سپاہی نے اپنی بی بی کو نکال دیا، اور رسالی سے جو فاحشہ تھی شادی کر لی۔ ایک دن برہمن باہر گیا ہوا تھا کہ "عورت نے اپنے آشنا کو بلایا، لیکن قبل اس کے کہ کوئی فعل سرزد ہو یہ برہمن لوٹ آیا

اپنی عورت کے پاس غیر مرد کو دیکھ کر۔ تلوار سے عورت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا' عورت کے آشنا نے ۔۸ گواہ اپنی بریت کے پیش کیے مگر عدالت سے اس کو حبس دوام کی سزا ہوئی اور خاوند کو دس سال کی سزا کہ اس نے عورت کو مارے جانے سے پہلے افیم کھلا دی تھی" (اس خبر میں کچھ غلطی ہے)

۲۲/۳ ۔ کنور ہرنام سنگھ اہلوالیہ (کذا) کو دربار سرکاری میں پرائیوٹ انٹرسٹ کا اعزاز ملا ہے(؟)

۲۶/۴ انڈین لٹریری ایسوسی ایشن لاہور کا قیام" سکریٹری ایڈیٹر رفاہ عام مولوی شمس الدین سالک" (رہا سابق اڈیٹر؟)

۹/۱۱ نیر آعظم مراد آباد سے منقول ہے کہ جامع مسجد دہلی کی مرمت کا چندا ہو رہا ہے ۔ شرکت کی درخواست جب مرزا داغ کے ذریعے نواب رام پور کے پاس گئی تو انھوں نے کل رقم مرمت ایک لاکھ ۲۰ ہزار خود ادا کرنا منظور کی۔

۲۲/۱۱ سلطان المعظم نے اس سال جو پوشش کعبے کے لئے بھیجی ہے اس کے بنوانے کا خرچ ایک لاکھ ۵ ہزار رُپے ہے اور خدیو نے جو بھیجی ہے وہ ایک لاکھ ۶ ہزار رُپے کی ہے۔

۳/۱۲ "لکھنؤ کی نمائش ۹۰ء میں جس دن پردہ نشیں عورتیں سیر کرنے آئی تھیں اس کی کیفیت ایک لیڈی نامہ نگار نے لکھی ہے کہ تمام دیسی عورتیں بڑے ٹھاٹھ اور تزک سے آئی تھیں ۔۔ زرق برق پوشاکیں پہنیں زیور سے لدی ۔۔ لیڈی ڈفرن ۔۔ بھی موجود تھیں ان کو دیکھ کر عورتوں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں ۔ جب معلوم ہوا نہایت متعجب ہو کر کہنے لگیں ۔ غالباً ان کی ساد

پر حیرت ہوئی۔"

۲۴/۱۳ "مدراس کی عدالت مطالبہ خفیفہ میں ایک نالش دائر ہوئی مدعی نے ۲۵ روپے کا دعویٰ کیا"۔ مدعا علیہ نے جواب دیا کہ۔۔ صرف دس یا بیس روپے باقی ہیں" یہ طے نہ ہو سکا کہ دراصل کس قدر رقم ہے' اس لیے قرعے سے اس کا فیصلہ ہوا۔ کاغذ کے ۳ ٹکڑوں پر تین ہندسے لکھے گئے اور پر خلط ملط کر دیے گئے۔ مدعی سے کہا گیا کہ ان میں سے ایک اٹھائے۔۔ اتفاق سے اسے وہ ٹکڑا ملا جس پر ۲۵ لکھا تھا

۲۳/۸ مدراس میں ایک ۷ بار کے سزا یافتہ چور کو" جو آخری مرتبہ دریائے شور سے ۱۰ برسوں کی میعاد جیل کر آیا تھا دو روپے چوری کرنے کی عدالت میں" عبور دریائے شور حبس دوام کی سزا ملی ہے۔

۳۰/۲ از اخبار عام: اس اخبار کو ایک نامہ نگار نے لکھا تھا کہ ایک بھولے بھالے آدمی کی رائے ہے کہ جنگ میں وہ بہادر بھیجے جائیں جنھیں رائے بہادر اور خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ اڈیٹر کا جواب:" اگر ایک دفعہ بھی سرکار دولت مدار اپنے بہادروں کو جنگ میں بھیجنے کا منشا ظاہر کرے تو پھر سو شخص بھی کوئی ہائے دیسی لوگ اس خطاب کو خرید سکتے ہیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی یہ خوش گمانیں کہاں سے نصیب ہوا اور اس لیے ہماری سرکار کیوں ایسا کرنے لگی ہے"

۸/۳ "بمبئی کی طرف ناٹک کے طور پر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہم جھگڑوں کا تماشا دکھلایا جاتا ہے کہ جس پر بالا پیز معترض ہے"

۹ مسٹر رام نرائن جو عارضی طور پر لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے

ہیں ان کے مستقل ہوجانے کی امید ہے' بنگالی وکیل و بیرسٹر اس تقرر سے
بہت ناراض ہیں۔

۱۲/۶ مسٹر پی مادھو راؤ کو آج کل عورتوں کے سنگار کی بہت فکر ہے۔ آپ
کہتے ہیں "مستی نہ لگانا چاہیے کیوں کہ یہ موتیوں کے سے دانت سیاہ کرتی ہے
۔۔ بجائے کمر بند کے زیر کا استعمال ہونا چاہیے ۔۔ سخت کرسی یا پائیوں کی کنگھی نہ کرنا
چاہیے۔ گھونگھر والے بال رکھنا چاہیے"

۱۱/۶ نواب عبداللہ خاں ساکن بھوپال کے مکان میں ۵۰ روز کامل ہوئے
کہ اینٹ پتھر بہت زیادہ گر رہے ہیں اور دوسرے عجیب و غریب واقعات
بھی ہو رہے ہیں (تفاصیل درج)۔ راقم خبر کہتا ہے کہ اس کی تصدیق مالک
مکان اور متعدد اشخاص سے ہوئی اور ایک بار سنگ باری میرے سامنے
ہوئی "ہزاروں اینٹ پتھر کا ڈھیر" میں نے خود دیکھے از کوہ نور

۱۱/۶ "کراچی سے اس سال کی اول ششماہی میں ایک کروڑ ۔۔ کا مال باہر
سے آیا اور دو کروڑ ۔۔ کا گیا"

۱۱/۶ ایک شخص نے اپنے مخالف پر قتل کا الزام لگانے کے لیے
اپنے بیٹے کو مار ڈالا تھا۔ اس کا مقدمہ مدراس ہائی کورٹ میں تھا
(یہ نہیں کہ فیصلہ کیا ہوا)

۱۲/۶ "پنجاب یونیورسٹی کے سالانہ جلسے میں لفٹنٹ گورنر نے ۔۔
بالکل اردو میں اسپیچ دی"

۱۱/۶ مسلمانوں کے تعلیمی اوقات سے متعلق تحقیقات کے لئے لفٹنٹ
گورنر بنگال نے ایک کمیشن زیر صدارت جی سی پال مقرر کیا تھا' ارکان

نواب عبداللطیف، نواب محمد علی خاں، مسٹر امیر علی، مسٹر ٹولن۔

۴/۹ "میڈم بلوٹسکی ہند میں اگر بد معاش پادریوں پر نالش کریں گی"

۱۲/۲ "مسٹر اولسٹن انڈیا آفس کی شاخ مال کے ملازم۔ فارسی ڈکشنری بنا رہے ہیں ۔۔ جو ۔۔ موجودہ لغتوں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ انھوں نے بہت سی فارسی کتابیں بنائی ہیں"

۹/۱۱ "میونسپلٹی بنارس نے اردو ہندی دونوں عرضیاں لینی منظور کیں"

۹/۱۱ "انگریزی اخبار خصوصاً پانیر کشمیر پر ہاتھ پھیلا رہے ہیں" ۱۱/۱۲ "کشمیر میں رزیڈنٹ کے تقرر سے عام گھبراہٹ ہے"

۱۱/۲۳ "پنجاب کے ایک ڈپٹی کمشنر کا قول ہے کہ انگریزوں کو فرنگی کہنا ہتک کرنا ہے"

۱۱/۲۳ "انڈین ڈیلی نیوز مسلمانان ہندوستان کو مبارکباد دیتا ہے کہ میر محمد حسین ممالک مغرب و شمال کے صیغۂ تجارت و کاشتکاری کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیے گئے ۔۔ اور نصیحت کرتا ہے کہ ۔۔ وہ اپنے تئیں عہدہ ہائے جلیلہ کے ۔۔ قابل بنائیں"

۹/۲ "مہاراج کوچ بہار شملہ میں انگریزی ناچ خوب ناچتے ہیں"

۹/۲ [illegible] میں ایک شخص مسٹر لال موہن گھوش بھی پارلیمنٹ کی رکنیت کا امید وار تھا اور انگریزی اخباروں نے اس کے چال چلن کی برائی کی تھی، لیکن لاہور کے ٹربیون نے لکھا تھا کہ یہ شخص اس شخص سے جو معترضین کے ذہن میں ہے مختلف ہے (یہ پتا نہیں کہ یہ آخر آخر تک امید وار رہا یا نہیں)

۸/۱۵ "ایک دیسی اخبار مدراس کا تجویز کرتا ہے کہ شاہی خاندان

انگریزی کے رکن شادیاں یہاں کے امراء سے کیا کریں اس طرح - بہت جلد اتفاق قائم ہو سکتا ہے"

۱/۴ لارڈ ڈربی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ روس ہند کے بہت قریب آرہا ہے، میں اسی لیے ہندوستانیوں کو دوست بنا رہا تھا۔

۱۲/۸ جنرل گورڈن کو مارنے کے قبل مہدی نے انگریزوں سے بطور فدیہ ساڑھے بارہ لاکھ فرانک مانگے تھے۔

۱۱/۵ "ترکوں کو اندیشہ ہے کہ اطالوی طرابلس الغرب پر حملہ کرنے والے ہیں"

"صاحبان یوریشین نے چند جلسے کر کے معروضداشتیں بغرض ارسال پریس لکھی ہیں کہ کیوں ہمیں بھی صاحبان یورپین کے مساوی حقوق نہیں دیے جاتے۔ اڈیٹر کوہ نور اس پر منصفانہ بحث کرتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے آبائی حقوق کا دعویٰ کریں۔ لیکن یہ ضرور ہونا چاہیے کہ پہلے دوسری کشتی سے پاؤں اپنا اتار لیں، یعنی یہ ان کی شان یوریشین کے ہرگز شایاں نہیں کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ کی نوکری جو دیسیوں کے واسطے مخصوص ہوئی تھیں وقت پر وہ اس میں بھی حصہ بٹانے کو آکودتے ہیں اور اس وقت اپنی آبائی موروثیت سے انکار کر کے دیسی بن بیٹھتے ہیں۔" ۴۴

۲/۳ "پشاور میں افواہ مشہور ہے کہ یہاں کل ساداتوں نے مسلمانوں سے کہدیا ہے کہ وہ لوگ جہاد کے واسطے تیار رہیں، کیونکہ ان سے اور سوڈانی مہدی سے خواب میں گفتگو ہوئی ہے"۔

اردو بہار ہیرلڈ و انڈین کرانکل

اردو انڈین کرانکل پر جو طویل مقالہ عام حصہ ۲ میں شائع ہوا ہے اس میں اردو بہار ہیرلڈ و انڈین کرانکل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اخبار کے جو پرچے میرے پیش نظر ہیں ان میں سے پہلا ۸ جنوری ۱۸۸۰ء اور آخری ۲۶ فروری ۱۸۸۰ء کا ہے، مگر میں یہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب نکلا اور کب بند ہوا۔ میرا خیال ہے کہ جو صاحب اس کی اشاعت کے ذمہ دار تھے، وہی انگریزی بہار ہیرلڈ بھی نکالتے تھے جو غالباً اب تک جاری ہے۔ ۲۹ جنوری کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابو گورد پرشاد سین جو پٹنہ کے نہایت مشہور بنگالی وکلا میں تھے، اس کے مالکوں میں تھے۔ اور بشیشر سنگھ وکیل پٹنہ، زمیندار آرہ اس کے "اسسٹنٹ پروپرائٹر" تھے۔ یہ محلہ جھکنا پہاڑی باتی پور (بانکی پور) سے نکلتا تھا اور اس کا اہتمام نرائن چندر چکرورتی کے ذمے تھا۔ مدیر کون تھا اس کا پتا نہ چل سکا۔ ذیل میں اس کے چند مندرجات کے اقتباسات یا ان کے خلاصے درج کیے جاتے ہیں:

۸ جنوری: اعلان متعلق تفسیر اردو من جانب محمد احتشام الدین مراد آباد۔ اس تفسیر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سید احمد خاں کی تفسیر کا جواب تھا۔

۱۵ جنوری: (۱) بابو رائے جیکشن آنریری مجسٹریٹ، خطاب رائے بہادر (۲) جلسہ انڈین نیشنل کانگرس زیر صدارت نوروزجی۔ صدر نے ایک حیدرآباد

کے "اہل اسلام" کا تار پڑھ کر سنایا جس میں کانگرس کے مقاصد سے "دلی اتفاق" اور کلکتہ کے "اہل اسلام" کی کنارہ کشی پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا: (۳) "نیشنل کانگرس اور اہل اسلام" (ماخوذ از کوہ نور): مسٹر امیر علی اور نواب عبد اللطیف خاں خود کانگرس سے علیحدہ رہے اور مقدم الذکر کی سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن اور مؤخر الذکر کی سوسائٹی نے مسلمانوں کو الگ رہنے کی بھی صلاح دی، مگر ان لوگوں کی اس رفتار کو اہل اسلام ہرگز قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مسٹر عبد السلام ایم۔اے رکن ایسوسی ایشن نے اسٹیٹسمین میں ایک چٹھی چھپوائی ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسوسی ایشن کے ارکان سے سید امیر علی نے مطلقاً مشورہ نہیں لیا، اور انہوں نے جو چٹھی اسٹیٹسمین میں اشاعت کرائی ہے، اس کی ایسوسی ایشن ذمہ دار نہیں۔ اہل اسلام کو اس سے بالکل ہمدردی نہیں، بلکہ وہ اسے اپنے لیے باعث شرم سمجھتے ہیں ... میں.. فرقۂ اسلام کی طرف سے.. ہر فرقے اور قوم کے ہندوستانی بھائیوں سے معافی مانگتا ہوں کہ وہ اس چٹھی پر کچھ خیال نہ فرمادیں۔

(۴) انڈین نیشنل کانگرس کلکتہ (از نامہ نگار کوہ نور): مندوبین پنجاب کے متعلق لکھا ہے کہ جس دن کلکتہ پہنچے، اسی دن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ گورنمنٹ ہاؤس گئے، اور وہاں وزیٹنگ بک میں اپنا نام اور مفصل پتا لکھا۔ غرض یہ کہ وائسرائے کی گارڈن پارٹی میں "شرکت نصیب ہو سکے"۔ خیر کلکتہ کانگرس میں دو مسلمانوں نے نام بھی دیے ہیں: نواب محمد رضا ۴ خاں اور حامد علی بیرسٹر۔ کوہ نور لاہور کے ایڈیٹر پنڈت دینا یال بھی مندوبین میں تھے۔

۲۲ جنوری: (۱) مسٹر نورالہدیٰ ال ال بی کینٹ بیرسٹر کا اسٹیٹوٹری سول سروس میں بعہدۂ اسسٹنٹ مجسٹریٹ و کلکٹر تقرر ہوا۔ (۲) "مسٹر ہیوم اور آنریبل سید احمد خاں" (یہ ایک طویل خط ہے بنام آنریبل سید احمد خان مخالفت کانگرس سے متعلق، اس کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے): "اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں عداوت اس سے بڑھ کر ہے جو انگلستان میں مختلف مذہبوں میں نظر آتی ہے ہو گی یا ہو سکے گی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دیس میں تو ہندو مسلمانوں میں کوئی عداوت نہیں ہے، گو یہ.. چھوٹا سا فرقہ.. ہر ایک کوشش اس کے پیدا کرنے کی کر رہا ہے.. پھر یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ ایک پارلیمنٹ میں سب ہندو ایک جانب ہوں گے اور مسلمان ایک جانب۔ میں ایڈیٹر علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ لکھ رکھے کہ نہ تو کسی شخص نے اب تک تجویز کی اور نہ خیال کیا اور نہ جہاں تک مجکو واقفیت ہے ہندوستان میں پارلیمنٹری گورنمنٹ کا ذکر کیا ہے۔" (۳) غضب کی دھمکی "(ازدار السلطنت): پایونیر کو لندن سے تار آیا ہے کہ پال مال گزٹ نے مشتہر کیا ہے کہ اگر ترکی روس سے دوستی پیدا کرے گی تو برٹش گورنمنٹ ان کو دھمکی دیتی ہے کہ قسطنطنیہ کو توپوں سے اُڑا دیا جائے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ خبر کہاں تک درست ہے۔ کیونکہ.. ترکی کچھ بے بہا نہیں ہے، اس کا لوہا تو روس مانے ہوئے ہے۔ غالباً یہ خبر بے بنیاد ہو۔"

۱۹ فروری: (مقالۂ افتتاحیہ): "ہمارے ناظرین اخبار کو یاد ہوگا کہ ہم لوگ سنیچر گذشتہ میں یہ تحریک کیا تھا کہ واسطے یادگار جوبلی ہند کے کوئی رعایت

اعلیٰ سکنائے ہند کے حق میں ملکی انتظام میں کیا جائے۔ اس سے مناسب بیش قیمت رعایت دوسری نہیں ہو سکتی کہ جلسہ واضعان قانون میں طریقہ انتخابیہ قائم کیا جائے۔۔ دوسرا کام مناسب۔۔ یہ ہے کہ انگریزی فوج برہما سے اٹھا لیا جائے اور۔۔ برہما شاہ برہما کو واپس دیا جائے؟: (۲) کفایت شعار و عاشق: برسٹل کے ایک عاشق نے اپنی معشوقہ کو لکھا ہے کہ "بہت طولانی خط نہ لکھا کرو۔ اگر شاید کبھی تم نے مجھ پر عہد شکنی کی نالش دائر کی تو وکلا اس خط و کتابت کو نقل کریں گے اور ۲۷ الفاظ کے ہر دو ورقے کی بابت ۴ فلیس (کذا) کے مجرا لیں گے پس جس قدر مختصر خطوط لکھے جائیں گے اسی قدر ہم لوگوں کی کفایت ہو گی" (۳) جوبلی کے موقع پر سید لطف علی خاں سی آئی ای کو نواب، سید فضل الرحمٰن کو خاں بہادر، "مولوی محمد سعید" کو شمس العلما کا خطاب ملا۔

۲۶ فروری: (۱) رسالہ روشنی لاہور کا اشتہار۔ (۲) آغا مرزا بیگ حیدرآباد پر اپنے کوچ مین کو قتل کرانے کا الزام ہے، ان کے مقدمے کی سماعت کے لیے ایک کمیشن مقرر ہو گا

ماہنامہ ادیب پٹنہ

ادیب ایک ماہنامہ تھا جو پٹنہ سے نکلتا تھا۔ اس کے غالباً صرف دو شمارے نکلے، پہلا جولائی ۱۹۱۰ء اور دوسرا اکتوبر ۱۹۱۰ء میں۔ یہ مطبع قیصری پٹنہ میں چھپا کرتا تھا اور اس کے سرورق پہ عبارت ہوا کرتی تھی۔

"حسب الحکم ممبران اردو لٹریچر سوسائٹی و نگرانی جناب نذیر حسین خاں صاحب "خیال" سکریٹری سوسائٹی پٹنہ عظیم آباد سے کی تعلیم و تہذیب کے لئے ۔ اپریل ۔ صفحات کی تعداد کم و بیش ۴۲ ہوا کرتی تھی اور سالانہ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ شمارہ ۱ میں جو مضامین ہیں ان کے لکھنے والے یا لکھنے والوں کا نام درج نہیں پہلے مضمون کا عنوان "ادیب" ہے۔ اس کے کچھ عبارات ملاحظہ ہوں

پیارے ہم وطنو، سارا عالم جانتا ہے کہ ہندوستان کے اور ملکوں نے ترقی۔۔ اردو کے لئے کیا کیا کوششیں کیں، اچھے اچھے اخبار جاری کئے، قابل قدر رسالوں اور بیش بہا تصنیفوں سے بہرہ مالا مال کر دیا۔ جب ہم اور ملکوں میں اردو لٹریچر کی روز افزوں ترقی دیکھتے ہیں تو اپنے قسمت کو کہنے لگتے ہیں:

ناصح بگو مگوئید کہ مردیم ز غیرت
طاقت سرگرمی پروانہ نداریم

جہاں زبان اردو کو محض ایک ماہر کھیل قفس شاعری میں بند کر دیا جاتا ہو وہ پیچ و تاب کر رہا ہو مگر اڑ نہیں سکتا۔۔ ایک انگریزی ناول نویس حسب منزلہ ام یا خیال سے زیادہ ہو لاکھ در ... کی زبان بانی ہے ایک ٹوٹے ہوئے کنارے کو فردوس بریں بنایا۔ ایک کھیل ہی کی عورت کو محبت سے ہی بیسیوں نظم کرتا۔ اس کے لمبے بالوں کی کنگھی پھینک کر فرشتوں کو روح سے زمین پہ پھینکا اور پریوں دیووں کے جھوٹے افسانے اور ... بادشاہی میں نہ بادشاہی ہے۔ اگر اردو لٹریچر کی ترقی میں یہی نہ بیج پھیلائے اور اس کا رخ علمی مضامین کی طرف پھیرا جائے تو ملک کو بے انتہا نفع ہو۔۔ فرانس جرمنی اور انگلینڈ میں جو لوگ اپنی فرصت کے وقتوں میں لٹریچر سے دل بہلایا کرتے ہیں ان کی ایک حیرت انگیز تعداد پڑھ گئی ہو دکھتا ہے۔ اسی وجہ سے تصنیفوں اور تالیفوں میں انتہا سے زیادہ ترقی ہوا اب لٹریچر لیٹنگ کتب خانوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ پرانے کھیل اور تماشے بھی بالکل نظروں سے گر گئے۔ تھیٹروں اور تماشہ دنیا بھی بھی ان لوگوں نے دور سے سلام کیا جو راتوں کو اودھم مچائے رہتے تھے۔ یہ سب باتیں دل مردہ کو زندہ کرنے والی بھی جاتی تھیں مگر اب تمام انگریزوں کا نیم السول لٹریچر کہا جاتا ہے جو اخلاق پاکیزہ منصوبہ کا اثر ڈالتی ہے۔

باقی مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں: "صحرا اور جنگل کی زندگی" "مزار شہدا" "تمنائے حیات" "انقلاب" "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" "حکیم سلطان اور دربار قاسول" "اپ میں خوش نظر خوش گذری" (۲ صفحے) اس عنوان کے تحت اردو لٹریچر سوسائٹی کا تعارف کرایا گیا ہے اور رسالے اور سوسائٹی کے "قواعد و ضوابط" درج کئے گئے ہیں۔

شمارہ دوم میں سید علی سجاد "سجاد" خیال، محمد نور الحسن،

سید محمد الحسن ضیاء اور سید محمد وصال کے مضامین ہیں جن میں
سے کوئی بھی قابل ذکر نہیں۔ آخر کے صفحے تو اردو نظموں
کے لئے وقف ہیں

شمارہ موسم میں خیال بہار اور وصال کی نثر اور سجاد کی
ایک نظم ہے۔ خیال نے ڈیمرناش ڈریم کا جو قصہ چارلس لیمب کے
یہاں ہے اس کا تمام ترجمہ پیش کیا ہے اس کا عنوان موسم بہار کی
اک رات کا خواب ہے۔ ایک گیت کہ جس کے مصرعے انگریزی اصل
انگریزی سے ہی اس طرح اردو میں منتقل کیا ہے۔

او وہ ترانہ والے اس وقت کے گیت
او رنگ برنگی ساریاں لو منہ چھپا کے اپنے
او بوڑھے اندھے کیڑے دریاں نہ بچنے ٹیڑھا
آکاش مرد اصلا سوتی ہے میری ملکہ
پنکھے سروں میں بیل وے اس گھڑی یہ لوگ کورس
لا لا لا لا لا لا لا لا لا
جادو ٹونا کوئی آئے قریب اس کے
نقصان میری پیاری بیگم کو کچھ نہ پہنچے
لو جوتی ہوں میں رخصت اب ہے پہرہ ملک
لا لا لا لا لا لا لا لا لا لا
اے بُننے والے کیڑے رستے بھی اِدھر نہ کرنا
تم لمبے پاؤں والے اس جا قدم نہ دھرنا
او کالا کالا موٹی ہشیار رہنا دیکھو
او کیڑے اور گھونگھے دکھ دیا تم نے اس کو
اس کے بعد کورس پہلے سروں ۔ لو جوتی ہوں۔ لالا"

سیاق کا تمام مضمون کا عنوان زبان اردو ہے۔ اس میں قاضی
محمد صادق خان اختر کی وہ فارسی عبارات بھی ہیں جو میں نے ایک
مقدمہ [illegible] کرنے نقوش [illegible] میں نقل کر چکا ہوں۔ مضمون مذکور
کے اقتباسات دیکھیں۔۔۔

"پھر پنجاب پر موقوف کہیں نہیں ہے۔۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا گلدستہ
نکالا رہتا ہے۔ پولیٹیکل مطالب سے اردو اخباروں کے صفحے کے صفحے
دکھائی دیتے ہیں۔۔ شاعری کا نہ بھی موجودہ زمانے میں وہ ترقی
کی ہے کہ اگلے عہد یہ بات نصیب نہ تھی۔ قریب قریب بیس تیس گلدستے
نکلتے ہیں۔۔ کوئی رسالہ یا گلدستہ اٹھا کر ایسے سخن شناسوں کے سامنے
رکھ دیجیے اور یہ نہ بتائیے کہ مضمون نگار یا شاعر کس شہر یا قریہ کا
ساکن ہے تو وہ باوصف اوصاف کے یا ان میں کسی شہر کی تخصیص نہ
کر سکیں گے اور ان کو یہی کہتے بنے گی کہ اس کی زبان نہایت شستہ
و فصیح ہے کیا عجب کہ اس کا مصنف اہل دہلی یا لکھنؤ سے ہو حالانکہ
اس کے مصنف نے کبھی دہلی کی صورت دیکھی ہوگی نہ لکھنؤ کی۔
دہلی و لکھنؤ کے علاوہ بھی ہندوستان میں بعض ایسے شہر ہیں جہاں
کے قدیم شرفا اور خاندانی امرا اگرچہ بہت کم ہوں اوسط کو ہر طبقے
نے تیزی سے کام لیا ہو لکھنؤ اگر ان کے لب و لہجے (لکھا) اور
فصاحت میں اہل دہلی و لکھنؤ سے زیادہ فرق نہیں تو کم بھی نہیں
اگرچہ الفاظ میں کسی طرح کا فرق دکھائی دے تو یہ کچھ محل اعتراض نہیں
ہے کہ اکثر اس قسم کا اختلاف اہل دہلی و لکھنؤ کے فصحا میں بھی
ہے۔ فصاحت و سلاست۔۔ کسی شہر کی تنگ خشت سے وابستہ
نہیں بلکہ سوسائٹی کی خوبی اور امتیاز کی کشش پر منحصر ہے۔ اگلے
دنوں کے بیان اور پرانے وقت کے تذکروں کے دیکھنے سے صاف
روشن ہے کہ اس زمانے میں مضافات دہلی و لکھنؤ کے کسی دوسرے شہر
کے اردو گو شاعر کو جیسے پاتے تو اس کی زبان کو کم [illegible] لیتے تھے اور
قابل استناد سمجھتے تھے۔۔ اہل زبان خصوص زبان کے بارے میں
نہایت متعصب ہوتے ہیں مگر جس طرح وہ دوسرے کا غیر از کہ بلکہ
کسی اسناد نہیں [illegible] اسی طرح [illegible] خود کو
تسلیم کرتے ہیں [illegible] جاتے ہیں!

وغیرہ وغیرہ تو ممالک ایران ہی میں داخل ہیں انھوں نے بخارا
و ترکستان کے باکمالوں کی بھی سند لینے . میں انشاءؔ کو باقی سے
شعیاء ان کی وسعت انشاءات سے ہندوستان بھی خالی نہ سا۔ امیر خسرو
میر حسن دہلوی ، واقف بٹالوی ۔۔ راسخ لاہوری ۔ نظیر شاہ جہاں آبادی
جمیل عظیم آبادی و ملا طغرائی تحقیق عظیم آبادی یہاں تک کہ ٹیک چند
بہار اور راجہ رام نرائن موزوں تخلص عظیم آبادی کے کلاموں کو
بھی سراہا اور ان کی زبانوں کو صحیح مان لیا ہے۔ اختر بنگال کی خاک
سے اٹھے اور وہیں شہرت حاصل کی ، کچھ عمر میں لکھنؤ گئے تو وہاں
کے سنسو طبع فصحائے ۔۔ ان کو اردو کی شاعری میں مسلم الثبوت
مانا اور بہتیروں نے زبان اردو پر ان کے دخل و تصرف کو جا کر
انھیں استاد رکھا ۔۔ انشا کی ابتدائی عمر کا بڑا حصہ . پورب اور
مرشد آباد کے امرا و شرفا میں بسر ہوا۔ عالمگیر ثانی کے آخر عہد میں
جب وہ پورے جوان ہو کر دلی پہنچے اور وہاں کے مشاعروں میں شریک
ہو کر علم استادی بلند کیا . تو ۔۔ رفتہ رفتہ مسلم الثبوت اساتذہ
میں اس کا شمار ہو گیا۔

ذیل کی نظم سجاد کی ہے اور اس کا عنوان "آسمانی سقا" ہے

لاتا دریا سے ہوں میں پانی
کرتا ہوں چمن پہ دُر فشانی

گل سوتے ہیں جب کہ دوپہر کو
منہ پر لئے سایہ سنبر کو

رن چلتی ہے جس گھڑی ستم کی
تڑپاتی ہے پیاس دم بدم کی

سایہ کرتا ہوں تب چمن پر
مخمل نسریں و نسترن پر

منہ دھوتا ہوں میں گلوں کو پیہم
ہو جاتی ہے تازہ روح عالم

مشہور ہے میری آبیاری
دیکھے کوئی رنگ سحر کاری

جان دیتا ہوں آ کے میں چمن میں
خوشبو گل ہائے یاسمن میں

ہے مجھ سے یہ پیچ و تاب سنبل
ہے مجھ سے بہار لالہ و گل

وہ شوخ نسیم عنبریں دم
دیتی ہے مجھے دعائیں پیہم

دہقان مجھ کو پکارتے ہیں
دریا مجھ کو ابھارتے ہیں

ہیں میرے امیدوار میکش
وارفتہ و بے قرار میکش

کعبے سے کبھی اُمنڈ کے آیا
آ کر کبھی میکدے پہ چھایا

میکش گرتے ہیں پھر سبو پر
مینائے شراب مشکبو پر

میخانے میں غل ہے چھیچھے ہیں
شورش ہے جیوں ہے ولولے ہیں

طوفاں سے جلال ہوں دکھاتا
موتی اولوں سے ہوں لٹاتا

قطروں سے ہمارے دشت و صحرا
بن جاتے ہیں اختروں کے دریا

کرتی ہے ہوا جو اس کو پانی
یہ بھی میری ہے حکمرانی

جاتا ہوں کبھی رود گر دکھانا
پانی پانی ہو اک زمانہ

جو کوہ سفید بہت سی ہیں — مدن میرے وہ فیل کے ہیں
ہنستے ہیں بلند پست مجھ سے — ڈرتے ہیں فیل مست مجھ سے
گو سیر میں خروش نہ آئے سونا — ہو نرم ہوا مرا بچھونا
ہو رعد جو ہمسر ہم یکتا نہ — ہو برق سواراں ہو تازیانہ
پیچ پھول گرج کی وہ صدائیں — جو کوہ کے قلب میں در آئیں
لرزہ اندام میں جو ڈالیں — سر پر ابھی آسماں اٹھالیں
ڈرجائیں دلیر ایسی آواز — طوفان کن خیز ایسی آواز
سوکھے پودے ہرے کئے ہیں — مُرجھے ہیں نے جلا دئے ہیں
صحرا پہ کبھی تو باغ پر ہوں — جھیلوں پہ کبھی تو راغ پر ہوں
گہ سیر کناں جبال پر ہوں — گہ سایہ فگن نہال پر ہوں
ملتا ہے راستہ جدھر کو — جاتا ہوں میں شوق سے ادھر کو
ہو اہل جہاں کو مجھ سے الفت — کہتے ہیں مجھے خدا کی رحمت
رہتا ہوں سروں پہ سایہ گستر — پہچانے مجھے بشر نہ کیونکر
جب ڈوبتا ہے سحر کا تارا — ہوتا دنیا میں ہے اجالا
وہ پردہ کشائے عارض صبح — آئینہ نمائے عارض صبح
پھیلاتا ہے نور کا جو دامن — دکھلاتا ہے سیر دشت ایمن
یعنی خورشید عالم افروز — جس سے دنیا ہو بہرہ اندوز
زینت وہ روش ہے وہ میرا — آویزۂ گوش ہے وہ میرا
جب ڈھلتا ہے روشنی دکھا کر — ڈھیلے ہوتے ہیں اس کے تیور
اور آتی ہے شام اس ادا سے — سر پہ چادر سیاہ ڈالے
وہ جانِ جہاں دلوں کا پیارا — آنکھوں کا نمک کی ہے جو تارا
پھرتا ہے جو اپنی روشنی میں — جو شمع ہے محفل خوشی میں
سب کہتے ہیں ماہتاب جس کو — ہوتا ہے نصیب ساں خواب جس کو
ٹھنڈک دیتا ہے جو دلوں کو — روشن کرتا ہے ساحلوں کو
بیٹھے ہے مجھ سے وہ لوٹتا ہے — جو اس کی ادا ہے خوشنما ہے
جب بات نہ اب وہ بھیگتی ہے — پھیلی ہر سمت چاندنی ہے

ہوتا ہوں ہوا سے جب کہ شیان — چھپتا ہے شال ماہ تاباں
ویراں پھر جھلکتے ہیں تارے — گویے کہنے وہ چھپے چھپے
جیسے گل راز تی چمن میں — یا جیسے چھپے گوش سیمتن میں
کھڑے ہوئے اٹھ جاگتے ہیں — میں دوڑتا ہوں چھپائے ہیں
دیکھیے تصویر کوئی میری — ہے شکل حبیب میری کیسی
جیسے گرد ول پہ دیو کالا — جس کا خورشید ایک نوالا
ظاہر میں سیاہ ہوں میں ایسا — لیکن باطن ہے صاف میرا
دُرریز و درفشاں دہن ہے — مجھ سے آبادی کا مدن ہے
چاہوں تو بجھادوں شمع خاور — گل کردوں چراغ ماہ انور
لاتا ہوں میں جوش میں سمندر — موجیں جاتی ہیں آسماں پر
پڑتے ہیں وہ دمبدم تھپیڑے — کشتی نہیں ناؤ کا خدا ہے
دکھلاتا ہوں سیکڑوں تماشے — اک گردش چشم سر بسر سے
جس وقت کہ برق کوندتی ہے — دہشت سے دلوں کو روندتی ہے
ڈرجاتے ہیں سب گرج چمک سے — اس شعلہ فشاں کی کڑک سے
کوئی گھر میں چھپا ہے — سجدے میں کوئی جھکا ہوا ہے
کانوں میں کسی کے انگلیاں ہیں — ہونٹوں پہ کسی کی نالہ خیز
آنکھوں پہ دھرے ہے ہاتھ کوئی — ہنستا ہے کسی کے ساتھ کوئی
ڈرپوک پڑے ہیں زلزلے ہیں — دیکھو کس طرح سے ڈرے ہیں
کس ہوں بساط امن برہم — دیتے مجھ سے ہیں اہل عالم
چاہوں تو کروں ہلاک کردوں — چاہوں دنیا کو خاک کردوں
لیکن ہے کرم کی مجھ کو عادت — ہے سایۂ دامن سعادت

یہ چوتھے شمارے میں "وصال" سید فدا حسین "سجاد" شاہ سر/ حسین کے مضامین "وصال" کی ایک نظم، اور سجاد کے ناول کے صفحات ہیں۔

- بگڑا اگر یا مرثیہ خواں سید گیا اشاعر مرثیہ گو ۔ [illegible]
اقتباسات: ۹ اس ترقی یافتہ زمانے کے مرثیوں سے نجات کرید [illegible]

یہ شاعری کسی قدر فطلاہ مبتذل ہو۔ میر اور ... سودا نے بھی مرثیے
کہے۔ یہ حضرات صرف شاعر کامل ہی نہیں بلکہ مرثیہ گو بھی تھے۔
ان بزرگوں نے مرثیہ گوئی بطور ثواب ذکر ابکا کی تھی نہ بخیال فن،
کیونکہ اگلے شعرا نے اس کو اپنا شعار کر لیا تھا جیسی کی تصدیق ...
مشفرہ اور ... احسان وغیرہ کے مرثیے اور کلام سے ہو سکتی ہے۔
اگلے زمانے میں مرثیے جو ہوتے یا مخمس بطور ترجیع بند مثلث یا قطعہ
میں کہے جاتے تھے مسدس شاذ و نادر ہی کسی نے کہا ہے وہ بھی
بہ تقاضائے ... ت الناقوس یا شہرہ میں۔ ہاں جب سے دلگیر، ضمیر،
خلیق اور ضمیر مرحوم نے اس فن کو جلا دی تو ہوئے ترجیع بند،
مثلث اور قطعہ موقوف ہو گئے اور سلام بطرز غزل مختصر بحروں
میں کہے جانے لگے۔ نوحوں کا بھی انداز بدل گیا اور قطعے اچھے
صورت واقعہ خوانی کے لئے تصنیف ہونے لگے۔ سلاموں کے مخمس
بھی ہونے لگے اور بعض استادوں نے بطور مثنوی طولانی مرثیے بھی
لکھے۔ اپنی جگہ پر تمام اقسام مذکورہ پسندیدہ ہیں لیکن مسدس
خیالات و مضامین میں جان تازہ ڈال دی اور اس کے مرثیے
میں زیادہ تر معرکہ آرا چیز یہی مسدس ٹھہرایا گیا جو آج تک
اگلے ہے اور شعر بزم عشق اخوب کیفیت یار مل عشق مضمون
زور یا مضامین میں اکثر کہا گیا ہے۔ دلگیر نے مسدس آ ایسے
اور اور فصیح نے سلام سے اچھے مسدس کہے۔ میر خلیق ... کے
ابیات ہیں۔ رخصت مسدس میں ایسے لکھے کہ ان کے زمانے
... ان کی زبان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ... فصیح و خلیق ... کے
سب خاص سے سخن گستری ... ایک آدھ بند رزمیہ بھی نکل گئے
۔ البتہ ضمیر ... نے جنگ کی صف آرائی، طلوع صبح، ماحول کی
ان گھوڑے، تلوار اور لڑائی کے بند دلسب زیادہ اور اچھے
لکھے۔ اس خیال سے میں بھی ان کے قول کی تصدیق کرتا ہوں۔
میں کہوں کہیں کوئی ... دریں مرا ... اس طرز میں جو جو کہ شاگرد ہو میرا

... دبیر۔ ضمیر کے ... تمام عمر ... شاگرد رہے ... خلیق
کے بڑے صاحبزادے تھے زبان تو ان کے گھر کی تھی اور ترکے میں ملی
تھی مگر اس کو انہوں نے اور بھی جلوہ دیا۔ صبح کا عالم، رات کی رخصت
جنگل اور بستی کی حالت، مرغزار کی بہار، گھوڑے کی جست
وغیرہ، تلوار کی برش، جنگ کا عالم، فوج کی سپہ اندازیاں،
زہد و عبادت کی حقیقت، صبر و شکر کے مراحل، ان مضامین کو
طولانی مسدسوں میں نہایت بیتات کے ساتھ نظم فرمایا ہے اور
ان کی ایسی ہی تصویر کھینچ دی کہ ... مانی و بہزاد تو کیا حال کے
تعلیم یافتہ مصوران مشہور سے بھی ناممکن ہو۔ وسعت خیال
طرز بیان اور فرقہ کے دلپسند محاوروں کے اعتبار سے ہندوستان
میں تو کیا دور دور تک ایسا باکمال شاعر نہیں ہوا ... انیس
مونس اور ... وحید ... بھی تھوڑے اختلاف کے ساتھ وہی زبان
اور وہی طرز رکھتے تھے خصوصاً ... مونس ... تو اپنے باکمال بھائی
کے پورے مقلد تھے ... اس زمانے میں بھی اگر کسی کو ... انیس کی کھینچی
جاگتی تصویر دیکھنا ہو تو ... نفیس کو لکھنؤ جا کر دیکھے یا کسی مجلس
میں ان کی زمزمہ خوانیاں سنے۔ یوں تو غزل سرا اور حسن و عشق
کے کوچہ گرد بہت ہیں پچھلے ہندوستان ... میں بہت سے آئے، بہت
سے آئیں گے اور ... بہت سے موجود ہیں مگر رونا تو اس کا ہے کہ
یہ نعمت ہندوستان کو شاید ہی پھر نصیب ہو ... گو فن مرثیہ گوئی
اور اس ترکیب خاص میں میر انیس خود ہی موجد اور خود ہی خاتم
سمجھے جاتے تھے۔ پھر بھی بعض محققین نہ ان کو نفس شاعری پر
بلکہ بعض خیالات شاعرانہ پر معترض ہیں۔ مگر زمانے کے اعتبار سے
اعتراض وزنی نہیں کہا جا سکتا ... انیس ... نے فصیح روایات
میں بہت کاوشیں کی ہیں کیونکہ قبل و بعد کے مرثیہ گویوں نے تو
نفس الامر ... کو ایسا لیپ پوت کر برابر کر دیا ہے کہ نہ اہلبیت
اہل بیت معلوم ہوتے ہیں اور نہ امام حسینؑ امام حسینؑ۔ رخصت میں

جلسے کا مقصد شاعری کو فروغ دینا تھا مگر قافیہ۔ ایک شعری مہمت
خاطر و... مطلوب... ہے اس امر کو بصراحت واضح کرتے کہ استعمال کی
گرامی اگر شعروں میں صرف کا خیال رکھا جائے تو ذہن میں زور پیدا کر
یہ ضرور پیش کیا گیا کہ سامعین وسعت بیان کا جاتا ہے اور خیالات
کے عادی ہیں ان میں دکھ کے ساتھ وسعت خیال اور ربط
یہ دونوں باتیں ہاتھ سے جاتی رہیں گی۔ یہ مضمون بھی نامکمل (۱)
وصال کی نظم ذیل کا عنوان "ہوا اور آفتاب میں
جھگڑا" ہے۔

کہتی ہے فلک کہ شب ہو آخر — آثار سحر ہوئے ہیں ظاہر
آتے ہیں ہوا کے سرد جھونکے — نس نس میں کے من سے ہوش کے
کس شان سے یہ ہوا ہو دیکھو — پیاری اس کی ادا ہو دیکھو
کلی اک کو جگا رہی ہے جا کر — شوخی سے الٹ رہی ہو چادر
بکھرے ہیں رخوں پہ تار گیسو — دیکھے کوئی اب بہار گیسو
لیتا ہو یہ کون منہ پہ دامن — اوستوں وصال ہوئے ہیں تن
پھرتی ہو چمن میں کس خوشی سے — جیسیں کرتی ہو ہر کسی سے
پتوں کو ہلا دیا ہو اس نے — غنچوں کو کھلا دیا ہو اس نے
پھر آتی کبھی گلوں کو جا کر — دوڑی کبھی فرش مخملی پر
اٹھلاتی ہو پھرتی ہو روش پر — اترا گئی کن گلوں سے مل کر
جو سب کی زباں پہ نام اس کا — جو فیض جہاں میں عام اس کا
محروم کوئی نہیں کرم سے — جیتے سب ہیں اسی کے دم سے
رک جائے اگر یہ ایک دم کو — راہی ہو جہاں پھر عدم کو
قینچی سی زبان چل رہی ہے — ہوتی کیسے اگل رہی ہو
کہتی ہو کہ مجھ سے ہو زمانہ — چلتا ہو مجھی سے کارخانہ
میرا ہی ہو تمام حکمرانی — جا ہوں جسے کر دوں میں پانی
پھل پھول لگے ہیں کیسے دیکھے — شاداب چمن مرے کرم سے
پائے پرسہولت ہو پڑ ہو سب کے — چلتا ہو ہمیشہ مجھ سے دب کے

کرتا ہوں جو ابر دوں کو پانی — ہوتا ہو زمیں پہ دور فشانی
جھولے ہیں یہ میری بیکڑوں کا — در دست تصرف ہستی تمام
پہنچاتا ہوں میں لونگ راحت — اک لو مجھے نہیں ہو فرصت
ہو کون سی جا جہاں نہیں ہوں — ہوں تیز کہیں تو کم کہیں ہوں
رہتا ہو فلک جو آب چشمہ — اڑتی تھا ہوا ہو یہ کرشمہ
اعلیٰ میں رہوں لطیف ہو جاؤں — ادنیٰ سے ملوں کثیف ہو جاؤں
ہیں خاص نئے میرے ناز و انداز — پہنچاتی ہوں تا بگوش آواز
ہو جاتی ہوں جب میں کہیں در — ہوتی ہو فلک کی سیر منظور
کرتی ہو تلاش مجھ کو خلقت — گھٹتی ہوتی ہو اور اذیت
ہیں ہوش کہیں تو خود کہیں ہو — بے میرے کسی کو کل نہیں ہو
ہو سارے جہاں کو مجھ پر دشوار — فرقت میں مری ہر ایک بیمار
آتا ہو کبھی جو مجھ کو غصہ — بگڑا ہوتا ہو سب کا نقشہ
سب کھوتے ہیں یہ حواس ان کا تمام — ہوتی نہیں عقل پاس ہر گام
پھرتا ہو تلاش میں کھلے سر — سب کہتے ہیں جس کو شاہ خاور
کرتا ہو جفائیں مجھ پہ جیسی — ہوتی نہ کسی پہ ہوں گی ایسی
کیوں کہنے میں آئے شرم مجھ کو — کر دیتا ہو آ کے گرم مجھ کو
جھنکا اتنے میں شاہ خاور — بولا اس سے بدل کے تیور
سنتا تھا تمام تیری باتیں — کرتی تھی ابھی تو میری ہجو بے
تو نے مرے رعب کو نہ مانا — تھراتا ہو مجھ سے اک زمانہ
ہو تیرا غرور طینت بد — احساں کرتا ہوں تجھ پہ بے حد
بولی یہ ہوا کہ تو طبیعی — کرتا نہیں کوئی مدح اپنی
مانا دنیا میں فرد ہو تو — پھر رعب سے کس کو زرد ہو تو
دن بھر کی فقط ہو سلطنت ہے — اس پر یہ غرور و تمکنت ہے
خاور نے کہا کہ کیجئے دھمل — ہر بات میں ہو رہی ہے تجھ سے فصل
ہو جائے بغیر میرے برہم — ہر مجھ سے ہے سب نظام عالم
یوں منہ میں جو تیرے آئے کہہ لے — آیا ہوں جہاں میں تجھ سے پہلے

شہ ہے اب دماغ تیرے | جوانی کے پھولوں کو کیا ہو گئی ہے
کیا ہوتی ری بساط کیا ہو | مجھ کو کچھ خبط ہو گیا ہو
مجھ پہ پڑے کرن کی پھوٹ | الٹی یہ مجھ ابھی ہو سیدھی
باد سحر ہو یا صبا ہو | چل دور ہو یہاں سے اب ہوا ہو
لی جوں میں اور تو ہوا دی | ایسوں کو برا بھلا کہا
غنچے میں سیاہ ابر آیا | حائل ہوا بیچ میں یہ پردہ
ٹوں میں اسی غنچے کی مٹھا | بڑھتے ہی جا نہ پائی تیرے رفاقت

سجاد کے ناول کا نام "پھولوں کی ڈالی" ہے اور اس
دیباچے کا آغاز شاد کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

چمن میں جا کے میں نے غور سے اوراق گل دیکھے
تمہارے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

ناول کے صرف ۲ صفحے دے ہیں۔ باب اول کا عنوان
ب بیٹی کا حال" ہے۔

سجاد اردو لٹریچر سوسائٹی کے صدر رہے اور جب شمارہ
اردو فن سخن میں شاد کے شاگرد ... ن کا مفصل حال قیال
سد کلکتہ کے ایک شمارے میں لکھا تھا جو اس وقت پیش نظر
ے رسالہ "چراغ حسن" حسرت مرحوم کی ادارت میں شائع
اتا تھا۔ فکر ذ 'جاوید' جلد ۴ میں سرکار نے تحریر کیا ہے۔
جاد عظیم آبادی ... اردو کے مشہور رسالے مخزن میں
یلدرم کے نام سے جو مضامین لکھ چکے ہیں' وہ ترکی کے قدیم قصص
کا ترجمہ ہیں۔ اب ان مضامین کا مجموعہ خیالستان کے نام سے شائع
ہو چکا ہے۔ یہ خاص شے قابل ہے۔ ان کا ایک ناول نئی نویلی بھی
سے زیادہ چھپ چکا ہے' دوسرا مکمل ناول بھی طبع ہو چکا ہے' لیکن
یہ مکمل شائع نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ اس کا دوسرا حصہ قلمی
مصنف کی اہلیہ کے پاس تھا۔ سجاد کے، شعر خمخانۂ جاوید میں ہیں۔
خیال خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنا
ضروری نہیں۔ وصال جو اسسٹنٹ سکریٹری تھے' ادیبا
سے شاد کے حقیقی بھتیجے تھے۔ شاد کے سیرت نگار تمیز نے
وصال کا ذکر نہیں دیا' لیکن ان کے والد ایجاد کے ترجمے میں
انہیں ایجاد کا بیٹا لکھا ہے۔ ایجاد شاد کے حقیقی بھائی تھے۔
۱۹۰۵ء سے قبل صوبۂ بہار میں گنے چنے بہت تھے۔ اور ان میں
تھوڑی بہت شرح بھی ہوا کرتی ہو گی۔ لیکن' جہاں تک میرا علم ہے یہ
پہلا اخبار ہے جس میں نثر کے مقابلے میں نظم بہت کم تھی۔ خیال
کی ایک تحریر میں میں نے دیکھا تھا کہ شرر نے دلگداز میں اس کی
بڑی تعریف کی تھی۔ مضامین میں شرر کا اثر نمایاں ہے۔ یہ
سبب ستائش کا ہو سکتا ہے۔

البنچ ۱۹۰۲ء

البنچ ۱۹۰۲ء کے کل شمارے میری نظر سے نہیں گذرے، مگر بیشتر جو یکجا مجلد میں کتب خانۂ الاصلا دسنہ سے ادارۂ تحقیقات اردو کی نمائش کے لیے آئے تھے۔ موجودہ شماروں میں پہلا ۱۴ فروری اور آخری ۷ کا ہے، ان میں سے بعض ناقص بھی ہیں۔

(۱)

۱۴ فروری (۱) "اب بانکی پور کے عوض خاص شہر پٹنہ سے اخبار کی اشاعت ہوگی.. آیندہ سے اخبار کا گویا ہوگا، پہلا متن، دوسرا مذاقیہ" (۲) "اسٹیٹسمین سے معلوم ہوا کہ شاہ ایران نے.. حبل المتین کی اشاعت میں روک دی.. وجہ یہ کہ وہ ممالک غیر کے اخباروں سے ایران کے خلاف مضامین نقل کیا کرتا تھا۔ لیکن، کل ہے کہ پچھلے ہفتے کے حبل المتین میں.. گورنمنٹ ایران کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور شہنشاہ.. کا وہ فرمان جس میں ا عصائے مرصع کے عطا کیے جانے کا ذکر تھا، شائع ہوا تھا" (۳) ظاہر ہوا ہے کہ پیکن الیزبتھ کا بیٹا تھا (۴) "سفر از سید نظیر حسین (۵) حیدر آباد میں رتن ناتھ سرشار کی موت۔

۲۱ فروری (۱) "سفر کربلائے معلیٰ و سیر فارس" از نظیر حسین (۲) وفات سر وقار الامرا وزیر حید
۱۸ فروری (۳) وفات نظام الدین طیب جی، تاجر نامی و برادر بزرگ بدرالدین طیب جی بعمر ۱۲ سال بمقام بمبر

۲۸ فروری (۱) "سفر کربلائے معلیٰ و سیر فارس" از نظیر حسین (۲) پٹنہ کی اردو لٹریری سوسائٹی کے ابھی سال بھر بھی نہیں گزرا، لیکن اس نے اپنا کتب خانہ قائم کر لیا ہے (۳) گیا کے نامی زمیندار ارشاد علی خاں میں مدرسہ قائم کرنے والے ہیں (۴) انجمن حمایت اسلام مونگیر کے تیرہویں سالانہ جلسے کی روداد۔

۱۴ مارچ (۱) "دارالترجمہ۔ کھلا خط بخدمت ندوۃ العلما لکھنو وایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔ ا حافظ" (۲) "زبان و تلفظ" از سرفراز حسین (خاں) (۳) اوبزرور لاہور اور بہار نیوز بھاگل پور نے البنچ اپنی رائیں ظاہر کیں (۴) منصور حنا نے نیویارک سے ایک عربی اخبار "المحیط" جاری کیا ہے۔

... ... سالم ماتر (۱) تعلیم اور ہندی اردو کا جھگڑا؟ بہار ٹائمس ...

ے ہندوؤں کا آرگن"، میں ہندی بھاشا پرچارنی سبھا مظفر پور کا میموریل بنام لفٹننٹ گورنر بنگال شایع ہوا تھا۔
اینج نے سبھا کے مطالبات کی مخالفت کی تھی (۲) اردو ہندی کا جھگڑا" از سرفراز حسین (خاں) (۳) اردو لٹریچر کمائی

۲۹ مارچ "والیان ریاستہائے ہند" از سرفراز حسین (خاں)

۵ اپریل (۱) "ہندی والی سے اردو خانم کی دو دو باتیں" ۲ "ہندو کے مذہبی اور اخلاقی پرچے، ادھم ریویو، آریہ بندھو، آریہ سماچار، دیش ہتکاری وغیرہ.. سب اردو میں نکلتے ہیں.. والمیکی کی رامائن، تلسی داس کی رامائن، بھاگوت گیتا، گیان پرکاش، پریم ساگر وغیرہ.. اردو ہی میں چھپ رہی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ.. بک رہی ہیں۔"

۱۰ مئی (۱) "اخبار دارالسلام دہلی میر ناصرت.. کو ڈنکے کی چوٹ للکارتا ہے کہ اگر مرد میدان ہو تو ایک ہفتے کے اندر ایک جلسہ منعقد کر کے علما اور عمائدین کے سامنے کسی مقام سے معرا قرآن کی (کذا) ایک رکوع پڑھ کر ترکیب نحوی بعض صیغے جو پوچھے جائیں اور ترجمہ بیان کر دو۔ اگر تم جلسہ نہ کر سکے تو ہم خود جلسہ کر کے آپ کو بلائیں گے" (۲) "حضرت بسر بھاگلپوری و حضرت مائل دھرم پوری.. کے نام کا یہ آخری پرچہ بھیجا جاتا ہے۔ اگر پرچہ پہنچتے ہی مضمون نہ پہنچا تو نام بٹرے سے خارج کر دیا جائے گا" (۳) مولانا ابو محمد ابراہیم.. نے متعدد رسالے عربی اور اردو کے تصنیف فرمائے اور تفسیر خلیلی لکھی.. آپ نے.. مدرسہ احمدیہ آرہ جاری فرمایا" (۴) وفات سر جنگ بہادر خاں "ناپارہ" بمقام بہرائچ

۲۴ مئی (۱) "مرزا قادیانی.. بڑے دعوے سے فرمایا کرتے.. تھے کہ "ہمارا قادیان دارالامان ہے۔ میرے قدم کی برکت سے مرزا طاعون خاں کا قدم یہاں نہیں آنے کا۔" ابھی ابھی ایک نامہ نگار کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس کی خاں قادیان میں ۷ آدمیوں کو مرزا طاعون بیگ چٹ کر چکے" (۲) "شحنۂ ہند میرٹھ سے دو دو باتیں" از مولانا [illegible] کا شحنۂ ہند کے مدیر شوکت میرٹھی کے بیجا دعاوی سے بحث۔

۷ جون "مولوی عبدالمنان، انگریزی کا ایک اخبار "مسلمان" بھاگلپور سے نکالنے والے ہیں۔

۲۱ جون "خاتونوں کی تعلیم" از س س س دسنوی البہاری دارالعلوم لکھنو (اس کی ایک قسط شمارہ ۵، میں چھپی ہے از "س س س دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو" میرا خیال ہے کہ یہ مضمون سید سلیمان ندوی کا ہے)

۲۸ جون (۱) "سعدی کی سیر" از حضرت بہاری علیہ الرحمۃ (۲) "جشن تاج پوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی (یہ مضمون اردو والے کے آزاد نمبر میں شائع ہوا ہے۔)

۵ جولائی (۱) حافظ شوکت علی رئیس سندیلہ کی وفات بعمر ۸۶۔ بہت بڑا کتب خانہ یادگار چھوڑ گئے۔
ن تاج پوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" از ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی (یہ مضمون ابھی حال میں اردو ڈا

کے آزاد نمبر میں شائع ہوا ہے۔)

۱۹ جولائی (۱) "مسوری ہل" از حافظ نماری علیہ الرحمۃ۔ (۲) سید رحیم الدین مالک و منیجر و ایڈیٹر جو دس بارہ برس سے عارضہ ضیق النفس میں مبتلا تھے اور خیر اسسٹنٹ ایڈیٹر آٹھ برس سے اخبار چلا رہے تھے۔ یہ سبب ابو الظرفا اور قہر نگار ہنٹر سپکار کے نام سے نامہ نگاری کرتے تھے۔ سید رحیم الدین (ان کا تخلص مجبور بتایا گیا ہے) وفات کے وقت ۵۴ برس سے زیادہ کے نہ تھے، وفات ۱۲ جولائی ۔ ۲۴ ربیع الثانی۔ ان کے حالات زندگی۔

۴ اگست "بقیہ سیر مسوری ہل" از حافظ نماری علیہ الرحمۃ۔

۱۶ اگست ہم ایک علمی ماہانہ میگزین (رسالہ) نکالنا چاہتے ہیں۔

۲۳ اگست "حضرت آزاد دہلوی آپ کا مضمون حجاز ریلوے سفر دو کر اخباروں میں شائع ہو۔ ہے اس لیے اب الپنچ میں شائع نہیں ہو سکتا۔"

۲۴ اگست نیاز احمد رئیس خیرآباد نے مدرسہ خیرآباد کے لیے ایک لاکھ روپے کی جائداد وقف کر دی ہے۔

۲۸ اگست "من از وضع زمانہ می ترسم کہ مبادا ازیں بتر گردد" از مجدد مأۃ حاضرہ۔ (بریلی کے عالم احمد رضا خاں کے مدّاح انھیں "مجدد مأۃ حاضرہ" کہا کرتے تھے، اس مضمون میں ان پر چوٹ ہے اور راقم کے بھی اگرچہ ان دونوں میں سے کسی کا نام نہیں آیا۔ والد مرحوم نے ندوۃ العلما کی مخالفت کی تھی اور انھیں احمد رضا سے بڑی عقیدت تھی۔) اس مضمون میں نثر کے ساتھ نظم بھی ہے اور آیندہ شماروں میں بھی اس طور کے مضامین

۶ ستمبر (۱) الپنچ بانکی پور واپس آگیا (۲) "ملک الشعرا تسلیم لکھنوی" — اودھ پنچ کے گذشتہ اپنی تحریر کے ساتھ جدید سرفراز نامہ بھی استاد تسلیم کا میں نے چھپوا دیا ہے۔ پہلے سرفراز نامے میں تو آپ نے یہ لکھا:

بجا ہے میں ابھی کہاں مرا ہوں، زمانے کی مصیبتیں ابھی کہاں تمام ہوئیں جو مجھے موت آتی۔

گردشیں افلاک کو ہیں دل دکھانے کے لیے
جلتی ہیں تو چکّیاں اس ایک دانے کے لیے

اب ... حسرت موہانی ... نے ایک عنایت نامے میں ... استاد کا سرفراز نامہ بھیجا ہے جس کا ایک مطلع "غلط خبر موت" یا "انتظار حرم بعد تمام" کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ :

مار ڈالا مجھے بے موت مرے یاروں نے
فلک اڑائی سر فسوس پہ اخباروں نے

۱۳ ستمبر (۱) ایک شخص نے سید بادشاہ نواب عشرتی کو ایک خط بھیجا جسے دیکھ کر انھوں نے

کرنے کی ٹھانی۔ خط یہ ہے :

"جناب سید بادشاہ نواب صاحب تسلیم۔ سنتا ہوں کہ آپ مشاعرہ کرنے کو ہیں، آپ لوگ پوربی ہو کر شعر کہنا کیا جانیں۔ استادوں کی غزل دیکھ کر تک سے تک ملا دیجیے گا۔ یہ اللہ نے لکھنو و دہلی پر ختم کیا ہے، بھلا آپ اور یہاں کے جو شاعر اچھے ہیں یطرح (کذا) میں بھیجتا ہوں اس میں اگر کچھ بھی موزوں کر دیں تو میں اپنی ناک بدتا ہوں اور یوں تو کہنا بکنے کو سب موجود ہیں۔ کندر کی گنتی نہیں ہے۔ میں یہاں کے اچھوں کو کہتا ہوں۔ میں غریب الوطن ہوں۔ مشاعرے میں میرا جو ہنر دیکھیے گا، مگر ان طرح (کذا) میں اگر آپ لوگ کہیں تو حال معلوم ہو۔ فقط ۲۵ر اگست ۱۹۰۲ء، مصرع طرح :

ہمراہ شب تار سر دوش ہوئی دھوپ — قافیہ آغوش، مینوش ردیف دھوپ

قد ناپتی ہے زلف رسا سر سے پاؤں تک — قافیہ ادا، خدا، روا

موت کا پیغام ہے تاخیر صبح — قافیہ تسخیر، تدبیر، تحریر

پر نور صورت رخ روشن ہے آفتاب — قافیہ گلشن، مدفن

تمہارے کوچے میں میری تربت برائے نام و نشاں رہے گی — قافیہ آسماں، کہاں

پر جھاڑتے ہیں مرغ سحر بولتے نہیں — قافیہ نظر، قمر، اثر، گہر

(۲) پروفیسر آزاد کے خیالات" "زمانہ" راقم نمک

۱۴ر اکتوبر (۱) "انجمن اسلامیہ بانکی پور" (۲) "اک بت سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد" از ابو الکلام آزاد (۳) مشاعرے کی اطلاع ز سید بادشاہ نواب عشرتی، وہی ۶ طرحیں جن کا ذکر آچکا ہے۔ مشاعرہ ۸ر اکتوبر کو شروع ہونے والا تھا اور خیال تھا کہ "پانچ سات روز سے کم میں ختم نہیں ہوگا" یہ بتایا گیا ہے کہ "سید بادشاہ نواب رباعی خواہ غیر طرح اشعار۔۔ سے ابتدا کریں گے پھر۔۔ شاد اور۔۔ اثر اور خان بہادر۔۔ خدا بخش خاں۔۔ جمیل۔۔ بیان کریں گے کہ شاعری کیا ہے اور اس کی نمایت کیا ہونی چاہیے۔"

۱۸ر اکتوبر "ہماری دلی آرزو ہے کہ۔۔ گمنام اور غریب الوطن شاعر جنہوں نے اکثر نوازش ناموں سے۔۔ سید بادشاہ نواب۔۔ کر دو۔۔ فرمایا ہے۔۔ کھلے بند مشاعرے میں تشریف لائیں۔"

۲۵ر اکتوبر (۱) "ہمارا معرکہ آرا مشاعرہ" ۱۸ر اکتوبر کو گیارہ بجے دن سے شروع ہوا۔ شہر کے باکمال شعرا میں حکیم عبد الحمید۔۔ پریشان۔۔ شاد۔ شوق۔ حفیظ۔ آزاد۔۔ باقر۔ خدا بخش۔ جمیل وغیرہ۔ بہار شریف سے۔۔ اعجز حضرت شاہ امین احمد کے صاحبزادے اور حافظ عبد اللہ اور گیا سے۔۔ سید خیرات احمد وکیل اور جناب عشرت اور

ہ سے جناب ہاشم وجناب واجد اور میاں قمر وغیرہ اور مظفر پور سے حافظ رحمت اللہ.. اور جناب مشرقی حزیں تشریف
رکھتے.. عمائد، شہر سے.. سرفراز حسین خاں.؛ آصف مرزا..؛ نواب کاظم حسین..؛ ننھا صاحب موج، مسٹر سید علی الہم
مٹر سید حسن امام، مسٹر نصیر الدین حسین. نصیرؔ شریک صحبت رہے" حکیم محمد مہدی اثرؔ اور مطیر لکھنوی بھی برابر شریک رہے لفظ
شاعرہ سید بادشاہ نواب نے ایک رباعی اور غیر طرحی غزل سے کیا صلا، صلا، صلا غائب (۲) وفات شمس العلما
پرحسن بعمر ۱۱ سال۔

۱ نومبر: "ہمارے گمنام غریب الوطن اہل زبان شاعر" گمنام شاعر اب اپنی ناک کٹوانی چاہیے۔ ان کے خطوط کے
اقتباسات: خط مورخہ ۱۹ رجب لفافے پر بانکی پور کی مہر میں حقاً اور ایمانا کہتا ہوں کہ.. اگر لکھنو دہلی کے اچھے شاعر بھی
ایسا ہی کہتے.. شاد کا کیا کہنا.. وہ آپ کے شہر میں باعث فخر ہیں اور ننھا میاں؛ افروز میاں؛ احقر بہاری، آزاد، شوق
وی، مولوی امداد امام (اثر)..؛ حفیظ، تبسم، بیتاب.. کی غزلیں.. دیکھنے کے قابل ہیں۔ میں نے بڑے بڑے معرکے لکھنؤ
دہلی کے دیکھے ہیں اور رام پور میں بھی بہت رہا ہوں۔ میں شاگرد میر وحید.. مرحوم کا ہوں" (۲) خط ۱۹ رجب ۱۳۲۰
آپ کی غزلیں بھی بہت عمدہ ہیں.؛ شاد نے تو زمین کو پانی کر دیا۔ بے شک وہ استاد ہیں.. مگر آپ لوگوں کو ان کی
قدر نہیں۔ شوق نیموی نے بھی غزلیں اچھی پڑھیں (۳) ۲۱ رجب "بہت عمدگی سے آپ نے مشاعرہ کیا۔۔ آپ لوگ میرے قصور
معاف فرمائیں اور یہ خط سب کے سامنے۔۔ پڑھ دیں" (۴) خط ۲۱ رجب "آپ نے بیشک سب پوربیوں کی عزت رکھ
لی" (۵) کارڈ کا مضمون جس پر آرہ چوک کی مہر ہے" ہم کو خیال تھا کہ یہ پوربی غزل کہنا کیا جانیں۔ اس کے برعکس پایا
اور میرا وطن دہلی ہے۔ میں چھٹوں طرحوں میں موجود تھا"۔

۱۵ نومبر ہیوز کلب منگل تالاب پٹنہ کے جلسے کی کیفیت

۲۲ نومبر (۱) خلیل الرحمن صاحب ڈمری نے انجمن اسلامیہ بانکی پور کی عمارت کے لیے ہزار روپے دیئے (۲)
بہاری ولایتی چھٹی" "دعا کیجیے کہ منشی انبا پرشاد صاحب صوفی اور مرزا عبد اللہ صاحب حسرتی رہائی پائیں" راقم مسٹر:
محمد از گلاسگو (۳) ایک مراسلے میں سید محمد طاہر بلگرامی کو سابق ایڈیٹر شہرہ آفاق لکھا ہے۔

۲۷ دسمبر: "مرزائے قادیانی اور اخبار الحکم پر عدالت جہلم میں نالش لائبل دائر ہوئی۔ اس کے جواب
میں ایک نالش عدالت گورداس پور میں دائر کی گئی ہے"۔

(۲)

۲۱ فروری ایک مختصر فارسی مثنوی از قاآنی ہند (حکیم عبد الحمید مرحوم اس نام سے لکھا کرتے تھے) بیت اول:

خوش ساعت ونج گردوں قباب	دل و مردم دیدۂ آفتاب

۲۸ر فروری ایک مختصر فارسی مثنوی "موسم بہار کی ترنگ" از قاآنی ہند، بیت اول :

بجام حلب زن مے پرتگال	کجائی تو اے ساقی پرجمال

۱۴ر مارچ نظم بعنوان "چائے" از آزاد (فضل حق ؟)، بیت اول :

کہ بعد بادہ اگر ہست ہمیں شرابے ہست	بگیر چائے اگر ازمے اجتنابے ہست

۲۹ر مارچ (۱) نظم "کمال نقص" از آزاد (۲) مسدس "نوروز سعید ہوئی کی کشید عید کی دید" از حفیظ علیم آبادی (حافظ نذر الرحمن)، بند اول :

جوبن پہ ہے بہار چمن لالہ زار ہے	گلشن ہے سبزہ زار گلوں پر نکھار ہے
گلہائے بیشمار سے پر کوہسار ہے	رندوں کی ہے پکار کہ فصل بہار ہے
ساقی بیار بادہ کہ آخر بہانہ چیست	در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ چیست

۱۲ر اپریل نظم بعنوان "گرمی" از صفیر لکھنوی مصرع : "اب کے تو بے سر و سامان ہی آئی گرمی"

۴ر مئی مسدس "سراپا یاس" از ضمیر الدین احمد عرش، ایک بند، حاشیے میں ہے کہ امیر سے مراد امیر لکھنوی، فریاد بیتی، حشر، آہ و عیش گیاوی تھے، ضیا علیم آبادی، لیئق سہسرامی اور خورشید لکھنوی تھے۔

ہیں امیر آج کہاں اور وہ فریاد و لیئق	کیا ہوئے حشر و ضیا، آہ و نفیس اور لیئق
عیش و خورشید کہاں اور کہاں ہیں وہ شفیق	تھے مرے دور میں یہ اہل صفا پاک طریق
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد	روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

۱۰ر مئی (۱) ایک نظم بعنوان "بیسویں صدی کی ایک بیاہتا بانو کی شکایتیں" از "ہم" ابتدا کے دو شعر :

مردوے فوج میں کیا جانوں کہ ہو گئے بھرتی	اب نہ انگریزی کے پڑھنے سے ہوا سب روشن
وہ تو ابا کو خدا بخشے مجھے پڑھوایا	مس فریڈم کو بلا لائے وہ خود جا کے کشن

قطعۂ تاریخ وفات "مولانا مولوی ابو محمد ابراہیم۔۔ آروی" از رکھو عظیم آبادی۔ مادہ :

ہائے اب دین کا چراغ بجھا ۱۳۱۹

۲۴ر مئی (۱) مدیر کی طرف سے صوبۂ بہار کے ایک پرانے زمانے کے شاعر "عبد الغنی غنی (حالات ندارد) کی ہیں تمہید نثر کے ساتھ :

ہے ابر و باد درد سے سینہ پھٹا پھٹا / بدلی ہے جب سے چشم محبت گھٹا گھٹا
ہر روز اس کو وعدۂ فردا دیا کریں / جوں کشت زیرہ رکھتے ہیں دل کو پٹا پٹا
آب حیات خضر لا سامنے مرے / میں زندگی سے سیر ہوں بس جی گھٹا گھٹا
تیر نگاہ و تیغ دو ابرو نے یار کی / سو ٹکڑے کر کے دل کو لیا ہے بٹا بٹا
شمشیر قتل پر مرے کی تھی علم مگر / خود شرم سے وہ جا دسے ہے کب ہی کٹا کٹا
کیا ذکر آب و دانے کا عاشق کے تئیں بھلا / تسکین دل کی کرتے ہیں لوہو چٹا چٹا
زاہد کا دخل بزم میں اس کی ہو دخل کیا / عشاق اس گروہ کو دیویں ہٹا ہٹا
کیونکر نہ جی اٹھے مرا جینے سے تنگ ہو / بیٹھے رقیب بازو سے اس کے سٹا سٹا
اتمام اس غزل کا غنی ہی کا کام تھا / کیا تنگ قافیہ تھا یہ آخر اٹا اٹا
ہنستی تھی مجھ کو دیکھ حیا سے سمٹ گئی / دانتوں میں انگلی کاٹ شرم سے دبک گئی
ہٹ بٹ چپاپڑی سے وہ پٹ پٹ جواب دے / چھٹ پٹ پلٹ جھپٹ کے کمر سے لپٹ گئی
سوز و گداز ہی میں ہوئی زندگی تمام / مانند شمع سر سے لے پا تک لہٹ گئی
مانند اشک تو نے نظر سے گرا دیا / ایسی ہماری آنکھوں میں توقیر گھٹ گئی
بس اب خموش ختم کرو یہ غزل غنی / ہے وقت تنگ فکر بھی سو طرف بٹ گئی
جو صحبت میں رہے تیری سو دل مغموم کر نکلے / تری خو بو سے واقف ہو تجھے معلوم کر نکلے
یہ وہ در ہے جسے سجدہ کریں جن و بشر یکسر / جو آئے آستانے میں سو چوکھٹ چوم کر نکلے
جو دیکھوں اسکی قامت کو تو اک سکتہ سا لگتا ہے / نفس رکتی ہے گر نکلے تو یا قیوم کر نکلے
کبھو گر سیر کو سرو چماں سوے چمن جاوے / چمن سے اس کے استقبال کو گل جھوم کر نکلے
نہ دو اس ترک شیرازی کے تئیں شمشیر سفاکی / وگرنہ خون عالم شام سے تا روم کر نکلے

(۲) مزیدار مشاعرہ کے عنوان سے تمہید نثر کے ساتھ صفیر لکھنوی نے فرضی شعرا اسکو فرخندہ خانم، چلبل بیگم، مغلق نواب گروہت اور مذاق مرزا نسوڑ بیگ کی غزلیں پیش کی ہیں۔

(۳) صحیح (۱) "مبارک شادی" کے عنوان سے منظر نثر جو ایک نظم تہنیت نامہ کی تمہید ہے۔ یہ ہزبانہ مہاراجہ گوپال سرن نارائن بہادر والی راج کاری کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی، بیت آخر،

عقد سے الپنچ بہاردرکی یہی اب ہے دعا   دولہا دولہن کو سُراور ہو دُلہا کو دولہن

(۲) "صبح کی سیر" مسدس از آزاد مصرع ۱ "انوار صبح سے ہے عیاں شانِ سیرِ صبح "

۷ جون ایک فارسی مسدس بعنوان "غم کی تصویر" مع تمہید نثر از م۔ی۔ر۔ج (رنجور) مصرع ۱ "زدنیا چو حرمان دغم بردہ باشم" ہر بند میں بیت ذیل کی تضمین ہے:

چو حسرت بزیر زمیں خوردہ باشم   کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

(۲) مسدس بعنوان "سایہ" از آزاد، مصرع ۱ "لے سائے ہم تو سمجھے ہوئے تھے اک قدر"

۱۴ جون (۱) مثنوی بعنوان "ساقی نامۂ آزاد" مصرع ۱ "ساقیا آج وہ دے جام مجھے" (۲) "وہ مارا ایک قطعہ از رنجور مع تمہید نثر بیت اول: جنگ افریقہ جنوبی میں رہے بورہی زیر دست آخر (۲) غزل کیفی گیاوی مع تمہید از عرش:

شب سے جلتی فزوں مرے زخم کہن میں ہے   روشن چراغ طور مرے انجمن میں ہے

مستی لگا کے سیر گلستاں نہ کیجیے   سوسن زباں دراز بہت اس چمن میں ہے

اس گل کے عشق نے وہ سُبکسار کر دیا   جسم اپنا مثل نکہت گل پیرہن میں ہے

کیا نالہہائے خاطر ناداں بلند ہیں   اک راستہ سا گنبد چرخ کہن میں ہے

کیفی فراق یار کا شکوہ نہ کیجیے   سب سے نرالی بات یہ رنج و محن میں ہے

۲۱ جون (۱) مخمس از آزاد بعنوان "بچہ سویرے اٹھتے ہی اسکول کو چلا" (۲) "کمال علم" مختصر قطعہ از آزاد "آزاد سے ایک منطقی نے پوچھا" (۳) "ڈاکیا" مثنوی از برائے نام خیر (مدیر الپنچ؟) (۴) "چھوٹے تارے" از جوئے نام خیر، ین مستار کا ترجمہ (۵) قطعہ تاریخ وفات الحاج سید محمد حسن نعمتی رئیس صدر گلی بتاریخ ۲۲ صفر از ہادی "مادۂ نو سن رفتہ پیش حسن" ۱۳۲۰ھ

۲۸ جون مثنوی از آزاد بعنوان "قدم عیش سُست می آید دیر آید درست می آید" مصرع ۱ "جنیاں سی جگہ میں کم کم لے"

۵ جولائی (۱) قطعہ تاریخ ولادت پسر نورالرحمن ندر خلف حفیظ عظیم آبادی از سید علی خاں بیتاب "نظم برسات" از مست سہسرامی۔

۱۹ جولائی (۱) مسدس بعنوان "شام" از عرش مصرع ۱ "طاؤس شام نے جو دیا کھول بال و پر" (۲)

لعہ تاریخ وفات سید رحیم الدین از قاآنی ہند، مادہ "واللہ داخل در جناں شد" از سراہ بو ۱۳۲۰

۲ اگست (۱) "زیارت" مسدس از آزاد مصرع ا "اے گہری نیند اجل کی تا حشر سونے والے" نام نہیں
رسید رحیم الدین کا مرثیہ معلوم ہوتا ہے (۲) شاد عظیم آبادی کے کہے ہوئے قطعات تاریخ وفات متعلق سید رحیم الدین

۱۴ اگست (۱) فارسی مثنوی بعنوان "نوروز عالم" از سید محمد آزاد (۲) قطعہ تاریخ تاجپوشی از رنجور
(۳) تواریخ جشن فارسی متعدد از ابو النصر غلام یسین آہ دہلوی (۴) اردو ایک از ایضاً (۵) "تاج تہنیت" از عرش
مصرع ا "ہے کہاں مطرب ادھر آ چھیڑ جلدی سے ستار" (۶) رباعیاں از آزاد (۷) نظم "تاج" مصرع ا "اے شہنشاہ
ملک رفعت و عالم سرتاج" (ردیف تاج) (۸) قطعہ تاریخ وفات سید رحیم الدین مہجور از رنجور (۹) "ماتم مہجور"
از عرش (۱۰) نظم متعلق سید احمد علی ہیڈ ماسٹر از آزاد مصرع ا "کعبے سے اٹھیں جھوم کے ساون کی گھٹائیں"

۲۰ اگست نظم از رنجور مصرع ا "مسند علم تو پائیں جہلا یعنی چہ"

۱۳ ستمبر "چٹ پٹی ریختی" از رنجور

۶ (۱) غزل کیفی تمہید نثر کے ساتھ از عرش "منیر الدین کیفی شاگرد کاہش فخر التلامذہ مصحفی۔
راج گیا میں گمنام ہیں مگر ان کے ایک دیرینہ سال شاگرد میرے دوست۔ منشی درگا پرشاد ستم موجود ہیں اور
ان کا کلام تصوف سے مالا مال ہے۔ کیفی نے اپنا دیوان استاد کاہش کے دیوان کے ضائع ہونے کے غم میں چاک کرکے
کنویں میں ڈال دیا (کذا)۔

کچھ بات کہی جو رات جی کی — لیں ہم نے بلائیں بیکسی کی
دل لیتے ہی اس نے دشمنی کی — کیا داد ملی ہے دوستی کی
آنا ہو تو جلد آؤ صاحب — ہے دیر یہاں کوئی گھڑی کی
پہلو میں نہیں ہے دل ہمارا — کیا جانیے کس نے رہزنی کی
کاہش کا یہ فیض دیکھو کیفی — جاتی نہیں طرز مصحفی کی

(۲) اشعار عربی سید سلیمان بہاری (دسنوی) طالب علم دار العلوم ندوۃ العلما

۲۵ اکتوبر (۱) رباعی و غزل سید بادشاہ نواب عشرتی بیت ا غزل:

کرے وہ کیا گلہ رنج و بلا کا — جو ہو پابند تسلیم و رضا کا

(۲) عشرتی کی دو طرحی غزلیں "وہ گھر سے نہ نکلے تھے کہ رو پوش ہوئی دھوپ" الخ

• چھوڑی جو اس نے زلف تو تا سر سے پاؤں تک" الخ

ا، نومبر وصیت نامہ مثنوی فارسی از محمد ابوسعید اہرانوی از تلامذۂ محمد لطف اللہ مفتی حیدرآباد دکن

۱۵، نومبر قومی قصیدہ ندوۃ العلما کے جلسۂ امرتسر میں پڑھا گیا از رکن الدین دانا سہسرامی۔

۲۲، نومبر "عظیم آباد کے امتحانی مشاعروں کی رباعیاں اور منتخب غزلیں"

اب ملک سخن کی آبرو ہے پٹنہ — مشہور زمانہ چارسو ہے پٹنہ
شوق اہل کمال کا یہاں مجمع ہے — رشک دہلی و لکھنو ہے پٹنہ
ہے اہل کمال سے یہ پٹنہ آباد — شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں آباد
کامل ہیں یہاں کے سیکڑوں اہل سخن — یہ ہیں وہ ہیں وہ شاد ہیں وہ آزاد
منکر ہے کہاں فدا اب آکر دیکھے — میدان کلام کا دلاور دیکھے
باری اب شوق نیموی کی آئی — اس پوربی شاعر کا بھی جوہر دیکھے

(۳)

۲۹، مارچ دبدبۂ امیری امیر عبدالرحمن کی "سوانح عمری" کا ترجمہ از سید محمد حسن بلگرامی۔ بوالہوس بنگالی، ناول از صغیر لکھنوی؟ تقویم الاسلام از حکیم وکیل احمد، رسالۂ فلسفہ از برج بہادر، "احسن الاخبار کلکتہ کی مذمت کی ہے۔ ذیل کے اخباروں کے متعلق مرقوم ہے "یہ سب نئے پرچے ہیں، یہ سب اخبار اچھے ہیں" شمس النہار دہلی، پٹیالہ اخبار پٹیالہ، سروج بمبئی، پولیس ایڈووکیٹ لاہور۔

۱۰، مئی ضیاء السنت کلکتہ، ماہوار رسالہ باہتمام غنی احمد و ضیاء الرحمن۔

۱۴، جون بچوں کا اخبار لاہور، علاج الطاعون" اکثر نسخے ہمارے شہر کے حکیم حاذق مولانا حکیم عبدالحمید۔ ....کھوائے ہوئے ہیں"

۱۹، جولائی "حیات تسلیم" از عرش، "حمایت اسلام" حبیب الرحمن شروانی کی تقریر انجمن حمایت اسلام ...سالانہ جلسے میں۔

۲، اگست عمدۃ التاریخ معروف بہ زنبیل تاریخی از تسلیم سہوانی، حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی ...وکت مہرسی۔

۲۳، اگست زبدۃ القواعد و مخزن المصادر (انگریزی آمد نامہ)" دونوں کے ملنے کا پتا: بنارسی لال

پلینڈ آرہ۔ اللمعان صاحب الفرقان اور تبیان حسن الملیح وجہ المحمد بن المسیح از عبدالغفور دانا پوری۔ رپورٹ مدرسہ و مشن اصلاح المسلمین سلطان گنج بابت ۱۹۔۱۳۱۸ھ۔ رسالہ پلیگ از سید ظہیرالدین نبورہ۔ ضمناً اسی موضوع پر شمس العلما امداد امام کی کتاب کا ذکر (اس کا تبصرہ از سید محب الحق)

۳۰ اگست الپنچ لکھتا ہے کہ سیر عظیم مراد آباد کی شائع کردہ کتابوں جانستان، افسوں، چاک گریبان، منتہی القواعد، دکھی کی پکار، تاریخ بغداد، محاربہ فرانس و پرشیا اور کنزالاسرار پر تبصرہ ہو چکا ہے، مگر پھر ہوگا۔

۲ ستمبر اخبار تاج بانکی پور سید فضل حق آزاد نے نکالا تھا۔ الپنچ لکھتا ہے کہ اس نام کا ایک اخبار راولپنڈی سے ۲۰ برس سے نکل رہا ہے۔

۸ نومبر دی رولا یٹڈری رولڈ، انگریزی کا مختصر رسالہ از سرفراز حسین خاں پٹنہ۔ صلح کل روزانہ گورکھپور کی تعریف۔ اس کا اشتہار ۸ نومبر کے اخبار میں ہے، ایک پیسہ قیمت، ایک پیسہ محصول، لعہ سالانہ۔ اشتہار منجاب سید ریاض احمد مہتمم صلح کل پرنٹنگ کمپنی لمٹیڈ۔ تقویم سلطانی، پتا: ابو محمد چراغ دین لائق لاہوری اہلکار مطبع ریاست بھوپال۔

۱۵ نومبر ہار اقیصر از محبوب عالم لاہور، آتش جغرافیہ، پتا: ایم۔ اے مرزا اینڈ کو بھوپال، گھاس چارا طبع ۲، بینہ ترکاری طبع ۲، درخت، عروج طبع ۲، امریکی ناول کا ترجمہ۔ ان سب کا پتا: امپریل بک ڈپو بازار چاندنی چوک دہلی۔ ثالث بالخیر ترکی ناول کا ترجمہ، مترجم سید سجاد حیدر، دولت باغبان، پتا: منشی شمشاد علی وزیر علی محلہ بخشی بازار الہ آباد۔

۲۹ نومبر خورشید عرفان دیوان شیخ باقر علی آبادی عظیم آبادی، خارغم ناول پتا: گوری پرشاد ہمدم آگرہ۔ بچوں کے والدین اور محافظوں کو نہایت ہی قیمتی ہدایت پتا: ڈاکٹر گنگا رام لاہور، حجاز ریلوے کا نقشہ پتا: اخبار وطن ...

۲۷ دسمبر جام الفت شیکسپیئر کے ٹمسر ناٹس ڈریم کا منظوم ترجمہ از اظہر علی آزاد کاکوروی، صفیہ بیگم اور انمول موتی ہر دو از صفیہ بیگم (مسز ممتاز علی)، خمار عشق صوفیانہ مثنوی از نثار علی نثار اکبر آبادی۔

(۴)

اشتہار کتب و اخبارات، رشتہ الشرف از سید ضمیرالدین احمد، نظم دلفریب (دیوان حفیظ عظیم آبادی) نئے عبدالرحمانی حصہ ا کا ترجمہ چھپ چکا تھا، دوسرا زیر طبع پتا: قاضی محمود الحسن مراد آباد، شرح آداب المریدین پیارے ... از عباس حسین ہوش لکھنوی، بچوں کا اخبار لاہور، انتخاب لاجواب لاہور، سیر عظیم مراد آباد، فتح اندلس از شرر، نورجہاں ... سوانح عمری از اشہری، دارالعلوم دہلی (ہفتہ وار اخبار) کتاب التفریح، اس میں شعر کے لطائف ہیں، سودا، میر، انشا، جرات، ناسخ، آتش، مومن، ذوق و غالب وغیرہ۔ پتا: دفتر خیر خواہ عالم دہلی۔

اپنچ پٹنہ (جنوری تا جون ۱۹۰۳ء)

اپنچ کے بارے میں اردو انڈین کرانیکل پٹنہ کے شمارہ ۲ر فروری ۱۸۸۵ء میں مرقوم ہے:

"اس ہفتے میں ایک اور ظریف اخبار "اپنچ" کی آمد آمد ہے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بطور آزمائش چار مہینے کیلئے جاری ہوا ہے۔ مہتمم منشی محمد اعظم ہیں۔"

اردو انڈین کرانیکل بابت ۹ر مارچ ۱۸۸۵ء اپنچ کے متعلق لکھتا ہے "اس وقت تک اس کے چار پرچے شائع ہو چکے ہیں۔ چند تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہفتہ وار پنجشنبے کو چار ورقوں پر شائع ہوتا ہے۔ نہایت معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تیسرے ہی پرچے سے اشاعت ۵۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔"

شاد عظیم آبادی کا قول تھا کہ اپنچ کے اجرا کی علت غائی انکی مخالفت تھی۔ یہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ اس میں کئی برس تک ان کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ اپنچ کا جس وقت آغاز ہوا ہے، شاد کی صورت الخیال چھپ چکی تھی، اور محمد اعظم مدعی تھے کہ یہ دراصل ان کی لکھی ہوئی ہے۔ نوائے وطن کی وجہ سے بھی بہت سے لوگ اس زمانے میں ان سے خفا تھے ۱۹۰۰ء میں یا اس سے بھی بیشتر اپنچ اور شاد میں صلح ہو چکی تھی ۲ر اگست ۱۹۰۲ء کے اپنچ میں سید رحیم الدین مجبور مدیر اپنچ کی وفات پر شاد نے جو قطعات تاریخ کہے تھے موجود ہیں۔ آج کل جو اردو کے اخبار بہار میں جاری ہیں، انکی عمر کیا ہوگی۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ مگر یہ مسلم ہے کہ جو اخبارات اب زندہ نہیں ہیں، ان میں سب سے پہلے طویل عمر اپنچ نے پائی۔

اپنچ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ظریفانہ اخبار تھا لیکن اسکی ظرافت کا پایہ بلند نہ تھا اور بے تکلف ذاتی حملے سوقیانہ انداز میں کیا کرتا تھا۔ اس مضمون کی غرض اپنچ کے کل پرچوں پر جو میری نظر سے گزرے ہیں تبصرہ کرنا نہیں، بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ ۱۹۰۳ء کی پہلی ششماہی میں اس اخبار کا کیا رنگ تھا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں یہ عموماً ۱۲ صفحوں کا ہوا کرتا تھا اور پنجشنبے کو نکلا کرتا تھا پہلے صفحہ میں پنچ کی تصویر ہوا کرتی تھی اور اس کے اوپر اخبار کا نام درج ہوتا تھا۔ اس صفحے میں ذیل سے فارسی اشعار التزاماً ہوا کرتے تھے۔

جاں نثار حضرت شاہ زمن   تاج بخش تاجداران سخن

بذلہ سنج، طوطیِ شکر شکن   خیر خواہ قوم، شیدائے وطن

"شاہی اعلان" سے جو عبارت اس صفحہ میں درج ہوا کرتی تھی، یہ ہے:

"کیا آپ نے اب تک مولانا "اپنچ" کو نہیں دیکھا ہے؟ ضرور دیکھئے جو اخبار نہیں چلتا ہوا جادو ظرافت کا پورٹ، ایک جملہ پڑھئے اور ہنستے ہنستے بیخود نہ ہو جائیے تو ہمارا ذمہ۔ ایک خبر دیکھئے اور پیٹ نہ پکڑ لیجیے تو ہم گنہگار۔ پھر یہی نہیں کہ صرف ہا ہا ہی ہی کے سوا کام کی باتیں بالکل ندارد، نہیں، پولیٹیکل، سوشل، مارل آرٹیکل سے مالامال، ملکی ترقی اور تمدنی مضامین پر زبردست چٹکیاں لینے میں گرو گھنٹال۔ اس پر زبان کی صفائی، محاورات کی بندش کا کیا کہنا، پڑھئے اور لوٹ پوٹ ہو جائیے۔ ان سب خوبیوں پر قیمت پوچھئے تو کچھ بھی نہیں، صرف سفید سفید چہرہ شاہی دیجئے اور سال بھر تک مزے لوٹئے۔ ہاں مسٹر اپنچ اپنے کارخانے میں ادھار کا کھاتا نہیں رکھتے، ہر کام مزدوری چوکھا کام، جو کچھ ہو دام نقد، سوکھی ساکھی درخواست بھیج دینے پر اپنا درشن نہیں دکھاتے۔ کمر اکمل فرخ آبادی چاہیے۔ غرض حضرت اپنچ بغیر مٹھیاں گرمائے اپنے آفس سے باہر نہیں نکلتے ہیں:"

صفحہ ۲ اور بعد کے بعض صفحات میں بھی اگر ضرورت ہو، مدیر اپنچ کے چھوٹے بڑے مضامین بعنوان "خود بدولت" اور خود بدولت کے بعد دوسروں کی نظم و نثر بعنوانِ "اعیانِ دولت"۔ ان کے علاوہ مستقل عنوانات اسلامی دنیا، چیدہ خبریں اور لوکل ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں اپنچ کے مدیر خیر در بھنگوی تھے۔ یہ ۱۹، ۲۰ جولائی سنہ کے شمارے میں سید رحیم الدین کی وفات کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ جب آپ ضیق النفس سے بہت پریشان ہوئے تو اس ہیچمدان حقیر کو جو پہلے ابو الظرافہ اور نگار، نیز چٹپکار کے نام نامہ نگاری کیا کرتا تھا، بلا لیا اور نائب ایڈیٹر مقرر کیا، آپ صرف پروف دیکھ لیا کرتے تھے۔ یہ ایک جگہ ہے، دوسرے مقام پر اسی شمارے میں تحریر کیا ہے۔ یہ "ہیچمداں" آٹھ برس سے اخبار چلا رہا تھا، صرف وہ مضامین کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اخبار جس طرح سے نکل رہا تھا، انشاء اللہ نکلتا رہے گا۔ جو آٹھ برس سے جس کی ایڈیٹری میں اخبار تھا اسی کے ہاتھ میں اب بھی رہے گا۔ جیسا کہ رنگ تھا وہی رہے گا۔ وہی ظرافت ہوگی وہی متانت۔

اپنچ کا سیاسی مسلک وہی تھا جو اس زمانے میں عام مسلمان اخباروں کا تھا، لیکن کبھی کبھی انگریزی حکومت پر اعتراض بھی کیا کرتا تھا۔ سنہ کا پہلا شمارہ ۱۲ صفحوں کا ہے اور سبز و سرخ رنگوں میں چھپا ہے۔ اس میں جو نظم نثر ہے وہ تقریباً کل دربار دہلی سے متعلق ہے۔

۱؎ "آج ہم اعیانِ دولت کے تحت میں نہایت فخر کے ساتھ اپنے شہر کے ہر دلعزیز رئیس اور مشہور شاعر جناب خان
بی سید علی محمد صاحب شاد کی دو نظم شائع کرتے ہیں۔ حضرت شاد اپنا کلام کسی اخبار میں شائع نہیں کراتے ہمارے
پرچے نے اپنے کی رونق بڑھائی ہے۔ ہم ان کے کلام کو سخن فہموں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دیکھیں کہ کس پائے کی نظم
بات پیدا کی ہے۔ ہم آئندہ حضرت شاد کے کلام اور ان کی محنت کی حقیقت لکھیں گے۔
جہاں کالموں میں نوٹس لاٹ صاحب کی آمد کے عنوان وائسرائے کرزن کے ورود پٹنہ کی کیفیت لکھی ہے۔ اس کا
یا اس مطلع سے ہوتا ہے۔

چمن میں بادِ بہار آئی اور آکے چلی نسیم روح فزا لائی اور لاکے چلی

اس مضمون میں وائسرائے کے کتب خانہ خدا بخش کے دیکھنے کا بھی ذکر ہے۔
۲؎ شاد کی کتاب "اردو تعلیم" کی تعریف کی ہے اور سفارش کی ہے کہ اخبار وطن اپنی حیدرا ایجنسی میں اسے
۔ وکیل اس کی اشاعت کی سعی کرے اور سررشتۂ تعلیم ابتدائی درجوں کے نصاب میں اس کو داخل کرے۔ اس رسالے
(چھوٹی حکایتیں، مزیدار نظمیں لکھی ہیں تو ایسی چٹ پٹی اور برجستہ کہ لڑکوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ یہ کتاب
دل میں الف با سے لیکر عبارت نویسی تک کا سلیقہ پیدا کر دیتی ہے۔ اردو کی کوئی پہلی کتاب اس اہتمام اور دعوے
لکھی گئی۔" امیر عبدالرحمٰن کی کتاب کا دو جلدوں میں ترجمہ بنام تزک عبدالرحمانی از محمد حسن "تزک ترجمہ کا حق ادا کیا گیا۔
"ہم کو معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے مولانا حکیم ظہیر احسن شوق نیموی علاج طاعون میں برابر کامیابی حاصل
رہے ہیں اور عام غربا کے ساتھ زیادہ تر ہمدردی و شفقت اور جانفشانی فرماتے ہیں۔"
قاضی محمد عبدالعلی عابد مراد آبادی کے ناول تیر نظر کی تعریف۔ جنگ ہندی میں مہا گیرت لال ساکن بسوہ ضلع میرٹھ
دگمے ضلع علیگڑھ نے سری مہاراج رامچندر جی کے تاریخی واقعات ناول کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ افسوس
جن لوگوں کو بھاشا زبان سے مذاق نہیں ہے انہیں کم لطف آئے گا۔ کیونکہ اس میں زیادہ تر بھاشا زبان کے
خیال کیے گئے ہیں۔ بخشی جنتری ۱۹۰۵، مرتبہ شیخ الٰہ بخش بخشی کلکتہ کی تعریف۔
جناب شاہ محمد حسن صاحب مغربی کا تریاق مغربی فی الحقیقت طاعونی مریضوں کو بہت فائدہ پہنچا رہا ہے اور
لوگ اس سے صحت پا رہے ہیں۔ ہار لوکل بمصر بہار بر ڈاہر بہار نامس لکھا اس کی حیرت انگیز تاثیر کا معترف ہے۔
۔ سہل آموز فارسی از آقا محمد کاظم شیرازی کلکتہ، نور جہاں مصنفہ امجد علی اشہری دختر نور جہاں سے متعلق میرزا حیرت
در حسن حیدرآبادی کی کتابوں کا ذکر اور مطبع آگرہ اخبار کی چھپائی کی ستائش، تذکرۃ النساء از درگا پرشاد دو حصے

گلشن ناز مع تکملہ اور چمن انداز) اور زہرا اختر کی ناول کا ترجمہ از سید سجاد حیدر کی تعریف ۔

[illegible] ۔ خالق باری انگریزی از جلال الدین مراد آبادی اور ماہنامہ کاشف العلوم کا تبصرہ ۔ یہ ماہنامہ محمد یعقوب بیگ دہلوی کے اہتمام سے نکلتا تھا ۔ پہلے شمارے میں تفسیر مظہری (قاضی ثناء اللہ پانی پتی) ترغیب و ترہیب (عبدالعظیم منذری) مسائل الارکان (بحر العلوم عبدالعلی) رسائل اربعین فی الدین (غزالی) کے اردو ترجمے (بعض حصص کا ترجمہ ہوگا) کے علاوہ مثنوی رومی کی اردو شرح از اشرف علی تھانوی نظاہر ہے کہ اس کا ایک مختصر حصہ ہوگا) اور کچھ اور چیزیں ہیں ۔

[illegible] ۔ پیچھے حضرت پھر کمبخت کالے کلوٹے ہندوستانی قلیوں نے شکار گاہوں میں آپ سے گورے بہادر شکاریوں کی گولیوں کا نشانہ بنکر ان کو بدنام کرنے کی ٹھانی ہے ۔ بنگلور میں ایک قلی سے غلطی ہوگئی کہ وہ نشانہ بن گیا ۔ دوسرا لکھنؤ میں بھی قلیوں سے ایسی گستاخی ہوئی ہے شکارگاہوں کے درمیان اپنی جانوں کو گھی میں لے کر بیٹھا پایا ضرور تھا ' بات تری کی ! کمبختو تمہاری یہی سزا ہے ۔ ہمارے وائسرائے کے کیا کہنے ہیں ۔ آپ سا مقرر پردۂ دنیا پر شاید ہی کوئی ہو ، وائسرائے سابقین میں سے کوئی بھی ایسا مقرر نہ تھا رعایائے ہند کو اپنے پیارے نائب السلطنت کی میٹھی باتوں کے سننے کا جیسا اشتیاق رہا کرتا تھا وہ ان کے وقت میں خوب ہی کمال ہوا ۔ واقعی ہندوستانیوں کے کل حقوق کا از بر یاد کرلینا ایک وائسرائے ہی کا کام تھا جہاں گئے اپنی اسپیچ میں آپ نے یہ ثابت کردیا کہ ہندوستان کے حقوق یہ ہیں اور وہ ہیں ۔ اب رہا یہ دلانا وہ بھی کسی وقت ادھوری رہے گا مگر دست آتی ہمدردی کیا کم ہے ہندوستانیوں کو اس وقت کی قدر نہ ہو مگر ہاں آپ کے بعد آپ کی قدر ہوگی ، جب کوئی زبانی ہمدردی بھی نہ ہوگا ۔"

[illegible] ۔ لو آنکھ کے اندھو خوش ہو جاؤ ۔ اندھا اور کیا چاہے دو آنکھیں ؛ فرانس کے ایک ڈاکٹر صاحب نے تاج الملوک بلکہ اصلی مصنوعی آنکھیں ایجاد کی ہیں جس سے تینوں تو لوگ سوجھتا ہے ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں تو گل بکاؤلی سے بھی بڑھ کر ۔

[illegible] ۔ اکسیر علاج (از ڈاکٹر ملک صفدر حسین) مطبع اپنچ کی تعریف ۔ اس کا تعلق ہومیو پیتھک سے ہے ۔

[illegible] ۔ یہاں یہ معلوم انگریزی اخباروں کی گپ تپ کہ نمک کے محصول میں تخفیف ہوگئی ۔ " محمود آباد کے تعلقہ دار " امیر الدولہ سعید الملک آنریبل راجہ سر امیر حسن خاں بہادر کے سی آئی ای ایف سی یو ممتاز جنگ کی وفات (۲ ربیع الاول شنبہ) کی خبر اور ۔۔۔

[illegible] ۔ بیان ہے کہ شاہ ایران کے حرم میں ، ۵ سو بیگمیں تھیں سفر یورپ سے واپس آکر آپ نے صرف ۶ عورتوں کو منتخب کرکے حرم میں رکھ لیا اور ۵ مختلف افسروں کے گلے میں منڈھی گئیں اور باقی کو حکم ہوا کہ وہ بھی جاکر یورپ کی ہوا کھائیں ۔"

ڈاکٹر نکلسن صاحب فرماتے ہیں کہ پاؤں پر دن بھر میں کئی بار ٹھنڈا پانی ڈالنے سے دماغ کو تقویت ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کو تجربے کے مطابق مسلمانوں کا پنجگانہ وضو بھی اس فائدے سے خالی نہیں ، مگر ٹھہئی چاہیے دماغ کو تقویت ہو یا روح کو یہ ہر وقت پاؤں سے موزے اور چڑھے ہوئے بوٹ کون اتارے ۔"

۔۔ شاہ کج کلاہ ایران کی نسبت بیان ہے کہ آپ کو بلیوں سے بڑا شوق ہے۔ چنانچہ اس وقت ۵۰ بلیاں آپ کے محل میں پلی ہوئی ہیں ہر بلی کے لیے ایک ایک محل اور جداگانہ ملازم مقرر ہیں۔ جب شاہ کج کلاہ کہیں سوار ہوتے ہیں تو یہ بلیاں بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمرکاب ہوتی ہیں۔ میاں ان بلیوں کے ڈر سے روسی چوہے ادھر کا رخ کریں یا نہ کریں یہ اپنا اپنا شوق ہے

پنچ ۔ ۔۔ ترجمہ اردو مقامات مولانا روم "موسوم بہ مناقب العارفین" کے ابتدائی چار صفحوں مطبوعہ مطبع احمدی کا نمونہ کا تبصرہ

پنچ ۔ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام حیدر آباد قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں دہلی سے کہیں زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا اسکا عارضی دفتر یا شاخ چاہے حیدر آباد میں ہو یا اعظم گڈھ و علیگڑھ میں "۔ مولوی محمد علی ناظم ندوۃ العلما نے استعفے دیدیا۔ جہاں تک ہم نے اپنے ذہن میں اس کے لیے لوگوں کو منتخب کیا ان سب میں مولوی حبیب الرحمٰن رئیس بھیکم پور کو ہی زیادہ موزوں پایا"

اعیان دولت : شاد عظیم آبادی کا "قطعۂ تہنیت بحضور قدم شہنشاہ جہاں پناہ" اس کے بعض اشعار یہ ہیں :

فطرت کی طرح مستقل احکام ہیں تیرے — بعد از خدا فقط ترا دنیا میں اعتبار
جب غیر سلطنت میں رعایا تری گئی — حکام واں کے کیے اس آنے کو افتخار
جس ملک میں قدم ترے حکام کا گیا — موسم بدل کے فصل خزاں کو کیا بہار
جب سے ہوئی حکومت برطانیہ یہاں — تب سے ہے یہ خاندان مرا معتقد و شکر گزار
جد تھا اور وردی والا اسم میرا — مشہور صوبہ داروں میں گزرا وہ ذی وقار
میں خود رہا ہمیشہ دعا خواں و مدح گو — چالیس سال سے ہے مرا شاعری کا شعار
اس بار کیوں نصیب نہ جاگیں مرے کہو — میں بھی نگاہ لطف و کرم کا امیدوار

در بار تاجپوشی "۴۹ بندوں کا مسدس، پہلا، آخری اور درمیان کا ایک بند درج ذیل ہے :

گھڑیوں سے انتظار ہے ساقی کہاں ہے آج — مے دے کہ بزم تہنیت مہرباں ہے آج
کیوں نغمہ سنج شاد فصیح اللساں ہے آج — اسّی برس کی عمر میں پھر نوجواں ہے آج
ہم دوستوں کے دل کو خوشی کیوں نہ ہو نصیب — مسرور عام خلق ہے کیسی یہ عید ہے
اگلوں کو خواب میں تھا یہ قانون کب نصیب — چاہے تو بادشاہ پہ نالش کرے غریب
دیباد کی ہیں عدل کی وہ صورتیں عجیب — سب مٹ گئے جو ظلم کے اشکال تھے مہیب
اب انکا کچھ اثر نہیں بد ہیں کہ نیک ہیں — اس سلطنت میں حاکم و محکوم ایک ہیں
جب تک ہماری قوم کو ہو حق پر اعتماد — جب تک گناہ ہے ستم فتنہ و فساد
جب تک کہ دور امن میں مستور ہے جہاد — اقوام مختلف میں ہے جب تک کہ اتحاد
یارب حیات شاہ کی بے حد دراز ہو — تا حشر حکمراں یہی اس کا رساز ہو

بہار

بہار کی جلد ۱ (۲ شمارے) پیش نظر ہے اور یہ کتب خانہ اصلاح دسنہ کی ملک ہے

شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۰۰ء) کے سرورق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک پنچ کا ضمیمہ تھا اور اسی کے مطبع میں چھپتا تھا۔ سید ضیاء الرحمٰن حفیظ[۱] کے سرپرست خاص، ابوالخیر خیر اس کے مدیر اور عابد حسین عابد اس کے مہتمم تھے۔ ص ۱ سے ص ۲۲ تک (۱) فروز، عبدالرزاق (۲) تسلیم لکھنوی (۳) شمشاد لکھنوی (۴) مبارک شاگرد داغ (۵) نصیر عظیم آبادی شاگرد داغ (۶) واجب سید واجب حسین شاگرد شاد (۷) حیات شاگرد حفیظ عظیم آبادی (۹) ظفر رسولپوری (۱۰) سید عبدالمجید مست[۲] بنارسی وغیرہ کے طرحی اشعار ہیں۔ اس کے بعد نثر بعنوان "نیچرل شاعری" (ص ۲۳ تا ۲۸) ہے جو بیتاب کی لکھی ہوئی ہے۔ ص ۲۸ میں بعنوان "ضمیمہ بہار" مرقوم ہے کہ:

"گلدستہ بہار کے جاری کرنے کی وجہ ہم اخبار ... میں لکھ چکے ہیں کہ ... اکثر حضرات عاشقانہ غزلیں بھیجا کرتے تھے جن کو ہم اخبار کے مذاق کے خلاف ہونے کی وجہ سے شائع نہ کر سکتے تھے اور بعض حضرات ایسی عالمانہ ... تحریر بھیجنے کے عادی تھے کہ وہ ... اخبار کے کام کی نہ ہوتی تھی مگر مجبوراً شائع ہی کرنا پڑتی تھی۔ جب ہم نے شعرا کی دلچسپی کے لیے یہ بہار نکالا تو نثر نگار حضرات کو موقع نہ دینا انصاف سے بعید تھا اس لیے ہم نے اس میں ضمیمہ بہار کا اضافہ کر دیا ہے۔ دونوں حصے ایک ایک جزو میں ہوگا۔ ہر ایک ... کی قیمت سالانہ ۲ ہوگی اور دونوں ... کے خریداروں سے صرف دو روپے لیے جائیں گے۔"

دوسرے شمارے میں (اس کا اور اس کے بعد کے شماروں کا سرورق غائب ہے) جن شعرا کا کلام ہے ان میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) خیال، ریاض حسن خاں (۲) سعادت[۳]، سعادت علی، مالک اسٹیٹ خیر پور (۳) شمشاد، محمد علی شاگرد شاد عظیم آبادی

۱۔ نثر شاگرد شاد کہتے تھے کہ فروز کو شاد سے تلمذ تھا۔ ۲۔ مست بہار کے شمارہ ۲ متعلق ص ۱ کے بموجب امیر کے شاگرد تھے۔

۳۔ سعادت کا دیوان بڑے اہتمام سے چھپا تھا اور یہ داغ کے شاگرد مشہور تھے۔ خیال مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ حفیظ جونپوری ان کے یہاں نوکر تھے اور یہ دیوان بڑی حد تک انہیں کا ہے۔ کچھ غزلیں اور دوسروں کی بھی حفیظ نے دیوان سعادت میں درج کر دی تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے [illegible] کے علاوہ خط سے موجود دیوان میں تلمذ ثبت ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ دوسرے [illegible] کلام اصلاح کے لیے بھیجتے ہوں۔ خیال مرحوم ان کے [illegible] تھے۔ ان کی شہادت آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ حفیظ کا تعلق بہار شمارہ ۱۲ میں ہے۔ سعادت سے کوئی [illegible] حفیظ کو ہے آپ [illegible] استاد [illegible]

(۱۴) احقر اشا رحمت اللہ مظفر پوری (۱۵) شیدا فرزند علی خاں شاگرد شاد (۱۶) شمیم نواب محمد حسن خاں شاگرد شاد۔ ۱؎ سے معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی خاں اس کے سرپرست ہوگئے تھے۔ دامن بہار میں لامذ تامذ ۲؎ نیچرل شاعری کی قسط دوم ہے۔

شمارہ ۳ کے نئے شعرا میں (۱۷) نسیم ہتسوی قابل ذکر ہیں۔ دامن بہار میں نیچرل شاعری کی قسط سوم اور انجمن مؤید اللسان کی روداد ہے۔ یہ انجمن جس کے مقصد سے یہ گلدستہ نکالا گیا تھا، اس کی تکمیل و تحصیل کے لیے قائم ہوئی تھی، اور یہ گلدستہ اسی انجمن کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ اس کے صدر شاد، نائب صدر حفیظ، معتمد بیتاب اور نائب معتمد نورالرحمٰن نذر پسر حفیظ تھے۔ ارکان میں حسب ذیل اصحاب بھی تھے: خدا بخش خاں، امداد امام اثر، نواب سکندر نواز جنگ، خورشید نواب خورشید، سرفراز حسین سرفراز، سید ضمیر الدین احمد۔

شمارہ ۴ کے نئے شعرا میں (۱۸) اثر (۱۹) احقر، بشارت حسین (۲۰) آزاد، فضل حق (۲۱) امداد، سید عنایت حسین شاگرد شاد، (۲۲) حفیظ جونپوری (۲۳) شاد (۲۴) شائق شاگرد شاد (۲۵) شہرت خواجہ محمد شاہ (۲۶) عشرتی، سید مہدی حسن عرف بادشاہ نواب (۲۷) فہیم، حکیم فہیم الدین ۳؎ (۲۸) مفتوں، سید مرتضیٰ نواب شاگرد شاد (۲۹) موج، شاگرد شاد (۳۰) خبیر (۳۱) صبغت، صبغت اللہ عظیم آبادی قابل ذکر ہیں۔ دامن بہار میں نیچرل شاعری کی قسط ۴ ہے۔ ۴؎ میں امداد کا ایک قطعہ۔

شمارہ ۵ کے نئے شعرا حسب ذیل قابل ذکر ہیں (۳۲) آزاد، رائے بھوانی پرشاد شاگرد شاد (۳۳) جلیل مانکپوری (۳۴) رنجور عظیم آبادی (۳۵) قیس مظفر پوری (۳۶) مائل سید وصی الحسن دعر سپوری ابن کامل مرحوم۔

دامن بہار میں نیچرل شاعری کی قسط ۵ اور زبان خلق کے تحت بہار سے متعلق ریاض الاخبار، زیر اعظم، پیسہ اخبار، الپنچ بہار کی رائیں ہیں۔

شمارہ ۶ کا آغاز "بہار" سے ہوا ہے، جس میں حسب ذیل مضامین نشر ہیں۔

یورپ کے "فلسفۂ جدیدہ پر ایک سرسری نظر" (از سید ضمیر الدین احمد مرحوم) یہ شمارہ ۲ تک چلا گیا ہے اور اس ناممکن نہیں ہوسکا، ضبط اوقات (از سید فہیم الدین احمد مرحوم)، رباعیات شاد، اور رباعیات ابر، حمید آزاد ان کے یہ دامن بہار کے تحت طرحی اشعار ہیں۔ نئے قابل ذکر شاعروں میں (۳۷) صفدر نواب شاگرد ہیں۔

شمارہ ۷ میں زیر عنوان "بہار" مضمون سید ضمیر الدین احمد مرحوم، رباعیات شاد اور قطعہ شاہ محمد مہدی مہدی۔ اس شمارے میں بھی دامن بہار کے تحت طرحی کلام ہے۔ قابل ذکر شاعر (۳۸) امداد، سید امداد حسین شاگرد شاد۔ آخر میں زبان خلق کے تحت بہار سے متعلق بہار ہیرالڈ، بہار ٹائمس اور اردوئے معلی کی رائیں۔ موخر الذکر میں ہے: خوشی کی بات ہے کہ "بہار" بعض واقفان سخن

۱؎ سعادت بہار کے شمارہ ۲ میں نسیم کا یہ مقطع ملتا ہے۔ کہتے ہیں سب ہم کو وفا شناس نسیم — سعادت علی خاں کے نوکر ہیں ہم

۲؎ گلدستہ کے دوسرے شماروں میں فہیم الدین احمد بھی ملتا ہے۔ یہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم کے بھائی تھے۔

۳؎ ممکن ہے کہ عنایت حسین، امداد ہوں، دونام میں عنایت کی جگہ امداد غلطی سے لکھ دیا گیا ہو۔

سا کلام بھی نظر سے گزرتا ہے۔ اثر نے بعض اشعار بہت خوب لکھے ہیں۔

عدو کے آتے ہی بارونق سدھاری تیری محفل کی — معاذ اللہ انسان کا قدم ایسا بھی ہوتا ہے

ہمیں بزم عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے — کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

مصرع ثانی کی بندش نہایت دلچسپ ہے۔

ذکر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا — محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

یہ شعر جان غزل ہے قسم کا قافیہ اس سے بہتر نظم نہیں ہوسکتا۔ آزاد کی غزل بھی خوب ہے۔

گھر جس میں بنا لیا تھا تو نے — اے دوست ہیں وہ مقام سونے

لائے کو کہاں نصیب وہ داغ — جو دل کو دیے ہیں آرزو نے

جاری ہو وہ لین دین ساقی — ساغر۔ لیا دیا سبو نے

شاد کی غزل کے بھی بعض اشعار اپنی خوبی کے بنا پر لاجواب ہیں۔

وقار کچھ تو شہیدوں میں رکھ دے تو میرا — دکھا نہ غیر کو کھولا ہوا لہو میرا

ایک لفظ وقار نے اس شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

وہ ذبح کر کے مری لاش سے یہ کہتے ہیں — تڑپ رہا ہے کہ منہ دیکھتا ہے تو میرا

راقم۔۔ اس شعر کو کمال سخن سنجی کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ سمجھتا ہے کیونکہ اس میں رنگینی بیان مساوگی الفاظ لطافت مضمون۔ نو انداز (کذا) غرضکہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

خزاں سے پھول یہ کہتے ہیں کیا خطا تیری — کہ خود بخود اڑ گئی کھیل رنگ و بو میرا

غضب کیا وہی حسرت نے بزم ساقی میں — خموش ہو گیا منہ دیکھ کر سبو میرا

مضمون خوب ہے اور نہایت مناسب الفاظ میں ادا ہوا ہے۔ اثر حسرت سے سبو کی خموشی کا احساس دلاویز اثر رکھتا اس قسم کی شاعری کا نام شاعری ہے "

شمارہ ۵ کا آغاز آمد بہار سے ہوتا ہے۔ پہلا مضمون سید ضمیر الدین احمد مرحوم کا ہے اور اس کے بعد محمد خلیل خلیل ایم۔ اے شاگرد شاد کی ایک نظم تمنا طوطی کہاں ہے جس کے ساتھ اس کے متعلق بیتاب کی نثر ہے اس کے بعد آزاد کی "چولی پر تتلی" اور مدیر کا نثر بعنوان انتظار ہے۔ دامن بہار میں جو ص ۴۲ پر ختم ہوتا ہے طرحی اور غیر طرحی غزلیں ہیں قابل ذکر شعرا ہیں (۳۹) کمال سید شاہ محمد کمال عظیم آبادی شاگرد وحید (۴۰) مبارک سید شاہ مبارک حسین شاگرد وحید (۴۱) وحشت

رضا علی وحشتؔ میں زبان خلق کے تحت ریاض الاخبار اور مخزن کی رائیں ہیں۔ دونوں نے اس کی تعریف کی ہے۔

شمارہ ۹ میں پہلے دامن بہار کے تحت طرحی غزلیں ہیں۔ قابل ذکر شاعر حزیںؔ، شاہ محمد حسین ہیں۔ بہار کے تحت حسب ذیل چیزیں ہیں۔ شکایت (نثر از مدیر)، جگنو (نظم از آزاد) رباعیات آزاد۔

شمارہ ۱۰ بہار میں حسب ذیل چیزیں ہیں۔ ضمیر الدین احمد، موجودات عالم کسی قانون معین کے پابند ہیں۔ ان میں بحث و نعاق کی غائبانہ مداخلتیں ہوا کرتی ہیں اور کیا قوانین معینہ کے ماننے سے خدا کا وجود باطل ہوتا ہے (از ضمیر الدین احمد) گلدستہ بہار (مسدس از آزاد) دامن بہار میں طرحی غزلیں۔

شمارہ ۱۱ بہار: مضمون سید ضمیر الدین احمد سید عبد المجید مست کا ایک مضمون جس کی ابتدا میں یہ شعر ہے۔

زدور چرخ گرداں ہرچہ دیدم ستم در یں عالم | مپرس از من کہ سر چشمِ لال میسازد زبانم را

دامن بہار: صرف طرحی غزلیں۔

شمارہ ۱۲: دامن بہار میں طرحی غزلیں، نئے شاعر قابل ذکر (۲۴) باقرؔ، شاگرد وحیدؔ، (۲۳) جوشؔ، (۲) ابو البرکات نیوی شاگرد داغؔ، مضمون سید ضمیر الدین احمد بے زبانوں کی صدا (نظم از آزاد)

مختلف شعرا کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

۱	وفا بھی کریں گر جفا کرنے والے	دعا ہی کریں گے دعا کرنے والے
۱۲	حسیں اور مہر و وفا کرنے والے	جفا کرنے والے وفا کرنے والے
۱۰	کدھر اٹھ گئے بزم سے آج ساقی	ترے دور کی ابتدا کرنے والے
۱۹	باغ میں تم آئے کلیاں کھل گئیں	عندلیبوں کی مرادیں مل گئیں
۱	عشق کا دم نہ بھریں کوئی ہوس ہم نہ کریں	اپنے جینے پہ جو مرنے کو مقدم نہ کریں
۲۳	سحر ہوئی کہ ادھر یاد آئی منزل کی	کسی نے آج تک ایسی نہیں کہی دل کی
	خدا ٹھکانے لگائے حباب کی محنت	ہوا ابھار کے لے تو چلی ہے ساحل کی
۲۲	اڑتی ہوئی جو فصل خزاں کی خبر آئی	بلبل کی گلستاں میں رو رو ہیں آنکھ بھر آئی
۲۰	آج ساقی جو بن آئے وہ میخانے میں	رند بدمست ہوئے ایک ہی پیمانے میں
	پی کے یہ گرنے لگا جب تو ترا نام لیا	اس قدر ہوش تھا باقی ترے دیوانے میں
۱۱	لے چکے دل جان بھی لے لیجئے	اس کے آگے تو خدا کا نام ہے

۲۰ گواہ پاکدامنی ہے تیرا صاف جل جانا — سبب اے شمع پھر کیا ہے پتنگے کا تڑپ جانے کا

۸ بہار آئی کب آئی کیا خبر ہے یاں تو اے ہمدم — قفس ہے اور ہم ہیں اور غم ہے آشیانے کا

۲۶ ستانے میں کوئی حسرت نہ رہ جائے مٹانے کا — مٹانے میں کوئی پہلو نہ رہ جائے ستانے کا

۲۰ چمن میں کیوں نہ میں حیراں ہوں اے گل تیری قسمت پر — ادھر شبنم کا رونا اور ہنس دینا ادھر تیرا

۸ بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے — سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

۳ سہرے ہی عشق سے دنیا میں ہے شہرت ان کی — مجھ کو وہ ہاتھ سے کھو دیں تو یہ غفلت ان کی

۲۹ وہ جو اس جشن خسروی میں نہیں — کتنے ساماں ہیں دل کسی میں نہیں

جب وہی بزم مے کشی میں نہیں — جی میں جو کچھ تھا اب وہ جی میں نہیں

کیسی بدلی ہے اس چمن کی ہوا — پھول میں رنگ و بو کلی میں نہیں

ل مجھے یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر سہالے سرور جہاں آبادی کے مجموعۂ اشعار "جام سرور" کے دیباچے میں یہ شعر سرور سے منسوب کیا گیا ہے۔

لسان الصدق

لسان الصدق[1] کے شمارۂ اوّلیں (نومبر ۱۹۰۳ء) کے سرورق میں (جو رسالے کے مقررہ ۸ اوراق میں شامل نہیں) عبارات مندرج ہیں۔

قیمت عام سالانہ عہ مع محصول ڈاک] دارالسلطنت کلکتہ کا ماہوار رسالہ] لسان الصدق] ایڈیٹر ابوالکلام محی الدین احمد آزاد کا جس میں] علمی اخلاقی تاریخی، سائنٹفک مضامین کے علاوہ ذیل کے ۴ مقصدوں پر مضامین شائع ہوتے ہیں] لسان الصدق کے خاص مسائل اربعہ] سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی] ترقی اُردو یعنی اُردو زبان کی علمی ترقی کی کوشش کرنی] تنقید یعنی ملک کی مشہور تصنیفوں اور اخباروں پر منصفانہ ریویو کرنا] علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگالہ میں اشاعت] نمبر ۱۴ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ] ہادی پریس کلکتہ ۱۳۲۱ھ پریس روڈ میں چھپا۔ سرورق کے صفحہ کی پشت پر عبدالرحمن امرتسری کی کتابوں کا اشتہار ہے۔

رسالہ کا آغاز جس تحریر سے ہوتا ہے اس کا کوئی عنوان نہیں۔ اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں: "الصدق ینجی والکذب یہلک" لسان الصدق کا دستور العمل ہے: اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچاتے اور راستی پر لاتے .. اس کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے .. سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے .. یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی سنائے گا .. جو تمہیں ناگوار معلوم ہوں گی ...

اس کے بعد مقاصد کی تشریح ہے۔ ذیل میں اس کی بعض عبارات اور اُس کے مطالب سے متعلق اشارات ہیں: واقفیت کے ساتھ جب میل جول بڑھا تو خود مفتوح قوم کے رسم و رواج نے فاتح قوم کے اعتدال پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ ادھر اکبر اعظم کی غیر متعصبیت یہاں تک ترقی کی کہ ہندوؤں کے رسم و رواج پر مائل ہو کر اکثر مسلمانوں میں غیر محسوس طور پر مسلمان پیدا کر دیا ... مدت سے توجہات پیدا کر دیتے ہیں۔ اصلاح معاشرت کی بحث میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا خاص طور ذکر کیا ہے۔ ترقی اُردو کی بحث میں کانفرنس مذکور کے متعلق لکھا ہے کہ یہ رسالہ "ان تمام مقاصد کو عمل میں لائے گا جو ترقی اُردو کی انجمن قرار دے گی۔" تنقید کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے: "اُردو میں ہمیشہ ریویو کا ترجمہ تقریظ کیا گیا ہے۔ جس سے ریویو کا اصلی مفہوم ہی مفقود ہو گیا۔ (اس سلسلے میں غالب کی تقریظ، آئین اکبری مرتبہ سید احمد خان کا ذکر) ریویو کا اصلی ترجمہ ہماری زبان میں تنقید ہے

---

[1] لسان الصدق کے جن شماروں کا حال لکھا گیا ہے، وہ کتب خانہ الاصلاح دسنہ (ضلع پٹنہ) میں ہیں اور ادارۂ تحقیقات اُردو کی کوشش سے مجھے ملے ہیں۔ [2] مدیر نے بعد کے کسی شمارے میں حالات سازگار ہونے کی صورت میں ترمیم ضخامت کا وعدہ کیا ہے۔

بہتر نہیں ہو سکتا۔ " چوتھے حصے کی بحث میں بنگالے کے مسلمانوں کی پستی اور ہندوؤں کی ترقی کا ذکر کر کے لکھا ہے: " اس مجلے کے کسی جز
رسالے کا نمبر ہو یہ مرد تھا۔ ۔ مذاق کے داعی نے ... کی تھی۔ جس کی کو لسان الصدق نے عالم وجود میں قدم رکھتے ہی پورا کر دیا۔
دیکھو قطعہ تاریخ متعلق لسان الصدق، شیخ محمد عبداللہ کے سفر انگلستان کا ذکر۔ کلکتہ کے ایک تاجر نے اپنی بیٹی کے کان چھیدنے
کی رسم ادا کی اور اس موقع پر ۷۲ ہزار صرف کئے، اس پر اظہار افسوس۔ کلکتہ سے انگریزی اخبار " محمڈن اینڈ کیٹ " علامہ جلی کی
تجویز، انجمن ترقی اردو کی مدد کی درخواست (آٹھ آدمی کے ترکیب انتخاب تھا) " زیر تصنیف کتابیں " اس عنوان کے تحت شبلی کی تاریخ
علم الکلام جلد ۲ اور عبدالرزاق کی نظام الملک کے زیر تصنیف ہونے کا ذکر، اپنی بیماری کا بیان۔ حیات جاوید کے متعلق اشتہار
دفتر لسان الصدق میں برائے فروخت موجود ہے۔ ہم عصروں سے مبادلے میں اخبارات و رسائل بھیجنے، مضمون نگاروں سے قلمی
اعانت اور مصنفین سے اپنی کتابوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی کی استدعا، معاصرین سے ریویو کی درخواست کی ہے اور
مصنفین سے لسان الصدق میں ریویو کے لئے کتابیں مانگی ہیں۔

شمارہ دسمبر: " رسالہ آرٹ دے ستلی، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی " " اسلام اور رسوم " اس عنوان میں ضمناً والدہ
محمد سلیمان بیرسٹر کی تصنیف کردہ کتاب اصلاح النسا کے مطالعے کی سفارش، " شادی " - سید احمد حسن اب کہاں ہیں؟
مدیر تحفۂ احمدیہ کا جواب، بانی احسن الاخبار کلکتہ کی وفات ۱۳۲۱ھ۔

شمارہ جنوری ۱۹۰۴ء - مدیر نے انڈین نیشنل کانگریس کے متعلق لکھا ہے۔

باخبر ناظرین واقف ہوں گے کہ جب ہندوؤں نے نیشنل کانگریس قائم کی تھی تو سر سید مرحوم کی مخالفت کی وجہ اور جو
سب سے زیادہ اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا نام گورنمنٹ کو سخت دھوکا دینے والا ہے۔ اس کا نام دعوی کرتا ہے کہ یہ ایک قومی کانگریس
ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس میں کوئی مسلمان شریک نہیں ہے۔ پس نیشنل کا لفظ بالکل حالت کے خلاف ہے۔ ہندو کہتے تھے کہ اس
دیسی عیسائی شامل ہیں اور مسلمان بھی اس کے ہمدرد ہیں۔ سر سید کو مسلمانوں کا بہانا ... تھا۔ انہوں نے پبلک اور گورنمنٹ پر
ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج تیرہ چودہ برس کے بعد خود کانگریس کے ہمدردوں کو اس کا احساس ہوا
ہے۔ اس کے سرگرم ممبر صاحب مدد کے گانے لگے ہیں۔ جو لفظ سر سید کی زبان پر جاری تھا اور جس کا کانگریس کی زبانی دشمن قوم
مت کا خطاب انہیں دیا تھا۔ چنانچہ کانگریس کے سرگرم کارکن مسٹر ... ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ کانگریس میں نیشنل کی ترکیب
فضول پائی جاتی ہے۔ دیسی عیسائیوں نے بھی اس سے کنارہ کشی کر لی ہے، مسلمانوں کی مدد بھی برائے نام ہے پھر اس کانگریس کو قومی
کیا معنی رکھتا ہے؟ "

" قومی اعتراض " حالی اور ان کی حیات سعدی اور مسدس کی ستائش کرنے کے بعد حیات جاوید کی نسبت لکھا ہے کہ " اگرچہ
شبلی ... کی ہے۔ جو اس محنت اور جانفشانی سے تصنیف ہو کر انگریزی تصانیف کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے! اس
تحریک کی تائید کو قوم کی طرف سے حالی کو " اعتراض " بخشا جائے۔

شمارہ فروری۔ انجمن ترقی اردو کا ذکر، ریاض الاخبار میں حالی کی شاعری پر جو اعتراضات ہیں منقول ہیں۔ محمد شمس
کا ذکر، انجمن کی رپورٹ جو شملہ ایجوکیشنل کانفرنس میں پیش کی تھی: " انتقاد حیات جاوید " اس کتاب پر مختلف اصحاب نے
کئے تھے ان کا جواب۔ مدیر اس کتاب کے بڑے مداح ہیں۔ اور یہ مضمون شمارہ اپریل میں تمام ہوا ہے۔ اس مہینے کی ضخامت ۳۲ ص
شمارہ مارچ: " ریاض الاخبار اور لسان الصدق " .... " ہماری بیجا خاموشی نے قوم کو صرف تعریف و ستائش کا ...

۱۔ اس خیال کے چند شمارے بابت ۱۳۲۲ھ ادارۂ تحقیقات اردو کی تلاش کے لئے گئے ہیں۔ ...
لسان الصدق کے مضامین ملتے ہیں۔

بتایا ہے کہ اگر مترجم کو تنقیدی نظر سے کام لیا جاتا ہے تو وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت ہمیں مل گیا۔ اور ریاض الاخبار کا فاضل ایڈیٹر ہماری طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ مدیر مخزن کے ریاض الاخبار میں فرماتے ہیں کہ "ہمارے سابقہ اب ایڈیٹر مخزن اور فاضل علامہ شرطانی (معترضین حالی) پر بھی گالی گلوچ کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ شاید یہ طریقہ استدلال جدید تہذیب و شائستگی کے اصول کا مسلم مسئلہ ہے کہ جواب دینے کے وقت بھٹیاروں کی زبان استعمال کی جائے۔ ایسے لوگوں کو مخاطب کرنا ہم مناسب نہیں خیال کرتے۔ اس سے ہم... ایڈیٹر مخزن کو صلاح دیتے ہیں کہ وہ لسان الصدق کلکتہ کا جواب دینے سے خاموشی اختیار کریں گے۔ ویسے بتایا ہے کہ لسان الصدق میں مخزن کی تنقید کے متعلق اظہار رائے سے پیشتر مدیر مخزن سے اس کی اجازت لی گئی تھی۔

ادبی خبریں۔ حالی تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھ رہے ہیں۔ دو تہائی مسودہ ان کا مکمل ہو جائے گا۔ شبلی میر انیس کے کلام پر مفصل ریویو لکھ رہے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی، میر خسرو کے حالات لکھ رہے ہیں۔ عبداللہ عمادی معارف ابن قتیبہ کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے تحت حسب ذیل کتابیں طبع ہو رہی ہیں۔ کارلائل کے ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ کا ترجمہ از عبدالغفور شہباز، اسٹوری آف چائنا کا ترجمہ از محمد اکبر، تاریخ دانشوران کا ترجمہ از ریاض الحسن (صحیح ریاض حسن، جن کا تخلص خیال تھا) ایکسرسائز کے ثبوت کا ترجمہ از عبدالقادر — اس شمارہ میں ابو الحفوظ کی ایک کتاب متعلق خیام کا اشتہار ہے۔ "اردو کا دکھڑا اور مجالہ از آزاد" اسی شمارہ میں تقریباً کلکتہ کے حسب ذیل اخبارات کے نام آتے ہیں... دارالسلطنت، جنرل، گوہر آصفی، المصباح، الوشتہ، لیڈر، گزٹ، بسمل، ناشر، احسن الاخبار۔

شمارۂ اپریل۔ حیات جاوید کا ریویو۔ حالی نے اردو کو جدید بایوگرافی سے آشنا کیا۔ حیات سعدی اور یادگار غالب تصنیف کے بعد لکھا ہے کہ حیات جاوید ان سے زیادہ قابل قدر ہے۔ چراغ دہلی از حیرت دہلوی اور تحفۃ المنشی کا ریویو ہے۔ ایسکی لفظ سے متعلق معاصرین کی باتیں۔

شمارہ مئی: "انجمن حمایت اسلام لاہور" اس سال کے جلسے میں مدیر لسان الصدق نے شرکت کی تھی۔ شمارہ جون و جولائی سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کچھ دنوں سے بیمار ہو گئے تھے۔

نوائے کیمبرج

"نوائے کیمبرج" کا نام میں نے ہندوستان میں سنا تھا۔ اپریل [illegible] میں کیمبرج پہنچا تو اس کا ایک شمارہ نظر سے گزرا اور خبر ملی کہ ایک شمارہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ لیکن اردو ایسوسی ایشن جس نے اسے جاری کیا تھا اس وقت [illegible] میرے دوران قیام میں نہ نوائے کیمبرج کا کوئی شمارہ نکلا اور نہ انجمن مذکور کا کوئی جلسہ ہوا۔ وہ شمارہ جو میں نے کیمبرج میں دیکھا تھا اس کا شمارہ دوم تھا اور اس وقت میری نظر سے نہیں گزرا۔ غالباً جس شمارے کے حوالے پر [illegible] ہے وہ شمارہ [illegible] [illegible] میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوائے کیمبرج "اردو [illegible] طلبہ کیمبرج یونیورسٹی کا ادبی رسالہ" [illegible] میں نکلتا تھا اور اس کی ترتیب کا کام انجمن اردو کیمبرج یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ انجام دیتی تھی۔ یہ مطبع [illegible] لکھنؤ میں چھپتا تھا اور ہندوستان میں بذریعہ نواب نصیر حسین خاں خیال [illegible] شائع ہوتا تھا۔ انگلستان میں اس کے ملنے کا پتہ یہ تھا آنریری سکریٹری اردو ایسوسی ایشن پوسٹ آفس [illegible] کیمبرج۔

[illegible] میں فہرست مضامین اور [illegible] [illegible] میں [illegible] کچھ اس کی طرف سے "ضروری اطلاع"۔ [illegible] سے پتا چلتا ہے کہ ایسوسی ایشن کا نام انجمن اردو تھا اور [illegible] کے سکریٹری تھے [illegible] کے نام کے بعد [illegible] بھی مرقوم ہے۔

[illegible] رسالے کے نام کے بعد [illegible] [illegible] [illegible] کیمبرج [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے "افتتاحیہ" شروع [illegible] [illegible] پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایڈیٹر کا فرض سب سے اہم فریضہ ہے [illegible] کہ اہانت کے فرائض کون انجام دیتا [illegible] [illegible] افتتاحیہ [illegible] سے قریباً [illegible] برس قبل کا ذکر [illegible] کیمبرج میں اہل ہند کی ایک جماعت تھی جس نے پہلی مرتبہ [illegible] اردو کا مشاعرہ پہلی مرتبہ منعقد کیا تھا جس میں متعدد مقامات انگلستان کے لوگ شریک ہوئے تھے۔ اس بحث کا ابتدا [illegible] [illegible] ہوئی تھی۔ لیکن یہ بحث بالکل [illegible] کی تھی اور بعض لوگ [illegible] تک محدود تھی۔ دو برس تک اس کی سرگرمیاں قائم رہیں [illegible] کہ [illegible] ختم ہو گئی اس کا وجود فنا ہو گیا۔ اس کے بعد [illegible] آکسفورڈ میں اردو کا مذاق رکھنے والے کچھ لوگ آ گئے جنھوں نے اپنی [illegible] [illegible] کا [illegible] قبول کیا اور اس محفل کو دو برس تک [illegible] چلاتے رہے۔ اس کے بعد لندن کی باری آئی۔ لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج [illegible] اور لندن کوئی مرکزی مشاعرہ [illegible] نہیں۔ مفصل تاریخ مذاق اردو کی مہیا کرنا ناممکن ہے۔ مگر [illegible] کہ اس کے بعد مستقل مذاق اگر کہیں باقی رہا تو ہر جگہ بالکل [illegible] البتہ جنگ سے چند سال پیشتر کچھ دنوں کے لیے آکسفورڈ دوبارہ شعر و سخن کا مرکز ہو گیا تھا جس میں سنا گیا ہے کہ ایک صاحب [illegible] اردو میں بھی [illegible] اور کچھ مذاقیہ اشعار [illegible] تھے جنگ کے [illegible] میں انگلستان میں اردو کا مرکز اور شاعری کا [illegible] [illegible]

[illegible] سال میں [illegible] ایک صاحب [illegible] کا [illegible] میں کیمبرج [illegible] [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کنڈن ہاؤس کیمبرج محکمۂ تعلیم ہوٹل خانوں کا بہت شاندار تھا
[illegible] یہی وقت ہے جبکہ اپنا گھر بنالیں۔ دوسرا گوشہ اکسفورڈ
۔ اکتوبر میں ہندکا اردو تحریک کی عمر تقریباً ایک سال کی ہوچکی
[illegible] خود گزشتہ موسم بہار ۔ [illegible] تو انجمن [illegible]
[illegible] پاکر لیں اور اس ترتیب پسندی کا نتیجہ آپ انجمن
[illegible] رہے ہیں جس کا یہ سالانہ جلسہ کیمبرج کا [illegible]
[illegible] کا نام " مجلس [illegible] کے ہاتھ انجمن [illegible]
[illegible] اس مجلس کے اجلاس کے کیمبرج کے پروگرام میں ایک مرتبہ
[illegible] اور اسکو نرم [illegible] کے ساتھ کم از کم ایک تحریر
[illegible] کی مشق ہو جایا کرے گی۔

[illegible] کیمبرج میں مسٹر عبدالماجد بی اے کا مضمون ہے [illegible]
[illegible] میں [illegible] دیکھنے کے لیے جہاں انہوں نے خود دیکھا تھا اس
[illegible] ذیل ہے اس نصف صدی کی مدت میں جب
[illegible] کیمبرج یونیورسٹی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں انہوں
[illegible] مفید خدمت سرانجام دی ہے تو وہ یہ ہے کہ اس پر ہے
[illegible] کا تعمیر کیا ہے۔ ہندوستان میں آج ہندو مسلمان
[illegible] کے لئے طرح طرح کے معاہدے کر رہے ہیں لیکن درحقیقت
[illegible] معاہدے کی ضرورت نہیں، دونوں قوموں کے درمیان
[illegible] کا حقیقی معاہدہ آج سے صدیوں پیشتر ہو چکا ہے جو موجود
[illegible] چند ناموں سے بدرجہا زائد پائیدار ہے، اور جس پر
وقت یا [illegible] ضروریات و حالات کی نہیں بلکہ باہمی [illegible]
[illegible] کی دریا ثبت ہیں۔ اس دستاویز محبت کا نام
ن ہے ..

[illegible] سال سے سر [illegible] کی کوشش
[illegible] لیکن ہندوستان کی ایک قدرتی [illegible]
[illegible] کا منشور [illegible] جا نہ نکالا جاتا ہے
[illegible] وسعت خیال کا مضمون ہے [illegible]

۔ سہ [illegible] کی شام کو۔ انجمن کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس لیے اسی دن ۔ لندن
سے [illegible] کر روانہ ہوئے۔ یوسف [illegible] ہمسفر ہوگئے۔ حافظ [illegible]
کا لطف آیا۔ [illegible] موٹر کار میں بیٹھے۔ لندن سے کیمبرج ۵۵ میل سے
زیادہ نہیں مگر موٹر جب شہر سے چلی۔۔ چلو تو ڈرائیوری کیا [illegible] اس
مختصر سفر میں گزر سکتے ہیں۔ ہمارے یوسف کو ولایت بہت پسند ہے مگر
یہاں کا سفر ناپسند۔ چار بجے کے بعد کیمبرج پہنچے دوستوں کے ساتھ ٹیکسی
میں بیٹھے۔ ریل کی طرح اس سواری میں بھی ایسے اسراف پر پچھتاوا
ہوا۔ ہم لوگ چراغوں کی روشنی میں۔۔ [illegible] ہوٹل پہنچے ۔۔ [illegible] پانی
سے [illegible] کے ساتھ منزل پر پہنچ جانے کا اندازہ لگائیے [illegible]
ہوٹلوں میں ہمارے [illegible]۔ ہوٹلوں کی طرح کمروں کے ساتھ غسل خانے
نہیں ہوتے ۔۔ [illegible] کے جلسہ میں [illegible] کے سالانہ [illegible]
جس میں مہمانان خصوصی ڈاکٹر رضا توفیق پاشا، عبداللہ یوسف علی
[illegible] مسٹر [illegible] اور [illegible] تھے، [illegible] کے صدر [illegible]
نائب صدر ڈاکٹر [illegible] (مصری) اور سکریٹری مسٹر [illegible] تھے اس
موقع پر خیال ہے اردو میں تقریر کی تھی،

دوسرے دن ۔ ۱۱ بجے [illegible] کے گھر میں صحبت تھی۔ تجویز
ہوئی کہ مسٹر عبداللہ (یوسف علی) میر مشاعرہ قرار پائیں، مگر وہ [illegible]
اس وقت میزبان کیونکر بن جاتے؟ .. اپنی کرسی مجھکو عنایت کردی!
صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا کچھ دیر انتظار رہا اور ان کی طرح
[illegible] غزل کا [illegible] اشتیاق تھا۔ [illegible] اور مسٹر [illegible]

[illegible]

تھے۔ ہما عزیزہ صاحبہ نے جو فون کیا ہے۔ افسوس کہ صورت وقت پر
دیکھ سکے۔ یہ سچ ہے۔ گزشتہ شب کے ڈنر سے پہلے زیادہ مزید دو
کا گھر تھوڑی ہی دیر سے ملتا ہے تو [illegible] چوہان سے [illegible]
سے [illegible] اپنا سمدرس پڑھ کر [illegible] کا محبت سے
پلٹ پھیر دیا۔ اور اس نے شاعروں کے ذریعے [illegible] کیمبرج کے [illegible]
[illegible] ۔۔۔ ۱۵ کا بجلی کے بجرے کا نام کیمبرج ہے۔۔ [illegible]
[illegible] ہے اور اس کے بیچ میں ننگے سروں کی بہار [illegible]
ہیں۔ زیادہ تر طلبا اپنے کالج کے کمروں میں رہتے ہیں۔ مگر جو [illegible]
ہر [illegible] وہاں کے طالب علم کالج کے [illegible] دوسرے مکانوں میں
آباد کرتے ہیں۔ ایسے طالب علم ان گھروں میں [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ۔۔ ہر کالج کا [illegible]
وہاں ہوتا ہے۔ بعض لڑکے پانچ دن [illegible] کرتے ہیں۔ مگر [illegible] پر سب مل کر
ساتھ کھانا وہیں کھاتے ہیں۔ [illegible] کو اس کے بعد گھر سے نکلنے کی
اجازت نہیں۔ یونیورسٹی کے منتخب۔ کبھی [illegible]
[illegible] اور لڑکی کو [illegible] جرمانہ لیتے ہیں۔ جو صاحب [illegible]
[illegible] اور [illegible] کے چوک میں [illegible]
[illegible] کیمبرج کی سی تعلیم گاہ نہیں ہے اور اس کے [illegible]

انگریز (ریز یونیورسٹی) وغیرہ کو تیز رنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر یہ خوش قسمت
[illegible] اور ماجد کیمبرج میں اس طرح بند ہو گئے اور [illegible]
رستہ بھول گئے۔ [illegible] اس کے بعد ایک خط ملنے کا ذکر ہے کہ [illegible]
پر اس کے بھیجنے والے کا نام [illegible] میں چھپا ہوا تھا اور جس میں [illegible]
کا وقت بتایا گیا تھا [illegible] اس کے بعد [illegible] کا حال اور [illegible] کا
پہنچنے کی کیفیت۔۔۔

• بائیں [illegible] قدیم ہندوستانی دستکاری [illegible]
[illegible] خط نستعلیق میں [illegible] ملا۔ [illegible]
گیا۔ اندر سے آواز آئی [illegible] جواب۔ [illegible]
تشریف رکھئے۔ [illegible] بسم اللہ اندر گئے تو [illegible]
طرف [illegible] بے ترتیب کتابوں اور [illegible] ایک طرف
آتش دان روشن، اس کے قریب [illegible] اور [illegible] کر بیٹھ گئے اور
کرنے کو [illegible] آگے بڑھا۔ [illegible] کرتے وقت یہ
دیکھا [illegible] جس کی جوانی [illegible] مسکراہٹ دل کھینچتی تھی اور
ان کی نظر [illegible] تھی۔۔ [illegible]
کر کے مسکرایا اور ایک [illegible] کی طرف اشارہ کیا " [illegible]
[illegible] کے پاس بیٹھو ، دیکھا تو ہمارے [illegible] اور [illegible]
ہیں۔۔ [illegible] فارسی کا بھی مذاق رکھتے ہیں [illegible]
[illegible] سے خود [illegible]
[illegible] ۔ ایران کا ذکر
وہاں کے سفر کا حال، فارسی ادبیات، [illegible]
[illegible] کا تذکرہ ، اور اس کا موجودہ حالت پر افسوس [illegible]
" [illegible] "

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہ ملک شدہ وسعت، باتوں میں دیر ہوگئی۔ ہم لوگ اس وقت پہنچے
ں میں در ہو گئے۔۔ رخصت طلب ہوئی آداب رخصت کے مطابق تہذیب
مطابق رہا۔ سب کا اور پھر بیٹا کا وعدہ کر کے ختم ہو کر تا دروازہ
یا۔ اور سب کو رخصت کیا۔ خدا حافظ، خدا حافظ، خدا حافظ، فی امان اللہ۔

لیت اور مذہب۔ مطہر شبیر حسین زیدی کا مقالہ۔ (ملاحظہ ۲ تا ۱ ملک)

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کبھی پرانی اور بوسیدہ طرز زندگی
بنیادیں گرا کر انسان پر نئی معاشرت و سیاست کی شاندار عمارتیں تعمیر کی
ہیں تو نئے حالات میں تغیرات اور انسان نے اپنے ساتھ بہت سی غلطیاں
مقاصد بھی سامنے آ کر رکھے ہیں۔ بیسویں صدی کا آغاز مشرق کی تاریخ
بہت بڑی اہمیت کا آغاز ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ سوتے ہوؤں
کروٹ لی۔ مصریوں کا لباس کہنہ اتار گیا اور تاریخ نے نیا ورق پلٹا۔
ہندوستان بھی جذبات و خیالات کے اس انقلاب اور ہلچل سے متاثر ہو
رہ سکا اور بجاست مشرق کے سپوتوں نے اس نئے پیغام پر صدائے
بلند کی۔۔ مسلمانوں کے تعلیمی اور تہذیبی عزائم نئے اور دریا سے
ت میں محبت وطن کی لہریں اٹھنے لگیں۔ موجودہ زمانے میں ملک کے
لیڈر اس بات کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے
مختلف فرقوں اور ملتوں کو رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے ایک متحد
مستحکم بنا دیں۔ یہ بجائے خود ایک قابل قدر اور اعلیٰ مقصد تھا
مگر انسان اکثر اوقات کسی خاص نقطۂ خیال کا اس قدر گرویدہ ہو جاتا
ہے اور اس کی قدر و قیمت کا اس درجہ مبالغہ کرتا ہے کہ وہ اور چیزوں
کی ضرورت اور اہمیت کو خواہ وہ اس سے زیادہ گراں قدر۔۔ ہوں یکسر
فراموش کر دیتا ہے۔ اس کے بعد انقلاب فرانس کا ذکر ہے کہ
کس طرح حالات ذیل ملک کے تمام اہل قلم اور باخیال مذہب کے خلاف
حامی کر رہے تھے اور والٹیئر نے تو انجیل تک کو نشانۂ ملامت و اعتراض
بنا لیا تھا۔ جب انقلاب شروع ہوا تو مذہب کی دیواریں تک ہل
گئیں اور لوگوں نے نہ صرف مذہبی بدعتوں کو خیر باد کہا بلکہ خود مذہب
کو بھی ٹھکرا دیا۔ فلسفے کے پرستاروں نے اخلاق کی بنیادیں کمزور کر کے
مختلف تغیروں اور اصولوں کے غیر کو بے قدر بنا کر اور انسان کے
پامال رہنے والے جذبات کو فرائض کے ان قاعدوں کا جو صدیوں
کے دوران میں جزو فطرت بن گئے تھے بدل بنا کر فرانسیسی سوسائٹی کی
تباہی اور بد اطواریوں کی رفتار کو تیز کر دیا۔۔۔ اس مادیت اور
حسن پرستی کا جو نتیجہ ہوا وہ انقلاب فرانس کی تاریخ میں خاص دلچسپی
رکھتا ہے۔

آج ہندوستان میں بھی اسی قسم کا خطرہ ہمارے پیش نظر ہے
اور تعلیم یافتہ نوجوان مذہب سے متنفر ہوتے چلے ہیں۔ اصل مگر
سوال یہ ہے کہ آخر مذہب ہمارے لئے کون سی خاص خدمت
انجام دیتا ہے؟ مذہبی تنگ نظریاں ترقی کے رستے میں مسلسل حائل
رہی ہیں اور مذہبی تفرقوں نے ادنےٰ ادنےٰ باتوں پر کشت و خون
کے میدان گرم کر دئے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب پرستی وطن
پرستی کی دشمن ہے اور لہٰذا ہم سب ہندوستانی پہلے ہیں اور ہندو
یا مسلمان بعد میں۔۔ یہ خیالات بہت کچھ صداقت کے ساتھ ساتھ
ایک زبردست غلطی پر مبنی ہیں۔ اگر یہ زاویۂ نگاہ مذہبی تعصب
کے برخلاف اظہار نفرت اور اس سے بالا رہنے کی ہدایت کرتا ہے
تو ہمیں اس کی صداقت ماننے میں کوئی تامل نہیں۔ مگر یہ اس حد سے
بہت آگے نکل کر ایک قومی خطرے کی صورت پیدا کرتا ہے جب کہ مذہب کو
ثانوی حیثیت دے کر سیاست کو اس سے بلند تر قرار دیتا ہے۔
قومیت محض سیاسی بنیاد پر کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ میزینی۔ جس کی
تمام زندگی اپنے ملک کے لئے ایک طویل قربانی تھی۔ ہمیشہ اس
بات پر زور دیتا ہے کہ "خدا کو ماننا اور اس پر بھروسہ کرنے کے
بغیر سیاست مضبوط۔۔ بنیادوں پر ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔۔ ہم

ے اور مقالہ میں کیمبرج سے فارغ ہوئے۔ زمانہ کیمبرج کے اس مقالے
ں۔ کیمبرج میں میری نظر سے گزرا تھا۔ ان کا ایک مضمون جمالیات پر ہے۔
: ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ حیثیت مشیر ... اور آج کل ... ... کے
اس چاسر ہیں

اس نے حکومت خود اختیاری کے طالب ہیں کہ ہندوستان ہندوستانیوں
کے لئے ہونا چاہیے۔۔ ملک کی اعلیٰ ملازمتیں وزارت، تجارت، انتظام، تعلیم
اور دیگر مختلف چیزیں ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ یہ تو
خیال بالکل درست ہے۔۔ لیکن۔ لالچ اور حصول منفعت پر مبنی ہے
سوراج ملنے کے بعد بھی اگر یہی جذبہ باقی رہا تو خدمت قوم کے بجائے
لوگ نفس پرستی کریں گے لہٰذا ملک کے لئے فائدہ مند وہ زاویۂ خیال
ہے جو مخروطی ہمارے قربانی اور ایثار نفس، محبت اور بہادری، نیکی
اور پاکیزگی کا سبق سکھا سکے صرف مذہب ہی ایک ایسا محرک ہوتا ہے
جو بنی نوع انسان کی تعداد غالب کو ایسے مقاصد عالی اور رضا اطاعت پیکرہ
سے پُر کر سکتی ہے۔ حقیقی اور سچا مذہب ہمارے اتحاد اور ترقی میں کسی
طرح مانع نہ ہوگا۔ بلکہ ان کے حصول کا تنہا مکمل اور قوی ذریعہ ہوگا۔
۔ مذہب کا مقدس اور مگر ان پایہ نام ہرگز اس تعلیم پر صادق نہیں آ سکتا
جو حب وطن جیسے پاکیزہ جذبے کی منکر ہو۔ آج ہندوستان کو جوش
ملا ہے۔ وہ یہ نہیں کہ مذہب کو ثانوی حیثیت دے کر قومیت کو اعلیٰ
سے اعلیٰ بنا دیا جائے۔ بلکہ مذہبی جذبات و خیالات کو اس طرح
پھیلایا جائے کہ قومیت جزو مذہب ہی بن جائے۔ ہندوستان کو کم مذہب
کی ضرورت نہیں بلکہ زیادہ روشن خیال اور وسیع النظر مذہب کی
آج ایسی ضرورت ہے۔ یہ جو یورپ کی تاریخ میں ریفارمیشن
(اصلاح مذہب) کے نام سے یاد کی جاتی ہے

.. ہندوستان کے بہت سے آزاد خیال اشخاص کا یہ عقیدہ ہے
کہ تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ایک ہی ہے۔۔ سب کی تعلیم یہ ہے
کہ دنیاوی زندگی اور خوش حالی انسانی حیات کا مقصود آخری نہیں
.. اس زندگی کے بعد اور زندگیاں آئیں گی جبکہ ہمارے افعال و
اعمال کی جزا و سزا ملے گی مختلف روحانی پیشواؤں نے۔۔ اپنی
قوم کی ضروریات وقت کے مطابق مختلف طریقہ ہائے عبادت
تعلیم کئے۔ لیکن اصل اور بنیادی تعلیم ایک ہی تھی یہ امر تسلیم کر
لے جانے کے بعد کیا وجہ ہے کہ ہم مختلف مذہبوں اور فرقوں کے پیرو رہے رہیں

اور ایک نئے عالمگیر مذہب کے متعلق کوشش: جس کا مذہبی فرقوں
منافرتوں کا امکان ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے؟ میں بلحاظ خود ان
لوگوں میں سے ہوں جن کے نزدیک یہ خیال صرف ایک خواب خوشگوار
نہیں بلکہ امکان انسانی ہے۔ جن کا خیال رکھنے سے کہ بہت کچھ ترقی
لگی ہے میں جو تمام مذاہب کی جان ہے۔ دھرموں کے جھگڑے مٹائے جا
سکتے ہیں۔ مگر۔ بنی نوع انسان کی کثرت غالب کے لئے یہ منزل ابھی
بہت دور ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح طریقہ یہ نہ ہوگا کہ موجودہ
دھرموں کو ٹھکرا دیا جائے۔ جب تک کہ ایک عالی شان محل نہ بن
جائے۔ یہ جھونپڑے کو ہٹا دینا دھوپ اور بارش میں مرنا ہوگا۔
انسانی شخصیت میں مذہبی جذبات کی بنیاد صرف انفرادی عقل پر نہیں
مذہب سیکڑوں برس کی پرانی روایات، ابتدائے عمر کی تعلیم اور
زندگی بھر کی عادات سے جزو فطرت بن جاتا ہے۔ مذہب روایات
روابط سے مل کر قوم میں اور انتظام کے قیام کے لئے باعث امداد ہوتے
ہیں کہ خواہ ہم ان کے اثرات سے ظاہراً واقف ہوں لیکن مذہبی تعلیم
اور وابستگیاں انسانی فطرت میں مختلف طریقے سے پیوست ہو جاتی
ہیں۔ رسومات و روایات اگرچہ کسی مذہب کی جان نہیں ہوتیں تاہم وہ
حیات انسانی کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ فطرت انسانی میں منطقی امر
کا استعداد جو جذبے کو مسرت سے بھلا دے۔ جیسے نا قابل برداشت
ہوتا ہے۔ وہ تصور ماحصل سے میں نے "نئے عالمگیر مذہب" کے نام سے
پکارا ہے، روایات، ابتدائی تعلیم کے اثرات اور عادت کے اثرات
سے خالی ہے، اس میں کوئی ایسی مرکز کا اور عظیم الشان شخصیت
نہیں جس کا ذکر چاروں طرف پھیلا اور انسانی جذبے کو متاثر کرے
جو جیسا کہ حضرت عیسیٰ۔ حضرت محمد۔ کرشن جی اور مہاتما بدھ
جی اور ... مہاتما تھے ہیں ہر مذہب میں ایک ذہنی تصور ہے۔
تاہم مختلف رسومات ہوتی ہیں اس سے تصور کا ماحصل رسومات سے
خالی ہے جو رواج کے لئے مستحسن تو بلحاظ سے بہر حال ضرور ملتا ہے
.. اس کے علاوہ ایک اور سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی:

کہ رسالہ کا ایک باقاعدہ تصور ہے، جس کی حیثیت ادعا، خیالات و جذبات کا نمیرہ اس کا جزو [illegible] کی تاریخ کرتا ہے۔ اور جب کہ افراد کے درمیان تفرقات کا کوئی ان کی گہنت اور ان کے علوم و اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں کوئی شخص یا گروہ جب تک ہی میں تنہا ایک ہی اعتقاد نہیں کر سکتا۔ گو اس امر کے یا امر ثبت کے حق میں قوی دلائل بھی کیوں نہ ہوں کیونکہ وہ ذہنی صدی لوگوں کے خیالات و احساسات کا دارومدار ان کے گرد و پیش پر ہوتا ہے اور تعمیر صرف ایک قدم بقدم اور ارتقائی تدریج کی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر افراد کے تفرقات میں مذہب کام کرتا رہا ہے تو اسے ایک تحت نکال رہا تنگی اور بے قاعدگی کا باعث ہوگا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ مذہب اور عقل و دلیل زمانہ کی خصوصیات اور انسانی تقاضے کے، اور اس سے آزاد ہو جائے۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ انسانی اخلاق و فرائض کے تصورات یا سوشل عقائد کا سرچشمہ آسمان ہے اور ہمارے دست تمیز کی نا پہنچ سے دور۔ جس بات پر میں زور دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ انفرادیت اور انفرادی تصورات کو آزادی ملنی چاہیے۔ مگر اسے انتہائی حد تک پہنچا دینا خود سائنس کے لئے مضر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ قوم کی زندگی میں ہمیں اس تاریخی تسلسل کو فراموش نہ کرنا چاہیے جس کی تشریح میں پیشتر کر چکا ہوں۔ ان دونوں وجوہات کی بنا پر موجودہ مذاہب کی بنیادوں کو کھود کر ہمارے لئے نقصان کا باعث ہوگا۔ اس کے بجائے یہ مناسب ہوگا کہ ان مذاہب کی حدود میں رہ کر ہم مختلف تنگ نظریوں اور امتیازی عقیدوں کو رفتہ رفتہ زائل کریں یہ طرز عمل ایک طرف تو قومیت اور وطن پرستی کے راستے میں سد راہ نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف ہمیں خانقاہی و روحانی مانع کے اثرات سے بچائے گا۔ اور آخر کار ایک مدبر ہم خوش گوار تعلق کے ساتھ معلوم کریں گے کہ اسلام کے منبع اور مبارک طرز عمل کے ذریعہ قوموں کی [illegible] حالت میں لے جاتے ہیں جس کے گیت اقبال لکھ رہے ہیں۔"

ایڈیٹر نے اس مقالے کے آخری حصے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا [illegible] سے ہوتا ہے۔ "ہمیں امید ہے کہ وقت منتشر [illegible] کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ اقبال بھی اسی "عالمگیر مذہب" کی حمایت اپنے گیت تیار کر رہے ہیں جس کی طرف اس مضمون میں اس قدر وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسرار خودی کے ترجمہ کا ذکر ہے اور یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کے حصے کا ترجمہ آئندہ اشاعت میں درج ہوگا۔ ایڈیٹر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اقبال کا عالمگیر مذہب نیا نہیں، بلکہ بہت پرانا ہے۔ ایڈیٹر کے نزدیک مضمون نگار کے مذہب کو بھی لفظ کے وسیع مفہوم میں نیا کہنا غالباً بہت درست۔ ہم کیونکہ بعینہ یہی خیالات ہندوستان کے ان عظیم الشان مدرسین اخلاق کی تعلیمات میں ہم پاتے ہیں جن کی کمی ہندوؤں اور مسلمانوں [illegible] کسی دنیا کی قوم میں نہیں رہی۔ مہاتما گوتم بدھ سے لے کر بابا کبیر داس اور گرو نانک تک ہم ان تعلیمات کو کسی نہ کسی صورت میں ضرور پاتے ہیں۔"

"انڈین کانفرنس ۱۹۲۲ء" کی روداد رسالے کے "نامہ نگار" نام نہیں رسالے کے [illegible] تا [illegible] میں درج ہوئی ہے۔ خلاصہ: تیسرا سالانہ جلسہ [illegible] میں ۲۵ مارچ کو شروع ہوا اور پہلی اپریل کو ختم ہوا حاضرین کی تعداد ۱۲۰ سے زیادہ تھی کانفرنس کے سکریٹری [illegible] آرد شیر کو تھے۔ کانفرنس میں ہر شام تقریریں ہوتی تھیں یا تحریریں سنائی جاتی تھیں ان پر عموماً مباحثہ ہوا کرتا، مقررین میں محمد علی شرکہ [illegible] کے سوا کسی کا نام درج نہیں [illegible] کے کھانے کے بعد [illegible] ہوا کرتے" یا [illegible] کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے باہر نکل جاتے، شام کو پھر تقریریں یا بحث مرہ۔ اردو، فارسی، ہندی، گجراتی اور انگریزی نظموں سے حاضرین لطف اندوز ہوتے تھے محمد علی [illegible] اور مسز سروجنی نائیڈو کا انگریزی کلام تو [illegible] فضلی پارلیمنٹ بھی ہوئی اور ٹیگور کا ڈرامہ "چترا" کھیلا گیا جس میں مسٹر [illegible] الرحیم [illegible] کیمبرج [illegible] آئندہ کانفرنس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

کیمبرج کی رفتار۔ میکلمس ٹرم ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۳

ہندوستانی طلبہ کی تعداد ۱۲۰ سے اوپر ہے اور کچھ طلبہ [illegible] کر [illegible] ۵۰ سے زیادہ ہیں۔ ہندوستانیوں کو اس سال دو خطاب میں [illegible]

دشواریاں پیش [illegible] سے زیادہ واضح نہ ہو سکے اور کچھ جنگ [illegible] کی مخالفت
کا منظر رہا۔ ہندوستانیوں کی تعداد اب دو سالوں میں بھی معین ہو گئی ہے
جن میں اب تک بہت اضافہ نہیں ہوا۔ اس سال پی ایچ ڈی کی ڈگری کا نام
بدل گیا ہے بعض لوگ اور D.Phil [illegible] امید [illegible] کی
[illegible] ہو گیا ہے کہ ہر جگہ ہندوستان میں یہ ڈگری بالکل [illegible]
گئی ہے۔ کیمبرج کے اخباروں میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ایک [illegible]
شخص ایک پروفیسر کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب مجھ کو پی ایچ
ڈی کی ضرورت ہے [illegible] اسپیڈ فسر
[illegible] ہوتا ہے [illegible] کیمبرج کے [illegible]
کی ترقی کے لئے ۵۰ ہزار پونڈ دئے۔ اس مہینے کہ آکسفورڈ میں اس
سال سے لڑکیاں بھی ڈگریاں لیا کریں گی۔ امید ہوتی تھی کہ کیمبرج
میں بھی یہ [illegible] منظور ہو گی [illegible]
سے بھی [illegible] پر ووٹ لئے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا [illegible] کے
موافق [illegible] تقریباً دو ہزار طلبہ نے ووٹ نہیں دیا
کیمبرج [illegible] ہندوستانی [illegible] مسٹر سینگ نے
ہندوستانی طلبہ کی [illegible] کمیٹی سے استعفا دے دیا" موصوف کے
[illegible] جیسے [illegible] لوگوں پر ہیں، ان کا ذکر اب حسرت سے [illegible]
[illegible] مسٹر سینگ کو ایک مستقل [illegible] ہے
[illegible] ہندوستانیوں کے لئے سب سے [illegible]
[illegible] کچھ [illegible] سید حسین اور سلیمان [illegible] کی
[illegible] تقریر [illegible] میں آئی تھیں۔ اس [illegible]
تقریر [illegible] آکسفورڈ کیمبرج [illegible]
[illegible] آکسفورڈ [illegible] عبدالرحمن صدیقی آئے تھے۔ اس [illegible]
[illegible] ان کا [illegible] تقریر [illegible]
[illegible] ہندوستانیوں [illegible]
[illegible] اس سال [illegible]
[illegible]

مخصوص نہیں۔ لیکن اب تک اتفاق سے اس میں زیادہ تر ہندوستانی
ہی ممبر تھے۔ اس سال ایک ہندو [illegible] ممبر ہوئے اور سرگرمی سے
شریک رہے۔ اور ایک انگریز نے [illegible] رکن بنائی گئیں۔ مسلم
[illegible] اس کی طرف سے [illegible]
[illegible] منعقد ہوئی۔ انجمن اردو کا چوتھا سالانہ مشاعرہ [illegible]
[illegible] کے مکان پر ہوا۔ پچھلی ٹرم [illegible]
[illegible] کے مکان میں ہوا تھا۔ سلیمان [illegible] تھے۔ اس بار
[illegible] نے صدارت کی۔ آکسفورڈ [illegible]
تھے [illegible] آفتاب احمد خاں [illegible] کر دے۔ [illegible]
[illegible] ہم ہونے کا [illegible]
[illegible] ہوگی۔ کیمبرج میں [illegible] پیدا ہوئی ہے کہ
[illegible] جنگ کے [illegible] کو [illegible]
کے ساتھ [illegible]۔ گذشتہ سال کی طرح [illegible] جنگ کی نوبت تو
نہیں آئی۔ [illegible] میں [illegible]
[illegible] نقصان [illegible]
[illegible] بیسیوں [illegible]
میں آگ لگا کر [illegible] جس سے [illegible]
پہنچا [illegible] کی شکل بنا کر [illegible]
[illegible] رقص کر رہی تھی [illegible] ایک [illegible] نازل ہوگئی۔ اب یہ
مشہور ہو گیا ہے کہ [illegible] خطرناک ہو سکتے ہیں۔
جواہر [illegible] کے تحت [illegible]
[illegible] ہیں جو [illegible]

[illegible] کو [illegible] سے
[illegible] ہے
[illegible]
[illegible]

[illegible] ایک ایک [illegible]

ملاحظہ، سنّ محمد حسن کی غزل، آمنہ شیروں کی غزل، میکال کی غزل

اس کو ضد سے آپ کا تیرا اس کا بیاں ہو گیا
ہم جو سنے کا فر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا
پاک دامانی کی شہرت حضرت یوسف کی تھی
یا کہیں پھر کس کی خاطر چاک داماں ہو گیا
لے لیا دل چھین کے سب کچھ اب کہاں ہوش و حواس
اس کا شاکر میں آ کر حیران ہو گیا
سوزشِ زخم جگر کی کوئی لذت کیا کہے
کس مزے میں شور تیرے خاک نمکداں ہو گیا
ماہ سے دل لے کے وہ نازک سو گئے جب سے گئے
خاطرِ تمکیں ہمدو کی ایسا ہم بھی مہماں ہو گیا
بعد مدت آج وہ آ اور یہ منکی غزل
خاطر جن سے آخر میں مسلماں ہو گیا
پیکر میں اس کی حسرت کھینچ لائی ہے خیال
انجمن آج کی شب تو بھی مہماں ہو گیا

مولوی محمد اشرف ہی سر بلند جنگ (کرا شنہ کا پا کیمبرج) کے دو شعر۔ مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تخلص تھا۔ شیخ محمد صلاح الدین پیدا جہد (کیمبرج) کے چار شعر۔ مسٹر محمد اظہار الرحیم انصاری ... کا (بی اے کیمبرج کا پا کیمبرج) کی دو غزلیں۔ مقطع میں شیدا تخلص ہے

دو اس کے مطلع یہ ہیں

صنم خرکت سے کہاں ایسی کدورت یار ہے
دل میں درد آ یا تو رہ گئی لب پر فریاد
آہ دیدیا رکی تھ بسی ہو کر رہ گئی
مسماں پھر گردشِ تقدیر ہو کر رہ گئی

مولوی محمد حسین الدین انصاری ہد ... سینٹ کیمبرج کا پا کیمبرج کی۔

تیرا ان کی غزل کے دو شعر ہیں

وہ جو زخمی مری جانی تو ... کی بات
چشم ساقی گر نہ پیمانہ چھلکانے کی بات

کیا شکوہ زمانہ کا ہمدم کا آئندہ ہے پھر جسے میں
آئینے نے کیا سکھا دی تم کو اتراتے کی بات
ذوقِ نظارہ زباں کو کیا کر رہ بتلائے کچھ
یاد ہیں ان نظروں کو جب وہ دل کے آ جانے کی بات
میں تو کہتا ہوں نہیں رکھے اگر تیکھے کہو
بات تو ہے میرے دل کی لیکن شرمانے کی بات
کاش سودائی کے دیتا تو میں خوش ہوں اگر
اور مری ہر بات سمجھی جائے دیوانے کی بات

"محبوبہ" کے عنوان سے اظہار الرحیم شیدا کی دو مختصر نظمیں ہر مہینے موقع پر مصنف سے ردکنگ میں سنائے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

حُسن کے شیدا منزلِ جاناں میں جب پہلا عید
نذر کرنے کے لئے ہم لے کے چاند دل گئے
واہ رے قسمت کہ وہ با ایں ہمہ انکارِ وصل
کھلکھلا کے مسکرائے، پھر گلے سے مل گئے

"مکتوبِ دوست" کے عنوان سے آخر کے دو شعر جن میں اختصار ملحوظ کے اظہارِ جذبات کی طرف ہے

پیغامِ دوست ہے یہ کاغذ کے پیرہن میں
یا ہے رواں ولولہ قرطاس کے وطن میں
تجدید و حس اس سے احساس پھر اس سے
دھوپ چھاؤں دیکھو کاغذ کے پیرہن میں
مقدری راز کا ہو لب میں جیسے ساکت
تانے بنے ہیں گویا اس کاغذ کی بدن میں
تار نگہ نے مل کر شریانِ قلب سے اک
غزل کیا ہے پیدا اس سے نا جان و تن میں
ہاں اے ستم شعار اے کس چیز کے اتر سے
بجلی سی دوڑتی ہے کچھ نور کے بدن میں

"ذوقِ کلام" کے عنوان سے شیخ محمد صلاح الدین جہد تخلص جیتا

کے لیے مختلف زمینوں میں مشغلہ۔ ان میں سے بعض یہ ہیں ۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ہیں اور
[illegible] ہو گیا
[illegible] ہیں
[illegible]
[illegible] ہوں۔

نوائے کیمبرج کے بارے میں قاضی صاحب کی تحریر کا عکس

"نوائے کیمبرج" کا نام میں نے ہندوستان میں سنا تھا۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں کیمبرج پہنچا تو اس کا شمارۂ دوم نظر سے گزرا، اور خبر ملی کہ ایک شمارہ جلد شائع ہوگا، لیکن وہ انجمن جس کی طرف سے جاری کیا تھا، اس وقت برائے نام زندہ تھی اور میرے زمانۂ اقامت انگلستان (۶ برس) میں نہ اس کا کوئی شمارہ نکلا اور نہ انجمن کا کوئی جلسہ ہوا۔ شمارہ دوم تو اس وقت پیش نظر نہیں، شمارہ اول جو جناب شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی کی مہربانی سے زیر مطالعہ ہے، اور یہ مقالہ اسی پر مبنی ہے۔

شمارۂ اول "لنٹ ٹرم جنوری فروری مارچ ۱۹۲۱ء" کا ہے اور دہلی میں چھپا ہے۔ رسالہ ہر ٹرم میں ایک بار نکلنا قرار پایا تھا، اور اس کی ترتیب کا کام "انجمن اردو کیمبرج یونیورسٹی" (اسی کو کسی جگہ اردو ایسوسی ایشن بھی کہا ہے) کی مجلس انتظامیہ انجام دیتی تھی۔ یہ [illegible] مطبع نسفور میں چھپا تھا، ہندوستان میں بذریعہ "نواب نصیر حسین خاں خیال" شائع ہوتا تھا اور انگلستان میں آنریری سکریٹری اردو ایسوسی ایشن پوسٹ آفس ٹرس کیمبرج سے مل سکتا تھا۔ سکریٹری جیون لال کپور بی اے تھے یہ سب ص ۱ تا ۳ سے معلوم ہوتا ہے۔

"افتتاحیہ" ص ۳ تا ۹ میں ہے اور اڈیٹر کی طرف سے لیکن صراحتہً یہ مرقوم نہیں کہ ادارت کے فرائض کون انجام دیتا تھا۔ اقتباسات افتتاحیہ:

ب

مقدمہ معدن تجربات

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

مقدمۂ معدن تجربات

تصنیف: ١٧٥٦ء

مؤلفہ

حکیم محمد مہدی اکبرآبادی

مرتبہ

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

(۱)

> خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار) کی تحریک پر مخطوطات طب کے موضوع پر پہلا جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار منعقد ہوا تو راقم نے "علامہ کلکشن" کے اردو طبی مخطوطات کی ایک مشرح فہرست مرتب کر کے خدا بخش لائبریری پٹنہ کو ارسال کی اور یہ فہرست "الآثار کتابات طب اسلامی در برصغیر" شائع ہوئی جسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے
>
> "علامہ کلکشن" کے مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے کے علاوہ راقم نے ایک تحقیقی مقالہ مخطوطہ "معدن تجربات" سے متعلق پہلے جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار میں پیش کیا جو مارچ ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوا تھا چونکہ "معدن تجربات" مولوی حکیم محمد مہدی اکبر آبادی کا ایک مخطوطہ دو جلدوں میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی موجود تھا۔ لہٰذا مناسب [illegible] خواہش [illegible] کہ اگر اس مخطوطہ کو مقدمہ کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کر دیا جائے تو علماء و اطباء کے لیے مفید ہوگا اور وہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے چنانچہ راقم نے یہ کام شروع کر دیا
>
> [illegible] "[illegible]" [illegible] کے مطالعہ کے علاوہ "معدن تجربات" کے ان مخطوطات کا مطالعہ بھی کیا جو [illegible] حیدرآباد، علامہ کلکشن علی گڑھ اور علی گڑھ میں موجود ہیں اور ان میں اس نسخہ [illegible] مخطوطہ علامہ کلکشن علی گڑھ مقابلتاً زیادہ مکمل ہے
>
> مؤلف

اکثر مورخین کا خیال ہے کہ قدیم مصریوں نے قدیم بابلیوں سے علم طب کو سیکھا تھا۔ لندن کے عجائب خانہ میں جو اسوریہ کی ایک خشتی کتاب نامکمل حالت میں موجود ہے اور جو حضرت مسیحؑ سے سات سو سال پہلے لکھی ہوئی ہے، وہ ایک قدیم اور مستند کتاب کی نقل ہے جسے بواسیہ کے طبی مدرسہ کے بعض اساتذہ نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب

میں اکثر طویل نسخہ جات اور ایک ایک مرض کے کئی کئی نسخے لکھے ہوئے ہیں۔

مصر میں بعض قدیم شہروں کے دبے ہوئے کھنڈرات کو کھودنے سے ایسے کتبات و تحریرات برآمد ہوئی ہیں جن سے کہ قدیم مصریوں کے تمدن و معاشرت اور علمی ترقی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ قدیم مصری پے پی رس (PAPYRUS) بردی کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب جس میں سے کہ ایبرس پے پی رس جو کہ حضرت مسیح سے ایک ہزار چھ سو برس پہلے کی لکھی ہوئی ایک نہایت اہم اور مکمل تحریر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قدیم مصری بادشاہ آتھوسس نے جس کا زمانہ خیالات حضرت مسیح سے چھ ہزار سال قبل کا ہے۔ علم طب پر ایک کتاب لکھی تھی۔

عربوں نے فن دواسازی کو فروغ دینے کے ساتھ مختلف قرابادینات بھی تالیف کیں۔ اولاً یوحنا ابن ماسویہ نے ایک جامع قرابادین مرتب کی جس کو سرکاری حیثیت حاصل رہی۔ عباسی دور کے آغاز میں سابور بن سہل متوفی ۲۲۵ ہجری نے ایک مفصل قرابادین لکھی جو سترہ ابواب پر مشتمل تھی۔ صدیوں تک شفا خانوں میں اس کے مطابق عمل جاری رہا۔ ابوالعباس ابن رومیہ کا رسالہ "مقالہ فی ترکیب الادویہ" محمد بن خجندی کی کتاب "اصول التراکیب فی الطب" نجیب الدین سمرقندی کی کتاب "اصول ترکیب الادویہ" (جس کا نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، اور جو ۱۲۲۵ھ کا مکتوبہ ہے) ذکریا رازی کی کتاب "الصیدلہ" اور کتاب الجامع کی پانچویں جلد جو علم الصیدلہ سے متعلق ہے، حنین ابن اسحٰق کی کتاب "اسرار الادویۃ المرکبہ" جو اس سلسلہ کی ایک قدیم تصنیف ہے، ابوالنصر عطار اسرائیلی کی کتاب "منہاج الدکان و دستور الاعیان فی اعمال و ترکیب الادویہ" فن دواسازی پر ایک منتخب کتاب ہے۔

فارسی زبان میں بھی علم الصیدلہ پر متعدد کتب تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، مثلاً ترکیب الادویہ مصنفہ مہدی حسن بن مولوی محمود عالم (جس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم لائبریری میں موجود ہے) تراکیب ادویہ مولفہ مہدی حسن بن محمد حسن بشارت خاں (جس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہے) احمد شاہ کے عہد میں حکیم سکندر نے دو سو پچاس کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک قرابادین موسومہ بہ قرابادین سکندری تالیف کی جس میں تراکیب ادویہ کو بھی واضح طور سے بیان کیا۔ آیورویدک سے کشتوں کے علاوہ بعض مرکبات بھی اخذ کئے، مثلاً مالتی بسنت، یوگراج گوگل، معجون سپاری پاک، نوشدارو وغیرہ۔

مذکورہ مختصر تمہید کے بعد علم الصیدلہ و قرابادین کا تاریخی جائزہ حسب ذیل ہے۔

علم الصیدلہ

صیدلہ یا فارمیسی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ ایک فن اور سائنس ہے ان دواؤں کی تیاری اور تقسیم کرنے کا جو تقدم بالحفظ و علاج امراض کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ابتداء علم طب ہی سے فن دوا سازی (PHARMACY) معالجہ سے متعلق رہا ہے۔

علم طب اور دوا سازی کے فن نے عہد جدید میں جو ترقی کی ہے اس کا اصل ماخذ قدیم یونانی اور مصری معالجین بقراط، دیسقوریدوس، جالینوس، رازی، جابر بن حیان اور ابن سینا وغیرہ کے علمی کارناموں میں پنہاں ہے۔ عصر حاضر کی اصطلاح فارمیسی یونانیوں نے قدیم مصریوں سے اخذ کی تھی جو لفظ " فارما" PHARMA کا استعمال دوائی تاثیر کا حوالہ دیتے وقت کیا کرتے تھے اور بمعنی " اعانت کرنے والی" سمجھتے تھے۔ یونانی فارماکی PHARMAKI کو دوا یا زہر سے منسوب کرتے تھے اور اس طرح دنیائے طب میں انگریزی میں فارمیسی PHARMACY کی اصطلاح رائج ہوئی۔

تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح قدیم مصری عطار یا دواساز متعدد لکڑی پتھر اور شیشہ سے بنے آلات دواسازی کا استعمال کرتے تھے اور مختلف طریق دواسازی مثلاً جوشاندے، عصارات، محلول، لعوق، مراہم، حبوب وغیرہ کے علم سے بخوبی واقف تھے۔ قدیم مصریوں کے دواء تیار کرنے کے طریقے عصر موجودہ کے طریقوں سے بڑی حد تک مطابقت رکھتے تھے۔ قدیم مصریوں نے اولاً لعوق 'لیڈ آکسائڈ' سے تیار کیا۔ ۔۔م حقنہ، خشخاش کے ڈوڈے (کوکنار) سے اور پہلی ڈوش ایک نباتی جوشاندے سے تیار کیا۔ وہ حلق اور ۔۔ن کے تعدیہ کی صورت میں لعوق اور غرغرے سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے بدن کی جلد کیلئے خوشبودار یا معطر مرہموں کا استعمال کیا۔ قدیم مصریوں نے اکثر معدنی، نباتاتی اور حیواتی دواؤں کا استعمال ۔۔۔ جو اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپی قرابادین میں شامل رہیں، اور عہد حاضر میں بھی عوامی معتقدات سے متعلق دواؤں FOLK MEDICINE کے طور پر مستعمل ہیں۔

قدیم یونانی معالجین خود اپنی ذاتی فارمیسی رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر بقراط (۴۶۰ - ۳۷۷ ق م) نے اپنی دوائیں خود تیار کیں اور یہ بجا طور سے کہا جا سکتا ہے کہ علم الصیدلہ کا آغاز بقراط ہی کے دور سے ہوا۔ وہ ان متعدد دواؤں کی تاثیرات سے واقف تھا جن کو آج ماڈرن ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں۔ اُس نے کوکنار سے حاصل شدہ افیون کا استعمال دافع وجع (درد دفع کرنے والی دوا) کی حیثیت سے کیا۔ مارفین جو افیون کا

جوہر ہے۔ آج بھی درد کو تسکین دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بقراط بعلاوہ ان سے بھی باخبر تھا جس سے بالشعناً اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی مقدار میں زہر ہلاہل ہے، لیکن اس کی قلیل مقدار سوئے معدی کی اصلاح میں بہت ہی موثر ثابت ہو سکتی ہے۔

بقراط کی تحریروں میں تقریباً چار سو مفرد اشیاء کا علم دوائی حیثیت کے ساتھ ملتا ہے۔ اس نے تکمید، پلٹس، مضمضہ، شیافات، فتائل، حبوب، ملوزات، مراہم، نشوقات، قطورات وغیرہ تیار کیے اور ان کو علاجاً امراض میں استعمال کرایا۔

عہد بقراط کے بعد پہلی صدی عیسوی میں علم الصیدلہ کے ایک اور اہم مصنف کورنیلیس سیلسس CORNELIUSCELSUS کا دور آیا۔ اس کا ایک نسخہ دانتوں کو سڑنے سے روکنے کے لیے سوری (SORY) نام سے معنون کیا گیا جو، تخم خشخاش، فلفل اور کاپر سلفیٹ کو اشق کے ساتھ شامل کر کے ایک ضماد کی صورت میں تیار کیا گیا تھا۔

۴۰۰ سے ۱۰۰۰ سال قبل مسیح اسکندریہ اور رومن دور میں بھی معالجین نے خیساندہ، جوشاندہ، مرہم، فرزجہ، سفوف، نسوار وغیرہ کا استعمال کیا تھا جو عہد حاضر میں بھی مستعمل ہیں۔

پہلی صدی عیسوی میں روم کا ایک مشہور یونانی معالج "دیسقوریدوس" تھا جو کئی صدیوں تک قرابادین PHARMACY اور صیدلہ MATERIA MEDICA پر مستند تسلیم کیا جاتا تھا۔ دیسقوریدوز کی کتاب الحشائش سترہویں صدی عیسوی تک یورپ میں جملہ قرابادینات کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی۔ اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے :

" ہمیں بخوبی معلوم ہونا چاہیے کہ سفید اور سیاہ خربق وغیرہ کی قوت کئی سال تک قائم رہتی ہے، اور دوسری دوائیں تین سال تک صحیح حالت میں رہتی ہیں۔ مثلاً وہ جڑی بوٹیاں جو شاخدار ہوتی ہیں جیسے اسطوخودوس، گل شبو، اث کیل، ثعلب مصری، افسنتین اور سنبولہ وغیرہ۔ ان کا ذخیرہ کرلینا چاہیے۔ جو جڑی بوٹیاں پھولدار اور تخم والی ہوں، ان کے پھول اور تخم پھول گرنے سے پہلے ذخیرہ کر لینا چاہیے۔ پھل جب پختہ ہو جائیں اور بیج جب خشک ہونا شروع ہو جائیں تو ان کے گرنے سے قبل انھیں حاصل کرلینا چاہیے۔ سرسبز بوٹیوں کا رس نکالنے کے لیے ان کو اس وقت حاصل کرنا چاہیے کہ جب ان میں کونپلیں پھوٹنا شروع ہو جائیں اور اسی طرح پتوں کا رس بھی تب

ہی نکالنا چاہئے لیکن افرازات حاصل کرنے کیلئے، نیم خشکی حالت میں تنے میں شگاف دینا چاہئے جڑوں کا ذخیرہ کرنے کیلئے، یا ان کے عصارات حاصل کرنے کیلئے اور ان کی چھال حاصل کرنے کیلئے اس وقت کا تعین کرنا چاہئے کہ جب پودے سے پتیاں جھڑنا شروع ہو جائیں تو جو صاف ہوں ان کو خشک مقام پر خشک کر لینا چاہئے، اور جن پر مٹی چپکی ہوئی ہو ان کو پانی سے دھونے کے بعد سکھانا چاہئے، پھول اور خوشبودار چیزیں لکڑی سے بنے خشک شدہ بکس میں رکھنی چاہئیں لیکن بعض عقاقیر ایسی ہیں جو نیم حالت میں رہتی ہیں اگر ان کو پتوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ تر دواؤں کی حفاظت کے لئے چاندی یا شیشہ یا سینگ کے برتن بہتر ہیں۔"

مذکورہ بیان دیسقوریدوس کے صحیح مشاہدہ اور اس کے وسیع مطالعہ کا غمازی کرتا ہے۔ دیسقوردوس کے زمانے تک صیدلہ معالجہ کے ساتھ منسلک تھا اور معالجات سے جدا اس کی حیثیت نہیں تھی۔ عہدرومن پہلا معالج جالینوس ہے جس نے فن صیدلہ کو ایک جداگانہ حیثیت بخشی اور قابل قدر کارنامہ اس فن میں انجام دیا۔ اسی بنا پر صیدلہ PHARMACY کا موجد جالینوس تسلیم کیا جاتا ہے۔ صیدلہ کا کثیر الادویہ تشریحی نظام اولاً جالینوس نے مرتب کیا اور طبی دنیا کو اس سے متعارف کرایا۔ اس فن پر اس نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس پودوں سے تیار کی جانے والی سینکڑوں ادویہ کی ترکیب تیاری کے بارے میں ہدایات درج کیں۔ ماڈرن فارمیسی میں جو ایک دوا، نباتات سے اخذ کی جاتی ہے۔ ہنوز گلینیکل کے نام سے موسوم کی جاتی ہے جس طرح طب یونانی میں ایک جوارش، جوارش جالینوس کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ادویہ کے بارے میں جالینوس کے تجربات تیرہ سو سال تک یورپ میں تسلیم کئے جاتے رہے۔ جالینوس نے ہمیشہ معالجہ کے لئے خالص ادویات کی اہمیت پر زور دیا اور ان کے صحیح طریق استعمال کا خیال رکھا۔ وہ اپنے قارئین کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

" دواؤں کو جاننے کے لئے ان کا نہ صرف ایک دو بار بلکہ بار بار نظری معائنہ کرنا چاہئے۔ باہم مماثلت رکھنے والی دوائیں ایک اجنبی کو تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن ایک شناسا کے ذریعہ ان میں تفریق بآسانی کی جا سکتی ہے۔"

صیدلہ کی تاریخ میں جالینوس کی پہلی منظم قرابادین DECOMPOSITION MEDICAMENT-ORUM اس طرح تقریباً پانچ سو سال تک یونانیوں نے صیدلہ (فارمیسی) کے میدان میں قابل ذکر ترقی کی لیکن

پانچویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی تک صیدلہ کے میدان میں جو ترقی ہوئی وہ عرب معالجین کی رہین منت تھی۔ علم النباتات، علم الصیدلہ والکیمیا کے تعلق سے عرب معالجین و محققین کی تحقیقات نویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک اس قدر وسیع تھیں کہ ان کی بنیاد پر ترتیب دی گئی قرابادین اور اعمال کیمیا دیر صدیوں تک عروج پر رہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج بھی مشرق، شمالی افریقہ، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور براعظم ایشیاء کے دوسرے حصوں میں معالجات کے نقطہ نظر سے اختیار کیے جاتے ہیں۔

سرل ایلگڈ کے مطابق صیدلہ (فارمیسی) کا فن اس قدر ترقی یافتہ اور منظم شکل میں کہیں اور موجود نہ تھا جیسا کہ خلیفہ کے شہروں میں عروج پر تھا۔ دواؤں کے ذخیروں کے مالک (عطار) محتسب (ڈرگ انسپکٹر) کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ جن کے فرائض میں داخل تھا کہ وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ صرف وہی لوگ جو دواؤں کا صحیح علم اور تجربہ رکھتے ہیں دواؤں کو تیار کر سکیں۔ محتسب نہ صرف دواؤں کا معائنہ کرتے تھے بلکہ ان کو مرکب دواؤں کے طریق تیاری کے معائنہ کا حق بھی حاصل تھا۔ خاص طور پر وہ معائنہ کر کے یہ حکم دیتے تھے کہ وہ برتن کہ جن میں ماء الشعیر اور عرق گلاب وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ وہ صاف اور قلعی دار ہیں کہ نہیں۔ پرانے اور بدبودار برتن محتسب کے حکم سے برباد کر دیے جاتے تھے۔

دواؤں کی معیار بندی سے قبل دواسازوں کے ذریعہ دھوکا دھڑی عام تھی۔ وہ قیمتی دواؤں کے ساتھ ارزاں اور کم قیمت ادویہ کو شامل کر دیتے تھے۔ یا انہی جیسی مماثل دواؤں کو ان دواؤں کے ساتھ مرکب میں شامل کر دیتے تھے۔ اس خامی کو دور کرنے کی کوشش سرکاری سطح پر صابر بن سہل کی قرابادین کی مدد سے کی گئی اور اس کے بعد دواؤں میں ملاوٹ کا خاتمہ ابن البیان اور ابن التلمیذ کی قرابادین کی معاونت سے کیا گیا۔

سرل ایلگڈ

عربی دور میں دواساز تین درجات پر منقسم تھے۔

پہلے درجہ میں وہ لوگ شامل تھے جو پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور مہذب دواساز تھے لوگ الصیدلانی کہلاتے تھے۔ پیشہ صیدلہ معالجات سے الگ نویں صدی کی ابتداء میں شروع ہوا۔

دوسرے درجہ میں وہ لوگ شامل تھے جو مستقل ادویہ فروخت کرتے تھے۔ یہ لوگ العطارین کہلاتے تھے اور یہ لوگ عرب عہد سے قبل بھی پائے جاتے تھے اور موجودہ دور میں بھی موجود ہیں۔

تیسرے درجے میں وہ لوگ شامل تھے جو ادویہ حاصل کرکے پھیری کرتے ہوئے فروخت کیا کرتے تھے ایسا تھا کہ معالجین اور دواسازوں کا کام بڑھتا گیا کیونکہ انھیں مریضوں کے کامیاب علاج اور اپنی شہرت و نیک نامی کی خاطر دواؤں کی شناخت اور ان کا معائنہ کرنا پڑتا تھا۔ بقول ہیمرنے HAMERNEH عرب معالجین کے تحقیق کردہ طریقے محفوظ ہیں۔ دواسازی کے مراکز میں یہ طریقے دواؤں کی شناخت سے متعلق ہیں نیز آگ کے اثرات سے اچھی اور بری دواؤں کی تفریق کرنے کے طرق پر مشتمل ہیں اور یہ طریقے عربوں نے ادویہ میں دھوکا دھڑی کو روکنے کے لیے ایجاد کیے تھے۔

اکثر عرب معالجین نے اعمال کیمیاویہ اور دواؤں کی تیاری میں کتب تصنیف کیں۔ یہ "کتاب القرابادین" کے عنوان سے معنون تھیں۔ ان کتابوں میں عام طور پر مختلف بیماریوں کا علاج کے لیے مرکب دواؤں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی مخصوص اسباب کے وقت درجہ بندی کی گئی ہے۔ مختلف مصنفین کی تصنیف کردہ ان کتب کی خاصی بڑی تعداد ہے۔

جندیشاپور کے شفاخانہ کے ناظم صابر بن سہل (۸۶۹ ء) کی مرکبات کے نسخوں پر مشتمل ایک کتاب "القرابادین کبیر" صدیوں تک ایک مستند کتاب کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ یسوع خرد نے جو قرابادین لکھی اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا اور یہ کتاب چار صدیوں تک یورپ میں فارمیسی پر ایک مستند تصنیف کی حیثیت سے تسلیم کی گئی اور بعد میں یہی کتاب یورپ کی سرکاری قرابادین کی اساس بنی۔ یسوع بن … (…) ھ ہارون رشید کا معالج تھا۔ اس کی تصنیف کردہ قرابادین بھی عربی سے لاطینی میں ترجمہ کی گئی اور پہلی لندن فارماکوپیا کے لیے اس نے بنیادی نمونہ کی حیثیت اختیار کی۔ معالجہ میں اولاً ملین اور مسہل کے طور پر سناء خاص، تمر ہندی وغیرہ کو متعارف کرانے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔

ایک مشہور طبی فارماکوپیا "ابن البیان" کی تصانیف سے "الدستور البیمارستان فی الادویۃ المرکبۃ" ہے جو انگریزی میں HOSPITAL PROCEDURES WITH COMPOUND DRUGS کہلاتی ہے۔ اس کتاب میں ایک جداگانہ باب کے تحت جدا جدا فہرست مرکبات، معاجین، حبوب، سفوف، اشربت منضجے، جوشاندہ وغیرہ مرتب کی گئی ہے اور ادویہ قطور، سفوف، ضمادات، حقنے، شیاف، فرزجہ، حب، سنون اور ادویہ برائے ناصور و خراج مرتب کی گئی ہیں۔ اور اکثر دوائیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو سلول، مدر حیض، مفید برائے بانجھ پن، مقوی باہ، معرق اور مقوی شعر ہیں۔

عربی فارسی طبی تصانیف کا جائزہ لینے پر واضح ہو جاتا ہے کہ صیدلہ (فارمیسی) عربی دور میں بہت ترقی یافتہ تھی۔ کیمیاوی اعمال کیمیاوی مثلاً تقطیر (DISTILLATION) تصعید (SUBLIMATION) اور تکلیس (CALCINATIO) سب سے پہلے حکیم جابر ابن حیان (شاگرد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ۷۰۲ تا ۷۶۵ء) نے بیان فرمایا۔ جابر اعظم، شورہ کے تیزاب اور گندھک کے تیزاب کا بھی موجد ہے اور رسالہ التقاسا اور نائٹرو ہائیڈرو ...یسڈ (ایکوا ریجیا) بھی اسی نے ایجاد کیا۔ علم کیمیا سے متعلق ایجادات میں اس نے مرتبہ عظیم حاصل کیا۔ اس نے پانچ سو رسائل علم کیمیا میں تصنیف کئے ہیں جن میں سے اکثر ہندستان میں رضا لائبریری رامپور اور دیگر لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ قرع انبیق RETORT بھی جابر بن حیان کی ایجاد ہے۔

مدرسہ طبیہ دہلی کے گیارہویں سالانہ جلسہ میں جو ۲۳ مارچ ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا نواب محسن الملک بہادر نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا:

"جابر ابو موسیٰ ہماری ہی قوم و ملت کا تھا جس نے آٹھویں صدی عیسوی میں ان مرکبات کو ایجاد کیا اور ان ابتدائی عملیات عرق کشی وغیرہ کو جاری کیا جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے اور ہزار برس پہلے وہ انکشافات اور ایجادیں شائع کیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو یورپ کے بڑے نامور موجد بھی کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس کی کتاب "نتائج التکمیل" کا ترجمہ ۱۶۷۲ء میں فرانسیسی میں ہوا اور اس سے اس فن میں یورپ کو بہت بڑی مدد ملی۔" (رپورٹ سالانہ مدرسہ طبیہ دہلی بابت سال یازدہم ہردواشنکر۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نمبر ۱۵۶ ک ۳۷۸)۔

محمد بن زکریا رازی (۸۵۰ء - ۹۲۵ء) نے اولاً مرہم سیاب سے طبی دنیا کو متعارف کرایا۔ اس نے قریباً دو سو پچاس کتابیں لکھیں جن میں سے کچھ خاص طور پر علم الصیدلہ پر لکھی گئی ہیں۔ رازی کے پاس ایک باقاعدہ معمل تھی۔ ای جی ہوم یارڈ E. G. HOLMYARDS نے اپنی تصنیف "الکیمی" میں رازی کے معمل میں موجود ساز و سامان کی درج ذیل فہرست پیش کی ہے۔

رازی کے معمل (LABORATORY) میں قدحے (BEAKERS)، زورق (FLASK)، شیشیاں (PHIALS)، حوض (BASINS)، شیشے کی قابیں (GLASS CRYSTALISING DISHES)، جگ (JUGS)، تابہ (CASSEROLES)، شمع دان (CANDLE LAMPS)، مجمر (BRAZIERS)، بھٹیاں (FURNACES)، ... (FILES)، مسواط (SPATULAS)، ہاون دستہ PESTAL AND MORTAR، تیشہ HAMMERS

قرع انبیق (WATER BATH) حمام مائی (SAND BATH) حمام ریگی (SHEARS) چمٹے (LADLES)
(ALEMBIC) (ALUDLES) قیف (FUNNELS) اور قرع (CUCURLUTS) موجود تھے۔

اس کے مخزن کی الماری میں نہ صرف جملہ اجساد کے نمونے موجود تھے، بلکہ دیگر ادویہ مثلاً حجر ازرق، جبس، شنگرف، جست سفید، جست سرخ، مردار سنگ، پھٹکری، سہاگہ، نمک طعام، چونا، پوٹاش، زنگار اور سرکہ وغیرہ کا بھی ذخیرہ موجود رہتا تھا۔

قرون وسطیٰ میں ابو علی سینا (۹۸۰ء - ۱۰۳۷ء) کی مایۂ ناز تصنیف القانون فی الطب، معالجات پر سب سے زیادہ مقبول کتاب تصور کی گئی جس کے حوالے بعد کے مصنفین نے عام طور پر دیئے ہیں اور یہ کتاب یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترہویں صدی عیسوی تک داخل نصاب رہی ہے۔ ابو علی سینا وہ پہلا حکیم تھا جس نے صیدلہ کی تاریخ میں حبوب و اقراص پر شکر، چاندی اور سونے کے ورق چڑھانے کی تدبیر متعارف رائی۔ نیز اس نے قانون میں ایک جامع قرابادین مرتب و مدون کی۔

یونانی عربی طبی نظام کے عروج نے صیدلہ (فارمیسی) کی ترویج و ترقی کے لیے بھی راستہ ہموار کیا۔ اسازی سے متعلق تیار شدہ اشیاء جیسے سفوف، محلول، شربت، معجون، جوارش، معرق اور بہت سی دوسری ال ادویہ تعداد میں ستر (۷۰) سے زائد تھیں۔ اس دور میں کچھ پیچیدہ تجرباتی آلات و اوزار APPARATUS بھی ادویہ کی تیاری کے سلسلہ میں وضع کیے گئے۔

ہندستان میں بابر کے عہد میں (جو ہندستان میں مغل بادشاہت کا موجد تھا) میر نظام الدین علی خلیفہ بالبقا دو عظیم معالج گذرے ہیں۔ ہمایوں نے خواجہ خاوند کو اپنے دربار میں رکھا جو شیراز کے ایک قابل ذکر ا تھے۔ اکبر نے بہت سے حکماء کو تمام ہندستان میں مقرر کیا تھا اور صیدلہ کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔ لی گیلانی نے روغن دیودار DEODAR OIL کا فارمولا دریافت کیا جو دور جدید میں بھی یونانی و تی طریقہ علاج میں مستعمل ہے۔

عہد مغلیہ میں امراء اپنی نفاست طبع اور نازک مزاجی کی بنا پر تلخ یا بدمزہ دواؤں سے استعمال سے کرتے تھے اس بنا پر اطباء نے خمیرے ایجاد کیے جو خوش ذائقہ بھی ہوتے تھے اور خوشبودار بھی۔ اسی سا ایک قابل ذکر اضافہ طب میں یہ ہوا کہ آیورویدک میں اعمال تکلیس کو اپنایا گیا اور مختلف دھاتوں کے کشتے جو آیورویدک تیار کیے جاتے تھے۔ استعمال کیے گئے اور اس طرح فولاد، سونا، ابرک وغیرہ کے کشتے

(OXIDE) تیار کئے گئے اور ان کو اقراص کی صورت میں استعمال کیا گیا۔

برٹش عہد حکومت میں دہلی کے خاندان شریفی کے نامور اطباء کے کارنامے یادگار ہیں جو طب یونانی کی ترویج و ترقی اور احیائے نو کے لیے انجام دیئے گئے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے ایک فارمیسی بھی قائم کی تھی اور آیورویدک اینڈ طبی کالج دہلی میں ہندی نژاد دواؤں پر تحقیق کی گئی جہاں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے اکثر مفید دواؤں کے جوہر فعال ACTIVE PRINCIPLES کو معلوم کیا جس سے طب یونانی میں خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا گیا۔ مثلاً انھوں نے سرپ گندھا اسرول کا جز موثر تحقیق فرما کے اجملین کے نام سے موسوم کیا اور اسی سلسلہ میں سر رام ناتھ چوپڑا کی نگرانی میں انسٹی ٹیوٹ آف ٹراپیکل میڈیسن کلکتہ میں یونانی و آیورویدک دواؤں پر مزید تحقیق ہوئی۔

آیورویدک دواسازی

تاریخ طب کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ عرب و ایران میں ہندستان کے مشہور وید حضرات کو دعوت دی گئی اور ان کے ذریعہ آیورویدک عربی اور پھر فارسی زبانوں میں منتقل ہوا اور اس طرح طب میں آیورویدک سے بڑی حد تک استفادہ کیا گیا اور بالآخر آیورویدک دواؤں کے ساتھ اعمال دواسازی بھی طب میں اپنائے گئے لہٰذا آیورویدک دواسازی (فارمیسی) کا تعارف بھی ضروری ہے۔

آیورویدک دواسازی کی تاریخ بھی اتنی پرانی ہے جتنی کہ خود آیورویدک کی تاریخ قدیم ہے۔ عقاقیر اور معالجوں کا معالجاتی طور پر استعمال بصورت بھیشاجیہ کلپنا SAISHAJYA KALPANA (فن) کہلاتا جو یونانی اصطلاح فارماکون PHARMACON سے مشتق ہے۔ آیورویدک فن دواسازی چار حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے

۱۔ کسایا کلپنا KASAYA KALPANA جو عصارہ، ضماد، چورن، جوشاندہ و خیسانده سے متعلق ہے

۲۔ سنیہا کلپنا SNEHA KALPANA (شحمی مرکبات) یعنی یہ ان مرکبات سے متعلق ہے جو گھی، تیل اور دیگر شحمی اشیاء سے بنائے گئے ہوں۔

۳۔ سندھانا کلپنا SANDHANA KALPANA (تخمیری مرکبات) یہ قسم ان مرکبات سے تعلق رکھتی ہے جس میں ارشٹا، آساوا، سورا، کنجیکا وغیرہ مرکبات شامل ہیں۔

۴۔ متفرقات MISCELLANEOUS GROUP اس میں حبوب، شربت، ضماد، مرہمات اور کشتہ وغیرہ شامل ہیں۔

مذکورہ اقسام کے مرکبات کا انتخاب مریض کی بدنی و نفسانی قوت، معدہ اور اس کے طبی احوالہ

منحصر ہے۔ قدرتی طور پر ایک معالج کے لیے بے شمار مرکبات ہیں جن میں سے اُسے حالات کے مطابق انتخاب کرنا ضروری ہے۔ معدنیات کا استعمال بھی آیورویدک کا ایک اہم پہلو ہے اور معدنی مرکبات کی تیاری سے متعلق بہت سے طریقے آیورویدک میں بیان کیے گئے ہیں۔ دھاتوں کو معالجاتی نقطۂ نظر سے قابل استعمال بنانے کے لیے آیورویدک میں مختلف طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً بھسم (کشتہ) بنانے کے طریقے یا تصعید کرنے اور چونہ بنانے کے طریقے تاکہ ان کی قوت جاذبہ ABSORBILITY یا جسم میں اثر پذیر ہونے کی قوت (BIO-AVAILABILITY) بڑھ جائے اور اس طرح وہ زیادہ مفید ثابت ہوں۔ دواسازی سے متعلق اعمال جڑی بوٹیوں اور معدنیات دونوں کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں۔ بیشک یہ طریقے معالجین اور دواساز دونوں کے ذریعہ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

کسی دوا یا معالجاتی اہمیت رکھنے والی شے کی معیار بندی بھی اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنی خود آیورویدک قدیم ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے گئے:

"کسی دوا کے بارے میں یہ جاننا چاہئے کہ اس کا نیچر NATURE کیا ہے؟ اس کی خصوصیت کیا ہے؟ کس حد تک وہ دوا افادیت رکھتی ہے؟ وہ کس خطہ یا ملک میں پائی جاتی ہے؟ کس موسم میں اگتی ہے؟ کس طریقہ پر حاصل کی جاتی ہے؟ کس طور پر وہ دوا محفوظ کی جا سکتی ہے؟ کس خوراک میں مستعمل ہے؟ کس کس بیماری میں قابل استعمال ہے؟ اور کس خلط کو جسم سے نکالتی ہے؟ یا اس میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کرتی ہے؟ اور اگر اس طریقہ پر کوئی اور بھی دوائی اہمیت کی شے ہے تو اس کی بھی جانچ پڑتال ایسے ہی کرنی چاہئے۔ (چرک سمہتا (CHARAK SAMHITA - ENGLISH TRANSLATI-ON OF GULAH KUNUARABA AYURVED SOCIETY, JAMNAGAR)

قرابادین

قرابادین یونانی لفظ ہے۔ اس سے مراد وہ کتاب یا تالیف ہے جس میں ہر قسم کے طبی مرکبات کے نسخے اور ترکیب تیاری مذکور ہو۔ بقول بعض یہ معرب ہے کرابادین کا۔

حکمائے قدیم نے اکثر قرابادینات تصنیف و تالیف فرمائی ہیں۔ جن میں سے چند اہم قرابادینات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ قرابادین قانون یعنی القانون فی الطب مصنفہ شیخ الرئیس ابو علی سینا۔ جلد پنجم۔

۲۔ "کامل الصناعت"۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن العباس کا جزو قرابادین۔

۳۔ "ذخیرہ خوارزم شاہی" مولفہ اسمٰعیل جرجانی کا جزو قرابادین یعنی جلد ہفتم۔

۴۔ "قرابادین سمرقندی" مصنفہ علامہ نجیب الدین سمرقندی (جس کا نسخہ کتب خانہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے)

۵۔ "قرابادین اغراض الطبیب" مولفہ اسمٰعیل بن حسن الحسینی الجرجانی۔

۶۔ "قرابادین معدن تجربات"۔ حکیم محمد مہدی بن محمد جعفر بن محمد حسن طبیب اُردستانی۔

۷۔ "قرابادین معصومی"۔ مولفہ معصوم الدین شیرازی۔

۸۔ "قرابادین کبیر" یا "مجمع الجوامع"۔ مولفہ حکیم محمد حسین خان۔

۹۔ "قرابادین مخزن الجواہر"۔ مولفہ حکیم سید حسن علوی ابن حکیم محمد حسین بھوپالی۔

۱۰۔ "قرابادین شریف خانی" مولفہ حکیم شریف خان دہلوی۔

۱۱۔ "قرابادین بقائی"۔ مولفہ حکیم محمد اسمٰعیل مخاطب بہ بقا خان۔

۱۲۔ "قرابادین ذکائی"۔ مولفہ حکیم ذکاء اللہ ابن اسحٰق۔

۱۳۔ "قرابادین شفائی" مولفہ مظفر بن محمد الحسینی الشفائی۔

۱۴۔ "قرابادین قادری" مولفہ حکیم محمد اکبر ارزانی، برہانپوری

۱۵۔ "قرابادین جلالی" مولفہ حکیم جلال الدین امروہی۔

۱۶۔ "قرابادین اعظم" مولفہ حکیم محمد اعظم خاں ناظم جہاں۔

۱۷۔ "قرابادین احسانی" مولفہ حکیم احسان علی خان۔

۱۸۔ "قرابادین کوکبی" مولفہ حکیم نیاز محمد خاں کوکب۔

۱۹۔ "قرابادین لطفی" مولفہ حکیم عبداللطیف۔

۲۰۔ "قرابادین حاذق" مولفہ حکیم محمد حسن میرٹھی۔

۲۱۔ "قرابادین نجم الغنی" مولفہ حکیم نجم الغنی رامپوری۔

۲۲۔ "قرابادین رضائی" مولفہ حکیم محمد رضا خان۔

۲۳۔ "بیاض کبیر جلد دوم" مولفہ علامہ حکیم محمد کبیر الدین۔

۲۴۔ "قرابادین ہمدرد" شائع کردہ "ہمدرد" دواخانہ (وقف)، دہلی۔

علم المفردات

بقراط (۴۶۰ ق.م) علم طب کا بانی ہونے کی حیثیت سے ابوالطب کہلاتا ہے، لیکن طب یونانی میں دیسقوریدوس نے اولاً علم ادویہ کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے نمایاں کیا اور معالجات سے جدا ایک مستقل فن کی حیثیت اسے دی۔ یہ حکیم طبی دنیا میں ماہر نباتات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دیسقوریدوس (۲۲۵ تا ۳۵۴ ق.م) یونانی النسل تھا اس نے ادویہ پر زبردست تحقیق کی اس نے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں متعدد ممالک کے سفر کیے۔ وہ مصر، ہسپانیہ، اطالیہ اور ملک شام بھی گیا اور وہاں اس نے بہت سی دواؤں کا مشاہدہ کیا اور مفردات پر سیر حاصل معلومات حاصل کیں اور ان کو ایک ضخیم کتاب میں پیش کیا۔ یہ کتاب یورپ میں صدیوں تک مستند تسلیم کی گئی۔ اس میں تقریباً پانچ سو جڑی بوٹیوں کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں نباتی ادویہ کے علاوہ حیوانی اور معدنی دواؤں کا بیان بھی بالتفصیل ہے۔ ابن جلجل نے جو ۹۸۰ء/۳۷۷ھ میں بقید حیات تھا، مکمل طور پر "کتاب الحشائش لدیسقوریدوس" کی صورت میں بزبان عربی ترجمہ کیا اور اس کے بعض حصوں پر حنین ابن اسحٰق (م ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) نے نظر ثانی کی۔ اور حنین بن ابراہیم بن حسین الطبری الناتلی (م ۳۸۰ھ/۹۹۰ء) نے تصحیح و اضافہ اور اپنے تجربات کے ساتھ مکمل کیا۔ (اس کا مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں کیٹلاگ نمبر جلد چہارم نمبر ۹۱، ص ۱۲۰-۱۴۲، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۸۹ پر موجود ہے۔)

دیسقوریدوس کے ہمعصر پلاتنی نے روم میں تاریخ طبیعیات لکھی جس میں علم الحیوان، علم النجوم اور حوادث فلکی کے علاوہ ایک ہزار نباتات کا بیان موجود ہے۔ پلاتنی کے بعد اسکافُوس کا نام تاریخ طب میں ملتا ہے۔ جس نے ایک جامع کتاب دواؤں کی تاثیر کے بیان میں لکھی ہے۔

جالینوس (۱۳۸-۲۰۱ ق م) نے بھی علم الادویہ پر بڑا کام کیا۔ اکثر نئی دواؤں کا حال معلوم کیا اور ادویہ کی تحقیق کے لیے دور دراز ممالک کا سفر کیا۔ اس نے مصر میں ایک مدت تک قیام کر کے دواؤں کی تحقیق کرتا رہا۔

۱۰۸ھ/۷۲۶ء میں عربوں نے مشاہیر اطبائے یونان بقراط و جالینوس کی طبی تصانیف کے ترجمے بزبان عربی کرالیے اور اس طرح یونان کا طبی سرمایہ عربی میں منتقل ہوا۔

عربی طب میں مفردات کا بیان سب سے پہلے علی بن ربن طبری کی کتاب "فردوس الحکمت" میں ملتا

ہے۔ ان کے بعد محمد ابن زکریا رازی نے حاوی کبیر میں اکثر دواؤں کو بیان کیا۔

ابن بیطار و رشید صوری مفردات کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ابن بیطار کی کتاب "الجامع فی الادویۃ المفردہ" یورپ میں مدت تک مستند تسلیم کی گئی۔ رشید صوری نے بھی مفردات کی تحقیق کا حق ادا کیا۔ یہ اپنے ساتھ ایک مصور بھی رکھتا تھا جو جڑی بوٹیوں کی تصاویر بناتا اور ان کے مختلف رنگوں کے مطابق رنگ بھرتا تھا چنانچہ اس نے مفردات پر ایک مصور کتاب مرتب کی جس کا مخطوطہ لندن کے رائل کالج آف فزیشنز کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں دمشقی کی شخصیت بھی یادگار رہے۔ جس کی "کتاب علم الادویہ" میڈیا میڈیکا پر ایک مستند کتاب قرار پائی اور سولہویں صدی عیسوی تک چھبیس[26] مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اور انگلستان کے شاہی طبی دار العلوم کی جانب سے جو پہلا فارماکوپیا شائع ہوا وہ یہی کتاب تھی۔

چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر اطباء میں شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا ایک مایۂ ناز حکیم گذرے جس نے "القانون فی الطب" علم طب کے شعبوں پر ایک جامع کتاب القانون فی الطب تصنیف کی جو سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں علم طب کے حصول کے لیے داخل درس رہی۔ اس کتاب کی دوسری جلد علم مفردات پر مشتمل ہے، اور مفردات کا انداز بیان ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔

سولہویں و سترہویں عیسوی میں مغلیہ عہد حکومت میں پایہ تخت آگرہ و دہلی اور قطب شاہی دار السلطنت دکن میں طب نے خاص طور سے عروج پایا۔ حکیم علی گیلانی نے قانون کی شرح کے علاوہ سب سے پہلے ادویہ پر کام کیا اور اس علم کو فروغ دیا۔ اس کے بعد شاہجہاں اور دارا شکوہ کے عہد میں حکیم نورالدین نے ایک جامع کتاب "دارا شکوہی" لکھی۔ جس میں اس نے اپنے عہد کی طب اور ویدک کی اہم معلومات کو سمو دیا۔ دوسری کتاب "حکیم امان اللہ خان کی "گنج باد آورد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے عہد کی تمام تحقیقات کو جو ادویہ پر ہوئی تھیں اس میں جمع کر دیا۔ یہ کتاب مفردات و مرکبات پر اپنے عہد کی ایک جامع قرابادین کہی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں معتمد الملوک حکیم سید علوی خاں نے فروغ دیا اور ایک جامع کتاب "مجمع الجوامع" لکھی جس میں ادویہ، معالجات اور قرابادین سے متعلق نہایت مفید ذخیرہ اس میں پیش کرد اور عہد اورنگ زیب میں برہان پور میں حکیم محمد اکبر ارزانی نے مرکب ادویہ پر بزبان فارسی "قرابادین قادری" تصنیف کی۔ اور دکن میں حکیم سید مومن نے ادویہ پر مستند کتاب "اختیارات بدیعی" کی تنقیح و تصحیح کی اور ان

مفردہ پر تحقیقی کام کیا جسے سلطان محمد قلی قطب شاہ سے منسوب کرکے "اختیارات قطب شاہیہ" تالیف کی۔ اسی دور میں حکیم تقی الدین نے دواؤں کے مزاج اور مقدار پر نادر تحقیقات کتاب "میزان الطبائع" میں پیش کیے۔ حکیم سید محمد مومن حسینی نے "تحفۃ المومنین" میں ادویہ کو تحقیقی انداز میں بیان کیا اور اس پر "حاشیہ" حکیم میر عبدالحمید نے لکھا۔ حکیم سید علوی خان اور حکیم سید محمد حسین کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ کتاب "مخزن الادویہ" ہے اور یہ اس دور کی یونانی ادویہ کے بیان میں ایک منتخب و مستند کتاب ہے۔ اس کے بعد حکیم محمد شریف خاں نے علم الادویہ پر "تالیف شریفی" اور حکیم عبدالعزیز نے "مفردات عزیزی" لکھیں جو قابل قدر ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں حکیم محمد اعظم خان نے ادویہ پر محیط اعظم ایک نہایت جامع کتاب بزبان فارسی تصنیف کی اور اس کے بعد حکیم نجم الغنی رامپوری نے مفردات پر ایک نہایت ضخیم اور جامع کتاب بزبان اردو "خزینۃ الادویہ" تالیف کی۔ نیز ہندستانی ادویہ پر تحقیقی نقطہ نگاہ سے حکیم رضا علی خاں دکنی نے "تذکرۃ الہند" لکھی۔ (تاریخ ادویہ مولانا حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی)

(۲)

معدن تجربات

حکیم محمد مہدی نے معدن تجربات میں حکمائے متقدمین کی تصنیف کردہ جملہ کتب ادویہ مفردہ و قرابادینیا سے استفادہ کرکے "معدن تجربات" مرتب کی۔

معدن تجربات، طب کی ایک جامع اور مستند قرابادین ہے اور ضروریات الطب کے لحاظ سے ایک نہایت مفید کتاب ہے۔ اس لیے کہ اکثر یہ قدیم مستند طبی تصانیف کا ایک بہترین خلاصہ اور بے نظیر لب لباب ہے، جس کا مطالعہ اکثر قرابادینیات کے مطالعہ سے طبیب کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے مؤلف حکیم میر محمد مہدی طبیب اس کتاب کی تعریف میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"اما بعد فقیر حقیر محمد مہدی بن محمد جعفر طبیب بن محمد حسن طبیب، عرض می دارد کہ اکثر نسخہائے مرکبات وغیرہ از کتب معتبرہ و مجربات حکمائے قدیم و جدید متفرق بودند خواست کہ اینہارا جمع کردہ در سلک تحریر در آرد تا خلائق از و منتفع شوند و محتاج بہ بقرابادینیات و مرکبات بفضل ایزد کار ساز صورت انتظام یافت الخ"[۱]

۱۔ مخطوطہ معدن تجربات، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ا۔

حکیم میر محمد مہدی، "معدن تجربات" کی تصنیف کے بارے میں اس قدر فرماتے ہیں :

"برین کتاب کہ موسوم بہ معدن تجربات را استخراج اعداد سال ہم ازاں می گردد" [۱]

پس اس کتاب کا سنہ تصنیف و تالیف اعداد "معدن تجربات" سے ۱۱۰۷ھ (مطابق ۱۶۹۵ء) برآمد ہوتا ہے، اور اسی سنہ میں یہ کتاب مصنف نے مکمل فرمائی ہے۔

حالات مؤلف

حکیم محمد مہدی بن محمد جعفر بن محمد حسن کے حالات کی تحقیق نہایت دشوار ہے۔ اس لئے کہ کسی تاریخ و تذکرہ میں جو مشہور کتب خانوں میں محفوظ ہیں درج نہیں ہیں۔ نیز آپ کا تشخص بھی دشوار ہے اس لیے کہ اس نام کے متعدد حکیم گذرے ہیں۔

کتاب مآثر الامراء میں، صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے حکیم الملک محمد مہدی کے حالات اس طرح درج فرمائے ہیں :۔

حکیم الملک :۔ آپ کا نام میر محمد مہدی اور وطن اردستان (ایران) ہے۔ جس سال کہ محمد اورنگ زیب بہادر، دکن سے مستقر الخلافہ (آگرہ) کے لیے روانہ ہوئے تو وہ (حکیم الملک) بھی ہمراہ آئے اور ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ گیارہویں سال جلوس عالمگیری میں اضافہ کے بعد دو ہزاری ذات اور پانچ سو ذات کے منصب پر سرفراز ہوئے۔

سینتیسویں سال جلوس عالمگیری (۱۶۹۵ء) میں محمد اعظم استسقاء کے مرض میں مبتلا ہوا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ چودہ گرہ چوڑی آستین بھی تنگ ہو جاتی تھی اور پاجامہ کا پائنچہ ایک گز چھ گرہ تک پہنچ گیا تھا۔ حکیم الملک شاہزادہ مذکور کے علاج کے واسطے مقرر ہوا۔ جب شاہزادہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا تو محبت پدری کی وجہ سے شہزادہ کا خیمہ گلال بار میں نصب ہوا اور بادشاہ (عالمگیر) روزانہ ایک مرتبہ بیٹے کو دیکھنے جاتا تھا۔ شہزادہ کی حقیقی بہن زیب النساء بیگم، شاہزادہ کے ساتھ پرہیزی کھانا کھاتی تھی اور اس پر مطمئن تھی۔

حکیم الملک شہزادہ کے علاج کے واسطے مقرر ہوا تھا۔ راستے میں اور بادشاہ کے حضور میں پہنچنے کے بعد (حکیم الملک نے) علاج میں بہت کوشش کی۔ شاہزادہ کو جب شفاء ہو گئی تو اس کے منصب میں ایک ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، اور بڑھ کر ان کا منصب چار ہزاری ہو گیا۔ [۲]

۱۔ مخطوطہ معدن تجربات، خدابخش لائبریری پٹنہ، ص ۲۔ ۲۔ مآثر الامراء، شاہنواز خاں، مترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری، شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ، ۳۰۔ جی گلبرگ، لاہور، مطبوعہ جون ۱۹۶۸ء۔ ص ۵۹۴، ۵۹۵۔

مآثر الامراء کا مؤلف شہزادہ کی زبانی لکھتا ہے کہ جو اس نے اپنے باپ (عالمگیر) سے کہا تھا کہ ایک دن مرض کی شدت بہت تھی اور لوگ مایوس ہو گئے تھے۔ خیال تھا کہ بدن پھٹ جائے گا کہ اچانک سونے اور جاگنے کی حالت میں (یعنی غنودگی کی حالت میں) کوئی نورانی شخصیت ظاہر ہوئی اور اس نے فرمایا کہ توبۃ النصوح کرو شفاء ہو جائے گی۔ چنانچہ توبہ کی گئی۔ غفلت ختم ہونے کے بعد پیشاب کی ضرورت ہوئی اور دو بڑے طشت (پیشاب سے) بھر گئے اور ساتھ ساتھ ورم ختم ہو گیا۔ دوسرے دن آزاد ولی شیخ عبدالرحمٰن درویش نے لکھا کہ جناب مرتضیٰؓ (حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسّلام) نے فرمایا ہے کہ آج رات کو توبہ (کی توفیق) دی ہے، شفاء جلد ہو گی۔[1]

قرائن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکیم الملک میر محمد مہدی نے شاہزادہ کی شفاء کے لیے کوئی عمل یا دعا کی جس کے نتیجہ میں آپ کو القاء ہوا اور آپ نے وہ مدر بول دوا تجویز کی کہ جس سے رطوبت فاسدہ سمیت مرض استسقاء کا تنقیہ بذریعہ بول ہوا حتیٰ کہ شاہزادے نے شفا پائی۔

مذکورہ عبارت ساقی مستعد خان کی تصنیف کردہ تاریخ مآثر عالمگیری سے اخذ کی گئی ہے۔ اور اس اعتبار سے معتبر و مستند ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکیم الملک میر محمد مہدی دربار عالمگیری سے کس سنہ میں وابستہ ہوئے؟

صاحب مآثر الامراء کے بیان مذکورہ سے واضح ہے کہ جس سال محمد اورنگ زیب بہادر، دکن سے مستقر الخلافہ (آگرہ) کے لیے روانہ ہوا تو حکیم الملک بھی ہمراہ آئے اور ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ پھر سینتیسویں سال جلوس عالمگیری (۱۶۹۵ء) میں شاہزادہ محمد اعظم کے مرض استسقاء کا کامیاب علاج کیا تو ان کے منصب میں اضافہ کیا گیا اور آپ چار ہزاری منصب پر فائز ہوئے

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت پچیس پچیس سال کے دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ پہلا دور ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء سے ۱۰۹۲ھ/۱۶۷۹ء تک وہ زمانہ ہے جس میں اورنگ زیب شمالی ہند کی طرف متوجہ رہا اور یہ زمانہ اس نے شمالی ہند کی طرف بسر کیا، اور دوسرا دور ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۰ء سے ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۷ء تک ہے جو جنوبی ہند میں گذرا۔

اکبر نامہ مؤلفہ محمد کاظم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم الملک میر محمد مہدی کو ۱۰۶۸ھ میں ایک ہزاری کے منصب پر فائز کیا گیا۔

---

[1] مآثر الامراء جلد دوم، ص ۲۰۰ و اطبائے عہد مغلیہ حکیم کوثر چاندپوری، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰

حکیم الملک میر محمد مہدی کی حذاقت کی تعریف عالمگیر نامہ میں بھی کی گئی ہے کہ آپ نے حکیم محمد امین شیرازی کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر کے بخار کا علاج نہایت محنت اور دلچسپی کے ساتھ کیا اور مناسب تدابیر علاج اختیار فرمائیں کہ جن کے نتیجہ میں بادشاہ کو صحت حاصل ہوئی۔

عالمگیر نامہ میں زیر عنوان۔ " شرح بعضے از عنایات ومراحم شہنشاہی کہ از جلوس میمنت عنوان عید قربان کہ متصلۂ ایام جشن بود نسبت بامرائے نامدار و اعیان دوست پائیدار سمت ظہور یافتہ" تحریر ہے :۔

" وازاصل واضافہ حکیم محمد امین شیرازی وحکیم محمد مہدی اردستانی ہر یک بمنصب ہزار و پانصدی دو صد سوار۔ مباہی گردیدند"[1]

مذکورہ تاریخی روایات کی روشنی میں واضح ہے کہ حکیم الملک میر محمد مہدی اردستانی اورنگ زیب کے ساتھ دکن (جنوبی ہند) میں رہے اور ان کا وطن اصلی اردستان تھا۔

حکیم محمد مہدی اکبر آبادی بھی زبان فارسی میں اعلیٰ معیاری کتابیں تصنیف وتالیف کرنے کے باعث کسی ایرانی طبی خانوادے کے فرد ثابت ہوتے ہیں، انھوں نے کتاب "معدن تجربات بزبان فارسی ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں اور "کتاب مخزن اسرار اطبا" بزبان فارسی ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۰ء میں تالیف فرمائیں۔ لہٰذا یہ حکیم محمد مہدی اکبر آبادی تاریخی اعتبار سے حکیم الملک میر محمد مہدی قرار نہیں پاتے جو اورنگ زیب کے درباری طبیب تھے۔

حکیم محمد مہدی نے "معدن تجربات" کے مقدمہ میں اپنے والد کا نام حکیم محمد جعفر اور دادا کا نام حکیم محمد حسن تحریر کیا ہے۔

حکیم محمد جعفر اکبر آبادی کا تذکرہ میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خاں نے تاریخ محمدی میں ۱۱۴۸ھ کے ضمن میں حسب ذیل کیا ہے،

" المولی محمد جعفر الاکبرآبادی الطبیب الحاذق وکان عالماً متفننـاً مرتاضاً عابداً ماتت بشاہجہان آباد وھو فی عشر الثمانین" (تاریخ محمدی ص ۹۲)

(ترجمہ)۔ " مولانا محمد جعفر اکبر آبادی طبیب حاذق، عالم، ماہر فن، زاہد، عابد تھے۔ شاہجہان آباد (دہلی) میں وفات پائی۔ وفات کے وقت وہ اسّی کے دہے میں تھے یعنی ان کی عمر ۷۰ اور ۸۰ سال کے درمیان تھی۔"

مذکورہ قول سے واضح ہے کہ حکیم محمد جعفر کی وفات ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۴ء بعہد محمد شاہ، شاہجہان آباد (دہلی) میں واقع

---

[1] عالمگیر نامہ، مؤلفہ محمد کاظم بن محمد امین منشی۔ ص ۲۹۹

ہوئی اور وطن ان کا اکبر آباد تھا۔

مذکورہ تاریخی حوالہ کے علاوہ منظفر بن محمد بن قاسم ہروی نے قرابادین سراج العلاج میں جو ایک ضخیم فارسی قرابادین ہے۔ حکیم محمد جعفر کے معتبر نسخے درج کئے ہیں۔

اور حکیم شریف خاں دہلوی نے کتاب "علاج الامراض" میں بھی حکیم محمد جعفر اکبر آبادی کے مجرب نسخے شامل کئے ہیں۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ حکیم محمد جعفر عہد محمد شاہ کے مشہور و مایۂ ناز حکیم تھے اور ان کی سکونت اکبر آباد یعنی آگرہ میں تھی اور انہی کے فرزند حکیم میر محمد مہدی اکبر آبادی ہوئے۔

حکیم میر محمد مہدی نے "معدن تجربات" ۱۱۷۰ھ/۵۶-۱۷۵۷ء میں تصنیف کی اور اس کے دو سال بعد ہی اس سے زیادہ ضخیم اور مستند کتاب کلیات و معالجات کے موضوعات پر "مخزن اسرار اطبار" ۱۱۷۲ھ/۵۸-۱۷۵۹ء میں تصنیف فرمائی اور اس کتاب کا نام بھی مصنف نے تاریخی رکھا ہے۔ اور سنہ تصنیف ۱۱۷۲ھ کا استخراج اعداد نام کتاب "مخزن اسرار اطبار" سے کیا ہے۔

یہ بات مغالطہ پر مبنی ہے کہ "معدن تجربات" جیسی ضخیم کتاب جو سات سو چوراسی (۷۸۴) صفحات پر مشتمل تھی اس کی تصنیف سے فراغت پاتے ہی دو سال کے اندر اس سے زیادہ ضخیم کتاب "مخزن اسرار اطبار" جو بڑے سائز کے نو سو صفحات پر مشتمل ہے تصنیف فرما دی جو علمی و تحقیقی لحاظ سے ایک امر محال ہے۔

فنی اعتبار سے ایک دیگر مغالطہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کلیات و معالجات سے متعلق معیاری و مستند کتاب کو ایک فاضل حکیم کو اولاً تصنیف کرنا اور قرابادین کو اس کے بعد، لیکن سنین تصنیف "معدن تجربات" اور "مخزن اسرار اطبار" کی رو سے واضح ہے کہ حکیم محمد مہدی نے فنی تقاضہ کے برخلاف "معدن تجربات" جیسی قرابادین کو اوّلاً تصنیف اور کلیات و معالجات پر مشتمل جامع کتاب مخزن کو آخر میں۔

مذکورہ مغالطات کا حل غور و فکر کے بعد یہی ممکن ہو سکتا ہے کہ مذکورہ دونوں کتابوں کا سلسلہ تصنیف و تالیف حکیم محمد مہدی کے والد حکیم محمد جعفر اکبر آبادی اور دادا حکیم محمد حسن کے عہد سے جاری رہا ہو لیکن ان کتب کی تکمیل حکیم محمد مہدی اکبر آبادی کے قلم مبارک سے ہوئی ہو اور انھوں نے دو سال کے وقفہ سے ان کتابوں کے تاریخی نام "معدنِ تجربات" (۱۱۷۰ھ) اور "مخزن اسرار اطبار" (۱۱۷۲ھ) قائم فرما کے ان کی تمہید بھی اپنے قلم سے لکھی ہو اور دونوں کتب کی تمہید ایک ساتھ لکھنے کی دلیل یہ ہے کہ "معدن تجربات" اور "مخزن اسرار اطبار" کی تمہید کی عبارت کا بیشتر حصہ یکساں ہے جسے ذیل میں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں:۔

"معدن تجربات" کی تمہید کی عبارت حسب ذیل ہے :

"اما بعد، فقیر حقیر محمد مہدی بن محمد جعفر طبیب بن محمد حسن طبیب عرض می دارد کہ اکثر نسخہائے مرکبات وغیرہ از کتب معتبرہ و مجربات حکمائے قدیم و جدید متفرق بودند خواست کہ آنہا را جمع کردہ در سلک تحریر آرد تا خلائق از او منتفع شوند و محتاج باقرابادینیات و مرکبات دیگر نگردند بفضل ایزد کارساز صورت ترتیب یافت۔ اُمید از عنایت عالی نشان بلند ہمت و دانش پژوہان ہمایون فطرت آنکہ چون انصاف دیدہ برین کتاب کہ موسوم است بمعدن تجربات (۱۱۰۰ھ) و استخراج اعداد سال تاریخ ہم ازاں می کردد و بنظر تعمق کشایند بمقتضائے نیک نہادے چشم عیب بینی و نکتہ چینی پوشیدہ تماشائے لطافت ہنر باشند و اگر احیاناً بمقتضائے بشریت کہ الانسان مرکب من السہو والنسیان واقع شدہ خطائے ملحوظ کردد در غور فطرت بلند و طبع ارجمند توجہ باصلاح فرمودہ چون سفلکان عاقبت نا اندیش و فرومالگان بکیش زبان طعن و تشنیع نکشایند و بفاتحہ کہ مقصد اقصیٰ و علت غائی از تالیف این مختصر است یاد فرمایند الخ۔"

"مخزن اسرار اطبا" کی تمہید کی عبارت حسب ذیل ہے :

"اما بعد میگوید فقیر حقیر محمد مہدی بن محمد جعفر بن محمد حسن طبیب کہ اکثر مقدمات طب و نسخہائے مرکبات وغیرہ در کتبہائے معتبرہ و مجربات حکمائے قدیم و جدید متفرق بودند خواست کہ آنہا را بزبان فارسی جمع نمودہ در سلک ترتیب درآرد تا اکثر خلائق از او منتفع شوند و محتاج بکتبہائے دیگر نگردند بفضل خدائے عزّوجل صورت ترتیب یافت۔ امید از عنایت عالی فشان بلند ہمت و دانش پژوہان ہمایون فطرت آنکہ چون دیدۂ انصاف برین کتاب کہ موسوم است بمخزن اسرار اطبا و استخراج سال تاریخ ہم ازاں میکردد و بنظر تعمق کشایند بمقتضائے بشریت کہ الانسان مرکب من السہو والنسیان واقع شدہ خطائے ملحوظ کردد در غور فطرت بلند و طبع ارجمند توجہ باصلاح فرمودہ چون سفلکان عاقبت نا اندیش و فرومالگان بدکیش زبان طعن و تشنیع نکشایند و بفاتحہ کہ مقصد اقصیٰ و علت غائی از تالیف این مختصر است یاد فرمایند الخ۔"

مذکورہ دونوں کتابوں کی تحریریں یکساں ہیں حالانکہ دونوں کتابوں کے موضوعات جدا جدا ہیں۔ "معدن تجربات" ایک قرابادین ہے اور "مخزن اسرار اطبا" کلیات و معالجات پر مشتمل ہے۔

حکیم محمد مہدی اکبر آبادی، حکیم محمد جعفر اکبر آبادی کے فرزند ارجمند تھے جن کے نسخے بانیٔ خاندان شریفی دہلوی حکیم شریف خان نے اپنی تصنیف "علاج الامراض" میں شامل کئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم محمد مہدی ایک عالی خاندان طبیب تھے اور اُن کی تصانیف کے مصادر و مراجع کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ایک اعلیٰ پایہ کے طبیب تھے۔

حکیم محمد مہدی کی مذکورہ دونوں تالیفات کو علامہ شیخ آقائے بزرگ الطہرانی نے اپنی جامع تالیف "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" میں شامل کیا ہے جس سے واضح ہے کہ حکیم محمد مہدی مذہب شیعہ رکھتے تھے۔

کتاب "معدن تجربات" کا ذکر آقائے بزرگ نے "الذریعۃ" کے "الحادی والعشرون" میں صفحہ ۲۲ پر حسب ذیل فرمایا ہے:

"معدن التجربیات للحکیم محمد مهدی بن محمد جعفر مؤلف "مخزن اسرار الاطباء" المذکور فی (۲۰ : ۲۲۳) فارسی اُلفہ فی ۱۱۷۰ھ یوجد فی (الآصفیہ ۲۸۲ طب) کتابتہ ۱۲۰۵ھ کما فی فہرسہا۔"

حکیم محمد مہدی کی دوسری تالیف "مخزن اسرار الاطباء" کا ذکر آقائے بزرگ نے الذریعہ کے جزو العشرین کے صفحہ ۲۲۳ پر حسب ذیل فرمایا ہے۔

"مخزن اسرار الاطباء فارسی للحکیم محمد مهدی بن محمد جعفر بن محمد حسن فی مجلدین اُلفہ ۱۱۷۲ یوجد فی (الآصفیہ ۳۳، ۷۷۳ طب) کما فی فہرسہا ولی للمولف "معدن تجربیات" ایضاً فی الطب۔"

مصادر و مراجع کتاب معدن تجربات

معدن تجربات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تالیف میں مندرجہ ذیل حکمائے قدیم اور مصنفات سے استفادہ کیا گیا ہے:-

۱۔ اسمٰعیل جرجانی - سید شریف شرف الدین اسمٰعیل بن حسین الحسینی جرجانی مؤلف ذخیرۂ خوارزم شاہی و خفی علائی و زبدۃ الطب۔

۲۔ بحر الجواہر - مصنفہ حکیم محمد بن یوسف الہروی۔ اس کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔ نفیسی - مصنفہ ملا نفیس بن عوض الکرمانی۔ شرح موجز القانون مصنفہ علاء الدین قرشی معروف

یہ ابن نفیس۔ مطبوعہ ہے۔

۴ شیخ الرئیس ابوعلی سینا:۔ مصنف "القانون فی الطب" و "احکام ادویۃ القلبیہ" وغیرہ۔

۵۔ صاحب مفتاح الطب:۔ ابوالفرج علی بن الحسین ابن الہندو۔ اس کا مخطوط کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ آرکائوز) حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں موجود ہے۔

۶۔ صاحب ریاض الفوائد:۔ محمد امان بن محمد افضل بن محمد عارف (تصنیف ۱۲۴۳ھ) اس کا نسخہ ہمدرد، پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

۷۔ صاحب تحفہ:۔ "صاحب تحفۃ المومنین" حکیم محمد مومن حسینی تنکابنی۔ مطبوعہ ہے۔

۸۔ میر مومن:۔ مصنف "قرابادین مومنین"۔

۹۔ جامع ابن بیطار:۔ "جامع المفردات" تصنیف ابن محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن بیطار متوفی ۱۱۹۷ء (اس کا مخطوط خدابخش لائبریری پٹنہ، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد۔ این۔بی۔آر۔آئی لکھنؤ میں موجود ہے۔ نیز یہ کتاب چار جلدوں میں قاہرہ سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوچکی ہے، اور اس کا ترجمہ اُردو ریسرچ یونٹ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن نئی دہلی سے زیر اشاعت ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔

۱۰۔ تقویم الصحت:۔ مصنف ابوالحسن المختار بن عبدون بن سعدون ابن بطلان (۴۴۴ھ) اس کا مخطوط حیدرآباد میں موجود ہے۔ (طب العرب، ص ۳۵۷)

۱۱۔ صاحب الفاظ:۔ عین الملک شیرازی مصنف "الفاظ الادویہ"

۱۲۔ حاوی:۔ مصنف محمد ابن زکریا رازی (مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

۱۳۔ زبدہ:۔ "زبدۃ الطب" مصنف سید اسمٰعیل جرجانی و ابن بطلان (م ۴۵۵ھ، ۱۰۶۳ء) اس کا مخطوط خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

۱۴۔ صاحب مختار:۔ مہذب الدین۔ ابن ہبل مصنف کتاب المختار۔ کتاب المختار کا نسخہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں موجود ہے۔

۱۵۔ علاءالدین محمود شیرازی:۔ مصنف امراض اطفال وافیونیہ وچوب چینی و تحقیقات سموم وغیرہ

۱۶۔ کناش:۔ "الکناش المنصوری" مصنف محمد بن زکریا رازی۔ اس کتاب کا مخطوط خدابخش

اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں موجود ہے۔

۱۷۔ حکیم کمال الدین حسین شیرازی :- مصنف رسالہ تریاق فاروق وغیرہ (تریاق فاروقی حکیم ظل الرحمٰن صاحب کے پاس موجود ہے۔)

۱۸۔ قادری :- "طب قادری" (فہرست مخطوطات فارسی پاکستانی مرتبہ احمد منزوی میں نمبر ۱۳۷ پر درج ہے) احمد کی تصنیف ہے۔ کتاب کا نمبر ۱۱۶۸ ہے۔

۱۹۔ حکیم محمد باقر :- ابن عماد الدین محمود الشیرازی، مصنف "قرابادین و مقالتین در مفردات" وغیرہ۔

۲۰۔ تذکرہ :- "تذکرۃ اولی الالباب" مؤلفہ حکیم داؤد ضریر انطاکی مطبوعہ مطبع ازہریہ مصر ۱۳۰۲ھ۔

۲۱۔ حنین ابن اسحٰق :- مترجم جوامع اسکندرانیین وغیرہ کتب طبیہ یونانیہ۔

۲۲۔ القلانسی :- بدرالدین القلانسی السمرقندی کی تصنیف کردہ قرابادین جسے اس کے مصنف نے قانون، حاوی، کامل الصناعت، ذخیرہ خوارزم شاہی، قانون شیخ الرئیس ابو علی سینا، کفایہ اور فردوس الحکمت وغیرہ سے استفادہ کرکے چھٹی صدی ہجری میں لکھا تھا۔ عبداللہ بن مولا عرب کمال کے قلم کی لکھی ہوئی برٹش میوزیم لندن میں ہے۔

۲۳۔ غنیٰ منیٰ :- مصنفہ حکیم ابو منصور حسن بن نوح القمری مترجمہ اردو حکیم منور حسین، دواخانہ معدن الادویہ، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۲۴۔ جالینوس :- مصنف "جوامع اسکندرانیین (طبی نصاب تعلیم سے متعلق جالینوس کے سولہ رسالے جن کا ترجمہ حنین ابن اسحٰق نے بزبان عربی کیا ہے۔)

۲۵۔ شفاء الاسقام و دواء الآلام :- مصنفہ خضر بن علی معروف بہ حاجی پاشا۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کا مخطوطہ کتب خانہ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں موجود ہے۔

۲۶۔ معالجات بقراطیہ :- مصنفہ ابوالحسن احمد بن محمد الطبری (متوفی ۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء) اس کا مخطوطہ کتب خانہ اجمل خاں طبیہ کالج، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

مذکورہ مصادر و مراجع کی روشنی میں کتاب "معدن تجربات" کی طبی افادیت واضح ہوجاتی ہے۔ نیز مصنف کتاب میر محمد مہدی کی مہارت فنی اور وسعت نظری بھی آشکار ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب بزبان فارسی جامع و مانع تصنیف فرما کے اپنے دعوے کو صادق کر دکھایا ہے اور دیگر قرابادین کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔

ترتیب وتبویب "معدن تجربات"

کتاب "معدن تجربات" دو مقالوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقالۂ اوّل:۔ مشتمل است بر چہار رسائل۔

رسالہ اوّل:۔ مقدمات و تراکیب ادویہ و طریق احراق و تکلیس و مُدبّر کردن و مشوی کردن و کشتن فلزات وغیرہ۔

رسالۂ دوم:۔ در تحقیقات اسامی مرکبات بترتیب حروف تہجی۔

رسالہ سیوم:۔ در تحقیقات اسامی الفاظ کہ مصطلح اطبا است۔

رسالہ چہارم:۔ در تدبیرات مفردیہ و ادویہ ثمانیہ کثیر المنفعت۔

مقالۂ دوم:۔ در مرکبات بترتیب حروف تہجی موسومہ بہ مرکبات "معدن تجربات"

خاتمہ:۔ یہ تین فصول پر مشتمل ہے۔

فصل اول:۔ در اوزان و مقادیر

فصل دوم:۔ در بیان غذا ہائے کہ مصطلح اطبا است

فصل سوم:۔ در ابدال، و مزاج و خواص ادویۂ مفردہ بترتیب حروف تہجی۔

مذکورہ فہرست کتاب کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ علم الصیدلہ و مرکبات پر یہ ایک جامع کتاب ہے جو علم الادویہ کے جملہ اہم موضوعات پر حاوی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کتاب علم الادویہ سے متعلق ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔

"معدن تجربات" کے قلمی نسخے

"معدن تجربات" ہنوز (۱۹۹۲ء تک) طبع و شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ "معدن تجربات" کا ایک قلمی نسخہ جلالی ضلع علی گڑھ میں کتب خانہ حکیم سید شاہ خیرات علی جلالی، واقع امام باڑہ سید خیرات علی[۲۱] وقف، نواب آصف الدولہ، گڑھی قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ میں موجود

ہے۔اس نسخہ کے کاتب حکیم سید نقی علی صاحب ابن سید ہادی علی صاحب ساکن قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ ہیں جیسا کہ اس مخطوطہ پر ان کی تحریر سے واضح ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے :۔

"تمت تمام شد نسخہ "معدن التجربات" بید عبد المذنب سید تقی علی ابن سید ہادی علی جلالوی غفرلہ بنا بر پاس خاطر قبلہ و کعبہ سید تقی علی صاحب تاریخ ۱۸ ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ فقط، ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندہ گنہگارم۔"

کاتب صاحب کی ایک دوسری تحریر جو مخطوطہ کے صفحہ اول پر ہے حسب ذیل ہے :

"کتاب معدن التجربات، مرتبہ حکیم سید علی نقی ابن سید ہادی علی بپاس خاطر سید تقی علی برادر حقیقی بتاریخ ۱۸ ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) بمقام اکبرآباد جمع کردہ صورت اتمام یافت۔"

اس دوسری تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ حکیم سید نقی صاحب نے اپنے برادر سید تقی علی صاحب کی خاطر بمقام اکبرآباد (آگرہ) نقل فرمایا ہے۔ نیز "مرتبہ" کا لفظ اس مقام پر صحیح نہیں ہے۔ "مکتوبہ" ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے نہ کہ ترتیب دیا گیا ہے۔

اس نسخہ کے عناوین اور ضمنی سرخیاں سرخ روشنائی سے اور باقی عبارت سیاہ روشنائی سے لکھی گئی ہے۔ قلم جلی اور کتابت معمولی ہے۔ بعض مقامات پر عبارت پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے یا نہیں پڑھی جاتی، اس لیے کہ کہیں کہیں الفاظ اور جملے کرم خوردہ ہو کر غائب ہو گئے ہیں۔ ص ۶۱، تا ۸۴، پر بادامی کاغذ جوڑ لگایا گیا ہے۔ جس کی بنا پر ان صفحات کی عبارت ناقص ہے جسے دگر نسخوں کی مدد سے مکمل کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کے دیگر کتب خانوں میں موجود ہیں اور جن کا تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ضخامت و سائز:۔ "معدن تجربات" کا یہ نسخہ ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰ انچ اور چوڑائی ۶½ انچ ہے۔ سطریں فی صفحہ بیس ہیں۔

۲۔ "معدن تجربات" کا دوسرا مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار) میں موجود ہے۔ یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد مجلد ہے۔ جلد اوّل صفحہ ۱ تا ۲۲۴، اوراق پر اور جلد دوم ۲۲۵ تا ۴۵۲، اوراق پر یعنی مکمل کتاب ۴۵۲، اوراق پر مشتمل ہے یعنی ۹۰۴ صفحات پر لیکن یہ نسخہ جابجا کرم خوردہ ہے اور نمبر اس کا ۲۹۳ ہے۔ سطور فی صفحہ سترہ اور پیمائش ۹ x ۳ ۱/۲ x ۷ ہے۔ نیز حسب ذیل ہے :

"تمت بالخیر کتاب "معدن تجربات" بخط بندہ رستم علی بلگرامی ۱۱۸ھ۔"

سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

۳۔ "معدن تجربات" کا تیسرا کلی مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کا اے۔پی۔ اورینٹل لائبریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ عابد روڈ حیدرآباد میں موجود ہے جو ۴۱۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے:

"تمت تمام شد کتاب "معدن التجربات" بخط شکستہ دلخستہ خاکپائے اہل اللہ محمد برکت اللہ قوم جعفر طیاری ساکن شاہجہان آباد سرکار فیض آثار دولت مدار آسمان جاہ کیوان بارگاہ، شاہزادہ (نام مٹا دیا گیا ہے) دام اقبالہٗ۔"

۴۔ "معدن تجربات" کا مقالہ سوم جو قرابادینی مرکبات پر مشتمل ہے۔ اس کا مخطوطہ، کتب خانہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ ۲۵۵، اوراق یا ۵۱۰ صفحات پر مشتمل ہے فی صفحہ ۱۲ سطریں ہیں۔ لمبائی ۲۴ سینٹی میٹر چوڑائی ۱۵ سینٹی میٹر ہے۔ یہ مخطوطہ بھی کرم خوردہ ہے اور کہیں کہیں سے الفاظ غائب ہیں۔ اخیر میں "نسخہ عبداللہ" لکھا ہے۔ آخری جملہ حسب ذیل ہے:

"یہ اللہ، نہایت جلیل القدر و عظیم المنفعت است جہت امراض گردہ و مثانہ مجرب کوہی جمادہ"

اس طرح یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔

اس مخطوطہ کا خط شکستہ گو نختہ اور صاف ہے عناوین سرخ روشنائی سے اور باقی عبارت سیاہ روشنائی سے لکھی گئی ہے۔

یہ نسخہ "معدن تجربات" کے مرکبات پر مشتمل ہے۔ جس میں ترتیب حروف تہجی مرکبات کے نسخے درج کئے گئے ہیں از الف تا یا بمطابق مرکبات کے نسخے درج کئے گئے ہیں۔ اور معمولات مطب حکمائے قدیم سے کوئی نسخہ ایسا نہیں ہے جو اس میں درج نہ ہو۔ دراصل یہ قرابادین، معدن تجربات کے مقالہ سوم پر مشتمل ہے اور فہرست معدن تجربات میں یہ مقالہ "مرکبات معدن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی فہرست جو ابتدا میں مرتب کی گئی ہے حسب ذیل ہے:-

باب الالف :- در نسخہائے ایارجات والقروبا۔

باب الباء :- در نسخہائے بزرگدارو و بادہرہ و برشعثا و بنادیل و جبشی و بخورہا جوشش و بنادق و بورہ و برکی و بہرود و یاسلیقون و بنفشی و برودیا و باشورے۔

باب التا :- در نسخہائے تریاق و تریاخس و تیزاب ۔

باب الثاء :- در نسخہائے ثنا و ریطوس ۔

باب الجیم :- در نسخہائے جواہر مہرہ و جوارش و جُلاب و جُلنجبین ۔

باب الحاء :- در نسخہائے حب ہا و حشو و حسار و حریرہ و حلول و حمول و حقنہ

باب الخاء :- در نسخہائے خرم و خندیقون و خسرودارو و خروس مدبر و خیرہ و خل و خضاب و خلوق و خشکدارو و خشکنید و خمیس ۔

باب الدال :- در نسخہائے دیا قوذا و دوار المسک و دحمرتا و دبیدالورد و دوار الجنطیانا وغیرہ دوا ہا و دیک بردیگ و دبس و دلوک ۔

باب الذال :- در نسخہائے ذرور

باب الراء :- در نسخہائے راز ہران و روغن و رفادہ و ربوب و راب و رامک و روشنایا ۔

باب الزاء :- در نسخہائے زرعونی و زرد ق و زنیار ۔

باب السین :- در نسخہائے سکنجبین و سفرجلی و سبز بنیاد سفوف و سک المسک و فروسنونات و سورنجان و سلاقہ و سعوط و سردار میج و سریشم پنیر ۔

باب الشین :- در شلیسا و نسخہائے شراب و شموم و شیاف ۔

باب الصاد :- در نسخہائے صبوغ و صادوج و صلحہ ۔

باب الضاد :- در نسخہائے ضماد ۔

باب الطاء :- در طلا کہ قسمے از خمراست و طرب الجرا و نسخہا رطلا ۔

باب العین :- در نسخہائے عصیدہ و عطوس و عز پر و عبیر و عقد سیماب ۔

باب الغین :- در نسخہائے غرغرہ و غالیہ و غمزہ و غسول ۔

باب الفاء :- در نسخہائے فلونیا و فلاسفہ و فیروزنوش و فنجنوش و فیامن الحی و غندادیقون و فلافلی و فودنجی و فلدفیون و فقاح و فتیلہ و فرزجہ ۔

باب القاف :- در قفطارغان، قوفیون، قرادارو و نسخہائے قرص و قطور و قیروطی و قوقی و قوقایا و قمیہ ۔

باب الکاف :- در کلکلانج و نسخہائے کموتی و کاسکیبج و کشوثا و کلقند و لعوب و کماد و کیوسر و کحل و کل کلتہ۔

باب اللام :- در نسخہائے لبوب و لبان و لعوق و لخلخہ و لزوق و لصوق و لطوخ۔

باب المیم :- در مشہور دیطوو مخلصہ و مطیبہ الارواح و نسخہائے معجون، و مفرح و مطبوخ و باد ماء مرق و مطفئا و ملح و مخیض و مثلث و مری مسبل و مسمنہ و مخلی ملو و مسہل غذائی و غیرہ و مرض کلقند و مقوی و مجلی و مضمضہ و مضوغ و مروح و مشموم و مسوح و مقئی و مرہم۔

باب النون :- در نسخہائے نقوع و نطول و نبید و نفوخ و نرو و ند و نشوق۔

باب الواؤ :- در وزرہ معتدل و نسخہائے وجور۔

باب الہا :- در ہلام۔

باب لام الف :- در لاذق

باب الیاء :- در نسخہائے یاقوتی و یداللہ۔

۵ - مخطوط فصل سوم "معدن تجربات مولفہ حکیم محمد مہدی بن محمد جعفر اکبر آبادی تصنیف کردہ ۱۱۰۱ھ ذخیرہ حکیم سید ظل الرحمن تجارہ ہاؤس دودھ پور علی گڑھ میں موجود ہے۔ یہ ادویہ مفردہ سے متعلق ہے ادویہ کی شناخت اور بہم معنی اسماء کی تحقیق کے سلسلہ میں مولف کی کاوش نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ترقیمہ کے مطابق "کتاب طب فرہنگ ادویہ مفردات من کتاب معدن تجربات" کی قاضی امداد علی بن فتح علی ساکن چکلہ الالاوہ نے ادویہ ہندی و ولایتی کے مطالعہ اور دریافت احوال کی خاطر ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۱۲ھ میں کتابت کی ہے۔

حکیم محمد مہدی کی دیگر تصانیف

"معدن تجربات" کے علاوہ حکیم میر محمد مہدی نے چند دیگر مفید کتابیں علم طب میں تصنیف فرمائی ہیں جو بصورت مخطوطہ ہندوستان کے مشہور اور وقیع کتب خانوں میں موجود ہیں۔ راقم کی نظر سے آپ کی جو مختلف کتب خانوں میں گذری ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱ - مخزن اسرار اطباء :- حکیم محمد مہدی کی تصانیف سے یہ ایک نہایت ضخیم اور مستند کتاب ہے جو علم طب کے شعبہ کلیات و معالجات پر مشتمل ہے۔ اس کا مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری

پٹنہ اور اسٹیٹ آرکائوز حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ یہ دونوں نسخے راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں۔

خدابخش لائبریری میں "مخزن اسرار اطباء" کے مخطوطے کا ہینڈ لسٹ نمبر ۱۰۰۵ اور کیٹلاگ نمبر ۱۰۰۷ ہے۔ اس کے سرنامہ پر تحریر ہے :

" قد دخل فی ملک جدی و انتقل فی الآخر الی و انا العبد المذنب مظفر حسین عفی عنہ ابن مسیح الدّولہ مرحوم ۲۸ دسمبر ۱۸۹۹ عیسوی "

نیز اس نسخہ کے سرنامہ اور آخری صفحہ پر حکیم مظفر حسین ابن مسیح الدولہ کی ایک مہر ثبت ہے جس پر کندہ ہے :

" بر اعدائے دین شد مظفر حسین ۱۲۷۷ھ "

اس مخطوطہ کے اوراق کی تعداد ۳۲۱ ہے، اور ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں۔ نیز ناقص الآخر ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت مرقوم نہیں ہے۔

اسٹیٹ آرکائوز حیدرآباد اے۔پی (واقع عابد شاہ مارکیٹ حیدرآباد دکن) میں "مخزن اسرار اطباء" مصنفہ حکیم محمد مہدی کا مخطوطہ دو جلدوں پر مشتمل ہے موجود ہے۔ جلد اول صفحہ ۱ تا ۷۰۰ اور جلد دوم صفحہ ۷۰۱ تا ۹۹۷۔ ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں تحریر ہیں۔ ہر جلد کی پیمائش ½۲۲ × ½۲۱ سینٹی میٹر ہے۔ یہ نہایت مکمل نستعلیق نسخہ ہے۔

۲- رسالہ اسماء ادویہ :- یہ رسالہ سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات میں شامل ہے۔ یہ بترتیب حروف تہجی ہے۔ پندرہ اوراق پر مشتمل ہے۔ سطریں فی صفحہ ۱۸ ہیں پیمائش "۸ × ½۵ ہے۔

ابتداء :- " مقدمہ در بیان امور مفیدہ آنچہ دریں رسالہ مرقوم شد۔ اسماء ادویہ موافق لغت شاہجہان آباد نیست و ناموافق السلوک واالسنہ مختلفہ غیر مناسب و خواص ایجاد کتب ہند نیست نوشتہ میشود در صورت تناقض سوء ظن بمصنف بہم نرسانید مثل آنکہ سرد بار را ہم بنویسد و افعال آن و آنچہ خود در مزاج و خواص دریافتہ است از اجد نوشتہ "

خاتمہ :- " قدتم چند لغات ہندیہ کہ در رسالہ تصنیف حکیم محمد مہدی اکبرآبادی بیان آن شود از رسالہ تالیف شریف علی سبیل الاختصار در استعمال بنام مقالیکہ عزیمت نہضت از شاہجہان آباد مداستم نوشتہ شد تا بار رسالہ سابق ممزوج نمودہ حاوی اکثرے از ادویہ متعارفہ باشد واللہ اعلم بالصواب "

ارد، اسی، اڑیہ، اونٹ، الو وغیرہ۔

اس رسالے کے صفحہ اوّل کے بالائی حاشیہ پر رسالہ کا نام "مفردات ادویہ ہندیہ" غلط تحریر کیا گیا ہے اس لئے کہ اس نام کا دوسرا رسالہ نمبر ۳/۱۱ ہے جو سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ صحیح نہیں ہے۔

اس رسالہ میں حکیم محمد مہدی اکبرآبادی نے ادویہ کے ہندی ناموں کی وضاحت فرمائی ہے اور ان کے مترادف فارسی نام بھی لکھے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ایک نادر رسالہ ہے۔

۳۔ مفرداتِ ہندیہ :۔ یہ مخطوطہ ۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی دواؤں کی ترتیب بحروف تہجی ہے۔ حکیم محمد مہدی اکبرآبادی نے یہ رسالہ برائے علاج غربا و مساکین وغیرہ لکھا ہے۔ مفرداتِ ہندیہ سے امراض کے علاج سے متعلق یہ ایک مفید رسالہ ہے۔ ادویہ کے خواص سے متعلق حاشیہ بھی اس پر درج ہے۔ سطریں فی صفحہ پندرہ ۱۵ اور پیمائش ۲۱ × ۱۶ سینٹی میٹر ہے۔ اس رسالہ کا مخطوطہ عبدالسلام کلکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

حکیم محمد مہدی کی تصنیف "معدن تجربات" اور "مخزنِ اسرار الاطباء" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ایک عالم و فاضل اور ماہر و تجربہ کار طبیب حاذق تھے۔ آپ نے اپنے عہد سے قبل کی جملہ طبی تصانیف سے استفادہ فرمایا اور ان کا جامع انتخاب دو ضخیم و مستند کتب (۱) معدن تجربات (۲) مخزن اسرار الاطباء میں فرمایا۔ بالفاظِ دیگر پورے علم طب کو ان دو کتب میں اس طرح پیش کر دیا کہ علم طب حاصل کرنے کے لیے طالب علم طب کو ان کتب کے علاوہ دیگر طبی کتب سے رجوع کی حاجت باقی نہ رہے۔ یہ دونوں کتابیں علم طب کے جملہ اہم شعبوں پر حاوی اور نصابی اعتبار سے مکمل اور مستند کتابیں ہیں۔

وہ اطباء جنھوں نے فارسی زبان میں علم طب کی کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں حکیم محمد مہدی ممتاز ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے "معدن تجربات" اور "مخزن اسرار الاطباء" جیسی ضخیم کتب تصنیف فرما کے علم طب کو نا فارسی کتاب میں منتقل کر دیا ہے۔ اور اس اعتبار سے دونوں کتابیں حکیم محمد مہدی کا قابل قدر شاہکار ہیں اور یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ ان کا ترجمہ بزبان اردو شائع کیا جائے تاکہ اردو داں طبقہ و اطباء بھی ان معیاری کتب سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔

معدن تجربات کی افادیت

حکیم محمد مہدی نے "معدن تجربات" میں یہ اہتمام کیا ہے کہ جملہ انواع و اقسام مرکبات طبیہ کے متعدد

نے حکمائے متقدمین کی مستند کتب سے انتخاب کر کے شامل کتاب کئے ہیں جو باعتبار اجزا باہم مختلف ہیں اور یہ مجموعہ اس اعتبار سے مفید ہے کہ مریض کے مزاج اور حالات اور موسم کے اعتبار سے کوئی مناسب مرکب حسب حاجت انتخاب کیا جا سکتا ہے اور اسی اعتبار سے قرابادین "معدن تجربات" ایک نہایت مفید قرابادین اور ایک جامع فارماکوپیا ہے۔ اور اسی اعتبار سے اس کتاب کی قلمی نقلیں متعدد کی گئیں جو ہندوستان کے مشہور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ جن کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

حکیم محمد مہدی نے اپنی حذاقت کی بنیاد پر متعدد نسخے اختراع کئے اور مشاہیر اطباء نے ان نسخوں سے استفادہ فرمایا۔ مثلاً حکیم صاحب عالم خاں نے اپنے "معمولات" میں جوارش خنزیریا حکیم محمد مہدی اکبر آبادی کا نسخہ اپنے معمولات میں شامل فرمایا ہے[1]

"معدن تجربات" مصنفہ حکیم محمد مہدی اکبر آبادی کی تعریف پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن چیئرمین شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

> "معدن تجربات" مولفہ حکیم محمد مہدی بن محمد جعفر اکبر آبادی ۱۱۰۰ھ کی ادویہ مرکبہ اور ہندوستانی ادویہ مفردہ کے ذخیرہ کی قابل قدر کتاب ہے۔ مرکبات کے تفصیلی بیان کے علاوہ اختیارات بدیعی، تحفۃ المؤمنین اور الفاظ الادویہ کی ان غلطیوں کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے جو ان کے مصنفین نے مفردات کی عربی فارسی ناموں کے ہندی مترادفات کے سلسلہ میں کی ہیں۔ ادویہ کی شناخت اور ہم معنی ناموں کے مطالعہ میں مؤلف کی کوششیں نظر انداز نہیں کی جا سکیں گی۔ الخ"

واضح ہو ذخیرہ حکیم سید ظل الرحمٰن، عربی و فارسی نوادر، کتاب طب اسلامی برصغیر میں شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ ص ۱۲۹

مآخذ

۱۔ "تاریخ الاطباء" مؤلفہ حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی مطبوعہ مرطبی کتب خانہ کشمیری بازار لاہور ۱۹۱۲ء۔

۲۔ مخطوطہ "معدن تجربات" مکتوبہ سید علی نقی ابن سید ہادی علی جلالوی بتاریخ ۱۸ ربیع الاول ۱۲۲۳ھ ذخیرہ حکیم سید محمد ریاض الدین حسین بہاری کتب خانہ سید خیرات علی امام باڑہ سید خیرات علی گڑھی نصیر آباد ضلع علی گڑھ۔

۳۔ "آثر الامراء" مؤلفہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں مترجم پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ مرکزی

۱۔ معمولات حکیم صاحب عالم خاں نمبر ۲۱۵۹ مخطوطہ بزبان فارسی، طب خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ بہار۔

ایبٹ روڈ، ۳۶۹- جی گلبرگ، لاہور۔ بار اول جون ۱۹۶۰ء ص ۴۹۴، ۴۹۵-

۴- "تاریخ محمدی" مصنفہ میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خان دہلوی تصحیح و تحشیہ امتیاز علی عرشی لائبریرین رضا لائبریری رامپور، ناشر پروفیسر سید نور الحسن ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵- "اطبائے عہد مغلیہ" مؤلفہ حکیم کوثر چاندپوری۔

۶- "عالمگیر نامہ" مؤلفہ محمد کاظم بن محمد امین مطبوعہ کالج پریس کلکتہ

۷- "السبحۃ المرجان" مطبوعہ بمبئی۔

۸- "ماثر الکرام" مؤلفہ غلام علی آزاد بلگرامی

۹- "ماثر عالمگیری" مؤلفہ ساقی مستعد خان تصحیح آغا احمد علی بحکم ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ مطبوعہ ۱۸۷۱

۱۰- "علاج الامراض" مؤلفہ اشرف الملک حکیم محمد شریف خان صاحب دہلوی تصحیح حکیم سید فرید احمد عباسی پرنسپل تنانہ طبیہ کالج دہلی مطبوعہ محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء۔

۱۱- "تاریخ شاکر خانی" مؤلفہ شاکر خان بن شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق۔

۱۲- "طب اسلامی برصغیر میں" مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۸۸ء

(13) Pharmacy in traditional Medicine by Hakim Mohammad Abdur Razzack, Director Central Council for Research in Unani Medicine (Ministry of Health & F.W. govt. of India) New Delhi, December 22, 1986

۱۴- مخطوطہ "معدن تجربات" خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار)

۱۵- مخطوطہ "معدن تجربات" کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔ یہ مخطوطہ فی الحال اے پی۔ اورینٹل لائبریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ عابد روڈ حیدرآباد میں موجود ہے۔

۱۶- مخطوطہ قرابادین "معدن تجربات" کتب خانہ اجمل خان طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۱۷- "خزانۂ عامرہ" مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی در ۱۱۷۶ھ مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۲۸ء۔

۱۸- "سبحۃ المرجان" (عربی) مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی در ۱۱۷۷ھ مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ۔

۱۹- "طب اسلامی برصغیر میں" نادر طبی مخطوطات پر جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار منعقدہ مارچ ۱۹۸۶ء کے مقالات شائع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

ممالک اسلامیہ کے سفر نامے

جادۂ حق

سید اعظم علی عظیم آبادی

جادۂ حق

سیّد اعظم علی عظیم آبادی

(تصنیف = ۱۸۶۸ء)

سید اعظم علی صاحب (پٹنہ سٹی) شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء کو حج کے سفر کے لئے روانہ ہوئے اور جمادی الثانی ۱۲۹۷ھ کو واپس آئے۔ دوسری بار زیارات عتبات وعالیات (نجف وکربلا) سے مشرف ہوئے۔ ربیع الاوّل ۱۳۰۰ھ میں سفر کے لئے نکلے اور ربیع الاوّل ۱۳۰۱ھ میں واپسی ہوئی۔ سفر کا یہ دوسرا حصہ کسی اور موقع پر دیا جائے گا۔ سفر حجاز والا حصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے

سلسلۂ التاج المستطاع الیہ

الحمد للہ کہ کتاب لاجواب متضمن احوال سفر خیر جناب حاجی سید معظم علی صاحب مرحوم مغفور مسیری

جادۂ حق

حسب ارشاد جناب مولوی سید خیرات احمد صاحب وکیل ضلع گیا

[illegible]

جب ماہ مبارک رمضان گذر گیا اور تاریخ نوین شوال سنہ ۱۲۹۶ ہجری تاریخ روانگی قریب پہونچی بندہ مع اہلخانہ اپنے مکان مغلپورہ واقع شہر پٹنہ مین مقیم تھا برادرم میر مظفر حسین صاحب بھی بمقام مغلپورہ ہمارے پاس آپہونچے اور مولوی ستار حسین صاحب نے بھی شیخپورہ کلان سے بتاریخ مذکور آنے کا وعدہ مستحکم کیا اوسوقت میرے اعزہ مخصوص لخت جگرم سید خیرات احمد سلمہ بوجہ سفر دور و دراز ہم لوگون کے سخت مضطر و بیقرار تھے ہماری جانے سے زیادہ اہلخانہ کے جانے پر سبھونکو تعجب گذرتا تھا اور آپسمین کہتے تھے کہ خود جاتے ہین ایسی مریضہ ضعیفہ کو کسواسطے لئے جاتے ہین شاید اونکو اونکی مٹی لیئے جاتی ہے مگر وہ باوجود ضعف و نحافت کے اسقدر مستعد تھین کہ کسی کو مجال ممانعت نہ تھی اور مجکو تو یہ خیال تھا کہ ہرگاہ حکم خدا عورت و مرد دونون کے لیئے بدرجہ مساوی ناطق و نافذ ہے تو بندہ کو اونمین کیا سرتابی ہے حافظ حقیقی عورت مرد

سبھون کا ماں باپ سے زیادہ نگہبان ہے انشاء اللہ تعالےٰ منزل مقصود
تک پہونچا ہی دیگا اسواسطے نہایت بشاشت اور خضوع وخشوع سے
اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہے قبل تاریخ معینہ برادرم سید تفضل حسین صاحب
ہر سہ برادران و نورچشم پارۂ جگرم سید خیرات احمد عمرہ وقدرہ مکان مغلپورہ
محلات شہر پٹنہ معہ دیگر اعزہ واقارب واسطے وداع ہمارے مجتمع ہوگئے بوقت
وداع ہم لوگون کے فرزند ارجمند سید خیرات احمد سلمہ کی عجیب حالت
تھی کہ بوجہ مفارقت ہم لوگون کے نہایت پریشان واشک ریزان تھے اور
بوجہ سفر خیر ہمارے رخصت کرنے مین بھی نہایت سرگرم ومستعد رہے پارۂ جگرم
نورچشم نے ہم دونون والدین کو اپنے کسقدر خوش وخرم ومسرور ومشکور کیا
ہر وقت وہر لحظہ ہر اک رگ وریشہ سے ہم دونون آدمی ہر ہر عتبات عالیات مین
دل وجان سے اوسکے لئے دعا ترقیات عمر ودرجات واولاد واموال کی کرتے
ہے خداوند عالم قبول فرماوے. الغرض بتاریخ نہم شوال سنہ ۱۲۹۶ ہجری مطابق
۲۷ اگست ۱۲۸۶ فصلی یہ گنہگار بجملہ عزیزان اسٹیشن بنکی پور مین قبل دوپہر
پہونچگیا نورچشم ممدوح نے ایک درجہ گاڑی خاص بلا مداخلت احدے بتعین
مبلغ للعہ معہ اسباب ہر سہ کسان تا مقام اسٹیشن بمبئی مقرر کرکے و
پاس حاصل کرکے درجۂ مذکور مین آویزان کردیا اور پاس اسباب کا ہمارے
حوالہ کیا چنانچہ بعد نواخت چار گھنٹہ روز بعد دوپہر بندہ معہ اہل خانہ وشاگرد
خدمتگار وبرادرم مظفر حسین صاحب بے چھوٹے صاحب ساکن عظیم آباد جو میرے
ہمسایگان مین سے کرعازم زیارت تھے مع بھائی حامد کے میر محمد عظیم صاحب بجملہ ہفت کسان

گاڑی مذکور پر سوار ہوئے اور گھنٹی بجی اور گاڑی روانہ ہوگئی سب عزیزان
ہم سب مسافران سے رخصت ہوکر اپنے اپنے مقام پر گئے اور ہم لوگ اونکی
نظروں سے غائب ہوگئے اور دم بھر مین بانکی پور پہونچ گئے وہان عزیزم
مولوی نثار حسین صاحب بھی منتظر تھے فوراً اوسی درجہ مین ہمراہ ہم سبھون کے
سوار ہوگئے اور گاڑی روانہ ہوئی دوسرے روز قریب صبح گاڑی اسٹیشن
نینی مین پہونچ گئی سب لوگ وہین فرود ہوکر حوائج ضروریات سے فرصت کرکے
فکر اکل و شرب مین مصروف ہوئے اور اوس روز شب وہین بازار مین مقیم
رہے جب گھنٹی بجی فوراً سب مسافران ٹکٹ جبل پور کا فی کس پیسے مین حاصل کرکے
بتاریخ گیارہوین روز دوشنبہ گاڑی پر سوار ہوئے اور صبح ہوتے
جبل پور پہونچ گئے اور گاڑی سے فرود ہوکر بسواری پالکی گاڑی سرا مین آکر
مقیم ہوئے جیسے سرای نینی کی تھی ویسے ہی سرائے جبلپور کی بھی بے مرمت
اور ویران پائی گئی ناگزیر ایک کوٹھری چند آنہ پر کرایہ لیکر شب بسر کی اور
اکل و شرب سب لوگون کا بخوبی ہوا کسیطرح پر کچھہ تکلیف نہوئی اور چونکہ اسباب کا
ہمراہ ریک مین لیجانا باعث زیرباری تھا اسواسطے ہم لوگون نے اسباب اپنا
اپنا جبلپور سے یکسو بمبئی روانہ کردیا اور پاس رکھ لیا اور ٹکٹ بھی جبل پور سے
بمبئی تک فی کس مبلغ آٹھ روپیہ مین حاصل کرکے بتاریخ ۱۲ شوال گاڑی پر
سوار ہوئے اور دوشبانہ روز مین بتاریخ ۱۴ شوال اسٹیشن بھائی کلہ
شہر بمبئی مین پہونچکر گاڑی سے فرود ہوئے اور بسواری بگھی اسٹیشن سے
امام باڑہ میر ببر علی صاحب مرحوم مین آکر مقیم ہوئے سبحان اللہ کیا خوب

امام باڑہ سہ منزلہ ہے ہرجگہ حاجیان و زنہانان کرایہ دیکر فرود ہوتے ہین
بندہ مع اہل خانہ نیچے کے درجہ مین اور جملہ ہمراہیان بالاخانہ کے درجہ مین
فرود ہوکر بہ انتظار جہاز بیس ۲۰ پچیس ۲۵ روز تک مقیم رہے اس عرصہ مین مرزا
قربان علی صاحب یکے از رفقاے نواب ولایت علیخان صاحب بہادر
بھی پہونچکر ہملوگون کے ہمراہ ہوگئے۔ بمبئی عجب شہر عظیم الشان ہے جسکے مکانات
سب عمدہ اور بلند اور سڑکین چوڑی ہین دوکانون کی انتہا نہین اور
زبان بمبئی وہانکی مختلف ہے۔ مہرٹی۔ سندھی۔ تلنگ۔ ناگپوری۔ پارسی انگریزی
جاری ہین مگر اردو ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے روزمرہ ہم لوگ یعنی برادرم
مظفر حسین صاحب و مولوی نثار حسین صاحب واسطے سیر و تفریح کے گشت
کیا کرتے تھے اور باعث عزیزان ہموطن ہونیکے کمال لطف تھا خورد و نوش
کی چیزین ہر قسم کی میسر آتی تھین چونکہ جہاز پر چیزین کھانے پینے کی بکتی نہین ہین
اسلئے ہملوگون نے بحری سفر کے انداز سے جنس اور گھی وغیرہ خرید کرلیا اور ایک
تھان کپڑا سنگین ۱۶ سولہ گز عمدہ حسب خواہ واسطے احرام حج کے خرید کرکے
ہمراہ لے لیا بعد مہیای سامان سفر بانتظار جہاز بہت ایام گذارے ہوے چند
اشخاص لکھنؤ ہم سفر تھے بہ صلاح و مشورہ اون کے سب لوگون نے حبشی جہاز
کی ٹکس تیس ۳۰ تیس روپیہ کی حاصل کرکے منتظر وقت رہے چنانچہ بعد انتظار
بسیار اشتہار ہوگیا کہ اب جہاز کھلتا ہے۔ سب حاجیان جلد سوار ہون
بمجرد اشتہار کے ہم سب مسافران راہ خدا ایک چھوٹی کشتی کہ جسکو بمبئی مین
ہوڑی کہتے ہین سفر کرکے بتاریخ ہفتم شہر ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ کشتی مذکور پر سوار

ہوئے اور قریب جہاز کے پہونچا اور اسباب جہاز پر روانہ کرنے لگے بعد اوسکے
خود سوار ہوکر بنہایت عافیت و آسانی سے بالائی جہاز پہونچ گئے اور اندر طرح طرح
کے فرود ہوئے وہ جہاز ترکل کمپنی کا بہت بڑا وسیع تھا جس طرح سے کہ لوگ
بلکہ فرود ہوئے غالبا دو تین سو آدمی سے کم نہ تھے علاوہ اوس کے
جہاں جہاں جسکو جگہ ملی سطح و عرشہ وغیرہ مین بستر لگا کر بیٹھ گئے
اور اپنے اپنے صندوقون کو تین طرف رکھ کر اپنی جگہ مین کسلی اس جہاز پر
بڑے بڑے امرا و علما وغیرہ خاص ساکنان شہر بمبئی ہی سے تھے. اور
کل مسافر تخمینا پندرہ سو سولہ سو سے کم نہونگے آخرکار آٹھوین یا نوین
ذیقعدہ کو لنگر اوٹھا اور جہاز روانہ ہوا آناً فاناً تمامی عمارات و مکانات شہر
بمبئی کے نظروں سے غائب ہوگئے پھر تو بجز آسمان سیاہ اور پانی
سیاہ سمندر کے کچھ نظر نہ آتا تھا جدھر نظر کیجیے آسمان ہی آسمان تھا یا
پانی پانی بعد چند ساعت کے سب آدمیون کو متلی وقی و چکر و دوران سر ایسا
ہونے لگا کہ عیاذاً باللہ دم بھر میں ہر کس و ناکس پریشان و نیم جان ہوگیا
جسکو دیکھا بدحواس سر بزانو پایا۔ اہل خانہ کو ہماری تو کشتی پر سوار ہوتے ہی
متلی ہونے شروع ہوگئی تھی جہاز پر پہونچے پہونچے نہایت بیچین ہو گئین
اور جہاز کے چلنے کے بعد اونکا تو کچھ ٹھکانا نہ تھا بالکل نیم جان تھیں علی ہذا القیاس
برادرم سید مظفر حسین صاحب مولوی نثار حسین صاحب وغیرہ مسافران
[illegible] دنیا کے بہت پریشان ہوگئے شکر خدا کہ بندہ کو متلی وغیرہ کچھ نہین ہوئی
تا اینکہ تیسرے چوتھے روز جہاز کراچی بندر پہونچ گیا اور پانچ چار روز تک

تنگ زاید ازحد تھا کہ اس وجہ سے سب لوگون کی جان مین جان آئی قے متلی دور
ہوگئی کھانے پینے کی خواہش ہوئی برادرم میر مظفر حسین صاحب
و مولوی نثار حسین صاحب جہاز سے فرود ہوکر بسواری کشتی کوچک اندر
شہر کراچی بندر کے گئے اور اشیاء خوردنی روٹی گوشت پختہ و خام وغیرہ
خرید کر لائے سبھون نے خوب خوب نوش جان کیا اور دو تین روز نکالنا
ہونے سے سب لوگ قوی و توانا ہوگئے جہاز ایسا کلان وسیع تھا کہ کبھی
تلاطم و تہلکہ کچھہ نہوا مگر تازہ یہہ مصیبت پیش آئی کہ جس طوطع مین ہملوگ
فرود تھے اوس مین مال تجارتی بہت تھا اسواسطے سب حاجیونکو حکم ہوا
کہ اپنا اپنا بستر بوریا لوٹا علحدہ علحدہ اوٹھا رکھین کہ اس طوطع سے مال
تجارت خلاص ہوگا اور اس شہر سے بھی مال تجارت لیا جائیگا چنانچہ کشتی ہاے
تاجران ہر طرف جہاز کے مجتمع ہوگئی باستماع اس حکم کے عجب طرح کا انتشار
ہوگیا دم بھر مین سبھون نے اپنا اپنا بستر اوٹھالیا سب طوطع کا تختہ اوٹھا کر
علحدہ ہوگیا بوڑہ کھینچنے کی کل کھڑی ہوگئی گھرنی کل کی گھر گھرانے لگی
اور مال اندر طوطع کے جانے لگا تین روز تک سبھونکا یہ حال رہا دن رات ہم
ر اکھانے پینے سونے بیٹھنے کا کچھہ ٹھکانا نرہا بارے تیسرے دن بعد داخل خارج
مال تاجران سب طوطع بند ہوگیا سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر آکر تکیہ بچھونا
کرنے لگے واضح ہو کہ اسوقت بہت ہوشیاری و چالاکی درکار ہے کہ جلدی سے اپنا اپنا
بستر لگا دین ورنہ جگہ چھین جانے سے کف افسوس ملنا ہوتا ہے اور چونکہ اسوقت
ہر شخص اپنی اپنی جگہ کی خواہش کرتا ہے اسلئے شور و غل بھی ہوتا ہے اسوجہ سے ہم

ہندیونکو بہتر ین زبانی بھی ضرور ہے عرب و عجم خوب دھینگا مشتی کرتے ہین۔
غرض بعد تھوڑی دیر کے جہاز نے لنگر اٹھایا اور چندروز کے بعد عدن پہونچگیا
اور لنگر انداز ہوا یہان معلوم ہوا کہ عدن مین بھی جہاز چندروز لنگر انداز رہیگا
اور آیندہ بھی جابجا مال تجارتی لیتا دیتا جائیگا اس مین ایام گذاری بہت ہوگی
باستماع اس امر کے سب حاجیونکو بڑا تردد ہوگیا کہ اس ایام گزاری مین اگر
زمانہ حج کا خدانخواستہ گذر گیا تو قیامت ہے اسواسطے سبھون نے بڑا بلوا
کیا بلکہ چند اشخاص عدن مین جاکر محکمہ انگریزی مین مستغیث ہوئے کہ اگر ایام گزاری
مین زمانہ حج کا گذر جائیگا تو ہملوگ کا ہرج عظیم ہوگا اور جہاز پر بھی کپتان کو
سبھون نے بہت پریشان کیا اور بڑا ہنگامہ مچایا اسواسطے کپتان نے مالک جہاز
کو بمقام بمبئی تار دیا کہ حاجیان بلوا کرتے ہین سو بہتر ہے پہلے حاجیون کو جدہ پہونچا
یا تاجرون کا مال خلاص کرین مالک جہاز نے بمبئی سے فوراً تار دیا کہ پہلے
حاجیون کو جدہ پہونچا دو تب تاجرون کا مال خلاص کرو چنانچہ دوسرے روز
اہالیان جہاز نے سبھون کو خوشخبری سنائی کہ حاجیو حاجیو مالک جہاز کی اجازت
آئی اب پہلے آپ سب حاجیون کو جدہ پہونچا لینگے تب مال تاجرون کا
خلاص کرینگے اب آگے کہین لنگر نہوگا بمجرد استماع اس مژدہ کے سب
باغ باغ ہوگئے تا اینکہ بعد دو یک روز کے سب لوگون کو دیکھا کہ احرام حج
باندھنے لگے اور دو تین روز تک احرام باندھے رہے معلوم ہو کہ محاذی یلملم
کے جہاز پہونچگیا مگر لنگر انداز نہوا اور روان رہا باینہمہ حاجی احرام
باندھتے رہے ہم سب اہل عظیم آباد و لکھنو کا عزم بالجزم ہوگیا تھا کہ محاذی

میقات جہاز پر احرام باندھنا خالی دغدغہ سے نہین ہے اور ہمارے برادرم حاجی
مولوی وزیر علی صاحب نے بھی تاکیداً ایسا ہی لکھا تھا کہ بمقام سعدیہ میقات پر پہونچکر
احرام باندھنا محض بے دغدغہ ہوگا اسواسطے ہملوگون کا ارادہ مستحکم ہوگیا تھا
کہ سعدیہ میقات امین پر پہونچکر احرام حج باندھینگے الغرض بمبئی سے بتیس[؟] کئیس
روز مین جہاز جدہ پہونچکر لنگرانداز ہوا سب حجاج بہت بہت شکر خدا کرکی
چھبیسوین ذیقعدہ کو جہاز سے فرود ہوئے اور کشتی ہای کوچک جو گرد جہاز
مجتمع ہوگئی تھی مقرر کرکے معہ اسباب سوار ہوئے کشتی والون نے حسب
معمول کشتی کو صین خانہ کمرک مین لگا دیا اور مردونکو اتار دیا کہ محصول سرکاری
داخل کرکے کنارہ دریا چلے آوین اور اسباب اوتروالین ہم سب مسافران
راہ خدانی کس یک یک روپیہ محصول داخل کرکے اپنی کشتی پر آئے اور سب اسباب
اوتروالیا اور سب عورتین بھی فرود آئین تا اینکہ شام ہوگئی تلاشی والہ عملہ شاہی
برخواست کرکے پیادہ تعینات کر گئے کہ سب لوگ اسوقت کنارہ دریا شب باش
قیام کرین صبح کو بعد تلاشی اندر شہر جانا ہوگا ناگزیر شباش سب لوگ مع اسباب
کنارہ دریا فرود رہے جب صبح ہوئی عمال شاہی نے آکر ہر ہر صندوق کو کھولکر ہر ہر چیز
کو خوب اولٹ پلٹ کرکے بخوبی تلاشی کی کوئی مال ناجائز نہ ملا اسپر بھی فی صندوق
یک یک روپیہ محصول لیکر رہا کیا اور یہہ سب انتظام طرف سے سلطان روم کے مقرر
ہے۔ الغرض بعد اس خرابی و تلاشی کے سب مسافران مع اسباب اندر شہر داخل
ہوئے مرزا محمد علی صاحب نائب و سید ابو الفضل صاحب معلوف نے واسطے لیجانے
حاجیان و زوار ان کی چند قطعہ مکانات کرایہ مین مقرر کر لیا تھا انھین مکانون

ہم سبھونکو بھی جگہدی کہ ہم سب مسافر وہان فرود ہوئے اور جو کچھ اسباب معرفت
معلوف صاحب کی بہ بار برداری شتران روانہ مکہ معظمہ کیا گیا اسباب زیادہ تھا
فی کس ایک ایک اونٹ سات سات روپیہ کرایہ پر مقرر ہوا اور واسطے سفر سعدیہ
کے ایک اونٹ اسپچے واسطے بہ کرایہ مبلغ ہفتدہ روپیہ مع آمد و رفت تا مکہ
معظمہ اور دوسرا واسطے حاجی شاکر کے بکرایہ ہفت روپیہ مقرر کیا اور ایک
شغدف بھی دس روپیہ کو خرید کیا اور بتاریخ اٹھائیسوین شہر ذیقعدہ تاریخ
روانگی مقرر ہوئی اور جب شہر جدہ مین داخل ہوئے تو اپنی جدہ معظمہ حضرت
حوا علیہا السلام کے مزار مبارک کی زیارت کی بڑی تمنا ہوئی ایک خادم
کو وہان کے ہمراہ لیا اور برادرم میر مظفر حسین صاحب و مولوی نثار حسین
صاحب تینون آدمی واسطے زیارت قبر اطہر حضرت حوا کے چلے روضہ
مبارک بڑا طول طویل بہت کلان نظر آیا ایک گنبد بالائے سر دوسرا قریب
کمر اور دونون پانون کا نشان تا سمندر پہونچا ہوا معلوم ہوا حسب ہدایت
اون خادم صاحب کے زیارت سے مشرف ہوکر مقام پر واپس آئے اور شکر
خدا کیا کہ پہلے زیارت سے اپنی جدہ معظمہ حضرت حوا کے مشرف ہوئے سید ابو الفضل
صاحب معلوف ماشاء اللہ بڑے مردم دیانت دار ہین ہم لوگ سب مسافرون
نے کل اسباب مع نقد روپیہ اور کاغذات نوشتہ وغیرہ باخذ رسید حوالہ اون
کے کر دیا کہ مکہ معظمہ پہونچکر واپس لے لینگے اور کچھ مختصر اسباب بقدر ضرورت
اخراجات آمد و رفت سفر سعدیہ کے ہمراہ لیا اور بتاریخ ۲۹ ذیقعدہ بسواری
شتران کہ جسکے دونون طرف شغدف مثل دو میانہ کوچک کے بندھا رہتا ہے

ایک طرف خود ذا ایک طرف اہلخانہ سوار ہوئے اور شاکر تنہا ایک اونٹ پر بطور گھوڑہ کے سوار ہوا او ز قریب شام سب حاجی روانہ ہوئے یہہ قافلہ آخری بہت چھوٹا تھا غالبًا اونیس بیس اونٹ سے زیادہ نہوگا اور سفر پر خطر تھا مظوف صاحب نے ایک شخص کو سردار قافلہ مقرر کرکے ہمراہ کردیا تھا کہ وہ محافظ و مددگار رہینگے اول روز بمقام ہدیدا مقام ہوا بعدہ یہہ طور رہا کہ تمام دن کھانے پینے آرام مین کٹتا تھا اور شب کو کوچ ہوتا تھا تا اینکہ چوتھے پانچوین دن بمقام سعدیہ میقات الیمن پر پہونچ گئے۔

چوتھے پانچویں روز ذی الحجہ کے بوقت صبح داخل مکۂ معظمہ ہوگئے مرزا محمد علی صاحب مطوف نے ایک مکان کرایہ کا دلوادیا اوس مین سب لوگ فرود ہوئے اور بعد الفراغ اکل و شرب وغسل مستحب کے واسطے طواف خانہ کعبہ کے مستعد ہوگئے مرزا صاحب موصوف سب حاجیون کو ساتھ اپنے لے چلے قریب دوپہر حرم محترم میں داخل ہوئے۔

ایک روز مرزا محمد علی صاحب نائب مطوف و شیخ سالم افسر جمالان

واحمد جمال نے ہملوگون کے پاس آکر کہا کہ عمال سلطانی نے کرایہ
شتران بابت آمد و رفت مدینہ منورہ تا جدہ باقرار اقامت
یک ہفتہ بمقام مدینہ طیبہ فی شتر شغدف دار تیس ریال تجویز
کردیا ہے اور تاریخ روانگی قافلہ بھی مقرر ہوگئی ہے ۲۶ ذی الحجہ
کو قافلہ روانہ مدینہ طیبہ ہوگا۔ آپ سب حاجیون کو جتنے شتر
مقرر کرنے ہون مقرر کر لیجئے اور آمادہ سفر رہیے۔ چنانچہ
ہمنے ایک شتر با شغدف واسطے اپنے اور ایک شتر بہ نصف کرایہ
واسطے حاجی شاکر کے پینتالیس ریال پر کہ جسکا بحساب انگریزی
مبلغ [illegible] ہوتا ہے مقرر کر لیا اور احمد جمال نے جو سفر
عرفات مین ہم سبھون سے بہت خوش ہوا تھا خود درخواست
واسطے لیجانے ہملوگون کے کی ہم سبھون نے بھی بدل منظور
کیا اور مرزا محمد علی صاحب اور سید ابو الفضل صاحب
معلوف کی بقدر وسعت خدمت کی اور علاوہ اوسکے حق امانت
اسباب کا بھی نذر کیا اور کل کرایہ شتران کا موصوف الیہ کو بے باق دیدیا
موصوف الیہ سفر مدینہ منورہ مین برابر ہملوگون کے ہم سفر و معین
و مددگار رہے اور جسقدر مال و اسباب نقد و جنس وغیرہ جدہ
مین حوالہ موصوف الیہ کے کر کے مکہ معظمہ پہونچکر واپس لے لیا
تھا اب بر وقت سفر مدینہ منورہ کے اسباب صرف بقدر ضرورت
ہمراہ لیکر باقی سب اسباب مع نقد و نوٹ وغیرہ حوالہ موصوف الیہ

سے کیا کہ بعد مراجعت مدینہ منورہ کے جدہ پہونچکر کل اسباب
مفوضہ واپس لینگے - چنانچہ بتاریخ ۲۶ ذی الحجہ قافلہ مدینہ طیبہ جانے کو
طیار ہوگیا اور احمد جمال مع شتران واسطے ہملوگون کے
لیکر حاضر آیا اور باربرداری ہونے لگی سب حاجی یکے بادیگری روانہ ہونے لگے
ہملوگ اوس روز بمقام وادی الفاطمہ بانتظار قافلہ متوقف ہوئے وہان ایک چھوٹی
پہاڑی سے ایک چشمہ آب خوب صاف وشفاف جاری تھا سب
لوگ اوس روز وہین مقیم رہے اور خوب غسل وطہارت کیا - شام
تک سب حجاج مجتمع ہوگئے اور قافلہ تین چار سو آدمیون کا شامل
ہوگیا کچھہ رات رہے قافلہ روانہ ہوا اور منزل بمنزل قیام
ہونے لگا - آبادی بستی کہین کچھہ نہین تھی - جہان جہان کنوان ملتا
تھا وہی منزل قرار پائی تھی - بعد وادی فاطمہ بیر محسن بعد اوسکے
بیر عسفان بعد اوسکے بیر قدیمہ بعد اوسکے نصف راہ مین رابغ بلا
جسکو اکثر رابق بھی کہتے ہین - یہان آبادی بستی کی بطور قصبہ
کے ہے اور قلعہ شاہی بھی ہے جس مین عسکر شاہی رہتے ہین
اور یہہ بستی کنارہ سمندر کے ہے اکثر چیزین کھانے پینے کی ملتی
ہین بعد اوسکے بیر ابی الحصان بعد اوسکے شریفہ قریب مدینہ
منورہ کے واقع ہے چنانچہ ہملوگ چلتے چلتے بتاریخ دہم محرم
الحرام مین روز عاشورہ کو داخل مدینہ منورہ ہوگئے - مرزا
محمد علی صاحب بھی ہمراہ قافلہ تھے وہان بھی ایک قطعہ مکان پختہ

دو وسیع کہ جس مین سب لوگ بہ آسایش تمام قیام پذیر رہین کرایہ
مین دلوادیا اور سب حجاج اوس مین قیام پذیر ہو گئے سب ہمراہیان
نے صلاح کی کہ امسال روز عاشورہ بجا لا کر اعمال زیارت رسول خدا
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بجالانا چاہیے۔ چنانچہ سب لوگ امام باڑہ
موسومہ حسینیہ مین گئے اور اعمال زیارت عاشورہ بجالاے بعد اوسکے
اپنے منزل پر آئے اور سب زواران ہمراہ شیخ امیر اللہ صاحب خادم
حرم محترم مسجد نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مین داخل ہوئے سبحان
اللہ عجب بارگاہ عرش پناہ ہے کہ فرش سے عرش تک نور نظر آتا ہے
حسب ہدایت خادم موصوف اولاً زیارت حضرت رسول خدا صلے
اللہ علیہ وآلہ وسلم بعدہ زیارت حضرت سیدہ خاتون جنت فاطمہ زہرا
بتول عذرا اندر ضریح مبارک حضرت رسول خدا اور پھر درمیان
منبر و ضریح مبارک پڑھکر دو دو رکعت نماز زیارت ادا کی اور بحصول
اس نعمت عظمیٰ کے سجدات شکر بجالایا کہ بعد حصول زیارت روضۂ
مطہر رسول خدا اعمال حج کامل ہو گیا۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے
کہ جسنے حج کیا اور ہماری زیارت کو نہ آیا اوسنے مجھ پر ظلم کیا۔

••

علومِ اِسلامیہ

- ہندستان اور مغرب میں فلسفے کی شرح نگاری کا روایتی انداز اور مسلمانوں کی شرحیں

مولانا محمد عبدالسلام خاں
(سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور)

ہندوستان اور مغرب میں فلسفے کی شرح نگاری کا روایتی انداز اور مسلمانوں کی شرحیں

(راجستھان یونیورسٹی جے پور کے سیمینار میں ۱۳ مارچ ۱۹۸۹ء کو پڑھا گیا)

حکمت و فلسفہ مسلم فلاسفہ کے نزدیک وجودی حقیقتوں کے واقعی احوال کو متوسط انسانی عقل کی رسائی (تک) جاننے اور سمجھنے کا اور اگر وہ عملی ہیں تو جاننے کے ساتھ ان کو عمل میں لانے کا نام فلسفہ ہے۔* چنانچہ [illegible]انیات، معاشریات اور سیاسیات فلسفے کا عملی حصہ ہیں اور طبیعیات، ریاضیات اور مابعد الطبیعیات ان کا فکری اور نظری حصہ۔ یہاں فلسفے سے مراد یونانیوں کا یہ عام مفہوم نہیں بلکہ صرف مابعد الطبیعیات ہے یعنی ایسی بنیادی حقیقت یا حقیقتوں کا علم جن کے جان لینے سے ساری وجودی حقیقتوں کی توجیہ ممکن ہو سکے۔ اپنے اس معنیٰ میں فلسفہ بہت محدود اور صرف الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے چھوٹے سے حصے کا نام رہ جاتا ہے۔

مسلم فلاسفہ اور آزادیٔ فکر اس محدود معنیٰ میں مسلم فلسفے میں مکمل آزادیٔ فکر اور خالص فلسفیانہ غور و خوض کی تلاش زیادہ تر عبث ہے۔ مسلم فکر اسلام کے بنیادی عقائد اور اس کے عملی رخ کی سختی سے پابند رہی ہے۔ نتیجۃً ان کا فلسفہ ایک خاص دائرے کے

---

* شرح ہدایۃ الحکمۃ از خیرآبادی، مطبوعہ شعلۂ طور ص ۵

اندر ہی محدود رہا۔ ان کا یہ فکری انداز مابعد الطبیعیات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ ان کے تمام علوم و فنون میں عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم فکر کو وہ آزادی میسر نہ آئی جو فلسفیانہ فکر کی پہلی ضرورت ہے۔ چناں چہ بنیادی فکروں کے اختلاف کی بنا پر ان میں مختلف اور متناقض مدارس فلسفہ وجود میں آ سکے۔ باری تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وحدت ان کی فکر کا وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے ان کا فکری سفر شروع ہوتا ہے۔ اسی بنیادی فکر کی بدولت ان کی الٰہیات کی قریب قریب سب بحثیں ان کی طبعزاد ہیں؛ رسالت حشر و نشر، ثواب و عذاب اور اخروی سعادت و شقاوت ان کا اپنا فکری اثاثہ اور یونانی فکر پر اضافہ ہیں۔

نوفلاطونی فلسفہ اور مسلم فلاسفہ

اسے مسلمان فلسفیوں کی غلط فہمی کہیے، مخطوطے کا اپنا غلط انتساب باعث سمجھیے یا ترجموں کی غلطی مانیے کہ مسلمانوں تک یونان سے ارسطو کے نام سے جو الٰہیات پر تحریر پہنچی وہ اسکندریہ کے نوفلاطونی فلسفی اور افلاطینوس[1] کی الٰہیات کا ایک حصہ تھا جس میں فرفوریوس[2] کی تشریحات شامل تھیں[3]۔ چونکہ یہ نوفلاطونی فلسفہ متصوفانہ[4] تھا اور اسلامی عقائد سے بنیادی طور پر متصادم نہ تھا اس لیے مسلمانوں میں مقبول ہو گیا، ابونصر فارابی[5] نے اس کی تنقیح کی، افلاطون سے اس میں جو اختلافات پائے ان کی توفیق اور تشریح کی۔ شیخ ابوعلی ابن سینا[6] نے شفا وغیرہ اپنی کتابوں میں اس کی تہذیب و تفسیر اور اس پر اضافے کیے[7]۔ مغرب میں ابن رشد[8] وغیرہ۔

---

[1] افلاطینوس مصر کا باشندہ تھا، روم میں معلم کی حیثیت سے سکونت اختیار کر لی تھی ۲۶۹ء میں وفات پائی۔

[2] فرفوریوس افلاطینوس کا شاگرد اور اس کا سوانح نگار ہے۔ افلاطینوس کی تحریروں کو اسی نے مرتب کیا تھا۔ ۳۰۳ء میں وفات

[3] ...bic thought and its place in History by O'Leary p. 116

[4] Short History of Philosophy by Alexander p. 141

[5] ابونصر محمد بن محمد بن طرخان ملقب بہ معلم ثانی متوفی ۳۳۹ھ

[6] شرف الملک، الشیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا متوفی ۴۲۸ھ

[7] مرقاۃ از فضل امام وغیرہ

[8] ابوالولید محمد بن احمد ابن رشد القرطبی متوفی ۱۱۹۸ء

اس کو رواج دیا،[1] اس کی تفسیر کی، تکمیل کی اور زیادتیں کیں۔ ابن رشد اگرچہ مشرق میں زیادہ روشناس نہ ہو سکا اور شیخ الرئیس کا ہی طوطی بولتا رہا لیکن مغرب میں ارسطو کا سب سے بڑا شارح مانا گیا اور اپنے یہودی مداحوں کے توسط سے اس کا تشریحی فلسفہ مغرب کی درسگاہوں میں بار پا گیا۔ غرض نو فلاطونی فلسفہ ارسطو کی طرف غلط انتساب کی وجہ سے براہ راست یونانی فلسفہ سمجھا جانے لگا۔ چونکہ مسلم فلسفیوں نے اپنے اضافوں، تکمیلوں اور تنقیحوں کو الگ نہیں کیا تھا بلکہ قدما کی تشریحوں میں مخلوط کر دیا تھا[2] اس لیے وہ سب یونانی فلاسفہ کی ملک مان لی گئیں جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی مجموعی صورت میں یہ مسلمان فلاسفہ کی اپنی مستقل فکر تھی، یونانی فکر سے بالکل الگ۔ چنانچہ اس کو مسلمانوں کا فلسفہ اور اس کے مفکرین کو مسلم فلاسفہ کہا جانے لگا۔

مسلم فلاسفہ اور ان کی اصالتِ فکر

یہ سچ ہے کہ مسلم فکر کا سرچشمہ براہِ راست بھی اور بالواسطہ بھی یونانی فلسفہ تھا، تاہم یہ کہنا مسلم فلاسفہ پر ظلم ہے کہ ان کی فکر میں اصالت اور اُپج نہیں ہے۔ مسلم فکر اگرچہ مذہب کے دائرے میں محصور رہی لیکن یہ دائرہ تنگ نہیں بلکہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں الحاد تک سما گیا، بہت سی ایسی فکروں کو جو نہ صرف یہ کہ اسلام سے بے تعلق بلکہ اسلام کے مستند عقائد سے متناقض ہیں، ان کے حامیوں نے اس وسیع تر دائرے میں شامل رکھا ہے، چنانچہ اس دائرے میں محصور ہوتے ہوئے بھی مسلم فلسفے میں کافی اصالت اور طبع زادگی ہے۔ اسی فکری اصالت اور طبع زادگی کی بنا پر اس میں متعدد مذہبی فلسفیانہ مدارس وجود میں آئے اور پھلے پھولے مسلمانوں کا علم کلام اور پھر اس میں اعتزال اور اشعریت، تصوف اور باطنیت مسلمانوں کی فکری اصالت اور طبعی جدت کی پیداوار ہیں۔[3] یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مسلمان فلاسفہ نے یونانی فکر کو جوں کا توں قبول نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ اس میں ان کی اپنی تنقیحیں، طبع زاد تفسیریں، تکمیلیں اور اضافے بھی شامل تھے جو خالص فلسفے میں بھی ان کی اصالتِ فکر اور جدتِ طبع پر دلیل ہیں، ان مدارسِ فکر میں سے

---

[1] Arabic thought and its place in History by O'Leary p. 253

[2] ابن رشد از رینان (ترجمہ جامعہ عثمانیہ) ص ۹۵

[3] ابن رشد از رینان (ترجمہ جامعہ عثمانیہ) ص ۹۹

تصوّف نے تو ہندوستان بھر کر یہاں کی فکر پر اثر ڈالا بھی اور قبول بھی کیا۔ جیسا کہ ہندوستانی صوفیہ وجودی تصوّرات اور ہندو ویدانت کے تقابلی مطالعے سے اور مسلم صوفیوں کے عشق و محبت ا آخری زمانے کی ہندو بھگتی کے مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے[1]

مسلم فلسفہ پر عدم اصالت اور نقالیٔ محض کے بے جا الزام کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ مسلم فلاسفہ نے قدما خصوصاً ارسطو سے غیر معمولی حسنِ عقیدت کی بنا پر اپنی فکر کو اُن کی نمائندہ قرار دیا اور اُن سے لیے ہوئے اجزا کو اپنے تنقیدی، تکمیلی اور مستزاد اجزاء سے الگ نہیں کیا ایک کُل کی صورت میں مرتب کیا، جہاں ضرورت سمجھی قدما کے اختلافات بھی ذکر کیے اور اُن تردید و توضیح بھی کی لوگوں نے بے مقابلہ کیے اس کو یونانی فلسفے کی ترجمانیٔ محض سمجھا۔ یہ دوسروں ہی کی بات نہیں بلکہ خود ہمارے متاخرین نے بھی اُن کی اپنی خالص فکر کو قدما کی فکر سمجھ لیا۔

ہندو فلسفۂ قدیم مسلم مدارسِ فکر کے مقابلے میں ہندی مدارسِ فکر مکمل اصالتِ فکر کے حامل کامل آزادی سے بہرہ مند ہیں۔ کائناتی معمّے کو حل کرنے میں یہاں کے فلسفیوں نے پوری آزادی سے سوچا اور جو صحیح سمجھا اُسے پوری جرأت اور خلوص کے ساتھ بغیر کسی ہیر پھیر کے بیان کر دیا اور ملک میں پھیلے ہوئے عقیدوں اور برتے جانے والی رسموں کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے چنانچہ یہاں کے مسلّم اور مستند مدارسِ فکر میں چارواک، جینی اور بدھ بھی شامل ہیں جو خدا کے منکر یا خدا سے بے تعلق ہیں، نہ ویدوں کی صداقت کے قائل ہیں نہ ان سے سند لیتے ہیں[2]۔ ساتھ ہی ساتھ سانکھیہ، یوگ، ویدانت، میمانسا، نیائے اور ویشیشک ہیں جو وید کو مانتے ہیں اور سند سمجھتے ہیں[3]۔ یہ دونوں قسم کے مدارسِ فکر پھلتے پھولتے رہے۔ قابلِ داد ہیں یہاں کے عوام انھوں نے خدا بیزار فلسفوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ ان کا احترام کیا اور بلا خوفِ ملامت اختیار بھی کیا۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی ص ۲۳۵ و Influence of Islam on Indian Culture by Tara Chand P. 12-416, 143, 151, 152

[2] Indian Philosophy by Max Muller, Vol. one, Introduction P. IX, XI

[3] تاریخ ہندی فلسفہ از ایس این داس گپتا (ترجمہ جامعہ عثمانیہ) جلد اول ص ۹۶–۱۰۰

ہندی فلسفے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا برتاؤ، عقیدہ اور مذہب ہے جس کے ہندوستانی زندگی اور کردار پر مثبت اثرات ہیں۔

فلسفیانہ فکر میں کامل آزادی کے باوجود کچھ تصورات یا معتقدات ایسے بھی ہیں جو ہندی آریاؤں کے ضمیر میں شامل ہیں اور انھوں نے ان کو نہایت واضح ہونے کی بنا پر عینی مشاہدات اور طبعی مظاہر جیسی حیثیت دے دی ہے اور سامنے کی دیکھی بھالی حقیقتیں مان لیا ہے۔ مثلاً عمل، تناسخ اور نجات کے عقیدے جو فلسفیانہ سہی مگر کسی خاص مدرسۂ فکر سے مخصوص نہیں بلکہ ہندوستانی زندگی کے لازمی جزو بن گئے ہیں اور عوام و خواص دونوں میں مذہبی عقیدے کے طور پر مانے جاتے اور برتے جاتے ہیں اور یہی عقیدے ہندوؤں کا گویا بین الفرقاتی مشترک مذہب ہے۔

ہندی فلسفہ باوجود مکمل آزاد ہونے کے اس کے اہم مدارسِ فکر نے یہاں کی الہامی کتابوں سے اپنا رشتہ توڑا نہیں بلکہ انھیں کی نمائندگی کے دعوے دار رہے، چاہے یہ دعویٰ لفظوں سے آگے نہ بڑھے۔ شاید ہندوستان کا یہی خاص اندازِ فکر ہے جس سے ہندوستانی فلسفے کی اس روایت نے نشو و نما پایا کہ شارحین نے کسی متن یا فکر کو سامنے رکھ کر پوری آزادی سے اپنی ذاتی فکر کی توضیح و تشریح کی اور اصل متن یا فکر کی توضیح و تشریح سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ مثال میں ..این کے ویدانت سوتروں اور شنکر اچاریہ کی شرح کو پیش کیا جا سکتا ہے[1]

مغربی اور مشرقی شرح نویسی

[..]نی فلسفوں کی شرح نویسی | مغرب کے قدیم یونانی فلسفے میں کسی خاص متن کو سامنے رکھ کر [..]ی تشریح کی مثال میرے علم میں نہیں۔ ہاں اپنی فکر کے ساتھ معاصر یا متقدم فلسفیوں کے رایوں [..]ین ان کی تایید و تردید، اصلاح، ان پر اضافہ اور نقد و تبصرہ کر دیا جاتا تھا۔ افلاطون کی [..]ن اور راویوں پر ارسطو کے تبصرے اسی انداز کی تشریح کی مثالیں ہیں لیکن [..] کے بعد

[1] Indian Philosophy by Max Muller Vol. two P. 5

سے نیا میلان شروع ہو گیا اور یونانی کی خصوصی فلسفیانہ متون کی حامل المتن شرحیں لکھی جانے لگیں۔[1] شرحوں کا بیشتر حصہ ارسطو کی کتابوں کی شرحوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں کچھ شرحیں مخلوط بھی ہیں کہ میں شرحیں اور متن ممتاز اور الگ الگ نہیں مزید برآں اکثر شروح محض شرحیں نہیں بلکہ ان میں شارحین خاص اپنے نظریات بھی مخلوط ہیں[2] چنانچہ مدرسہ اسکندریہ جو قدیم یونانی فلسفے کی آخری سا تھیں، اس کے نام لیواؤں؛ نوفلاطونی فلسفیوں میں کسی مستقل متن کو اپنی تشریحات کے ساتھ پیش کرنے کی مثال فرفوریوس کی اپنے استاذ افلاطینوس کی اینیڈس (Enneads) یا کتاب الشیخ کی تجزیہ وتفسیر ہے[3] جو مخلوط انداز کی شرح ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے مغربی فلاسفہ میں شرح نویسی

قرونِ وسطیٰ کا کلامی فلسفہ جو نویں صدی سے پندرہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے اور مسلم فلاسفہ کے زیر اثر اور ان کے واسطے سے اسکندریہ کے نوفلاطونی فلسفے پر مبنی ہے[4] مابعد کے یونانی شارحین کی یہ روایت یعنی خاص متن یا فکر کو سامنے رکھ کر شرح کرنے کا دستور ان میں قائم رہا، ساتھ ہی ساتھ یونانی فلسفے کی قدیم روایت بھی ان کے یہاں جاری رہی کہ وہ مستقل تصنیف کے ذریعے سے اپنے کلامی فلسفے کو پیش کرتے ہیں اور اس ضمن میں دوسروں کی رایوں کو بیان کرکے ان پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں، قبول بھی کرتے ہیں اور رد بھی۔ ایکویناس کی سما تھیالوجی (Summa Theologia) کو اس اندازِ بیان کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے[5]

مغرب کے فلسفۂ جدید کی شرح نویسی

مغرب کے کلامی فلسفے کے نقد و تبصرہ کی روایت مغربی فلسفے میں بھی آئی۔ چنانچہ اصلاحی عہد اور اس کے بعد کے فلسفی اپنے اپنے مخصوص فلسفے کو قدمائے یونان کے انداز پر مستقل تصنیفوں میں پیش

---

1. Simplicius on Aristotle edited by Richard Sorabji (Appendix) P. 141, 142, 14.
2. Arabic thought by O'Leary P. 116
3. Short history of Philosophy P. 157, 158
4. ابن رشد از بیان ص ۱۹۲، Short history of Philosophy P. 167-168

کرتے ہیں اور اسی ضمن میں دوسروں کی رایوں پر نقد بھی کرتے جاتے ہیں اور تائید و تردید بھی۔ ڈی کارٹ، بار کلے، ہیوم اور کانٹ کی تصانیف کا یہی انداز ہے۔

معاصر اور جدید عہد میں کسی فلسفی کی پوری فکر یا مخصوص جزدی فکر کی تشریح اور اس پر نقد و تبصرہ کی ایک نئی روایت قائم ہوئی۔ زیرِ تبصرہ فکر کی تشریح میں اس کے مخصوص مصطلحات کی تشریح اور اس کے مشکل و مبہم تصورات کی توضیح بھی آجاتی ہے۔ ان تبصروں میں کوئی خاص تصنیف سامنے نہیں رکھی جاتی بلکہ مجموعی یا جزوی فکر کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

مغرب کا یہی اندازِ تشریح و تبصرہ معاصر ہندی وا. دو شرح و نقد میں بھی آگیا اردو میں اقبال کے خطبات اور ان کی فکر کی تشریح و تبصرے پر برابر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس ذیل کی ہندی کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی بکثرت بازار میں آرہی ہیں۔

قدیم فلسفۂ ہند کی شرح نویسی

یوں تو ہندوستان کے تمام آستک مدارس کی حیثیت کسی نہ کسی متن کی شرح تک محدود ہے لیکن یہ شرحیں اپنے اپنے متنوں سے قریب [illegible] ادہیں اور شارحین کے اپنے مستقل فلسفے ہیں۔ ان کو کسی سوتر کی شرح کہنا بہت مشکل ہے۔ اپنے فلسفے [illegible] سوتر کہنے کی روایت ہندی فلسفیوں کی قدیم عادت ہے سوتر درحقیقت پرانی مجلسوں کی بحث و تحمیص کی حاصلے ملفوظات یادداشتوں کے سرے اور حوالے یا اشارے ہیں جو استاذوں سے شاگردوں تک زبانی پہنچتی تھیں۔ یہ سرے یا حوالے اس بحث و تحمیص کو یاد دلا دیتے جو کبھی ہوئی تھیں۔ شارحین کچھ تو اپنے ملفوظات ذخیرے [illegible] اور زیادہ تر اپنی رائے کے مطابق ان روایتی تشریحات کے حوالوں کی آزادی سے تفسیر کرتے، تغیر [illegible] ایسی روایتی رایوں کو جو ان کی اپنی رایوں سے متصادم ہوتیں یا جن کی حمایت ان کے لیے نہ ہوتی تردید بھی کر دیتے تھے۔ یہ تکمیلی تشریحات اور اصل میں اپنی طرف سے تغیرات تھے۔ [illegible] اپنے روایتی [illegible] میں نئی ترقی پاتے تھے۔[1]

مسلمان شارحین کا اندازِ تشریح

مسلمانوں میں شروح کی ابتدا غالباً قرآن کی تفسیر سے ہوئی جو کی عہدِ صحابہ میں بے ترتیب و روایت شدہ تھی [illegible] زمانہ تک

---

[1] [illegible] ہندی فلسفہ [illegible]

[illegible] ابن ندیم [illegible]

ع فلسفہ میں ایک مختصر تصنیف اشارات کی شرح کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں جس طرح
ب اشارات چوتھی صدی ہجری کا سب سے بڑا فلسفی ہے۔ اسی طرح اس کا شارح امام رازی
سدی ہجری کا مشہور اشعری متکلم ہے، دونوں الگ الگ مدارس فکر کے نمائندے ہیں اور
ب فکر وارنے میں ایک دوسرے کے مد مقابل۔ پوری شرح پر نظر ڈالنا اور اشارات میں جن
سائل پر بحث کی گئی ہے اور شارح کی ان کی توضیح اور ان پر ان کی اپنی رایوں کا بیان تو اس مختصر
لے میں ممکن نہیں اور نہ شرح نویسی کے مسلمانوں میں مروج اسلوب کی وضاحت کے لیے ضروری ہے
۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف ایک مسئلے پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ بھی نہایت مختصر اور ضروری ہوگا
متن کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا جزئیات کے متعلق علم اگرچہ محیط ہے لیکن وہ کلی حیثیت
ہے کیوں کہ وہ وحدت ہی وحدت ہے اور بے تغیر بے تبدل جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ایسا ہی
رہے گا اور جزئیات کو جزئی حیثیت میں جاننے سے اس میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی شان
لیت و کمال نا انفعالیت کے منافی ہے۔ شیخ باری تعالیٰ کے علم کی اس نوعیت کو پہلے دلائل سے
ت کر چکا ہے۔ اس موقعے پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جزئیات کو جزئی حیثیت میں جاننے سے
ے میں کس طرح تغیر راہ پا جاتا ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے وہ مثالوں سے صفات کی متعدد
ں گنا تا ہے اور واضح کرتا ہے کہ کس قسم کی صفات کی تبدیلی سے موصوف متأثر ہوتا ہے اور کس
متأثر نہیں ہوتا، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو سیاہی، سپیدی جیسی صفات ہیں کہ ان کے
لنے سے موصوف کا اپنا قائم وصف ہی بدل جاتا ہے کچھ اس طرح کی ہیں جس طرح کسی شے میں کسی
سرے جسم کو حرکت دینے کی قدرت، اب اگر وہ خاص جسم ناپید ہو جائے تو اس مخصوص جسم کو حرکت
نے کی قدرت بھی جاتی رہے گی اور قدرت رکھنے والی شے کا یہ خاص وصف اس خاص جسم کے
لے سے تو بدل جائے گا لیکن اس تبدیلی سے قادر شے میں کوئی تغیر راہ نہیں پائے گا، صرف قدرت
لق میں تغیر ہوگا کہ قدرت اب اس مخصوص جسم سے متعلق نہیں رہے گی لیکن جو وصف اس میں تھا یعنی
ت وہ اب بھی جیسا تھا ویسا رہے گا کچھ اس قسم کی صفات ہیں۔ مثلاً ایک شے جانتی ہے کہ ایک خاص

فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن عمر البکری المعروف بالامام الرازی متوفی ۶۰۶ھ

چیز نہیں ہے، جب وہ موجود ہوئی تو اس کو علم ہوا کہ چیز ہے۔ اس حالت میں علم بھی بدلا اور اس کی نسبت اور تعلق بھی۔ اور محض کلّی علم ہر ہر جزی کے علم کو محیط نہیں بلکہ خصوصی جزی کے لیے جدید علم، جدید تعلق کی ضرورت پڑے گی اور نفس میں نئے تعلق اور نئی صورت کا ارتسام ہوگا چنانچہ جو ذات تغیّر و تبدّل کا محل ہی نہیں اس کو پہلی اور تیسری قسم کا تغیّر لاحق نہیں ہو سکتا۔ ہاں دوسری قسم کے تغیّر کی معروض ہو سکتی ہے کیونکہ یہ تغیّر تعلقات میں ہے جو ذات پر اثر انداز نہیں۔"

امام رازی نے پہلے شیخ کے اس بیان کا سابق سے تعلق و ربط بیان کر کے اس کا منشاء و مقصد بیان کیا کہ چوں کہ زمانیات کے لیے تغیّر ناگزیر ہے اور زمانیات متغیرہ کے علم سے خود ذاتِ باری متاثر ہوتی ہے اور اس میں تغیّر و تبدل راہ پاتا ہے جو ذاتِ باری میں ناممکن ہے، لہٰذا اس کے لیے ان کا علم بھی ناممکن ہے، چنانچہ پہلے صفاتِ متغیرہ کو تین قسموں میں تقسیم کر کے ان تینوں قسموں کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا' ان کے حصر کی وجہ لکھی اور شیخ کی دی ہوئی مثالوں کو پوری وضاحت سے ان اقسام پر منطبق کیا اور ان قسموں میں سے پہلی اور تیسری قسم کی صفت سے ذات میں تغیّر و تبدّل کیسے راہ پاتا ہے۔ اس کی توضیح کی' پھر یہ بتایا کہ علم کُلّی ہر ہر جزی کو کیوں محیط نہیں بلکہ ہر جزی کے لیے نئے علم کی ضرورت ہے اور ہر نیا علم' نیا تعلق اور ذاتِ باری میں اس کی صورت کا حصول چاہتا ہے اور ذات کا یہی انفعالی تاثر ذات کا تغیّر ہے جو ذاتِ باری میں ممکن نہیں' اس لیے وہ پہلی اور تیسری قسم کی صفاتِ متغیرہ سے موصوف نہیں ہو سکتا، دوسری قسم کی صفاتِ متغیرہ چونکہ ذات پر اثر انداز نہیں ہوتیں صرف تعلق بدلتے رہتے ہیں اس لیے ذات انھیں صفات سے موصوف ہو سکتی ہے۔ یہاں تک شیخ کے بیان کی بے کم و کاست تشریح اور مفصلاً اس کی تقریر تھی۔ اس کے بعد شیخ کے بیان پر اعتراض کیا کہ فلاسفہ تعلقات و اضافات کا خارجی وجود مانتے ہیں اور چوں کہ اس استدلال میں یہ مان لیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ جن عارضی تعلقات و اضافات سے موصوف ہو سکتا ہے ان میں تغیّر و تبدّل ذاتِ باری کے تغیّر کو مستلزم نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان عارضی صفات یعنی اضافات و تعلقات سے اس طرح متصف ہو سکتا ہے کہ پہلے ایک اضافت سے متصف ہوا اور وہ زائل ہو گئی تو دوسری اضافت سے متصف ہوا گویا ذات پر اس عارضی اتصاف سے لاحق تغیّر و تبدل جائز ہے تو پھر صفاتِ حقیقیہ کی بنا پر ذات میں تغیر و تبدل کیوں ناممکن ہے اور اس نقطے پر صفاتِ عارضہ یعنی تعلقات حادثہ میں

صفات حقیقیہ میں کیا فرق ہے اور کیوں ہے۔ تاہم اگر تم صفات مادیہ اور صفات حقیقیہ میں اس قسم
پر فرق کرتے ہی ہو تو سرے سے علم ہی کو صفت حقیقی نہ قرار دو۔

انہوں نے اس اعتراض کو قوی سمجھ کر بے جواب دیے چھوڑ دیا اور فلاسفہ کے مقابلے میں اس مسئلے کے متعلق اپنی ذاتی رائے بیان کی اور فلاسفہ کی غلطی پر متنبہ کیا کہ یہاں اصل غلطی یہ ہے کہ علم معلوم کی ایسی صورت کو قرار دیا جو عالم کی ذات میں مرتسم ہوتی ہے اور ہر لحاظ سے اپنے معلوم یا متعلق علم کے مساوی ہوتی ہے اور ظاہر ہے صورتوں کا ذات میں ارتسام اور پھر ذات سے ان کا زوال ذات کے تغیر میں اثر انداز ہوتا ہے اور ہم فلاسفہ کے اس غلط خیال کی کہ علم صورتوں کا ارتسام ہے، پوری طرح تردید کر چکے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علم درحقیقت صورت نہیں بلکہ عالم و معلوم کے درمیان ایک خاص قسم کی نسبت ہے اور بس۔ لہٰذا علوم متجددہ میں صرف نسبتیں اور تعلق بدلتے ہیں۔ ذات میں تغیر نہیں سرایت کرتا۔ چنانچہ علم میں تغیر صرف اضافتوں کا تغیر ہے نہ کہ مضاف الیہ اور ذات کا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی تغلیط کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جزئیات معلومہ کا تغیر ذات کے تغیر کو مستلزم نہیں، الا یہ کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ علم صورۃ حاصلہ نہیں بلکہ مخصوص تعلق ہے اور تعلق کے تغیر سے ذات میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد علم کے اضافت ہونے کو تحقیقی طور پر بیان کیا ہے اور اس کی توضیح کی ہے۔ یہاں شیخ کے مذکورہ سابق قول کی، جس کو خود شیخ کی عبارت میں نقل کیا گیا ہے، شرح ختم ہو جاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو شرح اشارات از رازی بر حاشیہ شرح طوسی مطبوعہ مصر [illegible]، جزو دوم)

(اضافہ حسب فرمائش مکرمی جناب ڈاکٹر پی کے شری واستوا، راجستھان یونیورسٹی، جے پور)

مسلمان فلاسفہ و متکلمین کے ان اساطین کے علاوہ بعد کے لوگوں میں اثیر الدین مفضل بن عمر ابہری سمرقندی متوفی [illegible]ھ کی ہدایۃ الحکمۃ کی شروح میں آخوند صدر الدین محمد بن ابراہیم شیرازی معروف بہ ملا صدرا کی شرح ہے جو اپنی تفصیل و تدقیق کے لحاظ سے بہت اہم سمجھی جاتی ہے اور سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی رہی ہے۔ اس میں قدماء کے اختلافات، ان کے دلائل اور شارح کی اپنی تحقیقات کا مفصل بیان ہے۔ کسی خاص مسئلے پر ان کی شرح کا مفصل نمونہ بہت طویل بیان چاہتا ہے جس کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں، میں متن کے عنوان بحث اور اس کے ایک نکتے پر شارح کی شرح بحث کا بحیثیت ایک مختصر سا خاکہ پیش کیے دیتا ہوں۔ باقی قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

متن کا عنوان ہے "در زمان" اس کے تحت شارح نے اس کے تین مقصد قرار دیے ہیں۔ زمانے کے وجود پر تنبیہ[1]۔ اس کی ماہیت کی تحقیق اور اس کی ابدیت و ازلیت کا اثبات۔ اِن مقصدوں کی شرح سے پہلے شارح نے زمانے کے متعلق لوگوں کے اختلافات بیان کیے کہ کچھ لوگ اس کو حسی موجودات میں شمار کرتے ہیں اور کچھ ذہنی موجودات میں۔ حسی وجود کے قائل بعض اس کو جوہر اور قائم بالذات مانتے ہیں بعض عرض اور قائم بالغیر۔ جوہریت کے قائل کچھ تو مجرد اغیر مادی مانتے ہیں جن کا ایک فرقہ تو اسی کو واجب تعالیٰ اور خدا کہتا ہے (ہمارے زمانے میں اقبال کی بھی یہی تحقیق معلوم ہوتی ہے) اور کچھ مادی اور جسمانی کہتے ہیں، جو عرض سمجھتے ہیں وہ اس کو نا قار تو کہتے ہی ہیں، اسس میں مختلف ہیں کہ وہ خود ہی حرکت ہے یا خود حرکت نہیں ہے۔

اس تفصیل کے بعد ہر مذہب کے دلائل، اُن کی خامیاں، ان پر غلط اعتراضات کی تردید، پھر شارح کے نزدیک جو مسلک صحیح ہے اس کا اثبات ہے۔ یہ پوری بحث بہت دقیق اور عمیق مطالعہ چاہتی ہے۔

اس کے بعد بحث زمان جن مقصدوں پر مشتمل ہے ان میں سے پہلے مقصد یعنی اس کے وجود پر اصل متن کی تنبیہ کی شرح کی ہے، متن کی وجود زمان پر تنبیہ یہ ہے۔

"ہم نے کسی مسافت پر ایک خاص انداز سے یعنی درجے کی تیز اور دوسری کچھ مدہم مقررہ [illegible] شروع اور ختم ہونے والی حرکتیں فرض کیں تو مدہم تیز کی مسافت سے کم مسافت طے کریگی اور تیز مدہم سے زیادہ مسافت طے کریگی اور اکثر دونوں حرکتوں کی شروعات اور ختم میں سے کسی ایک میں ہی موافقت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں طے شدہ مسافت یکساں بھی ہو سکتی ہے اور دوسری حرکت میں اگر یکساں درجے کی تیزی فرض ریں اور شروع و ختم میں موافقت ہو تو تم دونوں کی طے کی ہوئی مسافت کی مقدار ایک ہی پاؤگے براگر ایک شروع ہوئی اور دوسری شروع نہیں ہوئی لیکن ختم ساتھ ساتھ ہوئیں یا اس کے برعکس دا تو ایک کی طے کی ہوئی مسافت دوسری کی طے کی ہوئی مسافت سے کم ہوگی اور ایسا واقع ہوا تیز کی شروعات اور ختم کے مابین ایک امکان یعنی ایک ایسی محدود شے پیدا ہوئی کہ جس میں ایک [illegible] مسافت کو معین تیزی کے ساتھ طے ہونے کی گنجائش اور معین مدہم حرکت کے لیے پہلی سے [illegible] مسافت طے کرنے کی گنجائش ہے (یعنی ایک ہی وسعت میں تیز اور مدہم دونوں حرکتوں کو سما لینے

[1] وضاحت طلب بدیہی کی دلائل سے توضیح تنبیہ کہلاتی ہے [illegible] دلائل نہیں ہوتے بلکہ تنبیہات ہوتے ہیں۔

کی قابلیت ہے)۔ اور یہ محدود شے (یا گنجائش حرکت کے لیے نہ تو بعینہ مسافت ہے نہ حرکت ہے نہ تیزی اور مدھم پن ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک میں اختلاف ہو سکتا ہے جبکہ گنجائش بحالہ رہتی ہے اور یہ سب موافق ہو سکتے ہیں جبکہ گنجائش مختلف ہوتی ہے۔ امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں اسی دلیل پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس دلیل میں تیزی اور مدھم پن جن کے مفہوم میں زمان شامل ہے اور حرکتوں کی شروعات اور ختم میں ساتھ ساتھ ہونا جس کے معنی زمانی معیت ہیں ملحوظ ہیں اور دونوں امروں کا ثبوت زمان کے ثبوت کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ اس دلیل میں دور (یعنی ہیر پھیر) ہے کہ زمانے کے ثبوت سے پہلے ہی زمانے کو ثابت ماننا پڑتا ہے اور اس طرح زمانے کا ثبوت خود زمانے پر موقوف رہتا ہے) پھر خود ہی امام نے اس کا جواب دیا ہے کہ اس دلیل سے مقصود زمانے کا وجود ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود زمانے کی ایک خاص نوعیت کو ثابت کرنا ہے کہ وہ حرکت کی مقدار ہے کیونکہ اس کا اصل وجود تو واضح ترین بدیہیات میں سے ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ زمانہ ظاہر الوجود اور خفی الماہیۃ ہے (چوں کہ شارح نے اصل بحث کے مقاصد میں زمانے کے اثبات اور اس کے مقدار حرکت ہونے کے اثبات کو الگ الگ مقصد قرار دیا ہے اور امام کا جواب اس پر مبنی ہے کہ مقصد زمانے کا اثبات نہیں بلکہ اس کے مقدار حرکت ہونے کا اثبات ہے۔ اس لیے شارح کے بیان کے پیش نظر) مناسب توجیہ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اصل غرض یہاں زمانے کو اس حیثیت میں ثابت کرنا ہے کہ اس پر اس کے مقدار حرکت ہونے کا اثبات مرتب ہو سکے اور یوں بھی جواب دیا جاتا ہے کہ ان امور کے وجود کا علم زمانے کے وجود خارجی کے علم پر موقوف نہیں کیوں کہ جو لوگ اس کے وجود خارجی کے قائل نہیں۔ وہ بھی شے کی شے سے معیت اور حرکتوں کے ایک دوسری سے تیز اور مدھم ہونے کے معترف ہیں اور اس اعتراف کے لیے زمانے کا فی الجملہ تصور کافی ہے چاہے اس کا خارجی وجود ہو چاہے ذہنی، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دلیل کا مقصد زمانے کا خارجی وجود ثابت کرنا ہے اور دلیل میں مذکورہ امور زمانہ کے فی الجملہ وجود پر موقوف ہیں نہ کہ اس کے وجود خارجی پر، لہٰذا دور لازم نہیں آتا۔ جواب کی تقریر کے بعد شارح نے اس جواب کے غلط موقف پر متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بنیادی طور پر یہ جواب اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کی یہ تقریر صحیح نہیں ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ،

" زمانے پر موقوف ان امور کی اصل حقیقتیں ہیں نہ کہ ان امور کے وجود کا علم، ان کے وجود کا علم تو اُن بدیہیات میں سے ہے جو زمانے کے حسّی ہونے یا ذہنی ہونے کے لحاظ کا محتاج نہیں اور دلیل میں جس کا لحاظ ہے وہ یہ (یعنی علم یا وجود) ہے نہ کہ وہ۔ (یعنی ان کے مفہوموں کا تصور اور اصل حقیقتیں۔ چنانچہ موقوف اور موقوف علیہ الگ الگ ہیں لہٰذا دور لازم نہیں)

شرح و متن کے اس اقتباس سے ملاصدرا کی شرح نگاری کا اسلوب سامنے آچکا ہوگا اور اشارات کی شرحِ رازی اور ہدایۃ الحکمۃ کی شرح صدرا کا فرق بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ پہلی میں متن اور شرح " اس نے کہا" اور "میں کہتا ہوں" کی تصریح کے ساتھ ہے اور دوسری میں متن کو شرح سے متن پر خط کھینچ کر یا دوسرے رنگ سے لکھ کر ممتاز کیا گیا ہے۔ اب میں غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے محض متن سے استدلال کی تکمیل کیے دیتا ہوں اور شرح کو نظر انداز کرتا ہوں۔

" یہ امکان (یا گنجایش) کم اور بیش ہونے کے قابل ہے اور ناقرار ہے کیوں کہ اس کے اجزا ساتھ ساتھ نہیں موجود ہوتے۔ چنانچہ یہ امکان (یا گنجایش) ناقرار مقدار ہے اور زمانے سے بھی مراد ہے۔ یہاں تک زمانے کے وجود پر تنبیہ تھی جو بحث کا پہلا مقصد تھا، آگے اس کی ماہیت کی تحقیق اور اس کی ازلیت و ابدیت کا بیان ہے جس کو چھوڑتا ہوں۔ (شرح ہدایۃ الحکمۃ از ملاصدرا مطبوعہ مطبع علوی ص ۲۳۶ — ۲۴۰)

مسلمان فلسفیوں کی شرح نویسی کا یہ عام اور روایتی نمونہ ہے اور شرح کا یہ روایتی اسلوب فلسفیانہ شرح سے مختص نہیں بلکہ غیر فلسفیانہ شرح و حواشی تک میں عام ہے لیکن موجودہ عہد میں قرآن، حدیث اور منظومات کی شروح و حواشی کو چھوڑ کر بالکل متروک ہو چکا ہے۔ قرآن، حدیث اور منظومات میں اس قدیم اسلوب کے باقی رہنے کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ان میں مختلف وجوہ سے الفاظ و عبارات کی بھی خصوصی اہمیت ہے۔

جہان سرسید

● سرسید کی دینی برکتیں

○ —— مولانا عبدالحلیم شرر

سرسید کی دینی برکتین

ایک

مدلل پرمعنی اور فاضلانہ لکچر

جو

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مدظلہ العالی کی زبان حقیقت ترجمان

سے

ایک سال سرسید مرحوم کی برسی کے موقع پر ایک عظیم الشان مجمع مین سنا گیا

اور

خاکسار محمد سراج الحق منیجر و پبلشر دلگداز نے

سنہ ۱۹۱۳ء مین

دلگداز پریس لکھنؤ محلہ گرونن بیگ خان مین چھاپ کے

شائع کیا

طبع ثانی

عرضِ حال

ہر سید مرحوم کی برسی کے [illegible] کوشش سے قریباً ہر سال [illegible] چنانچہ ایک سال [illegible] انھیں سید صاحب مرحوم کی [illegible] ہوا کرتا ہوں۔ اور [illegible] اصرار سے مجال انکار نہ ہوئی۔ اور میں نے [illegible] ایک بہت بڑے مجمع میں جس کے [illegible] پبلک میں پیش کیا جاتا سنایا۔ اسی عنوان سے اکثر حضرات [illegible] مگر اس کے سن لینے کے [illegible] کسی نے اس پر اعتراض یا اس سے اختلاف کیا ہو۔

پہلے اسے میرے دوست ظفر علی خان صاحب بی۔ اے ایڈیٹر زمیندار نے اپنے رسالہ دکن ریویو میں شائع کیا تھا۔ پھر جناب منشی حسن [illegible] خان صاحب [illegible] کی قدر دانی سے عزیزی پریس آگرہ میں ایک مستقل رسالے کی حیثیت سے طبع ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر حضرات اسے دلگداز پریس سے طلب فرمانے لگے۔ اس خیال سے میں نے اسے دلگداز پریس میں بھی طبع کر دیا۔

اکثر حضرات کی خواہش تھی کہ اس ایڈیشن میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ وہ چیز ہے جو پبلک میں پیش ہو چکی ہے اور ایک خاص جلسہ کی یادگار ہے لہٰذا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ اس میں کچھ رد و بدل کیا جائے۔

بس اس سے زیادہ کچھ عرض کرنے کی مجھے ضرورت نہیں معلوم ہوئی۔

خاکسار، محمد عبد الحلیم شرر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سر سید احمد خان کی دینی برکتیں

سرسید کے خلاف جو ہنگامہ آج سے ۳۰ ۔ ۳۵ سال پہلے زور و شور پر تھا۔ اُن کی زندگی ہی میں کم ہو چلا تھا۔ اور اب اُن کے انتقال کے دس گیارہ برس بعد تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سب اختلافات ہباءً منثوراً ہو گئے۔ اور ہر شخص اتنا ضرور تسلیم کر رہا ہے کہ سید مرحوم مسلمانوں کے سچے خیرخواہ اپنی قوم کے فدائی۔ اور اپنے ہم مذہبوں کے ولی دوست تھے۔ اس کا اعتراف کرنے میں بھی کسی کو تامل نہیں کہ اُن کی ذات سے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہونچا۔ بلکہ اکثر صاحب عقل عاقبت اندیش اور زمانہ شناس لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ممالک متحدہ و پنجاب ہی نہیں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک شخص نے تباہی و پامالی سے بچا لیا۔ اور وہ شخص سر سید تھا۔ لیکن سید صاحب کی زندگی کے اس رخ پر کہ قوم کو اُن کی ذات سے کیسے کیسے دنیوی فائدہ حاصل ہوے بہت کچھ غور کیا جا چکا۔ اور سب اسنادکشیں ہو چکیں۔ اور تسلیم کر لیا گیا کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے اُن کی ذات ایک فرشتہ تھی۔ چنانچہ جب اُن کا نام آجاتا ہے تو ہر جگہ تحسین و مرحبا کی صدائیں زور و شور سے گونجنے لگتی ہیں۔ لہذا اب اس بارۂ خاص میں کچھ کہنے یا ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو بتانے اور سمجھانے کی بہت کم ضرورت باقی رہی ہے۔

اسی لیے ہم آج سید صاحب کی زندگی کا ایک دوسرا رخ اختیار کر کے اس امر پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ سید مرحوم کے ظہور اور اُن کی مجتہدانہ کوششوں سے مذہب پر کیا اثر پڑا۔ اور آیا اُن کی ذات سے مذہب کو بھی کچھ فائدہ پہونچا یا نہیں اگرچہ سچ یہ ہے کہ اُن کی زندگی پر اس حیثیت سے بحث کرنے کا صحیح وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ سید صاحب اس بارے میں جو کچھ کر رہے تھے اُس کا تعلق موجودہ دور کے مذاق موجودہ تعلیم۔ موجودہ انقلابات۔ اور موجودہ رفتار کے آخری نتائج سے تھا۔ اور وہ نتائج گو ہر جگہ ظاہر ہونے لگے ہیں مگر ابھی اُن کا بہت کچھ ظاہر ہونا باقی ہے۔ اور خوب یاد رکھنا چاہیے کہ یہ نتائج جوں جوں زیادہ ظاہر و نمایاں ہوتے جائیں گے اُسی قدر سید صاحب کی مذہبی برکتیں بھی

زیادہ تر یا ان اعتقادوں میں جو کہی جاتی تھیں۔ اور روز بروز زمانہ زیادہ وضاحت سے بتاتا
جاتا تھا کہ سید صاحب کیا تھے اور مسلمانوں کو اس حیثیت سے کیا کیا فائدے پہنچا گئے۔

اسلام کو گزشتہ بارہ صدیاں اوج و عروج میں گزری تھیں۔ جبکہ تمام اسلام اون کے
ملک کا دین تھا اور حیثیت اسلام کی دلوں میں حکومت کا دور بھی موجود تھا۔ اون کے
اوضاع و اطوار ملک کو فیشن تھے۔ اور وہ تمدن کی وجہ سے غیر قوم اور غیر مذہب
والوں کو بھی اون کی ہر وضع میں ایک لحاظ اور اون کی ہر بات میں ایک خوبی نظر آتی
تھی۔ مسلمانوں ہی کو اپنی معاشرت اور اپنے مذہبی رسوم پر ناز نہ تھا۔ بلکہ دیگر مذاہب
والے بھی اون کی تمیزوں اور اون کی عادتوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے اور اون کے
نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی نہیں۔ اشتداد زمانہ نے مسلمانوں کو باور
کرا دیا تھا کہ اگر کوئی غیر قوم یا غیر مذہب والی جماعت اون پر غالب بھی آ جائے گی تو
وہ بھی اون کے نقش قدم پر چلنے کے لیے مجبور ہوگی۔ اور اون کے مذہب و اخلاق کی تقلید
کر کے ترقی اسلام ہی کا ذریعہ بن جائے گی۔

تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا تھی کہ یہ انقلاب ہوا کہ خدا نے عنان حکومت اون کے
ہاتھ سے نکال کے یورپ کے مسیحیوں کے ہاتھ میں دے دی۔ اور یہ لوگ تاتاریوں کی طرح
مسلمانوں پر حکمران ہونے کے بعد اون کے کیش و آئین کو اختیار کر لیتے اور مسلمان ہو جاتے
بلکہ شروع سے خود اپنے اوضاع و اطوار قائم رکھے اور جن چیزوں کو مسلمانوں سے پایا بھی تھا
اون میں غیر معمولی ترقی کر کے اس درجہ کو پہنچا گئے کہ وہ چیزیں غیر سے لی ہوئی نہیں
بلکہ خود اون کی اور اون کے مغربی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھیں۔

ایسے انقلابات میں ہمیشہ دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ اگر غالب و فاتح قوم ظالم و بے
رحم اور متعصب و بے درد ہوئی تو مغلوب و مفتوح قوم کو بالکل پامال اور ہمیشہ کے لیے
تباہ و برباد کر دیا کرتی ہے۔ جیسا کہ اگلے زمانہ میں آریہ لوگوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ
یا بابل و اسیریا والوں نے یہود وغیرہ کے ساتھ اور کلدیوں نے بابل کے صابئین کے
ساتھ اور قرون وسطیٰ میں کیسٹائل کے عیسائیوں نے ہسپانیہ کے مسلمانوں کے ساتھ
کیا۔ اور اگر فاتح و غالب قوم منصف مزاج ہوئی تو مغلوب و مفتوح قوم بے شک
دست ہو کر نشو و نما پا جاتی ہے جس کی مثال خود ہندوستان کی اگلی اسلامی سلطنت

تھی - ہم یہ [illegible] انگریزی قوم [illegible] بالکل [illegible]
بنیاد انسانیت کے اعلیٰ درجات سے [illegible] تعصب [illegible]
ہماری قوم کا دست بردار [illegible] تھا

مگر اس صورت میں بھی ایک نہایت بڑا اندیشہ ہے کہ [illegible] قوم کی [illegible] کے
اندیشے کہ خیال کرنا چاہیے کہ ایک مذہب اور ایک قوم کی [illegible] کا اجتماع
زمانہ [illegible] زیادہ [illegible] سے [illegible] ہوتا ہے - ایک [illegible] ہوتی ہے کہ
ہم اپنے [illegible] سے نفرت [illegible] اور [illegible] اختیار کرنا چاہیے
[illegible] کے [illegible] اور ان کے [illegible] بھی پرہیز کرنا چاہیے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ ایسی قوم اپنے زمانے کی ترقیوں سے محروم رہ کے [illegible] تباہ و پامال ہو جاتی ہے
پھر اس کے چند روز کے بعد جب [illegible]
کہ گویا [illegible] ایک دوسری [illegible] قوم [illegible] ہو جاتی ہے [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] تمام چیزیں [illegible]
ہو جاتی ہے کہ [illegible]
[illegible] ہیں کہ [illegible] قوم [illegible]
سے نفرت ہو جاتی ہے - [illegible] قوم [illegible]
اپنی قوم [illegible] شریک [illegible]
ملت میں داخل ہوتے ہوئے [illegible] ہو جاتی ہے -

اگلی تمام فنا شدہ قوموں کی یہی تاریخ ہے - اور یہی تاریخ ہماری قوم [illegible]
مسلمانان ہندوستان کی ہے - مگر [illegible] اس تاریخ کی [illegible] تک نہیں پہنچے [illegible]
کے درمیان میں آ کے [illegible] اور زمانے کی [illegible]
ہلاکت کی طرف لیے جاتی تھی - چونکہ انگریزوں کی قوم [illegible] پسند اور [illegible] متعصب
تھی اس لیے ان دونوں مذکورہ بالا [illegible] کو [illegible] ہمارے لیے [illegible] تھا -
غدر کے بعد ہم میں انگریزی زبان اور انگریزوں کی تعلیم [illegible] سے جو نفرت تھی
وہ بھی ظاہر ہے اور آپ میں سے اکثر حضرات [illegible] ہوں گے [illegible] اس کے
اب انگریزی اوضاع و اطوار کا جو شوق بڑھتا [illegible] اس کے ساتھ ہماری قوم میں [illegible]

جاتا ہے اُس کو بھی آپ خوب سمجھ رہے ہیں۔

اِس قدر ہماری تمہید کا پہلا جزو تھا۔ اب ہم تمہید ہی میں ایک دوسرے جزوی حیثیت سے اِس امر کو دکھانا چاہتے ہیں کہ انگریزی قوم کس مذاق اور وضع کی قوم ہے اور انہوں نے ہندوستان کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد کیا طریقہ اختیار کیا۔ دنیا کی تمام گزشتہ اور موجودہ قوموں کے خلاف انگریزوں میں حد درجے کی آزادی ہے۔ کسی کے مذہبی امور میں وہ دخل نہیں دیتے بلکہ ہر مذہب والوں کو اپنے مذہب کے شائع کرنے اور خود حاکم قوم کے مذہب کی علانیہ تردید کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ علم کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اور اُس کے بڑے زبردست حامی ہیں مگر وہ علم جس کو مذہب سے نہیں بلکہ فلسفہ سے تعلق ہے۔ لہذا موجودہ گورنمنٹ نے اگرچہ مذہبوں کو پوری آزادی دے دی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی چیز کی سرپرستی شروع کی جس سے زیادہ مذہب کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔ پھر فلسفہ کے ساتھ سائنس کو ترقی ہونا شروع ہوئی۔ جس نے مذہب کی جڑ کو اور کمزور کرنا شروع کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں فلسفہ اور سائنس کی ترقی نے مذاہب کی دنیا میں ایک ایسی کھلبلی ڈالی کہ تمام مذاہب میں ایک کون و فساد شروع ہو گیا۔ اور ہر مذہب نے اپنی مروجہ وضع چھوڑ کے ایک نئی صورت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اب عام طور پر معیار صداقت یہ قرار پا گیا کہ جو مذہب حقائق موجودات اور اصولِ تمدن کے خلاف ہو وہ مذہب سچا ہو نہیں سکتا۔ دوسری طرف غور سے دیکھیے تو مذہب کی حالت یہ ہے کہ اُس کی ابتدا تو نہایت ہی مضبوط و موجہ اصولِ عقلی سے ہوا کرتی ہے مگر بعد والے خلافِ فطرت واقعات کو واقعی حیثیت قرار دے کے مذہب میں شامل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور آخر میں مذہب صرف کرشمہ پرستی کا نام رہ جاتا ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ ایسے مذاہب جنہوں نے ضلالت کے رنگ میں رنگ کر ایسی صورت اختیار کر لی ہو زمانے کا کیونکر مقابلہ کر سکتے تھے۔

اس کون و فساد کے زمانہ میں سید احمد خان پیدا ہوئے۔ اور اُن کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ انہوں نے انقلابات کے نتائج اور قوم کے اس اندرونی مرض کو اُس وقت سمجھ لیا جب کہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زمانہ

ہمیں کو مریلے جاتا ہے انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت سے کیا نتائج ظاہر ہونے والے ہیں اور چند روز بعد کیا ہوگا۔ ایک ایسا شخص جسے انگریزی تعلیم بھی نہ ہوئی ہو۔ انگریزی زبان اور اُس کے علوم سے ناواقف ہو اُس کے خیال کا آج سے پچاس برس پہلے آپ ہی آپ اِس طرف مائل ہو جانا تھوڑی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ابتدائے زمانہ میں وہ ایک پیرو حدیث مسلمان تھے اور اُس مذہبی ریفارم سے متاثر تھے جس کی بنیاد شاہ ولی اللہ سے شروع ہو کے مولوی شاہ اسمٰعیل صاحب کے زبردست ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس ریفارمیشن نے دو باتیں اُنھیں پہلے ہی سے بتا رکھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مذہبی رسوم کثرت سے مروج ہیں اُن کا اصل مذہب اور حقیقی تعلیم نبوت میں پتہ نہیں اور دوسرے یہ کہ جو روایتیں اور حدیثیں اور سنن و آثار اسلام کے عام علما و واعظین کی زبانوں سے سُنے جاتے ہیں اُن میں سے اکثر ضعیف و موضوع ہیں۔ اس چیز نے اُنھیں تحقیق و تنقید کی جانب مائل کیا اور اِسی کی بدولت اُن میں وہ تعصب کم ہوا جو سوا تقلید جامد کے تحقیق کی طرف نہیں مائل ہونے دیتا لیکن یہ صرف وہ مادہ تھا جو پرانے مذاق سے بچنے اور نیا رنگ اختیار کرنے میں اُن کا معین ہوا۔

اصلی چیز جس نے اُنھیں ایک معمولی مسلمان سے وہ سرسید بنایا جس کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہم آج جمع ہوئے ہیں کتاب آثار الصنادید کا تصنیف کرنا ہے مولانا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تصنیف کرنے کی جانب انھیں مالی دشواریوں اور روپیہ کی ضرورت نے مائل کیا۔ خیر اس کا خیال چاہے کسی وجہ سے پیدا ہوا ہو مگر دیکھنا چاہیے کہ اس کتاب کی تصنیف کے لیے انھیں کیا کرنا پڑا۔ انھیں دلی کے پرانے کھنڈروں میں پھرنا، ایک ایک منہدم و پامال حوادث عمارت کو غور سے دیکھنا پڑا۔ اکثر راتیں اُنھیں خاموش اور سنسان کھنڈروں میں گزارنا پڑیں اور ایک ایک کی عبرتناک صورت سے عبرت اور دست بُرد زمانہ کا سبق لینا پڑا۔ خلاصہ یہ کہ یہ گرے پڑے قصر و ایوان اُن کے لیے ریاضت و عبرت کی خانقاہیں بن گئے اور یہ مثل صادق آئی۔ ع

سر بگر لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

پیغمبری تو اب حضرت ختمی مآب صلعم کے بعد کسی کو نصیب ہی نہ ہو سکتی تھی۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ ایک شخص اس قسم کی پیمبرانہ ریاضت کرے اور انسان کامل نہ بن جائے۔

انھیں مخاروں نے اپنی خاموشی کی سراپا حسرت زبان سے اُن کے کان میں کہہ دیا کہ ہماری بربادی کے کیا اسباب ہیں۔ اور تم اگر تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو تمھیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے علوم اسلامیہ کو غور و تامل سے مطالعہ کرنا شروع کیا اور چند روز کی تحقیق و تنقید کے بعد دعویٰ کیا کہ اس وقت دنیا میں جتنی الہامی کتابیں مانی جاتی ہیں۔ اُن میں سے صرف قرآن پاک ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقایق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی سدِ راہ۔ مگر علمائے زمانہ اور عام مسلمان اس دعوے کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ خلاف فطرت واقعات کا ظاہر ہونا ہی دلیل نبوت اور برہان حقیقت ہے۔ سید صاحب نے اس دعوے کے ساتھ ہی تمام مسائل مذہبی پر بحث شروع کی۔ موضوع و ضعیف روایات کو چھوڑ دیا۔ اور سوا قرآن و حدیث کے دیگر تمام چیزوں کی طرف سے آنکھ بند کر لی۔ یہ مباحث جوں جوں بڑھتے گئے۔ مخالفت بھی روز افزوں ترقی کرتی چلی گئی۔ جگہ جگہ سید صاحب کو گالیاں دی جانے لگیں۔ کفر و الحاد کے فتوے شائع ہونے لگے اور اُن کی تردید میں متعدد رسالے جاری ہو گئے۔ اور یکایک ایک ایسا زمانہ آگیا کہ در و دیوار سے لعنت و نفرین کی صدا بلند ہوتی تھی اور سید صاحب اپنے کام میں مشغول تھے۔

اُن کے اس طرز عمل پر آج کل بھی کبھی کبھی اعتراض کر دیا جاتا ہے کہ سر سید دہلوی اصلاح کے متعلق جس قدر بحث چاہتے کرتے مگر مذہبی معاملات میں اُن کو نہ دخل دینا چاہیے تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی معاشرت اُن کے لٹریچر اُن کے اخلاق و عادات اور اُن کے تمدن پر اُن کا مذہب اس قدر چھایا ہوا ہے کہ بغیر مذہبی مسائل میں دخل دیے کسی قسم کی اصلاح ہو ہی نہ سکتی تھی۔

اور سید صاحب کو جس قسم کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اُس کو تعلق زیادہ تر مذہب ہی سے تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف تو انگریزی کی عام تعلیم مسلمان بچوں کو لامذہب اور بدعقیدہ بنا رہی ہے ... ی طرف مشنری لوگ اسلام کی علانیہ تردید کر رہے ہیں اور وہ ناپاک الفاظ زبان سے نکال رہے ہیں جن کے سننے سے مسلمانوں

کا ان کا آشنا ہیں۔ تیسری طرف وہ مذاہب جو مدت ہائے دراز سے اُن کے محکوم چلے آتے تھے آزادی پاکے اُن کے مذہب پر سخت اور وحشیانہ تشنیع کرنے لگے ہیں۔ چوتھی طرف خود مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ بری رسوم اور ضعیف الاعتقادیوں کا نام انھوں نے مذہب رکھ لیا ہے۔

ان حالتوں سے مسلمانوں کا بچانا بغیر اس کے کہ مذہب میں دخل دیا جائے ممکن نہ تھا۔ علاوہ اس کے اب اسلام پر جو اعتراضات ہو رہے تھے وہ بالکل نئی قسم کے تھے۔ عیسائی مشنری اور مورخین کہہ رہے تھے کہ اسلام لوگوں کو مجبور کر کے اور بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ اور اسلام کی بنا ظلم و جبر اور لوٹ پر ہے۔ اس کے مقابل مسلمانوں کو بجائے جواب دینے کے اس پر ناز تھا کہ ہم نے اتنے کافر مارے اتنے گرجے گھر ڈھا دیے۔ اتنے بت توڑے۔ اور تقریر و وعظ کہہ رہے تھے کہ "فاقتلوھم" جہاں موقع پاؤ تم ان کو مار دو۔ کافر کے مارنے سے بڑا کوئی ثواب نہیں۔

عیسائی کہتے تھے کہ مسلمانوں میں جہاد فرض ہے۔ لہذا وہ قدرۃً باغی ہیں اور مطیع و وفاکیش رعایا کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے۔ ادھر ہمارے علما زور و شور سے جہاد کا فتویٰ دے رہے تھے۔ اور عوام کے نزدیک خانہ جنگی اور بلوے اور ہنگامہ کرنے کا نام جہاد تھا۔ عیسائی کہہ رہے تھے کہ اسلام علم و فضل کا دشمن ہے اور حضرت عمر نے مصر کا قدیم کتب خانہ جلوا دیا۔ ادھر ہمارے مولوی صاحب فرما رہے تھے کہ

علم دین فقہ است و قرآن و حدیث   ہر کہ خواند غیر ازین گردد خبیث

اور کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کی روایت جو متعصب عیسائیوں کی بنائی ہوئی تھی اُس کو فخر کے ساتھ قبول کرتے اور بجائے خود اُس پر ناز کر رہے تھے۔

عیسائی رسول اللہ صلعم سے گناہ و عصیان کو ثابت کرتے۔ مسلمانوں کی طرف سے اس کا الزامی جواب توریت سے نکال نکال کے یہ دیا جاتا کہ تمھارے نزدیک فلاں فلاں پیغمبر سے ایسی سیاہ کاریاں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور یہ نہ جانتے تھے کہ عیسائیوں کے نزدیک انبیا معصوم ہی نہیں ہیں۔ اُن کا کچھ نہیں بگڑتا اور تمھارے عقیدے کی نبوت اور اُن کی عصمت میں بٹہ لگا جاتا ہے۔

غرض کہ دشمنانِ اسلام جو اعتراض کرتے اُس کو مسلمان اپنے جاہلانہ غرور سے بجائے دور کرنے کے اُلٹے تسلیم کیے لیتے تھے۔ ایسی حالتوں میں ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ بغیر مذہبی مباحث میں دخل دینے کے مسلمانوں کی اصلاح کیونکر ممکن تھی؟ جو سید صاحب

کے دل میں جم گئی تھی کہ زمانے کا ایسا رنگ ہے کہ اگر مذہبی اصلاح نہ کی گئی تو یہ انگریزی اسکولوں کے تعلیم یافتہ بہت بچے سب عیسائی یا لامذہب اور ملحد ہو جائیں گے۔ اور یقیناً ہو جاتے کیونکہ سید صاحب کے پاس بعد کے زمانے میں متعدد انگریزی طلبہ کے ایسے خطوط آئے۔ جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہب اسلام کے چھوڑنے کو تیار تھے۔ یہ خطوط سید صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔ ان کو اپنی ہمدردی اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور انھیں کو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ ان دنوں اسلام کی پولیٹیکل حالت میں ایک بالکل نیا انقلاب ہوا تھا۔ اور مسلمانوں نے پہلے پہل ایک ایسا زمانہ دیکھا تھا۔ جیسا زمانہ دیکھنا اس سے پیشتر انھیں کبھی نہیں نصیب ہوا تھا۔ یعنی اس سے پہلے مسلمان یا تو خود اپنی مذہبی سلطنت میں رہے تھے یا ایسی غیر سلطنتوں میں رہے تھے جو دنیا میں ان کا اثر غالب دیکھ کے ان کا ادب اور ان کا پاس و لحاظ کرتی تھیں۔ بے شک اسپین میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تھا۔ مگر وہاں ان کی آہ و فریاد کی آوازیں قبل اس کے کہ کسی اور ملک کے مسلمانوں کے کانوں تک پہونچیں اسپین ہی کی خاک میں دب کے فنا ہو گئی تھیں۔ دیگر بلاد و ممالک کے مسلمان یا تو حاکم بن کے رہا جاتے تھے۔ یا کسی کے معزز مہمان بن کے رہتے۔ ایک کمزور رعایا کی زندگی سے وہ بالکل ناآشنا تھے حکومت جاتے ہی ان کو اپنے برابر ہندو نظر آتے تھے جو کل تک ان کے زیر حکومت تھے اور اپنے اوپر یورپ کے لوگ۔ جن کو ان کی وجاہت ماننے اور دیگر رعایا پر انھیں فوقیت دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس زندگی سے ناآشنا ہونے کے باعث ان سے ایسے حرکات صادر ہو جاتے تھے جو ایک طرف تو غیر مذہب پڑوسیوں اور ہم وطنوں کو برافروختہ کر دیتے۔ اور دوسری طرف حکمران قوم کی نظر میں ان کی اطاعت و وفاداری کو مشتبہ ثابت کر دیتے۔ اس زندگی کے عنوان پر انھیں ایک ایسے عاقل و فرزانہ رہبر کی ضرورت تھی جو نہ ہم وطنوں سے بگاڑ ہونے دے۔ اور نہ گورنمنٹ کو اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع دے۔

وہ عاقل و فرزانہ رہبر سر سید ثابت ہوئے جنھوں نے مذہبی مباحث میں پڑ کے اور ناز مانہ شناس ملاؤں سے لڑ بھڑ کے مسلمانوں کو اس زمانہ کے مناسب ایک ایسی مذہبی

زندگی کی تعلیم دی جو زمانۂ مرّوجہ ہو۔ جس کا نام غیر مذہب قوم دشمنوں کے مقابلے میں تو یہ ہو کہ ترکِ موالات و جہاد۔ اور غیر مذہب حاکم کے مقابل میں یہ ہو کہ اسلام میں حاکم اور فرمانروا کی اطاعت فرض اور بغاوت و سرکشی حرام ہے۔ اس زندگی کے متعلق احکام پوچھیے تو مسلمانوں کو نہ حدیث میں مل سکتے تھے اور نہ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں تھے۔ لہٰذا سچ یہ ہے کہ سید صاحب نے مذہبی اصول میں دخل دے کے فقہ اسلام کا وہ حصہ مکمل کر دیا۔ جو بیشتر ضرورت نہ پڑنے کے باعث مدوّن ہی نہیں ہونے پایا تھا۔ حضرات کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام کی یہ تھوڑی اور معمولی خدمت تھی؟ ہرگز نہیں۔ یہ بہت بڑی خدمت تھی۔ اور ایسی خدمت کہ نہ بجا لائی جاتی تو ہندوستان میں اب تک مسلمانوں کا پتہ بھی نہ لگا ہوتا۔

اب ہم اس بحث کو شروع کرتے ہیں کہ سید صاحب نے مذہب میں کیا اصلاحیں کیں اور کن کن مسائل پر گفتگو کی۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس بحث کو بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۴ ایسے مسائل گنوائے ہیں جن میں سرسید نے جمہور علمائے اسلام کے خلاف کیا ہے مگر باوجود اس کے سلف میں سے اپنا کوئی نہ کوئی مستند ہمراے ضرور پیش کر دیا ہے۔ گویا یہ کہنا چاہیے کہ ان مسائل میں وہ متفرد نہیں۔ ان مسائل کی پوری پوری فہرست پیش کر دینا چنداں ضروری نہیں تاہم میں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اجماع و قیاس کا حجت شرعی نہ ہونا۔ کسی آیت قرآنی کا منسوخ نہ ہونا۔ توراۃ و انجیل میں صرف تحریف معنوی ہونا۔ نصرانی کے پکائے ہوئے منخنقہ طایر (گلا گھونٹی مرغی) کو جائز سمجھنا۔ ملائکہ اور شیطان کا وجود خارجی نہ ہونا۔ کفار کے ساتھ تشبہ کا شرعاً ممنوع نہ ہونا۔ معراج اور شق صدر کا خواب میں ہونا۔ معجزہ کا دلیل نبوت نہ ہونا۔ ربا میں سود سے مراد بنیوں مہاجنوں کے سود کا ہونا نہ بنک اور پرامیسری نوٹ کے سود کا۔ رویت باری سے انکار کرنا۔ حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے اور آسمان پر زندہ چلے جانے کا قرآن سے نہ ثابت ہونا اور اسی قسم کے بہت سے مسائل ہیں مگر یہ سب وہ مسائل ہیں جن میں سید صاحب نے اپنے ذاتی اجتہاد کے علاوہ امام غزالی۔ ابن عربی۔ ابن رشد۔ امام ابو المعالی جوینی امام رازی۔ اور شاہ ولی اللہ سے پایہ کے مستند علمائے ماسبق میں سے کسی نہ کسی کو اپنا ہم خیال اور ہمراے ضرور بتایا ہے۔

ان مذکورۂ بالا مسائل کے علاوہ مولانا حالی نے گیارہ ایسے مسائل منتخب کیے ہیں

جن میں سید صاحب متفرد ہیں اور اُن سے پیشتر کسی کا خیال ان کی طرف نہیں گیا تھا وہ مسائل حسب ذیل ہیں

(۱) غلامی کا اسلام میں قطعاً ناجائز اور از روئے نص قرآنی ممنوع ہونا۔ یہ ان دنوں دنیا کا ایک پولیٹیکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یورپ کی سلطنتوں نے اس مسئلہ کو افریقہ و ایشیا کے پالٹیکس میں دخل دینے کا ایک زبردست ذریعہ بنا لیا ہے۔ جاہل مسلمان اور خصوص وہ مسلمان تاجر جو بردہ فروشی کرتے ہیں اسے ایک رکن اسلامی قرار دے رہے تھے۔ اور علمائے اسلام اُن کے اس خیال کی تصدیق کر دینے میں تامل نہ کرتے تھے۔ سید صاحب نے سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں معجز نما اجتہاد کر کے اور بغیر اس کے کہ قیاس کو ذرا بھی دخل دیں نص قرآنی سے ثابت کر دیا ہے کہ غلامی آخر عہد اسلام میں آیہ کریمہ "اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً" کے نزول کے بعد ناجائز ہو گئی۔ کیونکہ اس میں صریح حکم موجود ہے کہ لڑائی کے قیدی یا تو احسان رکھ کے چھوڑ دیے جایا کریں اور یا معاوضہ کا روپیہ لے کے۔ مگر صحابہ کے زمانہ میں اِس پر عمل نہ ہونے پایا۔ اگرچہ خود حضرت رسالت کے عہد میں اس آیۃ کے بعد کبھی کوئی قیدی غلام نہیں بنایا گیا تھا۔

(۲) دعا ایک قسم کی عبادت ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے "الدعاء ہو العبادۃ" اور دعا کے مستجاب اور مقبول ہونے سے مراد حصول مراد نہیں بلکہ مقبولیت عبادت مراد ہے۔

(۳) قرآن پاک میں جہاں "آیۃ یا آیات بینات" کے الفاظ آئے ہیں اُن سے مراد معجزات نہیں بلکہ مواعظ و حکم مقصود ہیں۔

(۴) حضرت مسیح کی مصلوبیت کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ آپ صلیب پر چڑھائے تو گئے مگر صلیب پر آپ کی موت نہیں واقع ہوئی۔

(۵) تعدد ازدواج کے متعلق اُن کی یہ رائے تھی کہ مرد کو اگر اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ عدل نہ کر سکے گا تو اسے ایک سے زیادہ جوروؤں کی اجازت نہیں اِس کو وہ قرآن پاک کی آیۃ "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً" سے استنباط کرتے تھے۔

(۶) چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا کے بارے میں اُن کا دعویٰ تھا کہ یہ سزا لازمی نہیں۔ کیونکہ لازمی ہوتی تو فقہا اس سزا کے تجویز کرنے کے لیے مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کو نہ مشروط کرتے۔ اور نیز صحابہ کے وقت میں بعض چوروں کو قید کی سزا نہ دی جاتی۔

(۷) وہ کہتے تھے کہ قرآن مجید میں جنوں سے مراد چھپے ہوئے لوگ یا پہاڑی اور صحرائی

اقوام ہیں۔

(۸) سورۂ فیل میں ابابیل کے کنکریاں پھینکنے سے مراد چیچک کے مرض کا پیدا ہو جانا ہے۔ جیسا کہ اکثر کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ لیکن اوروں نے اُس کو ایک روایت ضعیف کی حیثیت سے بیان کیا اور سید صاحب نے اسی کو حتمی بالاصل مدد آیت قرار دے دیا۔

(۹) قرآن میں انبیائے سلف کے جو واقعات و حالات مذکور ہیں ان میں اول تو خود ہی خلاف فطرت واقعات کم ہیں۔ مفسرین نے بنی اسرائیل کی کتابوں سے اخذ کرکے اُن واقعات کے جو حلے کیے ہیں وہ البتہ ایسی خلاف عقل باتوں سے لبریز ہیں۔ مگر اس قسم کی چند باتیں قرآن پاک میں موجود بھی ہیں۔ جیسے ید بیضا۔ عصائے موسیٰ۔ دریا میں راستہ ہو جانا فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا۔ خدا کا موسیٰ سے باتیں کرنا۔ کوہ طور پر تجلی الٰہی۔ سامری کے گوسالے کا بولنا۔ پتھر سے پانی کا چشمہ نکلنا۔ ابر کا سایہ کرنا۔ من و سلویٰ کا نزول۔ مسیح کا گہوارے میں بولنا۔ خلق طیر۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا اور مردوں کو زندہ کرنا۔ مائدہ۔ (آسمان سے خوان نعمت) کا نازل ہونا اور اسی قسم کے دیگر واقعات۔ ان سب میں سید صاحب نے اپنے خیال و اجتہاد کے موافق تاویلیں کی ہیں۔ زور اور شور سے قیاس کو دخل دیا ہے۔ اور ان کو فطرت کے موافق ثابت کرنا چاہا ہے۔ یہی باتیں تھیں جنہوں نے تمام علمائے اسلام اور قریب قریب کل مسلمانوں کو چونکا دیا۔ اور جن کی بنیاد پر آج بھی اکثر سید صاحب سے اختلاف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) سید صاحب دعویٰ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام ہے۔ ایک کلام مقصود اور دوسرا غیر مقصود یعنی وہ واقعات جن کا بیان ضمنی طور پر آگیا ہے اور یہ تقسیم کرکے وہ کہتے تھے کہ کلام غیر مقصود سے کسی شے کے نفی و اثبات پر استدلال نہیں ہو سکتا مثلاً کفار کی نسبت ہے۔ "لا تفتح لہم ابواب السماء" اس میں وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا اصل مقصود حرمان یعنی کا فروں کا رحمت الٰہی سے محروم رہنا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے اس بات پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ آسمان میں دریچے اور دروازے ہیں۔

(۱۱) وہ فرماتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ میں دو قسم کے احکام ہیں۔ احکام اصلی۔ اور احکام محافظ احکام اصلی کی بنیاد صرف احکام اصلی پر ہے۔ نہ ان احکام پر جو اصلی احکام کے محافظ ہیں۔ مثلاً وضو۔ قیام۔ قعود۔ رکوع۔ سجود وغیرہ نماز کے محافظ ہیں۔ اور

خود نماز اصلی ہے۔ جس سے توجہ الی اللہ مراد ہے۔ یہ تقسیم فرما دینے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ احکام مجازی کے متعلق یہ بحث نہیں چل سکتی کہ فطرت کے موافق ہیں یا نہیں۔ لازم ملزوم ہونے کے باعث دونوں حکموں کا درجہ یکساں ہے۔ مگر مرض یا عذر کی حالت میں جب مجبوری اور ضرورت سب لوازم ساقط ہو سکتے ہیں:

ان مسائل کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ سب ماننے کے قابل ہیں یا کہ خواہ مخواہ انہیں مان لینا چاہیے۔ اُن کی یہ حالت تھی کہ ایک مجتہدانہ حیثیت سے دینی مسائل میں بحث کرتے تھے اور تقلید سے سب کو منع کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہتے تھے کہ ہر شخص غور و تامل کر کے۔ تحقیق و تنقید سے کام لے۔ اگر یہ مسائل اور فیصلے اُس کے مذاق و تحقیق میں پورے اتریں تو اُن کو تسلیم کرے۔ اور اگر ان کے خلاف اُس کی رائے قائم ہو تو خود اپنی رائے کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے تو اُن کے پیروؤں بلکہ اُن کے دوستوں اور اُن کی تعریف کرنے والوں کا نام نیچری رکھ دیا۔ مگر انہیں لوگوں میں جو نیچری اور اُن کے پیرو بتائے جاتے ہیں۔ ایسے چار مسلمان بھی مشکل سے ملیں گے جو ان سب مسائل میں اُن سے متفق ہوں۔ اُن کے سب سے بڑے معرف جو اُن کی زندگی ہی میں اُن کے خلیفہ بتائے جاتے تھے اور حسن اتفاق سے بعد زندگی اُن کے جانشین قرار بھی پا گئے۔ یعنی نواب محسن الملک بہادر مرحوم۔ مذکورہ مسائل میں سے اکثر میں اُن کے سخت خلاف تھے۔ اُن کے موجودہ جانشین نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب جو اُن کے بڑے دوست اور خاص لوگوں میں تھے۔ وہ قریب قریب تمام مسائل میں اُن کے خلاف ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اُن کے گروہ میں نہ شمار کیے جاتے ہوں

اگر سید صاحب کے ہم مذاقوں کا نام نیچری ہے تو وہ بیشک نیچری ہیں اور اُن کے ساتھ اور بھی بہت سے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مخالفوں نے تو اس کوشش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا کہ نیچری اسلام کا ایک ممتاز فرقہ بن جائے۔ مگر خود سید احمد خان کی یہ حالت تھی کہ وہ کوئی نیا فرقہ نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ ملت اسلامیہ کے اندر تفرق اور نیا فرقہ پیدا کرنے کے نہایت مخالف تھے۔ اسی قدر نہیں وہ کوشش کر رہے تھے کہ جتنے فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ اُن سب کا اختلاف بھی اُٹھ جائے اور ایک سیدھا سادا خالص اور پاک بے غل و غش دین مصطفوی رہ جائے جیسے وہ ٹھیٹھ اسلام کہا کرتے تھے۔ وہ عام مسلمانوں

کی اصلاح کے درپے تھے۔ عام اس سے کہ لکھنؤ والے کسی فرقے سے علاقہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ خالص سنی نیچری نہیں بلکہ نیچری اثنا عشری شیعوں۔ وہابیوں، مقلدوں، اسمٰعیلیوں، آغاخانیوں سب میں موجود ہیں اور یہ مجرد اشتراک سب روشن خیال ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سید صاحب عام مسلمانوں کی اصلاح کے درپے تھے اور سب کے ہادی و رہبر۔ انھوں نے صرف یہ طریقہ بتا دیا کہ امور مذہبی میں کن چیزوں سے اور کیونکر استدلال کیا جائے۔

اگر غور سے دیکھیے تو یہ بڑی حیرت کی بات نظر آتی ہے کیونکہ آج تک جس کسی نے مذہب میں دخل دے کے اصلاح کی کوشش کی ایک نیا فرقہ پیدا کر دیا اس کے نظائر سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ مگر سر سید نے اتنے کثیر التعداد مسائل مذہبی میں گفتگو کی اور اس آزادی سے گفتگو کی۔ مخالفت کا اس قدر زور و شور ہوا۔ مگر ان کی نیک نیتی اور سچی قومی ہمدردی کی برکت سے کوئی نیا فرقہ نہیں پیدا ہو سکا۔ ان کے ماننے والوں میں ہمارے بیان کے موافق شیعہ بھی ہیں۔ سنی بھی ہیں۔ وہابی بھی ہیں۔ بدعتی بھی ہیں سب ہی طرح کے لوگ ہیں اور سب اپنے خاص مذہب کو ویسے ہی ماننے والے ہیں جیسے کہ پہلے تھے اور پھر بھی وہ سید احمد خانی یا نیچری بھی کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ سید احمد خان کے فریق سے مراد مذکورۂ بالا مسائل کے ماننے والے نہیں۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو سید احمد خان کی طرح سے قرآن کی آیت استفت قلبک پر عمل کریں۔ مذہبی روایات کی تنقید کریں اور جو سچ ثابت ہو اس پر عمل کریں۔

غرض سید احمد خان نے اصل میں جو کچھ کیا صرف دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اجتہاد کا عام دروازہ کھول دیا۔ اور جن لوگوں پر مخالفین اسلام اور غیر مذاہب کے اعتراضات کا جادو چلنے والا تھا۔ ان کے دل میں جما دی کہ تمھارے جن مسائل پر غیر لوگ اعتراض کر رہے ہیں ان کو صرف رواج یا علما کے کہنے سے اپنے مذہب کا مسئلہ نہ مان لو بلکہ غور و تامل سے دیکھو کہ وہ مسئلہ شارع سے ملا ہے یا بعد میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور رسم کے طریقہ سے دین کی باتوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ احادیث کی تنقید میں اہل حدیث و روایت کی طرح صرف روایت اور حدثنا و اخبرنا سے بحث نہیں کی بلکہ درایت سے بھی کام لیا۔ اصول حدیث میں یہ مسئلہ قدیم سے لکھا چلا آتا تھا کہ واقعات سلف اور حدیثوں کی جانچ میں قیاس

اور عقل سے بھی کام لینا چاہیے جیسے محدثین سلف اپنے ذوق سلیم سے بھی اندازہ کر کے بتا دیا کرتے تھے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع۔ مگر بعد والوں نے سوائے روایت کے اس اصول کو مطلقاً چھوڑ دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اور امام غزالی وغیرہ کے خیالات بھی اس جانب متوجہ ہوئے تھے۔ ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمہ میں اس اصول پر زور دیا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس اصول سے اگر کام لیا تو صرف سرسید نے۔ بس اُن کی اتنی ہی چیز ہے جس کو ہم لیتے اور اُن کے پیرو بنتے ہیں۔ باقی رہے وہ مسائل جو انھوں نے اپنے اجتہاد سے نکالے اُن کی نسبت ہر شخص کو اختیار ہے کہ چاہے مانے یا نہ مانے۔ تحقیق کا دروازہ کھلا ہے اور روز بروز زیادہ کھلتا جاتا ہے۔ وہ کتابیں جو نایاب تھیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ علوم دینیہ کا ذخیرہ روز بڑھتا جاتا ہے۔

ہر شخص کا ہاتھ اُن کتابوں تک پہونچنے لگا ہے جو پہلے کبھی خواب میں بھی نہ نظر آتی تھیں۔ اور ایسی ایسی مستند اور قدیم تصنیفیں پردۂ خفا سے نکل کے چھپتی اور شائع ہوتی جاتی ہیں۔ کہ تنقید کا سلسلہ روز افزوں ترقی کرتا رہے گا۔ بعد میں ایسے لوگ آئیں گے جو سرسید سے زیادہ وسیع النظر اور زیادہ محقق ہوں گے۔ اور بعد کی پرکھ میں خدا جانے کتنے مسائل رہیں گے اور کتنے مٹ جائیں گے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ سید احمد خان کے بتائے ہوئے مسائل میں سے کتنے لغو ثابت ہو کے فنا ہو جائیں گے اور کتنے نئے پیدا ہوں گے۔ مگر یاد رکھو کہ توحید و رسالت کا سکہ ایسا ہی جاری رہے گا اور سید احمد خان کی یہ برکت روز بروز زیادہ نمایاں طور پر ثابت ہوتی اور دنیا پر حکومت کرتی جائے گی۔ کہ مذہب کو سچے دل سے مانو۔ مگر سوچ سمجھ کے اور یہ دیکھ کے کہ کتنا حصہ بانیٔ مذہب کا بتایا ہوا ہے اور کتنا حشو و زوائد کے حکم میں ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ سید صاحب نے آج سے تیس۳۰ پینتیس۳۵ سال پہلے جن مسائل پر گفتگو شروع کی تھی اور جو فیصلے کیے تھے وہی اب مستند علمائے مصر کے زبان و قلم سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اور ویسی ہی اصلاحیں وہاں بھی شروع ہو گئی ہیں جیسی کہ ہندوستان میں سرسید مرحوم نے کرنا چاہی تھیں۔ مگر ہماری بدقسمتی سے جیسی مخالفت ہندوستان میں ہوئی مصر میں نہیں ہوئی۔

مسلمانوں پر ایک بہت قیمتی اثر سید صاحب کے مذہبی ریفارم کا یہ پڑا کہ مذہبی

تعصب جو حکومت و دولت مندی اور خود پسندی و جہالت کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا بہت کم ہو گیا۔ فرقہ ہائے اسلام کا باہمی تعصب بھی ایک بڑی خطرناک چیز تھا۔ شیعہ اور سنی کی دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔ سید صاحب نے اسے بھی کم کر دیا اور کالج میں طلبہ ایک ایسی بے آزار مہذب شائستہ اور غیر متعصبانہ زندگی سیکھ کے نکلتے ہیں جس کی نظیر سے مسلمانوں کی تمام درسگاہیں خالی ہیں۔

بس میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں میں نے کافی حد تک بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ غلط فہمی اب بہت کچھ رفع ہو گئی ہو گی کہ سید صاحب دنیا میں کوئی نیا مذہب نہیں چھوڑ گئے ہیں بلکہ تحقیق و تنقید کی برکت ایسی وسیع النظری کے ساتھ پیدا کر گئے ہیں کہ مسلمان اگر تحقیق سے کام لینا شروع کرے تو اُن کی پیروی کرنے ہی سے نیچری نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اُن کی تردید کرنے والا بھی اگر رسم پرستی سے محفوظ ہو تو نیچری اور سرسید کے گروہ کا رُکن رکین ہے۔ جناب پریسیڈنٹ اور حاضرین! میں اب آپ سے اجازت لے کے اپنے بیان کے سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ اور جس توجہ سے میرا لکچر سننے میں آپ نے اپنا وقت عزیز صرف کیا اُس کی نسبت آپ کا شکرگزار ہوں۔ والسلام

محمد عبدالحلیم شرر

ہان اقبال / جہان آزاد

ہندستان کا اچھوت مسئلہ

اور

اقبال اور آزاد کے دو اہم خطوط

- علامہ اقبال کا ایک نایاب مکتوبِ گرامی

بنام: شیخ الازہر، قاہرہ

محمد اکرام چغتائی

- مکتوبِ آزاد — بنام: سید سلیمان ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد

محمد اکرام چغتائی

علامہ اقبال کا ایک نایاب مکتوب گرامی

بنام : شیخ الازہر، قاہرہ

ہندو معاشرے میں ذات پات کا نظام صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس عرصے میں بہت سی مخالف ہوائیں چلیں، متعدد اصلاحی اور مذہبی تحریکوں نے لوگوں کو اس نظام کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوششیں کی، لیکن اس کی بنیادیں اس قدر مستحکم تھیں کہ اتنی شدید مزاحمت کے باوصف اس غیر انسانی نظام کی عمارت زمین بوس نہ ہو سکی۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہندو معاشرے کے لیے اس نظام نے ایک ایسا مضبوط اور بلند و بالا حصار مہیا کر دیا، جس میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے راستے مسدود دکھائی دیتے ہیں۔ نسلِ انسانی کی اس قلعہ بندی نے ہندوؤں کے معاشرتی خصائص کو تو کسی حد تک قائم رکھا، لیکن اس کے اندر رہنے والوں کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اس ماتم سے شاید کبھی فارغ نہ ہو سکے کہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی تک، پورا انسانی معاشرہ اس نظام کے جبر سے کراہتے ہوئے کروڑوں بے بس اولادِ آدم کی چیخ و پکار سنتا رہا لیکن ذات پات کے ذلت آمیز برتاؤ سے غریبوں کو نجات نہ دلا سکا۔ بے شبہ تاریخ میں اس ظلم کے خلاف آوازیں بھی بلند ہوتی رہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آوازیں غیر مؤثر رہیں۔

ایسی ہی ایک آواز ۱۹۳۵ء میں متحدہ ہندوستان کی ایک بہت بڑی آبادی کے، جسے اچھوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک سرکردہ لیڈر کی جانب سے بلند ہوئی۔ یہ آواز اچھوتوں کی نامور سیاسی شخصیت ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیدکر (۱۸۹۱ء - ۱۹۵۶ء) کی آواز تھی، جس نے اس طبقے میں اجتماعی طور پر سیاسی بصیرت، شعورِ ذات اور ذہنی

بیداری کی ایک لہر دوڑادی اور نتیجتاً یہ طبقہ بھی سیاسی محاذ پر ایک قوت بن کر سامنے آگیا۔

ڈاکٹر امبیدکر کے تفصیلی حالات زندگی اور ان کے سیاسی کارناموں کو اُن کے انگریزی[1] اور مرہٹی[2] سوانح نگاروں نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں اتنا ہی بتادینا کافی ہوگا کہ ڈاکٹر موصوف ایک اچھوت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ اعلیٰ تعلیمی خوبیوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھیں اُن بے انصافیوں اور زیادتیوں کا شدید احساس تھا جو ہندو معاشرہ صدیوں سے ان کے ہم ذات افراد پر کر رہا تھا۔

چنانچہ امبیدکر نے ہندوستان واپس آتے ہی اچھوتوں کی معاشرتی سطح کو بلند کرنے اور ان کو بنیادی انسانی حقوق دلانے کے لیے تگ و دو شروع کردی۔ ان کی خواہش تھی کہ اچھوت اپنے مسائل اور مطالبات کے لیے کسی اور کے محتاج نہ ہوں اور اُنھیں اپنی بکھری ہوئی قوت کو مجتمع کرکے خود ہی اپنے مسائل حل کرنا چاہییں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جداگانہ انتخابات کی پر زور حمایت کی لیکن کانگریس کے زعما اور مہاتما گاندھی نے ڈاکٹر امبیدکر کے سیاسی مطالبات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا، بلکہ ان کے خلاف مرن برت بھی رکھا۔ بالآخر مہاتما گاندھی اور امبیدکر کے مابین ۲۴۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ایک سمجھوتہ طے پایا، لیکن یہ سمجھوتہ سیاسی امور تک محدود تھا، جب کہ ذات پات کے مسئلے پر یہ دونوں رہنما کوئی متفقہ لائحہ عمل تلاش نہ کرسکے۔

جب امبیدکر اور گاندھی جی کے متذکرہ بالا معاہدے کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوسکے تو بالآخر ڈاکٹر امبیدکر نے ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ضلع ناسک (Nasik) کے ایک شہر Yeola میں منعقد ہونے والی اچھوت کانفرنس میں یہ اعلان کردیا کہ وہ عنقریب ہندو مت ترک کردیں گے اور کسی ایسے مذہب کو اختیار کرلیں گے جو اُنھیں اور اُن کے ہم ذات لوگوں کو ذات پات کے اس چنگل سے آزاد کردے۔ امبیدکر کی اس تاریخی تقریر کے کچھ حصے اس دور کے انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہوئے۔ اس تقریر کا مکمل متن S. R. Kharat نے اپنی مرہٹی کتاب میں دیا ہے[3]
ذیل میں اس تقریر کا متعلقہ حصہ درج کیا جارہا ہے:

"We shall cease our fight for equality where we are denied it. Because we have the misfortune of calling ourselves Hindus, we are treated thus. If we are members of another Faith, none would dare treat us so. Choose any religion which gives you equality of status and treatment We shall repair our mistake now. I had the misfortune of being born with the stigma of an Untouchable. However, it is not my fault, but I will not die a Hindu, for this is in my power."

اپنی تقریر کے آخر میں ڈاکٹر امبیدکر نے اچھوتوں کو یہ تلقین کی کہ وہ فی الحال اپنی دیگر تحریکوں اور مطالبوں کو پس پشت ڈال دیں اور متحد ہو کر اپنے انسانی حقوق کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اچھوت ایک الگ قومیت سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ بھی اس دھرتی پر آزادی کا سانس لے سکیں [۴۲]

ڈاکٹر امبیدکر کی اس تقریر نے ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ ہندو تبدیلِ مذہب کے اس اعلان سے سخت پریشان تھے اور انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں اتنی بڑی اکثریت ان کے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے اس تقریر کے حوالے سے ۱۵۔ اکتوبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو جو انٹرویو دیا، اس میں اچھوتوں کی سماجی بدحالیوں کو تو تسلیم کیا گیا، لیکن تبدیلِ مذہب کے بارے میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ مذہب کوئی گھر یا کوٹ نہیں، جس کو جب چاہا، تبدیل کر لیا [۴۳]

ڈاکٹر امبیدکر کے تبدیلیٔ مذہب کے اعلان نے جہاں ہندوؤں کو مستقبل کے خطرات کے سبب تشویش میں مبتلا کر دیا، وہاں دیگر مذاہب کے پیروکاروں، حتیٰ کہ بعض مذہبی فرقوں نے اچھوتوں کو اپنے مذہب یا مسلک میں شامل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ ں ضمن میں بعض مسلمان انجمنوں کے اہل کاروں نے سب سے زیادہ سرگرمی کا ثبوت ا۔ امبیدکر کی تقریر سے تقریباً ایک ہفتہ بعد یعنی ۲۱۔ اکتوبر کو مولانا محمد عرفان خلافت

کمیٹی کے نمائندے کی حیثیت سے اُنھیں ملے۔ ان کے ہمراہ سید عزیز الرحمن بھی تھے۔ ان اصحاب نے امبیدکر کو اسلام کی غیر طبقاتی تقسیم، مساوات اور رنگ و نسل کی تمیز کیے بغیر لوگوں کی خدمت جیسی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرایا اور انھیں دعوت دی کہ وہ اور ان کے تمام ہم ذات افراد جونہی دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے، انھیں یہ تمام مراعات خود بخود حاصل ہو جائیں گی اور وہ ہر مسلمان کی طرح آزادی کے ساتھ سانس لے سکیں گے، نیز سیاسی اعتبار سے مزید مستحکم ہو جائیں گے۔ جواباً امبیدکر نے ان علما کو بتایا کہ تبدیلی مذہب جیسے اہم مسئلے کو وہ ذاتی طور پر حل نہیں کر سکتے اور وہ اس سلسلے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، اس میں ان کے ساتھیوں کا مشورہ ضرور شامل ہوگا۔

امبیدکر سے رابطہ قائم کرنے والی ایک جماعت بمبئی کی "جمعیت شبان المسلمین" بھی تھی، جس نے انھی دنوں لاہور کے نومسلم قانون دان خالد لطیف گابا کو بذریعہ تار مدعو کیا تاکہ وہ آکر امبیدکر سے بالمشافہ گفتگو کر سکیں۔ گابا نے اس ضمن میں علامہ اقبال سے رابطہ کیا تو انھوں نے یہ ہدایت کی کہ وہ اور مولانا محمد عبداللہ قصوری (جمعیت دعوت و تبلیغ) فوراً بمبئی روانہ ہو جائیں۔ (بحوالہ "انقلاب" بابت ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء)۔ بمبئی ہی کی خاکسار تحریک کے ایک اجلاس (منعقدہ ۲۰، اکتوبر) میں، جس کی صدارت چوہدری افضل حق نے کی، اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ مبلغین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اچھوتوں کی بستیوں میں جا کر اسلام کی تعلیمات کا پرچار کرے۔ اس کمیٹی کے لیے ان کو منتخب کیا گیا: سید سلیمان ندوی (یوپی)، ڈاکٹر محمد اقبال (پنجاب)، مولانا مفتی کفایت اللہ (دہلی)، مولانا سید حسین احمد مدنی (یوپی)، مولانا محمد علی قصوری (بمبئی)، خالد لطیف گابا (پنجاب) اور مولانا شوکت علی (بمبئی)۔[۳۶]

علمائے دین اور تبلیغی اداروں کے علاوہ اس مہم میں مسلمان پریس نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "مدینہ" (بجنور) نے اپنے ایک شمارے (بابت یکم نومبر ۱۹۳۵ء) میں مسلمانوں پر زور دیا کہ انھیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اچھوتوں کو دائرۂ اسلام میں لانے کی کوششیں جاری رکھنا چاہییں اور اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کے لیے ایک عمومی کونسل

بھی تشکیل دینی چاہیے، جس میں مختلف صوبوں کے نمائندے شامل ہوں اور وہ وفد کی شکل میں امبیدکر سے ملاقات کریں اور انھیں اسلام میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔

روزنامہ "انقلاب" (بابت ۱۸، اکتوبر ۱۹۳۵ء) رقم طراز ہے کہ "اچھوت اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں، یہ ہم محض اس بنا پر نہیں کہتے کہ اسلام ہمارا اپنا مذہب ہے اور ہمارے نزدیک یہ دین و دنیا میں فلاح کے حصول کا واحد ذریعہ ہے بلکہ اس لیے بھی کہتے ہیں کہ کلمہ توحید کے اقرار کے ساتھ ہی اچھوتوں کے لیے کامل مساوات کا دروازہ کہیں اور نہیں کھل سکتا۔"

اس دوران میں جب ڈاکٹر امبیدکر کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا کہ "میں نے ایک مذہب قبول کر لیا ہے، لیکن ابھی اس کا نام نہیں بتانا چاہتا" (بحوالہ "انقلاب" بابت ۲۷، اکتوبر ۱۹۳۵ء) تو پورے ملک کے پریس میں امبیدکر کی قرارداد کی موافقت اور مخالفت میں مضامین اور اداریے لکھے جانے لگے۔ چنانچہ چند ماہ بعد بیرونی ممالک، مشرق وسطیٰ اور مصر کے ممالک تک اطلاعات پہنچنا شروع ہو گئیں کہ ہندوستان میں اچھوتوں کی بہت بڑی تعداد کے راہنما تبدیل مذہب کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔

مصر کے اخبارات مثلاً ہفت روزہ الفتح، روزنامہ البلاغ اور الاہرام میں اچھوتوں کے ارادۂ تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں رپورٹوں کی اشاعت شروع ہوئی اور وہ بھی زیادہ تر روزنامہ "البلاغ" میں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس اخبار کا اپنا ایک نمائندہ بمبئی میں مقیم تھا اور وہ اپنے اخبار کو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے حالات پر مبنی رپورٹیں ارسال کرتا رہتا تھا۔ اس نمائندے کی ایک رپورٹ "البلاغ" کے ۱۷، جون ۱۹۳۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور یہ اس نے بمبئی سے ۶، جون کو روانہ کی تھی۔ اس میں یہ خبر دی گئی کہ اس دفعہ عید میلاد النبیؐ کی مبارک تقریبات میں بہت سے نومسلم اچھوتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی کے بیٹے ہیرا لال نے بھی تقریر کی، جس نے اس سال ۲۹، مئی کو اسلام قبول کیا تھا اور اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا تھا۔

اسی سال یعنی ۱۹۳۶ء میں "الاہرام" کو بھی کلکتہ سے ایک مفصل رپورٹ ملی جو ۱۰، جون

کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس رپورٹ میں یہ بتایا گیا کہ مہاتما گاندھی کا ایک پیروکار پنڈت گزدھم اپنے بارہ سو ساتھیوں سمیت حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ہے۔
مصری اخبارات میں ان رپورٹوں کی اشاعت نے عوام الناس میں تبلیغ دین کے لیے ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور وہاں کے علماء و مبلغین، ارباب فکر و دانش اور متعدد شخصیات نے ہندوستانی مسلمانوں کے تعاون سے اچھوتوں کو دائرۂ اسلام میں شامل کرنے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا، چنانچہ فوراً ایک کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا، جو جمعیت شبان المسلمین (بمبئی) کے اشتراک عمل سے کام کرے گی۔ اس کمیٹی کے صدر شہزادہ عمر طوسون مقرر کیے گئے۔ علاوہ ازیں جامعہ الازہر کے ریکٹر (شیخ الازہر) نے اس مسئلے کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں ہندوستان کی بعض علمی شخصیات اور تبلیغی اداروں سے رجوع کریں گے اور اگر ممکن ہو سکا تو ایک خصوصی وفد بھی ہندوستان بھیجیں گے تاکہ صحیح صورت حال کا موقع ہی پر جائزہ لیا جا سکے (بحوالہ "البلاغ" بابت ۱۷ جون ۱۹۳۶ء)

جب مصری اخبارات میں اچھوتوں کے بارے میں ہندوستان سے آمدہ اطلاعات شائع ہو رہی تھیں، ان دنوں جامعہ الازہر کے ریکٹر محمد مصطفیٰ المراغی تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس عہدے پر فائز تھے (سنہ تقرر مئی ۱۹۲۸ء)، لیکن انھیں بعض وجوہ کے باعث نومبر ۱۹۲۹ء میں مستعفی ہونا پڑا۔ چند سال بعد انھیں پھر اسی عہدے پر تعینات کر دیا گیا (اپریل ۱۹۳۵ء) اور پھر وہ اپنی وفات (۲۲۔ اگست ۱۹۴۵ء) تک الازہر کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔

محمد مصطفیٰ المراغی علوم دینیہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے اور انھیں عرب ممالک میں ایک دینی مصلح، جید عالم، مفسر اور فقیہ کی حیثیت سے بلند مقام حاصل تھا۔ چنانچہ اسی قدر و منزلت کی وجہ سے انھیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایک ایسا وفد تشکیل دیں جو ہندوستان کے اچھوتوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرائے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اچھوتوں تک دعوتِ اسلام پہنچانے کے لیے کون سا لائحہ عمل سودمند ثابت ہوگا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ مصری وفد کو ہندوستان بھیجنے سے قبل وہاں کی نامور علمی شخصیات سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ ایسی تجاویز پیش کریں، جن پر عمل پیرا ہو کر یہ وفد اپنے تبلیغی فرائض بطریق احسن انجام دے سکے۔ چنانچہ شیخ الازہر نے اپنے اسی مقصد کے پیش نظر اس دور کی تین شخصیات یعنی علامہ محمد اقبال، نومسلم خالد لطیف گابا اور مولانا شوکت علی کو الگ الگ خطوط روانہ کیے۔

المراغی نے اقبال کے نام جو خط تحریر کیا، وہ عربی میں تھا، لیکن اس کا اصل متن دستیاب نہ ہونے کی صورت میں اس کا جو اُردو ترجمہ اُس دور کے اخبارات میں شائع ہوا، وہی یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اُمید ہے کہ جناب مکرم و معظم بخیر و عافیت اور اللہ تعالیٰ کے افضال و نعم سے شادکام و خوش ہنگام ہوں گے۔

گزارش ہے کہ میں نے جریدہ "البلاغ" مصر میں ایک جامع و طویل مقالے کا مطالعہ کیا ہے، جس میں اچھوتوں کی اس کانفرنس کا تذکرہ ہے، جس میں انھوں نے دین بت پرستی کو ترک کرنے اور کوئی مذہب اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جناب مکرم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ وہ زریں موقع ہے کہ جس کو اسلام بلکہ تمام ادیان و مذاہب کی تاریخ میں دوبارہ دستیاب ہونا ندرت کا حکم رکھتا ہے۔ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ کمر ہمت کو چست رکھیں اور جدوجہد کی آستینوں کو چڑھا لیں اور ان لوگوں کو اسلام کے مقدس و متبرک حلقوں میں داخل کرنے کے لیے جو کوششیں بھی ان کی قدرت میں ہوں، کر ڈالیں۔ اسلام وہ فطری مذہب ہے کہ رواداری، سادگی اور موافقت جمہور کے مسئلے میں کوئی مذہب اس کا مثیل نہیں بن سکتا۔ یہی وہ مذہب ہے کہ اللہ کے سامنے اور عدل و انصاف کے سامنے اپنے ماننے والوں کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت

حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ اسلام کا قطعی فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان نسب و قرابت کے کوئی وجوہ حائل نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے نزدیک وہی بندہ سب سے زیادہ مہذب ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان میں ایسی اسلامی جماعتیں موجود ہیں، جن میں بہترین علما اور قابل ترین مناظر و مبلغ موجود ہیں اور اُمید ہے کہ وہ اس راہ پر جو کہ سچے جہاد کی راہ ہے، قابلِ تحسین اقدام شروع کر دیں گے۔ بایں ہمہ اگر آنجناب پسند کریں تو ازہر بھی اس جہادِ اکبر میں حصہ لے اور اپنے علما اور قابل ترین مناظرین کا وفد ہندوستان کی طرف بھیجے جو اس کی جدوجہد میں برادرانِ ملتِ اسلامیہ ہند کا ہاتھ بٹائے۔

اگر جناب کا جواب اثبات میں ہو تو فرمائیے کہ ارکانِ وفد کیسے ہونے چاہییں اور کیا یہ ضروری ہے کہ ان ارکان کے ساتھ ایسے ترجمان ہوں جو ان کی تقریروں کا ترجمہ کریں یا ہندوستان ہی سے ایسے آدمی مل سکیں گے جو عربی اور انگریزی دونوں زبانیں جاننے کی وجہ سے ترجمان کا کام اچھی طرح کر سکیں۔"[لہ]

شیخ الازہر کا یہ خط ملتے ہی اقبال نے سب سے پہلے اپنے دیرینہ دوست غلام بھیک نیرنگ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے رائے طلب کی۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۳۶ء کو اقبال نے نیرنگ کو یہ خط ارسال کیا:

"مجھ سے شیخ الازہر صاحب نے مشورہ طلب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وفد کے متعلق آپ ضروری ہدایات دیں۔ مہربانی کر کے آپ لکھیں کہ ان کو کیا مشورہ دیا جائے۔ بعض باتیں میرے خیال میں ہیں، مگر میں آپ کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس وفد کے ہمراہ ملک کا دورہ بطور پروپیگنڈا سیکریٹری کے کریں۔ اس سے بہت اچھے نتائج نکلیں گے اور وفد کو آپ کی معلومات کے ایمان و عواطف سے بے حد فائدہ پہنچے گا۔"[ثلہ]

اقبال کی فرمائش پر نیرنگ نے اپنی تجاویز پیش کر دیں اور ساتھ ہی ان مشکلات کا بھی ذکر کر دیا، جو اس وفد کے مقصد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی تھیں۔ ممکن ہے، نیرنگ نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہو کہ مصری وفد کے ہندوستان آنے سے خاطر خواہ نتائج متوقع نہیں ہیں۔ چنانچہ اقبال نے فوراً نیرنگ کے موقف کو درست مانتے ہوئے پھر بھی اس وفد کی آمد کو مسلمانوں کے لیے مفید قرار دیا۔ ان کے خط (بنام نیرنگ بلا تاریخ، اندازاً جولائی ۱۹۳۶ء) کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"آپ کا خط عین انتظار میں ملا۔ یہ تمام مشکلات میرے ذہن میں تھیں جو آپ نے خط میں لکھی ہیں۔ باوجود ان کے میرا خیال تھا کہ ان کا ہندوستان آنا عام طور پر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اور نیز خود مسلمانوں پر اچھا اثر ڈالے گا۔ ان کے آنے سے مسلمانوں کے تبلیغی جوش میں اضافہ ہوتا بہت ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر عام اسلامی اخوت کا اثر پڑے گا۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ ان کو تمام مشکلات سے آگاہ کر دیا جائے اور جو فوائد ان کے وفد سے ممکن ہیں، ان کا بھی ذکر کر دیا جائے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔"[11]

اقبال نے شیخ الازہر کا خط ۲، جولائی ۱۹۳۶ء کے روزنامہ "احسان" میں شائع کرادیا اور اسی روز انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کو ایسے مترجمین مہیا کرنے کے بارے میں خط لکھا، جو مصری وفد کے ارکان کی تقریروں کا اردو اور انگریزی میں ترجمہ کر سکیں۔

علامہ اقبال نے غلام بھیک نیرنگ کی مفصل تجاویز اور انجمن حمایت اسلام کے باب بست وکشاد کے فیصلوں کی روشنی میں شیخ الازہر کو ایک طویل مکتوب روانہ کیا۔ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خط کا سنہ تحریر کیا ہے۔ البتہ اس کا جو خلاصہ قاہرہ کے اخبار "البلاغ" میں شائع ہوا (بابت ۲۵، جولائی ۱۹۳۶ء) اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے وسط جولائی میں یہ مراسلہ بھجوایا ہوگا۔ اقبال کے اس خط

ملخص پہلی بار بشیر احمد ڈار مرحوم نے مختصر تعارف کے ساتھ شائع کرایا تھا[۲۲] اس خلاصے کا
ردو ترجمہ اسی سال یعنی ۱۹۳۶ء ہی میں "انقلاب" ۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔
ں خلاصہ اب تک اقبال کے مکاتیب اور تحریروں کے مجموعوں میں شامل ہوتا چلا آرہا
ہے۔ اب پہلی بار سطور ذیل میں علامہ اقبال کے مکتوب گرامی بنام شیخ محمد مصطفیٰ المراغی
مکمل متن منظر عام پر لایا جارہا ہے۔

شیخ الازہر حضرت شیخ مصطفیٰ المراغی کے نام علامہ اقبال کے خط کا مکمل متن۔

Your reverence : I received your esteemed lette and ask to be excused for the delay in answering it Since it involved some necessary enquiries on my par before writing. I have applied to some of the Islami societies and some of the more important educationa societies of India, and I am now in a position to reply to you on the points on which you consulted me

It was a noble thought of yours to propose sending an Egyptian mission to India. For Islam in India moves on with hastening footsteps. And I have no doubt that the embracing of Islam by the outcastes will be an exceptional opportunity in Indian history and one with a great influence on the future history of Islam throughout Asia It is not only outcastes who are entering Islam, there is also a movement, even if it is slow, on the part of the higher ranks of Indian society No doubt you read in the Indian newspapers that the son of Mahatma Gandhi has actually become a Muslim Never a week passes but some member of the higher castes of India enters Islam in some Indian mosque

It is very clear to me that a great opportunity is before Islam in India And it seems as if this opportunity is calling out hitheto undreamed of powers in the Indian Muslim community

As for the matter of the outcastes, there is one hindrance almost impossible to overcome, which is that the greater number of these outcastes live in the south of India and speak six different languages, none of which are really capable of expressing the highest religious thought. Hence your Reverence will understand the difficulty of finding interpreters able to pass on the massage of your delegation in the language of the outcastes. So far, our Indian Islamic societies have not found a solution for this problem, and it would of course be impossible to make a success of evangelistic work except through the help of our Indian Muslim societies.

I have taken the advice of two of the largest Islamic societies in India, who assured me that they would do everything in their power to help such a mission from the Azhar, but this does not dispel the difficulty I have already explained

My opinion, then , is that the visit of an Egyptian mission to India would be beneficial to the Islamic movement in India, and would quicken the activities of Muslim societies in this land, and would reveal to the higher classes the true spiritual brotherhood of Muslims, and the spread of Islam into all parts of the world If in spite of the difficulties which I have mentioned, you still think of sending a mission to India. I should like to make the following proposals -

1 The mission must consist of 'ulama who are well informed and able to set forth Islam in the light of modern ideas and modern experience They must have information and figures showing how Islam has raised the pagans of Africa to a civilized status

2. It is necessary that during their stay in India and their travels in the country the mission should live in a manner which benefits the good reputation of the Muslims in Egypt.

3. It is necessary that secretary should be attached to mission who would secure invitations for its work in different Muslim towns.

4. On its return to Egypt the mission should take with it a number of young converts to Islam from the outcastes to be trained in the Azhar, and to spend sufficient time there to become really capable exponents of Islamic life and thought, thus fulfilling the saying of the converts of old, 'I was once a Kurd, now I am an Arab'. These, as you will have perceived, will be leaders in Islamic societies on their return to India, as we have seen in the case of non-Islamic societies.

5. I consider that it would be wise before the mission leaves Egypt to get into touch with Maulvi[13] Sayyid Ghulam Bheek Nairang the lawyer in the city of Anbala. He is a member of the Indian parliament and secretary of the principal Islamic society of India, and has written to me that he is willing to help the mission to the best of his ability.

It is not necessary for me to tell you that if you do send a mission to India they will have a warm welcome from their Indian Muslim brothers The Muslim community everywhere, as your Reverence knows, is waking up to the spiritual brotherhood which distinguishes Islam. The Muslims of India are deeply concerned to bring the outcastes into Islam and are found by the orders of their religion to do so Alas, the rich among them, unfortunately, for various reasons[14] which I need not specify, care very little for the affairs of Islam.

علامہ اقبال کا شیخ الازہر کے نام یہ مکتوب جولائی ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا اور اسے بعد میں شیخ الازہر کے خط بنام اقبال سمیت مصر کے اخبارات میں بھی شائع کرادیا گیا -

اس سے اگلے ماہ یعنی اگست میں دہلی کے انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" نے یہ دونوں مراسلات شائع کر دیے اور ساتھ ہی ان خطوط کے مندرجات کو بنیاد بنا کر ایک طویل مضمون بھی شائع کر دیا، جس میں اقبال کے اس اقدام پر شدید تنقید کی گئی کہ اُنھوں نے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے لیے علمائے مصر کی اعانت حاصل کی ہے۔ "ہندوستان ٹائمز" کے اس مضمون نے تمام ہندو پریس میں اقبال کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔

'ہندوستان ٹائمز' کی پیروی میں "تیج" اور "پرتاپ" نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہندو اخبارات کو اقبال سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ اُنھوں نے ہندومت سے تعلق رکھنے والی اتنی بڑی اکثریت کو ہندوؤں سے الگ کرنے کی ترغیب دے کر انھیں سیاسی اور سماجی سطح پر کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید یہ کہ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے مصر جیسے اسلامی ملک کے علما اور اربابِ فکر و نظر کو ہندوستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی دعوت دی ہے۔

اقبال کے خلاف ہندو پریس کی مخالفت کے جواب میں مسلم پریس کو آگے آنا پڑا اور مختلف اخبارات و جرائد میں اقبال کی تائید میں خبریں اور مضامین شائع ہونے لگے۔ مثلاً روزنامہ "انقلاب" (بابت ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۶ء) رقم طراز ہے:

"ہندوستان ٹائمز" میں مصر کے ایک انگریزی اخبار کے حوالے سے اچھوتوں کے تبدیلِ مذہب کے سلسلے میں شیخ الازہر اور حضرت علامہ اقبال کی خط و کتابت شائع ہوئی ہے، جسے ہندوؤں نے حسبِ توقع ایسے انداز میں شائع کیا ہے کہ گویا ہندوستان میں اچھوتوں کے تبدیلِ مذہب کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور شیخ الازہر نے مصر سے ایک تبلیغی وفد ہندوستان بھیجنے کی جو تجویز فرمائی ہے، وہ غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ شائع شدہ تحریرات حضرت شیخ الازہر اور حضرت علامہ اقبال کے حقیقی خیالات و افکار کا کس حد تک صحیح آئینہ ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اصل مسئلہ بے حد اہم ہے۔ مسلمانانِ ہند کو اس پر خاص توجہ مبذول کرنی چاہیے تھی لیکن افسوس کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا، ابھی تک اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کم از کم

ہندوستان کے اندر آج تک ایسا زریں موقع کبھی نہیں آیا کہ غیر مسلموں کی اتنی بڑی آبادی، جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ تعداد کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہے، تبدیلِ مذہب کے جذبے سے معمور ہوئی ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ صحیح اسلامی تعلیمات کا عملی پیکر بن کر دوسرے مذاہب کے باشندوں کے لیے سرچشمۂ جذب وکشش بنتے۔ وہ اپنے نیک، اچھے اور سچے اسلامی اعمال کے ذریعے سے ہر غیر مسلم قوم کے سامنے سراپا تبلیغِ دینِ قیم بن جاتے، لیکن انھوں نے اس فرض سے غفلت برتی۔ آخر قدرت نے خود اچھوتوں کو تبدیلِ مذہب پر آمادہ کر دیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کا فرض تھا کہ منظم طریق پر دینِ اسلام کی خوبیاں اچھوتوں پر واضح کرتے اور مختلف حلقوں میں مختلف جماعتیں ضروری اسباب کا انتظام کر کے تبلیغِ دین شروع کر دیتیں، لیکن افسوس کہ یہ بندوبست بھی جس پیمانے پر مطلوب تھا، نہ ہو سکا۔ ہمارے نزدیک اس غفلت کے ذمہ دار وہ اکابر ہیں جو سالہا سال سے مسلمانوں کی قیادت کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں، لیکن انھوں نے کما حقہٗ اس مسئلہ پر توجہ مبذول کی، نہ کوئی مستقل پروگرام بنایا اور نہ مسلمانوں کو دعوتِ عمل دی۔ متفرق طریق پر مختلف جماعتیں اور مختلف افراد بے شک جابجا مصروفِ کار نظر آتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ کام کی وسعت و اہمیت جس قوتِ عمل کی محتاج تھی، اس کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ زیادہ تر افراد نے اس کام کو بھی محض اپنی اپنی جماعتوں اور گروہوں کے پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیا اور اس طرح حصولِ مقصد میں آسانیاں پیدا کرنے کے بجائے حقیقتاً مشکلات پیدا کر لیں۔ ؎

ہندو پریس میں اقبال اور المراغی کی خط و کتابت پر جو مخالفانہ تحریریں شائع ہوئیں، ان کی خبر مصر بھی پہنچی۔ ستمبر ۱۹۳۶ء کے اواخر میں جامعۂ ازہر کے شعبۂ امورِ مذہبی کے منتظمین کو یہ اطلاع ملی کہ جو مصری وفد تبلیغِ اسلام کے لیے ہندوستان جانے والا ہے، ہندو پریس اور ہندو لیڈر اس کی سخت مخالفت کر رہے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کرنے کو تیار ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی شیخ الازہر نے ہندوستان کی سرکردہ مسلمان شخصیات کو خطوط لکھے اور ان سے یہ رائے طلب کی کہ ان حالات میں

مصری وفد کا بھیجنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ (بحوالہ "الاہرام"، بابت ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)
ہندو پریس اور مسلم پریس نیز مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں میں متذکرہ بالا مراسلت کے حوالے سے جو محاذ آرائی چل پڑی، اس کے پیش نظر علامہ اقبال کو بڑی تشویش لاحق ہوئی اور وہ یہ سوچ کر فکرمند ہو گئے کہ کہیں بات دور تک نہ جا پہنچے اور نتیجتاً اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات متاثر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد شیخ الازہر کو ایک خط ارسال کیا اور انھیں مصری وفد کو ہندوستان بھیجنے سے منع کر دیا۔ اس اہم خط کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے:

"اچھوتوں میں تبلیغ کی غرض سے مصری علما کی جماعت کو اس وقت ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے تو ٹھوس کام کی ضرورت ہے، جس کو ہندوستان کے علما ہی انجام دے سکتے ہیں۔ مصری وفد کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ اچھوت جن زبانوں کو جانتے ہیں، ان سے علمائے مصر واقف نہیں۔ ہم ہندوستان کے مسلمان اچھوتوں میں اطمینان اور سکون کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر مصر سے علما کا وفد آیا تو اس کی وجہ سے ہندو مسلم تعلقات پر ناخوش گوار اثر پڑے گا اور ہمارا حقیقی مقصد فوت ہو جائے گا۔"[۱]

علامہ اقبال نے شیخ الازہر کو مصری وفد ہندوستان بھجوانے سے منع تو کر دیا، لیکن بعض دیگر مسلمان مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے پُرزور اصرار کیا کہ اس وفد کو بھجوانے کا فیصلہ واپس نہ لیا جائے۔ چنانچہ مسلم پریس اور سرکردہ افراد کی یقین دہانیوں پر شیخ الازہر اپنے فیصلے پر قائم رہے اور انھوں نے فی الفور ایک وفد تشکیل دے دیا۔ اس وفد میں جن ارکان کو منتخب کیا گیا ان کا تعلق جامعہ الازہر کے مختلف شعبوں سے تھا۔[۲] وفد ان ارکان پر مشتمل تھا:

۱۔ شیخ ابراہیم الجبالی
۲۔ شیخ عبدالوہاب النجار
۳۔ پروفیسر شیخ العدنی

۴ - شیخ محمد حبیب احمد آفندی

۵ - محمد صلاح الدین النجار (فرزند شیخ عبدالوہاب النجار)

۶ - عبدالعزیز الشعالبی ان کا تعلق تیونس سے تھا لیکن یہ شیخ الازہر کی خصوصی دعوت پر وفد میں شامل ہوئے تھے۔

ان ارکان میں سے صرف حبیب احمد آفندی اور محمد صلاح الدین النجار انگریزی جانتے تھے، اسی لیے انہیں بالترتیب سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا اور انہی کو ترجمانی کے فرائض بھی سونپے گئے۔

تشکیل وفد کے ساتھ ہی اس کے مقاصد بھی بیان کر دیے گئے، جو درج ذیل ہیں:

۱- اچھوتوں کی زبوں حالی کا جائزہ لینا۔

۲- اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے لیے جامعہ ازہر ایک ثقافتی اور مذہبی ادارے کی حیثیت سے کہاں تک معاونت کر سکتا ہے۔

۳- اگر ممکن ہو تو اچھوتوں کے رہنماؤں سے ملاقات۔

۴- مسلمانوں کے رہنماؤں اور دینی تنظیموں کے مابین باہمی یگانگت کو فروغ دینا[۶۱]

رئیس وفد نے بمبئی پہنچنے کے دوسرے روز یعنی ۱۲، دسمبر کو غلام بھیک نیرنگ کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ وفد ان سے ملاقات کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ ۱۴، دسمبر کو نیرنگ صاحب وہاں پہنچے اور چار روز تک وفد سے ان کے مشن کے حوالے سے طویل مذاکرات کرتے رہے۔ ان ملاقاتوں کے بارے میں نیرنگ لکھتے ہیں:

"چار روز کے مسلسل مکالمات کے بعد رئیس وفد نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں وہ تمام واقعات و خیالات، جو میں بیان اور ظاہر کر چکا ہوں، انگریزی میں لکھ کر دے دوں۔ چنانچہ میں نے بائیس صفحے کی ایک ٹائپ شدہ یادداشت مرتب کر کے وفد کو دے دی۔ اندریں اثنا ایک صاحب نے ناگپور سے وفد کو ایک چٹھی لکھی تھی۔ وفد نے چاہا کہ میں اس چٹھی پر بھی ایک تبصرہ لکھ دوں چنانچہ پانچ صفحے کا ٹائپ شدہ تبصرہ لکھ کر ان کے حوالے کیا گیا۔[۶۲]

دہلی کے بعد یہ وفد علی گڑھ، رام پور، دیوبند اور پشاور گیا اور بالآخر ۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور پہنچا۔ دو روز بعد انٹر کالجیٹ برادرہڈ کی طرف سے وفد کو سپنسر ہوٹل میں دعوتِ چائے پر بلایا گیا۔ میزبان انجمن نے وفد کو علامہ اقبال کی کتابیں بطور تحفہ دیں جسے قبول کرتے ہوئے رئیس وفد نے کہا کہ:

"حضرت علامہ صاحب اس وقت دُنیائے اسلام کے سب سے جلیل القدر فرزند ہیں، جنھوں نے نوجوانانِ اسلام کے قلوب کو (گرما) دیا ہے"۱۲۵

اُن دنوں اقبال علیل تھے اور صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ اپنی مسلسل علالت کے باعث وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے وفد کے اعزاز میں سپنسر ہوٹل میں دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں شہر کے چیدہ چیدہ اربابِ علم و دانش کو مدعو کیا گیا۔ مہمانوں میں غلام بھیک نیرنگ بھی شامل تھے۔ کھانے کے بعد ارکانِ وفد، اقبال اور نیرنگ کی طویل نشست ہوئی، جس میں وفد کے ہندوستان آنے کے بعد کی پیش رفت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اس ملاقات کے بارے میں نیرنگ لکھتے ہیں:

"وفد کے مقصد سے متعلق وفد کی اقبال سے باتیں ہوئیں۔ میں جو کچھ کرچکا تھا، وہ میں نے بیان کیا۔ اقبال نے میرے خیالات سے اتفاق کیا۔ اقبال سے جو خاص مشورہ ہوا، اس کی ایک ٹائپ شدہ یادداشت مرتب کرکے میں نے وفد کو دے دی"۱۲۶

اقبال کی اس ضیافت میں جن اصحاب نے شرکت کی، کھانے کے بعد ان سب کی ایک سویر بھی کھینچی گئی۔ یہ تصویر انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ اقبال کی زندگی کی آخری تصویر ہے اور ں میں ان کی خرابیٔ صحت کے آثار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ نیز یہ آخری اجتماع تھا، ں میں اقبال بنفسِ نفیس شریک ہوئے اور وہ بھی چھ ماہ کے وقفے کے بعد۔ ں کے بعد انھیں ایسی کسی علمی مجلس میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اس تقریب اور دیر میں نیرنگ اور نذیر نیازی موجود ہیں، چنانچہ وہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لنچ کے بعد ایک گروپ فوٹو لیا گیا۔ جاوید اس فوٹو میں بھی ہیں۔ یہ گروپ فوٹو ایک نہایت خاص یادگار ہے۔"

"...کھانے کے بعد شرکائے دعوت کی تصویر بھی لی گئی جس میں حضرت علامہ کی تصویر نہایت صاف آئی ہے ... میرا خیال ہے، اس کے بعد شاید ان کی کوئی تصویر نہیں لی گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۷ء کی اس تصویر کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔"[۳۲]

لاہور میں مصری وفد کی اقبال سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور اس کی آمد کے اصل مقاصد پر سیر حاصل بحث ہوتی رہی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وفد واپس دہلی روانہ ہو گیا اور مختلف شہروں سے ہوتا ہوا اور وہاں کے علما اور سیاسی زعما سے تبادلۂ خیالات کرتا ہوا وسط مارچ ۱۹۳۷ء کو واپس مصر چلا گیا۔ اس وفد کی روانگی سے تقریباً تیرہ ماہ بعد اقبال کا انتقال ہوا (۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء) لیکن اس دوران میں وفد کے کسی رکن یا جامعہ الازہر کے ریکٹر نے اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اس وفد سے متعلق معتبر ترین شخصیت غلام بھیک نیرنگ بھی اسی انتظار میں رہے کہ وفد کی سفارشات کے بعد مصری حکومت کیا فیصلہ کرتی ہے، لیکن اُنھیں بھی کوئی خبر نہ ملی۔ بالآخر اُنھوں نے اقبال کی وفات کے چند ماہ بعد جون ۱۹۳۸ء میں وفد کے ایک رکن محمد حبیب احمد آفندی کو خط لکھا اور اس نے جواب میں مکتوب الیہ نے اُنھیں وفد کی تحریر کردہ عربی رپورٹ کی ایک کاپی ارسال کر دی، جس میں اُن کی تجاویز سے بھی اتفاق کیا گیا تھا۔ اسی دوران میں جامعہ ازہر کی انتظامی کونسل میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

چنانچہ اس وفد کی سفارشات اور اس پر عمل درآمد کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا اور وفد کی تیار کردہ یہ رپورٹ دفتر کی فائلوں کے انبار میں دب کر رہ گئی۔ اقبال کی وفات کے بعد غلام بھیک نیرنگ بھی خاموش ہو گئے، اور یوں اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کے دعوے، جوش و خروش اور مسلم پریس کا سارا پروپیگنڈا فضائے آسمانی میں تحلیل ہو کر رہ گیا، اور ہر طرف خاک اڑنے لگی اور علامہ اقبال کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ "اچھوتوں میں تبلیغ کی غرض سے مصری علما کی جماعت کو اس وقت ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے تو ٹھوس کام کی ضرورت ہے۔"

حواشی

۱ W.N. Kuber: *B.R. Ambedkar*, 2nd ed., New Delhi, 1990 (1987).

۲ رک: C. B. Kheirmode (ڈاکٹر بھیم راؤ جی امبیڈکر چرتر، حصہ اوّل، بمبئی ۱۹۵۲ء، حصہ دوم ۱۹۵۸ء)؛ S.R. Kharat: کرم ویر بھاؤ راؤ گر اور قادادا صاحب گائیکواڑ یانا ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکرانسی پتر، مطبوعہ پونا ۱۹۹۱ء

۳ *Ambedkarancya sahavasat*, Poona 1961.

۴ Shanthi Deva and C.M. Wagh: *Dr. Ambedkar and Conversion*, Hyderabad Deccan. 1965.

۵ "..... But religion is not like a house or a cloak which can be changed at will. It is more an integral part of one's self than of one's body."

۶ رک: الفتح (قاہرہ)، مضمون از بدرالدین الصینی، بحوالہ الجامعۃ العربیہ، ایڈ فلم، بابت ۶ دسمبر ۱۹۳۵ء۔

۷ شیخ الازہر محمد مصطفیٰ المراغی بن محمد بن عبدالمنعم کے مختصر حالات زندگی ان کی ایک کتاب "الاجتہاد فی الاسلام" (قاہرہ ۱۳۷۹ھ) کے مرتب محمد عبداللہ السمان نے قلم بند کیے ہیں اور ساتھ ان کی تصویر بھی دی ہے۔ ان تفصیلات کے مطابق شیخ الازہر ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) کو مصر کے شہر المراغہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ الازہر میں تعلیم مکمل کی اور شیخ محمد عبدہٗ کی مجالس علمیہ میں بھی شریک ہوتے رہے۔ مصر

کے متعدد علمی اور دینی اداروں کے مناصب جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کی تصانیف میں "بحث فی ترجمۃ القرآن الکریم واحکامہا" (قاہرہ ۱۹۳۶ء) اور "الدروس الدینیہ" (قاہرہ ۱۳۶۵ھ) قابل ذکر ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، جلد سوم، قاہرہ، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۷۵-۹۰۔

محمد مصطفی المراغی کے حالات اور علمی آثار سے متعلق رک: انور الجندی، تراجم الاعلام المعاصرین فی العالم الاسلامی، قاہرہ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۳۱۔

۷ جس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا، اس کی صدارت المراغی نے کی تھی (بحوالہ البلاغ بابت ۲۷ جنوری ۱۹۳۶ء)

۸ "حمایت اسلام" لاہور، ۶، جولائی ۱۹۳۶ء، صفحہ ۵ بحوالہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام از محمد حنیف شاہد، لاہور ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۲۷-۱۳۸) یہ خط بلا تاریخ ہے لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط وسط جون ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ تحریر کیا گیا۔ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سیکریٹری ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کو جو خط لکھا (بابت ۲، جولائی ۱۹۳۶ء) اس کی ابتدا کچھ یوں ہے: "شیخ مراغی جامعہ ازہر قاہرہ کا خط میرے نام آیا جو آج کے اخبار "احسان" میں بھی شائع ہو گیا ہے۔"

۹ اقبال کے بعض حالات از نیرنگ (رک: مسلم لیگ اقبال، مرتبہ گوہر نوشاہی، لاہور ۱۹۷۱ء، صفحہ ۴۱-۴۲)

۱۰ ایضاً، صفحہ ۴۲۔ اس خط کے بعد مکتوب الیہ رقم طراز ہے: "اس کے بعد مجھ کو اقبال کا کوئی اور خط اس سلسلے میں نہیں ملا، مگر یہ قرار پا چکا تھا کہ اقبال، شیخ جامعۃ الازہر کو میرے بارے میں لکھ دیں گے۔ انھوں نے ضرور لکھا ہوگا۔ میں نے اقبال کو اطمینان دلایا تھا کہ میں وفد کو ہر امکانی امداد دوں گا۔"

۱۱ Letters and Writings of Iqbal. Compiled and edited by B.A. Dar, Karachi, 1967, pp. 83-85.

۱۲ (۱۸۸۵-۱۹۵۷ء) اقبال کے دیرینہ رفیق۔ انھوں نے "اقبال کے بعض حالات" کے

عنوان سے ایک اہم معلوماتی مضمون تحریر کیا تھا (دیکھیے سطور بالا)۔ شعر کہتے تھے اور ان کا ایک مجموعۂ شاعری "کلامِ نیرنگ" کے نام کے تحت شائع ہو چکا ہے (طبع اوّل، ۱۹۰۷ء، طبع سوم مع غیر مدون کلام، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی ۱۹۸۳ء)۔ نیرنگ نے ۱۹۲۳ء میں انبالہ میں "جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام" کی بنیاد رکھی۔ اقبال نے مختلف مشائخ، علما اور معززین سے اس جمعیت کے ساتھ تعاون کی اپیل کی تھی۔

ابتدائی عمر میں سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے مرید ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مرشد کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کو چھپوایا اور اس کے شروع میں مقدمہ بھی تحریر کیا۔ یہ مجموعہ "تحائف اشرفی" کے عنوان سے شائع ہوا (طبع ثانی، درگاہ کچھوچھہ ضلع فیض آباد، ۱۹۰۰ء، مقدمہ نیرنگ، صفحہ ۴-۲۰) نیرنگ کے سوانح حیات، نیز ان کی شعری اور تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں رک۔

کلامِ نیرنگ (محولہ بالا) مقدمہ مرتب، صفحہ ۹-۴۴۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں از محمد عبداللہ قریشی، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۹-۱۱۱۔ سید جعفر طالب، میر غلام بھیک نیرنگ اور ان کی شاعری (قومی زبان، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۱۱۶-۱۱۷)۔ ڈاکٹر انور سدید، میر غلام بھیک نیرنگ (ہفت روزہ "چٹان"، بابت ۱۱ جولائی ۱۹۸۳ء)

۱۴؎ اقبال کے خط کا یہ مکمل متن قاہرہ کے اخبار "الاہرام" سے منقول ہے (بابت ۲۶ جولائی ۱۹۳۶ء)

۱۵؎ بحوالہ حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، صفحہ ۳۶۶-۳۶۷

مزید دیکھیے: "حمایتِ اسلام" بابت یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء بحوالہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، متذکرہ بالا صفحہ ۱۳۹-۱۴۱۔

۱۶؎ بحوالہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، صفحہ ۱۳۹۔ علامہ اقبال کا یہ خط مصر کے اخبار "البلاغ" میں شائع ہوا تھا (بابت ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء)

۱۷؎ بحوالہ "البلاغ" بابت ۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

وفد کے مقاصد کے بارے میں غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں کہ "اخباروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس وفد نے اپنا مقصد ہندوستان کے مسلم ادارات تعلیم

کا معائنہ اور مطالعہ اور مسلمانانِ ہند سے ثقافتی CULTURAL تعلقات قائم کرنا بیان کیا ہے۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے تبلیغی مقصد کو سب سے راز میں رکھا ہے اور اس بارے میں مجھے اور اقبال سے بصیغۂ راز مبادلۂ خیالات اور اخذ معلومات کریں گے" (اقبال کے بعض حالات، محولہ بالا، صفحہ ۴۳)۔

۱۸ اقبال کے بعض حالات، محولہ بالا، صفحہ ۴۴۔

۱۹ بحوالہ انقلاب، بابت ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء

۲۰ بحوالہ ایضاً، (دک، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے؛ محولہ بالا، صفحہ ۵۰۹)

۲۱ علامہ اقبال سید نذیر نیازی مرحوم کو اپنے مکتوبات (بابت ۲۳ جنوری ۱۹۳۷ء) یوں مدعو کرتے ہیں:

"مصر کے علما آج آگئے ہیں۔ میں نے ان کو ۲۷ جنوری بروز بدھ ڈیڑھ دو بجے دن لنچ دیا ہے۔ آپ مع راجہ حسن اختر صاحب ضرور آئیں۔ لنچ سپنسر ہوٹل (منٹگمری روڈ) میں ہوگا، جو آپ کی جگہ سے قریب ہے": (مکتوباتِ اقبال، مرتبہ سید نذیر نیازی؛ کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۱)

۲۲ مکتوباتِ اقبال، مذکورہ بالا، صفحہ ۳۶۱

(المعارف؛ نومبر-دسمبر ۱۹۷۲)

مکتوبِ آزاد

بنام

سید سلیمان ندوی

صدیقی العزیز!

مصری وفد کی بڑی لمبی داستان ہے... نے سب کو بے وقوف بنانا چاہا، لیکن چونکہ مسلمانوں میں بے وقوف
ی استعداد زیادہ ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ یہی بنے۔ سب سے پہلے بمبئی کے چند فرصت طلبوں نے ڈاکٹر امبیڈکر کے
ن اور مولانا عبداللہ کا ندھی کے معاملے کو ہر طرح کے مبالغوں سے آراستہ کر کے مصر پہنچایا۔ پھر عبداللہ فوزان بھی اس چکر
ا گئے اور جمعیت شبان قاہرہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ ہندوستان کے تمام اچھوت مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گئے
۔ علمائے ازہر کا ایک تبلیغی وفد ضرور بھیجنا چاہیے۔ مالابار کے ایک طالب علم عبدالقادر نے بھی بہت غلط سلط باتیں لکھ
، اور غالباً لاہور کے "علامہ کابہ" نے بھی اس میں کافی حصہ لیا۔ وہ قاہرہ میں ڈاکٹر عبدالحمید سے مل چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے
سے خط و کتابت کی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے جب ترسیل وفد انتظامات مکمل ہو گئے تو شیخ ازہر اور ارکان جمعیت نے
یک محسوس کیا کہ صورت حال قابل اعتماد نہیں ہے مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ اکتوبر میں شیخ مراغی کا ایک
لے مجھے وصول ہوا تھا اور بعد کو بمبئی سے عبداللہ فوزان کا بھی ایک خط ملا تھا۔ دونوں نے استفسار کیا تھا کہ کسی تبلیغی وفد کی
سیل سود مند ہو گی یا نہیں؟ میں نے انہیں لکھا تھا کہ اچھوتوں کے لیے مصر کا وفد یہاں آکر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس غرض سے
مد کا بھیجنا نہ صرف بے سود ہو گا، بلکہ کئی اعتبار سے مضر ثابت ہو گا لیکن اگر آپ وفد کا اہتمام کر چکے ہیں تو اسے ایک صحیح
ر ضروری مقصد کے لیے کیوں نہ کام میں لائیں؟ یعنی مصر اور ہندوستان کے علمی اور اسلامی روابط کے استحکام و ترقی
سلیے بھیجیں۔ یہ وہ کام ہے جو برسوں پہلے ہونا تھا، کم از کم اب شروع کیا جائے۔

معلوم نہیں پھر کیا ہوا؟ مصر ہی میں یہ بات قرار پاگئی تھی یا بمبئی پہنچ کر اور صورتِ حال دیکھ کر قرار دی گئی ہو؟ بہرحال وفد نے محض تعلیمی نوعیت اختیار کر لی اور یہ بہت اچھا ہوا۔ علمائے وفد بہرحال ازہری ہی ہیں اس لیے کوئی بڑی توقع نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب ازہر وہ ازہر نہیں رہا جو پچاس برس پہلے تھا اور جس سے شیخ محمد عبدہ کو بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا۔ اب ازہری مولوی بہرحال وقت کی عام مولویانہ سطح سے بلند تر ذہنیت رکھتا ہے اور شیخ مراغی کی اصلاحات نے تو واقعی اسے بالکل ایک نئے عالم میں پہنچا دیا ہے۔

ابوالکلام

---

۱ صدر پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن مشمولات بتلاتے ہیں کہ یہ دسمبر [illegible] یا جنوری [illegible] لکھا گیا ہے۔

○ یادداشتہاے ودود

● قاضی عبدالودود

قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اچھا خاصا نثری سرمایہ چھوڑا ہے۔

آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی نوشتے کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں وقتاً فوقتاً یکجا کیا جاتا رہے گا۔ شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کچھ ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں چھپ چکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔ کچھ رقعے بھی۔

——— [illegible]

[illegible] ۱۹۷۱ [illegible] میں [illegible]

(۲) المعانی کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر آپ کو حسب [illegible] مل سکے تو [illegible] ایک [illegible]

باقی [illegible] میں [illegible] مجبور [illegible] متعلق آپ [illegible] پہلی [illegible]

[illegible] ! دوسرے [illegible]

جو [illegible] منظوری [illegible] اور [illegible]

[illegible] ۵ [illegible] اور [illegible]

[illegible] ۱۸ روپے [illegible] اگر [illegible]

میری [illegible] خود [illegible]

نیاز علی بیگ نکہت مؤلف مخزن فوائد

اور ظہور اللہ نوا کے بارے میں

: نکہت تخلص نیاز علی بیگ از شاگردان شاہ نصیر دہلوی است طرز زبان ریختہ صحت سکندر نامہ
ریختہ منظوم کردہ است۔ از بستی دہستان برائی فوائد بود۔ از اوست :

آج اک پردہ نشیں کی ہے مرے گھر آنا | آنکھ لڑتے ہی ملک الموت کو ہمراہ آنا
دل سنبھالے نہ گرے زلف دوتا رکو | جمع ہو جائیگی خاطر نہ کو

نوا تخلص ظہور اللہ خاں بدایونی از اولاد ... عبداللہ خاں [illegible] ... کردہ از پیشگاہ
سر رشتہ داری ... لکھنؤ رفتہ و با عنایات ... واقع
پیشہ و طبعت ... کنندہ ... سلطنت ... دیدۂ نظر کسب ...
زبان با ... رفتہ ... بار لکھنؤ آمدہ ... وفات ... رفتہ، عمر طویل یافتہ
ایں ابیات از دیوان اوست :

خنجر یہ تیر ناز کا دل پہ مرے گذار تھا | زخمہ زخم بہ غمزۂ دیدۂ انتظار تھا :
اس ... تک ... اپنا جا پہنچا | جس میں کہ ... دیا لیا پھرا
سانس ... میں یارب ... پھانس کی | کیا ہی ... پر چڑھی ہی ناتوانی ان دنوں
اس پاؤں پر ... سر کو | کس ناز سے ... کہتا ہے ... سر کو
تو کیا ہی ... پیام پاس لاتا ہے | الٰہی خیر ہو نامہ بر ... آتا ہے
... جانوں کر کے | قتل ... ابرو پہ ... دکھاتا ہے
... کو نجات | شغل ... سے ... ہوتا ہے
... نہ ... پکڑی | ... ہاتھ پکڑی ... پکڑی

دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق

تاریخ ۱۹۲۷ء کو معیار میں میرا ایک مضمون چھپا جس میں تذکرۂ خوش گو [illegible] بھی چھاپا تھا
[illegible] خزانۂ عامرہ سے ترجمۂ آبرو میں قاضی [illegible] نقل ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبرو کی تاریخ
[illegible] ۱۱۴۵ھ ہے۔ اس کے بعد اس کی دوسری روایت ملی جس کی رو سے ۱۱۴۶ھ ہوتی ہے۔ محقق [illegible]
[illegible] میں دیوان ناجی پر اپنے مضمون میں کر دیا۔ ایک مدت کے بعد دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق دیکھا
[illegible] ذیل [illegible] مرتب کو توجہ کرانا ہے

۱۔ [illegible] میں [illegible] تاریخ کا مصرع تو نقل کیا ہے: کہ بیلی [illegible] اردو کی آبرو [illegible]
مصرع تاریخ سے ۱۱۵۷ھ نکلتا ہے۔ خوش گو آبرو کی [illegible] اور آبرو [illegible] دہلی [illegible]
[illegible] صحیح سال وفات معلوم ہو۔ میرا قیاس ہے کہ مصرع آخر دراصل یوں ہے کہ بیلی [illegible] اوکی
آبرو [illegible] نکال [illegible] ۱۱۴۹ [illegible] ہو جاتا ہے۔ مرتب [illegible] کاتب کی غلطی
کی تصحیح کر سکتا یا نہ کر سکتا۔ انھیں اس اختلاف کا ذکر ضرور کرنا تھا

۲۔ مرتب دیوان ناجی نے اپنے مقدمے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے [illegible]
کے مقدمے میں [illegible] میری [illegible] ناجی کو [illegible] آبادی [illegible] ہے۔ مجھے حیرت
تھی کہ سید صاحب [illegible] ایک [illegible]
کہ معلوم ہوا کہ [illegible] ناجی کا [illegible] آبادی ہونا انھوں نے لکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے
کیا [illegible] تو انھوں نے [illegible] جواب دیا کہ [illegible] کا زمانہ تھا۔ [illegible] اس کا باعث تھا
[illegible] ناجی کا [illegible] آبادی ہونا دکھانا [illegible]

۳۔ مرتب دیوان ناجی نے ناجی کے زمانۂ ولادت کے متعلق میری قیاس آرائی [illegible] لیکن زمانہ — کو قبول
کے بارے میں میرے قیاس کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ دیوان ناجی میں [illegible] انجام [illegible] ۱۱۰۹ھ
کی وفات کا قطعۂ تاریخ ہے۔ ناجی کے دیوان میں صرف ایک مادۂ تاریخ ہے جو غزل کے
ایک شعر کا مصرع ہے اور اس بنا پر کافی [illegible] مصرع [illegible] مادے ہیں
[illegible] اور مصرع آخر [illegible] سال مذکور [illegible] ہو مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ

مظہری اور نعمت کے بارے میں

•

مظہری تخلص سید محبوب علی از سکنای کوتانہ و منشیِ برکت اللہ خان برکت۔ ابتدا از استصلاح سخن کردہ، آخر صحبت مومن خان ہم دریافتہ، چند روز است کہ ترک کردہ، از دنیا رفت۔

نعمت تخلص نعمت اللہ، غلام محی الدین عشق و مبتلا را پدر میشود، بنظم فارسی میلان خاطر داشت، گاہی فکر ریختہ میکرد، از وست:

زخم کی صورت جو لگے ہوں ہیں پانی تیغ کے / تشنہ رہتا ہوں ہمیشہ سے دم شمشیر کا
دل کو اس زلف کی سے ہو کب ہو آزادی نصیب / چھوٹنا مشکل ہے دیوانے سے گھر زنجیر کا

نعیم تخلص نعیم اللہ خان از جہان آباد، دیر است منزوی، مشق سخن بایشان بشاہ حاتم میکرد، از زادہ ہای طبع اوست:

کوچۂ یار میں ہم سے اٹھایا نہ گیا / مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا
آفت کی نقش پا کی ہو ہم تو زمین پر / جو سنگ جفا چرخ سے لاتے ہیں سر پر
خیال تیرے سے ہو کر کو ڈرتا ہوں / وہ کیوں نہ ہو کہ پھرے جس کی بال آنکھوں میں

نعمت تخلص حکیم عبدالحق، شخصیت در نہایت شکستگی و انکسار و جمعیت، در ہند منزوی، رانز برہمن سکندرآباد، بر سبیل تفنن گاہ گاہی داشتہ، چیزی از رہ ذوق دل بر زبان آوردہ، با وضع برلب و ذکر خدا دولتش بود۔ عاقبت پردہ بر افگند و بی پردہ طریق خداپرستی از قدوۂ علمای کرام مولانا عبدالعزیز ظاہر قراۃ و جمیل الخیر مشغولہ آموخت، مانند ظاہر بدرستی باطن نیز پرداخت و نعمتہای خود را از مولانا ربودہ، بالجملہ ہم در مقام اخلاص بودہ، سالی چند است کہ ازین دار المحن بدار الخلد نقل فرمودہ، غزلی ہم سرزدہ، انتخاب:

کوچہ مت ایام ہجراں میں تھا کیا اسباب زیست / اپنا خون پیتا رہا اور تیرا غم کھاتا رہا
ظالم نہ پوچھ مجھ سے مری سرگذشت تو / اب کیا کہوں کہ تیرے ستم سے جو دیکھا ہوں
نکلا ہے کب چھپا یہ دل مسکین بغل میں / اسیر ہے اس کا باعث تسکین بغل میں
زلفوں کا اب تصور آنکھوں پھر رہی ہے / سودا کہیں نہ ہو یہ مجھ کو ڈر رہی ہے
ہر چند صبا گریہ کیا ضبط تو بھی / یہ آستیں دامن ہر وقت تر رہی ہے

سرورق دیوان قدرت

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ تحقیقات اردو
(۲)

دیوان قدرت

مصنفہ
شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی

مرتبہ
قاضی عبدالودود
و
شاہ مقبول احمد

سنہ ۱۹۵۵ء

شائع کردہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ ۴

مقدمہ دیوانِ قدرت ۔ ۱

مقدمہ دیوانِ قدرت

مقدمہ

(جلی الاسطر)

(جلی اور بہ فرم)

(۱) ماخذ

(۱) رباعیات کی قیاسی تصحیح بہت کم تعداد میں ہے (۲) تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ بعض الفاظ خارج از [illegible] (۳) حسب صورت یہ الحاقات [illegible] ذہن کی اس میں قدرت کے نسخہ اشعار ہیں۔ لہذا یہ کون سی ہیں؟ وہ [illegible] جو اشعار [illegible] کے ساتھ متعدد ہیں وہ مختار میں لو آئی ہیں۔ لیکن انکو [illegible] نہیں دی گئی۔

۲۔ نکات الشعرا، مصنفہ میر کا اختتام ۱۱۶۵ھ میں ہوا، لیکن قلمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکا آغاز کب ہوا تھا:

"دو [illegible] انتر قدرت تخلص اگرچہ حاضر سخن است لیکن برائے خاطر یاران ... است نوشتہ شد" (۱۳۷۶)

یکمال کو تحریر میں میر عارف کا ذکر آیا ہے: "این ہم از زبان میر عارف بہ تحقیق پیوستہ" میر محمد عارف: عارف (مذکور) سے تین مختلف ہیں: (۱) عارف تخلص فرزند ام [illegible] [illegible] "میر" نہیں لکھا۔ انکو نام سے قبل محمد آتا ہے جو میر عارف کے نام کا جزو نہیں۔ (۲) میر عارف [illegible] معلوم نہیں ہوتے ہو تو انکو نام کے ساتھ تخلص ہوتا۔ (۳) میر محمد عارف عارف کی نسبت لکھا ہے کہ "با فقیر نیز آشناست"۔ جو تخلص [illegible] [illegible] ایسا "یاران درکت فقیر" نہیں کہا جا سکتا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۳۔ تذکرہ ریختہ گویان مصنفہ فتح علی خان گردیزی کا آغاز نکات الشعرا کے بعد اور اختتام محرم ۱۱۶۶ھ میں ہوا ہے۔ مصحفی کو پیش نظر جو نسخہ تھا [illegible] اشعار تھے مثلاً ترجمہ یقین، ساجد، مصحفی:

قدرت تخلص قدرت ... ہر سخن قدرت دارد وبہ شاہجہان آباد بسر می برد [illegible]

[illegible] نیز گر حاضر سخن است کا جواب معلوم ہوتا ہے

۔ نکات مصنفہ قائم کا آغاز [illegible]

مقدمہ دیوان قدرت ـ ۲

[illegible]

شکریہ

دیوان قدرت کا چھپنا جناب سید مسیح الزماں (استاذ [illegible] الہ آباد) کی نگرانی [illegible] احساس [illegible] میں [illegible] بڑی زحمت اٹھائی ہے۔ ادارۂ تحقیقات اردو ان کا بہت شکر گزار ہے۔

علامات و مخففات

× حرف [illegible]　　؟ [illegible]

کتاب [illegible] کا [illegible] مصنف کا [illegible] [illegible] نکات [illegible]

آذرہ	آذرہ [illegible] شعار	[illegible]	[illegible]
الف	دیوان قدرت نسخۂ [illegible]	ق	تذکرۂ [illegible]
ب	نسخۂ [illegible]	[illegible]	[illegible] نسخۂ [illegible]
بیاض	عثمانیہ [illegible]	[illegible]	[illegible] نسخۂ [illegible]
ج	دیوان قدرت نسخۂ کلکتہ	ل	[illegible]
دیباچہ	دیباچہ دستور الفصاحت	[illegible]	گلشن [illegible]
د	عیار الشعرا	مس	تذکرۂ [illegible]
ش	تذکرۂ شورش	مصح	تذکرۂ [illegible]
عش	تذکرۂ عشقی	نسخۂ پٹنہ	[illegible]
ط	[illegible]	نسخۂ [illegible]	[illegible]

ابوالکلام آزاد کے بارے میں ۔ ۱

م = جناب الکلام ... مولانا ابوالکلام آزاد ۔ بیسویں صدی ۔ شائع کردہ تحریر ...
د = انڈیا ونس فریڈم شائع کردہ پروفیسر ہمایوں کبیر طبع دوم
ب = مولانا ابوالکلام آزاد از ڈاکٹر عابد رضا بیدار

۱) زمانۂ ولادت

م ۱۳: اپنے بیان کے مطابق ولادت مکہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ (بحوالہ تذکرہ) ذی الحجہ ۱۳۰۵ = ۹ اگست تا ۷ ستمبر
۱۸۸۸ء ۔ لہٰذا ولادت اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء میں ہوئی ۔ تاریخ ذی الحجہ نا معلوم ۔ اس لئے عیسوی ماہ کی تعیین ۔
نا ممکن (حاشیہ بقول جناب غلام رسول مہر خود ابوالکلام سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی بنا پر تاریخ ولادت ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵
= ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء متعین ہوتی ہے مارچ ۱۹۶۷ء) ۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تاریخ ولادت ۱۱ نومبر
۱۸۸۸ء کہی ہے (بحوالہ دیباچہ انڈیا ونس فریڈم) اور حکومت ہند کی طرف سے جو توضیحات ولادت ابوالکلام کے
سلسلے میں ہوتی ہیں ان کے لئے بھی یہی تاریخ کنفرم کی گئی ہے حالانکہ تذکرہ کو سوا اس کے کہیں بھی تاریخ ولادت
نہیں ملتی لہٰذا اس میں ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۰۵ سے ۱۱ نومبر کسی طرح [illegible] ۱۳۰۶ میں [illegible] ہوتا ہے ۔
دیباچہ د : میں لکھا ہے کہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا ص ۲ ۔
"It was Maulana Azad's wish that the book should appear in November 1958 to synchronise with his seventieth birthday" دیباچہ د :

ب ۔ پیدائش مکہ ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ (حاشیہ تذکرہ ۔ تاریخ پیدائش ابو سعید بزمی نے
۱۸۷۹ء لکھی ہے ۔ ص ۴۸ "میری عمر اس وقت ۷۰ سال کے قریب ہے جس [illegible] مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود مانتا
[illegible] میری بیعت کے زمانہ میں آپ کی شاید ۱۵ سال کی ہو گی [اجمل خاں کا نوٹ کہ اس حساب سے مولانا کی ولادت
۱۸۷۱ فرض ہوتی ہے ۔ ابو سعید بزمی نے [illegible] یہی سال پیدائش اختیار کیا ہے] ص ۱۵
تذکرہ میں صرف ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ دی ہے اور ایک تاریخی نام جو اس سنہ پر مشتمل ہے ۔ جناب مہر کو غلط فہمی ہوئی کوئی وجہ
نہیں ۔ اور ۹ ذی الحجہ خود ابوالکلام کا قول ہو گا ۔ دیباچہ میں نومبر تو ہے مگر ۱۱ نومبر نہیں اور پروفیسر ہمایوں کبیر
کی تحریر سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود ابوالکلام اپنا ماہ ولادت نومبر کو مانتے تھے ۔ تعجب کی بات نہیں اگر
ولادت [illegible] ۱۱ نومبر کی تعیین بھی کی ہو [illegible] ستمبر تا نومبر ۱۸۸۸ء [illegible]
۱۸۸۸ء عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا، لیکن جناب بزمی کا قول تسلیم کیا جائے تو بڑا تفاوت ہو جاتا ہے
عجیب یہ ہے کہ مرحوم یہ نہیں کہ جناب بزمی ۱۸۷۹ کو کیوں سال ولادت قرار دیتے ہیں اور ص ۱۵ جناب اجمل خاں

* It was Maulana Azad's wish that the book should appear in November 1958 to synchr

ابوالکلام آزاد کے بارے میں — ۲

کہ جو عبارت یا اس کا مطلب نقل ہوا ہے اس کی بھی پیدائش نہیں ہوتا کہ صحت کی وقت تعین
میں مدد ملتی نہیں۔ اگر کتاب خلک کی تحقیق کے مطابق ابوالکلام کی عمر پچاس برس کی تھی تو اس کی
قیاس کیا گیا کہ ولادت ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی
امور تحقیق طلب: (۱) کیا یہ خط پہلا ایڈیشن کب الزہرہ کا ہے؟ ان سے دریافت کر
پہنچا ہے؟ وہاں [illegible] اسی وقت ابوالکلام کی عمر ہو اتنی (۲) یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ
الزہرہ کی اشاعت کس طرح تھی (۳)

نام: "مولانا خیرالدین کی... دو لڑکے... ابوالنصر غلام یٰسین اور ابوالکلام غلام محی الدین احمد" ص ۷۹
[illegible] محمد سرور کی "مولانا ابوالکلام آزاد" کتاب میں صراحت اس کا ذکر نہیں کہ ان کو [illegible] کیا نام
ب: "۱۹۰۰ء میں غلام محی الدین آزاد (بحوالہ مکتوب بنام عبدالرزاق کانپوری)" دو سال بعد
ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی" — ۱۹۱۳ء میں الہلال میں "احمد المکنی بابی الکلام الآزاد الدہلوی"
سال بعد محمد حسین احمد — "نام ابوالکلام آزاد..... [illegible] ابوالکلام ہی [illegible]
۱۹۱۱ء میں اچھی تھی (بحوالہ صاحب بیان ۱۹۱۹ء) — ۱۸۳۰ء — ۱۳۲۱ھ [illegible] ابوالکلام
ترجمان القرآن جلد اول (بالمطل) ۱۹۴۲ — ۱۹۴۶ء میں ابوالکلام (بحوالہ غبار خاطر)، اور دوسرا
اپنے نام کی اکثر و بیشتر ابوالکلام ہی صرف کہیں کہیں ابوالکلام آزاد۔ اور محی الدین احمد (اس
اس کے سلسلے میں [illegible] "[illegible] خون [illegible] کے دو قطرے" کی تمہید میں ان کا
[illegible] مولانا ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی قادری نقشبندی)
[illegible] خدا بخش [illegible]: "مولانا کا نام [illegible]" [illegible] (۱۹۰۰ء) میں اس طرح کہ آزاد
[illegible] ... محی الدین صاحب آزاد [illegible]"... [illegible] میں [illegible]
[illegible] آزاد دہلوی [illegible] جلد ۱۹۰۲ء ... [illegible]
... [illegible] ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، اور [illegible] میں ... ایک [illegible]

یادداشت کا ایک صفحہ -۱

[illegible]

JANUARY 1962

[illegible]

24 Poh 2018 SUNDAY 7 29 Rajab

[illegible]

25 Poh 2018 MONDAY 8 1 Shaban 1381

[illegible]

یادداشت کا ایک صفحہ ـ ۲

[illegible]

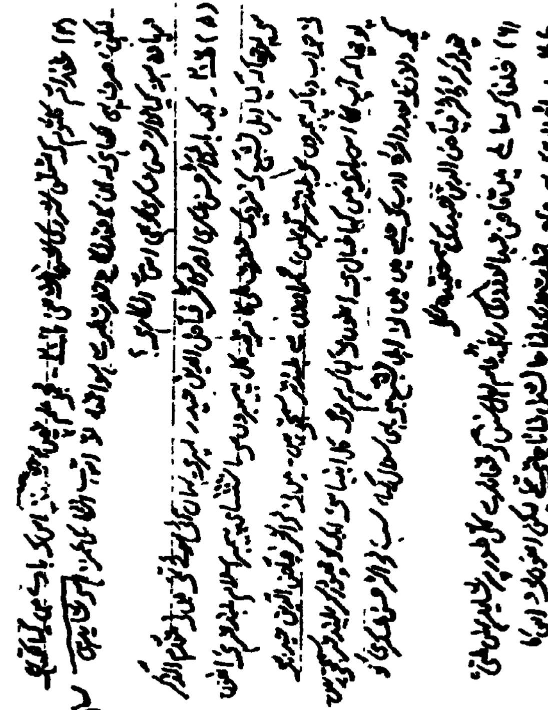
JANUARY 1962

Poh 2018 — FRIDAY 5 — 27 Rajab 1381

[illegible]

Poh 2018 — SATURDAY 6 — 28 Rajab 1381

یادداشت کا ایک صفحہ - ۳



میر حسن، ریاض خیر آبادی اور ناسخ و نسیم کے بارے میں

JUN

18 MON

تو وقت نامہ ذکر میں نسیم پر بتھا نہ کیا   تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف
یہ مطلع میر حسن نے میاں علی بن میر ولایت اللہ خاں دہلوی کی طرف منسوب
اور اس میں چشمک یہی کہ انھیں کا ہی لیکن یہ مدعا مختلف شکل میں سید محمد خاں
سے آتش کو

ماہنامہ نگار کے ریاض نمبر (جنوری فروری ۱۹۴۳ء) میں ریاض کی کچھ قدیم
جناب سید عقیل احمد جعفری نے بعنوان "ریاض کے بعض استادی مباحث" جمع کی
ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ "جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ تو بی قصہ
کے پردے میں چشمک کی گئی ہے جس کا کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اور خود
چشمک اپنے مقدمے میں کہتے ہیں:
مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت صاحب
ایک مصرع کہا ہے، دوسرا نہیں سوجھتا، انھوں نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے
مصرع پڑھا: "شیخ نے ... پر زنار پہنایا نہ گیا"... ان کے منہ سے

19 TUE

مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا: "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا
سب پھڑک اٹھے۔ شیخ ناسخ نے سخت چوٹ کی تھی مگر نسیم نے ٹھنڈا کر دیا"
اس کذب و افترا کے بیان میں چند باتیں قابل غور ہیں: (۱) ناسخ کی غیور طبع
اور ثقاہت کے دعوے ایسے نہ تھے جو وہ نسیم کو قابل خطاب سمجھتے اور ان کو اس
تعظیم و تکریم کے ساتھ مخاطب کرتے جو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے تھے (۲)
ناسخ ایسے غیر مہذب نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر اپنے محبوب ہندو کو)
طلب کر کے دل شکن مصرع پڑھتے (۳) نسیم چاہے لاکھ حاضر جواب ہوں گا
ناسخ کا دبدبہ اور شخصیت ایسی تھی کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے
(۴) حاصل النسیم کوئی مصرع لکھا یا نہ ناسخ نے کوئی مصرع پڑھا، نہ اس کا
کا ذکر کسی تذکرہ [illegible] نہیں دیکھا گیا۔ یہ صرف غلط گوئی [illegible] کا نتیجہ ہے جس نے

نسیم نگار میں اسی طرح [illegible] وجہ نہیں نسیم کا محبوب ناسخ ہونا [illegible]

امیر اللغات کے بارے میں (۱)

بکثرت الفاظ جو مستند اساتذۂ اردو کے یہاں آئے ہیں
امیر اللغات سے غیر حاضر ہیں:
۱۔ استراد "کیا استراد بہت بجان بیان کروں" میر ص ۱۱۰
۲۔ ایکوں جمع ایک "ایکوں کی کمال سے کھینچی ایکوں کو دارم
کھینچا" میر ص ۱۳۷
۳۔ ازاں جملہ "اک ازاں جملہ اب سکندر تھا" میر ص ۱۴۸
۴۔ آرمیدہ "التفات خیال [illegible] وی کہ یاں بھی دل
آرمیدہ تھا" میر ص ۱۵۱ ۵۔ آوارہ گرد "پھرتا رہا ہے
بہت گلیوں میں آوارہ گرد سا" میر ص ۱۵۹ ۶۔ انابت
"[illegible] سجدہ کروں ہوں الحاح با انابت" میر ص ۱۶۷ ۷۔
"از خویشتن رفتہ مردہ فکر وصال میں ہوں" میر ص ۲۴۲ ۸۔
ابرام "پریشانی گرد ادریافتی ہے ابرام کرد" میر ص ۲۴۴ ۹۔
"آفتاب زدہ" میر ص ۲۵۴ ۱۰۔ اضطراب زدہ" ایضاً
"آشنا" میر ص ۲۶۶ ۱۱۔ "اختلال تراجیں کا" میر
ص ۲۷۴، امیر مینائی "اختلاف حواس" ی ۱۳۔ "اطناب"
میر ص ۳۱۱ ۱۴۔ اندرونہ "اک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا" ص ۳۵۳ ۱۵۔ ۳۶۳ اصلح "اصلح
پر حجاب اس کلہم شوق کے یاروں سے" ص ۳۶۳ ۱۶۔
استادگی" میر ص ۲۶۴ ۱۷۔ آنکر اصوات" میر ص ۲۸۵
۱۸۔ اشکال "بالکسر یا سر کلی"
ص ۲۵۸ ۱۹۔ اجسام جمع جسم، میر ص ۴۲۹ ۲۰۔

امیر اللغات کے بارے میں ۔ ۲

آلام جمع الم، میر ص ۱۹ ، انتظار کشی، میر ص ۹ ، ۳۲ ۔ ۲
میر ص ۳۳ ، اضطراری میر ص ۲۲ ، احراق
بالکسر میر ص ۲۵ ، الکائی، میر ص ۲۶ ، ۲۶ ، احوال گری
~~میر ص [illegible] ، اتفاقات، میر ص [illegible] ، ۲۵~~ ، استماع
میر ص ۵ ، ۲۹ ۔

۳۹ اعلام کیا یلا متی کا لو تختا سر چڑھا ہی ان دنوں + آوری ہے کہ
محمد پر قالی کا اعلام [illegible] میر ص

ابلاک کو [illegible]
اکھڑ [illegible]
اسم
ابلاس
ابہام
اجو [illegible]

بابر کا وصیت نامہ

مصطفےٰ خاں شروا

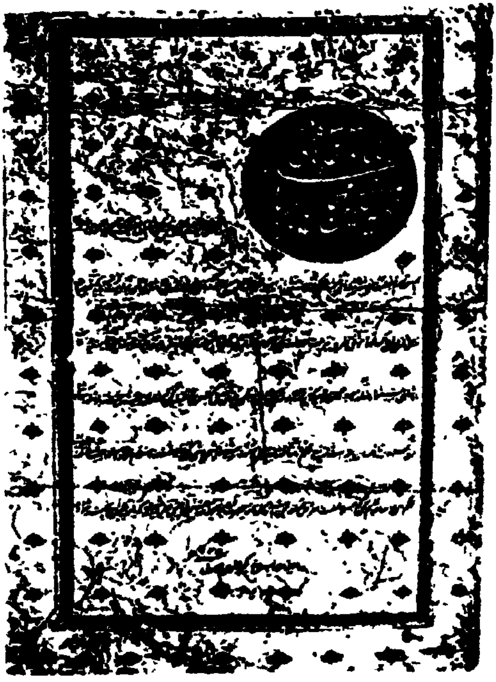
مصطفٰے خاں شروانی
حیدرآباد

بابر کا وصیت نامہ

اور اب جب ۶ دسمبر کو بابری مسجد شہید ہوئی تو مکرمی مصطفٰے خاں صاحب شروانی کو اس دستاویز کی فوٹو کاپی یاد آئی جو راس مسعود نے مصطفٰے صاحب کے والد مرحوم و مغفور ہارون خاں صاحب شروانی کے حوالے کر دی تھی۔ مصطفٰے شروانی صاحب نے فوٹو کاپی کی زیراکس خدابخش لائبریری جرنل کے لیے عنایت کرتے ہوئے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ انھیں کی زبانی:

— مدیر

"وصیت نامہ مخفی" محررہ یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ منجانب شاہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ بنام شاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں کا اصل نقش بھوپال میں سلطانیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے اور اسکی تصویری نقل کا سفر بھی ایک طرح تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے والد معظم پروفیسر ہارون خاں شیروانی مرحوم کے دیرینہ رفیق اور لندن میں ہمعصر پھر حیدرآباد میں والد گرامی کے ابتدائی دور ملازمت میں یہاں کے ناظم تعلیمات نواب سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ مرحوم) نے اسکی تصویر بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری کے کیوریٹر جناب ایم گھوسال سے ۱۱ فروری ۱۹۲۱ء کو حاصل کی اور جناب گھوسال کا خط مع فوٹو کاپی سر راس مسعود مرحوم نے متعدد تاریخی دستاویزات اور تصانیف کے ساتھ حیدرآباد سے علیگڑھ تشریف لے جاتے وقت والد معظم پروفیسر شیروانی کے حوالے کر دیے تھے۔ وصیت نامہ کی ایک فوٹو کاپی مع جناب گھوسال کے سر راس مسعود کی خدمت میں روانہ کردہ خط کی فوٹو کاپی کے پیش خدمت ہے۔



راس مسعود کے نام

اسٹیٹ لائبریری بھوپال کے بی گھوسال کا خط ۱۱؍فروری ۱۹۲۱ء

No 353.

State Library

BHOPAL C.I.

The 11/2/21

My dear Sir,

The photographer has now supplied me with the photo of Emperor Babar's to his son Emperor Humayun which I have great pleasure in sending on to your good self as per your request.

With my respectful regards,

I remain,

Yours very respectfully,

P. Ghosal

Syed Ross Masood. Esq
M.A. (Oxon). D.P.I.
Hyderabad. Deccan.

مصطفےٰ خاں شروانی

۳۱ر دسمبر

بنام خدا بخش لائبریری

میں نے آپ کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء اپنے عریضہ کے ساتھ شاہنشاہ بابر کے "وصیت نامہ مخفی بنام شاہزادہ نصیر الدین ہمایوں" کی فوٹو کاپی پیش کی تھی (بطور یادداشت ایک اور ارسال ہے۔) آنجناب نے اپنے والا نامہ ۳۳۵ مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۹۹۳ء میں ارشاد فرمایا تھا:

"یہ تفصیلات مع وصیت نامہ "جرنل" میں جا رہی ہیں" لیکن شاید تاخیر اشاعت کی وجہ سے "جرنل" ہنوز زیر ترتیب ہی ہے جس میں شاہنشاہ ظہیر الدین بابر کا وہ "وصیت نامہ مخفی" شائع ہونے والا ہے جیسا آپ نے "The Times of India" کے ۵ر دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں مترجم ڈاکٹر آر۔ ناتھ صاحب پروفیسر تاریخ جے پور یونیورسٹی کے مالا نہ مقالہ "THE LOST TESTAMENT" فرمایا ہوگا، موصوف مورخ نے میرے حوالے سے اس اہم دستاویز کے سلطانیہ (اسٹیٹ لائبریری) بھوپال سے اس سلسلہ میں استفسار کیا، جس کے جواب میں پروفیسر ناتھ:

"Much after Dr.Mustafa Sherwani's letter, I received a reply to my enquiries from the Library at Bhopal. Dated June 18, 1993 it acknowledged the receipt of my letter enquiring about Babur's will but stated that no such document was available..."

(Dr.R.Nath in The Times of India, dt.5.12.1993)

یعنی ایسی اہم دستاویز جس کی نشاندہی خود اسٹیٹ لائبریری بھوپال کے اس دور کے ناظم نے کی تھی اب اس لائبریری میں عدم دستیاب ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس وصیت نامہ مخفی کی مزید تشہیر میں شمولیت اب زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

مصطفےٰ خاں شروانی

۲۴ر فروری

بنام خدا بخش لائبریری

"وصیت نامہ مخفی شاہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر بہ شاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں" کا قضیہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ آپ نے Times of India کے ۵ر دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں پ

آر۔ناتھ پروفیسر تاریخ جے پور یونیورسٹی کا مضمون ملاحظہ فرمایا ہوگا (جس کا اردو ترجمہ مع شذرات کے فراش خانہ دہلی کے جناب ڈاکٹر فضل الحق صاحب نے "نئی دنیا" دہلی ۱۱ر تا ۱۷ فروری ۱۹۹۴ء کے شمارہ میں بھی شائع فرمایا ہے) ان ہر دو مضامین میں یہ دلخراش حقیقت سامنے آتی ہے کہ جیسا میں نے ۱۲ر فروری ۱۹۹۴ء کو دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر میں بتایا کہ "وصیت نامہ" اب بھوپال اسٹیٹ لائبریری میں موجود نہیں ہے اس لیے کہ اس لائبریری کے انچارج اردو سیکشن نے اپنے خط مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۹۲ء میں تحریر کیا ہے کہ لائبریری میں ایسا کوئی وصیت نامہ موجود نہیں ہے جبکہ سابق لائبریرین مسٹر گوکل نے ۱۱ر فروری ۱۹۲۱ء کو اپنے خط کے ساتھ اس وصیت نامہ کی تصویر سر راس مسعود مرحوم کو بھیجی تھی۔ (ایک عکس ملفوفہ ہے)۔

اب صورت حال یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں ہندستان میں ہی نہیں پوری دنیا میں صرف میرے پاس اس گم شدہ "وصیت نامہ" کی تصویر ہے۔ (ملفوفہ ۲)

مصطفٰی خاں شروانی

یکم مارچ ۹۴ء

بنام خدابخش لائبریری

کل ۲۸ر فروری ۱۹۹۴ء کے مقامی روزنامہ رہنمائے دکن میں گمشدہ وصیت نامہ بابر کے موضوع پر میرے نوٹ مع اس وصیت نامہ کی بہت صاف فوٹو کاپی کے شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشہ پیش خدمت ہے ساتھ ہی بھوپال لائبریری کے انچارج اردو سیکشن کے عجیب "نستعلیق انگریزی" میں اس خط کی فوٹو کاپی بھی ہمرشتہ ہے جس میں بھوپال لائبریری نے وصیت نامہ بابر سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلہ میں خدابخش لائبریری سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

گمشدہ وصیت نامۂ بابر

از۔ مصطفٰی شروانی

موقر روزنامہ رہنمائے دکن کی ۱۸ر فروری ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں "ہمایوں کے نام شہنشاہ بابر کا وصیت نامہ" کے زیر عنوان، ناگپور اور جرگاؤں سے شائع ہونے والے مراٹھی اخبار "لوک مت" نے اسی عنوان کے مضمون کا کچھ حصہ اور شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے "وصیت نامہ مخفی" بہ شاہزادہ نصیر الدین ہمایوں (یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ) کے فارسی متن کا مختصر ترجمہ بھی شائع فرمایا ہے۔ جیسا کہ راقم الحروف نے ۱۲ر فروری ۱۹۹۴ء کو نئی دہلی میں منعقدہ

INTACH Indian National Trust for Art & Cultural Heritage کے جلسہ
ایک خصوصی اجتماع سے خطاب کرتے وقت کیا تھا ... وصیت نامہ مخفی کا یہ جزو بھی لائق توجہ ہے:

”رعیت مختلف القلوب را بحکم اربع عناصر قائم کن“

INTACH کے اس ۱۲ر فروری ۱۹۹۲ء کے دہلی میں منعقد جلسہ میں محترم جناب سندر لعل ” بچاؤ اندولن“ کے روح رواں بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے وصیت نامہ کے اس جزو کو بہوگنا جی سے ؛ ہمسے ’ویدوں‘ سے ماخوذ قرار دیا۔

جیسا رہنمائے دکن میں شائع شدہ ”لوک مت“ کے مضمون سے ظاہر ہے شہنشاہ بابر کے اس مخفی کا فوٹو مسٹر بی گوسل صاحب لائبریرین بھوپال اسٹیٹ لائبریری بھوپال نے اپنے خط مورخہ ۱۱ فروری ۱۹ یہاں حیدرآباد میں سر راس مسعود (اس وقت کے ناظم تعلیمات حکومت نظام) کے پاس بھیجا تھا جو سر راس مسعود والماجد پروفیسر ہارون خاں شیروانی مرحوم کے حوالہ کیا۔ جیسا کہ پروفیسر آر ناتھ نے اپنے مضمون مطبوعہ of India مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۹۳ء میں تحریر فرمایا ’والماجد پروفیسر شیروانی نے ضرور اس وصیت نا کسی تحقیقی مضمون میں تذکرہ فرمایا ہوگا لیکن حالیہ دور میں سب سے پہلے راقم الحروف نے اپنے خط مطبوعہ ۱۱ ۱۵ر فروری ۱۹۹۲ء میں اس وصیت نامہ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس کا تذکرہ دہلی سے شائع ہونے والے ؛ دنیا کے ۱۱-۱۷ر فروری ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں جناب ڈاکٹر فضل الحق صاحب نے اپنے مضمون میں بھی فرمایا۔

ڈاکٹر آر ناتھ کے استفسار پر بھوپال اسٹیٹ لائبریری کے ”انچارج اردو سیکشن“ کا بگڑی انگریزی مورخہ ۸ر جون ۱۹۹۳ء موصول ہوا جس میں اس وصیت نامہ کی لائبریری میں موجودگی سے لاعلمی کا اظہار

پھر وہ سلطنت مغلیہ کی سب سے اہم دستاویز آخر کہاں گئی؟

شیخ محمد اکرام نے رود کوثر میں بابر کے وصیت نامہ کا اردو ترجمہ اس طرح دیا ہے:۔

"فرزندم! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا (۲) گاؤکشی سے بالخصوص پرہیز کرو تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔ (۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔ (۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی (۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔ (۶) اپنی رعیت کے مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔"

اکرام کو اس وصیت نامہ کا انگریزی ترجمہ ٹائٹس کی انڈین اسلام میں ملا جو پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ خود ٹائٹس کو یہ انگریزی ورشن ڈاکٹر سید محمود (بہار) کے ایک مضمون میں ملا تھا جو انڈین ریویو (الہ آباد) کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ انڈین ریویو کا یہ شمارہ ۱۹۲۲ء کے اگست کا تھا۔ اس سے دو سال قبل بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری کے مسٹر گھوسال نے اس کی فوٹو کاپی سر راس مسعود کو ان کی طلب پر اپنے ایک خط کے ساتھ حیدرآباد بھیجی تھی۔ [یاد رہے راس مسعود اس زمانے میں حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے، اور عثمانیہ کی اردو جامعہ قائم ہو چکی تھی، اس کے بعد مسعود علیگڑھ کے وائس چانسلر ہوئے اور پھر آخر میں بھوپال آ گئے، اور وہیں وفات پائی]۔ گھوسال کے خط کی تاریخ ۱۸ فروری ۱۹۲۱ء ہے۔

اسلام کے مقدمہ کا متن کا ترجمہ جو واقعۃً سید سعود کا ترجمہ ہے، تا متن کے چند سطری نوشت کے ساتھ درج ہیں

All of these contacts with the Hindu environment gradually ended to produce an attitude of tolerance among the Muslims f India, which has given to Indian Islam some peculiar haracteristics. Further proofs of this are found in the terms f a confidential will which Bābur left to his son Humāyūn, he original copy of which is preserved in the State Library t Bhopāl. The document, as translated, runs as follows:

O my son: People of diverse religions inhabit India; and it is a matter of thanksgiving to God that the King of kings has entrusted the government of this country to you. It therefore behoves you that:

1. You should not allow religious prejudices to influence your mind, and administer impartial justice, having due regard to the religious susceptibilities and religious customs of all sections of the people.

2. In particular refrain from the slaughter of cows, which will help you to obtain a hold on the hearts of the people of India. Thus you will bind the people of the land to yourself by ties of gratitude.

3. You should never destroy the places of worship of any community and always be justice-loving, so that relations between the king and his subjects may remain cordial and there be peace and contentment in the land.

4. The propagation of Islam will be better carried on with the sword of love and obligation than with the sword of oppression.

5. Always ignore the mutual dissension of Shī'ahs and Sunnis, otherwise they will lead to the weakness of Islam.

6. Treat the different peculiarities of your subjects as the different seasons of the year, so that the body politic may remain free from disease.

Source: Islam in India by M.T.Titus, 1930; rev. ed., 1959.

خود ماتشن کا ماخذ سید محمود تھے جنھوں نے ۱۹۲۳ء میں یہ دستاویز دریافت کی تھی۔
ڈاکٹر سید محمود نے اگست ۱۹۲۳ء کے انڈین ریویو میں مسلم حکمرانوں کے عہد میں گاؤکشی (Cow killing under Muslim Rule) کے عنوان سے ایک مضمون میں بابر کے اس وصیت نامہ کا ذکر کیا جس کا عکس انھیں بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں کی عنایت سے دستیاب ہوا تھا یہ اس زمانہ کے آس پاس کی بات ہے جب بھوپال کے ریاستی کتابخانہ کے کتابدار مسٹر محمد سالم نے اس کا عکس ہارون خان شروانی کو بھیجا تھا۔ سید محمود نے اپنی متعلقہ تمہید کے ساتھ اس کا ترجمہ اس طرح دیا تھا،

BABAR'S ADVICE TO HIS SON: When the Moghuls established their rule in India and Babar ascended the throne, he not only found out the depth of Hindu feeling in this matter during his few years' reign but also wrote out a confidential will for his son Humayun, in which he referred to this religious belief of the Hindus and exhorted him to prevent the killing of cows. The original copy of this document is preserved in the State Library at Bhopal, and a photo of it has been made available to me through the courtesy of Nawab Col. Hamid Ullah Khan Sahib. The following is a translation of the documen

"O my son People of diverse religions inhabit India: and it is a matter of thanks-giving to God that the King of Kings has entrusted the government of this country to you. It, therefore, behoves you, that :—

(1) You should not allow religious prejudices to influence your mind, and administer impartial justice having due regard to the religious susceptibilities and religious customs of all sections of the people.

(2) In particular, refrain from the slaughter of cows, which will help you to obtain a hold on the hearts of the people of India. Thus you will bind the people of this land to yourself by ties of gratitude.

(3) You should never destroy the places of worship of any community and always be justice-loving, so that the relations between the king and his subjects may remain cordial and there be peace and contentment in the land

(4) The propagation of Islam will be better carried on with the sword of love and obligation than with the sword of oppression

(5) Always ignore the mutual dissensions of Shias and Sunnis, otherwise they will lead to the weakness of Islam.

(6) Treat the different peculiarities of your subjects as the different seasons of the year, so that the body politic may remain free from disease

اصل وصیت نامہ جس کا عکس شیخ والی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے وہ عکسی صورت میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اب صاف خط میں بھی پڑھتے چلیے تاکہ انگریزی ترجمہ زیادہ واضح ہو جائے:-

الحمدللہ



وصیت نامہ مخفی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی بشاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایون طول اللہ عمرہ

باستحکام سلطنت نوشتہ شد

ای [illegible] ممالک هندوستان [illegible] [illegible] [illegible] فرمود

[illegible] تعصبات مذهبی [illegible] [illegible] طریق [illegible] عدالت کنی

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بادشاهی وابسته شود

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] و رعیت

از بادشاه آسوده شود

ترقی اسلام [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

والسلام [illegible] | غرہ [illegible] الاول ۹۳۵ھ

بھوپال سے آخری رپورٹ (مئی ۱۹۹۲ء)

بابر کا وصیت نامہ جو فی الحال غائب ہے، شیروانی صاحب کے توجہ دلانے کے بعد اس کی کھوج شروع ہوئی۔ راج بھون بھوپال کے علمی ذوق کے سبب کچھ مدد ملی اور ہمارے کہنے سے کچھ تلاش ہوئی، نتیجہ البتہ وہی کا وہی رہا۔ راج بھون کے سکریٹری مسٹر جے۔ ایل۔ بوس نے پرائیویٹ سکریٹری پی بشرا کو اس کی تلاش پر مامور کیا جن کی ہندی رپورٹ کا اردو ورژن درج ذیل ہے۔

شری ایس۔ این شرما چیترپہ گرنتھپال سنٹرل لائبریری نے بتایا کہ برس ۱۹۲۱ء میں یہ وِل اُپلبدھ ہوگی جس کے آدھار پر شری گھوشال "شکالین لائبریرین" نے حیدرآباد، ان کے پتر دینانک ۱۱ر۲ر۲۱ء کو فوٹو کاپی بھجوائی تھی۔ ۱۹۲۱ سے ۱۹۵۵ء تک اس لائبریری پر کسی کا دھیان نہیں گیا۔ ۱۹۵۵ء میں جس اَستھتی میں پرانا ریکارڈ تھا وہیں سنٹرل لائبریری کو ملا جس میں یہ "وِل" نہیں ملی۔ "اسٹیٹ آرکائیوز" کو جو ریکارڈ بھیجا گیا اس میں بھی یہ "وِل" نہیں ہے۔

اریے

● سوغات (بنگلور) کا اشاریہ

● ڈاکٹر سلمان عابد

سوغات (بنگلور)

پہلی بار ۱۹۵۹ء میں نکلا ——— ۱۹۶۳ء میں بند ہوا

دوسری بار ستمبر ۱۹۹۱ء میں نکلا اور ۱۹۹۷ء تک جاری رہا

تیسری بار ستمبر ۲۰۰۹ء میں نکلا۔ اور تیسری بار کے سلسلے میں

اب تک اس کے پانچ شمارے نکل چکے ہیں۔

● آل احمد سرور، جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، شمارہ ۸-۷، اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ جدت پرستی اور جدیدیت
کے مضمرات، شمارہ ۱، ستمبر ۱۹۷۱ء ● ابن انشاء، ن م راشد، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● اختر الایمان، نئی نسل
ایک خط، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ یادیں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● اسلوب
احمد انصاری، حالی ادبی مجدد کی حیثیت سے، ۲، مئی ۵۹ء ● اسٹیون اسپنڈر، ایک نوجوان ادیب کے
نام خط، ۵، ۶۰ء ● ایڈمنڈ ولسن، علامت نگاری، ۸-۷، ۶۱ء ● ایرش فرام، زوال آدم خاکی، ۲، ۵۹
● باقر مہدی، پرانے سوالات نئے نکات، ۳، ستمبر ۱۹۵۹ء ○ پرلوک وادی ہندی شاعری، ۸-۷، ۱۹۶۱ ○ صدی کی
اشتراکیت، فلسفہ، ۱۱، اپریل ۱۹۶۳ء ○ ایک جوان برگ کی موت، ۴-۳، اگست ۱۹۷۴ء ○ جدیدیت اور توازن، ۱، ستمبر ۱۹۷۱
○ سوالات بیل تک، ۱۴-۱۳-۱۲، جنوری ۱۹۶۳ء ● بلراج کومل، جدید نظم اور تعصب، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● جذبی
جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● جمیل جالبی، پیسٹرنک بحیثیت شاعر، ۲، ۱۹۵۹ء ● حسن عسکری
ادب اور قطعیت، ۱، ۱۹۵۹ء ○ ایک دیباچہ، ۹، دسمبر ۱۹۶۱ء ● حمید نسیم، جدید اردو نظم، ۸-۷، ۱۹۶۱ ●
خلیل الرحمن اعظمی، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ اس سے پہلے ہیں کہ ہم درد جگر دیکھیں گے، ۱۰-۹، دسمبر
● خورشید الاسلام، جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● دیوندر اسر، تخلیق، فن اور جنون، ۱۲،
جنوری ۱۹۶۲ء ● ڈی لن تھامس، جدید انگریزی شاعری، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● راجندر سنگھ بیدی، مختصر افسانہ
۱۲/۱۳، ۱۹۶۳ء ○ " میں " ۱۱، اپریل ۱۹۶۲ء ● ہزائے قطر، انگریزی شاعری ۵۵ کے بعد، ۸-۷، ۱۹۶۱
● رفیق خاور، ایک شاعر، راشد اور دو نظمیں، ۹، دسمبر ۱۹۶۲ء ● ریاض احمد، جدید اردو نظم کا ارتقاء، ۱۱، ۱۹۶۲
● سرل کنولی، جدید شاعری کے مراحل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● سی ایم بورا، علامت پسندی کی روایت، ۶، مارچ ۱۹۶۱
● شہزاد منظر، آل بیئر کامیو، ۵، ۱۹۶۰ء ● شیام لال ادیب، دل کی بستی، ۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ——

تنقید / جدید اردو ادب

● ہیئت کی تلاش میں (ن م راشد) صفحات ۸-۷، ۱۹۶۱ ● پرانے سوالات نئے نکات (باقر مہدی) ستمبر ۵۹ء
● عہد جدید کا ذہنی پس منظر (محمد حسن)، ۳، ۱۹۶۰ء ● فکر نو کا آغاز (علی جواد زیدی)، ۴-۳، ۱۰-۹، ۱۹۵۹
● جدت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات (آل احمد سرور)، ۱۲۰-۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۱ ● نئی اور پرانی نسل ذہنی کشمکش
اکتوبر ۱۹۶۱ ● نئی نسل ایک خط (اختر الایمان)، اکتوبر ۱۹۶۱ء ● نئے ادبی تقاضے (محمد حسن)، ۲، ۱۹۵۹ء

● جدیدیت اور آوانٹ (باقر مہدی) ستمبر ۱۹۶۱ء ● جدیدیت اور روشن خیالی (وارث علوی) ۸۰، اگست ۶۲ء
● جدیدیت ایک تہذیبی رویہ (وحید اختر) ۱۰، ۱۹۶۱ء ● جدیدی الافکار الشعریہ المنظمہ (باقر مہدی)
اپریل ۱۹۶۲ء ● ہمارے عہد کا ادبی مزاج (وحید اختر) ۲، ۱۹۶۰ء ● علامت پسندی کی روایت (سی ایم بورا)
مارچ ۱۹۶۱ء ● علامت نگاری (ایڈمنڈ ولسن) اکتوبر ۱۹۶۱ء ● ادب پر عدم اقلیت (حسن عسکری) ۱۰، ۱۹۵۹ء
● ادب کا مستقبل (محمود ایاز) ۱۰، ۱۹۵۹ء ● تخلیق، فن اور جنون (دیویندر اسر) جنوری ۱۹۶۳ء ●
شاعر صناع یا خالق (ممتاز حسین) ۱۱، ۱۹۶۲ء ● ادب اور جنسیات (دیویندر اسر) ۷، ۱۹۶۱ء

تنقید/افسانہ، ناول:

● جدید اُردو افسانے کا جائزہ (محمد حسن) ۵، ۱۹۶۰ء ● لباس مجاز میں۔ تبصرہ۔ میگھ ملہار
(ممتاز شیریں) ۳، ۱۹۶۰ء ● منفی ناول کی ایک مثال (ممتاز شیریں) ۹، ۱۹۶۱ء۔

تذکرہ/ راجندر سنگھ بیدی:

● بھولا سے بیل تک۔ تبصرہ بیدی (باقر مہدی) جنوری ۱۹۶۳ء ● بیدی کا فن (محمد حسن) ۱۲-۱۴،
۱۹۶۳ء ● دل کی بستی۔ بیدی کی ناول پر تبصرہ (شیام لال ادیب) ۱۲-۱۴، ۱۹۶۳ء ● مختصر افسانہ
(راجندر سنگھ بیدی) ۱۲-۱۴، ۱۹۶۳ء ● میں (راجندر سنگھ بیدی) اپریل ۱۹۶۳ء۔

تنقید/ جدید شاعری (نظم):

● اردو نظم کا مزاج (وزیر آغا) ۷-۸، ۱۹۶۱ ● اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ (خلیل الرحمن اعظمی)
اکتوبر ۱۹۶۱ ● جدید اردو نظم (محمود ایاز) اکتوبر ۱۹۶۱ء ● جدید اردو نظم (حمید نسیم) اکتوبر ۱۹۶۱ ● جدید اردو نظم
(ضیا جالندھری) اکتوبر ۱۹۶۱ء ● جدید اردو نظم کا ارتقا (ریاض احمد) ۱۱، ۱۹۶۲ء ● جدید نظم اور تعصب (سراج کول)
اکتوبر ۱۹۶۱ء ● جدید نظم کی ہیئت و تشکیل (اخترالایمان) اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ آل احمد سرور، اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ جذبی ۱۹۶۱ء
○ منیب الرحمن ۷-۸، اکتوبر ۱۹۶۱ ○ خورشید الاسلام، اکتوبر ۱۹۶۱ء ● جدید شاعری کے مراحل (سرل کنولی) اکتوبر ۱۹۶۱ء
● نئی شاعری کی بنیادیں (میراجی) ۷-۸، ۱۹۶۱ء

تذکرہ شعرا:

● اجتبیٰ رضوی (نذیر صدیقی) ۲، ۱۹۶۳ء ● دو جدید نظم گو۔ اخترالایمان، مجید امجد (محمد حسن) اکتوبر ۱۹۶۱ء
● یادیں۔ خود نوشت سوانح اخترالایمان (اخترالایمان) اکتوبر ۱۹۶۱ء ● نارسس کا دیباچہ۔ تبصرہ مجموعہ کلام
اخترالایمان (میراجی) ۷-۸، ۱۹۶۰ء ● حالی ادبی مجدد کی حیثیت سے (اسلوب احمد انصاری) مئی ۱۹۵۹ء ●

ام سا شد اور دو نظمیں (رفیق خاور) دسمبر ۱۹۶۱ء ● پردیسی کے خطوط۔ شاد عظیم آبادی (مجنوں گورکھپوری)

۱۹۶۱ء ● فراق۔ ایک مطالعہ (امیر ضیاء اللہ) ۱۰، ۱۹۵۹ء ● اپنی شاعری کے بارے میں، مصطفیٰ زیدی

۱۹۶۱ء ● خواجہ میر درد (مجنوں گورکھپوری) ۴، ۱۹۶۰ء ● اردو نظم کا آغاز (وزیر آغا) ۵، ۱۹۶۰ء ●

عظیم آبادی (مجنوں گورکھپوری) ۶، ۱۹۶۱ء

تذکرہ ادبا/ناقدین:

● من چہ می سرایم۔ سوانح ابن انشا (ابن انشا، اکتوبر ۱۹۶۱ء ● ایک جوان برگد کی موت۔

احتشام حسین (باقر مہدی) اگست ۱۹۶۲ء ● ایک دیباچہ، حسن عسکری، دسمبر ۱۹۶۱ء ● اس پہ چھلے ہیں

درد جگر رکھتے ہیں (خلیل الرحمن اعظمی، دسمبر ۱۹۶۱ء ● مجھے بھی کچھ کہنا ہے، محمد حسن، ۵، ۱۹۶۰ء ●

ں حاضر کے سوا دیں، عزیز حامد مدنی، اکتوبر ۱۹۶۱ء

غیر ملکی ادب:

● امریکی ادب جو مر چکا ہے، محمد اسمٰعیل تابش ۱۰، ۱۹۵۹ء ● انگریزی شاعری ۱۹۴۵ء کے بعد،

ئے قلن، اکتوبر ۱۹۶۱ء ● جدید انگریزی شاعری (ڈی لن تھامس) اکتوبر ۱۹۶۱ ● جدید فرانسیسی شاعری،

لُس فاؤلی) ۸، ۱۹۶۱ء

تذکرہ غیر ملکی ادبا/ناقدین:

● ال بیئر کامیو۔ شہزاد منظر ۵، ۱۹۶۰ء ● ایک نوجوان ادیب کے نام خط (اسٹیون اسپنڈر)

۱۹۶۰ء ● فطری آدمی اور سیاسی آدمی۔ ایڈون میورم (محمود سعید) ۱، ۱۹۵۹ء ● زوال آدم خاکی

فرام) ۲، ۱۹۵۹ء ● پیسٹرنک بحیثیت شاعر (جمیل جالبی) مئی ۱۹۵۹ء ● جیمز جوائس ایک مخنوزنگار

ن بن، ستمبر ۱۹۵۹ء ● سارتر سے ایک انٹرویو (مجید فاروقی ۹، ۱۹۶۱ ● فرانز کافکا۔ فلیپ راؤ، ۶، مارچ ۶۱ء

کامیو کی ایک کہانی، ضمیر الدین احمد ۹، اکتوبر ۱۹۶۱ء۔

تراجم/شاعری:

● انگریزی شاعری ۱۹۴۵ء کے بعد (ایک مذاکرہ)، رفیق خاور ۷، ۱۹۶۱ء ● جاوید نامہ (علامہ اقبال کی

فیق فاطمہ شعری ۴، ۱۹۶۱ء ● جدید انگریزی شاعری/مذاکرہ (ڈی لن تھامس، جیمز اسٹفنز، جیرالڈ بلیٹ)

ان الحق حقی ۷، ۱۹۶۱ء ● جدید شاعری کے مراحل، خیر النساء ۳، ۱۹۶۱ء • جدید فرانسیسی شاعری

والیس فاؤلی، منہاج برنا ۷، ۱۹۶۰ء ● چاند کی کھیتی (منظوم ڈراما۔ ہربرٹ ریڈ)، خلیل مامون ۴، ۶۱ء

تراجم/افسانہ :

● اوتاموتو۔ (سنٹ میوئل بوتنو شہید)، مریم نانی، ۱۱، ۱۹۶۲ء ● جلاوطن۔ (جیمز جوائس)، محمود ایاز، ۲، ۱۹۵۹ء ● دیوار۔ (ژاں پال سارتر)، حمید اللہ صدیقی، ۱۴۔۱۲، ۱۹۶۳ء ● سے پوریا۔ (اسٹیفن زویگ) چندر اکرن، مارچ، اپریل، ۱۹۶۲ ● فیصلہ۔ (فرانز کافکا)، محمود ایاز، ۶، ۱۹۶۱ء۔

تراجم/ناول :

● اجنبی ہوی آخت سائیڈر (البرٹ کامیو)، رفعت نواز، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● دل کی بستی (شیام لال ابیر)، خیر النساء، ۱۴۔۱۲، ۱۹۶۳ء ● زوال۔ دی فال (البیر کامیو)، محمد عتیق، ۱۴۔۱۲، ۱۹۶۳ء

تراجم/ب۔ ادب :

● امریکی ادب جو مر چکا ہے (ہنری ملر)، محمد اسمٰعیل تابش، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● ادیب کا مستقبل (وچے پی پرشیا) محمود ایاز، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● علامت پسندی کی روایت، محمود ایاز، ۶، ۱۹۶۱ء ● علامت نگاری (ایڈمنڈ ولسن) ضمیر الدین، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء

تراجم/ب۔ ادبا :

● ایک نوجوان ادیب کے نام خط، محمود ایاز، ۵، ۱۹۶۰ء ● فطری آدمی اور سیاسی آدمی۔ ایڈون میور، محمود سعید، ۱، ۱۹۵۹ء ● زوال آدم خاکی (ایرشی فرام)، محمود ایاز، ۲، ۱۹۵۹ء ● جیمز جوائس ایک منفرد فنکار (جان لیہی)، محمود ایاز، ۳، ۱۹۵۹ء ● ژاں پال سارتر سے ایک انٹرویو، مجید فاروقی، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ● فرانز کافکا ایک تعارف (فلپ راؤ)، محمود ایاز، ۶، ۱۹۶۱ء —

● ضمیر الدین احمد، گاؤں کی ایک کہانی، ۹، اکتوبر ۱۹۶۱ ● ضیا جالندھری، جدید اردو نظم، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ● عزیز حامد مدنی، دانش حاضر کے سوداگر، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ● علی جواد زیدی، فکر نو کا آغاز، ۴، جنوری ۱۹۶۰ ○ فکر نو کا آغاز، ۳، ۱۹۵۹ ● فلپ راؤ، فرانز کافکا۔ ایک تعارف، ۶، مارچ ۱۹۶۱ ● مجتبیٰ حسین، نئی ادبی نسل ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ● مجنوں گورکھپوری، یاس عظیم آبادی، ۹، ۱۹۶۱ء ○ پردیسی کے خطوط۔ شاد عظیم آبادی، ۵، ۱۹۶۰ء ○ خواجہ میر درد، ۴، ۱۹۶۰ء ● مجید فاروقی، سارتر سے ایک انٹرویو، ۹، ۱۹۶۱ء ● محبوب خزاں، مگر یہ کون ہے گا، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ● محمد اسمٰعیل تابش، امریکی ادب جو مر چکا ہے، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● محمد حسن، دو جدید نظم گو، فراق و یگانہ، مجید امجد، ۸۔۷، ۱۹۶۱ء ○ مجھے بھی کچھ کہنا ہے، ۵، ۱۹۶۰ء ○ جدید اردو افسانے کا جائزہ، ۵، ۱۹۶۰ء ● محمد حسن، نئے ادبی تقاضے، ۲، ۱۹۵۹ء ○ جدیدیت کا ذہنی پس منظر، ۳، ۱۹۶۰ء ○ بیدل کا فن، ۱۴۔۱۳۔۱۲

ء ● محمود ایاز، جدید اردو نظم، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ ادب کا مستقبل، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● محمود سعید، فطری کا دی
یا مکی کوی، ۱، ۱۹۵۹ء ● مصطفےٰ زیدی ' اپنی شاعری کے بارے میں '، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● ممتاز حسین ' شاعر
یا خالق، ۵، ۱۹۶۲ء ● ممتاز شیریں، منفی ناول کی ایک مثال، ۹، ۱۹۶۱ء ○ لباس مجازیں، ۳، ۱۹۶۰ء
منیب الرحمٰن ' جدید نظم کی ہیئت و تشکیل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● میرا جی، نازش کا دیباچہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ نئی شاعری
یا دیں ' ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● میر ضیاء اللہ، فراق - ایک مطالعہ، ۱، ۱۹۵۹ء ● نظیر صدیقی، اجتبیٰ رضوی، ۱۱، ۱۹۶۲ء
ن۔م۔ راشد، ہیئت کی تلاش میں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● وارث علوی ' جدیدیت اور روشن خیالی، ۴، اگست ۱۹۶۰ء
کافی تنگ اور زمین سنگلاخ، ۱۰، ۱۹۶۱ء ●
وزیر آغا، اردو نظم کا آغاز تقسیم کے بعد، ۵، ۱۹۶۰ء ○ اردو نظم کا مزاج، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● وحید اختر
ہیئت ایک تہذیبی رویہ، ۱، ۱۹۶۲ء ○ ہمارے عہد کا ادبی مزاج، ۲، ۱۹۶۰ء ● دیوندر اسّر ' ادب اور جنسیات
۱۹۶۱ء۔

افسانہ :

● احمد ندیم قاسمی، جن وانس، ۳، جنوری ۱۹۶۰ء ● اختر انصاری ' وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، ۳، ۱۹۶۰ء
● اسٹیفن زوئیگ ' سے پیلا، ۴، مارچ ۱۹۶۱ء ● البیئر کامیو، زوال ' ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ● امام الدین حمید
پر جپاں تو اشکوں کے جام حاضر ہیں، ۱، ستمبر ۱۹۶۱ء ○ لندن سے خیبر تک تک، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ● انور عنایت اللہ، گوہر مراد '
۱۹۵۹ء ○ معمولی لڑکی، ۳، جنوری ۱۹۶۰ء ● اونامونو، سینٹ مینوئل بونو شہید، ۱۱، اپریل ۱۹۶۳ء ● پریم ناتھ درّ
کی آنکھیں، ۲، ۱۹۶۰ء ○ اتراق، ۴، ۱۹۶۱ء ○ زندگی کا کمرشت، ۶، ۱۹۶۱ء ● جیلانی بانو، ایک آنسو، ۱۰، ۱۹۵۹ء
● جیمز جوائس ' جلاوطن، ۲، ۱۹۵۹ء ● حسین الحق، اندھی ونشانوں کے سائے، ۳، ۱۹۶۱ء ● راجندر سنگھ بیدی
بل، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ لمبی لڑکی، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ جوگیا ' ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ● رفعت نواز
بنی '، ۵، ۱۹۵۹ء ● ژاں پال سارتر، دیوار ' ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ● سہیل عظیم آبادی، یوں ہی ہوتا ہے زمانے میں
۴، ۱۹۶۰ء ● سید قاسم محمود، موت کی خوشبو، ۲، ۱۹۵۹ء ○ حیات گریزاں ' ۳، ۱۹۵۹ء ○ ایک شہر آرزو ' ۴، ۱۹۶۰ء
● شمروں کنار دریا، گنڈو کی کہانی، ۲، ۱۹۵۹ء ○ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر، ۳، ۱۹۵۹ء ○ ایک افسانہ
۵، ۱۹۶۰ء ○ سے لاڈ سوائی، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ● شفیق سہسرامی، اندھی رات، ۱۰، ۱۹۶۱ء ● صفیہ ادیب
بیت سے ہماری سرحدیں، ۱۰، ۱۹۶۱ء ● ضمیر الدین احمد، پتا کا، ۲، ۱۹۵۹ء ○ کانچ کی ایک کہانی، ۹، ۱۹۶۱ء ○

امر شہید، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● غیاث احمد گدی، ایمان سلامت بھئی، ۵، ۱۹۶۰ء ● فرانز کافکا، فیصلہ
● قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ۲، ۱۹۵۹ء ● قمر احسن، سلیمان سر بہ زانو اور سبا ویران، ۷-۸، ۴-۳،
کرشن چندر، اندھیرے کا ساتھی، ۳، ۱۹۵۹ء ○ دو چہرے، ۵، ۱۹۶۰ء ● کرشن کانت شرما، بھگوان
۶، ۱۹۶۱ء ● گربچن سنگھ، اندھے کی لاٹھی، ۱۲، ۱۹۶۳ء ● معین الورا، پرانی قمیص، ۴، ۱۹۶۰ء ○ بج
۱۹۵۹ء ● ممتاز شیریں، کفارہ، ۹، ۱۹۶۱ء ○ یاں کوئی خریدار نہیں جنس گراں کا، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● واجہ
رقیب روسیاہ، ۱۰، ۱۹۵۹ء۔

نظم:

● ابن الحق عظیم آبادی، نروان، ۱۱، اپریل ۱۹۶۲ء ● احسن لکھنوی، اجڑا ہوا گھر، ۸-۷،
● احمد ہمیش، پرچھائیں کا سفر، ۹، ۱۹۶۱ء ● اختر الایمان، میا شہر، ۸-۷، اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ مرگزیدہ سپنا
اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ میرا نام حسین ۸-۷، اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ کتبہ، ۸-۷، اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ مسافت (ایک نامکمل نظم
اکتوبر ۱۹۶۱ء ○ دعا، ۲، ۱۹۶۰ء ● اختر الایمان، شکست خواب، ۲، ۱۹۵۹ء ○ چلو چلیں، ۲، ۱۹۵۹ء (
۱، ۱۹۶۱ء ○ نظم کی تلاش، ۱، ۱۹۶۱ء ○ بنت لمحات، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ لوگو اے لوگو! ۱۴-۱۳-۱۲،
○ باز آمد ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ بے تعلقی، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ کوزہ گر، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ● اختر انصاری
چار قطعات، ۲، ۱۹۵۹ء ○ پانچ رباعیات، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ تین قطعات، ۳، ۱۹۵۹ء ● اسد محمد خاں، ۱۰
۱۱، ۱۹۶۳ء ○ آدھی رات کا سورج، ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ ہوشیار شب، ۱۰، ۱۹۶۲ء ● اسلم انصاری، فاوسٹ سے
● اشتیاق حسین قریشی، دست قدرت، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● اشوک باجپائی، پیار کرتے ہوئے، ۸-۷، ۱۹۶۱
● اعجاز احمد، یوں کہ جیسے ہمیشہ، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ موت کا عکس، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ چھ نظمیں، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ تنظیر
دعا کے تیر، ۴-۳، ۱۹۶۱ ○ چاند، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ پرچھائیں، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ گواگوں، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ ،
۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ فاصلوں کی بات، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ اقتباسات، اوشا کے لیے، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ○ میری موت
مسیحا، ۴-۳، ۱۹۶۱ء ● باقر مہدی، دو نظمیں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ منزل کے آگے، ۱۰، ۱۹۶۲ء ○ شہرت، ۱۰،
○ ایک شہری شام، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ پیڑ کے نیچے، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ لہو میں اتری دھنک، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ نیم خوابیدہ، ۱۰،
○ بے خوابوں کی تیسری شب، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ خواب میں اچھل، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ سرکس کا ایک منظر، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ دو تر
ہمسائے لب، ۲، ۱۹۶۱ء ○ ایک حویلی راستے میں، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ ایک دھوپ نرم پاگل سا، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ تمہارے نام چند پیمانے

۵، ۱۹۵۰ء ○ نئی آمد گیلری میں ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ حیات، ۱-۱، ۱۹۷۱ء ● بلراج کومل، دستِ گل، ۸-۷، ۱۹۶۰ء ○ فولاد کا
کارخانہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ اگلے برس کی بات، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ جدائی کا گیت ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ عالم گل ۵، ۱۹۶۰ء
○ بادل ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ ایک نظم، ۱۱، ۱۹۷۱ء ○ یہ میری حسین صورت، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۲ء ● بل کرشن اشک
ایک سانیٹ ۱۱، ۱۹۶۲ء ● پریم وار برٹنی، آرتی، ۶، مارچ ۱۹۶۱ ● تلوک چند محروم، بوئے گل، ۱۱، ۱۹۵۹ء ●
جالب وطنی، جیو دسورج کے آئینے میں، ۳-۴، ۱۹۷۷ء ● جبار جمیل، لفظوں کی تجارت، ۳-۲، ۱۹۷۱ء ● جلیل حشمی
انتظار سے پہلے، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ سانپ اور تقاضہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ گناہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ رات کی باتیں ۶، ۱۹۶۱ء
○ گورا انگن، ۶، ۱۹۶۱ء ○ دو سپے، ۶، ۱۹۶۱ء ○ دانۂ گندم، ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ بغداد کے بعد ۲، ۱۹۵۹ء ○
وقت کا پڑاؤ ۲، ۱۹۵۹ء ● جگن ناتھ آزاد، سنگِ ناکام، ۳-۴، ۱۹۶۳ء ○ رباعیات ۵، ۱۹۶۰ء ● حامدی کاشمیری
دردِ طمانہ ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● حبیب تنویر، جمیل، ۵، ۱۹۶۰ء ● حرمت الاکرام، درد کی آگ ۶، ۱۹۶۱ء ●
حسرت موہانی، بربطِ سلمیٰ ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ ترانۂ محبت ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ حفیظ ہوشیارپوری، بے وفائی ۸-۷، ۱۹۶۱ء
● حمید اکاس، جھلکے ۱، ۱۹۵۹ء ○ آخری نظم، ۳-۴، ۱۹۶۲ء ○ صبحِ تخلیق ۵، ۱۹۶۰ء ○ بیچارہ ۱۰، ۱۹۷۱ء
● خلیل الرحمٰن اعظمی، متاعِ نژادِ نو، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ کمزور حقیقتیں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ سلسلے سوالوں کے ۸-۷
۱۹۶۱ء ○ سوداگر ۴، ۱۹۶۰ء ○ تذکرہ شعرائے اردو، ۵، ۱۹۶۰ء ○ نقدنامہ ۵، ۱۹۶۰ء ● خلیل مامون
دعا، ۳-۴، ۱۹۷۷ء ○ لالہ، ۳-۴، ۱۹۶۲ء ○ جلاوطن شہزادگان کا جشن ۲-۳، ۱۹۷۱ء ● درشن دیندر کمار جین،
مٹی بیں ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● ڈاکٹر دھرم دیر بھارتی، یہ دستاویز ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● ذو الفقار احمد، رقت کا ساتھی ۱۱، ۱۹۶۲ء
● راج نرائن راز، جیسے فساد ختم ہوا، ۳-۴، ۱۹۶۲ء ● رؤف خیر، امانت آنے والے صاحبوں کی، ۲-۳، ۱۹۷۱ء
○ نذرِ غالب ۱، ۱۹۷۱ء ● زبیر رضوی، تشنگی ۱۰، ۱۹۵۹ء ● ساجدہ زیدی، ایک نظم، ۲-۳، ۱۹۷۱ء ○
اکائی ۲-۳، ۱۹۷۱ء ○ لا مساوی ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ قریب ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ امکانات ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ وحشت امکان تری عمر
۱۱، ۱۹۷۱ء ○ ایک نظم ۱۰، ۱۹۷۱ء ○ ایک نظم ۱۱، ۱۹۷۱ء ○ ایک نظم ۱۱، ۱۹۷۱ء ● ساقی فاروقی، ایک نیا موڑ
۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ ناخن کا قرض ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ شکست کی آواز ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ محفوظ شہر ۵، ۱۹۶۰ء ○ سفر انتظار
۶، ۱۹۶۱ء ○ مردہ خانہ ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ تنہا پانی پچا ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ انہدام ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ○ رقصِ مئی ۱۲-۱۳-۱۴
۱۹۶۲ء ● سجاد حیدر یلدرم، التجائے یاس، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● سکینہ رشید عیال، اپنی جنیا کے لیے ۸-۷، ۱۹۶۱ء
○ پلیٹ فارم ۳-۴، ۱۹۶۲ء ○ میگرنگ کے ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● سلیمان خمار، دو نظمیں، ۳-۴، ۱۹۶۲ء ○ سنگ وقف،

۱۹۶۲ء ○ آٹھواں رنگ، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ● سید مراتب اختر، دھرتی ماتا، ۱۲، ۱۹۶۲ء ● سید ہاشمی فرید
یاسین، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● سنیت جہاں پریس، گھنٹیاں، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ○ بے ولیار، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○
۱۶-۱۳-۱۲ ○ فراق نے، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ○ طوطا، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ○ کال کا چھلا، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ○
ایک دیوانہ، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ○ یہ کتاب، ۱۶-۱۳-۱۲، ۱۹۶۲ء ● شاد عارفی، قطعات،
۴، ۱۹۶۰ء ○ دبی تو گفتنی ہے اصل میں جو گفتنی نہیں، ۳۰، ۱۹۵۹ء ● شاد تمکنت، خوں بہا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ تخم نو
۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ قیمتیات و بند عم، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ بے نسبادی، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ○ گونج، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ●
شاہد عشقی، درد مشترک، ۱۰/۹، ۱۹۶۱ء ● شفیق فاطمہ شعریٰ، صدا بصحرا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ یادنگر، ۸-۷، ۱۹۶۱ء
زوال جسد تنہا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ خاک بجیر یانے، ۱۱-۱۰، ۱۹۵۹ء ○ نیل سے کف بلنے، ۱۱-۱۰، ۱۹۵۹ء ○ روح صحرائے نو
۱۱-۱۰، ۱۹۵۹ء ○ فعل نیک فال، ۱۱-۱۰، ۱۹۵۹ء ○ درماں، ۵-۶، ۱۹۶۰ء ○ سہ حنر کے، ۵-۶، ۱۹۶۰ء ○ اک ستارہ، ۴-۳
○ شفیع الام، ۴-۳، ۱۹۶۴ء ○ سایہ پیلہ، ۷-۶، ۱۹۶۴ء ○ نمک قمر ترجمہ (حصص از جاوید ناصر)، ۶، ۱۹۶۱ء ○
تو نکلات اخلاف بنی، ۶، ۱۹۶۱ء ○ خلائے سروش، ۶، ۱۹۶۱ء ○ پچھلن، ۳۰، ۱۹۵۹ء ○ کنارہ، ۳۰، ۱۹۵۹ء ○
اے دل اے دل، ۲، ۱۹۵۹ء ○ خلد آباد کی سرزمین، ۲، ۱۹۵۹ء ○ تار رنگ جہاں، خاص نمبر ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء ●
شمس الرحمٰن فاروقی، تخلیہ کرے میں نظارہ، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ○ جنگل دیکھتا ہے، ۱۰، ۱۹۶۱ء ● شہریار، زندگی جو آنے
والی ہے، ۶، ۱۹۶۱ء ○ یادیں، ۳۰، ۱۹۵۹ء ○ بجلی کا بیان، ۳۰، ۱۹۵۹ء ○ طلسم ٹوٹنے پر، ۴، ۱۹۶۰ء ○ دوستو، ۱۰،
۱۹۶۰ء ○ اجنبی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ کا بیوپار، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ سوال، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ منظر منظر سے آگے، ۱۱، ۱۹۶۱ء
○ پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا، ۱۱، ۱۹۶۱ء ● صادق، تین نظمیں، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ● ضیاء جالندھری،
ایک نظم، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● طاہر رضوی، بازگشت، ۴، ۱۹۶۰ء ● عبدالعزیز خالد، طاؤس درباب آخر، ۸-۷، ۱۹۶۱ء
● عبدالحلیم شرر، سمندر، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ فلک سار، ۱۰-۹، دسمبر ۱۹۶۱ء ○ نمک موج، ۱۴-۱۳-۱۲، ۱۹۶۳ء
● عبدالرحمٰن بجنوری، نت رہا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ یادگل، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ دعا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● عزیز
تمنائی، چار نظمیں، ۳-۲، ۱۹۶۱ء ● عزیز لکھنوی، مٹی کا جال چاند، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● عزیز حامد مدنی، اے
موسم کے پھاٹک، ۱۱-۱۰، دسمبر ۱۹۶۲ء ● عزیز قیسی، کیش نگری، ۴-۳، ۱۹۶۴ء ○ یکش نگری، ۵-۶،
۱۹۶۴ء ○ تسلسل، ۴-۳، ۱۹۶۴ء ○ کبو کبو تو کبو، ۴-۳، ۱۹۶۴ء ● علی ظہیر، چار نظمیں، ۴-۳، ۱۹۶۴ء
● علی جواد زیدی، قیس کی لاش (جاوید ویسالکی موت سے متاثر ہو کر کہی گئی)، ۶، مارچ ۱۹۶۱ء ○ انفیشن

۳، ۱۹۵۹ء ● عمیق حنفی، کنکریٹ کا جنگل، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ سراب احساس، ۸-۹، ۱۹۶۱ء ○ کرنوں کا گیت، ۱۰-۹،
۱۹۶۱ء ○ آدم نو، ۱۱، ۱۹۶۳ء ○ رات، ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ جیمنا سپنا، ۶، ۱۹۶۱ ○ آج کی ملہار، ۲۰، ۱۹۶۱ء ●
غلام ربیک نیرنگ، جان شیریں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● غیاث متین، آسمان کے زوال سے پہلے، ۵-۴، ۱۹۶۴ء ●
فضا کوثری، قطعات، ۶، ۱۹۶۱ء ● قاضی سلیم، پرواز، ۱۱، ۱۹۶۴ء ○ یہ قربتیں یہ فاصلے، ۲۰، ۱۹۶۱ء ○
ہنگ، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ بندھن، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ چاندنی، ۵، ۱۹۶۰ء ○ مصالحت، ۳، ۱۹۵۹ء ○ ورثہ،
۱۹۶۱ء ○ کھلونے، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ● قمر جمیل، نیل کا سیلاب، ۱۱، ۱۹۶۲ء ● کاوش بدری، چاندنی سوغات
۱۲-۱۳، ۱۹۶۲ء ● کرشن موہن، ناپ، ۴، ۱۹۶۰ء ○ روپ، ۴، ۱۹۶۰ء ● کوثر لدھیانوی، گیت، ۳، ۱۹۵۹ء
کیدار ناتھ سنہا، الکت، ۸-۷، ۱۹۶۱ ● گریش چندر بہار، نظمیں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● گوپال متل، ایک نظم
۱۹۶۱ء ● گوہر نوشاہی، سانپ آکاش مجھے، ۱۱، ۱۹۶۲ء ○ سفر درد، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ● مجید امجد، بہار
۶، ۱۹۶۱ ○ ایک سی، ۳، ۱۹۵۹ء ○ ایک تصویر، ۵، ۱۹۶۰ء ● محب عارفی، احساس خواب، ۱۱، ۱۹۶۲ء
○ تشکر و تہنیت، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ ازل سے پہلے، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ والد مرحوم کی رحلت پر، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ●
ب خزاں، فاصلے بڑھتے ہی جاتے ہیں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ دیداسی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ ایک نظر، ۸-۷، ۱۹۶۱ء
سرِ گنبد، ۶، ۱۹۶۱ء ○ رگھنڈ کے بعد، ۶، ۱۹۶۱ء ○ اتنا حسن کیا کروگے، ۵، ۱۹۶۰ء ○ میں نے کچھ کہا نہیں
۱۲-۱۳، ۱۹۶۳ء ● م، حسن لطیفی، پودے کا روگ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● محمد علوی، خواب کا جزیرہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء
کاگا، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ البوالہول، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ تنہائی، ۸-۷، ۱۹۶۱ ○ گونگی، ۸-۷، ۱۹۶۲ء ○ آنکھ کھلی تو،
۱۹۶۳ء ○ اتفاق، ۸-۷، ۱۹۶۲ء ○ مخگیرن کے نام، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ● محمود ایاز، حسن مطلق، ۱۲-۱۳-۱۴
○ اسپتال کا کمرہ، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ ○ کنفن، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ○ نوحہ، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ ○ پرانی بات،
۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ○ شب چراغ، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ○ ایک تصویر، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ مشت خاک، ۸-۷، ۱۹۶۱ء
اے جوئے آب، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ سیل زماں، ۱۱، ۱۹۵۹ ○ جلاوطن، ۴، ۱۹۶۰ء ○ نارسا یہ یک عالم کف خاک،
۱۹۶۰ء ● محمود سعید، پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال، ۳، ۱۹۵۹ ○ ایک خط، ۱۰، ۱۹۵۹ء ○ ماں، ۱۰، ۱۹۵۹ء
مسیحا، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ○ کوئی ولیس گئو، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ● محمود سعیدی، زندانی، ۵، ۱۹۶۰ء ○ خاک بباد
۱۰، ۱۹۶۱ء ● مسعود علی ذوقی، کا سی، ۸-۷، اکتوبر ۱۹۶۱ ● مصحف اقبال توصیفی، ایک صبح، ۲-۳، ۱۹۶۲ء
ظہیر العلم، ہجر، ۳، ۱۹۵۹ء ● مغنی تبسم، شبیہ، ۱۰، ۱۹۶۱ء ○ خاک زاد، ۱۲-۱۳-۱۴، خاص نمبر، ۱۹۶۳ء ○

ضیا شیمہ، ۱۱-۱۲-۱۳ خاص نمبر، ۱۹۶۳ء ○ چہرے، ۱۱-۱۲-۱۳ خاص نمبر، ۱۹۶۳ء ● منصور احمد، محبت کا دن، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● مسن موہن تلخ، سانگر، ۲، جنوری ۱۹۶۰ء ○ فنا و قیام شبی، ۲، جنوری ۱۹۶۰ء ● منیب الرحمٰن، مشاق بہار ۱۹۶۱ء ● میراجی، مجھے گھر یاد آتا ہے، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ حافظہ، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ طالب علم، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ساونی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● ن۔ م۔ راشد، اسرافیل کی موت، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● نادر کاکوری، گذرے زمانے کی یاد، ۱۰، ۱۹۶۱ء ● نازش انصاری، احتجاج، ۱۰، ۱۹۷۱ء ● ندا فاضلی، راستے کی منطق، ۱، ۱۹۷۱ء ● نذیر احمد تاجی نظم، ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۳ء ● نریش کمار شاد، تماشیں، ۱، ۱۹۵۹ء ● نند کشور قتل، کالے رنگ کا سنگیت، ۱۰، ۱۹۶۱ء ● وحید اختر، شاعری، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ رائگاں، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ پرومیتھیس، ۸-۷، ۱۹۶۱ء کھنڈر کا سیب اور پھول، ۴، ۱۹۶۰ء ○ سکوت شہر آشنا، ۱۰، ۱۹۵۹ء ○ بجا پاس، ۶، مارچ ۱۹۶۱ء ○ سورج کی ان، ۶، مارچ ۱۹۶۱ء ○ زکنار ما بکنار ما، ۶، مارچ ۱۹۶۱ ○ سنگ مدار، ۳۰، ۱۹۵۹ ○ عدم سے عدم تک، ۱۲-۱۳، ۱۹۶۳ء ○ اجنبی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ● وزیر آغا، زندگی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ طلسم، ۸-۷، ۱۹۶۱ء ○ وحشی، ۸-۷، ۱۹۶۱ء قریب و دور، ۶، ۱۹۶۱ء ● یوسف اعظمی، نیوز ریل، ۷-۴، ۱۹۶۴ء ○ سیال چہروں کا ساگر، ۴، ۱۹۶۴ء ○ آذر کا خواب، ۷-۴، ۱۹۶۴ء ○ پھانسی کا دائرہ، ۷-۴، ۱۹۶۴ء ۔

غزل :

● آل احمد سرور، ۵، ۱۹۶۰ء ● آنند نرائن ملا، ۵، ۱۹۶۰ء ● اثر لکھنوی، ۴، ۱۹۶۰ء ● اختر کاشی پوری، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● احمد ندیم قاسمی، ۴، ۱۹۶۰ء ● اختر ہوشیار پوری، ۶، ۱۹۶۱ء ● امتیاز علی، ۵، ۱۹۶۰ء ● انجم اعظمی، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ● انور صابری، ۴، ۱۹۶۰ء ● باقر مہدی، ۲، ۱۹۵۹ء ○ بدلتے سوال (غزل مسلسل)، ۱۰، ۱۹۵۹ء ● بشیر بدر، ۵، ۱۹۶۰ء - ۳، ۱۹۶۰ء - ۳، ۱۹۶۰ء - ۴، ۱۹۶۰ء - ۶، ۱۹۶۰ء ، ۱۹۶۳ء - ۱۱، ۱۹۶۲ء - ۳، ۱۹۵۹ء - ۳، ۱۹۵۹ء - ۲، ۱۹۵۹ء - ۲، ۱۹۵۹ء - ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۲ء ● [illegible]، ۱۹۶۰ء ● جاں نثار اختر، ۱۰، ۱۹۷۱ء - ۳، ۱۹۵۹ء ● جعفر شیرازی، ۲، ۱۹۵۹ء - ۳، ۱۹۵۹ء ● ن ناتھ آزاد، ۳۰، ۱۹۵۹ء ○ صد سالہ ماتم دو شد (غزل مسلسل)، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ ● جلیل حشمی، ۲، ۱۹۵۹ء ● حکیم منظور، ۷-۴، ۱۹۶۴ء ● حمید نسیم، چار غزلیں، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء ● خالد ندیم، ۲، ۱۹۵۹ء ● خلیل الرحمٰن اعظمی، ۱۰-۹، ۱۹۶۱ء - ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۹۶۲ء ● خلیل رامپوری، ۶، ۱۹۶۱ء ● راج نرائن راز، ۱۹۶۱ء - ۴، ۱۹۶۰ء ● راز امتیاز، ۷-۴، ۱۹۶۴ء ● راز یزدانی، ۳۰، ۱۹۵۹ء ● زاہدہ زیدی، ۱۰، ۱۹۷۱ء

ساحر ہوشیارپوری ۲۰، ۱۹۵۹ء ● ساقی فاروقی ۶۰، ۱۹۶۱ء ● سلام مچھلی شہری (چار قطعات اور غزلیں) ۴، ۱۹۶۴ء ● سلیم تمنائی ۲۰-۱۹۵۹ء ● سلیمان ادیب ۴۰، ۱۹۶۰ء ● شاذ عارفی ۴۰، ۱۹۶۰ء — ۱۹۵۹ء — ۳، ۱۹۵۹ء ● شاذ تمکنت ۱، ۱۹۵۹ء ● شان الحق حقی ۵، ۱۹۶۰ء ● شاہد منصور ۳، ۱۹۵۹ء ● سنا گوالیاری ۴، ۱۹۶۰ء ● شفقت تنویر مرزا ۴، ۱۹۶۰ء ● شفیق فاطمہ شعریٰ ۲۰، ۱۹۵۹ء — ۱، ۱۹۵۹ء ● شمس الرحمٰن فاروقی ۲، ۱۹۶۱ء ● شہادت جعفری ۱، ۱۹۵۹ء ● شہرت بخاری ۲۰، ۱۹۵۹ء — ۵، ۱۹۶۰ء ● شہریار ۶، ۱۹۶۱ء — ۴، ۱۹۶۰ء — ۴، ۱۹۶۰ء ● ضیاء فتح آبادی ۳، ۱۹۵۹ء ● عبدالرحیم نشتر ۴، ۱۹۶۰ء ● عبدالمجید حیرت ۳، ۱۹۵۹ء — ۴، ۱۹۶۰ء — ۲، ۱۹۵۹ء ● عزیز حامد مدنی ۱۲، ۱۳، ۱۹۶۲ء ● غلام ربانی تاباں ۵، ۱۹۶۰ء — ۱، ۱۹۶۱ء ● فراق گورکھپوری ۳، ۱۹۵۹ء ● فرحت کیفی ۷، ۱۹۶۲ء ● فضا کوثری ۴، ۱۹۶۰ء — ۲، ۱۹۵۹ء ● قمر جمیل ۱۱، ۱۹۶۲ء ● کاوش بدری ۱۰، ۱۹۶۱ء ● گوپال متل ۱، ۱۹۶۱ء — ۱۹۶۲ء ● لطف الرحمٰن ۷، ۱۹۶۲ء — ۱، ۱۹۶۱ء ● متین سروش ۱۰، ۱۹۵۹ء ● محب عارفی ۱۱، ۱۹۶۲ء ● محبوب خزاں ۶، ۱۹۶۱ء ● محمود ایاز ۶، ۱۹۶۱ء — ۳، ۱۹۵۹ء — ۱، ۱۹۵۹ء — ۲، ۱۹۵۹ء — ۱۹۶۰ء ● محمد علوی ۵، ۱۹۶۰ء ● مغنی صدیقی ۴، ۱۹۶۰ء ● مخمور سعیدی ۳، ۱۹۵۹ء — ۱، ۱۹۶۱ء ● مظفر حنفی ۴، ۱۹۶۰ء — ۱، ۱۹۶۱ء ● مظہر امام ۶، ۱۹۶۱ء — ۳، ۱۹۵۹ء ○ تشکیک (غزل مسلسل) ۱۱، ۱۹۶۲ء ● معین احسن جذبی ۴، ۱۹۶۰ء ناصر شہزاد ۱۱، ۱۹۶۲ء ● نصرت کانپوری ۴، ۱۹۶۰ء ● نگار صہبائی ۹، ۱۹۶۰ء ○ نجمن ۹-۱۰، ۱۹۶۱ء ● نظیر صدیقی ۱۰ اشعار، ۵، ۱۹۶۰ء — ۳، ۱۹۵۹ء — ۲، ۱۹۵۹ء ● ہادی مصطفیٰ ۳۰، ۱۹۵۹ء ● یوسف اعظمی ۷، ۱۹۶۲ء۔

بصرہ:

● آل احمد سرور ۱۲-۱۳، ۱۹۶۲ء ● اختر الایمان ۳، ۱۹۵۹ء ● باقر مہدی ۷-۸، ۱۹۶۱ء ● بلراج کومل ۷-۸، ۱۹۶۱ء ● ثناء اللہ ۲، ۱۹۵۹ء ● رضی اختر شوقی ۸، ۱۹۶۱ء ● رفیق خاور ۱۲-۱۳، ۱۹۶۲ء ● ساقی فاروقی ۹-۱۰، ۱۹۶۱ء ● شہریار ۷-۸، ۱۹۶۱ء ● عالم خوندمیری ۷-۸، ۱۹۶۱ء ● قمر جمیل ۷-۸، ۱۹۶۱ء ● حمید المجید ۱۹۶۲ء ● محمد حسن ۷-۸، ۱۹۶۱ء — ۱، ۱۹۵۹ء ● محمود ایاز ۱، ۱۹۵۹ء — ۵، ۱۹۶۰ء — ۱۲-۱۳، ۱۹۶۲ء — ۳، ۱۹۵۹ء — ۲، ۱۹۵۹ء ● محمود سعیدی ۱۹۵۹ء — ۱۲-۱۳، ۱۹۶۲ء ● میر ضیاء اللہ ۹-۱۰، ۱۹۶۱ء ● وارث علوی ۷-۸، ۱۹۶۲ء ● وحید اختر

مئی ۱۹۶۱ء ● وزیر آغا ، مئی ۱۹۶۸ء —

خطوط :

● آل احمد سرور ۳ ، ۱۹۵۹ء ● اثر لکھنوی ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● احمد ندیم قاسمی ، ۴ ، ۱۹۶۰ء ● اختر الایمان ، ۲ ، ۱۹۶۰ء — ۱۹۵۹ء ● اسلوب احمد انصاری ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● احتشام حسین ، ۱۹۶۱ء ● باقر مہدی ، ۲۰ ، ۱۹۵۹ء — ۳ ، ۱۹۵۹ء — ۴ ، ۱۹۶۰ء ● بشیر بدر ، ۳ ، ۱۹۵۹ء ● براج کومل ، ۱۹۶۱ء ○ ۲ خطوط ، ۱۹۶۱ء — ۱۱ ، ۱۹۶۲ء ● پریم ناتھ در ، ۱۹۶۰ء ● جذبی ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● جیلانی بانو ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● حمید نسیم ، ۱۹۶۱ء ● خلیل الرحمن اعظمی ، ۱۹۶۱ء — ۱۹۶۰ء — ۱۹۶۰ء ● راجندر سنگھ بیدی ، ۱۹۶۱ء — ۱۹۶۳ء ● سہیل عظیم آبادی ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● شاہد مارفی ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● شاذ تمکنت ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● شفیق فاطمہ شعریٰ ، ۲ ، ۱۹۵۹ء — ۳ ، ۱۹۵۹ء — ۱۹۶۳ء ● شمس الرحمن فاروقی ، ۱۹۶۱ء ● شہریار ، ۱۹۶۱ء ● ضمیر الدین ضمیر ، ۱۹۶۳ء ● ضیاء جالندھری ، ۱۹۶۱ء ● عبدالمجید حیرت ، ۳ ، ۱۹۵۹ء ● عصمت چغتائی ، ۳ ، ۱۹۵۹ء ● علی جواد زیدی ، ۱۹۶۱ء ● قاضی سلیم ، ۱۹۶۰ء ● قرۃ العین حیدر ، ۲ ، ۱۹۵۹ء ● کرشن چندر ، ۱۹۵۹ء — ۳ ، ۱۹۶۰ء ● گوہر نوشاہی ، ۱۹۶۳ء ● مجتبیٰ حسین ، ۱۱ ، ۱۹۶۲ء ● محمد حسن ، ۲ ، ۱۹۶۱ء — ۲ ، ۱۹۵۹ء ● محمد علوی ، ۱۹۶۱ء ● محمود سعید ، ۱۹۶۱ء ● مظہر امام ، ۱۹۵۹ء ● مبین انور ، ۳ ، ۱۹۵۹ء ● نظیر صدیقی ، ۱۹۶۳ء ● وارث علوی ، ۱۹۶۱ء

وحید اختر ، ۱۹۶۰ء — ۲ ، ۱۹۵۹ء —

انجم :

● چتندر کونتس ، مارچ اپریل ۱۹۶۰ء ● حمید اللہ صدیقی خاص نمبر ، ۱۹۶۳ء ● خیر النساء ، ۱۹۶۱ء — ۱۹۶۳ء ● رفعت نواز ، ۱۹۵۹ء ● رفیق خاور ، ۱۹۶۰ء ● شان الحق حقی ، ۱۹۶۱ء ● شفیق فاطمہ شعریٰ ، ۱۹۶۰ء ● ضمیر الدین احمد ، ۱۹۶۱ء ● محمد اسمٰعیل تابش ، ۱۹۶۱ء ● محمد عمر میمن ، ۱۹۶۳ء ● محمود ایاز ، ۱۹۵۹ء — ۱۹۵۹ء — ۱۹۵۹ء — ۱۹۶۰ء ● محمود سعید ، ۱۹۵۹ء ● مجیب فاروقی ، مئی ۱۹۶۱ء ● مریم زمانی ، ۱۹۶۲ء ● مرلی دھر ، مئی ۱۹۶۱ء ● خلیل مامون ، مئی ۱۹۶۰ء —

ضمیمہ

پچھلے صفحات میں آپ نے سوغات کے دور اول
کا یعنی ۵۹ء - ۶۳ء، ۷۰ء - ۷۱ کا اشاریہ ملاحظہ فرمایا۔ تیسرے
دور ۱۹۹۱ - ۱۹۹۲ کا اشاریہ بنانے کے بجائے صرف
پانچ پرچوں کا معاملہ تھا، ہم نے ان کی فہرست یہاں
بطور ضمیمہ شامل کر دی ہے۔ اب یہ UP TO DATE
ہو گیا ہے۔

موضوعات

۱

ستمبر ۱۹۹۱ء

نقشِ اوّل — اداریہ

اختر الایمان کی میعاد

ایک مکالمہ — اختر الایمان - محمود ایاز -
اختر الایمان کی شاعری کے چند پہلو — وارث علوی
اختر الایمان کی شاعری کا ایک مطالعہ — عزیز قیسی
اس آباد خرابے میں (خود نوشت) — اختر الایمان
اختر الایمان - ایک شخصی خاکہ — جمیل الدین عالی
روداد حیات کے چند گوشے — رفعت سلطانہ

ضمیر الدین احمد

اپنے بارے میں — ضمیر الدین احمد

افسانے :

پاگل — ضمیر الدین احمد
رانگ نمبر — ضمیر الدین احمد
پیل موٹ — ضمیر الدین احمد
پروائی — ضمیر الدین احمد
تشنۂ فریاد — ضمیر الدین احمد
سوکھا ساون — ضمیر الدین احمد

افسانوں پر تبصرے

ضمیر الدین احمد کے افسانے — نیر مسعود
تشنۂ فریاد اور سوکھے ساون — شمیم حنفی

عزیز حامد مدنی

عزیز حامد مدنی کی شاعری میری نظر میں — شمیم احمد

عزیز حامد مدنی کی نظمیں

یاد
دستِ حنائی تک
پچھلے پہر کا چاند
نہ کھوئے تھے گریباں کے چاک
وداع
انتظار
حرف و آگہی
بارہ غزلیں
عذر کرد مرے دل سے .....
وہ ساعت صورتِ چقماق
جس سے لو نکلتی ہے
تم سلامت رہو وحشت ماں سے کیا
کیا کچھ ہوائے زمستاں ہی بہلائے گی

آداب عرض — مشتاق احمد یوسفی
اردو غزل کا نیا منظر نامہ — شمس الرحمٰن فاروقی
فیض کو کیسے نہ پڑھیں — گوپی چند نارنگ
اردو شعریات کی اصطلاحیں — نیر مسعود

نظمیں

بند کمرہ — اختر الایمان
بیسک — وزیر آغا
سفوف — قاضی سلیم
تو جو ہو گیا ایسے مان لے — امجد اسلام امجد
ایلی ایلی لما شبقتنی — شائستہ یوسف
کیوں جیتی ہو — شائستہ یوسف
تم سے صدیوں کا پیار کروں/نجات — شائستہ یوسف
نظارہ درمیاں ہے — شائستہ یوسف
ترا تشکل — صلاح الدین پرویز
ڈیزرٹ ہسٹارم، التجا — محمد علوی
میری شاعری میرا نام — محمد علوی
وعدہ درشن — رؤف خیر
میلاد آدم — مظفر مجاز
زیاں، کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے — نثار جمیل

وداع — بیگ احساس
جبار جمیل
ساحرہ انور

غزلیں :

• وزیر آغا • ساقی فاروقی • مغنی تبسم
عبدالعزیز خالد • ؟ قیصر مہدی • عرفان صدیقی
• عبدالسلام امجد • اختر امام • کاوش بدری •
انیس اشفاق • عبداللہ کمال • مظفر ایاز۔

تین نظمیں ایک تبصرہ

غزال شب کے ساتھ — خلیل مامون
شاعری مت کرو — خلیل مامون
مہاتما گاندھی روڈ پر — خلیل مامون
تبصرہ — مغنی تبسم

مضامین :

اردو غزل کا مطالعہ — مغنی تبسم
معاصر ادبی نظریات — نظیر صدیقی
آفاق قا — ایک جائزہ — مسعود ہاشمی

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر
ظ۔ انصاری
ضمیر الدین احمد
عزیز حامد مدنی

"ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے"

• شمس الرحمٰن فاروقی • محمود ہاشمی • گوپی چند نـ
• شمیم حنفی • نیر مسعود • عبدالعزیز خالد • وز
باقر مہدی • نظیر صدیقی • مرزا حامد بیگ • کشور نـ
مظفر حنفی • قاضی سلیم • ساقی فاروقی۔

تبصرے :

• امیر خسرو کا ہندوی کلام۔ مصنف: گوپی چند نا
تبصرہ نگار: ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن • آفاق فرا۔
شفیق فاطمہ شعریٰ، تبصرہ نگار: مصطفیٰ مجاز • صلا
پرویز کے خطوط اور تنقیش، تبصرہ نگار: خلیل مامو

(۲)

مارچ ۱۹۹۲ء

حصہ اوّل
اداریہ

مضامین :

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں — پطرس مرحوم
منٹو کے افسانوں میں عورت — ڈاکٹر وزیر آغا
قرۃ العین حیدر کے اردو ناول — شمیم احمد
تصور شعور انگیز — ابوالکلام قاسمی
ژی ادب — صلاح الدین محمود

خاکے :

سائل دہلوی — جمیل الدین عالی
ضمیرہ۔ میرے شوہر — سادی ضمیر الدین احمد

خودنوشت

"..... اس آباد خرابے میں" — اختر الایمان

خصوصی گفتگو :

سوغات پہلی کتاب ـــــ ایک گفتگو، شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسـ
وقار صد

یادِ رفتگاں :

ظ۔ انصاری ادیب کے نام

پس ساختیات، گوپی چند نارنگ دوست تہہ سنگ آ

محمود ایاز، گوپی چند نارنگ، نظیر صدیقی، وزیر آغا، قمر رئیس، شمیم حنفی
ساقی فاروقی، اقبال کرشن، چودھری محمد نعیم، جمیل جالبی

ایک نظم تین تبصرے :

جواز — براج کومل
تبصرے — وزیر آغا، اختر الایمان، محمود ایاز

غزلیں

ن کی حقی۔ مرزا حامد بیگ۔ ساقی فاروقی۔ اکبر علی خان عرشی زادہ۔
اسد محمد خاں

نظمیں

آفتاب جوانی کی نذر — عبدالوہاب البیاتی۔ ترجمہ الجد سلام امجد
مسیحی خامہ — اختر الایمان
لبریز — اختر الایمان
نقل مکانی — اختر الایمان
تم جو آتے ہو — وزیر آغا
ہم — صلاح الدین محمود
ابھی ابھی — صلاح الدین محمود
لیب کا حقیقیانہ — صلاح الدین محمود
میں — صلاح الدین محمود
طلسم — صلاح الدین محمود
دستکاری — قاضی سلیم
دھرو تارا — شفیق فاطمہ شعریٰ
تنکے پر درد و تجسس کی ناتواں میرا — صلاح الدین پرویز
جب بھی میں دیکھتا ہوں — صلاح الدین پرویز
جب بھی میں لوٹتا ہوں — صلاح الدین پرویز
بہت ہونے کا ڈر، عزیز — محمد علوی
کون، وہ کون تھا — محمد علوی
مانو عورت اور لڑ دی، مشورہ، وہ کون ہے — محمد علوی
ست ساقی ہے — خلیل مامون

خدا کا استوا — اقبال کرشن
مسابقات — اکبر علی خان عرشی زادہ

جدید شاعری کا انحطاط

اعتراف — جلراج کومل

انتظاریہ

آب گم ——— ایک تاثر — آل احمد سرور

خصوصی مطالعہ

نصوح۔ صحیفے سے کتاب سوزی تک — آصف فرخی
کھو میاں گڈے — آصف فرخی
آصف فرخی سے بات چیت، نیّر مسعود، محسن خان، آصف اشفاق

تین افسانے

زمین کی نشانیاں — آصف فرخی
بحیرۂ مردار — آصف فرخی
ستارۂ غیب — آصف فرخی
آشوب اور نوحہ کا افسانہ نگار ——— آصف فرخی — قمر احسن

تبصرے

مرثیہ خوانی — مصنف: نیّر مسعود — تبصرہ نگار: [illegible]
احاطہ — مصنف: جہاد جمیل — تبصرہ نگار: علیم مسرور
مٹی مٹی میرا دل — مصنف: مغنی تبسم — تبصرہ نگار: مضطر مجاز
آوارگی — مصنف: محمد شریف — تبصرہ نگار: محمود ایاز
خاطر معصوم — مصنف: ضمیر الدین احمد — تبصرہ نگار: [illegible]

بازگشت

(۳)

ستمبر ۱۹۹۲ء

عرض حال — اداریہ

مضامین

یوسفی صاحب — شان الحق حقی
فیض اور غالب — ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

نیا جنم	خلیل مامون		
کنہانی کہاں مسکن ترا	حامد سعید	میکسیکو کی داستان	اوکتاویو پاز ترجمہ: انیس اشفاق
اے افسوں کہوں یا ہجر کا موسم	خالد سعید	ملاقات اس شہزادی کے	رما کانت رتھ ترجمہ: انیس اشفاق
میں تم سے زندہ ہوں	شاہد کلیم		
تصور میسر نہیں	رفیعہ شبنم عابدی	[illegible]	مثنی بحر نظمیں — مناظر عاشق ہرگانوی
محشر	اکرام خاور		
خوشبو، انکار و اصرار	حبیب حق		
بانہیں	حبیب حق		
لمس، دان، زندگی	حبیب حق		
پہلی بھول	حبیب حق		
سات زاویے	حبیب حق		
جب مجھ میں پیستا ہوں	صلاح الدین پرویز		
دو حق • دوسرا آدمی	اوکتاویو پاز ترجمہ: انیس اشفاق		

تبصرہ

شاخسانے ھنسف : شان الحق حقی۔ تبصرہ نگار: ثاقب انصاری

بازگشت

گوپی چند نارنگ ۔ شان الحق حقی ۔ شمیم حنفی ۔ [illegible]
احتشام احمد ۔ گمنام ۔ آصف فرخی ۔ سلام بن رزاق
شفیق فاطمہ شعریٰ ۔ علی امام نقوی ۔ نامی انصاری ۔ ضیا احمد
ابرار احمد ۔ اقبال کرشن ۔ حفیظ الکبیر قریشی ۔ [illegible]
مشرف عالم ذوقی ۔ سراجی فرانی ۔ انور سینائی

۵

ستمبر ۱۹۹۳ء

خودنوشت

"....اس آباد خرابے میں" — اختر الایمان

فصل اول

مضامین

صبیح الدین احمد کی افسانہ نگاری	وارث علوی
عصمت کی ٹیڑھی لکیر	شمیم حنفی
اردو ناول کی داستان	آصف فرخی
میراجی کی شخصیت	رشید امجد
میراجی کے بارے میں ایک خط	اختر الایمان
بیدی کا عصری افسانہ	انور خان
نسوانی کردار کی تفہیم	معین الدین جینابڑے

غزلیں

حمید نسیم
اسعد بدایونی

خصوصی مطالعہ

سید رفیق حسین	نیر مسعود
کچھ تحقیقی مباحث	نیر مسعود
آئینۂ حیرت کے انعکاسے	شمس الحق عثمانی

...نیبدنیانی — آصف فرخی
...وقت — سید رفیق حسین
...ل کے رنگ — الطاف فاطمہ
...ہ کی باتیں — شاہد احمد دہلوی

...ق حسین کے افسانے

...ره
...نگوں
...ــ وہ نوکل گئے
،
... بہرسرا

...لیں

...ر — خالد علوی
...نے والی بارش — صلاح الدین محمود
...عرت رنگ کی دو پینٹنگس — محمد صلاح الدین پرویز
...و تر — محمد صلاح الدین پرویز
...یا تنہا ہوئی — محمد صلاح الدین پرویز

وہ آنکھیں پوچھتی ہیں — اشفاق حسین
دو نظمیں — رفعت سروش
موٹیگو سے جیکا کی باتیں ، خود فریبی — خالد سہیل
اسفار البحور — اقبال کرشن

نشتر ——— پہلا ناول ؟ ؟ ترجمہ یا طبع زاد ؟

عظیم الشان صدیقی ——— یوسف سرمست ———

تبصرے

سوکھے ساون - ضمیر الدین احمد — تبصرہ نگار : مرزا حامد بیگ
خواب کہانی - محسن خان — تبصرہ نگار : ابو ریحان
سر راستہ کا چراغ : عزیز تمنائی — تبصرہ نگار : محمود ایاز
ناممکن کی جستجو - حمید نسیم — تبصرہ نگار : نامی انصاری
سیاہ / سیاہ - باقر مہدی — تبصرہ نگار : ابوالکلام قاسمی

بازگشت

آل احمد سرور ، شان الحق حقی ، آفتاب احمد خان ، میر مسعود ، شمیم حنفی ، فضیل جعفری ، مسعود انور بیگ ، امتیاز احمد ، انور معان ، احمد علوی ، احمد جاوید ، اقبال کرشن ، سید ارشاد حیدر ، محمد ابراہیم صدیقی ، ام القوی ، حسن حق ، اکرام جاوید ، انجم ظہری ، قیصر ریاں ، مظہر امام ، شاہد کلیم ، بروہ ...

●●

بیان ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدابخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۶۔ ملکیت : خدابخش لائبریری، پٹنہ ۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۳ء

مراسلات

عبدالرب عرفان
صدر شعبۂ فارسی
... آرٹس اینڈ سائنس کالج، ...

جرنل ۷۵-۷۷ کے بارے میں

خدابخش لائبریری جرنل کی تازہ اشاعت (۷۷-۷۵) میں امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات کی تصحیحات مندرجہ ذیل ہیں:

سطر ۱/ شعر بنزاید ۲/۱۲، بہتی، ۳/۱۳ میدان، ۲/۱۷ (پے)، ۲/۱۸ روستائی، ۱/۲۲ حظیہ، ۲/۲۶ ذکر د، ۳/۲۸ صوفی، ۲/۴۹ مستقیم۔

ان کی نشاندہی اور تصحیح کی غرض سے ایک مختصر سا خط تحریر کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے ایک کرم فرما نے چند مصرعوں کے بحر و وزن سے خارج ہونے کا شبہ ظاہر کرکے مجھے چونکا دیا۔ مقطعات پر دوبارہ نظر ڈالنے پر معلوم ہوا کہ فاضل معترض اُن مصرعوں کی قرأت ان مزاحفات کو نظرانداز کرکے فرما رہے تھے جن کے استعمال سے متعلقہ مصرعوں پر بحر اور وزن سے خارج ہونے کا گمان ہوتا ہے مگر فی الواقع مزاحف ارکان کی تبدیلی کے باعث وزن میں خفیف سے فرق کے باوجود وہ پوری طرح اپنی بحر کے پابند ہیں۔ مختصر سی گفتگو نے فاضل معترض کی غلط فہمی کا تدارک کر دیا۔ لیکن یہ اندیشہ دل میں جاگزیں ہو گیا کہ مبادا جرنل کے قارئین میں بعض ایسے بھی ہوں جو ایک ہی شعر میں مختلف الوزن مصرعے کہنے کی مروجہ علمت و رسم کی روایت سے جس کا رواج اور جواز فارسی شاعری کے روز اوّل سے آج تک ایران کی ادبی تاریخ کے ہر دور میں پایا جاتا ہے، ناواقف ہوں اور ان مصرعوں کی صحت پر سوالیہ نشان لگا دیں۔ اسی اندیشے کے تحت تصحیحات کے ساتھ توضیحات کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔

پہلی صدی ہجری کے دوسرے دہے میں عربوں نے ایران فتح کیا۔ ان کے ساتھ عربی کی ادبی اور شعری روایتیں بھی ایران پہنچیں۔ انہیں میں ان کا عروضی نظام بھی تھا جس کی تشکیل عربی زبان کے مزاج اور اس نحوی ساخت کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل میں آئی تھی اور اسی وجہ سے وہ گوناگوں مزاحفات سے گرانبار تھا (اور اب بھی ہے)۔ اس میں شاعروں کے لیے ایسے جواز اور مراعات موجود ہیں جن کا وہ استعمال کرتے ہیں اور بسا اوقات بحروں کے بعض اصل ارکان کو الگ کرکے دوسرے مزاحف ارکان سے تبدیل کرکے ایک ہی شعر کے مصرعوں کو مختلف الوزن بنا دیتے ہیں، مثلاً درج ذیل شعر کی اصل بحر "مدید مسدس مقصور" ہے جس کے دوسرے مصرعے کے پہلے رکن میں تبدیلی کی گئی ہے:

یا ومیض البرقِ بین الغمام   فعلیک لا علیہا السلام

اس کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں:

فاعلاتن	فاعلن	فاعلات	فعلاتُ	فاعلن	فاعلات
یا ومیض	برقِ بی	نل غمام	فَعَلَیْکَ	لا عَلَیْ	هَسَّلام

دوسرے شعر کے پہلے رکن میں "فاعلاتن" کے بجائے "فعلاتن" لایا گیا ہے جو مشکول زحاف ہے۔ اس کا وزن بحر کے نام کے ساتھ "مدید مشکول مخبون" ہے۔ عربی میں اس طرح کے مختلف الوزن مصرعوں پر مشتمل اشعار کثرت سے دستیاب ہیں۔

زحافات کی کثرت سے گراں بار ہونے کے باوجود ایرانیوں کو عربی بحروں اور ان کے اوزان میں ترنم اور خوش آہنگی کی ایک نعمت محسوس ہوئی اور انھوں نے ان بحروں کی موسیقیت کو اپنے مزاج و طبع سے قریب تر پایا۔ چنانچہ مروجہ مصرعی ہجائی اوزان کو جن میں ہجا کو شمار کیا جاتا تھا، ترک کر کے عرب کے نظام عروض کو اپنا لیا۔ ابتدائی دور میں ایرانی شاعروں نے بھی عرب شاعروں کی طرح میں زحافات کی تبدیلی کے جواز کا فائدہ اٹھایا اور ان بحروں میں بھی شعر کہے جو روانی اور ترنم نہیں رکھی جا سکتیں مثلاً مجلس اوروزکی مندرجہ ذیل شعر کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں:

ای باد ز بہر غریب ما   دردی ببر از غم حبیب ما

موزونی طبع اور موسیقیت پسندی کو اس شعر کو اور وزن سے خارج قرار دینے میں ممکن ہے چنداں تامل نہ ہو لیکن یہاں یہ رباعی طرح "بحر ہزج" میں ہے۔ پہلے مصرعے کے ارکان "اخرب مکفوف محذوف" ہیں اور دوسرے مصرعے کے "مکفوف مکفوف ..." اس کی تقطیع اس طرح کی جائے گی

مفعولُ ۔ مفاعیلُ ۔ فاع لن   مفاعیلُ ۔ مفاعیل ۔ فاع لن

ای باد ۔ ز بہر غ ۔ ریب ما   دردی بب ۔ بز غم ح ۔ بیب ما

شعر کا وزن ناموزوں ہے اور مصرعوں کا مختلف الوزن ہیں۔

ایرانی شاعری نے اپنے ارتقا کے سفر میں تقریباً دو صدیوں کا ابتدائی فاصلہ عربی عروض کی رہنمائی میں طے کیا۔ اس دوران کچھ عروضی کا بھی سراغ ملتا ہے جن کے زیر اثر عربی عروض کی جکڑبندیوں سے حصول آزادی کے امکانات روشن ہوئے۔ وہ بحریں نظر انداز کی جانے لگیں جو ترنم اور موسیقیت سے محروم پائی گئیں۔ جو بحریں خوش آہنگ اور ایرانی مزاج و طبع سے قریب تر نظر آئیں انھیں تراش خراش کے ساتھ اور سڈول بنا لیا گیا۔ باایں ہمہ بعض بحروں اور ان کے مصرعوں میں زحافات کے تبدیل کیے جانے کا جواز برقرار رہا۔ اس قبیل کی چند کثیر الاستعمال بحریں یہ ہیں۔

<u>ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور</u> : (مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن/فعولان)

اس کے حشو اول (مفاعیلُ) کو جو رکن سالم (مفاعیلن) کا مکفوف زحاف ہے، رکن سالم (مفاعیلن) سے بدل دیتے ہیں۔ دوسرے حشو (مفاعیلُ) کو بھی اخرب زحاف (مفعولُ) سے بدل جاتا ہے۔ بطور مثال ملک الشعرا بہار کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے

تا ہست کنار تو پر از لشکر دشمن   ہرگز نشود خالی از دل من محن

(مفعولُ مفاعیلُ مفاعیل۔ فعولن   مفعولُ مفاعیلُ مفعولُ فعولن

تابستہ کنار جنبشِ پیژ زشک بردشن   ہرگز نہ شود خالی از دل مِ حنی من)

بحر رمل مثمن مخبون محذوف/مقصور : (فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن / فعلان)

اس بحر کی اصل صورت یہی ہے کہ اس کے صدر اور ابتدا یعنی مصرع اوّل اور مصرع دوم کے پہلے رکن بھی مخبون (فعلاتن) ہیں لیکن شعرا عام طور پر اس کی جگہ سالم رکن (فاعلاتن) لاتے ہیں۔ اس بحر میں تبدیلی زحافات کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(۱) پہلا رکن فعلاتن یا فاعلاتن کے بجائے مفعولن۔ مثلاً بہار مشہدی کا یہ شعر:

الموت از شکم میغ نمایاں چو نامک   مہدی روی بمندیل بپوشد ز نفر[۲]

مفعولن فعلاتن فعلاتن فعلان   فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

الموتز شکمِ می غنمایاں چوناک   مہدی رو یبمندی ل بپوشد زنفر

(۲) دوسرا رکن فعلاتن کے بجائے مفعولن۔ مثلاً ملک الشعرا بہار مشہدی کا یہ شعر:

از بر گیلاں راندیم بدریا دکردید   سفر دریا بلی گفت و شنود بندر[۳]

فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلان   فعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

ازبرگی لاں رادی مَ بدریا دکِ دید   سفری در یابلی گف تُ شنودی بندر

(۳) تیسرا رکن فعلاتن کے بجائے مفعولن۔ مثلاً ملک الشعرا بہار کا یہ شعر:

گر سوی چپ متمایل شدی وگر سوی راست   گر فرد خفتی وگر جستی چون ضیغم نر[۴]

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان   فاعلاتن فعلاتن مفعولن فعلن

گرسوی چپ متمایل شدی وگر سوی راس   گرفرخف تیوگرجس تی چو ضَی غمِ نر

بحر مجتث مثمن مخبون : مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن

یہ مرکب بحر بحر رجز اور بحر رمل کے سالم ارکان مستفعلن فاعلاتن (دو بار) سے بنی ہے۔ اول الذکر رکن کا مخبون زحاف ہے اور ثانی الذکر کا مخبون زحاف فعلاتن۔ اس میں تغییر زحاف کی یہ صورت ہوتی ہے کہ دوسرے رکن فعلاتن کو مشعث مفعولن سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً شوریدہ شیرازی کا درج ذیل شعر جس نظم سے ماخوذ ہے اس کی اصل بحر مجتث ہے لیکن اس شعر کے دونوں مصرعوں کے رکن دوم ثانی مخبون (فعلاتن) کے بجائے مشعث (مفعولن) ہیں:

بدین دو گوہر پرمایہ بست شاید ہستی   بدین دو گوہر سرمایہ یافت مخزن امکان[۵]

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلاتن   مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلاتن
بنگاہ گو ہژبرا تکابستشا ہدیستی   بنگاہ گو ہژبرسا تمایافرخ زنہارکا

دوسرے مصرعے میں "یافت" کا آخری حرف "ت" ساقط ہے۔

<u>بحرِ مجتث مثمن مخبون محذوف/مقصور</u>: (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن/فعلان)

اس بحر میں بھی زحاف کی تبدیلی کی وہی صورت ہوتی ہے جو بحرِ مجتث مثمن مخبون کے تحت بیان کی جاچکی ہے۔

<u>بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف/مقصور</u>: (مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن/فاعلان)

اس بحر کے مزاحف رکن "فاعلاتُ" کو اس کے سالم رکن "فاعلاتن" سے تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس عمل سے تیسرا رکن "مفاعیلُ" مکفوف، "مفعولُ" (اخرب) سے بدل جاتا ہے۔ ملک الشعرا بہار کے شعر ذیل میں ایسا ہی کیا گیا ہے:

رفتند شیر مردان از مرغزار دیں   وینجا بجز شغالی و خوک و خری نماند
مفعولُ فاعلاتن مفعول فاعلن   مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلان
رفتند شیرمردا ازمرغ زاردی   ویجاب جزشغالی ئی خوکوخ ری نماند

<u>بحرِ منسرح مثمن مطوی منحور</u>: (مفتعلن فاعلاتُ مفتعلن فع)

اس بحر کے تیسرے رکن (مفتعلن) کو جو مطوی ہے اس کے سالم رکن (مفعولات) کے مطوی مسکن زحاف (مفعولن) سے بدل دیتے ہیں۔ اس کے بطور رودکی سمرقندی کا شعر پیش کیا جاتا ہے:

مادری را بکرد باید قربان   بچۂ او را گرفت و کرد بزندان
مفتعلن فاعلات مفعولن فع   مفتعلن فاعلاتُ مفتعلن فع
مادری رابکرد بایدقر با   بچۂ او راگرفت کردبزن دا

ان کے علاوہ چند نادرالاستعمال بحریں اور ان کے متفرعات بھی ہیں جن میں تبدیلی زحاف کا عمل فارسی عروض میں روا اور جائز ہے۔ ان سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

یہی ترمیم شدہ عروضی روایت فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی جس میں مختلف الوزن شعر کہنے کا جواز موجود ہے۔ اس عہد ابتدائی دور کے بعض اردو شاعروں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً شاہ حاتم جن کا درج ذیل شعر بحرِ رمل مثمن میں ہے اور اس کے ارکان: سالم مخبون محذوف مسکن اور سالم مشعث مخبون محذوف ہیں:

جوش بے کل جو مرے دل سے نکل جاتا ہے   جبکہ وہ ساغرِ انکھیاں کا دکھاتا ہے مجھے

فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن　　　فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

چھوڑ دیا کل مجھ کو جلا۔ یہ نکل جاتا ہے　　　جھک کے ساغر اٹھا کے دکھاتا ہے مجھے

مختلف الوزن اشعار سودا اور مصحفی کے کلام میں بھی خال خال موجود ہیں۔ اردو میں یہ روایت زیادہ عرصے تک قایم نہ رہ سکی۔ اردو شاعری نے بہت جلد اس سے دامن چھڑا لیا۔ لگ بھگ دو صدی سے اردو کا قاری وزن میں خلل پیدا کرنے والے زحافات سے پاک مستعمل اور متحد الوزن اشعار پڑھتا اور سنتا چلا آ رہا ہے اور اس کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ وزن کا غیر محسوس فرق بھی اس کی موزونیِ طبع پر گراں گزرتا ہے۔

اس تناظر میں "امیر خسرو کے غیر مطبوعہ مقطعات" میں مشمولہ مختلف الوزن مصرعوں کے حامل اشعار کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ فارسی زبان و ادب کے وہ قاری جو اس عروضی نکتے سے لاعلم ہیں، انھیں بحر و وزن سے خارج نہ سمجھ لیں۔ اشعار قطعہ نمبر اور شعر نمبر کی صراحت کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں:

گر آنچنانی کو گویدت زراست چہ رنجش　　　در آں زبی کہ ترا گفت از دروغ چہ رنجی (ق - ش)

یہ شعر بحر مجتث مثمن میں ہے۔ اس کے معینہ ارکان "مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن" (دو بار) ہیں۔ لیکن اس شعر کے مصرعِ اول کا دوسرا رکن "فعلاتن" کے بجائے "مفعولن" ہے جو رکن سالم یعنی فاعلاتن کا مشعث زحاف ہے۔ اس لحاظ سے دونوں مصرعوں کے ارکان کی صورت اور تقطیع حسب ذیل ہے:

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلاتن　　　مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعِلاتن

گر آنچنا نی کو گو یدت زرا ست چہ رنجش　　　در آن زبی کہ ترا گف ت از درو غ چہ رنجی

(مخبون مشعث مخبون مخبون　　　مخبون مخبون مخبون مخبون)

پہلے مصرعے میں "راست" کا آخری حرف (ت) ساقط ہے۔

عروض و ضرب میں زحاف کی تبدیلی کے ساتھ اسی بحر یعنی "مجتث مثمن" میں سات شعر ہیں جن کے مصرعے "مخبون" کے بجائے "مشعث" زحاف لانے کی وجہ سے متحد الوزن نہیں ہے۔ زحافات کی نوعیت کے لحاظ سے انھیں پانچ شقوں میں درج کیا جاتا ہے:

(الف) بگفت شیریں نتواں چو دفع دشمن کرد　　　مگوی تلخ کہ زخم زباں کند جاہل (ق - ش)

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعْلان　　　مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلن

بگفت شی ریں نتوا چو دفع دش من کرد　　　مگوی تل خ کہ زخمی زبا کند جاہل

(مخبون مشعث مخبون مقصور مسکن　　　مخبون مخبون مخبون مخبون مسکن)

(ب) (۱) گرت جیب نبود روا است دیدن سخن ۔ چو داری که آنچه گوشت شنیده بر خلاف است (ق۔ ش)

(۲) تو هیچ دانی گر تو پیمبر و ای عمر ۔ بدانند که خلائقش کھا یق دادست (ق۔ ش)

(۳) دهنده آن را احسان شمار و دو خیاط ۔ گمان مزد برد چه بل بغیر طمس ست (ق۔ ش)

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان ۔ مفاعلن فعلاتن۔ مفاعلن فعلان

(۱) گرت تمی سر نبود رواس دی دن رنج — ی داری آ نچه گوشی دنت ئی بر جادست

(۲) تو هیچ دا نی گر تو پیا میبرد ای عمر — بدا ندا کہ خلایق کھا یق دادست

(۳) دهندَ آ را احسا شما ردد خیاط — گمانِ مز د برد چه بغیر طم ست

(مخبون مشعث مخبون مقصورِ مسکن — مخبون مخبون مخبون مقصورِ مسکن)

شعر (۱) کے مصرع اولی اور شعر (۲) کے مصرع ثانی کے آخری رکن صرف "مقصور" ہیں مسکن نہیں۔ شعر (۱) کے مصرع اول میں "رواست" کا "ت" ساقط ہے

(ج) اگر توانی با منعمان تکبر کن ۔ کہ کبر بر سر درویش جمله را باشد (ق۔ ش)

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن — مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

اگر توا نی بامن عما تکب بر کن — کہ کبر بر سر دروی ش جمل را باشد

(مخبون مشعث مخبون محذوف مسکن — مخبون مخبون مخبون محذوف مسکن)

(د) بخور بشادی و زافلاس غم مخور که بغم ۔ کسی نبندد آن در که رزق بگشادست (ق۔ ش)

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن — مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان

بخور بشا دیُ زفلا س غم مخر کہ بغم — کسی نبن دد آ در کہ رزق بگ شادست

(مخبون مخبون مخبون محذوف — مخبون مشعث مخبون محذوف مسکن)

"زافلاس" میں افلاس کا الف "الف وصل" ہے۔ اس کے سقوط سے "ز" "فلاس" کے ساتھ مل گیا اور "زفلاس" باقی رہ گیا

اس شعر کے مصرع دوم کا رکن دوم "مخبون" کے بجائے "مشعث" ہے۔

(ھ) ہزار چوگاں دیدم شکست بریک گوی ۔ کہ گوی مسکیں خود ہمچناں درست بماند (ق۔ ش)

مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان — مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلان

ہزار چو گا دیدم شکست بر یک گوی — کہ گوی مس کی خد ہم چنا درس ت بماد

(مخبون مشعث مخبون محذوف مسکن — مخبون مشعث مخبون محذوف)

شعر کے قافیے "بیابانم" میں نون غنہ تقطیع میں ساقط ہے۔ اس شعر کے دونوں مصرعوں کے دوسرے رکن مخبون (فعلاتن) کے بجائے مشعث (مفعولن) ہیں۔

درج ذیل شعر بحر مضارع مثمن کے متفرعات میں سے ہے۔ اس کے مزاحف ارکان اخرب مکفوف مکفوف محذوف (مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن) ہیں۔ جب اس کے رکن دوم "فاعلاتُ" کو جو فاعلاتن کا مکفوف زحاف ہے رکن سالم (فاعلاتن) سے بدلتے ہیں تو رکن سوم "مفاعیلُ" بھی جو مفاعیلن کا مکفوف رکن ہے اخرب زحاف (مفعولُ) سے بدل جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

خواہی نوای دنیا یا برگ آخرت ‌‌ ‌ ‌ برگی ہمی رساں بفقیران بی نوا (ق۔ ش[۱])

مفعولُ فاعلاتن مفعولُ فاعلن ‌ ‌ ‌ مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن

خاہی نَ وای دنیا یا برگ آخرت ‌ ‌ ‌ برگی ہَ می رسا بَ فقیرا نِ بی نوا

(اخرب سالم اخرب محذوف ‌ ‌ ‌ اخرب مکفوف مکفوف محذوف)

درج ذیل شعر بحر رمل مثمن میں ہے اور اس کے مزاحف ارکان "مخبون مخبون مخبون مقصور" ہیں لیکن شعرا بالعموم پہلا رکن سالم (فاعلاتن) لاتے ہیں۔ اس شعر میں پہلا رکن سالم ہے۔ اس میں مصرع ثانی کا رکن دوم مخبون (فعلاتن) کے بجائے مشعث (مفعولن) لایا گیا ہے:

آنکہ دشوار نمود یش بسر نازکسی ‌ ‌ ‌ گل نمود او را خروار مغیلاں بر سر (ق۔ ش[۲])

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ‌ ‌ ‌ فاعلاتن مفعولن فعلاتن فعلن

آنک دشوا ر نمودی ش بسر نا زکسی ‌ ‌ ‌ گل نمود و راخروا ر مغیلا بر سر

(سالم مخبون مخبون محذوف ‌ ‌ ‌ سالم مشعث مخبون محذوف مسکن)

دوسرے مصرعے میں "او" کا الف (جو الف وصل ہے) ساقط ہو کر نمود کے دال کو واو سے ملاتا ہے ۔۔۔ مصرع اولیٰ کا چوتھا رکن "محذوف" ہے جبکہ مصرع دوم کا چوتھا رکن "محذوف مسکن" ہے۔

حواشی:

۱۔ تاریخ ادبیات در ایران جلد اوّل، دکتر ذبیح اللہ صفا، ص ۳۶۵ ۲۔ برگزیدہ قصاید بہار، سازمان کتابہای پرستو، ۱۳۴۵ خورشیدی، ص ۱۹۶

۳۔ ایضاً ص ۲۰۲ ۴۔ ایضاً، ص ۲۰۵ ۵۔ ایضاً، ص ۲۰۶ (مصرع اوّل کا آخری حرف "ت" ساقط ہے)

۶۔ سخنوران ایران در عصر حاضر، جلد اوّل، ڈاکٹر محمد اسحاق، کلکتہ، ص ۱۰۳ ۷۔ برگزیدہ قصاید بہار، ص ۲۳۹ ۸۔ منتخب اشعار رودکی مرتبہ ۔۔۔ چاپ تہران، ص ۲۰ ۹۔ انتخاب حاتم، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، دہلی ۱۹۲۲، ص ۱۲۳

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو • من موہن کی باتیں [illegible] • صراطِ مستقیم [illegible] • قطعات دلدار [illegible] • قومی یکجہتی کی روایات [illegible] • اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر [illegible] • داستان میری [illegible] • [illegible] • طلسم ہوشربا [illegible] • شخصیات و واقعات [illegible] • تحفۃ السرور [illegible] • ہندوستان کی آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ [illegible] • اقبال نامہ [illegible] • شریمد بھگوت گیتا [illegible] • لیلیٰ کے خطوط [illegible] • حکایاتِ لقمان [illegible] • [illegible] خدا بخش جنوبی ایشیائی • علاقائی سیمینار [illegible] • ہندو دھرم [illegible] • بھگوت گیتا [illegible] • اردو لٹریچر [illegible] • اردو ہندی ہندستانی [illegible] • ہندی لٹریچر [illegible] • تاریخ [illegible] • سائنس [illegible] • مجالس الشعراء [illegible] • ہندوؤں کے افکار [illegible] • محبوب الالباب [illegible] • ڈاکٹر ذاکر حسین [illegible] • پٹنہ کے کتبے [illegible] • ہندوؤں کے تہوار [illegible] • اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں [illegible]

مطبوعات فارسی • قطعات حسرت [illegible] • کنز التواریخ [illegible] • مجالس النفائس [illegible] • بہارِ معانی [illegible] • فرہنگ [illegible] • دیوانِ حافظ [illegible]

مطبوعات ہندی • من موہن کی باتیں [illegible] • دلدار کے دوہے [illegible] • اورنگ زیب: ایک نئی درشٹی [illegible] • بھارت میں قومی ایکتا کی پرمپرائیں [illegible] • مولانا آزاد کی یادیں [illegible] • اقبال ہندوستان اور پاکستان [illegible] • [illegible] • خدا بخش لائبریری ایک پریچے [illegible] • گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا [illegible]

مطبوعات انگریزی • ایک مشرقی کتب خانہ [illegible] • اسلام اور ہندوستانی تہذیب [illegible] • صوفیا کے مکتوبات اور ملفوظات: پروفیسر سید حسن عسکری [illegible] • مجموعہ مقالات: پروفیسر سید حسن عسکری [illegible] • بہار عہد سلطنت اور مغل دور میں [illegible] • مشرق و مغرب [illegible] • خدا بخش [illegible] • حضرت امیر خسرو [illegible] • فارسی ادب میں ہندوستان کا حصہ [illegible] • وہابی تحریک [illegible] • ٹیپو سلطان [illegible] • [illegible] • پٹنہ کے کتبے [illegible] • ہندوستانی تاریخ و تہذیب [illegible]

13. ibid., p. 126. An incident of how Jinnah kept the *Mullahs* at bay eve late as 1946 has of late come to light in a recent publication (Dr. A Iqbal; *Islamisation of Pakistan*; Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi; (198 25). Veteran League leader and a senior Minister of the martial administration of Pakistan in 1984, M.A. Haroon has informed writer that in 1946, once when Jinnah was told that he was b criticised by the *Ulema* for avoiding the expression *Shariah* (Isl Law) while talking generally of Islam, he retorted sharply, "Wl *Shariah*? Hanafis? Hambalis? Sha'afis? Ma'aliks? Ja'afris? I d want to get involved. The moment I enter this field, the *Ulema* will over for they claim to be experts and I certainly don't propose to h over the field to the *Ulema*. I am aware of their criticism but I d propose to fall into their trap."
14. op. cit., p. 55. But Chagla probably did not know that Jinnah had c interest in acting. In fact he had given up his plan of joining public s in England even after qualifying himself as a Barrister on account o intervention of his father and enjoyed reciting Shakespeare after a d hard work as a lawyer and politician (Wolpert; op.cit., p. 14).
15. op. cit., p. 121.
16. 14.6.1981.
17. Vasant T. Kripalani; "Jinnah's Last Legal Battle"; 27.3.1983.

(Source : Qaid-i-Azam: Muhammad Ali Jinnah and the Creation of P tan by S.K.Bandopadhaya, New Delhi, 1991)

eator of the theocratic state of Pakistan, is probably one of the very w enigmas of history.

An inquiry into the roots of this unbelievable and yet true fact of story appeared to me very fascinating. Therefore, ever since I read the ticle by Shiva Rao, a fresh study of Jinnah became almost an session with me. The following pages are the result of that pursuit.

References

1. *This is erroneous, as Jinnah left the organisation after the Nagpur* Congress of 1920.
2. *An Autobiography*; The Bodley Head, London (1955), p. 67
3. Quoted by Hector Bolitho, *Jinnah*; John Murray, London (1954); p. 197.
4. ibid., p. 161.
5. B. Shiva Rao, *India's Freedom Movement*; Orient Longman (1972).
6. ibid., p 125. Gandhi also admitted of this to Lord Casey (December 6, 1945) Manserg, N (Ed), *The Transfer of Power (T P)*, London, Vol VI; p 617. Also see Seervi, H.M., *Partition of India Legend and Reality*; Bombay (1988); pp 13-4.
7 ibid., p. 126
8. Raja of Mahamudabad, *Some Memories*; Quoted by Stanley Wolpert, *Jinnah of Pakistan*, Oxford University Press (1984), p. 79.
9 Ansar Harvani; *Before Freedom and After*; New Delhi (1989); p 70.
0 This is what M C Chagla, his one-time close associate has to say on this topic (*Roses in December*; Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1973). "He had hard and harsh things to say about Gandhiji, Nehru and others, but as far as Gokhale and Tilak were concerned, Jinnah had the most profound admiration and respect for them and their views" (p 14) Chagla has also narrated the story of writing a scathing remark on the circular circulated in the Bombay Bar for honouring Justice Davar for being conferred knighthood Jinnah commented that the Bar should be ashamed of this proposal as the Judge had convicted Tilak to six years' rigorous imprisonment. He refused to rescind his stand even after the Judge personally talked to him Such was his independent spirit and regard for Tilak (ibid , p. 15)
1. Jinnah married Rattanbai or Ruttie, the daughter of a Parsi noble, Sir Dinshaw Petit, on 19.4 1918 against the wish of his father in-law. Thus inter-communal marriage also indicates his modern and unprejudiced mentality. However, this was his second marriage, his first wedlock being solemnised with Emibai at the age of 16, before he left for England. But she also died early, before the return of Jinnah from England.
2 ibid., p. 125.

Jinnah, reports of the reaction of Jinnah on that occasion: "That was th only time when I found Jinnah 'betraying some shadow of huma weakness: there were actually tears in his eyes."[15] In an article in th *Express Magazine*[16] it is narrated how Jinnah would summon his truste chauffeur, Mohammed Hanif Azad, at the dead of night and ask him t open the wooden chest containing his dead wife's clothes and look a them as they were spread on the carpet. "He would gaze over them fo long with eloquent silence. Then his eyes would moisten."

Jinnah's biographer, Hector Bolitho, has written of Jinnah's love o the company of the young, "a manifestation of the frustrated fathe instinct in a solitary, ageing man." Citing one incident he says tha Jinnah "could not sleep" because, as he told a friend's son and hi companion who were his guests, "you are going away tomorrow." Further, his biographer adds, long after Jinnah had become a celebrity, he thought nothing of going through a crowd to a toy shop to buy a rocking horse for a friend's son.

In another article published in the *Express Magazine*[17] the writer narrates how Jinnah, the then outstanding public figure had found time to go to Agra amidst his busy schedule with a view to defending a young man in the court of a City Magistrate, five years after he had given up his lucrative practice in the Bombay High Court. Some remarkable aspects of his personality are revealed from the story told by Vasant Kripalani.

It was in late (October) 1942, when he was being dubbed as anti-Hindu, Jinnah, being persuaded by Kripalani, the son of a Hindu acquaintance from his home-town Karachi, took pity on a Hindu businessman and defended his son in the court, whom the then army and civil officers intended to crush for his not yielding to their pressure for greasing their palms. Jinnah's valet in those days was Bhagwan Dhondle, another Hindu and as reported by Kripalani, the Quaid-i-Azam "was very dependent on him and he was his constant companion." Kripalani adds further that with a view to helping him (Kripalani) Jinnah engaged him as his personal assistant and Kripalani gave up the job subsequently on his own volition.

I am sure many such incidents on the human side of Jinnah could be unearthed. But that is only incidental and not the main topic of this study. That a political leader of Jinnah's stature with his modern mentality, nationalist background and razor-sharp intelligence would become the rallying point of the Muslim separationists and would be the

occasions only. He used to feel more comfortable in Western dress. Gokhale used to say of Jinnah that he was the greatest advocate of Hindu-Muslim unity. Jinnah also had the highest regard for Gokhale and Tilak, and he defended the latter in the court gallantly when Tilak was charged with sedition.[10] Same was the view of Sarojini Naidu about the early phase of Jinnah's political career. It is strange that such a man should propound the Two-nation Theory in the Lahore session of the Muslim League in 1940 and spearhead the movement for Pakistan for the next seven years with utmost diligence to become later on the father of the nation of Pakistan, the sovereign state for the Muslims carved out of India.

Jinnah had scant respect far the Muslim obscurantist sentiments of his time and allowed his wife,[11] devoid of *purdah*, to be present in public places. Had she not become a victim of melancholia, left her husband and died in harness, Mrs. Jinnah might have become one of the leaders amongst the Muslim ladies of India working for modernism. B. Shiva Rao has reported about a conversation of Jinnah with Horniman, the then editor of *Bombay Chronicle*: "... the sect amongst the Muslims to which he belonged believed in the ten Avatars and had much in common with Hindus in their inheritance laws and social customs."[12] And there is nothing unusual in this inasmuch as most of the Muslims in India are converts from Hindus and it is but natural that they will retain some of their old habits and customs even when they have embraced a new faith. Jinnah was so much devoid of religious dogma that in 1924 he could propose in a light vein to Sir Tej Bahadur Sapru: "I think I have a solution for the Hindu-Muslim problem. You destroy your orthodox priestly class and we will destroy our Mullahs and there will be communal peace."[13]

Jinnah the man, as depicted in the contemporary press, appeared to be matter-of-fact, egoistic, haughty, highbrow, a resident of ivory tower and devoid of human sentiments. Even his one-time close associate M.C. Chagla has opined: "I have never come across any man who had less humanity in his character than Jinnah. He was cold and unemotional and apart from law and politics he had no interest."[14] But was he really so? Were there no occasions when he would react as a normal human being, full of sentiments and who wanted to love and be loved? A few facts have come to light recently which prompt us to reconsider alleged image of Jinnah, the cold and aloof person.

Chagla, who had the rare privilege to witness the last rites of Mrs.

year 1969, after I read an article by the eminent journalist and later parliamentarian, Shri B. Shiva Rao, in the *Statesman* of Calcutta. Th article was later on published in a book.[5] Shiva Rao had intima relations with the national leaders of his days. He recorded a discussio which he had with Jinnah in the early twenties as follows: "Gandhi Non-cooperation movement he considered to be dangerous for the sam reason that Mrs. Besant and the Liberals did; and he was particular apprehensive about the repercussions on Indian Muslims of the Khilaf movement. The enrolment of the ignorant and fanatical Muslims in th movement struck him as extremely unwise."[6] In support of the propos of Motilal Nehru for a Round Table Conference addressing the rulers i 1925 he stated in the Imperial Legislative Council: "India is not a natio we are told. We were a people when the Great War was going on and a appeal was made to India for blood and money.... We were not a people nor a nation when we ask you for a substantial advance towards responsible government and parliamentary institutions."[7]

As is known, Jinnah, the liberal and constitutionalist, dissociated himself from the Congress after its Nagpur session of 1920 on account of his disagreement with the programme of non-cooperation of Gandhi. In 1925 when the young Raja of Mahamudabad told him that he considered himself a Muslim first, instantaneous was the retort of Jinnah—no, he should consider himself "an Indian first, then a Muslim".[8] That he was nationalist to the core and exhorted for working for Hindu-Muslim unity at least until the middle of thirties, cannot be disputed even by his worst critics.[9]

I had it from a very respected and nonagenarian leader in the field of Gandhian constructive work in West Bengal that in their youth, i.e. in 1915-16, they got the inspiration of nationalism, *inter alia*, from the speeches of Jinnah, which used to be published in pamphlet form by the Nateshan Company of Madras during those days.

An eminent disciple of Dadabhai Naoroji and Phirozshah Mehta, Jinnah was not only an outstanding barrister of his time, he was also modern and up-to-date right from his dress to food-habits, speech, mannerism, and etiquette. He did not care to observe the rituals of the Indian Muslims of his day, like saying of regular prayers (Namaz), growing of beards, etc. In the choice of his food and drinks, he paid scant attention to the prevailing Muslim taboos. Shalwar-Kurta, the dress of the Punjabi Muslims or the so-called Jinnah cap was adopted by him as late as 1937 and those too were put on by him on ceremonial

For me this was indeed a discovery about Jinnah. To the best of my knowledge that speech was not reproduced by the contemporary nationalist papers, which I used to read. Even if it had been, somehow it escaped my eyes. Hansu Kevalramani's quotation of Jinnah prompted me to reconsider my assessment of that leader. I felt, a person holding such views could not be dubbed as communal.

In another instalment of his article Hansu Kevalramani reported that soon after the creation of Pakistan Jinnah tried to have a *rapprochement* with the Frontier Gandhi, Khan Abdul Ghaffar Khan, as he was feeling suffocated in the company of the persons with whom he was surrounded after he had become the head of the newly created State of Pakistan. But the deteriorating condition of his health from July 1948 onwards leading ultimately to his death on September 11, 1948 did not permit him to fulfil his wish.

Maulana Abul Kalam Azad's *India Wins Freedom* published in 1959 also gave me food for thought regarding the responsibility of partition of India. Maulana Azad is on record that the elections of 1937 in U.P. were fought by the Congress and Muslim League almost jointly with tacit understanding that if the two parties combined got a majority, the League will have its due share in the ministry. But when the time came, U.P. Congress leaders, including Nehru, would not honour the previous commitment and demanded that the League members of legislature should give up their identity to have representation in the cabinet. Naturally the negotiations fell through. Commenting on this episode the Maulana observed: "If the U.P. League's offer of cooperation had been accepted, the Muslim League Party would for all practical purpose have merged in the Congress Jawaharlal's action gave the Muslim League in U.P. a new lease of life. All students of Indian politics know that it was from U.P. that the League was reorganised. Mr. Jinnah took full advantage of the situation and started an offensive which ultimately led to Pakistan."[4]

Maulana's book is dedicated to his "friend and comrade" Jawaharlal Nehru and was published while he was alive. Nehru did not contradict the observations of Maulana. Nehru committed a similar blunder leading to the final break with Jinnah in 1946 also. However, I shall deal with that important phase of Indian history in some further detail later on.

But my real study of Jinnah began during the Gandhi Centenary

Quit India movement in my humble way, I used to consider Jinnah to be a traitor on account of the attitude of the Muslim League towards the movement. During 1946–47 I was a full-time Congress worker and was a close observer of the great drama on the national scene—achieving of independence along with the partition of the country. The negative role of Jinnah in those historic events led me to consider him as the villain of the piece, like many other compatriots of mine.

I had, however, come across the following observations of Jawaharlal Nehru on Jinnah:

> A few old leaders, however, dropped out of the Congress after Calcutta,[1] and among these a popular and well-known figure was that of Mr. M.A. Jinnah Sarojini Naidu had called him the 'Ambassador of Hindu-Muslim Unity', and he had been largely responsible in the past for bringing the Muslim League nearer to the Congress.[2]

But I missed the significance of the foregoing remarks, maybe, on account of the emotionally surcharged atmosphere of the early forties, and Jinnah's image with me continued to be that of a reactionary communalist.

It was during the first half of the fifties that I had the opportunity of coming across the "other side" of the personality of Jinnah for the first time. Hansu Kevalramani used to contribute a regular column captioned "Pakistan X-rayed" in those days in the weekly *Vigil* founded by Acharya Kripalani. In one of his articles he quoted the first speech of Jinnah delivered in the Constituent Assembly of Pakistan on the fourth day of his final departure from India in the background of the devastating carnage of both the Hindus and Muslims. In that speech on August 11, 1947, Jinnah said:

> You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other place of worship in the State of Pakistan. You may belong to any religion or caste or creed—that has nothing to do with the fundamental principle that we are all citizens of one State. Now, I think, we should keep that in front of us as our ideal and you will find that in course of time, Hindus will cease to be Hindus, and Muslims will cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the State.[3]

Gandhi has been my beacon-light since my youth. And yet I have ventured to undertake this study of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah, his political adversary. I, therefore, owe an explanation to my readers for this seeming "contradiction" of mine.

The main reason lies in the teachings of Gandhi. He was a seeker after truth. In his search for truth he did not hesitate the least to expose his most hidden weaknesses before the public. The readers of his *Autobiography* are aware of the outstanding role of truth in his life. Public figures in general and those in the field of politics in particular, adopt the stance of Caesar's wife and are deeply concerned to maintain that image. Or else, they may lose their popularity. For, popularity and public support are the kingpins in the career of any political leader. Gandhi was probably the only political leader who could declare in the height of the movement initiated by himself that he had committed a "Himalayan blunder" by launching the said movement. Many such instances could be quoted from his life.

The political consciousness of the present writer started taking shape around 1939. The Muslim League and its leader Jinnah were being condemned severely in those days on the various platforms of the Indian National Congress, the body representing the aspiration of that section of Indians who were working for the freedom of the country. The "nationalist press" also did not lag behind in spitting venom against the League and its stalwarts for what it considered to be their 'dog in the manger' policy, Needless to mention that I was also influenced, like other countrymen of mine, by those criticisms. Gradually I began to believe that Jinnah was out-and-out communal and was acting in accordance with the dictates of the British imperialists and for upholding their interests. In fact, in 1942, when I participated in the

On Muhammad Ali Jinnah

Sailesh Kumar Bandopadhaya

"So let our misguided countrymen understand that by their insensate action they are at once denying nation, God and man."

But this is a dismal note on which to end this chapter. So let us lift up our eyes to the heights reached by the spirit of our President. Addressing the Hindu Vishwa Dharma Sammelan, a conference of Hindu religious leaders, Dr Radhakrishnan exhorted them as follows:

"The one fact of our age is the confrontation of different cultures and different religions. Once upon a time we used to have religions working on parallel lines without much influence on one another. Today we are thrown together. The world has become a physical unity. There is nearness and neighbourhood. But it should become an integrated entity.

"How have religions been functioning? When you emphasise the formal aspects of religion, they divide the world. When you emphasise the inner, the deeper spiritual side of religion, they unite the world....

"Anyone who believes in God will not adopt attitudes which we sometimes adopt. We have to scrutinize ourselves, examine ourselves, ask ourselves every day a question whether we are trulv believers in God or merely counterfeit believers...

"I do hope if our religion rids itself of these pernicious practices which in the growth of centuries have come about, ... it will be able to tell people that here is a religion which has allowed peaceful friendly cooperation among all. .."

(Source : In Different Saddles by M.R.A.Baig, London, 1967, pp.128-179)

as Mrs. Indira Gandhi; and valiant crusaders such as Mr. Jayaprakash Narayan. Courageous, indeed was 'J.P.'s statement after the terrible communal riots that broke out in Jamshedpur and neighbouring areas in early 1964.

"The recent and recurring outbursts of sudden and cruel violence against Muslim citizens of this country and retaliatory punishment for the acts of Muslim citizens of Pakistan are a matter of the gravest anxiety for every thinking Indian.

"If Indian Hindus kill Indian Muslims for no other reason than that Pakistani Muslims have killed Pakistani Hindus, it is (among other things) a complete vindication of the two-nation theory. It simply means that we affirm in action what we loudly repudiate in words. It should be clear that such a split state of mind can have only one result; gradual undermining of the very basis of our nation.

"Sometimes the current incidents are excused in the name of Hinduism. As a Hindu who is proud of his religion, I cannot think of a greater blasphemy than to clothe these crimes that degrade man with the sanction of 'dharma'. Whatever of 'dharma' is left in the present atmosphere of creeping materialism, benumbed ethical sensibility, pseudo-science and undigested vulgar modernism would surely bleed to death if brother continues to knife brother only because he worships God differently.

"The future of the human race is in unity. Both science and the spirit of man point in that direction. Everything that stands in the way—nation, race even religion (if it is divisive, which true religion cannot be) will have to go. India with her great tradition of universalism, her humanism, was expected to play a significant role in this process of history. But these recent events, portents as they are, threaten to strangle that precious plant of our culture which produced even in the days of decline such beautiful blossoms as Tagore and Gandhi.

But no ambassador, Muslim or non-Muslim, can proje his country other than as it is, and as long as commun rioting regularly takes place, and trouble flares up in Kashmi from time to time, we should not be surprised if Muslin countries sympathise and even side with Pakistan when force to make the choice. Pakistan is the direct result of Congres leaders underestimating the centripetal force of Islam in Indian politics. The position is of course different, but it would be an equal mistake to underrate the basic fraternity of Islam in international relations. There being, except for neighbouring Nepal, no other Hindu-majority country in the world, it is understandable if this tendency is not fully appreciated by leaders brought up in exclusively Hindu culture.

But the writing on the wall during the Indo-Pakistani conflict was legible enough. Only a truly secular India with its Muslim citizens playing their proper part in all spheres of national affairs and activity will be able fully to tap this huge reservoir of international goodwill.

Western and Christian countries are little concerned with our secularism. In fact, apart from getting their support to our case over Kashmir, the point never arises in our relations with them. But they were greatly impressed and pleasantly surprised by the reception the Pope received in Bombay. Let us be very careful that Goa never becomes a "Christian" Kashmir. If there is unrest among the Goan Christians, this, added to the unrest among the Naga and Mizo Christians, might well make the Christian nations vulnerable to Pakistani propaganda.

But however hard and steep may be the path to secularism that we shall reach it is certain as long as India can produce modern *rishis* such as the President, Dr. Radhakrishnan; profound and liberal thinkers such as the* Vice President, Dr. Zakir Hussain; a prime minister as humanist and secular

* This chapter was already in print when Dr. Zakir Hussain was elected President of India. Rightly hailed as a victory for secularism, it would be a mistake to attach to it undue significance. An important battle has certainly been won. But the war has yet to be.

while I entirely agree with the policy of restraint self-imposed by the press in reporting such happenings, I also feel that its purpose would be defeated if it bred complacency in regard to secularism by us deluding ourselves that communal riots do not take place. One cannot cure a disease without recognising its gravity.

For an ambassador to project India as a truly secular state is therefore by no means easy. My term in Iran was regularly punctuated by communal rioting and some really horrible facts were brought to the attention of the Government of Iran by the Pakistan Embassy. I was constantly being asked if the facts were true by the Prime Minister, the Foreign Minister, by journalists and others, and though I could play down the exaggerations, and play up other favourable factors, the fact that riots could take place so often, with such intensity, and with every evidence of planning and organisation, spoke for themselves.

We attach great importance to Afro-Asian countries but we forget how many of them are Muslim in population and therefore susceptible to be emotionally moved by Pakistani propaganda. Apart from Pakistan itself, they are Indonesia, Malaysia, Afghanistan, Turkey, Iran, Saudi Arabia, Kuwait, Iraq, Jordan, Syria, Sudan, Somaliland, U.A.R., Libya, Tunisia, Morocco, Algeria, Mauritania, 50 per cent of Lebanon, and sizable and influential minorities in Nigeria, Senegal, Guinea, Mali and Sierra Leone.

This brings me to the question of appointing Muslim ambassadors in Muslim countries. It is sometimes thought that this goes against our secular policy. It certainly would if we only posted Muslims in these countries. But, as I have already said, secularism to such countries means the extent the Muslims in India receive good and fair treatment. To project this a non-Muslim is obviously at a disadvantage, whereas a Muslim ambassador is by his very presence a living example of secularism in action. I can say from my own experience that this lesson does not escape notice

communal riots take place and Kashmir remains unsettled. Muslim countries care little whether Kashmir is legally or constitutionally integrated. What matters to them is if it is emotionally integrated; and that a large and influential section of Kashmiris is not most foreign and even objective Indian observers seem to believe. The Indo-Pakistani conflict certainly showed that Kashmiris did not wish to join Pakistan. But that does not automatically mean that we can take for granted their attitude towards India. Fortunately, there are other indications. But a lot of people, too many, remain unconvinced. We must realise that Pakistan has convinced many foreign governments of our inconsistency in accepting the Radcliffe Award in Muslim-majority provinces and not applying the underlying principle to a Muslim-majority state. After all, they argue, the spirit of the agreement was that all Muslim-majority areas, whether province or state, should form Pakistan. This point is easy to counter but such arguments as also clichés like "self-determination" sound very plausible to foreign ears. The result is that no country, except ourselves, considers that Kashmir is "non-negotiable". But what is important is that few credit our attitude to our policy of secularism.

Muslim countries are no doubt impressed by such facts as there being fifty million Muslims in India, that they occupy high positions, and that all are equal before the law. But what worries them are the periodic communal riots which are given the maximum publicity by the local Pakistan embassies. For instance, Iran's sympathy for Pakistan during the recent hostilities was greatly influenced by all the Irani shops in Poona being looted and burnt just a few days before the war started. Several mosques were burnt and order only restored by the Army being called out and the firmest measures being adopted.

The full story of communal riots has never been told in India, and though a friend who has kept a record has shown me some disconcerting figures I do not intend to tell it. But,

ism as conservatism, ethnic-provincialism and casteism. To overcome all these requires the sustained utilisation of all media of publicity, propaganda and education by Government. In this connection the seminar on "Secularism: its implications for Law and Life in India" held in New Delhi in November, 1965, was most commendable. The inaugural speech by the Chief Justice of India, Mr. P. B. Gajendragadkar, was particularly inspiring. The Education Minister, Mr. Mohamed Currim Chagla, always staunchly secular, also made a notable contribution. Such seminars should take place all over India. The more people think, and even argue, on this subject the better. The one thing we should not do is to take secularism for granted as we have done so much in the past.

If I may strike a personal note, how little alert we are to publicise secularism in action was forcibly brought home to me when I was Ambassador in Iran. When I was leaving, the Gurdwara invested me with a Robe of Honour which is perhaps the highest distinction in the power of Sikhs to give. I asked the Embassy Information Officer to inform Government of the event so that it might be suitably publicised. An ounce of example, after all, is worth a ton of precept. He did so, but no action was taken. I thought it a good opportunity lost.

We must be constantly conscious of the image we project abroad and realise that secularism means different things to different countries. Though many countries regarded the caste system and untouchability with horror and welcomed their abolition few are concerned whether India is secular or Hindu. In fact, many would prefer it to be the latter. That Pakistan is Muslim and India is Hindu is easy to understand. But that Pakistan is Muslim and India is Indian is confusing. It is such over-simplification that partially explains the general lack of understanding of the Kashmir question.

The countries which are really concerned are the so-called Muslim countries which are subjected to sustained Pakistani propaganda. Here we will remain on the defensive as long as

if not impossible, for the Muslims of India to be emotionally integrated into the Hindu majority. Here, the solution doe not entirely lie with us. If Pakistan was really sincere abou Islam, it would not, for the sake of three million Muslims i Kashmir, jeopardise the happiness of fifty million in India Sheikh Abdullah might well reflect on the bitter fruits of hi policy.

While Tashkent produced a joint declaration which i certainly a big step in the right direction, it also clearl brought out that a joint agreement over Kashmir is still fa from possible. None should regret this more than Muslin Indians. At the same time they should fervently hope, a should all Indians, that the acts of commission and omissio which took place there do not cancel out each other.

Still another adverse factor is our conservatism. Lik the iceberg which floats with nine-tenths below the surfac we glory in the fact that a similar proportion of our tradi tions, culture, and customs lies below the twentieth-century What is above is looked at askance and condemned as bein "Westernised". The great charge against the "westernised", o as I prefer to call him the "twentieth century" Indian is tha he is "rootless". Though this state has admitted disadvantage it surely has some virtues also. Our roots today are eithe regional, caste or communal, and if secularism is our goal these surely have to be cut and grafts put down into Indian and secular soil. My own experience is that the only truly secular people I know are invariably "modern" Indians, and this, I think, is the greatest justification for "westernisation" "modernisation", "twentieth-century-mindedness", or what ever one may like to call it.

But, unfortunately, being educated is still far from syno nymous with being secular. Too many educated Indians, even if not caste-ridden, are still communal and regional-minded[1]

Indifference and apathy also operate as much against secular

[1]Professors abound in the R.S.S. and a former Rhodes scholar has been elected to the Lok Sabha by the Jan Sangh

it has escaped notice. But no great powers of imagination are necessary to conceive the outcry, in Parliament and press, if the Vice-Chancellor of Aligarh had spoken from the platform of a militant Muslim organisation (not that there are any) Innumerable other such cases can be cited. The existence and the toleration of the R.S.S. itself is one.[1] But any manifestation of Muslim communalism, such as the recent incident in Aligarh University, is, very rightly, universally condemned.

Moreover, as Jabalpur and Poona proved, whereas swift and severe retaliation follows any Muslim misdeed, by the very nature of things similar Hindu acts usually pass without protest.

If further proof of this double standard is needed it was well provided by the eulogies pronounced on the death of Dr. Savarkar. One should certainly speak well of the dead, and he was undoubtedly a remarkable man who did remarkable things. But the central fact remains that his ideology was the very negation of secularism. This, however, seemed to worry none of those who held him up as an example and inspiration for Indians to follow. The Muslim may be pardoned if he asks · which Indians?

In the same way as "cold" war can exist in a state of peace, "cold" communalism, full of prejudices, can, and does, exist in a state of secularism. Great harm is done to both country and community by artificial "Muslim leaders" who pretend that it does not, and who are more "appeasers" than secular.

Another factor against secularism is Kashmir. It is constantly said that this State is the symbol of our secularism. It may be, but it is also a barrier. What is necessary for our secularism is not so much the retention of Kashmir as a settlement on Kashmir between India and Pakistan. As long as there is no such settlement, Pakistan will carry on its anti-Hindu policy. And as long as it does, it will be difficult,

[1]The election of the R.S.S. chief for North India as the Mayor of Delhi has raised no critical comment whatsoever from any of those who so carefully scrutinised the secular credentials of Dr. Zakir Hussain.

service officers, lawyers, doctors, teachers, industriali businessmen, and even clerks and tradesmen. It will be fou that the Muslim participation in gainful occupations wo probably come to less than 5 per cent.

In such circumstances, whoever may be to blame and wh ever may be the reasons, obviously something more is need than incessantly reiterating that all are equal before the la and then leaving things to work out by themselves. This much like highly industrialised nations advocating free tra to newly-emerged countries trying to build up their econom

Here is another case, where some measure of enlighten communalism, Government encouraged, will lead secularism.

The fact is that no Indian who is sure of his own secul ism should fear, or be made to fear, to work where he h the most influence and where he can do the most goo Communalism can certainly be considered as diametrical opposed to secularism, but it can also be a half-way hou towards it. We should never forget the events that led to th formation of Pakistan. Reservation of seats was certainly theory against the Congress doctrine. But I sincerely belie that if the Congress leaders had had the realism to agree t joint electorates with reservation of seats, the demand fo Pakistan would never have arisen. The communal proble then would have been reduced to giving the Muslims enoug confidence to drop even that point. In retrospect, the shor cut to nationalism proved a very long way round.

A factor vitiating secularism is the double standar adopted in many quarters towards Hindu and Musli communalism. To give an example, the Education Ministe Mr. M. C. Chagla, recently had to issue a circular deplorin the appearance of the Vice-Chancellor of a university on th platform of the R.S.S.[1] If anyone criticized the Vic Chancellor, or praised the action of the Education Ministe

[1]The Rastriya Swayam Sevak Sangh: the Hindu Volunteer Corps dedicate to converting secular India into a Hindu State.

leaders can rise with the necessary moral hold over their co-religionists. Moreover, it is impossible to expect them to listen to non-Muslims on such a purely Islamic matter.

If, therfeore, it is thought, and rightly so, that without a common civil code secularism is impossible, a Government wedded to that policy should not adopt the negative attitude of waiting for the Muslims to come round to this view, but should take positive action to bring them around. This necessitates a Muslim-oriented campaign, sponsored by Government, and utilising Muslim lawyers and public men with the objective of convincing the general Muslim public that secularism and a common civil code is in their own interests, and in no way anti-religious in the true sense of the term. Muslims have to be convinced that secularism means anti-communalism not anti-religion. Only other Muslims are likely to do this.

In the economic field, the Muslims are of course, far too numerous, different and dispersed to be really considered a community in the sense that are Christians, Parsees or Sikhs. They have also their wealthy, middle-class and poor in the same way, if not in the same proportions, as other Indians. But taking them as a whole, their position in society and their standard of living are far too low for them to play any significant role on the Indian stage. To rectify this is far too big a task for themselves, and it is for them to take advantage of the opportunities offered in the rapidly developing India of today. But, in terms of secularism, however socialistic we may imagine ourselves to be, it is a fact of life that economic disparity creates a greater gulf between man and man than social origin. And when one is superimposed upon the other the gulf becomes an abyss. To cross this gulf necessitates a very friendly and helping hand from all those in a position to give it. Few may actually deny this hand, but still fewer think of spontaneously offering it.

How much the helping hand is necessary can easily be judged by glancing down any list of Government servants,

psychological changes, and social, economic and educati efforts by the Muslims. For instance, it was the Muslims in the 'fifties, prevented Parliament from passing a civil applicable to all citizens instead of the Hindu Code Bill. Muslims obviously cannot have it both ways. They ca behave as a minority themselves, and then expect the Hin not to behave as a majority. Surely, it is to their advan to end the majority-minority mentality; certainly not perpetuate it. Secularism is meaningless without a comn civil code.

The most superficial examination reveals that if Muslims are backward, and considering them as a whole t are, it is more due to their own failings than to the major not being as secular as it might be. If therefore the Musli are to march in the Indian ranks, and not lag behind, th will have to be shaken out of their present fears, lethar complexes and medieval thinking. But this can only be do by leaders to whom they will listen, and it must be fac that very few non-Muslims have troubled to gain the confidence. A paradox now occurs. If the onus of putti their house in order rests largely on the Muslims themselve then any action to achieve that purpose will superficiall appear to be "communal".

Perhaps I should give some examples to make my meanin clear. In the social sphere, the need for a Governmen inspired Muslim social movement rose when Parliamen passed the Hindu Code Bill instead of, as originally intended a Civil Code Bill governing the personal laws of all Indian of all religions. The Government were of course perfectl correct in not ramming through such comprehensive legisla tion in the face of Muslim opposition. But they were equall wrong in not doing anything afterwards except declaring tha they would wait till the Muslims themselves agreed to such a code. The question arises: who will make them agree? Muslim organisations hardly exist for fear of being labelled "communal", and, in present circumstances, no Muslim

and Muslims firmly stood the Cow. To the Hindus an object of worship—to the Muslims a favourite dish. Thousands were slaughtered daily by Muslim butchers and tens of thousands on Eid days. Cow-slaughter, in fact, played such a disproportionate part in the proceedings of pre-Independence Congress sessions that it assumed an importance next only to the demand for independence. If in spite of all our talk of secularism, and when it is by no stretch of imagination a live issue, disgraceful anti-cow-slaughter demonstrations can take place in New Delhi, as took place on November 7, 1966, the strength of feelings on this subject in the old days can be imagined.

Acquaintanceships may have been many, but friendships few. Through the long centuries, in the closest proximity, no inter-marriages ever took place. No Hindu boy met Muslim girl, or *vice-versa*. A bold glance could lead to bloodshed.

The Muslims, belonging to a catholic religion, of which Hinduism was the exact opposite, and, consequently, more gregarious and cosmopolitan, resented these inhibitions and taboos. But their reactions were not only subjective; they had plenty of positive prejudices of their own. Iconoclasm had always been one of the first acts of Muslim conquering armies, and contempt for the idol-worshipper was always in their subconscious. The word "kaffir" came out readily in moments of heat. They were, more often than not, in the clutches of Hindu money-lenders, and "bania" was too often and too easily applied to Hindus as a whole.

Individually, each nursed his grudges and prejudices; collectively, they assembled apart. The Hindus in the village temples, the Muslims in their mosques. They indeed were side-by-side; but so are the rails of a railway

Even simple dress played its sinister role. I perhaps cannot do better than quote from a speech I delivered and which was later reproduced in the December 1943 issue of *The Indian Journal of Social Work*. It attracted a gratifying amount of attention and my deliberately provocative words raised the

controversy I had hoped they would and made people thi which was the main object of the exercise:

> "Another superficial question about which I hold strc views is the question of dress. I can see no reason w people who need not do it, cling to denominational dre Let me tell you that I feel much more comfortable talki to a Hindu in trousers than in a dhoti or to a barehead Muslim to one wearing a fez. Just think what happens our minds as we go down any main street. We see tv Parsee ladies standing before a shop window; a Borah standing at the door of his shop; three Hindu clerks a walking along, and so on. As long as this mental cens goes on, we cannot help but think on communal lines an communal thinking is the father of communal disharmony Have you ever seen a photo of the Congress Cabinet Because they are dressed differently, the two figures tha stand out are Dr. Gilder and Mr. Nurie. All this is ver unhealthy. Long before we can have a common identit or ideology, we must, at least, have some degree of commo appearance and if you ask me to make a list of singl factors that will contribute to national union, very high in the list will be a pair of trousers."

The effect of the imposition of separate electorates on such a background is well known and needs no repetition. I might add, however, that nothing contributed to the success of the Muslim League and the establishment of Pakistan more than the fact that, generally speaking, to the politically-minded Hindus and Muslims "nationalism" meant two quite different things. To the Hindus it meant the desire for freedom from British rule, not at all necessarily with any changes in the existing social structure, however petrified it might be. To the Muslims, nationalism meant what is now, too late, understood as secularism. The Hindus formed the overwhelming majority and what the majority thought and desired they

tances it would be strange if the colours did not often clash.

The U.S.S.R. is sometimes cited as a country which permits onsiderable latitude to its ethnic minorities. But just below e surface of the apparently different identities is an xtremely close-knit political and administrative system. Is is the case with India ? Even Ministers in the Union Cabinet metimes cannot support policies which are opposed to their ome state's interests. Being elected from their own states, they did not act to some extent as state representatives ey would endanger their re-election.[1]

It therefore seems that while India is too large for a unitary rm of government, at the same time, with our basic ethnic d cultural differences, we cannot afford too great decenlization. It follows that till some political and administrae solution is found a truly composite and secular culture necessary to act as a centripetal force. To develop this ll require much sacrifice, profound re-thinking, and the tisoning of many ingrained habits, beliefs and inhibitions. t one cannot make an omelette without breaking eggs.

So when we talk glibly of secularism we must be clear as what it implies, and be prepared to act accordingly. We en speak of positive neutrality as opposed to negative atrality, between which there is considerable difference. ularism also can be positive and negative. Negative secuism being what prevails today with each variety of Indian e in his own different little slot, whereas positive secularism the other hand implies decommunalising and deprovinlising ourselves. This, even though there will undoubtedly e to be some intermediate stages is, I believe, the secusm towards which we should systematically work and ch is quite possible without in any way interfering with gious beliefs.

Moreover, in the Indian context, secularism should not be

[1] his was brought out dramatically in the General Election of 1967. ly as the result of the Government of India's Hindi policy, not a single ral Minister was re-elected from Madras.

circumstances "*Diversity*" is surely far the stronger sentim

In such a state of affairs appeals are often made to Mus to integrate themselves into the national stream. But wi is the national stream ? In Bombay the Muslims are expe to become Maharashtrians, in Ahmedabad Gujaratis, Madras Tamilians, and so on. Muslims belong to a religi and one might say a culture, both of which are inclus cosmopolitan, and international. To such an extent, in fa that they are often accused of finding it difficult to think terms of nationality. While this is not entirely true, they m perhaps be forgiven if they find it even more difficult to thi and act provincially. The biggest minority in India seems be Indians.

"Hindu-Muslim Unity" and "Unity in Diversity" shou therefore give place to "National Integration", intellectuall and what really matters, emotionally. Though I realise th many very eminent people hold strong views to the contrar trying to rationalise our large-scale tribal difference by slogar such as the former two is surely out of date in the fast shrink ing India and the world of today.

There are, it is true, great and obvious advantages in havin varied characteristics and cultures. It would certainly b perfect if India could be, as a distinguished Indian recently wrote "...like a bouquet of flowers of different colours, shapes and shades. This bouquet is more beautiful than any one of a single type of flowers, no matter how attractive these may be" Agreed. But who is going to collect the bouquet, and from where ? This inspiring concept presupposes one gardener who can not only gather the flowers according to his choice. but, what is more important, decide the colour, shape and shade of those in each flower-bed. But each of our flower-beds has its own gardener who is more interested in his own flower-bed than in the garden as a whole. In such circum-

[1]This Chapter was already in print when the General Election of February 1967 took place. The influence of caste, creed and community on the pattern of voting vividly brought out the extent our diversity exceeds any theoretic unity

later became the University. To term this event, however, as it often is, as a "command performance" would not be fair. The British motives were, as will be seen later, certainly mixed; but the address was drafted by Syed Hussein Bilgrami, later Nawab Imad-ul-Mulk, who was my father's immediate predecessor in the India Council and who was far too eminent a personality to act on anybody's behest. The fact was that separate electorates suited both Muslim and British interests.

One of the tragedies of the British was that however much the Muslims might have genuinely needed help, they could not give it without being accused of "divide and rule". The tragedy of the Muslims was that however much they might have genuinely needed help, they could not ask for it without being accused of being communal, loyalist and reactionary.

We have to thank Lady Minto herself for accusing the British of mixed motives. In her book, *India, Minto and Morley—1905-1910*, she quotes:

> "I must send Your Excellency a line to say that a very, very big thing has happened today. A work of statesmanship that will affect India and Indian history for many a long year. It is nothing less than the pulling back of sixty-two millions of people from joining the ranks of the seditious opposition."

It is perfectly true that the exclusiveness inherent in the Hindu caste-system dug a wide gulf between Hindus and Muslims. If, therefore, the British were really actuated by doing what was best for India, they would surely have attempted to narrow this gulf, and certainly not to stratify it by giving it legislative sanction. But it is sheer escapism to blame the British for Pakistan. The faults that led to it lie squarely on Indian shoulders.

I have always considered as positively insulting the theory that the British partitioned India as the climax of their policy of "divide and rule". This implies that our leaders, such as

Mahatma Gandhi, Jawaharlal Nehru, Vallabhbhai Patel, Rajagopalachari, Jinnah and Liaquat Ali Khan were no better than inanimate pieces of chess which the British cunningly moved about until one fine day they woke up to find the game over and Pakistan in being. The Indian leaders were probably more shrewd than their British counterparts and every move of the latter was not only perfectly understood but, where necessary, such as the introduction of separate electorates, could have been counteracted. It was because we were not big enough to agree on joint electorates that Pakistan exists.

It was not so much that the British divided and ruled as that we were divided, and they ruled. In fairness to them it must be said that they never visualised Pakistan, nor were all their actions on behalf of Muslims motivated by malice aforethought. Some, of course, certainly were, and this lends plausibility to a comforting theory which enables us to shift responsibility and feel less guilty.

So Pakistan was created like Eve, from the body of India. By no means inevitable it became so entirely due to our own failings and faults. In fact, as I have already said, things being as they were, it was perhaps for the best for both countries.

But the tragedy about Pakistan, at least from our point of view, is not its establishment, but its structure. In two halves with little in common between each half, and divided by India at its very widest, a common identity is only possible by creating a defensive psychosis. For Pakistan, therefore, anti-Indianism is a political necessity. If this is understood it will also be appreciated that the Kashmir problem is a symptom and not a disease. If it was solved to Pakistan's satisfaction some other problem would have to be invented. This also is understandable, but what is not is why Pakistan should have taken things to the stage of war. This has harmed her much more than India, and though for the reasons I have stated any close relationship between the two countries was extremely remote, the bitterness created by the war has snapped even the

were left very much like a country after a long war which leaves the population denuded of the flower of its manhood. The vast majority of political leaders, army officers, administrators, doctors, engineers, and other professional men migrated to Pakistan to fill the vacuum that was created there. But they left an equally great vacuum behind which will take years to fill. It is the habit of Pakistani leaders to cite the paucity of prominent Muslims in India as proof of an anti-Muslim policy. They overlook the fact that most of India's senior Muslims migrated to Pakistan and, with the best will in the world, the Government of India cannot manufacture senior Muslims. But this does not mean that more could not have been done than has been done.

The good effect of Pakistan is that with the disappearance of the Muslim League, the Muslims have ceased to be the "problem" community, and considered a disruptive force. Moreover, separate electorates no longer stimulate communalism in both communities, and secularism is gradually taking root.

But, amongst Muslims, the hang-over from the past has not yet dissipated and considerable frustration, by no means without cause, still exists. Even the pale shadow of the Muslim League makes its ghostly appearance now and then. The growing strength of the Jan Sangh also increases their fears. It is one of their tragedies that whenever serious lapses in secularism take place, Muslims cannot object without being considered "communal". Caste, however, is illegal and the humiliating Hindu inhibitions and taboos grow less and less. Cooperative societies have replaced the "bania" and widespread education and greater understanding have revealed to the Muslim "Ishwar" behind the idol's form.

In spite of the circumstances in which Pakistan seceded from India one would have thought that the fifty million Muslims in India would have been a bond between the two countries. But, on the contrary, Pakistan has proved their greatest enemy. Even when she expresses her deep concern

ew bonds that existed. But the point is if Pakistan has been one unit there is no reason why the two countries should not have been the good neighbours they should be.

It may now be asked: what of the Muslims who remained in India after Pakistan was established? Were they not left high and dry and at the mercy of an even greater Hindu majority? In actual fact approximately fifty million Muslims were left by the founders of Pakistan who, after inciting them to a pitch of frenzy, migrated and left their followers in India to fend for themselves. It speaks volumes for the tolerance and faith of the leaders of the Congress that, without hesitation or bitterness, they took every step to afford equal rights and opportunities for the Muslims left in India who were so intimately connected by blood, marriage and, more often than not, by past political associations and collaboration with those who had insisted on a partition of the country, and had, after migration, become the most vociferous critics, and, as the Indo-Pakistan conflict showed, the enemies of the new India.

The Hindus can indeed be forgiven if they thought that the Muslims had it both ways. In Pakistan they did not allow any non-Muslim to secure any place of honour or responsibility, but in India they claimed their share in the name of secularism and democracy. It required immense courage and greatness of mind for Hindus to convince other Hindus that a Hindu State in India was a bad thing, whereas a Muslim State, which the Congress had accepted, was good.

One of the greatest achievements of Jawaharlalji, the Government of India, and the Congress was that they withstood all the pressures which were exerted on them by powerful elements in the Hindu population—including millions of refugees who were ejected from Pakistan—for the creation of a Hindu State as a rival and effective counterpoise to the theocratic State of Pakistan.

The effect of Pakistan on Muslim Indians was both good and bad. The bad effect, apart from the tensions which were created in India by the act of partition, was that the Muslims

over their treatment she does so as a stick to beat the Hindus and not because she is at all concerned about their welfare. If Pakistan was really so she would appreciate that Muslim Indians are the greatest beneficiaries of secularism and would do everything in her power to help it to take root.

Pakistan's policies render her alleged concern over the plight of the Muslims of Kashmir completely hypocritical. As she asserts so loudly and so often she is determined to "liberate" the Muslims of Kashmir from the "dominance" of "Hindu" India. But for three million Muslims in Kashmir she is prepared to endanger the future of fifty million Muslims in India. One cannot believe that she does not fully realise that a plebiscite in Kashmir may well re-arouse some of the passions of 1947

Moreover, quite apart from the feelings aroused by the recent conflict, the history of Pakistan and the memory of the horrors that followed are too recent for the average Hindu to be sufficiently objective to be anti-Pakistani without being, if only subconsciously, to a certain extent, anti-Muslim. Even if he does not associate Muslim Indians with Pakistan, he certainly associates Hindu Pakistanis with India. It follows, as communal riots have shown, that whatever happens to the Hindu Pakistanis often rebounds on the heads of Muslim Indians. It is the "hostage" theory in reverse. For the sake of the Muslims of India, if for no other reason, Pakistan should take the best care of its minority. But she does exactly the opposite and in fact everything to fan into flame latent Hindu communalism.

Why then does this self-professed Islamic country follow such an anti-Muslim course? It can only be, as has been mentioned earlier, that anti-Indianism is about the only force that keeps the two wings of Pakistan together. And this sentiment could not be kept at fever heat if India was secular. Nor could Islam be in "danger" unless India was branded as militantly Hindu and anti-Muslim. In this policy India's fifty million Muslims are clearly expendable.

I HAVE talked a lot about communalism and so now, even if I go ahead of my story, let me say something about its opposite—secularism. All that we have gone through, and may still go through, will have been in vain if we have not grasped the lessons taught by Pakistan's creation, the miseries that ensued, and the bitterness that at present exists. This lesson, I believe, is that heterogeneity to the extent it exists in India is a luxury we cannot afford. Few, I think, will contest that we have far too many centrifugal and fissiparous tendencies to be healthy or safe. I, therefore, no longer believe in Hindu-Muslim Unity, or Unity in Diversity, since these concepts assume the permanent stratification of India's various communities and races, with all their basic differences: religious, geographical or ethnic. Moreover, they imply continuous co-existence on the national plane, and co-existence, however peaceful or happy, is a compromise—not a solution.

In regard to Hindu-Muslim Unity, I do not think anyone seriously expects unity between Hinduism and Islam. What is desired is a sense of oneness between Indians of the Hindu faith and Indians of the Muslim faith. If, therefore, we can learn to think of ourselves as Indians, irrespective of what religion we follow, the question of Hindu-Muslim Unity does not arise. Conceived with the best of intentions and representing the political thinking of that period this slogan contributed greatly to the two-nation theory.

Superficially, "Unity in Diversity" sounds reasonable enough, and one might think that the "Unity" counters the "Diversity" and a balance is thereby attained. But is it? The "Unity" is constitutional and intellectual, whereas the "Diversity" is emotional, linguistic and ethnic. In such

or less. Who can say that once they had gained confidence, the Muslims could not have been persuaded to drop even this point ?

Even then all was not lost. After the Muslim League had won the overwhelming majority of the Muslim seats, it seemed to the Muslim leaders that a National Government could only be a Government that represented Hindus and Muslims and that this happy state of affairs would be brought about by Congress-League Coalition Governments. But glorying in newly-found and long-deferred power, and their desire not to share such power rationalised by the British system of government by the majority party, the Congress repeatedly and resolutely rejected such approaches. Who can say for certain that joint responsibility would not have brought about a joint identity ?

It is easy to be wise after the event, but it seems to one that two or three Muslim seats, and the dropping of a purely British parliamentary practice, would have been a small price to pay for gaining the confidence of the Muslims by associating them with the national effort.

The British would indeed have been a nation of saints incarnate if they had not exploited the situation for their own ends. Arguing once with a Briton he retorted heatedly that it hardly lay in the mouth of a Muslim to criticise separate electorates since it was only that system that had saved the Muslims from being completely swamped by the Hindu mass. There is much force in such an assertion. It is true that separate electorates were introduced by Lord Minto at the request of a delegation of Muslim leaders led by the late Aga Khan. It is also true that, shocked by the force of the anti-partition movement in Bengal, they felt the need for safeguards which separate electorates were designed to be. But anyone who has studied the communal problem knows that the delegation which assembled in Aligarh had its address to the Viceroy approved by a member of the personal staff of Lord Minto, and by Mr. Beck, the Principal of the Muslim College which

considered as democratic. But the Muslims thought that democracy, in the context of the multi-racial and multi-religious social structure of India, should represent the views of the majority of Hindus and non-Hindus and not only of one community, however large. Indian democracy, in their opinion, should represent the views of the cross-section; not of the largest section.

Through such thinking it came about that the most militant Hindu, provided he was anti-British, was considered a nationalist. But the most freedom-loving Muslim, if he dared to suggest that a heterogeneous country's heterogeneity should be taken into political account, was branded a communalist. In fact, what was Hindu was considered Indian but what was Muslim was Muslim. The result of such difference in thinking was that thousands of perfectly patriotic Muslims were driven to despair, to the Muslim League, and eventually to Pakistan.

I have already referred to separate electorates creating the political-Muslim and the political-Hindu. Though in theory there was no reason why a secular political party could not put up candidates for both the Muslim and general seats, practical politics made it inevitable, and to a great extent logical, that there should be a Muslim political party to contest the Muslim seats. Moreover, the Congress at that period may certainly have been nationalist and patriotic, but it was far from secular. Muslim electorates thus brought into being the Muslim League and it can be too easily assumed that this led inevitably to Pakistan. This, however, is not so. The Muslim leaders of that period, mostly moderates, did not think so far or so extremely. Moreover, the more far-sighted of them, amongst whom Mr. Jinnah was prominent, realised that this system condemned the Muslims to a permanent minority status and thus favoured the strong more than the weak. On at least two occasions, therefore, they were prepared to accept joint electorates, but not having confidence in Hindu secularity, asked for the reservation of seats for Muslims. Such promising negotiations broke down over two or three Muslim seats more

considered only as a matter of religious beliefs or attitudes it should apply even more to our ethnic and provincial identities. It is not enough to be secular religiously; we must be secular nationally.

The fact is that too many of us separate ourselves from our fellow-Indians by out-of-date habits and customs. Positive secularism is fundamentally and essentially a matter of individual emotions, and minds and hearts have to be thrown open on a person-to-person basis. The importance of the person-to-person approach and attitude cannot be over-emphasised. Prejudiced words and acts by unthinking individuals sometimes have remarkably far-reaching and cumulative effects. If everyone of us determined that, within our own sphere, we would think and act Indian, communalism, casteism and provincialism would disappear overnight. In the dark days of the Hitler War the British maintained their morale by slogans such as "It all depends on me". In India one is often led to think that it all depends on someone else.

Much has been said of the secularism manifested during the recent attack by Pakistan, and extravagant statements such as a New India being born are being made. All of us should certainly be proud of the spirit that was generated. Muslims in particular should be gratified, even though constant references to them having "proved" their loyalty proved also the basic suspicion that exists. Moreover, in North India at least, the harassment so many experienced, and the ridiculous rumours about them, spread so widely and believed so readily, did not exactly increase their confidence in the fraternal and secular feelings of their fellow-Indians. But, apart of course from those who actually took part in the war effort, the spirit manifested was surely little more than negative secularism in that due to great vigilance by the authorities, and admirable self-restraint by all elements, the expected communal rioting did not take place. The questions now are: will we advance from negative to positive secularism and the formation of an Indian identity?; or will we revert to

the *status quo ante bellum*?

Let me not minimise the secularism that was shown. We certainly proved that we can rise to occasions and form a common front. But I would suggest that to act secularly for a short, emotionally-charged period is one thing; to be secular in thought and deed in normal conditions is another. Time alone will show the depth or the superficiality of the secularism manifested. If it proves as deep as we all hope, the conflict will have been a blessing in disguise. But I am frankly cynical about Pakistan-made secularism. It has to be of Indian manufacture.

We therefore cannot by any means take things for granted and much remains to be done by both Government and the people. Government, in fact, can certainly be accused of the sin of omission. By framing a secular constitution it did the right and proper thing that India's circumstances required. But then it sat back and looked on, satisfied and complacent. It ignored that legal provisions by themselves can no more bring about secularism throughout India than prohibition in Bombay. It also ignored that the psychology of a country does not change by itself but has to be changed by carefully thought-out and energetically carried out direction. Such was the case in practically all newly-emerged countries. Pre-communist China had its "New Life Movement", Egypt and other countries "Ministries of National Guidance". It may be true that such movements were used more to serve political purposes than to bring about national evolution. But at least they appreciated that they should do something. But all we did, till the Indo-Pakistani conflict at least, was to insert some high sounding phrases in a bulky Constitution and to leave it more or less at that. In actuality, the Constitution is certainly secular; the Government of India is by and large secular; but, the war notwithstanding, to say India as a whole is secular is gross wishful thinking.

Secularism therefore requires great psychological changes in the thinking and actions of the majority; and even greater

Partition cut the Gordian knot, and in spite of subsequent history has enabled the two countries to forge ahead according to their respective abilities and resources. The migration of the Muslim League has enabled a national government to be formed. Planning on an all-India basis, which is the only basis for national planning, would never have been possible if there had been Muslim League governments in certain states, suspicious and non-cooperative. Hindi could never have been adopted as the national language as long as the Muslim League was there to advocate Urdu. Even the Hindu Mahasabha, the Jan Sangh and the R.S.S. should be grateful to Mr. Jinnah since only after Pakistan does their dream of Hindu revivalism become possible. What has happened therefore is, I firmly believe, best for both countries. (Only the Muslim Indians have, to some extent, fallen between the two stools.)

The disputes and discussions, however, were mainly among the educated and urban leaders. What of the masses? Did they want Pakistan? India is a country primarily of villages and Hindu and Muslim villagers have lived side by side for centuries. Surely over this long period of time bonds had developed between them sufficiently strong to withstand the incitement and agitation of ambitious politicians?

Alas, no; the bonds between the two communities were of a thinness to be almost non-existent. To understand this we have to examine the Hindu and Muslim ways of life and thought. I may say at once that I speak generally; there were, of course, many exceptions, but they prove no more than that they were exceptions. Moreover, I speak of those days, many years ago now, when there were ripening and festering the sores that ejected the poison of communalism after separate electorates were introduced.

The Hindus, by and large, were prisoners of the caste system. This completely separated them socially from the Muslims from whose hands millions of Hindus could not take even a glass of water, let alone share a meal. Moreover, between Hindus

The Hindus were primarily responsible due to the exclusiveness inherent in their social system; an exclusiveness which placed the Muslim "beyond the pale". In the final analysis, a minority dances to the tune played by the majority. If the majority is secular, so is the minority. If the majority is communal, the minority has to be so in self-defence.

The Muslims could neither forget that they had once ruled India nor forgive the Hindus for outstripping them in all walks of life. Though 95 per cent of them were converts from Hindu stock, they considered themselves as the direct heirs of the glory of the Moghuls and never ceased to bewail and resent their fall from royal estate. As a direct result of this attitude, they sulked in their tents from the fall of the Moghul Empire till Sir Syed Ahmed awoke them by founding Aligarh in 1875 In the meantime, the Hindus, who had no such inhibition, had got a lead which the Muslims could never catch up To this, which was entirely their own fault, the Muslims could never reconcile themselves. No Hindu in their eyes was ever more intelligent or more capable than themselves, he was only more "cunning" or "wily". No Hindu was ever better in business than any Muslim; it was only his "bania mentality". They thus worked up their frustrations into resentment bordering on hatred.

The British, from the time of Lord Minto, exploited these inherent divisions, and Pakistan, even if unforeseen, was separate electorates in their ultimate form

Hindus ploughed the ground; Minto sowed the seed; Jinnah reaped.

As if the attitudes of the three principal parties were not harmful enough, Hindu and Muslim prejudices fed upon each other progressively. The more the Muslim resented and feared the Hindu, the more he leant on the British; the more he leant on the British, the more the Hindu resented the Muslim. Like a Greek tragedy the play grew steadily worse till it reached the stage when partition was the least bad alternative before the country.

From the above it seems clear that the Congress claim to represent both communities was more wishful thinking than real. It, therefore, seems probable that the situation that existed before Pakistan was established would have indefinitely continued. In fact, it would have become worse, for separate electorates steadily widened the gulf between the two communities. The League, by its very composition, was communal. *And the Congress, despite all its ideals and pretensions*, would inevitably have had to become so too. The communalism of the League could not but provoke counter-communalism in the Hindus, and the Congress was having to face the Hindu Mahasabha more and more in fighting the general seats: since the electorate was universally backward and caste-ridden, the Congress would indeed have had little political sense if it had not put up candidates most likely to win the confidence of the electors. It would have thus been forced to move more and more to the *Hindu right since a Hindu* communalist elected on the Congress ticket does not automatically become secular. The gulf, therefore, would, in all probability, have grown wider and wider, with the Congress in power and the Muslim League in perpetual and bitter opposition in Hindu-majority provinces, and the opposite case in those with a Muslim majority. Such a situation could well have disintegrated into chaos, anarchy and even civil war, and all the dire predictions of the Churchillian group of British Die-hards would have been justified.

It may well be asked: how did things come to such a sorry pass? Hindus, Muslims and British must all share the blame. Pakistan was by *no means* a "one-man" achievement and Mr. Jinnah can no more be said to have established Pakistan single-handed than Mr Churchill can be said to have won the War. Neither would Pakistan have been established, nor the War won, if both had not the undisputed confidence of their supporters. Moreover, instead of any "one-man" show, there was, in fact, a regular symposium in creating the conditions that brought Pakistan into being.

That it need not have done so I have already brought out and may be permitted to repeat: Joint electorates might well have brought into being a truly national and secular party, but the Hindu leaders of the day could not see their way to accept the Muslim terms. Even then, at one stage, coalition governments might quite possibly have succeeded, by common endeavour, in creating an identity of purpose which could have led to a measure of integration. But the Congress had firmly rejected this proposal too and there are no grounds to suppose that they would have changed their attitude. There is also no reason to believe that the Congress would ever have been able to prove their contention that it was a party representative of all communities by winning any substantial Muslim support. The Congress-sponsored Muslim mass contact movement completely failed, and the measure of its failure was vividly shown by the results of the general elections of 1945 and 1946.

In the elections to the Central Legislative Assembly in 1945, the Muslim League won every Muslim seat, the Nationalist Muslims forfeiting their deposits in many instances. In the elections to the Provincial Legislatures, the Muslim League's record was as follows:

Assam	Almost all the Muslim seats
Sind	28 seats, Nationalist Muslims and other groups, 4
NWFP	Muslim League 17 Congress 19
Punjab	75 out of 86 Muslim seats, with 4 Independent Muslims joining the League after the elections
Bihar	34 out of 40 Muslim seats
United Provinces	54 out of 66 Muslim seats
Bombay	All 30 Muslim seats
Madras	All 29 Muslim seats
Central Provinces	13 out of 14 Muslim seats
Orissa	All 4 Muslim seats
Bengal	113 out of 119 Muslim seats

As a Muslim Indian with three brothers in Pakistan, who has worked with Mr. Jinnah, and has served the Indian Government, I may be expected to have something to say about the establishment of Pakistan. Many have told, and will tell, a different story. But this is my version.

I read some time ago that well-written book, *The Last Days of the British Raj*, by Leonard Moseley, which gives the impression that the establishment of Pakistan was a fundamental mistake; that it was bulldozed through by Lord Mountbatten with supreme skill; that it was a "one-man" achievement by Mr. Jinnah who died within one year afterwards; and that if partition had only been delayed till then the whole concept of Pakistan would have died soon after him

I might have shared these views once, for, as I have related in the previous chapter, though I was at that time working closely with Mr. Jinnah I was so fundamentally opposed to the concept of Pakistan that I resigned from the Muslim League the very day the Pakistan Resolution was passed. I was certainly at the time greatly disappointed at finding that Indian nationalism was practically synonymous with Hindu patriotism, but the basic agnostic in me recoiled from the concept of a religious State. Furthermore, I thought it more as an escape than a solution, and, finally, I did not think it would work.

But later experience and reflection has changed my mind. The point is: if the partition had not taken place, would Hindus and Muslims have lived and worked together sufficiently closely to enable India to progress? Not, I think, as long as separate electorates continued to produce two irreconcilable parties, and this sorry state of affairs, as far as one can judge, would probably have continued indefinitely

ous with a communal majority, formed purely Congress Governments in the provinces, that he turned to Pakistan.

Coalitions, of course, were not enough, and could only have been regarded as the beginning, not the end. But one cannot help feeling that in order to secure Muslim support through coalition governments, the dropping of political theories such as majority-party governments, would have been a small price to pay. It is true that the Interim Government of 1947, which was a coalition, entirely failed. But it was formed after Pakistan had become the creed of the Muslim League. There is no reason why they should not have succeeded when the Muslim League believed in an undivided India.

But irrespective of whatever has happened his presence in an undivided India might well have raised more problems than it solved. Born in the Khoja community, he refused to follow its spiritual head, the Aga Khan; sprung from humble circumstances, with no one of influence to help him, he rose, in the face of the fiercest competition, to the top of the Bombay Bar; a radical young Muslim, he opposed, almost single-handed, the old conservative and loyalist Muslim leaders; dissatisfied and disagreeing with certain aspects of its policies, he resigned from the Congress; elected to the Legislative Assembly, he was always a prominent Leader of the Opposition. Incapable of playing second fiddle to anyone, he could only have been content as leader of his own party and master of his own house. Pakistan alone provided all that his character demanded. If Mr. Jinnah was necessary for the fulfilment of Pakistan, Pakistan was necessary for the fulfilment of Mr. Jinnah.

ment to the Muslims left in India.

By advancing this argument Mr. Jinnah displayed a cynicism that cannot be too strongly condemned. He was far too intelligent not to have realised that his followers in Pakistan, whom he himself had worked up to a state that they refused even to live in India with Hindus, would not have tolerated Hindus in their midst. And if the Congress and the Hindus were even a fraction as anti-Muslim as he himself had made out, they would hardly become less so after seeing their country divided into two. In the result the Hindu minority in Pakistan is either being driven out or converted. In India many more communal riots have taken place and far more Muslims killed than is generally known. There is no means of knowing how many Hindus or Muslims were taken in by the "hostage" theory. But whoever were must be regretting their gullibility.

But such cynicism strengthens rather than weakens my belief that Mr. Jinnah was and remained an agnostic to the end of his life. Separate electorates were introduced for political reasons; a product of these, he was a political-Muslim; the Muslim community became for him an electoral body; the Muslim "nation", his political following; the battle he fought was political—between the Muslim League and the Congress; and Pakistan was his political demand for the only area over which he and the Muslim League could rule. Religion in all this was incidental.

Pakistan, in fact, never came into his thinking till about 1939. I think he was perfectly sincere round about 1934 when he described Hindus and Muslims to me as two arms of the Indian body. When the Congress formed provincial governments in 1936, he expected them to form Congress-League coalitions, which was his concept of Hindu-Muslim unity. It was only when the Congress, wedded to political theories perfectly applicable to Britain, such as majority-party government, and not recognising that in the context of Indian conditions a numerical majority could be synonym-

secular than his address to the Pakistan Constituent Assembly on August 15th, 1947.

"Every one of you," he declared, "no matter to what community you belong, no matter what your colour, caste or creed is, is first, second and last a citizen of this State, with equal rights, privileges and obligations. . . . While you may belong to one religion or caste or creed, that has nothing to do with the business of the State. We start with the fundamental principle that we are equal citizens of the State. We should keep that in front of us as our ideal In course of time, Hindus will cease to be Hindus and Muslims will cease to be Muslims; not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the nation."

His sternest critic will concede that this was hardly the inaugural speech of a theological state. One may be permitted to wonder what the relations between the two countries would have been if Kashmir had not risen as a barrier between them. In any case, responsibility for the later situation which led up to actual armed conflict cannot be laid at his door Whatever he was, he was never a bigot in the religious sense

But what he did become towards the end was ruthless and cynical. Even if he may have genuinely wished the Hindus in the Muslim-majority provinces to have stayed on in Pakistan, the politician in him did not advance the well-known "hostage" theory purely for their sake. Apart from himself and a mere handful of the more extreme Muslim Leaguers, the Muslims as a whole had never considered Pakistan as more than a bargaining point. When, therefore, they realised that it was actually going to come about, the Muslims in the Hindu-majority provinces were aghast. It was to placate them, and also to ensure their political support, that Mr. Jinnah assured them that the existence of a contented Hindu minority in Pakistan would ensure fair treat-

sidered himself the political leader of the Muslim community, while he thought in terms of undivided India, and of the Muslim nation, when he thought in terms of Pakistan. Islam, as such, came very little into his thinking, and if asked how mere belief in a common faith by people of different ethnic stock could make a nation, he used to reply that America had proved that nationalism was purely subjective. If the Muslims thought themselves a *nation*, they were a *nation*, and that was all there was to it.

His opposition was not so much against Hinduism or Hindus as against the Congress which he considered as the political rival of the Muslim League, which, in its turn, he considered as an extension of himself. He, of course, made much out of Hindu-Muslim riots to prove the incapacity of Congress Governments to protect Muslims ; and also expressed fear of Hindu Raj to frighten Muslims into joining the League, but during innumerable conversations with him I can rarely recall him attacking Hindus or Hinduism, as such. His opposition, which later developed into almost hatred, was concentrated against Congress leadership, and if he used to rail against Gandhiji, Jawaharlalji, etc. it was more as Congressmen than as Hindus. He had innumerable Hindu friends.

It must be admitted that at that period the Congress had some regrettable characteristics. Most non-Congressmen, Muslim or non-Muslim, will probably agree that members of the Congress had developed an arrogance which was unfortunate. In fact, the "holier-than-thou" group, which followed Gandhiji, was far less irritating than the "more-patriotic-than-thou" group which gathered round Jawaharlalji, Vallabhbhai Patel, Subhas Chandra Bose, etc.

It would seem that once free from his hated Congress Mr. Jinnah allowed his basic secularism to rise again to the surface. *Even the intensely communal birth pangs of Partition* do not seem to have killed Mr. Jinnah's basic secularism. It is true, as will be explained later, that his motives were probably mixed, but nothing could be more exemplarily

Rebuffed by the nationalists, among whom was his proper place, opposed to, and by, the Muslim moderates and reactionaries, with whom he had nothing in common, and too fiercely independent to work with the British, he was thrown back on himself. Thus developed the well-known "ego" to which many of his later actions were attributable.

The worst evil of separate electorates was that they created the political-Hindu and the political-Muslim, who were far from synonymous with the religious-Hindu and the religious-Muslim. They divided politics into parliamentary politics, followed by Pandit Motilal Nehru, C. R. Das, Pandit Madan Mohan Malaviya, Mr. Jinnah, etc. and into party politics, such as followed by Jawaharlalji, Sardar Vallabhbhai Patel, Maulana Abul Kalam Azad, and others whose activities were confined to the Congress Party. The Congress, as a party, may have been open to all communities, but, in the parliamentary sphere, election to any legislative body could only be as a Muslim or as a Hindu. Not a Hindu could vote for the most non-communal Muslim, and the most secular Hindus, such as Motilalji, were elected without a single Muslim vote in their favour. Even Congress Muslims had to seek election from purely Muslim constituencies and had to shape their election propaganda accordingly. The same applied to Congress Hindus.

Mr. Jinnah was interested purely in parliamentary politics, and the Muslim League was, in his mind, no more than the instrument for capturing parliamentary power. He may, therefore, have been the virtual creator of the Muslim League, and the founder of Pakistan, but he could be both while still remaining an agnostic. His approach and frame of mind was purely cynical and political, and he used to scoff at those who brought religion into politics. He certainly brought Muslims into politics—but not Islam. Gandhiji, on the other hand, constantly brought Hinduism into politics, and his fast "to death" on the Harijan issue is a case in point.

Mr. Jinnah was a political-Muslim first and last. He con-

vising every detail and rejecting anything that was not of the very best quality.) He became—and one can use no other word—a snob, socially and politically. Socially, he became exclusive, liking to meet only those of his own social level and tastes in drawing-room and clubs. Politically, he became a committee-man, liking to meet only those of his own intellectual level and right-wing opinions round the conference table. He was the exact opposite of the demagogue, and no one could have been more dissimilar to Gandhiji and Jawaharlalji. They, in spite of their charismatic qualities, had to earn their leadership and win their following by speeches, writings and travels all over the country. Mr. Jinnah, on the other hand, sat comfortably in his drawing-room where the Muslim mass-leaders came searching to drag him out. Not knowing Urdu he even avoided public speaking. Socially, he had no time for the common man and, politically, he had no time for the ordinary political worker or minor politician. Yet his following ranged themselves behind him.

Religiously he was, whatever anyone in Pakistan may say, basically secular and agnostic. His most devoted biographer will be hard put to quote him preaching or even advocating religion. I can recall no speech or writing by him extolling the virtues of Islam. If he entered a mosque, and I cannot recall him doing so, it was through political expediency. If he had any dealings with Maulanas, and I cannot recall any, it was as vote-catchers. If he liked me, it was because I was, like him, modern, sophisticated and agnostic.

On more than one occasion he was prepared to accept joint electorates. But in order to make them acceptable to the more conservative Muslims he asked for reservation of seats. Though it was not explicitly stated, this concession might well have been considered as a half-way stage to completely open elections. But for the sake of a couple of seats here and there he was rebuffed. He was deeply hurt, felt let down and gradually became convinced that the Muslims could not expect a fair deal from the Congress.

the only language *banias* can understand?" And what of Mr. Jinnah himself? Much has been written about his "inflexibility of purpose", his "unswerving determination", etc. etc. But as late as the first week of July 1946 he was prepared to accept a Union Centre. It was only in the second week that he finally decided, for reasons that will be seen later, to accept nothing less than Pakistan.

Whatever the truth may be, I have never for a moment regretted my decision to resign. Some time after my resignation Tara and I ran into Mr. and Miss Jinnah. He greeted Tara in his usual manner, but he cut me dead. I am sorry my association with him had to end this way. He was not a person of whom one could get in any way fond, but I had and still have, a deep respect for his integrity. I would not have missed for anything my time with him.

After I resigned, I pondered a lot over how a man with Mr. Jinnah's record of free and independent thinking, religiously and politically, could have become the arch-communalist of them all. To understand this seeming paradox one has to examine the forces that shaped and moulded his personality which, after all, was an amalgam of his basic character, his tendencies, his upbringing and education, his experiences and his reactions to them, and other such factors.

Born in humble circumstances, Mr. Jinnah rose to the top of the legal profession in Bombay by sheer grit, hard work and ability. Professional success brought to him financial opulence and a standard of living and way of life which he adopted as easily as if it had been his birth-right. Having reached the top he now—and this is not to his credit—turned his back on his less fortunate fellows. Nothing but the best was now good enough for him; the best friends, the best clothes, the best hotels, the best clubs. (I was close to him when he was building his new palatial mansion on Malabar Hill and can testify to how he drove his architect and building contractors almost to desperation by personally super-

through this solidarity, to bring about communal peace on a permanent basis. I still believe in these two reasons and if I fall out from the Muslim ranks it is because the first reason is being used for the opposite of the second. I do not believe in solidarity for the purpose of permanent separation .... The issue is now clear before us Muslims. Do we believe in Hindu-Muslim unity or not? If we think it impossible our place is within the League. If we think it possible, our place is outside."

Did I resign from the League too precipitously? I have often asked myself that question. An English civilian, Penderel Moon, who was in the confidence of the Muslim leaders of Punjab, in his book, *Divide and Quit*, writes:

"Privately Jinnah told one or two people in Lahore that this Resolution was a 'tactical move'; and the fact that six years later he was ready to accept something less than absolute partition suggests that in 1940 he was not really irrevocably committed to it. In part, therefore, it may have been at this time a tactical move, designed to wring from Congress concessions which would make partnership more tolerable. Certainly the implications of the Resolution and even the composition of the proposed 'Independent States' and their inter-relations had not at this stage been fully thought out. Some of these matters were clarified later, but Jinnah was never keen to expound the exact nature of Pakistan, and right up till 1947 there was some doubt as to what he would accept as conforming sufficiently to his conceptions."

His conclusion that the Resolution may only have been passed for bargaining purposes conforms with what was said by League friends who returned from Lahore. "Why on earth have you taken the Resolution so seriously?" they chided me, "Don't you know that these Hindus are *banias*, and this is

observed the Direct Action Day. The result was "The Great Calcutta Killing" to which reference will be made later.

Mr. Jinnah left for Lahore about the middle of March. I saw him the day before he left and neither by word nor manner did he give the slightest hint that the Pakistan Resolution was going to be moved. But a few days later, late at night, Frank Moraes phoned. "Why did you not tell me" he asked "about the Pakistan Resolution?" "What Resolution?" I replied, surprised. He read it out to me. I was dumbfounded. But I saw my course clearly. I had joined the League to help as far as I could to bring about unity. But if no unity was possible through the League, I had no place in it. Frank who knew exactly what my ideals and objectives were, and guessing what I must be feeling, asked "what are you going to do now?" "Why, resign of course" I replied spontaneously. But, ever the journalist, Frank said quickly "I suppose you must. But issue a statement giving your reasons and we'll splash it." I got up early next morning and got down to work. As soon as I was satisfied with what I had written, I took it to Frank. He read it several times and thought it expressed my views and approach perfectly. It appeared in the *Times of India* the next day, and in all the local papers the day after. My statement received very wide press notice and several papers wrote appreciative leading articles. Even the Urdu press made little comment; they were too stunned by the Pakistan Resolution and frankly did not know what line to take.

My statement was far too long to be reproduced in full, but I may be permitted to quote the more relevant portions

> "The sole aim of Muslim politics should be the securing of permanent communal peace. Any advance towards this goal is good politics. Partition assumes permanent communal unity to be impossible and is, therefore, the worst politics.... I, therefore, believed the Muslim League necessary for two reasons. To bring about solidarity and

innocuous. I also realised that no one else round Mr. Jinnah would be able to play down the demonstrations he desired—and played down it must be—or else the enraged majority community might, as had happened so often in the past, take their vengeance. Furthermore, no one could tell what the minority community, incited to feel triumphant and to gloat, might not do. In Hindu-Muslim riots the Muslims had by no means always been on the defensive or the helpless victims.

I, therefore, decided to write the draft. If I felt it would serve the purpose I had in mind, I would take it to Mr. Jinnah; if not, I would ask him to excuse me from this particular task. I now took it to Frank and we went over every word. He fully realised the potential dangers in such a Day and that no chance should be lost in rendering it as harmless as possible. I, therefore, took care to write in sentences such as:

> "Let there be no hartals, processions or any such demonstrations, but let a spirit of humility and a mood of reflection prevail."
>
> "... my appeal emphasises that prayers should be offered for the establishment of truly popular ministries which would do even justice to all communities and interests."

We thought it doubtful if Mr. Jinnah, in his then aggressive mood, would accept the draft, but, if he did, it might just do the trick. Anyway nothing would be lost by trying. He pressed me to take it. I did so and found Mr. Jinnah busy. He asked me to leave it with him, which I did I next saw it in the press.

I might add as a footnote that, in the event, the Day passed off without an incident. Not a hand was raised, not a stone was thrown. It would be too much to claim that this was due to the wording of the manifesto. But I like to think it helped. The next time Mr. Jinnah ordered the observance of a Day he was not so lucky In 1946 the Muslim League

were indications of the connivance of local Congressmen, and even officials, but that the Congress Governments were directly involved was far from proved. It could, however, be said, and with justice I think, that understandably reluctant to take drastic action against those who had voted them into power, the Congress Governments had not always restored order as firmly or as quickly as they could perhaps have done.

Secondly, I thought I had the Congress pretty well sized up by then. It was not a political party of individuals with a common political belief, but an independence movement comprising all those who desired, for whatever different reasons, freedom from British rule. Since India was still in many ways a medieval country, it followed that the rank and file of the Congress still had a medieval mentality. They were for the most part caste and provincial-minded, and the Muslims entered very little into their scheme of things. A very large number, and this included the leadership in the lower levels, undoubtedly dreamed of a Hindu Renaissance, but the point was that even they were more pro-Hindu than anti-Muslim as such. The Muslims went by default, and it was not so much the case of what the Congress had done against the Muslims, but what it had not done for the Muslims. The upper echelons, as I well knew by personal acquaintance, such as Gandhiji, Jawaharlalji, Mrs. Naidu, and many others, were incapable of any anti-Muslim act.

Lastly, the millions and millions of Congress supporters had been very proud of their Governments and were extremely upset over them having to resign. For the Muslim League to gloat so ostentatiously over these resignations was indeed adding fat to a fire that might flare into a conflagration.

With such views my first reaction was to decline the assignment. But the thought of what might happen if the already excited majority community was driven to the point of exasperation haunted me. I wondered if I could render such a potentially dangerous situation less dangerous, if not

consider the matter, but made it clear that if I accepted I must be given a free hand. He told me not to worry about that. I conceived the paper as a means of acting as a brake on the Muslim League whose policies and activities were rapidly becoming more and more extreme. Rather than building up Muslims, the sole policy of the League now seemed to be anti-Congress and anti-Hindu. I thought some independent thinking could bring it back on the rails and for this I would need suitable help. I discussed the matter with a young independent-minded Muslim barrister, Sulaiman Seth, and even asked him if he would join me if I accepted. Frank was deeply concerned and strongly counselled refusal. He clearly saw that if I accepted I would have passed beyond the communal point of no return. He was also very sceptical about me being allowed a free hand. If it was a party paper, he argued, it would have to follow the politics of the party irrespective of what they were. After further reflection I refused.

The War broke out in September 1939 and after some abortive negotiations with the Viceroy the Congress Working Committee instructed the Congress provincial governments to give up office. They, therefore, resigned towards the end of November. Someone has said that opportunity is as powerful as purpose, and Mr. Jinnah now displayed his ability to discern and grasp opportunity. With the greatest cynicism he decided to turn the Congress decision to the League's advantage by directing the Muslim League all over India to observe a "Day of Deliverance and Thanksgiving". As was his wont, he asked me to draw up the manifesto. Moreover, beginning now to see through me, he took care to indicate what should be brought out.

This was an assignment that disturbed me greatly. To start with, I thought that this was really going too far. I was aware that a League committee had issued a report, known as the Pirpur Report, on so-called Congress atrocities. It was a dismal record of Hindu-Muslim riots. It was true that there

democratic principles--suitable for homogeneous com
were not applicable. A representative government in B
enjoyed the support of the numerical majority of the p
But in India only a government which enjoyed the supp
both Hindus and Muslims could be considered represent
This was all the more necessary, I wrote, since Hinduism
Islam were not religions, as Christians generally under
it, but ways of life with differing social codes. They c
even be said to be different cultures. I discussed my
with Frank and we rounded a phrase or two. I then to
to Mr. Jinnah who accepted it, but made one verbal ch
I had written "a Constitution must be evolved that recog
that there are in India two communities who must both s
the governance of their common motherland. In evol
such a constitution, the Muslims are ready to cooperate
the British Government, the Congress, or any party so
the present enmities may cease and India may take its p
amongst the great nations of the world". He scratched
"communities" and wrote in "nations".

This was sometime between the outbreak of war and
resignation of the Congress Government. It must, theref
have been about October 1939. It was the first time in
experience that Mr. Jinnah referred to the Muslims a
"nation". But as he had retained "common motherland"
did not for a moment suspect that he was very shortly go
to spring the two-nation theory on to a totally unprepa
India—Hindu and Muslim. Everyone had of course heard
the theory, conceived, it is said, by a Chaudhuri Rahmat
and enthusiastically advocated by that poetic genius
Mohomed Iqbal. But it was dismissed as the dream of vis
aries and poets. Apart from the incident just mentioned, M
Jinnah himself had never once referred to two nations
separate states.

About this time Mr. Jinnah had secured enough financ
support to launch a party paper which later emerged
Dawn. He offered me the editorship. I asked for time

Those in the Muslim localities were placed under the supervision of Mrs. Kulsum Sayani, a capable and active social and political worker. Though a member of the Congress, Kulsum wished to secure the moral support of the Muslim League for an activity beneficial to Muslims and about which there could be no controversy. One night, therefore, we took Mr. Jinnah for a tour of the night schools. We took him to places he never knew existed, and he dutifully climbed up dirty, narrow stairs to dark, dingy rooms. But we failed in our mission. At the end he thanked us politely, told Kulsum that she was doing good work, but refused to direct the Muslim League to support the adult-literacy campaign. The reasons were obvious. The Corporation was in Congress control, and it was not for him and the Muslim League to help them to get any credit or popularity amongst the Muslim public. That the Muslim public benefited or not did not matter.

I now began to see clearly the fundamental difference between his approach and mine. He was interested in the Muslim League—not Muslims. I was interested in Muslims, as the weaker arm of the Indian body—not the Muslim League.

I was at this time either speaking on the 'phone or seeing Frank Moraes almost daily. Balanced and objective, and with a keen political mind, he had become, as it were, the keeper of my conscience. We discussed the situation times without number. He was convinced that I should continue to remain as close to Mr. Jinnah as possible since, otherwise, the little influence for good that I had would be lost. He knew that I had succeeded in having issued in his name press statements far more moderate than they would have been had he written them himself. But matters started coming to a head. A British magazine, *Time and Tide*, asked Mr. Jinnah for an article on the Muslim case. I knew this by heart and wrote the article from start to finish. I brought out that India was a heterogeneous country for which

he said in English "what do you want?" "Sahib", one replied in Urdu, "we have come to see you." "Well, you've seen me" he replied in English, and turning in his chair resumed our discussion. Another time, a crowd had gathered at the Railway Station to welcome his arrival. As happens sometimes they got a little unruly. Furious, he pulled down the shutters and refused to come out till they had been dispersed.

He was a mass-leader with no time for the masses. His attitude towards them is epitomized perfectly by Tennyson's famous lines:

Their's not to wonder why.
Their's but to do and die.

The only improvement on this could be "Their's but to vote and die". I believe that later he made a conscious effort to unbend, but any geniality on his part was artificial to the point of being painful.

Now either I have a genius for getting into untenable situations or else I get disillusioned too easily, but I began to find in my work increasing cause for concern. I had resolutely kept before myself the two points Mr. Jinnah had made to persuade me to join him. I, therefore, looked in vain for him to apply himself to building up the Muslim community economically, socially and educationally so as to facilitate Hindu-Muslim unity. I also watched with apprehension him going not only halfway towards the Muslims but right through them and out the other side. From there he seemed to be leading them in the opposite direction. I found that he knew even less about economics than I did. But whereas I was prepared to learn, he was not. He was even less interested in social and educational questions. An incident about this time brought this home to me forcibly The Municipal Corporation had launched an adult literacy drive and had established night schools all over Bombay

was always ready to push ahead promising young men a in fact preferred them to those of his own generation. Anoth great thing about him was that he would never stoop to i trigue or do anything behind anyone's back. One alwa knew where one stood with him.

With Tara and myself Mr. Jinnah and his sister we always affectionately cordial. He never refused anything asked of him and readily came wherever I took him. Th lunched or dined with us whenever we wished him to me anybody and his conversation with John Gunther, the auth of *Inside Asia*, took place over lunch in our flat at Wor Point. Another such meeting is vividly described by Wilfre Russell in his book *Merchant in a Mirror*.

Supremely confident of himself, Mr. Jinnah was more dictator than a leader. The Muslim League Working Com mittee may have been a committee, but the only work it di was to agree. He presided over it like a general in his mes Once, Sir Sikander Hayat Khan and a group from Lahor had come to Bombay for one of its meetings. A commo friend had asked us to lunch. Throughout the meal Si Sikander and his friends expanded on some point to whic they were fundamentally opposed. "It totally ignored th conditions in Punjab", Sir Sikander declared angrily, "I wi never accept it." The meeting was in the afternoon, an next day I asked him if he had won his point. "Wel actually," he said sheepishly, "*I did not raise it.*" A frien who was present told me afterwards he did raise it. "Mr Jinnah", he began, "I would like to discuss . . . . " Mr. Jinnal turned slowly in his chair and looked at him. Sir Sikande subsided.

I was always amazed by the way he sometimes refused to play up even to his followers. I remember once sitting with him when a servant announced that some Muslim wished to see him. Looking annoyed, he said, "send them in". They came in, simple fellows, and awestruck before the great man huddled in a group shuffling their feet. "Well",

I did so. Instead of seizing the opportunity of winning the support of the influential *Times of India*, Mr. Jinnah sneered at the editorial policy of the paper and answered his questions as if from an uninformed school-boy. Ivor, a touchy Welshman, had always been extremely sympathetic to the Muslim case and was quite unnecessarily antagonised.

I have a feeling that somewhere deep down his conscience pricked him about his communal role, for he was always so much on the defensive. At the height of his fame I arranged for him to speak to the Progressive Group. It was a record attendance and all came eager to hear him. But for no reason whatsoever he sensed a lack of sympathy, and even opposition. Lifting his tall thin frame from the chair, with all his bristles out, he faced the audience as if before a hostile judge. He then lectured more than spoke, and snapped more than answered questions. His departure seemed to be a relief to both speakers and listeners.

Other episodes also come to mind. I recall vividly a wedding in the city at which he and Maulana Shaukat Ali were sat side by side on the same sofa. They disliked each other cordially, and the occasion was both comic and significant of their two characters. Bearded, fat, jolly and an extrovert, the Maulana was relaxed and carried it off by talking loudly to all within range. Clean-shaven, gaunt, sulky and withdrawn, Mr. Jinnah sat silent and tense, and stalked out haughtily at the first opportunity.

But when he wanted he could be charming and considerate too. During some negotiations Gandhiji came down to Bombay to see Mr. Jinnah, and Tara happened to remark that she had never met him. Mr. Jinnah immediately invited her to his house, and when Gandhiji arrived he was met by Mr. Jinnah at the door, and by Miss Jinnah and Tara in the drawing room. Tara wrote up the incident and it was later published in the *Illustrated Weekly* in a series entitled "My Most Memorable Meeting".

I have also seen him perfectly charming with students, He

for expressing himself in writing and was glad to pass on most of this work to me. Only he and I know whose letters I answered and what press statements and articles I drafted. I worked with him in this manner from 1934 till March 1940, a matter of six years. I became a member of the Bombay Presidency Muslim League Council and, together with two leading solicitors, Mohomed Ali Chaiwalla and Saif Tyabji, formed the committee entrusted by Mr. Jinnah to select candidates for the Bombay Legislative Council. I was also entrusted with many similar responsibilities.

But one could never get very close to him and he seemed to shun any form of intimacy. I could never understand this since both he and his sister were so obviously affection-starved. There, evening after evening, they would sit, two austere, ascetic figures, gaunt and grey, sombre and silent, desiccating progressively as the years marched by. I have often wondered what would have been the history of India if there had been love, life and laughter in that bleak house. I do not think that it is any co-incidence that his intense personal ambition and cynical communalism came out only after the death of his wife, Ruttie, sister of Sir Dinshaw Petit, a non-Muslim, a marriage which was quite in character of the Jinnah of those days. Many years younger than him, spontaneous and full of a lust for life, she kept him natural and cosmopolitan and completely secular. With her, he even used to laugh sometimes. But after her death in 1928 his elderly unmarried sister came to live with him, and their chill natures fed upon each other. Not having, like Ruttie, the capacity for friendship they were gradually left in solitary grandeur. Even his relations, and there were several in Bombay, felt constrained to keep aloof. Miss Jinnah, a shadowy presence, was a typical spinster. But once we saw her face soften as she crooned over our spaniel's tiny puppies.

Mr. Jinnah sometimes seemed to have little desire to win friends and influence people. Ivor Jehu once required some information. I took him along, and was sorry afterwards that

Commission is being got hold of by the Moslems and ma present a report altogether destructive of the Hindu posi tion, thereby securing a solid Moslem support, and leavin Jinnah high and dry."

Even his exit from the Congress, a few years before, wa due to the non-cooperation issue and not to any communa reason. Taking up parliamentary work which so eminently suited his talents, he had become, with Sir Purshotamdas Thakurdas as his deputy, the leader of the Independent Party in the Legislative Assembly in Delhi. During my visits there I myself had witnessed his debating skill and had learnt how deeply his integrity and independence of mind were respected by the Government and the Congress alike. Moreover, everybody who read the papers knew of his more recent activities, and the part he had played at the Round Table Conference at which he had held himself rigorously aloof from the "old guard" Muslim politicians who had acted as a group under the leadership of that staunch monarchist and loyalist, the Aga Khan.

With this group the younger generation of Muslims were entirely disgusted. But they were not enraptured with the Congress either which, at that period, only came to life at annual sessions, and during the periodic civil disobedience movements when its main appeal to Muslims was to go to jail. This was hardly enough to catch their imagination. They were ripe for fresh leadership for which Mr. Jinnah seemed the man most qualified. His credentials, so to speak, were impeccable, and his logic seemed to me irrefutable. I placed myself at his disposal.

As a leading barrister Mr. Jinnah had become used to what is known in legal jargon as "devils". These were fledgling barristers developing their knowledge of law and of arguing cases by acting as assistants to senior members of the Bar He now used me as a sort of political "devil". Though extremely articulate vocally, he had surprisingly little facility

"Who then was our doughtiest opponent in 1906? A distinguished Muslim barrister in Bombay, with a large and prosperous practice, Mr. Mohommed Ali Jinnah...... We had always been on friendly terms, but at this juncture he came out in bitter hostility towards all that I and my friends had done and were trying to do. He was the only well-known Muslim to take up this attitude, but his opposition had nothing mealy-mouth about it; he said that our principle of separate electorates was dividing the nation against itself, and for nearly a quarter of a century he remained our most inflexible critic and opponent."

The person for whom I had the deepest regard, Mrs. Naidu, admired him fervently till the end. At the 1915 Session of the Congress she had recited, in his honour, her poem "Awake". To exemplify " emotions he then evoked, I may quote the first verse:

Waken, O mother! thy children implore thee,
Who kneel in thy presence to serve and adore thee!
The night is aflush with a dream of the mo...w,
Why still dost thou sleep in thy bondage of sorrow?
Awaken and sever the woes that enthral us,
And hallow our hands for the triumphs that call us!

Even as late as 1928, when the Simon Commission was touring India, Lord Birkenhead, the then Secretary of State, as quoted by his son in his book "F.E.", was writing the following to the Viceroy:

"I should advise Simon to see at all stages important people who are not boycotting the Commission, particularly Moslems and the depressed classes. I should widely advertise all his interviews with representative Moslems. The whole policy is now obvious. It is to terrify the immense Hindu population by the apprehension that the

You imagine that Hindus and Muslims can work together. I only wish they could. But let me tell you that they cannot as long as the Hindus are united and strong, and the Muslims are disunited and weak. The Hindus and Muslims are two arms of the Indian body. But what use is a body with one arm paralysed? By strengthening the arm, you strengthen the whole body. Does a giant ever marry a dwarf? People of approximately the same size marry. You will never get Hindu-Muslim unity while the Muslims are in their present backward state, socially, educationally and politically. If you want to work for Hindu-Muslim unity, you must first work for the Muslims."

I had by this time, this was 1934, become rather disillusioned and distressed by the general lack of Hindu-Muslim unity, and his appeal fell on ears ready enough to receive his message. I had, however, one or two doubts. "I am entirely at your disposal to work for Hindu-Muslim unity" I said "but unity is the opposite of communalism. The Muslim League is a purely communal organisation. How can you get unity through communalism?" "My young friend", he replied loftily, "you know little yet about Muslims or politics. If you want the Muslims to come the whole way with you, you must first go half-way towards them."

I believed then, and I believe now, that Mr. Jinnah was at that period wholly sincere in what he said and advocated. His whole past bore witness to this. Fiercely independent, it was impossible for him to tolerate any form of subjection, and since in his early days the question of Hindu dominance did not arise he had revolted fiercely against British rule. It was thus in no way strange that in the infant Congress he was one of the shining stars and the brightest symbol of Hindu-Muslim unity.

The Aga Khan, whom Mr. Jinnah opposed all his life, describes in his memoirs the political situation after separate electorates had been introduced through the Morley-Minto Reforms.

IN early 1934 Mr. Jinnah returned to Bombay. He was still very much a lone wolf. Having left the Congress some years before, he continued his political career in the Legislative Assembly at Delhi as an Independent. In this capacity he participated in the Round Table Conference in London. There he kept aloof from the Muslim moderates who called themselves the Muslim Conference and were led by the Aga Khan. At that time the Muslim League existed largely on paper. After the Round Table Conference, realising that he could not fit into any of the existing political frames, he prudently remained in England practising before the Privy Council. Besides, Lord Willingdon, with whom he had clashed when the former was the Governor of Bombay, was now the Viceroy.

But tired of being in the wilderness he returned soon after Lord Willingdon had been replaced by Lord Linlithgow. He now unfurled the banner of the virtually defunct Muslim League, and having decided that he would be its General looked round for lieutenants. Among others, he sent for me. I had met him several times before, mostly under the hilarious aegis of Mrs. Naidu and having known him in such circumstances I could not take him as seriously as he took himself. In consequence, unlike most of his followers, and even colleagues, I never stood in awe of him. Many years later I developed a similar relationship with Jawaharlalji, and if my experience counts for anything both appreciated being treated with the respectful regard due to seniors and elders, and not as Great Leaders uncomfortably high on pedestals.

I went to see him in his Chambers in the High Court. "Look here", he said in effect, "I know all about your views.

When I was Secretary to Jinnah

M R.A Baig

Sir Syed Encyclopaedia

Sir Syed ki Deeni Barkaten — Abdul Halim Sharar

Iqbal/Azad Encyclopaedia

A Rare Letter of Iqbal addressed to Shaikh al Azhar, Cairo — Md. Ikram Chaghtai

A Letter addressed to Syed Sulaiman Nadwi — Abul Kalam Azad

Notes and jottings — Qazi Abdul Wadood

Babri Masjid Perspectives

The Will of Babur — Mustafa Khan Sherwani

Indexes of Periodicals

Index of "Saughat" (Banglore) — Dr.Salman Abid

Letters to the Editor

Regarding Journal Nos.75-77 — Dr.Abdur Rab Irfan

Contents

When I was Secretary to Jinnah	M.R.A. Baig	1
On Muhammad Ali Jinnah	Sailesh Kumar Bandopadhaya	53

Urdu/Persian Section

Wadood Encyclopaedia

Some Rare Urdu Newspapers and Periodicals	Qazi Abdul Wadood	1

Unani Medicine

Muqaddama Ma'dan-i-Tajribat of Hm. Md. Mahdi Akbarabadi	Prof. Hm. S.M.Kamaluddin Husain Hamadani	223

Travelogues of Islamic Countries

Jada-e-Haq: A Travelogue of Hajj	Syed Azam Ali Azimabadi	259

Islamic Studies

Commentaries on Traditional Philosophy	Maulana Md.Abdus Salam Khan	277

1993

Price Rs.75/-

Printer	: Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	: Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 650109, Tlx. 22-430 KBL IN)
Editor	: Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	: Rs.300/- (Inland) US$ 60 (Asian Countries) US$ 120 (Other Countries) Price (this issue) Rs. 75/-.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

81—83

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA

خدابخش لائبریری

جرنل

۸۴ تا ۸۶

پٹنہ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۲۴/۷۷	سالانہ : ۲۰۰ روپے (ہند)
شمارہ : چوراسی / چھیاسی	۶۰ ڈالر (ایشیا)
قیمت : پچہتر روپے	۱۲۰ ڈالر (دیگر ممالک)

۱۹۹۴ء

مصطفیٰ کمال ۔ شمسی نے سری آرٹ پریس، پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

▪ ہندستان اپنے حصار میں	جناب ایم۔جے۔اکبر (مصنف) / جناب مسعود الحق (مترجم)	۱
▪ وصی احمد بلگرامی کی ایک نادر تحریر	جناب سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲۳۱
[illegible] پریم چند سرسید کے علیگڑھ میں	مکتوب پریم چند	۲۵۱
سرسید پر پریم چند کا ایک مضمون	پریم چند کی باکمالوں کے درشن، سے	۲۵۲
[illegible] جماعت احمدیہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۶۳
▪ تاریخ مجمل مفصل مخطوط خدابخش: سوانح جانجاناں پر نئی روشنی	جناب فرخ جلالی	۶۴
▪ کچھ سرعلی امام کے بارے میں	ڈاکٹر اختر امام / تقدیم۔ ڈاکٹر انیس امام	۶۵
▪ کچھ اپنے بارے میں	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	۷۱
▪ نیپال میں عربی، فارسی و اردو کے مخطوطات	ترتیب: فصیح الدین بلخی / تقدیم نسیم اختر	۸۱
[illegible] یادداشتہائے ودود	قاضی عبدالودود	۸۳
▪ جرنل ۵۷-۶۲ کے بارے میں	جناب عبدالرؤف خاں	۸۹
▪ نہرو، علی گڑھ، راس مسعود اور وائسرائے	جناب مصطفیٰ خاں شروانی	۹۰
▪ لاروش فوکو کے مقولے: ایک تعارف	ڈاکٹر نظیر صدیقی	۹۱
[illegible]		
▪ مقولے	لاروش فوکو	۱-۹

ہندستان اپنے حصار میں

مصنف

جناب ایم۔ جے۔ اکبر

مترجم

جناب مسعود الحق

حرفِ چند

اس کتاب میں جا بجا ضمیر کی آواز ملے گی:

میرے ضمیر کی!

تمھارے ضمیر کی !!

تمھارے ضمیر کی !!!

اور ایک حصّہ (تیسرا حصّہ: آخری دو باب) تو بہت دن تک یاد رہے گا

یاد رہے گا۔ تازہ رہے گا

اور دلوں کو گرمی اور روشنی بخشتا رہے گا۔

محمد عارف

ایم جے۔ اکبر ایک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ انکی پیدائش جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ انکے نانا میر حبیب اللہ نے تربِ ساتوں کا اپنا کاروبار امرتسر میں شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں امرتسر مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور یہ خاندان ومددگار پناہ گزینوں کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا۔ انکے دادا کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بہار کے گاؤں کے افلاس اور اپنی تنگدستی سے عاجز آکر کلکتہ کے صنعتی نواح کا رخ کیا۔ یہ ایک ہندو تھے انکا نام پریاگ بعد کو یہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام رحمت اللہ رکھ لیا۔ انہوں نے کانگریس پارٹی سے پیمانِ وفا باندھا تھا اسی لیے ہندوستان میں رہے۔

اکبر کی اسکول کی تعلیم کلکتہ بوائز اسکول میں ہوئی۔ انگریزی میں آنرز کی ڈگری انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پریسیڈنسی کلکتہ سے لی بعدازاں انہوں نے ٹائمس آف انڈیا کی تنظیم میں ایک زیر تربیت سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ خشونت سنگھ کی ماتحتی میں السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں نئی پریس جرنل گروپ کے پندرہ روزہ کی ادارت کا کام انکے سپرد کیا گیا ۱۹۷۶ء میں اکبر کلکتہ میں آنند بازار گروپ آف پبلیکیشنز میں شامل ہوئے نے مقبول ہفتہ وار رسالے سنڈے کی تشکیل بھی کی اور اس کی ادارت بھی۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے انگریزی ٹیلی گراف کا منصوبہ بنایا اور پھر اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ اخبار جلدی ہی کامیابی کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچ گیا

زیر نظر کتاب کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں پینگوئن بکس انڈیا نے انکی ایک کتاب 'رائٹ آفٹر رائٹ' شائع کی۔ اس کتاب میں ہندوستان میں یکے بعد دیگرے ہونے والے ان فسادات کی چشم دید رپورٹیں ہیں جو یہاں ذات پات زبان اور مذہب و ثقافت کے نام پر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ رپورٹیں اپنی صاف گوئی اور صحافتی معروضیت کے لیے معروف ہیں انکی ایک اور کتاب نہرو دی میکنگ آف انڈیا منظرِ عام پر آئی ہے یہ ضخیم کتاب نہرو کی سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تشکیل و تعمیر اور اس جدوجہد میں پیش آنے والے نشیب و فراز کا تجزیہ بھی ہے۔

ہندوستان

اپنے حصار میں

محبت اور شکرگذاری کیساتھ

امّی جی ــــ اور ــــ ابّا جی

کے نام

فہرست

صفحہ نمبر

پیشگفتار ———— پانچ

تعارف ———— ۱

پہلا حصہ پاکستان کا جنم اور ہندوستان کی بقا ———— ۵

۱ ۱۹۴۷ء کی منطقی بنیاد ———— ۷

۲- پاکستان میں مفاد پرستوں کی بالادستی ———— ۳۰

۳ آقا نہیں، دوست ———— ۴۲

۴- اہل ایمان ———— ۵۷

۵ کیا موسم سازگار ہو رہا ہے؟ ———— ۶۱

۶ گاندھی جی کی آشا کا مسکن ———— ۶۶

۷ طالع آزماؤں کا عروج ———— ۷۲

۸ درد، جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا ———— ۷۷

۹ ۔۔ ات کی خدمت میں ———— ۸

۱۰ معاہدے ———— ۸۲

۱۱ ماضی اور مستقبل ———— ۹۲

دوسرا حصہ پنجاب ———— ۱۰۱

۱ مسئلے کی نوعیت ۱۰۲

۲ ایک پرانی بات ———— ۱۰۶

۳ ایک عقیدہ اور ایک مذہب ———— ۱۱۲

۴۔ پنجاب اور دلی کا مقابلہ ۔ سکھوں کا پہلا دھن ———— ۱۱۸

۵۔ تشخص کا بحران ———— ۱۲۸

۶۔ پگڑی سنبھال جٹا ———— ۱۳۷

۷۔ پیچیدہ اقلیت ———— ۱۴۶

۸ سودے باز ———— ۱۵۵

۹ عقیدے کی سیاست ———— ۱۶۲

۱۰ خالصتان کی تلاش میں ———— ۱۶۸

۱۱۔ جرنیل سنگھ بھنڈراں والا ———— ۱۹۱

۱۲ پنجاب ۔ ایک جرنیل کی موت ———— ۲۰۹

تیسرا حصہ کشمیر ———— ۲۲۱

۱ جنت میں جمہوریت ———— ۲۲۲

۲ احرامِ انسان ———— ۲۲۸

۳ تیرا کشمیر ———— ۲۳۵

۴ "دو دو میں گم شدہ" ریاست کی سمت کا ماجرا ———— ۲۴۹

۵ کچھ بھی رکا مت ہوا ———— ۲۶۶

۶ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے ———— ۲۸۰

۷ انتقام ———— ۲۹۵

۸ [illegible] ———— ۳۱۱

۹ صداقت آئی ہے ———— ۳۲۰

۱۰ جمہوریت کا ایک خط ———— ۳۳۲

پیشگفتار

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو — تو بستن در و من فتح باب می شنوم

چھ سال قبل، انڈیا۔ دی اینڈ۔ ود۔ ان کے آخری باب کا اختتام غیر یقینی رجائیت اور خوش امیدی کی انھیں سطروں پر ہوا تھا۔ اس وقت بھی دور افق کی گرج چمک پنجاب پر گہرے کالے بادلوں کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ تاریخ کا ہر طالبِ علم ان واقعات کو ایک منطقی سلسلے میں رکھ سکتا ہے۔ ایک بیج بویا جاتا ہے کچھ مدت تک کوئی کلا نہیں پھوٹتا، بیج جڑیں نہیں پکڑ پاتا، پھر ہوتا ہے جب خون سے اس کی آبیاری کی جاتی ہے۔ پودا پروان چڑھنے لگتا ہے، شاخیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پودے کے معتقدین اس کے مالی پودے کی نگہداشت کرتے ہیں، احتیاط اور بڑی لگن کے ساتھ۔ دیکھتے دیکھتے بغاوت کی ایک تحریک شروع ہوتی ہے جسے کوئی بھی روک نہیں پاتا۔ حکومت متحرک ہوتی ہے اور ایک مجبور اور جھلائی ہوئی گورنمنٹ کے ہاتھوں ایمان کی ایک علامت مسمار ہو جاتی ہے۔ ایک وزیر اعظم کا خون ہوتا ہے اور خونریزی کی نفسیات قومی ذہن پر عادی ہوتی نظر آتی ہے۔

ان چھ برسوں میں اس آگ نے کشمیر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ تفصیلات ظاہر ہے کہ مختلف ہیں مگر علامتیں وہی ہیں۔ انڈیا دی اینڈ ود ان کی صحیح مگر منحوس پیشن گوئی کی صحت اور صداقت کو دیکھ کر گہرا دکھ ہوتا ہے۔ کوئی بات تھی تو بس یہ کہ اس وقت اس کتاب میں ہمارے خواب امید کی ایک ڈور سے بندھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس وقت جب میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں مذہبی جنون ایودھیا کے شہر میں تین ہزار دو سو مربع فٹ مٹی کے ایک ٹکڑے کے نام پر انسانوں کو آگ میں دھکیل رہا ہے۔ فتح و کامیابی کے پرچم چار سو سال پرانی ایک مسجد کے تین بوسیدہ گنبدوں پر لہراتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف ایک بھیانک خوف دہشت سے لرز رہا ہے اور لوگوں کے ہجوم ندیوں کے پانی کو بے گناہ بچوں کے خون سے رنگ رہے ہیں۔ دل تھکے ہوئے ہیں اور احساس فرار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔

اس مایوسی کے ساتھ ہتھیار ڈالنا اور ہندستان کو چھوڑ دینا آسان ہے بلکہ بہت ہی آسان لگتا ہے کہ لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت میدان سے ہٹنے کا مطلب ان لوگوں کو ایک نہایت آسان فتح سے سرفراز کر دینا ہوگا جو ہندستان پر ایک رنگ تہذیب اور متنوع روایات پر ایک واحد عقیدے کو تھوپ دیں گے۔ حقائق تو یہ ہیں کہ ہندستان

ایک خیال اور عقیدے کی ڈکٹیٹرشپ کا ہمنوا نہیں ہے۔ مگر ایسے لمحے ہوتے ہیں جب ذرا سی تحریک کو نئی توانائی مل جاتی ہے کہ وہ ایک زبردست چیلنج کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور ہم اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔

بہت دنوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میں موجودہ کتاب میں دو ایک باب اور شامل کر کے کہانی کو آگے بڑھاؤں [illegible] ہندستان کی سیاست یا یہاں کے واقعات کا بیانیہ نہیں ہے یہ ایک سیاسی اور سماجی نظریے کو [illegible] اور استعماری خلجان کے عذاب سے نکلے ہوئے ایک ملک کی بنیادی حقیقتوں پر اس نظریے کے اطلاق کی ایک کوشش ہے۔ اس میں مزید کوئی تبدیلی کسی کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرے گی، بلکہ شاید ایسا کرنا کتاب کے ربط کے [illegible] کا سبب بن جائے گا۔ اس سب کے بجائے آئیے ہم اس پر اپنی توجہ مرکوز کریں جو ہیں اور آپ سنتے ہیں اور توقع کریں کہ یہ تو ان وعدوں کی ہوگی جو مکمل رہے ہیں۔

ایم۔ جے۔ اکبر

تعارف

۱۹۵۹ء میں مولانا آزاد میموریل لیکچر دیتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا تھا "آج کے ہندوستان کو سمجھنے
ی کوشش کرنا کسی ہمت والے ہی کا کام ہے۔ اور کل کے ہندوستان کا بیان ایک پاگل پن" مسئلے کی نوعیت کو اچھی
رح سمجھنے والا، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ تاریخ داں، مفکر، ادیب، ماہر سیاست
ں، تخیل پرست سربراہ حکومت، کبھی فاتح، کبھی ناکام، "ڈیموکریٹ" خواب دیکھنے والا نہرو، اپنے ملک کی آزادی کو ملک
ے منقسم ہونے کے بعد ہی دیکھ سکا۔ مہاتما گاندھی، ان کے تمام ساتھی، بشمول نہرو، ایک ایسے ہندوستان کی یکجہتی اور
سالمیت کے قائل تھے جو درۂ خیبر سے آسام اور کشمیر سے کیرالا تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسا کہ پنڈت نہرو نے ۱۹۳۶ء میں اپنی
ود نوشت سوانح عمری میں لکھا تھا کہ غالباً دنیا کا کوئی ملک جغرافیائی اعتبار سے یکجہتی اور سالمیت کے لیے ہندوستان
ے زیادہ موزوں وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ عدم اتحاد اور افتراق کی صلاحیت
رکھنے والے ملکوں میں بھی یہی ملک سرفہرست ہو سکتا ہے۔ یہ خیال ذہن سے ہندوستان کی تاریخ کے غلط تاویلات
ل۔ واضح اور ثقافتی طور پر مربوط و منسلک قطعہ اراضی اور جدید ملک و قوم کی پیدائش کے مابین نہ جانے کیسے نشیب و
واز ہوں گے۔

'تقسیم' کے لفظ ہی میں کسی کل کا منقسم ہونا مضمر ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کا یہ عمل گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد
ے لیے ایک شکست تھا۔ مولانا وہ مسلمان قائد تھے جو جناح صاحب کے دو قومی نظریے کی حمایت کرنے کی بجائے
ہاتما گاندھی کے ساتھ رہے۔ بہرحال پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد بھی مختلف مذاہب، مختلف نسلوں اور
ختلف زبانوں اور بھاشاؤں کے ہندوستان کا ایک معتدبہ حصہ ایک جھنڈے اور ایک سیکولر اور جمہوری آئین کا
ننے والا رہا۔ لیکن ملک کو تقسیم کرانے والے نظریات اور قوتیں ابھی بھی مطمئن نہیں تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گاندھی
ور جناح کے پیش کیے ہوئے جواز میں سے تاریخ کسی ایک ہی کو صحیح ثابت کر سکتی تھی۔ دونوں نظریات کی بقائے باہمی

کا تصور مشکل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا برصغیر کے ارتقا میں ایک وقفے کی حیثیت رکھتا ہے مستقل قیام کی نہیں۔ مسلم فرقہ پرستی نے دریائے سندھ کو ہندوستان سے نکال کر پاکستان میں رکھ دیا۔ اب بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں سکھ فرقہ پرست خالصتان کی تخلیق کرنے پر مصر ہیں۔ مگر اس سے جو سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کے ایک حصے کی فرقہ پرستی گنگا کو تقسیم کر کے ملک کو تباہ کر دے گی؟ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو بدھ کے دن صبح کے نو بج کر تیس منٹ پر اس وقت ملک بھر میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی جب دو سکھ محافظین نے مسز اندرا گاندھی کو گولیاں مار کر اپنی کمیونٹی کی انتقام کی بھوک کو مطمئن کر دیا۔ اور ہندوؤں نے ملک گیر پیمانے پر سکھوں کے خلاف تشدد کی آگ بھڑکا دی۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں اکثر ملتوی ہونے والا جیسا کہ خواب واقعی حقیقت تو نہیں بن گیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی نے شہادت کا درجہ حاصل کر لیا، اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن کیا ابھی مزید کوئی قیمت دینا باقی ہے؟

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو گھڑیال نے جب نصف شب ہونے کا اعلان کیا تھا تو پنڈت نہرو نے کہا تھا

" بہت دنوں کی بات ہے ہم نے اپنے مقدر سے ایک عہد کیا تھا۔ آج وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں اپنا عہد پورا کرنا ہوگا، مکمل طور پر ہی نہیں بلکہ مستحکم طور پر بھی۔ تاریخ انسانی کی ابھی صبح ہی تھی، جب ہندوستان نے کبھی نہ ختم ہونے والا سفر شروع کیا تھا۔ پچھلی بے نشان صدیاں اس کی جدوجہد کے نقوش اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی [illegible] علامتوں سے پُر ہیں ... آزادی کے جنم سے پہلے جنم کے عمل کے تمام مصائب کو ہم نے جھیلا ہے اور ہمارے دل اس تکلیف کی یادوں سے بوجھل ہیں۔ ان مصائب میں سے کچھ تو آج بھی موجود ہیں ... " بلکہ ان مصائب نے بیسویں صدی کی اس آٹھویں دہائی میں خوفناک قوت و توانائی حاصل کر لی ہے۔

مگر ۱۹۴۷ میں کس کا خیال کس کا تصور صحیح تھا؟ گاندھی کا؟ جناح کا؟ مصنف کے لیے اس سوال کے جواب کی تلاش ایک ذاتی پہلو بھی رکھتی تھی۔ میں ایک ہندوستانی مسلمان ہوں۔ میرے نانا میر حبیب اللہ ایک کشمیری تھے جنہوں نے امرتسر میں شالوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں امرتسر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور میری ماں کا خاندان، حالات پناہ گزینوں کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا۔ میرے دادا بڑی کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ وہ بہار کے اپنے گاؤں کی غربت اور افلاس سے گھبرا کر بھاگے اور معاش کی تلاش میں کلکتہ کے صنعتی قرب و جوار کا رخ کیا۔ وہ ایک ہندو تھے جن کا نام مریانک تھا۔ مگر بعد میں وہاں جمنے کے بعد وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام شیخ رحمت اللہ رکھ لیا۔ میرے والدین کی شادی ملک کی اس تقسیم سے پہلے

ہوچکی تھی جس نے خاندان کے دونوں حصوں کو دو الگ الگ ملکوں میں پہنچا دیا تھا۔ میرے والدین پر پاکستان چلے جانے کے لیے بہت زور ڈالا گیا، اس تحریک کو ترک کرنے پر راضی نہ ہوئے جس سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے تھے۔ یہ تحریک تھی کانگریس۔ وہ فسادات کے دوران آنے والے ناگزیر دکھ اور مصائب کے باوجود ہندوستان میں رہے

ایک لحاظ سے ۱۹۴۷، ان لوگوں کی زندگیوں میں ایک اہم نقطۂ مرکز تھا۔ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخی نصف شب کے تین سال سے کچھ بعد ہی پیدا ہوا تھا۔ اور حقیقت کی تلاش و جستجو اور اس سے واقفیت اپنے حال کے لیے بھی اتنی ہی ضروری تھی جتنی مستقبل کے لیے۔ جستجو کے اس سفر میں میں نے اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کے ایک شعر کو جو انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بارے میں کہا تھا، اپنا راہ نما بنایا۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

واقفیت حاصل کرنے اور سیکھنے کی میری کسی دوستوں اور ساتھیوں کی اس غیر معمولی محبت اور اعانت کے بغیر ایک تجا لا حاصل رہتی جو مجھے ان سب سے بڑی فیاضی سے ملی۔ یہ تذکرہ خدا کرے رسمی نہ لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو کسی اور طریقے سے کیسے کہوں۔ خود میں نہیں جانتا۔ اویک اور ارو پ سرکار کو میں نے پہلی بار اس وقت جانا جب انھوں نے دہلی سنڈے کے لیڈیٹر کی حیثیت سے مجھے ملازم رکھا۔ آج یہ دونوں میرے دوست بھی ہیں۔ ان دونوں نے اس کام میں میری جتنی مدد کی ہے اس کی عام حالت میں نہ کوئی توقع کر سکتا ہے نہ وہ اتنی مل سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر گزاری کا اظہار کیوں کر کروں؟ پچھلی دو دہائیوں میں تین افراد نے مجھے وہ تعلیم دی ہے جس نے اس کام کو ممکن بنا دیا۔ پروفیسر ارون کمار داس گپتا، پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں میرے استاد، اسٹیٹ دہلی میں میرے ایڈیٹر خشونت سنگھ، جن کی محبت کا نقش مٹایا نہیں جا سکتا اور لائق تحسین کلدیپ، خشونت سنگھ کا شکر گزار ہیں ان کے اس تنقیدی جائزے کے لیے بھی ہوں جو انھوں نے کتاب کے پنجاب سے متعلق باب کا کیا تھا۔ اور کلدیپ نیر کا ممنون ان ضروری اور اہم دستاویزات کے لیے ہوں جو ان کے پاس تھیں اور انھوں نے مجھے دیں۔

اپنے ساتھی شبھا برتا بھٹا چاریہ کا بھی خصوصی شکریہ مجھ پر واجب ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب کے کشمیر سے متعلق باب کی تیاری میں میری مدد کی بلکہ اس بات کا بھی شکریہ کہ انھوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ مانی چیٹرجی تو میری اتھیں۔ تحقیق اور تصحیح میں ان کی مدد و معاونت دینے میں ان کی بے تکلف فیاضی کا بدلہ دیا ہی نہیں جا سکتا۔

اپنے دوست ضمیر انصاری اور سونی لہتا کا بھی شکر گزار ہوں ان کے مشوروں کے لیے جو ان دونوں نے کتاب کے پہلے اور مشکل باب سے متعلق دیئے۔ نیکھر بھاٹیا (اور یقیناً پاکی بھی) سبیر رائے، توشور پنڈت، ماشیش رائے او ڈیلی گراف اور سنڈے کے میرے تمام دوستوں اور ساتھیوں نے آزمایش کے ان ہفتوں میں میری دلجوئی اور ہمت افزائی میں کمی نہیں کی جب میں صحافت سے زیادہ اس کتاب پر توجہ دے رہا تھا۔ میرے خصوصی شکریے کے مستحق فاروق عبداللہ اور وجے دھر بھی ہیں جنھوں نے ماضی کے بارے میں مجھے ایسی معلومات فراہم کیں جسے صرف وہی فراہم کر سکتے تھے۔ انتظامی معاملات میں امداد دینے کے لیے میں لسوار کن سرکار اور شرن کمار کا بھی مشکور ہوں۔ آنند بازار لائبریری میں توشور، سانیال، اور دوسرے دوستوں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں بے پناہ تعاون دیا۔ اس کتاب کا خیال میرے ایک دوست پیٹر میئر کا مرہون منت ہے جنھوں نے مجھ پر اس وقت اعتماد کا اظہار کیا جب کہ میں نے ایک حرف بھی نہیں لکھا تھا۔ لکھنے کے فن کی نزاکتوں اور مدلل انداز میں بات کہنے کے سلسلے میں میرے کار من نے جو دست گیری اور راہنمائی کی اس سے میں نے اداریاتی کاٹ چھانٹ کے بہت سے سبق سیکھے۔

میری زندگی میں ایک غیر معمولی شخصیت ہے جس کا شکریہ میں شاید کبھی ادا نہ کر سکوں گا اور وہ ہے میری بیوی ملکہ۔ ملکہ نے مجھے اتنی محبت دی ہے جس کا میں کسی طرح بھی مستحق نہیں تھا۔ اس نے اپنی محبت اور خبر گیری سے گھر میں ایک ایسا ماحول بنا دیا جس نے ایک مشکل شوہر کی پرورش کر دی۔ کتاب سے متعلق اس کے مشورے اور ہدایتیں بڑی واضح اور اہم تھیں۔ میری بیٹی موکولیکا اور بیٹے پرتیک کا ساتھ میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے اور یہی مسرت میری زندگی اور کام کا عجیب و غریب جواز بھی بن گئی ہے۔ یہ کتاب ایک باپ کی اپنے بچوں کو یہ بتانے کی بھی ایک کوشش ہے کہ اس نے کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سیکھا ہے۔

پہلا حصّہ

پاکستان کا جنم

اور

ہندوستان کی بقا

(۱)

۱۹۴۷ کی منطقی بنیاد

ہندوستان نے اپنا نام انڈس نام کے اُس عظیم دریا سے لیا ہے جو ہمالیہ سے نکلتا ہے اور شمال مغرب سے بہتا ہوا بحیرۂ عرب میں مل جاتا ہے۔ انڈس خود سنسکرت لفظ سندھو کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ سندھو کا مطلب ہے دریا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے یہ بتاتے ہوئے کہ کنگ الفرڈ نے اپنے مسودوں میں انڈیا کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس نام سے مراد حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل بھی جنوبی ایشیا کے ایک بڑے ملک یا بڑے علاقے سے تھی جو دریائے انڈس کے مشرق میں اور ہمالیہ پہاڑ کے جنوب میں واقع تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے اس بڑے ملک کو آزاد کیا مگر منقسم۔ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ انڈس جس نے اس ملک کو یہ نام دیا تھا آج ایک نئے ملک پاکستان میں ہے۔

بعض مورخین نے اس خیال کو فروغ دینے میں فخر محسوس کیا کہ ہندوستان کے ایک ملک ہونے کا تصور برطانوی شان خسروی کا عطا کیا ہوا ایک تحفہ ہے۔ اس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یکجہتی محض کچھ مدت کی بات ہے سلطنت برطانیہ کے اتحاد و یکجہتی کے اثرات ختم ہوئے اور ملک کے لسانی گروہوں نے ماضی کے تباہ کن جنگ و جدال کا پھر آغاز کیا۔ موجودہ نظریہ سازوں میں ایک David Page بھی ہے جس نے اپنی کتاب Prelude to Partition، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۲ء) میں لکھا ہے "انڈین نیشنل کانگریس یا مسلم لیگ کے قیام سے پہلے ہندوستان میں ایک کوئی تنظیم موجود تھی اور جس کا اثر و رسوخ دور افتادہ گاؤں تک پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ تنظیم تھی خود امپیریل قوت۔

دہلی پر انگریزوں کا تسلط ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا۔ یقیناً ایک [illegible] بڑے علاقے کو متحد کر دیا۔ اور اس کا یہ

مل ایک ایسے علاقے میں ہو جس میں پایا لگتا ہے کہ ہزاروں برس سے نہ تو کوئی قدر مشترک تھی اور نہ ہی ایک دوسرے کو قریب لانے کا کوئی عنصر۔ حضرت عیسیٰ سے ڈھائی سو سال پہلے اشوک کی حکومت نے بدھ مت کو حکومت کے کونے کونے تک پہنچا دیا مگر بظاہر اس نے مشترکہ پہچان کے کسی احساس کو پروان نہیں چڑھایا۔ برہمنیت کے وضع کردہ فطری انصاف کے اصول صدیوں سے عوامی عقیدوں کا حصہ رہے ہیں مگر کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان میں قانون کا احساس برطانوی عدالتوں کی دین ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ اکبر کے انتظامی ڈھانچے نے اس کی عظیم سلطنت کو یکجا اور مستحکم رکھا۔ مگر ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ضلع کا انگریز کلکٹر تھا جس نے ہندوستانیوں کو خود حکومت کرنے کے سبق یاد کرائے۔ شنکر نے ہندو مذہب کی تبلیغ کی اور ولیم آف نارمنڈی کے برطانیہ پہنچنے سے پہلے کیرالا سے کشمیر تک کی مسافت طے کر ڈالی۔ مگر یہ سہرا برطانوی ریلوں کے سر باندھا جاتا ہے جنہوں نے نقل و حمل اور رسل و رسائل کا ایک جال سا بچھا کر ہندوستانیوں کو متحد کر دیا۔ برطانوی حکومت کی مہربانیوں سے ملک کے اتحاد کا یہ نعرہ متعدد طریقوں سے رد کیا جا سکتا ہے۔ مگر سب سے آسان دلیل یہ حقیقت ہو گی کہ خود ۱۹۴۰ میں بھی اس ملک کا تقریباً نصف حصہ برطانوی حکومت کے تحت نہیں تھا۔ بلکہ اس پر اس کے دیسی اتحادی راج کرتے تھے جن کے مفاد ہندوستان سے منافی ہوتے تھے۔ مدرسوں میں استعمال ہونے والے نقشوں میں سارا ہندوستان لال رنگ کا ضرور دکھایا جاتا تھا مگر اصولی اور تکنیکی لحاظ سے ریاستیں برطانوی ہند کا حصہ نہیں تھیں۔ حصول آزادی کے وقت ان ۵۶۲ ریاستوں میں سے ہر ایک سے الحاق کا ایک الگ الگ معاہدہ کرنا پڑا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان جاگیردارانہ ریاستوں اور حکومتوں میں منقسم رہ چکا ہے اور اس کا نقشہ مختلف حکمرانوں کی شکست و فتح کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے لیکن یہ بات کسی ایسے یورپین کو جس کو جرمنی، اٹلی کے بارے میں ذرا سا بھی علم ہو کسی حالت بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ یہ کہے کہ جاگیردارانہ حصے بکھرے الگ الگ حکومتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ راجوں اور مہاراجاؤں کے تنوع کے باوجود، شمال مغرب میں کوہ سلیمان اور ہندوکش سے لے کر شمال میں ہمالیہ تک اور مغرب، جنوب اور مشرق کے سمندروں تک ہمیں ایک جغرافیائی اور ثقافتی یکجہتی کا احساس بیدار نظر آتا ہے۔ لاتعداد بادشاہوں اور حکومتوں کی موجودگی کے باوجود، ہردوار یا بنارس جانے کے لیے کسی ہندو کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں کسی مسلمان کو خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دینے کے لیے اجمیر میں داخل ہونے کے واسطے کوئی درخواست نہیں گزارنی پڑتی تھی۔ غرض اس سرزمین پر عقائد و خیالات کی لہر

موسموں کی تبدیلیوں سے بے نیاز رواں دواں تھیں۔ ریلوں اور سڑکوں کا فرق حقیقتاً صرف رفتار کی سُستی اور تیزی کا فرق تھا۔ جدید اور قدیم ٹکنالوجی کا فرق تھا۔ اسے کسی طرح بھی ایک نئے ملک اور پرانی افراتفری کا باہمی فرق نہیں قرار دیا جاسکتا۔

حقیقتاً انگریز جو کچھ لائے وہ تھے سیاسی نظام، علم قانون اور سائنس کے جدید رُجحانات۔ سب سے اہم سرمایہ جو ہندوستان کو انگریزوں سے ملا، انگریزوں کا دیا ہوا نہیں بلکہ ان سے ہندوستانیوں کا حاصل کیا ہوا سرمایہ تھا یعنی ایک جمہوری طرزِ حکومت۔ یہی وہ خیال اور ڈھانچہ تھا جو مہاتما گاندھی اور کانگریس کو ایسا لگا جس میں قدیم ورثے اور جدید آرزوؤں کو یکجا کیا جاسکتا تھا۔ اور اس میں وہ شکتی بھی نظر آتی تھی جو ان غیر معمولی کشمکشوں اور اختلافات کا مقابلہ کرسکتی تھی جو نوعِ انسانی اپنے مابین تخلیق کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتی۔ گاندھی جی کو اس بات کا یقین تھا کہ طبقاتی بنیادوں پر مبنی تشدد آمیز انقلاب یا جاگیردارانہ مذہبی فاشزم کے بجائے باہمی تعاون پر مبنی پالیسیاں ہی ہندوستان کو خوش حالی کا مژدہ سنا سکتی ہیں۔ اجمالی طور پر یہی فلسفہ تھا کانگریسی قوم پرستوں کا۔ اسی رویے کے مقابلے میں دوسرا نظریہ وہ سامنے آیا، جو نظریۂ فرقہ پرستی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سیدھے سادے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریے کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قومیں، باہمی مفاد کی خاطر تعاونِ باہمی کی حامل نہیں ہوسکتی ہیں۔ اقلیتیں ہندوؤں کی غلامی اور ماتحتی کا شکار رہیں گی اور اس صورت حال میں نہ تو تاریخ ہی اور نہ ہی ثقافت، باہمی تعاون کی اجازت دے گی۔ تین بڑے مذاہب ہندو دھرم، اسلام اور سکھ مذہب، تینوں کی نمائندگی کرنے والی فرقہ پرست جماعتیں تھیں۔ جمہوریت کو ایک اچھا سرمایہ سمجھنے کی بجائے بے بوجھ قرار دیا گیا۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا کہ ایک فرد ایک ووٹ کا طریقہ اقلیتوں کو حکمراں طبقے تک کبھی پہنچنے ہی نہیں دے گا کیوں کہ ہندوؤں کی زبردست اکثریت انھیں یہاں تک پہنچنے سے ہمیشہ باز رکھے گی۔ متحدہ ہندوستان میں آبادی کے اختلاط کا سرسری جائزہ بھی اس دلیل کی قلعی کھول سکتا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ پراپگنڈے کے لیے یہ ایک مفید اور نہایت آسان نعرہ تھا۔ اسی لیے اس صدی کی پہلی دہائی میں لیگی سیاست دانوں کا اولین مطالبہ علیحدہ نیابتی حلقوں کا تھا جس میں مسلمان، مسلمان کو اور ہندو، ہندو کو ووٹ دیتا۔ انگریزوں نے اس مطالبے کو آسانی سے مان لیا۔ ان کی یہ منظوری کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ یہ صورت حال ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں رکھنے کی ان کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ اور یہی طریقہ تھا کہ یہ لوگ خود انگریز کے خلاف یکجا نہ ہوسکتے تھے۔ مسلمان لیڈر محمد علی جناح نے نومبر ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس کے صدر لارڈ سینکی سے کہا تھا

"مائی لارڈ۔ ڈیوائڈ اینڈ رول' آج کا عام طریقہ ہے کہ ہندوستان میں ہم تقسیم ہوتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں۔ بکثر ہندوؤں نے ہندو برتری اور اقتدار کے فضول تذکرے سے شکوک وشبہات اور تعصبات کو مزید تقویت پہنچائی۔ ایسے ہندو خود اپنی ایک ایسی مذہبی ریاست بنانا چاہتے تھے جہاں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں سے تاریخ کی ایک عجیب و غریب بے ربطی کا بدلہ لیتے۔ ساڑھے سات سو سال کے عرصے میں کسی ہندو نے دلی میں حکومت نہیں کی تھی۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۸۵۷ء تک اقتدار کے زبردست نشیب و فراز کے باوجود دلی کے تخت پر مسلمان بادشاہ متمکن رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز عیسائیوں نے ان کی جگہ لی۔

مگر جاگیردارانہ نظام بیسویں صدی تک ایک فرسودہ تصور بن چکا تھا۔ قوت کی نوعیت اور اس کے حصول کی شرائط نوآبادیاتی نظام کے مابعد ہندوستان میں یکسر بدل گئی تھیں۔ حکمراں کے اقتدار کا جائز یا ناجائز ہونا نسل یا تلوار کے زور پر ہونے کے بجائے دونوں کی گنتی کی بنیاد پر ہونے لگا تھا۔ صدی کے آخر میں ہندوستانی دماغ پر قابو پانے کے لیے قوم پرستوں اور فرقہ پرستوں میں کش مکش شروع ہوئی۔ نیا ہندوستان کیا ہوگا اور کیسا ہوگا۔ اس کے بارے میں متضاد خواب دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۴۷ میں انگریزوں نے دو مکاتیب خیال کے لوگوں کو جزوی کامیابی عطا کر دی۔ مسلمان جو یہ کہتے تھے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ انھیں پاکستان دے دیا گیا اور ان قوم پرستوں کو جو ایک متحد اور جمہوری ہندوستان چاہتے تھے ملک کا باقی حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر جدوجہد آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ پاکستان میں جو لوگ جمہوریت کی بحالی اور ایک نامذہبی حکومت کا قیام چاہتے ہیں وہ آج بھی احتجاج کر رہے ہیں اور امید باندھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ان لوگوں نے، جیسے سکھ جو ملک کو ایک بار پھر تقسیم کرانا چاہتے ہیں، جمہوری ریاست کے خلاف اپنی جنگ کو تشدد اور غلط استدلال کی انتہائی پستیوں تک پہنچا دیا ہے۔

مورخ بپن چندر نے، ۳۰، ایک بڑی بروقت کتاب "کمیونلزم ان ماڈرن انڈیا" (وکاس پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۴) میں دونوں سیاسی تحریکات کو یوں بیان کیا ہے۔ "ہندوستان میں قوم پرستی اور فرقہ پرستی دونوں ہی حال کی پیداوار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں ہی جدید تاریخی عمل ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر ہندوستان کی تبدیلی اور اس کا تغیر۔ یہ دونوں پرچھائیاں تھیں اس روز بروز واضح ہوتی ہوئی حقیقت کی جو نوآبادیاتی نظام کے تسلط سے قبل کے سماجی ڈھانچے کی خاکستر سے پیدا ہوئی تھی۔ اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں ابھرنے والی جدید سیاست کی دین بھی تھی۔ جدید سیاست۔ عوامی شرکت کی سیاست تھی۔ رائے عامہ کی بیداری کی سیاست تھی او

وامی اقتدار و خودمختاری کی بے مثال اور انقلابی نظریے کی سیاست تھی۔ نئی سیاسی زندگی اور وفاداریوں کو بہر حال ئی سیاسی شناختوں اور ارتباط و اتحاد کے اصولوں پر مبنی ہونا تھا۔

مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن کی حمایت میں جو بعد کو مطالبۂ پاکستان کا منشور قرار پایا، تقریر کرتے وئے ۱۹۴۰ میں محمد علی جناح نے کہا تھا کہ یہ بات ایک خواب ہی ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی بھی ایک مشترکہ قومیت و فروغ دے سکیں گے۔ قوم پرستوں کا نقطۂ نظر ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے گاندھی جی کے ایک مضمون یں بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا "مذہب کی بنیاد پر انسان کو انسان سے الگ کرنا میں یہ غلط سمجھتا ہوں۔ مالگزاری، صحت عامہ، پولیس، عدلیہ یا عوامی سہولتوں کے استعمال کے معاملے میں ہندوؤں اور سلمانوں کے مفادات میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کے مابین فرق صرف مذہبی رسوم اور طور طریقوں میں ہو سکتا ہے جس سے ایک نامذہبی حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" گاندھی جی کے یہ جذبات محض زبانی یا ظاہری ہیں تھے۔ انھوں نے ان پر اپنی زندگی میں عمل پیرا ہو کر دکھایا اس حقیقت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں کہ گاندھی جی کا سب سے بڑا لڑکا مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا اس سلسلے میں جب لوگوں نے گاندھی جی کو طنز و تشنیع ہدف بنایا تو گاندھی جی نے کہا اگر میرا لڑکا مسلمان ہونے کے بعد شراب پینا ترک کر دیتا ہے (شراب اسلام یں ممنوع ہے) تو میں اس کے مذہب تبدیل کر لینے کو بخوشی قبول کر لوں گا۔ انھوں نے ان لوگوں سے جو سمجھتے ہیں مسلمان ایک الگ قوم ہیں، کہا "میرے بیٹے نے ابھی چند سال قبل اسلام قبول کیا ہے اس کا وطن پوربندر ہوگا (جہاں وہ پیدا ہوا تھا) یا پنجاب جہاں پاکستان کے تصور نے جنم لیا۔ میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں اگر ہندوستان تمھارا طن نہیں ہے تو پھر کس ملک سے تمھارا تعلق ہے؟ تم میرے بیٹے کو جس نے اسلام قبول کر لیا ہے کس دوسرے طن میں رکھو گے؟ (یہ اقتباس گاندھی جی کی اس تقریر سے لیا گیا جو انھوں نے بمبئی میں اس تاریخی کانگریس سیشن یں ۱۹۴۲ء میں کی تھی جس میں "ہندوستان چھوڑ دو" تجویز منظور ہوئی تھی)۔ اس صورت حال کا مقابلہ جناح صاحب سے کیجیے جنھوں نے اپنی بیٹی کو عاق کر دیا کہ وہ ایک پارسی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اور اس نے بہر حال ایک پارسی ہی سے شادی کی۔ جناح صاحب پاکستان چلے گئے، ان کی بیٹی ہندوستان میں رہی۔ ہندوستانیوں کو ن کی آزادی واپس دینے پر انگریزوں کو مجبور کرنے میں جد و جہد، ایثار و قربانی اور عزائم کے پچاس سال لگ گئے۔ دوسری طرف پاکستان نام کے ملک کی تخلیق و تشکیل محض سات برسوں کی قلیل مدت میں ہو گئی۔ ۱۹۴۰ سے قبل مسلم لیگ کی قیادت میں جو لوگ نسبتاً زیادہ کٹر تھے وہ بھی بار بار یہ کہتے تھے کہ وہ ایک الگ ملک نہیں چاہتے،

ان کا مطالبہ تو صرف بالغ رائے دہی ہے۔ مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے خیال کو ہر طرز فکر کے سب
قائدین نے حماقت آمیز کہہ کر رد کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے سیشن کے صدر مظہر الحق نے اس بات کو
بڑے مختصر مگر واضح طور پر یوں کہا تھا "ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ یہ الفاظ 'ہندوستانی مسلمان' ہماری قومیت
اور ہمارے مذہب کا اعلان کرتے ہیں .... جب کبھی ہندوستان کی فلاح و بہبود اور ہندوستانیوں کے
ساتھ انصاف کا سوال سامنے آتا ہے اس وقت میں صرف ایک ہندوستانی ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ پہلے ہندوستانی
ہوتا ہوں"۔ مولانا محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "مسلمان خدا کے احکام
کے معاملے میں اول مسلمان، دوم مسلمان اور آخر میں مسلمان اور مسلمان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا مگر جب
تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اول ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور بہر حال ہندوستانی ہوں"
۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کے صدر خان صاحب محمد عبداللہ نے بائیسویں سیشن کو خطاب کرتے ہوئے
۲۶ دسمبر کو کہا تھا "سب سے پہلے اور انتہائی صفائی کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اتنے ہی ہندوستانی ہو
نے کے دعوے دار ہیں جتنی ہندوستان میں کوئی دوسری قوم دعوے دار ہو سکتی ہے اور ہمیں بھی ملک کے حصول
آزادی سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی دوسرے کو۔ دقتیں اس وقت درپیش ہوتی ہیں جب ہم پر
اسلامزم کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ محض اس لیے کہ ہم کچھ خصوصی تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں
ہم ہندوستان میں مسلم راج کی حکومت کے منصوبے بنا رہے ہیں میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانیوں
کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمان سر زمین ہند کے ہیں اور ہمارا نقطہ نظر بنیادی طور پر ہندوستانی ہے۔۔
ہمیں ایک مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے فروغ اور خوشحال اور ترقی پسند ہندوستانی قوم کی تعمیر کے لیے
کوشش کرنا چاہیے یہ مشترکہ ثقافت ملک کی ان مختلف تہذیبوں کے مجموعے سے اس ملک میں رائج ہے
بہترین عناصر پر مشتمل ہوگی لیکن جب تک ایک کمیونٹی دوسری کمیونٹی پر اپنے تسلط کے لیے کوشاں رہے گی اور
ہندو یا مسلم حکومت کے خواب دیکھے گی اس وقت تک ایک عظیم اور آزاد ملک بنانے کی ہماری جائز
آرزوؤں کی تکمیل کی کم ہی امید رکھی جا سکتی ہے۔"

پاکستان کا قیام سوائے تھا مگر یہ بھی بہر کیف تھا ہر دو گروں کا۔ درحقیقت مسلمانوں کا ایک حصہ بالخصوص آخر وقت تک
گاندھی اور قوم پرست جماعت کے ساتھ رہا۔ سب میں عظیم تر جیسے ابوالکلام جن کے دینی علم و فضل نے انہیں اپنے
ایک قوم کا امام کہلانے کا حق دیا تھا۔ دوسری طرف قوم پرست جمعیت علماء ہند تھا۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ ہم ہندوستانی ہیں

...ن موثر تقریر میں مل جاتا ہے جو انھوں نے ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے رام گڑھ سیشن میں کی تھی۔ یہاں وہ اُسی ہفتے میں ...نگ کے صدر منتخب ہوئے تھے جس ہفتے میں مسلم لیگ نے لاہور میں پاکستان کی تجویز منظور کی تھی۔ "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں ...ئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی ...وین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

اگر ہندوستان کا اتحاد اور سالمیت ایک بار پھر تباہ ہوتی ہے تو اس کے اسباب اس دفعہ بھی وہی ...وں گے جو پچھلی دفعہ تھے یعنی ایک اقلیت کی قیادت نے شعوری طور پر بڑھا کر ہوئے تشدد کے درمیان ...س نقطہ نظر کو پھیلانے کا اہتمام کر لیا کہ ایک ہندو اکثریت انھیں یا تو غلام بنا لے گی یا پھر ان کے وجود ہی کو ختم کر دے ...ی۔ مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ ہندو سیکولرزم ایک دکھاوا ہے اور اس کی جمہوریت، مسلمانوں کو غلام بنانے کے اس کے زہریلے ارادے پر پردہ ڈالنے کی ایک چال۔ آج سکھوں کو بھی یہی یقین دلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ...ن کا مذہب، ہندوؤں کی اسے اپنے میں جذب کر لینے کی کوشش سے اس وقت تک نہ بچ پائے گا ...ب تک کہ وہ خود اپنا ایک الگ ملک حاصل نہ کر لیں۔ ہندوستان کے نقشے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی سے پتہ ...ل جاتا ہے کہ نازک اور حساس مقامات کہاں کہاں ہیں۔ پنجاب کی سکھ ریاست اور جموں و کشمیر کی مسلم ریاست۔ یہ ...یاستیں خود ایک دوسرے سے ملحق ہیں اور پاکستان سے بھی ملی ہوئی ہیں۔ دہلی حکومت کے مبلغین دعوؤں کو ...ل دینے کی سعی میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پنجاب اور کشمیر کو ہندوستان میں نہیں رکھا جا سکے گا۔ اگر نئی حکومت ...کرنے کی ... کوئی ... سے ... ہے تو ہندوستان کے نقشے میں تبدیلی ایک دوسرے ...ڈھنگ سے ہوگی۔ اگر ہم مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء کی تقسیم ... کو سمجھ لیں۔ کیونکہ اس فیصلے کا منطقی ... ملک کی نظریاتی اساس مضمر ہے اور اس ...

کی صحت یا اس کے عدم صحت پر ہی ملک و قوم کی ناکامی یا کامیابی کا انحصار ہے۔ ۱۸۸۵ء میں ایک منکسر المزاج انگریز Allen Oclavia Hume کی دین کانگریس کا قیام ۱۹۴۷ء تک کے سفر کا ایک بنیادی واقعہ تھا تاریخ کے نشیب و فراز سے ہر وقت مطابقت دیتے ہوئے کانگریس نے اتنے عرصے اپنے آپ کو زندہ رکھا کہ اسے موہن داس کرم چند گاندھی جیسا ایک قائد نصیب ہو گیا جس نے وکیلوں کی اس پارٹی کو ایک عوامی پارٹی میں تبدیل کیا اور آزادی کی راہ دکھائی۔ گاندھی سے پہلے کے عہد میں بھی مختلف مذہبی فرقوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے اہم سوال پر کانگریس کا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا۔ اس کا پہلا صدر اگر انگلستان سے آیا ہوا ایک عیسائی تھا تو تیسرا بمبئی کا ایک مسلمان بدرالدین طیب جی۔ مسٹر بدرالدین طیب جی نے اپنے صدارتی خطبے میں پُرزور طریقے پر یہ کہا تھا "کم از کم میں ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی تعلقات میں وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، کوئی ایسی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا جو ایک فرقے کے لیڈروں کو دوسرے فرقے کے لیڈروں سے اور اس جدوجہد سے الگ کرتی ہو جو ہم سب مفادِ عامہ کی خاطر عظیم عوامی اصلاحات اور عوامی حقوق کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔"

انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ ہندوستان میں دریافت اور از سرِ نو جاگنے کا زمانہ تھا۔ پرانا نظام اقتدار و اختیار کا جاگیردارانہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا اور مختلف مفادات رکھنے والے مختلف گروہ ان طریقوں کی تلاش میں لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے مرتبے اور اپنے مقام کو استحکام بخش سکیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایک نئے انگریزی داں طبقے نے اصل ہندوستان کی دریافت کرنے اور اسے نئے ماحول میں صحیح مقام دلانے کی اپنی کوشش میں اپنے نظریات و جذبات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ کیشب چندر سین جیسے مصلحین نے ایک عظیم وفاق میں ذات پات کی پابندیوں سے آزاد، اور ایک متحدہ ینگ انڈیا کی خواہش ظاہر کی۔ دوسروں نے جن کی آرزوئیں اور خواہشیں مختلف تھیں، ایک ایسی سرکاری زبان کی تلاش شروع کی جو شمالی ہندوستان کی ہندو خصوصیات اور ہندو جذبات کی انگریزی اور فارسی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترجمانی کر سکے۔ ہندی اسی ضرورت کی پیداوار تھی۔ ماضی کی وضاحت کرنے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے تاریخ اور ادب کی تخلیق ہوئی۔ یہ ایک عام خیال تھا کہ سفید چمڑی والوں کی حکومت ایک عارضی حقیقت ہے مگر سوال یہ تھا کہ انگریزوں کے بعد سریرِ حکومت پر کون آئے گا اس سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیے جاتے تھے۔ آزاد خیال (لبرل) طبقۂ اشراف ایک عظیم اور اچھے آدمی کے وضع کیے ہوئے آئین کی حکومت چاہتا تھا۔ دوسرے بہت سے لوگ بڑے خطرناک ارادے اور آرزوئیں رکھتے تھے۔ اس صدی کے ایک سب سے زیادہ ممتاز فرقہ پرست ایم۔ ایس گولوالکر نے اپنی کتاب میں اپنے خیالات کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب "دی" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ "اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر رہنا

چاہیے صرف ایک ہندو ہی سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے، جن لوگوں کے عقائد کی جڑیں اس برصغیر میں نہیں وہ بدیسی ہیں۔ مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور پارسیوں کو ہندو کلچر اور ہندو زبان کو اپنانا ہوگا، انہیں ہندو دھرم کا احترام اور اس کی تعظیم و تکریم کرنا سیکھنا ہوگا۔ انہیں اپنے دماغوں کو بالکل صاف کرکے صرف ہندو نسل اور ہندو تہذیب کی مدح وثنا کرنا ہوگی ...... (وہ) ملک میں رہ سکتے ہیں مگر ہندو قوم کے ماتحت محض ہو کر، کسی چیز کے دعوے دار نہیں ہو سکتے، کسی قسم کی مراعات کا ان کو حق نہیں ہوگا، کسی ترجیحی سلوک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، ایک عام شہری کے حقوق بھی ان کے نہیں ہوں گے ...... اور ملک میں صرف ہندو ہی قوم ہیں اور مسلمان اور دوسرے لوگ جو اس قوم مخالف نہ بھی سمجھے جائیں، قوم سے باہر ضرور ہوں گے۔" راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ وہ تنظیم تھی جس کی گولوالکر نے بہت دنوں قیادت کی اور یہی وہ تنظیم تھی جس نے مہاتما گاندھی کے قتل کی ہمت افزائی کی تھی۔ بہرحال ایسی ہندو جنیا پرستی کو جو متوسط طبقے کے بھی صرف ایک حصے کی آرزو تھی ایک ایسے ہندوستان میں کچھ مقبولیت نہیں مل سکی جس کی اسی فی صد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان صرف اس لیے سیکولر نہیں ہے کہ اس کی آبادی کا پانچواں حصہ مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں پر مشتمل ہے اور ایک سیکولر آئین میں اس کا ذاتی مفاد مضمر ہے۔ بلکہ ہندوستان اس لیے سیکولر ہے کہ یہاں کے دس میں سے نو ہندو اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کے تشدد پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر سارے ہندو کٹر اور تشدد پسند ہوتے تو قانون اور ضابطے کی کوئی طاقت بھی ان مسلمانوں کے قتل عام کو روک نہیں سکتی جو ملک بھر میں گاؤں اور قصبوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے طبقہ اشراف کے جو صدیوں سے جاگیردارانہ دور حکومت کی پیداوار تھا، دو اہم حصے تھے۔ ایک زمیندار اور دوسرے علماء۔ دونوں ہی جمہوریت کے خیال سے کچھ بہت خوش نہیں تھے کہ اس میں یقیناً اصلاحات اراضی اور ایک عام قانون ہوگا۔ لفظاً اور عملاً اسلام میں ایک دوسرے سے جس طرح وابستہ ہیں ایسا کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ قرآن اور حدیث بالترتیب فرمان الٰہی ہے اور سماجی قانون کی اساس۔ اس میں ملّا کا اثر ہے اور قوت کرتا دھرتا و ترجمانی سمجھا کرتا ہے اور دینی علم بھی ہے۔ ملّا صرف مسلم عدالت ہی میں بااثر نہیں ہے وہ فرقے کی روزانہ زندگی پر اور تعلیمی نظام پر بھی قابو رکھنے کی وجہ سے اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ قانون اور تعلیم پر سے اپنے اس قابو اور کنٹرول سے دست بردار ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا کیوں کہ یہی دونوں چیزیں مسلم فرقے کی روحانی اور تشکیل کرتی ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی ایسے سماج کی تشکیل کی خواہش نہیں کر سکتا جس میں قانون اور تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہو۔ اور اسی لیے ملاؤں کے ایک حلقے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی اور جذباتی بُعد پیدا کرنے کی کوششوں کی قیادت سنبھال لی۔ یہی کوششیں بعد کو جغرافیائی علیحدگی کی تمہید ثابت ہوئیں۔ اس گروہ کا پہلا نشانہ شہری اور نیم شہری

متوسط طبقہ تھا جس کی کارکردگی اس کی تعداد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اس کا سب سے موثر ہتھیار خوف تھا اور اسی میں اسے اکثر ہندوؤں سے زبردست مدد ملی جو کہ نیا دستیاں تحقیقی ہندو راستے ماں کی حیثیت سے پیش کی جاتی تھیں اور جن کے خواب و خیال آئندہ حالات کا منظر کہہ کر دہرائے جاتے تھے جو مسلمان حکومت ہندوؤں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد ہوں گے تو جنگ یہ تھا کہ مسلمان خطرے میں ہے۔ پہلا حل تحفظ کی آئینی ضمانتیں تجویز کیا گیا۔ بعد کو کوئی ضمانت بھی کافی نہیں سمجھی گئی اور مطالبہ ایک الگ ملک کی مانگ میں بدل گیا۔ ایک ملک جس میں مثلاً ایک مذہبی آئین کے ذریعے خود اپنا تحفظ کر سکے گا یہ ایک مشکل کام تھا اور اس میں کافی وقت لگا۔ پچھلی صدی میں سنٹرل پروونسز (سی۔ پی) میں ۱۸۷۲ء میں، بہار میں ۱۸۸۱ میں اور یو پی میں ۱۸۹۱ء میں سرکاری کاموں میں انتظامی اصلاحات کے ضمن میں ہندی کے استعمال کا جو فیصلہ ہوا اسے بڑی چالاکی سے اس خوف کو پھیلانے میں استعمال کیا گیا کہ یہی تو ابتدا ہے ان کوششوں کی جو مسلمانوں کو (جو ہندی نہیں اردو جانتے ہیں) سرکاری نوکریوں سے محروم رکھنے کے لیے کی جائیں گی۔ اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے پراپگنڈے پر متوسط طبقے کے افراد کا ردعمل کیا ہوگا۔

زمیندار، نواب اور خان بہادر حضرات بڑی خوشی سے ان مُلاؤں سے مل گئے۔ دو روایتی قوتوں کا یہ ایک بڑا دلچسپ کلاسیکی ملاپ تھا۔ ان میں سے ایک کو اپنی اقتصادی قوت بچانے کی فکر تھی اور دوسری اپنی سماجی برتری کو برقرار قائم رکھنے پر کمربستہ ہو گئی تھی۔ ۱۹۰٦ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ اسی اتحاد کی پیداوار تھی۔ اس کا آغاز ڈھاکہ میں، ڈھاکہ کے نواب کی ایما اور پہل پر ہوا تھا۔ بنگال کے خاص صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مگر اقتصادی قوت ہندو زمینداروں کے ہاتھ میں تھی، نفرت کے بیج بونے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کشمکش کا ایک مستقل ذریعہ گائے کا ذبیحہ ہو سکتا تھا۔ ملاؤں کا دعوی تھا کہ یہ ان کا حق ہے اور کٹر ہندو چاہتے تھے کہ ان کا فرقہ مسلمانوں کو قتل کر کے گائے کا تحفظ کرے۔ ایسی فضا میں قوم پرست عموماً ناقابل اعتنا اور بے اثر ہو جاتے تھے۔ "دی بنگال مسلمز ۱۹۰٦ء۔۱۸۷۱ء (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) میں رفیع الدین احمد نے لکھا ہے " ایک بنگالی مسلمان لیڈر بیرسٹر اے۔ رسول جس نے اپنے آپ کو اس وقت موثر بحث میں آئے ہوئے ایک تنازعہ میں پھنسا لیا جب انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ اخوت اور بھائی چارگی کی خاطر مسلمانوں سے رضاکارانہ طور پر گائے کشی کو ترک کرنے کی وکالت کی۔ ... (انھوں نے) کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگیوں کا ایک دوسرے پر اتنا انحصار ہے کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مختلف مذاہب کو ماننے والا کہتے ہیں مگر دلوں میں اور اپنے عمل میں وہ ایک جیسے ہیں۔" مشرف کی اس معقول اور اعتدال پسندانہ بات کو قبولیت نصیب نہ ہوئی نہ ان کے ہم مذہبوں میں اور نہ ہی ہندوؤں میں۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے ایک مسلم اکثریت والے حصے اور ایک ہندو اکثریت والے حصے بنانے کے لیے صوبہ بنگال کی تقسیم کی۔ جب لوگوں کو یہ علم ہوا کہ اس قسم کا کوئی فیصلہ زیرِ غور ہے تو دونوں فرقوں نے زبردست احتجاج کیا۔ لارڈ کرزن نے انعام و اکرام کی پیش کش کر کے مسلمانوں کو ملا لیا۔ ۱۸ فروری ۱۹۰۴ میں ڈھاکہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے لارڈ کرزن نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ ڈھاکہ میں مسلم قوت کا ایک مرکز بنانے میں ان کی مدد کریں گے "جو مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں وہ اتحاد و یک جہتی پیدا کر دے گا جو انھوں نے مسلمان وائسرائے اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بھی نہ دیکھی ہوگی
مسلم لیگ کو اپنی جاگیردارانہ اور مذہبی فطرت کے اظہار میں بھی تردّد نہ ہوا۔ ۱۹۰۷ء کے اس کے آئین نے رکنیت چار سو بارسوخ اور اہل حیثیت افراد تک محدود رکھی۔ اس کا پہلا مطالبہ اُن ضمانتوں کا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے الگ حلقہ انتخاب کی مانگ کی۔ مسلم لیگ کے قیام کے محض تین سال بعد ۱۹۰۹ء کے انڈین کاؤنسل ایکٹ (جو مارلے منٹو ریفارمس کے نام سے مشہور ہے) نے علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب اور قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی الگ اہمیت اور حیثیت کو دستوری طور پر تسلیم کر لیا۔ مگر مسلم لیگ کو کچھ عرصے بعد ہی ایک زبردست دھکا اس وقت لگا جب ۱۹۱۱ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے "دہلی دربار" میں کنگ جارج پنجم نے بنگال کی تقسیم کے ناسور کو ختم کر کے اور صوبے کو پھر سے متحد کر کے ہندوستان کو ایک عطیہ دے دیا۔

ایک افسردہ و غمگین نواب سلیم اللہ نے ۱۹۱۲ء میں عملی سیاست سے دست کشی اختیار کر لی۔ مسلم لیگ نے اب تک ہندوؤں کے تسلط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے خیال سے برطانوی حکومت کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے سیلف گورنمنٹ کے کانگریس کے مطالبے کو مان لیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح اور سر وزیر حسن اور کانگریس کی طرف سے موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو نے دونوں پارٹیوں کے مابین مشہور و معروف لکھنؤ پیکٹ کی تدوین کی۔ اس معاہدے کے امکانی عواقب کو مسلم لیگ کے لیڈر راجہ محمود آباد نے خوش آمدید کہتے ہوئے بہت اچھے طریقے پر بیان کیا تھا "ہم ہندوستانی پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں" (۱۹۸۲ میں پاکستان کے جنرل ضیاء سے مصنف کی ایک گفتگو میں اس بیان کی بڑی دلچسپ بازگشت سننے میں آئی تھی۔ جنرل نے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ ہندوستانی مسلمان خود اپنی شناخت مانیں۔ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا فخر ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی پہلے، مسلمان بعد میں کہنے میں فخر محسوس کریں۔ ایسا سننے کے بعد میرا سر فخر سے تن جائے گا۔" بڑا اعلیٰ خیال ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کے لیے ہندوستانی ہونا اور اس پر فخر کرنا ممکن ہے تو ملک کی قطع و برید کر کے پاکستان کیوں بنایا گیا؟)

مسلم لیگ کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ جو پارٹی مسلمانوں کے نام پر بنی تھی اسے خود مسلمانوں کی حمایت نہیں مل رہی تھی۔ مسلمانوں میں زیادہ دلچسپی کانگریس سے نظر آتی تھی۔ اس مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ حقیقی معنوں میں باقاعدہ جماعتیں تھیں ہی نہیں۔ یہ دراصل تحریکیں تھیں۔ ایک ملک کی آزادی کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے تحفظ کے لیے۔ محمد علی جناح جیسے پرانے لیڈر صدی کی دوسری دہائی میں بیک وقت دونوں تنظیموں میں اہم عہدوں پر فائز رہے اور بغیر کسی قسم کی دشواری محسوس کیے ہوئے۔ یہ تو جب گاندھی جی نے کانگریس کے لیے ایک مستحکم نظریاتی اساس کی تشکیل شروع کی اس وقت سے ہندو اور مسلمان فرقہ پرست کانگریس سے دور ہونا شروع ہوئے۔ یہ صورت حال خود گاندھی جی اور ان کے ساتھ ان کے نئے دست و بازو جواہر لال نہرو، سبھاش بوس، مولانا آزاد اور آچاریہ کرپلانی جن کی گاندھی جی تربیت کر رہے تھے سب ہی کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔ تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے مسلم لیگ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جاں بلب تھی۔ تین افراد جو اسے اب بھی بچا سکتے تھے مر چکے تھے۔ تحریک خلافت کے پرجوش قائد مولانا محمد علی ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو لندن میں ذیابیطس کے مرض میں انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین یروشلم میں ہوئی۔ اسی سال ۳۱ مئی کو راجہ صاحب محمود آباد پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ بھی اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان دونوں کے بعد ۶ جنوری ۱۹۳۲ء کو پنجاب کے لیڈر سر محمد شفیع بھی رحلت کر گئے۔ بددل اور مایوس جناح صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے بعد لندن ہی میں رک گئے کہ وہاں اپنی وکالت کی پریکٹس کی تجدید کریں۔

آزادی سے قبل مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر چودھری خلیق الزماں اپنی کتاب (پاتھ وے ٹو پاکستان۔ لانگ مینس ۱۹۶۱) میں اپنی پارٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں "مسلم لیگ پر ۔ خطاب یافتہ شرفاء، نوابوں، زمینداروں اور جی حضوریوں کا تسلط تھا۔ ... ۱۹۰۶ء میں اس کے قیام کے بعد ہی سے مسلم لیگ کی سرگرمیاں تقریباً ہمیشہ ہی اندرون خانہ سرگرمیوں تک محدود رہیں۔ اس کے سالانہ اجلاس بھی سجے سجائے پنڈالوں میں یا کبھی بڑے ہال میں ہوا کرتے تھے جن میں خصوصی اجازت ناموں کے ذریعے معدودے چند عزت مآب حضرات کو شرکت کا موقع ملتا تھا۔ بڑے بڑے عوامی جلسوں سے مسلم لیگ واقف ہی نہیں تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں اس کے قیام کے بعد سے ۱۹۱۰ تک اس تنظیم کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔ رکنیت کی فیس اور سالانہ چندوں سے آنے والی رقم عوام میں کام کے لیے تو کم تھی ہی وہ سیکٹے کا ایک دفتر چلانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تین ہزار روپے سالانہ کی امداد پر اس نے اپنی زندگی گزارنا شروع کی یہی رقم اس کی اصل مقررہ آمدنی تھی۔

مسلم لیگ کو بچانے کے لیے ۱۹۳۴ میں بہرحال جناح صاحب کو واپس آنے پر مجبور کر لیا گیا۔ اسی سال فروری کے مہینے میں اسلیم پور کے راجہ نے دہلی کے سیسل ہوٹل میں جناح صاحب کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا اور اس میں انھیں یو۔ پی۔ کے مسلم تعلقہ داروں سے انھیں متعارف کرایا گیا۔

۲ جولائی ۱۹۳۵ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو شاہی رضامندی حاصل ہو گئی۔ اور ۱۹۳۷ کے انتخابات کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ ان ہی انتخابات کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں میں پہلی بار حکومت، ہندوستانی پارٹیوں کو سونپی جانے والی تھی۔ یہی موقع تھا کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیے، یہ ثابت کرنے کا کہ انھیں ان عوام کی حمایت حاصل ہے جن کی نمائندگی کا وہ دعویٰ کرتی ہیں۔ جناح صاحب نے پورا زور لگایا، گھر گھر جا کر مسلم لیگ کا ساتھ دینے کی بات کرنے والے علماؤں کی پشت پناہی کی مدد سے "ہندو جبر و استبداد" کو اپنی مہم کا محور بنایا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۲ کروڑ ہندو ۷ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دیں گے اور ان ہندوؤں کو مسلمانوں کی اس بربادی کے لیے کانگریس کی شکل میں ایک موثر ہتھیار مل گیا ہے۔ ۱۹۳۷ میں مسلم لیگ کے اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ "ایسی قوتیں ہیں جو تم کو چھیڑیں گی، تم کو ڈرائیں اور دھمکائیں گی۔" اپنے ۱۹۳۸ کے خطبے میں انھوں نے کہا کانگریس مسلمانوں سے غیر مشروط طور پر ہندو راج کی ماتحتی قبول کرانا چاہتی ہے ...... کانگریس ہائی کمانڈ عزم کر چکی ہے، مصمم عزم، تمام دوسری کمیونٹیز اور دوسری ثقافتوں کو نیست و نابود کرنے کا، اور ہندو راج کے قیام کا . ... (گاندھی) کا مطمح نظر ہے ہندو مذہب کا احیا اور اس ملک میں ہندو راج کا قیام۔" ہندوستانی قوم پرستی کی تعریف مسلمانوں کی غلامی سے کی گئی اور اسی لیے سب سے بڑے دشمن مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے وہ مسلمان قرار پائے جو بدستور کانگریس میں شامل رہے۔

مگر جناح صاحب اور مسلم لیگ دونوں کو یہ پتہ چل گیا کہ مسلم عوام اس نقطہ نظر سے بالکل اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ فیصلہ کن حد تک مسترد ہوئی (یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ مسلم لیگ نے صرف ایک ہی الیکشن جیتا جو ۱۹۴۶ میں تقسیم ہند سے ذرا پہلے ہوا تھا۔ مسلم لیگ خود اپنے تخلیق کردہ پاکستان میں کوئی الیکشن نہیں جیت سکا) چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ کے گڑھ یوپی کی مسلم لیگ کے لیڈر رہے تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں "ہم نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں انتخابی مہم کے لیے چندہ جمع کرنے کی خاطر بلائے گئے ایک جلسے کو خطاب کرنے کے لیے مسٹر جناح کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ جو گنگا پرشاد میموریل ہال میں منعقد ہوا تھا، بہت برا ہوا۔ یہ افسوس ناک صورت حال اس وقت مسلم لیگ سے

مسلمانوں کی دلچسپی کی آئینہ دار ہے۔ کمیونل ایوارڈ آف ۱۹۳۲ کے تحت مسلمانوں کے صوبے میں ۴۸۵ نشستیں دی گئی تھیں۔ وہ جماعت جسے مسلمانوں کا تحفظ کرنے کا دعویٰ تھا، ان میں سے صرف دس نشستیں ہی جیت سکی۔ اور یہی پارٹی تھی جسے انگریز "ہندوستانی مسلمانوں کی آواز" کہتے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود مذہبی لوگ بھی پورے طور پر لیگ کے ساتھ نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۸ء میں جمعیۃ العلماء ہند کے مولانا مدنی مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ "آج قوموں کا تعین ان کے وطن کے توسط سے ہوتا ہے، نسل یا مذہب سے قوم نہیں بنتی"۔ پچھلے سال مولانا آزاد، جمعیۃ العلماء کو غیر مشروط طور پر مسلم لیگ کو چھوڑنے اور کانگریس میں شامل ہونے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ۱۰ مئی کو الہ آباد میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں جمعیۃ العلماء نے اس سلسلے میں ایک تجویز بھی منظور کی تھی (ضیاء پرست مذہبی گروہ نے علیحدگی اختیار کی اور جماعت اسلامی کے نام سے ایک الگ تنظیم اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں بنا لی)

۱۹۳۷ میں جناح صاحب کے پیش کیے ہوئے اس فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر کی حمایت سے اکثر اہم مسلمان لیڈروں نے انکار کر دیا۔ ان میں یہ خیال پرورش پانے لگا تھا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو وہ "ضمانتیں" مل گئی ہیں، مسلم لیگ کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات مذہبی کی بجائے سیاسی منشوروں پر بڑی کامیابی کے ساتھ لڑے۔ پنجاب میں سکندر حیات خاں اور سر فضل حسین جیسے لیڈروں نے کسان لیڈر سر چھوٹو رام کے ساتھ مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی اور انتخابات میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ انتہائی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ پنجاب کی ۸۶ مسلم نشستوں میں سے صرف دو نشستیں جیت سکی (ان دو نشستوں میں بھی ایک پر راجہ غضنفر علی خاں کامیاب ہوئے تھے جو انتخابات کے بعد یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے) بنگال میں فضل حق کی کرشک پرجا سمیتی جو غریب کسانوں کے حقوق اور زرعی اصلاحات کے لیے لڑ رہی تھی فاتح ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ فضل حق نے مسلم لیگ کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کو خود ان کے حلقۂ انتخاب میں شکست دے کر یہ دکھا دیا کہ در حقیقت مسلم ووٹ کس طرف ہیں۔ سندھ میں کل ۶۰ نشستیں تھیں ان میں سے ۳۵ مسلم سیٹیں تھیں۔ ان میں سے مسلم لیگ کو ایک بھی سیٹ نہیں ملی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے ۱۸ نشستیں حاصل کیں، مسلم پارٹی نے تین، سندھ مسلم آزاد پارٹی نے دو، اور آزاد امیدواروں نے بارہ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ سر ہدایت اللہ نے ایوان میں سب ہی کے تعاون سے حکومت بنائی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کے لیے انتخاب کے نتائج اتنے ہی شرمناک تھے۔ غرض مسلم لیگ کے لیے ان علاقوں میں جو بعد کو پاکستان بننے والے تھے، مسلم عوام کی حمایت کا یہ حال تھا۔

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ضرور لگے گی مگر حقیقت یہی ہے کہ مسلم لیگ مسلم اکثریت والے علاقوں میں بھی، جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ بادشاہ ہوگی بہت حمایت کبھی بھی حاصل نہ کر سکی کشمیر میں ایک شاہی ریاست ہونے کی وجہ سے انتخاب نہیں ہوئے تھے مگر وہاں بھی مسلم عوام نے مسٹر جناح کی ان تھک کوششوں کے باوجود، مسلم لیگ کے مقابلے میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو ترجیح دی۔ خود صوبہ متحدہ (یو۔ پی) میں بھی، جہاں کٹر مسلم لیگیوں کا اچھا خاصا مجمع تھا، مسلم لیگ ۶۶ مسلم نشستوں میں سے صرف ۲۹ نشستیں جیت پائی۔ اس صورت حال کے باوجود، یہ افسانہ حقیقت کے روپ میں مشہور ہو گیا کہ مسلم عوام پاکستان چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی حمایت یقیناً حاصل کی مگر یہ صرف اس وقت ممکن ہوا جب ملک ایک عظیم طوفان کے پیدا کیے ہوئے بھنور میں پھنس کر ناچ رہا تھا۔ انسانی معاملات میں ایسے طوفان شاذ و نادر ہی آتے ہیں مگر اس کی قوت ہر ایک کو اندھا ضرور کر سکتی ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۳۷ کے انتخابات عوامی رجحان کے سچے مظہر نہیں تھے۔ ووٹ کے اختیار کو جو ۱۹۳۲ کے انتخابات میں بہت محدود اور پیچیدہ تھا، وسعت دے دی گئی تھی۔ اور کسانوں کو پہلی دفعہ ووٹ دینے کا موقع ملا تھا۔ اسی الیکشن میں کانگریس نے اپنے قومی پلیٹ فارم سے انتخابات میں اتحاد، جمہوریت، سیکولرزم اور ۔ دی صدارت کے زمانے میں سوشلزم کے نعروں کے ساتھ شرکت کی اور یہ دکھا دیا کہ اس کی حمایت کی بنیادیں کتنی گہری ہیں۔ کانگریس کی جیت اچھی جیت تھی۔ مسلم نشستوں کے حلقے میں بھی کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھائی تھی اور ان ۵۸ سیٹوں میں جس پر اس نے اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے ۲۶ سیٹوں پر کامیابی حاصل کی (ہندو فرقہ پرست پارٹی ہندو مہاسبھا نے بھی جو مسلم لیگ کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، اتفاق سے ان انتخابات میں بری شکست کا منہ دیکھا) ۱۹۳۷ کے انتخابات اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل تھے کہ ملک کے سارے مسلمانوں کی نمائندگی کے مسلم لیگ کے دعوے کو کسوٹی پر پرکھنے کا پہلا موقع سامنے آیا تھا اور اس کے نتائج کا اور بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی یا جناح، کس کی خلاصی نے عوامی ذہن کو متاثر کیا تھا؟ گاندھی نے ایک سیدھا سادا نعرہ دیا تھا جسے انھوں نے اپنی انوکھی خوب صورت انگریزی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا دلی ملاپ کہا تھا۔ اور اس کے اظہار کے لیے "ہندو مسلمان کی جے" کا نعرہ تجویز کیا تھا۔ عدم تشدد، اس فلسفے کا بنیادی عنصر تھا۔ ۱۹۲۰ کے کلکتہ سیشن کے بعد جب سے گاندھی جی نے کانگریس کا چارج لیا تھا، ان عوام کو ان کا یہی پیغام تھا جس سے خود ان کو محبت تھی اور وہ خود انھیں چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو کسانوں کے مسائل سے وابستہ کرایا اور ان کے مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے جدوجہد کی، بہار کی نیل تحریک یا گجرات میں باردولی کی جدوجہد

گاندھی جی کو اُن جیسے ہندو اور مسلمان، حکومت کے روایتی ٹھیکیداروں سے نفرت تھی۔ ان کا تعلق تو چند افراد سے نہیں لاکھوں لوگوں سے تھا۔ (اور لاکھوں یقیناً اسمبلی کے ٹکٹ یا سیاست داں نہیں بننا چاہتے) ان میں اس بات کی جرأت و ہمت پیدا کرنا کانگریس کا ان لوگوں سے وعدہ رہیں جو اسے مسلم لیگ جیسی یا ہندو جماعت میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔" ڈاکٹر موجے اور ساورکر جیسے ہندو جو تلوار کی طاقت کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کو ہندو اقتدار و تسلط کے ماتحت رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں اس حلقے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ میں کانگریس کی نمائندگی کرتا ہوں۔" انھوں نے ۱۹۳۲ء کے کانگریس سیشن کی اپنی تقریر میں وضاحت کی۔ "اور بالکل اسی طرح جس طرح وہ کانگریس کو ایک ہندو پارٹی بنانے کی اجازت نہیں دیں گے ویسے ہی مسلم لیگ کے اس حق کو بھی وہ نہیں مانتے ہیں کہ وہ سارے مسلمانوں کو لیگ کی جاگیر سمجھے۔ یہی وہ چیز تھی جو جناح صاحب چاہتے تھے کہ کانگریس مان لے۔ اور یہی وہ بات تھی جسے کانگریس بھی اپنے نظریات کو قربان کیے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ یہی کشمکش اور تنازعہ تھا جو ۱۹۳۷ء میں ایک اور شکل کی جڑ بنا اور جسے پاکستان کے قیام کا ایک فیصلہ کن عنصر کہا جا سکتا ہے۔ یہ عنصر تھا ۱۹۳۷ کے انتخابات کے بعد صوبہ متحدہ میں کانگریس اور لیگ کا متحدہ محاذ بنانے کی ناکام کوشش کا عنصر۔

انتخابات کی شکست نے مسلم لیگ کی حکومت کی خواہش کو ختم نہیں کیا۔ اس خیال کو زندہ رکھنا تھا کہ صرف لیگ ہی ہے جو مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اگر کانگریس کے مسلمان وزرا اپنی وزارت کے زمانے میں یہ دکھا سکتے کہ وہ کانگریسی حکومت کا ایک حصہ ہونے کے باوجود اپنی کمیونٹی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں تو بھی کبھی مسلم لیگ بھی ختم ہو جاتی۔ جناح صاحب صوبہ متحدہ (یو۔پی) جیسی اہم ریاست میں حکومت میں شامل ہونے کے لیے بے چین تھے۔ اور اسی لیے انھوں نے اس حقیقت کے باوجود کہ صوبے میں کانگریس اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے، کانگریس سے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے کے لیے کہا۔ توقع کے مطابق جناح صاحب نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ کانگریس کو اپنی طرف سے کسی مسلمان وزیر کا تقرر نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسے اپنا ایک ہندو پارٹی کی طرح رکھنا چاہیے۔ مسلم لیگ نے ۲۲۸ اراکین کے ایوان میں ۲۹ نشستیں جیتی تھیں مگر اس نے کابینہ میں دو وزیروں کی شمولیت پر اصرار کیا۔ چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر بنائے گئے اور نواب اسمٰعیل خاں۔

لیگ نے یہ تجویز رکھی کہ اگر اس کے مطالبات مان لیے گئے تو ریاست ہندو مسلم تنازعہ کو ختم کرنے کی اور انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنانے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مگر یہ بات کہ کانگریس مسلم لیگ کی شرائط کو منظور کرے گی، ناممکن

سی نظر آتی تھی۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے کانگریس نوآبادیاتی حکومت کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد میں، بلا امتیاز نسل و مذہب ہر ہندوستانی کی نمایندگی کرنے کے اپنے دعوے کے جواز اور اس کی صداقت کو یکسر ختم کر دیتی۔ کانگریس حقیقت میں ایک ہندو پارٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجوزہ اتحاد کے خلاف لڑائی میں سب سے زیادہ جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ کانگریس سوشلسٹ اور مسلمان کانگریسی شریک ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ ان تمام مقاصد اور اصولوں سے غداری کے مترادف ہوگا جن کے لیے وہ اب تک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ خلیق الزماں نے لکھا ہے کہ "۱۲ مئی ۱۹۳۷ کو مجوزہ اتحاد کے سلسلے میں نہرو سے تبادلہ خیال کرنے گئے۔ اس دن نہرو آنند بھون الٰہ آباد میں صاحب فراش تھے۔" میرے نظریات کے بالکل برعکس نہرو کا خیال تھا کہ ہندو مسلمان کا سوال ہندو مسلم دانشوروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے جو اسے ایک مسئلہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اور جو حقیقت تو یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں میں ہے ہی نہیں۔ اسمبلی کی چہار دیواری میں مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کے خیال کا بھی انھوں نے مذاق اڑایا۔

مسلم لیگ سے گفت و شنید کرنے کے ذمہ دار مولانا آزاد تھے۔ اور اس کام میں انھیں مدد دینے کے لیے تھے رفیع احمد قدوائی اور گوبند بلبھ پنت۔ مولانا نے کابینہ میں نواب اسماعیل خاں کی شمولیت پر اعتراض کیا کیوں کہ نواب ان سرمایہ دارانہ مفاد کی نمائندگی کرتے تھے جو کانگریس کی اقتصادی فلاسفی کے برعکس تھے مگر مسلم لیگ کا اصرار ختم نہیں ہوا۔ ۱۵ جولائی کو مولانا نے کانگریس کی کم سے کم شرائط کی پیش کش کی۔ انھوں نے خلیق الزماں کو ٹائپ کیے ہوئے دو صفحات دیئے۔ اتحاد کے لیے خلیق الزماں کو دستخط کر کے ان کاغذوں کو واپس کرنا تھا۔ مذکورہ تحریر میں لکھا تھا: "مسلم لیگ کا گروپ صوبہ متحدہ میں الگ حیثیت سے کام کرنے کو ترک کر دے گا۔ صوبہ متحدہ کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے موجودہ اراکین کانگریس کا حصہ بن جائیں گے۔ اور کانگریس پارٹی کے دوسرے ممبروں کی طرح تمام مراعات اور ہر ذمہ داری میں ان کا حصہ ہوگا۔" لیگ نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ بڑی کڑی شرطیں ہیں۔ مولانا نے معاہدے میں ترمیم کی۔ مگر مسلم لیگ بہر حال مسلمانوں سے متعلق مسائل پر ووٹ دینے کے وقت کانگریس سے الگ اپنے ووٹ دینے کے حق کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ حقیقتاً کانگریس کو اسی بات کا ڈر تھا۔ بہر حال اس نے بھی مسلم لیگ کی اس ضد کو نہیں مانا۔

۳۰ جولائی ۱۹۳۷ کو جب اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی میں حزب مخالف کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ تو نہیں مگر ان کے پاس ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں بیٹھے ہوئے تھے جنھیں بعد کو پاکستان میں جناح کا جانشین بننا تھا۔ لیاقت علی خاں نے ۱۹۳۰ کے اواخر تک مسلم لیگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ جہاں تک اسلیم پور کے راجا نے بھی مسلم لیگ چھوڑ دی تھی۔ وہ بھی ایوان میں ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا

راجہ صاحب ان لوگوں میں تھے جو جناح صاحب کو لندن سے واپس لائے تھے۔

کون صحیح تھا؟ کیا نہرو کا یہ کہنا صحیح تھا کہ مسلم لیگ محض طبقہ اشراف کی تخلیق اور عوام کی ضرورتوں سے یکسر بے تعلق جماعت ہے؟ ثبوت صرف عمل میں اور تخلیق شدہ پاکستان کی اساسی نوعیت میں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ یہ بات اب بالکل صاف طور پر سامنے آ چکی ہے کہ مذہبی حلقے اور زمینداروں کے اتحاد نے کس طرح پاکستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا ایک طرف اگر زمینداروں اور سرمایہ داروں نے مذہبی حلقے کو اس کی اجازت دی کہ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنائیں تو دوسری طرف مذہبی حلقے نے زمینداروں کو یقینی حقوق ملکیت اور سرمایہ داروں کو اقتصادیات پر بے روک ٹوک قابو کی ضمانت دی۔ حکومت الٰہیہ اور زمینداری اور سرمایہ داری، پاکستان اور بنگلہ دیش کے دو اہم ستون ہیں۔ سر پر حکومت پر کوئی بھی آ جائے۔ حاکم وردی میں ہو یا شہری لباس میں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ دونوں باتوں میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں حقوق کے بارے میں کسی نے معمولی سوال بھی کرنے کی کوشش کی تو اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا

جناح صاحب کا یہ خیال کہ پاکستان انھوں نے تخلیق کیا ایک خوش خیالی تھی، جس کی ہر شخص نے ہم نوائی اور ہمت افزائی کی وجہ یہ تھی کہ جناح صاحب جیسے غیر معمولی عزم، صلاحیت اور سلیقہ رکھنے والے ایک لیڈر کی ان کو ضرورت تھی اور یہ صحیح بھی ہے ان خوبیوں کے بغیر جو جناح صاحب میں تھیں، پاکستان وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا

ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کے گاندھی کے خواب کو جس شخص نے بالآخر چکنا چور کر دیا وہ بھی ایک گجراتی ہی تھا، جس کے والدین کا گاؤں گاندھی جی کے آبائی گھر سے تقریباً تیس میل دور جنوب میں تھا محمد علی جناح ۱۸۷۶ء میں کرسمس کے دن پیدا ہوئے اور اپنا بچپن انھوں نے کراچی میں گزارا جہاں ان کے والد نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔

سولہ برس کی عمر میں جناح صاحب کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا تا کہ وہ اپنے باپ کی فرم کی وراثت کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ لائق ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ایک خطرہ ان کی ماں نے محسوس کی تھی اور وہ یہ تھی کہ باہر جانے سے پہلے ان کی شادی ہو جائے گی۔ ان کی ماں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا کسی انگریز میم کے جال میں پھنس جائے۔ فرمانبردار بیٹے نے چودہ برس کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ لندن میں کاروبار سے متعلق تعلیم نے انھیں بور کر دیا ایک موقع پر تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی تھیٹر میں شامل ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک تھیٹر گروپ کے ساتھ تین مہینے کا ایک معاہدہ کیا تھا لیکن پھر طے یہ کیا کہ انھیں قانون کی ڈگری لینے پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے چنانچہ انھوں نے "لنکنس اِن" میں داخلہ لے لیا یہ فیصلہ ایک بڑی دوررسی کا فیصلہ تھا کیونکہ اپنی نسل کے بہترین وکیلوں میں ایک وکیل ہونا جناح صاحب کا مقدر تھا۔ جناح صاحب ابھی بیس برس کے تھے کہ ان کے والد کی صحت خراب ہونا شروع

ے فرقہ پرستی مراد نہ ہو تو جناح ایک کٹر قوم پرست تھے۔ ۱۹۱۹ء میں پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت کے موقع پر ان سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی امتیازات کا یکسر خاتمہ چاہتے ہیں۔ تو ان کا جواب تھا "جی ہاں۔ اس سے زیادہ خوش کن بات میرے لیے اور نہیں ہو سکتی" تیسری دہائی کے وسط تک وہ انتہائی فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ "ایک ہندوستانی پہلے ہیں اور ایک مسلمان بعد میں۔"

جناح صاحب کو ان مولویوں اور ملاؤں سے کوئی محبت نہیں تھی جو سیاست میں دخل اندازی کرتے تھے۔

یہی جناح صاحب تھے جنہیں پاکستان کے خیال کا اصل معمار بنا دیا گیا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا خیال اس وقت تشکیل ہوا تھا جب جناح صاحب خود ترکِ وطن کیے ہوئے لندن میں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم رحمت علی نے لندن کے والڈورف ہوٹل میں ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ کھانوں کی فہرست انتہائی غیر اسلامی تھی۔ فہرست میں کچھ گھٹیا بھی تھے اور اچھے قسم کی وائن بھی۔ کھانے کے موقع پر جو خیال پیش کیا گیا وہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے قیام کا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کو "طالب علم کی تجویز" کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء تک جناح صاحب بالکل تیار ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک اخباری نمائندے کو بتایا بھی تھا کہ لیگ کا لاہور سیشن ایک تاریخی سیشن ہوگا۔ پاکستان کا نام نہیں لیا گیا تھا مگر یہ بات طے ہو گئی تھی کہ وہ علاقے، جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، ایک ساتھ کیے جانے چاہئیں اور ان علاقوں پر مشتمل ایک "آزاد ریاست" بنائی جانی چاہیے جس میں شامل اکائیاں خود مختار اور آزاد ہوں گی۔ ۱۹۴۷ء آتے آتے جناح صاحب کا فیصلہ کامیاب ہوا۔ ایک طرف گاندھی جی نے ہندوستان کو یومِ آزادی کی خوشی منانے سے انکار کیا کہ یہ وہ ہندوستان نہیں جو وہ چاہتے تھے دوسری طرف جناح صاحب نے تالیوں کی گونج میں ایک نئے ملک کی پیدائش کا اعلان کیا

یہ تو پاکستان کے حصول کے بعد ہی جناح صاحب کو پتہ چلا کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ اس ملک کا کیا کریں۔ دفعتاً وہ ایک بار پھر آزاد اور روشن خیال ہو گئے۔ ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کی ایک پریس کانفرنس میں، ایک صحافی نے جب ان سے پوچھا کہ کیا پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگا؟ جناح صاحب نے جواب دیا "تم ایک ایسا سوال پوچھ رہے ہو جو فضول اور حماقت آمیز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک مذہبی ریاست کا مطلب کیا ہوتا ہے۔" ۱۱ اگست کو جس دن انھیں پاکستان آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا اور نئے ملک کا پرچم اپنا لیا گیا تھا انھوں نے ایوان سے کہا تھا "ہم اس ریاست کا آغاز بغیر کسی امتیاز و تفریق کے کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمیں اپنے سامنے اپنے مقصد کی طرح رکھنا چاہیے اور آپ کچھ دنوں بعد دیکھیں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہ جائیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ یہ تو ہر فرد

ذاتی اور نجی عقیدے کی بات ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے، ایک ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے۔"

جناح صاحب کے دست راست اور جانشین لیاقت علی خاں کے یہاں بھی قائداعظم ہی کے جذبات کی بازگشت تھی۔ جب انھوں نے ۱۱۔ اگست کو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس پرچم کی وضاحت کی تھی جسے وہ اس وقت لہرانے جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "یہ پرچم کسی ایک مخصوص جماعت یا فرقے کا نہیں ہے۔ یہ پرچم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اس کے وفادار ہوں گے۔ آزادی، حریت اور مساوات کا پرچم ہوگا۔ پاکستان کی ریاست کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس میں کسی مخصوص فرقے یا فرد کے لیے خصوصی مراعات نہ ہیں، خصوصی حقوق نہیں ہیں۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پاکستان کیوں؟

پاکستان کی تخلیق کرنے والوں اور عوام میں جو تضادات تھے وہ خود جناح صاحب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ جناح صاحب خود اُردو نہیں جانتے تھے، گجراتی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کی اظہار کا ذریعہ۔ سارے کا سارا بنگال یا پاکستان اُردو نہیں جانتا تھا۔ مگر یونائیٹڈ پراونس لابی کے دباؤ کی وجہ سے اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں کو جناح صاحب خطاب کرنے گئے تو انھوں نے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا "اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے ملک کی صرف ایک ہی زبان ہو سکتی ہے... اور وہ صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔" ہربرٹ فلڈمین (دی اینڈ اینڈ دی بگننگ۔ پاکستان ۱۹۶۹-۷۱ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) نے کچھ زیادہ صفائی سے یہ بات کہی ہے "یہ بات مشکوک ہے کہ خود محمد علی جناح ان سیاسی الجھنوں سے واقف تھے جو اس پاکستان میں فطری طور پر مضمر تھیں جو بالآخر انھوں نے منظور کیا تھا۔"

پاکستان کا خیال تیسری دہائی میں پیدا ہوا، چوتھی دہائی میں جدوجہد شروع ہوئی، پانچویں دہائی میں اس کی شکل مسخ ہوئی، چھٹی دہائی میں اس کا گلا گھٹا، اور ساتویں دہائی میں وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

برصغیر کے حالات ایک بار پھر ویسے ہی ہو رہے ہیں جو جناح صاحب کے تھے تو ۱۹۴۷ء سے کہ ہم خود؟ تقسیم کے بعد پاکستان کو بیان کرتے وقت جناح صاحب نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے، برصغیر کی طرف بڑھنے کے عمل کا محض آغاز تھا۔ اپنی اپنی حکومت کے چھتیس سال بعد، اب وقت آگیا ہے کہ حقائق کا جائزہ

کی کوشش کی جائے کہ زبردست دشواریوں اور مسائل کے باوجود کون زیادہ کامیاب
یہ ہے اور یہ دریافت کرنے جمہوری وفاقی ریاست جسے مہاتما گاندھی چاہتے تھے یا وہ مذہبی ریاست جو جناح صاحب اپنے بعد چھوڑ
گیر، تقسیم ایک حقیقت تھی یا برصغیر کے ارتقا کے سفر میں ایک بے کیف وقفہ۔ آخری وائسرائے لارڈ لوئیس
سس البرٹ وکٹر نکولس ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق
ے حاصل کرنے کے فوراً بعد نجی طور پر لکھا تھا " اس مجنونانہ فیصلے کی ذمہ داری، دنیا کی نگاہوں میں پورے
مو، یہ ہندوستانیوں پر ڈالی جانی چاہیے۔ ایک دن وہ اس فیصلے پر جو وہ عنقریب لینے والے ہیں خود کف افسوس
ملیں گے۔"

(۲)

پاکستان میں بنیاد پرستوں کی بالادستی

۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی نے بالآخر برطانیہ کے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ آخری سامراجی لارڈ ویول کو ہٹایا اور بتایا کہ جون ۱۹۴۸ تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سلسلے کی اختتامی تقریبات کی سربراہی کریں گے۔ آخری تاریخ کے آنے میں ابھی ایک سال سے زائد کی مدت باقی تھی۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر لارڈ ماؤنٹ بیٹن مدت میں مختصری مزید توسیع کے لیے نہایت آسانی سے درخواست کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے التوا یا تاخیر کی بجائے بے حد جلدی کی۔ ان کی اس جلد بازی کی کوئی منطقی وضاحت آج تک نہیں ہو پائی ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عذر یہ رہا ہے کہ اگر انھوں نے انتقال حکومت میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو دینی پڑی۔ مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ بہرحال یہ سمجھ میں آنا مشکل ہی نظر آتا ہے کہ اس صورت میں اور ابتری ہی ہوتی۔ کیوں کہ نہ صرف ملک ہی تقسیم ہوا تھا بلکہ چند ہفتوں کے اندر ہزاروں انسانی جانیں اس تقسیم کی نذر ہو گئی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے جنگوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ابھی بھی ختم نہیں ہو پایا ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ انگریزوں نے انتقال حکومت میں اتنی جلدی اس لیے دکھائی کہ وہ ایک ایسی بات جانتے تھے جو ان کے اور خود جناح صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ بات یا یہ راز تھا پاکستان کے خالق جناح صاحب کا دق کا مرض۔ اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا۔ اور اگر وہ پاکستان کے قیام کے منصوبے کے اعلان سے پہلے مر جاتے تو شاید لیگ الگ ملک کے مطالبے کی تحریک دم توڑ دیتی۔ اس انداز فکر کا جواز موجود تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگ کی حمایت کبھی نہیں کی۔ اور پاکستان کی تحریک نے صرف چوتھی دہائی کے وسط میں اس وقت تقویت حاصل کی جب جناح صاحب خوف و ہراس کی فضا بنانے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔ پاکستان مسلم عوام نے نہیں بنایا۔ اس کا جنم تو مرہون منت ہے ان مٹھی بھر لیڈروں کا جن کے لیے محض عقائد

یہ علیحدگی کی باعث تسکین نہیں تھی۔ وہ تو الگ الگ حلقۂ انتخاب، الگ الگ زبانیں، الگ الگ لباس، الگ الگ شناختیں غرض کہ الگ الگ گھر چاہتے تھے۔ ۱۹۰۶ میں اپنے قیام کے بعد صرف ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو کچھ ووٹ ضرور ملے تھے۔ مگر لیگ، خود اپنے قائم کیے ہوئے ملک میں بھی زندہ نہیں رہ پائی۔ پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے مبصرین نے بھی مسلم لیگ کے لیے عام حمایت کی کمی کو محسوس کیا۔ مثال کے طور پر خالص انگریزی اخبار دی اسٹیٹس مین (جس کی ملکیت بھی انگریزوں کی تھی) کے انگریز ایڈیٹر Ian Stephens جنہیں سارے واقعات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور نئے ملک سے ان کو ہمدردی بھی بہت تھی، اپنی کتاب "پاکستان، اولڈ کنٹری - نیو نیشن" (Penguin Books, p. 90) میں کہتے ہیں: "لندن میں کچھ دنوں وکالت کرنے کے بعد مسٹر جناح ۱۹۳۴ میں ہندوستان آ گئے درمیان انھوں نے کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو مسلم لیگ کے لیڈر کے منصب سے سرفراز پایا۔ کانگریس کی بجائے بہترین لبرل پارٹی کی طرح مسلم لیگ نے بھی ابھی تک عوامی رابطے کی کوشش شاذ و نادر ہی کی تھی۔ اور اس کی حیثیت طبقۂ امرا کے ان افراد کے لیے جو ایک خاص قسم کی سیاسی دلچسپی رکھتے تھے، تبادلۂ خیال کی ایک جماعت سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔ فلسفی شاعر سر محمد اقبال نے جناح صاحب کے نام اپنے ایک خط میں جو انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ کو لکھا تھا یہی بات لکھی تھی۔ (جس کا اقتباس طارق علی نے اپنی کتاب "Can Pakistan Survive" میں دیا ہے) اس خط میں شاعر نے سیاست داں سے کہا تھا "لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے امرا کی نمائندہ جماعت بنی رہے گی یا وہ ان مسلم عوام کی نمائندگی بھی کرے گی، جنھوں نے ابھی تک بوجوہ اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ اپنے طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کے حالات کو بہتر کرنے کا وعدہ نہیں کرتی ہے وہ ہمارے عوام کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتی۔" ہمارا ذہن پھر اسی بنیادی سوال کی طرف لوٹتا ہے۔ آخر کس کا مفاد تھا جس کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں آیا؟ یہ مفاد بہرحال مسلم عوام کا مفاد نہیں تھا۔

اسے صرف انگریزوں کی دین کہنا چاہیے کہ جناح صاحب مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کر سکے۔ یورپ میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو کانگریس نے اس سلسلے کی برطانوی کوششوں میں مدد دینے سے انکار کیا۔ اور (۱۹۳۷ میں منتخب ہونے والی) اپنی صوبائی حکومتوں سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہہ دیا۔ جناح صاحب کے لیے جو انتخابات کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے، یہ موقع فیضانِ الٰہی تھا۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے انگریزوں کی خوشنودی اور ان کی مہربانی۔ اور اسی وجہ سے ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۷ کے درمیانی دس برسوں میں مسلم لیگ نے انگریز دوستی کا زبردست اور سرگرم رول ادا کیا، ان دس برسوں

میں انگریزوں کے خلاف اس نے نہ تو کوئی تحریک خود چلائی اور نہ ہی کسی ایسی تحریک میں شرکت کی۔ اپنے سارے جوش و خروش اور غم و غصے کو کانگریس کے لیے محفوظ رکھا جو نوآبادکاروں کی مخالفت بدستور جاری رکھے ہوئے تھی۔ دوسری طرف جناح صاحب ہر ہر موقع پر انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ چنانچہ جب کانگریس وزارتوں نے استعفے دے دیئے تو جناح صاحب نے اعلان کیا کہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" منایا جائے گا۔ جنگ کے زمانے میں بنگال جیسے اہم صوبے میں لیگ کو حکومت کا وہ مزا مل گیا جس سے وہ ۱۹۳۷ء میں محروم رہی تھی۔ جناح صاحب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ریاستی مشینری کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے ہتھیار کی طرح استعمال کریں۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے "ہندو کانگریس سے اسلام کو خطرہ" کے نعرے کو اپنی مہم کا موضوع بنایا تھا جسے بہرحال مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اب انگریزوں نے فیصلہ کیا اور انتہائی اہم اور تشویش ناک فیصلہ۔ یعنی انتخابات میں شکست کھائے ہوئے ان ہی جناح صاحب کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ آواز بننے کا حق دینے کا فیصلہ۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں جب جنگ سے تھکے ہوئے اور نڈھال انگلستان نے ہندوستان کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا شروع کیا تو جناح صاحب کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اگر برصغیر تقسیم نہ کیا گیا تو وہ ہندوستان میں سول وار کی دھمکی تو دے ہی سکیں گے۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام کے ذریعے بنگال میں شہید سہروردی کی مسلم لیگی حکومت نے یہ بات ظاہر کر دی کہ برسراقتدار لیگ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ کلکتہ خوفناک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیگ کے مسلح کارکنوں نے بڑے پیمانے پر ہندوؤں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کے جواب میں ہندوؤں نے بھی ویسی ہی سنگدلی اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ یہ سول وار کی دھمکی کے سچ ہونے کا ایک اشارہ تھا۔ قتل و آتش زنی کا دور دورہ ہوا۔ دلوں میں خوف و ہراس بیٹھ گیا، اور یہی غیر فطری ماحول تھا جس میں مسلم لیگ نے اپنے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔ مارچ میں ماؤنٹ بیٹن آ گئے۔ اپریل کے آغاز میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے چھ ملاقاتیں کیں۔ ۱۰ اپریل کو برطانیہ نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ یکم مئی کو کانگریس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس کی ہائی کمان نے نہرو کو ایک منقسم ہندوستان کی آزادی کو مان لینے کا اختیار دے دیا۔ گاندھی جی نے بڑی بے چارگی کے ساتھ، جو کچھ ان کے چاروں طرف ہو رہا تھا، اس میں معنویت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انھوں نے کانگریس سے 'ایک متحدہ ہندوستان میں جناح صاحب کو برسراقتدار آنے دینے کی اپیل تک کی۔ مگر قتل و غارت گری اور بربریت کے اس بے نظیر دور دورے میں انسانیت اور سمجھداری کی بات کون سنتا۔

۲ جون کو ایک آل پارٹیز کانفرنس میں تقسیم کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ کانفرنس میں نہرو، سردار پٹیل

نہرو اور سردار پٹیل نے کانگریس کی نمائندگی کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے جناح صاحب، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر شریک ہوئے۔ برطانیہ کے ترجمان ماؤنٹ بیٹن، لارڈ اِسمے اور سر ایرک میویل تھے۔ ۳ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت دوسری پریس کانفرنس کو خطاب کیا اور اعلان کیا کہ ۱۵ اگست کو حکومت منتقل ہو جائے گی۔ صرف دو ماہ باقی تھے سرحدوں کے تعین کا سب سے دشوار کام ابھی تک شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ وکیل سر سیسل ریڈ کلف (Sir Cycil Redcliffe) کو لندن سے بلایا گیا کہ وہ ایک ایسے برصغیر کے اندر نشتر چلائیں جسے انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ مُلا ایک ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جناح صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ چوں کہ انھوں نے ۱۹۴۳ء کے ایک ناممکن خواب کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا، وہ اسے ایک نظریہ دینے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر پاکستان اُن لبرل اصولوں کی خاطر وجود میں نہیں آیا تھا جن کو جناح صاحب خود اس وقت تک مانتے رہے تھے جب تک کہ ان پر ایک ضد نہیں مسلط ہوئی تھی۔ ملاؤں نے جو کام کافی برسوں پہلے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل میں جناح صاحب آخری مگر انتہائی موثر ہتھیار تھے۔ تاریخ نے آج یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کون تھا جس نے حقیقتاً پاکستان کے خیال کی تشکیل کی۔ اور مذہب کے نام پر بنے ہوئے اس ملک میں کون حکومت کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پانچ سال کے اندر اندر لیاقت علی خاں کے قتل سے جناح صاحب کا سیکولرزم ختم ہوا۔ اگلی دہائی میں ایوب خاں نے جناح صاحب کی جمہوریت کو دفن کیا اور ۲۵ برس کے اندر پاکستان تباہ ہو چکا تھا۔ تو پھر ۱۴ اگست کو جناح صاحب نے کیا بات ثابت کی سوائے اس کے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں جانا کہ اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انھوں نے کیا کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک ملاؤں کو پاکستان میں اپنے اقتدار اور تسلط کو قائم کرنے کے لیے جد و جہد کرنا پڑی لیکن آخر میں بہر حال یہی ہوا۔ یہ صورتِ حال کب تک چلے گی یہ ایک دوسری کہانی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کوئی یہ فرض ہی کیوں کرے کہ مُلاؤں کا اقتدار بہت دن نہیں چل سکتا؟ بنیادی طور پر اس لیے کہ برصغیر کا تجربہ دکھاتا ہے کہ مذہبی شدت، اپنے ماہرانہ اقتصادی نظریات کے ساتھ، خوف و ہراس کی فضا میں، عارضی طور پر تو موثر رہ سکتی ہے مگر اکثریت کی مدد اور تعاون کا جذبہ بہت دن برقرار نہیں رکھ سکتی۔ پاکستان میں ان مُلاؤں کی سب سے بڑی خواہش اگر کوئی ہے تو یہی کہ ان کی اس دینی حکومت کو کسی طرح جمہوری جواز حاصل ہو جائے۔ مگر جب بھی کسی شکل میں بھی کوئی موقع فراہم کیا گیا تو پاکستان میں انتخابات میں ان مذہبی جماعتوں کا بھی طرح صرمت ہو گئی۔ اگر فوج، نوکر شاہی اور ملا سب ہی کا یہ اصرار ہے کہ پاکستان میں ہر شخص ایک اسلامی

ریاست کے قیام میں دل و جان کے ساتھ ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اس دینی جرگے کی ظاہری مقبولیت کی بہترین مثال ۱۹۷۷ء میں سامنے آئی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب بھٹو مخالف تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بھٹو کی بدنامی اور غلطیوں کا ثمرہ تھا جو دائیں بازو اور مذہبی جرگے کو انتہائی مقبولیت کی فضا میں پرواز کرنے کا موقع مل گیا۔ مگر جب بھٹو کو حکومت سے ہٹانے کے بعد جنرل ضیا نے واقعی انتخابات کرانے کی پیش کش کی تو اس وقت یہی دینی جرگہ تھا جس نے اپنی یقینی شکست کی پردہ پوشی کی خاطر انہیں رائے شماری کو ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔ یہ دینی جرگہ کسی ایسے انتخابات ہی میں جیت سکتا ہے جس میں سیکولر اور معقول پارٹیوں کے انتخاب لڑنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہو۔ مگر ایسا مجوزہ جواز ایک محض عارضی صورت حال ہو سکتی ہے۔

اس خیال کو لوگ آج بھی مانتے ہیں کہ اگر جناح صاحب زندہ رہتے تو انہوں نے محض اپنی شخصیت کے زور پر ملک کو صحیح راستے پر لگا دیا ہوتا۔ اور ہمارے سامنے اس وقت بیگم ضیا کا پاکستان نہیں رتی جناح کا پاکستان ہوتا۔ جی دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ جناح صاحب نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کیا۔ اس وقت ان کے ایک پھیپھڑے کا دو تہائی حصہ اور دوسرے کا ایک چوتھائی حصہ تپ دق کے مرض کی نذر ہو چکا تھا۔ بالآخر جواب دے گیا Collins اور La Pierre نے اپنی کتاب Freedom at Midnight میں لکھا ہے کہ بمبئی میں جناح صاحب کے معالج ڈاکٹر جے۔ اے۔ ایل پٹیل نے مرض کی تشخیص جون ۱۹۴۶ء ہی میں کر لی تھی۔ مگر تقسیم ہند کا وہ راز تھا جسے انتہائی خوش اسلوبی سے راز رکھا گیا۔ جناح صاحب نے اس مرض کا اظہار کسی سے نہیں کیا۔ وہ حسب دستور اتنی ہی سگریٹ پیتے رہے جتنی وہ پیتے تھے۔ بے کھانسی اور بلغم کو وہ برسوں کی ناکامیوں میں ورم کا نتیجہ بتاتے رہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں Ian Stephens سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "مسٹر اسٹیفنس! میں بہتر ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں بیمار تھا میں بیمار نہیں تھا"۔ جناح صاحب کی گفتگو کا یہ اقتباس اسٹیفنس نے اپنی کتاب Pakistan, Old Country New Nation (p. 281) میں دیا ہے۔ مگر یہ یقیناً اس بات سے واقف تھے کہ جناح صاحب بیمار ہیں۔ لارڈ ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ جناح صاحب ایک بیمار آدمی تھے۔

وہ نحیف و ناتواں ملک ہوگا جیسے کسی ایک بوڑھے آدمی کی دق کی بیماری مسخ کر دے۔ ایک فرد اپنی موجودگی یا اپنی غیر حاضری کی وجہ سے ترقی کی رفتار کو سست تو کر سکتا ہے لیکن اگر بنیاد ہی کسی غیر مستحکم یا نامعقول نظریے پر پڑی ہو تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جناح بھی گاندھی کی طرح پاکستان کو ایک مختلف رخ پر موڑ سکتے تھے۔ اگر انہوں نے بھی کوئی نئی آئیڈیالوجی تشکیل کی ہوتی۔ مگر ان کے پاس اپنے ملک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے اس

سنے کے جو انھوں نے ملاؤں سے ورثے میں پایا تھا۔ ملک کی تخلیق قرآن اور ہلال کے نام پر ہوئی تھی اور اب اس کا امکان بہت کم تھا کہ اسلام کا خود ساختہ کاڈر لندن میں تعلیم حاصل کیے ہوئے ایک وکیل کو نئے نئے نظریات وخیالات کے تجربے کرنے کی اجازت دے گا۔

یہ خیال دلوں میں بیٹھ سا گیا تھا کہ ایک شخصیت ہی ہندوستان اور پاکستان میں بڑا اہم فرق پیدا کر دیتی ہے کہ یہی امر فکر تھا جس کی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ ہندوستان میں جمہوریت کی کامیابیوں کے لیے جواہر لال نہرو کی بقا بہت ضروری ہے۔ اپنے ملک کے استحکام کے لیے نہرو نے بڑا اہم بلکہ بڑا انوکھا رول ادا کیا ہے مگر یہ کہنا کہ جمہوریت کا قیام ان کے اکیلے کا مرہون منت ہے محض جھوٹ ہوگا۔ یہی رویہ تھا جس نے اس سوال کی ہمت افزائی کی جو پانچویں دہائی کی مسافت پر مسلط ہو گیا تھا۔ سوال تھا "نہرو کے بعد کون؟" حالانکہ ہونا صرف یہ تھا کہ نہرو کے بعد کس دوسرے شخص کو منتخب کیا جانا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں بہر حال سوال کا جواب دینا پڑا۔ نہرو کا انتقال ہوا۔ اور جمہوری طور پر ان کے جانشین نے عہدے سنبھالا۔ یہ وہی ہوا تھا جو کتاب نے کہا تھا کہ ہوگا۔ ایک وزیر اعظم کی ذہانت وفطانت کی بنا پر ہندوستان نسبتاً تیزی کے ساتھ ترقی کر سکتا تھا یا کسی کی لاپروائی اور عدم دلچسپی کی وجہ سے ٹھہراؤ اور جمود کے آثار نمایاں ہو سکتے تھے۔ مگر ملک کی مکمل تباہی وبربادی صرف اسی وقت ہوگی جب اس کی بنیادی آئیڈیالوجی اور اس کی سیکولر اور جمہوری بنیادوں میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ انتہائی ذہین ڈکٹیٹر بھی ہندوستان کو متحد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور ایک نقلی اور ناکارہ ڈیموکریٹ کے لیے بھی ملک کی شکست وریخت کا کام آسان نہیں تھا۔

پاکستان سے متعلق اپنے منصوبوں اور پروگراموں سے درحقیقت اگر کوئی واضح طور پر واقف تھا تو وہ پاکستان کے مفاد سے وابستہ ملاؤں کا گروہ تھا۔ نوکر شاہی، انگریزی تعلیم کے پروردہ افراد کے گروہ کا خیال تھا کہ اب جب کہ انھوں نے ایک مسلمان حکومت میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ ذہین سینیں سے ___ ___ واپس جانے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ ان کا خیال غلط تھا۔ ان کے مقابلے میں دینی جرگے کو زیادہ خبر تھی کہ ہدف کہاں بنانا چاہیے وحکومت پر قبضہ کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اپنانا چاہیے۔ فیصلہ کن کشمکش دراصل آئین پر ہو رہی تھی۔ ایان اسٹیفنس نے اپنی کتاب (پاکستان اولڈ کنٹری، نیو نیشن، صفحہ ۷-۲۵۶) میں لکھا ہے۔ "ہم پاکستان میں ایک طرف حاکم طبقے کے تو ملک کے پروردہ اور یہ کہتے ہیں جو ثقافتی لحاظ سے انتہائی مسلمان مگر عمل میں کٹر انگریزی بولنے والے اور آج کی دنیا میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لینے والے ہیں دوسری طرف ملا ہیں، علما دین، مفتی اور ماضی میں ڈوبے ہوئے جن کی تعلیم وتربیت پچھے سے سہارنپور کے قریب دیو بند اور لکھنؤ کے ندوۃ العلما جیسے مدرسوں میں ہوئی تھی

ان دونوں گروہوں میں افہام و تفہیم کیسر معدوم ہو سکتی تھی۔ یہ بات ناگزیر تھی کہ دو کیسر مختلف دنیاؤں میں پرورش پائے ہوئے دونوں گروہوں کے ترجمان، کبھی کبھی ملک کے آئین کی حیثیت و مواد کے سلسلے میں ایک دوسرے کو دو بالکل مخالف سمتوں میں پائیں۔

وزیراعظم لیاقت علی خاں، جن پر اب جناح صاحب کے انتقال کے بعد ذمہ داریوں کا زبردست بوجھ پڑ گیا تھا، بڑی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ ایک آئین کی تدوین میں لگ گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو بنیادی اصول کمیٹی (بیسک پرنسپلز کمیٹی) کی ایک رپورٹ، پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو پیش کی گئی۔ یہ رپورٹ یکلخت رد ہو گئی۔ ملاؤں کو اس میں مذہبی ریاست کا کوئی وعدہ کوئی امکان نظر نہیں آیا۔ اس رپورٹ میں تو جمہوریت کی بات کہی گئی تھی۔ اور اس سے بڑھ کر برائی یہ تھی کہ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "اقلیتوں کو اپنے اپنے مذاہب کو ماننے، ان پر عمل کرنے اور اپنی اپنی ثقافت کو فروغ دینے کے مواقع فراہم کرنے کیلئے مناسب اقدامات کیے جائینگے" ۲۲ نومبر ۱۹۵۰ میں اسے واپس لے لیا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر جناح صاحب نے بھی مستقبل کے پاکستان کا ایسا کوئی تصور پیش کیا ہوتا تو انہیں بھی مذہبی جرگے کے غم و غصہ کو جھیلنا پڑتا۔ بہر حال ان کی وفاداریاں "اللہ کی رضا" کی ان کی اپنی تاویل سے تھیں جناح صاحب سے نہیں۔ (اسٹیفنس جو پاکستان کا ہمدرد بھی ہے تھوڑی جھجک کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ملا ایک جمہوری آئین کی تدوین کی کوششوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔)

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ کو، خود جناح صاحب کے منتخب کئے ہوئے جانشین لیاقت علی خاں کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا گولی مارنے والے کی شناخت یا اس کے مقصد کا سرکاری طور پر آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ حکمراں طبقے نے اس حادثے کو محض کسی پاگل کی مجنونانہ حرکت کہہ کر ٹال دیا۔ مگر لیاقت علی خاں کے قتل میں سازش کا نظریہ عوام کے ذہنوں میں بیٹھ گیا۔ یہ صورت حال مذہبی جرگے کی طرف انگلی اٹھاتی ہے۔ نوکر شاہی کی مدد سے لیاقت علی خاں نے ایک ذمہ دار حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دے لیا ہوتا۔ ان کی موت کے بعد اس کے امکانات ختم ہو گئے۔ سیاسی کھیلوں کی بساط بچھ گئی۔ اسباب عمل ردِ عمل، جوڑنا اور الگ کرنا، لوٹ کھسوٹ اور پاگل پن۔ یہ سب عناصر جمہوریت کو ختم اور بے اثر کرنے کے لیے یکجا ہو گئے۔

لیاقت علی خاں کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے لی۔ انھوں نے گورنر جنرل کی رسمی کرسی چھوڑی اور وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔ اور جانشینی کا کبھی نہ ختم ہونے والا بے قاعدہ ڈھنگ شروع ہو گیا۔ اس بات کو سمجھنا بہت اہم ہے کہ پاکستان میں عوامی خواہشات کے بل بوتے پر، حکومت کی تبدیلی صرف ایک دفعہ اس وقت ہوئی تھی جب ایک شکست خوردہ فوج نے ۱۹۷۱ میں حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کی تھی۔ کیونکہ بھٹو نے ۱۹۷۰ کے منحوس انتخابات میں، مغربی پاکستان

میں زیادہ نشستیں جیتی تھیں اور اس نازک گھڑی میں عوام کے جذبات ان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ اقتدار کی تبدیلی جیسے ڈرائنگ روم میں لیے جانے والے ان فیصلوں کے مطابق ہوئی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور بارسوخ گروہ لیتا تھا۔ پاکستان کا کاروبار بالکل اسی طرح چلایا جا رہا تھا جس طرح ۱۹۴۷ء سے قبل مسلم لیگ چلائی جاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا گروہ، عوام کے تعاون کے مصنوعی دعوے کے ساتھ، ان کی اعلیٰ خواہشات کا ذکر کیے بغیر عوام کا نام لے کر کام کیا کرتا تھا۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کیونکہ حکمران اور بااثر طبقہ پہلے ہی والا تھا۔ بعض آرام دہ عادتیں بڑی مشکل سے چھٹتی ہیں! ———— ————. خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک پنجابی بیورو کریٹ غلام محمد ملک کے گورنر جنرل بن جائیں۔ سوائے اس کے کہ مٹھی بھر آدمیوں نے کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ایسا ہونا چاہیے۔ اقتدار کے حصول اور اس کے استعمال سے متعلق نہ تو کوئی نظام تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی نظریہ۔ سازش کرنے والوں کے لیے آزادی تھی۔ پہلے دس برسوں کی سیاست نے سب سے واضح طور پر یہ بات ثابت کی کہ درحقیقت پاکستان طبقہ امراء کو ان کی خدمات کے سلسلے میں انعام کے طور پر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس زمانے کے واقعات بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ نظریات اور اخلاق سے مستغنی مٹھی بھر لوگ بے پناہ ورثے کو کس طرح تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔

دینی جرگے نے یہ جلدی ہی جتا دینے کا فیصلہ کیا کہ نئے ملک کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے تو مجوزہ آئین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس کے بعد یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ وہ پاکستان یعنی "اہل ایمان کی سرزمین" سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اس بات کی بھی وضاحت ہو گئی کہ کسی قسم کی ملاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ احمدیہ یا قادیانی اسلام ہی سے نکلا ہوا ایک فرقہ ہے۔ متمول اور انتہائی لائق (۱۹۷۹ میں فزکس میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام اسی فرقے کے ہیں) جو ہمہ دانی میں مشہور و معروف پاکستانی احمدیہ، سر ظفر اللہ خاں تھے۔ جو اس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور انہوں نے اقوام متحدہ میں کشمیر کے کیس کی وکالت کی تھی اور چھوٹے موٹے ہیرو بن گئے تھے مگر ۱۹۵۲ میں وہ خصوصاً اور ان کا سارا فرقہ عموماً بدعت کے مانوس الزام میں، باوجود اس کے کہ انہوں نے یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ اچھے مسلمان ہیں تقریباً ناکیں رگڑ ڈالیں، ملاؤں کے غیظ و غضب کا ہدف بنا۔ تقریباً ایک برس تک یہ دینی جرگہ جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی قیادت میں، احمدیوں کو "خالص" مسلمانوں کی سرزمین سے خارج کیے جانے کے مطالبے کو منوانے کے لیے سڑکوں پر نکل آیا۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ جناح صاحب کے اس اعلان کے پانچ سال سے کم ہی بعد کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کا خیال بالکل غلط ہے یہ سلسلہ شروع ہو گیا،

۳۱ اور ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کے درمیان اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ ملاؤں کی زیر قیادت ہجوموں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ خواجہ ناظم الدین نے جو ابھی ان کے خلاف اقدام کرنے سے ڈرتے تھے، مارشل لا نافذ کرنے، مولانا مودودی کے ساتھ ساتھ تحریک کے دوسرے بہت سے قائدین کو گرفتار کرنے، دولتانہ کی پنجاب کی صوبائی حکومت کو معطل کرنے اور اس کی جگہ پر فیروز خان نون کو فائز کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دینی بزرگی کی مخالف قوتوں نے ملاؤں کو کیفر ختم کرنے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مولانا مودودی اور نیازی کو نہ صرف قید کیا گیا بلکہ ان فسادات میں ان کے حصے کے پیش نظر انہیں موت کی سزا دی گئی۔ مگر پاکستان میں پھانسی پر صرف کھڈو کو لٹکایا جا سکتا ہے۔ موت کی سزائیں جلد ہی واپس لے لی گئیں اور ملاؤں کو چھوڑ دیا گیا۔

اسی دوران اپنے وجود کے پانچ برسوں کے اندر اندر پاکستان کا نظریہ، ملک کے مشرق میں اپنی دلفریبی کھونے لگا۔ یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی چیزیں عوام کے ذہن میں کتنی اصلی اور اس کے برخلاف کتنا دور متاثر و رسوخ افراد کے دماغوں میں کتنی گہری پیوست تھیں۔ ۱۹۴۹ کے اوائل میں مولانا عبدالحمید بھاشانی نے نرائن گنج مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے تین نائب سیکرٹریوں میں ایک شیخ مجیب الرحمان تھے۔ برصغیر کے پار پاکستان کے ... سرے پر بھی اسی طرح کا ایک امکان اس وقت نظر آیا جب شمالی مغربی سرحدی صوبے میں پیر صاحب مانکی شریف نے اسی نام کی ایک پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ یکسر مسلمانوں پر مشتمل ہونے اور مسلم پنجاب کے مغرب میں واقع ہونے کے باوجود ہمیشہ سے کانگریس کا ایک مضبوط گڑھ رہا تھا۔ فروری ۱۹۵۰ میں دونوں جگہ کی عوامی مسلم لیگوں نے حسین شہید سہروردی کی زیر صدارت ایک دوسرے سے الحاق کر لیا۔ جیسا کہ Herbert Feldman نے اپنی کتاب [illegible] میں وضاحت کی ہے[2] اس بات سے سب ہی واقف ہیں کہ جناح صاحب نے یہ نقطہ نظر اپنے گھروں میں ہر چیز پر اختیار جو مسلمانوں کو ہونا چاہیے ۱۹۴۶ میں بہار میں ہوئے فرقہ وارانہ قتل عام کے بعد ہی اپنایا تھا۔ "بحیثیت مجموعی یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کا پاکستان ۱۹۴۷ میں سامنے آیا تھا، بے جواب سوالات کے باوجود، دریائے سندھ کے دونوں جانب واقع صوبوں کے لیے قابل قبول تھا۔ مشرقی بنگال کے لیے بھی جو اس وقت مسرت سے سرشار تھا، یہ صورت حال قابل قبول تھی مگر بہت سے لوگ تھے جنہیں شبہات بھی تھے اور وہ بہت سے تحفظات بھی رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایسے متعدد غیر مطبوعہ دستاویزوں کا وجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح صاحب نے مشرقی بنگال کو اپنی خود مختار حکومت بنانے پر رضامند کر لیا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان دستاویزات پر نہ تو کوئی رائے زنی ہوتی ہے نہ ان کا کبھی انکشاف ہوا۔

سو بات اچھی طرح جانتے تھے وہ یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے تین سال کے اندر مشرقی بازو میں بے اطمینانی کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے تھے۔ اور پانچ برسوں کے اندر اندر انسانی جانیں سیاست کی نذر ہونے لگی تھیں۔

خود ایک بنگالی خواجہ ناظم الدین کی مہربانی سے انسانی جانوں کا اتلاف ہوا۔ جناح اور لیاقت علی خان نے یہ بات واضح طور پر کہہ دی تھی کہ بنگالیوں کو قومی زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنا ہوگی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۲ کو (جب ہندوستان دو سال تک اپنے آئین کی تدوین کر کے اسے منظور کر چکا تھا اور بالغ رائے دہندگی کی بنا پر اپنے یہاں پہلا اور عظیم انتخاب کرا چکا تھا) پاکستان قانون ساز اسمبلی کی Basic Principles Committee نے اپنی سفارشات میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی یعنی ایک ایسے ملک کی جہاں بنگالیوں کی اکثریت ہوگی، واحد سرکاری زبان اردو ہوگی۔ فروری کے آخر تک زبردست ہڑتالوں، مظاہروں اور رد عمل کے طور پر پولیس کارروائی میں طالب علموں اور بچوں کی جانیں جا چکی تھیں۔ آخر کار ۱۹۵۶ کے آئین میں بنگالی زبان کو مساوی درجہ عطا کیا گیا۔ مگر اس وقت تک ڈھاکہ میں شہید دن کی یادگار ایک زیارت گاہ بن چکی تھی۔ اور خود مختار مشرقی بنگال کے بیجوں میں کلّے پھوٹ چکے تھے۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ کو پاکستانی دیوان خانوں میں کیا جانے والا ایک اور فیصلہ مسلط ہو گیا۔ یہ دن تھا جب پاکستان میں پہلا ناگہانی تغیر ہوا۔ غالباً یہ تغیر تاریخ میں اولین تغیر تھا جسے منظم بھی نوکرشاہی نے کیا اور اس پر عمل در آمد بھی۔ یہ تغیر غیر معمولی تھا۔ اپنے اچانک پن کی وجہ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں وہ تمام اقدار و معمولات مفقود تھے جو کسی بھی نظام کی رواداری کے لیے عموماً ہوتے ہیں۔ گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو اچانک اقتدار سے ہٹا دیا۔ اور اسے اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ وہ اسمبلی کے سامنے جا سکے۔ ایک ہی اشارے میں قوت کا توازن بدل گیا۔ اسمبلی کی فیصلہ کن حیثیت دفعتاً ختم ہو گئی۔ ریاست کے رئیس سربراہ نے اپنا تکنیکی اختیار استعمال کر کے حکومت کو معزول کر دیا۔ درحقیقت یہ سب کچھ اوپر سے ہوا تھا۔

وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی جگہ پر تقرر بھی فیصلہ سازی کی یکسر مطلق العنانی کی دوسری مثال تھی۔ ایک گمنام سابق سیاست داں محمد علی بوگرا، جو ۱۹۴۸ سے ایک سفیر کی حیثیت سے نسبتاً آرام دہ اور پُرسکون زندگی گزار رہے تھے، وزیر اعظم کے عہدے پر کام کرنے کے لیے بلائے گئے۔ ان کی قابلیتوں کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد اگر نکالا جا سکتا تو وہ دو تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ انتہائی مطیع و فرماں بردار مشہور تھے اور دوسری یہ کہ وہ بنگالی تھے اور ان کے تقرر کو بنگالیوں کے لیے ایک میٹھی گولی قرار دیا جا سکتا تھا۔ جو خواجہ ناظم الدین کے برطرف کیے جانے کو پنجابیوں کی طرف سے کی جانے والی بنگالیوں کی ایک اور تذلیل سے ناخوش ہو سکتے تھے۔ محمد علی بوگرا ابھی وزیر اعظم ہوئے ہی ہوں گے کہ

ان کے اندر کا سیاست داں سرگرم عمل ہو گیا۔ انھوں نے قوت کے ایسے مرکز کی تشکیل کی کوششیں شروع کر دیں جو خود ایوب کے محسن کے لیے ایک چیلنج تھا۔

بنگالیوں سے پنجابیوں کی نفرت کا الزام اس سے پہلے بھی صحیح تھا۔ بنگلہ دیش کے مابعد واقعات کے بعد ان تعلقات کے سلسلے میں پہلے ہی کافی لکھا جا چکا ہے اور اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پنجابی، بنگالی کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہے اس سے لطف اٹھانے کے لیے صرف ایک اقتباس کافی ہوگا۔ اقتباس صدیق سالک کی ایک بہت اچھی کتاب سے لیا گیا ہے۔ صدیق سالک ۱۹۷۱ میں ڈھاکا میں پاکستانی فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک تھے اور یکے از ایک ایسے شخص بھی تھے جس نے جنگ کو شکست خوردہ فریق کی طرف سے دیکھا تھا۔ اپنی کتاب Witness to Surrender (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ص ۹۳) میں سالک ان طریقوں کا بیان کرتے ہیں جو پنجابی اور پٹھان افسر ۱۹۷۱ کی جنگ کے اصلی آغاز سے قبل بنگالیوں سے برتاؤ کرنے میں استعمال کرتے تھے۔ آبادی اور خود مختاری کے جرائم کو ختم کرنے کی بجائے حکام بنگوز (Bingos) کو قابو میں رکھنے کے لیے خوف و ہراس کے دور دورے کو قائم رکھنے میں عقل مندی سمجھتے تھے Bingos بنگالیوں کی تذلیل کے لیے ایک خاص سینڈہرسٹ اور سیالکوٹی اصطلاح تھی۔ مشرقی پاکستان کے ان بنگوز نے آئینی قوت کے سلسلے میں جو سوال اٹھایا تھا وہ محض یہ تھا کہ تعداد کے لحاظ سے یہ لوگ مغربی پاکستان کے غیر بنگوز سے زیادہ ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ پاکستان کا مغربی علاقہ چار مبہم آزاد ریاستوں میں منقسم تھا، کوئی صورت نہیں تھی کہ کوئی نظری طور پر بنگالیوں کو ایک فرد ایک ووٹ کی بنا پر حاکم اعلیٰ ہونے سے روک سکے۔ اس سلسلے میں ہتھیار ڈالنے کے بجائے پنجابیوں نے اختیار کی اکاس بیل کے پھلنے پھولنے کو ترجیح دی۔

۱۹۵۲ تک بنگالی پاکستان کے اساسی نظریات کی طرف سے تشکیک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ عوامی مسلم لیگ نے اپنے نام سے دانستہ طور پر "مسلم" کا لفظ نکال دیا تھا۔ بات یہیں نہیں تھی۔ تقسیم کے وقت بڑے پیمانے پر انتقال آبادی کے باوجود تین کروڑ ہندوؤں میں سے ایک معتد بہ حصہ جو تقسیم سے پہلے مشرقی بنگال میں رہتا تھا، بدستور مشرقی پاکستان میں قیام پذیر رہا۔ اسی دوران میں ستمبر ۱۹۵۳ میں فضل الحق نے اپنی کرشک شرمک پارٹی یا کسان مزدور پارٹی بنائی۔ یہ اور اس جیسی دوسری تمام کوششیں شعوری کوششیں تھیں مسلم لیگ کی مذہبی اور جاگیردارانہ سیاست کا نعم البدل فراہم کرنے کی۔ ۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں عوام نے اس کی مکمل طور پر تائید و تصدیق کر دی۔ مسلم لیگ (پاکستان دوست پارٹی) پر ۱۹۷۰ میں کیا گزری تھی اس بات کا صحیح اندازہ ۱۹۵۴ کے ان انتخابات میں اس وقت ہو گیا جب اس نے ۳۰۹

نشستوں کے ایوان میں محض دس نشستیں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں عوامی لیگ، کرشک شرامک پارٹی اور دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

مگر پنجابی غیر فوجی شہری ڈکٹیٹر گورنر جنرل غلام محمد اپنے منصوبوں کی راہ میں عوام کی خواہش جیسی کسی حماقت کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ جس چیز کو وہ برداشت نہیں کریں گے وہ نہیں ہوگی۔ اور وہ مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کی حکومت کو منظور نہیں کریں گے۔ مئی کے مہینے میں وزیر اعلیٰ فضل الحق کلکتے گئے۔ ان کے بعض جملوں سے مایوسی جھلکی جو انھیں اب اس پاکستان کے بارے میں ہو رہی تھی جس کے قیام میں انھوں نے خود مدد کی تھی۔ غلام محمد نے وزیر اعلیٰ کے ان چند جملوں کو بہانہ بنایا اور فضل الحق کی حکومت کو سبکدوش کر دیا۔ ایک بار پھر یہ بات جتا دی گئی کہ صاحب اقتدار وہی ہیں۔ انھوں نے متحدہ محاذ کو توڑنے اور حکومت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی کے اراکین کراچی کی سازشوں کے جلدی ہی اور خوشی خوشی شکار ہو گئے۔ دھڑے بندی کن پستیوں تک پہنچ گئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عوامی لیگ نے اسمبلی کے اسپیکر کو مجنون و پاگل قرار دیئے جانے کی سازش کی۔ اس کے جواب میں کرشک شرامک پارٹی کے اراکین نے اپنے دشمن ڈپٹی اسپیکر شاہد علی پر میزیں اور کرسیاں اٹھا کر پھینکیں اور انھیں مار ڈالا۔" جنون سے موت تک " یہ قول نہ صرف اسمبلی کے اراکین کی تصویر پیش کرنے کے لیے نہایت مناسب ہے بلکہ سارے ملک پر بھی صادق آتا ہے۔

مغرب میں بھی حالات کے سقیم ہونے کے آثار صاف نظر آنے لگے تھے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو غلام محمد نے ایک بار پھر اپنی من مانی کرتے ہوئے ساری آئین ساز اسمبلی کو ہی اس افسوس کا اظہار کرتے ہوئے برخاست کر دیا کہ " آئینی ڈھانچہ ہی منہدم ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے اعلان کا اختیار خود اپنے آپ کو دے دیا۔

بہر حال اس بات کے آثار نظر آ رہے تھے کہ مسلح افواج کو جلدی ہی دخل اندازی کرنا پڑے گی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے جب ۱۹۵۸ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے پہلے نشریے میں پاکستانیوں کو بتایا تھا کہ " آپ شاید نہ جانتے ہوں گے میں نے حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی مسٹر غلام محمد کی متعدد پیش کشوں کو کئی بار رد کیا۔" یہ بات اب یقینی معلوم ہوتی ہے کہ غلام محمد صاحب بہت بیمار تھے بلکہ قریب مرگ۔ اور انھوں نے سیاست دانوں کو حکومت سونپنے کے بجائے اسے فوجی جرنیلوں کے حوالے کرنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے فوج کو سول انتظامیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی تربیت دینا شروع کر دی تھی جنرل ایوب خاں ۱۹۵۴ء میں غلام محمد کی نامزد کی ہوئی کابینہ میں وزیر دفاع بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جنرل اسکندر مرزا بھی کابینہ میں امور داخلہ کے وزیر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ اسکندر مرزا ایک بیوروکریٹ تھے جنھوں نے اگرچہ فوج چھوڑ دی تھی مگر اپنے فوجی عہدے کو برقرار رکھنے کی انھیں اجازت دے دی گئی تھی۔ پاکستان کو آئین دینے کی ایک کا

پھر کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں دوسری آئین ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی۔ جولائی میں اس سے پہلے کہ اس اسمبلی کا کوئی اجلاس ہوتا دونوں بازوؤں کے سیاستدانوں نے معاہدے کے ایک فارمولے Murree Pact پر رضامندی ظاہر کی۔ بنگالی نیز اکثریت کے دعوے سے دست بردار ہوئے اور اس کے بدلے میں بنگالی زبان تسلیم کی گئی اور خود اختیاری کا وعدہ کیا گیا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں غلام محمد جو اب بستر مرگ پر تھے، اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ان کی جگہ اسکندر نے لے لی اور ایک نئے وزیر اعظم چوہدری محمد علی کا تقرر کیا۔ یہ موخر الذکر کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۶ء کا آئین قانون سا دستوری طور پر پاکستان ایک اسلامی ملک قرار پایا جس میں صرف کوئی مسلمان ہی سربراہ ہو سکتا تھا۔ دونوں مذکورہ شرطیں آئین کے اس پہلے مسودے میں نہیں تھیں جس کے نفاذ کو ملاؤں نے ناکام کر دیا تھا۔ بہر حال ۱۹۵۶ء کا آئین اس لحاظ سے گنیز بک آف ریکارڈز میں رکھا جا سکتا ہے کہ دنیا کا سب سے کم مدت نافذ رہنے والا آئین تھا۔ دو سال سے کم مدت میں یہ آئین کالعدم ہو گیا۔

اسکندر مرزا نے بشمول شہید سہروردی تین وزیر اعظم مقرر کیے۔ مگر کامیاب کوئی نہیں ہو سکا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ کو بالآخر انہوں نے جنرل ایوب خان سے حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کہا۔ ۱۹۵۶ کا آئین کالعدم قرار دیا اور مرکزی اور ریاستی کابیناؤں کو ختم کر دیا گیا۔ ۲۷ اکتوبر کو نئے اختیارات سے سرشار فوج نے اسکندر مرزا کو بھی نکال دیا (ان کی یادداشتوں کے مطابق) ایوب خان نے بڑا اونچا ساہبانہ یہ استدلال کیا کہ اسکندر مرزا کی بیوی سازش کرنے کے عمل کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔ تمام دوسرے جرنیلوں کی طرح ایوب خان نے بھی حکومت پر قابض ہونے سے قبل وعدہ کیا کہ "مجھے بالکل صاف الفاظ میں یہ اعلان کرنے کی اجازت دیجیے کہ ہمارا اصل مقصد جمہوریت کی بحالی ہے مگر اس قسم کی جمہوریت جسے عوام سمجھ سکیں" عوام نے ظاہر ہے کہ کبھی "سمجھ" کر نہیں دیا۔ ایوب خان نے کہا کہ "نہ تو فوج نے جمہوریت کو ملک کیا نہ ہی جمہوریت نے فوج کو چھوڑا۔" مگر بات دراصل یہ تھی کہ جمہوریت اور فوج ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔

فوجی حکومت اگر یہ تھی، فوج کے حق میں ایک اہم حقیقت ضرور تھی۔ پاکستان کے وجود کے پہلے دس برسوں میں سارے ہی ادارے خودکشی میں مصروف تھے۔ صرف فوج ہی ایک ایسا ادارہ تھا جو اپنی قوت، اپنی طاقت اور اپنے وقار میں اضافہ کر رہا تھا۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہندوستان میں اس کے بالکل برعکس ہو رہا تھا۔ عدلیہ، آئین ساز اسمبلیاں اور جمہوری سماج کے دوسرے اہم ادارے جیسے ذرائع ابلاغ وغیرہ آزادی اور ذمہ داری کی بقائے باہمی کے مشکل اسباق یاد کر رہے تھے۔ اندر ہندوستانی فوج بے توجہی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس حقیقت کا اظہار ۱۹۶۲ء میں چینی جنگ کے زمانے میں بڑے واضح طور پر ہوا تھا۔ ہندوستانی فوج کی طرف سے ... بے توجہی اور لاپروائی۔ بے ارادہ ہو سکی

ر یہ تقاضائی ہرگز نہیں تھی۔ اس صورت حال کے پیچھے یہ حقیقت تھی کہ ہندوستان کو چلانے کی ذمہ داریاں اٹھانے
ے لوگوں کی تمام تر توانائیاں اور ان کی ساری دلچسپیاں مرکوز تھیں یا تو اقتصادی ترقی پر یا پھر جمہوری اداروں کے اذ
کام آسان نہیں تھا۔ ملک کے ہزاروں عظیم مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، ہندوستانی آئین میں اقتدار
ط کے لیے جواہر لال نہرو جیسے فرد کی ذہانت درکار تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کو بہت سے ایک جیسے مسائل
ے میں ملے تھے۔ مثلاً پناہ گزیں، علاقائیت، ایک قومی زبان جو عوام کے ایک بڑے حصے کو قبول نہیں تھی، مذہبی
بستی (جو آج ہندوستان میں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھیانک شکل اختیار کر چکی ہے) اور بدترین مسئلہ
بس اور بھوک کا۔ ان سارے مسائل کا حل دونوں ملک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ڈھنگ سے ڈھونڈنے میں
ے گئے۔ ایک طرف پاکستان ایک تمسخر آمیز عہد میں پھنس گیا، دوسری طرف ہندوستان اپنے اوپر بھروسہ کرتے
ے مصائب سے نبرد آزما ہوا۔ ہندوستان نے دنیا کی بدترین پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کیا۔ پاکستان کو خود اپنی
دت کے لیے جرنیلوں کے عہد حکومت (جو جناح کے پروگرام میں نہیں تھا) کا تجربہ کرنا پڑا۔ اور فوجی حکومت کے
برسوں (جسے آج عہد زریں کہا جاتا ہے) کے بعد پاکستان نے اگر کچھ دریافت کیا تو یہ کہ یہ کوئی ملک ہی
یں تھا۔

(۴)

آقا نہیں دوست

جنوری ۱۹۴۸ میں جنرل ایوب خاں (بعد کو خود اپنی کارگزاریوں اور کامرانیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے آپ کو فیلڈ مارشل مقرر کر لیا تھا) کو جنرل آفیسر کمانڈنگ مشرقی پاکستان کا عہدہ سنبھالنے کے لیے وزیرستان کے گرولی کی کمان سے تبدیل کر دیا گیا۔ آیئے ایک نظر جنرل کے کیریئر پر ڈال لیں۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ خود "خود نوشت سوانح عمری" رہے گی۔ یہ کتاب جون ۱۹۶۴ میں اس وقت لکھی گئی جب وہ مری کے پہاڑی مقام پر آ. رہے تھے اور پاکستان میں اپنے اختیار و اقتدار کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھے (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی شاخ نے جب، ۱۹۶ میں یہ کتاب شائع کی اس وقت تک ایوب خاں کے لیے حالات بہت کم سازگار رہ گئے تھے

سوانح عمری کا عنوان "آقا نہیں، دوست" بڑا معاندانہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ خود ان کے بارے میں پاکستانی عوام کیا سوچتے تھے تو اس عنوان کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے۔ کتاب کا آغاز روایتی دعائیہ بسم اللہ الرحمٰن سے ہوتا ہے۔ اس کے نیچے قرآن کی ایک آیت ہے جس کے ذریعہ حکومت کو ہاتھ میں لینے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود نہ بدلے"۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (اقبال)

ایوب خاں نے پاکستانی عوام کی حالت کو بدلنے کا عزم کیا، کیوں کہ ۱۹۵۸ تک ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے جو تبدیلیاں کیں وہ مزید ابتری ہی کے لیے تھیں۔ "وقت آگیا تھا" جیسے بھیانک جملوں کے بار بار استعمال کو اگر نظر انداز کر دیجیے تو سوانح کا پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ کتاب سے اُن رویّوں کا ادراک بھی ہوتا ہے جنھوں نے چھٹی دہائی میں پاکستان کی تاریخ کی تشکیل کی۔

ایوب خاں نے مشرقی پاکستان میں تقرری پر اپنی ناپسندیدگی پر پردہ ڈالنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ میں یہ
کہہ سکتا کہ آیندہ کے امکانات کے سلسلے میں کچھ بہت خوش تھا۔ یہ ایک انتہائی خراب قسم کی "بیرون ملک" ذمہ
تھی (اس کے برعکس بنگالی بیوروکریٹ یا بنگالی افسر کو اگر مغربی پاکستان بھیجا جاتا تھا تو یہ بات اس کے لیے باعث
ز تھی۔ دراصل حقوق یافتہ اور ناحقوق یافتہ کا رشتہ تھا) ظاہر ہے کہ جنرل اس پریشان کن اور تکلیف دہ تقرری میں
یوں کر ساتھ نہیں رہ گئے اور مشرق میں اپنا زیادہ وقت مغرب میں واپس آنے کی کوششوں میں صرف کرتے رہے۔
یوں کے لیے ان کی نفرت ان کے قول اور فعل دونوں سے ظاہر تھی۔ خود ایوب خاں نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے محمد
بوگرہ سے، جو بعد کو وزیراعظم بنے اور اس وقت مشرقی پاکستان کی اسمبلی کے ایک چھوٹے موٹے لیڈر تھے، جولائی
۱۹۰۰ء میں ایک مظاہرے کے دوران پوچھا تھا "کیا تم گولی کی تلاش میں ہو؟" بھٹو جنھوں نے ایوب خاں کے
ساتھ کام کیا تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کے گرد (ایوب خاں) بنگالیوں کے خلاف "زبردست تعصب" رکھتے
تھے۔ یہ صرف ایک انفرادی شنک کا معاملہ نہیں تھا۔ ایوب خاں کا یہ رویہ پٹھانوں اور پنجابیوں کے اس تکبر کی علامت تھا
جو ... کو پاکستان کی تنسیخ کا سبب بنا تھا۔ جب فوج برسر اقتدار آئی تو اس نے تعصبات، ثقافتی اور اقتصادی دونوں،
سیاستوں تک پھیلا دیے۔ اس خیال کا برملا اظہار بھی بنگالیوں کے لیے اذیت کا باعث تھا کہ بنگالی زبان اور بنگالی
ثقافت گھٹیا درجے کی ہے، ہندوانہ ہے، غیر عسکری اور نسوانی ہے اور اس لیے قابل نفرین ہے (اپنی مردانگی پر
... پنجابی اور پٹھان پاکستانیوں کے لیے عورت تیسرے درجے کی مخلوق ہے)۔

عام آدمی کے لیے یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ پنجابی اور پٹھان، اس میدان میں اپنے کارناموں
ے باوصف کسی دوسرے کو تہذیبی اعتبار سے اپنے آپ سے حقیر تصور کریں جیسے تکبر اور جہالت ساتھ ساتھ ودیعت
کی گئی ہوا سے کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے۔ پاکستانی فوج کے بارے میں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ فوج ہمیشہ
صح دار مرد رہی ہے جب پہلی بار اس نے حکومت سنبھالی تو بنگلہ دیش بنانے میں اس نے مدد کی، حکومت کے اپنے
دوسرے دور میں وہ سندھ کو ایک خودمختار ملک بنانے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کر رہی ہے۔

پاکستان اور خیال پاکستان میں جو خرابیاں مضمر ہیں، فوجی حکومت ان ہی کی ایک دوسری علامت ہے۔ تربیت
اور صلاحیت دونوں کے اعتبار سے غیر نظریاتی ہونے کی وجہ سے یہ ناگزیر تھا کہ ایک دن فوج، ایک ایسے ملک کو جس کی
کوئی نظریاتی اساس نہیں تھی اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔ پاکستان بغیر کسی ایسے موثر و مربوط نظریے کے، جو عوام اور
لیڈروں میں حقیقی قوم پرستی کی روح پھونک سکتا، ایک جغرافیائی علاقہ تھا جسے ایک ملک میں تبدیل کر دیا گیا۔ غیر فوجی

سیاست دانوں نے اس حقیقت کو پردے میں رکھنے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے غلطیاں کیں اور ناکام ہوئے کیونکہ ذہن، سیاسی عقاید کی سرزمین میں پروان نہیں چڑھ سکتے۔ آپ کسی مصنوعی تخلیق پر حکومت نہیں کر سکتے ہو سے زیادہ عارضی طور پر نظم و ضبط فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ بات بالکل منطقی تھی کہ فوج کسی نہ کسی دن حکومت پر قبضہ کر لے گی۔ بہرحال اصل مسئلہ باقی رہا۔ نظم و ضبط فراہم کرنے کے پیچھے "قانون نہیں تھا" ایمان لانے کے لیے کچھ نہیں تھا احترام کچھ نہیں تھا۔ عوام کو متحد کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کسی ملک کی تخلیق اپنے ایمان کے صرف اظہار کی خاطر۔ کر سکتے۔ مسلمان جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں وہ اس کا اظہار کہیں بھی کر سکتے ہیں۔ افریقہ اور امریکا میں بھی اور چین اور ہندوستان میں بھی اسی لیے یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کہ بہت سی کوششوں کے بعد (جن سب کی توثیق آئین ساز اسمبلیوں نے کی تھی) پاکستان کے پاس آج بھی کوئی ایسا آئین نہیں ہے جس پر سارا ملک متفق ہو۔ آئین لفظیات کا کھیل نہیں عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔

فوجیوں کو اگر کسی پر بھروسہ تھا تو وہ خود اپنے آپ پر اور یہ چیز ایک انحطاط پذیر اتحاد کے درمیان کامیابی فریب دینے کے لیے کافی تھا۔ ایوب خان نے اس وقت تک بغاوت نہیں کی جب تک کہ انھوں نے فوج کی صلاحیت اور اس کا اتحاد مستحکم نہیں کر لیا۔ یہ ان کی دور بینی تھی ورنہ تو پاکستان کا ایک واحد ادارہ جس نے کچھ مضبوطی حاصل کر لی اسی غیر مستحکم حالت تک پہنچ جاتا جہاں سارا ملک پہنچا ہوا تھا۔ ۱۹۷۱ میں یہ حال فوج بھی ملک کو نہ بچا سکی اور پھر کون فوج ہے جو ایک ملک کو خود اپنے آپ سے بچا سکتی ہے۔

حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش کرنے والی فوج کی قیادت نہ تو ایوب خان کر رہے تھے اور نہ ہی یہ کارروائی ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ کوشش اس وقت ہوئی جب ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ میں پہلے پاکستانی ایوب خان نے جنرل سر ڈگلس گریسی سے ملک کی فوج کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لی تھی (جنرل گریسی وہی ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کی جنگ میں کشمیر میں اپنی فوجوں کو بھیجنے کے جناح صاحب کے حکم کو نہ مانتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے احکامات اگا تک ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لیتے ہیں۔) اپنے برطانوی پیشرو سے پہلی بات ایوب خان کو جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ فوج میں "ینگ ٹرکس" کا ایک گروپ ہے جو ملک اور نئے کمانڈر ان چیف دونوں کے لیے درد سر بن سکتا ہے۔ جنرل گریسی مزید زیادہ سے زیادہ جو بتا سکتے تھے وہ یہ تھا کہ میجر جنرل اکبر خان جیسے افسر "عجیب و غریب" تھے۔

ایوب خان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کے شک و شبہ کا اظہار وزیر اعظم لیاقت علی خان نے

میں اس نے اور اسکندر مرزا سے دوپہر کے ایک کھانے پر سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بیان ہے وزیر اعظم نے اس وقت کہا تھا "حضرات، میرے پاس آپ کے لیے بری خبر ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ فوج کے بعض افسران حکومت کا تختہ الٹنے کا ایک منصوبہ تیار کر چکے ہیں اور اس منصوبے پر عمل درآمد بھی جلد ہی ہونے والا ہے۔" ایوب خاں کو بریگیڈیئر صدیق خاں پر شبہ تھا جن کے بارے میں عام طور پر لوگ جانتے تھے کہ وہ کچھ متضاد خیالات رکھتے ہیں۔ یہ میٹنگ بہت مختصر تھی۔ کمانڈر ان چیف نے کہا "صدیق تم مجھے سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمھیں یہیں تک اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔" صدیق نے جھوٹ بولا اور ایماندار بنے رہے۔ انھوں نے اس قسم کی سازش سے صاف انکار کر دیا اور انھیں اپنی کمانڈ پر جموں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر صدیق پہلو بچا کر ان کا ٹیلی فون خفیہ طور پر سنا جاتا ہے بلکہ جاسوسی نے انھیں اس وقت بے نقاب کر دیا جب سیالکوٹ کے مقام پر انھوں نے فون پر سازش میں شریک اپنے دوست کرنل ارباب کو یہ بتایا اور غالباً خاص سینڈ ہرسٹ والوں کے انداز میں کہا "تمام تفصیلے سے باہر نکل گئی ہے"۔ پولیس انسپکٹر جنرل قربان علی نے جستجوؤں کی قیادت کی اور ایک رات میں فوجی اور شہری سب ہی سازشیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

مقدمہ بند کمرے میں ہوا اور سازشیوں نے اپنے دفاع کے لیے جو شخص وکیل لیا وہ حسین شہید سہروردی تھے مقدمے کی کارروائی آج بھی صیغۂ راز میں ہے مگر یہ بات معلوم ہے کہ سازش میں شریک لوگوں کی نیت میں حکومت کا تختہ الٹنے کے خیال کے حامی دوسرے بہت سے افراد بھی تھے۔ اور ۱۹۵۱ء میں ہی ایسے خیالات رکھنے والے افسروں کو الزام دینا مشکل ہوگا اگرچہ یہ وہ وقت تھا جب سویلین حکومت عوام کی نگاہوں میں بدنام ہو چکی تھی۔ افسروں نے دیکھا کہ ملک کا بااثر طبقہ غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر ملنے والے ملک کے بیشتر مادی وسائل پر قبضہ کر لیا ہے تو انھوں نے سوچا کہ اس لوٹ میں شریک ہونے کا حق انھیں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ دوسروں کو۔ آپ کو کرنا صرف یہ تھا کہ وہاں سے ٹینک ۹۵ میل کھینچتے رہیے۔ اور یہ کام کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

بعد کو ایوب خاں نے ۱۹۵۸ء میں خود اپنے "انقلاب" (حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے سرکاری اصطلاح) کو یہ کہہ کر حق بجانب ثابت کیا کہ "ملک کا دارالسلطنت اپنی سازش اور جعل سازی کا مرکز تھا۔ آخر لوگ اپنا کام ستھری سی ایمانداری کے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟ وہ اپنے اندر ایک اجتماعی احساس کیوں نہیں پیدا کر پاتے یہ دھڑے بندیاں کیوں؟ اختلافات اور جھگڑے کیوں؟ یہ بغض و حسد اور بدگمانیاں کیوں؟ وہ سب ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کراچی کے ایک دوست سے پیدا ہونے والی مایوسی سے نجات پانے میں مجھے

تین دن ٹک جاتے تھے۔ وہ تمام ادارے جو حصول آزادی کے وقت ہمیں ورثے میں ملے تھے یا بعد کو ہم نے خود بنائے تھے، ایک ایک کر کے منہدم ہوتے جا رہے تھے۔ ہر شخص سیاسی دنگل میں شامل ہو گیا تھا۔ انتظامیہ کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جسے شخصی سیاسی مفادات کو فروغ دینے میں نہ لگا دیا گیا ہو۔

۹ جون ۱۹۵۸ء کو وزیراعظم فیروز خاں نون نے ایوب خاں کو کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے مزید دو سال اور دیئے۔ ۸ اکتوبر کو جنرل ایوب خاں نے خود اپنے لیے تھوڑی اور توسیع کا فیصلہ کیا۔ مگر اکتوبر کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کارروائی کے لیے وہ کم از کم چھ مہینے تک بہت سرگرم رہے۔

اس زمانے میں انھوں نے جو ڈائری رکھی اور جس کے بہت سے حوالے انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دیے ہیں، اس میں انھوں نے لکھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۵۸ کو انھوں نے ہیگ میں بیگم لیاقت علی خاں سے ملاقات کی۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ تقریباً دس سال تک سخت حکومت رکھی جائے (درحقیقت یہی مدت تھی جس میں یہ حکومت قائم رہی، اور پھر وہ پراگندگی اور انتشار پھیلا کر جس نے ملک کو توڑ ہی ڈالا) ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ جنرل ایوب اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں جو کتاب ان کے زیر مطالعہ تھی اس کا نام تھا "افراد جنھوں نے ہندوستان پر حکمرانی کی۔"

۴ اکتوبر کو ایوب خاں ٹرین کے ذریعہ اپنے مخصوص ڈبے میں بیٹھ کر کراچی پہنچے جہاں جنرل حامد اور جنرل یحییٰ خاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ۷ اکتوبر کی شام کے سات بجے تک وزیراعظم نے اپنے متحدہ محاذ کے ساتھیوں کے آپسی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے باہمی مصالحت کی راہ نکال لی مگر آٹھ بجے تک مصالحت کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ صدر اسکندر مرزا کے تعاون سے ایوب خاں نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے مرحلے کی تکمیل کر دی۔

پاکستان کی تاریخ کو نہایت واضح چار حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ دو پرانے پاکستان میں اور دو نئے پاکستان میں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک بتدریج انحطاط کا شکار ہوتی ہوئی سویلین حکومت، موجودہ پاکستان میں ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۷ تک روز افزوں غیر نمائندہ ہوتی ہوئی جمہوریت اور ۱۹۷۷ کے بعد جیسا کہ ہم خود دیکھ رہے ہیں ایک فوجی آمریت جو اپنے اقتدار کو مستقل شکل دینے میں مصروف ہے۔ یہ دونوں غیر متوازی عہد ہیں۔ مستقبل ماضی کا عکس۔ سوائے اس کے کہ دوسری بار کی سویلین اور فوجی دونوں حکومتیں پہلے دور کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور تباہ کن تھیں۔

جمہوریت کے میدان میں پاکستان کا ابتدائی تجربہ، صاحبان اقتدار کی کم ظرفی اور چھوٹے پن کی مہربانی سے مایوسی اور ناامیدی کی شکل میں سامنے آیا۔ دوسرا تجربہ ایک فرد کے، ذہانت و قابلیت سے نیچے گر کر مخبوط الحواس ہو جانے کی

ی ہور سے کشت و خون میں ڈوب گیا۔ اگر غلام محمد سے لے کر اسکندر مرزا تک لیڈروں کے سلسلے نے ہر صبح آئینے کے سامنے بیٹھ کر شدومد کے ساتھ اپنی ناک اور منہ کے مباحثے جاری رکھ کر اپنے آپ کو تباہ کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے آئینے کے سامنے بیٹھ کر ایک بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ عارضی اور ناپائدار لیڈروں کی بجائے کسی دوسری یا وہ اہم چیز پر ایمان رکھنے والے ادارے اول الذکر کی حماقتوں اور موخر الذکر کی انا پر قابو نہ پا سکے۔ غلام محمد مر گئے کبھی ن آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔ اسکندر مرزا کو ایوب خاں نے جلاوطن کر کے لندن بھیجا۔ بھٹو کو پھانسی پر چڑھنا پڑا۔ نظام کی اعتماد پذیری کی اس سے بڑی علامت اور کیا ہو سکتی تھی۔

بھٹو، میکالے کے تعلیمی نظام اور صدیوں سے چلی آ رہی جاگیردارانہ روایت کی پیداوار تھے۔ ف میں وہ اچھی گفتگو اور دلچسپ خیالات کے لبرل تھے اور گھر میں ملاقات کے لیے آنے والے کسانوں کو، اس سے پہلے کہ ایک شہزادہ اور ایک زمیندارزادہ ملاقات کا شرف بخشتے کئی دن انتظار کرا سکتا تھا۔ اپنے صحیح مقام اور اپنی اصلی حیثیت کا احساس دلانے کے لیے گنواروں اور دیہاتیوں کے لیے اس طرح کی تحقیر ضروری تھی۔

سڑکوں پر اور اپنے انتخابی جلسوں میں وہ ملاؤں کی قدامت پرستی کی دھجیاں اڑانے والا تھا۔ وہ مذہبی ٹولے و ر فوج دونوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ لاکھوں لوگوں کی تالیوں سے خود سرشار اور اپنی خوب صورت اور موثر تقریروں سے سامعین کو مسحور کرنے والا، عوام کا ہیرو۔ وہ ضرورت، ردعمل موڈ اور دوسروں کی قوت فہم کا زبردست نباض تھا۔ لاہور ن نعرے لگاتے ہوئے عوام کے ایک جلسے میں ان کی تقریر کی ایک کہانی بہت مشہور رہی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اس وقت بھی لوگ جانتے تھے کہ بھٹو اپنے ذاتی عادات و اطوار میں کچھ بہت اسلامی نہیں تھے اور موڈ بنائے رکھنے کے لیے تھوڑی سی اسکاچ وسکی پسند کرتے تھے۔ ملاؤں کو بھی اس کا علم تھا اور وہ انھیں شرمندہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس جلسے میں ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی، انھیں شرابی کہا، خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کا مجمع ایسی غیر اسلامی عادت کو معاف نہیں کرے گا۔ تھوڑی دیر تک تو بھٹو ان باتوں کو سنتے رہے اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں شراب پیتا ہوں۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں مگر ملاؤں کی طرح عوام کا خون نہیں پیتا“ مجمع نے یہ فوراً ایک نعرہ بنایا اور اس کا ورد شروع کر دیا۔ ”پیو رے پیو رے بھٹو، جیو رے جیو رے بھٹو“ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد عوام، مذہبی ٹولے اور فوج دونوں ہی کو ملک کی شکستگی و بربادی کا ذمہ دار سمجھنے لگے تھے اور پاکستان میں روشن خیالی کی ایک ہوا سی چلنے لگی تھی۔ بھٹو نے اس لہر کا پورا فائدہ اٹھایا، اور ان لوگوں کے خلاف اپنی جنگ کو کسی حد تک جذباتی سطح پر زیادہ کارگر بناتے ہوئے لاہور کی سڑکوں پر ملاؤں کے امرد پرستی کے بدنام جہاں شوق کا تذکرہ برملا کر

شروع کر دیا۔

بھٹو کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو ان کے پریس ایڈوائزر خالد حسن کے ایک تجربے سے سامنے آتا ہے۔ ایک دفعہ بھٹو روسیوں کو ایک ذاتی اور اسی لیے کسی حد تک پوشیدہ خط بھیجنا چاہتے تھے اور وزارت خارجہ کو اس قسم کا خط تیار کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد بالآخر بھٹو کو اس غیر رسمی خط کا دفتر خارجہ کا تیار کیا ہوا مسودہ ملا۔ بھٹو نے خط کے مسودے کو پڑھا اور خالد حسن کو بلا بھیجا۔ چہرے پر بڑے صابر و شاکر تاثرات کے ساتھ بھٹو نے خالد حسن سے پوچھا "تم جانتے ہو کہ برصغیر میں انگریزوں کی سب سے بڑی ناکامی کیا تھی؟ اب مایوسی اور بے بسی کی جھلک خالد حسن کے چہرے پر تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ آقا اپنی طول طویل اپ شناپ خود کلامی پر اترنے والے ہیں مگر بھٹو نے خلاف امید بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔" ان کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ یہاں دو سو سال حکومت کرنے کے بعد بھی وہ کسی کو انگریزی نہیں سکھا سکے۔"

دھواں دھار شعلہ بیان اور زبردست ذہانت کے درمیان ایک نپولین کا مزاج تھا۔ اگرچہ بڑی انا اور نسبتاً کم صلاحیت کے ساتھ، خود ان سے وفاداری رکھنے والے لوگ انھیں ڈیموکریٹ نہیں کہتے تھے۔ شاید اپنے خیالوں کی دنیا میں وہ سمجھتے تھے کہ عوامی خواہش کے مطابق ان کی تاجپوشی ہونا ہے۔ بہرحال انھوں نے جلدی ہی اس تھوڑے بہت کا انتظام کر لیا جس کا براہ راست تعلق اور جس کی مماثلت اس چیز سے تھی جو ملک نے اپنے خالق جناح صاحب کو دی تھی یعنی صاحب قائد اعظم تھے۔ بھٹو نے اپنے آپ کو قائد عوام نامزد کیا۔ (یہ اس قسم کی حماقت تھی جس کا تصور بھی مسز اندرا گاندھی نہیں کر سکتی تھیں)۔

اگر جمہوریت کی فضا میں پروان چڑھے ہوئے ادارے پاکستان میں ہوتے تو شاید بھٹو صاحب ان زیادتیوں سے بچ جاتے جو ان سے سرزد ہوئیں۔ مگر انھیں تو ایک غیر واضح اور مبہم پاکستان ملا تھا جو استحکام کی طرف جا تو رہا تھا مگر اسے یقین نہیں تھا۔ اور منطقی جواز کی حدود کے اندر وہ قابل راہ بھی نہیں تھے جن سے اسے ٹھیک راستے پر رکھا جاتا۔ بھٹو صاحب کو ایک جمہوری پاکستان بنانے کا موقع ملا مگر یا تو وہ یہ جانتے نہیں تھے کہ یہ کیسے بنایا جائے یا پھر یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ۱۹۷۱ نے اگر سویلین حکومت کی واپسی کو یقینی بنایا تھا تو ۱۹۷۷ نے ایک دوبارہ بحال کی ہوئی فوج کا چہرے

تذار میں ۱۹۷۱ء تک بزیر کر دیا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی بڑے غیر معمولی درک کی ضرورت نہیں ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جگجیت سنگھ اروڑہ
کی فوجوں کے سامنے مشرقی پاکستان کی شکست کے بعد جب بھٹو کو عنان حکومت سونپی گئی تو اس وقت ان کی ترجیحات
کیا ہوں گی۔ ملک جسمانی اور اخلاقی طور پر شکستہ ہو چکا تھا مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اس وقت بھی فوج کو نکالنے کے لیے
دھکا دینا پڑا۔ ۱۷ دسمبر کو واقعہ سے ڈھاکہ نکل گیا اور ریڈیو پاکستان کے نشریوں میں سے یحییٰ خان کا نام غائب ہو گیا مگر
چوبیس گھنٹوں کے بعد پھر آنے لگا۔ مستقبل کے بارے میں برے خدشات تھے، مثال کے طور پر اسٹیٹ بنک آف
پاکستان کو اس افواہ کی تردید کرنا پڑی کہ بڑی رقموں والے کرنسی نوٹ ترک کیے جا رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نیویارک میں
تھے اور ۱۹۶۵ء کی طرح اقوام متحدہ میں ہونے والی جنگ (مباحثہ) کی قیادت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں وہاں
سے واپس بلا لیا گیا مگر یہ خبر گرم ہوئی کہ "اسلام آباد کے بنگالی رفیق نور الامین کو وزیر اعظم بنایا جائے اور بھٹو صاحب کو ان کا
نائب۔ اس سلسلے میں بھی کوئی واضح اور قطعی بیان نہیں تھا کہ یحییٰ خان سبکدوش ہوں گے۔ ایر مارشل اصغر خاں یحییٰ خاں سے ملے
اور ان سے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ وہ نکل جائیں نہیں تو ان کی تکا بوٹی ہو جائے گی۔ اصغر خاں نے کہا "یحییٰ نے قوم کی
تحقیر کی ہے۔۔۔ (بدقسمتی سے) جاپان کی (ہراکری کی) طرح کی روایت ہمارے یہاں نہیں ہے۔۔۔ مجھے اس
بات سے کوئی دل چسپی نہیں ہے کہ ان کی جگہ پر کون آتا ہے۔"

نیویارک سے واپسی پر سر ایلک ڈگلس ہوم سے گفت و شنید کے لیے لندن پہنچنے تک بھٹو صاحب کے پاؤں
زمین پر نہیں تھے۔ انھوں نے اخبار نویسوں سے خطاب کرتے وقت کہا تھا "عوام کو مجھ پر بھروسہ ہے" اور پھر انھوں
نے مستقبل میں اپنے امکانی رول کی تصویر کشی شروع کی۔ "ہم پورے ایک نیا ملک بنانے جا رہے ہیں۔ ہمارے
سامنے بہت سے مسائل ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ کتاب پیدائش کا پہلا باب ہے۔"

بھٹو کے ذہن میں یہ کتاب پیدائش تھی اور وہ خدا کا رول ادا کر رہے تھے۔

قوم سے کیے جانے والے پہلے خطاب میں لفظ "میں" کا بہت استعمال تھا۔ یحییٰ خاں نے بھٹو کو اسی طرح
اقتدار سونپا تھا جس طرح ایوب خاں اور خود ان کے درمیان حکومت کا تبادلہ ہوا تھا۔ ایک کا دکھ دوسرے کا سکھ
مگر یہ سب کچھ ہوا پر امن طریقے پر۔ بھٹو صاحب نے بھی ریڈیو پر منتظر عوام سے خطاب کیا۔ بھٹو کی اس تقریر میں ایک
تو لفظ "میں" سے پرہیز کیا گیا تھا اور دوسری طرف ساری کی ساری تقریر ایک اچھی ہوائی تقریر تھی۔ "کاش میں آج
نہ ہوتا"...... "میں آج آپ لوگوں سے دل سے بات کروں گا (تقریر کے باقاعدہ تحریری شکل میں نہ ہونے کی طرف

کرتے ہوئے) فوج کی فتح کوئی فتح نہیں ہوتی (نیا آئین) میرا آئین نہیں ہوگا۔ میں عوام کا خادم ہوں ... مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے تعاون کی ضرورت ہے... میں آپ کی رضامندی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ جمہوریت کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں ساڑھے پانچ سال تک لگا رہا ہوں۔ یہ جدوجہد کوئی معمولی جدوجہد نہیں۔

اس سے قبل لندن میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا تھا "ریاستوں کا ایک لیگ وفاق ہی حل ہے۔" اس وقت بھٹو صاحب نے برملا یہ تسلیم کیا تھا کہ دو چیزیں ہیں جو پاکستان کو اب بھی قائم رکھ سکتی ہیں اور وہ ہیں جمہوریت اور صوبائی خود اختیاری۔ بھٹو صاحب یہ بات بنگلہ دیش کے حوالے سے کر رہے تھے اور اس خوش فہمی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ پاکستان ابھی ٹوٹا نہیں ہے مگر وہ اس بات سے یقیناً واقف تھے کہ بلوچستان اور سندھ بھی بنگالی ہونے کے لیے بے چین ہیں۔ بہرحال، حال اور مستقبل کی آزادی کو یقینی بنانے والے اداروں کی تشکیل اور ان کے استحکام کے لیے کچھ کرنے کے بجائے بھٹو صاحب نے ان کو اپنے شخصی اقتدار کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

علامتیں بہت شروع ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ مثلاً برسرِ اقتدار آنے کے چند ماہ بعد بھٹو صاحب نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ صرف وہی اخبارات اور وہی صحافی چل سکیں گے جو سچائی کو خود بھٹو صاحب کی نظر سے دیکھیں گے۔ لاہور کے تین رسالوں 'زندگی'، 'اردو ڈائجسٹ' اور 'پنجاب پنچ' پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کے ایڈیٹروں اور ناشروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ 'ڈان' نے جو ایک زمانے میں مسلم لیگ کا ترجمان تھا، اس کارروائی کو آزادی کے لیے پاکستان پر سب سے زبردست حملہ قرار دیا۔

یہ بات بہت جلدی واضح ہوگئی کہ بھٹو صاحب کے ذہن میں کس قسم کی جمہوریت ہے۔ ضیا حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے قرطاس ابیض سے ظاہر ہے کہ جاب وار ہیں۔ ان میں دیے گئے بہت سے اقتباسات مسٹر بھٹو کے سیاسی حریفوں اور ذاتی مخالفین کے ہیں اور اسی لیے ان پر شک و شبہے کی پرچھائیاں ہیں لیکن پھر بھی اگر ہم اپنی شہادتوں کو ان باتوں تک محدود رکھیں جو مسٹر بھٹو کے زمانے کے سرکاری دستاویزات سے لی گئی ہیں تب بھی یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اگر انھوں نے کسی کا احترام کیا تو وہ خود ان کی اپنی ذات تھی۔ ہر وہ شخص جس نے انھیں کسی معمولی کسی مسئلے پر چیلنج کرنے کی کوشش کی نہ صرف ان کا بلکہ ملک کا دشمن قرار پایا۔ مسٹر بھٹو نے ایک ایسی غلطی کی جو کوئی دوسرا کم متکبر اور زیادہ محتاط آدمی کرنے سے احتراز کرتا۔ انھوں نے بھی خاصی باتیں تحریری شکل میں اور خود سرکاری فائلوں پر لکھ دیں۔ ۱۹۷۶ء میں پانچویں آئینی ترمیم کی منظوری کے متعلق عدلیہ کے بارے میں دو واقعات اس حقیقت کی نشاندہی

ہیں کہ اس اہم ادارے کے سلسلے میں بھٹو گورنمنٹ کس طرح سوچتی ہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۶ کو (بھٹو عہد کی کارگزاریوں سے ترجمانِ "ابیعین" جلد دوم کے مطابق بنیادی ریاستی اداروں کے ساتھ برتاؤ) ایک آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ملک کریم نے ایک تحریر بھیجی جس میں انھوں نے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدارت کے بھٹو کے دوست امیدوار کی شکست کا الزام لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سر رکھا اور سفارش کی کہ "اب جب کہ عدلیہ ایک متوازی حکومت کے روپ میں سامنے آگئی ہے، وہ وقت آگیا ہے جب امریکہ کی طرح، عدلیہ کو سپریم جیوڈیشری کونسل کے بجائے پارلیمنٹ کے ماتحت لانے کے لیے پانچویں آئینی ترمیم پاس ہو جانا چاہیے۔"

بھٹو صاحب کو یہ بات پسند آئی اور انھوں نے حاشیہ پر لکھ دیا "اشد ضروری"۔ پانچویں ترمیمی بل پر ہونے والی بحث کے دوران مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے عدلیہ پر زبردست حملے کیے۔ ۳ ستمبر کو مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ "عدلیہ قانون کی تشریح کے بہانہ پر، غلط تطبیق، غلط نمائندگی اور غلط تاویل کر کے ایک متوازی انتظامیہ نہیں بن سکتی۔ اس بات کو مکمل طور پر سمجھ لیا جانا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص اسے نہیں سمجھتا ہے تو اسے اس کی قیمت اپنی تباہی و بربادی کی شکل میں دینا ہوگی۔" یہ ترمیم کسی شخص کو حراست میں رکھنے کے انتظامیہ کے حق کے تحفظ کی خاطر کی گئی تھی۔ انتظامیہ کی وکالت میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے اسمبلی کو بتایا "یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، مسٹر اسپیکر، احتیاطی نظربندی ہنگامی حالات کے مترادف ہے۔ یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ ایمرجنسی کو منظور کیا گیا ہے اور اسے منظور کیا جاتا تھا کیونکہ ہنگامی حالات کا وجود ہے یا نہیں اس بارے میں فیصلہ کرنا اور اعلان کرنا صرف انتظامیہ ہی کا حق ہے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ مسٹر بھٹو جس ایمرجنسی کا حوالہ دے رہے تھے وہ ۱۹۷۱ کی جنگ سے قبل ۲۳ نومبر کو نافذ ہو چکی تھی اور مسٹر بھٹو نے اپنے چھ سال سے زیادہ کے عہد حکومت میں بغیر اس کو ختم کیے ہوئے کام کیا۔

عدلیہ بے اثر کر دی گئی اور جمہوریت کو کرسی کی جاگیر بنا دیا گیا۔ تحکم پسند بھٹو سے کم وفاداری جیسے جرم پر سیاسی برخاستگی اور سزاؤں کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں، اور سب کی سب سرکاری فائلوں میں۔

آخر میں بھٹو صاحب نے جن اداروں کو استعمال کیا تھا وہی ان کے خلاف ہو گئے۔ اور جب انھوں نے ۱۹۷۷ کے انتخابات میں دھاندلی کر کے عوام کی تحقیر کی تو وہ بھی ان کی تشدد آمیز مخالفت پر اتر آئے۔ بھٹو صاحب کو یہ علم الیقین ہمیشہ رہا کہ انھوں نے اعلیٰ عہدوں پر وفادار جرنیلوں کا تقرر کر کے فوج سے پیچھے کی پالیسی لے لی ہے۔ اس خوش فہمی کے ساتھ ساتھ اپنی ذکاوت و ذہانت (میکیاولی، سسرو، بھگل، رنیڈ، افلاطون) کے بارے میں خود ان کے اندازے نے انھیں اپنی نظر میں ایک با اصول اور معصوم فرد بنا رکھا تھا۔ جیل میں اپنی بدبختانہ حالت، پھانسی کے

پھندے کے بارے میں ان کی قابل رحم بے یقینی، بڑی الم ناک ہے۔ انھیں کوئی نہ بچا سکا۔ یہاں تک کہ ان کی خارجہ پالیسی جو ان کے آڑے نہ آئی جس پر انھیں فخر تھا اور حق بجانب تھا۔ اپنے کردار اور اپنی داخلہ پالیسیوں کے نتائج سے بچ کر نکل جانے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں۔

مگر فوج، جس کے لیے بھٹو صاحب نے اتنا کچھ کیا، اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا، ان کے خلاف کیوں ہوگئی؟ اور ضیاء نے، کہ جنھیں بھٹو صاحب نے جنرل بنایا تھا، کس طرح ان کو پہلے جیل بھیجا اور پھر پھانسی کے تختے پر۔

۱۹۶۹ میں ایوب سے الگ ہونے کے بعد بھٹو صاحب کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ اقتدار تک پہنچنے کا راستہ ان کے لیے صرف جمہوریت ہی کا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ فوج تو ان کو اپنی مدد سے اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہونے دے گی چنانچہ انھوں نے فوجی حکومت کے خلاف ایک بڑی سیاسی تحریک شروع کی۔ ۱۹۶۹ میں انھوں نے پرجوش طالب علم لیڈر طارق علی (مصنف: Can Pakistan Survive Penquine Books) سے ان کی پارٹی میں شامل ہونے کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا "تم کچھ بہت زیادہ اصولی ہو۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں ہم اسلام سے صرف نظر نہیں کر سکتے ہیں۔ ان حرام زادوں (فوج) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ میرا یا چی گویرا کا۔ یہ یا تو میں ہوں گا یا پھر پہاڑوں میں بندوق بدست بلوچی۔"

آخر جیسا کہ طارق علی نے اپنی کتاب میں انتہائی معقول طور پر لکھا ہے، بھٹو اور ان کی حکومت کے طبقاتی کردار نے انھیں ان ہی بلوچیوں سے پہاڑوں کے دروں میں، مقابلہ آرائی کے لیے دھکیل دیا۔ علاقائی قومیتوں کو زیادہ خود مختاری دینے سے متعلق اپنے تمام خیالات و نظریات کو کیسر بھلا کر بھٹو صاحب نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک مہم کا آغاز کر دیا۔ سندھ نے بغاوت نہیں کی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب خود ایک سندھی تھے اور یہ علاقہ باوجود اس کے کہ اقتصادی طور پر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا ان کی حکومت سے کچھ جذباتی لگاؤ رکھتا تھا۔ حکومت پنجاب میں تھی اور بھٹو صاحب نے اپنے پورے عہد میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ پنجاب کو اپنی توقع کے مطابق بڑا حصہ ملتا رہے۔

بلوچیوں کو پاکستان میں زبردستی کھینچ لیا گیا۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کی ایک جاگیردارانہ اسٹیٹ تھی اور وہ ۱۹۴۷ کے بعد اسی طرح رہنا چاہتے تھے۔ پاکستان نے ۱۹۴۸ میں اس الحاق کو یقینی بنانے کے لیے اپنی فوج بھیجی اور ۱۹۴۹ میں بلوچیوں کے خلاف پہلی فوجی مہم کی قیادت ایوب خان نے کی۔ بلوچی لیڈروں کو پھانسیاں دی گئیں۔ تحریک اس وقت دب گئی مگر بنگلہ دیش کے واقعہ کے بعد پھر نئی لہریں اٹھنے لگیں۔ خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس میں پاکستان کی چار ڈویژن فوج نے حصہ لیا۔ اگست اور ستمبر ۱۹۷۴ میں پاکستان کی بری اور فضائی فوجوں نے زبردست زمینی اور ہوائی کارروائی کی

جس نے ایک بار بلوچیوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔

طارق علی نے اپنی کتاب میں اس کے نتائج کو یوں لکھا ہے "بنگلہ دیش کے زوال کے بعد رسوائی کا منہ دیکھنے والی پاکستانی فوج کو ایک بار پھر ملک کے سیاسی اسٹیج پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ اس بات کی طرف خصوصی توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی جرنیلوں کی چلائی ہوئی سب سے طویل مہمیں، خود پاکستان کے اندر، بنگالیوں اور بلوچیوں کے خلاف تھیں۔ ایک کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں نکلا اور دوسری نے ۱۹۷۷ کے بعد کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے لیے راہ ہموار کی۔۔ بھٹو کے زوال اور غیر فوجی حکومت کے خاتمے کو، ایک بامعنی علاقائی خود مختاری کو ماننے سے، پاکستان پیپلز پارٹی کے انکار سے براہ راست جوڑا جا سکتا ہے۔ بلوچستان میں بھٹو کی من چلی مہم ہر لحاظ سے ناکام تھی اس نے پاکستان کی فضا کو ایسا مسموم کیا کہ ملک آج بھی اس حیثیت سے آزاد نہیں ہو پایا اسی نے جولائی ۱۹۷۷ کے فوجی انقلاب کی اساس رکھی۔ جب بھٹو اور ان کے وزیر دفاع جنرل ٹکا خان نے بلوچیوں کو زیر کرنے کے لیے اپنی فوج کے چار ڈویژن کو احکامات صادر کیے تو در اصل انھوں نے خود اپنے عہد حکومت کے مقدر پر مہر لگا دی" ۱۹۸۳ میں ضیا کے خلاف اپنی مہم میں جب سندھ نے بلوچیوں سے ساتھ آنے کے لیے کہا تو انھوں نے سندھی لیڈر بھٹو کی ۱۹۷۴ کی کارگزاریوں کو یاد کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔)

پاکستان کا ایک اور پرانا مسئلہ بھٹو صاحب کے لیے درد سر بنا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ تھا بیرونی اور خصوصاً امریکی زور [illegible]۔ فوجی حکومتیں جنھیں اندرون ملک حمایت کا یقین نہیں تھا ہمیشہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے ہتھیاروں اور سہارے کی بیساکھی کی ضرورت مند تھیں ۱۹۷۷ میں جب فوج دوبارہ سامنے آئی تو اسے کچھ امریکی ہمت افزائی کی ضرورت تھی۔ بھٹو اپنے دوست اور ساتھی کرنل قذافی کے ذریعہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کچھ موڑ لا رہے تھے۔ واشنگٹن کے عدم اعتماد کی جڑیں بڑی گہری تھیں ان کا خیال تھا کہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں امریکا نے ہندوستان کو بیچ کر نکل دیا تھا (بھٹو نے اپنی کتاب "آزادی کا فریب" (The Myth of Independence) [illegible] "امریکا ہندوستان کی مدد کرتا ہے اور پاکستان سے صرف [illegible]" اور چھٹے باب "پاکستان کو ہندوستانی اقتدار تحت رکھنے کی امریکی پالیسی" میں اس کا ذکر کیا ہے)

دلچسپ بات یہ ہے کہ جنرل ضیا نے جب [illegible] کے ایک نمبر [illegible] سے [illegible] اس کی تصدیق کی۔ دونوں کی اس ملاقات کا حال ۱۴-۱۲ [illegible] ۱۹۹۳ کے [illegible] میں شائع [illegible] ضیا نے [illegible] کو بتایا کہ "بھٹو جو کچھ چاہتے تھے اس کو [illegible] ۱۹۰۰ میں پاکستان [illegible] تقریباً [illegible] تھا۔ چوں کہ انھیں امریکا سے کچھ حاصل نہیں ہو [illegible]

تعاون کرانے کے لیے بھٹو نے مسٹر قذافی سے درخواست کی۔ انھوں نے قذافی سے کہا کہ روس کے مفادات کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار ہیں۔ قذافی نے مارشل ٹیٹو سے رابطہ قائم کیا جو اس وقت ماسکو جا رہے تھے اور انھیں بھٹو کی اس پیش کش کے بارے میں بتایا اور بھٹو کے حق میں وہاں وکالت کی درخواست کی۔ مارشل ٹیٹو نے بعد کو یہ بتایا کہ انھوں نے روسیوں سے اس کام کی کوئی قیمت مقرر کرنے کو کہا تھا جو پاکستان ادا کرتا۔ مگر اس سب میں تاخیر بہت ہو گئی اور اقتدار بھٹو کے ہاتھ سے چلا گیا۔" اقتدار ہاتھ سے چلا گیا یا انھیں نکالا گیا، قید کیا گیا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بہرحال یہ اختتام تھا پاکستان کی جمہوریت کے دوسرے اور زیادہ المناک تجربے کا۔

۴

اہلِ ایمان

عوامی تحریک میں مختلف خیال اور مختلف عقاید کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ شدید متضاد نظریات، مفادات اور رجحانات کے ساتھ لوگ کسی ایک چیز کی مخالفت میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱ کے پُرفریب انتخابات کے بعد پاکستان میں شروع ہونے والی تحریک کی، ایک طرف پاکستان قومی اتحاد میں شامل مُلّا اور دوسری طرف قومی جمہوری محاذ کے سیکولر [illegible]ے اور ۱۹۷۱ کے بعد کے غیر فوجی عہد حکومت میں از سر نو زندہ ہونے والے بائیں بازو کے لوگوں نے زبردست مدد دی۔ مگر مسٹر بھٹو کو ہٹانے کی تحریک کو تقویت ملی دراصل عوام کی بے مثال شرکت سے جو مصیبتوں اور دشواریوں کے ساتھ لیڈرشپ کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ مگر ایک غدار ڈیموکریٹ کی بے ایمانی پر انھیں سخت طیش تھا۔ انتخابات کے اعلان کے فوراً بعد سے مسٹر بھٹو نے اس بات کی مسلسل کوشش شروع کر دی تھی کہ ان کی جیت یقینی رہے۔ ذرائع ترسیل و ابلاغ جو ہمیشہ ہی سے کمزور تھے انھیں پروپگنڈے کا ایک وسیلہ بنا دیا گیا۔ زمینداروں جیسے اقتدار کے دلالوں کو نہایت خاموشی کے ساتھ ملا لیا گیا دوسری طرف مسٹر بھٹو نے عوام کو اپنی لچھے دار تقریروں سے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔ اپنی کامیابی کے بارے میں پُر اعتماد ہونے کے ان کے پاس اسباب تھے۔ مگر انتخابات میں بھٹو صاحب کو اپنی شکست کے سلسلے میں ایک دھڑکا سا ضرور لگا ہوا تھا اور اسی لیے انھوں نے برملا بے ایمانی شروع کر دی۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مسٹر بھٹو اگر انتخابات آزادانہ اور ایماندارانہ ہو جانے دیتے تب بھی وہ جیت جاتے۔ شاید ایسا ہی ہوتا مگر پاکستان میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو انتخابات میں اپنے تجربے کے بعد اس بات پر یقین لاتا۔ پاکستانیوں کے غم و غصے کو مزید بڑھا دیا اس حقیقت نے کہ مارچ ۱۹۷۷ میں جمہوری ہندوستان نے مسز اندرا گاندھی کو نہ صرف سریرِ حکومت سے ہٹایا بلکہ نہایت پُرامن طریقے پر یہ ساری کارروائی کر دی۔ مسز گاندھی نے بھی تو انتخابات کو بے ایمانی سے جیتنے کی کوشش کی اور نہ ہی شکست کے بعد اپنے عہدے پر برقرار رہنے کی۔

جب کبھی کوئی تحریک کسی حکمران کے خلاف کامیابیوں کی منزل کے قریب پہنچتی ہے تو عموماً ہوتا یہ ہے کہ اس میں شریک لوگوں میں کوئی گروپ جو نسبتاً زیادہ بااثر ہوتا ہے جانے والے حکمرانوں کی جگہ کو پر کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے۔ کچھ وقت تو ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے جدوجہد میں شانہ بشانہ شرکت کی تھی باہمی جھگڑوں اور افراتفری کا ہوتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ طاقتور گروپ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دائیں بازو کے افراد تھے اور خصوصاً بنیاد پرست جنھوں نے بھٹو مخالف تحریک میں مرکزی کردار ادا کیا تھا مگر جوں ہی وہ کامیابی کے قریب پہنچے ان کی بنیادی کمزوری بھی بے نقاب ہو گئی۔ ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگرچہ بھٹو کو ہٹانے کے محدود مقصد کے لیے وہ عوام کو سڑکوں پر لا سکتے تھے مگر ایک نئی حکومت کے قیام کے لیے عوامی حمایت کی جس توانائی کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی۔ بھٹو مخالف تحریک جب اپنے شباب پر تھی اس وقت بھی تو عوامی حمایت پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے تو کسی اور موقع پر قبولِ عام حاصل کرنے کی ان کی صلاحیت سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ جائزہ یا یہ رائے صرف مصنف ہی کی نہیں ہے، کوئی دوسرا نہیں خود جنرل ضیا نے مئی ۱۹۸۲ کے ایک انٹرویو میں یہ بات بڑی صفائی سے کہی تھی۔ انھوں نے ۱۹۷۷ کے انتخابات کرانے کے وعدے کو پورا نہیں کیا کیوں کہ دائیں بازو کی پارٹیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ خود جیت نہیں سکتیں اور بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی سر پر حکومت پر پھر آ جائے گی۔ جنرل ضیا نے کہا: "۱۹۷۷ میں پیپلز پارٹی جیت گئی ہوتی۔ یہ وہ پارٹی تھی جسے ہم نے دس سال باہر کیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی مخالف پارٹیوں نے کہا: اس سے کیا فائدہ ہے؟ آپ حکومت بھی ان کے ہاتھ میں دے دیجیے۔ ہم نے اس پہل قدمی کے لیے فوج کو صرف اس لیے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ اس حکومت کو ختم کر دے بلکہ یہ بھی چاہا تھا کہ ایسے اقدامات بھی کیے جائیں جن سے اسلامی قوانین کا نفاذ بھی کیا جا سکے۔ نظامِ مصطفیٰ قائم ہو اور ایک ایسی حکومت بنے جسے پاکستان کے عوام کا فرمان ملا ہو۔" میں نے کہا تھا کہ اس بات میں تضاد ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی حکومت کو عوام کا فرمان کیا حاصل ہوگا جو انتخابات میں عوام کے سامنے جانے کی جرأت نہیں رکھتی۔ اس کے جواب میں جنرل ضیا نے صرف یہی کہا "ہاں اس میں تضاد ہے۔"

اس گفتگو میں 'مجبور کیا' کا لفظ ہمارے لیے دلچسپ ہے۔ جنرل ضیا کے قول کے مطابق ملاؤں نے حکومت پر قابض ہونے کے لیے فوج کو "مجبور کیا"۔ وجہ بالکل سیدھی ہے۔ کیونکہ کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں جس سے ان کے، جتنا یہ سہ مطالبات ملک میں قانون بن سکتے کیونکہ ملا ایک جمہوری نظام میں حکومت کر ہی نہیں سکتے تھے اس لیے انھوں نے فوج کو آلۂ کار بنایا۔ اس وقت ملاؤں کو بنیاد پرست جنرل مل گئے تھے۔ اس دور کے عام میں جب بھٹو صاحب بھی برسرِ اقتدار تھے حکومت پر قابض ہونے کا اس سے پہلے بھی موقع تھا ان حریفوں کے ہاتھ ایک بہانہ آ گیا اللہ کے نام کا۔

۷۷ء میں جولائی کا مہینہ تھا کہ جنرل ضیا بھٹو کے دفتر میں داخل ہوئے اور ان کو یہ بتا دیا کہ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

جنرل ضیا نے مصنف کو بتایا تھا کہ درحقیقت انھوں نے مسٹر بھٹو کو حکومت پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں پندرہ دن کا نوٹس دے دیا تھا۔ یہ بات اس وقت سامنے آئی تھی جب میں (مصنف) نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا ان کے دماغ میں کبھی بھی یہ بات آئی کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکانا غلط تھا۔ جنرل ضیا نے جواب دیا تھا کہ "نہیں نہیں، کبھی نہیں، میں نے یہ سوال کیا کہ انھوں نے ذاتی طور پر اس وقت کیا محسوس کیا جس وقت مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا؟ جنرل ضیا نے ایک بڑا طویل جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ "مجھے اس وقت بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ پھانسی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے نہ جانے کتنے قتل کیے تھے، خود ان کے پانچ سالہ ریکارڈ پر نظر ڈال لیجیے، پیچھے کی طرف دیکھیے۔ غالباً یہ سزا تھی جو خدا کی طرف سے متعین تھی۔ مجھے کوئی تاسف نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دوسری بات میرے ذہن میں آتی ہے کیوں کہ ان کی جیسی فراست اور صلاحیتوں والا آدمی اور اتنا پڑھا لکھا..... اگر ان میں صرف خلوص ہوتا اور وہ وفادار ہوتے اور جبر اور زیادتیوں میں ملوث نہ ہوتے، اپنے عہد میں انھوں نے انتہائی غیر انسانی حرکتیں نہ کرائی ہوتیں تو انھوں نے ساری زندگی اس ملک پر حکومت کی ہوتی۔ تو پھر وہ کیوں ہٹا دیے گئے؟ کچھ تو ہوگا ہی، کوئی بات تو ہوگی ہی؟ یہ بات تھی انکی زیادتیاں ان کے ظلم، خود ان کے عہد میں، اور غالباً ان کے علم میں، باعزت لوگوں کی بیٹیاں اغوا کی گئیں اور ان کے ساتھ زنا کیا گیا۔ لوگوں کے ساتھ بدکاری کی گئی اور یہ صرف سیاسی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا۔ کیا یہ سب انسانی افعال تھیں؟ ہزاروں باتیں ہیں..... مجھے حیرت ہوئی سچ کہتا ہوں (جب مجھے یہ معلوم ہوا) میں ان کے پاس گیا اور میں نے کہا: "بھٹو صاحب، مہربانی کر کے انتخابات کرا دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ زبردست اکثریت سے جیتیں گے۔" میں ایک دفعہ پھر ان کے پاس گیا اور کہا کہ "وزیراعظم صاحب! یہ ایک تشویش ناک مسئلہ ہے اسے سیاسی طور پر حل کیجیے۔ اس سے پہلے کہ فوج ٹوٹ جائے۔ فوج کے ٹوٹنے کے بعد آپ اسے حل نہ کر سکیں گے۔" اور ۲۰ جون، ۱۹۷۷ء کو میں ان کے پاس پھر گیا اکیلا گیا اور میں نے ان سے کہا: "سر! چار سو موتیں ہو چکی ہیں۔ میں اس لحاظ سے ایک آتش فشاں پر کھڑا ہوں کہ اگر فوج میں رخنے پڑنے لگے تو ہم کچھ نہ کر پائیں گے۔ اگر آپ مسئلے کو حل نہیں کر سکتے ہیں تو پھر مجھے فوجی فیصلہ لینا ہوگا..." بھٹو صاحب کا ردعمل تھا "برائے مہربانی مجھے کچھ اور وقت دیجیے براہ کرم کوئی کارروائی جلدی میں نہ کیجیے۔" میں نے کہا "میں آپ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے رہنا ہے تو میں عوام کو اب اور دھوکہ نہیں دے سکتا آپ کو اس مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنا ہے نہیں تو پھر میں فیصلہ لینے پر مجبور ہوں گا۔" میں نے جنرل ضیا سے کہا کہ وہ شاید دنیا میں واحد ایسے شخص ہوں گے جس نے حکومت پر قبضہ کرنے کا پہلے سے نوٹس دیا ہو اس کے جواب

میں جنرل ضیا نے کہا "پندرہ دن" اور یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے اور یقیناً یہ صرف میں تھا اور وہ تھے۔ صرف میں اور ان کی گفتگو تھی مگر یہی حقیقت تھی۔

ان پندرہ دنوں میں کیا کچھ ہوا اور وہ کون سے رخنے تھے جن کا ذکر جنرل ضیا نے کیا تھا؟ جنرل ضیا یقیناً اس بحث کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو اس وقت فوجیوں میں چل رہی تھی اور موضوع تھا کہ حکومت کا تختہ پلٹا جائے یا نہیں اور اگر پلٹا جائے تو اس کی تاریخ کیا ہوگی؟ آخر میں بنیاد پرست جنرل کی فتح ہوئی اور بھٹو صاحب کو اپنی جان کی قیمت دینی پڑی۔ جنرل اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی جو وہ اتنے دن چلے گئے۔

جنرل ضیا دائیں ہاتھ میں بندوق اور بائیں میں جمہوریت کی بحالی کے وعدوں سے بھرا ایک تقریر لے کر سامنے آئے اور چند ہی دنوں میں، بائیں ہاتھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔ انتخابات کی اجازت دے دی جائے گی مگر صرف اس وقت جب پاکستان پیپلز پارٹی کو راستے سے بالکل ہٹا دیا جائے گا۔ جنرل ضیا نے اس سلسلے میں مصنف کو بتایا کہ "جی ہاں اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے" میں نے کہا کہ "انتخابات تو ایک ذریعہ ہیں، بذات خود کوئی مقصد نہیں" اہم تو بہر حال پاکستان میں نظام مصطفیٰ اور ایک خالص مذہبیت کا قیام تھا لیکن یہ سوچنا ایک حماقت ہوگی کہ ایک ایسے پاکستان کو جسے فوج کے جنرل چلا رہے تھے محض اسلام کے نام پر چلایا جا سکتا تھا۔ ایوب خان کے عہد کے مشرقی پاکستان نے جمہوریت کی بازیافت کو اپنی سب سی مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ ادارے کی غلطی کی بنا پر تھی، مگر جنرل یحییٰ خان کی اپنے ملک کے لیے واحد دین یہ تھی کہ انھوں نے جہاں تک پاکستانیوں کے حافظے اور تجربے کی بات ہے واحد حقیقی انتخابات کرا دیے۔ ۱۹۷۰ء کے ان انتخابات نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ۱۹۴۷ کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔

۵

کیا موسم سازگار ہو رہا ہے

اگر ڈکٹیٹر شپ میں، عوامی جذبات کو سمجھنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے تو وہ بہت دن ڈکٹیٹر شپ نہیں رہ سکتی۔ دوسرا راستہ اس کے سامنے صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جبر و ظلم کے ذریعہ جب تک ہو سکے حالات پر قابو رکھے۔ ۱۹۸۳ کے آخری چوتھائی زمانے میں جنرل ضیا نے یہی کیا۔

انھوں نے جب پہلی بار حکومت سنبھالی، انھیں لوگ ایک وقتی اہمیت کا حامل، اتفاقی طور پر اقتدار حاصل کرنے والا اور ایک ایسا شخص سمجھ کر مسترد کر دیتے تھے جو ۱۹۷۰ کے انتخابات سے پیدا ہونے والے جذبات و نظریات کی روشنی کے سامنے بہت دن تک نہیں ٹک سکے گا۔ مگر وہ چل گئے اور اس وجہ سے کہ وہ پاکستان کو ملنے والے پہلے حاکم تھے جو صرف یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کیوں بنا اور اسے کس نے بنایا بلکہ انھیں اس حقیقت پر کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ملک عوام کے نام پر نہیں بلکہ ایمان کے نام پر بنا ہے اور اس لیے اگر ملک کو زندہ رہنا ہے تو وہ ایمان کی منطق کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے نہ کہ عوامی خواہش اور ارادے کی منطق کی مدد سے۔ جمہوریت اور پاکستان کا قیام دو متضاد چیزیں تھیں اور اس لیے جمہوریت کو پنپنے کے لیے ذرا سی بھی ڈھیل دینا انتشار پھیلا سکتا تھا اور آخر میں اس بنیادی نظریے ہی کو چیلنج کر سکتا تھا جس نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کو جنم دیا تھا۔ جنرل ضیا نے مصنف کو بتایا تھا کہ پاکستان کے قیام سے قبل، جب اس کا مطالبہ ایک تصور تھا، یہ بات مان لی گئی تھی کہ پاکستان میں تمام مسلمانوں کو جگہ نہ دی جا سکے گی۔ اگرچہ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں گے۔ ایک بڑی اقلیت کو ہندوستان میں ہی چھوڑنا پڑے گا اور توقع یہ تھی کہ یہ لوگ ہندوستان میں اسلامی عقائد رکھنے والے سب ہندوستانی باشندوں کی طرح ہی رہیں گے۔ مشکل یہیں ہے۔ بنگال ایک مختلف حالات کی پیداوار ہے اگرچہ یہاں بھی ہندوؤں کی ایک اچھی خاصی اقلیت ہے اور جس کی وجہ سے یہ سوال یہاں اتنی وضاحت کے ساتھ طے نہیں ہوا جتنا کہ پاکستان میں۔ اگر یہ ملک اسلام کے نام پر قائم کیا گیا اور اگر کسی نے بھی یہ خیال انھوں نے غلط توجیہ بجا کہا۔ آپ ایک نظریاتی

ریاست سے نظریے کو نکال لیجیے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے ایک رکاوٹ کے بعد دوسری رکاوٹ کا سامنا کیا۔ مگر اس کی شخصیت کی شناخت ہی قائم نہیں ہوئی۔ بنیادی فلسفہ دھندلا گیا تھا اور عوام تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے۔ یہ چاہے ۱۹۵۶ کا آئین ہو یا ۱۹۶۲ کا دستور، مارشل لا ہو یا مارشل لا نہ ہو، پیپلز پارٹی ہو، سوشلسٹ نظام اور پھر مارشل لا اسی سبب سے ہماری قسمت خراب رہی۔ آپ کے سامنے آپ کی منزل واضح تھی آپ اس کے لیے چل کھڑے ہوئے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان اچھی طرح مستحکم ہے اور ہم تاریکیوں میں کھوئے ہوئے ہیں

یہ بڑا خوبصورت تجزیہ ہے غلطی صرف ایک مرکزی حقیقت کے سلسلے میں ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام محض یہ چاہتے ہیں نہ کہ ایک نظریاتی ریاست جو ان کی زندگیوں کی توجیہ و تعریف، ملاؤں اور ان کی نئی حلیف فوج کے خیال کے مطابق کرے گی۔ عوام یہ نہیں مانتے کہ ایک اچھا مسلمان ہونے کے لیے آپ کو ملاؤں کے بنجر ذہنوں کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ عوام یہ بھی نہیں سمجھتے کہ 'ہندو' انڈیا سے مسلسل نبرد آزمائی ان کے وجود کے لیے کوئی شرط ہے اس کے برعکس انھیں اپنے پڑوسی کے وسیع و عریض علاقوں میں جمہوریت اور آزادی کی تازہ ہوا پر رشک آتا ہے اور وہ بھی اپنے یہاں ایسی ہی خوشگوار فضا چاہتے ہیں جو انھیں بھی آزادی کی مسرتوں سے ہم کنار کر دے۔ چنانچہ بااثر طبقہ اور عوام کی باہمی کشمکش متعدد اور بسا اوقات مسلح شکلیں اختیار کرے گی۔ ایک طرف اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بااثر طبقہ ان پالیسیوں کی طرف بڑھے گا جو وقتی طور پر ملک کے اندر عدم توازن پیدا کریں گی اور داخلی نوآبادیاتی رجحان ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے بالآخر ملک کی شکست و ریخت ہو جائے گی۔ اسرائیل ایک دوسرا اہم مذہبی ملک ہے مگر وہاں انتخابات کرائے جا سکتے ہیں اس لیے کہ وہاں کی اکثریت کی عقاید سے وابستگی صدیوں کے ان مصائب کا نتیجہ ہے جو یہودی جرمنی کے ہاتھوں کیے گئے قتل عام پر ختم ہوئے تھے۔ ایسی کسی زبردست یا ایسے کسی محرک کا وجود پاکستان میں نہیں ہے۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں جو کچھ ہوا سب سے بڑا ہے۔ اسلام نے بہت سے مد و جزر دیکھے مگر اسے ناپید ہونے کا خطرہ کبھی لاحق نہیں ہوا۔ نہ تو تقسیم سے پہلے اور نہ تقسیم کے بعد۔ ذاتی عقاید سے وفاداری اور مذہبی ریاست سے وفاداری ایک ہی بات نہیں ہے پہلی کا وجود دوسری کے بغیر بھی ممکن ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت اس کا ثبوت ہے المیہ یہ ہے کہ "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لینے کا بڑا آسان اور موثر ہتھیار رہا ہے۔

عوام کے حقیقی تعاون کو حاصل کرنے میں ناکام رہنے کی وجہ سے موجودہ فوج اور ملاؤں نے وہی حکمت عملی اپنائی جو ایسے حالات کی فوج اور نوکر شاہی راج نے اپنائی تھی اور ناکام رہا تھا یعنی پنجاب کو ایک مستحکم قلعہ بنا دو جس کی ایک خودمختار فوج ہو اور جہاں سے آپ سارے ملک پر حکومت کر سکتے ہوں۔ پاکستان، ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا ملک نہیں بنا بلکہ وہ

سلمانوں کی پہلی سلطنت بن گیا۔ یہ بات ۱۹۸۳ کی بغاوت کے زمانے میں جس وضاحت سے سامنے آئی اس سے زیادہ
ھی نہیں آئی تھی۔

۱۹۸۳ میں یوم پاکستان کے موقع پر، تحریک برائے بحالی جمہوریت (ایم۔ آر۔ ڈی) نے فوجیوں کو ان انتخابات
ے پر مجبور کرنے کے لیے، جس کا وعدہ وہ اس وقت سے کر رہے تھے جب سے وہ برسر اقتدار آئے تھے ایک ادر
مہم کا آغاز کیا۔ یہ تحریک ہڑتالوں اور چھوٹے دھماکوں کے چھ سے زیادہ برسوں کو ختم کرنے کی ایک دلیرانہ کوشش
ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۴ اگست کو ایک سرکاری دفتر پر دو بم پھینکے گئے، جس میں ایک آدمی شدید
زخمی ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے اندر سارا سندھ آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ نواحی علاقوں کے دیہاتی لوگوں نے فوجی اقتدار
اس علامت سے جو انہیں نظر آئی نبرد آزمائی اور بسا اوقات تشدد کے ساتھ نبرد آزمائی شروع کر دی۔ پولیس والوں کو
ر دیا گیا۔ فوجوں پر حملے کیے گئے۔ نفرت کے ایک علامتی اظہار کے طور پر کتوں کے جسموں پر ضیا کا نام لکھ کر چھوڑ دیا گیا۔
ی صورت کا یہ ایک بے ساختہ اور ولولہ انگیز اظہار تھا مگر آخر میں یہ ناکام ہو گیا کیوں کہ یہ صرف سندھ تک محدود رہا۔ پنجاب
ریک میں کوئی خاص حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کرسچین سائنس مانیٹر کی دہلی میں مقیم نامہ نگار میری این ویور نے سندھ
ست حال سے متعلق اپنی رپورٹوں میں ایم آر ڈی کے جنرل سکریٹری اقبال حیدر کے قول کو لکھا ہے "مستقبل کو سامنے
، تو اگر پنجاب ساتھ نہیں آتا ہے تو یہ بات پاکستان کے مستقبل کے لیے اور بھی نقصان دہ ہوگی ... صوبوں کی تھوڑی
خود مختاری پر مبنی جمہوریت ہی اس ملک کو متحد رکھ سکتی ہے۔" یہاں پر خود مختار جمہوریت پر توجہ دینے کی ضرورت
یہ خیال تھا جو کانگریس نے مسلم لیگ کے پاکستان کے مقابلے میں پیش کیا تھا۔

پنجاب کے اس رویے نے عظیم اور معمر بزرگ جی ایم سید کو جو ایک الگ سندھو دیش کا مطالبہ کرنے کی پاداش
پچھلے بیس سال سے اپنے گاؤں سان میں گھر میں قید ہیں، مایوس کرنے کے بعد خوش کر دیا کیوں کہ اس بات نے ان کے
ال کی تصدیق کر دی کہ لیا پوری سے وجود میں لائے ہوئے پاکستان کے لیے اگر یہی نظام قائم رہا تو بکھرنے کے
کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔ اسّی سالہ بزرگ نے جنہوں نے دنیا دیکھی ہے، میری این ویور کو بتایا کہ "اب مصالحت
کی گنجائش نہیں ہے ... سندھ کو ایک خود مختار ریاست بن جانا چاہیے۔" انھوں نے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے
ہ بتایا کہ وہ کیوں سمجھتے ہیں کہ سندھ کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ "مسلح افواج کا صرف دو فی صد حصہ سندھی ہے۔
ستبری ملازمتوں میں صرف پانچ فی صدی سندھی ہیں اس وقت صوبے میں تقریباً دو ہزار صنعتی یونٹ چل رہے ہیں
ں صرف پانچ سو سندھیوں کے ہاتھ میں ہیں۔"

جنرل ضیا نے دو حربے جو بہت آسانی سے دستیاب تھے استعمال کیے۔ ایک جبر و تشدد کا اور دوسرا اس خوف کا کہ ہندو، انڈیا ایک سامراجی اسلامی پاکستان کو تباہ کر رہا ہے۔ مسز اندرا گاندھی کا ایک بڑا نرم سا بیان جو انھوں نے، پر بشمول پاکستان، اصولی طور پر جمہوریت کی حمایت میں دیا تھا سے اس بات کا ثبوت بنا دیا گیا کہ وہ سندھ میں: چاہتی ہیں جو انھوں نے بنگلہ دیش میں کیا اور وہی اس سب کے پیچھے تھیں۔ مگر یہ ایک بڑی فرسودہ دلیل تھی۔ سندھیوں، اسے یا تو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا یا پھر اس خیال کو خوش آمدید کہا۔ میری ایک ڈرائیور نے اس بیان کے بارے میں جی ایم سید ردعمل سے متعلق لکھا تھا" انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ سندھ کو ہندوستان کا حصہ بننے کو ترجیح دیں گے۔" انھوں نے اس بات پر اپنی مسرت کا برملا اظہار کیا کہ مسز اندرا گاندھی نے موجودہ احتجاج کی صاف صاف حمایت کی ہے اور یہ کہ پاک کے عوام اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ شاید اسے شدت پسند سندھی ردعمل قرار دیا جائے مگر پاکستان پارٹی کے لیڈر غلام مصطفیٰ کھر نے اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ کوئی محب وطن پاکستانی کسی دوسرے ملک کی مداخلت برداشت نہیں کرے گا ..... مگر درحقیقت ان کے 'مسز گاندھی کے بیان کو' اپنے جمہوری حقوق کے لیے لڑنے والے پاکستانی عوام نے خوش آمدید کہا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے عوام کے درمیان ایک نیا اور ہم آہنگ رشتہ استوار ہوگا۔ انشاء اللہ۔ •

بھٹو نے عوام کی حمایت، اپنے وطن سندھ میں حاصل کر لی تھی اور پنجاب میں بھی۔ لیکن ان کی بیٹی بے نظیر اس وقت اپنے باپ سے زیادہ تلخ نظر آئیں جب انھیں ۱۹۸۴ میں پاکستان سے نکالے جانے کے بعد دنیا سے بات کرنے کا موقع د طارق علی سے جو اس وقت کلکتے کے روزنامہ ٹیلی گراف کے لیے لکھ رہے تھے گفتگو کرتے ہوئے (۱۵ جنوری ۱۹۸۴) انھوں نے کہا "ہمارے عوام کی خصوصاً سندھ میں حالت بڑی ابتر ہے۔ میری حالت تو ان مردوں اور عورتوں کے مقا: میں کچھ بھی خراب نہیں ہے جنھوں نے اس ڈکٹیٹر شپ میں بھگتا ہے۔ .. میں اپنی آزادی پر خوش ہوں مگر اس بات پر غمگین کہ میں اپنے ملک میں آزاد نہیں ہو سکی۔"

انڈیا ٹوڈے (فروری ۱۹۸۴) کے نامہ نگار رمیش چندر سے اپنی ایک طویل ملاقات میں بے نظیر نے کہا: سند میں فوج کی زیادتیوں کے الزامات بڑے پیمانے پر عام ہیں۔ میں چونکہ حراست میں تھی اس لیے ان ذرائع تک میری پہنچ نہ ہو سکی، مگر پھر بھی، بڑی عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں۔ فصلوں کے جلانے کی، گنے کے کھیتوں میں لاشوں کے ملنے کی، مردوں، عورتوں اور بچوں کو مشین گنوں سے بھون ڈالنے کی۔ ہمارے ایک آدمی نے جو بنگلہ دیش میں کام کر چکا تھا مجھے بتایا کہ صورت حال بنگلہ دیش سے بھی زیادہ خراب تھی۔ زبردست فوجی طاقت استعمال کی گئی ہے۔ ...

و ح کو عوام کے غصے کی شدت کا احساس نہیں ہے۔ سارا دیہی سندھ انقلابی بن چکا ہے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ کیا ضیا صاحب کا ملک کو اسلامی بنانے کا عزم پورا ہو رہا ہے؟ بے نظیر نے جواب دیا۔ یہاں کا اسلامی بنانا؟ اگر کوئی کہتا ہے کہ موسم سرد ہے تو آپ اس کے الفاظ پر نہیں جاتے۔ کیا لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے ہیں؟ کیا درختوں نے اپنی پتیاں گرا دی ہیں؟ کیا موسم سرد ہو رہا ہے؟"

۱۹۴۷ میں جناح صاحب نے اپنا کرم خوردہ پاکستان حاصل کیا۔ ۱۹۷۱ میں مجیب نے اس میں سے نصف لے لیا۔ جو کچھ بچا وہ ایک کانپتا کپکپاتا ہوا ملک، اور ایسا لگتا ہے کہ ایک اور زلزلے کے ابتدائی جھٹکے محسوس ہو رہے ہیں۔

مگر ساری روایتی ذہانت کے مطابق، یہ ہندوستان تھا پاکستان نہیں جس کے مقدر میں اپنی آزادی کی جوتھی دہائی میں بکھر جانا لکھا تھا۔ درحقیقت، ۱۹۴۷ میں، مدراس میں، ایک باقاعدہ، طاقتور اور بڑھتی ہوئی علیحدگی پسند سیاسی پارٹی موجود تھی جس نے منبر پہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ وہ خود مختاری چاہتی ہے۔ مگر ہوا کیا؟ ۱۹۸۵ تک ہندوستان متحد رہا۔

(۶)

گاندھی جی کی آتما کا مسکن

آزادی کے دن (۱۹۴۷) پاکستان، ایک نئی سرمستی اور سرخوشی کی کیفیت میں تھا۔ ناقابل بیان دکھوں اور مصائب کے مارے قافلے برصغیر میں خون آشام راہوں پر اب بھی محو سفر تھے لیکن کم از کم مسلمانوں کے لیے اطمینان و سکون کا ایک پہلو تھا کہ وہ بہ حال ایک ایسی سرزمین کی طرف جا رہے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اور ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں جو اس خوف و دہشت سے پاک ہو چکا ہے جس کا وہ پچھلے چند مہینے میں شکار رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی طرف آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو نفرت و تعصب سے ایسے نفسیاتی سکون کو حاصل کرنے کا موقع نہیں تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی کا اصرار تھا کہ ان سب کو ان لوگوں کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ رہنا سیکھنا چاہیے جنھوں نے مذہب کے نام پر ان کے پیاروں کو مارا تھا اور عورتوں کو بے عزت کیا تھا۔ گاندھی کے پیروؤں نے، راجندر پرشاد، جواہر لال نہرو ولبھ بھائی پٹیل اور ابوالکلام آزاد نے اپنے اپنے ذاتی تعصبات سے قطع نظر گاندھی کے اس پیغام کو اپنے سینوں سے لگایا کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ایک دستاویز آئین ہند میں جسے ملک کے دل کی دھڑکن بننا تھا محفوظ کر دیا۔ ہندوستان ایک ہندو ریاست نہیں ہوگا

ہندوستان کی سڑکوں پر خوشی اور مسرت کا رقص ہو رہا تھا جب جواہر لال نہرو نے پہلے کبھی کی لکھی ہوئی چند سطور کی مدد یادداشت کے سہارے پر مگر حقیقتاً ایک طویل خواب سے جاگتے ہوئے ایک بڑا انوکھا سا وعدہ کیا تھا۔ "ایک مدت ہوئی جب ہم نے اپنے مقدر سے ایک عہد کیا تھا اور آج وہ وقت آ گیا کہ ہم اپنے عہد کا اعادہ کریں اور صرف اعادہ ہی نہیں ایک عزم کے ساتھ اعادہ ٹھیک آدھی رات کو جب ساری دنیا سو رہی ہے ہندوستان آنکھ کھولے گا زندگی اور آزادی کی فضا میں۔ ایک لمحہ آتا ہے، اور تاریخ میں شاذ و نادر ہی آتا ہے جب ہم قدیم سے جدید میں قدم رکھتے ہیں، جب ایک عہد ختم ہوتا ہے، اور مدتوں سے دبی گھٹی قوم کی روح کو قوت گویائی ملتی ہے۔ ہمیں آزاد

ہندوستان کا ایک ایسا پرشکوہ ایوان تعمیر کرنا ہے جس میں اس کے تمام سپوت رہ سکیں گے۔"

یوم آزادی کے اس موقع پر اپنے غموں کو چھپانا انتہائی مشکل تھا جیسا کہ مسرت اور خوشی کو کیوں کہ یہ آزادی وہ آزادی نہیں تھی جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔ یہ آزادی تھی جو تقسیم اور نفرت کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور تاریخ کی سب سے زیادہ بھیانک سول وار کے ہیجان کے درمیان بربریت کی ایک ایسی جنگ میں الجھی ہوئی تھی جس کی آگ فرقہ پرستوں نے لگائی تھی اور جسے ختم ہوتے ہوتے پانچ لاکھ افراد کی جانیں لینا تھیں وہ آگ آج بھی جلتی ہے اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنا سارا وقت اسی راکھ کو کرید کرید کر بھڑکانے میں لگے رہتے ہیں۔

اس آزادی کے پیچھے جو المیہ ہے اس کی علامت گاندھی سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو گاندھی جی اس وقت کی مسرت اور شادمانی میں شریک نہیں ہوئے کیوں کہ ان کے پاس جشن منانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اس وقت کلکتے میں حیدری ہاؤس ۱۵۱ بیلیا گھاٹ میں تھے اور اپنی زندگی کا آخری معجزہ دکھا رہے تھے جس وقت نہرو نے نصف شب ہوتے ہی آزادی کا اعلان کیا تھا، مہاتما گاندھی ایک مسلمان کے لٹے ہوئے گھر کے ایک کمرے میں چٹائی پر لیٹے سو رہے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے چند پیرو بھی ساتھ تھے، ان کے پاس ہی مقدس گیتا کا ایک نسخہ، ان کی لوہے کی فریم کی عینک اور مصنوعی دانت رکھے ہوئے تھے۔ پچھلی شام انھوں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا تھا "کیا میں نے ملک کو بھٹکا دیا ہے؟" اس رات وہ خلاف معمول دو بجے یعنی ایک گھنٹہ پہلے ہی بیدار ہو گئے اور حسب معمول اپنے دن کا آغاز عبادت اور مقدس گیتا کے پاٹھ سے کیا۔ یہ دن قوم کے باپ کے لیے غم کا دن تھا۔

وہ دہلی کی طرح چہل پہل میں شرکت کرنے کی بجائے کلکتے میں بیٹھے ہوئے تھے کیوں کہ انھوں نے خود اپنے آپ سے ایک عہد کر رکھا تھا کہ وہ کلکتہ جیسے ہنگامہ خیز شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تباہی و بربادی نہ ہونے دیں گے اگر کلکتہ اس دن عرصہ کارزار بن گیا ہوتا تو تباہی اور بربریت نے پنجاب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہوتا۔ گاندھی جی نے کلکتے کو پرامن رکھا۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہا کہ اگر انھوں نے ایک دوسرے کے قتل سے ہاتھ نہ روکا تو وہ مرن برت رکھ لیں گے۔ یہ ایمان اور اعتقاد کا ایک ناقابل یقین مظاہرہ تھا کہ سارے کلکتے نے وحدت اور امن و آشتی کے اس پیغامبر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ وہی کلکتہ تھا جس نے ایک سال قبل ۱۹۴۶ میں ایک بھیانک قومی تباہی کا [illegible] کیا تھا۔ اس وقت [illegible] صاحب کہ سارا شمالی ہندوستان قتل عام [illegible] تھا۔ یہ بڑی تیزی [illegible] اس دن [illegible] لیے جس نے ترجمے [illegible] اس کی آزادی کا تحفہ دیا تھا۔ اس دن کا سب سے مقدس لمحہ [illegible] عبادت [illegible]

میٹنگ میں گڑبڑ کرنے کے واقعات بڑھتے جارہے تھے۔ یہ گڑبڑ ان ہندوؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس بات پر خفا تھے کہ گاندھی جی آیت بھی ان میٹنگوں میں قرآن کی تلاوت کراتے ہیں۔ گاندھی جی کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ افراتفری کے اس دور دورے میں ان کی بصیرت برقرار رہی۔ وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ فرقہ پرستی کی سرحدوں کو پیدل پار کرنا چاہتے تھے۔ ۳۰ جنوری کو انھیں اس کام سے روک دیا گیا۔ انھیں روکا کسی حکومت نے نہیں بلکہ ایک فرقہ پرست ہندو برہمن ناتھو رام گوڈسے کی گولیوں نے یہ کام انجام دیا، شام کے پانچ بج کر سترہ منٹ پر۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر یہ سوال تھا۔ یہ کس نے کیا؟ ہر شخص جانتا تھا کہ اگر قاتل کوئی مسلمان نکلا تو اس کا نتیجہ ملک کی تباہی و بربادی کی شکل میں سامنے آئے گا۔ آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستان کے معزز ترین شہری کی موت کی خبر ملنے پر اپنی نشریات کو روکا نہیں۔ اس کے مقررہ پروگرام بدستور چلتے رہے۔ بہر حال، پولیس نے قاتل کی شناخت کر کے حکومت کے اوپر سے دباؤ کو کم کیا۔ چھ بجے آل انڈیا ریڈیو نے بالآخر ایک پیغام نشر کیا، پیغام کا ایک ایک حرف بڑی احتیاط سے چنا گیا تھا "پانچ بج کر بیس منٹ پر نئی دہلی میں، مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ قاتل ایک ہندو تھا۔" گاندھی جی کی موت نے ملک میں فرقہ پرستی کے پاگل پن کو پس پشت ڈال دیا۔ اس وقت کے سب سے بڑے مسئلے کو ان کی قربانی نے حل کر دیا مگر دیگر مسائل تو در پیش تھے۔ تمام وہ امکانی کشمکشیں جو پاکستان میں تھیں، وہ ہندوستان میں بھی موجود تھیں۔ اور وہاں سے زیادہ گمبھیر شکل میں۔ زبان، نسل، علاقائیت، افلاس، سات کروڑ اچھوت، چار کروڑ مسلمان پناہ گزیں، قبائلی، راجے مہاراجے جو اپنے جاگیردارانہ اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ تناؤ اور بے یقینی کے پہلے دو سال دہلی میں حکومت کے لیے مشکل ترین سال تھے کئی برس گزرنے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دو ادیبوں arry اور Dominique la Pierre اور Collins کو بتایا تھا کہ ایک وقت ایسا آیا تھا جب پنڈت نہرو نے درحقیقت ان سے کہا تھا کہ وہ آزاد ہندوستان کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ یہ بات یقیناً متنازعہ فیہ ہے کیوں کہ یہ بات فرد کی یادداشت پر عمر کے اثرات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان ابتدائی دنوں میں بے بسی کا ایک عنصر ضرور موجود تھا۔ جمہوریت پر عمل درآمد کو ملتوی کرنے کے لیے کوئی بہانہ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا کیوں کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جمہوریت اور آزادی نے کن قوتوں کی بیڑیاں کاٹی ہیں۔ کیا فرقہ پرستی کے فسادات پھر شروع ہو جائیں گے؟ کیا لسانی ریاستوں کا مطالبہ انتخابات کے زمانے میں تشدد اختیار کرے گا؟ کیا ۱۹۴۶ء کی طرح علیحدگی پسندوں کو عوامی رائے عامہ کی مدد سے ایک بار پھر نیا جواز مل جائے گا۔ کیا فرقہ پرستوں کی جیت ہوگی؟ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا آسان ہے کہ پنڈت نہرو کو اس بات کا یقین تھا کہ کانگریس زبردست فتح حاصل کرے گی۔ مگر انتخابات سے

یہ بات یقینی کسی طرح بھی نہیں معلوم ہوتی تھی پنڈت نہرو کو خطرہ صرف کٹر اور علیحدگی پسند قوتوں ہی سے نہیں تھا بلکہ کانگریس
ی جدوجہد آزادی کے بہت سے باصلاحیت لیڈر، جن پر گاندھی جی کو بھی اعتماد تھا، کانگریس کو چھوڑ کر، سوشلسٹ پارٹی کرشک
، درپرجا پارٹی، پیپلز فرنٹ، ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی وغیرہ بنا چکے تھے۔ سوشلسٹ خصوصاً اپنے انقلابی نعروں، پرجوش
خطاب، اور توانا قیادت کی وجہ سے اس بات کا یقین کر چکے تھے کہ وہ آزاد ہندوستان میں ہونے والے ان پہلے انتخابات میں
یقینا کامیابی حاصل کریں گے۔ مگر پنڈت نہرو اور کانگریس پارٹی نے جمہوریت کی راہ کو روکنے اور انتخابات کو ملتوی کرنے
ہندوستان کو بچالیا۔
سے یے کوئی بہانہ استعمال نہیں کیا۔ یہ اس اعتماد کا مظاہرہ تھا جس نے ہندوستان کو بچالیا۔
۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء تک، پاکستان میں لیاقت علی خاں، اپنے بنیادی اصولوں کی تلاش و تدوین میں الجھے ہوئے
تھے۔ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی اپنا کام مکمل کر چکی تھی اور ہندوستان ایک سیکولر جمہوریہ بن چکا تھا۔ اس تاریخ کا انتخاب
اس لیے ہوا کہ ۱۹۳۰ء کی یہی تاریخ تھی جب کانگریس نے ملک کو آزاد کرنے کا اپنا پہلا عہد کیا تھا۔ نئی جمہوریۂ ہند کے
میں پہلے تین فوجی افسروں کو صدر جمہوریہ ہند نے اعزازات بخشے ان میں ایک مسلمان بریگیڈیئر عثمان بھی تھے جو کشمیر کی ۱۹۴۸
کی جنگ میں پاکستانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ انھیں فوج کا ایک اعلیٰ اعزاز "مہاویر چکر" بھی دیا گیا تھا
دوسرے افسران جنھیں اعزاز ملا تھا وہ تھے لفٹیننٹ کرنل رنجیت لال اور میجر سومناتھ شرما۔ قومی ترانہ بھی ملک کو اسی
دن ملا تھا۔ جن گن من کی پیانو پر دھن مشہور و معروف موسیقار ہربرٹ میورل نے تیار کی تھی۔
پہلے عام انتخابات جو تجربے سے لگے ہوئے دور افتادہ گاؤں اور جنگلوں کی گمنام بستیوں تک میں ہونے تھے تقریبا
چھ مہینے تک چلتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی ۲۵ تاریخ تھی جب ہماچل پردیش کے پہاڑوں میں چینی اور سیکل کے دور افتادہ
گاؤں میں ہندوستان کے ۱۷۵ ملین میں سے پہلے ووٹروں نے اپنا اپنا ووٹ ڈالا تھا۔ پنڈت نہرو نے وزیراعظم کی
حیثیت سے حلف ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو اٹھایا تھا۔
انتخابات اتنے ہی ہندوستانی تھے جتنا کہ ہندوستان، ہندوستانی ہو سکتا تھا۔ جو واقعات نیچے بیان کیے گئے
ہیں وہ اس واحد مطالعے سے لیے گئے ہیں جو ۱۹۵۲ء کے ان انتخابات کے بارے میں انڈین جنرل الیکشن ۵۲-۱۹۵۱ کے
عنوان سے تعلیم کے میدان میں کچھ کام کرنے والوں نے کیا تھا (مولفین: ایس وی کوگیکر اور ریچرڈ ایل پارک۔ پاپولر
بک ڈپو ۱۹۵۶ء) سلسلے کے آغاز کے لیے اس سے بہتر کیا ہو گا کہ اس بات کو بتایا جائے کہ ووٹ حاصل کرنے
کے لیے اڑیسہ کے کچھ کانگریسیوں نے کیسے گاؤں میں یہ خبر مشہور کر دی کہ گاندھی جی کی آتما نے دونوں
... [illegible] ... کو ووٹ ڈالے ... بعض دفعہ

نے اس بات کو اتنی سنجیدگی سے قبول کیا کہ وہ ان کی پارٹی کانگریس کو ووٹ دینے سے پہلے دونوں کی پیشیوں کے سامنے عقیدت کے جذبے سے سرشار لیٹ لیٹ گئے۔

ان اولین انتخابات میں "ہندو ردعمل" "Back lash" کا نظریہ پھیلایا گیا۔ اس نظریے کے مطابق ہندو بخصوصاً تقسیم کے بعد ہوئے فسادات کے بعد صرف ان امیدواروں کو ووٹ دیں گے جو خاص طور پر ہندو دھرم کی نمائندگی کریں گے۔ ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں نئی نئی قائم ہونے والی پارٹی جن سنگھ دونوں نے اسی پر الیکشن لڑا۔ دونوں نے ایسی بھرپور شکست کا منہ دیکھا کہ پھر کبھی جانبر نہ ہو سکیں۔ مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر این بی کھرے، اپنے وطن ناگ پور سے پارلیمانی امیدوار تھے۔ ناگ پور ہی مہاتما گاندھی کے قتل کی ترغیب دینے والی راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کا گڑھ تھا۔ انتخابات میں ڈاکٹر کھرے کی ضمانت ضبط ہوئی لیکن کٹر ہندو دراصل جو چاہتے تھے وہ تھا پنڈت نہرو کا ان کے حلقۂ انتخاب پھول پور میں ہارنا۔ نہرو کے واحد مخالف ایک سادھو پربھودت برہمچاری تھے جنہوں نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مسئلہ جس پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز کی تھی وہ تھا ہندو کوڈ بل جس نے ہندوؤں کے سماجی قوانین کو نسبتاً لبرل بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نہرو کو ایسے مخالف کے خلاف مہم چلانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اگرچہ ایک وقت ایسا ضرور تھا جب ان کی پارٹی کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں پھول پور سے مخالف نتیجہ نہ نکل آئے۔ کانگریس پارٹی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ خاموش سادھو کو نہرو کے دو لاکھ ۲۳ ہزار ۱۷۵ ووٹوں کے مقابلے میں صرف چھپن ہزار سات سو آٹھ ووٹ ملے تھے۔ ہارنے کے بعد پربھودت برہمچاری نے نہرو کے نام اپنے ایک پیغام میں ان کی کامیابی پر مبارک باد دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ خود جیت بھی جاتے تو وہ نہرو کے لیے اپنی سیٹ خالی کر دیتے۔

کمیونسٹوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کسی ہندوستانی کا ووٹ محض … کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مثال میں کانگریس اپنے انتخابی نشان، بیلوں کی جوڑی کا جو کسانوں کی نمائندگی کرتی تھی خوب استعمال کر رہے تھے اس کے جواب میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا کہنا تھا کہ اس کا انتخابی نشان گیہوں کی بالی خوش حالی کی دیوی لکشمی کا پرتو ہے۔

دہلی کے ایک جیوتشی نے ایک پیشین گوئی کر کے اپنے قبیلے کی عزت میں کچھ اضافہ نہیں کیا۔ انہوں نے ایک پورے انتخابی حلقے میں اصولوں سے ایک پوسٹر لگایا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہر نشست پر کانگریس کو کامیابی حاصل ہوگی۔ ایک ایسے الیکشن میں جس میں کانگریس نے ملک کے زیادہ تر حصوں میں اور خود دہلی میں بھی زبردست کامیابیاں حاصل کی تھیں یہ ایک سیٹ تھی جو اس نے سوشلسٹوں کے مقابلے میں کھو دی تھی۔ … یہ وہ سیٹ تھی جس پر اس وقت کے … دہلی کے سیتارام بازار کے

حلقۂ انتخاب میں جہاں اتنا ہیجان، بازار آرائیں ایسا اور فرقہ پرست ہندوؤں کا گڑھ تھا کانگریس نے اپنے عقائد کے استحکام اور مضبوطی کے ایک اظہار کے طور پر ہندو اکثریت والے اس حلقۂ انتخاب سے ایک مسلمان امیدوار کھڑا کیا۔ کانگریسی مسلمان نے اپنے مدِ مقابل کو تین ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی۔ عام طور پر مسلمانوں نے بہت بڑی تعداد میں کانگریس کو ووٹ دیا۔ اتر پردیش میں ۴۲ مسلمان ممبران اسمبلی میں سے ۳۶ نے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ بچا ہوا ایک ممبر آزاد امیدوار تھا۔

سوشلسٹوں نے ذرا کچھ زیادہ نفاست کا مظاہرہ کیا۔ اس کے تحقیقی شعبے نے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا اور لیبر اور کنزرویٹو دونوں پارٹیوں سے اپنے پوسٹر ڈیزائن کرنے میں مدد مانگی۔ مگر برطانیہ سے اس نوعیت کی امداد کچھ بہت مفید ثابت ہوئی دیہاتی کی کارگزاری توقع سے بہت کم رہی۔ ایک پوسٹر کا برطانوی ڈیزائن شاید پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کچھ بہت کامیاب نہیں رہا "جھجک کیسی؟ بڑھیے۔ چلیے ہم کانگریس کو ووٹ دیں جس نے شراب ممنوع کر دی۔" یہاں کے ووٹروں نے ثابت کیا کہ وہ سیاست دانوں کے حیلوں اور ان کی چالوں کو سمجھنے میں کہیں آگے ہے۔ "انڈین جنرل الیکشن ۵۲ - ۱۹۵۱" میں بودھ راج شرما نے لکھا ہے "ضلع ہوشیارپور کے ایک ووٹر نے یہ واقعہ بیان کیا۔ ایک امیدوار نے ووٹ دینے کے لیے مجھے تین روپیے دیئے اور دوسرے نے مجھے دو روپیوں کی پیش کش کی۔ میں نے دونوں کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ تم نے ووٹ کس شخص کو دیا تو اس نے بتایا کہ موخرالذکر کو۔ اس فیصلے کی اس نے وجہ یہ بتائی کہ دو روپے والے نے چونکہ کم رقم دی تھی اسلیے اسکے بارے میں یہ خیال ہوا کہ وہ کم بے ایمان ہوگا اور اسمبلی کا نسبتاً بہتر رکن ثابت ہوگا۔

ہر خاندان کے ایک فرد، ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ بغاوت پر آمادہ نظر آتا ہے۔ یہ ۱۹۵۲ تھا جب ہندو کی مہا کرشنا ستی سنگھ نے کہا تھا کہ یہ کانگریس ہے جو ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ سوشلسٹوں نے اس بات کو فوراً اپنے انتخابی پوسٹروں میں استعمال کر لیا۔ سوشلسٹوں کا خاص نعرہ تھا "کام دو، مکان دو، ورنہ گدی چھوڑ دو۔" مگر یہ نعرہ کانگریس کے نعرے کے سامنے کہ "استحکام، سیکولر اور ترقی پسند ملک کے لیے کانگریس کو ووٹ دیجئے۔" انتخابات میں شکست کھانے کے بعد سوشلسٹوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ الیکشن میں بے ایمانی کی گئی ہے۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کہا کہ "اتر پردیش میں الیکشن کے نتائج کو مسخ کرنے کے لیے لکھنؤ میں بیٹھ کر ایک سازش کی گئی تھی" اس الزام کو بہرحال کسی نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ سوشلسٹوں کو ایک جائز شکست ہوئی تھی۔ کچھ شکایتیں ضرور ہوئیں، جیسے سادھیر جہاں ۱۹۴۲ پولنگ بوتھوں میں سے ۹۰ میں دوبارہ ووٹ ڈالے گئے مگر عوام کو اس بات کا یقین تھا کہ انتخابات حتی الامکان ایمانداری سے ہوئے تھے جتنی ایمانداری کا امکان تھا۔ ہندوستانی جمہوریت کا آغاز اطمینان سے ہوا تھا۔ ۱۳ مئی کو جواہر لال نہرو نے آزاد ہندوستان کے پہلے منتخب وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اب آزادی، استحکام اور ترقی کے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا کام سامنے آئے گا

۷

طائرِ قفس کا عروج

پاکستان کے بنگالی صرف ذات اور برابری کے خواہاں تھے، اس کے بدلے انہیں ملا ایک ملک۔ جنوبی ہندوستان کی ریاست مدراس کے تاملوں کا مطالبہ تھا ایک ملک کا۔ وہ ذات اور جمہوریت پاکر مطمئن ہو گئے۔ یہ موازنہ جمہوریت کی جوڑنے اور متحد کرنے کی خوبی کے برعکس ڈکٹیٹرشپ کی تخریبی صلاحیتوں کی بڑی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کا لسانی مسئلہ درحقیقت پاکستان کی بنگالی دشواری سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ سب سے پہلے تو یہی کہ ہندوستان میں صوبائی وکالت کرانا پورے طور پر آئینی تھا۔ ۱۹۶۳ء تک ہندوستانی آئین نے ہر سیاسی جماعت کو علیحدگی کی تبلیغ کا حق دے رکھا تھا۔

اس صورت حال سے وابستہ علاقائیت اور لسانی مطالبات تھے۔ ہندی، ملک کے سب سے بڑے حصے کی زبان ہونے کی وجہ سے آئین میں قومی زبان قرار دی گئی مگر کوئی صورت نہیں تھی کہ جنوبی ریاستیں اور بنگال ہندی کے لیے راک اور عملاً استعمال و قبول کر لیں۔ زبان کا مسئلہ دنیا بھر میں ہمیشہ ایک دھماکہ خیز مسئلہ رہا ہے۔ ہندوستان بھی اس مسئلے پر اکثر اور حقیقی اسباب کی بنا پر شور کر چکا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً نو سو بولیاں ہیں۔ کشمیری، راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، تامل، تیلگو، بنگالی، آسامی اور اردو، اور ان سب زبانوں کو بولنے والے اتنے ہیں کہ وہ ایک اوسط یورپین ملک سے کچھ بڑے ہی ملک کو آباد کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے ہندی اپنے لیے ایک برتری کی دعوے دار ہو سکتی ہے۔

ابھی آزادی ملی ہی تھی کہ یہ مطالبہ ہونے لگا کہ ملک کا موجودہ ڈھانچہ جو برطانیہ کی سیاسی اور انتظامی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تھا اسے لسانی اصولوں پر صوبوں کی از سر نو تشکیل کی خاطر پھر سے بنایا جانا چاہیے۔ اپنی مصاحبت سے پُر مدبروں کے تحت یہ کمیٹی دیر تک ہندو اور وزیر اعظم نہرو اور پٹیل یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نظریہ کس سمت رہنمائی کر سکتا ہے۔

وہ لوگ بھی خوف زدہ تھے اور انھوں نے ایک مضبوط مرکز اور انتظامی اصولوں کی بنیاد پر تقسیم کے خیال کو فروغ دینے کی اپنے بس بھر کوشش کی مگر لوگ احتجاج میں سڑکوں پر نکل آئے اور جب انھوں نے اپنی بات کہی تو ان کی آواز دبائی نہیں گئی۔ انھیں غدار یا جاسوس کے لقب نہیں دیے گئے۔ اس کے بجائے انھیں اپنی پسند کے مطابق ملک کی تشکیل و تعمیر کی اجازت دی گئی۔ یہی طریقہ کار تھا جس کی وجہ سے ہندوستان بچ گیا۔

تامل علیحدگی پسندی کی تحریک ایک بڑے قابل ذکر شخص کی زندگی سے منسلک ہے جس نے ایک الگ ملک کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ایک امیر زمیندار کے اس لڑکے نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا جو ابھرتے ہوئے طبقہ امرا کا روایتی ٹھکانا تھا۔ ای وی راما سوامی نائیکر (جنھیں E.V.R. کے نام سے جانا جاتا تھا) کا عہد اپنے عملی آغاز کے باوجود ــــــــــ عظیم شخصیتوں کے ہجوم کا ایک دلفریب ثابت ہوا۔ ای۔ وی۔ آر نے بالکل روایتی انداز میں کانگریس کی شرکت سے آغاز کیا اور اپنی سماجی حیثیت کے بل بوتے پر جلد ہی مدراس کانگریس کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہ ابھی کانگریس ہی میں تھے جب ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر سی نٹیسن مدلیار نے، دراوڑین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کا مقصد دراوڑ لوگوں کی حالت کو (شمال میں آ... کی حالت کے مقابلے میں) بہتر کرنے میں امداد دینا تھا۔ اس تحریک کی خاص مخالف برہمنوں کی ذات تھی، جو ذات پات کے نظام کی وجہ سے جنوبی ہندوستان کی ایک اقلیتی مگر صاحب اختیار و اقتدار جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مثال کے طور اس صدی کی دوسری دہائی تک ٹراونکور کی راج دھانی میں، کوئی اچھوت سڑکوں پر چل نہیں سکتا تھا اس سے بھی زیادہ یہی ذات سے اونچے فرد کے سامنے اسے آنکھ بھی اٹھانے کی اجازت نہیں تھی دراوڑ ایسوسی ایشن نے ساؤتھ انڈین فیڈریشن کا نام اختیار کیا اور "جسٹس" نام کا ایک روزنامہ نکالنا شروع کیا۔ اخبار نے اپنا یہ نام ایک سیاسی پارٹی کو دیا جسٹس پارٹی کہلائی۔ اسی دوران ای وی آر ساتھ ہی ساتھ ایک لڑائی کانگریس کو برہمنوں کے شکنجے سے آزاد کرانے لیے لڑ رہے تھے ان کی اس جد و جہد نے ان کو ایک ممتاز برہمن، زبردست کانگریسی شری راج گوپال اچاریہ کے رو... کیا۔ بالآخر ای۔ وی۔ آر نے جسٹس پارٹی میں باقاعدہ شرکت کرلی۔

ای وی آر ذات پات کے ظالمانہ نظام کے کٹر مخالف تھے۔ ان کا فلسفہ سیدھا سادا اور عملی تھا۔ وہ اسے کو جو ذات پات کی تفریق کی اجازت دیتا ہے ملیریا کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انھیں دوا کی تلا دلچسپی نہیں ہے وہ تو ان مچھروں کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جو بیماری پھیلاتے ہیں۔ ذات پات کی بنیاد ان پرانو بقول ان کے معتقدین کے، کلام الٰہی تھا اسی لیے وہ ایک دہریے بن گئے۔ برہمن ان دیوتاؤں کے ایجنٹ

لیے ان کی لڑائی ان ہی ایجنٹوں سے تھی۔ چورانوے سال کی عمر میں، اپنی موت کے وقت تک انھیں نہ تو اپنی دہریت پر کوئی افسوس تھا اور نہ مذہبی برہمنوں کے خلاف اپنی لڑائی پر کوئی تاسف۔

دوسری دہائی میں انھوں نے ٹراونکور کی سلطنت میں، اچھوتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ویکم کا احتجاج شروع کیا۔ مہاراجا، ای وی آر کے ذاتی دوست تھے اور کبھی کبھی ایروڈ میں جہاں ای۔وی۔آر رہا کرتے تھے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے مگر ان باتوں سے مہاراجہ کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ای وی آر کو قید کر دیا گیا مگر احتجاج کامیاب ہوا اور اچھوتوں کی زندگی کو کچھ قابل برداشت بنانے کے لیے ایک خصوصی قانون وضع ہوا۔ اس کامیابی کے بعد ای وی آر کو ویکم سیاتی کا ہیرو کہا گیا۔ اس احتجاج سے متعلق ایک نسبتاً زیادہ دلچسپ کہانی یہ ہے کہ برہمنوں نے اپنے اقتدار کے اس خطرے کو محسوس کر کے اور اس سے گھبرا کے دیوتاؤں کو خوش کرنے اور نحوست کو ٹالنے کے لیے ایک زبردست یگیہ (مقامی زبان میں واہ تردساگر ایگیم) کا اہتمام کیا اور اس میں دیوتاؤں سے اس دہریئے "ناستک" احتجاجی کو مار ڈالنے کی درخواست کی مگر ظاہر ہے کہ پرارتھناؤں میں کچھ گڑبڑ ہوئی کیونکہ ناستک ای وی آر تو زندہ رہا مگر مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۲۵ میں ای وی آر نے ایک تحریک "تحریک خودداری" کے نام سے چلائی آج بھی ۵۰ ایگمور روڈ مدراس میں ایک ادارہ "پیریار خودداری پروپگنڈہ انسٹی ٹیوشن" کے نام سے قائم ہے جو ای وی آر کی تحریروں کی اشاعت کرتا ہے۔ ان کی تحریر کی ایک مثال پیش ہے۔ "آریا جو اپنی گزر بسر کرنے کی کوشش میں ہندوستان آئے، انھوں نے اپنی رہبری حیثیت کے عین مطابق بہت سی لغو کہانیاں گھڑ لیں ۔ نتیجے میں دعوت برہمنوں کی اس زمانے کی بکواس آج بھی اس جدید دنیا میں، مذہبی رسوم، اخلاقی کہانیوں، تہواروں، برتوں، قسموں اور عقائد کی صورت میں جاری ہیں" ای وی آر کے نزدیک برہمنوں اور ذاتوں کے نظام کا منبع دراصل ملک میں آریاؤں کی نوآبادکاریت کا نتیجہ تھا۔ یہ وہی آریہ تھے جنھوں نے دراوڑ کمیونٹی کو اپنی نوآبادیات اور اپنی تسخیر کے بل پر گنگا کے میدانوں میں سے نکالا اور پھر اپنے اقتدار کو مذہبی اور ثقافتی بالادستی کے ذریعے قائم رکھا۔ ای وی آر کے فلسفے میں آریائی شمال اور دراوڑی جنوب کی علیحدگی لازمی طور پر شامل ہے اور یہ کہ جنوب کے برہمنوں کو تباہ و برباد کرنا ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ آریائی شمال کے حقیقی ایجنٹ تھے۔ تامل ناڈو میں راون کو جنوبی ہندوستان کا ایک شہزادہ تصور کیا جاتا ہے اور رام کے ہاتھوں اس کی شکست تامل لوگوں کے نزدیک کسی عفریت یا آسیب کی شکست نہیں بلکہ ایک قوم پرست کی شکست سمجھی جاتی ہے۔ ریاست میں ہندی زبان کی اتنی شدید مخالفت کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس زبان کو شمالی آریائی سامراجیت کا جدید ترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے جس کے خلاف ای وی آر نے اپنے پیروؤں کو آگاہ کیا تھا۔

بہرحال ۱۹۳۷ کے اہم انتخابات میں، ایک برہمن راج گوپال اچاریہ کی قیادت میں کانگریس نے بابلی راجہ کی جسٹس پارٹی کو تباہ کن شکست دی اور ایک نشست کے علاوہ ساری نشستیں جیت لیں۔ جسٹس پارٹی کی قیادت پر زمینداروں کا غلبہ تھا۔ کانگریس نے اس کے اس تضاد کو بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ خود کانگریس نے اپنے آپ کو گاندھی کی کسانوں کی پارٹی سے وابستہ کیا۔ اچھوتوں کو اس وقت ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ انتخابات کے نتائج کی بنا پر کانگریس نے حکومت بنائی اور سی راج گوپال اچاریہ، مدراس کے وزیر اعظم بنے۔ موجودہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ اس وقت وزیر اعظم کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ وزیر اعظم بننے کے کچھ ہی دنوں بعد راج گوپال اچاریہ نے ایک کام ایسا کیا جس کی وجہ سے ای وی آر جو اس عرصے میں جسٹس پارٹی کے سربراہ ہو چکے تھے۔ پھر ابھر کر سامنے آگئے۔ راج گوپال اچاریہ نے کانگریس کی قومی پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہندی کی تدریس کو اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا۔ ای وی آر کے لیے تو یہ پہلے ہی سے ایک موثر ہتھیار تھا۔ ایک بار پھر ایک برہمن، تامل زبان اور تامل تہذیب کو تباہ کر کے ہندوستان کی سامراجیت کا ایجنٹ بن کر سامنے آیا تھا۔

ای وی آر نے ایک ہندی مخالف تحریک شروع کی اس تحریک کو ۱۹۶۷ میں اس تحریک کا پیش خیمہ بننا تھا جو ای وی آر کے جانشین کو سربر حکومت پر لانے والی تھی۔ کانگریس حکومت نے ای وی آر کو جیل بھیج دیا۔ (اور جان بوجھ کر ملیریا کے بدترین علاقے میں رکھا)، ای وی آر دو سال تک قید میں رہے۔ پندرہ برس کی مدت میں وہ تیس بار جیل گئے۔ اسی وجہ سے ان کا نام ہی "طائر قفس" پڑ گیا مگر ملیریا کے دو برسوں میں ہندی مخالف تحریک عوام کے ذہن و روح میں سما گئی۔ چونکہ ای وی آر بذات خود موجود نہیں ہو سکتے تھے اس لیے جلسۂ عام میں، ان کی تصویر یا ان کا مجسمہ اسٹیج پر رکھا جاتا تھا۔ قید سے رہائی ملنے کے بعد ای وی آر کو ۲۸-۳۰ دسمبر ۱۹۳۸ کی مدراس کانفرنس میں "پیریار" کا خطاب دیا گیا۔ پیریار کا مطلب ہوتا ہے غیر معمولی ذہانت والا آدمی۔ ان کی مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ کانگریس کو انھیں خریدنے کی کوشش کرنا پڑی ۱۹۳۹ میں ان کے حریف راج گوپال اچاریہ نے انھیں اپنی حکومت میں ایک جگہ دینے کی پیش کش کی۔

پیریار نے انکار کر دیا۔ ان کے ذہن میں کچھ دوسرے ہی منصوبے تھے۔ وہ مسلم لیگ میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہے تھے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ جب شمالی ہندوستان کا مسلمان وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتا ہے جبکہ ان کے مابین بہت کچھ مشترک ہے تو پھر دراوڑ اور خصوصاً تامل لوگوں کی شمال کے ساتھ نبھائے! ایسی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ان کی زبان، ان کا رسم الخط، ان کا کھانا، ان کے خدوخال ہر چیز ہی مختلف تھی۔ ای وی آر نے اب ایک دراوڑ ناڈو یا ایک دراوڑ قوم کے اپنے نعرے کی لے بلند کرنا شروع کی۔ اپنی مکمل شکل میں یہ جنوبی ہند

کے ملائیلی، کناڈیا، تیلگو اور تامل چار لسانی گروہوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن تھی اگرچہ یہ ایک ناممکن بات تھی مگر ایک علیحدہ تامل ملک "تامل ناڈو" کے علاوہ کوئی دوسری صورت قابل قبول بھی نہیں تھی۔ (یہ نام آج ایک حقیقت ہے مگر اس نام کا علاقہ بہر حال انڈین یونین میں ہے)۔ ایس رامن نے جنہوں نے ای وی آر کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد کو وہ تامل ناڈو قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی رہے تھے ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے مصنف کو بتایا کہ علیحدگی کی خواہش ایک سنجیدہ کوشش کی شکل میں شروع ہوئی۔

اس بات کا احساس بھی پیدا ہو چلا تھا کہ قیادت پر زمینداروں کے غلبے کے کانگریسی الزام میں حقیقت کا ایک جزو ہے۔ تحریک اگر عوامی حمایت دلچسپی کی خواستگار ہے تو اسے متوسط درجے کے کسانوں کو اپنی طرف کھینچنا پڑے گا۔ ۱۹۴۴ میں سی این انا دورائی نے جو ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور ای وی آر کے نائب کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، سیلم کانفرنس میں جسٹس پارٹی کے نام کو تبدیل کر کے دراوڑ کازگم (D.K.) کا نام رکھنے کی تجویز پیش کی اور پارٹی کے تمام لیڈروں سے یہ کہا کہ وہ انگریزوں کے عطا کیے ہوئے اپنے تمام خطابات ترک کر دیں۔ مگر بہ حال "ڈی کے" کو اپنے لیڈر اتنا بھروسہ نہیں تھا کہ وہ ۱۹۴۶ کے انتخابات میں حصہ لیتی چنانچہ اس نے الیکشن میں کانگریس کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔
ایک اور دشواری سامنے آئی۔ انا دورائی نے پیریار کی سنکی پن کی باتوں پر تنقید کرنا شروع کی، ان کے خیالات سے پارٹی کی اکثریت نے جو ۱۹۴۹ کی پارٹی کی تقسیم کے وقت ان کے ساتھ آگئی تھی اتفاق کیا مگر نئی پارٹی دراوڑ منیترا کازگم (ڈی ایم کے) میں ای وی آر کے لیے جنہوں نے اس کے نظریات کی تشکیل کی تھی، محبت واحترام کا اتنا شدید جذبہ تھا کہ اس نے ان کی جگہ پر کسی کو بھی پارٹی کا صدر نامزد نہیں کیا۔ پارٹی میں صرف جنرل سکریٹری کے عہدے تھے۔ ای وی آر کی جسمانی موجودگی کو رد کیا گیا تھا مگر ان کے خیالات کی فرمانروائی بدستور تھی۔ کرسی صدارت "پیریار کی روح" کے لیے خالی رکھی گئی۔

مگر اس سے قبل کہ تامل علیحدگی کے اپنے مطالبے کو سڑکوں پر مظاہرے کر کے موثر بنائیں، پڑوس میں ایک اور بھیانک آگ لگ گئی۔

۸

فرد، جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا

اگرچہ تامل، مدراس پریسیڈنسی کے سب سے اہم باشندے تھے مگر وہ اکیلے نہیں تھے۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی گیارہ اضلاع کی اس پریسیڈنسی میں تلگو آندھرا کے عوام بھی تھے۔ (بقیہ تلگو آبادی اور اس کی سرزمین پر نظام حیدر آباد کی حکومت تھی) انھوں نے مدراس پریسیڈنسی کی تقسیم اور ان کی اپنی ایک ریاست بنائے جانے کا مطالبہ کیا.... اس مطالبے میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کانگریس پارٹی نے اپنے ۱۹۱۹ اور ۱۹۲۰ کے دونوں اجلاسوں میں آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کے اصول کو تسلیم کیا تھا۔ ۱۹۲۸ کی موتی لال نہرو رپورٹ نے اس یقین دہانی کا اعادہ کیا۔ کانگریس نے ۱۹۲۷ کے اپنے کلکتہ اجلاس میں آندھرا اور کرناٹک کی ریاستوں کی تشکیل کے خیال کو خاص طور پر منظور کیا تھا اور ۱۹۴۸ میں واردھا میں آزاد ہندوستانی وفاق کے اندر ملایلی لوگوں کے لیے کیرالا کی ریاست کے قیام پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔

مگر تقسیم ہند کے مابعد اثرات کی بنا پر لسانی ریاستوں سے متعلق نہرو کے وعدے میں تزلزل پیدا ہوا اور یہی کیفیت وزیر داخلہ سردار پٹیل کے یہاں بھی نظر آئی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو قانون ساز اسمبلی میں اسی موضوع پر ہونے والے ایک مباحثے کے موقع پر نہرو نے نہایت ٹھنڈے انداز میں کہا "پہلی چیزیں پہلے آتی ہیں اور پہلی چیز ہے ہندوستان کا تحفظ اور اس کا استحکام" کانگریس کے وعدے کو پورا کرنے کی بجائے حکومت نے لسانی ریاستوں کے خیال پر از سر نو غور کرنے کے لیے کمیشن مقرر کر دیا۔ کمیشن نے انتہائی تابعداری کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ اس وقت کوئی بھی تبدیلی خطرناک ہوگی۔ کمیشن نے مزید کہا کہ زبانیں نہیں انتظامی سہولتیں ہندوستان کی تنظیم نو کی بنیاد ہونا چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ انگریزوں کا اصول بدستور قائم رہنا چاہیے اور نہرو کو لاتعداد لسانی ریاستوں کے بجائے صرف چار انتظامی علاقے بنانے کی اجازت دی جانی چاہیے۔

انگریز نے ملک کو سیاسی یا انتظامی مصلحتوں یا وقت کی سہولتوں کے مطابق تقسیم کیا تھا۔ ہندوستانی آئین

اصطلاحات ۱۹۱۸ء کی رپورٹ) ۱۸۰۱ اور ۱۸۲۷ تک، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیاں بتدریج اپنے پورے قد وقامت پر پہنچ چکی تھیں مگر چہ بنگال اس وقت تک برطانوی اقتدار کا مرکز بن چکا تھا مگر وہ ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہو سکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میدان جنگ اور ہندوستانی راجاؤں کے سازشی درباروں میں کامیابیوں کی مدد سے برطانوی قلمرو ترقی کر گئی اور ۱۸۳۳ء میں آگرہ پریسیڈنسی وجود میں آئی۔ ۴۹۔۱۸۴۸ء میں سکھ فوجوں کی شکست کے بعد پنجاب بھی زیر ہو اور اسے ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا۔ اودھ ۱۸۵۶ء میں شکنجے میں آیا۔ ۱۸۶۱ء میں سنٹرل پراونسز کا وجود عمل میں آیا۔ آسام کو غصب کر کے ۱۸۲۶ء میں بنگال کا حصہ بنا دیا گیا۔ مگر وہ ۱۸۷۴ء میں پھر الگ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مشرق، چھوٹا ناگپور سے آسام تک، کرزن کے دو بنگالوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بہار اور اڑیسہ کو ایک اور صوبہ بنانے کے لیے ملا دیا گیا۔ آخری صوبہ جسے انگریزوں نے بنایا وہ اڑیسہ تھا۔ یہ اپریل ۱۹۳۶ء میں وجود میں آیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو مختلف عرض و وسعت اور جیش و کر اہمیت کی حامل ۵۶۵ سلطنتیں (ریاستیں) ورثے میں ملیں۔ رقبے کے لحاظ سے یہ سب برصغیر کے دو تہائی سے زیادہ حصے پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے ۲۱۵ چھوٹی چھوٹی رجواڑہ ریاستیں جن کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی، موجود صوبوں سے منسلک تھیں۔ ۷۰ لاکھ کی آبادی رکھنے والے ۶۱ رجواڑے (ریاستیں) مرکزی انتظامیہ کے حوالے کیے گئے۔ ۲۷۵ ریاستوں کو، جن کی آبادی تقریباً ساڑھے تین کروڑ تھی، راجستھان، مدھیہ بھارت، ٹراونکور، کوچین، سوراشٹر اور پیپسو (پٹیالہ ایسٹ پنجاب اسٹیٹ یونین) میں تبدیل کر دیا گیا۔ حیدرآباد، میسور اور جموں و کشمیر کی بڑی ریاستوں کو ان کی سابقہ حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ ان تینوں ریاستوں کو ہندوستان میں مدغم کرنا، پُرعزم سردار پٹیل کی اس ملک کو آخری بڑی دین تھی۔ مگر یہ وہ نہیں جو اس کی عوام کو خواہش تھی۔ عوام تو اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی حدود میں رہنا چاہتے تھے نہ کہ انتظامیہ کی ضرورتوں کے مطابق۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۱ کا دن تھا اور صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے جب مہاتما گاندھی نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور ۲۴۱ میل دور بحر ہند کے ساحل پر ڈانڈی کی طرف کوچ شروع کیا۔ ۶ مارچ کو انھیں وہاں پہنچ کر ایک مٹھی نمک اٹھا کر ایک بار پھر ایک عظیم قومی احتجاج شروع کرنا تھا جو ساری دنیا کو ہلا دینے والا تھا۔ مہاتما گاندھی کے جن ۷۹ پیروؤں نے مارچ میں شروع سے لے کر آخر تک ساتھ دیا ان میں پوٹی سری راملو بھی تھے۔ خود مہاتما نے ان کے خلوص اور لگن کی بار بار تعریف کی ہے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو گاندھی کے اس پیرو نے خود ہندوستانیوں کے ساتھ وہ کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کے گرو نے انگریزوں کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک عظیم حکومت کی طاقت اور ایک فرد کے ایمان و عقیدے

قوت کی آزمائش، انھوں نے ایک برت شروع کیا اور کہا کہ یہ برت یا تو ان کی موت پر ختم ہوگا یا پھر آندھرا کے الگ ریاست کی تشکیل پر۔ پنڈت نہرو جو آزاد ہندوستان کو چلانے کی پریشانیوں میں غالباً یہ بھول گئے کہ ایک گاندھی وادی کیا کچھ کر سکتا ہے، انھوں نے سری راملو سے برت ختم کرنے کے لیے کئی اپیلیں کیں اور اس کے بعد ان کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء رات کے آٹھ بج کر چالیس منٹ پر سری راملو جو مدراس میں مائیلاپور کے علاقے میں بلوسو سبا مورتی کے گھر پر مقیم تھے، بے ہوش ہو گئے۔ برت کا اٹھاونواں دن تھا۔ رات کو گیارہ بج کر بیس منٹ پر سری راملو نے دم توڑ دیا۔ بھوک سے جان دے دی۔

پنڈت نہرو اس دن سارا دن، پارلیمنٹ میں اپنے نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے رہے۔ اس دن انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنے پہلے پنج سالہ منصوبے کی تمہید شروع کی تھی۔ وہاں انھوں نے کہا کہ "آج کا دن ملک کے لیے ایک عظیم دن ہے۔ یہ منصوبہ ملک کے اتحاد اور اس کی یکجہتی کا شعور پیدا کرنے کی اولین کوشش ہے اور ایک غیر طبقاتی سماج کی طرف پہلا قدم۔" یک جہتی اور اتحاد کے جذبات کو بہرحال اگلے دن کسی دوسری سطح پر ایک کڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔

سری راملو کی موت کی خبر جیسے ہی نکلی، مدراس پریسیڈنسی کے گیارہ تلگو اضلاع میں ایک شور مچ گیا اور بے ساختہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ دو تین دن میں مشتعل ہجوم نے ریلوے اسٹیشن کو پانچ گھنٹے تک اپنے کنٹرول میں رکھا (اپنے غم و غصے کو کوئی شکل نہ دیتے ہوئے، ہجوم نے ٹرینوں کو اپنی لوٹ کا سامان ادھر سے ادھر لے جانے میں استعمال کیا) تشدد ہر طرف پھیل گیا اور پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ اخبار نے نقصان کا اندازہ دو کروڑ روپیوں کا لگایا (اور یہ وہ زمانہ تھا جب روپے کی قیمت کہیں زیادہ تھی) چوبیس گھنٹوں کے اندر ایک مضبوط مرکز اور چار انتظامی حلقوں کا نہرو کا، بڑی احتیاط سے تشکیل دیا ہوا تصور چور چور ہو گیا۔ ۱۸ دسمبر کو ہندوستانی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ آندھرا پردیش بنایا جائے گا۔ دوسری ریاستوں نے ۱۹۶۶ میں پنجاب کی تشکیل کے بعد تک، فیصلے کے منطقی تسلسل کی پیروی کی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۳ کو سید فضل علی کی قیادت میں ایچ ایس کنزرو اور کے ایم پانیکر پر مشتمل ایک ریاستی تنظیم نو کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن نے تقریباً دو ہزار انتہائی غور و خوض کے بعد تیار کی ہوئی یادداشتوں کے مطالعے ۳۸ ہزار میل کے سفر ۱۰۴ مقامات کے دوروں اور نو ہزار افراد سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں ہندوستان کی لسانی تقسیم کا جواز پیش کیا۔

(۹)

اعزازات کی فہرست میں

جب انھوں نے اپنی سیاسی پارٹی کی جگہ ایک نئی بیوی کو دے دی تو پیری یار ای. وی. راما سوامی نائیکر ایک ڈ
باز بن کر رہ گئے۔ مگر ان کے پروگرام اب بھی بہ حال بڑے موثر ہوتے تھے اور انھوں نے پارٹی کی روح کو بیدار رکھ کر تحر
کو زندہ رکھا۔ ۱۹۵۲ میں اس معمر آدمی نے اعلان کیا کہ وہ جنوری میں رامائن کو جس میں رام اور راون کی لڑائی بیان کی
ہے، سرعام نذر آتش کریں گے اس اعلان کے بعد انھیں یہ لطف ضرور آیا کہ ان کے پاس سیکڑوں کی تعداد میں نارا
برہمنوں کے خطوط آنے لگے جن میں اُن سے کتاب کی بے حرمتی کرنے سے احتراز کرنے کی درخواست ہوتی تھی۔ ۵۸
میں انھوں نے علیحدگی کے تاحل مطالبے کے اظہار کے طور پر ہندوستان کے آئین کو جلانے کا پروگرام بنایا لیکن جب ایک
طرف یہ معمر بزرگ اخباروں کی شاہ سرخیوں پر توجہ مبذول کیے ہوئے تھا ڈی ایم کے میں اس کے حامی شدید جدوجہد
میں مصروف تھے۔

۵۲-۱۹۵۱ کے عام انتخابات کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ مگر ۱۹۵۶ میں تیروچیراپلی کانفرنس میں ڈی ایم کے
یہ فیصلہ کیا کہ وہ سی این انّادورائی کی قیادت میں ۱۹۵۷ کے عام انتخابات لڑے گی۔ پارٹی کے بعض عملی پروگراموں پر شد
عوامی ردعمل نے پارٹی کے ممبروں کی ہمتیں بڑھا دی تھیں۔ ان عملی پروگراموں میں مثال کے طور پر ۱۹۵۴ میں انادورائی
قیادت میں مدراس میں ہمپسی کیمٹی کے دفتر سے پیپلز پارک اور وہاں سے میرینا بیچ کے ساحل تک جلوس لے جانے
ذکر کیا جا سکتا ہے۔ حامی داروں کا کہنا ہے کہ جلوس میں تقریباً پانچ لاکھ افراد شریک ہوئے۔ سیاست والوں کی معمو
مبالغہ آرائیوں سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ اس میں عوام کی شرکت ڈی ایم کے کی ہمتوں کو بلن
کرنے کے لیے کافی تھی۔ ۱۹۵۷ کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں پارٹی نے پندرہ نشستیں جیتیں اور علیحدگی پسند انادورا
قانون ساز نظام کے ایک رکن بن گئے۔ اس کامیابی کے نتیجے کے طور پر پارٹی کو الیکشن کمیشن نے تسلیم کر لیا اور ابھرتے ہو

• ہاتھ ان سرکاری مزید نشانوں میں شامل کر لیا گیا۔ علیحدگی، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اس وقت تک کلی طور پر جائز چیز تھی
۱۹۵۹ء تک ڈی ایم کے نے مدراس کارپوریشن کے انتخابات جیت لیے تھے۔ اور پہلا سرکاری افسر کارپوریشن کا
ہر ان سکادی منتخب ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں، ریاستی اسمبلی کی ۲۰۷ نشستوں میں سے پچاس نشستیں جیت کر انھوں
نے یہی ترقی کو جاری رکھا مگر قسمت کی ستم ظریفی، جس کا بعد کو بہت اثر پڑنے والا تھا، یہ ہوئی کہ اناّ دورائی خود الیکشن میں
ہار گئے۔ ان کی شکست کی اصل وجہ کانگریسی چیف منسٹر کامراج نادر کی وہ ذاتی دل چسپی تھی جو انھوں نے علیحدگی پسند لیڈر
کو ہرانے میں دکھائی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر ڈی۔ ایم کے نے اناّ دورائی کو دہلی میں راجیہ سبھا میں بھیجنے کا فیصلہ
کیا جہاں انتخاب بالواسطہ ہوتے ہیں۔ اناّ دورائی پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے۔ اس سے صرف یہی نہیں ہوا کہ ڈی ایم کے
کی تحریک قومی پیمانے پر سامنے آ گئی بلکہ خود ڈی۔ ایم کے کی تحریک میں قومی خصوصیات سرایت ہونے لگیں۔ ۱۹۶۲ء کو ملک
کی تاریخ میں ایک اہم سال ہونا تھا۔

اپریل ۱۹۶۲ء کو صدر کے خطبے کے شکریے کی تحریک پر پہلی بار راجیہ سبھا میں کنجیورم نڑاجن اناّ دورائی بولنے
کھڑے ہوئے تو انھوں نے دراوڑ ناڈ کی وکالت کرنے میں اپنی تقریر کرنے کی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ انھوں نے
ایوان کے تمام اراکین سے کہا کہ وہ ان کے عوام کو شمالی سامراجیت سے نجات دلانے کی ضرورت پر سنجیدگی اور ہمدردانہ
طور پر غور کریں۔ "میں دراوڑ ناڈ کی علیحدگی کی بات کسی دشمنی کے جذبے سے نہیں کہتا۔ میرا یہ خیال صرف اس لیے ہے
کہ اگر یہ علیحدہ کر دیا جائے تو یہ ایک چھوٹا سا ملک بن جائے گا، مستحکم، یک رنگ اور متحد۔ اس وقت ہم اقتصادی نشاۃ ثانیہ
اور زیادہ موثر اور سماجی حیات کو زیادہ بارآور بنا سکیں گے۔" تقریر میں ان کا دوسرا ہدف ظاہر ہے کہ ہندی تھی۔

وزیر مالیات کی تقریر پر ہونے والے مباحثے میں شرکت کرتے ہوئے جون ۱۹۶۲ء میں جو تقریر انھوں نے
کی اس کا لہجہ بھی وہی تھا (راجیہ سبھا میں اناّ دورائی کی بہترین تقریروں کا انتخاب "اناّ اسپیکس" کے نام سے اورینٹ لانگمین
نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔ انتخاب کے مولف ایس راما چندرن ہیں) "مجھے یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہیے کہ جس
حق کو میں نے اپنایا ہے اس سے نہ تو ہند دق مجھے الگ کر سکتی ہے اور نہ ہی اظہار نفرت۔" اس سلسلے میں کسی مفاہمت کا
سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر اسی سال اکتوبر تک ایک بڑا انقلابی واقعہ ہوا۔ ملک کے شمال میں چینی فوجوں کے دھاوے کئے
گئے اور ملک جو ابھی تک امن و آشتی اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعروں میں گم تھا اسے نہ صرف جنگ سے نپٹنا پڑا بلکہ
ہزیمت کی ذلت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بریگیڈیر جے۔ دلوی صاحب نے ایک بریگیڈ کی قیادت کی تھی اور سات مہینے
چینیوں کی قید میں گزارے تھے جنگ کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف "ہمالین بلنڈر" ۱۱ اور مینٹ پیپر بیک میں اول

بیان کرتے ہیں "۱۹۶۲ کی چین ہند جنگ، مدمقابل فوجوں کے ایک بہت چھوٹے حصے تک محدود تھی اور سرحد کے بہت چھوٹے سے دور دراز کونے میں محض ایک مہینہ لڑی گئی تھی جس میں حقیقی لڑائی کے صرف دس دن تھے مگر اس سب کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ نے ہماری بین الاقوامی حیثیت، داخلی سیاست اور اقتصادی ترقی میں بڑی مدبیر کا آغاز کر دیا۔"

جنگ نے ہندوستانی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے عنفوان شباب کا عہد ایک دم ختم ہو اور ملک کو ایک تکلیف دہ بحران سے گزر کر پختہ اور بالغ ہونا پڑا۔ نہرو کی محافظ ہستی یک لخت جواب دے گئی۔ اس صدمہ سے وہ بحال ہو گئے مگر اس دوران میں اس بات کا احساس بھی تھا کہ کسی ایک کا ہاتھ پکڑے رہنے کا اب وقت نہیں رہا۔ ایک شکستہ دل ہوئے نہرو کو بڑھاپے نے آ گھیرا اور وہ بیس مہینوں کے اندر ہی چل بسے۔ ان دس دنوں میں، جب ایسا لگتا تھا کہ چینی ہمالیہ پہاڑوں کو پار کر کے نیچے وادی کو فتح کرتے ہوئے آسام میں در آئیں گے تو اس وقت یہ شعور بھی پیدا ہو رہا تھا کہ آزادی اور قومیت بے ساختہ اتنی زیر دانی نہیں برتی جا سکتی تھی کہ ابھی تک برتی گئی تھی۔ چنانچہ شکست کا وہ لمحہ ملک کا سب سے زیادہ حیات افزا لمحہ ثابت ہوا۔ ایک جذبے نے سارے ملک کو ایک ایسی سرشاری عطا کر دی جو اس سے پہلے کسی نے نہ بخشی تھی۔ ۱۹۶۲ کی اس ذلت آمیز شکست نے بہت سے توہمات بھی دور کر دیے تھے۔ "اس شکست نے اگر ملک کو اصلاحی اقدامات پر مجبور نہ کر دیا ہوتا اور ۱۹۶۵ کی پاکستانی جنگ میں ہندوستانی فوج شاید مقابلہ نہ کر سکتی اور کشمیر ہاتھ سے نکل گیا ہوتا۔ بیدلی اور مایوسی کا ایک اور حملہ شروع ہو جاتا مگر سب سے بڑا اور غیر متوقع نتیجہ تھا جذبہ حب الوطنی کی بیداری، علیحدگی پسندی کے احساسات کا خاتمہ۔

انادورائی نے چینی حملے کی خبر سے پہلے ویلور جیل میں پڑھی اس وقت وہ اپنی سیاسی حراست کی ایک اور مدت گزار رہے تھے۔ مدراس مستقبل کو تامل ناڈو، میدان جنگ سے دور ہندوستان کے دوسرے کنارے پر تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ شمال جس سے انہیں نفرت تھی ہمیشہ کی طرح دور تھا اور جنوب اس سے بالکل غیر متاثر اور محفوظ تھا۔ مگر ۲ اکتوبر کو اپنی رہائی کے بعد انادورائی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ ڈی ایم کے کی تمام سرگرمیوں کو خواہ وہ احتجاجی ہوں یا کوئی دوسری یکسر ملتوی کر دیا اور پارٹی کے تمام کارکنوں سے کہہ دیا کہ وہ حملہ آور کے عزائم کو رد کرنے کے لیے اپنی ساری تنظیم اور ساری توانائی کو یکسر حکومت ہند کے سپرد کر دیں۔ "میں ڈی ایم کے کے نام کو اعزاز کی اس فہرست میں درج کرتا ہوں جو اس وقت اس ملک اور اس قوم کے لیے اس کے وقار کے لیے اور اس کے مستقبل کے لیے تیار ہو رہی ہے۔" انادورائی کی تقریروں کے انتخاب کے مؤلف کی حیثیت سے ایس راجندرن نے کتاب "انا اسپیکس" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

یک لحاظ سے ۱۹۶۲ ہندوستان کے لیے بہترین ساعت تھا کیوں کہ اسی ادبار نے ہندوستانی عوام کو اپنے اختلافات بھلا کر
مہ آور کے خلاف متحد ہو جانے پر مجبور کر دیا" ستمبر ۱۹۶۵ میں السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (۲۶ ستمبر) کو ایک انٹرویو دیتے
دے انادورائی نے اس بات کی تصدیق کی کہ "ہم نے اب دراوڑ ناڈو کا اپنا مطالبہ ترک کر دیا ہے۔ ہم نے چینی حملے کے
قت پہلی مرتبہ اس مطالبے کے خطرناک امکانات کو محسوس کیا۔"

حکومت ہند نے بھی موقع ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ ۱۹۶۳ء میں سارے ایوان کی حمایت کے ساتھ اس نے آئین
مہ سے وہ دفعہ ہی نکال دی جو بہرحال غلط تھی۔ وزیر قانون اسے کے سین نے آئین کی دفعہ ۱۹ کو بدلنے کے لیے سولھواں
ترمیمی بل ۱۹۶۲ پیش کیا، جس کی رو سے ہر علیحدگی پسند جماعت کو انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دیا گیا۔ ڈی ایم کے
نے اپنے خیالات میں اتنی تبدیلی ہو جانے کے باوجود بھی، ایک ایسے بل کی موافقت کے لیے اپنے کو تیار نہیں پایا جو
کے اصل موقف کے خلاف تھا۔ بہرحال بل منظور ہوا اور زبردست اکثریت کے ساتھ جلدی ہی ڈی ایم کے نے
علیحدگی کے اپنے مطالبے کو باقاعدہ ترک کر دیا اور اپنے صوبے کی حکمراں جماعت بننے کی تیاری میں لگ گئی۔ یہی کلیدی
سی حقیقت تھی کہ وہ مدراس میں حکومت کر سکتی ہے۔ ڈی ایم کے کے علیحدگی کے مطالبے کو بے معنی اور فضول بنا دیا۔
گرس سے پہلے کہ پارٹی اور تحریک پورے طور پر ہندوستان میں مدغم ہوں ڈی ایم کے کے سامنے ایک اور اہم لڑائی لڑنے
و۔ ڈی تھی۔

۱۰

مہاندی

یورپ کے جن لوگوں نے عثمانی اور آسٹرو ہنگرین سلطنتوں کا زوال اور زبانوں کی بنا پر چھوٹے چھوٹے ملکوں کی از سر نو تشکیل کو دیکھا ہے ان کے لیے یہ سمجھنا خاص طور پر مشکل ہوتا ہے کہ یہ مقدر برطانوی سلطنت کے جنوب ایشیائی علاقوں کا آخر کیوں نہ ہوا۔ اگرچہ بہت تاخیر ہوتی مگر پھر بھی ہندوستان کو آٹھویں دہائی تک منتشر ہو جانا چاہیے تھا۔ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل کے لیے جان دینے والے ایک سری راملو تھے تو ہندوستان میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں قومی زبان ہندی کو غلام بنانے کا ہتھیار بننے کی مخالفت میں اپنی جانیں دے دیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جہاں ایک انتہائی اہم فیصلہ لیا جانے والا تھا اور وہ تھا آزاد ہندوستان کی قومی زبان کو طے کرنے کا مسئلہ۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو جلد سے جلد انگریزی کے استعمال کو ختم کر کے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ ہندی کے ان مبلغین کے پاس جواز یہ تھا کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستان کی ۳۲۰ ملین آبادی میں سے ۱۴۰ ملین افراد ہندی سمجھتے تھے۔ دوسرے فریق کو اس فیصلے میں بقائے باہمی کا اختتام دکھائی دے رہا تھا۔ اسمبلی کے بہت سے اراکین اس بات سے متنبہ کر رہے تھے کہ اگر ہندی کو اقتصادی یا ثقافتی اقتدار کی زبان کا درجہ مل گیا تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اعتدال پسند حضرات چاہتے تھے کہ انگریزی اس وقت تک سرکاری زبان بنی رہے جب تک کہ ہندی کا کوئی مقبول عام روپ دریافت نہ کر لیا جائے۔

کانگریس پارٹی ۲۵ سال قبل اس وقت ہی ہندی کی حیثیت تسلیم کر چکی تھی۔ جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندی کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی رضامندی دی تھی (اتفاق یہ ہے کہ یہ فیصلہ ایک ووٹ کی اکثریت سے ہوا تھا مگر اس کا ' وہ یہ تھا کہ ہندی کے لیے دو رسم الخط ہوں گے ایک دیوناگری اور دوسرا اردو مگر یہ بات ۱۹۲۴ کی ہے اس وقت ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اسے اپنے

ریزولیوشنوں اور تجویزوں میں دونوں کے جذبات کو مطمئن کرنا ہوتا تھا۔ مہاتما گاندھی، بہرحال قومی زبان کی حیثیت سے ،
سنسکرت آمیز اور فرقہ وارانہ شدت کی مظہر ہندی کی بجائے ہندی اور اردو سے مل کر بننے والی ایک زبان، ہندوستانی کی
وکالت کرتے رہے۔ انھوں نے جو زبان سوچی تھی وہ ایک وسیع القلب اور روشن خیال زبان تھی جو اردو اور دوسری ہندستانی
بولیوں کے الفاظ بھی اپناتی اور ان کے اثرات بھی قبول کرتی اور جو بنارس کی نہیں ہندوستان کی تہذیب کی علامت بھی ہوتی
ربس کی تعریف بھی۔ مگر ۱۹۴۹ میں اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ تقسیم ہند کے مابعد بھیانک فسادات کے نتیجے کے
طور پر ہندوستانی مسلمان کی آواز گھٹ کر رہ گئی اور مولانا آزاد جیسا آدمی بھی اس حقیقت پر کہ ہندوستانی کی بجائے ہندی
ملک کی قومی زبان ہوتی جا رہی ہے صرف اپنے بوجھل دل کا ذکر کر سکا۔ یہ صرف پنڈت نہرو تھے جو ہندی اور اس کی بہن
اردو کے باہمی رشتے کو قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دے سکے۔ زبان کے سلسلے میں اور بھی بہت سے مختلف خیالات
پیش کیے گئے۔ مثلاً ہندی کے دیوناگری کے بجائے رومن رسم الخط کو استعمال کرنا (یہ بات بظاہر جتنی مشکل معلوم ہوتی
ہے، اتنی ہے نہیں۔ ہندی صحافی جو انگریزی ٹیلکس استعمال کرتے ہیں اپنی خبریں رومن رسم الخط ہی میں بھیجتے ہیں)
اس خیال کے ممتاز حامی عظیم انقلابی اور سر سے پیر تک سیکولر قوم پرست سبھاش چندر بوس تھے۔ ان کا اتنی جلدی مرنا ہندستان
کا ایک عظیم نقصان تھا۔

بہرحال اس بات پر ایک عام اتفاق تھا کہ اگر کسی زبان کو قومی زبان بننا ہی ہے تو وہ ہندی ہوگی۔ اس سلسلے میں بھی
بہت سی مختلف رائیں تھیں کہ یہ کام ہو کیوں کر۔ اس بات کا سب کو احساس تھا کہ لسانی پالیسی کے سلسلے میں ذرا سی لغزش بھی
نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ قانون ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس موضوع پر مباحثے کو شروع کرنے کی
اجازت دینے سے پہلے یہ کہا کہ "اگر ہمارے فیصلے کو ملک کے کسی بھی خاصے بڑے حصے کی خواہ وہ شمال ہو یا جنوب
حمایت حاصل نہیں ہوتی تو پھر آئین کا نفاذ ایک انتہائی دشوار مسئلہ بن جائے گا۔ زبان کے مسئلے کا حل سارے ملک کو
بہ حیثیت مجموعی کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے پورے آئین میں کوئی دوسری شق نہیں ہے جس کے نفاذ
کی عملی طور پر ہر روز بلکہ ہر لمحہ ضرورت پڑے گی۔"

جواہر لال بھی بالکل واضح تھے "ہم ہندوستان میں ایک لسانی انقلاب کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور ہمیں اسے صحیح
سمت دینے صحیح شکل دینے اور صحیح سانچہ دینے میں بہت محتاط رہنا ہوگا کہ کہیں۔ غلط۔ ہو جائے اور ہمیں کہ
غلط سمت میں نہ موڑ دے۔" انھوں نے اسمبلی کے اراکین کو گاندھی جی کے خیالات یاد دلائے جب انھوں نے کہا تھا
ہندی میں سب کچھ شامل ہونا چاہیے اور یہ کہ اسے کسی پر بھی جبراً مسلط نہیں کیا جانا چاہیے اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ

کتنے جذباتی ہوسکتے ہیں ثبوت خود اسمبلی میں موجود تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز سکھ لیڈر سردار حکم سنگھ جنھوں نے دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو قومی زبان بنائے جانے کے خیال کی تائید کی تھی۔ تین دن کی بحث کے دوران انھوں نے موقف بدل لیا۔ آخری دن تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں نے اب اپنے ذہن کو بدل لیا ہے۔ ہندی کے حامیوں نے میری حمایت کھودی ہے اور اب میں مسٹر انھتونی کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں (فرینک انھتونی، ایک انڈین لیڈر جو متعدد جگہوں پر انگریزی کو بدستور قائم رکھنے کی وکالت کر رہے تھے) میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو دیوناگری رسم الخط میں ہندی کی حمایت کرنے والوں کے پاگل پن اور ان کے تعصب اور غیر رواداری کی وجہ سے ہی حمایت سے دست کش ہو گئے ہیں۔"

یہ صرف اردو سے خصوصی تعلق محسوس کرنے والے مسلمان ہی نہیں تھے جو ہندی سے ڈرے ہوئے تھے۔ جنوبی ہندوستان، جو ہندی سے ناواقف تھا، اس کے خلاف تھا۔ تاملوں کی مخالفت شدید ترین تھی اور شاید اسی لیے انڈین یونین کی حکومت نے ہندی کو ہندوستان کی لنگوا فرانکا بنانے کی تجویز کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری ایک تامل برہمن پر ڈالی۔ ۱۲ ستمبر کو این گو پالا سوامی آئینگر نے، قانون ساز اسمبلی سے یہ درخواست کرتے ہوئے کہ ہندی کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے پر اپنی رضامندی دے، تجویز پیش کی۔ اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے کہا تھا "ہم آج ایک زبان کو الوداع کہہ رہے ہیں، جس کی مدد سے، میرا خیال ہے کہ ہم نے آزادی کی لڑائی لڑی اور آزادی حاصل کی" الوداع کے اس عمل کو ابھی کچھ دن جاری رہنا تھا۔

آئینگر، ڈاکٹر بی آر امبیدکر، اور کے ایم منشی کے نام سے پیش ہونے والا ریزولیوشن نمبر ۳۰۱ اے اس طرح شروع ہوا تھا "یونین کی سرکاری زبان دیوناگری رسم خط میں ہندی ہوگی اور سرکاری کاموں میں استعمال ہونے والی گنتی، بین الاقوامی گنتی کی شکل میں ہوگی۔ انگریزی ہندوستان کے آئین کی منظوری کے بعد پندرہ سال تک رہے گی۔ اس کے بعد ایک قومی زبان کی حیثیت سے ہندی اس کی جگہ لے لے گی" مگر آئینگر نے، جو بہر حال ایک اچھے وکیل بھی تھے تجویز میں ایک راہ فرار کی گنجایش رکھی تھی "اگرچہ اس دفعہ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے مگر پارلیمنٹ، پندرہ سال کے بعد ان ضرورتوں میں جن کا تعین قانون نے کر دیا ہوگا، انگریزی کے بدستور استعمال کے لیے قانون بنا سکتی ہے۔"

اس مفاہمت پر ہندی پریمیوں کا تاثر کافی خوش تھا اور پھر ایک خواب کی زندگی میں پندرہ برس ہوتے کیا ہیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر اور قانون ساز اسمبلی کے رکن سیٹھ گوبند داس نے ایوان کو بتایا کہ زبان کا مسئلہ ۹۵ فی صدی حل ہو چکا ہے باقی ۵ فی صدی ابھی حل ہونا ہے۔ وہ ان کے خیال میں غالباً دیوناگری گنتی کے بجائے رومن ہندسوں کے استعمال کا

رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندوستان کی لاتعداد زبانوں کو یہاں کی ندیاں قرار دیا تھا اور ہندی کو 'مہاندی'۔ اس ندی کو باقاعدہ ملک کے معاملات میں اپنا رول مل گیا۔ مگر یہ بہرحال ابھی دیکھنا تھا کہ ملک اس مہاندی کی لہروں اور اس کے دھاروں کو نفع بخش طریقوں پر استعمال کرنے کے لیے پورے طور پر تیار تھا یا نہیں۔

۱۹۶۳ تک یہ بات ظاہر تھی کہ ملک میں لوگوں کا بہت بڑا گروہ ابھی بھی اس 'مہاندی' کو خطرناک سمجھتا تھا ان کے خیال ...س کے پانی کو ابھی تک ملک کی ضرورتوں کے مطابق قابو میں نہیں کیا گیا تھا اور آئین کے مطابق دو سال سے کم مدت ...کے اندر یعنی جنوری ۱۹۶۵ تک، انگریزی میں سرکاری خط و کتابت کرنے کا طریقہ ختم ہو جانا چاہیے تھا اور اس کے ...ے ساری سرکاری خط و کتابت ہندی میں ہونا چاہیے تھی۔ حکومت ہند نے جس کی سرپرستی پنڈت نہرو کر رہے تھے ...یہ جو سمجھ داری کا تقاضا تھا یعنی اس نے وہ راہ فرار والی شق استعمال کی۔ ۱۹۶۳ء کا سرکاری زبانوں والا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اس موضوع پر ہونے والی بحث اس حقیقت کا ایک اور ثبوت تھی کہ شکایتوں کے حل نکالے جا سکتے ہیں۔ ...ذ طیکہ ان کے اظہار کا پورا پورا موقع فراہم کر دیا جائے۔ جیسا کہ سی انادورائی نے کہا تھا میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی سوجھ بوجھ کے ...ب کتاب سے الگ، یہ مقتدر ایوان، سیاسی اخلاقیات اور جمہوری رسم العملی پر بھی توجہ دے گا کیوں کہ جمہوریت کا مطلب محض اکثریت کی حکومت نہیں ہوتا اس کا مطلب بنیادی طور پر اقلیتوں کے حقوق کے تقدس کو محسوس کرنا اور ان کی حفاظت کرنا ہی نہیں بلکہ اقلیتوں کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہے۔"

توقع کے مطابق انادورائی کی تقریر بحث کی مرکزی تقریر تھی انھوں نے ہندی کی اعلان کی جانے والی حیثیت اور حقیقت کے فرق کو بڑی خوبی سے پیش کیا تھا۔ بنگالی کمیونسٹ لیڈر بھوپیش گپتا ہندی کی وکالت کر رہے تھے۔ ...ب انادورائی کی باری آئی تو انھوں نے بھوپیش گپتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "میرے دوست بھوپیش گپتا کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم ٹوڈیوں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور اسی لیے انگریزی چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں" انھوں نے کہا کہ "بھوپیش گپتا ہندی کی وکالت کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ہندی ہی قومی زبان اور سرکاری زبان بنائی جائے مگر وہ ہندی سیکھنے ...ر ہندی میں بات کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

بھوپیش گپتا جو خود ہی ایک زبردست پارلیمنٹیرین تھے فوراً بولے "میرے پاس وقت نہیں تھا" انادورائی بھی ...س کا جواب دیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ انھوں نے بھی فوراً جواب دیا اور کہا "لیکن ان (بھوپیش گپتا) کے پاس ...اس کیپٹل پڑھنے کے لیے وقت تھا، ان کے پاس روسی کیمونزم اور چینی کیمونزم کے فرق کو سمجھنے کے لیے وقت تھا، ان کے پاس ہندی کے علاوہ سب کچھ پڑھنے کا وقت تھا۔"

انادورائی نے اس دلیل کا بھی جواب دیا کہ ہندی کی حیثیت اور اہمیت اس حقیقت کی بنا پر بھی ہے کہ ملک کا ۴۲ فی صدی حصہ تسلیم کرتا ہے انھوں نے کہا کہ یہ حقیقت کہ یہ ۴۲ فی صدی حصہ تقریباً ایک ہی جغرافیائی علاقہ آجاتا ہے، اس خیال کو خطرناک بنا دیتی ہے۔ اگر یہ علاقہ سارے ملک میں بکھرا ہوا ہوتا تو شاید اس زبان کا استعمال قابل قبول ہوتا۔ اس لیے ۴۲ فی صد کو جو زیادہ تر ایک ہی علاقے میں ہے مفروضہ اکثریت کی علامت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ محض اعداد و شمار کی گنتیوں کی اکثریت ہے۔ پھر مسئلے کا حل کیا ہے؟ آئین میں ترمیم کرکے صورت حال کو رکھیے۔ یہ مسئلے کا حل ہونے دیجیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حل ہم ہی کریں۔ ہم ہندوستان کے آخری خلف نہیں۔ غالباً ہماری سمجھ زیادہ الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ ہم میں سیاسی نفرت بہت ہے آنے والے زمانے میں شاید کوئی حل ڈھونڈا جا سکے۔ اگر ہندی کی یہ حیثیت ایک حقیقت بن جاتی ہے تو...... سارا جنوبی ہندوستان اس کے خلاف بغاوت کر دے گا۔'

یہ انقلاب کیا اور کیسا ہوگا اس کی کچھ جھلک جلدی ہی نظر آنے لگی۔ سرکاری زبانوں کے بل کو ۱۹۶۳ء میں وزیر امور داخلہ نے پیش کیا تھا وہ تھے لال بہادر شاستری۔ مئی ۱۹۶۴ء میں جواہر لال کی موت کے بعد لال بہادر شاستری وزیر اعظم بنے۔ ابھی وہ اپنے منصب کے ابتدائی مشکل دور سے گذر ہی رہے تھے کہ پہلا بحران ان کے سامنے آگیا۔ آئین ہند ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو باقاعدہ قانون بن گیا۔ یہی دن تھا جب ہندوستان ایک جمہوریہ بنا تھا اور ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو ہی پندرہ برسوں کی وہ مدت ختم ہو رہی تھی جس میں انگریزی کے استعمال کو ختم ہونا تھا۔ اگرچہ ایک حقیقت کہ ۱۹۶۳ء کے ایکٹ نے اس پریشانی کو دور کر دیا تھا کہ اس تاریخ تک انگریزی زبان کا بستر پورے طور پر بند ہو جائے گا مگر جنوب کو اس سلسلے میں شبہات تھے۔ مدراس میں ڈی ایم کے نے آزاد ہندوستان کے پندرھویں یوم جمہور کو "یوم تاسف" کی حیثیت سے منانے کا فیصلہ کیا۔

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء، اتوار کے دن ونسٹن چرچل کا انتقال ہوا۔ ہندوستانی اخباروں نے اس خبر کو شاہ سرخیوں میں شائع کیا۔ اخباروں کے پہلے صفحات طول طویل کہانیوں سے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک نے بڑے مہذب طریقہ پر اس بات کے اظہار سے گریز کیا تھا کہ اگر مسٹر ونسٹن کو اپنے ڈھنگ سے عمل کرنے کا موقع ملتا تو شاید سورج برطانوی سلطنت میں کبھی غروب نہ ہوتا۔ عام حالات میں ایک عہد کا خاتمہ جیسی شاہ سرخیوں سے ایک ایسی خبر کو جو عام حالات میں پہلے صفحہ پر شائع ہوتی اسے اندرونی صفحات پر چھاپ دیا۔ اور وہ خبر تھی یونین گورنمنٹ کی اس تشویش کی جو ان امکانات کے بارے میں اسے تھی جو ۲۴ جنوری یا ۲۶ جنوری کے بعد پیش آ سکتے تھے۔ گر انگریزی زبان کا قتل نہیں بھی ہوا تھا

بی ہندی ملک کی سرکاری زبان بننے جا رہی تھی ۔ انگریزی کی حیثیت رابطے کی ایک سرکاری زبان کی ہو رہی تھی ۔ ہندی بولنے والی ریاستیں خوش تھیں ۔ غیر ہندی ریاستیں پریشان اور مشکوک تھیں ان کے نزدیک "جبری تسلط" کی گھڑی آگئی تھی ۔ دہلی میں وزارت داخلہ کے حکام مخصوص صحافیوں کو اس سلسلے میں وضاحتی خبریں شائع کرنے کا مشورہ دے رہے تھے کہ ملک اچانک ایک زبان کا ملک نہیں بننے والا ہے ۔ ایک ذمہ دار نے کلکتے کے اخبار سنڈے اسٹینڈرڈ کے خصوصی نمائندہ کو بتایا کہ ہندی کو واحد سرکاری زبان بنانے کا عمل بہت ہی طویل وقت لے گا ۔ میں کوئی وقت تو متعین نہیں کر سکتا عملی طور پر جو کچھ ہوگا وہ کچھ ایسا ہوگا ۔ ذمہ دار نے کہا :

(الف) ہندی میں لکھے ہوئے مرکزی حکومت کو وصول ہونے والے خطوط کا جہاں تک ممکن ہوگا ہندی ہی میں جواب دیا جائے گا ۔ (پہلے ہندی میں جانے والے خطوط کی تعداد محض ایک فی صدی ہوا کرتی تھی) ۔ تمام خطوط جو انگریزی میں ہوں گے ان کے جوابات انگریزی میں دیئے جائیں گے ۔ اہم خطوط اور احکامات ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بھیجے جائیں گے ۔

(ب) انگریزی اصطلاحات کے ہندی متبادل بنائے جائیں گے ۔

(ج) سرکاری گزٹ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوگا ۔

(د) فائلوں پر نوٹنگ انگریزی یا ہندی میں ہوگی ۔

(ہ) ہندی ریاستوں کو اپنے ان مراسلات کا ہندی ترجمہ بھی بھیجنا ہوگا جو وہ غیر ہندی ریاستوں کو بھیج رہی ہیں ۔

(و) سپریم کورٹ کی زبان صرف انگریزی ہی رہے گی ۔ ویسے ریاستیں اپنی ریاستی زبان کو عدالتوں میں متعارف کرانے کی درخواست دے سکتی ہیں ۔

۲۵ جنوری کو گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے پہلا ہندی اعلان نکلا ۔ ایک غیر معمولی گزٹ نام تھا "بھارت کا راج پتر" اس میں ان روایتی صدارتی انعامات کا اعلان تھا جو ان ہندوستانیوں کو دیئے جاتے تھے جنھوں نے اپنے اپنے پیشوں میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ۔ اور اس طرح دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ بنگالی فلم ساز ستیہ جیت رے اور مہاراشٹر کے ممتاز سائنس داں جینت نارلیکر کو پدم بھوشن کا اعزاز دیتے وقت پہلی دفعہ ہندی کو سرکاری کام میں استعمال کیا گیا ۔ لندن نے ہندوستان میں اپنے نئے ہائی کمشنر کے لیے جان فری مین کے نام کا اعلان کیا ۔ جان فری مین نے انتہائی وفاداری کے ساتھ بی بی سی کی ہندی سروس کے کارکن آل حسن کو بتایا کہ وہ آزاد بھارت کی قومی زبان کو سیکھنے کی پوری کوشش کریں گے ۔ "میں اس وقت ہندی کا ایک لفظ نہیں جانتا اور میں سمجھتا ہوں

کر اپنے ان ہندوستانی سامعین کو جو شاید مجھے اس وقت سن رہے ہوں آگاہ کر دینا چاہیے کہ میں زبانیں سیکھنے کے معاملے میں بڑا بے ہنر اور بے استعداد ہوں، مگر پھر بھی میری یہ کوشش ہوگی کہ دلی پہنچنے پر میں ہندی پڑھوں، وہ کام کروں جس سے میں زبان کے کم از کم آسان اور سیدھے سادے عناصر سے واقف ہو جاؤں۔"

مگر مدراس میں لوگ ایسی وسیع القلبی کے موڈ میں کم تھے۔ گڑبڑ کے خدشے کو محسوس کرتے ہوئے، کانگریسی وزیر اعلیٰ بھگت وتسلم نے انادورائی اور ڈی ایم کے کے دوسرے ممتاز لیڈروں کو ۲۵-۲۶ جنوری کی نصف شب میں گرفتار کر لیا۔ مگر یہ احتیاطی تدبیر ۲۰ ہزار طالب علموں کے اس اجلاس کو نہ روک سکی جس کے آگے آگے "ہندی عفریت" کا پتلا تھا اور اس کے گلے میں جوتوں اور چپلوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ مدورائی میں کانگریس کے جھنڈے ہٹا کر سیاہ جھنڈے لگائے گئے۔ دوسرے مقامات پر قومی جھنڈے کی بے حرمتی کی گئی۔ اور یہ سب محض تمہید تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں دو نوجوانوں نے تامل کو بچانے کی خاطر خود اپنی جانیں لے لیں۔ ویرو گیا کم میں، ڈاک خانہ میں کام کرنے والے ۳۲ سالہ نوجوان رنگا راجن نے ایک چوراہے پر اپنے آپ کو آگ لگا لی آگ کے شعلوں جوں جوں اسے اپنی لپیٹ میں لیتے جاتے تھے وہ "تامل زندہ باد" کا نعرہ لگاتا جاتا تھا۔ کوڈامبکم کے مقام پر ۲۲ سالہ سیوالنگم نے بھی یہی کیا۔

مظاہرے پرتشدد ہو گئے۔ مدراس کے وزیر اعلیٰ (وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ کے الفاظ میں ایک چٹان کی طرح سخت) نے ان مظاہروں کو نظم و ضبط کا مسئلہ قرار دینے کا فیصلہ کیا اور پولیس بھیج دی۔ اب مظاہرین پولیس کی گولیوں سے مرنے لگے اور غم و غصہ کی لہر ملک کے باقی حصوں کو بھی متاثر کرنے لگی۔ ۲۸ جنوری کو اپنے کلکتے کے ایک دورے میں وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ "میں نے بالکل واضح اور مثبت وعدہ کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہندی مسلط نہیں کی جائے گی"۔ کانگریس کے اونچے حلقے میں ان کے ساتھ اتو لیا گھوش نے بھی ہندی کے پرجوش حامیوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد بازی آہستہ کریں۔ دلی میں وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے پیش کش کی۔ "ہم ہمیشہ ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور اختلافات کو دور کر سکتے ہیں"۔ (یہ بیان دیتے وقت شاستری جی انگریزی میں بول رہے تھے)

مگر ڈی ایم کے کے اہم لیڈر ابھی تک جیلوں میں تھے اور عوام سڑکوں پر، اور کوئی بھی مل بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ۲۹ جنوری کو کیرانور کے ایک ہوٹل کے ایک بیس سالہ بیرے نے دو خط لکھے ایک اپنے باپ کو اور دوسرا ڈی ایم کے کے لیڈر اناّ دورائی کو۔ ان خطوں میں اس نے لکھا کہ وہ تامل کے لیے اپنی جان قربان کر رہا ہے۔ اس نے کھٹمل مارنے والا زہر پی لیا اور مر گیا۔ لوگوں کو اس سلسلے میں اپنی قطعی رائے ظاہر کرنا پڑی، وہ کس کے طرف دار ہیں بتانا پڑا۔ گروہوں کی تقسیم ہندی اور غیر ہندی کے روایتی خطوط پر ہوئی۔ بمبئی میں ذہین کارٹونسٹ لکشمن نے (جو خود کرناٹک

ہندوستان کے ہیں ٹائمز آف انڈیا (جس کے لیے وہ آج بھی کام کرتے ہیں) میں ایک کارٹون شائع کیا۔ کارٹون میں ہندوستان کے جہاز کو فرقہ پرستی، غربت، رشوت خوری اور کمزور دفاع کی ہیبت ناک لہروں کے تھپیڑے کھاتا اور اس کے کپتان اور غافل عملے کو انگریزی کی تحریروں کو ہندی میں بدلنے میں مصروف دکھایا گیا تھا۔ کلکتے میں انگریزی ادب کے استاد اور شاعر مسٹر پی لال نے ہندوستان میں انگریزی کے دفاع میں ایک بڑا سخت مضمون لکھا جس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا: "اس سے زیادہ بچکانی اور بات نہیں ہو سکتی کہ لسانی مسائل کو سڑکوں اور گلیوں میں طے کیا جائے۔"

۳۰ جنوری کو ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں گاندھی جی کے قتل کی برسی کے موقع پر شاستری جی نے ملک سے خطاب ہو کر باقاعدہ اعلان کیا تھا "انگریزی ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے بدستور استعمال ہوتی رہے گی۔ اور پارلیمنٹ کے ایکٹ کے مطابق مدراس میں بغیر کسی رکاوٹ یا دشواری کے استعمال ہوگی" دوسرے دن، اس خوف کو دور کرنے کے لیے کہ ہندی کے قومی زبان بن جانے سے غیر ہندی لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہوگا، مرکزی حکومت نے سرکاری ملازمتوں میں ریاستوں کے کوٹے کی پیش کش کی۔ ۳ فروری کو کلکتے میں طالب علموں نے مظاہرہ کیا ان کے بینروں پر لکھا تھا "ہم ہندی نہیں بولیں گے۔ ہم ہندی نہیں پڑھیں گے، ہم ہندی موسیقی نہیں سنیں گے۔" (اس میں آخری عہد سب سے بڑی قربانی تھی کیوں کہ مقبول عام ہندی فلمی میوزک کا سارے ملک میں شوق پاگل پن کی حد تک موجود ہے)

۱۰ فروری کو وہ تشدد جو مدراس میں آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایک دن میں دو درجن موتیں ہو گئیں۔ پولیس کو جگہ جگہ گولی چلانی پڑی۔ سیلم میں جہاں بدترین گڑبڑ ہوئی تھی فوج بلانا پڑی۔ ترپور کے مقام پر غضبناک مجمع نے پولیس کے دو سب انسپکٹروں راماسوامی اور اپن کے ونکٹیسن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذر آتش کر دیا۔ تشدد پر ردعمل اتنا شدید تھا کہ یونین گورنمنٹ کے دو انتہائی اہم مدراسی وزیروں (سی۔ سبرامنیم (جنھوں نے بعد کو سبز انقلاب کا آغاز کیا) اور او۔ وی۔ الگاسن نے کانگریس کی مرکزی حکومت سے اس بنا پر استعفا دے دیا کہ وہ شاستری جی سے مدراس کے مطالبات منوانے میں ناکام رہے تھے۔ ۱۲ فروری تک پولیس نے پولاچی میں عوام کے خلاف ہلکی مشین گنیں استعمال کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایک اور تامل تروچی کے ابتدائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر ویراپن نے خودسوزی کا مظاہرہ کر کے اپنی جان دے دی (بعد کو جب ڈی ایم کے برسر حکومت پر آئی تو اس نے اس تحریک کے شہیدوں کو اعزاز دینے کی خاطر ان کے پس ماندگان کو مالی انعامات دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر سپریم کورٹ نے اس قدم کو غیر آئینی قرار دیا اور کہا کہ آئین تمام ریاستی حکومتوں کو ہندی کی ترویج میں مدد کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا ہے)

مرکزی حکومت کے وزیروں کے استعفے نے ایک بحران سا پیدا کر دیا کیوں کہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی

سیاست دانوں کو کسی عہدے کو چھوڑنے پر مجبور کرنا پڑتا ہے انھیں خود کسی چیز سے دست کش ہونا کچھ بہت پسند نہیں
ہوتا ان استعفوں کا وہی اثر ہوا جو چاہا گیا تھا۔ تحریک نے ان لوگوں کو ہیرو بنا دیا۔ وزیر اعظم لال بہادر شاستری جو خود ہن
پریمیوں کے ایک خاموش حامی تھے ان وزیروں کو اپنی کابینہ میں واپس نہیں لینا چاہتے تھے مگر صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس
رادھاکرشنن نے اس ضد کے عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ اس سے ملک کا اتحاد خطرے میں پڑ جائے گا
اس کے بعد ہی ان مطالبات کی تکمیل کے طریقوں پر کچھ سنجیدگی سے غور و فکر ہونا شروع ہوا۔

مطالبات کیا تھے؟ تامل ایک قومی زبان کی حیثیت سے ہندی کو متروک قرار دیئے جانے پر مصر نہیں تھے
کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ وہ نہرو یقین دہانی کو جس میں کہا گیا تھا کہ ہندی کسی ایسے شخص پر مسلط نہیں کی
جائے جو اسے نہیں چاہتا ہے، آئینی شکل دلوانا چاہتے تھے۔ ایک بار پھر یہ نہرو ہی کی بصیرت تھی جو اس ملک کی دست گیری کر
تی۔ "نہرو یقین دہانی" کے پیچھے کیا فلسفہ تھا اسے مختصراً بیان کرتے ہوئے ان کی ۱۳ ستمبر ۱۹۴۹ کی قانون ساز اسمبلی کی
ایک تقریر کا اقتباس بہت مناسب رہے گا۔ "اپنے ملک میں انگریزی کے علاوہ ہماری خود اپنی زبان ہونا چاہیے
... ہمیں اس سلسلے میں جمہوری طریقہ کار اپنانا ہوگا یا ایک تحکمانہ رویہ؟ یہ سوالات میں ہندی کے پرجوش حامیوں سے
کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کیوں کہ ان کی متعدد تقریروں میں جو میں نے یہاں اور بعض دوسری جگہوں پر سنی ہیں مجھے تحکمانہ لب
و لہجہ محسوس ہوا ہے۔ یہ صرف یہی نہیں کہ بنیادی طور پر غلط رویہ ہے بلکہ یہ ایک خطرناک رویہ بھی ہے۔ اس سوال پر آپ
سمجھ داری کے ساتھ غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اگر آپ ہندی کو ان لوگوں پر مسلط کر دیں جو اس کے مخالف ہیں
تو یہ طریقہ خود ہندی کے فروغ میں مددگار نہ ہوگا۔ ہندوستان کے جمہوری پس منظر میں یہ صورت حال یقیناً ناممکنات میں
سے ہے۔ اسی لیے آپ کو ہندوستانیوں کے ان تمام گروہوں کی نیک خواہشات کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی جن کی
مادری زبان ہندی نہیں ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے دل بھی جیتنے ہوں گے جو ہندی ہی کی ایک مختلف قسم بولتے ہیں جسے
ہندوستانی یا اردو کہا جاتا ہے۔ آپ اگر کوئی ایسی بات کریں گے جو تحکمانہ نظر آئے تو وہ ناکام ہی رہے گی۔"

۱۰ فروری ۱۹۶۵ کو ہندوستانی پارلیمنٹ کے بجٹ کے اجلاس کا افتتاح صدر جمہوریہ کے خطاب سے ہوا۔ صدر
جمہوریہ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے دونوں ایوانوں کی مشترکہ نشست کو خطاب کرتے ہوئے اراکین کو یہ یقین دلایا کہ ہندوستان
میں انگریزی باقی رہے گی۔ ۲۴ فروری کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حکومت سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ
"آفیشیل لینگویجز ایکٹ" میں نہرو کی یقین دہانی کو آئینی شکل دینے کے لیے ضروری ترمیم کرائے۔ بحران
دھیما پڑ گیا

۱۹۶۷ء کے انتخابات میں، لسانی تحریک کے لیڈروں کے فیض سے ڈی ایم کے نے نفسیاتی رکاوٹوں کو توڑا، اور مدراس میں الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس تحریر کے لکھے جانے کے وقت تک تحریک کو شکست نہیں ہوئی لیکن آج ہندی اور تامل ناڈو کے درمیان باہم گفتگو کرنے والے تعلقات نہیں ہیں۔ ہندی کا ریاست کے کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری کاروبار میں تذکرہ نہیں ہے، لیکن بہرحال ہندی، قومی شعور میں بتدریج اہم کردار ادا کرتی جا رہی ہے۔ مگر اب کوئی لسانی سامراج کا نعرہ لگاتا ہوا سڑکوں پر نہیں نکلتا۔ ۱۹۶۵ء کے بیس سال بعد، لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ ملک کے مستقبل کو زبان پر ہونے والے مباحثے سے خطرہ لاحق تھا۔

(۱۱)

ماضی اور مستقبل

پانچویں اور چھٹی دہائی میں، ہندوستان سے متعلق خبروں میں، بے یقینی اور ظلمت کا طاقہ۔ جیسے استعا
کے استقال کا ترانہ دیتا، ہندوستان کی غربت، آپس کی پھوٹ، اس کی گندگی اور سب سے زیادہ اس کے،
شان پر عظیم آہ و بکا کا دور دورہ تھا۔ اس بات پر زیر لب مسکراہٹیں تھیں کہ ہندوستان اسا باتہ محض بھیک مانگنے کے
بڑھاتا ہے حالانکہ اسے کسی بہتر کام کے لیے غلا منہ مند کرنے کے لیے استعمال ہونا چاہیے اور یقیناً اس جیسے جاہل اور
بھو کے ملک میں جمہوریت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بہتر یہ حالات میں زیادہ سے زیادہ۔ ایک ناکام ہو
بدترین صورت حال میں اوالتوڑی کا شور و غل جو ان تمام پوشیدہ اور تخریبی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرے گا جو ملک کی
تباہی و بربادی کی ضامن ہوں گی۔ گمشدہ سلطنت کی اذیت نے برطانیہ کی آنکھوں کی یرقانی کیفیت کو اور بڑھا دیا،
میں، ہندوستانی خارجہ پالیسی نے نظر کو اور مسخ کر دیا۔ وہ زمانہ سیدھے سادے تصورات کا زمانہ تھا اور مشہور سیٹو ا
بغداد معاہدے کا رکن پاکستان اب بہتر لوگوں کے ساتھ تھا۔ یہ بڑی قابل توجہ بات ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ موت
پیشین گوئی کرنے والی کتابوں کی تو کمی نہیں تھی مگر کوئی ایسا "عالم" نہیں تھا جو پاکستان کی موت کی پیش بینی کرتا

ہندوستان پہلے سے طے کیے ہوئے رویوں کے شکنجے میں تھا۔ یہ رویے آج بھی دماغوں کو متاثر کرتے
آج تک۔ ملک کی لعنت ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ اگرچہ غریبی اس کا آج بھی سب سے بڑا
مسئلہ ہے۔ اچھی خاصی صنعتی بنیاد قائم کر لی ہے۔ تیل کے معاملے میں بھی اس کی حیثیت کے اچھے ہونے کے امکانات ہیں۔

۱۹۹۰ میں بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کے قرضے کی آخری قسط کے لینے سے انکار کے تیور بھی نظر آتے ہیں۔ مگر واشنگٹن حکام اور امریکی سیاحوں کے لیے ہندوستان آج بھی "بھکاری انڈیا" ہے مگر یہ بات آپ واشنگٹن میں کہیں تو شاید نہیں دیں۔ یہ لوگ تو کلکتہ میں مرنے والوں، آگرہ کے تاج محل اور جے پور کے راستے میں ملنے والے سپیروں کے ہی جاننا چاہتے ہیں۔ (ٹھیک ہے۔ کلکتے میں اب لوگ مر نہیں رہے ہیں۔ آگرہ میں تاج محل کے قریب تیل صاف کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ لگ گیا ہے، سپیرے اب لگتا ہے کہ وزارت سیاحت میں شریک ہو گئے ہیں۔)

نائی پال کی کتاب "این ایریا آف ڈارک نس" جیسی کتابوں پر ہمیں بہت وقت دینے کی ضرورت نہیں ہے یہ تو بہر صورت انگریزی کے پردے میں محض تعصب تھا۔ زیادہ صحیح شاید "سیلگ ہیریسن" کی کتاب "دی موسٹ ڈینجرس ڈیکیڈس" پر نظر ثانی کرنا ہوگا۔ ہیریسن دہلی میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک قابل احترام نامہ نگار تھے جو ہندوستان، پاکستان، نیپال، سری لنکا اور افغانستان کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ (اس وقت تک ظاہر ہے کہ بنگلہ دیش وجود میں نہیں آیا تھا) اس کتاب کے انتخاب کی وجہ صرف وہ اثر نہیں ہے جو اس کتاب نے اعلیٰ سیاسی حلقوں پر ڈالا تھا۔ اس انتخاب کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں اس علاقے کے لیے ایک ہمدردانہ رویہ بھی ملتا ہے۔ ہیریسن نے ان شکوک و شبہات کو پیش کرنے میں ان دلائل کو استعمال کیا ہے جو پانچویں دہائی میں بہت عام تھے اور جنھیں مفاد پرست آج بھی اس ملک کے بارے میں دنیا کے نقطہ نظر کو دھندلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، آخری بات یہ ہے کہ ہیریسن کی کتاب پرنسٹن یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۰ میں شائع کی تھی اور ظاہر ہے کہ اس کتاب کے پیش نظر "موسٹ ڈینجرس ڈیکیڈس" یعنی چھٹی ساتویں اور آٹھویں دہائی کا شمار رہا تھا اس وقت تک کل کی پیشین گوئیوں کا آج کی حقیقتوں سے موازنہ کرنے کا وقت آچکا تھا۔

ہیریسن نے جو سب سے بڑا خطرہ محسوس کیا وہ لسانی قوم پرستی کا خطرہ تھا۔ ہیریسن نے اپنی کتاب کا آغاز ایک ممتاز بنگالی ادیب نیشی کانت چیٹرجی کے ایک اقتباس سے کیا ہے۔ چیٹرجی سنسکرت کے ایک بڑے عالم اور بنگالی قوم پرست تھے ۱۹۵۰ میں، ہندوستان کے اتحاد کے دوام پر ان کو بھروسہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ "ہندوستان کے لیے متعدد آمرانہ قوموں میں بٹ جانے کا بہت خطرہ ہے" انھوں نے جس جذبے کا اظہار کیا ہے وہ یہ تھا کہ نو ممتاز لسانی گروہ جن پر غیر ہندی ہندوستان مشتمل ہے، ملک کے غالب مرکزی علاقے کے ساتھ مل کر نہ رہ سکیں گے۔ سیاسی افراتفری ہوگی بنی سیاست بیگانگی کی طرف لے جائے گی اور پنجاب، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، آندھرا اور اڑیسہ، بنگال، آسام اور کشمیر کی راجدھانیوں میں کم حیثیت ڈکٹیٹروں کو براجمان کرادے گی۔ اور یہ صورت حال منزل یہی ہے کہ آخری ہو کیونکہ دوسرے چھوٹے چھوٹے ضمنی گروہ اپنی خود مختاری کے مطالبات شروع کر دیں

گے اور اس طرح کے سلسلے چلتے رہیں گے؟"

ہیریسن نے پانچویں دہائی کا ہندوستان دیکھا تھا اور اس نے یہ کتاب اس صدی کے نصف میں لکھی تھی۔ اس نے پوٹی سری رامالو کی قربانی سے پیدا ہونے والے جذبات دیکھے تھے۔ ای۔ وی۔ راما سوامی نائیکر کا وہ مطالبہ بھی سامنے تھا جس کا ابھی کوئی حل نہ ملا تھا۔ بنگالیوں کے تشکک اور ان کا جنون اور کشمیر سے متعلق کیے گئے وعدے ایفا میں نئے شبہات پر بھی اس کی نظر تھی۔ ہیریسن نے نہرو کو بار بار یہ آگاہی دیتے بھی سنا تھا کہ لسانی ریاستیں کا پنڈارا کھول دیں گی جس سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ (نہرو نے انگریزوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ ملک کو تقسیم کرو اور حکومت کرو کے سہارے اور اب ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جانا چاہتے ہیں۔) اس نے جناح کی کامیابی کے ساتھ دکھائے ہوئے سبز باغ کے اثرات سے سینکڑوں سینوں کو پھولتے بھی دیکھا تھا۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ وہ بھی اپنے یہاں وزیر اعظم اور گورنر جنرل بن سکتے ہیں۔ وہ جب اپنی کتاب لکھ رہا تھا اس وقت مہاراشٹرا بمبئی کی ریاست کا حصہ تھے۔ اپنی علیحدگی حاصل کرنے کے لیے انہیں ۱۹۶۰ کے عوامی تشدد کی ضرورت تھی اس نے ملک کی ایک اقلیت سکھوں کو اس خطرے کے پیش نظر کردہ اسے خالصتان بنالیں گے جغرافیائی علاقہ نہ دینے میں کانگریس کی بے بسی بھی دیکھی تھی۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ جنہوں نے اپنے حامیوں کو مذہبی پاکستان سے دور جیل میں قیدی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیلگ ہیریسن نے اس مجموعہ اضداد صورت حال کو دیکھا اور پانچویں دہائی مایوس ہونے کا کافی سرمایہ بہم پایا مگر یہ سارے مسائل ایک کے بعد دیگرے وقت اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ غیر محسوس پر حل ہوتے گئے۔ ایشیا کے دوسرے عظیم ملک چین نے اپنے آپ کو دنیا سے الگ کر کے ایک پارٹی کے اقتدار اعتدال کا سسٹم تخلیق کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان ساری دنیا کے سامنے اپنے تجربے میں مصروف تھا۔ اس نے کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے تھے اور ہر فرد کو آزادی تھی کہ وہ آئے اور اس کے پھپھولوں کو دیکھے۔ اور اگر چاہ تو اصل چہرے پر نظر ڈالے بغیر، صرف اس کے پھپھولوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔

ہندوستان کی اپنی قومی بقا کی جدوجہد خود اپنے خلاف جدوجہد ہے، "ایک تمدن اور گھٹتے ہوئے تہ ملک کی حیثیت سے ہندوستان نے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی اس توانائی کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر صرف چین ہے ہے۔ مگر ہر لسانی ہندوستان کے بکھرے ہوئے علاقے یورپ کی طرح کسی سیاسی اتحاد کی مدد سے اپنے آپ کو مجتمع میں لگاتار ناکام ہوئے ہیں ..... ہندوستان خود ایک دنیا ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے مختلف لوگ، ان میں سے ہر ایک سے واقف ملاکھوں کروڑوں ہیں ان گنت، ایسا شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ یہ سب لوگ ایک واحد سیاسی اکائی کے ا

ے دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوں۔ سیلگ ہیریسن نے ۱۹۶۰ میں لکھا تھا: ”یہ امکان کہ طوائف الملوکی، فاشزم نے چھوٹے آمرانہ ممالک“ میں سے ہر ایک اس سیاسی اکائی کو آنے والی دہائیوں میں آج نہیں تو کل، ابھی نہیں تو ادیت پہنچائے گا۔ یہ امکان ہندوستان کی کسی پیدائشی نا اہلیت کا نہیں ہندوستانی قوم پرستی میں مضمر چیلنج ہے اور یہ ہیریسن کے نکالے ہوئے نتائج کا سب سے زیادہ مایوس کن حصہ نہیں تھا۔

مگر کثیر لسانی ہندوستان کے الگ الگ علاقے ۱۹۶۰ سے چوتھائی صدی کے بعد بھی بکھرنے اور معدوم ہونے میں ہوئے ہیں۔ طوائف الملوکی ایک ایسا لفظ ہے جو ہندوستانی سیاست کو بیان کرنے کے لیے کبھی کبھی استعمال ہوتا رہا ب اسے کوئی بھی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتا اور رجحان تک فاشزم سے پینگیں بڑھانے کا تعلق ہے آیا۔ ہیریسن کے خوفناک کمیونسٹوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک ڈیموکریٹ کی طرف سے ہوا جس نے بڑی سمجھداری بات جمہوریت کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ کیا اور یہ ڈیموکریٹ تھیں مسز اندرا گاندھی۔

صوبے میں بسنے والی قومیتوں میں ڈکٹیٹروں ——— کے سامنے آنے کی بجائے مسٹر ہیریسن کے زمانے بے ہندوستان میں اگر کوئی غیر معمولی لہر پیدا ہوئی تو وہ تھی دو فلمی اداکاروں کی وجہ سے جنہوں نے دو طرح کے ڈراموں درمیانی حد فاصل کو اپنی اپنی ریاستوں کے وزیر اعلیٰ بننے کے لیے پار کر لیا۔

ہندوستان کو جو حقیقی خطرہ درپیش ہے وہ ان مذہبی مفادات کی طرف سے ہے جنہوں نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کی ی تھی۔ دوسرے خطرات یا تو دور کیے جا چکے ہیں یا دور کیے جا سکتے ہیں۔ اس صدی کی چوتھی دہائی میں مسلم مذہبی رہنماؤں نے نفت جتوں کے تعاون سے تقسیم اور تفریق کا کھیل کھیلا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ایک جمہوری اور سیکولر ریاست میں ہ مستقل تاریک تھا۔ آٹھویں صدی میں سکھ مذہبی رہنماؤں نے اسی طرح ایک جنگ کو مزید شدید بنایا۔ مسلم کمیونٹی کی قیادت ہری سبب تو یہ ہوا کہ سیکولر سیاست داں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ان کا مقابلہ کیوں کر کرے۔ سکھ سمت کو یہ توقع ہے ہی صورت حال دوبارہ ہوگی۔ مذہبی رہنما کی آڑ، صرف ایک ایسا عارضی وقفہ ہے جو اس کی کمیونٹی کو اپنی لہر میں بہا لے ہ سے اس فرقے کو اتحاد کو تباہ کرنے اور ایک اور علاقے کو مذہبیت کے ہاتھوں میں دے دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف، سیاست داں کے لیے یہ چیلنج ایک غیر معمولی چیلنج ہے۔ ایک اقلیت کی اقتصادی ضرورتوں یو اپنے اور اس کے جذباتی اور مذہبی خدشات کے درمیان ایک توازن تلاش کرنا ہوگا اور ایک ایسی جمہوری حصا رقرار رکھنا ہوگی جس میں اکثریت، اقلیت کو دی جانے والی خصوصی توجہ کو بھی برداشت کر سکتی ہے۔ پنجاب کے باب میں ہم اسی صورت حال کے ہزاروں لاکھوں دھاگوں کے تانے بانوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ایک طرف پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال اور دوسری طرف ہندوستان کے باہمی تعلقات میں، ۱۹۴۷ء میں والی امید اور خوف کے ورثے کا پرتو ہمیشہ نظر آئے گا۔ دلی پر بڑا بھائی بننے کی کوشش کرنے کا الزام لگتا رہا ہے یہ الزام محض اسلامی ڈھاکہ اور اسلام آباد ہی نہیں بلکہ خالص ہندو کھٹمنڈو اور بدھ مت کولمبو کی طرف سے بھی عائد کیا اس لیے یہ صرف ہندو ہندوستان کے مسلم پاکستان کے خلاف ہونے ہی کا سوال نہیں ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں پر اور برما کے علاوہ اسلامی جمہوریہ پاکستان، عوامی اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش، نیپال کی ہندو سلطنت اور بھوٹان کی بدھ سی بادشاہت ہے۔ ایک چیز ہے جو ان تمام ملکوں میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی ملک میں مہ نہیں ہے؟ اگر ایک طرف بھوٹان خود اپنے حال میں مست ملک ہے تو دوسری طرف دوسرے ایک بین الاقوا مه کا حصہ ہیں۔ خود برصغیر کی قومیں یا ممکنہ قومیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف تاریخ، مذہب، زبان اور تہذیب کے ذریعے ملی ہوئی ہیں بلکہ وہ ان اقتصادی تعینات سے بھی ایک دوسرے سے منسلک ہیں جو ان دریاؤں کی طرح ہیں معاملات میں رواں دواں رہتے ہیں جن کا پانی باہمی کشمکش کا ایک مستقل ذریعہ ہیں۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال ہندوستان سے ایک منفی توانائی حاصل کرتے ہیں اپنے ایک الگ تشخص کو قائم رکھنے کے لیے وہ خود اپنے سامنے اور دنیا کے سامنے اس بات پر زور دیتے رہتے ہیں کہ وہ ہندوستان سے نسلی اور ثقافتی طور پر مختلف ہیں اور اسی لیے سیاسی طور پر بھی الگ ہیں ان کی یہ کوشش مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ایک سطح پر مثال کے طور پر بنگلہ دیش کی وہ کوشش ہے جو وہ بول چال کی بنگالی زبان میں 'اسلامی' کی ہلکی سی جھلک کو برقرار رکھنے کے لیے کرتا ہے اسی طرح دوسری طرف پاکستان کے طبقہ اشراف کی لکھنؤ کی گلیوں کے بجائے اپنے جنوب میں عرب کے صحراؤں میں یا ایران کے کشت زاروں میں، اپنے تہذیبی رشتوں کی تلاش و جستجو کی کوششیں ہیں۔ یہ سب عارضی، ناپائیدار اور بے ضرر ہو سکتا تھا اگر "دشمن ہندوستان" سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی مسلسل کوشش نہ ہوتی کہ یہ خطرناک جغرافیائی سیاست کی طرف لے جا سکتی ہے۔

یہ ہندوستان کی صرف طویل و عریض ضخامت ہی نہیں ہے جو اس کے پڑوسیوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتی ہے بلکہ یہ ان کے حکمرانوں کا مالیخولیا بھی ہے جنہیں یہ خوف گھیرے رہتا ہے کہ کہیں اس سے دوستی اور جمہوریت کے عوام کے لیے ضرورت سے زیادہ دلکش و دلفریب ثابت نہ ہو اور خصوصاً اس وقت جب ایک مشترک جذبے کی حقیقت بھی روز روشن کی طرح موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حکومتوں کو رکاوٹوں کی، بندشوں کی ضرورت ہے۔ جمہوری آرزوؤں کی نسیم، سرحدوں کے پار پہنچ کر ان مفاد پرستوں کا تختہ پلٹ سکتی ہے جنہوں نے

اور بنگلہ دیش دونوں پر قبضہ جار رکھا ہے ۔ اگر ہندوستان اپنے لامحدود مسائل کے باوجود اپنے یہاں
نظام نافذ کر سکتا ہے تو پاکستان یا بنگلہ دیش ایسا کیوں نہیں کر سکتے ۔ یہی سوال ہے جو مشرق اور ہندوستان
ب دونوں میں ملا اور فوج کے گٹھ جوڑ کو پریشان رکھتا ہے ۔ اسی طرح اگر ہندوستان اپنے یہاں فرسودہ جاگیردارانہ
تم کر سکتا ہے تو نیپال بدستور ۱۹ویں صدی میں آخر کیوں رہے ؟ اسی لیے برصغیر میں بڑے توانا
ے موجود ہیں جو ہندوستان میں جمہوریت کی ناکامی اور اس کے اتحاد کی تباہی کو دیکھ کر خوش ہوں گے ۔
رصغیر کے دل اور دماغ کے لیے لڑی جانے والی لڑائی ابھی اپنے انجام سے بہت دور ہے ۔

دُوسرا حصّہ

پنجاب

(۱)

مسئلے کی نوعیت

۱۹۸۴ کے پنجاب میں، ہندوستان کی تمام دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ٹیلی ویژن سٹوں اور ویڈیو کیسٹ
...وں کے اشتہارات کہیں زیادہ ہوتے تھے۔ ہندوستانی بازاروں کی ہر چیز کے لاتعداد اشتہار پنجاب کی سڑکوں اور
...وں پر نظر آتے تھے اور یہ سب کچھ اس حقیقت کا بیّن ثبوت تھا کہ پنجاب ہندوستان کے باقی اکثر حصوں کے برعکس اب
...ی دنیا کا حصہ نہیں رہا ہے۔ وہاں گاؤں میں اب مٹی اور پھوس کی جھونپڑیوں کی جگہ اینٹ اور پتھر سے بنے ہوئے
...مکانات تھے۔ عوام جفاکش تھے انہوں نے سخت محنت کی تھی کھیت سرسبز و شاداب تھے۔ قریب ہی واقع ہمالیہ
...نیائیوں سے پانی آتا تھا۔ بیج اور کھاد کی نئی قسموں نے پنجاب کو ہندوستان کے غلے کا گودام بنا دیا تھا۔ ملک کے کسی
...حصے کا قصہ اگر کامیابی کا قصہ تھا تو وہ پنجاب کا تھا۔

متضاد اور یقین نہ آنے والی حقیقت یہ تھی کہ یونین آف انڈیا میں پنجاب ہی وہ واحد ریاست تھی جہاں دہشت
...پسند ... کی مدد وقوں کے سامنے ملک کے وجود کی آزمائش تھی۔ اچھی طرح سے منظم اور پورے طور پر ایک مسلح گروپ سامنے
...یا تھا اس کا مطالبہ اور اس کا مطمح نظر سیدھا سادا تھا۔ سکھوں کے لیے ایک خودمختار ملک جس کا فی الوقت نام خالصتان
...بنا لیا گیا تھا (پاک لوگوں کی سرزمین جس اتفاق دیکھیے کہ پاکستان کے معنی بھی یہی ہیں)۔ ۱۹۴۰ء میں [illegible] پنجاب
...ستان بنا تھا اسی طرح اگر مشرقی پنجاب اپنے آپ کو خالصتان کی مذہبی ریاست میں [illegible] کامیاب ہو جاتا ہے
...تو متحدہ ہندوستان کے وفاق کے سارے تجربے کو ایک ایسا دھکا لگے گا جس سے شاید ہندوستان [illegible]
...سلسلہ چل گیا تو کشمیر بھی نکل جائے گا۔ نقشے پر سرسری نظر اس بات کی [illegible] ہے۔ [illegible]
...دونوں ریاستیں پاکستان سے ملی ہوئی ہیں بلکہ ہندوستان (انڈیا)۔ پنجاب [illegible]
...اکثریت والی ریاست ہے اور جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے [illegible]

(۲)

ایک پرانا خوف

پانچویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک ایک ہزار سال سے زیادہ برسوں کی بات ہوگئی۔ آریاؤں کا ابتدائی مذہب جو بعد کو ہندو دھرم کے نام سے جانا گیا، بڑے خطرے میں رہا۔ معقول تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ آریا ... کی طرف ۱۵۰۰ قبل مسیح کے آس پاس ہی آئے تھے۔ جب روسی قبائلیوں کے ترکِ وطن نے جو انہیں یونان، ایشیا ایران پہنچانے والا تھا، افغانستان سے پرے ہندوکش کی پہاڑیوں کے درّوں سے گزر کر وہاں پہنچ گئے، جو آج ... کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پنجاب کا مطلب ہے "پانچ دریاؤں کی سرزمین" وہ پانچ دریا ہیں جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج۔ شاید وہ صحیح نام سپت آب ہوتا — یعنی سات دریاؤں کی سرزمین اس لیے کہ جس وقت آریا یہاں آئے اس وقت دریاؤں کی تعداد تھی۔ دریائے سندھ جو مغربی سرحد کا نشان دہی کرتا تھا اسے گنتی سے نکال دیا گیا اور ساتواں دریا سرسوتی خشک ہو گیا۔ سرسوتی، علم کی ہندو دیوی کا بھی نام ہے۔ اور بعض مخبوط الحواس افراد کا خیال ہے کہ اس نام کے دریا کا سوکھنا، آج کی دہائی میں پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی علامت ہے۔)

آریا قبیلوں کی کسی سرزمین پر نہیں آئے تھے ان کا ورود یہاں اس وقت ہوا جب ایک عظیم تمدن جو اب وادی سندھ تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے زوال کے کرب سے گزر رہا تھا۔ شہروں کا ایک سلسلہ تھا جو مشہور ہڑپا اور موہنجوداڑو سندھ میں کوٹ ڈیجی، راجستھان میں کالی بنگن، گجرات میں لوتھل اور پنجاب میں روپڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ آریا سب سے پنجاب میں قیام پذیر ہوئے اور ان کے پروہتوں اور مذہبی رہنماؤں نے یہیں "رگ وید" کے وہ ایک ہزار اٹھائیس منتر وضع کیے جو آریائی عہد کی ابتدائی زندگی کے اولین ریکارڈ ہیں۔ دلی کے شمال میں اسی زمانے میں وہ تاریخی مہابھارت لڑی گئی جو دنیا کی طویل ترین نظم کا موضوع بنی۔ وہ رزمیہ داستان قدیم مہابھارت اور رامائن ہیں جن کے

ایک ہزار اور سات سو سال قبل مسیح کے حالات بیان کیے
ترتیب ویاس اور والمیکی بتائے جاتے ہیں، خیال ہے کہ
یں یہ دونوں رزمیے ہندو مذہبی صحیفوں کا مرکزی حصہ ہیں۔ ہندو تصورات کو وجود بخشنے والی زیادہ تر طاقتیں ان ہی
ے ملی ہیں۔ مثال کے طور پر رام کی حکومت، جو دوسرے اور بعد کے رزمیے کے ہیرو ہیں، طاقت کے منصفانہ اور
ی استعمال کی مثال ہے انگریزوں کے جانے کے بعد گاندھی جی نے بھی ہندوستان میں ایسے ہی رام راجیہ کا خواب دیکھا
یہ حال یکوئی ایسا تصور نہیں تھا جس کے بارے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی کی مسلم قیادت میں بھی شرف
یت حاصل کر سکتا۔ مسلم قیادت نے اسے ہندو غلبہ کو "قابل قبول" بنانے کی کوشش قرار دیا اور بالآخر ۱۹۴۷ میں
ب اور بنگال کو بانٹ کر اپنا پاکستان تخلیق کر لیا۔

دھاتوں کے زمانہ کے آغاز سے جو ٹکنالوجیکل ترقی شروع ہوئی اس نے آریاؤں کے برصغیر کے مشرق اور
وب کے سفر کی راہ کو ہموار بھی کیا اور ان کی رفتار کو نسبتاً تیز بھی کر دیا۔ رام کی سلطنت جو کوسالا کے نام سے مشہور تھی،
ذ آج اتر پردیش اور مغربی بہار کے علاقے میں تھی اور رزمیہ میں رام، سری لنکا کے مہاراجہ راون سے سیتا کے اغوا پر اپنی
یہ جنگ لڑنے کے لیے جنوب جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آریا اس وقت تک جنوب کی فتوحات بھی شروع کر چکے تھے
یا ہم نے پچھلے صفحات میں کہا ہے جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو میں جب مشاہیر کی حیثیتوں پر نظر ثانی ہوئی تو
میں راون ایک ایسا مقامی دراوڑ ہیرو بن گیا جو ان آریائی آبادکاروں کے خلاف نبرد آزما تھا جن کی نمائندگی رام
ر رہے تھے۔ بہر حال اگرچہ جنوب نے جواز تلاش کر لیے اور جزوی طور پر رزمیہ کو رد بھی کر دیا مگر یہ اس روایت اور ان
قدیم روایت کو چیلنج نہیں کر پائے جنھیں لے کر کر یہ سارے برصغیر میں پھیلے تھے۔

ایک روایت، آریاؤں کے ہندوستان کے اولین تجربات (اس نئے پیمانے سے باہر کے ہتھے کے طور پر تھی۔
ے کا احترام اور اس کا تحفظ۔ آریہ ہندوستان میں چرواہوں کی طرح آئے تھے جن کی گزر بسر مویشیوں اور ان سے ملنے
والی دوسری اشیا پر ہوتی تھی اور گائے ان کے آرام و آسایش کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دولت کا پیمانہ بھی تھی۔
یہ دور اتنا متبرک سمجھا جاتا تھا کہ عام زندگی میں اس کا کھانا ممنوع تھا۔ بڑے مخصوص موقعوں پر اس کا یا استعمال روا تھا مذہبی
روایوں نے جلدی ہی گائے کو مقدس بنا دیا اور اس کا گوشت کھانے کی فہرست سے یکسر خارج ہو گیا گائے کے اس
تقدس کی جڑیں بڑی گہرائی تک پہنچیں اور اسے بدھ اور مہاویر جیسے دیانت پر اعتراض کرنے والوں نے بھی چیلنج میں کیا
گائے ایک سیاسی مسئلہ صرف اس وقت سے بنی جب سے مسلمان یہاں آئے مسلمان گائے کے گوشت کو
ے اور بکری کے گوشت سے مختلف نہیں سمجھتے تھے۔ نئے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سب سے

زیادہ کشت و خون کا ذمہ دار گائے کو گوشت میں بدلنے کے علاوہ کوئی دوسرا مسئلہ نہیں رہا۔ اس وقت جب کہ یہ لکھی جا رہی ہے سیکولر ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ جاری ہے۔ اس کا سہرا مارکسیوں کے سر ہے جو مغربی بنگال و ... دونوں جگہوں پر حکومت کرتے ہیں انھوں نے باقی ملک کی طرح اپنے یہاں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگانے ت نہ نہیں کیا جب کہ مسلمانوں کی اکثریت والی ریاست کشمیر بھی ذبیحہ گاؤ کی اجازت نہیں دیتی اور مسلمانوں سے بھیڑ بکری کا گوشت ' نے پر اکتفا کرنے کو کہتی ہے۔ کشمیری برہمن دوسرے لوگوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے سور کا گوشت جس ت مسلمانوں کی طرح یہودی بھی پرہیز کرتے ہیں، نہیں کھاتے (حالانکہ کشمیری برہمن اپنی ذات کے دوسرے لوگوں کی طرح سبزی خور نہیں ہیں) دہلی اور پنجاب کے مسلم حکمرانوں کے خلاف اپنی لڑائی کے زمانے میں سکھوں نے گائے کے تحفظ کی اپنی خواہش کا بہت مظاہرہ کیا مگر آٹھویں دہائی میں تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی آجانے کی وجہ سے تشدد پسند سکھوں نے ہندو مندروں میں گائے کے سروں کو رکھ کر ہندوؤں کو بھڑکانا شروع کیا۔

ہندوستان کے ذات کے عجیب و غریب نظام میں پنجاب کے آریاؤں کا خاص حصہ ہے۔ رومیلا تھاپر (ا ے ہسٹری آف انڈیا۔ پنگوئن بکس ۱۹۶۶) جیسی تاریخ داں خاتون نے اس تعصب اور عدم رواداری کو آریاؤں کے اس تعصب کا براہ راست نتیجہ قرار دیا ہے جو ان کے دلوں میں، ان نسبتاً کالی نسلوں کے لیے تھا جن سے برصغیر میں ان کا مقابلہ ہوا تھا اور جنھیں انھوں نے محکوم بنایا تھا۔ آریاؤں کی تین اعلیٰ ذاتیں تھیں، برہمن یا مذہبی رہنما، کشتری یا سپا ... اور ویشیہ یا تاجر اور کسان۔ ان سب کے نیچے شودر تھے جو سیاہ فام اس سرزمین کے اولین باشندے جنھیں سب سے پہلے تو بے زمین کھیت مزدور بنایا گیا اور بعد کو انتہائی جسمانی اور اخلاقی تحقیر ان کا مقدر بنی۔ جلد ہی یہ سب سے نچلی ذات اچھوت قرار پائی اور اس ظلم و جبر کا شکار ہوئی جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ بدھ کا کوئی نظریہ ذات کے اس تعصب کو مٹا نہ سکا کچھ لوگوں کو اسے کم کرنے میں کچھ کامیابی ضرور ہوئی۔ بدھ مت نے اپنی برہمنیت اور ذات مخالف رجحان کی وجہ سے شودروں میں بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا مگر خود یہ مذہب ہندوستان میں باقی نہیں رہ پایا کیوں ... اعلیٰ ذات کے جن لوگوں نے تبدیل مذہب کیا تھا وہ بالآخر پھر ہندوازم کی طرف لوٹ گئے۔ اسلام اپنے مساوات اور برابری کے پیغام اور اللہ کے سامنے مساوات کے کھلم کھلا مظاہرے کے باوجود، ذات پات کے نظام کی پر فریب ترغیبات کا شکار ہو گیا اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے ذات پات کے لیے اپنے تعصب کو اتنا جابر نہیں بن ... جتنا کہ ہندوؤں نے اسے بنا دیا تھا مگر ان میں بھی، وہ اخوت اور بھائی چارگی مفقود تھی جو ان کے ایمان کا مطمح نظر تھی گرونانک کے مذہب سکھ ازم نے بھی ذات پات کو ممنوع قرار دیا مگر اچھوتوں میں سکھ ازم کو اپنانے والوں کو لوئی ذات

ہ کہ ہم منصب بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں

تیا۔ مذہبی رہنماؤں اور پنڈتوں نے کسی تاخیر کے بغیر سود و زیاں کا حساب لگایا اور فوراً اپنے آپ کو اعلیٰ ترین پر فائز کر لیا۔ جو اندیشہ پیش کیا کہ یہ صرف برہمن ہی ہے جو غیر محفوظ راجاؤں کو مقدس توثیق کی سند عطا کر سکتا ہے۔ کیونتی کا دماغ اور اس کی زبان بن گیا۔ سپاہی دست و بازو اور کسان زانو ہو گئے۔ رہا اچھوت تو وہ پاؤں تلے کچلا رہا۔ دماغ نے کرم اور دھرم کے نظریات تخلیق کیے۔ اوّل الذکر کے ذریعے ذات پات کی اس ناانصافی کو سیدھی ی یہ وضاحت کر کے کہ یہ آدمی کی پچھلی زندگی کے اعمال کے مطابق سزا یا جزا ہے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش ی۔ موخر الذکر نے فطری نظام، کا ایک مذہبی غلاف فراہم کر دیا جس کے اندر ہر چیز کی اپنی ایک حیثیت تھی اور اپنا مقام تھا اور ذات بھی ظاہر ہے ان ہی چیزوں میں شامل تھی۔

ہر ذات پات کا نظام اس صدی تک جاری رہا مگر اس وجہ سے نہیں کہ اس کے سامنے چیلنج نہیں تھے۔ پچھلے ر ہزار برسوں کے عمل اور رد عمل پر ایک سرسری نظر ڈالنا بہت ضروری ہے کیوں کہ وہ انگریزوں کے عہد کے بعد کی ندوستانی جمہوریت کے ڈرامے کی سیاست میں بار بار سامنے آتا ہے۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کے طفیل، پنجاب خاص ور پر نظریات کے اختلاط اور ان کو پروان چڑھانے کے معاملے میں ایک انوکھا مقام رکھتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں علاوہ ہر حملہ آور پنجاب کی سرزمین ہی میں داخل ہوا، ان میں وہ بھی تھے جو یہاں مستقل قیام کی نیت سے آئے جیسے ریا، تورانی، ترک، افغانی اور مغل اور یونانیوں اور ایرانیوں جیسے وہ لوگ بھی تھے جو آ کر واپس لوٹ گئے (موخر الذکر اریوس کے عہد ۴۸۵ - ۵۲۱ ق م میں آئے اور تقریباً سو سال تک اس علاقے پر حکومت کرتے رہے جس میں یکسلا اور راولپنڈی شامل ہے۔ یہ جگہیں آج، پاکستان میں ہیں) اگرچہ ویدانت ہندو ازم پنجاب میں سن بلوغ کو پہنچ تو دو سو سال سے کچھ زیادہ کے بعد اسلام کو بھی یہیں جڑیں پکڑنا تھیں یہاں کے لوگوں کے ذہن اور تہذیب میں اپنا مقام شامل کرنا تھا اور یہ بات کہ جذبات اور نظریات کے ملن کا نتیجہ ایک نئے مذہب سکھ ازم کی پیدائش کی شکل میں سامنے آنا صرف پنجاب ہی جیسی سرزمین میں ممکن تھی۔

ہندوازم کے لیے اولین خطرات پانچویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئے دونوں خطرات کی قیادت کرنے والے دو ر مہاویر اور گوتم بدھ تھے۔ مہاویر نے برصغیر کو اہنسا یا عدم تشدد کی تعلیم دی جو جین مت کا بنیادی عقیدہ ہے، ہندوستان میں اس وقت اس مذہب کو ماننے والے بھی تقریباً بیس لاکھ افراد ہیں مگر بدھ ازم تھا جو اپنے شہنشاہ بادشاہ ر محض مشنریوں کی مدد سے نہ صرف برصغیر میں پھیلا بلکہ ایران اور جاپان جیسے دور دراز ملکوں میں اپنے پیرو بنا کر

ایشیا کا ایک اہم مذہب بن گیا۔ مذکورہ دونوں مذاہب کو اپنانے والے زیادہ تر لوگ تیسری اور چوتھی ذات کے لوگ اور برہمن دو اعلیٰ ذاتوں کے اتحاد کے نیچے پس رہے تھے۔ عروج پذیر تاجر طبقوں کو جین مت میں نئی حیثیتوں کو کرنے کا موقع نظر آیا اور اچھوت، برہمنوں کے جبر و تشدد سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی بھی متبادل کے لیے بے تاب بدھ مت نے ترقی زیادہ کی اور اس کی ترقی کی اصل وجہ اس کی جاگیردارانہ معاونت تھی۔ خصوصاً موریہ راجا اشوک۔ اشوک ایک بہاری تھے جنہوں نے اپنی حکومت سارے برصغیر میں پھیلا دی اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب برہمن ازم ویدانت دونوں کے یکسر معدوم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

اس صورت حال میں برہمنوں کا ردعمل تغیر اور بقا تھا۔ رومیلا تھاپر نے اپنی کتاب (اے ہسٹری آف انڈیا، پینگوئن ۱۹۶۹ء) میں اس ارتقائی عمل کو یوں بیان کیا ہے: "ان تمام صدیوں کے دوران برہمن ازم تبدیلیوں اور ترمیم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور نہ ہی بدھ مت اور جین مت سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکا۔ کچھ ویدک دیوتا خاموشی کے ساتھ گمنامی میں چلے گئے اور کچھ نے مزید خصوصیات کے ساتھ نئے دیوتاؤں کی شکل میں جنم لیا۔ یہی تھا جب برہمنی مذہب نے وہ خدوخال حاصل کیے جو آج ہندو ازم کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس پر اسے ہندو ازم کہنا ایک تاریخی غلطی ہوگی کیونکہ یہ اصطلاح دراصل آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کی را ہوئی تھی جو وہ ہندوستان کے رائج مذہب اور شیو اور وشنو کی عبادت کرنے والوں کے لیے استعمال کرتے ہندو ازم کی بنیاد کسی وحی یا الہام کے نتیجے کے طور پر کسی تاریخی شخصیت نے نہیں رکھی۔ یہ کوئی الہامی مذہب ہے۔ یہ مختلف النوع مسلکوں اور عقاید سے پیدا ہوا اور پروان چڑھا جن میں کچھ تو ویدک مذہب سے مستعار کچھ وہ مقبول عام مسلک تھے جو اس ترقی یافتہ مذہب سے منسلک ہو گئے تھے کیونکہ برہمنوں کو عوام میں مقبول اور رسومات کو اپنے مذہب میں بطور رعایت جگہ دینی پڑی تھی۔"

ہندو دھرم لاتعداد عوامل سے مل کر ایک مخصوص دھرم کی شکل میں وجود میں آیا۔ برہما خالق، وشنو اور شیوا تباہ کرنے والا۔ اس تثلیث سے ایک باقاعدہ نصاب بنا لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں دیوتاؤں کی عظیم حیثیت تھی۔ جیسے ایک ایک بھی ان کے لاتعداد پیرو ہوئے ان ہی کے گرد ہندوؤں کے دو اہم فرقے میں آئے ہندو دھرم۔ ایک دیوتا ماننے کے گرد عقائد کی مرکزیت کی وجہ سے ایک دیوتائی کی طرف بڑھ رہا بھگوان اور عبادت گر کے درمیان جائز کو لیے یعنی برہمن کو ناپسند کرنے کا جو رجحان لوگوں میں تھا وہ عوام کو خیال اور ایک نئی سمت کی طرف لے گیا۔ جو ملک پر بڑا گہرا اثر ڈالنے والی تھی یعنی بندہ اور بھگوان کے درمیان ایک

ور انفرادی رشتے یا پرہیزگاری یا بھگتی کا خیال۔ برہمن اور رسوم کی اہمیت کو اس طرح کم کرکے ہی ہندو دھرم بدھ مت
ے چیلنج کا مقابلہ کرسکا۔ ہندو دھرم کی آخری اور قطعی فتح کا اظہار اس وقت ہوا جب بدھ دھرم کی شکست ہوئی اور بدھ
و وشنو کی نوی تجسیم نو قرار دیا گیا جو انسان کی شکل میں وقتاً فوقتاً دنیا کو برائیوں سے بچانے کے لیے آسمانوں سے زمین پر آتا
ے۔ حال ہندو دھرم کو درپیش سب سے بڑے خطرے کے تدارک کے لیے یہ سودا سستا تھا۔
۔ بدھ مت ہی کی کامیابیاں تھیں جو آج بھی ہندوستان کی ان اقلیتوں پر منڈلاتی رہتی ہیں جنھیں ایک غیر متعین ہندو
ثقافت کی گود میں رہنا ہے۔ یہی سبب ہے جو اقلیتی لیڈروں کو اپنی شناخت اپنی علامتوں اور اپنے سماجی قوانین کو
ئی رکھنے کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ چوکس بنائے رکھتا ہے۔ یہ لوگ اس قوت جذب سے سہمے رہتے ہیں
یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غلامی اور ماتحتی کے بجائے دھیرے دھیرے ختم کرنے کے اصول پر کاربند ہوتا ہے اور
زائی کو اور تیکھا اور مشکل بنا دیتا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ آٹھویں دہائی کے سکھ بحران کے پیچھے یہی
سبب کارفرما ہے۔

۴

ایک عقیدہ اور دو مذہب

اس میں وقت بھی لگا اور درد اور کوشش کی ضرورت بھی پڑی۔ لیکن "قانون کے پہیے کی گردش" کے مظہر پر پہلے وعظ اور سارناتھ کے ہرن پارک میں ہونے والے الہام کو جس کی تبلیغ مہاتما بدھ نے سب سے پہلے اپنے محض پانچ چیلوں کے سامنے کی تھی، بالآخر ہندوازم نے تحلیل کر لیا۔ عرب کے ریگستانوں میں بی بی آمنہ اور عبداللہ کے بیٹے محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی کا ہضم کرنا نسبتاً زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اسلام کا پیغام ۶۱۰ء میں آیا اور ۶۲۲ء تک محمدؐ کو مفاد پرستوں کے غیض و غضب سے بچنے کی خاطر اپنی جائے پیدائش مکے کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ دو سال بعد بدر کے مقام پر ہونے والی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جانے والی اہم جنگ میں فتح نصیب ہوئی مگر ۶۳۰ء میں یہ ہوا کہ شہر مکہ نے نئے عقیدے "اسلام" کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۶۳۲ء میں حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا۔ مگر ان کا پیغام طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ محض گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار تھی مگر ایک سو سال کے اندر اندر اسلام کی فوجیں، مغرب میں پیرس کی طرف جانے والی سڑکوں پر تھیں اور مشرق میں چین کے دروازوں پر۔ عرب تاجر عقیدے کو مالابار کے ساحل پر لائے اور رسولؐ کے انتقال کے دس برسوں کے اندر یہاں اور مغربی ساحل کے مختلف مقامات پر لوگوں نے مذہب تبدیل کیے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مالابار کے مسلمانوں کے لیے آج بھی "موپلا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ موپلا (مہاپلائی) ایک مرکب مشتق ہے جس کا ترجمہ "عظیم بچہ" کیا جا سکتا ہے نویں صدی عیسوی میں، عام عقیدے کے مطابق خود مالابار کے راجہ نے اسلام قبول کیا۔ وہاں اسلامی فوجیں نہیں تھیں، اس لیے اتفاق سے، تبدیلی مذہب کے لیے کسی جبر و تشدد کا سوال نہیں اٹھتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قبضہ اس وقت حاصل ہوا جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے بلوچستان سے گزر کر سندھ کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ مگر عرب کوششیں، سندھ کے سرحدی ریگستانوں پر آ کر رک گئیں۔ مسلمانوں کے ان حملوں کو جنہوں نے شمالی

ستان کی عام آبادی، تہذیب، سیاست اور انتظامیہ پر ان مٹ اور راسخ نقوش مرتب کیے ایک ایسے شخص کے
ں سے تقریباً ڈھائی سو سال بعد شروع ہوتا تھا جس کا نام آج بھی جذبات میں تہلکہ مچا رہا ہے۔ ہندوستان میں وقت
م کا کام نہیں کرتا۔

یہ شخص تھا محمود غزنوی، ایک ترک جس کے باپ نے اس مقام پر اپنی حکومت قائم کی تھی جسے آج افغانستان
ے کہا جاتا ہے۔ حکمرانی کی اس کی توقعات مرکوز تھیں وسط ایشیا پر، مگر چونکہ افغانستان انتہائی بنجر علاقہ تھا، اس کے
۔ بنا رخ ایک ایسے ملک کی طرف ہونا ناگزیر ہو گیا جس کی دولت خود اس کے پڑوسیوں میں رشک و حسد کے جذبات بیدار
رتی تھی۔ ۱۰۰۰ء کے بعد وہ تقریباً ہر سال ایک انتہائی تربیت یافتہ اور برق رفتار فوج کی معیت میں جنوب میں وہاں
تک گیا جہاں تک وہ جا سکتا تھا۔ لوٹا جتنا وہ لوٹ سکتا تھا اور پھر اسی برق رفتاری سے واپس ہوا۔ اور افغانستان اور
رت تو یا وسط ایشیا میں مزید علاقوں کو فتح کرنے کی کوششوں میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے دس برسوں کی لوٹ مار میں اس
ے پنجاب کے ملتان جیسے اہم شہروں اور مرفہ حال کسانوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ ۱۰۱۰ء تک اس پر یہ حقیقت منکشف
ہوئی کہ اصل دولت ان شہروں میں ہے جہاں مندر ہیں بلکہ خود مندروں کے اندر ہے۔ جو عوام سے سونے اور نقد کی
شکل میں نذرانے اور چڑھاوے پاتے ہیں۔ ۱۰۲۶ء تک محمود نے مندروں اور متھرا، قنوج، تھانیسر جیسے مندروں
ے شہروں کو لوٹا اور بالآخر گجرات کے ساحل پر واقع ان میں سب سے مالدار مندر سومناتھ کو تاراج کیا۔ محمود غزنوی اپنی
سرزمین کو چونکہ اس لوٹ مار کی وجہ جواز نہیں بنا سکتا تھا اس لیے اس نے مندروں پر اپنے ان حملوں کو مذہبی
رنگ دیا۔ ایک اہل ایمان "مشرکین کے بتوں کو توڑ رہا تھا" اس کی اس لوٹ کھسوٹ اور سومناتھ کے مندر کی بے حرمتی
آج بھی متعصب ہندوؤں کے لیے نعرۂ جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہرحال یہ ایک دوسرا ہی فرد تھا جسے ہندوستا
پائیدار اثرات چھوڑنے تھے۔ یہ غوریوں کا افغانی قبیلہ تھا۔ محمد غوری بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں آیا، رو
سردار پرتھوی راج کو ۱۱۹۲ء میں ترائن کی دوسری جنگ میں شکست دے کر قتل کیا اور دہلی میں وہ حکومت قائم کی جو
سلطنت کے نام سے جانی گئی۔ دہلی پر مسلم حکمرانی کے اس دور کو ساڑھے سات سو سال تک چلنا تھا
ملک کے مانے ہوئے سیاسی مرکزوں میں جاگیردارانہ بارسوخ شخصیتوں کی عدم موجودگی ممتاز (اعلیٰ) ہمد
ے لیے کسی حد تک بے بسی اور بے چارگی کا سبب رہی ہے۔
جاگیردارانہ طاقتوں کے مختلف گروہوں نے جنھوں نے اقتدار کی خاطر تمام ہتھیاروں یہاں تک کہ مذہب
ہتھیاروں سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ عروج و زوال کی کہانی کے بجائے ہندو قوم پرستوں اور بدیسی مسلم حملہ آوروں کے حوا

سے اس برصغیر کی تاریخ مرتب کرنا دراصل ایسی بے بسی اور بے چارگی کا ردِ عمل رہا ہے۔ بعد کو یہاں آنے والوں نے حالانکہ وہی راستے استعمال کیے جو ان سے پہلے سفید چمڑی کے آریاؤں نے استعمال کیے تھے مگر آریہ نہیں بعد میں آنے والے بدیسی کہلائے۔

ظاہر ہے کہ ترک، افغان اور ترک منگل حملہ آور پہلے لوٹ کھسوٹ کے لیے آئے اور بعد کو حکمرانی کرنے لگے۔ نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے یہاں مقامی آبادی سے اتحاد کیا ان کی اطاعت حاصل کی جس نے ان کو سلطنتیں قائم کرنے اور ایسے انتظامی ڈھانچے کھڑے کرنے کے لائق بنایا جنھوں نے نئے ہندوستان پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ شکست کے بعد بھی وہ ہندوستان میں ٹھہرے رہے۔ حملہ آور اور آباد ہونے والوں کا فرق بابر اور تیمور کے رویّوں سے بڑا صاف سامنے آتا ہے۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے شمالی ہندوستان کی جاگیردارانہ طاقتوں کو تباہ و برباد کیا۔ اس کی فتوحات اور لوٹ مار کا اختتام دہلی میں تباہی و بربادی اور اتلافِ جان کی شکل میں ہوا۔ ملک کو تاراج کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ اس کا خلف بابر جو سوا سو سال بعد آیا اس نے اپنے سپاہیوں کو یہ سمجھایا کہ ہندوستان اب ان کا نیا گھر ہونا ہے۔ دہلی کو کبھی کسی آباد ہونے والے نے لوٹا اور برباد نہیں کیا۔ یہ کام تو صرف تیمور، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مغلوں کے ساتھ کیا۔ ہر مصیبت کا شکار مسلم طبقۂ امرا ہوتا تھا اور اس کی وجہ بھی تھی۔ حکومت اور دولت میں ان ہی کا حصہ سب سے بڑا تھا۔ تیمور نے ترکی سلطنت کو تباہ کیا اور نادر شاہ ابدالی اور انگریزوں نے زوال پذیر مغلوں کو ختم کیا۔ انگریز ۱۹۴۷ء میں واپس گئے جب کہ ٹکڑوں کے پچھلے معمار ترک، افغان یا منگل اپنے آبائی ملکوں کو کبھی واپس نہیں ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے ۱۵۰۰ قبل مسیح میں آریوں کی طرح وطن کا تصور ہی کھو دیا تھا۔ کٹر ہندوؤں نے یہ بات ثابت کرنے کی حماقت کی حد تک کوشش کی ہے کہ آریہ مسلمانوں کی طرح ہندوکش کی پہاڑیوں کو پار کر کے یہاں نہیں آئے۔ ان میں ایک نے تو انتہائی سنجیدگی سے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ قطبِ شمالی کا وہ علاقہ جس سے آریہ اپنے ترکِ وطن کے سفر پر نکلے تھے۔ ایک زمانے میں دنیا کے الٹ پلٹ ہونے سے پہلے ہندوستان کے بیچ میں واقع تھا۔ بدیسی اور دیسی مذہب (عقاید) کے نظریے کا پرتو پنجاب کی صورتِ حال میں بھی ہے چونکہ سکھوں پر بدیسی ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، معکوس منطق کے سہارے ان کے مذہب کو ہندوازم کا حصّہ بنایا جاتا ہے۔

تیمور نے شمال میں کوئی مضبوط حکمران نہیں چھوڑا، مرکز منہدم ہو گیا اور اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والی

ترہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بدترین پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا، دو حریف مذہبوں کے باہمی تعلقات پر رائے
رتے ہوئے عالم شارلوٹ میٹ کے آر تراین اپنی کتاب "الیسیز اِن انڈر اسٹینڈنگ" (صفحہ ۲۷، حکومت ہند کی
کی ہوئی) میں لکھتے ہیں "ہندوستان میں اسلام کی کہانی نہ تو کسی ایسی زبردست عسکری قوت کی کہانی ہے جو ایک
تہذیب پر چھا گئی ہو اور نہ ہی پرانی تہذیب کے اسے نگلنے اور ہضم کرنے کا قصہ ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک
مل رہا ہے باہمی صلح پسندی اور باہمی رواداری کا جس میں بیچ بیچ میں دشمنی اور کش مکش کے دور آتے رہے۔
رہویں صدی کی طرح، پندرھویں صدی بھی ایک طوفانی صدی تھی جس میں اعلیٰ طبقے کی سطح پر کش مکش شروع ہوئی۔
روں کر جاگیر دار سرپرستوں نے عوام کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا تھا اس لیے یہ کش مکش عوام کی سطح تک سرایت کر گئی۔
م حکمراں جو تیمور کے خالی کیے ہوئے خزانوں کو بھرنے کے لیے بے چین تھا، مذہب کے نام پر کافر ہندو تاجر پر حملہ آور
ا ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے جواب دیا۔ خشونت سنگھ نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف سکھس" (آکسفورڈ یونیورسٹی
پریس جلد اول، صفحہ ۲۹) میں گرو نانک کی ایک عبارت کا بڑا موثر اقتباس نقل کیا ہے " زمانہ ایک چاقو کی طرح ہے،
تاہ قصائی ہے۔ مذہب نے پر لگائے اور اڑ گیا، کذب کی اندھیری رات چھائی نہیں دیکھ پا رہا ہوں کہ سچ کا چاند
یاں اور کدھر طلوع ہو رہا ہے۔ ...... یہ نانک اور کبیر جیسے ولی اور بزرگ ہی ہوں گے جو کذب کی اندھیری رات
نے بعد روشنی فراہم کریں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تلواروں کے ٹکراؤ کے ساتھ ساتھ خیالات و نظریات کا خلط ملط بھی تھا اور بالکل اسی
دح جس طرح حملہ آور کی تلوار بالآخر بدیسی نہ رہ کر ہندوستانی تلوار ہو گئی، اسلام خود بھی ہندو ذہن اور ہندو رسوم و
رواج سے متاثر ہوا اور انھیں بھی متاثر کیا۔ ہزار سالہ عہد کے اختتام پر ایک زبردست ہندو احیا شروع ہوا جس کی
قیادت خاص طور پر کیرالا کے ایک برہمن شنکر نے کی۔ انھوں نے سارے ملک کا سفر کیا اور مغربی گھاٹ پر دوارکا میں
ہمالیہ میں بدری ناتھ، اڑیسہ کے مشرقی ساحل پر پوری اور شمال میں سری نگر میں ادارے قائم کیے۔ انھوں نے برہمنوا
ل رسوم کو چیلنج کیا اور الوہیت کی ثنویت کی تردید کی اس سلسلے میں اپنے عقاید کے جواز میں انھوں نے اپنشد کا استعما
کیا اور بہت ممکن ہے کہ ان پر اسلام کا اثر بھی ہو رہا ہو۔ یہ شنکر ہی تھے جنھوں نے بدھ مت کی قطعی ہزیمت میں بہت
مدد کی۔ عبادت کرنے والے اور خدا کے درمیان شخصی رشتے کے تصور نے بھکتی کی تحریک کی شکل میں بڑا
فروغ پایا۔

پندرھویں صدی ایک سیاسی دلدل تھی اور اس سے ہندوستان کو بچایا حقیقی معنوں میں ایک انٹلیکچوئل نشا

تحریک نے جو مردوں اور عورتوں کے ایک ایسے گروہ کو منظر عام پر لایا جنھوں نے ہندوستانی شعور پر ایک اَنمٹ چھاپ چھوڑی جن کے گیت عوامی زندگی کا حصہ ہیں۔ جن کا پیغام اگرچہ اب وہ اعتقادی اصولوں میں مدغم ہو چکا ہے، اب بھی ، ہندو قومی خصوصیت کو کٹر پن کی طوفانی لہروں سے بچانے میں ایک بند کا کام کرتا ہے۔ بھگتی کی تحریک نے بُت کو ختم نہیں کیا مگر ہندوؤں کو برہمن ازم سے بچا ضرور لیا۔ اس تحریک کا ایک مثنیٰ اسلام میں صوفیاء کے پیغام میں ملتا ہے جو مذہبی رہنماؤں یعنی علماء (جن کا ہندو متبادل یقیناً برہمن ہوگا) کے مقابلے میں صحیح معنوں میں عوامی لیڈر رہے۔ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، فرید گنج شکر، نظام الدین اولیاء اور علی مخدوم جیسے اولیا کے مزارات اجمیر، دہلی، لاہور اور پاک پٹن میں آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مقدس زیارت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علماء کی کوششوں کے مقابلے میں، ان مذہبی لیڈروں نے اختلافی عناصر کے بجائے مشترک عوامل پر زور دے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سماجی ہم آہنگی کی تبلیغ کی اور اس کے لیے کوشاں رہے۔

آسام میں شنکر دیو، بنگال اور اڑیسہ میں چیتنیہ مہاپربھو، شمال میں رامانند، راجستھان میں میرا بائی، سندھ میں سادھنا، مہاراشٹر میں تکارام، نام دیو اور رامانند، جنوب میں ولبھ سوامی تھے لیکن ان سب میں عظیم ترین دو ہم عصر (زمانہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب جتنے کہ مہابیر اور گوتم بدھ تھے) جنھوں نے تیمور کے عہد کی صدی کے گیتوں کے درمیان، خدا کی وحدت، عبادت گزار کی ریاضت اور لگن اور گرو یا مرشد کے اہم رول پر مبنی مذہبوں کو پروان چڑھایا۔ یہ دو ہم عصر تھے کبیر (۱۴۴۰ - ۱۵۱۸) اور گرو نانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۹) انھوں نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش جھوٹی ہے کیونکہ خدا تو ایک تھا۔ نانک نے کہا کہ "جھوٹ کا بول بالا ہے۔ مسلمان ملّا اور ہندو پنڈت اپنے فرائض کو بھول گئے ہیں۔ شادی کے عہد نامے شیطان پڑھتا ہے۔" کبیر نے اپنے آپ کو اللہ اور رام کا بچہ کہا اور چار سو برس سے زیادہ عرصے کے بعد گاندھی نے یہی تشبیہیں استعمال کیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی اپنی کوششوں میں کبیر کے گیت گائے۔

کبیر ایک ناجائز اولاد تھے اور ان کے رضاعی باپ ایک جولا ہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ مسلم پیدا ہوئے۔ کبیر ہندوستان میں آج بھی ایک مسلم نام کی حیثیت سے رائج ہے۔ بہرحال کبیر محض ایک مصلح نہیں۔ انھوں نے ایک باقاعدہ نظام کبیر پنتھی کی بنیاد ڈالی جس کی حیثیت ایک نئے مذہب کی سی تھی جس نے دونوں قدیم مذاہب سے کچھ مستعار لیا تھا اور کچھ نئے پہلوؤں کا اضافہ کیا تھا۔ سماجی طور طریقوں میں کبیر نے اپنے مذہب کے ماننے والے سارے عقیدت مند دستکاروں اور کاشتکاروں میں، اگرچہ ان کے نظریات و خیالات زندہ رہے مگر ان کے

ب کو مرکبتی۔ ہندوازم نے ایک اور خطرے کو ٹال دیا تھا۔

گرو نانک ۱۴۶۹ء میں، لاہور سے جو اب پاکستان میں ہے، چالیس میل دور ایک گاؤں تلونڈی رائے بھوئیں
ہوئے، وہ گاؤں کے ایک خزانچی، مہتا کلیان داس بیدی کے بیٹے تھے انھوں نے ہندی ایک پنڈت سے اور
رسی اور عربی ایک ملا سے پڑھی۔ بارہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی اور ۱۹ برس کی عمر پر وہ بیوی کے ساتھ رہنے لگے
ے دو لڑکے ہوئے۔ (سری چند کی پیدائش ۱۴۹۴ء میں اور لکشمی داس کی پیدائش ۱۴۹۷ء میں ہوئی) ۱۴۹۹
انھوں نے اپنے مشن کا اعلان کیا "نہ کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان" انھوں نے بھگتی روایت کے مطابق اپنے
یت لکھے تحریک کی کچھ اصطلاحات آج سکھ ازم میں سنی جا سکتی ہیں مثال کے طور پر سنت کا لفظ آج بھی سکھ
مذہبی لیڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے بھگتی تحریک کے مرد لیڈر جیسے تکارام سنت کہلاتے تھے جس کا مطلب
دینی اور سیکولر ہوتا ہے۔ (آج جن چند ناموں کے ساتھ یہ لقب لگایا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ان میں لیاقت

۔ پیشواری بھی ہو)

نانک اور کبیر کے فلسفوں میں یقیناً فرق تھا۔ دونوں خدا کو مختلف ہندو اور مسلمان روایتی ناموں سے پکارتے
تھے (سکھوں کا گووند، ہری، سندر کہا جاتا ہے جو خدا کا ایک ہندو نام ہے) مگر نانک ایک کٹر اور سخت توحید
پرست تھے انھوں نے خدا کو ست کرتار کا نام دیا جس کے معنی ہوتے ہیں، خالق حقیقی، سچائی خدا ہی ہے۔ مزید اور
بڑی اہمیت کی حامل حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے پیروؤں کو خصوصی اصول دیئے جنھیں سکھ اپنے روزمرہ کے عمل
میں تبدیل کر سکتے تھے نام (لفظ) دان (خیرات) اسنان (صفائی) سیوا (خدمت) اور سمرن (عبادت)۔ انھوں
نے ایسے ادارے بنائے جن کے ذریعے ان کے ماننے والے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کر سکتے تھے انھوں نے ذات
پات جو اب گردوارہ لنگر۔ کے تصور سے، یا جس کا مطلب گرو کے نام پر کھانا، جو گردوارہ سے ملتا ہے اور
سب کو اس کی ذات پوچھے بغیر دیا جاتا ہے۔ آپ نے ایک بار مختلف ذات والوں کو ایک ساتھ کھانے پر بٹھا دیا تو ذا
چاہیے خود بخود ختم ہو گیا جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ سکھوں میں ذات پات اب بھی رائج ہے گو ملانے اور جھو
بات کی منزل تک نہیں پہنچی اس کا اثر اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ شادی بیاہ تک محدود ہے
مگر یہ سب کچھ شاید نانک جانشینوں کو کبیر کے جانشینوں کے جیسے تباہ سے بچا سکتا اگر انھیں ... ل ت ا ل
... پال مل گیا ہوتا۔

۴

پنجاب اور دہلی کا مقابلہ

سکھوں کا پہلا وطن

گرونانک نے ۱۴۹۹ء میں اپنے مذہبی مشن کا اعلان کیا اس کے تقریباً ۲۵ سال بعد مغل بابر نے دہلی پر افغان لودھی کی انحطاط پذیر سلطنت پر حملہ کیا۔ چھوٹی مگر بہتر قیادت اور زیادہ پرجوش مغل فوج نے ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت (دہلی کے شمال میں ۵۶ میل دور) کی مشہور پہلی لڑائی میں اپنے سے کہیں بڑی افغانی بادشاہ ابراہیم لودھی کی فوج کو شکست دی۔ دوسرے سال ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو کنواہا کی نسبتاً کم مشہور اور مگر اہم جنگ میں بابر نے لاکھ سپاہیوں کی افغان، راجپوت اتحاد کی فوج کو جس کی قیادت میوار کا رانا سانگا کر رہا تھا، شکست دی۔ اس سے پہلے کہ ۱۵۳۰ء میں اس کا انتقال ہوتا، بابر نے ایک عظیم سلطنت کی مستحکم بنیاد ڈالی۔ اس کے بیٹے ہمایوں کی غیر یقینی صلاحیتوں کی وجہ سے تھوڑا سا وقفہ انحطاط و زوال کا ضرور آیا مگر اکبر نے اپنے دادا کے خوابوں کو پورا کر دیا۔

دوسرے الفاظ میں، سکھ مذہب اور مغل قوت کا ساتھ ساتھ اور ایک جغرافیائی قربت میں فروغ ہوا۔ نانک کا پنجاب، شاہانہ دہلی کے بالکل شمال میں تھا۔ دونوں کا ایک دوسرے کا رابطے میں آنا، وہ چاہے پر امن ہو یا پر تشدد لازمی تھا۔ ابتدا میں تعلقات یکسر خوشگوار تھے مگر جوں جوں سکھوں کی طاقت بڑھتی گئی دوستی میں کمی ہوتی گئی۔ حقیقتاً ہوا یہ تھا کہ پہلی طویل جنگ جو سکھوں نے لڑی اور جس نے بکھیر پنتھیوں کو منظم کر لیا تھا وہ سکھوں نے مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ ان مسلمانوں سے لڑی تھی جو سلطنت کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہ جنگ شروع بھی کسی وجود کے تحفظ کی لڑائی کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی یہ تو بہت سی شرارتوں کا نتیجہ تھی۔ علاقائی ہوس اور جاگیردارانہ طور طریقوں کے ٹکراؤ

ے اس کا انجام بھی ویسا ہی کیا۔ سکھوں اور مغل سلطنت کے مابین جب تک رشتہ ایک نئے مذہب اور ایک نئی قوت کا رہا، اس وقت تک تعلقات غیر معمولی حد تک دوستانہ رہے۔ یہ تو جب سکھوں نے ایک جغرافیائی علاقہ کی تلاش شروع کی جس کا نیا مذہب سلامتی کے ماحول میں پروان چڑھ سکے اس وقت جنگ نے موت اور زندگی کی کشمکش کا رنگ اختیار کیا۔ قدیم سلطنت کسی دوسرے کو بغیر لڑے عروج کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھی اور نئے مذہب کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ بغیر ایک محفوظ وطن کے وہ بھی کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ نانک کے بعد نو گرو اور ہوئے۔ آخری گرو، گرو گوبند سنگھ نے گروؤں کے نظام کو جو خود جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں میں ملوث ہو چکا تھا ختم کر کے اپنے مذہب کو بچایا۔ گرو کو اپنا جانشین منتخب کرنے کا حق تھا جیسے جیسے سکھ علاقہ حاصل کرتے گئے ویسے ہی ویسے گرو روحانی کے ساتھ ساتھ دنیاوی ہوتے گئے اور پیچیدہ جانشینی کے بارے میں فیصلہ کن جنگیں شروع ہو گئیں۔ بہرحال اس وقت تک سکھ کچھ کامیابیاں حاصل کر چکے تھے۔ مثال کے طور پر یہ کہ گرو نانک کے پہلے جانشین گرو انگد تھے جنہوں نے سکھوں میں الگ شناخت قائم کرنے کے لیے ایک مختلف رسم خط گورمکھی متعارف کرایا اور گرو نانک کے سارے مذہبی گیتوں کو اس رسم الخط میں منتقل کیا۔

دہلی اور نیا مذہب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ یہ بات اس وقت بالکل ظاہر ہو گئی جب اکبر سکھوں کے تیسرے گرو امر داس سے ملاقات کرنے گیا اور ان کے لیے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر حکم دیا کہ مست... ... سے حاصل ہونے والا لگان گرو کی بیٹی بھانی کو اس کی شادی کے تحفے کے طور پر دے دیا جائے۔ ان کے دوسرے گرو رام داس کو شہنشاہ اکبر نے پانچ سو بیگھے زمین کا عطیہ دیا جس پر آج ان کا مقدس شہر امرتسر بسا ہوا ہے، وہ جگہ ہے جہاں سکھوں کے پانچویں گرو ارجن نے ہری مندر یا گولڈن ٹیمپل کی تعمیر کی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان بہت دوستی تھی۔ خود گولڈن ٹیمپل کی بنیاد لاہور سے مدعو کیے ہوئے ایک مسلمان میاں میر نے رکھی ... ارجن کی وزارت کے ۲۵ برس میں گرنتھ صاحب کی تدوین مکمل ہوئی اور سکھ مذہب ... ہو گئے ... اور ملاؤں کے عقیدے ... کے ... ہونے لگے اور عوام نے ارجن کو سچا بادشاہ کے نام سے پکارنا شروع کیا

مسائل اس وقت سے پیدا ہونے شروع ہوئے جب گرو ارجن قوت کی ... سے ... اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اپنے ... اور ... کے ساتھ گرو ارجن مغل ... کے ... سے ... ہو گئے۔ انھوں نے جہانگیر کے بیٹے خسرو کی بغاوت کی حمایت کی، اگر خسرو کامیاب ہو جاتا ... ارجن ...

کے دربار میں چاند اور سورج کی مانند ہوتے، قدر دانی اور انعام یقینی تھے اور ہو سکتا تھا کہ راجپوت مغل اتحاد کی طرح مغل اتحاد بھی وجود میں آجاتا۔ اس سب کے بجائے انھیں جہانگیر کا غم و غصہ دیکھنا پڑا جس کی شدت اور ظلم کا اظہار واں نے کیا ہے۔ گرو ارجن کے دشمنوں کو خصوصاً مذہبی رہنماؤں کو اس ابھرتے ہوئے شخص کو تباہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ سکھ تاریخ گرو ارجن کو اذیت پہنچانے والوں میں ایک نام ایک ساہوکار چندو شاہ کا لیتی ہے جس کی کی شادی گرو ارجن نے اپنے لڑکے کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ گرو ارجن کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور ۱۶۰۶ء میں قید میں ہی ان کی موت واقع ہوئی۔ گرو ارجن کی شہادت اور بعد کو اورنگ زیب عہد میں نویں گرو تیغ بہادر (جنھوں نے ایک مسلمان فقیر حافظ آدم کے ساتھ مل کر لوگوں سے نذریں وصول کرنا شروع کر دی تھیں) اور دسویں گرو گوبند سنگھ کے دو لڑکوں کا قتل مسلمانوں کی طرف سے سکھوں کی نفرت کی علامت بن جو تین سو سال تک چلتی رہی۔

جاگیردار طبقے کے اسلحہ خانے میں ایک مزید ہتھیار مذہب تھا جسے ایک بادشاہ، اپنی ضرورتوں کے پیش نظر لیے گئے فیصلوں کے مطابق بیش و کم کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا۔ تاریخ کے ساتھ مشکل در یادداشت کی ہوتی ہے حقائق کی نہیں۔ واقعات کی ایک شعوری طور پر منتخب کی ہوئی تصویر عوامی ذہنوں میں حکمران کے مفادات کی تکمیل کے لیے بٹھا دی جاتی ہے۔ اس کوشش میں وہ حلقہ زیادہ کامیاب ہوتا ہے جس کے پاس ضروری پروپیگنڈے کے لیے ہراول دستے کے طور پر تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ ایسی جزوی تاریخ سکھ نفسیات میں بھی ڈالی گئی خصوصاً ۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں جب ہندو احیا پرست، مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ کی تشکیل کے لیے بے چین تھے۔ پاکستان کے وجود میں آنے تک، یہ صورت حال، سکھ قیادت کے لیے بڑی سازگار رہی اور سکھوں کے ذہنوں پر گرو تیغ بہادر کے کٹے سر سے بہتے ہوئے خون اور اس سے زیادہ بڑھ جانے والی گرو گوبند سنگھ کے دو معصوم بچوں کے قتل کی تصویریں نقش ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد انگریز بھی بدمعاشوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ باقی کی تمام رقابتیں پس پشت ڈال دی گئیں جیسے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی یہ ذرا مختلف جیسی شرارت کرنے والا اب ہندو ہے۔

پہلے سکھ لیڈروں نے مسلمانوں اور مسلم جاگیردارانہ مفادات کے باہمی امتیازات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ گرو گوبند سنگھ، سکھوں کے ایک زبردست سپاہی ہیرو تھے جن کے والد دربار سے مغل ظلم کا شکار ہوئے تھے لیکن خود کی فوج میں مرکزی حیثیت پانچ سو مسلمان پٹھانوں کی تھی۔ ایک موقع پر جب مغل فوجی دستوں نے انھیں گھیر لیا تھا،

جان ان کے دو پٹھان وفاداروں نے اس طرح بچالی کر کر انھیں پردہ پڑے ہوئے ایک فینس میں بٹھا کر مغل محاصرین
سے یکھ کر نکال لے گئے کہ وہ اس فینس میں اپنے پیر صاحب کو لیے جارہے ہیں۔ یہ شاذونادر ہی ہوتا تھا کہ سکھ فوج
ور مسلم فوج کے درمیان کوئی براہ راست مسئلہ پیش آئے۔ اورنگ زیب نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے جو افواج بھیجیں
گرچہ ان کی قیادت سرہند کا صوبے دار وزیر خاں کر رہا تھا مگر اس میں راج پوت بھی تھے۔ مثال اس دستے کی دی جا
سکتی ہے جس کی قیادت راجہ باس پورنے کی تھی۔ اسی وزیر خاں کا سب سے زیادہ معتمد مشیر اس کا ہندو دیوان سچانند
تھا جس نے گرفتاری کے بعد گرو گوبند سنگھ کے دونوں لڑکوں کو قتل کرنے کے لیے وزیر خاں پر زور ڈالا تھا (اسی لیے
سکھوں کے لیڈر کی حیثیت سے گوبند سنگھ کے جانشیں بندا بہادر نے جب ۲۴ مئی ۱۷۱۰ء میں سرہند پر قبضہ کیا تو
سچانند اس کا خاص نشانہ تھا) گرو گوبند سنگھ، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کے دوست تھے اور انھوں نے
جانشینی کی جنگ میں اس کی مدد کی تھی۔ انھیں بہادر شاہ کے دربار میں اعزاز بھی ملا تھا وہ اس وقت تک شاہی
افواج کی معیت میں رہے ـــ جب تک کہ ان کے پٹھان سرپرست نے انھیں قتل نہیں کیا تھا۔ اسے اتفاق ہی
سمجھیے کہ یہ پہلا موقع تھا جب سکھوں نے مغلوں کی جانشینی کی لڑائی میں صحیح انتخاب کیا تھا اس سے پہلے انھوں نے
اورنگ زیب کے بھائی دارا شکوہ کی مدد کی تھی اور اس طرح عالمگیر کی خفگی مول لی۔ تاریخ بالکل دوسری ہوتی اگر گرو
گوبند سنگھ کو حاسد وزیر خاں کے، جو مغل بادشاہ پر گرو کے اثرات سے سہما ہوا تھا، زرخرید قاتلوں نے قتل نہ
کر دیا ہوتا۔

عظیم سکھ مہاراجہ، رنجیت سنگھ نے سب سے پہلے جن تین ماہرین فن کو تنخواہ پر رکھا تھا وہ تھے بخارا کے
رہنے والے تین بھائی عزیز الدین، امام الدین اور نور الدین۔ ان سے موخر الذکر رنجیت سنگھ کا ذاتی طبیب (طا
شہ کر یہ عہدہ انتہائی معتمد آدمی ہی کو دیا جا سکتا تھا) بھی بنا۔ عزیز الدین وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا اور را
سے بھی زیادہ یہ کہ مہاراجہ کے قریب ترین دوستوں میں اس کا شمار ہوا۔ اس نے رنجیت سنگھ اور اس کے بعد ا
کے جانشیں کھڑک سنگھ دونوں کا زمانہ دیکھا۔ رنجیت سنگھ کے توپ خانے کا عملہ بھی مسلمان تھا جس کی قیادت غوث
خاں اور شیخ الٰہی بخش کرتے تھے۔ اول الذکر کہا ہے جو روایتوں میں میاں غوثا کے نام سے مشہور ہے ۸۶۹
ء میں انگریزوں اور سکھوں کی فیصلہ کن جنگ جس میں سکھ سلطنت کا خاتمہ ہوا، بعض سکھ فوجوں کی جنگ جیسی لگتی جو انھو
کے انگریز افسروں اور ان کے بنگالی سپاہیوں کے خلاف لڑی تھی بلکہ خود انگریزوں کے قول کے مطابق پہلے مسلما
ور تھی۔ اس بات کا بالکل امکان ہے کہ لفٹننٹ جنرل سر جارج میس تاریخی تفصیلات کے سلسلے میں بہت

قابل اعتبار نہ ہوں۔ مگر رجمنٹل یادداشتوں کی صحت پر شبہ کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ انھوں نے اپنی کتاب "مارشل ریسیز آف انڈیا (تھل پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱۴) میں چلیان والا کے مقام پر انگریزوں کی فتح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "ہتھیار ڈالنے کا یہ قابل دید منظر تھا جب سکھ فوج کے نڈر اور جری سکھ اور مسلمان سپاہیوں نے سرخ وردی والوں کو سلامی دی، کمانڈر ان چیف کو سلام کیا اور میدان جنگ سے غمگین مگر زیادہ سمجھ دار ہو کر شکست خوردہ مگر باعزت رہ کر نکل گئے۔۔۔۔" پنجابی مسلمانوں کے علاوہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والی فوجوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے افغان بھی آئے۔ (شمالی پنجاب میں) گجرات کی جنگ میں امیر دوست محمد کا بیٹا سردار اکرم پانچ ہزار افغانیوں کا ایک دستہ لایا تھا۔ ایسی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور صرف سکھوں اور مسلمانوں سے متعلق ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان تعلقات کے سلسلے میں بھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تاریخ، عوام کی سطح پر آکر ان لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہو جاتی ہے جو ہندوستان کو پہلے سے زیادہ تباہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ عظیم مراٹھا سلطنت کے معمار شیواجی کو ہمیشہ ایک ایسے ہندو لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس نے اپنی ساری زندگی بدیسی حملہ آوروں سے اپنے مادر وطن کی حفاظت کی خاطر لڑتے ہوئے گزار دی لیکن شیواجی کو گرفتار کرنے اور اورنگزیب کے دربار میں لانے والا کوئی مسلمان کمانڈر نہیں بلکہ راجا جے سنگھ تھا جو ایک راج پوت سردار تھا اور ہندو سیاسی طبقے سے اپنے تعلق پر ناز کرتا تھا۔ ہندوستان خود اپنے ماضی کے بارے میں زیادہ سچائیوں کو جان لیتا تو شاید آج کے مسائل کچھ کم ہوتے۔

گرو گوبند سنگھ ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء کو شہید ہوئے اور یہ صرف انہی کا چھوڑا ہوا ورثہ تھا جس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ سکھ ازم ایک الگ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ انھوں نے سکھ تشخص کو ایک ظاہری شکل عطا کر دی۔ اگرچہ بالکل سیدھی سادی تکنیک تھی مگر تھی انتہائی موثر۔ گرو نانک نے اگر مواد فراہم کیا تو گرو گوبند سنگھ نے ہیئت یا شکل و صورت۔ ۱۶۹۹ء میں موسم بہار کے تہوار بیساکھی کا دن تھا، گرو گوبند سنگھ نے گرو نانک کے پیروؤں کو آنند پور آنے کا بلاوا بھیجا۔ انھوں نے اس دن معتقدین سے کہا کہ انھیں پانچ ایسے رضاکار چاہئیں جو اپنے مذہب کے نام پر ان کی تلوار سے اک لمحہ اور خود ان کے ہاتھ سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پانچ افراد جو اس قربانی کے لیے تیار ہوئے، وہ بہرحال مارے نہیں گئے اور ان کا نام "پانچ پیارے" رکھ دیا گیا۔ گرو کی بیوی نے شربت بنایا جس میں انھوں نے ایک دودھاری تلوار سے شکر ملائی۔ ان پانچوں کو یہ شربت پلا کر ان کا بپتسمہ کیا گیا۔ سنگھ (شیر) کا لقب ملا اور یہ خالصہ (پاک) کہلائے۔ فرقے کے یہ پہلے لوگ تھے جنھیں سکھ مذہب کے تحفظ اور اس کی بقا کو یقینی بنانے کے

ایک ایسے ملک کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی جس پر سکھوں کی حکمرانی ہوگی۔ انگریز خفیہ کے ایجنٹوں نے دہلی کے مغل دربار کو اطلاع دی تھی کہ اس دن بیس ہزار لوگ خالصہ بنے تھے) پانچ چیزوں سے خالصہ کی پہچان ہوتی تھی۔ کیس، کنگھا، کڑا اور کرپان اور یہ سب چیزیں انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا تھیں۔ سکھ جسے ہم آج اتنی آسانی سے پہچان لیتے ہیں وہ گرونانک کے تبلیغی کام کے آغاز سے دو سو سال بعد کی تخلیق ہے۔ "راج کرے گا خالصہ" کا جو نعرہ ہم سکھوں کی ہر ارداس کے وقت ہمیشہ سنتے ہیں اسی وقت سے شروع ہوا۔ نعرہ اپنی پوری شکل میں نیت کے سلسلے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

دلی تخت پر بیٹھے گی آپ گرو کی فوج
چھتر پھرے گا سیس پر بڑھی کرے گی نوج
راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کوئے
خوار ہوئے سب ملیں گے بچے سرن جو ہوئے

پنجاب کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں کو یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوئی کہ دہلی پر خود اپنے طور پر کوئی حکمرانی کرے چنانچہ انھوں نے اس نظم کو ممنوع قرار دے دیا۔ سکھ لیڈروں نے عام استعمال میں پہلی دو لائنیں حذف کر کے مصالحت کی۔ آخری دو لائنوں کے لیے انھوں نے یہ جواز پیش کیا کہ پاک 'خالصہ' کی صرف روحانی حکمرانی ہوگی دنیاوی نہیں۔ یہ ایک پرانی چال تھی ایک خواب کو خیال کہہ کر زندہ رکھنے کی۔ انگریزوں نے اسے اسی طرح رہنے دیا۔ یہ نعرہ آج بھی دہلی اور امرت سر میں دیواروں پر لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے اور سکھوں کی ہر ارداس کا ایک حصہ ہے۔

خالصہ لوگوں کو گرو گوبند کا ایک چیلا کٹر نو سکھ لچھمن داس، لیڈر کی حیثیت سے مل گیا اس نے اپنا نام بندہ بہادر یعنی جادر علام رکھا۔ ۱۹ جون ۱۷۱۶ میں اپنی حراست اور قتل تک بندہ نے خالصہ حملہ اتنا یا پنجاب کے کونے کونے میں پہنچایا تھا ان میں وہ مقامات بھی تھے جنھیں وہ محکوم کرنے کے بعد قبضے میں نہیں لے سکا تھا۔ اس کا اصل ہدف وہ لوگ تھے جنھیں وہ سکھ ازم کا خصوصی دشمن سمجھتا تھا۔ ان لوگوں میں سر فہرست نام مسلمانوں کا تھا۔ اس ساری کارروائی میں وہ انتہا درجہ تباہی و بربادی میں ملوث ہو گیا اور عوام کو خصوصاً مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنا دست نگر بنا دیا

اٹھارویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک غیر مطیع اور شورش کا عہد رہا ہے۔ ایسے حالات میں مغلوں کے علاوہ کوئی بھی حکومت کہیں جلدی ختم ہو گئی ہوتی لیکن مغلوں کے غیر معمولی زوال پذیر جانشین بھی تاہم سے لے کر اورنگ زیب تک چھ بادشاہوں کی قائم کی ہوئی سلطنت کو تباہ نہ کر سکے عظیم مغل سلطنت کے ختم ہونے کے لیے سو

بلکہ سو سے بھی کچھ زیادہ ہی برسوں کی ضرورت پڑی مگر اس دوران دہلی میں شمال اور جنوب کی علاقائی حرص و ہوس کی بہ...
بلکہ بیرونی لٹیروں کے مقابلے کی بھی سکت کم ہو چکی تھی ۔ نادر شاہ ایران سے آیا اور واپسی میں لاتعداد مال غنیمت جس میں
تخت طاؤس اور مشہور زمانہ کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا، لے گیا۔ (ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں تک پہنچنے اور ملکہ کے تاج کی
زینت بننے تک کوہ نور ہیرے کی قسمت میں بھی بڑا طول طویل سفر لکھا تھا) یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ جن لوگوں
کا ایرانی، ترکی اور افغانی حملوں کے تسلسل پر حیرت ہوا نہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایران اور دہلی کا درمیانی فاصلہ
ہند کی ریاست کیرالا اور دہلی کے درمیانی فاصلے کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔

نادر شاہ کے قابل ترین جرنل احمد شاہ ابدالی کے حملے سے ملک کو بدترین مصیبت کا سامنا کرنا تھا۔ احمد شاہ ...
افغانستان کا وہ حکمران تھا جس کے قبیلے کا نام درانی پڑا۔ ابدالی آیا، اس نے دیکھا اور لوٹ مار دوبارہ پھر آیا۔ ۱۷۴۷ء
۱۷۶۹ء کے درمیان افغانوں نے ہندوستان پر نو حملے کیے۔ بغیر کسی روک ٹوک کے لوٹ مار کی اور مقامی مہروں
مہروں کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلتا رہا۔ ایک قوت جو ابدالی کا مقابلہ کر سکتی تھی وہ تھی مراٹھوں کی۔ مگر یہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت
کی تیسری جنگ میں شکست کھا چکے تھے اور ان کے بعد درانیوں کے مقابلے کے لیے صرف سکھ رہ جاتے تھے جو اپنے
مثلوں (ایک لفظ جس کے معنی مثال کے بھی ہوتے ہیں اور برابر کے بھی) کے تحت اپنی صف بندی کی تھی۔ اپنے تیسرے
حملے کے دوران ابدالی نے امرتسر میں قتل عام کا حکم دیا تھا اور مال غنیمت سے لدے ہوئے واپس ہوتے ہوئے ...
کو لوٹنے کی پاداش میں گولڈن ٹیمپل مسمار کر دیا تھا۔ اس کی یاد سکھوں کے ذہن میں آج بھی دہشت کا سبب تھی۔ ...
وقت افغانستان کی مجموعی قومی پیداوار ایسا لگتا ہے کہ صرف ہندوستان سے لوٹے ہوئے مال غنیمت پر ہی ...

خالصہ ایک ایسی تحریک تھی جو ایک قائد کی تلاش میں تھی، ایک ایسے قائد کی تلاش میں جو ... کو ... ایک ...
اور ایک سلطنت کے خیال کو حقیقت میں بدل سکتا۔ یہ آدمی ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو لاہور کے مغرب میں ایک شہر گوجرانوالہ
میں جو اب پاکستان میں ہے، پیدا ہوا۔ اس کی عمر ابھی بارہ برس ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خشونت سنگھ کے
الفاظ میں بیٹے کے لیے اس نے پنجاب کے بالکل بیچ میں ایک بڑا ضلع اور ایک ایسی خواہش جس کی کوئی حد نہیں تھی
ورثے میں چھوڑی۔ ایسے حوصلے اور خواہش کے لیے وقت نہایت سازگار تھا۔

۱۷۶۱ء میں مغل بادشاہ نے ابھرتے ہوئے مراٹھوں سے دہلی کو افغان لٹیرے ابدالی سے بچانے کی درخواست
کی۔ اگر اس وقت ... سے ... کی کوئی صورت نکال لی جاتی تو دہلی پر قبضہ ان کا اگلا منطقی قدم ہوتا اور پھر
دہلی کے تخت پر مراٹھوں کی فرمانروائی مسلط آتی۔ مگر ابدالی نے پانی پت میں صرف ... کو شکست دی بلکہ ...

دام اوماراؤں کو بھی پست کر دیا۔ پیشوا کی زیر قیادت ایک وفاق کے بدلے مراٹھا پانچ خود مختار سلطنتوں میں بٹوا، بھاگیکواڑ، بھونسلے، سندھیا اور ہولکر) بٹ گئے، یہ تقسیم ہوئے اور زیر ہوئے۔ اس زمانے میں مغل سلطنت کی ت کی صحیح تصویر کشی شاہ عالم کے انجام سے ہوتی ہے جسے ایک افغان سردار نے ۱۷۸۸ میں اندھا کر دیا تھا اور پہلے سندھیاؤں کا وظیفہ خوار ہوا بعد کو انگریزوں کا۔ لیکن اگر دہلی کمزور تھی تو ویسے ہی حکومت کے دعویدار بھی رہے تھے۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی قوت نہیں تھی جو مغلوں کو حکمران کی جگہ لے سکتا، کچھ مدت تک دہلی کے ب وجوار میں بسنے والے جاٹوں نے سورج مل کی دلکش قیادت میں (۶۳-۱۷۰۷) ایسا مزد ظاہر کیا کہ گویا وہ اس لی جگہ کو پُر کر سکتے ہیں مگر راجپوت، جاٹ، مراٹھا اور حکومت کے مسلمان متمنیوں نے (روہیلوں کی طرح) ایک ، صبح کے لیے مغلوں کے طویل غروب آفتاب کا انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ یہ کام انگریزوں کے لیے چھوڑ دیا گیا کہ و سکال سے داخل ہوں اور ۱۸۵۷ تک مسئلے کو قطعی طور پر حل کر دیں مگر انگریزوں کی آمد سے پہلے شمالی افق پر ایک ستارہ چمکا، اس کی آمد بالکل اچانک تھی، اس کی چمک نے سارے افق کو پُر نور کر دیا اور پھر وہ بالکل اسی طرح پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا جس طرح اچانک وہ نمودار ہوا تھا۔ پیشوا نے پانی پت میں ابدالی کے ملنے سے پہلے کہا تھا مراٹھا اٹک کی دیواروں کو پار کر جائیں گے۔ یہ مقام دریائے سندھ پر خیبر درّہ سے آنے والی اس سڑک پر تھا جہاں سے افغان آئے تھے، مگر یہ اعزاز رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں کو ملنا تھا، جنہوں نے خالصہ پرچم اٹک کی دیواروں کے پرے افغانستان اور کابل تک پہنچا دیا۔

اولین اور شاید واحد سکھ سلطنت نے ایک بار پھر یہ بات ثابت کر دی کہ نشوونما، ترقی، توسیع اور استحکام رت اسی عہد میں ہوتے ہیں جب حکمراں کی پالیسی مذہبی جنون سے ہٹ کر تعاون و اشتراک کی طرف مائل ہو جاتی ہے دشمنی اور تشدد سکھوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خصوصیت رہی ہے اس کے پیش نظر اس بات پر کوئی تعجب نہ ہوتا اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے انتقام لینے میں مصروف کر لیا ہوتا لیکن پھر ایسی صورت میں اسے مغرب میں دریائے سندھ سے لے کر مشرق میں جموں تک پنجاب کی ٹھیٹ دو عملیت کبھی نصیب ہوئی ہوتی رنجیت سنگھ نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے دوستی کی شعوری کوشش کی، حکومت میں انھیں حصہ دیا اور وہ تمام رویے اختیار کیے جو لوگوں میں اعتماد و یقین پیدا کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہوتے ہیں [illegible] غیر معمولی تھا [illegible] حیثیت دی گئی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جموں کا ایک ڈوگرہ [illegible] دھیان سنگھ، رنجیت سنگھ کا وزیر اعظم تھا، وزیر مالیات دینا ناتھ، ایک ہندو برہمن تھا اس کے توپ خانے کے [illegible]

لیا تھا دوسرے اور مسلمان افسر بھی تھے جن میں جنرل الٰہی بخش، خدا یار اور سلطان محمد شامل تھے اس کی بائیس بیویوں میں
ی کل بیا نگیم بہت چہیتی تھیں ۔ لاہور کو فتح کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے جو پہلا کام کیا وہ تھا لاہور کی بادشاہی
بد، مذیر خاں کے مقبرے اور داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری ۔ داتا گنج بخش کا مقبرہ بعد کو اس کی سکھ بیوی نے
بارہ تعمیر کرایا ۔ رنجیت سنگھ نے جب اپنی فوج کی تنظیم نو کی تو اس میں اعلیٰ عہدوں پر ہندو اور مسلمان بھی رکھے
یہ جب سکھ فوج مغربی تکر میں داخل ہوئی تھی فوج کا جھنڈا ایک ڈوگرا ہندو جنرل زورآور سنگھ کے ہاتھ میں تھا
طرح جب ۱۸۳۹ میں (رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد) فاتح سکھ دستے کابل میں داخل ہوئے تو جامع
پر ان مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھے جن کی قیادت کرنل شیخ بساون کر رہا تھا ۔ ریاست میں ہر پنجابی برابر
تھا لیکن سکھ مسلمانوں کو قرآن کے احکامات کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لیے اپنے قاضی اور جج مقرر
نے کی اجازت تھی ۔

رنجیت سنگھ نے یہ سب کچھ کسی ریاکاری یا لغویات میں مبتلا ہوئے بغیر کیا ۔ ان کی سلطنت بالاعلان ایک سکھ سلطنت
، مہاراجہ کا خطاب دہلی یا کابل کا دیا ہوا نہیں بلکہ خالصہ پنتھ (سکھ مذہبی قیادت) کا عطا کیا ہوا تھا ۔ اولین سکھ سکوں پر
مہاراجہ کی تصویر کے بجائے سرکار خالصہ جی لکھا جاتا تھا مگر رنجیت سنگھ کا سیاسی فلسفہ جیسا کہ اس نے اپنے دوست
یزالدین کو بتایا تھا، غیر جانب دار تھا ۔ بچپن میں چیچک کے مرض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے چہرہ کھردرا ہو گیا تھا اور
پر دانوں کے گہرے گہرے نشانات پڑ گئے تھے، ایک آنکھ بھی اس مرض کی نذر ہو گئی تھی ۔ رنجیت سنگھ نے ایک
عزیزالدین کو بتایا تھا کہ یہ سب کیوں ہوا ؟ اس نے کہا تھا کہ "خدا چاہتا تھا کہ میں سارے مذاہب کو ایک آنکھ
دیکھوں اسی لیے اس نے ایک آنکھ کی بینائی چھین لی ۔"

سکھ سلطنت شمال میں تبت کی سرحدوں تک تھی، مغرب میں افغانستان تک اور جنوب مشرق میں دریائے
ج سے پرے تک پہنچ گئی تھی ۱۸۳۹ میں رنجیت سنگھ کی موت کے کچھ ہی عرصے بعد سلطنت کے انتشار نے
نفسیات پر بڑا گہرا اثر ڈالا ۔ مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے رنجیت سنگھ کے بیٹوں نے اپنے ورثے کی
رکی ۔ ان کے جائز یا ناجائز ہونے پر انگریزوں کو کوئی سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ انھوں نے خود ایک دوسرے
جائز ہونے کے الزامات لگائے ۔ سلطنت کی صحت مند جنگی نے بوسیدگی کی شکل اختیار کر لی ۔ سکھوں کے
لات میں دخل نہ دینے کے معاہدے کے باوجود ، انگریز صورت حال کی ترغیب سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے ۔
نواہ مخواہ کے بہانوں کا سہارا لے کر ۱۸۴۰ کی جنگوں کا آغاز کر دیا جنھوں نے وسیع و عریض پنجاب کو ان کے ہاتھ

یا۔ سکھوں کو سب سے بڑا نفسیاتی دھکا خالصہ عظیم رنجیت سنگھ کے بیٹے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تبدیلی مذہب یسائی ہو جانے اور ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں ایک کھلونے کی حیثیت اختیار کرنے سے پہنچا (یہ دلیپ سنگھ ہی ہے کوہ نور ہیرے کو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کرنے پر مجبور کیا گیا تھا حالانکہ اس کے باپ رنجیت سنگھ نے ے افغانوں سے واپس لے کر ہندوستان کو دیا تھا ملکہ وکٹوریہ نے اس "کوہ نور" کو ترشوا کر ایک تہائی سائز

یا۔)

سکھ وطن جو ایک حقیقت بن چکا تھا ایک بار پھر خواب ہو گیا۔ خود مذہب بھی خطرے میں تھا۔ مہاراجہ عیسائی یا تھا اور عیسائی مشینریوں کا پنجاب کی طرف تانتا لگ گیا تھا جو عوام میں دلیپ سنگھ کے تبدیل مذہب کو اپنی الی فوقیت کے ثبوت کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ دنیاوی فائدے ایک عملی ترغیب کا کام دیتے تھے۔ جلدی ہندو مبلغین آئے انہوں نے سکھوں کو اپنے اصلی مذہب کی پاکیزگی اور طہارت کی طرف واپس آنے کی دعوت ی۔ ان کا کہنا تھا کہ خالصہ تو ہندو عقیدے کا ہی ایک مختلف روپ ہے اور یہ آریہ سماج ہی کا ایک حصہ ہے۔ آریہ اج نام کی ایک تنظیم کے قائد دیانند سرسوتی دوبارہ تبدیل مذہب کرانے کے لیے نانک کے بجائے اسلام تک کے طریات کے لیے بعض ضروری رعایتوں (ذات پات اور بت پرستی کی تردید اور ایک خدا کی پرستش کرنا) پر راضی تھے۔ آریہ سماج کا مقابلہ کرنے میں مسلمانوں کے سامنے کوئی بڑی دشواری نہیں تھی۔ ان کے مقابلے میں سکھ لیت و مل میں تھے اور پست ہمت تھے یوں کہنا چاہیے کہ وہ پہلی دفعہ اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا گرو نانک کے ماننے والے بھی مہادیر، سدھارتھ اور کبیر کے ماننے والوں کی طرح معدوم ہو جائیں گے؟

۱۴۹۹ء میں گرو نانک نے اپنے مشن کا اعلان کیا، ۱۶۹۹ء میں گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو خالصہ کی شناخت دی۔ ۱۷۹۹ء میں سکھوں کی پہلی خودمختار سلطنت قائم ہوئی اور ٹھیک پچاس سال کے اندر اندر ۱۸۴۹ء تک یہ شخصی سلطنت دھوئیں کی طرح تحلیل ہو گئی۔ مسلمانوں کے خلاف اپنی خوفناک جنگ کو سکھ جھیل گئے۔ کیا وہ ہندو ذہن سے لڑی جانے والی جنگ میں اپنے وجود کو قائم رکھ سکیں گے؟

۵

تشخص کا بحران

تاریخ میں، برتری اور رفعت کا مضحکہ خیز حد تک ایسا زوال شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ
یچ اس بات کو دی کہ انھیں سنگھ صاحب کہا جائے۔ حالانکہ وہ صحیح معنوں میں ایک بادشاہ تھے۔ ان کے بڑے
بیٹے کھڑک سنگھ نے بے انتہا چاہا کہ وہ بادشاہ بنے۔ سخت بات کہنے سے پرہیز کرتے ہوئے اگر نرم الفاظ استع
کیے جائیں تو یہ کہا جائے گا کہ وہ ایک سادہ لوح تھا اور افیون کی لت نے اس کے ذہن کو مزید کند کر دیا
تخت پر اپنے حق کو جتانے کے لیے وہ سب سے بڑی جو دلیل دیتا تھا وہ یہ تھی کہ اس کے چھ بھائی، شیر سنگھ، تا
سنگھ، کاشمیرا سنگھ، پشورا سنگھ، ملتانا سنگھ اور دلیپ سنگھ ناجائز اولاد تھے۔ ان کی ماؤں کی نیک نامی یا
پیش نظر رکھتے ہوئے سکھ سردار، غالباً اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھے۔ بڑے لڑکے کی حیثیت سے
ان کا دعویٰ بہرحال سب سے زیادہ زبردست تھا۔ ایک طرف کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ نے جلد ہی زمام
اپنے ہاتھ میں لیا اور باپ کے چھینے اور حکومت کے پس پشت اصل قوت جیت سنگھ باجوا کو اپنے ہاتھوں
دوسری طرف اس کے باپ نے اپنا سارا وقت لوگوں کو یہ یقین دلانے میں صرف کر دیا کہ وہ بیوقوف اور احمق نہیں ہے
۵ نومبر ۱۸۴۰ء میں شراب، پیچش، افیون اور تیز بخار (امراض کی ترتیب کیا تھی کون جانے؟) میں مبتلا
کھڑک سنگھ کی موت افسوس سے زیادہ ایک اطمینان و سکون کا موقع تھی۔ توقع تھی کہ جیسے ہی نونہال سنگھ حالات
بو پالے گا۔ مگر اسی دن جس دن اس کے باپ کی آخری رسوم ادا کی گئیں، سر پر ایک پتھر گرنے کی وجہ سے اس کی
ت ہو گئی۔ انگریزوں کی منظوری سے، کھڑک سنگھ کے بھائی شیر سنگھ کو جانشینی ملی۔ لاہور کی درباری سیاست
ں انگریزوں نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی کیونکہ مختلف گروہوں نے جانشینی
کے تنازعے میں ان کی مدد مانگنا شروع کر دی تھی۔

کھڑک سنگھ کی ایک بیوی، بی بی چاند کور، کو اس کے دل میں مرحوم شوہر کے لیے محبت کے جذبات، وہ چاہے
بیوہ ستی پر اکسا نہ سکے (ستی کی رسم سکھوں میں ممنوع کی جا چکی تھی، مگر اب پھر واپس آ گئی تھی) چاند کور نے
ہم کا ارادہ شروع کیا کہ شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا نہیں بلکہ ایک انگریز (شیرڈ کوبا) کا خون ہے، اور اسی
نے تخت پر اپنے حق کا دعویٰ کرنا شروع کیا۔ ۲ دسمبر ۱۸۴۰ء تک اس نے اچھی خاصی قوت غصب کر لی تھی اور
مقدس کہی جانے لگی تھی۔ نجومیوں کے لیے تباہی و بربادی کی پیش گوئی کرنے کے لیے اتنا کافی ہے اور وہ
تھے۔ کیونکہ جلد ہی نہ تو کوئی ادب و احترام باقی رہا اور نہ ہی کوئی سلطنت۔ شیر سنگھ (غالباً اولین سکھ تُرڈی —
یہ جو بعد کو بہت پھولا پھلا) نے انگریزوں سے مدد لی اور لاہور پر چڑھائی کر دی، دونوں فریقوں نے سپاہیوں
موں میں اضافے کا لالچ دلائی۔ شیر سنگھ کی بات پر لوگوں کو یقین آیا، ملکہ پر نہیں۔ کیونکہ فوج کی ابھی پچھلی تنخواہیں بھی
باقی تھیں۔ ملکہ نے جموں کے ہندوؤں سے امداد طلب کر کے حالات کو خرابی سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کے
گلاب سنگھ ڈوگرا کو اپنا کمانڈر ان چیف مقرر کیا، مگر شیر سنگھ نے فتح حاصل کی اور ۱۷ جنوری ۱۸۴۱ء کو اطاعت
کر لیا۔ رات کے پچھلے پہر ڈوگرا سردار، سکھوں کا تمام سونا اور جواہرات لے کر لاہور کے قلعے سے بھاگ گیا۔ اس
نے اسے جواہرات کے کامیاب ترین چور کا مرتبہ عطا کر دیا۔ (اس لوٹ کا کچھ حصہ سری نگر کے سرکاری خزانے
آج بھی موجود ہے۔ بعض سکھوں کا دعویٰ بھی ہے کہ یہ چیزیں کشمیریوں کی نہیں ان کی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی کوئی
قیمت ہے تو ان سکھوں کے اس دعوے میں جان ہے)

یہاں سے پنجاب میں انگریزوں کی حکومت کے قیام تک ایک چھوٹے قدم کا فاصلہ تھا۔ ۱۸۴۳ء میں
چارلس نیپیئر نے بغیر کسی جواز کے سندھ پر قبضہ کر لیا اسی سال ستمبر میں اجیت سنگھ سندھاوالا نے جو ایک زمانے
ناقابل احترام ملکہ کا حامی تھا اور اس وقت انگریزوں کا تنخواہ دار ہو گیا تھا، نمایاں غداری کی مثال پیش کرتے ہوئے
نے شیر سنگھ اور اس کے بڑے لڑکے پرتاپ سنگھ کو مار دیا اس نے ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا اور قلعے
داخل ہونے سے پہلے انہیں لاہور کی سڑکوں پر گھمایا۔ وفادار سکھ فوجی دستوں نے غصے میں آ کر قلعے پر حملہ کیا اور
دشمنوں کو قتل کر دیا۔ ایک اکیلا خوش قسمت جو بچا وہ تھا اجیت سنگھ سندھاوالا۔ اسے اس کے آقاؤں یعنی انگریزوں
نے فوراً پناہ دی۔ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے، سات سالہ دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھا لیا اور اس کی
خوبصورت ماں چندن کور نے اب فیصلے لینے شروع کیے۔

انگریزوں کے پنجاب کو ہتھیانے تک کی کہانی، ناقابل یقین کمینگی اور سازش کی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ

اس بات کی اچھی توضیح ہے کہ انگریزوں نے کس طرح پہلے ہندوستان کو فتح کیا اور پھر اس پر اپنا تسلط قائم کیا۔
جاگیردار جو اب ذہنی اور جسمانی عیاشی میں مبتلا تھے، انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے ملک ان کے حوالے کر
کو ہندوستانی متوسط طبقے نے سلطنت کے استحکام میں ان کی مدد کی) اس عہد میں لاہور دربار کی پیچیدگیوں
سے محض بیانیہ کے علاوہ کوئی دوسرا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا اور باقی ساری کتاب اسی میں پوری ہو
گی۔ علامت کے طور پر مشتے از خروارے، ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ حالات اب قابو سے اتنے باہر ہو چکے
کہ محل میں سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت دلیپ سنگھ کے چچا کی داشتہ منگلا، ایک تیس سالہ خوبصورت
ہوگئی تھی۔ منگلا ایک سقے کی لڑکی تھی۔ دلیپ سنگھ پر لگائے جانے والے الزامات میں ایک الزام یہ بھی تھا
سنگھ کا اصلی بیٹا نہیں تھا بلکہ اس کی پیدائش ذی فی جنداں کور اور سقے کے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

١٨٤٥ کے اوائل میں انگریزوں نے ڈوگرا سردار گلاب سنگھ سے اتحاد قائم کیا اور موسم خزاں تک
کرنے کے لیے اپنی فوجوں کی صف بندی شروع کر دی۔ ہندوستانی جاگیرداروں کے روایتی فن غداری نے فتح
کرنے میں انگریزوں کی ایک دفعہ پھر اس وقت مدد کی جب سکھ سردار تیج سنگھ جو کمک کے طور پر موقع پر پہنچا تھا
گفت لی فوجوں کو جو ٢١-٢٢ دسمبر ١٨٤٥ء کی جنگ میں تقریباً ہار مان چکی تھیں، ختم کرنے کے بجائے
فوجوں کو لے کر پسپا ہوگیا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے اتحاد کا انعام یہ دیا کہ اسے وہ علاقہ خریدنے کی اجازت
دے دی جو آج جموں اور کشمیر کی ریاست کہلاتا ہے اور جس پر اس کے وارث حکومت کرتے رہے یہاں تک
کی کشمکش میں ہری سنگھ خوف زدہ ہوکر بھاگ نکلا۔

٢٩ مارچ ١٨٤٩ء کو، ایک ناکام بغاوت کے بعد، انگریزوں نے سکھ سلطنت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان
کر دیا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ نے کوہ نور واپس کر دیا۔ سکھوں کا کہنا تھا کہ آج رنجیت سنگھ مرے ہیں، وہ
اور ان کے ساتھ اس نئے مذہب کی روح کا ایک حصہ مر گیا۔

اسی دوران دہلی میں، سلطنت کے ناٹک کو بڑی مضحکہ خیز تفصیلات کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔ مغلوں
آخری ایام کی حقیقت تخیل سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جنھیں ١٨٣٧ء میں تاج پہنایا
گیا تھا، اسی اپنے آپ کو "شاہ عالم" کہتے تھے اور سر سید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے مطابق انھیں
تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک مکھی یا ایک مچھر کے روپ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی توجیہ فرائڈ کے یہاں
مل جائے۔ عظمت و شکوہ کے فریب کا مخالف یا اُلٹ شاید یہی ہو سکتا تھا لیکن ایک سال میں چار مرتبہ عید

سال اور انگلستان کی ملکہ کے یوم پیدائش پر انگریزوں کے نمائندے ایک خیالی سلطنت کے اس حکمران کے سامنے
پر کھڑے ہو کر نذریں پیش کیا کرتے تھے۔ درحقیقت انگریز دھوکہ دیتے تھے۔ تحقیر اور ذلت کی علامت، برہنہ پائی
سے وہ اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتے تھے اس لیے وہ اپنے جوتوں پر موزے چڑھا کے سامنے آتے تھے جہاں تک بادشاہ
کا تعلق ہے، جب انھیں اپنا مرثیہ لکھنے سے فرصت ملتی تھی تو وہ انگریز سے اپنی پنشن بڑھانے کی درخواست کرتے رہتے تھے
مگر بادشاہ کا سحر ابھی تمام نہیں تھا۔ دہلی کا تخت جس پر کبھی بابر، کبھی اکبر، کبھی شاہ جہاں اور کبھی اورنگ زیب بیٹھا تھا
پر ایک بے کار ضعیف آدمی کے بیٹھنے کے باوجود وہ آج بھی حقیقی قوت کی علامت تھا۔ ہولکر کے سکوں پر تکاجی راؤ کے عہد
(۱۸۰۴ - ۱۸۴۳) تک مغل بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ انگریزوں نے اس وقت تک تمام ان جاگیردار خاندانوں کو شکست دے
جلا وطن کر دیا جن سے ہندوستان میں ان کی فوقیت کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ مرہٹہ پیشوا کو شمالی ہندوستان کے ایک گاؤں میں
نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ٹیپو سلطان کے ورثا کلکتہ کے ایک نواح میں، اودھ کے حکمراں کلکتے میں، اور رنجیت سنگھ کے
مذہب تبدیل کرنے والے لڑکے کو انگلستان کے ایک کنٹری ہاؤس میں رکھ دیا گیا تھا۔ انگریز کی راہ میں اگر کوئی چیز اب
حائل تھی تو وہ دہلی میں نحیف و نزار یادگار تھی

۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء کی صبح کو پچھلے دن کی کامیابیوں سے سرشار میرٹھ کی کالی پلٹن کے سپاہیوں نے کلکتہ گیٹ اور شاہی
محل کے درمیان سے دہلی میں داخلے کے لیے کشتیوں کے ایک پل کے ذریعے دریائے جمنا کو پار کیا۔ جیسا کہ لوگ عام
طور پر جانتے ہیں کہ اس بغاوت کا فوری سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کی وہ ناراضگی تھی جو انھیں نئی این فیلڈ رائفل کے
کارتوسوں میں چربی کے استعمال سے ہوئی تھی ان کارتوسوں کو رائفل میں ڈالنے سے پہلے اپنے دانتوں سے کھولنا ہوتا
تھا لیکن بغاوت کی آگ تو بہت دنوں سے سلگ رہی تھی۔ دہلی کے نواح کے کسان (جنھیں چربی کا مزہ چکھنے کا موقع
کبھی نہیں ملا تھا) بغاوت میں شامل ہو گئے اور یہ بغاوت عوامی سطح پر ایک انوکھی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی جس میں
ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اپنے باہمی اختلافات بھول کر سفید چمڑی والوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ شمالی
ہندوستان میں اسے ایک وسیع حلقے سے تعاون ملا۔ دستکاروں اور کسانوں جیسے قبائل کی صفوں نے ذات پات کو کبھی
تسلیم نہیں کیا لیکن بدیسی کو جانتے تھے، حمایت بغاوت کو حاصل ہوئی۔ بہرحال باغیوں کی دشواری یہ تھی کہ لاتعداد قومیں
و تعداد مختلف چیزوں کے لیے نبرد آزما تھیں اور ان میں سے بہت سوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فتح کے بعد کیا ہوگا
اس کا اہم سبب جاگیردارانہ قیادت کی نااہلی تھی۔

جب سپاہی پہلی بار بہادر شاہ کے محل پر پہنچے اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ بادشاہ ان کی قیادت کرے تو انھوں نے

انگریز ریذیڈنٹ کیپٹن ڈگلس سے کہا کہ وہ انھیں کسی طرح ٹال دے۔ جب سپاہیوں نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ میں محض وظیفہ خوار ہوں اور وہ ان کو تنخواہ دینے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ سپاہیوں نے کہا کہ وہ تنخواہ نہیں بلکہ بعض لوگوں پر عظمت تھوپ دی جاتی ہے۔ مغل خاندان کا یہ آخری چشم و چراغ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس وقت جذبات اتنے شدید تھے کہ انھوں نے بہادر شاہ جیسے آدمی کو بھی تاخیر کیے بغیر نہیں چھوڑا اور وہ قیادت کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ سپاہیوں نے دلی پر قبضہ کر لیا۔

انگریز نے اس اتحاد کو تباہ کرنے کے لیے مذہبی اختلافات پیدا ہونے کا انتظار کیا، خصوصاً بقرعید کے دن کہ جس دن مسلمان اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ انھیں یہ توقع تھی کہ اس موقع پر گائے کاٹنے پر ہندو مسلمان میں روایتی دشمنی ہو گی اور اس اتحاد کو توڑا جا سکے گا۔ مگر اس کے بالکل برعکس مسلمان لیڈروں نے ذبیحہ کو ممنوع قرار دیا اور خود بہادر شاہ نے بکرے کی قربانی کر کے لوگوں کے سامنے ایک مثال رکھ دی۔ جنگ کے دوران انگریزوں کے محاصرے کو توڑنے کے لیے ہندوستانیوں نے بڑی جانبازی اور بہادری دکھائی۔ ایک مسلمان نے اپنے آپ کو ایک مجاہد کہا اور سبز صافہ باندھ کر توپوں سے کیے جانے والے ایک حملے کی قیادت کی وہ گرفتار کر کے قیدی بنائی گئی مگر حراست سے پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے دو انگریزوں کو مار ڈالا۔ بہر حال ۱۴ اگست کو نکلسن کا دستہ انگریزوں کی امداد کے لیے آگیا۔ ۱۳ ستمبر تک قلعہ دلی کی دیواروں میں رخنے پیدا کر لیے گئے اور تب تک انگریزوں نے اپنی سلطنت کو بچا لیا تھا۔ اگرچہ اس سودے میں ان کے تین ہزار آٹھ سو سینتیس افسر اور جوان مارے گئے یا لاپتہ یا زخمی ہوئے۔ اکیس مغل شہزادے پھانسی پر لٹکائے گئے، فوجی دستوں نے دلی کے جتنے باشندوں کو چاہا موت کے گھاٹ اتارا۔ دلی کو انگریزوں نے بالکل اسی طرح جس طرح پہلے فاتحین نے کیا تھا جی بھر کر لوٹا اور تباہ کیا۔ برطانوی دستاویزات کے مطابق، ہر افسر اس لوٹ مار کے بعد نوکری سے سبک دوش ہو سکتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ افسروں کی ایک غیر معمولی تعداد نے مال غنیمت دے کر اپنے عہدوں سے سبک دوشی حاصل کر لی۔ مشہور شاعر غالب نے "میرے سامنے خون کا سمندر" اسی کے بارے میں لکھا ہے اور اس طرح انگریزوں نے دلی سے حکومت کا وہ دور شروع کیا جو ٹھیک نوے سال بعد ایک خون خرابے پر ختم ہوا۔ مگر اس دفعہ یہ خون خرابہ ایک ایسی جنگ میں ہوا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ لڑی گئی۔

اسی بغاوت کے دوران سکھوں نے یہ دکھا دیا کہ وہ ایک فرقہ کی حیثیت سے خود اپنے مفادات اور مرکز رکھتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے مختلف ہیں۔

۱۱ اور ۱۲ مئی کی نصف شب کو سپاہیوں اور نوجوان شہزادوں نے بالآخر ستاسی برس کے بہادر شاہ ظفر کو بغاوت
کی قیادت کرنے پر مجبور کر دیا اور شاہی توپوں نے ایک ذرمن مجہ کر کارتیس گولے داغ کر بے بسی اور مجبوری کے اس
عارضی نتائج کا اعلان کیا۔

پنجاب کی فوج میں اس وقت ساٹھ ہزار سپاہی تھے اور ان میں انگریز محض دس ہزار تھے۔ ۱۴ مئی کو
ہندوستانی فوجی دستوں کو ہتھیار جمع کر دینے کا حکم دیا گیا۔ انگریزوں کی حکومت داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ
شملہ کی پہاڑی چوکیوں میں رکھے گئے گورکھا سپاہیوں نے بھی شکوہ شکایت شروع کر دی۔ جو سپاہی کسولی میں تھے
انھوں نے وہاں خزانے کو لوٹ لیا اور اپنی اپنی بیرکوں میں واپس جانے سے پہلے بہت سی رعایتیں حاصل کر لیں۔ یہی وہ
وقت تھا جب سکھ، کشمیری ڈوگرا، پنجابی اور پنجابی مسلمان انگریزوں کے تحفظ کے لیے سامنے آئے۔ ان سب کے
پاس اپنے اس عمل کی اپنی توجیہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی کہ یہ نئے باغی سپاہی وہی فوجی تھے جنھوں نے ایسٹ
انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی حیثیت سے کوئی دس سال قبل سکھ، پنجابی اور ڈوگرا سلطنت کو تباہ کیا تھا۔ اس اتحاد کے ا
عنصر سکھ نہ تو دہلی میں ایک مراٹھا راجہ کے وجود کی ہندو آرزو کی تکمیل کے لیے کوئی اشتیاق دکھا سکتے تھے اور نہ ہی
مغل عظمت کی بحالی کی مسلمانوں کی توقع ان میں کوئی جوش و خروش پیدا کر سکتی تھی۔ بنارس اور اس کے قریب جون پو
سکھوں کے ان سپاہیوں کا ساتھ دینے کے اکا دکا واقعات کے علاوہ، سکھ سپاہی، سارے شمالی ہندوستان میں ا
کے اہم مرکزوں میں، انگریزوں کو بچانے کے لیے لڑے۔ انگریزوں نے دہلی پر سکھوں اور انگریزوں کے قبضے کے خیال کو
بہت افزائی کر کے اس میں مدد کی۔ درحقیقت یہ ہوا بھی مگر انگریزوں کو حکومت ملی اور سکھوں کو شاباشی اور کچھ ما
غنیمت جو ستمبر میں دہلی پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ان کے ہاتھ آیا تھا۔

سکھ شہزادوں کو، انگریز دشمن جاگیرداروں سے چھینی ہوئی زمین کا کچھ حصہ بھی ملا۔ مثلاً نواب جھجر ایک
کو پھانسی دی گئی اور ان کی املاک کو پٹیالہ اور نابھا کی سکھ ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا (اول الذکر کو دہلی میں بہادر
ظفر کی بیوی بیگم زینت محل کا ایک گھر بھی ملا) خالصہ، فوج کے نئے چہیتے بن گئے۔ ابھی تک رجمنٹ میں سکھ
تعداد سو تک محدود تھی (برطانوی فوج میں ۳۰ رجمنٹیں تھیں) بغاوت کے بعد ہونے والی تنظیم نو میں عسکری نسل
نظریے کی تجدید ہوئی۔ سکھ، پنجابی، مسلمان، راجپوت، جاٹ، ڈوگرا اور مراٹھا اب نوکر رکھے جائیں گے او
کیسے پیچھے اصول یہ بتایا گیا آریا ہیں یا کم و بیش آریا ہیں اور اس لیے بنیادی طور پر یورپی ہیں۔ بہاریوں کو جنھوں نے د
انگریزوں کو ان کی پہلی فتوحات دلائی تھیں مگر ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تھی۔ ایک غیر عسکری نسل قرار دیا گیا اور ستا

ڈوگرا عسکری نسل مانے گئے۔ سکھوں کو مزید انعام پنجاب میں نہروں کی تعمیر کے پروگرام میں ملا۔

حالات کی یہ عجیب و غریب کروٹ تھی کہ یہی چیز تھی جس نے اپنا پہلا بحران پیدا کرنے میں سکھوں کی مدد کی تھی
پاکر خشونت سنگھ نے لکھا ہے۔ "شاہی فوجوں کو ترقی سے جو خوش حالی نصیب ہوئی اس کا کمیونٹی کے مستقبل
ذات پات کے ڈھانچے پر بڑا اہم اثر پڑا۔ سکھ ہونے کے اقتصادی فوائد نے سکھوں کے منتشر ہونے
۔ ہندو ازم کی آغوش میں ان کی مراجعت کو روک لیا۔ (عبارت کو خط کشیدہ مصنف نے کیا ہے
اس کے برعکس انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سکھوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا
طرح سکھوں کے معدوم ہو جانے کی لارڈ ڈلہوزی کی افسردہ پیشین گوئی کو سچ ہونے سے خود ڈلہوزی کی شروع کی
ئی اور پنجاب کے کمانڈروں اور دوسرے منتظمین کی تقویت پہنچانے والی پالیسیوں نے بچا لیا۔"

انگریزوں نے سکھ ہونے کو نفع بخش بنا دیا۔ نہروں کے جال نے بنجر زمین کو سونا اگلنے والی زمینوں میں بدل
۔ بہترین زمینوں کے قطعے سکھ کسانوں کو دانستہ دیئے جانے کے بڑے دور رس اثرات پڑنے تھے۔ اکیلی چناب
نکلی ہوئی نہر نے تقریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت کے قابل بنا دیا جس سے ۸۷ ملین روپیہ سالانہ سے زیادہ
دن سمجھیے کہ نہر کی تعمیر پر آنے والی لاگت کا تین گنا لگان آیا۔ مفلس ترین سکھ بسنے والے کو ۱۴ سے ۱۶ ایکڑ تک زمین
نت دی گئی۔ متوسط درجے کے کسانوں کو ۹ سے ۹ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے ۱۱۱ سے ۱۳۹ ایکڑ تک اور ایک
دس سے بیس روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے ۱۹۷ سے لے کر ۵۵۶ ایکڑ تک زمین عطا ہوئی۔ نہروں کی تعمیر کے
وگرام سے پہلے جو زمین دس روپیہ فی ایکڑ تھی اس کی قیمت اب ۲۰۰ روپیہ فی ایکڑ ملنے لگی۔ گیہوں کی برآمد کی
ٹن سالانہ سے بھی بڑھ گئی۔ اگرچہ سکھ پنجاب کی آبادی کا محض بارہ فی صدی حصہ تھے مگر ہندوستان کی شاہی
ج میں وہ بیس فی صدی سے زیادہ تھے۔ لہٰذا دارت کے بعد سکھ ہونا اچھی بات تھی۔

مگر قابل غور سوال یہ ہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے آخر کیوں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سکھ معدوم ہو جائیں گے اور
ریخ والوں نے یہ کیوں کہا کہ ہندو ازم کی طرف مراجعت شروع ہو گئی تھی؟ اس کا سوال نہیں ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں
ے درمیان تعلقات بہت قریبی تھے اور وہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک بہت قریبی رہے تھے۔ اس دوستی اور محبت
سلمانوں سے مشترکہ دشمنی نے صیقل کیا اور روزمرہ کے معاملات میں اس نے مثال کے طور پر گائے کے احترام کی
شکل اختیار کی۔ (اگرچہ خود سکھ مذہب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر ایک آمدنی دینے والے جانور سے
یادہ احترام کی ضرورت پیش آئے) ہندوؤں نے سکھ گردواروں میں عبادت کرنا شروع کی، اور اس کی وجہ سے

ت ۔۔۔ رو نانک کے سختی سے ممنوع کیے ہوئے بت وہاں بھی متعارف ہو گئے۔ ۱۹ویں صدی اور بیسویں صدی کے
۔۔ں میں یہ ایک طریقہ رائج ہو گیا تھا کہ ہندو اپنے بڑے لڑکے کو سکھ بنا دیتے تھے۔ بعض سرپھروں کا خیال ہے کہ یہ
۔۔ھی ان فوائد کا براہ راست نتیجہ تھی جو سکھوں کو انگریزوں سے پہنچ رہے تھے اور ہندو بھی ان فائدوں سے محروم
نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس صورت حال کا بہر حال سبب کچھ بھی ہو دونوں کے تعلقات اتنے قریبی ضرور تھے کہ دیکھنے
والے یہ پیش گوئی کر سکیں کہ نانک پنتھی، وہ دن دور نہیں، جب ہندو ازم کی طرف لوٹ آئیں گے۔ تغیرات کے اس
زمانے میں، مختلف اقسام کی مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ نانک اور گرو گوبند سنگھ ازم اور برہمنوں کے ہندو ازم کے
درمیان، مختلف فرقے وجود میں آئے۔ ان ہی میں سے ایک فرقہ نرنکاریوں کا تھا جس کی قیادت پشاور کا ایک تاجر
دیال داس کرتا تھا۔ اسی طرح ایک ہندو ساہوکار شیو دیال نے رادھا سوامیوں کا فرقہ قائم کیا۔

مگر انگریزوں کی دی ہوئی مراعات اور ترغیبات نے سکھوں کی چاہے جتنی امداد کی ہو، وہ بہر حال ہندو ازم
کے چیلنج اور عیسائی مشنریوں کی دلکش پیش کشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ تبدیل مذہب کی عیسائی
تحریک ۱۸۳۵ میں اس وقت سے شروع ہوئی جب لدھیانہ میں ایک امریکن پریسبیٹیرین مشن قائم کیا گیا، یہاں
سے پھر یہ تحریک باہر نکلی۔ تبدیل مذاہب کرانے میں، عیسائیوں کو ابتدا میں کامیابی اچھوتوں میں ملی بعد کو انھوں نے اعلیٰ
۔۔۔ میں بھی کچھ کامیابیاں حاصل کیں ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر راجہ ہرنام سنگھ کا تبدیل مذہب ہے یہی راجہ
۔۔ م سنگھ تھے جن کی بیٹی راج کماری امرت کور آزاد ہندوستان میں ایک وزیر بنیں۔

آریہ سماج، کی بنیاد ایک گجراتی برہمن سوامی دیانند سرسوتی نے رکھی جنھوں نے ویدانت ازم کی طرف لوٹنے کی
تبلیغ کی۔ ظاہر ہے کہ انھیں اس سرزمین سے خصوصی دلچسپی تھی جہاں ویدوں کی تدوین ہوئی تھی۔ وہ اپنی موت سے
چھ سال قبل ۱۸۷۷ء میں پنجاب آئے اور اپنا اچھا خاصا اثر پیدا کر لیا۔ بہت سے سکھوں نے ہندو ازم کی طرف پھر
۔۔اس لوٹ جانے کے لیے شدھی کرائی۔ دیانند نے اپنے عقائد کے سلسلے میں کسی کو فریب یا غلط فہمی میں نہیں رکھا۔ ان
۔۔اب ستیارتھ پرکاش میں جو ۱۸۷۴ میں طبع ہوئی تھی انھوں نے حضرت محمدؐ، حضرت عیسیٰؑ اور گرو نانک کو ایک ہی سند
سے رکھا ہے۔ نانک کے لیے غیر پردیسی ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سوامی جی ایک مخصوص نفرت رکھ
تے اور انھیں ریاکار اور رنگا بھگت کہتے تھے۔ سکھ دانشوروں نے جواب دینے کی کوشش کی اور آریہ سماج کی
تبلیغ کے جواب میں ریاست نابھا کے کاہن سنگھ نے دیواروں پر "ہم ہندو نہیں ہیں" لکھوا دیا۔

سکھوں کو جس چیز نے حقیقتاً کمزور کیا وہ باہر والوں کے حملے نہیں بلکہ خود ان کی گروہ بندیاں اور کمیاں تھیں

انتہائی تیزی کے ساتھ ان کے اندر پھیل گئی تھیں ۔ ابھی صرف پچاس سال قبل تک خالصہ کی تعداد بڑھ رہی ہ
اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگی تھی ۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں لکھا ہے کہ اگرچہ بحیثیت مجموعی آبادی "
مردم شماری کے بعد سے بیس فی صدی کا زبردست اضافہ ہوا ہے مگر سکھ ازم روبہ انحطاط ہے" وہ تما
خصوصاً ذات پات، گرونانک نے جن کے خلاف جنگ کی تھی، پھر عام ہو گئے تھے ۔ برابری اور بھا
مندر امرت سر جیسے مقدس شہری مندر میں نیچی ذات کے سکھوں کو داخل ہونے کی اجازت صرف مخصوص او
تھی اور انھیں کڑاہ پرشاد چھونے کی اجازت نہیں تھی اگرچہ یہ ایک ایسا کھانا تھا جو عوامی باورچی خانے سے ہر
ملتا تھا اور شروع ہی ذات پات کی تفریق کو مٹانے کے لیے ہوا تھا ۔ مگر مذہب کی حالت سکھ گردواروں کی
سے بڑی اچھی طرح ظاہر ہوتی تھی ۔ انحطاط کا یہ عالم تھا کہ اگر اسے روکنے کی سعی نہ ہوتی تو وہ خود فرقہ ہی
نابود کر دیتا ۔

٦

پگڑی سنبھال جٹّا

صدی کے اختتام پر، پنجاب میں مخرب اخلاق ادب، طوائفوں سے ملاقات، یا جوئے کی سہولتیں آدمی
احیت اور شوق کے مطابق فراہم تھیں اس انحطاط نے مقدس ترین مقام کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔
دل چسپ بات یہ تھی کہ سکھ گردواروں کے مہنتوں کا سکھ ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ ان میں سے بہت سے
تھے، جنھوں نے عیاشی کے ساتھ ساتھ وہاں یعنی ایک ایسی جگہ پر جہاں بتوں کی پوجا صاف طور پر ممنوع تھی بت پرستی
روع کر دی تھی۔ درحقیقت مقدس ترین گردوارے گولڈن ٹمپل سے بت ۱۹۰۵ میں سکھوں کے بہت دباؤ ڈالنے
لے گئے۔ مہنتوں کی یہی شہرت تھی جس کی وجہ سے نظام حیدرآباد نے ایک قانون نافذ کر دیا تھا کہ ناندیڑ (جو نظام
رمیں آتا تھا) گردوارے میں صرف ایک 'بااخلاق برہمچاری' ہی مہنت ہو سکتا ہے۔ ناندیڑ کا گردوارہ گرو گوبند
ہ کے مارے جانے کی جگہ کی نشان دہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے برہمچاریہ اور اچھا اخلاق اپنی عدم موجودگی سے
نے جاتے تھے۔ مہنتوں کے ہندو یا غیر سکھ ہونے کے اسباب تاریخ میں ہیں۔
اٹھارہویں صدی کے نصف اول نے سکھوں کے خلاف پنجاب کے ذکریا خان، یحییٰ خان، اور میر منو جیسے مسلمان

گورنروں کا زبردست ظلم وستم دیکھا اس سے گھبرا کر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خالصاؤں کو شہر چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ اسی وقت گر
کے بڑے بیٹے بابا سری چند نے اداسی نام کے ایک فرقے کی بنیاد ڈالی (اداسی نام گرونانک کی ان طول طویل سیاحتوں
نام پر رکھا گیا کہ ان سیاحتوں کو اس وقت اداسیاں ہی کہا جاتا تھا۔)

یہ اداسی فرقہ گردواروں کے تحفظ میں مدد دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ اداسی چوں کہ نہ تو لمبے بال رکھتے تھے
نہ ہی ان کے پاس سکھوں کی کوئی دوسری ظاہری علامات ہوتی تھیں، اس لیے وہ اذیت سے بچ گئے۔ بہر حال جب مسلما
طرف سے خطرہ ختم ہو گیا تو انھوں نے گردواروں کو سکھوں کو واپس کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ سکھ حکومت کے
کے بعد گردواروں کو بے انتہا زمینیں دی گئیں تاکہ مہنت اس کی آمدنی سے کمیونٹی کے لوگوں کی امداد کریں اور گرد
کی دیکھ بھال میں ان رقموں کو استعمال کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے جو کیا وہ یہ تھا کہ اس رقم
خود انھوں نے اپنی مدد کی اور جاگیرداروں کا تحفظ کیا۔ لاہور ہڑپ لینے کے بعد انگریزوں نے جب ناموں کی تجدید شر
کی تو ان مہنتوں نے ان ساری زمینوں کو اپنی موروثی املاک لکھوا دیا۔

یہ بالکل صاف تھا کہ سکھوں نے اپنی آزادی، امتیازی علامتوں، اپنے گردواروں اور اپنے مقدر پر
بھی اپنا اختیار کھو دیا تھا۔ گردواروں کے ہندو مندروں میں تبدیل ہو جانے یا برائیوں کے گڑھ بن جانے یا یک وا
دونوں تبدیلیاں ہونے کے ساتھ ہی ہندوازم کی طرف مراجعت میں بھی تیز رفتاری آ گئی تھی۔ سکھ قیادت نے مرض کی تش
مذہبی اور سیکولر تعلیم میں کمی اور اس کی وجہ سے سکھ عقاید اور سکھ شناخت پر فخر و ناز کے معدوم ہو جانے میں
اگر سکھوں کو ایک الگ خود مختار مذہب کی حیثیت سے باقی رہنا تھا تو انھیں یہ معلوم ہونا ضروری تھا کہ ان کے مذہب
مطلب کیا ہے؟ یکم اکتوبر ۱۸۷۳ کو امرت سر میں سری گرو سنگھ سبھا قائم ہوئی۔ سکھ اعتماد کو بحال کرنے اور آر
سماج اور عیسائی مشنریوں کے اثرات سے اپنے عقائد کو محفوظ کرنے کا کام سب سے پہلے اسی تنظیم نے کیا۔ سبھا
تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع کرنے، پنجابی زبان میں نئی تعلیم پھیلانے اور مرتدوں کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ تحریک
جلد ہی خالصہ اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا دیا۔ ۵ مارچ ۱۸۹۲ میں، سب سے بڑا خواب اس وقت پو
جب امرت سر میں، سر جیمس لائل نے خالصہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ کالج میں باقاعدہ تدریس ۲۲ اکتوبر ۱۸۹۳ء سے
شروع ہوئی۔ ۱۹۰۸ تک مغربی تعلیم کو جس کی شدید ضرورت تھی، پھیلانے، پنجابی زبان کے علم اور سکھ عقائد کی ترویج کے
لیے سکھ ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۳ کا سال، جس میں سکھ سبھا وجود میں آئی، سکھ تاریخ میں ایک اہم سا
سیاسی بازو، چیف خالصہ دیوان ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا لیکن اس پر جلد ہی ان لوگوں کا تسلط ہو گیا جو کچھ

ںدہ خوش حال صرف انگریزوں کی سیاسی غلامی ہی کے ذریعے ہو سکتے ہیں مگر تعلیم نے نئے خیالات بیدار کیے
دان نسل نے اپنے آپ کو تحریک آزادی سے وابستہ کرنا شروع کیا۔ مشہور برطانوی سی آئی ڈی (سنٹرل انٹیلیجنس
ںٹ) نے پنجاب گورنمنٹ کو آگاہ کیا تھا کہ خالصہ کالج ۱۹۰۷ تک "طالب علموں میں قومی جذبات پیدا کرنے کا
رزین چکا تھا" ۱۹۰۷ میں جب گوپال کرشن گوکھلے خالصہ کالج آئے تو وہاں کے طالب علموں میں اتنا جوش و خروش
ہوا کہ انھوں نے ان کی گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے اور ان کی جگہ پر ریلوے اسٹیشن سے کالج تک خود انھوں نے
ہ کھینچی۔

اسی دوران مختلف بوجھوں تلے دبے ہوئے کسانوں کی ناراضگی اس وقت اور بڑھ گئی جب ۱۹۰۷ء میں
نائزیشن بل پاس ہوا اور جس نے زمین کے لگان میں مزید اضافہ کر دیا۔ اعداد و شمار بڑھتی ہوئی مفلسی اور غریبی
آئینہ دار ہیں۔ قرضہ دینے والے ساہوکاروں کی تعداد جو ۱۸۶۸ء میں ۵۲۲۶۳ تھی۔ ۱۹۱۱ء میں بڑھ کر
۱۹۳۸ ہو گئی۔ زمین کی خرید و فروخت جو انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اوسطاً ۸۸۰۰۰ ایکڑ سالانہ تھی اس
بھی اضافہ ہوا اور وہ ۱۹۱۰-۲۰ کے دوران ۳۳۸۰۰۰ ایکڑ ہو گئی۔ زمین کے کاروبار میں بھی یہی صورت حال
ں یہی وہ زمانہ تھا جب بانکے دیال کا مشہور گیت "پگڑی سنبھال جٹا" ہر سمت گونجنے لگا۔ بہرحال کالونائزیشن
کو بالآخر وائسرائے نے اپنے ووٹ سے رد کر دیا۔ اس وقت تک جوان مرد سکھ جو روزگار کی تلاش میں ہندوستان
ہوڑ کر برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں اور امریکا میں آباد ہو گئے تھے۔ رنگ کے امتیاز کی لپٹ محسوس کرنے لگے
تھے پہلی عالمی جنگ کے دوران سفید چمڑی والوں کے خلاف ان کی ناراضگی نے ناکام غدر کی شکل اختیار کی۔ پنجاب کے
سکھ شاید اس بغاوت کا ساتھ نہ دیتے مگر انھوں نے بھی ایک نوآبادکار حاکم سے اپنے رشتوں کی نوعیت کو سمجھنا شروع
کر دیا تھا۔ بہرحال انھوں نے پہلی عالمی جنگ میں یورپ، افریقہ اور ترکی میں لڑ کر اپنا فرض پورا کیا اور ہندوستانیوں
کو ملنے والی بہادری کے بائیس ملٹری کراس میں سے چودہ ملٹری کراس حاصل کیے۔ مگر حالات میں تبدیلی آنا تھی جیسا کہ
خود انگریزوں کو بھی پتہ چلنا تھا، خصوصاً دوسری عالمی جنگ میں، جب وفادار سکھوں کے غول کے غول، سبھاش چندر
بوس کی باقی ماندہ انڈین نیشنل آرمی (آزاد ہند فوج) میں چلے گئے۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کی تاریخ بہرحال وہ تاریخ ہے جب حالات نے پلٹا کھایا۔ بریگیڈیر جنرل آر۔ ای۔ ایچ ڈائر، جو
۹ اکتوبر ۱۸۶۴ کو ہندوستان میں مری کے مقام پر پیدا ہوا تھا، وہ شمالی ہندوستان کے ایک شراب کشید کرنے والے
خاندان ڈائر میکن اینڈ کمپنی کا ایک فرد تھا (یہ کمپنی اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا نام اب موہن میکن

ہو گیا ہے) اس نے شہر میں بشپ کاٹن اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی حیثیت تک کا
پر اس کی پرورش ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے جلیان والا باغ کے مقام پر ایک نہتے مجمع میں شامل مردوں عورا
بچوں کے، جس میں زیادہ تر سکھ تھے، قتل عام کا حکم دیا۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس قتل عام میں ۱
افراد مرے تھے اور ۲۰۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ (خود سامراجی ونسٹن چرچل بھی بدحواس ہو گیا تھا!)
باغ میں ڈائر نے صرف بادشاہ کے انتہائی خیر خواہ ملازم کی وفاداری ہی نہیں دکھائی بلکہ اس نے غلاموں کے
کی تحقیر کے جذبات کا بھی پورا اظہار کیا تھا۔ سرکاری سکھ لیڈرشپ کے رویے کے پیش نظر اس بات کا سمجھ لینا
آسان ہے کہ گولڈن ٹیمپل کے سربراہ اروڑ سنگھ جیسے سکھوں نے جلیان والا باغ کے قتل عام کے بعد جنرل ڈائر
افزائی کیوں کی۔ دراصل جنرل ڈائر کی خدمت میں اعلیٰ ترین نذرانہ سروپا اور تلوار پیش کی گئی اور اسے ایک اعزازا
بنایا گیا۔ ہندر سنگھ کی کتاب دی اکالی موومنٹ (میکملن ۱۹۷۸) میں جس گفتگو کا اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ایک
چاپلوس خوشامدی کی جس کے لیے کوئی بھی تحقیر کافی نہیں تھی اور ایک ایسے آقا کی جو ہونٹوں پر طنزیہ تبسم کے ساتھ نو
کے ساتھ کھیل کرتا ہے، ایک مثالی بات چیت ہے۔ گفتگو کا اقتباس یہ ہے۔

"صاحب، آپ بھی نکلیسین صاحب کی طرح سکھ ہو جاؤ" (نکلیسین، جان نکلسن کا بگڑا ہوا تلفظ
شخص ۱۸۵۷ کا ایک انگریز ہیرو تھا) جنرل (ڈائر) نے اعزاز کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا مگر ساتھ ہی یہ اختلاف
"وہ انگریز افسر ہونے کی حیثیت سے اپنے بال نہیں بڑھا سکتا" جنرل ڈائر نے ایک اور اختلاف بھی کیا "میں سگ
بھی نہیں چھوڑ سکتا" "یہ تو آپ کو کرنا چاہیے" اروڑ سنگھ نے کہا "نہیں" جنرل نے کہا "مجھے بہت افسوس
مگر میں سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا" مہنت نے مفاہمت کرتے ہوئے کہا "ہم آپ کو اسے آہستہ آہستہ چھوڑنے کو
دے دیں گے"۔ "یہ میں وعدہ کرتا ہوں" جنرل نے کہا "ایک سال میں ایک سگرٹ کے حساب سے۔"

مگر اب سکھ اوران کے قائد ایک نئے عہد کے اوائل میں تھے جس میں وہ خودداری کے معنی از سر نو سیکھ ر
جلیان والا باغ کے بعد پنجاب انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ مہاتما گاندھی نے پنجاب کا دورہ کیا اور ان کی ہ
افزائی سے، انگریز دوست چیف خالصہ دیوان کے مقابلے میں ۱۹۱۹ کے موسم سرما میں سنٹرل سکھ لیگ کا قیام
آیا۔ لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کیا اور ۱۹۲۱ میں یہ اعلان کیا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اس کا مقصد
ہے۔ اس نے اروڑ سنگھ کا استعفیٰ طلب کر لیا۔ جب اس نے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو سکھوں نے اس کا ایک
جنازہ نکال کر اپنے ارادوں کا واضح اظہار کر دیا۔ بات اروڑ سنگھ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ۲۹ اگست ۱۹۲۰ کو مستعفی

ے بعد اس نئی سکھ قیادت نے قیاش مہنتوں کی طرف توجہ مبذول کی۔ ایک تحریک شروع کی گئی جسے نہ صرف ان سکھ ی اداروں کو قائم کرنا اور کوئی شکل دینا تھا جو آج بھی موجود ہیں، بلکہ اسے الحاد کے سیلاب پر بھی بند باندھنا تھا۔ یہ ۱۹۲۰ اور ۱۹۲۵ کے درمیان گردوارہ ریفارم موومنٹ۔

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ سکھ مصلحین، سامراجی حکومت کے لیے نسبتاً زیادہ خطرے کا باعث ہیں انگریزوں والی مہنتوں کی کھلم کھلا حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل ڈائر اور پنجاب کے گورنر سر مائیکل نے صرف قتل عام ہی کے سکھوں کا خون نہیں بہایا تھا بلکہ اس کے بعد سات مہینوں تک ہونے والے احتجاج کے دوران بھی خوب خون خرابہ کیا جس میں سینکڑوں افراد سڑکوں پر مارے گئے تھے اور ۸۵ کو سرسری عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق پھانسی پر چڑھا یا گیا تھا۔ جیل بھر گئے تھے اور ہزاروں کو کوڑوں کی سزا دی گئی تھی۔ پیٹ کے بل چلایا گیا تھا اور ذلت و تحقیر کے نہ جانے تنے طریقے استعمال کیے گئے تھے۔ سکھ اب گاندھی جی کے "نربھئے" یعنی بے خوف ہونے کے نعرے کی پیروی کرنے تیار رہتے۔ سنٹرل گردوارہ مینیجمنٹ کمیٹی (یا جو آج کل شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی "ایس جی پی سی" کے نام سے روف ہے) سکھ گردواروں کو مہنتوں سے اپنے اختیار و اہتمام میں لینے کے لیے بنی تھی۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو ۱۷۵ اراکین کی ایس جی پی کمیٹی کا الیکشن ہوا۔ (ایس جی پی سی کی حیثیت سکھ پارلیمنٹ کی سی تھی اور اس کے انتخابات میں زبردست مقابلے ہوتے تھے) ۱۴ دسمبر کو رضا کاروں کی ایک جماعت شرومنی اکالی دل کی تشکیل ہوئی، جو بالآخر ایک باقاعدہ سیاسی جماعت بن گئی جسے ہم لوگ آج جانتے ہیں۔ اکالی کا مطلب ہوتا ہے "غیر فانی" یہ اصطلاح سب سے پہلے گرو گوبند سنگھ نے ان لوگوں کے لیے استعمال کی تھی جو سکھ ازم کے تحفظ کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے پر راضی ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی پگڑیوں کا رنگ گہرا نیلا ہوتا تھا جو بعد کو اکالی پارٹی والوں کے پگڑیوں کا رنگ قرار پایا۔ اکالیوں کو نہنگوں سے ملانا ہیں چاہیے۔ ان کا یہ نام فارسی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے "گھڑیال" یعنی مگرمچھ۔ نہنگ قدیم سپاہیوں کے باقیات ہیں اور اکالی ایک سیاسی پارٹی جس نے اپنے آغاز سے آج تک ایس جی پی سی کو کنٹرول کیا ہے۔

مہنت ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان میں جو زیادہ طاقت ور تھے انھوں نے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ د مقابلوں کی کہانی اس عجیب و غریب تحریک کے کردار اور اس کی کامیابی کو بڑی اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کے ذہنوں پر گاندھی جی کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ چار سال سے زیادہ کے عرصے میں اور انتہائی ظلم و زیادتیوں کو برداشت کرنے کے باوجود گردوارہ تحریک غیر متشدد رہی، حقیقت تو یہ ہے کہ سکھوں نے عدم تشدد کے بڑے بے خوف مظاہرے

۱۹۲۱ء میں انگریزوں نے ایک مصالحتی بل پیش کیا جس میں گردواروں سے متعلق فیصلے کرنے کا حق کمشنروں بورڈ کو سونپا گیا۔ بہت سے مہنتوں نے فوراً ہی یہ اعلان کر دیا کہ ان کے مذہبی مقامات سکھ گردوارے نہیں بلکہ ہندو مندر ہیں انگریزوں نے حیلہ جوئی کی ہمت افزائی کی۔ اس صورت حال سے سکھ خوف زدہ ہوئے اور ہندو اندر اندر خوش۔ اکالی تحریک جاری رہا مگر پہلے ہی کی طرح پر امن۔ انگریزوں نے جب ایس جی پی سی کے نئے صدر پر جوش بابا کھڑک سنگھ سے جو بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے، گولڈن ٹمپل کی چابیاں لے لیں تو اکالیوں نے اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور ان کے مسلسل نے بالآخر انگریزوں کو چابیاں واپس کرنے پر مجبور کر دیا۔ گاندھی جی نے اس جیت کو قومی تحریک کی حقیقی فتح کہا۔ گردوارا کامیابی اگست ۱۹۲۲ میں گرو کا باغ گردوارے پر قبضہ کرنے کے لیے کیا جانے والا احتجاج تھا۔

امرت سر سے تیرہ میل دور واقع یہ مقام اس جگہ کی یادگار ہے جہاں پانچویں گرو ارجن گئے تھے۔ اس کے مہنت سندر داس کو بھی وہی عادتیں تھیں جن سے قاری اب واقف ہو چکے ہیں۔ بہرحال جنوری ۱۹۲۱ میں اس نے ایس جی پی سی سے کچھ مصالحت کر لی وہ خالصہ سکھ بننے پر راضی ہو گیا اور اپنی عادتوں اور شوق کا کچھ جواز پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنی داشتہ اشرو سے شادی کو بھی منظور کیا۔ مگر جب اس تعاون اور اس امداد پر اس کی نظر پڑی جو انگریزوں نے فراہم کو دی تھی تو اس نے معاہدہ توڑ دیا۔ ۹ اگست کو گرو باغ کے مقام پر سکھوں نے اپنا پر امن احتجاج شروع کیا۔ اس بار ان کے مقابلے پر مہنت کے غنڈے نہیں انگریز سامراج کی فوجیں تھیں۔

سکھوں نے اپنے کو جتھوں کی شکل میں منظم کیا۔ ہر جتھے میں زیادہ سے زیادہ سو افراد ہوتے تھے۔ جتھا صبح کے وقت گولڈن ٹمپل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی قسم کھاتا تھا اور پھر اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے لیے گردوارے کی طرف پیش قدمی کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو پولیس نے جتھوں کو گرفتار کرنا شروع کیا مگر جب جتھے ایک دوسرے بعد لگاتار آنے لگے تو پھر پولیس والوں نے لاٹھیوں اور لاتوں کا استعمال شروع کر دیا۔ سکھ خاموش کھڑے پٹتے رہتے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گرتے تھے اور انھیں اٹھوا کر جیل پہنچا دیا جاتا تھا۔ پر امن مدافعت کے اس غیر معمولی مظاہرے نے نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر کی دنیا پر بھی اثر ڈالا۔ ایک امریکی فلم ساز کیپٹین اے ایل ورگیز آیا اور اس نے ایک دستاویزی فلم "ہندوستانی شہادت کی خصوصی تصویر" بنائی۔ (انگریز حکام نے اس فلم پر پابندی لگانے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی) سوامی شردھانند اور حکیم اجمل خاں جیسے قوم پرست ہندو اور مسلمان لیڈر سکھوں کی حمایت میں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ موقع واردات پر ان لوگوں نے تقریریں کیں۔ کانگریس نے ایک تحقیقی کمیٹی دی جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ "ہر جگہ اور ہر موقع پر ضرورت سے زیادہ قوت استعمال کی گئی اور بعض مقامات پر

ں کا انتہائی بے رحمانہ استعمال ہوا تھا" (اس کمیشن میں امریکی مشنری ریورنڈ ایس ای اسٹوک بھی تھے) پنڈت مدن موہن ویہ نے کہا کہ اس کے بعد حکومت کی کارروائی کے لیے نفرت اور تحقیر کا اظہار ہر ہندوستانی کا فرض تھا۔ مہاتما گاندھی ے دوست ریورنڈ سی ایف اینڈریوز جو ہندوستانیوں کی مدد کو اہل کتاب بنانے آئے تھے خود اپنے ہم وطنوں سے آزادی وانے کے لیے یہیں رک گئے (۶۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ۵ اپریل ۱۹۴۰ء میں کلکتے میں ہوا۔) اور گرو کے باغ ا دورہ کیا اور وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں کہا کہ "غیر انسانی، بے رحم اور بزدلی کی کارروائی تھی اور یقین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ انگریزوں کی ایک اخلاقی شکست ہے۔ انھوں نے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ایڈورڈ میکلاگن سے احتجاج کیا۔ اس مار پیٹ کو روکنے کے لیے اس پر زور ڈالا۔ چار دن بعد ۱۷ ستمبر کو پولیس ہٹا دی گئی اس ساری کارروائی میں ۵۶۰۵ سکھ گرفتار اور ۹۳۶ کی مرہم پٹی ہوئی لیکن انھیں ایک اہم مورچے پر کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۹۲۵ء تک وہ اپنی جنگ بھی جیت چکے تھے۔ سکھ گردوارہ ایکٹ جس کی رو سے مہنتوں کی جگہ منتخب نمایندوں کو لینا تھی، قانون بن گیا تھا۔

گردوارہ احتجاج نے وہ راہ متعین کر دی جس پر سکھ تحریکوں کو مستقبل میں چلنا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں اپنے آپ کو پر امن طور پر گرفتاری کے لیے پیش کرنے کی یہ حکمت عملی ۷۷-۱۹۷۵ میں نافذ ہونے والی ایمرجنسی میں بھی بہت موثر ثابت ہوئی جب ہر روز گولڈن ٹمپل سے مسز اندرا گاندھی کی حکومت کے خلاف ایک جتھہ نکلتا تھا مگر اسی کے ساتھ سکھ سیاست کا ایک متشدد پہلو بھی تھا۔ گردوارہ احتجاج کے دوران ایک گروہ نے جو اپنے آپ کو ببر اکالی کہتا تھا اور جس کی قیادت حوالدار میجر کشن سنگھ بیدا انگ اور ماسٹر موتا سنگھ کر رہے تھے تشدد کو اپنایا۔ ببر کی قوت ہمیشہ محض اضافی رہی مگر انھوں نے (آج کے شدت پسندوں کی طرح) سکھ مفاد کے خیالی یا حقیقی "غداروں" سے "انتقام" لینے کے معاملے میں خصوصی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ انگریزوں نے باسٹھ ببر گرفتار کیے ان میں سے بائیس سرکاری گواہ بن گئے چھ کو خود اپنے ساتھیوں کی گواہیوں کی بنا پر پھانسی ہوئی باقی کو یا تو چھوڑ دیا گیا یا پھر مختلف مدتوں کی سزائیں ہوئیں۔

تحریک کا اصل نتیجہ وہ خلیج تھی جو پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کے مابین اب پختہ ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں شروع ہونے والی کشمکش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے جیسے پنجابی ہندو لیڈروں کی حمیت کے باوجود گرو کا باغ کے واقعے جیسے موقعوں پر ہندو عوام کے بڑے حصے کی ہمدردیاں مہنتوں کے ساتھ رہی تھیں جو خود بھی اپنے قبضے کو قائم رکھنے کے لیے گردواروں کو ہندو عبادت گاہ کہنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ سر گو چند نارنگ جیسے مقامی ہندو لیڈروں کا اصرار تھا کہ سکھ ہندوؤں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ راجہ نریندر ناتھ جیسے دوسرے

لیڈر نے پنجاب لیجسلیٹو کاؤنسل میں تقریر کرتے ہوئے (۵ اپریل ۱۹۲۱) پریوی کونسل کے ۱۹۰۲ کے اس فیصلے کا جو جس نے سکھوں کے ہندو ہونے سے اتفاق کیا تھا اور کہا کہ "میں سکھ ازم کو اعلیٰ سطح کا ہندو ازم سمجھتا ہوں... عوامی زبان میں ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیمات سے نہ تو کچھ کم ہے اور نہ زیادہ ..... اس بات سے آج سب ہیں کہ دو بھائیوں میں ایک ہندو ہو سکتا ہے اور دوسرا سکھ ..." ماجر نریندر ناتھ کی یہ بدقسمتی تھی کہ سکھوں نے زیادہ کسی بھی شکل میں ہندو نہ ہونا چاہا۔ سکھ، ہندو سلسلہ مراتب میں اپنے مقام سے متعلق کسی بحث میں پڑے بغیر یہ کہ سکھ ہونے پر مطمئن تھے بلکہ سکھ رہنے کے لیے بے چین بھی تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی اس سعی کو انھیں ہضم کر لینے کی ایک اور کوشش ہی سمجھا۔ سکھوں نے صرف اپنی شناخت کو برقرار رکھنا چاہا اور ان کی یہ خواہش بیسویں کی آٹھویں دہائی میں بھی ان کی اصل محرک ہے۔ گردوارہ تحریک کے ایک لیڈر مہتاب سنگھ نے ۸ اپریل ۱۹۲۱ء کو بحث میں حصہ لیتے ہوئے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں بڑے واضح طور پر کہا تھا "جہاں میرا سوال ہے میں کہتا ہوں کہ سکھ اگر ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو ہندو اس سلسلے میں ان پر زور کیوں ڈالیں، زبردستی انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیوں کریں؟ ناراضامند لوگوں کو اپنی کمیونٹی میں شامل کر کے انھیں کیا فائدہ ہوگا؟ یہی چیز ہے جو اس سارے جوش و خروش کی تہ میں ہے۔ ہندو کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمہارے معاملات کا اختیار سے انتظام کریں گے کہ تمہارے گردوارے کچھ تمہارے ہیں اور کچھ ہمارے۔ ہم کہتے ہیں کہ اپنے معاملات کو ہم سنبھالنا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔"

اور جناب والا: ۱۹۲۰ کے جوش و خروش کی تہ میں حقیقتاً یہی تھا اور بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے کی تہ میں بھی یہی عنصر ہے اور مہتاب سنگھ معتدل گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سکھ شعور کی بیداری نے کمیونٹی اور اس کے پیروؤں پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اکالیوں نے درحقیقت سکھ ازم کو بچا لیا۔ ۱۸۸۱ کی مردم شماری میں پنجاب (شاہی ریاستوں کو چھوڑ کر) ۴۸ر۳۴ فی صدی آبادی نے اپنے آپ کو ہندو لکھوایا۔ ۵ر۴۷ فی صدی مسلمان محض ۲۲ر۸ فی صدی سکھ۔ اور سکھ مزید کم ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں ۹۰ر۸ فی صد سکھوں کے مقابلے میں ہندو ۴۸ فی صد تھے۔ آریہ سماج کے اثرات کے بعد یہ ہندو ازم کا نقطۂ عروج تھا مسلمان بھی اس دہائی میں ۵۶ر۴۷ فی صد سے ہو کر ۳۹ر۴۷ فی صد رہ گئے مگر ۱۹۰۱ء میں سنگھ سبھا کی کوششیں بار آور ہونے لگی تھیں۔ اب سکھ ۹۲ر۸ فی صد ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۱ میں ان کی تعداد ۱۱ر۱۲ فی صدی، ۱۹۲۱ء میں ۳۸ر۱۲ فی صد اور ۱۹۳۱ء میں ۲۹ر۱۴۔۱ ۱۹۴۱ء تک بڑھ کر ۹۲ر۱۴ فی صد تک پہنچ گئے۔ مسلمانوں کی (شمشیر بکف بادشاہ کی مدد کے بغیر) جو تعداد ۱۱

۴۷ر۲ فی صد تھی، بڑھ کر ۱۹۴۱ء میں ۵۲ر۸۸ فی صد ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب میں ہندو آبادی محض
۲۹ فی صدی تھی اور وہ زیادہ تر شہروں میں بسی ہوئی تھی، صرف ۸ر۳۶ فی صد سکھ شہری علاقوں میں رہتے تھے
ت تک صرف چھ فی صدی ہندو اپنے آپ کو آریہ سماجی کہتے تھے۔

اس بال بال بچنے کے بعد، اکالی سیاست صرف اپنے عقائد کے خصوصاً ہندو ازم سے تحفظ کے سہارے زندہ
ی۔ اسے الفاظ میں کہا جائے یا نہ کہا جائے، اکالی ذہن کے پیچھے یہی یقین ہے جس کا اظہار سب سے پہلے گرو گوبند سنگھ
تھا کہ عقائد کی حفاظت، سیاسی قوت پر قبضہ کیے بغیر نہیں ہو سکتی اور چوں کہ ایسی قوت کا امکان ایک ایسے علاقے کے
ں ہے جہاں سکھوں کی اکثریت ہو، اسی لیے ایک سکھ وطن کا حصول ناگزیر ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی اور اس
بعد بھی سوال یہ تھا کہ آیا یہ وطن ہندو اکثریت والے ہندوستان کی حدود کے اندر واقع ہوگا یا اس کے باہر سکھوں
حلقہ اس سوال کا جواب دینے میں ہمیشہ مختلف درجوں کا ابہام رکھتا ہے۔ اس کے اولین لیڈر ماسٹر تارا سنگھ تھے۔

۷

پیچیدہ اقلیت

اس صدی کی چوتھی دہائی میں سکھوں کے سامنے ایک مسئلہ تھا۔ ان کی تعداد بہت نہیں تھی۔ غیر منقسم ہندوستا کی آبادی کا محض ایک فی صدی حصہ اور غیر منقسم پنجاب میں بکھرے ہوئے چودہ فی صدی۔ اس دہائی کی سب سے بڑ بحث "تقسیم ہوں یا تقسیم نہ ہوں" میں انھوں نے اپنے آپ کو کناروں پر کھڑا ہوا پایا۔ انگریز اگرچہ اپنے عہد کی آخری منزل میں تھے مگر نئے گھروں کی بات سننے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اکالیوں نے محسوس کیا کہ نظری طور پر وہ ایک تاریخی د رکھ سکتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں ہے جہاں وہ اپنے خواب کی تجسیم کر سکیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صوبۂ پنجاب میں سکھوں کی اکثریت والا کوئی علاقہ تھا ہی نہیں اور یہ بات کانگریس، مسلم لیگ اور انگریز سب جانتے

۱۹ویں صدی کے نصف آخر کے تجربے اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں قابل لحاظ چودہ فیصد ہونے کے لیے کی جانے والی جدوجہد نے مسیحاؤں (اکالی لیڈروں) کو مریض کی حالت پھر سے خراب ہو جانے کے امکانات کی طرف سے بہت محتاط کر دیا تھا مزید یہ کہ سکھ ازم کو ختم کرنے کے لیے محض آریہ سماج کا دوبارہ احیاء ہی نہیں بلکہ نوآبادیاتی نظام کے بعد کی زندگی کی حقیقتیں بھی تھیں انگریزوں کا راج ختم ہونے والا تھا اور اندیشہ تھا کہ خالصہ تشخص کی بنا پر ملازمتوں میں ترجیح جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ شہری نوکریاں صلاحیت اور سیکولر تعلیم کی بنیاد پر مہیا ہوں گی۔ ایک نسل میں اپنے آپ کو شیونگ بلیڈ سے بچا کر رکھنے یا خاموشی سے کرپان باندھ لینے کے لیے شاید کافی مستحکم عقائد نہ ہوں (جیسا کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ ہائی جیکنگ کے اس دور میں تلوار انتہائی غیر عملی چیز بن گئی) تو پھر سکھ کہاں ہوں گے کہیں بھی نہیں اگر وہ گوبند سنگھ کی عطا کی ہوئی شناخت کے بغیر کوئی سکھ اور ہندو میں تمیز کیسے کرے گا؟ ان حقائق میں ایک اور معمولی سی حقیقت شامل کر لیجیے اور وہ یہ کہ اگر سکھ ازم پنجاب سے معدوم ہو گیا تو پھر وہ روئے زمین ہی سے ناپید ہو جائے گا۔ اگر ہندوستانی مسلمان تباہ ہو جائے، اسلام زندہ رہے گا وہ چاہے جنوب مشرقی ایشیا میں ہو یا وسطی ا

ایشیا میں یا افریقہ میں۔ مگر سکھ ازم کی پنجاب کے علاوہ کوئی جغرافیائی بنیاد نہیں ہے اور خود سلیمان رینج سے دریائے
ن پھیلے ہوئے اکیس[۲۹] اضلاع کی اس سرزمین میں، جس پر ابھی محض سو سال قبل سکھوں نے بڑے فخر کے ساتھ حکومت
، ایک ضلع بھی ایسا نہیں جسے سکھ اپنا کہہ سکے۔ یہ ایک انوکھا اور پیچیدہ اقلیتی مسئلہ تھا اور جس کا حل اکالی قیادت
یک گروہ کے مطابق ایک سکھ مذہبی ریاست کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، اور یہی گو مگو کا عالم تھا جس نے
یا صدی کی دوسری دہائی میں وجود میں آنیوالی سکھ قیادت کو ایک خود مختار سکھ ملک کے خیال کو زندہ رکھنے کی خاطر اپنائے
ر مجبور رکھا، سکھ ایک ایسے آبادیاتی اور سیاسی ماحول میں رہ رہے تھے جس میں انھیں اپنے ان جذبات کے کھلم کھلا
ر کا موقع نہیں ملا مگر ان کی یہ محرومی اس کے وجود پر پردہ نہیں ڈالتی ہے۔

چوتھی دہائی میں سکھوں کا مسئلہ یہ تھا کہ انھیں ایک طرف مسلم لیگ کے عفریت اور دوسری طرف ہندو اکثریت
لے ہندوستان کے بہت گہرے اور بہت نیلے سمندروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اپنی پسند کے انتخاب
وئی بہت موقع بھی نہیں تھا۔ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹفورڈ کرپس کی خدمت میں ایس جی پی سی نے ایک میمورنڈم رکھتے
ے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سائمن کمیشن کے تجزیے کو پیش کیا تھا؟ سکھ ازم ایک صلح جویانہ مسلک تھا مگر مسلمانوں
ے سیاسی ظلم اور ہندوؤں کی سماجی زیادتیوں نے اسے ایک عسکری مسلک میں تبدیل کر دیا۔ دو استبدادوں کے درمیان
نتخاب کی صورت میں ہندو استبداد ترجیحی تھا۔ تقسیم سے پہلے پنجاب ایک واضح مسلم اکثریت کا صوبہ تھا (۵۳ فی صدی)
یہ فوقیت مزید توانا ہو جاتی تھی مغرب میں ملحقہ علاقوں کی مسلم اکثریت کی وجہ سے۔ یہ علاقے تھے، ڈیرہ غازی خان، مظفر
ڑھ، میانوالی، اٹک، جہلم، راولپنڈی، شاہ پور، گجرات، جھنگ، ملتان، بہاولپور، لائل پور، منٹگمری لاہور اور
گوجرانوالا کے۔ اسی طرح حصار، روہتک، گوڑگاؤں، کرنال، ہوشیارپور اور مشرق کے پہاڑی علاقوں میں ہندوؤں
ر (۳۰ فی صدی) برتری حاصل تھی۔ سکھ ہر جگہ اقلیت میں تھے یہاں تک کہ ان مرکزی اضلاع میں بھی جہاں ان کی
سب سے زیادہ تعداد مرکوز تھی۔ وہ، امرت سر، فیروزپور، گورداس پور، لدھیانہ اور پٹیالہ میں ۲۰ سے ۴۲ فی صدی
تک تھے۔ (گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت ۵۰.۴۱ فی صدی تھی) مگر یہ ضلع تقسیم کے وقت، جموں کشمیر کو ملانے
والی سڑک فراہم کرنے کے لیے ہندوستان کو دیا گیا۔ (یہی وہ سڑک ہے جسے پاکستان ہندوستان سے ہونے والی
۔ جنگ میں کاٹنے کی کوشش کرتا ہے) مزید خرابی کی بات یہ تھی کہ سکھ تقسیم ہونے والے پنجاب کے دونوں حصوں میں
تقریباً برابر برابر بٹے ہوئے تھے۔ تقریباً بیس بیس لاکھ۔ ان میں سے ایک حصے کو ہندوستان میں آنا تھا اور دوسرے
کو پاکستان میں۔ اور ان کے متمول ترین علاقے، مغرب کے وہ حصے تھے جہاں آب پاشی کے لیے نہریں تھیں اور جو

اگر پاکستان حقیقت بنا تو انھیں چھوڑنا پڑے گا۔

سکھ تعداد میں کم تھے مگر خوش حال تھے۔ غدر کے بعد کی انگریزوں کی عنایتیں تھیں جن کی وجہ سے مرکزی اضلاع میں سکھ سب سے بڑے زمیندار تھے۔ مثلاً لاہور ڈویژن میں زمین کے کل لگان کا تقریباً ۴۲ فی صدی حصہ یہ لوگ دیتے! تجارت اور سود پر روپیہ چلانے کے کاروبار میں اپنی فوقیت کی وجہ سے ہندو دوسرے نمبر پر آتے تھے (سود کا کاروبار کرنے والے فرقے سکھوں میں بھی تھے جیسے اروڑہ) تقسیم سے پہلے لاہور میں ۲۹۰۰ کروڑ روپیوں کا سرمایہ لگا تھا ان میں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ۱۲ر۵ کروڑ روپے تھے۔ بنکوں کی نوّے شاخوں میں سے صرف تین مسلمانوں کی ملکیت تھیں اور بیمہ کمپنی کی نوّے شاخوں میں سے صرف دو کے مالک مسلمان تھے۔ کرپال سنگھ اپنی کتاب "دی پارٹیشن آف پنجاب" (پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ) میں لکھتے ہیں۔ "زراعت کے بعد ساہوکاری سب سے اہم تجارتی سرگرمی تھی مغربی پنجاب کے مسلمان کاشت کار من حیث الجماعت ملتان اور راولپنڈی ڈویژن کے ہندو اور سکھ ساہوکاروں کے قرض دار تھے۔ اس اقتصادی تسلط نے مسلمانوں کے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی تھی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے اقتصادی استحصال کے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵۷ لاکھ مسلمان مشرقی پنجاب میں ۴۷ لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ کر پاکستان گئے۔ دوسری طرف ۴۹ لاکھ سکھ اور ہندو ۶۷ لاکھ ایکڑ زمین پاکستانی پنجاب میں چھوڑ کر ہندوستان آئے۔ اس حقیقت کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ مغربی پنجاب کی زمین کوالٹی کے اعتبار سے بہتر تھی، تو بھی یہ اعداد و شمار فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخر میں بنگال کی طرح مسلم لیگ نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زرخیز زمینوں کا لالچ دے کر مشرقی پنجاب کے مسلمان کاشت کاروں کو پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ اُس وقت ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ اس تسلط کی جگہ ایک نیا تسلط لے لے گا۔

پنجاب کے اس سہ رکنی مسئلے کے حل کی کوششوں کی بازگشت فضا میں بہت دنوں سے تھی۔ ۱۹۴۲ء کی گول میز کانفرنس میں سکھوں نے ایک بڑا سیدھا اور سچّا حل تجویز کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسّی فی صد سے زیادہ مسلمان آبادی والے علاقے راولپنڈی اور ملتان کے بارہ اضلاع کو خارج کر دیا جائے تو مسلمان اور غیر مسلموں کے مابین توازن برابر ہو جائے گا۔ مسلم لیگ ایسی تجویزوں پر کان دھرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہی تھی جو مغرب میں افغانستان کی سرحدوں سے، دہلی کے مشرق میں علی گڑھ تک، شمال میں کشمیر چین کی سرحد اور تبت سے لے کر جنوب میں راجستھان کے جیسلمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی جو جناح صاحب نے پاکستان حاصل کرنے کے بعد کہا تھا کہ انھیں ایک "کرم خوردہ" پاکستان ملا ہے۔

۱۹۴۰ تک، پنجاب کے لیے چار حل پیش کیے جا رہے تھے۔ کانگریس ایک غیر منقسم ہندوستان چاہتی تھی مگر اس نے
دن کی اضافی شرط یعنی پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا جائے، مان لی تھی۔ مگر یہ یقینی تھا کہ بہرحال دونوں حصے ہندوستانی وفاق
میں رہیں گے۔ مسلم لیگ پاکستان چاہتی تھی، تیسرا اور چوتھا حل ایک غیر منقسم خودمختار پنجاب تھا، وہ چاہے انڈین یونین میں
چاہے اس سے باہر؛ اس میں سے جو بھی صورت ممکن ہو۔ آخری صورت کی وکالت یونین پارٹی کے ناقابلِ تسخیر
ندر حیات خاں بالکل اس طرح کر رہے تھے جس طرح ان کے ہم رتبہ، فضل حق بنگال میں، لیگ اور کانگریس
مابین ایک متوسط اور خودمختار حل کے لیے کوشاں تھے۔ یونینسٹ ایک شہری مخالف، کسانوں کی پارٹی تھے
ان کی اپیل، بلا امتیاز مذہب زمین کے جوتنے والے سے تھی۔ سکندر حیات نے، سر چھوٹو رام کے ساتھ مل کر، بڑی کامیابی
سے ساتھ ہندو اور مسلمان کسانوں کا ایک ایسا اتحاد قائم کر لیا تھا جس نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو دیہی پنجاب
سے دور دور رکھا۔ سر سکندر حیات ملتان لیگ میں اس وقت تک بہت سرگرم تھے۔ جب تک کہ مسلم لیگ کے علیحدگی
پسندانہ جوش و خروش نے انھیں اس کی طرف سے مایوس نہیں کر دیا۔ جناح صاحب نے شعوری طور پر انھیں اس
ریزولیوشن کا مسوّدہ بنایا جو بعد کو پاکستان ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہوا۔ اور جسے مسلم لیگ نے اپنے ۱۹۴۰ والے
لاہور سیشن میں منظور کیا تھا مگر اس بات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس ریزولیوشن میں خود پاکستان کا ذکر بالکل
نہیں تھا۔ سر سکندر حیات خاں نے ۴ مارچ ۱۹۴۱ء کی پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی اپنی مشہور اور بار بار دہرائی جانے والی تقریر
میں یہ نکتہ بار بار دہرایا کہ جب یہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا اس وقت اسے لاہور ریزولیوشن کہا گیا تھا، پاکستان کا لفظ
استعمال نہیں ہوا تھا..... " سر سکندر حیات کو پاکستان کے خیال سے بالکل ہمدردی نہیں تھی جو خود مسلمانوں کے نقطہ
نظر سے ناپسندیدہ تھا۔ انھوں نے پنجاب کے کسانوں کو تقسیم کے خطرات سے متنبہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا " ہم
آزادی کا مطالبہ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ یہاں ایک مسلم حکومت ہو گی اور دوسری جگہ ایک ہندو راج۔ اگر پاکستان
کا مطلب یہی ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے..... اگر آپ پنجاب کے لیے حقیقی آزادی یا دوسرے لفظوں میں ایسا
پنجاب چاہتے ہیں جس میں ہر فرقے کو اقتصادی اور انتظامی امور میں، مشترکہ ساتھیوں کی طرح واجب حصہ ملے گا تب پنجاب
پاکستان نہیں ہو گا بلکہ وہ صرف پنجاب ہو گا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب، پنجاب ہے اور کوئی کچھ بھی کہے وہ ہمیشہ پنجاب
رہے گا۔ یہی وہ سیاسی مستقبل ہے جو میں کسی بھی نئے آئین کے تحت اپنے صوبے اور اپنے ملک کا دیکھتا ہوں "

آپ اس سے زیادہ مطلق اور منطقی نہیں ہو سکتے۔ سر سکندر حیات خاں نے ایک سات منطقوں میں بٹے ہوئے متحدہ
ہندوستان کی تجویز رکھی تھی جس میں ہر منطقہ (زون) میں ایک مضبوط نیم خودمختار علاقائی اسمبلی تھی اور مرکز کے پاس دفاع

امور خارجہ، رسل و رسائل اور کرنسی کے محدود اختیارات تھے انھوں نے اپنے بس بھر کوشش کی کہ مسلم لیگ ان کے اس
کو مان لے، جب مسلم لیگ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ سے استعفا دے دیا۔
بھی ۱۹۴۶ کے انتخابات میں اپنے رول سے پنجاب یعنی ہندوستان کے مستقبل کو ایک بڑا ڈرامائی موڑ دے سکتے تھے
دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا ان کے جانشین پنجاب کے وزیر اعظم سر خضر حیات خاں اس خطرہ کا مقابلہ نہ کر
جو جناح صاحب اور ان کے جاگیردار اور ملا مزاج دستے نے پھیلا دیا تھا۔

بدقسمتی سے سکھ، سر سکندر حیات کی طرف سے ہمیشہ مشکوک رہے، وہ مسلمانوں کی تاریخی غیر معتبری پر حادی نہ
وہ نئے اورنگ زیب اور نئے جناح کو تو سمجھ سکتے تھے مگر نئے اکبر اور نئے رنجیت سنگھ سر سکندر کو نہیں سمجھ سکتے تھے
آزادی کا مژدہ فضا میں تھا کہ انھوں نے اور کسی سے نہیں، جناح صاحب سے لین دین کرنے کی کوشش کی۔ ایک مال د
مالیات کا سردار بلدیو سنگھ جو اس وقت تک سکھوں کے اصل نمائندے بن چکے تھے اور جلدی ہی وزیر دفاع کی حیثیت ۔
نہرو کی کابینہ میں شامل ہونے والے تھے اور مہاراجہ پٹیالہ (جو ایک ریاست کے سربراہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ش
ہونے کا تکنیکی حق رکھتے تھے) دونوں نے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں سے پاکستان کی حدود کے اندر ایک سکھ ر
کے قیام کے امکان پر تبادلۂ خیال کیا۔ جناح صاحب اور لیاقت علی خاں نے تجویز کو مان لیا اور اس حد تک کہ سکھوں کو،
مسلم سکھ پاکستان میں اپنے فوجی ادارے بھی قائم کرنے کی اجازت دی مگر سکھوں نے الگ ہونے کے حق پر اصرار کیا ج
کہ جناح صاحب جیسا منطقی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا (اگر جناح صاحب میں کچھ لچک ہوتی تو پاکستان
نہ بنا ہوتا یا پھر اس سے کہیں بڑا ہوتا جیسا وہ بنا) ہندوستان نے بہرحال سیاسی پارٹیوں کو الگ ہونے کے حق کی
تبلیغ و تلقین کی اجازت دی۔

اس وقت تک اکالی قیادت پورے طور پر ماسٹر تارا سنگھ کے ہاتھ میں آچکی تھی جنھوں نے ۱۹۲۵ء میں داجب الـ
بابا کھڑک سنگھ کی قائم مقامی اختیار کر لی تھی۔ تارا چند ملہوترا ذات کے ایک ہندو کے گھر میں راولپنڈی ضلع کے ایک گاؤں
میں ۲۴ جون ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ابھی اسکول ہی میں تھے جب وہ سکھ ہو گئے اور اسی وجہ سے ان کے
کے ساتھ سنگھ لگ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے پنجاب کے گورنر سر چارلس ریواز کے خلاف ایک مظاہرے کو منظم کر کے خالصہ
کالج میں ایک طالب علم کی حیثیت سے خاصی چپقلش پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے معلمی کا ڈپلوما کیا اور ایک مقبول ماسٹر بن گئے
یہی ماسٹر کا لقب تھا جو تاحیات ان کے نام کے ساتھ لگا رہا۔ ریاستی سطح پر انھیں امتیاز ان کے اس رول کی وجہ سے ملا جو ا
نے گردوارہ اصلاح تحریک میں ادا کیا۔ ۱۹۲۵ء تک وہ نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ تقسیم اور بازآبادکاری کے مشا

ب سے زیادہ با اختیار اور با اثر اکالی سیاست داں تھے۔ ان کا یہ اختیار اور اثر ۱۹۶۱ء میں ان کے ایک مرن برت پر
اجب ان کا۔ برت شہادت کے بجائے ایک کھانے پر اختتام پذیر ہوا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ سکھ وطن کی، جس کا کہ سکھ مطالبہ کر رہے تھے، نوعیت کے سلسلے میں وہ غیر واضح
ں کی اس غیر واضح کیفیت میں بڑا تسلسل تھا۔ درحقیقت اکالیوں اور قابل احترام مہاتما گاندھی کے درمیان جو خلیج
، وہ اسی مسئلہ پر ہوئی، جب گاندھی جی نے اکالیوں سے ایک "سکھ راج" کے خیال کو باقاعدہ ترک کرنے کے لیے کہا۔
نے گاندھی جی سے ایسا کوئی وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی ساری عمر سکھوں کے مذہبی اور سیاسی
کو مخلوط کرنے میں لگا دی۔ اور شعوری طور پر سکھوں کو کانگریس سے دور کرنا شروع کر دیا جو چاہتی تھی کہ سکھ، مذہب
ت سے الگ رکھیں۔ اور اپنے گردوارے سکھوں کے سپرد کر دیں اور ووٹ کانگریس کو دیں ۱۹۳۷ کے انتخابات
ر تارا سنگھ کانگریس کے ساتھ کسی طرح کے بھی تعاون کے خلاف تھے۔ اگرچہ اکالی پارٹی کی اکثریت نے ایک متحدہ محاذ کے
یصلہ کیا (اس الیکشن میں یونینسٹ پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی اور اکالیوں کو صرف دو نشستیں ملی تھیں)
دیں صدی کی چوتھی دہائی میں، ماسٹر تارا سنگھ اکالیوں کو ایک ایسے مسئلے پر کانگریس سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے
اپنے مفادات کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ تھا مسلح افواج میں بھرتی کا۔ اگر ایک طرف مہاتما گاندھی اور کانگریس
نہ کی جنگی کوششوں میں شریک ہونے سے انکار کیا تو دوسری طرف ماسٹر تارا سنگھ نے دوسری جنگ عظیم کو سکھوں
ہی افواج میں اپنی اس پرانی حیثیت کو بحال کرنے کا ایک سنہری موقع تصور کیا، جو ان کی "غیر وفادار" گردوارہ
ورمنٹ کی وجہ سے سزا کے طور پر کم ہو گئی تھی۔

۱۹۴۲ تک اکالیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ انگریز ان کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ یورپی جنگوں میں اپنے آپ
بناد ینے پر راضی ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کے بعد کے ہندوستان میں ایک سکھ وطن کی کوئی ضمانت نہیں
شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی (ایس جی پی سی) نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۲ کو سر اسٹفورڈ کرپس کو ایک میمورنڈم
ا یہ شکایت کی گئی تھی کہ سب سے زیادہ وفادار ہندوستانیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک منصفانہ نہیں ہے

"سکھ فرقے کے مفادات سے بڑے افسوس ناک طریقے پر غداری کی گئی ہے انگریزوں کے آنے کے بعد
سے فرقے نے ساری قلمرو کے ہر میدان کے ہر معرکے میں انگلستان کے لیے لڑائی لڑی ہے۔ اس کا جواب یہ
ہے کہ پنجاب میں ہماری حیثیت، جسے قائم رکھنے کا انگلستان نے وعدہ کیا تھا، اور جس میں ہمیں ایک ممتاز اور
مقام حاصل تھا، قطعی طور پر ختم کر دی گئی۔"

سکھ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کے بیس لاکھ افراد ایک مسلم اکثریت والے ملک میں چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اس کانگریس پر بھی اپنی طرف سے بے توجہی برتنے کا الزام لگانا شروع کیا، اس حقیقت کے پیش نظر کہ سکھ ہمیشہ کانگریس مقابلے میں انگریز کے کہیں زیادہ وفادار رہے، یہ ایک عجیب و غریب الزام تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء کو امرت سر گاندھی اور مسٹر جناح کو ملعون کرنے کے لیے سکھوں کا ایک جلسہ ہوا۔ گیانی کرتار سنگھ (اگلے دن کے اخبار سول ملٹری گزٹ میں رپورٹ) نے عام جذبات کا اظہار کیا تھا جب انھوں نے کہا "اگر برطانوی سنگینوں کے زور پر پاک سکھوں کے سر پر مسلط کر دیا گیا تو ہم اسے اس طرح چیتھڑے چیتھڑے کر دیں گے جس طرح گرو گوبند سنگھ نے مغ سلطنت کو پارہ پارہ کیا تھا"۔ گرو گوبند سنگھ بھی مغل سلطنت کو پورے طور پر پارہ پارہ نہیں کر پائے تھے اور نہ ہی گ کرتار سنگھ پاکستان کے قیام کو روک سکے۔ یہی جلسہ تھا جس میں ماسٹر تارا سنگھ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان بن کر رہے گا، ایک خود مختار سکھ ملک کا باقاعدہ مطالبہ کیا۔ یہ خیال ایک ناممکن مطالبہ سمجھ کر اسی وقت رد کر دیا گیا" ساتھیوں کے تمام شکوک و شبہات کے باوجود، ہم دیکھیں گے کہ کم از کم تارا سنگھ، اپنی ساری زندگی چولے بدل بدل کر ناممکن بات کو ممکن بنانے میں صرف کر دیں گے۔

پاکستانی پنجاب کے چالیس لاکھ ہندوؤں اور سکھوں اور ہندوستانی پنجاب کے اتنے ہی مسلمانوں کا مسئلہ سیاست کے اُن تنخواہ دار ٹھگوں اور مجرموں کے ذریعے طے کر دیا گیا جنھیں ان لوگوں نے دنیا کی تاریخ کے بدترین جرموں میں موت کے لیے مقرر کیا تھا۔ مسلم لیگ تبادلِ آبادی کی بات بہت دنوں سے کر رہی تھی مگر اس پر کسی نے بھی کان نہیں دھرے یہ تک کہ مسلمانوں نے بھی اسے نہیں سنا۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر مسٹر افتخار حسین نواب آف ممدوٹ کا ایک بیان ۱۲ ۱۹۴۶ کے پارٹی کے ترجمان "ڈان" میں شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے کہا تھا کہ تبادلِ آبادی مسلمانوں کی کثیر الانواع کا انتہائی عملی حل تھا۔ آبادی کا تبادلہ، ــــــــ پاکستان کے خلاف کانگریس کی طرف سے بار بار پیش کی جانے والی کا مسکت جواب ہوگا۔ ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے چند ماہ قبل تک، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں نے (اگرچہ یہاں کے مسلمان ملک بھر میں سب سے زیادہ غیر محفوظ تھے) اس وطن کی سرزمین کی طرف جانا منظور نہیں کیا تھا جو جناح صاحب انھیں پیش کر رہے تھے۔ دوسرے پنجاب میں ہندو اور سکھ بھی اس مخمصے میں گرفتار رہے ایسا لگتا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ گاؤں جن میں وہ صدیوں سے رہتے چلے آ رہے تھے اس لیے شمشان بن جائیں گے یا پڑوسی، پڑوسی کی جان لیں گے، بچے قتل ہوں گے، ماؤں اور بہنوں کی عصمت دری ہوگی انھیں نیزوں کی سنانوں سے لہولہان کر کے مارا جائے گا اور یہ سب کچھ چند مٹھی بھر سیاست دانوں کی حرص کی بنا پر

ریخ میں ۱۹۴۷ء جیسے منظم ظلم و ستم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

پنجاب کی تقسیم کا سب سے بڑا راز اور غور کرنے کی بات یہی ہے کہ یہاں کے عوام نے اپنے نئے ملکوں کا رخ پروپگنڈے
یا اشتعال انگیزی کے باوجود ہندوستان کی تقسیم سے قبل نہیں بلکہ اس کے بعد ہی آخر کیوں کیا۔ اس کا منطقی جواب یہی ہے کہ
، اپنی زمینوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جب تک کہ سیاست داں ان کے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہی نہ چھوڑیں
یچ ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نہ تو چالیس لاکھ مسلمان اور نہ ہی چالیس لاکھ ہندو اور سکھ ان گاؤں کو چھوڑنے
لے تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی چنانچہ مارچ ہی کے مہینے میں مسلم لیگ نے اس علاقے میں ہندو اور سکھ مخالف فسادات
روع کروا دیئے جواب پاکستان ہے۔ تین مہینے بعد سکھوں نے مسلمانوں کو مار بھگانے کے لیے اپنے بدمعاشوں کو منظم کرنے
کامیابی حاصل کر لی۔ جون میں تقسیم کا اعلان ہوا اس کے بعد بھی مایوسی اور ناامیدی کے قافلوں نے وسط اگست تک انتظار
ا۔ غالباً نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ سکھ کوئی بھی یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ تقسیم کا دراصل کیا مطلب ہوگا۔

جیسا کہ وی پی مینن نے اپنی کتاب "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" (صفحہ ۴۳۶) میں لکھا ہے کہ اگست کا مہینہ
عجیب و غریب ڈھنگ سے برطانوی مقدر سے جڑا ہوا ہے۔ یہ ۱۷۶۵ء میں اگست کا ہی مہینہ تھا جب شہنشاہ
ہ عالم دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا حق عطا کیا تھا، ۱۸۵۸ء میں بھی یہ اگست ہی
مہینہ تھا جب برطانیہ کے تاج شاہی نے ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لی تھی (مینن
یہ اضافہ اور کر سکتے تھے اور وہ یہ کہ اگست ۱۸۵۷ء ہی میں دہلی کے سپاہیوں سے جنگ میں اگلے نوے سال کے
ہندوستان کا مقدر طے ہوا تھا) اور اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان سے چلے گئے۔" اگست کے آخر میں پنجاب
کھیت خون سے لالہ زار ہو گئے۔ پناہ گزیں جو ابھی تک پندرہ اگست سے پہلے اکے دکے تھے اب ان کے
لوں کے قافلے سرحد پار کرنے لگے۔ ہولناک تفصیلات کے اعادہ سے کوئی فائدہ نہیں صرف اتنا کہنا کافی ہے
ہ قافلے اور وہ ٹرینیں ملاریوں اور لاشوں کے وہ کارواں اپنے اندر اتنا زہر لے کر چلے جو آج بھی برصغیر میں، زندگی کو
کرنے کے لیے کافی ہے لیڈروں نے بہت کچھ کہا اور اسے بار بار دہرایا ہے۔ یہاں پر مصنف ایک جمعدار
ج میں ایک نان کمیشنڈ افسر) کی تحریر کا حوالہ دینا چاہے گا جو اس نے جالندھر میں اپنے ایک گاؤں سے مشرقی کمانڈ کے
، میجر کو ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو بھیجی تھی۔ (یہ اقتباس سر فرانسس ٹکر کی خود نوشت سوانح عمری "وائل میموری سیروز"
لیا گیا ہے۔) "یہ ملک ۱۶ اگست سے میدان کارزار بن گیا ہے۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں پر حملہ کرتا ہے اور
کمیونٹی دوسری کمیونٹی پر۔ ایک ہفتے تک کوئی بھی سو نہیں سکا۔ گاؤں تباہ کیے جا رہے ہیں اور ہزاروں مارے

جا رہے ہیں یا زخمی ہو رہے ہیں۔ میرے گاؤں میں ہر طرف آگ ہے اور دھواں۔ ملک میں ہر روز لاتعداد اموات ہو رہی ہیں۔" جمعدار نے نہایت صفائی سے لکھا اور صحیح لکھا۔ ۱۵ اگست کو یہ ایک ملک تھا، ۱۶ اگست کو یہی ایک میدانِ جنگ بن گیا۔ سکھ اور مسلمان دیہاتی جو ابھی ۱۵ اگست تک جہانگیر سے ابدالی اور ابدالی سے جناح تک ہر اشتعال انگیزیوں کے باوجود ساتھ ساتھ رہ رہے تھے، چشم زدن میں بٹ گئے۔ اور اس کا انجام بس وہ تھا جیسے جمعدار اس کرب اور تعجب کے ساتھ دیکھتا رہا جو ایک ناقابلِ یقین چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ہر روز اور آج بھی ملک میں بے شمار حادثات ہوتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن لوگوں نے ہندوستان کو تقسیم کرایا تھا آیا وہ بھی اس ادبار کے بعد احساس جرم کا شکار ہوئے ہیں؟ ۱۹۱۹ کے بعد جنرل ڈائر سکون کی نیند نہ سو سکا، مگر وہ تو صاحب ضمیر تھا، کیا ان کی بھی، جنھوں نے ہزاروں اور لاکھوں (جو تخمینے دیئے گئے وہ دو لاکھ سے پانچ لاکھ تک کے ہیں) مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کرایا تھا کسی ایک رات کی نیند اڑی۔ ان لوگوں کی نیند اڑنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی، نہ ہندوستان میں اور نہ ہی پاکستان میں، مگر پھر کون ہے جو خود اپنے بارے میں سچی باتوں کو یاد رکھنا چاہتا ہے۔ نفرت کے محضر کی سرفہرست کسی گوری چمڑی والے کا نام رکھ دینا اور نہایت خاموشی کے ساتھ برصغیر کے سانولے بدمعاشوں کو جو بدتر قسم کے مجرم تھے، نظر انداز کر دینا بہت آسان ہے۔

ہندوستان کو پنجاب کے ۲۹ اضلاع میں سے ۱۳ اضلاع اور ۳۸ فی صدی زمین ملی، جو راستے میں گئے انھیں ملا کر بیس لاکھ سکھ اپنی زمینیں اور ۱۵۰ مذہبی مقامات چھوڑ کر اُدھر سے اِدھر آئے۔ بیساکھی کے دن (۱۹۴۷) کو ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ۲۸۰ پیروؤں نے گولڈن ٹمپل میں جنگ کا عہد کیا اور نعرہ لگایا "پاکستان = موت" اس نعرے نے اور کچھ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو، اگلی تین دہائیوں میں، ایک چیز کو ضرور روک دیا اور وہ ہندوستان کے خلاف سکھ اور پاکستانیوں کے مابین کوئی خفیہ معاہدہ حقیقت تو یہ ہے کہ سکھ ہندوستان کی سرحدوں کے زیادہ سے زیادہ پُرجوش پاسبان بن گئے اور ان کے اس جذبے نے انھیں ایک وطن فراہم

۸

سودے باز

پنجاب میں اس دو طرفہ ترکِ وطن نے بھی سکھوں کا بنیادی مسئلہ حل نہیں کیا اب بھی پنجاب میں ان کی تعداد کافی
ی تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے سرکنی حساب میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ میں توازن کو
ررلما ان کے ہاتھ میں ہے۔ تقسیم کے بعد کا لیکھا جوکھا یہ ہے کہ وہ سارے پنجاب میں سابق شاہی ریاستوں کو
رنے کے بعد ۱۹۵۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی رو سے ۶۲ر۳ فی صدی ہندوؤں کے مقابلے میں ۳۵
مدی کی ایک واضح اقلیت تھے۔ اقتصادی تعلقات کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی - ہندو شہری مرکزوں
بچاروں طرف کی دیہی زمینیں اب بھی سکھ کاشتکاروں کے قبضے میں تھیں۔ مغرب سے آنے والے سکھ، پنجاب میں
چہار طرف بکھرے نہیں بلکہ انھوں نے شمال مغرب میں بسنے کو ترجیح دی (جنوب مغرب میں پہلے ہی سے سکھوں
تعداد اچھی تھی) اور پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک مخصوص علاقے میں سکھ اکثریت بنانے کی یہ ان کی ایک شعوری
ست عملی تھی۔

کانگریس سے اپنے کو دور رکھ کر انگریزوں سے ایک الگ معاملہ کرنے اور پھر مسلم لیگ کے ساتھ پینگیں بڑھا
سکھوں کی کوشش ہم دیکھ چکے ہیں (مثلاً تقسیم سے ذرا قبل، شمال مغرب سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کی اقلیتی
ومت میں ایک اکالی موجود تھا) جب ۱۶ جولائی ۱۹۴۶ کے کیبنٹ مشن پلان میں سکھستان کے مطالبے کا کوئی
ر نہیں ہوا تو سکھ کانگریس سے، خصوصاً ۱۹۴۶ کے اہم انتخاب کے پیش نظر معاملہ کرنے کی کوشش کرنے پر مجبو
ہو گئے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اس کو روکنے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کی اور آخر میں یہ اتحاد برائے نام ہی رہا۔
کانگریس جو سکھ نشستوں کے خیال ہی سے متنفر تھی، مصالحت کرنے سے منکر ہوئی اور ۳۳ سکھ حلقہ ہائے انتخاب میں
سے صرف چار پر مصالحت ہو سکی۔ پنجاب کی سیاست جو باقی ماندہ شمال سے مختلف رہی تھی اب ویسے ہی ہو گئی۔ ۱۰

یونینیٹ پارٹی کے زوال سے جو خلا پیدا ہوا تھا وہ مذہبی بنیادوں پر پُر ہوا۔ مسلم لیگ نے ۸۶ مسلم نشستوں میں سے پر قبضہ کر کے زبردست کامیابی حاصل کی۔ کانگریس نے بھی ۵۱ نشستیں جیتیں اور ہندو مخصوص نشستوں کا اچھا خاصہ حصہ حاصل کر لیا۔ لیکن کانگریس جس نے کُل اکیاون نشستیں حاصل کی تھیں، مسلم لیگ یا اکالیوں کی طرح کسی مذہب کی پارٹی نہیں تھی۔ اکالیوں میں ایک خالص سکھوں کی جماعت ہونے کے باوجود کانگریس نے اکالیوں کی نشستوں پر کامیابی کے مقابلے میں دس سکھ نشستیں حاصل کیں۔ کانگریس نے ایک مسلم نشست پر بھی کامیابی حاصل کی۔ یونینیٹ پارٹی محض اپنے دو عظیم معماروں سر سکندر حیات خاں اور سر چھوٹو رام کی موت کے بعد اپنے ماضی ایک عکس رہ گئی تھی، اب بھی اپنے نظریات کی پیرو تھی، اس کی حمایت مذہبی تفریق سے بلند تھی، جن نش کامیاب ہونے والے اس کے امیدواروں میں ایک عیسائی بھی تھا۔

انتخابات کے نتائج اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اکالیوں کے اس دعوے کو کہ سکھوں کی وہی اور صرف وہی کرتے ہیں، چیلنج کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد ہندوستان کے انتخاب میں رائے دہندگ صورت سامنے آتی ہے وہ ایسے دعووں کی قلعی کھول دیتی ہے مگر خود انگریزوں کے کرائے ہوئے انتخابات نشستوں کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر کی جاتی تھی اور مذہبی جذبات اپنی بدترین شکل میں سامنے آ رہے تھے ۱۰ بھی اکالی دل، دس سکھ نشستوں پر کانگریس کی کامیابی کو روک نہیں سکی۔ یعنی انتہائی سازگار حالات میں بھی اکا محض ساٹھ فی صدی سکھ نشستیں جیتیں۔ باقی سکھ ووٹ سیکولر پارٹیوں (جیسے کانگریس یا کمیونسٹ) نے حاصل یہ مسئلہ سکھوں کے لیے خصوصاً آزادی کے بعد سے بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ اس کا جواب ان کے پاس صرف یہ ہے جذبات کو بھڑکا کر زیادہ سے زیادہ سکھوں کو اکالی صفوں میں لے آئیں۔ ہر شکست سے پیدا ہونے والی ان کی اور مجبوری انھیں روز افزوں عسکریت کی طرف دھکیلتی ہے۔ سکھوں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ اس حقیقت مان پاتے ہیں کہ جمہوریت میں مقدرات بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق سکھوں کو مستقل طور پر حاکم رہنا چاہیے، کہ یہ وہ خلافی ہے جسے گرو گوبند سنگھ کی تائید حاصل ہے اور عقیدہ اسے توانائی بخشتا ہے

مگر دنیا بدل گئی ہے اور اکالیوں نے اس تبدیلی کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ ایک جمہوری نظام، جد و جہد کو مان بھی سکتا ہے اور اس پر لبیک بھی کہہ سکتا ہے، مگر جھگڑے کی ہمت افزائی نہیں کر سکتا۔ دلی میں نہ تو جاگیر اور نہ ہی نو آبادکار۔ اکالی لیڈروں نے اس طرح عمل کیا ہے گویا وہ سکھ ازم کے محافظ ہیں، اس لیے وہ جو اس انکار کرتا ہے، سکھ نہیں ہے مگر سکھ عوام نے اپنے وجود کو اکالیوں کے وجود سے وابستہ نہیں کیا۔*

توں دہائی میں بحران کا ایک بہت بڑا سبب یہی تھا کہ عوام اکالیوں کو جیتنے نہ دیں گے اور اکالی اپنے آپ کو
نے نہ دیں گے۔

سکھ ووٹ بھی ایک رُخا نہیں ہے۔ سکھ بھی بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں
ہیں بلکہ باہمی طور پر معاندانہ اور حریفانہ طور پر ان میں تین واضح اور طاقت ور گروہ ہیں۔ کسان (جاٹ) شہری اہل
، دکان دار اور تاجر (کھتری، اروڑہ اور رام گڑھیا) اور تبدیل مذہب کیے ہوئے اچھوت (مذہبی) شیڈولڈ
ٹ سکھ جاٹوں کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تورانی قبائل کی اولاد ہیں، جو آریاؤں کے کچھ ہی عرصہ
ان ہی راستوں سے ہندوکش کو پار کر کے آئے اور افغانستان اور راجستھان کے درمیانی علاقے میں آباد ہو گئے
وک، پنجاب کے تینوں بڑے مذاہب اسلام، ہندوازم اور سکھ ازم میں معتد بہ تعداد میں دیکھے جا سکتے ہیں،
یہی لوگ دولت اور تعداد دونوں لحاظ سے سکھوں کے غالب طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی تعداد
ں تبدیل مذہب کرنے والے اوّلین لوگوں میں تھے۔ کہتے ہیں کہ خود گرو ارجن نے ان لوگوں کو اپنی صفوں میں شامل
تھا۔ یہی لوگ تھے جو ابتدائی سکھ افواج کے ہراول ہوئے۔ بعد کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے قیام سے
ے زمیندار امرا میں ان کا شمار ہونے لگا اور ان کی خود اپنی ایک حیثیت ہو گئی۔ انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں
ری اور زمینوں کے بڑھتے ہوئے نرخوں نے معمولی معمولی کسانوں کو بھی خوش حال بنا دیا اور پورے فرقے پر جاٹوں کو
الب کر دیا۔ شہری اہل حرفہ اور تاجر سکھ ازم کو بعد کو قبول کرنے والوں میں تھے اور ہندوؤں سے ان کے تعلقات
برابر کے ہندو طبقوں میں شادی بیاہ کے رواج کی وجہ سے بڑے قریبی رہے۔ اور پھر اچھوتوں میں سے بھی تبدیل
ذہب کرنے والے تھے۔ یہ وہ بدقسمت ہندوستانی تھے جن کا مقدر وہ پستی تھی جو اگر نہ ہوتی تو اس پر کسی کو یقین نہیں
آ سکتا تھا۔ سکھ ازم میں مساوات کے وعدے نے ان کو اپنی طرف رجوع کیا۔ جلد ہی انھیں پتہ چل گیا کہ اگرچہ صورت حال
اتنی بری نہیں ہے جتنی کہ ہندوازم میں تھی مگر ساتھ ہی ان کو یہ احساس بھی ہوا کہ یہ بھی بہر حال وعدہ ہی ہے۔ جاٹ اب
ردواروں میں مذہبیوں کے ساتھ عبادت کرتے تھے اور مشترکہ رسوئی میں کھانا کھاتے تھے مگر قبولیت کا اثر صرف
یہیں تک محدود تھا۔ اچھوتوں کی سماجی اور اقتصادی حیثیت بدستور پہلے ہی جیسی رہی۔

اکالی سیاست کو توانائی ملتی رہی ہے جاٹوں سے اور مذہبی سکھ ہمیشہ سے اکالی مخالف رہے ہیں، انھیں
اس سلسلے میں کبھی کوئی خوش فہمی نہیں رہی ہے کہ بے زمین مذہبی سکھوں کے ساتھ ایک ایسے ملک میں جہاں جاٹوں کا غلبہ ہو
کیا سلوک ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی سکھوں نے، جو سکھ آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ ہیں، ہر شکل میں سکھ ریاست کی

مخالفت کی۔ انھوں نے تو، انڈین یونین کے اندر ایک سکھ اکثریت والے صوبے کے سکھ مطالبے کو بھی، جو ۱۹۶۶
مان لیا گیا تھا، روکنا چاہا۔ مذہبی سکھوں نے، انتخابات میں بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ اکالیوں کے خلاف ووٹ د
اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ اکالی سکھ ووٹ حاصل کرنے کا کام اسّی فی صد ووٹوں کی بنیاد سے شروع کرتے ہیں ا
شہری اور دیہی کشمکش اپنے تضادات پیدا کرتی ہے۔ شہری سکھ سوائے غیر معمولی موقعوں کے، اپنی ترجیح
کے لیے ظاہر کرتے ہیں اور ان سب سے اوپر سکھ کاشت کاروں میں کمیونسٹوں کے زیر اثر مضبوط حلقے ہیں۔ نتـ
کی تعداد کو اگر سامنے نہ رکھا جائے تو کمیونسٹوں نے دس فی صدی ووٹ بڑے تسلسل کے ساتھ حاصل کیے ہیں
صورت حال میں اگر مزید یہ حقیقت اور شامل کر لی جائے کہ خود جاٹ کاشت کاروں میں ایک حلقہ ہے جو اکالیو
ایک مذہبی ریاست کے خواب میں شرکت نہیں کرتا تو ہمیں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اکالیوں کے لیے خود سکھ اکثر
والے پنجاب میں جمہوریت کے ذریعے حکومت میں آنا کتنا مشکل ہے اور اصل مسئلہ تو ہندوؤں کا ہے جو اکالیوں
سکھوں کی کسی جماعت کو کبھی بھی ووٹ نہیں دیں گے۔

بہر حال جمع تفریق کا یہ حساب ۱۹۴۷ء میں اکالی ذہن سے بہت دور تھا، خواب عوامی یادداشت کے
سیاں پر سجا دیے گئے تھے اور پناہ گزینوں کی باز آبادکاری کا کام انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ میں لے لیا گیا تھا۔
ایک گراں قدر کوشش کے ساتھ کام میں شامل ہوا۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی از سر نو تقسیم سے، زمینوا
ملکیت کے معاملے میں ایک انقلاب آ گیا۔ غیر حاضر امیر مالکان زمین غائب ہو گئے اور زمین کے مالکانہ حقو
جوتنے والے کاشت کار کے پاس آ گئے۔ پناہ گزینوں کو معاوضہ "معیاری ایکڑ" یعنی زمین کی پیداواری صا
لحاظ سے دیا گیا۔ ایک معیاری ایکڑ سے مراد اس ایکڑ زمین کے قطعے سے ہوتی تھی جس میں دس گیارہ من گیہو
جاتا ہو۔ اس عمل سے پہلی بار یہ ہوا کہ مذہبی سکھوں کا بھی کچھ فی صدی حصہ زمینوں کا مالک بن گیا۔ اکا
نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ حکمراں کانگریس پارٹی سے سکھوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی صور
ہے کہ ان کا شریک بن جایا جائے۔ چنانچہ کچھ ممتاز اکالی لیڈروں نے اس نظریے کے پیش نظر باقاعدہ
شرکت کر لی کہ اب اکالیوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور اب کانگریسی کی حیثیت سے ان کی افادیت کا
اکالی جوں جوں کانگریس کے قریب آتے گئے ماسٹر تارا سنگھ عارضی طور پر سیاست سے سبا
اپنی ساری توجہ مذہبی بیداری کی طرف مبذول کر دی۔ چوبیس پچیس اپریل ۱۹۴۸ میں سکھ اسٹوڈنٹ فیا
... کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ

یاسی پارٹی کے خودمختار کردار کو باقی رکھنے کی ضمانت ہو جائے مگر اکالیوں نے ۱۰ مارچ کو ہونے والی ورکنگ کمیٹی یٹنگ کے کانگریس میں شامل ہونے کے فیصلے کو ترجیح دی اب جب کہ ان کے ایک الگ قوم ہونے کے مطالبے کو ز انداز کر دیا گیا تھا، ان کا اصل مقصد اپنے وجود کو برقرار رکھنا تھا۔

کیبینٹ مشن کی آمد سے دو دن قبل ۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو اکالی دل نے "سکھستان" کا مطالبہ کرتے دے باقاعدہ ایک تجویز منظور کی تھی، اس میں سکھستان کا جواز یہ بیان کیا گیا تھا کہ سکھوں کے وجود کو ایک طرف تو سلمانوں کے پاکستان کے مسلسل مطالبے کی وجہ سے اور دوسری طرف ہندوؤں کے انھیں اپنے اندر جذب کر لینے کے خدشے کے پیش نظر سخت خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ ۲۴ مارچ کو سر اسٹیفورڈ کرپس لارڈ پیتھک لارنس اور اے وی الیگزینڈر دہلی پہنچے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ ہندوستانی کیا چاہتے ہیں۔ سکھوں کے نمائندے رپس کمیشن کے سامنے "سکھستان" کا مقدمہ معقول طور پر پیش نہ کر سکے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے آخر میں تمام فرقوں کی می لی مرکزی حکومت کے ساتھ ایک متحدہ ہندوستان کی وکالت کی اور کہا کہ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک الگ سکھ صوبہ بنے دیا جائے اور اسے یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ ہندوستان یا پاکستان جس کے ساتھ چاہے الحاق کر لے۔ گیانی کرتار سنگھ یک ایسا صوبہ چاہتے تھے جس میں سکھ غالب یا تقریباً غالب ہوں گے۔ ہرنام سنگھ تقسیم کے مخالف تھے اور سکھوں لیے مختلف ضمانتیں چاہتے تھے۔ بلدیو سنگھ نے سکھستان کی امکانی سرحدوں کی نشان دہی کی مگر آخر میں ان کا مطالبہ " جو بھی سیاسی فریم ورک بنے اس میں خصوصی تحفظ " تک رہ گیا مگر جلد ہی سکھوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے سودا نے میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ کانگریس کو، نہ مسلم لیگ کو اور نہ ہی انگریزی حکومت کو۔ انھوں نے الیکشن عارضی حکومت کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی۔ سودے بازی کی خواہش میں بے بسی اور بے چارگی کا رنگ آنے پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، ایک پیش کش کی۔ جو زیادہ سے زیادہ سکھوں کو کر سو یقین دہانی تھی مگر اس یقین دہانی کو سکھ لیڈر آج بھی، زیادہ بڑی چیزوں کا وعدہ کہہ کر دہراتے رہتے ہیں۔ لائی کو روزنامہ اسٹیٹس مین میں پنڈت نہرو کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا "پنجاب کے سکھ خصوصی مراعات کا حق رکھتے ہیں، مجھے شمال میں ایک ایسے علاقے اور ایک ایسے نظام میں کوئی خرابی یں آتی جس میں سکھ آزادانہ طور پر آزادی کی چمک دمک کا تجربہ کر سکیں۔" یہ بات سننے میں اچھی لگتی ہے مگر سکھوں پر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد منکشف ہو گیا کہ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور دراں آزادی کی ـ کے بجائے محض ایک ہندو اکثریت کا سایہ تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان کے داخلی نقشے کے بننے کا طویل طویل عمل شروع ہوا تو پنجاب کو دو انتظامی
اکائیوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سکھ شاہی ریاستوں (بشمول مالیر کوٹلہ اور نالاگڑھ) کو پٹیالہ اینڈ ایسٹ پنجاب اسٹیٹس یونین
(PEPSU) بنانے کے لیے ایک الگ اکائی میں شامل کر دیا گیا۔ پیپسو میں سکھ اور ہندو تعداد کے لحاظ سے برابر
تھے۔ (۴۸.۸ کے مقابلے میں ۴۹.۲ فی صدی) مگر پہلی دفعہ ایک علاقہ ایسا بنا تھا جس میں سکھ آبادی غالب یا تقریباً
غالب تھی۔ سکھ پناہ گزینوں نے پیپسو سے ملحق اضلاع میں بسنا شروع کیا۔ اس وقت امور داخلہ اور باز آبادکاری
کی وزارتوں کے سربراہ ایسے سکھ تھے جو تقسیم سے قبل ممتاز اکالی رہ چکے تھے چنانچہ آبادکاری کے اس نہج پر کچھ ہندوؤں
نے فوراً ہی شعوری نیت کے عمل دخل کا شبہہ شروع کر دیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان کشمکش پیدا ہونے لگی اور سکھ مذ
مرکز زبان کے مانوس مسئلے کے نام پر شروع ہوا۔ تین حرف "گاف" سکھ عقیدے کے مرکزی عوامل ہیں: گرو، گرنتھ
اور گرمکھی۔ پنجابی رسم الخط گرمکھی ہے۔ یہی وہ رسم الخط ہے جس میں سکھ مذہبی صحیفے لکھے گئے ہیں، اس رسم الخط
کو اسی مقصد کے لیے دوسرے گرو انگد نے بنایا اور یہ بالآخر مذہب کا ایک جزو لاینفک بن گیا مگر تقسیم کے کچھ ہی دن
بعد سے ہندوؤں نے جو عام طور پر پنجابی بولتے ہیں، پنجابی زبان کو ریاستی حکومت کی سرکاری زبان بننے سے روکنے کے
لیے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ان کی مادری زبان ہندی ہے۔ سکھ چونک پڑے، جذب کرنے کا عمل شروع ہو چکا
اور پہلا حملہ پنجابی کو ختم کرنے کی اس سازش سے شروع ہوا تھا انھوں نے ایک چھوٹے پنجاب کا مطالبہ شروع کیا جس میں گ
رسم الخط کے ساتھ پنجابی سرکاری زبان ہو سکے۔ ڈیڑھ سو سال میں پہلی مرتبہ، سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ۱۹۵۱ء میں مردم
شماری کے وقت فسادات شروع ہو گئے۔ متنازعہ مسئلہ زبان تھا۔ (ان فسادات سے پہلے ہندوؤں اور سکھوں کے در
تشدد ۱۷۹۶ء میں اس وقت ہوا تھا جب پٹیالہ کے صاحب سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کے لشکروں نے کمبھ کے
کے موقع پر ہندو سنتوں اور زائرین پر حملہ کیا تھا، کمبھ کا میلا متبرک شہر ہری دوار کے مقام پر ہونے والا ایک
ہندو تہوار ہے) سیکولر ہندوستان میں، پنجاب کے ہندوؤں نے ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ لگا کر
زبان، ہندو مذہب اور ہندوستان کی خطرناک تثلیث کو جنم دے دیا۔ سکھوں نے اس کے جواب میں "
ٹوپی جنا پار" کا نعرہ لگایا وہ اکالی جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے نسبتاً خاموش تھے۔ اب ایک بار پھر ان کے کٹر عناصر نے نعرہ
کو زندہ کر دیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں "سکھ بغیر اپنی ریاست کے محفوظ نہیں رہ سکتے۔" نعرہ تھا "پنجابی صوبہ
پنڈت جواہر لال نہرو کسی طرح بھی کٹر اور متعصب نہیں تھے، ان کے دشمن بھی کبھی ان پر اتنا فرقہ
الزام نہیں لگا سکے۔ مگر ایک چیز ضروری تھی جس کے لیے وہ کٹر ہو گئے تھے اور وہ تھی ہندوستان کی علاقائی

ے نزدیک پنجاب کی ایک اور تقسیم اور ایک چھوٹے سے صوبے کا ایک غیر یقینی اور نا معتبر اقلیت کے ہاتھ میں ہونا اور
یسی صورت میں کہ اس کے مغرب میں اسلامی پاکستان اور شمال میں مسلم اکثریت والا کشمیر ہو، خودکشی سے کم نہیں تھا۔
حتجاجات اور زور دباؤ کے باوجود مرتے دم تک نہرو کے پائے ثبات لڑکھڑائے نہیں، انھوں نے سکھوں کی اکثریت
پنجاب وجود میں نہیں آنے دیا یہ تو ۱۹۶۴ میں ان کے انتقال کے بعد ہوا اور وہ بھی ان کی بیٹی اندرا گاندھی کی عنایت
پر سکھوں کو ان کا پنجاب مل گیا۔ اکالی پریس نے نہرو کو بدنام کیا، خصوصاً ۱۹۵۵ء میں، جب اسٹیٹس ری آرگنائزیشن
ن نے دوسرے لسانی گروہوں کو تو صوبے دے دیئے مگر سکھوں کے مطالبے کو انتہائی سطحی بنیادوں پر رد کر دیا۔ سردار
سنگھ نے جو ستم ظریفی دیکھیے کہ بعد کو کانگریسی بھی ہوئے اور پارلیامنٹ کے اسپیکر بھی، نہرو کو عسکری ہندو وطن پرستی کا
ا، کہا جو باتیں قوم پرستی کی کرتا ہے۔ ایک جابر جو جمہوریت کے گن گاتا ہے وہ گوبلز کی طرح جھوٹا ہے۔ مختصراً یہ کہ
ایک سیاسی مکار اور دھوکے باز ہے اور ہندوستانی رجعت پسندی کی خدمت گذاری کے لیے ایک فریبی" اتنی تلخ
ور ترش باتوں سے بہرحال نہرو پریشان بالکل نہیں ہوئے اور پنجاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بجائے جیسا کہ سکھ چاہتے
ے۔ نہرو کی حکومت نے پنجاب کو ۱۹۵۶ء میں نسبتاً بڑی ریاست بنا دیا۔

اکالی دل نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "جمہوریت کی حقیقی آزمائش، شرومنی اکالی دل کی رائے
یہ ہے کہ اقلیتیں درحقیقت اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی ہوں اور ملک کے مقدر میں اپنے آپ کو برابر کا
یک تصور کرتی ہوں۔ شرومنی اکالی دل سارے ہندوستان میں لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل کا حامی
مگر سکھ ایک نئے پنجاب کو جو تشکیل دیا جانے والا تھا، موت اور زیست کا مسئلہ سمجھتے ہیں ... دل ہندوستان
یک خودمختار اکائی کی حیثیت سے پنجابی بولنے والوں کے ایک صوبے پر یقین رکھتا ہے۔" اسٹیٹس ری آرگنائزیشن
ن نے نظری طور پر اس سے اتفاق کیا اس نے کہا کہ "لسانی ریاستوں کے مطالبے کا مطلب ثقافتی احیا پرستی نہیں ہے
مقصد زیادہ وسیع ہے جس میں یہ مختلف لسانی گروہوں کے لیے سیاسی اور اقتصادی انصاف کا متلاشی ہے۔
ن ریاستوں میں سیاسی قیادت اور انتظامی اختیارات عام طور پر غالب لسانی گروہ کی جاگیر ہوتے ہیں۔ اور ریاست
ی کی معاملات میں اقلیتیں موثر آواز سے محروم رہتی ہیں۔" مگر عملی طور پر اسی کمیشن نے یہ کہا کہ سکھ، ایک الگ لسانی
نے کے باوجود خود اپنا صوبہ رکھنے کے حق دار نہیں ہیں۔ پنجاب سے کہا گیا کہ وہ اپنے یہاں زبان کے مسئلے کو پنجابی/
ور ہندی دونوں کو استعمال کر کے خوش اور مطمئن رہے۔ کمیشن نے سکھوں کو ایک چھوٹا لسانی صوبہ دینے کے بجائے
یں پیپسو اور ہماچل پردیش کو ملا دینے کی تجویز رکھی

تارا سنگھ جواب دینے کھڑے ہوئے "سکھوں کی بربادی کا ایک فرمان منظور ہو چکا ہے اور اس وقت ۱۹۴۷ء کی تباہی سے بڑی تباہی ہمارے سامنے ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تباہی نے ہزاروں سکھ ختم کیے اور اسٹیٹ ری آرگنائزیشن کی رپورٹ انھیں صفحۂ ہستی سے محو کر رہی ہے۔ (اسپوکس مین ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء کمیشن کی رپورٹ، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء، حکومت ہند کے سامنے پیش کی گئی تھی) ماسٹر تارا سنگھ مبالغہ آمیزی سے کبھی نہیں گھبرائے اور ان کے جانشینوں نے بھی ان سے یہی سیکھا تھا، مگر اس خطابت اور چرب زبانی کے پیچھے حقیقی خفگی بھی پنہاں تھی اور وہ یہ کہ سکھوں پر کبھی اعتبار نہیں کیا گیا ہے اور انھیں کبھی ان کا حق نہیں ملنے والا ہے۔ اکالیوں کے سامنے اب مقصد یہ تھا کہ وہ سکھ ووٹرز کو اس بات کا یقین دلائیں کہ کانگریس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اب اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ابھی تک انتخابات میں سکھوں نے کم و بیش اکثر اکالیوں کے مقابلے میں کانگریس کو ترجیح دی تھی۔ اس ترجیح کا مظاہرہ انھوں نے ایک بار پھر ۱۹۵۴ء میں پیپسو کے وسط مدتی انتخابات میں کیا، پچاس فی صدی آبادی کے باوجود انتخابات میں اکالیوں کو صرف ۲۶ ر ۲۷ فی صد ووٹ ملے اور جن ۳۴ نشستوں پر انھوں نے اپنے امیدوار کھڑے کیے ان میں سے صرف دس پر انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کانگریس کو ۴۴ ر ۴۰ فی صدی ووٹ ملے اور اسے ۲۲ نشستوں پر کامیابی ملی پنجاب میں اکالیوں کے سامنے نسبتاً بڑا مسئلہ تھا۔ ایک سرگرم اور ذہین کانگریسی سکھ لیڈر پرتاپ سنگھ کیروں جو مشی گن یونی ورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے گریجویٹ تھے۔ گاؤوں کے اقتدار کے یونینسٹ پارٹی کے نعرے کو دہرا کر دیہی علاقوں میں ووٹروں کو اپنے ساتھ شامل کرتے جا رہے تھے۔ کانگریس کے سکھ وزراء اعلیٰ اکالیوں کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہے ہیں۔ کیروں سے کم تر درجے کے لیڈر جیسے ساتویں دہائی میں گیانی ذیل سنگھ (جو بعد کو صدر جمہوریہ ہوئے) اور دربارا سنگھ بھی سکھوں میں اپنی حمایت کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ کیروں کی زیر قیادت کانگریس سے شکست کھانے کے خیال سے اکالی اتنے خوف زدہ تھے کہ نہرو کی پالیسیوں کے خلاف آہ و بکا کرنے کے باوجود اکالی دل نے کانگریس سے ایک انتخابی سمجھوتہ کیا جس کی شرائط ماسٹر تارا سنگھ جیسے لوگوں کے لیے محض حقارت آمیز تھیں۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ماسٹر تارا سنگھ کی صدارت میں اکالی دل نے "کانگریس اور اس کے لیڈروں پر اپنے اعتماد کے اظہار کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ خود دل اپنے آپ کو، سکھوں کی، مذہبی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی فلاح کے کاموں تک محدود رکھے گا۔ مزید یہ کہ انھوں نے دل کے آئین سے وہ تمام دفعات خارج کر دیں جن سے کسی طرح بھی ایک الگ سکھ ملک کی خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ ماسٹر تارا سنگھ کے لیے روایتی آخری تنکا تھا۔ وہ اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکے اور انھوں نے ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات میں خود اپنے امیدوار کھڑے

اور کانگریس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائی۔ وہ کسی ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ کانگریس کو کل ووٹوں سے ۴۷٫۵ فی صدی ووٹ ملے۔ کمیونسٹوں نے بھی اچھے خاصے ۱۳٫۶ فی صدی ووٹ حاصل کرلیے۔ ان کے یہ ووٹ کانگریس۔ اکالی اتحاد کی عنایت تھی جس نے جاٹ مخالف مذہبی سکھوں کو لال پرچم کے نیچے جمع کردیا۔

میں اس وقت جب کہ اکالیوں کی خواہشات کی شدت کو کیروں نے کچھ کم کردیا تھا۔ ہندو کٹر پن کے ایک نئے ے نے اکالیوں کے لیے ایک بہانہ فراہم کردیا جس کے سہارے اپنے آپ کو ایک بار پھر بحال کرنے کا انھیں موقع گیا۔ "ہندی بچاؤ" کی ایک تحریک شروع کی گئی۔ بظاہر ہندی کے تحفظ کے لیے اور بہ باطن شہری پنجابی ہندو کے وقار بحال کرنے کے لیے جسے ۱۹۵۷ء میں کیروں کی کابینہ جس میں کانگریسی تھے، اکالی تھے اور ہندو کاشت کاروں کے نمائندے تھے مگر اسے کوئی نمائندگی نہیں ملی تھی۔ تحریک بہت کم دن زندہ رہی، مگر ماسٹر تارا سنگھ کو وہ موقع ہاتھ آگیا جس کا انھیں انتظار تھا۔ انھوں نے کہا کہ کیروں سکھوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکام رہے ہیں سکھوں کو ان کا اپنا پنجاب ملنا چاہیے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو امرتسر میں پہلی پنجابی صوبہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جدوجہد کی "ڈکٹیٹر شپ" کی ذمہ داری جس شخص کو سونپی گئی وہ ماسٹر تارا سنگھ کے چہیتے لیفٹیننٹ اور اکالی دل کے نائب صدر سنت فتح سنگھ تھے (تمام سکھ اصطلاح کی قیادت "ڈکٹیٹرشپ" کرتے ہیں اکالیوں کو فوجی اصطلاحات پسند ہیں۔)

جنوری ۱۹۶۰ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے مذہبی انتخابات میں پنجابی صوبے کے نام پر کامیابی حاصل کی اور اپنے ۱۳۱ فتح یاب حامیوں کے ساتھ انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ سب پنجابی صوبے کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے جسم، اپنی روح اور اپنی جائدادیں (اسی ترتیب سے) قربان کردیں گے اپریل ۱۹۶۰ء میں پنجابی صوبے کے لیے احتجاجی مہم شروع ہوئی اور اس کی نوعیت اکالی دل کے ریزولیوشن کے مطابق تھی۔ "ابھی یا پھر کبھی نہیں"

جہاں تک جواہر لال نہرو کا تعلق تھا یہ "کبھی نہیں" کا معاملہ تھا۔ کیروں نے جو نہرو ہی کی طرح سخت گیر آدمی تھے فوراً ہی تارا سنگھ کو گرفتار کرلیا۔ سنت فتح سنگھ نے ان کی جگہ سنبھالی۔ مجاہدوں سے کہا گیا تھا کہ وہ پرامن مدافعت کریں۔ اکالیوں کے تخمینے کے مطابق اس سلسلے میں ستاون ہزار سکھ جیل گئے۔ حکومت کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جیل جانے والے سکھوں کی تعداد ۲۶ ہزار تھی۔ جذبات کو جھنجوڑنے کے لیے سنت فتح سنگھ نے نومبر ۱۹۶۰ء میں مرن برت رکھنے کا اعلان کیا اور ۱۸ دسمبر سے یہ برت شروع بھی کردیا۔ اس وقت تک چیلے کی مقبولیت کچھ اتنی بڑھ گئی کہ گرو کے لیے پریشانی کا سبب بننے لگی چنانچہ ان دونوں کے درمیان کشمکش کے آثار پیدا ہونے لگے۔ کیروں نے اس بات کو محسوس کرلیا

اور ماسٹر تارا سنگھ کو رہا کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا کہ سنت فتح سنگھ کے بعد وہ خود مرن برت رکھیں گے جو مقصد کے لیے جان و دل کی پیش کش پھر ہونے لگی۔ بہر حال تھا یہ کہ روح گریزاں تھی اور جسم یقیناً کمزور۔ ہر برت کا موت پر نہیں بلکہ سنترے کے مفرح ایک گلاس پر ہوا۔ ہر دفعہ ایک برت پر بیٹھے اکالی لیڈروں کی جان بچانے سے مصالحت کا ایک کمزور سا معاہدہ ہوا اور اسے نام دیا گیا فتح و کامیابی کا۔ حکومت ہند کو بھی اس بات کا یقین ہوسے لگا جس کا بہت سے سکھوں کو شبہ بھی تھا کہ ان فاقہ کشیوں میں خفیہ طور پر غذا بھی پہنچائی جاتی ہے۔ حکومت کے پاس جو طبی رپورٹ کے مطابق ایک ایسے ہی برت کے دوران سنت فتح سنگھ کے وزن میں اضافہ ہو گیا تھا (دھرم ویرا سول سرونٹ کے ذمے ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے معاملات کیے گئے تھے۔ انھوں نے اس بات کا ذکر خود مصنف تھا) سنت فتح سنگھ کے دسمبر ۱۹۶۰ء کے برت کو ۹ جنوری کو بغیر کچھ حاصل کیے ہوئے ختم کرنے کا اعلان ہو گیا

اب ماسٹر تارا سنگھ کی باری تھی۔ ان کا برت یوم آزادی ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو ایک جشن کی طرح شروع ہوا۔ مگر ماسٹر تارا سنگھ کے سامنے ایک انتہائی عجیب مسئلہ آ گیا تھا۔ حکومت ان کو مرن برت رکھنے کی اجازت دینے پر مائل تھی اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ برت صحیح معنوں میں برت ہو، انتہائی وسیع پیمانے پر تفصیلی احتیاطی انتظام کیے گئے اور چوری چھپے کھانا پہنچنے کے سلسلے میں مسلسل نگرانی کا انتظام کیا گیا۔ یکم اکتوبر کو ماسٹر تارا سنگھ نے فیصلہ کیا پنجابی صوبہ ان کی زندگی کا بدل نہیں ہے اور انھوں نے کھانا شروع کر دیا۔ اس سے زیادہ تضحیک اور کسی کی نہیں جب کسی شہید کے بارے میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے۔ "اگر میں نے غداری کی ہے تو سزا دو" ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا۔ سکھوں نے سزا دی، اور ماسٹر تارا سنگھ کو حکم دیا گیا کہ وہ پانچ دن تک گوردوارے میں ہر آنے والے کے جوتے صاف کریں۔ کچھ عرصے بعد انھیں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور اکالی دل دونوں سے نکال دیا گیا۔ ان کے جانشین سنت فتح سنگھ ہوئے۔ ماسٹر تارا سنگھ کا ردعمل سامنے میں آنے والا تھا انھوں نے اپنے نظریے میں اور شدت پیدا کر لی اور اکالی دل سے اپنے کو اور دور کر لیا۔

اکالی دل نے اپنی چار سالہ کوششوں کے باوجود، ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں، جو اس نے تنہا لڑا، اپنے ووٹوں کی تعداد کو کم پایا۔ ۱۹۵۲ء میں اکالیوں کو سکھ علاقوں میں ۲۴ فی صدی ووٹ ملے تھے اب انھوں نے صرف ۲۰٫۷ فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ دوسری طرف کانگریس نے سکھ علاقوں میں ۴۵٫۷ فی صد ووٹ حاصل کیے یہ تعداد اسے ہندوؤں سے ملنے والے ووٹوں کی تعداد سے زیادہ ہے کیونکہ پنجاب میں اوسطاً ۴۳٫۷ فی صدی تھا۔ اکالی ووٹ، دیہی سکھوں کے ایک حلقے میں مرکوز ہو گیا تھا۔ اقلیتی ووٹ کی بنیاد

درمشترکی ہوئی ایک تحریک کی یہ بوالعجبی اظہر من الشمس تھی۔

ماسٹر تارا سنگھ نے جولائی ۱۹۶۲ء میں اپنے علیحدہ اکالی دل کے قیام کا اعلان کیا اور اس میں بالکل واضح
ر ایک الگ سکھ ملک کا مطالبہ کیا لیکن ایک دفعہ پھر سکھ عوام نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ شدت پسندوں کے ساتھ ہیں
ندال پسندوں کے ساتھ۔ ۱۹۶۴ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے پٹی کے حلقہ انتخاب سے ہونے والے ایک
چناؤ میں سنت فتح سنگھ کے امیدوار کو ملنے والے ۱۸۷۴۷ ووٹوں کے مقابلے میں ماسٹر تارا سنگھ کے امیدوار کو
۲۷۴۵ ووٹ ملے۔ سکھوں کو جب بھی موقع ملا انھوں نے جمہوری ووٹنگ کے ذریعہ یہ دکھا دیا کہ وہ یا تو کانگریس
ساتھ ہیں یا پھر اعتدال پسند اکالیوں کے ساتھ اور یہ کہ وہ بہر حال تشدد اور علیحدگی کی وکالت کرنے والوں کے
ہرگز نہیں ہیں۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ اخباروں کی شاہ سرخیاں شدت پسندوں سے متعلق ہوتی تھیں اس کی وجہ سے
غلط تاثر یہ ضرور پیدا ہوا کہ یہی تشدد پسند، سکھوں کی حقیقی آواز ہیں۔

ہر حال، یہ اُن مذہبی لیڈروں کی جھوں نے اپنے اپنے بستروں میں پرامن طریقے پر اپنی جانیں، جان آفریں کے
یں۔ جرأت اور بہادری نہیں تھی جس کی وجہ سے سکھوں کو اپنا پنجاب ملا۔ یہ تو ۱۹۶۲ اور ۱۹۶۵ء کی اہم جنگوں
ں کی حب الوطنی تھی جس نے ہندوستان کی حکومت کو اس بات کا یقین دلایا کہ سکھ قوم پرست تھے ان دونوں
میں سکھوں نے بڑے پرجوش اور شاندار طریقے پر لبیک کہا اور ملک کے دفاع میں آدمی، سرمایہ اور جرأت
بھی کچھ دے دیا سب سے بڑا خطرہ ۱۹۶۵ء میں سامنے آیا سنت فتح سنگھ نے پنجابی صوبے کے لیے احتجاج
ہد کی اور ریڈیو پاکستان نے اپنے باقاعدہ نشریاتی سلسلوں میں اگر سکھ خود مختار ملک کا مطالبہ کرتے ہیں تو اپنی
اور اپنے تعاون کا یقین دلانا شروع کیا۔ پاکستان کو اس وقت یقیناً پنجاب میں ایک مضبوط پانچویں کالم
تع رہی ہوگی جب یکم ستمبر ۱۹۶۵ء میں ان کی فوجوں نے چھمب جوڑیاں کے مقام پر بین الاقوامی سرحد پار کی
کہ پاکستان کی یہ توقع تو پوری نہیں ہوئی بلکہ اس کی جگہ انھیں ایک بہت بڑا دھکا لگا پنجاب میں پاکستانی
یت کے خلاف جوابی حملوں کی قیادت سکھوں نے کی۔ شہریوں کی حیثیت سے بھی اور فوجیوں کی حیثیت
بی۔ انھوں نے ہی پاکستان کی اسلحہ اور پیدل فوج دونوں کو ناکارہ بنا دیا۔ سکھ ایک اہم گھڑی میں آزمائش میں
سے اترے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بندی کے دو دن بعد، وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے پرانے عسکری
اور پارلیمنٹ کے موجودہ اسپیکر سردار حکم سنگھ کی سربراہی میں بائیس اراکین پر مشتمل ایک پارلیمانی کمیٹی سائی
ب سے کمیٹی مقرر کی۔ قاعدے کی سربراہی میں ان دونوں کمیٹیوں کے ذمے پنجابی صوبے کے مطالبے کا

از سرِ نو جائزہ لینے کا کام کیا گیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں کہا گیا کہ " ایک صوبہ جس پنجابی سرکاری زبان ہو، بنایا جائے" اس فیصلے کا نفاذ ہو گیا۔ پنجاب ایک بار پھر تقسیم کیا گیا اس بار تین حصوں میں۔ ہندو اکثریت والا صوبہ، ہریانہ قائم کیا گیا جس کا علاقہ ۱۹۸۳۵ مربع میل اور جس کی آبادی ۵۳ء۷ ملین تھی۔ (پانچ فی صدی سکھ تھے) ۲۱۵ء۱۰ مربع میل اور ۰۲ء۱ ملین افراد (اس کے دو فی صدی) پر مشتمل دوسرا حصہ ہماچل پردیش ہو گیا اس تخفیف کے بعد پنجاب محض ۲۰۲۵۴ مربع میل کے علاقے میں اور جالندھر، امرتسر، ہوشیار پور، لدھیانہ، فیروز پور، گرداس پور، پٹیالہ، بھٹنڈا اور کپورتھلہ کے اضلاع اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی جگہوں پر ہو گیا اس کی کل آبادی ۵۸ء۱۱ ملین تھی اور بہر حال ایک جگہ ایسی ہو گئی تھی جہاں سکھ اکثریت میں تھے جہاں ان کی تعداد ۵۶ فی صدی تھی چنڈی گڑھ کو اس وقت تک کے لیے ہریانہ اور پنجاب کی مشترکہ راج دھانی بنا دیا گیا جب تک ہریانہ اپنی نئی راج دھانی تعمیر نہ کر لے۔ سنت فتح سنگھ بہت خوش تھے۔ انھوں نے کہا کہ "میرے گھر میں خوب صورت بچہ پیدا ہوا ہے" (سنت غیر شادی شدہ تھے) "پنجابی صوبہ ہمارا آخری مطالبہ ہے انھوں نے ایک آزاد و خود مختار سکھ ملک کے لیے جد و جہد کو جاری رکھنے کی ماسٹر تارا سنگھ کی اپیل کو "بے کار محض" کہہ کر رد کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ زیادہ سنکی تھے۔ انھوں نے کہا کہ سنت ایک مذہبی آدمی ہیں اور سیاست کو نہیں سمجھتے ہیں اس میں یہ امید ظاہر کی جانے لگی کہ اب جب کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے اکالی اپنے دَل کو ختم کر دیں گے مگر اکالی جلد ہی ایک دوسری مہم میں لگ گئے اور یہ مہم تھی انتخابات جیت کر اپنے صوبے میں حکومت خود بنانے کی۔

سکھ پنجاب کے قیام سے ... وزیر اعظم تھیں مسز اندرا گاندھی، جن کی قسمت میں، سیاسی مقدر کے کتنے ڈرامائی نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس صدی کی آٹھویں دہائی میں سکھ انتہا پسندوں کے تشدد کا شکار اور بالآخر ایک بڑی قیمت چکانا لکھا تھا۔ ایک پرانے کانگریسی لیڈر جنھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک الگ سکھ صوبہ کے قیام کی بڑی سختی سے مخالفت کی تھی وہ نائب وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ حالات کیسے کیسے پلٹا کھاتے ہیں۔ مرارجی ڈیسائی کے سیاسی مقدر میں اندرا گاندھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ڈرامائی نشیب و فراز تھے۔ مرارجی ہندوستان کے وزیر اعظم بنے اور انھوں نے ان ہی اکالیوں کو وہ قبولیت عطا کر دی جو ہندوستان کی سیاست میں ابھی تک اعلیٰ ترین ہے۔ مرارجی ڈیسائی نے ۱۹۷۷ء میں تشکیل ہونے والی مرکزی کابینہ میں دو نشستیں اکالیوں کو دے دیں۔

(۹)

عقیدے کی سیاست

جشن ختم ہوا تو سکھوں نے محسوس کیا کہ ان کے بنیادی مسئلے میں تو کوئی تبدیلی آئی ہی نہیں۔ وہ اب بھی کافی نہیں تھے ۵۶ فی صدی کی تعداد کو دیکھنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس خیال سے مطمئن ہو جائیں کہ آپ اکثریت میں ہیں اور دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ آپ کو یہ پریشانی لاحق رہے کہ آپ کی اس حیثیت کو کسی وقت بھی دھکا لگ سکتا ہے [illegible] گوبند سنگھ نے، جنھوں نے سکھوں کو یہ بتایا تھا کہ تم حکومت کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو، سکھوں میں ایک ایسی جوش پیدا کر دی تھی جو ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ تھی۔

اکالیوں کی ۵۶ فی صدی تعداد کا مطلب تھا رائے شماری کے ذریعے فرماں روائی کی ایک ناکافی ضمانت۔ [illegible] ناڈو میں ڈی ایم کے اپنے آپ کو علیحدگی پسند تحریک سے الگ کر کے ایک حکمراں قوت میں بدل سکی اس کی وجہ یہ تھی [illegible] آبادی کی کوئی جھنجھٹ یا افراتفری نہیں تھی۔ اکالیوں کو تامل ناڈ جیسی پر سکون تبدیلی نصیب نہیں ہو سکی کیوں کہ ان [illegible] کی بنیاد بہت وسیع نہیں تھی کانگریس کو شکست دینے کی توقع اکالی صرف اسی حالت میں کر سکتے تھے جب کسی بڑے ہندو حزب اختلاف کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیں۔ یہ صورت حال اگرچہ فطری طور پر ممکن ہو سکتی ہے اور ایسا ہوا بھی، مگر یہ صورت حال کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سی ناگوار مصالحتیں اور مفاہمتیں [illegible] پڑتیں جیسا کہ ۱۹۶۷ اور ۱۹۷۱ کے مابین ہونے والے تجربات نے ظاہر کر دیا۔ اکالیوں کی مایوسی اور ان کی [illegible] سمجھ میں آنے والی ہے۔ ان کے سامنے اپنے ہی بنائے ہوئے صوبے میں انتخابات میں کامیابی نہ حاصل کر سکنے کی [illegible] امید مگر حقیقی صورت حال تھی۔

اسی لیے سکھ انتہا پسندوں کو دوسری تقسیم کے مطالبے کے سلسلے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ [illegible] نے [illegible] ایک حد تھا وہ ایک خود مختار سکھ ملک چاہتے تھے جہاں [illegible]

وہ اپنی مذہبی عبادت کے بعد اپنے آپ کو یاد دلاتے رہتے ہیں) مگر چالیس فی صدی سے زیادہ ہندوؤں کی تعداد ہونے کے لیے بہت بڑی تھی۔ اتنی بڑی، خوش حال اور جنوب مشرق میں ہمدرد پڑوسی کی قربت میں رہنے والی اقلیت کی موجودگی میں ایک مذہبی ریاست ناممکنات میں سے تھی اور پھر علیحدگی پسند اس علاقے میں سے کچھ چھوڑنے پر بھی راضی نہیں تھے جو ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے حصے میں آ گیا تھا وہ تو اگر کچھ چاہتے تھے تو اس علاقے میں مزید کچھ اضافہ ہی چاہتے تھے ان کے خواب کے خدوخال تشکیل پا چکے تھے۔ کام پنجاب کو خالصتان میں تبدیل کرنے کا کیا تھا انھوں نے ایک لائحہ عمل وہ تیار جو جناح صاحب نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پنجاب میں ایسے ہی مسئلے کے حل کے طور پر پیش کیا تھا یعنی تبادلہ آبادی اور مسلم لیگ کی طرح سکھ انتہا پسند جانتے تھے کہ پنجاب میں ہندوؤں سے چھٹکارا پانے اور باقی ہندوستان میں رہنے والے سکھوں کو "اپنے وطن" میں واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے تشدد۔ یہ ایک ایسی حکمت عملی تھی جس کی کامیابی کے لیے وقت درکار تھا درحقیقت ایک دہائی سے زیادہ کا وقت۔ اور اس دوران مسلح رضاکاروں کی پرورش ہوتی رہی۔

مسلمانوں کے خلاف، ہندوؤں اور سکھوں کے مشترکہ محاذ کا زمانہ دونوں کے تعلقات کا نقطہ عروج تھا جو بہ جاری رو بہ زوال تھا۔ مگر اس صدی کے نصف اول کے اتار چڑھاؤ میں جذبات بدستور رہے۔ دھرم ویرا ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے گورنر تھے انھوں نے مصنف کو ۱۹۸۴ء میں ایک گفتگو کے دوران بتایا "پچاس سال قبل جب لاہور میں میری شادی ہوئی تو میرے والدین نے جو پہلی بات مجھ سے کہی وہ تھی امرتسر میں گولڈن ٹیمپل جانے کی اور وہاں جا کر گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹیکنے کی۔ اس زمانے میں یہ بات بالکل عام تھی کہ ہندوؤں کے خاندان کا ایک لڑکا سکھ ہوتا یہ سلسلہ تقریباً ابھی تیس سال قبل اس وقت تک جاری رہا جب ہندوؤں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سکھوں کی آبادی میں اضافہ خود ان کے مفادات کے لیے براہ راست خطرہ ہے۔

دوسرے الفاظ میں دلوں کی یہ تبدیلی ۱۹۴۷ کے بعد ہوئی جب پنجاب کے مسلمان "اپنے" پاکستان چلے گئے تھے۔ جب ہندو اور سکھ میل جول کی ضرورت کم ہو گئی تھی اور جب نئے تنازعے کی کشاکش کا بوجھ ہر دماغ پر پڑنے لگا تھا۔ اب دلچسپیاں زیادہ مخصوص نہ ہو گئی تھیں۔ بعض سکھوں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں نے خود اپنے لیے ایک نہایت عمدہ اور خوش گوار انتظام کر لیا ہے، سکھوں کے ذمے زمین جوتنے، غلہ اگانے اور دہلی اور کابل کے حملہ آوروں سے پنجاب کی حفاظت کرنے کا سخت کام کر دیا گیا ہے جب کہ خود شہری ہندو شہروں میں بستے ہیں۔ اقتصادیات پر قابو رکھتے ہیں۔ روپیہ قرض پر چلا کر موٹے ہوتے ہیں اور قانون، اور تعلیم جیسے ہلکے پھلکے کام اپنے واسطے رکھتے ہیں اس کے

یہی سکھوں کو ایک نامعتبر امتیاز یہ ملا کہ وہ ہندوازم کے ایک ادنیٰ درجہ کے رکن کہلائے۔ آزادی کے بعد کی سیاست ں فرق کو صرف واضح ہی نہیں کیا بلکہ اس نے اس پر تیز دھار رکھ دی۔

سکھوں کی نفسیات کا سب سے اہم عنصر عسکری روح، جسمانی قوت اور اپنی مردانگی پر ایمان ہے۔ اس عقیدے ر مسلمان حکمرانوں کے خلاف اپنے وجود کی بقا کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں ہے۔ گرو ہرگوبند سنگھ کی دی ہوئی جنگ مارت میں ہے۔ گرو ہرگوبند سنگھ خود بھی دو تلواریں لٹکاتے تھے۔ ان میں سے ایک تلوار ان کی روحانی قوتوں (پیری) ہر تھی اور دوسری دنیا کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کے واسطے (میری) اس عقیدے کی بنیاد خالصہ کی تخلیق میں ئی، بندہ بہادر کی لڑی ہوئی جنگوں اور مسلسل جھڑپوں میں اور رنجیت سنگھ کے تحت ایک عظیم سلطنت کے کامیاب یں بھی تھی اور پھر انگریز آئے اور انھوں نے اس خیال کے گرد "عسکری نسلوں" کے نظریے سے دانش ورانہ بیرونی بھی کھڑا کر دیا۔ انگریزوں کی نیت بالکل واضح تھی۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں ان کی سلطنت کی بقا میں مدد کی تھی۔ تعریف و مدح ہوئی تھی، دوسری طرف دوسرے لوگوں کے جذبات کا پہلے تو مذاق اڑایا تھا اور پھر انھیں یکسر ٹھنڈا تھا۔ سکھ "عسکری نسلوں" میں سرفہرست تھے۔

انگریزوں کے نظریات کی قلعی کھولنے والی ایک کتاب "دی مارشل ریسز آف انڈیا" ۱۹۳۲ء میں لیفٹیننٹ جنرل ج میکمن، کے سی بی، کے سی ایس آئی، ڈی ایس او، کرنل کمانڈنٹ آف رائل آرٹلری نے لکھی تھی۔ اس کو پبلشرز دہلی نے ۱۹۷۹ء میں دوبارہ شائع کیا۔ اس کتاب کے چند اقتباس کافی ہوں گے کیوں کہ یہ خود اپنی وضاحت یتے ہیں "ہندوستان میں دوسرے ہر ملک کے برعکس، غیر عسکری لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہندوستان کی عسکری نسلیں ن ہیں اور کیا ہیں، اور کس نازک موقع پر کسی آزمائش کی گھڑی میں اور درد کی کس شدت میں ہندوستانی سپاہی کھڑا ہے اس سپاہی کو بابائے گاندھی (مراد مہاتما گاندھی سے ہے) نے یقیناً جنم نہیں دیا ہے . . . ہم برطانیہ کی نسلوں کا ذکر وہاں کی غیر عسکری نسلوں سے الگ نہیں کرتے ہیں۔ نہ جرمنی اور نہ ہی فرانس کا ذکر اس طرح ہوتا ہے ہندوستان میں۔ ہم عسکری نسلوں کا اس طرح سے تذکرہ کرتے ہیں گویا وہ عوام کی بڑی اکثریت سے الگ کوئی چیز ہیں یہاں کے عام لوگوں میں نہ تو کوئی عسکری رجحان ہے اور نہ ہی جسمانی صلاحیت۔ صلاحیت جسے ہم اپنے روزمرہ شن کہتے ہیں۔ . . . ترس کا موروثی ہیں دین کرنے والوں کو نیک طبع مگر بے رحم نسل کو جس سے لاکھا دمی ن کہتے ہیں۔ کبھی کبھی کھال کھینچ کر یا جلا کر قابو میں رکھا گیا، وہ کبھی بھی خود نہ تو اپنے لوگوں کا تحفظ کر سکے اور نہ انھوں ں اس کی کوشش کی۔ . . . " تاریخ کو آزادی سے وہ چاہے جتنی کراہیت محسوس ایسے گھر سے جاتے تو

بادشاہ یا پادشاہ، سے متعلق اس عظیم سفید بادشاہ سے متعلق جس کے گورے افسر انھیں (ہندوستان کی ملکہ کو) بین الاقوامی عظمت دلائیں گے۔ محض عام سمجھ کر پیش کر رہے تھے اس صورت حال میں اگر آپ کو کچھ غصہ ہو ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھیے جنھوں نے لارڈ گاندھی کی دو ٹانوں تک کھال کھینچنے اور جلانے کا عظیم کارنامہ انجام پر رضامندی ظاہر کی۔

بہرحال تیجی خیال کردہ عسکری نسل سے ہیں (اور اس معاملے میں سکھ، راجپوتوں اور پنجابی مسلمانوں اپنے جاٹ بھائیوں کی طرح ہی ہیں جن کی اپنے بارے میں یہی رائے ہے) ہتھیاروں کے لائسنس ختم کر دینے یا کم از کم ان کی آزادانہ تقسیم سے حکومت سے اکالیوں کے باقاعدہ مطالبے کا سبب ہے (سکھوں کو لائسنس بندوقوں کے لیے چاہیے کیوں کہ تلواروں اور خنجروں کے سلسلے میں تو آئین ہند کی دفعہ ۲۵ کی رو سے کرپان چلنا سکھوں کا بنیادی حق ہے۔ "کرپان رکھنا اور رکھ کر چلنا سکھ مذہبی عقیدے میں شامل سمجھا جائے گا") ہند میں، عسکری نسلوں کے نظریئے کے بارے میں لوگ زیادہ بات نہیں کرتے غالباً اس رویئے کے پیچھے یہ کارفرما ہے کہ بھڑوں کے چھتے کو کیوں چھیڑا جائے مگر اس نظریئے نے سکھ عوامی تحریک میں ایک انتہا پسند شامل کرنے میں ضرور مدد کی ہے۔ اس عنصر کو مذہبی جواز کی وجہ سے مزید تقویت مل جاتی ہے۔ گرو گوبند سنگھ جی کو دھرم یعنی عقیدے کا تحفظ راج (حکومت) کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انتہا پسند تشدد پر فخر کرتے اسے اپنے عقیدے اور اپنی روایات کا ایک حصہ کہتے ہیں۔ بہرحال اس اصلی انقلاب کا رنگ، جو پنجاب اکثریت میں، اس صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا سرخ نہیں سبز تھا۔

آزاد ہندوستان میں سکھوں کے تجربات کا سب سے دل چسپ منظر چھٹی دہائی کے آخر اور دہائی میں سامنے آیا۔ یہ اشتھا خوش حالی کا جس نے اس سخت جان کمیونٹی کی مختصر مگر گہما گہمی والی تاریخ میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما کر دیں۔ یہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں زرعی انقلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والی تھی جس نے پنجاب کو تیسری دنیا سے نکال کر پہلی دنیا کی راہ پر لگا دیا۔ جن لوگوں نے اس سبز انقلاب کا اس میں تامل ناڈو کے سی۔ سبرامنیم سی سبرامنیم تھے جو نہرو کے انتقال کے بعد لال بہادر شاستری کی کابینہ میں وزیر ہو گئے تھے۔ سبرامنیم کئی برسوں تک منصوبہ بندی رہ چکے تھے۔ ان دنوں ترجیحات خاصی بے محل ہوا کرتی تھیں وزارت زراعت اتنی کم تر سمجھی جاتی تھی کہ سبرامنیم جیسے سینئر آدمی کے شایان شان تصور نہیں کی جاتی تھی یہ کرتا ہے کہ ایسے ملک میں جو غذا کے معاملے میں پسماندہ تھا کیا چیز اہمیت رکھتی ہے اور کیا نہیں رکھتی۔ وزیر

ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں دلا سکے کہ وہ وزارت زراعت کی اہمیت کو بڑھانا چاہتے ہیں نہ کہ اپنے ایک ساتھی کو وزیر زراعت بنا کر اس کے رتبے میں کمی - آخر میں صرف سبرامنیم ہی نے یہ سمجھا کہ وزیر اعظم کی خواہش کیا ہے انھوں نے اس عہدے کو قبول کر لیا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ غیر معمولی تھا - پانچ سال کی مدت میں ، بھوکے ہندوستان نے اپنی غذائی پیداوار کا مسئلہ حل کر لیا تھا -

دوسرے پنج سالہ پلان کے وسائل کو بھاری اور بنیادی صنعتوں میں لگا دیا گیا کیوں کہ آب پاشی کی نئی اسکیموں نے پہلے پنج سالہ پلان یعنی ۵۷-۱۹۵۲ کی درمیانی مدت میں زرعی نشانوں کو حاصل کرنے میں حکومت کی بہت مدد کی مگر وسائل کو زراعت کے بجائے صنعت میں لگانا غلطی بھی ہو سکتی ہے اس کا انتباہ ، اس وقت ہوا جب پانچویں دہائی کے آخر میں ملک کو انتہائی بھیانک خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا - چھٹی دہائی کے وسط میں ملک دوسرے قحط سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا - اس بوجھ میں مزید اضافہ ، وسائل کو جذب کرنے والی جنگوں کے اخراجات نے کر دیا - ایک عام سال میں ، غذائی قلت کو پورا کرنے کے لیے دس گیارہ ملین ٹن غذائی اشیاء کی درآمد کرنا پڑی - اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر بھکمری کو روکنے کے لیے غذائی امداد کی ضرورت پڑی - صرف امریکا یہ امداد دے سکا - عالی ہمتی اور فیاضی دکھانے کے بجائے امریکی صدر لنڈن جانسن نے ہندوستان کو دبانے اور تنگ کرنے کا فیصلہ کیا - سی سبرامنیم نے اس حقیقت کو بتایا کہ اس وقت ملک کے سامنے بھکمری اور امریکہ کا طفیلی ملک بننے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا - سبرامنیم کے لہجے میں جو خود کوئی بہت بڑے روس دوست نہیں تھے صدر جانسن کے اس رویے کو بیان کرتے وقت بھی تلخی تھی - خوراک بہر حال امریکا سے آئی مگر دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے بجائے اس نے باہمی تلخی کو مزید بڑھا دیا اور جلد از جلد غذائی معاملے میں خود کفیل ہونے کا ہندوستان میں مصمم عزم پیدا کر دیا -

سی سبرامنیم نے وزیر زراعت ہونے کے فوراً بعد دو فیصلے کیے - پہلا تو یہ کہ انھوں نے ہندوستانی سائنس دانوں سے کہا کہ وہ ہندوستان کے خصوصی حالات میں بیجوں اور کھادوں کے میدان میں جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کرنے کے متعلق اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں - اس سلسلے میں آغاز ۱۹۶۳ء میں اس وقت ہو چکا تھا جب ڈاکٹر این ای بورلاگ نے میکسیکو کی اپنی لیبوریٹری سے ، پنجاب اور مغربی اترپردیش کے کھیتوں میں تجرباتی طور پر بوئے جانے کے لیے گیہوں کے چھوٹے پودوں کی تقریباً ڈیڑھ سو قسموں کے نمونے یہاں بھیجے تھے - لدھیانہ ایگریکلچرل یونیورسٹی نے اس پروگرام پر پہلے ہی بہت کچھ کام کر لیا تھا مگر یہ سبرامنیم ہی کا عہد تھا جب گیہوں کی ان نئی نسلوں کو بہت سا کھاد دیا فراہم

کرکے زبردست فروغ دیا گیا اور یہی نہیں بلکہ گیہوں کی ان نئی نسلوں کی کاشت سے متعلق کسانوں کے لیے مظاہروں کا اہتمام کیا گیا اور ساتھ ہی یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر ان تجربوں میں ان کی فصلیں خراب ہو جائیں انھیں اس کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ سکّہ کاشتکاروں نے تجربے کرنے کا حوصلہ دکھایا اور خوش حال ہو

دوسرا فیصلہ زیادہ متنازعہ فیہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ملک کی سستے غلے کی پالیسی بدلی نہیں جا۔ اس وقت تک غذائی پیداوار بڑھ نہیں سکتی ہے۔ انھوں نے چاہا کہ حکومت کسانوں کو یہ ا دلائے کہ ان کی پیداوار کے لیے گورنمنٹ کی حمایت کی بنیاد پر ایک قیمت ہوگی جس پیداوار میں ان کی لگائی ہوئی لاگت کی واپسی کی بھی ضامن ہوگی اور ایک مناسب منافع کی بھی۔ اس تجویز پر میں ہنگامہ مچ گیا کیونکہ اس تجویز میں دوسرے وزیروں کو یہ نظر آیا کہ اس پر عمل درآمد کے نتیجے میں ملک گیر پیمانے کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے ایک اور وزیر ٹی ٹی کرشنما چاری نے اس تجویز کو ایک "تباہی" قرار دیا جو شہروں کو نا امن کر دے گی۔ سبرامنیم کا کہنا تھا کہ حکومت کو غذا کے معاملے میں خود کفیل ہو شہری بے چینی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کابینہ نے وزیر زراعت کی تجویز مان لی۔ غلے کی قیمتوں میں طور پر پندرہ فی صدی کا اضافہ منظور کیا گیا اور قیمتوں کے سارے ڈھانچے پر غور کرنے کے لیے ایک یک دایل کے جھا کمیشن مقرر کیا گیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں سے متعلق ایک کمیشن کی تشکیل ہوئی جو ہر سال زراعتی پید کی امدادی قیمتیں متعین کرتا ہے۔ خشک سالی اب بھی آتی ہے مگر اب ہندوستان کو غذا کے لیے کاسۂ گدائی۔ واشنگٹن نہیں جانا پڑتا۔ ایک بُرے سال میں، جب محفوظ ذخائر خالی ہو جاتے ہیں تو ملک بین الاقوامی منڈی میں جاتا ہے۔ نقد رقم دیتا ہے ضرورت کے مطابق غلّہ خرید لیتا ہے۔

پارلیمنٹ کے ۱۹۸۴ کے بجٹ سیشن میں وزیر زراعت راؤ بریندر سنگھ کے دیئے ہوئے بیان۔ مطابق ہندوستان میں اناج کی پیداوار ۱۴۰ ملین ٹن تک پہنچ گئی تھی جب کہ ۵۶-۱۹۵۵ میں یہ محض ۳۸ر ملین ٹن تھی اور ۶۱- ۱۹۶ میں ۸۲ر۲۱ ملین ٹن۔ ۶۶ ۱۹۶۵ میں خشک سالی کے حالات نے اسے گھٹا کر ۷۲ر۳۵ ملین ٹن تک پہنچا دیا تھا۔ اگلے سال یعنی ۶۷-۱۹۶۶ میں پیداوار ۷۴ر۲۳ ملین ٹن یعنی تقریباً اتنی رہی تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ تک حکومت کی دلچسپی، سائنس دانوں کی کوششیں اور کسانوں کی محنت بڑے ڈرامائی سے رنگ لانے لگی۔ اناج کی پیداوار بے مثال حد تک بڑھ کر ۹۵ر۰۵ ملین ٹن ہو گئی۔ ۷۰-۱۹۶۹ تک تقریباً سو ٹن ۹۹ر۵۱ کی مقدار کو چھونے لگی اور اگلے سال اس نے بالآخر سو کی گنتی پار کر لی اور بڑھ کر ۱۰۸ر۴۲

ختم ہو گئی۔ آر ایچ کیسن (انڈیا پاپولیشن، اکانومی سوسائٹی۔ میکیلن ۱۹۷۸) اس کامیابی کو ممتاز تاریخ داں ابن خلدون کے ایک اقتباس کی مدد سے بیان کرتے ہیں: "قحط بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کی زمین میں صلاحیت نہ ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ نتیجہ ہوتے ہیں سیاسی افراتفری اور طبعی زیادتیوں کے، جو دور انحطاط میں ملک میں درآتی ہیں: ہندوستان کی قسمت کا رخ اب اوپر کی طرف تھا، قحط کی عبارز طلبی کا جواب دیا جا رہا تھا۔

انگریزی تجارتی بیڑے جب پہلی بار ہندوستان کے ساحلوں سے آکر لگے تھے اس وقت یہ ملک وبائی امراض اور قحط سالی کا مترادف نہیں تھا۔ ہم عصر یورپ میں مغل سلطنت ایک داستان بن چکی تھی۔ مغرب والے جس سے کاروبار کرنے اور ایک خوش حال اور متمول طبقۂ اعلیٰ سے کچھ کمانے کی غرض سے ہندوستان آئے۔ برصغیر اپنی کپاس، ریشم اور مصالحوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اور یہاں کی خوش حالی کی عام سطح بوربن یون، ٹیوڈر اور تاتاریوں کی ہم عصر سلطنتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اونچی تھی۔ مگر کمزور حکومت، سیاسی افراتفری اور طبعی جبر بڑی تباہیاں لایا۔ قدرت کی تلون مزاجیاں سمجھ میں بھی آتی ہیں اور ان سے نپٹا بھی جا سکتا ہے مگر جابر حکمرانوں کے ظلم کا مقابلہ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ سیاسی بدنظمی اور ابتری کے ازلی شکار، پنجاب کو قحط اور بیماریاں ہمیشہ ہی گھیرے رہتی تھیں (ہری رام گپتا، ہسٹری آف سکھس، جلد چہارم، منوہر لال پبلشرز ۱۹۸۲) ایک ایسے کو یوں بیان کرتے ہیں: "۱۷۸۱-۸۲ اور ۱۷۸۳ء میں بارش بالکل نہیں ہوئی۔ قحط نے سارے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا، مگر اس کا سب سے زیادہ اثر پنجاب میں تھا...... ہزاروں مویشی بھوک اور پیاس سے ضائع ہو گئے لاتعداد افراد مر گئے۔ ایک ہم عصر ہیرین داس کے قول کے مطابق پانچ یا چھ دنوں کے اندر صرف دہلی میں ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن گئے بچے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بیروں کی تلاش میں جنگلوں میں جاتے اور وہ اُن جنگلی جانوروں کا شکار ہوتے جو آس پاس کے گاؤں میں دن کی روشنی میں بھی ادھر اُدھر گھومتے رہتے تھے..... ایسی بھی کہانیاں سننے میں آئی ہیں کہ والدین نے خود اپنے بچوں کو کھا لیا.... اور اس بات میں تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس مہلک سال میں بچے کے بدلے مٹھی بھر اناج اچھا سودا سمجھا جاتا تھا۔"

آٹھویں دہائی میں خوراک کے قومی ذخیرے میں اناج کا ساٹھ فی صدی حصہ اکیلے اسی پنجاب نے فراہم کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ۲۷۶۸ روپیے کی فی آدمی اوسط آمدنی (تمام اعداد و شمار ۱۹۸۰-۸۱ کے ہیں) ہندوستان میں فی آدمی ۱۷۵۱ روپیوں کی آمدنی کے عام اوسط سے کہیں زیادہ تھی صرف ہریانہ اور مہاراشٹر کے اعداد و شمار کچھ کچھ پنجاب کے قریب آتے ہیں۔ ۱۹۵۱ کے بعد سے پنجاب میں فصلوں کی پیداوار میں چھ گنا اضافہ

ہو گیا ریاست کی آمدنی کا ۵۸ء۱۲ فی صدی حصہ زراعت کی دین تھا اور کام کرنے کے لائق لوگوں کی کل تعداد کے ۵۹ء۱ فی صدی لوگوں کو اس پیشے نے روزگار فراہم کر رکھا تھا۔ دھان کی پیداوار جو (۵۱-۱۹۵۰) میں ۱۰۰۰ کلوگرام فی ہیکٹر تھی وہ تیس سال بعد بڑھ کر ۲۹۵۷ کلوگرام فی ہیکٹر ہو گئی۔ اسی طرح گیہوں جو ۱۹۵۱ء میں ۹۰۱ کلوگرام فی ہیکٹر پیدا ہوتا تھا، اب ۲۳۴۲ کلوگرام فی ہیکٹر ہونے لگا تھا۔ پھر خوش حالی خود اپنے جلو میں بے شمار فائدے لائی۔ تعلیم میں اضافہ، کمیت میں بھی نظر آتا ہے اور کیفیت میں بھی۔ مثلاً ۶۸-۱۹۶۷ء میں ابتدائی اسکولوں کی تعداد ۷۱۸۲ تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۱۲۲۸۴ ہو گئی۔ مڈل اسکول ۸۶۳ سے ۱۴۱۰ ہو گئے۔ ہائی اسکول جو ۱۹۶۸ء میں ۷۸۹ تھے ۱۹۸۱ میں ان کی تعداد ۲۱۵۸ ہو گئی۔ آرٹس اور سائنس کے کالجوں کی تعداد ۱۹۶۸ء میں ۹۰ تھی ان میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۱ء میں ۱۶۱ ہو گئے۔ اور جہاں تک میڈیکل کالجوں کا تعلق ہے۔ ۱۹۶۸ء میں تو ان کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ۱۹۸۱ میں ۸ میڈیکل کالج قائم ہو چکے تھے۔ کسانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے اپنے بچوں کو شہر کے اچھے اسکولوں میں بھیجنا شروع کیا۔ خود پنجاب میں انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے والے نجی اسکولوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اور ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ۴۵ ہزار بے روزگار گریجویٹ (ناخواندہ بے روزگاروں کے تو تھے ہی نہیں) میں سے نصف دیہی علاقوں کے تھے۔ بائیں بازو کے ماہرین ابھی ابھی تک اگرچہ اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ آیا "سبز انقلاب" نے چھوٹے اور معمولی کسانوں کو مفلس کر دیا تھا اور متوسط درجے اور بڑے درجے کے کاشت کاروں کو سرمایہ داروں میں تبدیل کر دیا تھا مگر کسی ماہر اقتصادیات نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ بہ حیثیت مجموعی خوش حالی آئی ہے۔ یہ خوش حالی دین تھی انفرادی حوصلوں کی، آبپاشی کے یقینی اہتمام کی اور جدید زرعی سائنس کے حیرت انگیز کارناموں کی۔ پنجاب کا کسان اس لحاظ سے بھی کافی سمجھدار تھا کہ اس نے اپنی فاضل آمدنی کو تجارت، ٹرانسپورٹ اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں لگایا۔

مگر تموّل اپنے ساتھ اپنے مسائل بھی لایا۔ سب سے بڑا مسئلہ سب سے قدیم مسئلہ تھا یعنی سکھوں کی آبادی کے تناسب کا مسئلہ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں ان کی آبادی ۶۱ فی صدی کے بلند ترین نقطے تک پہنچ گئی تھی مگر وہ پھر نیچے آ ہو گئی۔ سکھ لیڈرشپ کو اس سلسلے میں ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس زوال کو خود دیکھ سکتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ خوش حالی، ترک وطن میں اضافہ کر رہی تھی کیوں کہ سکھوں کے اتنے پیسے ہوتے تھے کہ وہ بیرونی ملکوں میں جا سکتے تھے جہاں بہتر روزگار مہیا تھے۔ آزادی کے بعد کی تین دہائیوں میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ سکھ نوجوان ہندوستان سے باہر مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے

ہت سے اور لوگ ڈالر کمانے کے لیے تھوڑے عرصے کے لیے باہر گئے۔

ترکِ وطن ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ قانونی ہی ہو۔ اگرچہ دیہی پنجاب کے قلب میں واقع روڑ جیسا چھوٹا گاؤں ابھی حقیقت پر فخر کرتا ہے کہ وہاں دو یا تین ٹریول ایجنسیاں ہیں۔ سکھوں کے لیے یہ باہر جانا چیتھڑوں سے کمخواب بلکہ ں کیے کرسوٹ سے فرکوٹ تک کا سوال نہیں تھا۔ خواہشات اور حوصلوں میں تبدیلی آنے کی ایک بہترین مثال جالندھر نٹونمنٹ کے قریب کے ایک گاؤں سنسارپور میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ گاؤں ہاکی کے لاتعداد ممتاز کھلاڑی پیدا کرنے کی جہ سے بہت شہرت یافتہ ہے۔ ایک کھلاڑی تربیت دینے والے نے روشن آنکھوں والے بچوں کو تربیت دے دے کر نہیں اپنی جانشینی کے لائق بنا دیا۔ اولمپکس میں شریک ہونے والے میں سے زیادہ ہاکی کھلاڑی اسی گاؤں سے آئے تھے۔ کی انھیں شہرت کے ساتھ ساتھ اتنی دولت کا ذریعہ بنا کہ آرام دہ گھر بنایا جاسکے۔ مزید یہ کہ سرکاری نوکری، سرحدی حفاظتی و۔ پنجاب پولیس یا ریلویز میں نوکری کی بھی ضمانت ہوئی۔ ہاکی کے عظیم ہندوستانی کھلاڑیوں میں سے ایک بلبیر سنگھ لا جونیا نے مصنف کو کسی قدر تاسف کے ساتھ بتایا تھا کہ اب کوئی بھی ہاکی نہیں کھیلنا چاہتا۔ اب سب لوگ یورپ میں کسی کام کا خواب دیکھتے ہیں کیونکہ وہاں کے کام کے بعد بڑی سی کار ہے، شان دار مکان ہے اور یقیناً ایک گوری میم۔ گاؤں کے ایک آدمی نے یہی بات ذرا مختلف انداز سے یوں کہی تھی کہ آٹھویں دہائی میں سب سے قیمتی چیز جو پنجاب سے درآمد ہو رہی ہے وہ ہے یہاں کا مرد۔

اس کے برعکس دوسری طرف ریاست کی خوش حالی کی کشش سے کھینچ کر بڑی تعداد میں ہندو پنجاب آرہے تھے کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ دستیاب سکھ اور مقامی ہندو (جن میں زیادہ تر اچھوت تھے) مزدور سب کے سب روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ مزید ضرورت سے پیدا ہونے والے خلا کو ہندوستان کے نسبتاً غریب علاقوں جیسے اتر پردیش بہار اور مدھیہ پردیش سے آنے والے لوگوں نے پُر کیا ۱۹۸۱ء تک ان باہر سے آنے والوں کی تعداد کھیتوں پر کام کرنے والے کل مزدوروں کی تعداد کے ۳ء۲ فی صدی حصے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان فصلی مزدوروں کا ایک معتد بہ حصہ اگرچہ بوائی یا کٹائی کے کاموں کے بعد اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ جاتا ہے، مگر اچھے خاصے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پنجاب کو اپنا نیا گھر بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اپنے آبائی گاؤں جانے کے لیے کوئی ترغیب بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہاں یہی نہیں کہ انتہائی افلاس ہوتا ہے بلکہ سماجی تناؤ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ سکھ نچلے طبقے کے ہندوؤں کے مقابلے میں ذات پات کے امتیاز کو نسبتاً کم محسوس کرتا ہے۔ پنجاب میں یہ رشتہ مالک اور مزدور کا تھا اور ذات پات کو ماننے اور برتنے والی ریاست بہار کے برخلاف جہاں یہ رشتہ مالک اور جانور جیسا ہوتا

ہے۔ یہاں ان دونوں کے درمیان نسبتاً زیادہ انس اور گرم جوشی پائی جاتی تھی۔

آبادی اور بستیوں کے توازن کو جو ہمیشہ ہی متلون رہا تھا، ایک بار پھر خطرہ تھا کہ سکھوں کے خلاف رخ اختیار کر جائے۔ آٹھویں دہائی تک سکھ خود اپنی ریاست میں آبادی کا ۵۲ فی صدی تھے اور یہ مسئلہ نئی خوش حالی اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک دوسرے مسئلے کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔

دوسرا خطرہ جو سکھوں کے سامنے آ رہا تھا وہ تھا شناخت کا جو نئے اثرات کی ہانڈی میں پک رہا تھا اس کا الزام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اس دفعہ سبب تھا جمہوری دور کی صنعت اور جدیدیت، وہ چاہے نو ہو یا تباہ کن۔ کے اثرات۔ اگر سکھ نوجوان، نو دریافت عیش اور دولت کی وجہ سے نشہ آور دواؤں اور شراب کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں (ہندوستان میں آئینی طور پر جائز پھلتی پھولتی صنعت ہے۔ شراب کی اور حشیش پاکستان میں ممنوع مگر ترقی کرتی ہوئی تجارت ہے) تو یہ کسی دوسرے کی غلطی نہیں تھی۔ لہراتی ہوئی داڑھیاں بھی اب نسبتاً کم نظر آتی تھیں۔ سکھوں کی کافی بڑی تعداد اب اپنے بالوں کو کاٹنے کا آسان طریقہ اپنا رہی تھی۔ صورت حال پیچ کی تھی۔ ... صاف شیو اور رہتی آزادانہ نشو و نما۔ مگر رجحان بالکل واضح تھا۔ پنجاب جانے والا ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ آٹھویں دہائی میں ترشی ہوئی داڑھیاں اتنی ہی عام ہو گئی تھیں جتنی کہ وہ کسی زمانے میں مفقود تھیں۔ یہ تبدیلی گاؤں تک میں ہو رہی تھی۔ خطرے کی گھنٹی ایک بار پھر سنائی دینے لگی تھی۔

اور اس گھنٹی کو سب سے زیادہ زور سے بجانے والے، قدرتی طور پر، اکالی تھے جن کے نزدیک وجود کا ... ہی مخصوص خالصہ شناخت کا باقی رہنا تھا۔ بہرحال اکالی ایک مذہبی تحریک کا سیاسی بازو تھے اور عقیدے کی ... بھی کمی اور ارتداد کا شائبہ بھی بڑی بنیادی سطح پر چوٹ پہنچا سکتا تھا یہاں تک کہ گاؤں کے جاٹ سکھ جنہوں نے اکالیوں کو ووٹ دیا تھا ان نئے رجحانات سے متاثر ہو رہے تھے۔

آزاد ہندوستان نے سکھوں کی خوش حالی کو زراعت تک محدود نہیں رہنے دیا۔ وہ اگرچہ ملک کی آبادی کا دو فی صد حصہ ہیں مگر مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں ان کا تناسب، وہاں کے تمام ملازمین کی تعداد میں آٹھ فی صدی ہے۔ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں (پرانے آئی سی ایس، امپیریل انڈین سول سروس کا بدل) براہ راست منتخب کیے ہوئے چار ہزار افراد میں ۲۵۶ یا (یا ہر سولہ میں ایک) افراد سکھ ہیں۔ اسی طرح انڈین پولیس سروس میں ۱۵۲۷ افسروں میں اکیاسی افراد سکھ ہیں۔ ہماری فوج میں آج بھی سکھوں کی تعداد ۷ر۵ فی صدی سے کچھ زیادہ ہی ہے اس وقت جب یہ تحریر لکھی جا رہی ہے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ، ہوائی فوج کے چیف دلباغ سنگھ اور ریزرو بینک کے گورنر من...

لہ سب سکھ ہیں۔ تجارت اور کاروبار میں بھی ملک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ سکھوں نے بھی اپنا ایک اہم
م بنالیا ہے۔ اوران کا پانچواں حصہ پنجاب سے باہر رہتا ہے اور خوش حالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ملک کی دوسری
ہیں۔ اگر ایسے اعداد و شماران کے بارے میں مل جائیں تو بہت کچھ نثار کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ صدارت کے
رسمی عہدے کے لیے باری باری مختلف لوگوں کو منتخب کرنے کی جو پالیسی ہے اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بھی اس
ے تک پہنچنا نصیب ہوتا ہے مگر جہاں تک حقیقی طاقت (اقتدار) انتظامیہ صنعت یا تجارت کی بات ہے اس
کھوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اسی لیے یہ حلقہ ایک اہم اور بااثر حلقہ ہے جس کو سکھ کٹرپن سے کوئی دلچسپی نہیں
ہے۔ یہ حلقہ یا گروہ اکالیوں کے وجود کو صرف اس حد تک مانتا ہے کہ یہ پارٹی دباؤ ڈالنے والے گروپ کی حیثیت سے
فید ہو سکتی ہے یا پھر کسی حقیقی بحران کے وقت اس کا سایہ ایک نعمت ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد معتدل اکالی ہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی سالمیت خالصہ شناخت اور مذہب کے لیے وقف۔
پنجاب جیسے صوبہ میں جمہوریت کے تضادات اور دشواریوں کے پیش نظر سیاسی قوت کیوں کر حاصل کی جائے۔
س کے بارے میں غیر یقینی۔ مذہبی نظریات اور جمہوری عقائد کی درمیانی پھسلواں زمین پر چلنا اکالیوں میں الجھن، جلد
ی اور پھر مایوسی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کی چرب زبانی اور لفاظی اپنی قیمت کا مطالبہ کرنے لگتی ہے۔ سکھ عقائد
کھنے والوں کا آخری گروہ ظاہر ہے انتہا پسندوں کا ہے جو سکھوں کو ہندوستان سے الگ لے جانا چاہتا ہے اور
یہ کھتا ہے کہ وہ بندوق کے زور اور پاکستان کی تھوڑی سی مدد پر ایسا کر سکتا ہے۔ اس گروہ کو ایک فوقیت اس اعتقاد
کی صورت میں حاصل ہے جو سیدھے سادے، صاف اور سرفروشی کا جذبہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ
سوچتے نہیں اور اسی لیے باقی ہیں۔

(۱۰)

خالصتان کی تلاش میں

یہ کیمبرج کے پڑھے ہوئے ایک صاحب تھے۔ چودھری رحمت علی جنھوں نے پہلی بار برصغیر میں ایک م
ملک کی، جو پاکستان کہلائے گا، تجویز رکھی تھی۔ اور یہ آکسفورڈ کے ایک طالب علم کپور سنگھ تھے جن کی پیدائش ۱۰۹
میں ہوئی تھی۔ آئی سی ایس کے لیے ان کا انتخاب ہوا تھا اور پھر بعض الزامات کی بنا پر ان سے ریٹائر ہونے
درخواست کی گئی تھی۔ انھوں نے چھٹی دہائی میں سکھوں کو ان کے مجوزہ آزاد ملک خالصتان (پاک لوگوں کا ملک ا
قوم) کے بارے میں یاد دہانی کرانا شروع کی۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ (وزیر اعظم) سر سکندر حیات خاں نے پنجاب
لیجس لیٹو اسمبلی میں، نظریۂ پاکستان پر اعتراضات شروع کیے تو چودھری رحمت علی کی اسکیم سے متعلق ان کے طنزیہ جملوں
ایوان کے تمام حصوں سے قہقہوں کی آواز آئی تھی۔ چھٹی اور ساتویں دہائی میں کپور سنگھ کے خیالات کی توضیح بھی کچھ ا
طرح ہوئی وہ لوگ جو سیاسی مقابلے کے بجائے طنز کو ترجیح دیتے ہیں انھوں نے خالصتان کے معنوں میں لطف کا پہ
ڈھونڈ نکالا ہندی میں خالی کا مطلب ہوتا ہے جس میں کچھ نہ ہو اور استھان کے معنی ہوتے ہیں جگہ کے۔

اکالی دل ماسٹر تارا سنگھ نے مئی ۱۹۶۵ اور دسمبر ۱۹۶۶ میں دو تجویزیں منظور کیں جن میں جمہوریہ ہند.
دائرے کے اندر ایک خود مختار حیثیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تجویز میں جمہوریۂ ہند کا تذکرہ بڑا ہلکا پردہ تھا۔ ۰،
اور ۱۹۷۱ء میں جب برصغیر پاکستان میں ہیجان کے عروج پر پہنچنے کے ساتھ ایک ڈرامائی کیفیت سے گذر رہا
اسلام آباد نے خود دہلی کے ساتھ سیاسی شطرنج کی بازی کھیل رہا تھا، ہندوستان کی دوررس چالوں کے مقابلے
لیے پنجاب میں کچھ پیادوں کو آگے بڑھا دیا۔ اکالی دل کے ایک سابق سکریٹری اور ایک قلیل مدت کے لیے م

یاب کے وزیر مالیات ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان نے، جو تارا سنگھ گٹ کی عسکری آواز بن گئے تھے (ماسٹر ہ کا انتقال ۱۹۶۸ میں ہوگیا اس کے بعد ان کے کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا) اب ملک چھوڑ دیا، ا پاسپورٹ حاصل کیا اور گرونانک کی جائے پیدائش ننکانہ صاحب میں جو پاکستان میں تھا، ایک "باغی سکھ ت" کے قیام کے ایک منصوبے کا اعلان کر دیا۔ (مشرقی پاکستان میں مارچ کے مہینے کی فوجی کارروائی کے بعد ں دہلی، ہندوستانی علاقے میں بنگلہ دیش کی ایک باغی حکومت کی یقیناً حمایت کر رہا تھا) ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو رک ٹائمز میں ڈاکٹر چوہان نے نصف صفحہ کا اشتہار شائع کرایا جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اسباب کی وضاحت کی وہ خالصتان کیوں چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ تھا فوج میں سکھوں کا حصہ۔ ر فوج میں بھرتی سے متعلق حکومت ہند کی نئی پالیسی سے بہت پریشان تھے اس نئی پالیسی کا اعلان ۱۹۷۴ء میں اع جگ جیون رام نے کیا تھا اور جس میں بھرتی میں آبادی کے لحاظ سے تناسب کو مد نظر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ا حصہ ۲٫۵ فی صدی تھا اور جمہوری ہندوستان نے بالآخر فوج کی ملازمتوں میں "عسکری نسلوں" کی قومیت مے انکار کر دیا تھا۔

پنجاب میں ۱۹۶۷ء کے بعد کی سیاسی اتھل پتھل، اکالیوں کے لیے کسی حد تک تلخ تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اس بل نے اکالیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ضروری نہیں کہ طاقت و اختیار ایک کامیاب سیاسی تحریک کا ناگزیر اٹھویں دہائی میں سکھوں کے تذبذب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مایوسی اور نا امیدی کے حقیقی سبب ا، ات جیتنے میں دشواری، اور اگر جیت لیں تو پھر حکومت کو قائم رکھنے میں ان کی پریشانی کو سمجھ لیا جائے۔

سارے شمالی ہندوستان میں امرت سر سے کلکتے تک مسز اندرا گاندھی کی پہلی شکست ۱۹۷۷ کی ایمرجنسی میں ہوئی تھی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ان کی اصل شکست ٹھیک دس سال قبل ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات ں تھی۔ عظیم سوشلسٹ لیڈر اور نظریہ ساز ڈاکٹر رام منوہر لوہیا مسز اندرا گاندھی کی اس شکست کے اصلی محرک ھوں نے حزب اختلاف کے تمام لوگوں سے یہ کہا کہ انھیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اکیلے کبھی بھی کانگرس یں سکتے، کانگریس منقسم رائے شماری میں ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلے گی، انھوں نے ایک حلقہ انتخاب سے حزب ، کے صرف ایک نمائندے کو کھڑا کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس حکمت عملی نے کام کیا۔ کانگریس کسی طرح مرکز میں ، مانے میں کامیاب ہوئی اس کی کامیابی زیادہ تر جنوب کی ریاستوں آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اور مغربی ن مہاراشٹر میں زبردست کامیابیاں حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئی لیکن ہندی گڑھ، تمل . ت پور، لکھنؤ،

بھوپال، بھوبنیشور، پٹنہ اور کلکتہ میں متعدد مختلف پارٹیوں نے جلدی جلدی متحدہ محاذ کی حکومتیں قائم کرنے کا بد
کرلیا۔ اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کا مخالف پارٹیوں کے لیے یہ بہتر موقع تھا مگر انھوں نے یہ موقع گنوا دیا ؟،
میں دوبارہ برسراقتدار آنے کا زمانہ کانگریس نے مخالف جماعتوں کی ان متحدہ محاذوں کی مشترکہ حکومتوں سے دل
اور غیر کانگریسی جماعتوں کی ساکھ کو ختم کرنے کا کھیل بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلنے میں صرف کیا ۔ صرف ایک تا
سا کانگریس اس کھیل میں کامیاب نہ ہوسکی وہ تھی جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو جہاں ڈی ایم کے نے کا؟
بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔ اور خود ایک غیر متنازعہ فیہ متبادل کی طرح سامنے آئی تھی۔

سکھ اکالی دل، ہندو جن سنگھ، اور دہرے کمیونسٹوں کے درمیان موجود سخت نظریاتی اختلافات کے :
پنجاب کی ان اہم مخالف پارٹیوں کے مابین الیکشن سے قبل یک جہتی اور اتحاد دشوار تھا اور ان سب کے ا
اختلافات کی پیدا کی ہوئی باہمی تلخی تھی۔ اکالی سنت فتح سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کے گروہوں میں بٹے ہوئے تھ
یک کر کمیونسٹ بھی، مارکسسٹ کمیونسٹوں کے نام سے اصل پارٹی سے الگ ہو گئے تھے۔ سنت فتح سنگھ :
کے اکالیوں نے الیکشن سے قبل صرف کمیونسٹوں کے ساتھ نشستوں کے سلسلے میں مفاہمت کی راہ نکال لی تھی
نے اگرچہ انتخابات میں سب سے زیادہ یعنی ۲۷٫۶ فی صدی ووٹ حاصل کیے تھے مگر وہ ۱۰۴ نشستوں میں ؎
۴۸ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی۔ سکھ اگرچہ آبادی کا ۵۶ فی صدی حصہ تھے مگر دونوں اکالی گروپوں نے:
مجموعی محض ۲۵ فی صدی ووٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حسب معمول، اعتدال پسند اکالیوں کو اچھا ما
ملا۔ ۲۰٫۴۶ فی صدی ووٹ اور ۲۴ نشستیں، ماسٹر تارا سنگھ کے گروپ کو صرف دو نشستیں حاصل کرنے پر اکتا
پڑی۔ جن سنگھ نے جو ہندو انتہا پسندوں کی نمائندگی کر رہی تھی صرف ۹٫۸۵ فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ کمیو
کا حصہ محض ۹ فی صدی رہ گیا اور دونوں گروپوں نے مل کر آٹھ نشستیں جیتیں پانچ کمیونسٹ پارٹی آف انڈ
تین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) نے۔

منشوروں میں اختلافات کے باوجود، مخالف پارٹیوں نے ایک متحدہ محاذ بنالیا اور سنت اکالی دل :
کو (ایک بیرسٹر جو ۱۹۵۹ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے) وز
حیثیت سے منتخب کیا اور ۸ مارچ ۱۹۶۷ء میں وزارت قائم کرلی۔

نفاست پسند لیڈر گرونام سنگھ ہندوستانی متحدہ محاذ کی سیاست کی ہنگامہ خیزی کو سمجھنے اور اس ؟
میں بالکل ناکام ثابت ہوئے حرص و ہوس اور ذاتی مفادات نے بھی اپنا کام کیا۔ مثلاً اس بات پر ناراض ہ

ممبر نہیں بنایا گیا اکالی دل کے نائب صدر سرچرن سنگھ ٹوہڑا نے پارٹی سے استعفا دے دیا۔ کانگریسی لیڈر گیان سنگھ راڑے والا نے بھی نہایت آسانی کے ساتھ اس ساجھے کی ہنڈی کا ستیاناس کیا۔ انھوں نے ماسٹر تارا سنگھ گروپ کے لیڈروں کو جن کی قیادت لچھمن سنگھ گل کر رہے تھے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس متحدہ محاذ کو چھوڑ کر لیجسلیٹو اسمبلی میں کانگریس کی مدد سے ایک نئی حکومت کی تشکیل کریں۔ ماسٹر تارا سنگھ اپنے ایک شاگرد کی سربراہی میں چلنے والی پہلی حکومت کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو گل کے حلف لینے کے محض تین دن قبل انتقال کر گئے۔ گل حکومت نے پنجابی کو سرکاری زبان بنا دیا۔ وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ یہ کام مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ (سوال یہ ہے کہ کیا رنجیت سنگھ نے ایسا چاہا بھی تھا) مگر جلدی ہی کانگریس نے اس حکومت سے جس کے قیام میں اس نے مدد کی تھی حمایت کرنے کا عہد توڑ لیا۔ ضدی لچھمن سنگھ گل نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ اسمبلی میں تشدد ہوا اور دہلی نے ۲۳ اگست ۱۹۶۸ کو وسطی مدت کے انتخابات ہونے تک گورنر راج کا نفاذ کر دیا۔ اگر اس سب کو پڑھنے کے بعد قاری ایک دم پریشان ہو جائیں تو اس پر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہی کیفیت لوگوں کی پنجاب میں تھی۔

۱۹۶۹ کے انتخابات کے لیے اکالیوں نے ایک مختلف حکمت عملی اختیار کی۔ وہ جن سنگھ کے شہری ہندوؤں کے ساتھ تو مصالحت کر سکتے تھے مگر ان کمیونسٹوں کے ساتھ وہ کوئی معاہدہ نہیں چاہتے تھے جو سکھ کسانوں کی حمایت کے معاملے میں ان کے حریف تھے۔ اکالی گٹھ جوڑوں کا ارتقا بہت دلچسپ ہے یہ پانچویں دہائی میں کانگریس سے متردد ہوا۔ کانگریس کے بعد ۱۹۶۷ء میں کمیونسٹ دوستی کے قابل سمجھے گئے اور اب اکالی اپنے سب سے کٹر دشمن جن سنگھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ مگر موخرالذکر سے گٹھ جوڑ سب سے زیادہ منطقی گٹھ جوڑ تھا کیوں کہ ان کے مابین علاقوں کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اکالی ہندو ووٹ کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اسی طرح جن سنگھ سکھ کسانوں کی حمایت کی توقع کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ دو فرقہ پرست جماعتیں اپنے اپنے فرقوں کی واحد نمائندہ بننے کے لیے کوشاں تھیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس کو، جسے ہندوؤں اور سکھوں دونوں کی حمایت حاصل رہتی تھی ختم کرنا ناگزیر تھا۔ یہ گرنام سنگھ تھے جو ۱۹۶۹ء میں ایک بار پھر وزیر اعلیٰ ہوئے۔

ہندوستانی سیاست میں یہ ایک ڈرامائی سال تھا۔ مسز گاندھی نے سرکاری کانگریس پارٹی سے اپنا ناطہ توڑ صدر جمہوریہ کے بالواسطہ انتخاب میں خود اپنا امیدوار کھڑا کیا اور کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ان کا امیدوار بہت اکثریت سے ہی سہی بہرحال کامیاب ہوا۔ مسز گاندھی کو گرنام سنگھ سے اہم اور انتہائی اہم مدد ملی۔ اس کے مد سلے؟

اکالیوں کو چنڈی گڑھ سونپ دیا گیا۔

جب ۱۹۶۶ میں پنجاب تقسیم ہوا تھا، راج دھانی چنڈی گڑھ کے شہر (جس کے ڈیزائن کرنے والوں دوسرے لوگوں کے ساتھ Le Corbusier بھی ہیں) کی قسمت کا فیصلہ اس وقت تک ہریانہ کی نئی ریاست اپنی راجدھانی تعمیر نہ کر لے التوا میں رکھا گیا تھا۔ اکالی انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۹ کو سنت سنگھ نے دھمکی دی کہ اگر چنڈی گڑھ فوراً حوالے نہ کیا گیا تو وہ آگ میں جل کر اپنی جان دے دیں گے۔ بہرحال ا نے اپنی اس دھمکی پر عمل نہیں کیا لیکن ۱۹۶۹ء میں جنگِ آزادی کے ایک سکھ سپاہی درشن سنگھ پھیرومل نے چنڈ کے ٹرانسفر کے لیے ۷۴ دن کا برت رکھا اور ۲۷ اکتوبر کو مر گئے۔ ان کی اس موت نے ان تمام سنتوں کو نا شرمسار کر دیا جو اکثر شہادت کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ عوام کے موڈ اور ان کے جذبات کو بھانپتے ہوئے چ گڑھ کو پنجاب کے حوالے کرنے کی خاطر دہلی پر دباؤ ڈالنے کے لیے سنت فتح سنگھ نے یوم جمہوریہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ ایک بار پھر مرن برت شروع کر دیا۔ برت شروع ہوئے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے کہ مسز گاندھی نے ایک کا اعلان کر کے سنت کو بچا لیا۔ ایوارڈ تھا پنجاب کو چنڈی گڑھ ملے گا اور ہریانہ کو معاوضہ کے طور پر فاضلکا او کے اضلاع کے کچھ حصے اور خود نئی راج دھانی بنانے کے لیے دس کروڑ روپیہ۔ ایوارڈ کا نفاذ جنوری ۱۹۷۵ ہونا تھا۔ وزیر اعلیٰ گرنام سنگھ اور سنت فتح سنگھ دونوں نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ یہ ان کی ذاتی کوشش تھی ج یہ جیت حاصل ہوئی۔ گرنام سنگھ کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ اس حمایت کی وجہ سے ہوا جو انھوں نے صدارتی انتخاب مسز اندرا گاندھی کو اکالیوں سے دلوائی اور جس کے لیے ساری بھاگ دوڑ انھوں نے کی۔ دوسری طرف سنت ف کہتے تھے کہ مسز اندرا گاندھی نے ان کی مر جانے کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ (یہ فتح بہرحال نفع کا سودا نہیں ثابت ہوئی۔ ۱۹۷۵ء کا جنوری کا مہینہ آیا اور گذر گیا مگر چنڈی گڑھ پنجاب کو نہیں ملا) م لیڈروں سے جھگڑا کرانے کی گرنام سنگھ کو قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ پارٹی سے نکال دیے گئے۔ ۲۷ مارچ کو اکالی دل اور جن سنگھ کی ایک اور مخلوط وزارت نے حکومت سنبھالی، اس کے سربراہ سنت فتح سنگھ کے کیے ہوئے پرکاش سنگھ بادل تھے۔ بادل نے کاشت کاروں کو خوش کرنے کی کوششوں کو تیز کیا۔ اکالیوں پانچ ایکڑ تک زمین کی ملکیت کو لگان سے مستثنیٰ کر دیا۔ اناج کی خریداری کی نسبتاً زیادہ قیمت کی ضمانت کا رواج (جن سنگھ کے اپنے ساتھیوں کی سراسیمگی کے باوجود، جنھیں ساہوکاروں اور تاجروں کی اچھی خاصی حمایت حاصل غلے کی خرید و فروخت میں بچولیے کے وجود کو ختم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اقتدار کے زمانے میں اکالیوں کا م

بنا انتہائی معقول رہا۔ ان کی خصوصیت ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان جب تیسری بار وہ حکومت میں آئے وقت بھی نظر آتی تھی۔ جب ۱۹۷۸ء میں ایک سکھ لیڈر رہنمت سیوا داس نے چنڈی گڑھ کے لیے برت رکھا تو الی لیڈروں نے یہ کہہ کر کشمکش کو دبا دیا کہ برت سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

بادل کی کسان دوست اقتصادی پالیسی کے باوجود ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء کے انتخابات میں اکالی یکسر صاف ہو گئے سز گاندھی کی کانگریس نے "غریبی ہٹاؤ" کے اپنے پرکشش نعرے کی مدد سے پنجاب میں لوک سبھا کی بارہ نشستوں میں سے گیارہ اور ریاستی اسمبلی کی ۱۰۴ سیٹوں میں ۶۶ سیٹیں جیت لیں۔ پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم۔ یعنی وہی پرانا مسئلہ پھر سامنے تھا۔ خالصہ رہنموں کو جب بھی کبھی حکومت میں وزارتیں نہیں ملتیں وہ سکھ وطن کے بارے میں، کہ جہاں ان کی وزارتوں کو انتخابی شکست سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، بھیانک امکانات کی تبلیغ شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اکتوبر ۱۹۷۳ء میں وہ مشہور اور متنازعہ فیہ ریزولیوشن آیا جو آنند پور صاحب ریزولیوشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کی جان کو سب سے پہلا خطرہ مغلوں سے یا ان کے بدنام ترین بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کی طرف سے نہیں آیا بلکہ یہ خود سکھوں کی طرف سے پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں بڑا خلط مبحث تھا کہ آیا پچھلے گرو ہری کشن نے اپنے تایا ______ (یا بابا بکالے) کو اپنی موت کے وقت اپنا جانشین مقرر کیا تھا یا نہیں مگر ہری کشن کا انتقال چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر ہوا تھا وہ اس وقت اورنگ زیب کی فوج کے ابتدائی اہم جنرل مرزا راجہ جے سنگھ کی دہلی میں قیام گاہ پر مقیم تھے (گرودوارہ بنگلا صاحب اسی جگہ پر تعمیر ہوا ہے) گرو کے اعزاز کے دعوے دار دو رشتے دار دھیر مل اور رام راج بھی تھے۔ اول الذکر نے گرو تیغ بہادر کو مارنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ اپنے قتل کے متمنی رشتہ داروں سے تو بچ گئے مگر اپنے باپ کے بنائے ہوئے شہر امرتسر یا کرت پور میں اپنے حامی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے کرت پور کے شمال میں تقریباً پانچ میل دور ایک پہاڑی خرید لی اور وہاں خود اپنی راجدھانی بنائی۔ اس کا نام انھوں نے آنند پور رکھا۔

مگر داخلی جھگڑوں نے گرو تیغ بہادر کو آنند پور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے مشرق کی طرف آسام تک کا سفر کیا۔ اسی دوران اورنگ زیب کے اندر کا تعصب سرگرم ہو چکا تھا۔ تمام ان لوگوں نے اذیتیں اٹھائیں جنھوں نے اس کے خصوصی مسلک کو نہیں مانا (مثال کے طور پر مسلمانوں کا شیعہ فرقہ بھی نشانہ تھا۔) اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ دکن کی مسلم سلطنتوں سے جنگ کرنے میں گزارا۔ ان سلطنتوں کے سربراہ شیعہ تھے۔ گرو تیغ بہادر پنجاب واپس آئے یہاں انھیں ایک مسلمان صوفی فقیر حافظ آدم ملا جو شیخ احمد سرہندی کے سلسلے کے تھے

کے بیٹے اپنا ایک رفیق نظر آیا دونوں نے مل کر مغل بادشاہ کے خلاف ایک عوامی بغاوت کو دبا دیا اور گرو تیغ بہادر کو میں گرفتار کر لیا۔ انھیں موت کی سزا ہوئی۔ اور ۱۱ نومبر ۱۶۷۵ء کو دہلی میں اسی جگہ پر جہاں آج گرودوارہ سیس گنج ہے، ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ان کے جسد خاکی کو دہلی میں اس جگہ نذر آتش کر دیا گیا جہاں آج پارلیمنٹ ہاؤس کے عقب میں گرودوارہ رکاب گنج بنا ہوا ہے ان کے کٹے ہوئے سر کو نذر آتش کرنے کے لیے ان کے بیٹے اور جانشین گرو گوبند، آنند پور صاحب لے گئے۔

آنند پور صاحب، دوسرے الفاظ میں، ایک شہر جس میں سکھوں کے لیے اشاریت اور علامتوں کی بھرمار ہے خصوصاً دہلی کے خلاف جنگ کا نعرہ بلند کرنے والے سکھوں کے لیے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں گرو گوبند نے قلعوں کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ یہ آنند پور ہی تھا جہاں انھوں نے خالصہ کے اپنے نئے فرقہ کی ابتدا کی اور پھر سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا دفاع کیا، پہلے ہم نوا ہندو راجپوت سرداروں کے حملوں سے جن کی قیادت بلاس پور کا راجہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وزیر خاں سرہندی کی زیر قیادت لڑنے والی مغل فوجوں سے۔ (سرہند مزید شمال میں ہے) یہ آنند پور ہی تھا جہاں ۱۷۰۴ء میں گرو گوبند سنگھ کے شہر چھوڑنے پر مجبور ہونے سے قبل دا اسم گرنتھ کا زیادہ حصہ مدون ہوا۔ آنند پور میں پانچ تختوں میں سے ایک تخت بھی ہے جہاں سے حکم نامے جاری کیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں اپنے نئے پروگرام کا اعلان کرنے کے لیے اکالیوں نے آنند پور صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ باہمی طور پر منسلک سیاسی اور مذہبی عناصر کے تانے بانے کو ایک بار پھر چنا گیا۔ مگر اس دفعہ بھی بنیاد اسی پرانے خوف پر رکھی گئی تھی جیسا کہ اکالی دل کے صدر سردار ہرچند سنگھ لونگووال نے ایک وضاحتی کتابچے ("ہمارے ساتھ انصاف کرنا آپ کا فرض ہے") میں جو بعد کو پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ لکھا تھا کہ اصل وجہ "یہ پیش اندیشگی تھی کہ بدھ ازم اور جین مت کی طرح، وہ (سکھ) بھی زبردست ہندو اکثریت کے وسیع سمندر میں اپنی شناخت کھو سکتے ہیں۔ نانک پنتھی کہہ رہے تھے کہ بغیر سیاسی قوت کے وہ بھی کبیر پنتھیوں کی طرح مصائب کا شکار ہوں گے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی نے "سکھ دانش وروں اور مفکروں" پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی اور جس کے ذمے سکھ پنتھ کے مقاصد اور نصب العین کو از سر نو طے کرنا تھا تاکہ دل سکھوں کی توقعات پورا اتر سکے۔" کمیٹی کے صدر تھے سرجیت سنگھ برنالا (مرارجی ڈیسائی کی حکومت کے زمانے میں یہ وزیر خوراک و زراعت ہوئے) کمیٹی کے دوسرے اراکین میں ایس جی پی سی کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ گر چرن سنگھ جیون سنگھ امرانگل، گرمیت سنگھ، ڈاکٹر بھگت سنگھ، بلونت سنگھ، گیان سنگھ راڑے والا، پریم سنگھ لال پورا، جسو

سنگھ برار، بھاگ سنگھ، میجر جنرل گربخش سنگھ بدھنی اور امیر سنگھ امبالوی تھے۔ اس کمیٹی کی پہلی نشست ۲۲ دسمبر ہوئی دس مزید میٹنگوں کے بعد (جو چنڈی گڑھ میں، ۱۹۷۷ میں اکالی دل کے سکریٹری اجمیر سنگھ کے الفاظ میں وہاں کے پُرامن اور مانوس ماحول کی وجہ سے ہوئیں) ایک مسودہ تیار ہوا جو ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۳ کو سری آنند پور صاحب (سکھوں کے دسویں گرو کا مقدس اور تاریخی مقام) میں شرومنی اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا، ورکنگ کمیٹی نے دوسرے دن اسے منظور کر لیا۔

بنیادی مفروضے کی تعریف یوں کی گئی تھی "شرومنی اکالی دل، سکھ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کی حقیقی تجسیم ہے۔ اور اسی لیے یہ ان کی نمائندگی کی پوری حق دار ہے" تنازعہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے "اکالی قوم" سے اکالیوں کی کیا مراد ہے؟ پرانے خدشات کو ہوا دی گئی، جناح صاحب نے یہ اصرار کر کے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اپنا پاکستان حاصل کر لیا۔ اکالی جنھوں نے سرکاری طور پر کبھی بھی نہ تو علیحدگی کی وکالت کی اور نہ تشدد کی، انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نیشن کا لفظ، پنجابی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ قوم کا قریب ترین متبادل ہے جس سے نیشن کے بجائے کمیونٹی زیادہ مراد ہوتی ہے مگر کیا یہ وضاحت سچائی پر مبنی تھی یا محض ایک پردہ۔ جو کچھ ہوا وہ اچھا خاصا صاف ہے۔ مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی نے 'قوم' کا لفظ دانستہ استعمال کیا تھا اور ہر شخص کے یہ جاننے کے باوجود کیا تھا کہ اس لفظ کی مختلف تاویلیں کرنے کے کتنے امکانات ہیں۔ اس لفظ کا استعمال ایک پنہاں دھمکی تھی کہ اگر اکالیوں کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ اس لفظ کی وہ تاویل کرنا شروع کر دیں گے جو دہلی کے لیے کم ہی گوارہ ہوگی۔

آنند پور صاحب ریزولیوشن میں، قدرتی طور پر، خاصہ مذہبی عنصر شامل تھا مگر اس میں صرف دو ہی مذہبی مطالبات ایسے تھے جن کا ہندوستان کی حکومت سے ان کے تعلقات پر اثر پڑتا تھا۔ اکالی ایک آل انڈیا گردوارہ ایکٹ چاہتے تھے (انگریزوں نے ۱۹۲۰ء کی تحریک کے بعد صرف پنجاب کے گردواروں کے لیے قانون وضع کیا تھا) تاکہ سکھ ازم کے روایتی تبلیغی فرقوں کو انفرادی مٹھوں کی املاک کو غصب کیے بغیر پھر سے مربوط کیا جا سکے۔ دوسری بات جو سکھ چاہتے تھے وہ تھی تمام سکھ مقدس مقامات کی بشمول ننکانہ صاحب جن سے سکھ پنتھ دور ہو گیا تھا زیارت اور ان کی دیکھ بھال کے لیے رسائی چاہتے تھے دوسرے الفاظ میں ان کا مطالبہ پاکستان کے ساتھ دوستی کی پالیسی کا تھا (جہاں ان کے مذہبی مقامات تھے) جو دونوں ملکوں کے درمیان سفر کو آسان بنانے کی ضامن ہوتی، اور شاید پاکستان کی حکومت کی اجازت سے کوئی ایسا معاہدہ ہو جاتا جس کی بنا پر اکالی ان مقدس مقامات کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے سکتے۔

دوسرے مذہبی دفعات میں الحاد وارتداد کی فوری پریشانی کا پہلو نظر آتا ہے۔ مبلغین اور مشنری، ہند اور بیرون ہند کے گاؤں اور شہروں میں بھیجے جاتے۔ پیدائش نو کا بپتسمہ (امرت پرچار) ہوتا خصوصاً اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں۔ پنجاب کی خوشحالی کے ایک نسبتاً کم خوش گوار اثر کو تسلیم کرتے ہوئے شراب نوشی کے مسئلے اور خالصہ کی پاکیزگی پر پڑنے والے اثرات کے مسئلے کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ مگر آنند پور ریزولیوشن کے سیاسی مضمرات تھے جو دہلی کے لیے زیادہ پریشان کن تھے۔

ایک بار پھر تعارفی عبارت کو دانستہ مبہم چھوڑ دیا گیا۔ پنتھ کی سیاسی منزل بلاشبہ دسویں گرو کے احکامات جو تاریخ کے صفحوں اور خالصہ پنتھ کے ایک ایک دل میں محفوظ ہے جس کا اصل مقصد خالصہ کی فوقیت و برتری ہے نیز اکالی دل کی بنیادی پالیسی ایک سازگار ماحول اور ایک سیاسی ڈھانچے کے ذریعہ خالصہ کے لیے اسکا پیدائشی حق کا حصول ہے۔ دسویں گرو گوبند سنگھ کا کون سا حکم؟ خالصہ راج کرے گا؟ کیسا راج؟ ایک الگ سکھ ملک۔ چونکہ جمہوریت سکھوں کو مستقل حکومت کا موقع فراہم نہیں کر رہی تھی اس لیے کیا وہ اب پاکستان کی طرح ایک مذہبی طرز حکومت کو اپنائیں گے جہاں مذہب کے نام پر اقلیت کی حکومت کو جائز سمجھا جاتا ہے؟ اسلام خطرے میں تھا چنانچہ ملاؤں نے اسے بچانے کے لیے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، کیا اسی طرح سکھ ازم کو اس وقت تک ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا جب تک کہ اکالیوں کو ان کا سکھستان یا خالصتان نہ مل جائے؟ کیا یہی اصلی مقصد تھا جس کا ذکر تو تھا مگر کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی وہ کون سا پیدائشی حق" تھا اکالی جس کی بات کر رہے تھے؟ ایک سازگار ماحول اور ایک سیاسی ڈھانچے سے ان کی کیا مراد تھی؟

ریزولیوشن نے جدوجہد کے اگلے مرحلے کا خاکہ پیش کیا۔ سب سے پہلی بات جو اکالیوں نے کی وہ تھی ان تمام پنجابی بولنے والے ان علاقوں کو پنجاب میں شامل کرنا جنہیں جان بوجھ کر پنجاب سے باہر رکھا گیا تھا۔ مثلاً گورداس پور ضلع میں ڈلہوزی، چنڈی گڑھ، پنجور کا علاقہ اور انبالہ صدر وغیرہ ضلع انبالہ میں نالاگڑھ کا "دیش" کا علاقہ، کرنال ڈسٹرکٹ شاہ آباد اور گوہلا بلاک، تھانیسر، ذیلی تحصیل، رتیا بلاک اور حصار کی سرسا تحصیل اور راجستھان میں گنگا نگر ضلع کی چھ تحصیلوں کو ایک انتظامی اکائی بننے کے لیے پنجاب میں ملا دیا گیا جہاں سکھ اور سکھ ازم دونوں کو خصوصی طور پر محفوظ کیا گیا۔؟ جہاں خیال تھا کہ "ہندو شہریوں کے مفادات موخر کیے جا سکتے ہیں جہاں تک علاقائی مفادات کا تعلق ہے کون سے موجودہ حدوں پر روک لگا سکے؟ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مسلم لیگ کے شیخ چلی، موجودہ پاکستان سے دو گنے علاقے کے پاکستان کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ خالصتان کے خیال کی ہمت افزائی کرنے والے پاکستانی شاید یہ

بوں کہ مجوزہ اکالی سکھ ملک میں بہت سارا علاقہ، بشمول لاہور، بھی شامل ہے جو اس وقت پاکستان میں ہے۔

سب سے اہم اور تشویش ناک سیاسی مسئلہ جو آنند پور صاحب ریزولیوشن نے اٹھایا وہ تھا مرکز میں تمام توں کی مساوی نمائندگی کے ساتھ حقیقی وفاقی اصولوں کو یقینی بنانے کے لیے آئین کی ازسرِ نو تشکیل کا مطالبہ ی تجویز بھی کہ ۱۹۴۶ء کے کیبنیٹ مشن کی تجاویز کی تجدید کی جائے یعنی صرف دفاع اور خارجہ، کرنسی اور ذرائع ترسیل و ملات کی ذمہ دار دہلی کی مرکزی حکومت ہو۔ جہاں تک مسز اندرا گاندھی کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ریزولیوشن یہنے میں کوئی جھجک نہیں تھی کہ "کانگریس پارٹی کی بنائی ہوئی خارجہ پالیسی ..... بالکل ناکارہ اور بے کار ہے اور ے و قوم بلکہ نوعِ انسانی کے مفادات کے لیے انتہائی نقصان دہ"۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ مسز گاندھی کی خارجہ یسی ابھی دو سال قبل، بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہر فرد و بشر کی توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہو چکی تھی، یہ قف بہت دل چسپ تھا۔ "شرومنی اکالی دل ہندوستان کی صرف اس خارجہ پالیسی کی حمایت کرے گا جو امن اور ری مفادات کے اصولوں پر مبنی ہوگی۔ یہ پڑوسی ملکوں کے ساتھ خصوصاً ان ملکوں کے ساتھ جن میں سکھ رہتے ہیں ان کے مقدس مقامات ہیں، امن کی پالیسی کی پر زور وکالت کرتا ہے۔" سیدھے سادے طور پر اگر یہ بات کہی جائے نوں کہی جائے گی کہ اکالی ایک ایسے وقت پر، جب کہ نوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کو واپس ہوئے ابھی بہت مت نہیں ہوئی تھی، ایک نرم اور کمزور سرحد کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کیا اکالیوں کی خارجہ پالیسی برصغیر میں امن کی ایک حقیقی خواہش تھی؟ یا یہ کہ پاکستان سے مفاہمت کی طرف ایک قدم جس کے بدلے میں خالصتان کے لیے ان کی دہلی سے لڑائی میں پاکستان کی مدد حاصل کرنے کی سبیل کی تمنا۔ بہر حال شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ غداری کے الزام کے خطرے کو مول لے کر ہندوستان کی دوست رہ چکی تھی اور یہ سب، بنگلہ دیش کے قیام میں ہندوستانی فوجوں کی مدد کی ضرورت پڑنے سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔

پہلے سے معلوم تھا کہ فوج میں سکھوں کی بھرتی کی بات اٹھے گی، چنانچہ وہ اٹھی۔ اکالیوں نے یہ بھی چاہا کہ کرپان، سکھ فوجیوں کے فوجی لباس کا ایک حصہ قرار دی جائے۔ انھوں نے سابق فوجیوں کو منظم کرنے کی بات کی (جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ خواہش بھی اتنی معصوم نہیں تھی جتنی کہ وہ بظاہر معلوم ہوتی تھی۔ انتہا پسندوں نے اپنے دستوں میں سابق فوجیوں کو استعمال کیا) اور ظاہر ہے کہ سکھوں کی عسکری روایات کے احترام اور اعزاز میں اکالیوں نے مطالبہ کیا کہ سوائے مستند مجرموں کے ہر شخص کو بغیر لائسنس صرف اندراج کی بنیاد پر ہر قسم کے چھوٹے ہتھیار جیسے ریوالور، بندوق، پستول، رائفل اور کاربائن وغیرہ رکھنے کی اجازت ہونا چاہیے۔ گرو گوبند سنگھ نے صرف کرپان پر اصرار کیا

تھا ۱۹۷۳ء کے سنتوں نے سکھوں کی "مدافعتی" صلاحیت کو جدید سطح تک اٹھانا چاہا اگر یہ دفاع کس سے ؟ اس مطالبہ کے لیے کوئی وجہ یا جواز پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کیا اکالیوں کو یہ تجربہ ہوا تھا کہ دہلی کی فوجوں نے بڑی تعداد میں سکھوں کو قتل کیا تھا جس کی بنا پر ان کو ان ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ یقیناً ایسا نہیں تھا، پھر آخر کیوں ؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پھر یہ اسی دن کے لیے خفیہ تیاری تھی جب مذہبی رہنما سکھ قوم سے بغاوت کرنے کے لیے کہیں گے ؟ مگر واقعات تسلسل میں دوسرے عناصر نے رخنہ ڈال دیا۔ مثلاً ۱۹۷۵ء اور ایمرجنسی۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے تین دن کے اندر اندر اکالی دل کی ایگزیکیٹو کمیٹی نے مسز اندرا گاندھی کی انھیں منانے و رام کرنے کی کوششوں کو مسترد کر دیا اور ایمرجنسی کو فاسسٹ، جمہوریت کی بے حرمتی اور ڈکٹیٹرشپ کی طرف ایک قدم قرار دیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔ ایک لحاظ سے صورت حال ویسی ہی تھی جیسی کہ [illegible] والی جس میں کانگریس اور اکالی اتحاد کے نتیجے میں تھی۔ اس دفعہ فرق یہ تھا کہ اب کانگریس کی جگہ جنتا پارٹی نے لے لی تھی جنتا پارٹی کو اس شمالی ہندوستان میں بے مثال اور شاید دوبارہ نہ ملنے والی زبردست حمایت ملی جہاں کانگریس ایک نشست بھی جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اکالی۔جنتا اتحاد نے پنجاب میں بھی کانگریس کو ختم کر دیا۔ اکالیوں کو ۱۹۷۷ کے اسمبلی کے انتخابات میں اتنے ووٹ ملے جتنے کہ انھیں پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ یعنی ۴۱ر۳۱ فی صدی اور ساٹھ ۵۸ نشستیں بھی جیتیں مگر اب بھی اکالی شہری سکھ ووٹوں میں کوئی بڑا رخنہ نہ ڈال پائے اور وہاں پست ہمت کانگریس ۷۰ر۳۳ فی صدی ووٹ حاصل کر کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی بنی رہی مگر کامیابی اسے صرف سترہ نشستوں پر ہی ملی۔ کمیونسٹوں نے تمام سیاسی تغیر و تبدل کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہمیشہ کی طرح دس فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ جنتا اور اکالی دل کی ملی جلی حکومت صرف پنجاب ہی میں نہیں دہلی میں بھی برسر اقتدار آئی۔ یونین گورنمنٹ میں اکالیوں کو دو سیٹیں ملیں اور پنجاب میں پرکاش سنگھ بادل ان کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ان لوگوں کو ملنے والی حمایت نوعیت کا اندازہ ان کے وزیروں سے ہوتا ہے۔ وہ چاہے چنڈی گڑھ ہو یا دہلی، ایک بھی اکالی وزیر شہری سکھ

جنتا پارٹی کے اہم لیڈروں میں جن لوگوں کا شمار ہوتا تھا وہ اگر کچھ تھے تو مسز اندرا گاندھی کے مقابلے میں کے مطالبات کے سلسلے میں کہیں سخت تھے۔ کانگریس کے تین میں سے جن دو وزیروں نے ۱۹۶۶ء میں پنجابی کے مطالبے کو ماننے کی مخالفت کی تھی وہ جنتا کی کابینہ میں تھے۔ اڑیسہ کے ممتاز لیڈر بیجو پٹنائک اب اسٹیل اینڈ کے وزیر تھے، اور مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہو چکے تھے مزید یہ کہ نئے وزیر داخلہ چودھری چرن سنگھ تھے جو تبدیلی کرانے والی جماعت آریہ سماج کے حامی ایک ہندو جاٹ تھے۔ چرن سنگھ سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ ایک سیاسی ا

تو سکتے تھے مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے قبول بھی کریں کیوں کہ ان کے پیش نظر یہ دونوں ہندوازم کے غدار تھے۔
سنگھ کی حمایت کا اصلی ذریعہ ہریانہ کے ہندو جاٹ اور اتر پردیش کے پس ماندہ طبقات " تھے اور اگرچہ
طرف ان کی سیاست عام طور پر اعتدال پسند تھی تو دوسری طرف ان کے ذاتی تعصبات ایسے نہیں تھے۔ کیبنیٹ میں
لیوں کی موجودگی کو برداشت کر لینے کے رویے کی توسیع چنڈی گڑھ کو ان کے حوالے کر دینے تک نہیں ہوئی۔

اب جب کہ اکالی خود حکومت میں تھے، طاقت ان کے ہاتھ میں تھی، اکالیوں کو خود اپنے خلاف تحریک شروع
ر، دشوار نظر آیا مگر وہ اکالیوں کی ایک آل انڈیا کانفرنس میں آنند پور صاحب ریزولیوشن کی توثیق کے عمل سے
ور گزر گئے۔ ۲۸ اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۸ء لدھیانہ میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر گرچرن سنگھ
توہرا اور وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے بارہ تجاویز پیش کیں جن میں اکالی مطالبات درج تھے۔ ساتھ ہی ساتھ
انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ آج کے حالات کا تقاضا اور اس وقت کی ضرورت اعتدال پسندی ہے یہاں تک کہ
اکالی صدر جگدیو سنگھ تلونڈی نے بھی، جنھیں بعد کو سب سے الگ ہونا تھا اور بعد ازاں ایک نسبتاً کٹر اکالی دل قائم
کرنا تھا اس جنگ جو گروہ کو متنبہ کیا جس نے دلی کے خلاف اگلی جنگ شروع کرنے کی ترغیب شروع کر دی تھی۔

اکالیوں کے ایک حلقے نے جو غالباً اس سلسلے میں پریشان تھا کہ یہ جنگ جو گروہ انھیں نہ جانے کہاں پہنچائے
نہایت خاموشی کے ساتھ مذہبی لیڈروں کی گرفت کو ڈھیلا کرنے اور اکالی دل کو نہ صرف سکھوں کی پارٹی رکھ کر دی ا
ی طرح صحیح معنوں میں ایک علاقائی پارٹی میں تبدیل کرنے کی کوشش شروع کی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ صرف یہی طریقہ
ہے جس کی مدد سے پنجاب میں اکالی، کانگریس کا قدرتی متبادل بن سکتے ہیں کیونکہ اکالی ووٹ، جیسا کہ ہر ایک جانتا تھا ا
نی تعداد میں نہیں تھا کہ وہ تنہا اکالیوں کی فتح کا ضامن بن سکے۔ ان سیاست دانوں نے جنتا کے ساتھ اس اتحاد کو
ی ان قومی پارٹیوں سے جو اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ کسی طرح ہندوستان کی سیاسی قوس قزح میں اپنی جگہ
ناسبین رابطے کا ایک وسیلہ بنا رہی تھیں۔ جنگ جو گروہ نے یہ بھانپ لیا کہ کیا ہو رہا ہے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا
پارٹی کے بنیادی کردار میں ذرا سی بھی ملاوٹ خود مختاری کے مقصد کو فوت کر دے گی۔ انھیں اعتدال پسندو
صف میں لانے کے لیے زبردستی کرنا پڑی۔ انتہا پسندوں نے دل خالصہ، اپنا پہلا پریشر گروپ قائم کیا ۱۹۷۸
چنڈی گڑھ میں، دل خالصہ کے تقریباً نصف درجن کارکنوں نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے
کے سامنے اس وقت مظاہرہ کیا جب وہاں اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی اور لیڈروں کو چو
پیش کیں (چوڑیاں نسوانیت کی نشانی ہیں، مردانگی اور اپنی عسکریت پسندی... خالصہ دماغ میں اس سے ز

کوئی بات قابلِ نفرت نہیں ہے کہ مرد عورتوں کی طرح برتاؤ کرے۔ عورت اور کمزوری کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔) خالصہ نے اس حقیقت کو راز میں نہیں رکھا کہ وہ خالصتان چاہتے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۹ میں دل خالصہ نے ایس جی پی سی کے انتخابات میں اکالیوں کا مقابلہ کیا۔ خود اپنے پندرہ امیدوار کھڑے کیے مگر بعض بڑے غیر معمولی حلقوں سے جن کا جا بعد میں لیں گے، امداد ملنے کے باوجود وہ بری طرح ہارے۔ جولائی ۱۹۷۹ میں جب دہلی میں جنتا حکومت نے خود اس کے بعد پنجاب کی سیاست نے ایک بڑی کروٹ لی۔ چرن سنگھ نے پارلیمنٹ کے ممبروں کا ایک حصہ ناقابل عارضی حکومت بنانے کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اکالی لیڈروں میں اس مسئلہ پر کہ جنتا کے کس بازو کی حمایت کی اختلافِ رائے پیدا ہو گیا۔ تلونڈی اپنا ایک اکالی دل بنانے کے لیے الگ ہو گئے، قومی دھارے سے دور رہنے والے تمام اکالی لیڈروں کی طرح انھوں نے بھی حمایت حاصل کرنے کے لیے غلط طریقہ اپنایا تھا یعنی زیادہ جنگجویانہ اور حسبِ معمول یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوا۔ تلونڈی سکھوں کے لیے آزادی اور خود مختاری کے مطالبے کی حد تک گئے مگر انھوں نے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے سے ایک بہت کم سن، زیادہ واضح، سادہ لوح اور ہر ایک کے مقابلے میں زیادہ بے رحم اور سنگ دل، جنگجو کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا شروع اس شخص کا نام جو عنقریب، ہندوؤں اور سکھ غداروں کو قتل کرانے کے لیے قاتلوں کے گروہ بھیجے گا فضا میں لگا۔ شروع شروع میں بے اعتنائی کے ساتھ، پھر مذاق میں اس کے بعد غصے کے ساتھ۔ بعد ازاں ہیبت اور خوف و ہراس کے ساتھ۔ اور یہ نام تھا جرنیل سنگھ بھنڈران والا۔

⑪

جرنیل سنگھ بھنڈراں والا

"میں خود حکومت نہیں کرنا چاہتا، میں تو چاہتا ہوں کہ سکھ حکومت کریں۔ دہلی پر حکومت کریں، دنیا پر حکومت کریں۔ راج کرے گا خالصہ، باقی رہے نہ کوئے...... اگلے دس برسوں میں سکھوں کو ان کی آزادی مل جائے گی۔ یہ یقیناً ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ میں ایک نیا ملک دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا یا نہیں..... میں نے کسی نئے ملک کی ابتدا نہیں کی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کے خلاف ہوں۔ میں نہ تو خالصتان کے حق میں ہوں نہ اس کا مخالف۔ ہم ہندوستان میں مساوی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔ اب یہ دہلی پر ہے کہ وہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم خالصتان لیں یا نہ لیں۔ وہ ہم کو باعزت طور پر رہنے دے گی یا نہیں۔۔ ..... بہرحال پاکستان بھی آخر وجود میں آیا تھا۔"

لوگ جو دوسرے لوگوں کی موت کے احکامات سناتے ہیں ضروری نہیں کہ انھیں احساس جرم ہو یا ان کی آنکھوں میں کوئی سوال ہو۔ بہت سے لوگ فخر کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ جج، جنرل یا انقلابی، یا پھر خود ساختہ پیغمبر۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کی آنکھوں میں ہنسی بھی ظاہر ہے کہ انھیں اس خیال کا سرور تھا کہ ایک اور صحافی اظہار عقیدت کے لیے اور ان کی اہمیت و عظمت کا پرچار کرنے کے لیے آیا ہے، اس کے حامی اس کے چرنوں میں بیٹھے تھے اور ایک استعار نور سے ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ ساری دنیا ان کے قائد کے پاس آ رہی تھی۔ میری پشت پر، ہمارے ایک صحافی سے زیادہ دل چسپ اور بدیسی چیز تھی۔ فلم بنانے والا ایک بڑا یورپین گروپ اس نوجوان سکھ لیڈر سے انٹرویو کا منتظر تھا۔ یہ ایک مسحور کن منظر تھا، ہم لوگ گولڈن ٹیمپل کے اطراف میں بنی ہوئی ان عمارتوں میں سے ایک کی چھت پر تھے جنھوں نے وہاں پر تقریباً ایک بستی سی بسا دی ہے اور جو ہندوستان کے آئینی دفاع اور دسترس سے اس وقت تک باہر تھی جب تک کہ ہندوستانی فوج وہاں داخل نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اس کے اندر

کسی پولیس والے کو یا سیکورٹی فورس کے کسی آدمی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ ان عمارتوں میں صرف سکھوں کے
ترین مذہبی پیشوا ہی نہیں رہتے تھے بلکہ ان میں بہت سے معروف مجرموں نے بھی مذہب کی آڑ میں پناہ لے رکھی
ہتھیار مذہبی مختار کل اکال تخت کی اجازت سے یا اس کے بغیر ہی تہ خانوں میں جمع تھے۔ ہم لوگ فروری کی
کی ایک سہ پہر موسم سرما کے سورج کی خوش گوار گرمی میں سری گرو رام داس صاحب کے لنگر میں بھنڈران والا
بیٹھے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی کے اکثر گھنٹے سنت عام طور پر یہیں گزارا کرتے تھے۔ عمارت کے سامنے ا
اجڑے لان میں، ہندوستانی فوج کی ایک بیکار رفیلڈ گن رکھی ہوئی تھی اور لان پر متعدد دہنگ ـــــ
ـــــ پڑے ہوئے تھے وہاں تین بدمعاش آدمیوں کی ایک تصویر بھی تھی جس میں وہ ہ
اور پسے ہوئے سکھوں کو اذیت دے رہے تھے ان آدمیوں میں پہلا ایک شمشیر بکف مسلمان تھا، اس کے
۱۵۲۶ء (یہ سن پانی پت میں بابر کی فتح کا سنہ ہے) سے ۱۸۴۹ء (جب سکھ سلطنت ختم ہوئی) لکھا ہ
دوسرا بدمعاش بندوق لیے ہوئے ایک انگریز تھا۔ سنہ تھا ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء۔ تیسرا لاٹھی تانے ہو
ہندو تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ۱۹۴۷ء ـــــ تھوڑی خالی جگہ دوسری جگہ تاریخ لکھنے کے لیے
گئی تھی (فوجی کارروائی کے بعد اگر تصویر بچی ہوگی تو خالی جگہ کو غالباً پُر کر دیا گیا ہوگا)

جس چھت پر بھنڈران والا بیٹھے تھے اس کے چاروں کونوں اور متعدد خاص خاص جگہوں پر بندوق
ہوئے اور جدید ترین نیم خود کار ہتھیاروں سے لیس محافظ تھے۔ یہ انتہا پسند وقتاً فوقتاً گولڈن ٹیمپل سے با
سڑکوں پر ہندوستانی پولیس والوں سے گولیوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ریت کی بوریاں محاصرے کی کیف
مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ بھنڈران والا خود خول میں رکھے ہوئے ایک ریوالور سے لیس تھے اور پیٹی پر
کارتوس تھے۔ ان کے چاروں طرف ضعیف مرد اور عورتیں تھیں جو یا تو آہستہ آہستہ ان سے کچھ نصیحتیں
لیتیں یا پھر ان کو تحیر، استعجاب اور احترام کے ملے جلے جذبات سے دیکھے جا رہی تھیں، یہ سب کے سب
ان بوڑھوں میں سے کچھ تو وہ تھے جن کے بے صبر بیٹوں نے جائداد پر قبضے کے لیے ان کے مرنے کا انتظار نہ ک
وجہ سے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ لوگ اب گردوارے کے ساکن ہو گئے تھے۔ بھنڈران والا کو ان
بات چیت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ بغیر وقفے کے مسلسل بولتے تھے، بولنے میں ان کا منہ مستقل
رہتا تھا ـــــ۔ ان کے پاس ہر سوال کا فوری جواب موجود
دشواری کا فوری حل موجود تھا، یہ مسئلہ چاہے گھر کی خوشی کا ہو یا مذہبی فلسفے کا۔ گفتگو کا ایک سلسلہ تھا جو کبھی

ے نوٹ شا تھا جو ان کی بذلہ سنجی یا ظریف الطبعی پر لگتے تھے۔ ان قہقہوں کا اشارہ وہ خود قہقہہ لگا کر دے دیتے تھے۔
پہرے پر عیاری بھی اور ان کے ہاتھ ہمیشہ ان کے لباس کے اندر چھپے رہتے تھے، سوائے اس وقت جب
یے میوں کا کوئی تحفہ لینے اور اسے جیب میں رکھنے کے لیے انتہائی تیزی سے انھیں باہر نکال لیتے تھے۔ یہ رقم
یخ یا دس روپیے کے نوٹ کی شکل میں ہوتی تھی، جو کوئی نو وارد معتقد نذر کرتا تھا۔ اور یہ ڈراما دنیا کی ایک انتہائی
غریب اسکائی لائن کے مقابل کھیلا جا رہا تھا۔ امرت سر شہر کی عمارتیں عام طور پر دو منزلہ ہیں اور حقیقتاً ایک
پر سوار ہیں۔ چھتوں پر، آنکھ کی سطح پر، لاتعداد ٹیلی ویژن کے انٹناؤں کا تاحد نظر ہجوم ہے۔ نیلے آسمان کے
لیب نظارہ تھا۔ مگر یہ بھی پنجاب کی خوش حالی کی ایک بصری تصدیق ہے۔ یہ شہر ایک نئے سکون و اطمینان کا، نئی تعلیم
ب کی بڑھتی ہوئی فروخت کا شہر تھا۔ یہ خوش حالی ٹیلی ویژن اور تفریح کی نئی قسموں کے ساتھ ساتھ نئے خیالات و نظریات
ہا تھی۔ پاک خالصہ، مسلم شمشیر اور ہندو ساہوکار سے بچ نکلا تھا۔ کیا اب وہ پنجابی ٹیلی ویژن پروگراموں سے بھی
کو محفوظ رکھ سکے گا؟ یہ بات اتنے مذاق کی نہیں ہے جتنی یہ سننے میں معلوم ہوتی ہے۔ سنت بھنڈرانوالا
لسلے میں کوئی شک و شبہہ نہیں تھا کہ وہ اپنی مذہبی ریاست میں اپنے اُس سکھ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے جس
کی بنا پر یا جدید علم سے پیدا ہوئے یقین کی بنا پر اپنی کرپان الماری میں رکھ دی تھی اپنے بالوں کو حجام کی دکان پر
تھا۔ انھوں نے مصنف سے کہا تھا کہ "ایک سکھ کو حقیقی معنوں میں سکھ ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک سب سے
رت پر چارسے ہے۔ اگر کوئی سچا سکھ شراب پیتا ہے تو اسے زندہ جلا دینا چاہیے۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈراں
ح صاحب سے زیادہ ایمان دار ہو رہے تھے۔ کیوں کہ جناح صاحب نے مسلمانوں کو اس بات سے کبھی آگاہ
ایک مذہبی ریاست میں عورت بدکاری کے شبہے میں سنگ سار کر کے ماری جائے گی جیسا کہ ۱۹۸۳ء اور
میں پاکستان میں ہوا۔ انھوں نے لوگوں کو اس سے بھی متنبہ نہیں کیا تھا کہ شراب پینے والے کو سرِ عام کوڑے
ائیں گے۔ بھنڈراں والا کو انصاف کے اپنے اصولوں کے اطلاق کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی شک یا کوئی
نہیں تھا۔ "وہ، جو برائی کرتے ہیں، انھیں انصاف کے دروازے تک لایا جانا چاہیے اور برائی وہ نہیں
فرد سوچتا ہے۔ برائی وہ ہے جو گرو گرنتھ صاحب میں لکھی ہوئی ہے۔" اور ظاہر ہے کہ اس کے واحد ترجمان
ران والا۔

سکھ کو کیا ہونا چاہیے اس سلسلے میں بھی بھنڈراں والا اپنے ذہن میں بالکل واضح تھے۔ سکھ خالص (پاک) تھا
کا سب سے بڑا اثاثہ تھا اور اسے بہرحال ہر قیمت پر محفوظ رکھنا تھا۔ ایک سکھ، مسلمان یا ہندو سے کس طرح

زیادہ پاک تھا؟ سیدھی سی بات ہے۔ بنی نوع انسان میں سکھ وہ واحد لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ہیئت کو ا
ہی برقرار رکھا جیسا کہ خالق نے انھیں تخلیق کیا تھا۔ ہندو اپنے بال کاٹتے ہیں اور اس طرح وہ ایک ایسی چیز ک
ہیں جسے خدا نے چاہا تھا کہ اسے اس کی فطری نشو و نما نصیب ہو۔ مسلمان نے ختنہ کرا کے ایک چیز کو کھو
دیا اس لیے سکھ ہی واحد ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہر چیز کو بالکل اسی طرح چھوڑ دیا جس طرح قدرت چاہتی تھ
موقع پر کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ اس دل چسپ نظریئے کے مطابق گوبند سنگھ سے پہلے کے ۹ گرو پاک نہیں ت
ہے کہ انھوں نے کسی وقت اپنے بال کاٹے تھے۔ یہ صرف گرو گوبند تھے جنھوں نے، گرو نانک کے
بعد اس "پاک" خالصہ شناخت کی تخلیق کی۔ بہر حال گولیوں کی آوازیں اور بھنڈران والا کے نظریات
خود رادران کے وجود کی حفاظت کرنے والے مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں میں نیم خود کار بندوقیں دیکھ
اور تبادلۂ خیال کی ہر خواہش پر پانی پڑ گیا۔

اس بات کو سمجھنے میں بہت وقت نہیں لگا کہ بھنڈران والا کی دانش ورانہ صلاحیتیں محدود تھیں، ج
سادہ لوح نہیں لگتے تھے تو مضحک معلوم ہوتے تھے۔ بھنڈران والا کے مطابق ہندو اور مسلمان مسخ شدہ سکھ
انفرادی آدمی سکھ پیدا ہوا تھا، بعد کو وہ بال کٹا کر ہندو ہو سکتا تھا یا ختنہ کرا کے مسلمان۔ بھنڈران والا کے پاس
کی تاریخ کی اپنی ایک مخصوص شکل تھی۔ ان کے مطابق "تین سو کروڑ دیوتا، نو سے ملین دیویاں، ایک
ہزار پیغمبر، چونسٹھ جوگنیں اور دس گرو، یہ سب لمبے بال رکھتے تھے۔" دوسرے الفاظ میں وہ سب کے
سچے سکھ تھے۔ بہر حال وہ بیسویں صدی کے دوسرے مذاہب کے ساتھ بقائے باہم پر راضی تھے مگر
کے ساتھ، اور وہ یہ کہ ہر ایک کو تمباکو نوشی چھوڑنا ہوگی (سکھ روایت میں تمباکو ممنوع ہے) "میرا کام" انھ
نے کہا "گرو بانی پڑھنے کا ہے، پاکیزگی کی تبلیغ کا ہے اور لوگوں کو منشیات سے بچانے کا ہے۔ گرمیں بہر حال یہ
کہ ایک ہندو کو سچا ہندو ہونا چاہیے ایک سچے ہندو کی خصوصیات کیا ہیں؟ چوٹی، ٹوپی، دھوتی، بارہ تلک (
کے نشان) پیشانی پر، ناک، ٹھوڑی، سینے، بغلیں، گال، گردن اور سر کے اوپر۔ ہندو کو نو دھاگے پہننے چا
اسے شیو لنگ کا پجاری ہونا چاہیے اور ہندو کو بھی تمباکو نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ ہندو ہمارا بھائی ہے۔ مسلما
سچا مسلمان ہونا چاہیے اسے یہ ماننا چاہیے کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ (متاثر
لیے قرآن کی آیتیں پڑھنے کی کوشش میں بھنڈران والا نے عربی کے بجائے کچھ عجب سے الفاظ ادا کیے، یہاں تک
کو ایسا لگا کہ یہ کسی مزاحیہ ڈرامے کا کوئی حصہ تھا) اگر مسلمان قرآن کی آیتیں پڑھتا ہے، دن میں پانچ بار

ہے، مجھ کو جانتا ہے، جتبا کو استعمال نہیں کرتا ہے تو میرا دوست ہے۔"

پینتیس سال کی عمر کا یہ آدمی، جب یہ گفتگو ہو رہی تھی پنجاب کی علیحدگی پسند تحریک کا آیت اللہ خمینی بھی تھا اور بھی..... وہ روڈ کے ایک جاٹ خاندان میں پیدا ہوا روڈ ایک اچھا خاصا بڑا گاؤں ہے جہاں کی آبادی تقریباً ہے۔ جرنیل سنگھ، جوگندر سنگھ کے (دو بیویوں سے) سات بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ایک بھائی فوج ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ باقی لڑکے باپ کی چھوڑی ہوئی چالیس ایکڑ زمین پر کام کرتے تھے۔ گھر کے ہی ایک گوردوارہ تھا۔ جرنیل سنگھ کو بڑی کم عمری ہی سے مذہب سے دلچسپی تھی۔ چھٹی جماعت کے بعد بابا دیپ کے شروع کیے ہوئے دمدمہ صاحب ٹکسال میں مذہبی مسلک کی خدمت کرنے کے لیے چلا گیا۔ اس مسلک کے میں سنت بھنڈران والا گاؤں کے سندر سنگھ تھے۔ جرنیل سنگھ کے نام کے ساتھ بھنڈران والا اسی تعلق سے گیا ہے۔ اس سلسلے کے چودھویں سنت کرتار سنگھ تھے جنھوں نے اپنے شاگردوں کے ذہن میں ایک خود مختار کے نظریہ کو بڑے مستحکم طور پر بٹھایا تھا۔ کرتار سنگھ کے بیٹے بھائی امریک سنگھ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن صدر ہو گئے۔ یہ فیڈریشن علیحدگی پسند سرگرمیوں کی بنیاد پر ۱۹۸۴ء میں غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ بھائی امریک حقیقت تو یہ ہے کہ توقع کر رہے تھے کہ اپنے باپ کی موت کے بعد انھیں اس سلسلے کا سنت نامزد کر دیا جائے یہ اہم حیثیت بیٹے کے بجائے ایک چہیتے شاگرد کو ملنی تھی۔ ۳۰ اگست ۱۹۷۷ء کو سنت کرتار سنگھ ایک حادثے کا شکار ہوئے اور ان کے سر میں بہت چوٹ آئی ضروری آپریشن کے لیے سر کے بالوں کو کاٹنے کی ضرورت پڑی سنت کرتار سنگھ نے ڈاکٹروں کو اس کی اجازت نہیں دی اور اپنی خالصہ پاکیزگی کی حرمت کو موت پر ترجیح دی لدھیانہ کے براؤن اسپتال میں ۱۶ اگست ۱۹۷۷ کو جان دے دی۔ ان کا جانشین جو نامزد ہوا اس کا نام تھا جرنیل اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال سے کم تھی۔ سنت جرنیل سنگھ نے امرت سر سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور چوک کے مقام پر گوردوارہ گرو درشن پرکاش میں قائم اس سلسلے کے ہیڈکوارٹرز کو اپنی نگرانی میں لیا۔

اسی سال جولائی کے مہینے میں، بیرونی ملکوں میں خالصتان کی تحریک شروع کرنے والے ڈاکٹر جگجیت سنگھ، ہندوستان واپس آئے۔ کسی نے بھی ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اکتوبر میں چوہان نے ہرسمرن سنگھ نام ایک شخص کی سربراہی میں دل خالصہ کی تنظیم میں مدد کی۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ یہ ہرسمرن کون تھا۔ سارا خیال ابھی ایک 'پاگل پن' سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ دل خالصہ نے ایک دو نکاتی پروگرام اعلان کیا۔ ایک تو خالصتان کا قیام اور دوسرے سکھوں میں اپنے مذہب کا زیادہ شعور پیدا کرنا (دی پرانا ورڈر)۔

۱۹۷۹ء میں دل خالصہ نے بھنڈراں والا کی مدد سے ایس جی پی سی کے مذہبی انتخابات میں اکالیوں کے خلاف کیا۔ بھائی امریک سنگھ بیاس کے حلقہ انتخاب سے کھڑے ہوئے اور اکالی امیدوار جیون سنگھ امرانگل سے شکست کھائی۔ کانگریس نے انتخابات میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا مگر پنجاب میں اس کے لیڈر گیانی نے اکالیوں کو سبک کرنے کے لیے مالی امداد کے ذریعے انتہاپسندوں کو بڑھاوا دیا جو خود بھی اکالیوں سے درحقیقت ابتدائی دنوں میں، یہ مسز اندرا گاندھی کی کانگریس تھی جس نے بھنڈراں والا کو سرفراز کیا اس کا خمیازہ لیڈر اور ملک دونوں کو اٹھانا پڑا۔

۱۲ نومبر ۱۹۷۹ء کو جگجیت سنگھ چوہان نے گولڈن ٹمپل میں ایک چھوٹا ٹرانزسٹر نصب کیا ۲۰ سے اس پر گرو گرنتھ صاحب کا جاپ شروع کیا گیا۔ یہ رعایت بالآخر مذہبی گیتوں کی نشریات کے لیے ریڈیو اسٹیشن کے مطالبے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ایک بار پھر، یہ ایک دو دھاری تلوار ثابت ہوا۔ ایک د اسٹیشن قائم ہو جائے تو پھر ایسے ریڈیو کے ذریعے سے آزادی و خود مختاری کے مطالبے کو کون روک سکتا یقینی ہے کہ گوردوارے کے سنتوں اور مہنتوں کو محض مزید شور و شغب کے لیے ریڈیو اسٹیشن کی ضرورت کیونکہ آواز کو دور دور تک پہنچانے کے لیے وہاں یوں ہی بہت کافی لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ مارچ میں چوہان نے آنند پور کے تاریخی شہر میں بنے ہوئے گوردوارہ کیسر گڑھ صاحب میں خالصتان کا جھنڈا وقت تک انھیں ایک اور خالصتانی مل گیا تھا، بلبیر سنگھ سندھو۔ ایک ناکام اسکول ماسٹر اور ایک ناکام صحا طور پر پریشان، اس شخص کا چوہان سے تعارف جالندھر کے ایک کافی ہاؤس میں کرایا گیا اور اس نے خالصتا میں شرکت کر لی۔ حکام کی توجہ پہلی دفعہ اس پر اس وقت ہوئی جب اس نے گولڈن ٹمپل کے ریڈیو سے ایک کیا۔ چوہان نے سندھو کو خالصتان نیشنل کونسل کا سکریٹری جنرل مقرر کیا۔ ۱۲ اپریل کو ایک گیارہ نفری کونسل ا دوسرے ہی روز سندھو نے خالصتان کے نام کے ڈاک ٹکٹ اور پاسپورٹ جاری کیے۔ ابھی تک یہ سب قومی سطح پر اس کہانی کو مشتہر کرنے والی 'رسالہ' سنڈے' کی نامہ نگار مدھو جین تھیں جن کے پاس آج بھی خا وہ پاسپورٹ یادگار کے طور پر موجود ہے۔ جو سندھو نے ان کے نام پر جاری کیا تھا۔ (پاسپورٹ کی ا میں ہوئی ہے اور یہ دیکھنے میں بڑا دیدہ زیب ہے)

۸ جون ۱۹۸۰ء کو سندھو نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ جون کی ۱۶ تاریخ تک، اکال تخت ا سے خالصتان کی حکومت کا اعلان ہو جائے گا اور چوہان (جو موقع کو غنیمت جان کر اس وقت تک ملک چ

ے باہر جاکر حکومت کی کابینہ کا اعلان کریں گے۔ سندھو نے تمام آزادی پسند ملکوں سے خالصتان کی حکومت کو
نے کی اپیل کی اور ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت کو خالصتان کے خلاف قوت کے استعمال سے پرہیز کرنے کا
یا نہیں تو دوسری صورت میں نیا ملک دونوں بڑی طاقتوں سے امداد کا خواستگار ہوگا۔ ۱۶ جون کو ڈاکٹر چوہان نے
یہ میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو خالصتان کا صدر بنایا۔ انھوں نے صحافیوں کو بتایا کہ وہ جلدی ہی لندن اور
دوسرے یورپی ملکوں میں قونصل خانے کھول دیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ امریکہ میں ایک جلاوطن حکومت
رنے کے امکانات کے بارے میں واشنگٹن سے بات چیت کر رہے تھے اور دس ہزار فوج کو تربیت دینے
یے امریکہ سے درخواست کی تھی۔ ہندوستان میں ۱۵ اگست کو آزادی کے دن خالصتانیوں نے ایک جلوس نکالا
۱۹۸۱ میں چوہان نے دعویٰ کیا کہ خالصتان کے مطالبے کو اکالی تخت اور ایس جی سی پی اور اسی لیے اکالی دل کی
ش حمایت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ دعویٰ صحیح لگا جب ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو ایس جی سی پی کے صدر گردچرن توہرا
نیویارک میں ایک جلسے کی صدارت کی جس میں ایک یہ ریزولیوشن منظور کیا گیا کہ سکھ ایک الگ قوم ہیں اور یہ کہ فلسطین
ادی تنظیم کے نمونے پر، اقوام متحدہ کے ساتھ ایسوسی ایٹ حیثیت حاصل کرنے سے متعلق اقدامات کیے جانے
ہیئں۔ مگر صحافیوں سے الگ الگ ملاقاتوں میں توہرا نے اپنے آپ کو خالصتان کے نظریئے سے بے تعلق بتایا
ر تمام تحریر تو اکالی دل، نہ ہی ایس جی پی سی اور نہ ہی اکال تخت نے باقاعدہ طور پر علیحدگی کی حمایت کی ہے۔
سری طرف دوسری سیاسی تنظیموں نے بشمول آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اس نظریئے کی حمایت کردی۔
فیڈریشن کا دعویٰ ہے کہ وہ اکالی دل کا طالب علموں کا بازو ہے۔ جون ۱۹۷۸ میں یوتھ اکالی دل، سکھ ینگ ایسوسی ایشن
سکھ نوجوان سبھا اور نوجوان اکالی دل وغیرہ جیسے گروپوں کو ملا کر دل خالصہ قائم کیا گیا۔ ۱۳ جون ۱۹۸۱ء کو چیف خالصہ دیوان
کے زیر اہتمام ۵۴ ویں سکھ ایجوکیشن کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ایک باقاعدہ تجویز پیش ہوئی اور جس کا پرجوش خیر مقدم
ہوا اور اسے منظور کیا گیا۔ اس کانفرنس کی صدارت ایک دوسرے امریکی شہری گنگا سنگھ ڈھلوں نے کی۔ اسی کانفرنس
میں خالصتان کے لیے اقوام متحدہ کی رکنیت کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ (اس مطالبے پر منتظمین کانفرنس تھوڑی الجھن میں بھی پھنسے)
خالصتان کے مطالبے کی طرف دل خالصہ نے قومی توجہ اس وقت مبذول کرائی جب انھوں نے ۱۰۷ مسافروں
کے ساتھ انڈین ایئر لائنز کے ایک جہاز بوئنگ ۷۳۷ کا جو دہلی سے سری نگر جا رہا تھا اغوا کیا اور اسے پاکستان لے گئے۔
اغوا کرنے والے لاہور میں گرفتار ہوئے، مسافروں کو چھوڑ دیا گیا مگر اس کارروائی کے مقصد کی بہرحال تبلیغ ہوگئی۔ جوابی
کارروائی کے طور پر پنجاب پولیس نے چنڈی گڑھ میں دل خالصہ کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ کچھ علیحدگی پسندوں نے گرفتاری

سے بچنے کے لیے بھاگ کر گولڈن ٹمپل میں پناہ لی۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالا اس سے پہلے ہی گورو نانک نواس کے کمرہ نمبر ۲۵ میں قیام پذیر تھا۔
سکھ مذہبی قائدین پولیس کو گولڈن ٹمپل میں داخلہ کی اجازت نہیں دے سکتے کیونکہ یہ جگہ انتہائی مقدس ہے کہ جسے
ضبط قائم کرنے والوں کے ناپاک جوتوں سے بے حرمت نہیں کیا جا سکتا۔ اکالیوں کی نظر میں گولڈن ٹمپل کی
پر اس وقت کوئی آنچ نہیں آئی جب قاتل اور مفرور مجرم وہاں پناہ لے رہے تھے۔

۱۹۸۱ء کی آخری چوتھائی میں، جب پنجاب کو غیر سکھوں سے خالی کرانے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا، انتہا پسندوں نے اپنی پر تشدد توجہ کو عام شہریوں کی طرف مبذول کر دیا۔ اس وقت تک وہ پولیس کے محکمے میں داخل ہو چکے تھے اور دوست پولیس والے منصوبہ بند قتل و غارت گری کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ۲۰ ستمبر میں، دوسرے دن ترن تارن میں اور ۱۶ نومبر کو کپور تھلا کے مقام پر چار آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ وزارت داخلہ کی ایک خفیہ دستاویز کے مطابق "اس سنسنی خیز جرم سے مجرموں کی شناخت کے اشارے بھی ملے"۔۔۔۔۔ یہ تھا کہ گولیوں پر "REM-UMC-38" لکھا ہوا تھا۔ یہ گولہ بارود ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا جہاں کہ ریوالور، صرف پولیس یا ہوائی فوج والے استعمال کرتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس گولہ بارود کو ہوائی فوج نے کبھی بھی درآمد نہیں کیا اس لیے پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ سارا سامان چوری چھپے لایا گیا ہے۔ چنانچہ ہتھیار اور گولہ بارود کے اسمگلروں سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ بالآخر نومبر ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں ایک بیان میں مجرموں کی شناخت ہوئی۔۔۔۔۔ بدقسمتی سے انکشاف یہ ہوا کہ مجرموں کی مدد میں فرید کوٹ کے سیوا سنگھ، گرنام سنگھ اور ... سنگھ تین پولیس کانسٹیبل ملوث تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل گرنام سنگھ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھائی ... سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالا کا قریبی ساتھی۔

جال پھیل رہا تھا اور جس لیڈر کی حیثیت مستحکم ہوتی جا رہی تھی وہ تھا جرنیل سنگھ بھنڈرانوالا۔ ہاتھ میں ... اور زبان پر وعظ کے ساتھ ہی سنت نے مذہبی احتساب کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ ان کے پہلے ہدف نہ تو ہندو تھے اور نہ حکومت ہند، ان کے بجائے "گمراہ اور غدار" سکھ تھے۔ سر فہرست (پاک کے مقابلے میں) ناپاک نرنکاری تھے۔

۱۹ویں صدی کے وسط میں دیال داس نے اس بات کی تبلیغ کی کہ خدا کی کوئی شکل نہیں ہے اور اسی لیے اس کا نہ تو کوئی بت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شبیہ۔ انھوں نے مزید کہا کہ سنتوں اور دیوں کا ادب و احترام بھی اتنا بے معنی ہے۔ دیال داس پشاور کے ایک تجارت پیشہ ہندو خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے آپ کو حقیقی گرو کہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ اور ان کا نرنکاریوں کا فرقہ ہندو اور سکھ کے درمیانی سلسلوں میں سب

۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ۳۸۹۰۷ افراد نے کہا کہ وہ ہندو نرنکاری ہیں اور ۱۱۸۱۷ افراد نے اپنے کو سکھ لکھوایا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ان نرنکاریوں نے ہندو اور سکھ دونوں مذاہب کے قائدین کو ناراض کیا۔ دیال کا احترام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ بابا ان مصلحین میں سے ایک تھے جنھوں نے سکھ ازم کو ل سے بچانے میں مدد کی۔ اگرچہ بابا دیال نے دس گروؤں کے مقابلے میں گرو گرنتھ صاحب پر زیادہ زور دیا۔ سماچار" کے ایڈیٹر بھائی ہری سنگھ شیر گل کے لکھے ہوئے اور ایس جی پی سی کے شائع کیے ہوئے ایک کتابچے یکس آف دی سکھ - نرنکاری نسل" کے مطابق "بابا دیال نے برہمن رسوم و رواج کی مذمت کی اور انھیں لیا . . . (ان کی) تحریک کا مقصد سکھ عقائد کو اس کی اصلی اور قدیم شکل پر بحال کرنا تھا" اکالی ناراضگی کا ب گمراہ فرقے کی طرف تھا جس کی شروعات تقسیم ملک سے ذرا قبل، نرنکار دربار کے ایک ملازم بوٹا سنگھ نے ۔ جو خود کتابچے کے مطابق "شراب اور اس سے متعلق دوسرے سماجی عیوب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ متعلقہ سماجی ب بھی بتائے گئے ہیں۔ "وہ گوشت خور ہونے کے ساتھ ساتھ شراب کے عادی اور آزادانہ جنسی تعلقات رکھنے ے تھے۔" کتابچہ مبینہ آزادانہ جنسی تعلقات کی کچھ مثالیں بھی پیش کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ بوٹا سنگھ آتشک رض میں مبتلا ہو کر مری کے مقام پر، جو اب پاکستان میں ہے، ۱۹۴۳ء میں مر گئے۔ ان کے جانشین اوتار سنگھ ی بیان کیا گیا ہے کہ انھی متعلقہ سماجی عیوب بشمول آزادانہ جنسی تعلقات میں خصوصی درک حاصل کیا تھا۔ ان دونوں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو آدم، نوح، رام، موسیٰ، جان دی بیپٹسٹ، عیسیٰ، پال، محمدؐ، ، گوبند سنگھ اور بابا دیال سے گربچن سنگھ تک (اوتار سنگھ کا بیٹا اور جانشین) کے انتہائی عالی سلسلے سے سنت مسلک بتایا۔ بعد کو گربچن سنگھ نے پیغمبریت کے کسی بھی ایسے دعوے کی تردید کی۔ بہرحال جو بھی ہو الیوں نے اس گمراہ فرقے کے پیچھے ایک ناپاک اور نامبارک سازش دیکھی۔ ایس جی پی سی کے کتابچے کے مطابق ومت ہند کی طرف سے اس فرقے کی شعوری طور پر ہمت افزائی ہو رہی تھی جو شروع ہوئی تھی اس وقت جب سردار ٹیل وزیر داخلہ تھے اور یہ ہمت افزائی شدید کی گئی تھی گوشت خوری، شراب نوشی اور عیاشی کی عادتیں ڈال کر ص کو آلودہ کرنے کے لیے اور واحد ذریعہ سکھ پنتھ کے ترجمان شرومنی اکالی دل کے امیج کو اس کی صلاحیتوں اور قابلیتوں برباد کرنے کے لیے۔ ایس جی پی سی کے کتابچے نے اکالی دل کے [illegible] وضاحت بھی کی۔ ۱۹۴۶-۴۷ میں موقع گنوا دینے کے بعد (عبارت کے نیچے خط مصنف نے کھینچا ہے) دل نے، مذکورہ پہلوؤں میں کمیونٹی خود مختار حیثیت کی بحالی کی حق جانب تاریخی جدوجہد کو جاری رکھا۔ اکالی، دہلی میں حکومت پر اس نرنکاری فرقے

کی مدد کرنے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ نرنکاریوں کو بھی، سکھ ازم کے اثر
کو تباہ کرنے اور اس طرح ایک حقیقی خالصہ راج کو روکنے کے لیے "ہندو سازش" کا ایک عنصر سمجھتے ہیں
ایس جی پی سی کے جاری کیے ہوئے ایک قرطاس ابیض میں سکھوں کے غم و غصے کا اظہار ہوتا ہے
تحریک کا اصل زور اور اس کی اصل خصوصیت سکھ ازم کی مخالفت ہے۔ اس کی روشن خیالی
کی حیثیت ثانوی ہے، اس کا طریقہ، سکھ رسوم و رواج کا حقارت آمیز اور بھدا مذاق ہے۔ یہ سکھ
جذبات اور سکھ مذہبی عقائد کی تحقیر و بے عزتی ہے اس کی محرک سیاست ہے۔ اور یہ سیاست ہے
سیاسی قوت کی جس کا مطمع نظر سکھ عوام کو مستقل طور پر ذلیل اور پست ہمت کرنے اور انھیں اپنی تاریخ
اپنی روحانی صلاحیتوں سے محروم کر کے دوسرے درجے کے شہری اور طفیلی بنا کر بالآخر انھیں علیحدہ وجود سے
کرنا اور انھیں گھٹا کر تاریخ پر لکھا ہوا حاشیہ بنا دینا ہے۔

جرنیل سنگھ بھنڈراں والا نے اتنی آسانی سے حاشیہ بننے سے انکار کیا ۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء کو جیسا کہ
جو سکھوں کے لیے ایک متبرک دن ہے کیوں کہ اسی دن خالصہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، انھوں نے امرت سر میں ہو
والی نرنکاریوں کی ایک کانفرنس کے خلاف ہونے والے ایک مظاہرے کی قیادت کی۔ نرنکاری بھی تیار تھے
جھگڑا ہوا اور جھگڑے میں بھنڈراں والا کے تیرہ حامی، تین نرنکاری اور دو راہ چلتے مارے گئے۔ اس
نے بھنڈراں والا کی حیثیت بنا دی اب انھوں نے نرنکاریوں اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں یعنی ہندوؤں کو
برا بھلا کہنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ کو دہلی میں نرنکاریوں کے سربراہ بابا گربچن سنگھ مار
گئے۔ سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن نے قتل کی سازش کرنے کا الزام بھنڈراں والا پر لگا کر پہلی رپورٹ میں ان کا
اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے تمام اخباروں میں شہ سرخیوں میں بھنڈراں والا کا نام آنے لگا مگر عجیب بات ہے
اگرچہ بھنڈراں والا بغیر کسی روک ٹوک کے آزادانہ ہر طرف گھومتے پھرتے تھے مگر انھیں اس کیس میں کبھی گرفتار
نہیں کیا گیا اسے اتفاق کہیے کہ اس وقت امور داخلہ کے وزیر گیانی ذیل سنگھ تھے قانون کی گرفت سے اپنی
آزادی سے فائدہ اٹھا کر بھنڈراں والا نے اپنے حامی بڑھائے انھوں نے گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں حامیوں
کے چھوٹے چھوٹے گروپ قائم کیے۔ ۳۱ مئی ۱۹۸۱ء کو امرت سر میں انھوں نے سکھوں کے اس مقدس شہر میں
اور سگریٹ کی فروخت پر پابندی لگانے کے مطالبے میں ایک جلوس کی قیادت کی۔ جلوس میں شریک ہونے والوں
نے سگریٹ کی چند دکانوں کو نذر آتش کر کے اپنے خالصہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں

ہا شروع ہوا۔ ستمبر ۱۹۸۱ میں اس طرح کے چار واقعات ہوئے، دوسری طرف سکھوں کی اس بڑھتی ہوئی عسکریت
ف ہندو ردِ عمل بھی شروع ہوا۔ ایک بار پھر ہندوؤں نے مردم شماری کرنے والوں سے کہا کہ پنجابی نہیں ہندی
دری زبان ہے۔ ایک انتہائی اہم ہندو لیڈر اور آریہ سماجی سیاست داں، اخبار کے مالک اور ایڈیٹر سمجھے
ت نرائن۔ ۹ ستمبر ۱۹۸۱ کو جب لالہ اپنی ایمبیسڈر کار میں گرینڈ ٹرنک روڈ (جس کا نام اب شیر شاہ سوری مارگ
پر جا رہے تھے، سکھ انتہا پسندوں نے گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔ اس جرم کا الزام جن لوگوں پر لگایا گیا ان
یک بار پھر بھنڈراں والا کا نام تھا۔ پولیس اپنی ماضی کی نرمی کا اعادہ نہیں کر سکی۔ اور بھنڈراں والا سے کہا گیا کہ وہ
آپ کو حوالے کر دیں۔ انھوں نے اپنی اس سپردگی کو ایک بہت بڑا عوامی تماشا بنا دیا اور دو لاکھ سے زیادہ سکھوں
یک مجمع کے سامنے انھوں نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا۔ پولیس نے ایک بار پھر ان کے خلاف کوئی
ہادت نہ ملنے کا عذر کیا۔ بھنڈراں والا جیل سے لوٹے تو وہ نسبتاً بڑے ہیرو تھے۔

پڑوسی صوبے ہریانہ میں کچھ ہندوؤں نے لالہ جگت نرائن کے قتل پر ناراضگی کے اظہار کے لیے گرنتھ صاحب
بے حرمتی کی۔ بھنڈراں والا کے گروہ نے علی الاعلان یہ دھمکی دی کہ اگر اب پھر کبھی ایسا ہوا تو وہ ہندوستانی دستور
اہ کر دیں گے اور اب آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری، ہرچند رسنگھ سندھو جیسے نوجوان لیڈر
دھمکیاں دینا شروع کیں کہ اگر بھنڈراں والا کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ کشت و خون سے پرہیز نہیں کریں گے۔ بھائی
بیر سنگھ کے بھائی منجیت سنگھ نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ دربارا سنگھ کے بچوں اور بی جے پی لیڈر رانی بہاری
ہی کو جو اتفاق سے غیر شادی شدہ ہیں، جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی اور پنجاب کے پولیس والوں کی یونین
صدر کرنیل سنگھ نے بھنڈراں والا کو پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ سنت کا جال پھیل رہا تھا۔

تشدد کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا آخر کار حکام نے ۱۸ جولائی ۱۹۸۲ کو بھنڈراں والا گروہ کے دو
ز دوں، بھائی امریک سنگھ اور چوک مہتا میں بھنڈراں والا کے ہیڈ کوارٹرز کے منیجر ٹھارا سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ بھنڈراں والا
اب یہ فیصلہ کیا کہ دور اندیشی، شجاعت و بہادری سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ بھاگے اور جا کر گولڈن ٹیمپل میں پولیس
وں کی دست رس سے محفوظ، چھپ گئے۔ جرنیل سنگھ بھنڈراں والا نے یہ جائے امن پھر کبھی نہیں چھوڑی حتیٰ کہ
ہ ان کی لاش کو وہاں سے باہر لائی۔

اس سارے ڈرامے میں، اکالیوں کی حیثیت تماشائیوں کی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو علیحدگی
پسندی کے نعرے اور بھنڈراں والا کے تشدد سے منسلک نہیں کرنا چاہا مگر پیچھے رہنے سے وہ خوف زدہ بھی

تھے کیوں کہ اگر کوئی دوسرا کبھی بھی کسی سکھ تحریک کی قیادت کرنے میں کامیاب ہوتا تو کیمونٹی کے لیے ان
ختم ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ کانگریس (اندرا) کے لیڈروں کے دوہرا کھیل کھیلنے کے امکانات کو بھی وہ مسترد نہیں
تھے فرض کیجیے کہ کانگریس حکومت بھنڈران والا سے گفت وشنید کرتی ہے اور ان کی کچھ مانگیں مان لیتی ہے
اکالی کہاں ہوں گے؟ یہ، جیسا کہ حالات نے ثابت کر دیا کہ ایک افسوس ناک کیس تھا کمزور حکمرانی اور منفرد رد عمل کا جو
ایک ایسی آگ سلگائی جو بہت جلدی ہی قابو سے باہر ہو گئی۔

اکالیوں کی اجازت یا ان کے تعاون کے بغیر انتہا پسندوں نے ایک احتجاج شروع کر کے ان پر سبقت
حاصل کر لی۔ بہر حال اکالیوں نے علیحدگی کے مطالبے جیسے دلفریب نعروں سے متاثر ہونے سے انکار کر
۱۲ اور ۱۵ اگست ۱۹۸۱ کو جنرل سکریٹری اور اکالی دل کے ایم ایل اے سکھجیندر سنگھ نے جب خالصتان
مسئلے پر پنجاب میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا تو پارٹی نے ان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اکالیوں کے ر
تین صورتیں تھیں یعنی یہ کہ انتہا پسندوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھ کر کام کیا جائے۔ اس خیال کی وکالت ایس جی پی
صدر گرچرن سنگھ توہرا نے کی۔ دوسری طرف پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے بھنڈران
اور ان کے حامی موالیوں کو یکسر رد کرتے ہوئے پارٹی کو جنگجو مذہبی افراد سے بتدریج دور کرنے کی اپنی ما
کوششوں کو جاری رکھا اکالی دل کے صدر سنت ہرچند سنگھ لونگووال نے مسئلے کی نوعیت اور اس سیاسی د
جس میں کہ فیصلہ لیا جاتا تھا، پیش نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے ایک معتدل اور متوسط راہ نکالنے کی کوشش
کی۔ بہر حال تمام لیڈر اس بات پر متفق تھے کہ اگر بالکل تنہا نہیں رہنا ہے تو پارٹی کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اک
نے آنند پور صاحب ریزولیوشن میں مذکورہ مطالبات کی تکمیل کے لیے ایک "مذہبی جنگ" کی بات کرنا شروع
یہ حقیقتاً کون سے مطالبات تھے؟ پہلا یہ تھا کہ علاقائی معاوضہ دیے بغیر چنڈی گڑھ پنجاب کو ملنا
دوسرا پنجابی بولنے والے علاقے (فاضلکا اور ابوہر ضلعوں کے کچھ حصے) جو پنجاب سے باہر رہ گئے ہیں ان کو
پنجاب کے صوبے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ تیسرا آب پاشی کا سارا انتظام اور بھاکڑہ ننگل ڈیم کا اہتمام پنجاب گو
کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ چوتھا پنجاب چوں کہ دریا کے کنارے بسنے والی ریاست ہے اس لیے اس کو ۲۴
سے زیادہ پانی لینے کی اجازت ہونی چاہیے۔ بقیہ پانی غیر ساحلی ریاستوں، جیسے ہریانہ اور راجستھان کے
پانچواں مطالبہ مرکزی حکومت سے زیادہ بڑے پیمانے پر سرمایہ لگا کر پنجاب میں بہت زیادہ صنعتیں لگائی جانا چاہیئں
حقیقی وفاقیت کے اصول کو مانتے ہوئے مرکز کو کچھ ان اختیارات کو پھر سے ریاست کے حوالے کر دینا چا۔

نے پہلے کبھی ہڑپ کر لیے تھے۔ ساتواں، فوج میں بھرتی لیاقت کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ آبادی کے تناسب
سے۔ آٹھواں اتر پردیش کے ترائی کے علاقوں کے سکھ کسانوں کو پریشان نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ مذہبی
مطالبات تھے۔ گولڈن ٹمپل سے شبد اور مذہبی گیتوں کو نشر کرنے کے لیے ایک ریڈیو اسٹیشن کی تنصیب ہونا
چاہیے گولڈن ٹمپل کے نواحی علاقے میں (امرتسر کا اندرون چہار دیواری علاقہ) تمباکو اور شراب کی فروخت پر
پابندی ہونا چاہیے ۔۔ یہ مطالبات ۱۹۸۱ء میں پیش کیے گئے تھے۔

۱۹۸۲ء کے موسم خزاں میں حکومت ہند نے ناقابل برداشت مصارف سے ایشیائی کھیلوں کا انعقاد کیا۔
نئی دہلی پر کچھ ایسی ہیبت طاری تھی کہ سکھ انتہاپسندوں کی طرف سے ہونے والی کسی گڑبڑ کے تدارک کے لیے
سخت حفاظتی اقدامات کیے گئے ان اقدامات میں سکھوں کی من مانی جامہ تلاشی بھی شامل تھی۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے
سکھ فوجیوں کو (یہاں تک کہ جنرل بھی) مستثنیٰ نہیں کیے گئے۔ اس کارروائی کو اپنی انتہائی ذلت کہہ کر اکالیوں نے
اپنے مطالبات کے حصول کے لیے ایک " مذہبی جنگ " کا آغاز کیا کافی عرصہ بعد بلکہ حقیقتاً ایک سال سے زیادہ
عرصہ کے بعد اکالیوں کے دماغ میں ایک لہر اٹھی اور انھوں نے اپنے مطالبات کی فہرست میں ایک مطالبے کا
اضافہ کر دیا۔

ہندوستان کے دستور کی دفعہ ۲۵ ہر ہندوستانی کو مذہبی آزادی کے اس بنیادی حق کی ضمانت دیتی
ہے۔ امن عامہ اخلاقیات وصحت اور اس حصہ کے دیگر مندرجات کے تقاضوں کی روشنی میں تمام لوگوں کو ضمیر کی
آزادی۔ مذہب کو ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا مساوی استحقاق ہے۔" ایک دوسری شق میں کہا گیا
ہے کہ اس دفعہ کی کوئی بات اس قانون کے نفاذ کو متاثر نہیں کرے گی یا کسی ایسے قانون کے وضع کرنے میں مملکت کی
راہ میں حارج نہیں ہوگی جو (الف) کسی اقتصادی، مالی، سیاسی یا دیگر سیکولر سرگرمی کو (جو مذہبی طور طریق سے متعلق
ہو) منضبط کرنے یا پابند کرنے کے سلسلے میں وضع کیا جائے (ب) سماجی بہبود اور اصلاح کے لیے نیز عوامی
نوعیت کے ہندو مذہبی اداروں کے دروازوں کو، ہندوؤں کے جملہ طبقات اور فرقوں کے لیے کھول دینے کے
نام سے متعلق کوئی قانون وضع کیا جائے۔" اس دفعہ کے ساتھ مزید دو توضیحات ہیں: " اول یہ کہ کرپانوں کا لگانا
ساتھ رکھنا مذہب کی پیروی میں شامل متصور ہوگا۔ دوم یہ کہ شق نمبر ۲ کی ذیلی شق (ب) میں جہاں ہندوؤں کا ذکر
ہے وہاں یہ سمجھا جائے گا کہ اس میں وہ تمام افراد بھی شامل ہیں جو سکھ، جین یا بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ اسی طرح
ہندو مذہبی اداروں کے ذکر میں بھی ایسا ہی تصور کیا جائے گا۔

اشتعال انگیزی کے لیے یہ کافی تھا۔ اکالی دل جو ۱۹۲۰ء میں خاص طور پر سکھوں کے مذہب اور ان کے تقدس کے تحفظ کے لیے وجود میں لایا گیا تھا اس کے لیے سکھوں کو "ہندوؤں کے طبقات اور گروہوں" میں شامل کرنے کی بے حرمتی سے کم نہیں تھا "مذہبی جنگ" کو مزید وسعت دی گئی اور بڑے بڑے اکالی لیڈروں نے دستور کی دفعہ کو سرِ بازار نذرِ آتش کیا اور مارچ ۱۹۸۴ء میں جیل گئے مگر تعجب کی بات یہ نہیں تھی کہ اکالی مطالبات کر رہے ہیں تعجب اس پر ہے کہ ابھی تک دہلی اور اکالیوں کے مناقشے کا حل نہیں نکلا تھا۔ اعتدال پسند اکالی درحقیقت دہلی پر فوقیت یا فتح کے خواہش مند تھے تاکہ وہ میریان ہونے کے اپنے منصب کو بحال کر سکتے اور قیادت اور سیاست انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے سکتے۔ دہلی میں بینائی سے محروم حکومت بھی اس بات کو کہ ہیز اور کوئی راہ نکال لیتی، جیسا کہ پنڈت نہرو نے ماسٹر تارا سنگھ اور سنت فتح سنگھ کے ساتھ اکثر کیا تھا مگر زخم کو مندمل کرنے کی بجائے حکومت نے اسے زہرباد بننے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں اکالیوں کے مطالبات کا کوئی نہ کوئی حل نکالا جاتا رہا تھا اور اعتدال پسند اکالی، دہلی کے لیے مسائل کو آسان بنانے کے خواہش مند تھے اور ان مسائل کو جو طے نہیں ہو پائے تھے انھیں سپریم کورٹ یا کسی ثالث کے سپرد کرنے کے لیے کافی تیار تھے۔ اکالی اپنے شیر کی پیٹھ پر سے اترنے کے لیے اتنے ہی خواہش مند تھے جتنا کہ کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔ ان کے تضادات جو بھی رہے ہوں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی جو بھی نوعیت ہو وہ خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس وقت مقابلے میں ایک خطرناک عنصر بھی کارفرما ہو جائے گا اور جس کے اوپر ان کا کوئی قابو نہ تو ہے اور نہ ہی ہوگا اور یہ عنصر تھا، متشدد، مسلح اور مالی طور پر مطلق علیحدگی پسندوں کا۔ جو نہ تو سکھوں کی اکثریت کی رائے کے پابند تھے اور نہ ہی کسی منطق اور دلیل کے، وہ بس اپنے خوابوں کی مثبت تعبیر دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

حکومت نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ وہ مذہبی مطالبات کو ماننے کے لیے تیار تھی رہ جاتا تھا سیاسی پہلو، سے بڑا مسئلہ چنڈی گڑھ کا تھا مگر مسز اندرا گاندھی، نے ۱۹۷۰ کے اوائل میں بذات خود اسے واضح طور پر چنڈی گڑھ کو پنجاب کو دے دیا تھا جہاں تک فاضلکا اور ابوہر کا سوال تھا، اسے ہریانہ کے حوالے کرنے کے لیے دس میل لمبا اور چار میل چوڑا ایک راستہ فراہم کرنا ہوتا کیونکہ یہ مذکورہ علاقے ہریانہ سے متصل نہیں تھے۔ انھیں بہت آسانی کے ساتھ پنجاب میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اکالیوں نے، سرحدوں، ہیڈورکس اور پانی کی تقسیم کے مسائل کے حل کے۔ کسی تیسرے کی ثالثی کی تجویز کی تھی جہاں تک مرکز اور ریاست کے مابین تعلقات کا سوال تھا حکومت نے اس مسئلے

دور کرنے کے لیے ایک کمیشن کی تشکیل کر دی تھی۔ فوج میں بھرتی اور ترائی کے علاقوں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا
وہ مصالحت کی راہ میں رکاوٹ بنتا۔ اسی طرح دستور کی دفعہ ۲۵ کے سلسلے میں حکومت اس بات پر راضی تھی کہ مجوزہ
ترمیم کا فیصلہ ججوں کے کسی پینل کے حوالے کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ پھر کوئی مصالحت کیوں نہیں ہوئی؟ اس
سوال کا جواب اس انتہا پسندی میں نہیں تھا جس کے واضح ثبوت موجود تھے۔ اس سوال کا جواب تھا ایک نئی اور غیر
روایتی پالیسی میں جس نے ۱۹۸۰ کے بعد مسز اندرا گاندھی کے عہد حکومت میں کانگریس (اندرا) کے فیصلوں پر بہت
اثر ڈالا تھا۔

ساتویں دہائی کے اواخر میں، ایک یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ آزادی کے بعد سے ہندو اکثریت کے حقوق
مار کر اقلیتوں کے بڑے ناز اٹھائے جا رہے ہیں اور انھیں بگاڑا جا رہا ہے۔ انتخابی فائدوں کے لیے اقلیتوں کی
بے جا خاطر داری کا الزام لگایا گیا، خصوصاً کانگریس پر جس نے ہمیشہ اقلیتوں کے ووٹ چاہے اور حاصل کیے۔ اس
سازش میں سب سے اہم کردار یقیناً نہرو کا تھا مگر ان کی بیٹی بھی کچھ کم مجرم نہیں گردانی گئی۔ ۱۹۸۱ء میں تامل ناڈو کے
ایک گاؤں میناکشی پورم میں چند سو اچھوتوں کے اسلام قبول کر لینے کی انتہائی اچھالی ہوئی خبر کو رد اپنی آخری تنکا
کہا جانے لگا۔ ہندو احیا پرستوں نے کہنا شروع کیا کہ ہندو اکثریت والے ہندوستان میں اب اسلام نہیں ہندو دھرم
خطرے میں ہے۔ وشو ہندو پریشد اور ویرات ہندو سمیلن (جس کے سربراہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے جانشین کرن
سنگھ تھے) جیسی تنظیموں نے ہندو دھرم کے تحفظ کے لیے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ اس سب کا اثر اتنا
گہرا تھا کہ مسز اندرا گاندھی نے بھی یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ اقلیتوں کی مزید ذرا سی بھی خاطر و دل جوئی پر "ہندو ردعمل"
ہونا لازمی ہے۔ اس احیا پرستی کا مقابلہ کرنے کے بجائے مسز گاندھی نے اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک چلا جا سکے
چلنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۱ء میں مرادآباد میں آزادی کے بعد کا بدترین تشدد مسلمانوں کے ساتھ
ہوا مگر مسز اندرا گاندھی نے زبانی تسلی اور دلاسے کے لیے بھی اس وقت ایک حرف زبان سے نہیں نکالا۔ ہندو
احیا پرست ۱۹۸۲ء میں اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئے جب انھوں نے "ہندو دھرم کو بچانے" کے لیے ملک
بھر میں یاترائیں شروع کیں۔

مسز گاندھی نے اکثر اقلیت مخالف انداز کا مظاہرہ کیا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا اعادہ کرتی رہیں کہ ہندوستان
میں مسلمانوں نے ابھی تک اپنے تخریبی کھیلوں کو ترک نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں سے متعلق ہر مسئلہ کی پشت پر کسی "بیرونی
سازش" کا تذکرہ ہمیشہ ہوا۔ اسی طرح کے شک و شبہات سکھوں کے بارے میں پیدا کیے گئے۔ موخر الذکر کے

لیے یہ بات کسی حد تک خود تسکینی کی پیش گوئی بن گئی۔ اس لیے مسز گاندھی کے پاس کوئی پنجاب پالیسی نہیں تھی بلکہ اقلیتوں کے لیے ایک پالیسی رکھتی تھیں جس کی توسیع انھوں نے پنجاب اور جموں و کشمیر دو اقلیتی ریاستوں تک کی ان کی تقریروں میں اور ان کے بیٹے راجیو گاندھی کی تقریروں میں سکھوں، خصوصاً اکالیوں کی تصویر کشی علیحدگی پسند کی طرح کی گئی۔ اور جموں و کشمیر کے مسلمانوں بہ مع ان کے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو غداری بلکہ اس سے بھی بدتر جرم کے الزامات سے نوازا گیا۔ یہ رویہ کانگریس کے روایتی رویوں سے بڑے اساسی قسم کا انحراف تھا۔ ماضی میں سکھ یا مسلمانوں کا کوئی حلقہ اگر کبھی وطن دشمنی کی آواز اٹھاتا تھا تو مرکز شعوری طور پر اس سے صرف نظر کرنے کی کوشش کرتا اور جو مسلمان یا سکھ لیڈر ہندوستان کے دستور کو مانتے اور اس کا احترام کرتے تھے ان کے ساتھ نمایاں طور پر اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ آج ہمارے سامنے اس کے بالکل برعکس صورت حال تھی۔ اگر ایک طرف فاروق عبداللہ برملا اصرار کرتے رہے کہ وہ اول ہندوستانی اور آخر ہندوستانی ہیں، اور یہ کہ کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک ہے۔ دوسری طرف اندرا اور راجیو گاندھی فاروق عبداللہ کی حب الوطنی کی کوالٹی کے بارے میں کبھی علی الاعلان اور کبھی دبے لفظوں میں اظہار خیال کرتے رہے۔ یہ پالیسی مرکز گریز داخلی پالیسی پر عمل درآمد کی ایک تباہ کن مشق تھی۔ جو مسز ہندوستان کے عام ہندو موڈ کی غلط تاویل کا نتیجہ تھی۔

اور اسی طرح پنجاب میں بجائے اس کے کہ انتہا پسندوں کو بے سہارا بنانے کے لیے اکالیوں سے تعاون کر دہلی دانستہ یا نادانستہ ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی۔ متعصب ہندو تنظیموں کی "سکھوں کو سبق سکھانے کے لیے" تمنا بڑھ گئیں جب دہلی آخر کار امن و سکون کی خواہش مند ہوئی تباہ کار ہندو "توا" کی تمنائیں بلند ہو چکی تھیں۔ پون شرما کی قیادت میں ہندو سرکشا سمیتی ہندوؤں کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اس تباہ کار بھوت نے جو عناد اور جو قیمت وصول کی وہ فروری ۱۹۸۴ میں اس وقت سامنے آگئی جب کامیاب خفیہ مذاکرات کے بعد حکومت ایک سہ رکنی میٹنگ میں جس میں حزب اختلاف بھی شامل تھا اکالیوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی، عین میٹنگ کے دن سمیتی نے اس خطرے کے پیش نظر کہ اکالی اور کانگریس کا معاہدہ ان کے لیے نہ جانے کیسا ثابت ہو، امن و شانتی کے سارے امکانات کو اپنی شرارت انگیزی سے ختم کر دیا۔ مذاکرات جاری تھے کہ سرکشا سمیتی نے ہریانہ میں سکھوں کے خلاف تشدد شروع کر دیا۔ یہ تشدد دن بھر چلا۔ اس میں بے سہارا سکھوں کی تحقیر کی گئی، انھیں ڈرایا دھمکایا گیا اور بے گناہ سکھوں کو جان سے مار دیا گیا، مذاکرات ناکام ہو گئے اور گولڈن ٹیمپل کے پرسکون ماحول میں بیٹھے ہوئے بھنڈراں والا معصومیت کے ساتھ مسکرا رہے تھے، صرف یہی نہیں کہ ہندوؤں نے مفاہمت کے امکانات ختم کر دیئے بلکہ اب بھنڈراں والا

ں ہندو مخالف نفرت و تعصب کا سامان بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ مگر ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۴ کے درمیان پنجاب میں دہشت و
ت کی طویل کہانی کے بارے میں انتہائی افسوس کی بات یہ بھی کہ اس تمام اشتعال انگیزی اور دانستہ پیدا کیے جانے والے
اؤ اور شک و شبہات کے باوجود ۱۹۴۷ کی طرح عام قتل و غارت گری اور تباہی کی آگ نہیں بھڑکی۔ ہمارا یہ عہد
بڑا نہیں نیم خود کار ہتھیاروں کا ہے اور ذرا سے بھی بڑے پیمانے کے فسادات قتل عام کی طرف لے جا سکتے
سکھ عوام نے ہندو مخالف فسادات کے لیے بھنڈران والا کی کوششوں کی حمایت نہیں کی۔ اکالی ایک مخمصے میں
نار تھے اور ان کے ذہن اس سلسلے میں صاف نہیں تھے کہ وہ بھنڈران والا سے علی الاعلان کب الگ ہوں گے۔
۱۹۸۴ تک وہ اپنا رخ اس سمت میں کر چکے تھے۔ اکال تخت نے جو سکھوں کا سب سے بڑا اور معزز مذہبی ادارہ ہے،
ںڈران والا کے خلاف الزامات کی فہرست تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ علیحدگی پسند سنت نے اس پر اپنے ردعمل کا
اظہار یہ کہہ کر کیا کہ وہ اکال تخت کی باتوں پر کان نہیں دھریں گے۔ اکال تخت نے جواب میں یہ انتباہ دیا کہ سکھ ازم کی
ری تاریخ میں اس کی حکم عدولی نہیں ہوئی ہے اور وہ اس قسم کی نافرمانیوں کو کسی حالت میں برداشت نہیں کرے گا
بھنڈران والا کا مسئلہ صرف ایک غیر یقینی اکالی قیادت ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت بھی تھی کہ سکھوں کی ایک
اد اکثریت کو ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو ختم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور بہ طرف شہری یا مذہبی
ملحوظ نہیں تھے جو اس طرح سوچتے تھے بلکہ خالصہ جاٹ بھی جن میں بھنڈران والا کے گاؤں روڈے کے قرب و جوار
میں رہنے والے بھی شامل تھے، یہی انداز فکر رکھتے تھے۔ جب فروری ۱۹۸۴ میں میں نے اس گاؤں کا دورہ کیا اور
ایک نوجوان سے میں نے بات کی اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اب روڈے کو خالصتان کا نیا روحانی دارالسلطنت بننے کا اعزاز
حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، تو اس نوجوان کا ردعمل بڑا سخت تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "تم رہتے
کہاں ہو؟" میں نے جواب دیا "کلکتے میں" اس نے کہا "کیا تم کلکتے میں مجھے ایک کمرہ کرایے پر دے سکتے ہو؟"
میں نے پوچھا "کیوں؟ اگر خالصتان بن گیا تو وہاں رہنے کے لیے؟" جواب میں اس نے یہ سوال کیا "ایسے کسی ملک
میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے جہاں اس پاگل سنت کی حکومت ہو؟" تین ماہ بعد گولڈن ٹمپل میں ہونے والی فوجی کارروائی
کے بعد کتنے لوگوں نے اپنے ایسے خیالات بدل لیے ہوں گے۔ زندہ بھنڈران والا کو مسترد کرنے والوں میں سے
کتنے ہوں گے جو مرے ہوئے علیحدگی پسند کے پیرو بن گئے ہوں گے؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا۔
ایک چھت پر بیٹھا ہوا ایک چالاک آدمی، جو مبلغ، سپاہی اور بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے، اس
وقت بھی گفتگو یوں کرتا ہے جیسے کوئی سربراہ مملکت ہو اور کہتا ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت یا اس کی وزیر اعظم

مسز گاندھی اس سے بات کرنا چاہتی ہیں تو وہ گولڈن ٹیمپل میں آسکتی ہیں ۔ وہ خود دہلی نہیں جاسکتا ۔ ایسے
کی موت کیا ایک جیت تھی ؟

میں نے پوچھا تھا " وہ کس چیز سے خوف زدہ ہے ؟ کوئی بھی چیز ۔ مثلاً موت ۔ اس نے جوار
" مجھے موت " سے ڈر نہیں لگتا ۔ ایک سکھ موت سے نہیں ڈر سکتا اور اگر وہ ڈرتا ہے تو وہ سکھ نہیں ـ
طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر خوشامد اور چاپلوسی کی چمک تھی اور خود سنت اپنے فی البدیہا
انتہائی مسرور نظر آتے تھے ۔

عقیدہ ، جذبات ، عزت ، شناخت ، خوف ، نشو ونما ، خوش حالی ، دار و مدار ، موقع پرس
شرافت ، بے بسی ، تعصب ، ولولے ، یہ سب عناصر ہیں جو اس وقت اور الجھیں گے اور تکلیف د
جب پنجاب ایک بار پھر شورش سے گزرتا ہے ۔

(۱۲)

پنجاب: ایک جنرل کی موت

سکھ والدین، دوسرے ہندوستانی والدین کی طرح اپنے بچوں کے نام اپنی خواہشوں اور اپنے ولولوں کے ابق رکھتے ہیں۔ جرنیل سنگھ کے ماں باپ نے بھی چاہا تھا کہ ان کا لڑکا بڑا ہو کر کسی فوج کی قیادت کرے۔ جرنیل ابی زبان میں انگریزی کے لفظ جنرل کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جرنیل سنگھ کا رجحان عسکری تھا مگر اس نے اسے ب کی خدمت میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا بھائی ہندوستانی فوج میں ایک سپاہی حیثیت سے بھرتی ہوا اور ۱۹۸۴ تک ترقی کر کے ایک صوبے دار (نان کمیشنڈ افسر) بن گیا۔ جون کے پہلے تے میں دونوں بھائی ایک اہم لڑائی میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ گولڈن ٹمپل کے اندر انتہا پسندوں کے تھ ایک خونخوار جنگ کے بعد جب ہندوستانی فوج نے وہاں سے چتاؤں پر جلانے کے لیے انتہا پسندوں لاشیں نکالیں تو اس میں جرنیل سنگھ کی لاش کو اس کے بھائی نے ہی پہچانا تھا۔

اس سال اپریل، مئی اور جون کے مہینوں میں پنجاب میں تشدد میں اضافہ ہی ہوتا رہا تھا، رات کی ڈیوٹی ام کرنے والے صحافی ویت نام کی باتیں کرتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ آپ کچھ اموات پر بھروسہ کر کے ایک سنسنی خیز ی کہانی تیار کر سکتے تھے۔ سارے ملک میں ایک بے بسی کا ماحول پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ اقلیت کا فاشزم رجنسیہ کر بڑھ گیا تھا بلکہ وہ کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ علیحدگی پسندوں نے بھی یہ تصور کرنا شروع کر دیا تھا کہ ان کے ب پورے ہو رہے ہیں۔ لندن سے خالصتان کے خودساختہ صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان نے بھنڈران والا یغام بھیجا کہ اب خالصتان کی ہنگامی (وقتی) حکومت کے قیام کے اعلان کا وقت آ گیا ہے۔ یہاں سے ردِعمل ت ہوا۔ یہ بات خود ڈاکٹر چوہان نے سید مصطفیٰ کو بتائی تھی اور جو ۱۹ جون کے ڈیلی ٹیلی گراف میں شائع ہوئی تھی اسکیم ی کہ ایک پارلیمنٹ نامزد کی جائے گی جس کا اجلاس گولڈن ٹمپل میں ہوگا۔ ایک حکومت کی تشکیل ہوگی جو کھلوا

سے کہے گی وہ اس حکومت کو اپنی وفاداری بھی دیں اور اپنے ٹیکس بھی۔ اسی دوران لندن میں ایک "خالصتان ہاؤس" ؟ کر دیا جائے گا اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے خالصتان کو تسلیم کرنے کی اپیل کی جائے گی۔ (نئی دہلی میں سرکاری حلقو کا خیال تھا کہ درحقیقت چند ممالک ایسا کرنے پر تیار تھے)

اکالی حسب دستور کسی بھی ایسے لیڈر کے پیچھے چلنے کے لیے بے چین تھے جس نے ان کی مذہبی جنگ کو ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہو۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ مسز گاندھی کی حکومت سے معاہدہ کی کوشش میں خفیہ طور پر ملاقاتیں کر رہے تھے مگر کسی اور چیز نے نہیں، بدگمانی نے کامیابی کے امکانات کو ختم کر دیا۔ فریقین نے ایک دوسرے پر بے ایمانی اور تذبذب کے الزامات لگائے۔ بات چیت کے ذریعے کسی معاہدے کی توقع ایسا لگتا تھا کہ ختم ہو گئی ہے۔ اکالیوں نے اعلان کیا کہ وہ ۳ جون کو گرو ارجن کے یوم پیدائش سے پنجاب کے کسی بھی حصے میں پنجاب سے غلہ کی برآمد کو روکیں گے اور سکھوں سے کہیں گے کہ وہ کوئی بھی ٹیکس ادا نہ کریں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ڈرامے کا کوئی انجام سامنے آ رہا ہے۔ یکم جون کو شعلہ بھڑک اٹھا جب گولڈن ٹمپل کے علاقے میں بنی ہوئی عمارتوں کی محفوظ چھتوں پر مقیم بھنڈراں والا کے مسلح آدمیوں اور باہر تعینات فوج کے درمیان گولیاں چلیں اور اس میں گیارہ آدمی مارے گئے۔ تشدد میں دوسرے دن بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں بارہ آدمی دہشت پسندی کا شکار ہوئے۔ ہوشیار پور میں اپچاس سالہ سابق ایم ایل اے اوم پرکاش کو اسکوٹر پر سوار تین دہشت پسندوں نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اسی شام اچانک ایک اعلان ہوا کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ریڈیو پر قوم کے نام ایک خصوصی پیغام نشر کریں گی اور یہ وہ لمحہ تھا جب پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سوچا نہیں جا سکتا یعنی فوج سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گولڈن ٹمپل کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ اس سے پہلے آخری دفعہ سکھوں کے اس مقدس مقام میں فوج اس وقت داخل ہوئی تھی جب احمد شاہ ابدالی نے اپنے مال غنیمت لے کر افغانستان واپس ہونے والے قافلوں پر کیے جانے والے مسلسل حملوں سے تنگ آ کر، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ، انتقامی طور پر گولڈن ٹمپل کو اڑا دیں مگر اس واقعے کو دو سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ گولڈن ٹمپل اور اس سے متصل بنی ہوئی عمارتیں سکھوں کے لیے مقدس ترین ہیں۔ گولڈن ٹمپل جیسے مقامات کو، جس کی بنیاد گرو ارجن نے رکھی تھی یا اکال تخت جسے گرو ہری گوبند نے تعمیر کیا تھا، نقصان پہنچانے والا ذرا سا بھی نقصان ہر سکھ کو جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں انتہا پسندوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی، خفا کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسری طرف، علیحدگی پسند عناصر، دوسروں کی شرافت کا پورا فائدہ اٹھا

نڈران والا اور اس کے ساتھیوں نے انجام سے بے نیاز ہو کر ان مقامات مقدسہ کو قلعوں میں تبدیل کر دیا
ہندوستان کے دستور کی عملداری نہیں تھی۔ ہر روز گولڈن ٹمپل سے چند مزید ہندوؤں کو مارنے کے احکامات
ی ہتھیار انتہا پسندوں کو بھیجے جاتے تھے۔ اور ٹوہرا، لونگوال اور بادل جیسے اعتدال پسند اکالی لیڈر خوب اچھی طرح
ے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر انھوں نے اسے چیلنج نہیں کیا۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ صورت حال اس حد تک بگڑ چکی ہے
فوج ہی انتہا پسندوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بھنڈران والا کو اس بات کا پورا یقین اور بھروسہ تھا کہ مسز اندرا گاندھی
بھیجنے کی ہمت کبھی نہیں کریں گی مگر مسز اندرا گاندھی نے ہمت کی جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں اکثر کرتی رہی تھیں۔

دو جون سنیچر کی شام کو، مسز اندرا گاندھی قومی ٹیلی ویژن پر آئیں اور پنجاب کے بارے میں باتیں کیں۔ ان
ر سے پہلے ٹیلی ویژن پر دو گیت ہوئے۔ پہلی اثر انگیز نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" تھی
ہ اقبال کی تھی۔ انھوں نے یہ نظم اس صدی کی دوسری دہائی میں لکھی تھی جب وہ ایک متحدہ ہندوستان پر ایمان
تے تھے۔ دوسرا گیت سرسوتی وندنا تھا۔ مسز گاندھی نے قوم کو بتایا کہ حکومت نے اکالیوں کے اکثر مطالبات مان
ہیں مگر کوئی معاہدہ صرف اس لیے نہیں ہو پایا ہے کہ سکھ ہر دفعہ کچھ اور نئے مطالبات سامنے رکھ دیتے
ھوں نے الزام لگایا کہ ایسا لگتا ہے کہ تمام اکالی فیصلے اب انتہا پسند کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس
تعاون کی تحریک کا ذکر کیا جو اگلے دن سے شروع ہونے والی تھی۔ مسز گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ انھوں نے فوج
لڈن ٹمپل میں داخل ہونے کا حکم دے دیا تھا مگر اب یہ بات ظاہر تھی۔ فوج کے اس اقدام کا سربراہ خود بھی
ک سکھ تھا۔ ویسٹرن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف لفٹیننٹ جنرل رنجیت سنگھ دیال کو اسی دن پنجاب کے گورنر
ڈی. پانڈے کا سیکورٹی ایڈوائزر بھی مقرر کیا گیا۔

فوج اس قسم کے امکان کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ پنجاب کے حساس علاقوں میں فوجی دستے تعینات کیے
ے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ سرحدی حفاظتی فوج چونکہ سکھ انتہا پسندوں سے نبٹنے میں معذور ہے۔ فوج
کے تدارک اور عام حفاظتی انتظامات کے وہ کام کرے گی جو عام حالات میں سرحدی حفاظتی فوج کرتی
ے۔ میرٹھ اور سکندرآباد سے پیدل فوج کے دو ڈویژن امرتسر بھیجے گئے۔ مسز گاندھی نے جب اپنی تقریر ختم
ب اس وقت یہ ڈویژن گولڈن ٹمپل کے اطراف میں مورچے سنبھال رہے تھے۔ اتوار کی صبح ہوئی اس وقت
مہ شخص جان چکا تھا کہ اصل جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھنڈران والا جو عام طور پر بڑے جوش و خروش میں رہتا تھا
وہ اداس اور مغموم تھا۔ صحافی جو اکالی عدم تعاون تحریک کی خبروں کے لیے امرتسر میں موجود تھے حسب معمول

بھنڈران والا سے ملنے گئے۔ اخبار ٹیلی گراف کے فوٹو گرافر سندیپ شنکر جو بھنڈران والا سے ملنے والے آخری آدمی تھے ان کا کہنا ہے کہ "وہ (بھنڈران والا) خود رائفلوں میں گولیاں بھر بھر کر اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ اگر فوج اندر آئی تو وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔" اس رات نو بجے سے پنجاب میں چھتیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا یہ وہ مدت تھی جو خالصتان چاہنے والوں کو ختم کرنے کے لیے فوج کو ... ترسیل کے بری اور ہوائی تمام ذرائع مسدود تھے اور باقی ملک سے پنجاب کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بدیسی صحافیوں سے بڑی نرمی کے ساتھ یہ کہا گیا کہ وہ اپنے ٹائپ رائٹروں کو کچھ آرام دے لیں۔ ان سب کو پنجاب سے باہر پہنچا دیا گیا۔ جنرل دیال اور جنرل کے سندر جی نے اپنے ڈویژنوں اور بریگیڈ کمانڈروں ... گولڈن ٹیمپل کے صدر دروازے سے تقریباً پچاس میٹر کے فاصلے پر اپنی کارروائی کے ہیڈ کوارٹر قائم ... انتہاپسندوں نے اپنے دفاع کے لیے تین دائروں میں یا تین صفوں میں انتظام کیا تھا۔ بیرونی سمت ... نے سترہ شہری گھروں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنا تھی۔ دوسری صف گولڈن ٹیمپل کی چہار دیواری پر بنی ہوئی عمارتوں پر تھی۔ چھتیں، گھنٹہ گھر، پہرے کے مینار، عمارتیں جن پر سے رائفلوں اور بندوقوں کے ذریعے اس مرکزی صحن پر قابو رکھا جا سکے جہاں سے ملحق ... کے کنٹرول روم پر قبضہ کرنے کے لیے فوج کو بہرحال گزرنا تھا۔ تیسری دفاعی لائن اکال تخت میں قائم خود ... اکال تخت کی مقدس عمارت جہاں بڑے بڑے لیڈر اور خاص خاص لوگ جمع تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بھنڈران والا، بھائی امریک سنگھ، ماہر فن حرب شاہ بیگ تھے۔ شاہ بیگ سنگھ لفٹیننٹ جنرل دیال کی طرح ایک جنگ ... وہ میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ میں گوریلا جنگ کے پیچھے ان ہی کا دماغ تھا مگر بدعنوانیوں کے الزامات کے پیش نظر انھیں فوج سے "چھٹی" دے دی ... وہ ایک کٹر خالصتانی ہیں (انھوں نے ایک صحافی خاتون تولین سنگھ کو اپنی موت سے کچھ قبل بتایا تھا کہ آ... جس نے ہندوستان پر سے ان کا اعتماد بالکل ختم کر دیا وہ تھا ۱۹۸۲ کے ایشیائی کھیلوں میں جاتے ہوئے راستے میں ان کی تحقیر کا واقعہ)

۴ جون کی صبح کو چار بج کر ۴۵ منٹ پر لڑائی کا آغاز ہوا۔ پہلے مقابلے میں پانچ گھنٹوں تک ... رہیں اس کے بعد سناٹا ہوا۔ ۵ جون کو انتہاپسندوں نے گولیاں چلانے میں پہل کی۔ فوج کو اب کچھ ہو چلا تھا کہ انتہاپسند کتنی اچھی طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس ہتھیاروں اور گولہ بارود کی کمی نہیں تھی۔

نے فیصلہ کیا کہ اب بڑی بندوقوں کو لا کر اس تعطل کو ختم کرنا چاہیے۔
لاتے رہے۔ سات بجے شام کو فوج
ر ۳ انچ والی توپ کی مدد سے اس مینار اور پانی کے حوض کو تباہ کیا گیا جہاں سے انتہا پسند ابھی تک بڑی
سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے۔ جوں ہی خالصتانی، افراتفری کے عالم میں پیچھے ہٹے، فوجیوں
ہی گولڈن ٹیمپل کے اندر اپنے قدم جما لیے۔ اب کام یہ رہ گیا تھا کہ مرکزی صحن کو پار کر کے اکال تخت پر قبضہ کیا
دو مسئلے تھے جنھوں نے اس کارروائی کو بڑا خطرناک بنا دیا تھا۔ پہلا مسئلہ ہر طرف سے ہونے والی لگاتار
ہوئی جان لیوا گولیوں کا تھا جن کے سامنے فوجی کے جانے کا مطلب یقینی ہوئی بیلچ کی موت مرنا تھا اور دوسرا
یہ حقیقت تھی کہ فوج کو بڑی سختی سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ کسی بھی صورت میں گولڈن ٹیمپل پر آنچ نہیں آنا چاہیے
میں بنے ہوئے ایک حوض کے بالکل بیچوں بیچ واقع تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ فوج نہ تو گولیوں
اب گولیوں سے آزادانہ دے سکتی تھی اور نہ ہی بڑی توپوں کو استعمال کر کے اپنے لیے راستہ بنا سکتی تھی۔
دستانی فوج نے جاں بازی اور بہادری کا ایک اور ثبوت دیتے ہوئے کسی طرح کی بھی حکم عدولی نہیں
اگرچہ اس احتیاط میں انھیں دو سو سے زیادہ جوانوں کی جانیں گنوانا پڑیں۔

اس کارروائی میں جرنیلوں پر یہ انکشاف ہوا کہ انتہا پسندوں کے پاس اندازے سے کہیں زیادہ ہلکی
راوسط درجے کی مشین گنیں تھیں اور انھیں نہایت ماہرانہ اور جان لیوا طریقے پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس
ت ساڑھے دس بجے، بجلی کی سپلائی بند کر کے فوج کا اصل حملہ شروع ہوا۔ انتہا پسندوں نے دو بڑے الاؤ
ئے تاکہ اس کی روشنی میں وہ فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے جنرل
یہ مدد وجینتا ٹینک لائے جن میں آنکھیں خیرہ کر دینے والی روشنیاں لگی ہوئی تھیں، ان ہی روشنیوں میں
فوجیوں اور کمانڈوز نے پیش قدمی شروع کی۔ فوجیوں کی بہت جانوں کا اتلاف ہوا وہ توپوں کی مدد کا مطالبہ کرتے رہے
دہ انھیں نہیں ملی کیوں کہ جنرل کسی حالت میں بھی گولڈن ٹیمپل کو زک نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ فوج کے ایک یونٹ
نے چار دیواری پر بنی ہوئی عمارتوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا۔ وہاں پھنسے ہوئے تقریباً چار افراد نے جن میں دو
بڑے اکالی لیڈر، سنت ہرچند سنگھ لونگوال، گرچرن سنگھ توہرا اور ہر خالصہ کی انچارج خاتون بی بی امرجیت کور بھی
تھیں، اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا اس میں ایک حیرت انگیز سپردگی آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے
نوجوان سکریٹری ہرچندر سنگھ سندھو کی تھی۔

مسلسل جنگ کے بعد، دوسری صبح تک بھی فوج اکال تخت تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

گیئں۔ انتہاپسندوں نے اس کا جواب اینٹی ٹینک راکٹوں سے دیا۔ کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بھنڈ
کے لوگوں کے پاس اس اعلیٰ معیار کے ہتھیار ہوں گے۔ آخر میں فوج ٹینکوں کو اندر لانے پر مجبور ہوگئی
ہو رہی تھی جب فوج اکال تخت میں داخل ہوئی۔ دوپہر تک وہاں کے کمرے کمرے کے لیے لڑائی
کمین گاہوں سے وقتاً فوقتاً گولیاں چلنے کا سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔ ۷ جون کی صبح کو، فوج بالآخر اکال
تہ خانے میں بھی داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں ۳۵ لاشوں (بشمول شاہ بیگ سنگھ اور امریک سنگھ
سنگھ بھنڈران والا کی لاش بھی تھی۔

پنجاب پر اچانک ایک سکوت طاری ہوگیا۔ دلی کے شاندار بنگلوں میں بیٹھے قیمتی اسکاچ
متمول شہریوں سے لے کر کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں تک، سکھ رائے عامہ کے حلقے، جو کچھ
پر ہیبت زدہ تھے یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنھوں نے علیحدگی کی مانگ کو کبھی بھی معاف نہیں کیا وہ بھی
کارروائی کا جواز ڈھونڈنے سے قاصر تھے۔ ساری دنیا کے سکھوں نے سوگ منایا۔ بھنڈران والا ایک
ایسا ہیرو بن گیا جیسا وہ زندگی میں کبھی نہیں بن پایا تھا۔ ہندو ردعمل اگر خوشی کا نہیں تو اطمینان کا تھا ایک
تک تو ایسا لگا کہ مسز گاندھی نے اپنی وہ مقبولیت بحال کر لی جو انھیں بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد ملی تھی
آہستہ دونوں طرف مزاج کچھ ٹھنڈے ہونے شروع ہوئے۔ حکومت نے اپنے تمام وسائل مجتمع کر
تخت کی تعمیر نو کی۔ اس سلسلے میں ایس جی پی سی کو نظر انداز کرنے کی ایک احمقانہ کوشش کی گئی اور گولڈ
تعمیر نو کی ذمہ داری ایک خاصے مقبول مگر کم سمجھ نہنگ لیڈر بابا سنتا سنگھ کے حوالے کر دی گئی مگر تشکر
ہی عقل آگئی اور آخر کار فوج نے گولڈن ٹمپل کو بڑے مذہبی لوگوں کے حوالے کر دیا۔ صدر ذیل سنگھ
وقت اس حکومت کے جس نے گولڈن ٹمپل پر اس حملے کا حکم دیا تھا، رسمی سربراہ ہونے کی وجہ سے
زبردست ناراضگی مول لی تھی۔ انھوں نے بڑے مذہبی رہنماؤں کے سامنے اپنی مبینہ غلطیوں کی معا
اپنے آپ کو سکھ دھرم سے باہر کیے جانے سے بچا لیا۔

پنجاب میں تشدد پسندوں کا تشدد پورے طور پر ختم نہیں ہوا اگر بہرحال اب یہ پہلے جیسے بڑے
نہیں تھا۔ اکتوبر کے آخر تک ہندوستان کو دوسرے مسائل کی پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔ مسز اندرا گاندھی
اور ان کے وقار میں آندھرا پردیش کی مضحکہ خیز ناکامی کے بعد، جہاں مرکزی حکومت کی ہدایات پر عمل
ایک جانب دار گورنر نے ایک جائز حکومت کو برطرف کر دیا تھا، بہت کمی ہوگئی تھی حکومت کے اسر

نے اپنی ناراضگی کا خاصے موثر طور پر اظہار کیا۔ جمہوریت ظاہر ہے محفوظ رہتی ہے اگر عوام سڑکوں پر نکل آنے
میں کی گولیوں کا سامنا کرنے اور ایک عوامی حکومت کی بحالی کی خاطر جان دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

انتخابات کا جوش و خروش ملک کی فضا میں محسوس ہونے لگا تھا۔ جنوری ۱۹۸۵ کے پہلے ہفتے میں ان کا
ہونا طے ہوا تھا۔ حرص و ہوس کی شکار حزب اختلاف کی پارٹیوں نے الیکشن سے پہلے کی روایتی نوچ کھسوٹ شروع
کی اور پھر اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہیں کہ ایک ملی جلی سرکار کی پیشکش کریں اور اس کے
امکان کے لیے ملک کو تیار کریں۔

اگر پنجاب کا ذکر کبھی ہوتا تھا تو صرف یہ کہ آیا وہاں انتخابات کرانا ممکن تھا یا نہیں۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ
تک وزیر داخلہ نرسمہا راؤ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پنجاب میں باقی ملک کے ساتھ
انتخابات کیوں نہیں ہونے چاہئیں۔ مسز اندرا گاندھی بہرحال کچھ بہت زیادہ پُرامید نہیں تھیں۔ ۳۰ اکتوبر کو اڑیسہ
کے اپنے دورے کے اختتام پر جو بالکل واضح طور پر ان کی انتخابی مہم کا ایک حصہ تھا ایک پریس کانفرنس کو خطاب
کرتے ہوئے مسز گاندھی نے کہا کہ انھیں ابھی بھی یقین نہیں ہے کہ سکھ انتہا پسندوں کے تشدد پر آزادانہ اور محفوظ
رائے شماری کرانے کے لیے کافی قابو حاصل کیا جا چکا ہے۔

دوسرے دن سکھ انتہا پسندوں نے وہاں گزند پہنچائی، جو نازک مقام تھے دل کے جہاں چوٹ لگنے سے
ملک بھر کو انتہائی تکلیف ہوئی۔ یہ بات عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ مسز گاندھی جب عوامی مجمعوں میں جاتی تھیں تو ایک
ضرور بلٹ پروف جیکٹ پہنا کرتی تھیں۔ دہلی میں ان کے دن کی شروعات عموماً کچھ وقت اُن عام لوگوں کے ساتھ گزا
رہوتی تھی جنھیں ان کے دفتر اور گھر کے ملے جلے احاطے میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ جگہ اکبر روڈ اور صفد
جنگ روڈ کے کنارے پر واقع ہے ظاہر ہے کہ تمام آنے والوں کی پوری طور پر تلاشی ہوتی تھی۔ آپریشن بلواسٹا
کے بعد حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیے گئے تھے۔

۳۱ اکتوبر بدھ کی صبح یہ روزانہ کا درشن ملتوی کر دیا گیا تھا۔ پچھلے رات ان کا پوتا اور ان کی پوتی ایک موٹر
سے حادثے کا شکار ہو گئے تھے اور پریشان مسز گاندھی ہنسنے اور خوش طبعی کے موڈ میں بالکل نہیں تھیں۔ روزا
درشن کے اس پروگرام کے لیے جو مزید حفاظتی انتظام ہوتا تھا اسے ترک کر دیا گیا تھا مسز گاندھی نے کچھ وقت
رہائش گاہ کے اپنے آفس میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور اسی لیے انھوں نے بلٹ پروف جیکٹ پہننا بھی ضرور
نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے احاطے سے ہوتی ہوئی دفتر کی طرف چلیں جب ہی ان کے دو حفاظتی سپاہ

نے، جو اُن کے گھر میں ان کی حفاظت کرنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے، اُس اعتماد کو ٹھوکر مار کر جو اُن پر کیا گیا تھا ایک اسٹین گن اور ایک ریوالور استعمال کرتے ہوئے اس سے پہلے کہ دوسرا حفاظتی عملہ انھیں گولی مارے، سات گولیاں ان کے جسم میں پیوست کر دیں۔

سب انسپکٹر بینت سنگھ اور کانسٹبل ستونت سنگھ نے انتقام لے لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سازش کی اس کامیابی کا مطلب انٹلی جنس سروسز کی کھلی ناکامی تھا۔ قتل کی منصوبہ بندی میں یقیناً دونوں سکھ اکیلے نہیں تھے۔ وزیرِ اعظم کے حفاظتی گارڈوں میں دونوں کا بغیر کسی شک و شبہ رہنا ان کی ذاتی صلاحیتوں کا مظہر تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ حکومت کی لاپرواہی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ مگر جس وقت یہ خبر ملک بھر میں پھیلی اس وقت لوگوں کے ذہن میں پہلا سوال یہ نہیں تھا۔ معتبر رپورٹوں کے مطابق، مسز گاندھی بہت دیر زندہ نہیں رہیں اگرچہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ان کا آپریشن بھی ہوا — سب سے اہم سوال ظاہر ہے کہ یہ تھا کہ اب وزیرِ اعظم کون ہو؟ کانگریس کے اہم لیڈر اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کے لیے بیٹھے۔ مسز گاندھی کے بیٹے، اور بظاہر وارث، راجیو گاندھی منصب کے دعوے دار تھے، اس دن وہ دلی میں نہیں تھے بلکہ مغربی بنگال کے مارکسسٹوں کے گڑھ میں الیکشن کی مہم میں مصروف تھے اور اچھے خاصے بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کر رہے تھے۔ وائرلیس پر یہ خبر سن کر ایک پولیس والا کاغذ کے ایک پرچے پر لکھا ہوا پیغام راجیو گاندھی کے پاس لے گیا جو اس وقت دیہی بنگال کے کولاگھاٹ کے مقام پر تھے۔ پرچے پر لکھا تھا مسز گاندھی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ راجیو گاندھی کو فوراً دلی واپس آنا چاہیے۔

ان کے بیٹے کو یقیناً بدترین شبہات ہوئے ہوں گے مگر انھوں نے خبر دل کو بڑے سکون اور ضبط کے ساتھ سنا۔ وہ ایک خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعہ واپس آئے۔ ان کے نام پر اگر کوئی اختلاف یا اعتراض ہو سکتا تھا تو وہ تھا صرف ان کے ناتجربہ کار ہونے کا۔ ۱۹۸۰ میں جب ان کے چھوٹے بھائی سنجے ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوئے اس وقت تک راجیو گاندھی نے سیاسی قوت کی موہنی آوازسے اپنی دلچسپی کا کم ہی اظہار کیا تھا وہ ایک ائر لائن پائلٹ کی حیثیت سے اتنا کمانے پر قانع تھے جس سے ایک نسبتاً آرام دہ زندگی گزر جائے۔ یہ صرف ۱۹۸۰ کے بعد ہوا کہ اس سلسلے کی ان کی تربیت شروع ہوئی وہ صرف چالیس برس کے تھے۔ کیا ستر کروڑ آبادی والے اس ملک کے وزیرِ اعظم کی ذمہ داریاں ان کو دی جا سکتی تھیں؟

یہ بحث چل رہی تھی اور حکومت ہند کے سرکاری ذرائع ترسیل یہ افسانہ سنائے جا رہے تھے کہ مسز گاندھی زندہ ہیں اور اسپتال میں موت اور زیست کا مقابلہ جاری ہے، خبر رساں ایجنسیوں نے یہ خبر دے دی تھی کہ ان کا

ے اخباروں نے خصوصی ایڈیشن نکالے۔ امریکہ کے رونالڈ ریگن نے، وزیراعظم کے انتقال کے سرکاری
ن سے پورے چار گھنٹے قبل اپنا تعزیتی پیغام بھیج دیا تھا۔ ہندوستان اس دن، پڑوسی ملک پاکستان میں
ں کا کرکٹ میچ کھیل رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے کچھ دیر بعد ہندوستانی ٹیم کے منیجر ڈنگرپور کے
سنگھ نے آبدیدہ ہوتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی ٹیم اپنا کھیل جاری نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کی وزیراعظم کا
ل ہو گیا ہے گرچہ جہاں تک آل انڈیا ریڈیو کا تعلق ہے اس کے لیے مسز گاندھی اب بھی زندہ تھیں، بہرحال شام
ے لیا گیا کہ مسز اندرا گاندھی کا انتقال ہو گیا ہے اور راجیو گاندھی اب وزیراعظم ہوں گے۔

مال اہم لیڈروں کے سامنے انتخاب کا کوئی موقع نہیں تھا اس افسوس ناک خبر سے لگنے والے دھکے کے
اکم ہوئے تو سارے ملک نے غم و غصہ اور شکست و ریخت کا وہ مظاہرہ کیا کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے
زراف کی شاہ سرخی غالباً صورت حال کو بڑے جامع انداز میں پیش کرتی ہے۔ "مسز گاندھی کو گولی مار دی
زخمی"۔ ایک عورت کی موت کے غم میں غصے سے بھرے ہوئے عوام کی شہروں کو بند کرانے کی
ے کے ہر حصے سے آرہی تھیں۔ یہ موت ایک ایسی عورت کی تھی جو بلاشبہ ایک شہید کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔
تھا کہ اسے دیوی کا مرتبہ بھی مل جائے گا۔ عوام کے اس غم و غصے نے بتدریج ایک خطرناک شکل اختیار
ع کر دی اور سکھوں کے خلاف تشدد میں تبدیل ہو گیا۔

جس دن مسز گاندھی کا انتقال ہوا اس دن تشدد نسبتاً دبا دبا سا تھا۔ مگر دوسرے دن، مسز گاندھی کے مرنے
ہر میں سکھوں کی خوشیاں منانے کی خبریں آنے لگیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں ٹیلی ویژن کے کیمروں کے سامنے
ی بوتلوں کے کاگ اڑائے گئے۔ خود امرت سر میں، لوگوں نے سکھوں کو مٹھائی بانٹتے ہوئے دیکھا (جس
ن ٹمپل میں فوجی کارروائی پر کچھ ہندوؤں نے مٹھائی تقسیم کی تھی) سکھوں کے اعلیٰ مذہبی رہنماؤں نے بھی
ں کی تحقیر میں اس طرح اعانت کی کہ انھوں نے پہلے تو قاتلوں کی مذمت کی اور بعد میں اس مذمت کو واپس
یا۔

سکھ جنھوں نے مسز گاندھی کی موت کی توصیف کی وہ اپنے وجود سے متعلق ایک سیدھی سادی اور پرانی
ت کو بھول گئے تھے۔

ان کی تعداد کافی نہیں تھی اور اس میں بھی ان کی ایک چھوٹی سی تعداد، تقریباً پانچواں حصہ پنجاب سے باہر
تھا۔ یہ جس فی صدی سکھ شمالی ہندوستان کے شہروں میں بکھرے ہوئے تھے، دہلی میں خصوصاً اس کے

علاوہ پٹنہ، کلکتہ، بھوپال، کان پور، دہرادون اور بنجانے کتنے دوسرے مقامات پر۔

اس پر مزید یہ کہ وہ خوش حال تھے ان کی دوکانیں تھیں ان کے پاس کاریں تھیں جو چیز سکھوں سے کی شکل میں شروع ہوئی وہ آخر میں کسی اور چیز میں تبدیل ہوگئی۔ شہری علاقوں کے مفلس اور غریب لوگو پر انکشاف ہوا کہ حملہ کرنے اور لوٹنے کی ان کو اجازت مل گئی ہے۔

لوٹ کا ذائقہ منہ کو لگا تو انھوں نے خون کی تلاش شروع کی ساری دلی پر ایک ہوا امیہ گیا۔ نو جد پہلی دفعہ سکھ اس ہیبت ناک اور ناقابل یقین فرقہ وارانہ تشدد کا نشانہ بنے جو اس ملک نے ۱۹۴۷ء تھا سکھوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نذر آتش کیا گیا۔ بچے مارے گئے، دوکانیں لوٹی گئیں، کاروں کو گئی۔ بازار تباہ کیے گئے۔ مکانات جلا کر راکھ کیے گئے۔ ٹرینیں روکی گئیں۔ اس میں سفر کرنے وا نیچے اتار لیے گئے اور تالیاں بجاتے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے پاگل بلوائیوں نے انھیں موت کے

عوام الناس نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پولیس تماشائی تھی، بلکہ حقیقت تو یہ سارے پاگل پن میں ملوث۔ مشرقی دہلی میں قتل عام ہوا۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر ٹرینیں آتی رہیں نہیں، ہیبت ناک کہانیاں لا رہی تھیں۔ یہاں ایک بار ۱۹۴۷ء دہرایا جا رہا تھا۔ وہی سلسلہ وہی ایک اقلیتی فرقے کے مذہبی رہنماؤں کی برسہا برس کی اشتعال انگیزی، ابتدا میں خود اپنوں کا بحران میں بتدریج اضافہ، ایک سہمی ہوئی پریشان اکثریت، صبر و ضبط کی آزمائش اور پھر اچانک واقعہ جس نے اکثریتی فاشزم کو بھڑکا دیا۔ ۱۹۸۴ء اور ۱۹۴۷ء میں ایک فرق اگر تھا تو وہ یہ تھا ہندوستان انگریزوں کے ماتحت نہیں تھا۔ یہاں کوئی تیسرا فریق نہیں تھا جو داد دیتا۔

خالصتان، پاکستان کی طرح آسانی سے حاصل ہونے والا نہیں ہے مگر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ نے، خالصتان کے لیے کی جانے والی دوسری جنگ کا پہلا معرکہ دیکھا۔ پہلا معرکہ جرنیل سنگھ بھنڈرا اندرا گاندھی کے درمیان ہوا تھا۔ ۳۱ اکتوبر کو یہ تنازعہ اگلی نسل کے سپرد کر دیا گیا۔

پنجاب کی تاریخ کا ایک اور باب اپنے اختتام کو پہنچا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کہانی اب کیا رخ ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات بنیادی طور پر تبدیل ہو چکے تھے۔ اخوت اور بھائی چارہ سکھ [illegible] اور خصوصاً نفسیاتی طور پر ہندوستان میں ایک اقلیت ہو چکے تھے

۱۹۶۵ء، ۱۹۶۲ء [illegible]

ئوں میں ، سکھوں کو ہندوستان کے جاں باز محافظوں کا درجہ دے دیا تھا۔ ایسی علامتی مہربانیوں سے زیادہ
ی اور چیز کی ضرورت ہوگی ۔ کیا ایک مرا ہوا بھنڈران والا ، زندہ بھنڈران والا کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور
ور موثر ہوگا ؟ اکالیوں کے اغلب حلقوں نے ابھی تک ہمیشہ علیحدگی پسندی کو مسترد کرنے میں عقل مندی
مجھی ۔ کیا اب وہ بدل جائیں گے ؟ یا سکھوں کی بڑی اکثریت جنرل دیال کی طرح اس بات کو قبول کرے گی کہ
ان مذہبی طاقتوں کے ساتھ ، جو تشدد اور علیحدگی کی ہمت افزائی کرتی ہیں ، اسی طرح کا سلوک ہونا چاہیے ؟
یا سکھ عوام کے لیے جمہوریت اور سیکولرزم کی توانا دل فریبی بدستور رہے گی ؟ کیا وہ اقدار ، جنھوں نے اس
اتو کھے ملک کو جنم دیا ہے ، انسانی المیے کے بوجھ کو انگیز کرنے کے لیے کافی توانا ثابت ہوں گی ؟ سوالات مختصر
ہیں مگر جوابات طویل ۔

تیسرا حصّہ

کشمیر

(۱)

جنّت میں جمہُوریّت

اس دنیا میں، سیاحوں کے لیے شائع ہونے والے کتابچوں میں جنت جیسی خوبصورتی کیلئے بہت سے اشتہارات
ہیں۔ اس دعوے کی تکمیل کرنے والی ایک ممتاز جگہ، عظیم ہمالیہ کے مغرب میں خوب صورت جھیلوں سے
ایک وادی ہے۔ وادیٔ کشمیر۔ سطح سمندر سے پانچ ہزار فیٹ بلند، ہندستان کے سرِ تاج کی طرح کشمیر کی گھاٹی ہے
کے چار طرف پہاڑوں کے سلسلے ہیں، ہمالیہ، شمالی کشمیر کے پہاڑی سلسلے اور جنوب میں پیر پنجال۔ اگرچہ
بہ کل علاقہ بہت بڑا ہے مگر آبادی زیادہ تر وادی ہی میں مرکوز ہے۔ اور آبادی کا تقریباً نوّے فی صد حصّہ
الوں پر مشتمل ہے اس حسین پرستان کے بارے میں نہ جانے کتنا شعر و ادب ہے اگرچہ اس میں اچھا خاصہ
نہ لفظی اور عبارت آرائی کا بھی ملتا ہے۔ اس ادبی سرمایے میں، ممتاز کشمیری جواہر لال نہرو کی ایک انتہائی
انگیز تحریر بھی ہے جو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ "ایک
ا انتہائی حسین و جمیل صورت کی طرح، جس کا حسن بڑا غیر شخصی اور انسانی خواہشات سے ماورا ہو، کچھ
ا نسوانی حسن تھا کشمیر کے دریاؤں، اس کی وادیوں، اس کی جھیلوں اور اس کے درختوں کا اور پھر اسکی
ا مردانہ خوب صورتی کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے، مردانہ حُسن کا ایک پہلو، سخت پہاڑوں اور سنگین چٹانوں کا
پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں اور گلیشیروں کا اور پہاڑوں کی بلندیوں سے وادی میں گرنے والے جھرنوں
ا۔ جو حسین بھی ہیں اور ہیبت ناک بھی اس کشمیر کے سینکڑوں چہرے ہیں اور لا تعداد پہلو۔ ہر آن بدلتے ہوئے
سی مسکراتے ہوئے، کبھی افسردہ، کبھی غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے۔ . . . یہ اس محبوب کے چہرے
کی طرح تھا جو خواب میں نظر آتا ہے اور آنکھ کھلتے ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔"

ایک زمانے میں، دشوار گزار پہاڑی درّے واحد راستے تھے اس وادی میں آنے اور یہاں سے

جانے کے۔ اس کی اس تنہائی اور یکسوئی نے بہرحال اسے فاتح کی عظیم سلطنتوں کی دست برس سے باہر نہیں میں دولی شمال میں وسط ایشیائی حکومتیں، مغرب میں افغان اور مشرق میں تبتی اور چینی۔ مگر پہاڑ اچھے تھے اور وفادار محافظ۔ جب تاتاریوں کے سلسلے کے ایک ہیبت ناک شخص زلفی خاں جو دلچو کے نام جانا جاتا تھا، چودھویں صدی کے اوائل میں اپنے گھوڑ سواروں کی معیت میں آیا تو اس نے سری نگر کو نذر بے حساب مالِ غنیمت اور پانچ ہزار غلام (کہانی یہی ہے) اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر یہ سب کس کے لیے میں درۂ دیواسار کے مقام پر ایک برفانی طوفان میں اپنی پیدل فوج کے ساتھ تلف ہو جانے کے لیے

۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مقدر، پیر پنجال کے جنوبی سلسلے کے پار کے صوبے جموں کے ساتھ منسلک جموں کے ڈوگرا راجہ نے پچھتر لاکھ روپوں میں، کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا یہ کوئی سودا نہیں بلکہ سکھوں کے خلاف انگریزوں کی لڑائی میں ڈوگروں کی خدمات کا صلہ زیادہ تھا۔ جموں و کشمیر کی سلطنت (اکتوبر ۱۹۴۷ء) تک ڈوگروں کے ہاتھوں میں رہی۔ سری نگر کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی، اور جموں موسم سرما کا دارالخلافہ بنا۔ ڈوگروں نے بانہال کارٹ روڈ اور جہلم ویلی روڈ بنا کر وادی کے دروازے کھ

جموں میں، جنوب کی طرف ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر بحیثیت مجموعی، سلطنت کے مسلمان تعداد کے ہندوؤں کے مقابلے میں تین اور ایک کی نسبت سے زیادہ تھے۔ اسی لیے تقسیم کی منطق کے ہر پہلو کشمیر کو پاکستان میں، جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وجود میں آیا تھا، جانا چاہیے تھا۔ مگر کشمیر پاکستان گیا۔ جناح صاحب نے اپنے بس بھر جتن کر لیے۔ پہلے تو انھوں نے ہندو مہاراجہ اور مسلمانوں کے عوا کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، اس میں وہ ناکام رہے۔ تب انھوں نے آزادی ملنے کے تین ہفتوں اندر حملہ آور اور اس کے بعد پاکستانی فوجی دستے بھیجے کہ وہ طاقت کے بل پر کشمیر پر قبضہ کر لیں۔ ایک ایسا بھی آیا کہ ان لوگوں نے سری نگر پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا مگر پھر انھیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان تصرف میں مغرب میں وادی کا ایک چھوٹا سا حصہ اور شمال میں، افغانستان اور چین کی سرحدوں پر ایک و بنجر علاقہ رہ گیا۔ اس وقت کشمیر منقسم ہے اور حدِ فاصل وہ لائن ہے جس پر ۱۹۴۸ء کے آخری دن پہلی جنگ میں، جنگ بندی کے وقت فوجیں کھڑی تھیں۔ کشمیریوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں رہتی ہے ان کا دارالخلافہ ہے۔ پاکستان کے مقبوضہ کشمیر پر مظفر آباد کے شہر سے ایک حکومت حکمرانی کرتی ہے او علاقے کو آزاد کشمیر کا نام دیتی ہے۔

دو آدمیوں نے کشمیر کو ہندوستان میں رکھا۔ دو کشمیری برہمن خاندانوں کے اخلاف۔ ان میں سے ایک طاہر ہے کہ جواہر لال نہرو تھے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے اپنی آخری سانس تک یعنی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک ہندوستان کے وزیر اعظم رہے تھے۔ دوسرے فرد تھے شیخ عبداللہ جن کے خاندان نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں برہمن ازم کو چھوڑ اسلام قبول کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے جنھیں پیار سے لوگ "بابائے قوم" یا "شیر کشمیر" کہتے تھے اپنے عوام کو ایسی قیادی اور رایگانی نظریہ دیا جس نے انھیں ایک غلام ماضی کے بوجھ سے نجات دلائی اور صدیوں بعد پہلی دفعہ اس زمین کو آس دلائی۔ وہ اپنے مشن کو بیان کرنے کے لیے اپنے پسندیدہ شاعر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے" ایک کامیابی، جسے سمجھنے میں ایک ہی چشمے سے دیکھنے کی وجہ سے، دنیا کو آج بھی دشواری ہوتی ہے یہ تھی کہ شیخ عبداللہ اور کشمیری، ۱۹۴۷ء میں پاکستان جانے کے بجائے ہندوستان میں ٹھہرے۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ بار بار کہا کرتے تھے کہ جناح صاحب کے ساتھ وہ ایک مشترکہ مذہب رکھتے ہیں، اور نہرو کے ساتھ ایک مشترکہ خواب۔

یہ دو خاندان، نہرو کا خاندان اور شیخ عبداللہ کا خاندان جس طرح ہندوستان اور کشمیر کی سیاست پر حاوی رہے ہیں اس کی شاید نظیر نہیں مل سکتی۔ دونوں خاندان بہترین ذاتی دوست تھے اور بدترین سیاسی دشمن۔ جب انھوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا، امن تھا۔ جب دونوں لڑے تو سری نگر پھٹ پڑا۔ دونوں نے ہندوستانی قومیت سیکولرزم اور جمہوریت سے زبردست تعلق اور وفاداری کا مظاہرہ کیا اور دونوں جب، ان تعصبات اور کمزوریوں کا شکار ہوئے جنھیں اگر تعدیل قوت کی منطق کی روشنی میں دیکھیے تو انھوں نے سارے ملک کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ کشمیر کو ہندوستان میں رہنا ہے کیوں کہ یہی وہ محل ہے جہاں انسانیت، جمہوریت اور اخوت کے نظریات کی، انتہائی مشکل حالات میں آزمایش کی جا سکے گی۔ اگر مسلم کشمیر، ایک سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان میں پل بڑھ سکتا ہے تو اس سے بہتر جواز اس نظریے کے خلاف نہیں پیش کیا جا سکتا جس نے ملک کو تقسیم کرایا اور پاکستان بنوایا۔

جناح صاحب نے تقسیم سے پہلے شیخ عبداللہ کی طرف سے بار ہا دھتکارے جانے کے باوجود کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق میں کوئی دشواری بھی ہو سکتی ہے کیونکہ بہر حال انگریز ہندوستان کی تقسیم کی ضمانت کلی طور پر مذہب کی بنیاد پر لے رہا تھا۔ کشمیر میں چوں کہ مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی لہٰذا وہ پاکستان کا حصہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو پاکستان سے الحاق کرنے پر مجبور کر رہے تھے

اپنی بس بھر کوشش کی ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ، مستحکم عزم وارادے کے مالک، سردار پٹیل بھی کشمیر پاکستان
کو دینے پر پورے طور پر راضی تھے۔ اس معاملے میں کسی جغرافیائی خلط ملط کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ کشمیر صرف یہی نہیں
کہ نئے ملک کے ساتھ مشترکہ سرحد رکھتا تھا بلکہ اس کی بہت سی ضروری سپلائی اور خدمات کا انحصار ان علاقوں
تھا جو پاکستان میں جانے والے تھے۔ اس بظاہر منطقی منظر نامے میں صرف ایک رکاوٹ تھی۔

کشمیری پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے، انھوں نے دو قومی نظریے پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا
تک کہ اس وقت بھی، جس بیسویں صدی کی غیر معمولی چوتھی دہائی میں، کشمیر کی سرحدوں پر، پنجاب میں اور شمالی
سرحدی صوبے میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو ذبح کر رہے تھے۔ کشمیر کی وادی میں متعصبانہ قتل کا ایک
واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، کشمیری مسلمانوں نے ان پاکستانیوں کے خلاف لڑ کر اپنی جانیں دیں جو کشمیر
میں اپنے مسلمان بھائیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے "جہاد" میں اپنے فوجیوں اور اپنے لیڈروں کو
کشمیر میں بھیج رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ کو جب پناہ گزینوں کے کیمپس بھرے
ہوئے تھے اور دل خالی تھے، دہلی میں مسلمانوں کے ایک مجمعے کو خطاب کرتے ہوئے کسی حد تک فخر کے ساتھ کہا تھا

" میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری یا مولانا آزاد کی پیروی کریں، مگر میں آپ سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ آپ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں کی ضرور پیروی کریں جو تیرہ سو سال قبل انھوں نے دی تھیں۔ رسولِ مقبول صرف مسلمانوں
کے نہیں تمام نوع انسانی کے محسن تھے ...... آپ دو قومی نظریے اور اپنے بعض لیڈروں کی پھیلائی ہوئی نفرت
کے شکار ہو گئے ہیں۔ ہم کشمیر کے لوگوں نے اس کا اثر نہیں لیا اور اس سے مدافعت کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم
سکون کی فضا میں رہ رہے ہیں اور آپ اور آپ کے ہزاروں بھائی ناقابلِ بیان مصائب سے گزر رہے ہیں۔
آپ کو میری نصیحت ہے امن و شانتی کے ساتھ رہیے اور پروپگنڈے سے گمراہ نہ ہوجیے۔"

شیخ عبداللہ ایک مشترکہ بصیرت کی بنا پر نہرو اور گاندھی کے ساتھ رہے مگر اس وقت کیا ہوگا اگر دہلی
یہ مشترکہ بصیرت بدل جائے؟ اس وقت کیا ہوگا جب قوم پرستی اور جمہوریت کمزور ہونا شروع ہو جائے اور ر
پسند مذہبی قوتیں اپنا زور دکھانے لگیں، اور اس وقت کیا ہوگا جب ملک کا دستور خود اس کے محافظوں کے ہاتھوں
ہونے لگے۔ انڈین یونین کی اساس ایک مخصوص نظریے پر رکھی گئی تھی جو فرد کو اس کی آزادی بھی ودیعت کرتی ہے
مہاتما گاندھی کے سماجی فلسفے سے ایک مشترکہ وفاداری کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسی لیے یونین کی بقا ان ہی اقدار
تحفظ اور استحکام پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو خطرات

یں اتنے ہی داخلی بھی ہیں۔ دہلی میں برسراقتدار لوگ اگر کسی بہانے کا سہارا لے کر کبھی اس بنیادی نقطے سے
گئے، تو یہ اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا کہ پاکستانی فوج تھوڑی سی زمین پر قبضہ کر کے اسے دہلی کے اثر
زاد قرار دے دے۔

شیخ عبداللہ نے آزادی کے بعد صرف چھ سال کشمیر میں حکومت کی۔ ۱۹۵۳ میں انھیں جیل بھیج دیا گیا
د دہلی میں ان کا بہترین دوست وزیر اعظم تھا۔ شیخ عبداللہ جو اب بھی اس مقصد کے وفادار رہتے، پھر واپس
، اور اپنی زندگی کے آخری سات برسوں میں کشمیر کی عنان حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۸۲ء میں
، ان کا انتقال ہوا تو ان کے جسدِ خاکی پر ہندوستان کا پرچم لپیٹا گیا تھا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ان کی جگہ لی —— اور ۱۹۸۳ کے انتخابات میں زبردست
بابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انھیں ورثے میں صرف عقیدہ ہی نہیں ووٹ بھی ملے ہیں۔ جولائی
۱۹۔ میں وہ متعدد ایسے فیصلوں کی بنا پر حکومت سے ہٹا دیے گئے جنھوں نے اگرچہ جمہوریت کی روح
بال کر دیا مگر انھیں نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کی منظوری حاصل رہی۔ ۱۹۵۳ کی طرح اس دفعہ بھی کشمیری عوام
تجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ کیا کچھ تبدیل نہیں ہوا تھا؟ یا انسانی اطوار کی
روں کے باوجود، یہ توقع باقی بچی کہ وہ خواب جو ۱۹۴۷ میں دیکھا گیا تھا کسی دن صحیح ثابت ہوگا؟

۲

راجہ اور کسان

ہندو عقیدہ، حسب توقع کشمیر کے وجود میں آنے کے عمل کی بڑی نفیس اور خوب صورت تصویر فراہ
وادی ایک خوب صورت جھیل تھی ۔ ستی سر، جس میں ناگا، جنھیں سانپ والا کہا جاتا تھا، بستے تھے۔ ان پر جالادیو
کا سایہ تھا۔ اس ہیبت سے جب ناگا تنگ آ گئے تو مجبور ہو کر اپنے سرپرست نیلا ناگا کی خدمت میں
ہوئے ۔ نیلا ناگا نے اپنے باپ برگزیدہ کشیپ (جو دُنیا کے خالق، برھما کے دماغ سے پیدا ہوئے
حضور میں درخواست کی۔ کشیپ ناگاؤں کی نجات کے لیے طویل مراقبے میں گئے۔ دیوتاؤں کو رحم آیا۔ لارڈ شِ
پر خاکستر ملے، لنگوٹ باندھے، کیلاش کی چوٹی پر اپنے استھان سے نیچے آئے اور اپنے زبردست ترشول کو
ایک طرف پھینک دیا۔ پہاڑ میں ایک سوراخ بن گیا اور جھیل کا پانی باہر نکلنے لگا یہاں تک کر زمین سوکھ گئی
کی ساتھی لکشمی نے ایک مینا کا روپ دھارا اور بڑی بلندی سے دیو کے اوپر ایک کنکر گرا دی، دیو اپنے
پوست میں جم کر رہ گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک پہاڑی کے برابر ہو گیا۔ یہ پہاڑی آج ہری پربت کہلا
جاتی ہے ۔ ہری پربت کی چوٹی پر شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے اور ڈھال پر ہندوؤں، مسلمانو
سکھوں کے متبرک مقامات بکھرے ہوئے ہیں ۔

اس برگزیدہ ہستی سے عقیدت اور احسان مندی کے اظہار کے طور پر یہ جگہ کشیپ امر کہلا
جاتی تھی ۔ یہی نام ہے جو بگڑتے بگڑتے کشمیر ہو گیا۔ کشیپ نے جنوب کے میدانوں سے اس وادی میں
لیے لوگوں کو مدعو کیا۔ سائنس اس ساری کہانی کی وضاحت شاید زیادہ آسانی سے کر سکتی ہے ۔ ایک بڑ
جھیل، ایک زلزلہ جس سے پہاڑوں میں شگاف پڑا اور ارضیاتی دھماکا ہوا جس نے زمین سے ایک پہا
دی وغیرہ وغیرہ ۔ بہر حال دیومالا نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ لوگ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ کشمیر

ت بنا مرکز تھا، اس کا جو محل وقوع ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف نظریات وخیالات
بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر آج کشمیر ایک آزاد ملک ہوتا تو جنوب میں ہندوستان، مشرق میں چین،
ب میں افغانستان اور جنوب مغرب میں پاکستان کے ساتھ اس کی مشترک سرحدیں ہوتیں۔ روس بھی بہت
فاصلے پر ہوتا بہرحال کشمیر جو بھی اس کا ہمسر ہوتا اپنے جغرافیائی وسیاسی اعتبار سے اس کا پشت پناہ ہوتا۔
، جس نے ایسا کیا وہ کوئی دوسرا نہیں اشوک اعظم تھا۔ یہ شخص جس نے بدھ ازم کو ایک بین الاقوامی مذہب
بنایا اسی نے دارالخلافہ سری نگر کی تعمیر کی۔

کشمیری ہمیشہ مفلس رہے ہیں۔ زراعت میں کچھ بہت دولت ہوتی بھی نہیں ہے۔ کشمیر کی سب سے زیادہ
ب اور روزی فراہم کرنے والی صنعت اس کے ان صناعوں اور دستکاروں کی روایتی مہارتوں کی مرہون
ہے جو اپنے ہاتھوں سے بُنائی اور کشیدہ کاری کے نفیس نمونے تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی
ء دستکار کی نہیں، حاکم اور تاجر کی جیبوں میں جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نپولین نے جوزفین کے لیے ایک
ال بھیجی تھی۔ شال پیرس میں کچھ اس طرح مقبول ہوئی کہ اعلیٰ فیشن ایبل حلقوں میں اس کی مانگ کہیں سے
گئی اور تاجروں کے منافع بھی۔ ایسے بازاروں اور ایسی منڈیوں کے باوجود کشمیری غریب رہا۔ اس
ے اوائل میں، مفلسی غیر معمولی سطح تک پہنچ گئی۔ نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (۱۹۳۶ء میں
ئی) میں لکھا ہے "باقی ہندوستان کے مقابلے میں کشمیر زیادہ تضادات کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین
لی حسن اور فطرت کے دیئے ہوئے حسین ترین تحائف سے بھری پڑی ہے، انتہائی غریب
دور دورہ رہا ہے اور معمولی گزربسر کے لیے بھی انسانیت کو مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کشمیر کی عورتیں
یکھنے میں خوب صورت اور بات کرنے میں اچھے لگتے ہیں، وہ ذہین ہیں اور چابک دست۔ ان کے
ے کے لیے ایک حسین وجمیل ملک ہے۔ پھر وہ آخر اتنے مفلس کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب جاگیردارا
ہے، اور اُس ظلم وستم میں ہے جو عام کشمیریوں کا مقدر رہا ہے۔

اس سرزمین کا، جس کے مناظر جتنے ہی سکون بخش تھے اس کی سیاست اتنی ہی ہنگامہ خیز۔ سب سے
خ کلہانا ہے جس نے اپنی کتاب راج ترنگی بارھویں صدی عیسوی میں لکھی۔ کلہانا نے اپنے عوام کا تذکرہ
ہے۔ "کشمیر کو روحانی قوتوں سے تو جیتا جا سکتا ہے مگر سپاہیوں کی طاقت کے بل پر اسے شکست نہیں
[illegible]

کشمیریوں کو مفتوح بنایا۔ اس کے زوال پذیر ہونے کے بعد ہی ہندو عقاید پھر پنپے۔

بارھویں صدی عیسوی میں، یہ محمود غزنوی کی فوجیں تھیں جنھوں نے کشمیر کو اسلام کی پہلی جھلک دکھائی۔ مگر اسلام خود صوفی بزرگ بلبل شاہ کے ساتھ آیا جن کا سب سے ممتاز نومسلم پیرو ایک تبتی شہزادہ رنچنا تھا جو کہ ہندو راجہ سُہادیوا (۲۰-۱۳۰۱ء) کے دربار میں پناہ کے لیے آیا تھا۔ ۱۳۲۰ء میں چنگیز خاں کے اسلاف میں سے ایک زلفی خاں نے (جو ڈُلچو کہلاتا تھا) مشہور و معروف تاتاری انداز میں کشمیر کو لوٹا۔ سُہادیوا بجائے دفاع کرنے کے بھاگ گیا۔ جب ڈُلچو کی لائی ہوئی تباہی کا غبار کچھ بیٹھا تو رنچنا نے پھر تخت پر قبضہ کر لیا۔ وہ اب مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے صدر الدین نام اختیار کیا تھا۔ اس کے سریر حکومت پر بیٹھنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ——— مسلمان بادشاہوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی ابتدا ۱۳۴۳ء میں شاہ میر سے ہوئی۔ ان لوگوں نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ان میں عظیم ترین تھا زین العابدین۔ آج بھی ان کے نام سے کشمیر میں لاتعداد مقامات ہیں زیناکدل، زیناپور، زیناگیر اور زیناڈب وغیرہ۔ ۱۵۸۵ء میں کشمیر مغل شہنشاہ اکبر کے قبضے میں آیا۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر کو اگر کہیں اور نہیں تو کم از کم کشمیر میں آج بھی شالیمار اور چشمۂ شاہی نسیم باغ اور ویری ناگ کے خوبصورت باغات تعمیر کرانے کے سلسلے میں یاد کیا جاتا ہے۔ جہانگیر بستر مرگ پر تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ کشمیر میں مرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کو چھوڑ کر مغل عہد کو خوش آمدید کہنے کا ہندوؤں کے پاس سبب تھا کیوں کہ ان لوگوں نے جزیے جیسے تعزیری ٹیکس ترک کر دیئے تھے۔ ۱۷۵۲ء میں، احمد شاہ دُرّانی کی زیر قیادت از سر نو بیدار ہونے والے افغان آئے اور مقامی کمانڈروں کی غیر یقینی وفاداری کے پیشِ نظر کشمیر کی سرزمین کو مصیبت زدہ کر دیا۔ مگر عہد جدید کا آغاز، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی سلطنت میں کشمیر کے ادغام اور سکیاولی کے ذہین و طباع چیلے گلاب سنگھ کے عروج سے ہوتا ہے۔ اس وقت تک کشمیر کی نوّے فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ صرف کشمیری پنڈت اپنے صبر، مکر و فریب، انتظامی صلاحیت اور اپنے غرور کے ساتھ وادی کشمیر میں رہتے تھے۔ سلطنت کے دوسرے ہندو جموں کے میدانوں میں تھے جس پر بارھویں صدی میں ان پر محمود غزنوی کی لائی ہوئی آفت سے پہلے راجپوتوں کا تسلط تھا۔ انھوں نے دوبارہ اپنے آپ کو صرف مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد بحال کیا۔

[illegible]

ہے کہ نوعِ انسانی کا سب سے پہلا راجہ مانو سوایمبھو تھا، جو دُنیا کو پیدا کرنے والے دیوتا، برہما کا بیٹا تھا۔ مانو مرد بھی تھا اور عورت بھی۔ مانو کے نو لڑکوں میں سب سے بڑا بھی ایک مخنث تھا اور اسی لیے دو ناموں سے ایک مردانے نام اور ایک زنانے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسی سے دو حکمران فرقے وجود میں آئے۔ ایک سوریہ ونشی اور ایک چندر ونشی۔ گلاب سنگھ کے خاندان کے ڈوگرہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سوریہ ونشی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان کی حکمرانی کا قصہ بہت پُرانا ہو چکا ہے۔

گلاب سنگھ ڈوگرا نے ۱۸۰۹ء میں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ فوج میں تین روپیہ ماہانہ کے معاوضے پر ایک ٹروپر کی حیثیت سے شرکت کی۔ گلاب سنگھ کی پیدائش ۱۷۹۲ء میں ہوئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا مگر شہسواری اور فنِ حرب سے خوب واقف تھا۔ ۱۸۱۹ کے ملتان کے محاصرے میں اس کی بہادری نے اسے بہت سے انعام و اکرام دلوائے۔ دوسرے سال، رنجیت سنگھ نے جموّں اسے جاگیر کے طور پر دے دیا اور ۱۸۲۲ء میں راجہ کے موروثی لقب سے بھی نوازا۔ شرط یہ تھی کہ "راجہ پہلے کی طرح اب بھی ریاست کے وفادار رہیں گے، اور ہماری اولادوں کا بھی عزت اور اطاعت گزاری کے ساتھ سواگت کریں گے۔" گلاب سنگھ بہرحال اولادوں کے ساتھ کسی احترام اور کسی اطاعت گزاری دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے گفت و شنید شروع کی جو اس سلطنت میں جس سے انھیں حسد تھا اور جس پر وہ قبضہ کرنا چاہتے تھے، ایک ایجنٹ کی تلاش میں تھے۔

گلاب سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ پہلی اہم رعایت یہ کی کہ ۱۸۴۱ء میں پہلی افغان جنگ کے لیے ان کی فوجوں کو جموّں سے گزرنے کی اجازت دے دی (جب کہ سکھوں نے انگریزوں کو محفوظ راستے کی ضمانت نہیں دی تھی) انگریزوں نے ۱۸۴۲ء میں درّہ خیبر میں شکست کھائی مگر وہ گلاب سنگھ کی امداد کے لیے اس کے احسانمند تھے چنانچہ انھوں نے اسے شکریے کا ایک خط بھیجا۔ ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء کو، انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ میں، جسے انگریز "ہندوستان کی واٹرلو" کہتے تھے، سب سے اہم لمحہ سوبراؤن کی فیصلہ کن لڑائی میں آیا۔ لاہور دربار کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے گلاب سنگھ کو سکھوں کے شانہ بشانہ لڑنا چاہیے تھا اس کے برعکس وہ ایک ایسی لڑائی میں الگ رہا جس میں سکھ فتح حاصل کرتے کرتے رہ گئے۔ ۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے ایک خط میں، گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے لارڈ ایلن برو کو بتایا کہ اس غداری کا باقاعدہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔

بس اور اس کی حیثیت پر پوری طرح غور ہوگا اس کا یہ رویہ ایک طے شدہ پالیسی کے مطابق تھا۔"

یہ کھیل ۱۸۴۵ء میں اس وقت شروع ہوا تھا جب گلاب سنگھ کے ایجنٹ شیودت نے لاہور میں انگریزوں کے نمائندے میجر براڈفوٹ کو بتایا تھا کہ وہ پہاڑوں پر سے "چالیس ہزار سپاہی جمع کر کے سکھوں پر حملہ کر سکتا ہے"۔ فروری ۱۸۴۶ء میں، ایک بنگالی فزیشین نے گلاب سنگھ کا ایک خط لفٹیننٹ ای۔ لیک (گورنر جنرل کے اسسٹنٹ ایجنٹ) کو دیا تھا جس میں کہا گیا تھا " وہ جو فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی آرزو دل میں رکھتا ہے اسے علی الصباح سفر شروع کر دینا چاہیے۔ اگر وہ دیر کر دیتا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کے دل کی مراد پوری ہو رات جاتی ہے۔" گلاب سنگھ نے یقیناً اپنا سفر علی الصباح شروع کیا تھا اور اس کے دل کی مراد ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو اس وقت بر آئی جب انگریزوں نے معاہدہ امرت سر کے تحت تیس نقرئی سکے ادا کر دیئے۔ پچھتر لاکھ روپوؤں (جو نانک شاہی کہلاتے تھے) کی حقیر رقم کے بدلے انگریزوں نے جموں اور کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بہر حال اس کے ساتھ گلاب سنگھ کو تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ یہ کبھی نہ بھولے کہ کشمیر اسے کس نے دیا ہے۔ معاہدہ امرتسر کی دفعہ (۱۰) میں کہا گیا تھا " مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتا ہے اس برتری کے اقرار کی ایک علامت کے طور پر وہ ہر سال برطانوی حکومت کی خدمت میں ایک گھوڑا، بارہ بکریاں (چھ نر اور چھ مادہ) اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے نذر کیا کرے گا۔"

سو سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں جب گاندھی جی کشمیر گئے تو اس وقت بھی انھوں نے پچھتر لاکھ روپیوں میں کشمیر کے اس سودے کی مذمت میں لگائے جانے والے نعرے سنے تھے۔ کشمیریوں کو اتنا ناراض کسی اور بات نے نہیں کیا۔ اس طرح بیچے جانے اور خریدے جانے کے خیال ہی سے ان کو اپنی تذلیل کا احساس ہوتا تھا اور وہاں کے جاگیردارانہ نظام کی مخالفت کے اُن جذبات کی زیادہ ذمہ داری اسی خیال پر ہے جنھوں نے تقسیم ملک کے دوران کشمیر کے معاملے میں اتنی اُلجھنیں پیدا کیں۔

انگریزوں کے لیے یہ ایک اچھا سودا تھا۔ وہ اب کشمیر جیسی ریاست میں اپنا ایک وفادار ایجنٹ رکھتے تھے (انھوں نے ۹ نومبر ۱۸۴۶ء میں کشمیر پر قبضہ کرنے میں گلاب سنگھ کی مدد کی) اور ڈوگروں نے ہمیشہ انگریزوں کی توقعات پوری کیں۔ ان سے اپنی وفاداری کو برقرار رکھا اور سلطنت کو جب بھی ضرورت پڑی آدمیوں اور روپے پیسے سے مدد کی۔ ۱۸۴۸ء میں گلاب سنگھ نے افغانستان کے دوست محمد خاں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حمایت میں سکھوں کے ساتھ اس معاہدے میں شرکت کرنے سے انکار کیا جسے انگریزوں کے خلاف آخری اہم موقف قرار دیا جاتا

ہیے۔ ۱۸۵۷ کے غدر (جنگ آزادی) میں گلاب سنگھ نے دہلی کے محاصرے میں انگریزوں کی مدد کے لیے اپنے بیٹے زبیر سنگھ کے ساتھ دو ہزار پیدل سپاہی، دو سو سوار اور چھ بڑی توپیں بھیجی تھیں۔ ۱۸۵۸ میں گلاب سنگھ کا انتقال ہو گیا مگر اس کے جانشینوں نے اپنی وفاداریوں میں کمی نہ آنے دی۔ ۱۸۷۸-۸۰ء کی اینگلو افغان جنگ میں کشمیر پھر اپنی فوجوں اور توپ خانے کے ساتھ انگریزوں کے مفاد کے پیش نظر شامل ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ میں سکنڈ کشمیر رائفلز کا بارہ سو سپاہیوں کا ایک دستہ اور اس کے بعد ایک ہزار ستر فوجیوں پر مشتمل ایک دوسرا جتھا ۱۹۱ء میں برطانیہ کی امداد کے لیے گیا۔ اسی نوعیت کی مدد دوسری عالمی جنگ میں بھی دی گئی۔ برطانیہ نے اس کے صلے میں تمغے عطا کیے اور اکیس توپوں کی سلامی (دوسری ریاستیں جن کی اس طرح عزت افزائی کی گئی ان میں، حیدرآباد، گوالیار، میسور اور بڑودہ تھیں) جموں اور کشمیر کے اس تحفے کو قبول کرتے ہوئے گلاب سنگھ نے اپنے آپ کو "زر خرید" کہا تھا اور یہ بات کتنی صحیح کہی تھی۔

گلاب سنگھ کی موت استسقا کے مرض میں ہوئی۔ اگر پہلے ڈوگرا شہزادے نے کوئی بہت زیادہ خوشگوار شہرت نہیں حاصل کی تو چوتھے اور آخری راجہ ہری سنگھ نے ایک دوسری نوعیت کی شہرت پائی۔ جب ۱۹۲۵ء اپنے الحاق کے سال، وہ افشائے راز کی دھمکی دے کر رقم اینٹھنے والے ایک گروہ کے چکر میں پھنس گیا۔ ان لوگوں نے اسے لندن کے سوائے ہوٹل میں . . . . پکڑلیا۔ پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے سے پہلے ان لوگوں نے راجہ سے جو رقم وصول کی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیس لاکھ پونڈ تھی۔ لندن کے چھوٹے اخباروں کو "مسٹر اے" سے متعلق خبروں کی اشاعت میں بڑا لطف آیا۔ احتیاط کی خاطر مہاراجہ کا ذکر اسی نام سے ہوتا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی شخصی عادتوں سے متعلق صحیح تفصیلات اس وقت ضائع ہو گئیں جب ان سے متعلق برطانوی حکومت کی فائلوں کو ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے سے قبل مسٹر کنارڈ کورفیلڈ نے تلف کرادیا۔ شاہی خاندانوں کے تحفظ کا مسٹر کورفیلڈ کو کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ کمزور اور خود اپنی خواہشات میں گم ہو جانے والے ہری سنگھ دراصل علامت تھے جاگیرداری کی تمام ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ خصوصیات کے۔ اگر ایک طرف مہاراجہ نے ریاستی خزانے کو اپنی عیاشیوں کی خاطر (یا افشائے راز کو روکنے کے لیے رقمیں دے دے کر) خالی کر دیا تھا تو دوسری طرف عوام انتہائی مایوسی میں ڈوب گئے تھے۔ انتظامیہ کے مسلم مخالف تعصبات کی دھار بھی بہت تیز ہو گئی تھی۔ صحافی گوا شانا تھ کول، جنھوں نے اپنی کتاب "کشمیر دین اینڈ ناؤ" پہلی بار سری نگر سے الحاق سے قبل ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی۔ کتاب کے آٹھویں ایڈیشن میں (جو ۱۹۶۷ء

میں شائع ہوا) لکھتے ہیں کہ سری نگر کا شہر، دوسری دہائی کے اوائل میں بڑی تشویش ناک تصویر پیش کرتا ہے۔ زینا کدل اور گنو کدل میں طوائفوں کے دو اڈے، صبح و شام چوریاں اور بھیک مانگنا اتنا عام کہ ایک ایک دمڑی پر لوگوں کا ہجوم ٹوٹ پڑتے۔ مزدور اتنے سستے کہ ایک کھروار (تقریباً ۸۰ پاؤنڈ یا ایک من) شالی محض چار آنے کی اجرت پر صاف کرائی جا سکتی تھی۔ گھروں میں کام کرنے والی عورتیں تقریباً مفت۔ ناخواندگی ایسی کہ خدا کے چند محبوبوں کے علاوہ کوئی پڑھا لکھا ملنا مشکل۔ بے روزگاری کی وہ شدت کہ دس بارہ افراد پر مشتمل خاندان میں ایک کمانے والا ملنا دشوار۔ شرح پیدائش کم، شرح اموات بیماریوں کی وجہ سے جن کے علاج کا انتظام بھی نہیں، زیادہ۔ تفریح اور دلچسپی کے سامان عنقا۔ چکٹ کپڑے ایک عام بات تھی، صابن قیمتی اور کمیاب۔ سکھوں کی حالت بھی اتنی نازک تھی۔ پنڈت بحیثیت ایک طبقے کے نسبتاً بہتر نظر آتے تھے۔ سری نگر میں نوے فیصد مسلمانوں کے گھر ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھے۔

کشمیری مسلمانوں کو غم و غصے کے اظہار کے لیے بہرحال راہ ڈھونڈنا تھی۔ یہ لاوا پہلے کیوں نہیں پھوٹا اس کی وجہ، فرقے کی انتہائی پس ماندگی تھی اور اس کے ساتھ ہی تشدد سے جبلّی کراہت تھی۔ سول سرونٹ والٹر لارنس نے صدی کے آخری زمانے میں لکھا تھا کہ (مختصرا) "کشمیری کسان کے ساتھ ابھی تک ایک غلام جیسا سلوک ہوتا رہا ہے اور درحقیقت جوتنے بونے کا کام اس سے جبراً کرایا جاتا ہے۔ انھیں اپنی زمین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انھیں یہ خطرہ بھی ہر لمحہ گھیرے رہتا ہے کہ کب انھیں حکام یا بارسوخ لوگوں کے یہاں بیگار کرنے کے لیے لے لیا جائے ..... (لیکن) گاؤوں میں جرائم کا نام نہیں ہے۔ جائداد اور ملکیت بالکل محفوظ ہے اور میں نے فصلوں کی چوری جیسی بات کبھی نہیں سنی۔ جسمانی لڑائی شاذ و نادر ہی ہوتی ہو گی۔ کشمیری جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ اگر کبھی بات بہت بڑھ گئی تو صافہ نوچ لیتے ہیں یا پھر مُکّے گھونسے۔ خون دیکھ کر انھیں گھن آتی ہے۔"

دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کی اولین بغاوت ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں ہوئی جب سری نگر سلک فیکٹری کے مزدوروں نے بغاوت کی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے زمین کے ایک پلاٹ پر قبضہ کر لیا۔ جو حکومت کی ملکیت تھا۔ فوج بلائی گئی اور مہاراجہ نے تحریک کے لیڈروں کے خلاف کارروائی کی۔ سعد الدین شال کو نکال دیا گیا اور ایک دوسرے لیڈر نور شاہ نقشبند کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ مگر یہ سب محض تمہید تھی۔ بھوکے کسان اس زمین پر اپنی ملکیت چاہتے تھے جس پر وہ صدیوں سے غلام تھے۔ عوام اپنی عبرت ناک مفلسی سے چھٹکارا چاہتے تھے اور مہاراجہ کا اختتام چاہتے تھے۔ جس نے ان کو اتنے دنوں سے بھوکا رکھا تھا۔ عوام تیار تھے، وقت آ گیا تھا۔ لیڈر اٹھا اور ان کی راہ نمائی کرتا۔

●●

(۴)

شیرِ کشمیر

اساطیری ہری پربت کے شمال میں، انچھر جھیل کے کنارے سردہ نام کا ایک گاؤں ہے یہاں ایک برہمن خاندان رہتا تھا جس کی گزر بسر شال اور دوشالے تیار کرنے پر تھی۔ خاندان کی روایت کے مطابق انھیں ایک صوفی میر رشید بیہاقی نے ۱۷۶۶ء میں مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ لوگ متمول کبھی نہیں تھے۔ شال بنانے والوں پر ڈوگروں کے عائد کیے ہوئے ٹیکسوں کی وجہ سے ان کی حالت اور سقیم ہو گئی۔ اس خاندان میں ۱۹۰۵ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام شیخ محمد عبداللہ رکھا گیا۔ عبداللہ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ وہ شیخ محمد ابراہیم کی تیسری بیوی خیر النساء کے بطن سے باپ کے انتقال کے پندرہ دنوں بعد پیدا ہوئے۔ شیخ محمد ابراہیم کی دوسری دونوں بیویوں کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور سارے خاندان کی نگہداشت کی ذمہ داری خیر النساء پر تھی اس میں ان کی مدد ان کے سوتیلے بیٹے بھی کرتے تھے۔ خیر النساء کا صرف ایک خواہش تھی اور وہ یہ کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے ذریعے افلاس کے اس چکر سے آزاد دیکھنا چاہتی تھیں انھوں نے شیخ عبداللہ کو سب سے پہلے صوفی اخون مبارک شاہ کی خدمت میں بھیجا۔ ان بزرگ سے بچے نے نہ صرف فارسی عربی کے لکھنے پڑھنے کے فوائد سمجھے بلکہ تصوف کے جوہر ضبط و برداشت کو بھی حاصل کیا۔ اپنے بچپن ہی میں عبداللہ نے قرأت قرآن پاک سیکھی۔ ان کی قرات اتنی دل نشیں ہوتی تھی کہ لوگ اسے سن کر جھومنے لگتے تھے (اور ملا جھنجلاتے تھے کہ ان ہی کے منہ میں ان کی سبکی ہوتی تھی۔)

عبداللہ خود دراصل ڈاکٹر بننا چاہتے تھے وہ ڈاکٹر نہیں بن سکے (اگرچہ بعد کو ان کے دو بیٹے ضرور ڈاکٹر ہوئے) کسی کی مدد سے ان کو مشہور و معروف علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہاں سے انھوں نے سائنس میں ایم ایس سی کیا۔ اس عہد میں اتنی کمیاب قابلیت حاصل کرنے کے باوجود سری نگر کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں سائنس کے استاد سے زیادہ کی نوکری انھیں نہیں مل سکی۔ عبداللہ کی واپسی ایک ایسے وقت میں ہوئی تھی جب کشمیر غم و غصہ کی آگ میں

پیدا ہوا تھا۔ وہ حالات کو بدلنے کے لیے عزمِ مصمم کے ساتھ کمربستہ تھے چنانچہ انھوں نے سیاسی کام شروع کیے۔ شیخ عبداللہ
کے ایک تقریباً ہم عصر ڈی۔ این۔ کول نے جو آخری عمر میں شیخ عبداللہ کے وزیرِ اعلیٰ ہونے کے زمانے میں ترقی کر کے
پولیس کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے، ان دنوں کو یوں بیان کیا ہے: "میرے بڑے بھائی جن کو انھوں
(شیخ عبداللہ) نے سائنس پڑھائی تھی یاد کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتنے طویل القامت اور دُبلے پتلے تھے۔
ترکی ٹوپی پہننے والے سائنس کے استاد سائنس کی بہت سی اصطلاحوں کو کشمیری روزمرہ میں بتایا کرتے تھے تاکہ
ان کے لیکچر کو سننے میں غرق نوجوان طالب علم انھیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ طالب علموں میں ان کا رعب بھی تھا اور احترام
بھی۔ طالب علموں کا یہ ردِ عمل صرف اسی وجہ سے نہیں تھا کہ وہ نظم و ضبط کے معاملے میں بڑے سخت تھے بلکہ عظیم
مرتبے کی وجہ سے بھی تھا۔ ان کا یہ مرتبہ جسمانی بھی تھا اور تعلیمی بھی، اور وہ بھی صرف طالب علموں کے مقابلے میں نہیں بلکہ دوسرے
استادوں کے مقابلے میں بھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے انھیں سری نگر کی پتلی پتلی گلیوں میں ، مزاحمتی نعرے
لگاتے ہوئے پُرجوش جلوسوں کی قیادت کرتے دیکھا۔ عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے ان کی بہترین اور
پُرشکوہ آواز میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہے۔ ان کی عوامی تقریریں عموماً قرآن کریم کی تلاوت یا علامہ اقبال کے شعروں
سے شروع ہوا کرتی تھیں۔ یکسر مسلمان سامعین اور یونی ورسٹی کے اثرات کے غلبے کی وجہ سے شیخ عبداللہ نے اپنے
طبقے کے مسائل کے حل کے لیے مسلم کانفرنس تنظیم دی۔ مگر مستقبل کے رجحانات اسی زمانے سے نظر آنے لگے تھے۔
انھوں نے کہا تھا کہ حقیقی جنگ، جاگیرداری کے خلاف اور سیلف رول اور اصلاحات اراضی کے لیے ہے۔

پہلی چنگاری جولائی ۱۹۳۱ء میں بھڑکی۔ مسلمان غصے سے بھڑک اٹھے جب انھوں نے سنا کہ جموں کے ایک
تھانے میں ایک کانسٹبل نے قرآن کریم کی بے حرمتی کی ہے۔ مہاراجہ کے خلاف جو غم و غصہ ابھی تک قابو میں تھا وہ اس
واقعے سے بے قابو ہو گیا۔ شیخ عبداللہ نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی اور کسانوں، مزدوروں اور دستکاروں
کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مطالبات میں سیاسی حقوق اور سماجی اصلاحات مزید شامل کر لیں۔ انھوں
نے شہری عدم تعاون کی ایک تحریک کا آغاز کیا اور رضاکاروں کے پہلے جتھے کی قیادت کی۔ جو گرفتار ہوا اور ہری
پربت کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ ۱۳ جولائی کو تشدد پر آمادہ ایک مجمعے نے سری نگر میں سنٹرل جیل پر حملہ کیا۔ اس موقع
پر پولیس فائرنگ میں نو افراد مارے گئے۔ شیخ عبداللہ نے کشمیریوں کو یہ دن بھولنے نہیں دیا۔ انھوں نے اس دن کا
نام "یوم شہیداں" رکھا۔ ہر سال، انھیں جب بھی موقع ملتا وہ اس قیمت کو یاد دلاتے رہتے جو مرنے والوں نے اپنی
جانیں دے کر ادا کی تھی۔ مہاراجہ کی حکومت کو مجبور ہو کر ایک انگریز سر برٹرینڈ گلاسی کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی

کمیشن بٹھانا پڑا۔ ایک عوامی تحریک کے عواقب کے طور پر پہلی دفعہ کشمیر نے کچھ اصلاحات دیکھیں۔

شیخ عبداللہ نے اب اپنے آپ کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کا ذوق کسی ایسے نظریے کا ساتھ نہیں دے سکتا جو کسی ایک مذہب تک محدود ہو۔ ۱۹۳۲ء میں ہی انھوں نے مسلم کانفرنس کے ایک سیشن میں کہا تھا کہ "ہم تمام فرقوں کے حقوق کے لیے لڑتے ہیں۔ ہمارے ملک کی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم مختلف فرقوں کے درمیان خوش گوار تعلقات استوار نہیں کرتے ہیں۔" مگر "مسلم کانفرنس" کا نام اور یہ پیغام ظاہر ہے کہ دو متضاد چیزیں تھیں۔ ان میں سے کسی ایک کو تبدیل ہونا تھا۔ نام بدل گیا۔ بعد کو شیخ عبداللہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے اقتصادی پروگرام کے لیے کتنے وقف ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب انھیں حکومت ملی تو انھوں نے پہلا کام جو کیا وہ تھا جاگیرداری نظام کی عطا کی ہوئی زمین کی بڑی بڑی ملکیتوں کا خاتمہ۔ ۱۹۶۹ء میں "یوم شہیداں" کے موقع پر انھوں نے کسانوں (آبادی کے ۸۳ فی صدی حصہ) کو اس قطعۂ اراضی کی ملکیت دے دی جسے وہ جوت رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کا "بگ لینڈ ہیڈ اسٹیٹس ابالیشن ایکٹ" سارے ملک میں مشہور ہو گیا اور اس نے ان سوشلسٹوں کو بھی شرمندہ کر دیا تھا جنھوں نے ایسا کرنے کے وعدے تو بہت کیے مگر ایفا نہ کر سکے۔ کشمیری کاشت کار کے لیے یہ حقیقی آزادی تھی۔

۱۹۳۳ء میں شیخ عبداللہ نے بیگم اکبر جہاں سے شادی کی (بیگم اکبر جہاں کے باپ، اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے) ان کی سب سے بڑی لڑکی کا نام خالدہ رکھا گیا (خالدہ نے بعد کو غلام محمد شاہ سے شادی کی) خالدہ کے بعد فاروق پیدا ہوئے۔ پھر طارق ایک اور لڑکی ثریا اور مصطفیٰ کمال۔ بیگم عبداللہ پردے میں نہیں بیٹھیں بلکہ انھوں نے اپنے شوہر کی ہنگامی سیاسی زندگی میں پوری طرح شرکت کی۔ تیسری دہائی میں شیخ عبداللہ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ شیخ عبداللہ کی دوسری برسی کے موقع پر کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی یادگاری جلد میں مسز اندرا گاندھی نے لکھا ہے "میں نے شیخ صاحب کو پہلی بار ۱۹۳۴ میں دیکھا وہ ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے اس کے بعد کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ ہماری تحریک آزادی کی ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ پرانی شاہی ریاست کے دوسرے معقول لیڈروں کی طرح انھوں نے بھی جاگیرداری اور نو آبادیاتی نظام دونوں کے جبر و ظلم کے خلاف لڑائی لڑی۔ انھوں نے مسلم لیگ کی سیاست کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ ہمارے ملک کے سیکولر آئیڈیل کے بہترین نمونہ تھے۔"

اور وہ یہ بہترین نمونہ تیسری اور چوتھی دہائی کے بدترین زمانے میں بھی رہے جب جناح صاحب نے

مذہب کے نام پر خطرناک قسم کا تہلکہ مچانا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۳۹ میں انھوں نے مسلم کانفرنس کو باقاعدہ طور پر "نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دیا۔ اس نئے نام کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا تاکہ یہ مسلم لیگ اور نیشنلسٹ تحریک کے نظریاتی فرق کو واضح کر سکے۔ شیخ عبداللہ نے اپنے شمالی پڑوسی سوویت یونین کے تجربات کے سلسلے میں اپنی پسندیدگی کا اعلان بھی شروع کر دیا۔ نیشنل کانفرنس کے جھنڈے کا رنگ دانستہ طور پر لال رکھا گیا۔ جو انگریزوں کے لیے مزید تشویش کا باعث بنا۔ جھنڈے کے درمیان میں ایک ہل کی تصویر تھی اور کسانوں کو جو نعرہ دیا گیا تھا وہ تھا "الیاں ہاں ہلا کاری، دشمناں چلا کاری" کشمیری زبان کے اس نعرے کا مطلب ہے کہ جب ہل چلتا ہے، دشمن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ساتھ شیخ عبداللہ قوم پرست مسلمانوں کے عظیم نمائندے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر پر لیگ کا خاص ہدف تھا۔ شیخ عبداللہ نے انتہائی فعال طریقے پر لیگ کی فلاسفی اور اس کی سیاست کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ دو قومی نظریہ ایک زہر ہے جو جب پھیلے گا تباہ کر دے گا۔ اگر ہم اس منظر کو ذہن میں رکھیں جس میں شیخ عبداللہ نے اتحاد و یک جہتی کی وکالت کی تو ان کے کارنامے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہو جاتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کشمیریوں کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ تھی ان کی تعداد۔ سیاسی اور اقتصادی دونوں اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ مسلمان اپنے غم و غصے اور ہندوؤں سے انتقام کی خواہش رکھنے میں پورے طور پر حق بجانب تھے۔ ۱۹۴۷ میں کشمیر میں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد و شانتی کا برقرار رہنا جو بڑی حد تک شیخ عبداللہ کی قیادت کی وجہ سے تھا، اسے ایک قابلِ ذکر زندگی کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں، جیسا شخص بھی کشمیر سے متصل شمالی مغربی سرحدی صوبے کے پٹھانوں کو فرقہ پرستی کے جال سے بچانے میں ناکام رہا تھا۔ لیگ نے اپنے بس بھر کوشش کی۔ جناح صاحب نے شیخ عبداللہ کو پاکستان میں اقتدار اور وقار دونوں کی پیش کش کی اور جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو مسلم لیگ نے اپنے قدیم حلیفوں یعنی ملا اور جماعت اسلامی کی مدد سے گزند پہنچانے کی کوشش کی۔ (جماعت اسلامی کے کشمیری یونٹ نے تا دمِ تحریر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو نہیں مانا ہے۔ اس کی وفاداریاں پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہیں) شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ان سے محفوظ رکھا کیونکہ ان کے لیے ان کا پیغام سیدھا سادا تھا: "اچھے ہندو اور اچھے مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ برے ہندو اور برے مسلمان نہ صرف یہ کہ جھگڑے پیدا کرتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں جو کوئی اچھی بات کرنا چاہتے ہیں۔"

۱۹۴۴ء میں شیخ عبداللہ نے کشمیر کے مستقبل کے اپنے ایک خاکے کا اعلان کیا۔ شیخ عبداللہ کے بیٹے فاروق عبداللہ کی وزارت میں وزیر قانون پیارے لال ہانڈو کے مطابق "سیاسی آزادی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کا مطلب اقتصادی نجات کی لڑائی سے تھا...... جب ایک دفعہ انھوں نے ہماری ریاست کی سیاسی اور اقتصادی نجات کے اس پروگرام کو ایک منشور کی حیثیت سے منظور کرا لیا تو پھر تبدیلی کی ایک ہوا چل گئی جس کا نتیجہ ۱۹۴۶ء کے تاریخی نعرے "کشمیر چھوڑ دو" کی شکل میں سامنے آیا۔ یہی زمانہ تھا جس میں شیخ صاحب کے خوابوں کے جموں اور کشمیر کی بنیاد ایک ایک اینٹ کر کے پڑنے لگی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، جاگیردارانہ نظام کی مخالفت شیخ صاحب کے پروگرام کا ایک اہم حصہ تھی، وہ مہاراجہ ہری سنگھ کی حیثیت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے اور مہاراجہ کو وہ اس کا حق بھی نہیں دے سکتے تھے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ مستقبل کا کشمیر کیسا ہونا چاہیے۔ استصواب رائے عامہ کے نزاعی سوال کی بھی عموماً غلط تاویل کی جاتی ہے، کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ خیال کشمیریوں کے پاکستان سے الحاق کرنے کی خواہش کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا۔ اور جس کے بارے میں بعد کو یہ بھی سمجھا جانے لگا کہ اس معاملے میں ہندوستان نے گڑبڑ کر دی۔ اس سے زیادہ حقیقت سے دور اور کوئی بات نہیں ہو سکتی چوں کہ ۱۹۴۷ میں کشمیر کی کسی نمائندہ حکومت کے پاس ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے کوئی آئینی طریقہ نہیں تھا اس لیے شیخ عبداللہ نے یہ تجویز کیا (اور نہرو نے خوشی سے مان لیا) کہ مہاراجہ (جو شیخ عبداللہ کی نظر میں کشمیر کے ناجائز نمائندے تھے) فی الوقت الحاق کے کاغذ پر دستخط کر سکتے ہیں، مگر الحاق کی اس کارروائی کے اخلاقی جواز کی خاطر اسے عوام کے سامنے بھی پیش کر دیا جانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے بھی اس مسئلے پر خصوصی استصواب کی تجویز نہیں رکھی تھی۔ مثلاً ایک عوامی آئین کے تحت، بالغ رائے دہندگی کے ذریعہ منتخب کی ہوئی حکومت کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ ہندوستان سے الحاق کی توثیق کر دے۔ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے سلسلے میں کسی کے دماغ میں کوئی شبہہ نہیں تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ اس کارروائی کے لیے طریقہ کون سا اپنایا جائے۔ جاگیردارانہ نظام کے پرانے دشمن شیخ عبداللہ اس سلسلے میں مہاراجہ کو کشمیریوں کے مقدر پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کوئی تکنیکی بہانہ بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے استصواب رائے عامہ کے خیال کی ابتدا جناح صاحب کے جنھیں شیخ نے ہمیشہ حقارت سے دیکھا، نظریات سے کوئی محبت یا کسی قسم کی دلچسپی پر نہیں، شیخ عبداللہ کی راجوں مہاراجوں کے خلاف نبرد آزمائی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۴۶ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں ہندوستان آنے والے کیبنٹ مشن کو نیشنل کانفرنس نے جو

میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں کانفرنس کے مقاصد اور اس کا مطمح نظر بالکل واضح تھا "کشمیری عوام کا قومی مطالبہ نہ
ایک ذمہ دار حکومت کا قیام نہیں ہے بلکہ وہ ڈوگرہ خاندان کے تاناشاہی اقتدار سے اپنی مکمل نجات اور آزادی کا
بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اسی خاندان کی
حکومت کے خلاف تھی اور گاندھی اور نہرو کی مکمل حمایت کے ساتھ تھی۔ کانگریس نے جو صرف ایک تحریک آ...
تھی، اپنے وجود کو برطانوی ہند تک محدود رکھا۔ دیسی ریاستوں، (رجواڑوں) میں، کانگریس کی ہم پلہ جماعت
انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس تھی اور مختلف ریاستوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں اس کے تحت چلتی تھیں ۴۰
میں نہرو اس کانفرنس کے صدر تھے، اور شیخ عبداللہ نائب صدر۔ اسی سال، مئی کے مہینے تک شیخ عبداللہ
ڈوگروں کے خلاف اپنے عوامی احتجاج کی لے کو خاصا بلند کر دیا تھا۔ ۱۵ مئی کو سری نگر میں، انھوں نے ایک تقریر
کی جس نے جاگیردارانہ حکومت کو ہلا دیا۔ تقریر کے کچھ اقتباسات سے اس کے تاثر اور لطف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

"یہ مطالبہ کہ راجہ کے خاندان کو ریاست چھوڑ دینا چاہیے دراصل "ہندوستان چھوڑ دو" کی اس پالیسی ہی کی توسیع ہے
(جسے انگریزوں کے خلاف ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے اپنایا تھا۔ ہندوستانی راجے ایک معاہدے کی رو سے انگریزوں
کے اتحادی تھے اور ان کی ریاستوں کی حیثیت "علاقہ زیر حمایت" کی تھی) جب تحریک آزادی، انگریزی حکومت کی
واپسی کا مطالبہ کرتی ہے، تو منطق یہی کہتی ہے کہ برطانوی استعمار کے پٹھوؤں کو بھی جانا چاہیے اور اقتدار اعلیٰ کو اس
کے اصلی حق دار یعنی عوام کے حوالے ہونا چاہیے ...... دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے ہندوستان کی آزادی سے
مقصد سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ ایک انقلاب نے زار روس کی حکومت کا تختہ پلٹا اور انقلاب فرانس نے وہاں
کے حکمراں طبقے کا خاتمہ کر دیا۔ امرت سر عہد نامے کے پرخچے اڑانے کا وقت آگیا ہے اور کشمیر چھوڑنے کی گھڑی
پہنچی ہے۔ اقتدار اعلیٰ مہاراجہ ہری سنگھ کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ "کشمیر چھوڑ دو" بغاوت یا سرکشی کا سوال
نہیں ہے۔ یہ حق کا سوال ہے۔"

پنڈت نہرو اگرچہ کرپس مشن سے متعلق کاموں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے مگر کشمیر کے واقعات نے
اپنے جوش و خروش کو دبا نہ سکے۔ انھوں نے اپنے نائب صدر کو وہاں کے حالات بتانے کے لیے دہلی آنے کو۔
شیخ عبداللہ کو جوں ہی پیغام ملا انھوں نے فوراً ہی سری نگر سے راولپنڈی کے لیے رخت سفر باندھا جہاں سے
دہلی کے لیے ہوائی جہاز مل سکتا تھا ابھی وہ سری نگر سے کوئی سو میل دور گڑھی کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ ریاستی
حکومت نے انھیں وطن دشمنی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ثبوت میں ان کی ۱۵ مئی والی تقریر پیش کی گئی۔ نہرو کو جب

ست کی گرفتاری کا پتہ ایک ٹیلی گرام سے چلا۔ انھوں نے ایک تازہ ترش بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ کیا جاگیردارانہ
ندوستان کے راجے مہاراجے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "چھوٹی چھوٹی ظاہری تبدیلیوں" کی بنیاد پر بچ نکلیں گے۔ بیان
ں انھوں نے ایک تنبیہ بھی شامل کر دی، شیخ انگریزوں کے باہر نکالنے پر گرفتار کیے گئے تھے۔ "ہم اچھی طرح جانتے
ہ کہ ایسے معاملات میں مہاراجاؤں کے درباروں (انگریز) ریزیڈنٹ ہی ہے جو ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

نہرو کے اس کہنے کے پیچھے کہ روسیوں کی توسیع پسندی سے تشویش کی وجہ سے انگریز ہری سنگھ کو بچانے
لیے بے قرار تھے، معقول سبب تھا۔ بعض ریاست کشمیر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ہری سنگھ اس پالیسی کی
لیل میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ چرچل کی وار کیبنیٹ کے ایک رکن بنائے گئے تھے، یہ ایک
زیب تھا جس میں برطانوی سامراجیوں کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ہری سنگھ کے بیٹے کرن سنگھ کے مطابق اس کیبنیٹ
بنانے کا مقصد برطانوی سامراج کے ممبروں کو ملکی معاملات میں فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوئی حقیقی طاقت دیئے
ایک علامتی حق رائے دینا تھا، جنگ کے بعد کی سیال دنیا میں بڑی طاقتیں اپنے اپنے علاقہ ہائے اثر و تسلط کے لیے
ا محترم لفظ کو وسیع کرنے کی متمنی تھیں اور ظاہر ہے کہ ماسکو اپنی جنوبی سرحدوں، ایران، افغانستان، برطانوی
اور کشمیر کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ماسکو کے مفادات کے
غ کے لیے استعمال کیے جانے والے ہتھیاروں میں سے ایک تھی کمیونسٹ پارٹی نے اس وقت حد کر
س نے تعاون سے انکار کر دیا تھا نہ صرف برطانیہ کی جنگی کوششوں کی حمایت کی بلکہ جب مسلم لیگ انگریزوں
ل گئی تھی تو اس نے پاکستان کے خیال کی پرزور تائید کی۔ بہت سے کمیونسٹوں نے (کچھ میادیرستوں کو جو دہ سے
ھوں سے زیادہ کسی کو بھی نامحترم نہیں سمجھتے ناخوش کر کے) مسلم لیگ میں شرکت کر لی کمیونسٹوں کے اس عمل
ندوستان میں لوگ واقف تھے اور ۲۱ مئی ۱۹۴۶ء کے روزنامہ ہندوستان اسٹنڈرڈ میں لاہور کی ایک
ٹ میں کہا گیا تھا "بعض سیاسی حلقوں میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہندوستان
نے اثر و رسوخ کو بڑھانے میں روس کی مدد کرنے کے لیے کشمیر میں کسی جگہ بہت مضبوط اور فعال "خفیہ" دفتر قائم
ہے۔ یہ بات سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ روس ایران کے ذریعے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا ہے
ست سے جائز اسباب تھے جن کی بنا پر روس، افغانستان کے ذریعے اس قسم کے جوڑ توڑ نہیں کر سکتا تھا پنجاب
ان جو کمیونزم اور روس کے اثرات کے فروغ کے خطرے کو محسوس کر چکے ہیں، مسلم لیگ کو کمیونسٹوں سے
سے پاک کرنے کے سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ہری سنگھ کی حکومت کے روتے اور پولیس

فائرنگ نے پیڑول چھڑک کر لاشوں کو جلا کر، زخمیوں کو اسپتال میں داخل کرنے کے بجائے جیلوں میں ٹھونس کر،
خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا اس پر نہرو کو سخت غصہ تھا" انھوں نے سری نگر کو "شہر خموشاں" کہا اور کہا کہ وہ
کے حالات جنرل ڈائر کے پنجاب کی یاد دلاتے ہیں جہاں لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل چلایا جاتا تھا یا سنگینوں
نوک پر ڈانٹا پھٹکارا جاتا تھا " مہاراج زندہ باد " شیخ عبداللہ کی تعریف کے ان کے پاس بہت سے جواز تھے
"ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے وہ وہاں شیخ عبداللہ کی حیثیت کو بھی جانتا ہے۔ وہ وہاں شیر کشمیر ہیں، دور افتادہ دیہات
تک کے لوگوں کے وہ چہیتے ہیں۔ نہ جانے کتنے عوامی گیت اور کتنی کہانیاں ان کی شخصیت کی گرد بن گئی ہیں
ریاستوں کی تحریک آزادی میں وہ میرے ایسے قابل قدر ساتھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں جن سے تمام اہم مسائل پر
مشورہ لیا جاتا ہے۔ کیا کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں گے؟" نیشنل کانفرنس کی پبلسٹی کمیٹی کے سکریٹری شیام لال
نے صحافیوں کو بتایا کہ "کشمیر کی تمام کی تمام پولیس نے اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں پر لاٹھی چلانے سے انکار کر دیا
حکم عدولی کے نتیجے میں ان کشمیری پولیس والوں میں سے چالیس کو ڈوگرا فوجوں نے حراست میں لے لیا اور کشمیری
پولیس کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ ایک تلخ و ترش نہرو نے کہا " دنیا کے اکثر ملکوں میں مردودوں کی حکومتیں ختم ہو چکی ہیں
آج بھی مردودوں کی حکومت کا ہونا کشمیریوں کی بدنصیبی ہے۔" انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شیخ عبداللہ کے دفاع کے
بذات خود وکیلوں کی ایک جماعت کی سربراہی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا
تک کہ شیخ عبداللہ کو رہا نہ کیا جائے۔

لارڈ ویول نے زور ڈال کر سمجھا کر بہت کوشش کی کہ نہرو کشمیر نہ جائیں مگر وہ نہرو کو روک نہیں سکے۔ کانگریس
لیڈروں نے بھی کہا کہ کیبنٹ مشن کے مذاکرات میں ان کی ضرورت ہے مگر نہرو اس سب کے باوجود کشمیر گئے۔ ۱۵
کو نہرو نے ہری سنگھ کی حکومت کو ایک تار بھیجا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ کشمیر آرہے ہیں۔ سری نگر سے
نہایت سرد مہری کا جواب آیا کہ انھیں ریاست میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹ جون کو سہ پہر
ایک بجے نہرو، آصف علی، دیوان چمن لال، تلک راج اور چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کار کے ذریعے کوہالہ پل
پاس پہنچے۔ یہ جگہ سری نگر سے تقریباً ایک سو چالیس میل دور، سری نگر اور راولپنڈی روڈ پر واقع ہے۔ دوپہر کے کھانے
کے بعد ان لوگوں نے پل کی طرف چلنا شروع کیا۔ ضلع مجسٹریٹ نے ایک سرکاری حکم نامہ پیش کیا جس میں نہرو کو ریاست
میں داخل ہونے سے روکنے کی ہدایت تھی وہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نہرو نے ضلع مجسٹریٹ
کہا کہ انھوں نے پچھلے بیس برسوں میں، برطانوی حکومت کے کسی حکم کو نہیں مانا ہے اور ہری سنگھ اور ان کے مطعون وزراء

ریاعظم پنڈت رام چندر کاک کے احکامات کو ماننے کی بھی ان سے توقع نہیں کرنا چاہیے۔

نہرو کے راستے میں فوجیوں نے گھیرا ڈال دیا۔ نہرو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "شاید کشمیر کے ریاستی حکام
نہیں جانتے کہ ان کا مقابلہ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کے منتخب صدر سے ہے میں نہیں جانتا کہ کسے پیچھے
سا پڑے گا اور یہ کہہ کر وہ گھیرا بنانے والے حیران و پریشان فوجیوں کے بیچ سے نکل گئے اور اگلے تین ساڑھے
ن میل تک ان کی راہ میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی یہاں تک کہ شام کے ساڑھے سات بجے پولیس ان کے سامنے پھر آئی
ں وقت وہ کار بھی آچکی تھی جو انھیں کوہالا تک لائی تھی۔ پوری پارٹی کو رات بسر کرنے کے لیے ڈومل لایا گیا۔ دوسرے
ں نہرو کو حراست میں لے کر، سری نگر سے تقریباً چھیانوے میل دور اُڑی کے مقام پر ایک ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔

نہرو کی گرفتاری کی خبر جب پھیلی تو ملک بھر میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ کانگریس کارکنوں نے کشمیر جا کر اپنے آپ
رفتار کرانے کی تیاری کی۔ ہری سنگھ کی حکومت نے پنڈت نہرو کے مقرر کیے ہوئے شیخ عبداللہ کے وکیل، بہار
سابق ایڈووکیٹ جنرل بلدیو سہائے اور اُدیش نرائن کو تو اجازت دے دی مگر آزادانہ نقل و حرکت کے لیے
د کو اجازت نہیں ملی۔ لیکن نہرو بھی شیخ عبداللہ سے ملاقات کیے بغیر واپس نہیں جا سکتے تھے۔ دلی میں، کانگریس ورکنگ
ٹی ایک اضطراب کے عالم میں تھی۔ کیبنیٹ مشن سے متعلق انتہائی اہم مسائل، قطعی اور آخری فیصلوں کے منتظر تھے
نہرو جنھیں مکمل آزادی اور نوآبادیاتی حکومت کے درمیان عبوری عارضی حکومت کا سربراہ ہونا تھا کشمیر کی ایک
میں بیٹھے تھے۔ بالآخر، کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے نظم و ضبط کے پابند کانگریسی کو دلی واپس آنے
م دیا۔ پہلے تو نہرو نے انکار کر دیا اور ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی کہ "وہ میرے بغیر کارروائی کو آگے بڑھائے"
د نے جواب دیا۔ "یاد رکھو، تم ایک تنظیم کے ماتحت ہو اور جسے تم نے برسوں سے چاہا اور پسند کیا ہے
اس کی ضرورتیں، تمھارے لیے اور میرے لیے سب سے افضل ہونا چاہییں . . . ." نہرو نے پیچھے ....
ب بھیجا "آپ کا پیغام، دوپہر کے کھانے کے بعد ایک بجے ملا۔ میں اس توقع اور یقین کے ساتھ فوراً واپس
نے پر تیار ہوں کہ میں بعد کو کشمیر واپس آؤں گا۔" نہرو کشمیر سے چل دیئے مگر غالباً اپنے اس عمل سے نہرو نے کشمیریوں
دل جیت لیے۔ کشمیری جو انتہائی جذباتی لوگ ہیں کبھی نہیں بھول سکتے کہ پنڈت نہرو نے ایک تاریک گھڑی میں
کے لیے کیا کیا انھوں نے کس طرح ان کے مقدمے کو لیا اور ہری سنگھ کی حکومت کو اپنی زیادتیوں پر لگام لگانے پر
ر کر دیا۔ مشترکہ وفاداریوں کے ایسے ہی مظاہرے تھے جن سے کشمیر اور جمہوری ہندوستان کے باہمی رشتے استوار
ہوئے۔

شیخ عبداللہ کا مقدمہ ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ کو شروع ہوا۔ پنڈت نہرو مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے ۲۵ جولائی کو آئے۔ چار دن تک ٹھہرے رہے اور چار ہی دفعہ اپنے دوست سے ملے۔ شیخ عبداللہ کے معاون وکیل شانتی سروپ دھون اور آصف علی تھے اور استغاثہ کی طرف سے لاہور کے جے گوپال سیٹھ مقرر ہوئے تھے۔ مسئلے کو خود شیخ عبداللہ نے اس وقت ہی طے کر دیا جب انھوں نے اپنے آپ کو مجرم نہ قرار دیتے ہوئے تین ہزار الفاظ پر مشتمل ایک بیان دیا۔ اس بیان میں انھوں نے کہا "میں آج بھی ان تمام باتوں کو صحیح سمجھتا ہوں جو میں نے جموں اور کشمیر کے عوام کے حقوق سے متعلق کہی یا لکھی ہیں۔ سرکشی اور بغاوت کا میرا مقدمہ، میرے خلاف صرف شخصی الزام ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ چیز ہے۔ حقیقت میں یہ مقدمہ جموں اور کشمیر کی ساری آبادی کا مقدمہ ہے" بادامی باغ کنٹونمنٹ کے سیشن جج نے شیخ عبداللہ کو بغاوت کے الزام میں تین سال کی قید محض اور ڈیڑھ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔

جیل سے شیخ عبداللہ نے چوری چھپے کسی طرح اپنے ساتھیوں کو ایک خط بھجوایا جو ان کے انداز فکر کا آئینہ دار ہے۔ "جدوجہد کے عزیز ساتھیو۔ یہ لڑائی وہ ہے جسے انجام تک لڑنا ہے۔ یا ہم اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا ہے اور میں اب بھی کہتا ہوں کہ مہاراجہ ہری سنگھ کو ہم پر حکومت کرنے کا کوئی اخلاقی حق نہیں ہے اور جہاں تک ان کے آئینی استحقاق کا سوال ہے جب اور جہاں بھی ممکن ہوا ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ ہندوستان سے برطانوی استعمار کے معدوم ہو جانے کے بعد اقتدار اعلیٰ خود بہ خود عوام کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور اب یہ مہاراجہ کا کام ہے کہ وہ عوام کے ساتھ اپنا نیا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس نئے رشتے کا امکان عوام کے مطالبات کو مہاراجہ کے ماننے کی بنیاد پر ہے اور بس۔ اسے اس رشتہ یا اس تلوار کو پڑھ لینا چاہیے یا پھر عوام سے لڑائی انجام تک لڑنا چاہیے۔ اسے عوام اور موجودہ وزیر اعظم رام چندر کاک میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ موخر الذکر جب تک وزارت عظمیٰ کی گدی پر متمکن ہیں، کشمیر میں امن و سکون نہیں ہو سکتا اس لیے ساتھیو! کمر بستہ ہو جاؤ، رجعت پسندی اور بربریت کی اس آخری پناہ گاہ پر آخری اور بھرپور حملہ کرنے کے لیے اور اس بات کا یقین کرو کہ آخر میں فتح ہماری ہی ہوگی۔ حق کے اس معرکہ میں شخصی مصائب اور پریشانیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ ہمارے مہتم بالشان مقاصد ہیں جو ہمارے دلوں میں سب سے پہلے ہونے چاہئیں انقلاب زندہ باد، بینامہ امرت سر کو توڑ دو۔"

دہلی میں حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور جون ۱۹۴۷ تک پاکستان قبول کیا جا چکا تھا۔ نہرو (جو کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر ہے) گئے تو وہاں قابو سے باہر جوش و خروش تھا۔ گاندھی جی کا رخ ... کرفیو ... فضا

تھا۔ نہرو نے گاندھی جی سے اپنا یہ شکوہ جاری رکھا کہ ایک طرف ہندوستان آزادی کی منزل کے قریب پہنچ رہا ہے، دوسری طرف شیخ عبداللہ ابھی تک جیل میں ہیں اور کانگریس ان کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ وہ کشمیر کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے اس کی تائید نہیں کی اور یہ کہا کہ وہ خود وہاں جائیں گے۔ وہ غیر معمولی زمانہ تھا۔ مذہبی تعصب اپنے عروج پر تھا۔ ہر شہر میں خون خرابہ ہو رہا تھا۔ پنجاب میں بھی گھبراہٹ اور ہراس پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ سارے ملک میں کشیدگی تھی، تناؤ تھا۔ ہر جگہ یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ کون سا صوبہ کس ملک کے ساتھ جائے گا اور یہ کہ اس پر عمل درآمد کیوں کر ہوگا۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ اس صورت حالات میں ان کے کشمیر جانے کی غلط تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ وضاحت کی کہ وہ کشمیر اس لیے نہیں جا رہے ہیں کہ کشمیریوں کو ہندوستان کے ساتھ رہنے پر آمادہ کریں۔ یہ بات تو پورے طور پر کشمیریوں پر منحصر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی تو اپنا ایک وعدہ پورا کرنے جا رہے تھے جس کے ایفا میں غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے ایک سال کی تاخیر ہو گئی تھی۔ وہ صرف بیگم عبداللہ سے ملنے اور یہ کہنے جا رہے تھے کہ کانگریس ان کے مقاصد اور ان کے مفاد کو بھولی نہیں ہے۔ اگر نہرو اس وقت کشمیر گئے تو اس کا یہ غلط مطلب نکالا جائے گا کہ ہندوستان کا ہونے والا وزیر اعظم کشمیریوں پر دباؤ ڈالنے گیا تھا۔ گاندھی جی ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ کو روانہ ہوئے۔

وہاں پہنچتے ہی گاندھی جی کو وہاں کے جذبات کا ذائقہ مل گیا۔ اس کا پہلا اشارہ ان کا بے مثال استقبال تھا۔ سڑکوں پر دو رویہ ہجوم تھے۔ نعرے لگ رہے تھے "باغی عبداللہ کی جے" بیگم عبداللہ نے گاندھی جی کو ہار پہنائے۔ گاندھی جی نے لوگوں کو بتایا کہ وہ مہاراجہ سے ملنے نہیں بیگم عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ ہری سنگھ کی حکومت کو توقع تھی کہ گاندھی جی مہاراجہ سے ملاقات کی درخواست کریں گے۔ گاندھی جی نے حکومت کو یکسر نظر انداز کیا۔ ہری سنگھ نے اپنے محل میں گاندھی جی کی میزبانی کی پیش کش کی، انھوں نے انکار کر دیا اور نیشنل کانفرنس کے مہمان بن کر رہے (جس نے انھیں سیٹھ کشوری لال کے مکان پر ٹھہرایا) بالآخر وزیر اعظم کاک گاندھی جی سے ملنے گئے۔ انھوں نے ہری سنگھ سے ملنے پر رضامندی ظاہر کی مگر انھیں صرف یہ بتانے کے لیے کہ "آپ کے عوام آپ سے خفا ہیں، میں آپ کی طرف سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کر سکتا جب تک آپ کے عوام آپ کو قبول نہیں کرتے ہیں اپنے عوام کو خوش کیجیے اور میں آؤں گا اور آپ کے محل میں دس دن ٹھہروں گا"

جب گاندھی جی پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرنے کے لیے مجاہد منزل (جو پہلے کی طرح آج بھی نیشنل کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر ہے) گئے تو وہاں قابو سے باہر جوش و خروش تھا: گاندھی جی کی جے کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ خوشی سے پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے۔ بیس ہزار سے زیادہ آدمیوں کا مجمع تھا۔

گاندھی جی کو پاکستان کے جنم سے محض دو ہفتہ قبل، مسلم اکثریت والے کشمیر نے ناقابل یقین طور پر خوش آمدید کہا تھا ان کا استقبال کیا تھا۔

شیخ عبداللہ کو بالآخر ایک نسبتاً آرام دہ مقام پر رکھا گیا اور ان کے دوست جواہر لال نہرو کی زیر قیادت آزاد ہندوستان کی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے بالآخر انھیں ستمبر ۱۹۴۷ء میں چھوڑ دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ کشمیر سرمستی و سرخوشی میں ڈوب گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی پہلی عام تقریر کے موقع پر مجمع میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شریک ہوئے تھے۔ اس پہاڑی ریاست کی مختصر آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد غیر معمولی تھی۔ ۴ اکتوبر کو حضوری باغ کے مقام پر شیخ عبداللہ نے عوام کو ایک بار پھر وہ سب کچھ بتایا جس پر ہمیشہ سے ان کا ایمان رہا تھا، ان کی سولہ مہینوں کی حراست کے زمانے میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آچکا تھا کشمیر کے سامنے انتخاب کا مسئلہ آگیا تھا۔ ہری سنگھ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس ملک سے الحاق کریں گے شیخ نے یہ بات صاف کر دی کہ ہری سنگھ کو کشمیریوں کی نمائندگی یا ترجمانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فیصلے کا حق عوام کو دیا جانا چاہیے نہ کہ ان کے جاگیردار آقا کو۔ یہ وہی اصول تھا جس پر ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے جوناگڑھ اور حیدرآباد کے مسلمان راجاؤں کو چیلنج کیا تھا، جو اپنی ریاستوں میں بہت بڑی ہندو اکثریت کے باوجود خود مختاری یا مذہبی ملک پاکستان سے الحاق کے اعلان کی دھمکی دے رہے تھے۔ شیخ عبداللہ نے کہا کہ کشمیر میں بھی اسی اصول کا نفاذ ہونا چاہیے۔

اس وقت یہ سوال سامنے آیا کہ عوام کے حق میں کیا بہتر ہوگا، ایک مسلمان ملک پاکستان سے مل جانا چاہیے یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے جو ایک سیکولر ملک ہے۔ اس سوال کا جواب شیخ عبداللہ نے اپنی تقریر میں دیا۔

"پنڈت جواہر لال نہرو میرے دوست ہیں اور گاندھی جی کے لیے میرے دل میں انتہائی احترام ہے ... ہم دو قومی نظریے پر جس نے اتنا زہر پھیلایا ہے یقین نہیں رکھیں گے اس موقع پر کشمیر نے روشنی دکھائی جب سارے ہندوستان میں بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔ کشمیر نے ہندو مسلم اتحاد کی اپنی آواز اٹھائی۔ میں ہندو اور سکھ اقلیتوں کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک ان کی زندگیاں اور ان کی عزت بالکل محفوظ ہے۔" ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود اس وقت جس وقت شیخ عبداللہ یہ تقریر کر رہے تھے، ہندوستان در پاکستان میں کیا ہو رہا تھا اس مہینے اور عین اس دن، ہندو مسلم فسادات، انتہائی ہولناک اور بھیانک شکل میں ہو رہے تھے اور وادی کشمیر میں نیشنل کانفرنس اپنے نعرے "ہندو مسلم اتحاد کی جے" سے مسلم لیگ کی ہر کوشش کا مقابلہ کر رہی تھی۔

اس زمانے میں ملک کی صورتِ حال کے بارے میں کچھ اندازہ ان تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو کہیں ر ہو رہی تھیں۔ ۴۔ اکتوبر کو اپنی روزانہ کی پرارتھنا سبھا میں ایک مایوس اور ناامید گاندھی جی کہہ رہے تھے کہ وہ بھگوان سے ایک سو پچیس سال کی اپنی زندگی کی دعا مانگا کرتے تھے تاکہ وہ آزاد ہندوستان میں رام راج دیکھ سکیں مگر اب ندگی اس لائق لگتی نہیں ہے۔ جس شخص نے اپنی ساری زندگی اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے ا دوست رکھنے میں صرف کر دی اس نے کہا " ہندو اور مسلمان آج ایسا لگتا ہے کہ ظلم اور زیادتی میں ایک دوسرے ے سبقت لے جانے میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے غرض کوئی بھی چھوڑا نہیں جاتا۔" نہرو و غصہ تھا اس ہندوستان پر جو انھیں دیا گیا تھا۔ دہلی میں کانگریس کے کارکنوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وہ پھر گئے۔ محض چار دن قبل انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں ہندوستان ایک ہندو یاست نہیں بن سکتا۔ کانگریسی کارکنوں کا یہ جلسہ دہلی کے سبزی منڈی کے محلّے میں ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اشزم ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ ایک ہندو ریاست کے مطالبے ہو رہے تھے مگر وہ "نیا زیر اعظم، ایسی رجعت پرستانہ نقطۂ نظر کا ساتھ نہیں دے سکتا وہ کانگریس کی قدروں پر ایمان رکھتے تھے ور اگر یہ اقدار اب عوام کو قبول نہیں ہیں تو انھیں اپنا کوئی دوسرا وزیر اعظم منتخب کر لینا چاہیے وہ اپنے اعتقادات و دونوں کے لیے تبدیل نہیں کریں گے۔

اپنی ۴۔ اکتوبر کی تقریر میں شیخ عبداللہ نے بہت بڑی تعداد میں سامعین کو یہ سمجھایا کہ مسلم لیگ نے اپنا پاکستان کس طرح حاصل کیا۔ کوئی دوسرا اتنے تیقن اور اعتماد کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔" میں نے پاکستان ے نعرے پر کبھی بھی ایمان نہیں رکھا یہ میرا محکم ایمان رہا ہے کہ یہ نعرہ سب ہی کے لیے پریشانیاں اور مصائب لائے ا۔ میں نے دو قومی نظریے کو بھی نہیں مانا مگر اس کے باوجود پاکستان ایک حقیقت ہے ۔ ہندوستان کے یے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو اس سے کیا ملا؟ ان کی پریشانیوں سے میں ہمدردی رکھتا ہوں۔ پاکستان "دست ناصر نے اپنا راست عمل" ۱۶۔ اگست سے نواکھالی سے شروع کیا تھا اور وہاں غیر مسلموں پر ناقابل بیان مصائب وڑے تھے۔ اس کے بعد بہار میں اس کا بدلہ لیا گیا۔ بعد کو صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھ مارے گئے۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کا کشت و خون ہوا۔ . یہ نتیجہ تھا "دو قومی نظریے کا...... ہم کشمیر میں عوامی راج چاہتے ہیں یہ کسی ایک فرقے کی حکومت نہیں ہوگی، بلکہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سب کی ہوگی۔" یہ تھے شیخ عبداللہ تاریخ کی اس گھڑی میں جب ان کی زبان سے

نکلا ہوا ایک بھی حرف نہایت آسانی کے ساتھ کشمیر کو پاکستان میں پہنچا سکتا تھا اور سردار پٹیل بھی کشمیر کو پاکستان میں جانے کی بخوشی اجازت دے دیتے اگر اس سے حیدرآباد اور جوناگڑھ کو ہندوستان میں رکھا جانا آسان ہو جاتا۔

۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ، جواہر لال سے ملنے کے لیے دہلی آ رہے تھے ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ہری سنگھ کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اب شیخ صاحب کشمیر کے غیر متنازعہ سربراہ تھے اور پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم۔ نہرو نے انھیں آرام کرنے کی غرض سے دہلی آنے کی دعوت دی تھی۔ ظاہر ہے دہلی میں صرف ایک جگہ تھی جہاں یہ مہمان ٹھہر سکتا تھا اور وہ جگہ تھی ۱۶ پارک پلیس، ہندوستان کے نئے وزیر اعظم کی عارضی رہائش گاہ۔ شیخ کے قیام کے سلسلے میں نہرو کو جو مسئلہ پریشان کیے ہوئے تھا وہ تھا شیخ صاحب کا اچھے کھانے کا شوق (کھانے کے معاملے میں شیخ صاحب کی خوش مذاقی اور خوش خوراکی دونوں بہت مشہور ہیں) نہرو کی بیٹی اندرا اسی زمانے میں الٰہ آباد سے آئیں تو اس سلسلے کے انتظامات انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیے۔ ایک وقت پھر آئے گا ان گنت طوفانوں کے گزرنے کے بعد، یہ عمل پھر دہرایا جائے گا اور شیخ صاحب ایک طویل مدت کی حراست سے رہا ہونے کے بعد پہلا کام تو یہ کریں گے کہ جلدی سے کشمیر کا ایک چکر لگائیں گے اور پھر اپنے "عزیز ترین دوست" کے گھر ٹھہرنے کے لیے دہلی آ جائیں گے۔ یہ سب کچھ ۱۹۶۴ء میں ہوگا اور شیخ عبداللہ ہری سنگھ کے حکم سے ملی ہوئی نہیں بلکہ نہرو حکومت کی دی ہوئی حراست سے رہا ہو رہے ہوں گے۔ مگر یہ دوستی سیاست کے بے رحم اثرات سے غیر متاثر ایک غیر معمولی دوستی تھی جو صرف اس نسل میں ممکن تھی جسے کبھی نفرت کرنے اور کبھی نہ خوف کھانے کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ یادگاری جلد میں بی کے نہرو اس رشتے کی کو اسی کو یاد کرتے ہیں، "۱۹۴۷ء میں ایک بار جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ نے میری رہائش گاہ (۱۰ صفدر جنگ روڈ) پر میرے اور میری بیوی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس وقت تک ہم نے کھانے کے بعد اور طور طریقوں کو جمہوریت کے منافی سمجھنا شروع نہیں کیا تھا۔ حفاظتی اقدامات نے بھی اس زمانے میں حکمرانوں کی زندگیوں کو آج کل کی طرح ناممکن نہیں بنا دیا تھا۔ کھانے کے بعد کناٹ پلیس کے ریگل سنیما میں ہم چاروں سامرسٹ کے ناول پر بنی ہوئی ایک فلم "دی ریزرس ایج" دیکھنے گئے۔ ہم لوگ بالکنی میں بالکل دوسرے عام لوگوں کی طرح بیٹھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آخری موقع تھا جب جواہر لال نہرو نے نجی طور پر ایک عوامی جگہ پر فلم دیکھی۔"

طوفان آ رہا تھا۔ اب نہرو اور شیخ عبداللہ کی دوستی کی ایک ایسے بحران میں کڑی آزمائش ہوگی جس نے برصغیر کے نوزائیدہ اور نوجوان ملکوں کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا بلکہ وہ قیمت طلب کی جو آج بھی وہ

(۴)

"فردوسِ گم شدہ" ۔ بازیافت کی سعیِ ناکام

۲۲ اکتوبر کی تاریخ تھی اور ۱۹۴۷ کا سن ۔ پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبے پشاور میں ایک بہت بڑا جلسہ عام ہوا اس جلسے سے خطاب کرنے والے شخص کو اپنے حق کے طور پر ہندوستان میں رہنا چاہیے تھا ۔ اس نے اپنی ساری زندگی ، ایک سیکولر ملک بنانے کے لیے لڑائی میں صرف کر دی تھی اور عدم تشدد پر ایمان رکھتا تھا ۔ اسے لوگ سرحدی گاندھی کے نام سے جانتے تھے ۔ ۔ وہ بادشاہ خان بھی کہلاتا تھا ۔ تشدد اور بربریت کے حالیہ ننگے ناچ میں اس نے دیکھا کہ اس کی ساری زندگی کا کیا دھرا ختم ہو رہا ہے مگر اس نے اب بھی طوفان کا رخ بدلنے کی کوشش کی ۔ جلسے میں موجود پٹھانوں سے اس نے کہا " اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ضبط و برداشت کا جذبہ ہے ۔ اسلام کا لفظ ہی محبت اور خیر سگالی کو ظاہر کرتا ہے جو پٹھانوں کے قوانین کی بھی خصوصیت ہے اس لیے اگر کوئی کسی کمزور ، غیر محفوظ اور بے یار و مددگار شخص کو اذیت دیتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے پاکیزہ نام پر دھبا نہیں لگاتا بلکہ وہ ایک بالکل غیر پٹھانی عمل کا بھی مجرم ہوتا ہے ۔ " یہ الفاظ اس دن خصوصاً بڑے دھار دار تھے جو صوبہ سرحد اور کشمیر کی سرحدوں پر اسلام کی ایک بالکل مختلف تاویل پیش کی جا رہی تھی ۔

جناح صاحب نے کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے لیے اپنا بس بھر زور لگا لیا تھا ۔ شیخ عبداللہ نے اس بات کو ہمیشہ ہی خودکشی کے مترادف سمجھا تھا ۔ تقسیم کے بعد جب ایسا محسوس ہوا کہ نہ تو نیشنل کانفرنس اور نہ ہی مہاراجہ کی حکومت کشمیر کو پاکستان میں لے جانے کے لیے تیار ہے تو جناح صاحب نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ ہوائی قلعوں کی تباہ کن تعمیر میں الجھ چکے تھے اور ان کے ذہن میں خود مختار سلطنت کے عجیب و غریب نقشے گھومنے لگے تھے ان کے درباریوں کی خوشامدانہ تجاویز تو یہاں تک تھیں کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عظیم سلطنت کی بازیافت کر سکتے ہیں ۔ جولائی میں ، کشمیر کے ایک دورے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس اشارے

باوجود کہ سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ پاکستان سے الحاق کیا جائے، مہاراجہ نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ تک کسی کا فیصلہ
نہیں کیے تھے اس کی جگہ پر کشمیر نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ توقف کا ایک معاہدہ کر لیا
دوستان مذہبی فسادات کے علاوہ حیدرآباد، جوناگڑھ اور ریفیوجیوں کے مسائل کی وجہ سے پریشان تھا اس
رت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے کشمیر پر قبضہ کرنے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

۲۴ اگست کو جناح صاحب نے اپنے ملٹری سکریٹری کو حکم دیا کہ وہ وسط ستمبر میں کشمیر میں دو ہفتے کی چھٹیاں
ارنے کے انتظامات کر دے مگر یہ سن کر انہیں بہت زبردست دھکا لگا کہ ہری سنگھ انہیں وادی میں قدم بھی
ں رکھنے دیں گے۔ معاصرین کا خیال ہے کہ اس تحقیر نے جناح صاحب میں کشمیر میں چھٹیاں منانے کا عزم اور
م کر دیا۔ ستمبر کے وسط تک کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے صوبہ سرحد کے قبائلیوں کو کشمیر بھیجنے کے منصوبے پر
ل درآمد شروع ہو گیا۔ پاکستان کے لیے یہ عمل اس وار کی حیثیت رکھتا تھا جس سے بیک وقت تین شکار ہوتے
تھے۔ اول یہ کہ اس کارروائی سے پٹھانوں کی توجہ کو کابل کی طرف سے ہٹایا جا سکتا تھا جب ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو
ستان کو اقوام متحدہ میں داخل کیا گیا تھا، افغانستان واحد ملک تھا جس نے اس کی مخالفت کی تھی)۔ دوم یہ
رروائی اس پاکستانی فوج کا استعمال کیے بغیر ہی کشمیر کو پاکستان میں شامل کرا دے گی جس کی سرزمین کشمیر میں موجودگی
نی طور پر کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی اور سوم یہ کہ یہ کارروائی قبائلیوں کو ان کے پسندیدہ مشغلے یعنی لوٹ مار کا
ک موقع فراہم کر دے گی جو بہت دنوں سے ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ قبائلی لیڈروں کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ لڑائی صرف
نہیں کہ ایک ہندو راجہ کے چنگل سے اپنے مسلمان بھائیوں کو آزاد کرانے کے لیے جہاد ہو گی بلکہ منزل پر مال غنیمت
ل کرنے کے بھی بے پناہ مواقع فراہم کرے گی۔ یہ قبائلی ۲۲-۲۳ اکتوبر کی رات میں جہلم کے پار کشمیر میں داخل
ئے۔ سرحدی مورچے پر نہایت آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ سری نگر تقریباً ایک سو چالیس میل دور تھا جہاں پہنچنے کے لیے
ٹر کے لائق ایک سڑک تھی۔ جموں و کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی پر تکنیکی طور پر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر قبضہ ہو
تا تھا مگر جب لٹیروں کے سربراہوں نے سیدھے سری نگر جانے کا فیصلہ کیا تو اس انکشاف سے انہیں ایک بہت
دھکا لگا کہ ان کے پیروان کے ساتھ ہیں ہی نہیں۔ پٹھان رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے تھے وہ لوگ قریب
قصبے مظفر آباد میں لوٹ مار کے لیے چلے گئے۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ مقدم کیا چیز ہے۔ اس حرص و ہوس کی
ہ سے سری نگر پر دھاوے میں چند انتہائی اہم دنوں کے لیے خلل پڑ گیا اور ان ہی دنوں میں برصغیر کی تاریخ ایک با
ر سے لکھی گئی۔

ہا کمشش ہمیشہ اسوار پر دیوی درگا کی فتح کشمیری محل میں ہر سال بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ درگا ایک ایسی دیوی ہے ڈوگرے جس کی بہت پرستش کرتے ہیں تقریبات کے سلسلے میں وہاں ایک رواج یہ تھا کہ وہاں کے امرا ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر سونے کا ایک ٹکڑا ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور ان کا یہ عمل ان کی وفاداری کا ایک ثبوت تصور ہوتا تھا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ کی شام کو امرا اپنی وفاداریوں کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ تمام روشنیاں گل ہو گئیں۔ جشن میں شریک لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ہوا کیوں؟ مگر حقیقت یہ تھی کہ مہورا کے پاور ہاؤس میں جو ساری وادی کو بجلی سپلائی کرتا تھا، حملہ آوروں نے قبضہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ قبائلی اب سری نگر سے پچاس میل سے کچھ کم ہی فاصلے پر تھے۔ جموں اور کشمیر کے عظیم حکمراں نے پہلا کام وہ کیا جو ان کا ذہن سوچ سکتا تھا اور یہ کام تھا کہ انھوں نے اپنے لاتعداد تھیلے جمع کرنے شروع کیے اور چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عوام کو لٹیروں حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

نہرو کو اس بحران کی اطلاع ۲۴ اکتوبر کی رات میں ملی۔ ان کے ہوش اڑ گئے۔ شیخ عبداللہ اس وقت ان ہی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، دونوں نے مختلف امکانات اور مختلف کارروائیوں پر غور کیا۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کو بچانے کے لیے ہندوستانی فوج کو وہاں بھیجنے کے فیصلے کی پوری قوت کے ساتھ تائید کی مگر نہرو اس عمل کے آئینی پہلو کی توثیق پہلے چاہتے تھے۔ اگلی صبح، ۲۵ اکتوبر کو کابینہ کی ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی اسی سہ پہر رائل انڈین ایر فورس کا ایک جہاز ڈی سی۔ تھری سری نگر کے ہوائی اڈے پر اترا اس جہاز میں ریاستوں کی وزارت کے سکریٹری وی پی مینن تھے۔ ان کے اوپر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط لے لیں ہندوستانی فوجیں کشمیر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گی جب تک کہ انھیں آئینی طور پر یہ اختیار نہ مل جائے۔ ابتدائی مذاکرات ختم ہوئے، مینن واپس دہلی آ گئے۔ دوسرے دن وہ ایک دوسرے جہاز کے ذریعے جموں روانہ ہوئے۔ (رات میں مہاراجہ اپنا روپیہ اور قیمتی خزانہ لے کر ٹرکوں اور کاروں کے ایک قافلے کے ساتھ جموں کے محفوظ مقام کی طرف بھاگ گئے تھے) مہاراجہ نے بخوشی کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ بن گیا

مگر ایک الجھن تھی یہ الحاق عارضی تھا، ایک اصول تھا جس پر شیخ عبداللہ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ خاندان جس نے کشمیر انگریزوں سے پچھتر لاکھ روپیے میں خریدا تھا اسے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایسا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو تھا، اور بعد کو کسی وقت ان عوام کو اس فیصلے کی توثیق کا حق دیا جانا چاہیے۔ اس توثیق کا طریقہ کیا ہوگا اس کے بارے میں ابھی تک کسی کے ذہن میں کوئی صاف بات

نہیں تھی۔ نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال کے مطابق یہ ماؤنٹ بیٹن تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ تجویز اس وقت تو الحاق کے عارضی ہونے کا پہلو اور نہ ہی توثیق کا خیال کوئی مسئلہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے لیے شیخ کی وفاداری کسی قسم کے شک و شبہہ سے بالاتر تھی۔ یہ جناح صاحب نہیں پنڈت نہرو تھے جنھوں نے یہ بات علی الاعلان کہہ دی تھی کہ الحاق کے فیصلے میں یہ شرط شعوری طور پر رکھی گئی تھی۔

۲ نومبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک نشریئے میں جس کے الفاظ جب بھی کشمیر پر بحث ہوتی ہے، دہرائے جاتے ہیں۔ نہرو نے کہا "آج کی رات میں آپ لوگوں سے کشمیر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ مشہور و معروف کے حسن کے بارے میں نہیں بلکہ اس دہشت کے بارے میں جس کا اس نے ابھی حال ہی میں مقابلہ کیا ہے . . . .

۲۴ اکتوبر کی رات تھی جب ریاست کشمیر کی جانب سے ہم سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست کی گئی تھی سری نگر بلکہ پورے کشمیر کا مقدر تذبذب کا شکار تھا۔ ہم کو ہنگامی پیغامات بھیجے گئے، صرف مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عوام کے نمائندوں خصوصاً کشمیر کے عظیم لیڈر شیخ محمد عبداللہ، جو اس وقت نیشنل کانفرنس کے صدر ہیں، کی طرف سے بھی۔ کشمیر کی حکومت اور نیشنل کانفرنس دونوں نے ہم پر انڈین یونین سے کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کے لیے زور ڈالا۔ ہم نے اس الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ اپنے سپاہی بھیج دیئے مگر ہم نے ایک شرط بھی لگا دی کہ اس الحاق کی، جب نظم و ضبط اور امن و شانتی قائم ہو جائے گی تو عوام سے بھی توثیق کرانا ہوگی۔ ہم اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ بحران کی اس گھڑی میں عوام کو اپنی بات کہنے کا موقع دیئے بغیر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہونا چاہیے یہ طے کرنا بہرحال ان کا کام ہے اور مجھے یہ بات بھی صاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس پورے عرصے میں ہمارا یہ موقف رہا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے بارے میں ایک تنازعہ ہے اور فیصلہ ریاست کے عوام کو کرنا چاہیے۔ یہ ہماری اس پالیسی کے مطابق تھا کہ ہم نے کشمیر کے الحاق کے معاہدے میں یہ شرط بھی بڑھا دی۔"

دراصل یہ جناح صاحب تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ کے خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں ریاست میں ہیں وہاں ایمان داری کے ساتھ رائے شماری ہو ہی نہیں سکتی۔ جناح صاحب کو یقین تھا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی قیادت ہے کشمیری ہندوستان کے حق میں ہی رائے دیں گے۔

اسی تقریر میں جس میں پنڈت نہرو نے الحاق کی توثیق کے لیے "اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم کے تحت، عام رائے معلوم کرنے" کا وعدہ کیا تھا اسی میں انھوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ کشمیر کیوں نظریاتی طور پر ہندوستان

مدت سے سری نگر پر تباہی آئی ہوئی تھی اور حملہ آور تقریباً دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ انتظامیہ کا کوئی وجود باقی نہیں رہ گیا تھا۔ فوج نہیں تھی، پولیس نہیں تھی، روشنی اور بجلی خراب ہو چکی تھی، اور پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد وہاں تھی اور پھر بھی بغیر کسی ظاہری سراسیمگی کے بغیر حسب معمول تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ سڑکوں پر چل پھر رہے تھے۔ اس معجزے کا سبب کیا تھا؟ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ان کے رفیقوں، ان کے غیر مسلم مسلمان، ہندو اور سکھ رضا کاروں نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لیا، نظم و ضبط کو قائم رکھا اور پریشانی اور سراسیمگی کو روکا۔ یہ ایک حیرت ناک کام تھا جو انھوں نے کیا اور ایک ایسے وقت میں کیا جس میں اکثر لوگوں کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں انھوں نے ایسا اپنی تنظیم مضبوط ہونے کی وجہ سے بھی کیا مگر اس سے بھی زیادہ اس لیے کیا کہ وہ ان بے رحم اور ظالم وحشی حملہ آوروں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کا مصمم تہیہ کر چکے تھے جو ان کے ملک کو تباہ کر رہے تھے اور تشدد کے بل بوتے پر انھیں پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔

ایک ایسے لمحے میں جب ہر آن مقدرات بدل رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کے کارنامے بیان کرنے میں پنڈت جی کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ ۲۶ اکتوبر اتوار کے دن، اس وقت بھی جب ایک سہما ہوا مہاراجہ محلوں میں بیٹھا الحاق پر دستخط کر رہا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ کشمیر میں دس ہزار افراد پر مشتمل ایک امن بریگیڈ بنائی گئی ہے جو حملہ آوروں سے عوام کی حفاظت کرے گی۔ نیشنل کانگریس کے چند وہ رضا کار جو پاکستانی قبائلیوں سے لڑے اساطیری بن گئے۔ جیسے بارہ مولا کے مقبول شیروانی، جب بالآخر ہندوستانی فوج بارہ مولا میں داخل ہوئی انھوں نے دیکھا کہ مقبول شیروانی کو ایک بتی پر کیلوں سے ٹھوک کر گولی ماردی گئی ہے اور اصل میں زندگی کی علامت محض ایک رستے ہوئے سکتے کی آواز تھی جو مشن ہاسپٹل میں راہباؤں اور مدر سپیریر کی لاشوں پر رو رہا تھا۔ دو اکتوبر کو جب تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں، کشمیر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے (اپنے جاگیردار پیش رو ہری سنگھ کے برعکس، جو مخالف سمت میں بھاگ گئے تھے) شیخ عبداللہ نے کہا "میں واپس جا رہا ہوں حملہ آوروں کے خلاف عوام کی مدافعتی جدوجہد کی قیادت کے لیے۔"

الحاق کی شرائط کے مطابق اب جب کہ ہری سنگھ اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے تھے۔ شیخ عبداللہ کو نئی حکومت کی سربراہی کرنا تھی۔ ۳۱ اکتوبر کو انھوں نے اپنے قریبی ساتھیوں مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، شام لال صراف اور جی ایم صادق کے ساتھ حلف لیا۔ اسی دن مہاتما گاندھی نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا کہ میں نے جب بھی فوجیوں اور سامان کو کشمیر لے جانے والے جہازوں کی آوازیں سنی، میرا دل شیخ عبداللہ میں لگا رہا۔ (ملک کا ہر فاضل جہاز اس کام

میں لگا دیا گیا تھا) ان جہازوں نے کشمیر کو بچا لیا۔ ۳۱ اکتوبر کو نہرو نے دو ٹیلی گرام پاکستان بھیجے جس میں امن و شانتی قائم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تاروں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کو ابھی بھی یہ خیال تھا کہ وہ اس لڑائی میں جیتنے والا ہے، مگر جلد ہی لڑائی کا رُخ بدلنے لگا اور حملہ آور گھیرے جو اچھی طرح مسلح بھی تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے، پیچھے دھکیلے جانے لگے۔ چودہ مہینے بعد جب تک جنگ بندی ہوگی تو اس وقت ان کے پاس مغرب میں زمین کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور شمال میں دور افتادہ بنجر آراضی ہوگی۔ ہندوستانی فوج کے کمانڈروں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ اگر انھیں روک دیا گیا نہیں تو انھوں نے اپنے ملک کے لیے "کشمیر کے مسئلے" کو تقریباً حل کر دیا تھا۔ سری نگر کے کنارے سے انھوں نے پاکستانی فوج کو پونچھ کے مغرب میں اس جگہ تک دھکیل دیا تھا جہاں سے پاکستان نظر آنے لگا تھا اور وہ شمال میں گلگت پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے مگر پنڈت نہرو نے اقوام متحدہ کے اہتمام میں جنگ بندی کو قبول کر لیا۔ بہر حال کشمیر کا اصل مسئلہ نہ تو پاکستان کے رویے کا تھا کہ یہ تو اس سے مختلف ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوشش کا تھا کہ یہ بھی اس سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو افراد، جو ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں اتحاد کی علامت تھے جو ملک کو متحد رکھ سکتی تھیں، شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے۔

۱۹۴۷ء کے رشتۂ یگانگت کو جن جذبات اور جس اعتماد نے جنم دیا تھا وہ شاید ۱۱ نومبر کو سری نگر سے زیادہ کہیں اور ظاہر نہیں تھا۔ ۱۱ نومبر کو پنڈت نہرو دہلی سے کشمیر کے دورے پر آئے۔ اس وقت تک سری نگر کے نواحی علاقے خالی کرائے جا چکے تھے اور بریگیڈیر ایل۔ پی۔ سین کے فوجیوں نے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس وقت کی کیفیت اور موڈ کی تصویر کشی کی تھی جب انھوں نے ۵ نومبر کو شائع ہونے والے روزنامے ہندوستان ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستان کی قبر وادیٔ کشمیر میں کھودی جائے گی" ۱۱ نومبر کو رفیع احمد قدوائی، اجوذ چھوڑ دھن اور اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے ساتھ پنڈت نہرو سری نگر پہنچے۔ ایک بار پھر پر جوش استقبال ہوا۔ ہوائی اڈے سے شہر تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کے ہجوم تھے۔ اسی دن جلسہ عام میں تالیاں بجاتے ہوئے مجمع کو پنڈت نہرو نے بتایا کہ "ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہم ساتھ کھڑے ہوں گے اور دشمن کا مل کر مقابلہ کریں گے" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے، پھر مڑے اور انتہائی جذبات میں اپنا ہاتھ شیخ کی طرف بڑھا دیا جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ متحیر شیخ نے فوراً پنڈت جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دو دوست محبت اور وفاداری کی عالمی علامت کے طور پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور مجمع خوشی سے چلائے جا رہا تھا۔

پنڈت نہرو، جنھیں ہندوستانی موقف کے آئینی طور پر جائز ہونے کا یقین تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ کو یہ

انجمن اقوام متحدہ کے سامنے لے گئے جس پر بعد کو انھیں خود بھی بہت افسوس رہا۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے حملہ آوروں کو واپس بلائے۔ سیکوریٹی کاؤنسل نے حسب توقع فریقین سے امن کی اپیل کی۔ حملہ آوروں نے کہ جنھوں نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی تھی وہ انداز اختیار کیا کہ جیسے سیکوریٹی کاؤنسل کا وجود ہی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی کوششوں کے سلسلے میں پاکستان کا ردعمل یہ تھا کہ موسم گرما میں جب ہندوستان نے اپنا کامیاب حملہ شروع کیا انھوں نے حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اپنی باقاعدہ فوج کے سپاہی بھی محاذ پر بھیجنے شروع کر دیئے۔

پاکستان نے اب یہ کہنا شروع کیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں بیک وقت اپنی فوجیں ہٹانا چاہیئں تاکہ ایک ایماندارانہ استصواب ہو سکے۔ یہ کہتے ہوئے پاکستان نے اس سیدھی سادی حقیقت کو نظرانداز کر دیا تھا کہ وہ کشمیر میں کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتا ہے جب کہ ہندوستان کی حیثیت آئینی تھی۔ اس دلیل میں ایک سے زیادہ چالیں تھیں۔ پاکستان کو جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے فوقیت حاصل تھی۔ پاکستان بروقت ہی اپنے نائبین یعنی قبائلیوں کو واپس بھیج سکتا تھا اور یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ کشمیر پر حملہ سوائے ایک "داخلی معاملے" کے اور کچھ نہیں ہے۔ ———— پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں بھی یہی کیا تھا اور ۱۹۶۵ء میں بھی اسے یہی کرنا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی فوجی اڈے کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے بہت قریبی فاصلے پر تھے۔ ایبٹ آباد کی دوری صرف سولہ میل تھی، راولپنڈی اکتیس، مری پندرہ، سیالکوٹ چھ اور جہلم محض چار میل کے فاصلے پر تھا۔ دوسری طرف کسی بحران میں اچھی تعداد میں ہندوستانی فوج کو لانا پہلی ہی دفعہ مشکل کام تھا جو ظاہر ہے کہ بار بار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شیخ عبداللہ جو اب کشمیر کے وزیراعظم تھے وہ بھی ہندوستانی فوج کی واپسی نہیں چاہتے تھے۔ وہ نیویارک گئے اور وہاں کہا کہ "وہ پاکستان کو انھیں غلام بنانے کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیر میں ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے"۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں شیخ عبداللہ نے نیویارک میں دوپہر کے ایک کھانے کے موقع پر کہا کہ "ہم کشمیر میں یہ زبان استعمال نہیں کرتے ہیں ...... پچھلے سترہ برسوں میں نیشنل کانفرنس کے سامنے سیکولر جمہوریت کے حصول کا مقصد رہا ہے"۔

کشمیر سے متعلق، اقوام متحدہ کی طول طویل کارروائیوں کا ذکر ایک بے مصرف عمل ہوگا کیوں کہ اس کا رول، آخری تجزیئے کے بعد بھی نظر آتا ہے کہ محض رسمی اہمیت کا تھا جو لڑائیاں اہمیت رکھتی ہیں وہ وہ تھیں جو میدان جنگ